ہمایوں کے مشرق کی جانب بلندی پر کھڑے ہو کر دریائے جمنا کا جو منظر سامنے آتا ہے، ویسا ہی منظر بارہ دری کے مشرق سمت کا نظر آتا ہے" اور کسی شاعر کے حسین خواب کی آماجگاہ معلوم ہوتا ہے۔ اس بارہ دری کے باغ و بہار ماحول میں روح الامین ادیب کی شاعری پروان چڑھی۔ اس کے نورستہ پھولوں اور نو شگفتہ کلیوں سے انھوں نے جو پیغام پایا اُس کو غزل کے پیرائے میں سدا بہار بنانے کی ہر امکانی سعی کی۔ ان کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب پیش خدمت ہے :

غزل

(۱)

کیا کہوں ہم دم دلِ پُر آرزو کی آرزو   آرزو اور اس بت بے گانہ خو کی آرزو
رنجِ تنہائی سے کچھ باقی نہیں عقل و تمیز   اپنے سایہ سے ہے مجھ کو گفتگو کی آرزو
ایک ہو سکتی ہے دنیا میں بھلا مرگ و حیات   یہ ہماری آرزو ہے، وہ عدو کی آرزو
آپ کے پیاں ہیں یا میرے جگر کی حسرتیں   آپ کا خنجر ہے یا میرے گلو کی آرزو
کون سمجھے اس دلِ بے مدعا کا مدعا   کون پوچھے اس دلِ پر آرزو کی آرزو
متقاضی عشق ... ے ذوقِ ابتلا   غم کا غم، حسرت کی حسرت آرزو کی آرزو

(۲)

مگر کچھ پاؤں پڑ کر کہہ رہی ہیں بیڑیاں میری
نے شاید سیکھ لی طرزِ فغاں میری
شعلیں بن کر جلی ہیں ہڈیاں میری
سے پہلے ہی سن لی ہے گویا داستاں میری
... معقولے ایسا
الجھ کر رہ گئیں ہاتھوں میں میرے دھجیاں میری

(۳)

خونِ دل کیا ہے اگر دامنِ مژگاں میں نہیں   دل بھی وہ دل ہے کوئی جو ترے پیکاں میں نہیں
کچھ تلافی دلِ وحشت کی بیاباں میں نہیں   چاک دامن میں نہیں، خار بیاباں میں نہیں
کچھ نہ پوچھیے دلِ دیوانہ کی وہ بربادی   سر کے ٹکرانے کو دیوار بیاباں میں نہیں
وائے خوردئی قسمت کہ بہار آئی جنوں   میں قفس میں ہوں، قفس میرا گلستاں میں نہیں
کون سا جرم کیا ہے ترے دیوانوں نے   شورِ زنجیر بھی ظالم ترے زنداں میں نہیں

مے ہے، پیمانہ ہے، ساغر بھی ہے، رات، گھٹا، ادیب
توبہ زاہد کی مگر محفلِ رندا...

(۴)

زمیں مقتل کی دیتی تھی دہائی اس سے کچھ پہلے   مرے نالہ میں شاید تھی خدائی اس سے
مرا رشک عدو ان کو تو اکثر کھینچ لایا ہے   نہ تھی نالہ میں گر میرے رسائی اس سے
نہ تھا رنگ حنا ظالم، تھے چھینٹے خونِ ناحق کے   پیامِ قتل تھا دستِ حنائی اس سے
ادھر گلچیں نے گل توڑا، ادھر بلبل نے دم توڑا   خزاں تیرا برا ہو کیوں آئی اس سے

(۵)

مری فریاد میں تاثیر تھی یہ جذب کامل کی   نگاہ خیال میں کھنچ کر پھری
خبر ہم کو نہ دل کی ہے، نہ دل ہم سے کچھ واقف   خدا جانے کہاں ہم ہیں، تو
تمہارے روبرو ٹوٹا، تمہارے ہاتھ سے ٹوٹا   زباں کا تو، شکایت کی شکس
چمن میں لالہ و گل اس لیے رنگیں کفن آئے   کہ چھینٹیں تھیں گریباں گیر خو

مسودات کلام میں ایک قطعہ نما غزل ہے، جسے ہم مثنوی نما قطعہ کہ ہیں۔ اس قطعہ میں جو واردات قلبی اور تاثرات بیان کیے گئے ہیں وہ گھر کرنے والے اور آگ لگانے والے ہیں۔ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں :

ان سے بے داد کی شکایت کی   او زباں تو نے کیا قیامت کی
نہ کٹی رات ہم سے فرقت کی   دیکھ لی بات تاب و طاقت کی
گو نہ دیکھو، مری طرف، لیکن   آنکھ چھپتی نہیں، محبت کی

ق

کل یہ دل نے کہا کہ اس بت سے   لکھیے رودادِ رنجِ الفت کی
کیجیے شوقِ وصال بالتفصیل   کہیے بیدادِ دردِ فرقت کی
کیجیے کچھ بیانِ جوشِ جنوں   کیجیے شرح زورِ وحشت کی
کہیے کچھ دل کے اضطراب کا حال   لکھیے کچھ شدتیں اذیت کی
غیر کی کچھ برائیاں کیجیے   کچھ ثنا ان کی شکل و صورت کی
شاید ان میں سے نکلے کوئی بات   طرز بدلے ذرا طبیعت
دل سے جاتا رہے یہ شوقِ ستم   جی میں آجائے لطف و الفت
بس اسی وقت بزم میں جا کر   ظاہرا اس سے سب حقیقت و
دردِ فرقت بھی اب بیان کیا   کچھ عیاں وصل کی بھی حسرت کی
کج ادائی کے بھی کیے شکوے   بے وفائی کی بھی شکایت کی
سن کے تقریر میری فرمایا   ہم نے درخواست کی تھی چاہت کی

(بقیہ صفحہ ۷۱ پر)

ہمایوں کے مشرق کی جانب بلندی پر کھڑے ہو کر دریائے جمنا کا جو منظر سامنے آتا ہے، ویسا ہی منظر بارہ دری کے مشرقی سمت کا نظر آتا ہے، اور کسی شاعر کے حسین خواب کی آماجگاہ معلوم ہوتا ہے۔ اس بارہ دری کے باغ و بہار ماحول میں روح الامین ادیب کی شاعری پروان چڑھی۔ اس کے نو رستہ پھولوں اور نو شگفتہ کلیوں سے انھوں نے جو پیغام پایا اس کو غزل کے پیرائے میں سدا بہار بنانے کی ہر امکانی سعی کی۔ ان کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب پیش خدمت ہے:

غزل

(۱)

کیا کہوں ہم دم دلِ پُر آرزو کی آرزو — آرزو اس بت بے گانہ خو کی آرزو
رنج تنہائی سے کچھ باقی نہیں عقل و تمیز — اپنے سایہ سے ہے مجھ کو گفتگو کی آرزو
ایک ہو سکتی ہے دنیا میں بھلا مرگ و حیات — یہ ہماری آرزو ہے، وہ عدو کی آرزو
آپ کے پیماں ہیں یا میرے جگر کی حسرتیں — آپ کا خنجر ہے یا میرے گلو کی آرزو
کون سمجھے اس دلِ بے مدعا کا مدعا — کون پوچھے اس دلِ پُر آرزو کی آرزو
[illegible] ذوقِ ابتلا — غم کا غم، حسرت کی حسرت، آرزو کی آرزو

(۲)

[illegible] جگر [illegible] کر کر رہی ہیں بیتابیاں میری
[illegible] شاید سیکھ لی طرزِ فغاں میری
[illegible] کر چلی ہیں [illegible] یاں میری
پہلے [illegible] اس دل نے گویا داستاں میری
[illegible]
[illegible] میں سایہ [illegible] میری

(۳)

[illegible] دل [illegible] کوئی جو ترے [illegible] میں نہیں
[illegible] دل [illegible] بیاباں میں نہیں — [illegible] نہیں [illegible] میں نہیں
[illegible] ویرانہ کی [illegible] — [illegible] بیاباں میں نہیں
[illegible] قسمت [illegible] — [illegible] گلستاں میں نہیں
کون [illegible] — [illegible]
[illegible] پیمانہ ہے ساغر [illegible]
[illegible] محفل [illegible]

(۴)

زمیں مقتل کی دیتی تھی دہائی اسے کچھ پہلے — مرے نالہ میں شاید تھی خدائی اثر
مرا رشک عدو ان کو تو اکثر کھینچ لایا ہے — نہ تھی نالہ میں گر میرے رسائی اثر
نہ تھا رنگ حنا ظالم، تھے چھینٹے خون ناحق کے — پیام قتل تھا دست حنائی اسے
ادھر گلچیں نے گل توڑا، ادھر بلبل نے دم توڑا — خزاں تیرا برا ہو کیوں آئی اسے

(۵)

مری فریاد میں تاثیر تھی یہ جذب کامل کی — نگاہ خیال میں کھینچ کر رکھ دی [illegible]
خبر ہم کو نہ دل کی ہے، نہ دل ہم سے کچھ [illegible] — خدا جانے کہاں ہم ہیں [illegible]
تمھارے روبرو ٹوٹا، تمھارے ہاتھ سے ٹوٹا — زباں کاٹو، شکایت کی [illegible]
چمن میں لالہ و گل اس لیے رنگیں کفن آئے — کہ چھینٹیں تھیں گریباں گیر [illegible]

سودا کے کلام میں ایک قطعہ نما غزل ہے، جسے ہم مثنوی نما قطعہ کہہ سکتے ہیں۔ اس قطعہ میں جو واردات قلبی اور تاثرات بیان کیے گئے ہیں وہ گھر کرنے والے اور آگ لگانے والے ہیں۔ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

ان سے بے داد کی شکایت کی — اور زباں تو نے کیا قیامت کی
[illegible] کٹی رات ہم سے فرقت کی — دیکھ لی بات تاب و طاقت کی
گو نہ دیکھو مری طرف لیکن — آنکھ چھپتی نہیں محبت کی

[illegible]

کل [illegible] نے کہا کہ اس [illegible] — لکھیے روداد رنج الفت کی
لکھیے شوقِ وصال بالتفصیل — لکھیے بیدادِ روزِ فرقت کی
لکھیے کچھ بیانِ جوشش جنوں — کیجیے شرح [illegible] کی
لکھیے کچھ دل کے اضطراب کا حال — لکھیے کچھ شدتیں [illegible] کی
[illegible] کچھ [illegible] — کچھ تمنا ان کی [illegible]
شاید ان میں سے لکھے کوئی بات — [illegible] طبیعت
دل سے جاتا رہے یہ شوق ستم — جی میں آجائے لطف و الفت
[illegible] اسی وقت بزم میں جا کر — ظاہر اس سے سب حقیقت [illegible]
[illegible] تھی اب بیاں کیا — کچھ عیاں وصل کی بھی حسرت کی
[illegible] کے بھی کچھ [illegible] — بے وفائی کی کچھ شکایت کی
سن کے [illegible] — ہم نے درخواست کی تھی بیانہ کی

(بقیہ صفحہ ۷ اپر)

قدر ہے، اس سے ان کے کلام کی خوبی، سادگی، صفائی، برجستگی اور پاکیزگی کا خاصہ ہوتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ادیبؔ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ کم از کم ان کے ہے قلمی نسخے سے جو ان کے دست و قلم کا ہے، اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اکثر کلام پر جو حک و اصلاح ہے وہ خود ان ہی کے دست و قلم کی مرہون ہے۔ نیز یہ شاعر سے متاثر ہونے کا اشارہ یا عقیدت کا اظہار بھی کسی شعر سے ہویدا نہیں ہوتا ہے۔ حک و اصلاح سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب اور جس وقت کلام کی خامی سے آگاہ ہوتے، صحت کر لیتے تھے۔ صفائی کلام کا خاص خیال رکھتے بے ہودہ یا لغو اور پامال مضامین و خیالات سے پرہیز کرتے تھے۔ اس کے برعکس ...ق الٰہی کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

بت کش جام مے وحدت ہوں ادیبؔ لاکھ ساماں ہے مجھے بے سر و ساماں ہونا

شعر:

مثال آئینہ صورت نما ہوا اس کو جو ربط صحبت اہل صفا ہوا
حیات تازہ شہادت ہوئی نصیب اک آب زندگی مجھے جام فنا ہوا

لیکن ان کا ذہنی شعور، غزل، اس کی رمزیت اور اس کے ایمائے رچا ہوا تھا۔ صنف شاعری میں انھوں نے ایسے تیکھے، اچھوتے اور نرالے مضامین پیدا کیے ہیں نہ لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ نازکی اور ندرت خیال، پاس و لحاظ، رعب حسن اور خودی خودداری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے۔ کیف غزل اور سراپائے یار کا ذکر حسن کلام ہے۔ شاعری کے متعلق عام تخیل یہ ہے کہ وہ عطائے الٰہی ہے۔ میرا خیال ہے قدرت کے اس فیضان سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہی دراصل عطائے الٰہی کی علامت ہے۔ لہو و لعب اور ذوق و شوق کے ذکر کا نام نہ تو شاعری ہے، نہ ہی ادبی خدمت۔ شاعری وصف خاص کی چیز ہے۔ اور اس کے حصول میں ادائے خاص کی نہیں خون جگر سے سیرابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میر تقی میرؔ نے اسی جذبے سے متاثر ہو کر کہا تھا ؎

خشک سیر دل تن شاعر کا لہو ہوتا ہے تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

یہی مصرعۂ تر اصل زندگی اور حیات جاودانی کی علامت ہے۔ ادیبؔ بھی اس رمز سے آگاہ تھے اور اپنے کلام کو اس کیف سے مملو کرنے کا گُر ان کو خوب آتا تھا۔ خالص غزلیت اور اشاریت کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

یاد گیسو میں رکھا کیا ہے پریشاں ہونا
آئے دن سر پہ بلائے شب ہجراں ہونا

کہتے ہیں نقش پا، کف پا ان کے چوم کر کچھ حکم دیتے جائیے محشر کے باب

کیف آگیں اور غزل آگیں دو شعر ملاحظہ ہوں:

توبہ کی تھی نہ چھوئیں گے، کبھی گیسو ان کے بت خوگر نے کیا ہائے گنہگار
کس نشیمن پہ گری آہ یہ بجلی کہ ادیبؔ سانس لینا بھی قفس میں ہوا دشوار

یا یہ اشعار:

گریباں کی سیر، تجھے دھجیاں اڑانا، نہ باد صبا چاہیے
رو پوشش ہو کے رہ نہ سکے وہ حجاب میں ڈالے نگاہ شوق نے رخنے نقاب میں
پسا جاتا ہے دل اپنا کسی کی چال و ستی پر الٰہی خیر ہو دل کی، سلامت آبرو میں
حشر کا دن بھی اسی میں گزرا طول دیکھو شب تنہائی
آہ کرتا دل حزیں نہ کہیں آگ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

مندرجہ بالا سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ قصبہ کوڑہ جہان آباد کی دوسری ... بارہ دری اور امام باڑہ ہے۔ یہ دونوں عمارتیں شاہان اودھ سے متعلق تھیں، میاں الماس خواجہ سرا کے انتظام و انصرام میں تھیں۔ الماس جب اس ... میں آئے تو ان کے ہمراہ بنا طوائف بھی آئی۔ مشہور ہے کہ اس طوائف کا ... منا لال کا تخم سے تھا، جو بعد میں مسلمان ہوا اور حیدر بخش نام پایا۔ اس کی ... میں فدا حسین وغیرہ ہوئے۔ لیکن حیدر بخش آخر عمر میں دیوانہ ہوا اور اسی حالت فوت ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد منا لال کے اعزا اور بھائی وغیرہ نے دولت ... کیا اور کل املاک کے وارث بن گئے۔ اور اب اس جائداد کے مالک منا لال ... اس کے بھائی کے ورثا میں رائے بہادر دھیرین سنگھ حیات ہیں۔ بارہ دری اس کے ملحقہ باغات وغیرہ اب ان ہی کے قبضہ میں ہیں۔ مگر آزادی ہند سے کچھ دن پہلے امام باڑہ اور امام باغ واگزار ہو چکے تھے۔ جو شیعہ وقف بورڈ کے زیر انتظام ہیں اور ہر سال محرم الحرام میں باقاعدہ مجالس امام حسین علیہ السلام برپا ... ہیں۔ قصبہ کے معتبر حضرات کا کہنا ہے کہ پہلے امام باڑہ اگرچہ اہل ہنود کے ... میں تھا مگر مجالس کا احترام اور امام باڑہ کا احترام بے حد کیا جاتا تھا۔ ادھر سنگھ کے اب و جد پا برہنہ و سر برہنہ جلوس کے ساتھ ہوتے، عقیدت و خوش ... کے پھول نچھاور کرتے، نذر و نیاز کرتے، لنگر تقسیم کرتا اور غربا و مساکین کی امداد کی آمدنی سے مالی اعانت بھی کی جاتی تھی۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ... بدلتے گئے اور اس وجہ سے اہالیان قصبہ نے احترام امام باڑہ کی خاطر ... کا بندوبست کیا۔ امام باڑہ اور بارہ دری کی عمارت دیدنی ہے۔ لال قلعہ دلی

اردو کا گمنام شاعر

— روح الامین ادیب

مرتضیٰ حسین بلگرامی

جامعۂ اردو علی گڑھ کے امتحانات کے سلسلے میں مجھے یوپی کے ایک مشہور قصبہ کوڑہ جہان آباد جانا پڑا۔ وہاں کے لوگوں سے مل کر ان کی مہمان داری اور خوش اخلاقی دیکھ کر بہت مسرت ہوئی تھی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی ہماری قصباتی زندگی میں فیشن پرستی اور بے راہ روی کے جراثیم داخل نہیں ہوئے ہیں، جس نے مشرقی آداب و لحاظ کو مجروح کر رکھا ہے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں یہ قصبہ

ے ڑے قلعہ نما مکانات مٹی کا ڈھیر

...ابل کی یاد دلانے کے لیے باقی ہیں۔

ں، وہ بھی آثار قدیمہ میں شمار ہونے کے

...عات کا بھی یہی عالم ہے۔ میرا قیام

رے خاص سلسلے پر ایک چھوٹی سی تین در کی مسجد بنی ہوئی ہے، جو امتداد زمانہ کے باوجود مگر اہل خانہ (محترم صدیق حسن صاحب) کی توجہ خاص کی بدولت، محفوظ اور بہتر حالت میں ہے۔ اس پر جو کتبہ نصب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۹۶۸ ہجری میں سلطان شرقی کی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اب اسے میاں ٹولی کی مسجد کہتے ہیں، کیونکہ یہ محلہ سادات حنفی کا ہے۔ اگرچہ اب سادات کے دو ہی ایک گھر باقی رہ گئے ہیں، جن کے دم سے شرافت و نجابت کا نام باقی ہے، ورنہ اس مسجد یا خانۂ خدا کے ارد گرد کی تمام عمارات ملبے میں تبدیل ہو چکی ہیں اور یاس و بے کسی کے مناظر پیش کر رہی ہیں۔

کوڑا جہان آباد کے ایک سمت بارہ دری اور امام باڑہ ہے۔ دوسری سمت بجلی خاں کا قلعہ ہے، جس کی بابت مشہور ہے کہ راجہ ارگل کے بھائی بجئی سنگھ نے مخدوم سالار قطب الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام قبول کیا۔ اس کا نام کی مناسبت سے بجلی خاں تجویز ہوا۔ یہ خاندان گوتمانہ سے تعلق رکھتا تھا اور بڑا گھرانہ تھا۔ حسرت موہانی مرحوم کی ماں، اسی نومسلم خانوادے کی تھیں۔ اگرچہ حسرت کے والد ماجد موہان ضلع اناؤ (یوپی) کے سادات سے تعلق رکھتے تھے مگر کہا جاتا ہے کہ قلعہ والوں سے ان کے اہل خاندان کے بڑے عمدہ مراسم تھے اور اسی بنیاد پر یہ رشتہ استوار ہوا تھا۔ حسرت موہانی مرحوم کے ایک بھائی سید مبین الحسن فتح پور ضلع کے قصبہ بندکی میں قیام پذیر ہیں، جن کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی ہے۔ افسوس کہ موصوف سے ملاقات نہیں کر سکا۔ حالاں کہ حسرت موہانی سے علی گڑھ اور دہلی میں کئی بار ملا تھا۔ ان کی شرافت، سادگی، وضعداری اور علمی وجاہت کا کون شخص ہوگا جو معترف نہ ہوگا۔ حسرت کا تعلق خاندان بلگرام کے کئی افراد سے تھا، مگر جو تعلق خاطر سید کاظم علی شوکت بلگرامی اور الحاج سید علی احسن احسن مارہروی مغفورین سے تھا، وہ قدر اول کی بات تھی۔ علی گڑھ کے دوران قیام میں حسرت اور شوکت بلگرامی ہم محلہ و ہم مکان تھے۔ حسرت کے ایک دوست میاں روح الامین عرف مچھن میاں تھے، جو علی گڑھ کے طالب علم اور قصبہ کوڑہ جہان آباد کے باشندہ تھے۔ علمی اور شعری صلاحیت و استعداد بہت عمدہ تھی تخلص ادیب تھا۔ ان کی صحبت اور علمیت سے قصبہ کے اہل علم مستفید ہوتے۔ اسی لیے حسرت اور ادیب کے تعلقات بھی بہتر تھے۔ اور حسرت جب اپنی ماں کے گھر مہمان ہوتے، تو زیادہ تر وقت حضرت ادیب کے ساتھ گزارتے۔ ادیب کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا اور یہ واقعہ ہے کہ قدرت نے بڑی فیاضی سے غزل کی ماورائی کیفیت ان کو عطا فرمائی تھی۔ میرے پیش نظر موصوف کا "قلمی کلام" جس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پھاگ

بیتاب بریلوی

چھوتی شاید صبا دھو بجے آتی ہے — لپٹ کر دامنِ گلزار سے ہنسی جاتی ہے
اتی ہیں سہیلیں، بوٹا بوٹا لڑکھڑاتا ہے — گھٹا میں تال دیتی ہیں، شجر تالی بجاتا ہے
تی ہیں کہیں کلیاں کہیں زلفیں بکھرتی ہیں — فضائیں نکہتوں میں ڈوب کر کیا کیا سنورتی ہیں
نتِ دہقاں میں سنہری نافہ کے سائے — دلوں پر وجد طاری ہے، نظر کے پر نکل آئے
رں، سہارے ناگ بوکے کار دالے کر — قدم ہولی کے آئے یا بہار آئی ہے جوبن پر
کہ اتی، ناز فرماتی ہوئی آئی — برنگِ شعلۂ تنویر بل کھاتی ہوئی آئی
ی جھلجھلاتی رادھکا سی موہنی مورت — سلوچن، سرو قد، نتھری، سلونی، سانولی صورت
ے مانگ کے موتی، مہکتا غازۂ گلگوں — سنبھالے لغزشِ پا بارِ جبیں پر برہمن جوں تو
غ نازِ محبوبی سرِ لوحِ جبیں روشن — جھمکتا چاند بندی کا فروغِ الف کا سامن
فِ زلفِ نجم افگن، جو مارے برملا شب خوں — گلِ رخسار پر لوٹے تو پھونکے سامری افسوں
بعد مطلاتے شعاعیں رنگ و روغن کی — گلابی ہاتھ میں ...ہ چولی کی نہ دامن کی
ندی، جمالا کھا حسین مکھ، چندن کومل — شرابی مدھ بھرے نینوں میں ڈورے ڈالتا کاجل
رنگیں سے لو اٹھتی، لبِ لعلیں جلا دیتے — شباب انگڑائیاں لیتا تو تیور رُت بنا دیتے
ملائی پیرہن سے کیوں نہ کندن کی دمک آتی — سرک جاتا اگر آنچل تو بجلی سی چمک جاتی

نہ پائل کی جھنک آتی نہ بربط کی صدا آتی
بعنوانِ فغاں آتی اگر ہولی تو کیا آتی

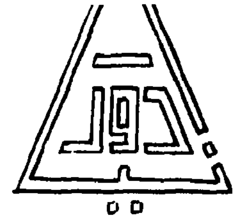
جدھر دیکھو اُدھر طوفاں بپا ہے رنگ پاشی کا — غرض گوکل نے منہ پھیرا ہے اس عنوان کاشی کا
کہیں چہلیں کہیں طعنے، کہیں خفیلے، کہیں قسمیں — مگر دہرائی جاتی ہیں یہی ہولی کی رسمیں
بڑا لیوں کی لاگ سے گھلتا ہے رس بس میں — کریں کیا بس میں ہیں دل کے دل بس کہاں بس میں

فضا میں نگہتِ حسن کی بکھیلیاں آئیں — من جامے سے باہر خود نئے البیلیاں لیتی
سگھڑ سندر سجیلی سو برن سی ناریاں کھیلیں — جمایا رنگ ہاتھوں میں لیے پچکاریاں کھیلیں
جہیتی رُت ماتی پیا کی پیاریاں کھیلیں — پیا کی پیاریوں سے پھاگ بڑھ کر لنوا کھیلیں
چلیں دو ہاریں مقابل سے تو یہ صورت نظر آئی — فلک سے ٹوٹ کر قوسِ قزح گویا اُتر آئی
چھٹیں پچکاریاں سہم تو منہ کی کھا گئے بانکے — چھٹیں چھینٹے جہاں چھپ کر کوئی کیا ہاں جھانکے
بھگو دینا وہ مہوش کا کسی مہوش کو چوری سے — لپٹ جانا وہ ہاتھوں ہاتھ بڑھ کر گوری کا گوری سے
وہ مستی ہے جس میں زندگی آواز دیتی ہے — وہ لمحے میں دنیا جسے جب سانس لیتی ہے
حسینی انساں حسین چنچن پریم کم نے اڑ اڑ کر — کھلی دکنکتاں کی گونج دیکھے اور مڑ مڑ کر
کھشکتی ہے نظر میں خار سی گو وسعتِ امکاں — کھڑی ہے پا بگل محبور ہو کے گردشِ دوراں
سہاگن سرلقا گج گامنی چت پر البیلی — نہ پیا کرتی بھتی پی کی باؤلی ایسی کہ کھل کھیلی
چنچل، ہٹیلی، چلبلی چپکے سے چٹکیاں لیتی — چھبیلی یوں چھپا چھپنا کہ شوخی میں ہتھی رہتی
کلیجہ تھام کر سیانی چھبیلی چھیل کی برہن — لگی دل کی بجھانے کو لگی رنگنے رنگیلا من
کوئی رنگ میں ہوئی رادھا، بنا گھنشیام ہولی — لیے آنکھوں پہ آنچل منہ چھپا کر کھیل لی ہولی
ملے مستی میں یوں تو سے سرشار خوش نشاں یکسر — قسم اُن کی جو منہ باندھے پڑے ہیں گھر میں مل کر
نہ اب مہندی کا بیرے، نہ وہ رسیا کی رادھا ہے — ذرا کہہ دو نہ روٹھو یہ کیسی مان لیلا ہے
اٹھو ہولی سو ہولی کیا گلے شکوے گلے مل کے — مزا ملنے کا جب آئے ملے جب سے ملے دل سے
اڑیں یوں تو بلوں سے کاگ شیشے میں پری آئے — بھری ہے جو سماں میں آنکھوں کی بھری جائے

نہ رہتی کم سے کم تفریقِ خاص و عام ہولی میں
صراحی رقص میں آتی، تھرکتے جام ہولی میں

چیتر ۰۰۰ اشک

عنوانات



جلد ۲۲ | نمبر ۱

چیتر ۱۸۸۸ شک
اپریل ۱۹۶۶ عیسوی

سالانہ پانچ روپے
پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
گرجا کشور جوشی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
گورنمنٹ پریس۔ عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

اپنی بات

حکومت اتر پردیش ہر سال ہندی، اردو اور سنسکرت کے مصنفوں کو ان کی کتابوں پر انعامات دیتی ہے۔ ان میں پانچ پانچ ہزار روپے کے کچھ اسپیشل انعامات بھی ہوتے ہیں جو اس سال کی اہم تصانیف پر دیے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ ۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو حکومت کی جانب سے انعامات کا جو اعلان ہوا ہے اس میں ہندی، اردو اور سنسکرت کی کتابوں پر مجموعی طور پر ۵۵۰۵ روپے کے ۶۰ انعامات دیے گئے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار روپے کے اسپیشل انعام پانے والوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر گیان چند، اردو کے مشہور ادیب اور تنقید نگار شری سید احتشام حسین (الہ آباد) اور دارالسنسکرت شری ستھرا پرشاد دکشت ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کو ان کی کتاب [illegible] پر اور شری ستھرا پرشاد دکشت کو ان کی سنسکرت کتاب پر اسپیشل انعام ملا۔ اس کے علاوہ سنسکرت یونیورسٹی وارانسی کے ڈاکٹر [illegible] کو ان کی تصنیف [illegible] پر تیسرا [illegible] ۲۵ روپے کا نرنیدر دیو انعام دیا گیا ہے۔ اردو کی کتابوں میں پہلا انعام یعنی "غالب انعام" ڈاکٹر محمد حسن (دہلی) کو ان کی کتاب [illegible] ۱۵ روپے کا "دوسرا انعام" "اکبر الہ آبادی انعام" شری [illegible] اکبرآبادی کو [illegible] ۱۲ روپے کا اور تیسرا انعام "رام پرشاد بسمل انعام" شری [illegible] کو ان کی [illegible] ۱۰۰ روپے کا ملا ہے۔ ان انعامات کے علاوہ اردو میں پانچ پانچ سو روپے کے پانچ انعامات اور بھی دیے گئے ہیں جو ڈاکٹر اکبر حیدری (سری نگر کشمیر) کو ان کی کتاب [illegible] شری شاہد احمد فاروقی (دہلی) کو [illegible] شری پریم پال اشک (نئی دہلی) کو [illegible] "ایک مطالعہ" پر شری سید [illegible] احمد (جونپور) کو ان کی کتاب [illegible] اور شری دلاور فگار (بدایوں) کو "شامت اعمال" پر ملے ہیں۔ ہم ان ادیبوں اور شاعروں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ آئندہ بھی ان کی اعلیٰ تصنیفوں سے ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافے ہوتے رہیں گے اور نئے لکھنے والے بھی ادبی، سائنسی، سیاسی، معاشی، تعلیمی، فلسفیانہ وغیرہ موضوعات پر اپنی تخلیقات سے تصنیفی سرمایہ کو مالا مال بنانے کی سعی کریں گے۔

ادھر کچھ عرصے سے چین کی معاندانہ سرگرمیاں پھر بڑھ گئی ہیں۔ دراصل کمیونسٹ چین کی توسیع پسندانہ پالیسی کا اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا جب یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو یہ اعلان کیا گیا کہ چین کی "نجات دہندہ عوامی فوج" کا اولین مقصد تبت کو نجات دلانا ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو چینی فوجوں نے زبردستی تبت پر قبضہ بھی کر لیا۔ چین کی اس حرکت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو دھکا لگا۔ پھر بھی ہندوستان جو اس جارحیت سے براہ راست متاثر ہوا تھا، تبت میں اپنے تجارتی اور تیرتھ یاتراؤں کے روایتی حق کے بارے میں چین سے گفت و شنید پر آمادہ ہو گیا اور اپریل ۱۹۵۴ء میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تمہیدی حصے میں پنچ شیل کا پہلا اصول "ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت اور اقتدار اعلیٰ کے احترام" کی بات کہی گئی تھی لیکن ابھی اس معاہدے کی روشنائی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ چین کی جانب سے ہندوستانی علاقوں کو نقشوں کے ذریعے چینی علاقے دکھانے کی ایک سرگرم مہم شروع کر دی گئی جو یقیناً ہندوستان کے خلاف جارحانہ اقدام کا درجہ رکھتی تھی۔ پنڈت نہرو جب ۱۹۵۴ء میں پیکنگ گئے اس وقت بھی اور ۱۹۵۶ء میں چینی وزیر اعظم کے دورۂ ہندوستان کے وقت بھی انھوں نے چینی لیڈروں کی توجہ ان نقشوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت کی طرف مبذول کرائی لیکن ہندوستان کے وسیع علاقوں کو چینی علاقے دکھایا گیا تھا یہی نہیں بلکہ ۱۹۵۸ء میں ایک بار پھر چینی ذمہ داروں کو اس نقشے کی جانب متوجہ کیا گیا جو چین کے ایک سرکاری جریدے میں شائع ہوا تھا اور جس میں نیفا کے پانچ ڈویژنوں میں سے چار ڈویژنوں کو اور یو۔ پی کے بعض علاقوں اور لداخ کے وسیع علاقوں کو چینی علاقہ دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۵۹ء کو مسٹر چو این لائی نے پنڈت نہرو کو جو خط لکھا اس میں یہ اقرار کیا کہ "یہ صحیح ہے کہ ۱۹۵۴ء میں سرحدی مسئلہ نہیں اٹھایا گیا۔ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ اس وقت اس سوال کو حل کرنے کے لیے حالات سازگار نہیں تھے"۔ ان واقعات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابتدا ہی سے چین کی نیت بخیر نہ تھی اور وہ ہندوستان سے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ چین کی جارحانہ سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں اس نے ہندوستان پر باقاعدہ اور بغیر کسی قسم کی اشتعال کے اچانک بھاری حملہ کر دیا۔ اس حملے کے خلاف جس طرح سارا ہندوستان متحد ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، عوام میں ایثار و قربانی کی جو برقی لہر دوڑ گئی اور ہمارے جوانوں نے انتہائی دشوار اور کٹھن حالات میں جس طرح شجاعت دی اور مادر وطن کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں قربان کیں اس کی مثال اگر ملتی ہے تو اسی چین کی شہ پر پاکستان کے ہندوستان پر حالیہ حملے اور مسلح تصادم کے دوران ملتی ہے۔ بہرحال چین نے [illegible] بردلانہ اور پرفریب طریقے پر ہندوستان پر حملہ کیا تھا اسی طرح اس نے شاید دنیا کو اپنے مصالحت پسندانہ رویے کے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے ۲۱ نومبر کو یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا اور ۲۲ نومبر سے جنگ بندی بھی کر دی اور اپنی فوجیں کچھ پیچھے ہٹا بھی لیں۔ اس سے پہلے ۲۴ اکتوبر کو بھی چینیوں نے سمجھوتے کے نام سے ایک تین نکاتی تجویز پیش کی تھی لیکن سبھی نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا کہ یہ ان کی چالیں دکھاتیں ہیں اور ان پر ہرگز بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور اس خیال کو تقویت چین کی ان سرگرمیوں سے پہنچتی رہی ہے جو وہ ایشیا میں امن کو درہم برہم کرنے کے لیے برابر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ۱۹۶۲ء کے بعد سے ہندوستان کی سرحدوں پر اس کی فوجی نقل و حرکت اور جارحانہ سرگرمیاں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حالیہ مسلح تصادم سے ٹھیک پہلے اس تصادم کے دوران اور اس کے بعد اس کے اقدامات، دھمکیاں اور الٹی میٹم، ویٹ نامی جنگ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھینچنے اور خود اپنی فوجوں کو الگ رکھنے کی کوشش، ہندوستان کے خلاف پوری قوت سے پاکستان کی مدد کرنے کا اعلان، حال ہی میں پاکستان میں چین کے بڑے بڑے فوجی افسروں اور حکومت کے دوسرے ذمہ داروں کی آمد، چینی ٹینکوں اور دوسرے فوجی اسلحہ کی پریڈ اور پاکستان سے تازہ ترین معاہدہ یہ سب چین کے ایک زبردست طمانچہ تھا جو ہمارے چہرے پر [illegible] کی یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ چین کی ہندوستان دشمنی میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ ہند۔ پاک علاقے میں امن برقرار رہے۔ لہٰذا اس نے پاکستان سے کہا کہ ایک غیر یقینی اور غیر مستحکم حالت باقی رہے اسی لیے اس نے ہماری سرحدوں پر جارحانہ طریق کار اختیار کر رکھا ہے اور فوجیں جمع کرنا شروع کی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جو چین کا مقابلہ کر سکتا ہے اور وہی اس کا زور توڑ سکتا ہے اس لیے کہ ہندوستان نہ صرف مستحکم ملک ہے بلکہ متحد بھی ہے۔ یہاں کے باشندے اپنے ملک، اپنی آزادی کا احترام کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی اقتصادی اور بیرونی پالیسیوں کو صحیح ثابت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ہمارا نصب العین امن، بقائے باہم، ناجانبداری اور [illegible] ہمارا یہی نصب العین اور طریق کار ہماری طاقت اور استحکام کا سبب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ہمیں بعض مسائل مثلاً غذائی بحران اور بعض دیگر مشکلات کا سامنا ہے لیکن ان کا حل اتحاد [illegible] ہم ان مسائل اور دشواریوں کا اس وقت ہمارے سامنے ہیں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے آنکھیں بند کر لینے یا اشتعال انگیزیوں کے ذریعے [illegible] ہمیں، ہمارے درپے آزار رہنے پر کسی کی جانب سے کچھ بہت [illegible] اگر ہم متحد ہو کر [illegible] کہ ہم ان مشکلات پر اور دشواریوں پر جلد قابو پا سکیں گے بلکہ بیرونی طاقتوں کا بھی مقابلہ کرنے کی [illegible] اپنے اندر پیدا کر سکیں گے۔

ادارہ

درسِ نظامی ـــ ۲

علی جواد زیدی

عہدِ عالمگیری کے خاتمے کے قریب درسِ نظامی کی تنظیم ہندوستان میں زبی تعلیم کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس دور تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان عربی تعلیم و تدریس کا سب سے بڑا اور متحرک مرکز بن گیا تھا۔ یہاں تقریباً ہر بڑے گاؤں، قصبے اور شہر میں مدرسے اور مکتب تعمیر ہو چکے تھے اور عالموں اور فاضلوں کی کثرت تھی۔ یہ شرف نہ تو اس دور کے ایران کو حاصل تھا نہ افغانستان کو۔ ترکی حجاز، عراق اور مصر بھی اس زمانے کے تعلیمی ہندوستان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ ان ممالک میں علم کے دروازے بند ہو گئے تھے، لیکن بہ حیثیت مجموعی یہاں علم کا دائرہ محدود اور اس کی نوعیت رسمی سی ہوتی جا رہی تھی۔ تجدید و اجتہاد کی ہوائیں ان اطراف سے کم کم اٹھ رہی تھیں۔ تعلیم کو عام بنانے کی بھی کوئی خاص کوشش وہاں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی دہائیوں کے بعد بھی وہاں تدوینِ نصاب کی ارادی کوششوں کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ فخر ہندوستان ہی کو نصیب ہے کہ عربی اور اسلامی تعلیم و تدریس کا پہلا منضبط اور ہمہ گیر نصاب درسِ نظامی کے نام سے یہیں مرتب ہوا۔

تعلیم کے بے حد عام ہو جانے کی وجہ سے ایک تو ایسے مدرّسین کی ضرورت پیش آگئی تھی جو درسی کتابوں اور مضامین کو پڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مطابع کے موجود نہ ہونے سے درسی کتابوں کی فراہمی کا بھی سوال تھا۔ اگر کتابیں معین کر دی جاتیں تو نقل کرنے والوں کو آسانی ہوتی۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ماہر علما کی تلاش میں طلبا کا گھروں سے باہر نکلنا، قدیم روایت ہونے کے باوجود مشکل ہو رہا تھا۔ کیوں کہ اب ماہرین شمال سے جنوب تک اور مغرب سے مشرق تک پھیلے ہوئے تھے۔ پھر ماہرین کی تعداد بھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ سب سے علم حاصل کرنے کا خواب دیکھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ان دشواریوں پر قابو پانے کے لیے درسِ نظامی کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ نصابی کتابوں کے مقرر ہو جانے کے بعد ماہرین نے ان کتابوں کی شرحیں لکھیں ... ع کیے۔ ماہروں تک نہ پہنچنے والے حواشی سے کام چلا لیتے تھے۔ ... کی حاشیہ نگاری کا کام بھی ملا نظام الدین نے شروع کیا۔ ہدایۃ ... اور مسلم الثبوت پر ان کی شرحیں موجود ہیں۔

سیاسی طور سے سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ ہر طرف نظم و ضبط کے مقابلے میں افراتفری زیادہ نمایاں تھی۔ انفرادی طور پر علما کو شاہی سرپرستی اب بھی حاصل تھی، لیکن سرکاری سرپرستی میں ہندوستان گیر پیمانے پر علمی یا فنی حرکت مفقود تھی۔ اس لیے تدوینِ درس کا کام غیر سرکاری حلقے ہی میں ہو سکتا تھا۔ غیر سرکاری طور پر ترتیب دیے گئے درس میں اس زمانے کی سماجی ضرورتوں کا خیال رکھنا ناگزیر تھا۔ ملا نظام الدین کی دوربین نگاہوں نے اس کو محسوس کر لیا تھا کہ دورِ زوال میں ان علما کی مانگ زیادہ ہوگی جو ہمہ جہاتی ہوں اور وقت پڑنے پر دفتر کے عامل، مدرسہ کے معلم، مسجد کے واعظ و امام اور شہر کے قاضی و مفتی بھی بن سکیں۔ درسِ نظامیہ کی اسی خصوصیت کی طرف سید مناظر احسن گیلانی نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حکومتِ سلطنہ سے قبل مسلمانانِ ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا (اور) عام طور پر درسِ نظامیہ کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے اس کے متعلق

لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ در حقیقت اس نظام میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی نظم و نثر وغیرہ میسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب، خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔[1]

ابوالحسنات ندوی نے ملا نظام الدین کے طریقۂ درس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ کتابی خصوصیات کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے، بلکہ کتاب کو محض ذریعۂ تعلیم قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے۔"[2] یہی وجہ ہے کہ وہ انتخاب کتاب کے وقت علی العموم اختصار کو مد نظر رکھتے تھے اور بعض اوقات فن کی مشکل ترین کتاب ہی کو چنتے تھے۔ طلبا متن کتاب سے زیادہ اساتذہ کے لکچروں کے ذریعہ علم و فن کی پیچیدگیوں اور مشکلوں سے واقفیت حاصل کرتے۔ کتاب کے مشکل ہونے کی وجہ سے اساتذہ بھی پوری توجہ اور شرح و بسط سے عبارت کا مفہوم سمجھاتے۔ ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ مشکل ترین کتابوں کو اس بسط و شرح سے پڑھ لینے کے بعد طالب علم اس مخصوص فن کے تمام لازمی نکات پر حاوی ہو جاتا تھا اور بڑی حد تک دوسری درسی کتابوں سے مستغنی۔ اگر وہ کسی ایک فن میں حصول کمال کا جویا ہوتا تو دوسری کتابیں خود سے پڑھتا اور علم میں وسعت پیدا کر کے اجتہاد و تحقیق کرتا۔ نہیں تو اس دور کی عام علمی ضروریات کو درس نظامی کافی تھا اور اس کی تکمیل کے بعد انسان زندگی کے جس شعبہ میں جاتا اطمینان و یقین سے اپنے علم کا استعمال صحیح کرتا۔ اس نظام میں بہت کھلی ہوئی درجہ بندی تو نہیں تھی لیکن ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی جھلک موجود تھی اور تعلیم یافتہ طبقوں میں سبھی مدارج کے تعلیم پانے والے موجود تھے۔ مبتدیوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تب بھی عالم، فاضل اور منشی کے القاب سے ان مدارج کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اگر ان غوامض پر نظر رکھی جائے تو یہ بات اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ درس نظامی کے بانی کا سماجی شعور کافی بیدار تھا۔ انھوں نے سماجیات کے عالم کی طرح پہلے تو اس دور کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لیا، تعلیم کے بعد طلبا کو جن شعبوں میں کام کرنا تھا اسے پیش نظر رکھا اور پھر وہ اس بات کو بھی نہیں بھولے کہ ہر طالب علم کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں ہے، بالخصوص اعلیٰ مذہبی تعلیم۔ پھر انھوں نے ایسا نظام بنایا جس میں مذہب کی ابتدائی معلومات اور نوشت و خواند سے لے کر فارسی کی بھرپور اور عربی کی معمولی تعلیم پانے والے ایسے طلبا کے لیے بھی گنجائش نکل آئی اور ایسے طلبا کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں جو اسلامیات میں کمال پیدا کرنا چاہتے تھے۔ تذکروں میں درس نظامی کے ماتحت تعلیم پانے والے ایسے طلبا کا ذکر آتا ہے جو ریاضی داں، جغرافیہ داں، مورخ، ادیب و شاعر، منشی، فلسفی، منطقی، کیمیاگر، موسیقار اور طبیب کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دربار شاہی میں بھی رسوخ پاتے ہیں اور بوریائے فقر کی زینت بھی بڑھاتے ہیں۔ ایسے ہمہ گیر درس اور اس کے بانی کے بارے میں ہمیں یقیناً بہت زیادہ تفصیل سے جاننے کی ضرورت ہے۔

درس نظامی (نظامیہ) خاندان فرنگی محل (لکھنؤ) کے روشن ترین علمی چراغ ملا نظام الدین[3] نے ترتیب دیا تھا اور یہ انھیں کے نام سے منسوب بھی ہوا۔ اسی درس کے باعث انھیں استاذ الہند کہا گیا اور وہ ہندوستان سے لے کر

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، سید مناظر احسن گیلانی ۲۲ ص ۶ [2] ہندوستان میں قدیم اسلامی درس گاہیں ص ۹۸

[3] ملا نظام الدین ۱۰۸۹ھ یا ۱۰۹۰ھ میں سہالی شتر، رہ سکی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ تقریباً چودہ برس کے تھے کہ باپ ملا قطب الدین شہید کر دیے گئے۔ یہ انصاری شیوخ میں تھے۔ غلام علی آزاد نے ملا قطب الدین کو امام الاساتذہ، مقدام الجہابذہ، معدن عقلیات اور مخزن نقلیات جیسے خطابات سے یاد کیا ہے (سبحۃ المرجان ص ۷۶) انھیں کے لفظوں میں ملا نظام الدین عالم خبیر اور فاضل نحریر تھے۔ ہندوستان کے پوربی قصبوں کا ابتدا ہی میں سفر کیا اور علمائے زماں سے فنون درسیہ حاصل کیے۔ شیخ غلام نقشبندی سے فاتحہ فراغ پڑھی، پھر لکھنؤ میں قیام کر کے وہیں ساری عمر درس و تدریس میں گزاری۔ ۱۱۳۶ھ میں شیخ عبدالرزاق ہانسوی نے خرقۂ خلافت عطا کیا اور سید اسمٰعیل بلگرامی سے بھی فیوض کثیرہ حاصل کیے۔ ۹ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ میں اکہتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علام علی آزاد نے تعمیہ میں تاریخ نکالی ہے

عالم کامل امام عصر استاد جہاں ۔ طائر روحش بسیر جنت الماویٰ شتافت ؛ سال تاریخ وفات او بطر تعمیہ ؛ گفتہ شد ملا نظام الدین از دنیا برفت ۱۱۶۱ھ

ان کی تالیفات میں صدر الدین شیرازی کی ہدایۃ الحکمۃ کی شرح اور ملا محب اللہ بہاری کی مسلم الثبوت کی شرح (جو اصول فقہ کی کتاب ہے) ہیں (سبحۃ المرجان ص ۹۲-۹۵ و ماثر الکرام دفتر اول ص ۲۲)

افغانستان و ایران تک کے علمی ماحول پر چھا گئے[1] غلام علی آزاد کی ہمعصر شہادت ہے کہ:

"تمام عمر به تدریس و تصنیف اشتغال ورزید و اعتبار و اشتہار عظیم یافت۔ امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ به مولوی دارند و کلاہ گوشہ تفاخر می شکنند و کسے که سلسلۂ تلمذ بادمی رساند بین الفضلا علم امتیاری افرازد و مردم بسیار را دیده شد که تحصیل جاہائے دیگر کردند و برائے اعتبار فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند۔"[2]

کم و بیش انھیں خیالات کا اظہار علامہ شبلی نے درس نظامی کے بارے میں بھی کیا ہے:

"ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں سب اسی درس نظامی کی شاخیں ہیں۔ کوئی عالم عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ ثابت نہ ہو کہ اس نے اس طریقۂ درس کے مطابق تعلیم حاصل کی ہے۔ جس طرح کھوٹا سکہ ٹکسال باہر کہلاتا ہے اسی طرح کسی کتاب کا درس نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ نصاب تعلیم میں داخل ہونے کی قابلیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔"[3]

ایسے زبردست عالم اور ایسے اہم درس کے بانی کا حال یہ تھا کہ پچاس برس تک ایک بوسیدہ سی چٹائی پر بیٹھ کر درس دیا کیے اور کتنے ہی عالموں اور فاضلوں کو جدید طریق تعلیم سے آشنا کرا کے اپنے طریق درس اور نظام تعلیم کا ڈنکا ہندوستان ہی کے کونے کونے میں نہیں بجا یا بلکہ بقول علی میاں افغانستان اور ایران تک اس کی شہرت پہنچا دی۔ جن علما نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ان کا تو ذکر چھوڑیے دوسرے جید علما بھی ان کی زیارت کے لیے ان کے آستانے پر آیا کرتے تھے۔ چنانچہ غلام علی آزاد ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ کو اسی غرض سے لکھنؤ میں وارد ہوئے اور ملا نظام الدین سے ملاقات کی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "میں نے انھیں طریقۂ سلف صالحین پر کاربند پایا۔ ان کی پیشانی سے نور تقدیس چمکتا تھا"۔[4]

ملا صاحب عربی میں تصانیف کثیرہ کے مالک ہیں۔ ان کی تصانیف زیادہ تر درسی نوعیت کی ہیں یعنی درسی کتابوں کی شرحیں ہیں، لیکن ان شرحوں میں وہ معانی و غوامض یکجا کر دیے گئے ہیں کہ ان کی حیثیت تصانیف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ پھر بھی ان کی شہرت عام اور بقائے دوام کا اصلی راز ان کے نصاب تعلیم کی جامعیت اور مقبولیت میں ہی پوشیدہ ہے۔

درس نظامی کے اولین شاگردوں میں کمال الدین فتح پوری، شاہ حقانی ٹانڈوی، محمد اللہ سندھی، عبدالرشید جونپوری، شاہ شاکر اللہ سندیلوی، سید ظریف عظیم آبادی، غلام محمد برہان پوری، مولوی احمد لکھنوی، غلام فرید موہ آبادی، مولوی محمد وجیہہ دہلوی، محمد مغربی تلمسانی، غلام عمر شمس آبادی، سید کمال الدین، عبید اللہ امیٹھوی اور قاضی قل احمد سترکھی نے بڑا نام پیدا کیا اور پھر ان کے تلامذہ در تلامذہ کے گروہوں نے ملا نظام الدین کے نصاب اور تعلیم کو جاری و ساری کیا۔

ملا نظام الدین کے بعد ان کے خاندان والوں نے علم کا علم بلند رکھا اور تقریباً دو سو برس تک اس خاندان کی علمی خدمات کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ خاندان فرنگی محل کے ارباب علم میں مولانا عبدالحق، ملا رضا، ملا احمد حسین، مولینا بحر العلوم، ملا حسن، ملا مبین، ملا ولی اللہ، ملا ولی، مولانا عبدالحی، مولانا عبدالباری اور متاخرین میں مولانا عنایت اللہ نے ایک علم و مدرس کی حیثیت سے بھی بڑی شہرت پائی اور یہ سب کے سب اسی خ[illegible] درس نظامی کے خوشہ چین تھے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے:

"[illegible] جس قدر اور جہاں جہاں بڑے بڑے سلسلۂ درس قائم ہوئے الترامی، [illegible] کا فیض ہے۔ مثلاً پورب میں محب اللہ بہاری اور غلام یحییٰ بہاری سے علم پھیلا۔ دونوں اسی خاندان کے شاگرد ہیں۔ رام پور ایک زمانے تک درس گاہ علم تھا۔ یہ مولانا بحر العلوم اور ملا حسن کا فیض تھا، کیوں کہ یہ دونوں بزرگ یہاں رہے تھے اور ملا حسن نے رام پور ہی میں وفات پائی۔ نجیب الدولہ نے دارا نگر میں جو امروہہ کے قریب ہے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں نہایت کثرت سے طلبا نے تعلیم پائی۔ اس مدرسہ کے اکثر مدرسین اسی خاندان کے شاگرد تھے۔ بنگال اور مدراس میں جو کچھ علم پھیلا، وہ مولانا بحر العلوم کا فیض ہے کہ ان مقامات میں آپ نے قیام فرمایا۔"[5]

اس نظام درس کی ایک خصوصیت کے بارے میں کافی اور مخالف و موافق دونوں پہلوؤں سے لکھا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ درس نظامی میں حدیث و فقہ کے پہلو بہ

---

[1] MUSLIMS IN INDIA از ابوالحسن علی ندوی ص ۸۴ [2] ماثر الکرام، دفتر اول ص ۲۲ [3] مضامین شبلی ج ۳ ص ۱۲۲ [4] سبحتہ المرجان از غلام علی آزاد ص ۹۵ [5] مضامین شبلی ج ۳ ص ۱۲۲

منطق و فلسفہ و کلام پر بھی زور دیا گیا، بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ منطق و فلسفہ و کلام پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ اس بات کو کچھ لوگ تو اعتراضاً بیان کرتے ہیں کہ اس نظام میں علوم اسلامی پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ اور کچھ لوگ (مثلاً مولانا مناظر احسن گیلانی) اس بات کو اس درس کے ایک ہمہ گیر تعلیمی نصاب ہونے کے ثبوت میں پیش کرتے اور یہ دکھاتے ہیں کہ پرانے نصاب کا مقصد صرف زاہد خشک پیدا کرنا نہیں تھا۔ بلکہ انھیں تو یہاں تک اصرار ہے کہ "ابتدا سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علما صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حال ہے) حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فقہ کے سلسلے میں گو بظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا ہے، یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ، لیکن ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو شرح وقایہ میں پڑھائے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ میرے بیان پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے ڈھائی پارے تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے کافی سمجھا جا سکتا تھا"[1]

ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ مولانا مناظر احسن کے اس بیان کا عام رنگ مناظرانہ ہے۔ انھوں نے اصول فقہ تک کو دینیات سے خارج کر دیا اور علم کلام کو منطق و حکمت کے خانے میں ڈال دیا۔ یہ مانا کہ اصول شاشی، حسامی، نور الانوار، توضیح مع تلویح اور مسلم پر منطقی اور فلسفیانہ مباحث کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے، مگر اس سے کیوں کر انکار کیا جائے گا کہ یہ اصول فقہ کی کتابیں ہیں؟ شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، شرح تجرید قوشجی اور حواشی قدیمہ و جدیدہ کو خالص اسلامی فن کلام سے باہر کیسے سمجھا جائے گا؟ بہر حال مولانا گیلانی ایک نقطۂ نظر کی وضاحت کر رہے تھے اور انھوں نے یہ بات محض دلیل کے طور پر کہی ہے، درس نظامی پر کوئی تحقیقی نظر نہیں ڈالی ہے۔ ان کے مذکورہ بالا بیان کو اسی پس منظر میں دیکھنا بھی چاہیے۔

دوسرا گروہ معقولات کی زیادتی سے اس لیے نالاں ہے کہ اس سے منقولات کی جانب سے توجہ ہٹ گئی۔ اولاً تاریخی اعتبار سے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ منقولات کو علما نے کسی زمانے میں بھی بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ دوسرے یہ ایک حقیقت تھی کہ فلسفۂ یونان اور فلسفۂ ہند سے سابقہ پڑنے کے بعد مسلم علما نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اگر اسلامی تعلیمات کو فلسفہ و حکمت کی ترازو پر تولنے سے انکار کیا گیا تو صرف منقولات سے ذہنوں کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ فلسفہ و حکمت ہندوستانی دانشوروں میں عام تھے اور ان کے اثرات اعلیٰ طبقوں سے لے کر متوسط طبقوں تک جاری و ساری تھے۔ ان سے اغماض ممکن نہیں تھا۔ علما کے ایک بہت بڑے طبقے نے یہ محسوس کیا کہ عقل کی کاٹ عقل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے خالص دینی علوم و فنون کو بھی عقل کی ترازو پر تولنا شروع کیا۔ خود مختلف اسلامی فرقے اور گروہ اپنے اپنے نظریوں کو صحیح باور کرانے کے لیے عقلی دلایل پیش کرتے تھے۔ ہر فرقہ کا کلامیہ ادب بڑھتا جا رہا تھا۔ ملا نظام الدین نے اس صورت حال کو پیش نظر رکھ کر اپنے نصاب میں منطقی اور فلسفیانہ عناصر شامل کیے۔ اس سے ذہنوں میں جلا ہوئی اور تنقید و تفتیش کا حوصلہ آیا، تنگ نظری اور سخت گیری بھی کم ہوئی۔ متبعین و متوسلین نے علی العموم اور علمائے فرنگی محل نے علی الخصوص عصبیت اور مناظرہ بازی سے پرہیز کیا۔ وہ فرقہ وارانہ شورشوں سے الگ رہتے ہوئے اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم رہے۔

اسی عام وسیع النظری کی بدولت درس نظامی میں منقولات کے دوش بدوش معقولات پر بھی معقول توجہ دی گئی۔ اس میں دوسرے علوم کے مقابلے میں منطق و کلام و فلسفہ کی کتابیں زیادہ ہیں۔ حدیث کا حصہ نسبتاً کم ہے اور ادب کا حصہ بہت ہی کم۔ یقیناً ملا نظام الدین کا نظریہ یہ رہا ہوگا کہ ادب اور حدیث جیسے علوم فاتحۃ الفراغ کے بعد اپنے طور پر تفصیلاً حاصل کیے جائیں اور انھیں کسی محدود نصاب میں جکڑا نہ جائے۔ ہاں اتنا ضرور پڑھا دیا جائے کہ فن کے عام اصول نگاہوں کے سامنے آ جائیں۔

اس درس سے نسبت رکھنے والوں کو معقولات سے جو شغف تھا اس کو شہرت عام حاصل ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں مولوی عنایت اللہ فرنگی محلی نے اپنے بزرگوں کی زبانی ایک روایت یوں بیان کی ہے:

"ملا حسن جب لکھنؤ سے ترک وطن فرما کے رام پور و دہلی گئے اور کچھ مدت

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ج ۲ ص ٦

وہیں قیام فرمایا تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگردوں کو خبر ہوئی۔ وہ بھی ملا حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی بحث علمی پر بحث کرنے لگے۔ ملا حسن نے جوابات معقول سے ان کی تشفی کر دی۔ وہ حضرت شاہ صاحب کے پاس واپس گئے اور ملا حسن کی تعریف کرنے لگے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان معقولین کو حدیث و قرآن سے بالکل بے خبری ہوتی ہے۔ یہ بیچارے عمر بھر قال الشیخ اور قال الرازی میں پڑے رہتے ہیں۔ ملا حسن اس عرصے میں رام پور واپس ہو چکے تھے۔ کسی نے بحر العلوم تک یہ واقعہ پہنچا دیا۔ بحر العلوم نے جواب میں ارکان اربعہ[1] لکھ کر شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجی۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں جو خط بھیجا اس میں نہایت توصیف و مدح مولانا کی لکھی اور خط کے عنوان میں مولانا کو "بحر العلوم" کے لقب سے ملقب فرمایا۔[2]

اس اقتباس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ درس نظامی میں معقولات پر زیادہ زور دیا جاتا تھا وہاں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے فارغ التحصیل طلبا فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم پر بھی عبور حاصل کر لیتے تھے۔ انھیں ان مضمونوں پر جو دو چار کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ ان کے لیے مشعل ہدایت کا کام کرتی تھیں اور وہ انھیں کی روشنی میں آئندہ بھی تحقیق و مطالعہ کا کام جاری رکھتے تھے۔ درس نظامی ایک بنیادی درس تھا جس میں ضروری سمجھے جانے والے تمام علوم کی ضروری باتیں پڑھا دی جاتی تھیں اور معقولات کے ذریعے علم و فکر کی راہیں کھول کر اور طالب علم کے دل میں تحقیق و جستجو کا جذبہ بیدار کر کے اسے اس کے ذوق پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اب یہ طالب علم کے ذوق پر منحصر تھا کہ فقیہ بنے یا مفسر، محدث بنے یا ادیب۔

درحقیقت کسی زمانے میں زیر درس کتابوں کی فہرست سے کسی علم کے رواج عام یا عدم رواج کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔ یہ طریقہ ہی سراسر غلط ہے۔ صرف ایک مصنف ملا محب اللہ بہاری صاحب مسلم الثبوت کو لے لیجیے۔ ان کی کتاب اصول فقہ میں ہے۔ اس کتاب کے آخر میں انھوں نے ایسی کتابوں کی فہرست دی ہے جس سے انھوں نے مسلم الثبوت کی ترتیب میں مدد لی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیف کتاب کے وقت ان کے پیش نظر، فقہ حنفی میں البزدوی، اصول سرخسی، کشف بزدوی، کشف المنار، البدیع، اور اس کی شرحیں التوضیح، التلویح، ابن ہمام کی تحریر، التقریر، التیسیر اور اس کی شرحیں اور شافعیوں کی کتابوں میں امام شافعی کی المحصول، آمدی کی الاحکام، قاضی کی شرح المختصر اور اس کے تعلیقات مع حواشی، سید شریف، الابہری، تفتازانی کی شرح الشرح حاشیہ فاضل میرزا جان الردود، العقود، بیضاوی کی المنہاج مع شرح اسنوی اور مالکیوں کی کتابوں میں ابن حاجب کی المختصر اور المنتہی ان کے پیش نظر تھیں۔ اگر یہ کتابیں موجود تھیں تو ارباب ذوق و تحقیق اور علما و فضلا ان سے استفادہ بھی ضرور ہی کرتے ہوں گے۔

اگر خانوادہ فرنگی محل درس نظامی کے لیے اپنا مخصوص مقام رکھتا ہے تو متاخرین میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے گھرانے کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ انھوں نے درس و افادہ کے ذریعے علم کو عام کرنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں دھارے ساتھ ساتھ تقریباً متوازی طور پر چل رہے تھے۔ شیخ عبدالحق کے دور کے نصاب کا کوئی خاکہ تو موجود نہیں ہے، لیکن شاہ ولی اللہ کے دور کا خاکہ موجود تھا۔ شاہ ولی اللہ سن میں ملا نظام الدین سے ۲۴ برس چھوٹے تھے اور انھوں نے ملا صاحب کے پندرہ برس بعد وفات پائی۔[3]

شاہ صاحب کا مرتبہ ہندوستان کے اسلامی مفکرین میں بہت بلند ہے۔ ان کا حلقۂ درس بھی بہت وسیع تھا۔ اجڑتی ہوئی دلی میں انھوں نے علم و فکر کے چراغ کو روشن رکھا اور دوسرے امور معاشی و فکری کی طرح، درس کی تہذیب کی طرف بھی دھیان دیا۔ انھوں نے اپنے وصیت نامہ اور الجزء اللطیف میں اپنے تعلیمی اور نصابی تصورات قلمبند کیے ہیں۔ ممدوح کے وصیت نامۂ فارسی کی اصل عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے:-

"تجربے سے علم پڑھانے کا جو طریقہ محقق ہوا وہ یہ ہے کہ پہلے صرف و نحو کے مختصر رسالے درساً پڑھائے جائیں۔ (طالب علم کی ذہنی صلاحیت کے مطابق ہر ایک کے تین تین یا چار چار نسخے کافی ہوں گے) اس کے بعد عربی زبان میں تاریخ یا حکمت کی کوئی کتاب پڑھائیں اور اسی دوران میں کتب لغت کا تتبع اور

---

[1] یہ کتاب فقہ میں ہے۔ [2] تذکرۂ علمائے فرنگی محل ص ۱۴۰۔ ۱۴۱

[3] "او بود امام اعظم دیں" سے مادۂ تاریخ (۱۱۷۵ھ) نکلتا ہے۔

مشکلات کے رفع کرنے کے طریقے بتاتے جائیں۔ جب زبان عربی پر قدرت حاصل ہوجائے تو یحیٰ بن یحیٰ مصمودی کی روایت سے موطاء کو پڑھائیں۔"[1]

شاہ ولی اللہ نے الجزء اللطیف میں اپنے درسیات کی حسب ذیل تفصیلات درج کی ہیں:

(۱) نحو میں کافیہ اور شرح جامی
(۲) منطق میں شرح شمسیہ شرح مطالع
(۳) کلام میں شرح عقاید نسفی مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف
(۴) فقہ میں شرح وقایہ وھدایہ کامل
(۵) فلسفہ میں شرح ھدایۃ الحکمۃ
(۶) اصول فقہ میں حسامی اور کسی قدر تلویح
(۷) بلاغت میں مختصر اور مطول
(۸) ہیئت اور حساب میں چند مختصر رسالے
(۹) طب میں بوعلی سینا کے قانون کا خلاصہ
(۱۰) حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح (مکمل)، شمایل ترمذی (مکمل) اور کسی قدر صحیح البخاری۔
(۱۱) تفسیر میں مدارک اور بیضاوی
(۱۲) تصوف وسلوک میں عوارف، رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔

یہاں درس ولی اللہی پر کوئی تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ یہ تفصیلات یہاں صرف اس غرض سے درج کردی گئی ہیں کہ ناظرین کو درس نظامی اور درس ولی اللہی کے بنیادی اتحاد فکر سے کماحقہ آگاہی ہوجائے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو قبل کے درسیات میں اور درس ولی اللہی میں کوئی نمایاں فرق کیفیت کا نہیں ہے۔ کمیت کے اعتبار سے فقہ وحدیث میں نصاب قدرے زیادہ ہے اور علوم عقلی میں کم ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی نصاب وہی ہے جو درس نظامی میں ہے۔ فلسفہ، منطق، کلام اور اصول فقہ کے علاوہ ہیئت، حساب، طب وغیرہ خالص عقلی علوم ہیں اور ان میں بھی ایک ایک موضوع پر کئی کئی کتابیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ معقولات اور منقولات کے مابین ایک توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے جہاں اپنے وصیت نامے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ "امام مالک کی موطا کی تعلیم کو ہرگز معطل نہ کریں، کیوں کہ اصل علم حدیث ہے اور اس کے پڑھنے سے بہت سے فیض ہیں" وہاں انھوں نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ حدیث وتفسیر کا علم حاصل کرلینے کے بعد ایک وقت حدیث کی کتابیں مثلاً صحیحین وغیرہ اور فقہ و سلوک وعقائد کی کتابیں پڑھیں اور دوسرے وقت دانشمندی کی کتابیں مثلاً شرح ملا جامی وقطبی وغیرہ۔ گویا معقولات کی حیثیت ثانوی تھی۔

اب جب تک یہ ثابت نہ کیا جاسکے کہ درس نظامی میں منقولات کو ثانوی حیثیت دے دی گئی تھی، اس وقت تک یہ ثابت کرنا کہ ملا نظام الدین نے اپنے درس میں ان علوم پر پوری توجہ نہیں دی، مناسب نہیں ہوگا۔ حدیث ہی کو لے لیجئے۔ وہاں صحاح ستہ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن حدیث کا علم ایک بے پایاں سمندر ہے اسے دو ایک کتابوں میں سمیٹا نہیں جاسکتا۔ مشکوٰۃ اور ترمذی اور کسی قدر بخاری۔ یہی ڈھائی کتابیں درس ولی اللہی میں بھی ہیں۔ علم حدیث میں مشکوٰۃ تو درس نظامی میں بھی شامل ہے۔ مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی نے اپنے رسالہ قطبیہ میں بخاری کے داخل درس نظامی ہونے کا باقاعدہ ذکر کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ھدایۃ النحو کے خاتمے کے بعد تعلیم دو سبقہ ہونا چاہیے۔ یعنی ایک کتاب معقول کی پڑھائی جائے اور ایک منقول کی۔

اگر ہم ذرا اور بعد تک تحقیقات کے دائرے کو بڑھا دیں تو صورت حال عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے۔ سر سید احمد خاں نے اپنے دور کے درس نظامی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں مشکوٰۃ المصابیح اور امام مالک کی موطا ہی نہیں تمام صحاح ستہ کو شامل کیا ہے۔ اسی طرح تفسیر اور اصول حدیث میں کشاف، مدارک، بیضاوی اور جلالین اور تحبیۃ الفکر کا ذکر کیا ہے۔[2]

اگر ہم اس پردے پر پوری تصویر کو دیکھیں گے تو یہ واضح ہوجائے گا کہ درس نظامی درسیات عربی واسلامی کا متفق علیہ ڈھانچہ تھا۔ درس ولی اللہی یا کوئی اور درس اس سے مختلف نہیں تھا، صرف مخصوص درس گاہیں اہم مدرسین کے ذاتی میلانات کے پیش نظر جزوی ترمیمیں کرلیا کرتی تھیں۔

درس کی وسیع النظری۔

جس دور میں یہ درس مرتب ہو رہا تھا، اس کے کافی پہلے سے اسلامی معاشرے پر اور اس کی وجہ سے مروجہ عربی علوم پر تنزل وانحطاط کی لمبی پرچھائیاں پڑنے لگی تھیں۔ آخر اس دور کے ادیب اور علماء اسی گروہ علماء کے تو وارث تھے

---

[1] فارسی اصل حسب حوالہ ھندوستان میں قدیم اسلامی درس گاھیں ص ۱۰۲ [2] تھذیب الاخلاق ج ۲ ص ۴۰۸ ۔ ۴۰۹

جو بقول مولانا ابوالکلام آزاد ساتویں صدی ہجری سے تمام تخلیقی صلاحیتیں کھو بیٹھا تھا اور زیادہ تر قدما کی خوشہ چینیوں اور مینا کاریوں پر اتر آیا تھا۔ مسند علم و فضل پر بیٹھنے والے تشریح و تلخیص میں الجھ گئے تھے۔ حرکت جمود میں تبدیل ہو چکی تھی اور مزا یہ تھا کہ اس جمود پر بھی حرکت کا دھوکا ہوتا تھا۔ اس دور میں نئی بات کہنے والے شاذ تھے۔ علوم سے زیادہ کتابوں کی عبارتیں اہم ہو گئی تھیں اور فن حاصل کرنے کے بجائے لوگ صرف کتابیں گھول گھول کر پیے جا رہے تھے۔ قدیم اور مروج کتابوں سے وہ شغف تھا کہ لوگ علم و فن کا اور چھور ہی بھول گئے تھے۔ اس کا ایک اور برا نتیجہ یہ بھی ہوا تھا کہ جو علوم ضمنی تھے اور مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق وغیرہ انھیں پر زیادہ زور دیا جانے لگا تھا۔ فلسفہ اور علوم مفیدہ کی طرف سے عام بے اعتنائی برتی گئی تھی۔ جس طرح قدیم زمانے میں سنسکرت کی تعلیم ویاکرن (قواعد) اور روایات میں الجھ کر بے روح ہو گئی تھی، وہی کچھ حال عربی کا ہونے والا تھا۔ اس فضا میں درس نظامی پورا انقلاب تو برپا نہیں کر پایا، لیکن اس سے معقولات کا رواج ضرور بڑھ گیا۔ کتاب کے لیے حفظ ہی کافی نہ تھا، عقل کی بھی ضرورت تسلیم کی گئی۔ کچھ تازہ ہوا چلی، کچھ فضا بدلی، اور یہ بجائے خود کچھ کم اہم بات نہ تھی۔

جب علم شرحوں، تلخیصوں یا دوسروں کے جمع کیے ہوئے مواد کو نئے قالب میں ڈھالنے ہی تک محدود ہو جاتا ہے تو جزدی اختلافات و انحرافات بڑی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ شرحوں کے دست نگر تقلید سے زیادہ کا حوصلہ نہیں رکھتے اور اجتہاد کے کواڑ بند ہو جاتے ہیں۔ تقلید میں کورانہ پابندی کا عنصر غالب رہتا ہے اسی لیے عصبیت اور تنگ نظری بھی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اس وقت بھی دیکھنے میں آتی ہے جب ایک طرف نئی حرکت و حیات کے آثار نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قدامت اس جدت پسندی کے خلاف صف آرا ہوتی ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ دوسری صورت میں عصبیت مغلوب ہوتی ہے اور پہلی صورت میں غالب۔ علمی دنیا میں بھی اس کی کئی مثالیں ہیں۔ معتضد باللہ عباسی کے دور میں یہ سختی تھی کہ کوئی فلسفہ کی کتاب بیچ نہیں سکتا[1] مرا کو کے فرماں روا مامون نے حکیم بن حبیب کو قتل ہی کرا دیا تھا اور حکیم بن رشد قید کر دیے گئے تھے۔ محمود غزنوی نے جرم اعتزال میں قاضی عبد الجبار کے کتب خانے کو جلوا دیا تھا[2] اس نے معتزلیوں کی کتابوں کے علاوہ فلسفہ اور نجوم کی کتابیں بھی جلوا دی تھیں[3] مصر میں ابن العربی کو زندیق کہا گیا اور عام علمائے مصر جو ان کے بعض خیالات سے متفق نہ تھے، ان کے قتل ہی کے درپے ہو گئے[4] سلطان محمود گجراتی کے عہد میں جب شیخ محمد غوث گوالیاری (مصنف جواہر خمسہ) گجرات آئے تو اس دور کے عالم بزرگ شیخ علی متقی نے ان کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ سلطان محمود کو عمل میں تامل ہوا اور اس نے ملا وجیہ الدین کی رائے پر قتل کو موقوف کیا۔ وہ شیخ کا دیدار کرتے ہی ایسے شیفتہ ہوئے کہ فتویٰ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اس طرح شیخ غوث نے نجات پائی[5] جہانگیر کے زمانے میں قاضی نصیر الدین برہان پوری کا معاملہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ چونکہ وہ ہر قسم کی حدیث کو ترجیح دیتے تھے، قیاس کا انکار کرتے تھے علما امتی کالانبیاء بنی اسرائیل والی حدیث کو موضوع قرار دیتے تھے۔ اس لیے خود ان کے خسر شیخ علم اللہ نے داماد کے جلائے جانے کا محضر تیار کیا[6] اسی طرح عالمگیر کے زمانے میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کے رسالۂ تسویہ کے بارے میں شیخ محب اللہ کی وفات کے بعد علما نے بادشاہ سے یہ درخواست کی کہ اس کی تمام نقلیں جلوا دی جائیں اور جو لوگ اس کی صحت کے قائل ہوں ان پر حد شرعی جاری کی جائے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ممالک محروسہ کے تمام درویش حاضر کیے جائیں۔ رسالہ کی تلاش شروع ہوئی۔ آخر کار پہلا حکم تو منسوخ کر دیا گیا لیکن تسویہ کے جتنے نسخے مل چکے تھے وہ سب جلا ڈالے گئے[7] اس سلسلے میں شیخ کے خلفا میر سید محمد قنوجی اور شیخ محمدی سے بھی بازپرس کی گئی[8] اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ شیخ محب اللہ عالمگیر کے سیاسی رقیب و حریف دارا شکوہ کے مربی و مرشد تھے تو اس فرمان پر سیاسی اثرات کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔

معاملہ سارا یک طرفہ نہیں تھا۔ جہاں تنگ نظری کی یہ مثالیں مل جاتی ہیں وہاں وسیع النظری کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں قاضی رکن الدین سمرقندی نے یوگ کے موضوع پر امرت کنڈ نامی کتاب فارسی میں منتقل کی، ملا عبد القادر نے اپنے ابتدائی دور میں مہابھارت کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ سترھویں صدی کے آغاز میں میر عبد الواحد بلگرامی نے وشنو شاعری کے تمام اساطیری اشارات کی مسلم عقائد سے مطابقت کی۔ دارا شکوہ نے سرِّ اکبر تصنیف کی۔ لیکن یہ وہ رجحانات ہیں جن سے عام علما رکنارہ کش رہے ہیں۔ میں ان کی

---

[1] تاریخ الخلفاء [2] روضۃ الصفا ج ۴ ص ۶۰ [3] تاریخ الکامل: ابن اثیر ج ۹ ص ۱۲۸ [4] المنہاج ج ص ۲۸ [5] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۴۹ [6] تذکرۂ علماء ہند ص ۲۳۰ [7] رود کوثر ص ۲۰۰ [8] ماثر الامراء ج ۳ ص ۲۰۶–۲۰۷ بحوالۂ بزم تیموریہ ص ۲۹۲

بجائے وہ مثالیں دوں گا جہاں علمائے اسلام نے اعتقادی اختلافات کی تہ تک جانے کی ہمت کی ہے اور انحرافات کے اظہار و تعلیم کو جائز سمجھا ہے۔ مثلاً اگرچہ تفسیر الکشاف میں کچھ معتزلی رجحانات مثلاً عقیدۂ خلق قرآن وغیرہ موجود ہیں لیکن اس کی تعلیم عام مدرسوں میں جاری رہی۔ عہد عالمگیری میں بھی سید محمد ابوالمجد محبوب عالم نے دو تفسیریں لکھیں۔ ایک فارسی میں اہل بیت کی روایت کے مطابق اور دوسری عربی میں جلالین کی طرز پر۔ علم حدیث میں زینہ النکاۃ فی شرح المشکوٰۃ ان سے یادگار ہے اور اس میں ہر مذہب کے تمسک کا بیان ہے[1]

غرض، اس مذہبی احتساب کے باوجود جس کی سخت گیریوں کی چند مثالیں اوپر دی گئیں تعلیمات میں مخصوص عقائد سے انحراف بھی جاری رہا اور مختلف عقائد کی تعلیم بھی۔ خانقاہوں، مسجدوں اور علماء کے گھروں پر جو ذاتی اور غیر سرکاری ادارے قائم تھے ان تک سرکاری احتساب کے ہاتھ کہاں پہنچ سکتے تھے۔ وسیع اور عریض ہندوستان کے کونے کونے میں پہرے بٹھانا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ شروع ہی سے مسلمانوں کے اندر اتنے فروعی اختلافات موجود تھے کہ علی العموم ان سے درگزر کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ بعض اوقات درباری علماء کی حدود کے پیچھے دارالخلافہ کی سیاست کا بھی اثر ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اکثر دارالخلافہ میں افراط و تفریط کے حادثے زیادہ ہوئے۔ دور رہنے والے علماء اکثر متواتر ریشہ دوانیوں اور نظر بحالفتو سے بچ جاتے تھے۔ بحیثیت مجموعی احتساب کی سخت گیری اپنے محدود دائرہ عمل کی وجہ سے انحرافی کارروائیوں کا انسداد کر نہیں پائی اور علمائے ہند کے ایک بہت بڑے طبقے نے اظہار خیال کی آزادی اور وسیع النظری کو بہت کچھ بچائے رکھا۔

اس وسیع النظری کی بھی حدیں تھیں۔ شریعت اور طریقت نے جو دائرے بنائے تھے انھیں کے اندر ہر طرح کے انحرافات بھی ہوتے تھے۔ لیکن دور زوال میں بعض اوقات لوگ ایسے ضمنی انحرافات پر بھی چونک پڑتے تھے۔ ایسی فضا میں اگر علماء کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مذہبی تعلیم کے معاملے میں علی الخصوص اور تعلیم کے معاملے میں علی العموم "جیو اور جینے دو" کے اصول سے قریب تر تھا، تو وہ انھیں معقولی علماء کا تھا جن کا نصاب میں معقولات کے رواج نے وسیع النظری کے لیے نئی راہیں کھولیں اور درس نظامی معقولی اور منقولی نصابوں کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ بن گیا۔ اس درس سے وابستہ طلبا اور مدرسین میں علم کو علم کی حیثیت سے حاصل کرنے کا رواج زیادہ تھا۔ انھیں مختلف نقطہ ہائے نظر سے واقفیت حاصل ہو جاتی تھی۔ اور پھر ایک طرف شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا یہ نعرۂ حق سنائی دیتا ہے:

"یہ کیا شور ہے اور کیسا طوفان پھیلا ہوا ہے کہ کوئی مومن ہے، کوئی کافر ہے، کوئی اطاعت کرنے والا ہے اور کوئی گناہگار ہے، کوئی صحیح راستے پر ہے، کوئی غلط راہ چل رہا ہے، کوئی مسلم ہے، کوئی پارسا ہے، کوئی ملحد ہے، کوئی ترسا ہے، سب ایک ہی لڑی کے موتی ہیں۔"

اور دوسری طرف شاہ ولی اللہ دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں کو ٹوکتے نظر آتے ہیں:

"اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر رکھی ہے، حالانکہ تم اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دو گے۔"

اس معقولی نصاب نے بڑے بڑے منقولی کو بھی متاثر کیا تھا اور امتزاج صحیح نے ایک صحت مند نقطۂ نظر کو جنم دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ واقفیت اور عقل حقایق کے چہروں سے بہت سے حجابات اٹھا دیتی ہے۔ لوگ معتقدات کے معاملے میں صلح نہیں کرتے تھے لیکن ایک دوسرے کے نقطہ ہائے نظر سمجھ لینے سے، ذہن و فکر میں ایک نیا توازن ضرور آ جاتا ہے۔ درس نظامی نے ہر طبقہ اور بیشتر مکتبہ ہائے خیال کے لوگوں کے لیے ایک ہی فرش پر تعلیم کی سہولت فراہم کی اور اس کی ساخت ایسی رکھی کہ ہر شخص اپنی حاجت اور صلاحیت کے مطابق علم حاصل کر سکے۔

اس درس میں ایسے علوم پر جن میں بڑے اور شدید اختلافات کی گنجائش کم تھی، مثلاً علوم عقلیہ انھیں پر زیادہ زور دیا گیا۔ علوم نقلی پر زیادہ زور نہ دینے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس درس کے بانیوں کے نزدیک علوم نقلیہ کی اہمیت نہیں تھی۔ حقایق سے یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اس درس کے تمام اہم متوسلین فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ علوم میں خود مہارت تامہ رکھتے تھے اور ان موضوعات کی بیشتر اہم کتابوں کا الگ سے درس بھی دیا کرتے تھے۔ دراصل ان لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان علوم کے درسیات میں ذرا سا آگے چلنے کے بعد اختلافات کی منزل آ جاتی تھی۔ اس منزل پر درس نظامی طلبا کو یہ آزادی دینا چاہتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو تفصیلی تعلیم اپنی پسند کے اساتذہ سے لے سکیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ مختلف العقیدہ طلبا اس درس کے متوسلین کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ اس طرح مذہبی کورس ہونے کے باوجود ایک محدود معنی میں ہم درس نظامی کے اس کردار کو سیکولر بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہندوستانی مدارس علی العموم جامع العلوم تھے اور یہ روایت دور اکبری سے

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۵

زیادہ قوی ہوگئی تھی۔ درس نظامی بھی فلسفہ، منطق، ریاضی، ہیئت، نجوم، طب، موسیقی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ عربی یا اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی، سنسکرت اور مقامی بھاشاؤں کی خالص ادبی تعلیم پر بھی روک ٹوک نہیں تھی۔ وحدت الوجود کے قائل علماء نے بے شمار تصنیفیں لکھیں اور پھر فارسی تراجم کے ذریعے ہندو دھرم اور عقاید تک بہت سے علماء کی بھی رسائی ہوئی۔ اس طرح ہندوستانی علماء کے ایک وسیع طبقے اور ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت کا ذہن نئے رجحانات سے بدلنے کی بجائے ان کے اچھے نکات کو اخذ و جذب کرنے لگا۔

درس نظامی کی قوم پروری کے ایک پہلو پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اس کے پہلے کے نصابوں میں عربی اور عجمی علماء کی تصنیفیں تو آسانی سے شامل کرلی جاتی تھیں لیکن ہندوستانی علماء کی تصنیفیں شاذ و نادر ہی شامل کی جاتی تھیں کسی مدرس نے خود سے کوئی کتاب پڑھا دی ہو تو دوسری بات ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ملا نظام الدین نے پہلے پہل علمائے ہند کی کتابوں کو باضابطہ طور سے شامل درس کیا۔ یقیناً ملا صاحب کے دل میں دھڑکتا ہوا قوم پرور ہندوستانی دل قابل مبارکباد ہے۔ اگرچہ ملا نظام الدین کے خاندان والوں کی رسائی دربار عالمگیری تک تھی۔ (فرنگی محل عطیہ عالمگیری ہے) لیکن ملا نظام الدین کا مزاج امارت پرستی کے خمیر سے تیار نہیں ہوا تھا۔ وہ عالم باعمل اور ظاہرداری سے بیزار تھے۔ جب ان کی شہرت سن کر شاہ دہلی نے انھیں اپنے دربار میں بلانا چاہا تو انھوں نے یہ پیش کش مسترد کردی۔

تعلیمی مشاغل سے اسی غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی ہی میں ان کا مرتبہ نصاب صوبہ صوبہ اور شہر شہر پھیل گیا۔ آنے والی صدیوں میں بھی جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما کر بجھ گیا اور برطانوی حکومت نے علوم عربیہ سے بے اعتنائی برتی، اسی درس کے نام لیواؤں نے ان علوم کے چراغ کو گل نہ ہونے دیا۔

کسی نہ کسی صورت میں درس نظامی آج بھی رائج ہے۔ خود خانوادۂ فرنگی محل نے اس درس میں وقتاً فوقتاً اضافے اور ترمیمیں کی ہیں۔ ایسے حضرات میں ملا حسن، بحرالعلوم، عبدالاعلیٰ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ فرنگی محل کے باہر دوسرے شہروں اور صوبوں میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز کے پہلے اس نظام درس میں کسی اہم تبدیلی کا خیال ذہنوں میں نہیں آیا۔ جب تبدیلیاں عمل میں آئیں بھی تو درس نظامی سے وابستگی ایک حد تک باقی رہی۔ لیکن ان تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اُردُو کا گمنام شاعر ــــــ رُوحُ الامین اَدیب

(بسلسلہ صفحہ ۹)

بے وفا آج ہم نے، تو نہیں ۔۔۔ تم نے ہم سے، عبث محبت کی
خود بخود تم ہوئے اسیرِ بلا ۔۔۔ اب سزا بھگتو اس حماقت کی
سن کے اس بے وفا سے صاف جواب ۔۔۔ ہم نے مہر و وفا پہ لعنت کی
کوئے قاتل سے آ گئے رسوا ۔۔۔ بچ گئی جان خود بدولت کی

اس طرح کی غزلیں ادیب کے قلمی مجموعہ میں بہت ہیں اور سب کی سب موثر۔ زبان و بیان کی صفائی، محاورات کے استعمال اور نئے مضامین کے انتخاب کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ الفاظ کی نشست اور مضمون کی دل آویزی پر بھی توجہ رکھی ہے۔ صوفیانہ اقدار اور ادبی بلاغت کا خاص خیال رکھا گیا ہے:

اپنے جلوے کو نہ اب پردے کے اندر دیکھیے ۔۔۔ بجلیاں گرتی ہیں باہر، آ کے باہر دیکھیے
آئینہ ہے دیدنی، یہ بھی تماشہ دیکھیے ۔۔۔ دیکھیے حالِ دلِ بے تاب و مضطر دیکھیے
اف رے خود بینی کہ پھر اس نے نہ دیکھا آئینہ ۔۔۔ جب کہا میں نے کہ لیجیے اپنا ہمسر دیکھیے
دیجیے الزام مجھ کو بے حجابی کا مگر ۔۔۔ اپنی چشمک، اپنی چتون، اپنے تیور دیکھیے
رہ نہ جائے دل میں شوقِ خونِ ناحق ٹھہریے ۔۔۔ گر نہ جائے ہاتھ سے غصہ میں خنجر دیکھیے

پھر دلِ گم گشتہ یاد آیا، مجھے یادش بخیر ۔۔۔ پھر خیال آیا کہ اس کی جستجو کر دیکھیے
پھر دلِ ویراں اس بت کا خیال آیا ادیب ۔۔۔ پھر ہوا آباد، یہ اجڑا ہوا گھر دیکھیے

آخر میں ایک اور غزل: مظلوم نما آنکھیں: جسے: غزل نما: کہا جا سکتا ہے، پیش خدمت ہے۔ غزل کا مطالعہ کیجیے اور حسرت موہانی کی غزلیات کا تصور کیجیے وہی کیف، وہی لطف، وہی سراپا اور وہی انداز ملے گا، جو حسرت کی شاعری کا ہے۔ محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور عشق میں لاگ اور لگاؤ کی باتیں ملاحظہ ہوں:

ہیں وصل میں شوخی سے پابندِ حیا آنکھیں ۔۔۔ اللہ رے ظالم کی مظلوم نما آنکھیں
آفت میں پھنسائیں گی، دیوانہ بنائیں گی ۔۔۔ وہ غالیہ سا زلفیں، وہ ہوش ربا آنکھیں
کیا جانیے کیا کرتا، کیا دیکھتا، کیا کہتا ۔۔۔ زاہد کو بھی میری سی دیتا جو خدا آنکھیں
رحم اس کو نہ آیا تھا، تو شرم ہی آ جاتی ۔۔۔ بیداد کے شکوے پر جھکتیں تو ذرا آنکھیں
کس شوق سے آیا ہوں، میں محفلِ جاناں میں ۔۔۔ اے رشک عدو دم بھر مجھ کو نہ دکھا آنکھیں
کیوں آنکھ چراتے ہو، کیوں منہ کو چھپاتے ہو ۔۔۔ دیکھو تو کہ ہیں کب سے مشتاق نما آنکھیں
تم جان کو کھو بیٹھو، یا آنکھوں کو رو بیٹھو ۔۔۔ روح امین تم سے نہ ملائیں گے ذرا آنکھیں

رام گنگا باندھ — کالاگڑھ

ماتا پرشاد نہب بریلوی

کالاگڑھ فطرت کی تعمیرات کا شہکار ہے	دستِ قدرت کی نوازش کا تجلی زار ہے
یوں تو ہر وادی یہاں کی سخت ناہموار ہے	رام گنگا کے کنارے بارشِ انوار ہے
کونپلوں میں پھول کلیوں کی پھبن آئی ہے
رہ گزاروں سے یہاں کی کہکشاں شرمائی ہے

دور ہو جائیں گی جس سے قوم کی محرومیاں	پیش آئیں گی نہ پھر انساں کو مجبوریاں
کامراں ہو جائیں گی تعمیر کی جولانیاں	قوتِ ایثار کی مٹ جائیں گی بے تابیاں
پھر مجاز امن پر جائیں گے بھارت کے سپوت
دیکھ کر بھاگیں گے جن کو دورِ غداری کے بھوت

کاٹ کر کہسار جھیلیں بنائی جائیں گی	اور سرنگیں پانی لانے کی لگائی جائیں گی
ڈام کی اونچائی سے دھاریں گرائی جائیں گی	جن سے بجلی گھر کی ٹربائین چلائی جائیں گی
جتنا پانی بچ کے بجلی گھر سے اوپر آئے گا
نہر کے رستوں سے وہ کھیتوں میں بھیجا جائے گا

کارخانے جا بہ جا پھر دیکھنے میں آئیں گے	اور سامانِ دفاع ان میں بنائے جائیں گے
نوجوانانِ وطن جن میں ٹریننگ پائیں گے	جو محافظ امن کے بن کر جہاں پر چھائیں گے
اس طرح تکمیلِ تعمیرِ وطن ہو جائے گی
شانتی بھارت کی حسنِ انجمن ہو جائے گی

دھان کی کھیتی کو جس سے زندگی مل جائے گی	اور گنّے کے لیے بھی تازگی مل جائے گی
سبزیوں کے واسطے وارستگی مل جائے گی	کاشت کاروں کے لیے دل بستگی مل جائے گی
آم لیمو دیکھ کر، امرود و جامن دیکھ کر
جی سکے گا آدمی کھیتوں کا خرمن دیکھ کر

سوزِ دل سے شمعِ آزادی جلا کر ملک میں	آنے والوں کے لیے مشعل دکھا کر ملک میں
ہم نئی نسلوں کے دامن کو سجا کر ملک میں	جملہ سامانِ ضرورت کو بنا کر ملک میں
اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر زمانے کے لیے
رنگ ہر صورت سے دیں گے اس فسانے کے لیے

پھر نہ ہم محتاج اوروں کے رہیں گے عمر بھر	اور نہ ہوں گے پھر کبھی غیروں کے ہم دستِ نگر
پھر زمانے کے حوادث کا نہ کچھ ہو گا اثر	زندگی ہو جائے گی ہندوستاں کی معتبر
زندہ باد! آزادیِ قوم و وطن کی کامنا
زندہ باد! ہندوستاں کی پنچ ورشی یوجنا

لوک ساہتیہ کی سماجی اور قومی اہمیت

محمد یٰسین

لوک ساہتیہ جنتا کے دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جن کی زندگی کھیت کھلیانوں اور کھلے میدانوں میں بسر ہوتی ہے، پھر اعلیٰ تعلیم کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے خیالات و احساسات کا اظہار اپنی مقامی بولیوں میں ہی کرتے ہیں۔ عالمی اور مہذب ادب کے مقابلے میں لوک ساہتیہ کو ایک حد تک "ناشائستہ" اور بھونڈا کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ساہتیہ میں حیات انسانی اور بالخصوص دیہاتی سماج کی جو ترجمانی ملتی ہے وہ درباری شاعروں یا شہروں کے رہنے والے ادیبوں کے یہاں نہیں ملتی۔ جب ہم اہیروں، دھوبیوں اور چماروں کا ناچ دیکھتے ہیں اور جھولوں کی پینگیں اور کھیت کھلیانوں سے اٹھتی ہوئی مترنم لہروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں ان کی کیفیت اور تاثر کے متعلق دبستانی نقادوں کی رائے کچھ سطحی معلوم ہوتی ہے۔ لوک گیتوں اور گاتھاؤں میں ابتدائی انسان بولتا ہے۔ ان سے ہمیں دیہاتی عوام کے سماجی، اخلاقی، مذہبی، معاشی اور نفسیاتی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پنڈت ہزاری پرشاد دویدی کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے ابتدائی نقوش لوک ساہتیہ میں جس طرح ملتے ہیں وہ موہن جوڈرو اور ہڑپا کے آثار قدیمہ سے کم اہم نہیں ہیں۔ دیہاتی شاعر نے اپنے سماج کو جس حال میں دیکھا ہے بجنسہٖ اُسے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہاں آدرش بیویوں کے ساتھ چڑیلوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو تمام خاندان کے لیے بلا ہوتی ہیں۔ جہاں ماں بیٹی کی محبت دکھائی گئی ہے وہاں ساس بہو اور نند بھاوج کی باہمی چشمکوں کا بھی ذکر ہے۔

لوک ساہتیہ میں جنتا کی روزمرہ گھریلو زندگی کی بہترین تصویریں نظر آتی ہیں۔ دیہاتوں میں اب بھی مشترکہ خاندانوں کا چلن ہے۔ اس ملے جلے خاندان میں باپ بیٹے، ماں بیٹی، بھائی بہن، نند بھاوج سبھی چین سے رہتے ہیں۔ شوہر اور بیوی کی باہمی محبت اعلیٰ اور مثالی ہوتی ہے۔ جاں نثار بیوی دنیاوی ترغیبات کو ٹھکرا کر "پردیسی بالم" کا انتظار کرتی ہے۔ تیلگو زبان میں کئی گیت ایسے ملتے ہیں جن میں بیوی اپنے رنگون گئے ہوئے شوہر کے انتظار میں اپنی جوانی بھینٹ چڑھا دیتی ہے لیکن کسی حوس کا شکار نہیں ہوتی۔ شمالی ہند بالخصوص بھوجپوری علاقے میں تو "بدیسیا" اور "پردیسی بالماں" کی روایت ہی قائم ہو گئی ہے۔ قدیم ہندو عورتیں اپنی عصمت اور عفت کی حفاظت کے لیے "جوہر برت" اور "ستی برت" کا پالن کرتی تھیں۔ "کسما دیوی" اور "چندراولی" نے ظالموں کے شکنجہ سے بچنے کے لیے اپنی جان دینے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ "ہیر" میں فوق الفطری محبت کا جذبہ موجود ہے اور "سارنگا سدابرت" میں "ست" اور "پریم" کا مثالی امتزاج ہے۔ اعلیٰ محبت میں فوق الفطرت توانائی بھی ہے۔ ستی کے چھونے سے دلدل میں جہاز چلنے لگتا ہے اور سوکھے تالاب پانی سے بھر جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ستی عورت اپنے "ست بل" (پاک دامنی) سے مردہ شوہر کو بھی جلا سکتی ہے۔

لوک گیتوں میں ماں بیٹی کا پریم بھی نہایت اعلیٰ درجے کا دکھایا گیا ہے۔ لڑکیاں جوان ہو کر خاندان اور بالخصوص باپ بھائی کے لیے مسئلہ بن جاتی ہیں لیکن ماں کا دل ان کے لیے پریم رس گھولے رہتا ہے۔ لڑکیاں سسرال

سے اگر سب سے پہلے اپنی ماں سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ اپنا دکھ درد ان کے علاوہ کسی اور سے نہیں کہتیں۔ مثال کے طور پر جب پاربتی جی اپنے شوہر شیوجی کے یہاں سے میکے آئیں تو انھوں نے سب سے پہلے اپنی ماتا سے ہی دکھڑا رویا :۔

؎ بھنگیا پیست ہوا ماں، ہتھوا کھئیلے
دھتورا گھٹ ہوا ماں، جیئرا اکو تیلے

(ماتا جی ہم تو شیوجی کے لیے بھانگ (بھنگ) پیستے پیستے تھک گئے، میرے ہاتھوں پر بل پڑتے کا نشان دیکھو۔ ان کے مرغوب شربت کے لیے دھتورا گھٹتے گھٹتے بھی میرا دل گھبرانے لگا ہے)۔

بھائی بہن کا پریم بھی لوک ساہتیہ میں بے نظیر ہے۔ بھائی کی خاطر بہن اپنے سسرال کے سب لوگوں سے لڑ جھگڑ کر اسے اچھے سے اچھا کھانا کھلاتی ہے۔ ایک لوک گیت میں بہن اپنے بھائی سے ناراض ہو کر نوید نہیں بھیجتی لیکن جب اسے اس کا احساس ہوتا ہے کہ بھیا نہ آئے تو میں کس کے پیروں پڑ کر "بھینٹ" (ملاقات) کروں گی؟ تو فوراً "کاسے بھوزا" کو بھیجتی ہے کہ بھیا کو بلا لائے۔ بھائی کے نہ آنے پر گھر میں گانا بجانا بند کرا دیا جاتا ہے لیکن اس کی آمد پر گیت منگل ہونے لگتے ہیں :۔

؎ آرے آرے جوگن بھائن، سب کو گا دُ نہوں ہو
مورا جیئرا بھیلے بُولاس، بیرن مورا آدے لے ہو

(بہن گاؤں کی سہاگنوں سے گانے بجانے کی فرمائش کرتی ہے اس لیے کہ اس کا بہادر بھائی آگیا ہے اور اس کا دل خوشی سے پھولا نہیں سماتا)

بھائی بہن کی عصمت کا پاسبان ہے اور اس کے لیے جان دے دینا فخر کی بات سمجھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بھائی تمام دنیا سے قطع تعلق کر لینے کے بعد بھی بہن کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ راجہ گوپی چند سادھو ہو جاتے ہیں مگر ان کے منع کرنے پر بھی بہن کے گھر جانے سے باز نہیں آتے۔

مشترکہ خاندان میں نند بھاوج کا رشتہ بھی خوب ہوتا ہے۔ نند کو بھاوج عزیز تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے حسد بھی کرتی ہے اور بھائی سے موقع ملنے پر شکایت کرنے سے بھی نہیں چوکتی۔ وہ بات بات پر طنز کرتی ہے اور اس کے میکے کی برائیوں کو بتانے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ بھاوج بھی نند کی رخصتی پر زیادہ غم کا اظہار نہیں کرتی :۔

؎ بھوجی نینواں نا لور (بھابھی کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں)

لوک گیتوں کا سب سے دلچسپ پہلو ساس بہوؤں کے تعلقات پر مبنی ہے۔ اکثر ان کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ ساس بے رحم ہوتی ہے اور نئی نویلی دلہن کو طرح طرح سے تنگ کرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر اس کی ہر بات پر نکتہ چینی کرنا عام بات ہے لیکن "ہورل" کی پیدائش پر سب سے زیادہ خوشی اسی کو ہوتی ہے۔

دیہات میں مشترکہ خاندان کے لوگوں کے تعلقات مجموعی طور پر بہتر ہوتے ہیں۔ یہاں ہر ایک فرد دوسرے کے آرام کا خیال رکھتا ہے۔ سکھی خاندان کے لیے عورتیں بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہیں۔ ایک راجستھانی گیت میں ایک عورت اپنے دیور اور جیٹھ کو اپنا زیور مانتی ہے۔ سسر کو گھر کا راجہ اور ساس کو رانی تصور کرتی ہے۔ اپنے بیٹوں کو موتیوں کا ہار اور بہوؤں کو موتیوں کے بیچ کا لال کہتی ہے۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بیٹی کو زری دار چولی اور داماد کو چمیلی کا پھول سمجھتی ہے۔

لوک ساہتیہ میں شادی بیاہ اور دوسرے رسوم و روایات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان میں لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بہت کٹھن ہے۔ یہ کام دیہاتوں میں اب بھی زیادہ تر والدین ہی کرتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کو والدین کی مرضی کے مطابق شادی کرنا پڑتی ہے۔ شادی کے لائق ہو جانے پر لڑکی کی ماں اپنے شوہر کو اچھے بر کی تلاش کے لیے ادھر ادھر بھیجتی ہے۔ وہ تلک اور جہیز سے نالاں رہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بر ملے تو گھر نا، گھر ملے تو بر نا۔ اس لیے اکثر بے میل شادیاں ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی دوشیزاؤں کی زندگی بڈھوں کی ہوس کے نذر ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے دیہاتوں میں "بال بیاہ" (بچپن کی شادی) کا عام رواج تھا۔ چھوٹی عمر کے بچوں کی شادیاں کسی صورت میں قابل تحسین نہیں: لوک گیتوں میں اس کا ذکر بھی بہت ملتا ہے۔ ایک بھوجپوری لوک گیت میں بیوی اپنے نابالغ شوہر کا رونا اس طرح روتی ہے :۔

بنواری ہو، ہمرا کے لڑکا بھتار
سب کا کے دیلو رااما، اُن دھن سونواں سے
ہمرا کے لڑکا بھتار

[عورت بھگوان سے شکایت کرتی ہے کہ تو نے سب کو اناج، مال اور دولت سے خوش کیا اور مجھے اس میں سے کچھ نہیں ملا۔ شوہر بھی بالکل بچہ

اس لیے میری زندگی تلخ ہے۔)

اسی گیت میں بیوی رات کے وقت ڈر سے روتے ہوئے شوہر کو سمجھاتی ہے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اربر کے کھیت میں پیار بول رہے ہیں : ۔

؎ "رہری میں بولے لاسیاڑ"

جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور سماجی اصلاح و ترقی کے نتیجے میں کثرت ازدواج کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ لیکن لوک گیتوں میں اس خرابی کی جو جھلکیاں ملتی ہیں وہ ابھی صادق آتی ہیں۔ اکثر مرد دو شادیاں کر لیتے ہیں جس سے گھر کی ساری برکت ختم ہو جاتی ہے اور "سوتیا ڈاہ" کی آگ میں ساری خوشیاں بھسم ہو جاتی ہیں۔ ایک گیت ملاحظہ کیجیے جس میں کسی "البیلے مردوا" کی دو بیویوں میں باہمی رقابت کا نقشہ ہے۔ "چھوٹی" کہتی ہے کہ میں نتھیا گڑھاؤں گی تو "بڑی" کا خیال ہے کہ اسے اپنی "چُنری" رنگانا چاہیے۔ "چھوٹی" جب سیج بچھاتی ہے تو "بڑی" اس کی ٹانگ کھینچنے کی دھمکی دیتی ہے : ۔

البیلوا مردوا کے دو دو مہری
چھوٹکی کہے ہم نتھیا گڑھائب، بڑکی کہے ہم رنگائب چُنری
البیلوا مردوا کے دو دو مہری
چھوٹکی کہے ہم سیجیا سجائب، بڑکی کہے ہم کھینچب ٹنگری
البیلوا مردوا کے دو دو مہری

گھریلو زندگی کی خوشی معاشی خوش حالی پر مبنی ہے۔ کھیتوں میں اکثر فصلیں ماری جاتی ہیں۔ سیلاب اور خشک سالی جیسی آفتوں سے بھی سابقہ رہتا ہے۔ ایسی حالت میں گھر کے مرد بنگال اور آسام یا دوسری جگہوں پر نوکری کرنے چلے جاتے ہیں اور غریب بیویاں ان کے غم میں گھلتی رہتی ہیں۔ دیہاتی زندگی کا یہ پہلو بڑا دردناک ہے۔ شیخ سعدی نے کہا تھا کہ دمشق میں قحط پڑنے پر یاروں نے عشق کرنا چھوڑ دیا۔ ہندی شاعر نے کہا کہ :

بھوکے بھجن نہ ہوت گوپالا
لے لو اپنا کنٹھی مالا

لیکن دیہاتی اہیر کہتا ہے :

بھوکھیا کے مارے برہا بسر گئے، بھول گئی کجری کبیر
دیکھ کے گوری کے موہنی صورت، اٹھے نا کریجوا میں پیر

اس حالتِ زار کے باعث ازدواجی زندگی کس قدر کٹھن ہے اس کا اندازہ ایک گیت کے پہلے بند سے کیجیے۔

بدریا جھمک آوے موہے راجہ
سانجھ بھئی دیا باتی کے بیریا، راجہ دوہا دسے گئیا
میں جونا بناؤں موہے راجہ

لوک ساہتیہ میں عوام کی خانگی، سماجی اور معاشی زندگی کی ہی جھلکیاں نہیں ملتیں بلکہ ان سے ان کے اخلاقی اور مذہبی رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہندوستانی جنتا کے دل و دماغ پر اگرچہ مذہب کی گہری چھاپ ہے اور ہندو دھرم اور اسلام کے پیرو اپنی اپنی جگہ اپنے مذاہب کے پابند ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں کوئی باہمی اختلاف نہیں ہوتا۔ اکثر تو ایسا ہوا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کی دیوی دیوتاؤں کی پرستش میں حصہ لیا ہے۔ اس کے ثبوت کیلئے سنت شاعروں اور صوفیوں کے کلام کو دیکھیے۔ بنگال میں "ستیہ پیر" شمالی ہند میں غازی میاں" بالا پیر" اور پنجاب و راجستھان میں "ظاہر پیر" ہندو مسلم عوام میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ہمارے لوک گیتوں میں اگر ایک طرف شیوجی، رام چندر جی، کرشن جی اور دوسرے اوتاروں کا ذکر ملتا ہے اور شیتلا، گنگا مائی، دیوی بھگوتی کی پوجا اور منت ہوتی ہے تو دوسری طرف نبیوں اور پیغمبروں کے بیان بھی ملتے ہیں۔ ان تمام گیتوں اور گاتھاؤں میں خدا پرستی اور تقدیر کی دہائی ملتی ہے۔ گاؤں کے سیدھے سادے عوام اپنی بےبسی اور مجبوریوں کو "بھاگیہ کا لکھا" (نوشتۂ تقدیر) کہہ کر سہہ لیتے ہیں۔ "آلہا" میں یہ بند قابل ذکر ہے :

رام بنیہیں تو بن جیہیں
بگڑی بنت بنت بن جائے

ایک لوک گیت میں لڑکی اپنے باپ سے اپنی مصیبتوں کا حال بیان کرتے کرتے کہہ اٹھتی ہے :

بابا کانسوا پیتر سب بدلی
کرم کیسے بدلی اے رام

(بابا کانسہ اور پیتل جیسے دھات تو بدلے جا سکتے ہیں لیکن تقدیر کا لکھا نہیں بدلا جا سکتا ہے)

گیتوں کے علاوہ لوک کتھاؤں اور گاتھاؤں میں بھی لوگوں کے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی بڑی حد تک ترجمانی ہوتی ہے۔ لوک کتھائیں اکثر رجائی

ہوتی ہیں۔ ان میں سب کے لیے سکھ کی خواہش اور منگل کامنا ہوتی ہے۔ اگر جھومر کے گیتوں میں سونے کی تھالی، گنگاجل اور ریشمی پلنگ عام ہیں تو لوک کہانیوں میں غیبی سہاروں، دیوی دیوتاؤں یا بزرگوں کی مدد سے بڑی بڑی مشکلوں کا حل بھی تلاش کیا گیا ہے۔ عورتیں گیتوں اور کتھاؤں میں اپنے خاندان اور تمام لوگوں کی بھلائی کے لیے دعا مانگتی ہیں۔ بھجن اور برگن میں اخلاق حسنہ (سداچار) اور نیکی کی تلقین ہوتی ہے۔ حق و باطل اور خیر و شر کے تصادم میں ہمیشہ حق اور خیر کی فتح ہوتی ہے۔

عوامی ادب جنتا کا ادب ہے اس لیے یہ انھیں عزیز بھی ہے۔ اس کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق براہ راست جنتا کے دل و دماغ اور رسوم و عقائد سے ہے۔ لوک گیتوں، کتھاؤں اور کہاوتوں (PROVERBS) میں شخصی نفسیات کے علاوہ اجتماعی نفسیات (GROUP PSYCHOLOGY) کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوک ساہتیہ کے مطالعہ کے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسان کے دل میں قدیم رسومات و عقائد کسی نہ کسی شکل میں آج بھی محفوظ ہیں۔ خوف و حیرت، خوشی اور غم، جادو ٹونے، بھوت اور آسیب، آج کے ترقی یافتہ سائنسی سماج میں بھی انسان کے دلوں سے نہیں جا سکے ہیں۔ کہانیوں میں آج بھی فوق الفطرت عناصر ملتے ہیں۔ جن اور پریوں نیز غیبی قوتوں کی جگہ آج کل "اتفاق" (CHANCE) نے لے لی ہے لیکن "تقدیر" (DESTINY) بہرحال سب پر حاوی ہے۔ مہذب ادب میں اگرچہ فوق الفطرت عناصر کو زیادہ دخل نہیں ہے اور عقلیت (RATION-ALIZATION) کا عام رجحان ہے لیکن بڑے ادیبوں اور شاعروں کے یہاں یہ عناصر مختلف علائم و رموز کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس مادیت کے زمانہ میں بھی ہمارے ہندوستانی سماج کی بنیاد روحانیت، خدا پرستی، مذہبیت اور پریم و سداچار کے اصولوں پر ہے۔ ہمارا لوک ساہتیہ بہت حد تک جدید مغربی ادبی رجحانات بالخصوص شدید جنسی میلانات (SEX-OBSESSION) اور داخلی مریضانہ کیفیات (SUB-JECTIVE MORBIDITY) کے خلاف صحت مند عناصر کا ضامن ہو سکتا ہے ہماری تہذیب ترقی کی تمام منزلوں کو طے کر کے عدم یقین اور تشکیک کے دلدل میں پھنسی معلوم ہوتی ہے لیکن لوک ساہتیہ سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے اور ہم پھر بھرپور اور صحت مند زندگی کے اس حسین وادی میں پہنچ جاتے ہیں جہاں فطرت کے صاف و شفاف چشمے رواں دواں ہیں۔

اجتماعی نفسیات کے نظریہ سے لوک ساہتیہ میں وہ گیت بالخصوص قابل لحاظ ہیں جو گروہ (CHORUS) میں گائے جاتے ہیں۔ عورتوں کے جھومر، کجری، ڈھوے اور مردوں کے رسیا، ہولی اور بھجن اس اعتبار سے زیادہ اہم ہیں۔ انسان کی اجتماعی حیثیت اس کی انفرادی حیثیت سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ جن باتوں کو ہم ذاتی طور پر کہتے ہوئے گھبراتے یا شرماتے ہیں انھیں گروہ میں مل کر کہنے میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہولی اور رسیا اور کجری ڈھوے میں عریانیت کو بھی دخل ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے لوک ساہتیہ میں عوام کی سماجی، معاشی، اخلاقی، مذہبی اور نفسیاتی زندگی کی بہترین عکاسی موجود ہے اور ان کا مجموعی اثر عوام کی روزمرہ زندگی اور ان کے طرز معاشرت پر پڑے بغیر نہیں رہتا۔



غزل

سلیمان اریب

کوئی دشمن، کوئی ہمدم بھی نہیں ساتھ اپنے
تو نہیں ہے تو دو عالم بھی نہیں ساتھ اپنے

ساتھ کچھ دور ترے ہم بھی گئے تھے، لیکن
اب کہاں جائیں کہ خود ہم بھی نہیں ساتھ اپنے

وہ بھی اک وقت تھا خورشید بکف پھرتے تھے
یہ بھی اِک وقت ہے شبنم بھی نہیں ساتھ اپنے

ناخنِ وقت نے کب زخم کو دھکایا ہے ؟
ایسے اک وقت کہ مرہم بھی نہیں ساتھ اپنے

سامنے کتنی صلیبیں ہیں پہ بے گنہی !
آج لختِ دلِ مریم بھی نہیں ساتھ اپنے

پی کے سوچا کہ خریدیں گے غمِ دنیا بھی !
طے ہوئے دام تو درہم بھی نہیں ساتھ اپنے

اپریل ۱۹۶۶ء — چیتر ۱۸۸۸ اشک

افسانہ

پناہ گاہ

رشید انور

سردیوں کی وہ صبح میرے لیے بڑی چونکا دینے والی تھی۔ بستر پر چائے کے ساتھ فرحت نے مجھے جب یہ خبر سنائی کہ موجی ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا تو میں نے محسوس کیا جیسے کوئی بڑی قیمتی چیز ہم سے چھن گئی ہو اور میں بغیر پلک جھپکائے فرحت کے چہرے کی طرف یک ٹک ایسے دیکھتا رہا جیسے موجی کے چلے جانے کی اصل وجہ اس کے چہرے پر نقش ہو۔ میں نے چائے کا کپ جلدی سے خالی کر کے انگلیوں میں جلتے ہوئے سگریٹ کا آخری کش کھینچا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے میدانوں میں اتر آنے والی سنہری دھوپ میں دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ برگد کی دو رویہ قطار سے ڈھکی ہوئی پکی سڑک کو ہمارے گھر سے ملانے والا کچا سا راستہ ابھی تک سونا تھا۔ میں نے اِس سرے سے اُس سرے تک کچے سے اس راستے پر بڑی گہری اور اداس نظریں ڈالیں۔ یہ راستہ اب موجی کے قدموں کے لیے ترس جائے گا۔ یہ اب موجی کبھی اس پگڈنڈی پر گاتا جھومتا نہیں چلے گا۔ فرحت کا وہ صحیا جس پر وہ جان دیتی تھی اب کبھی صحن میں سر جھکائے اس کی پیار بھری ڈانٹ نہ سنا کرے گا۔ ہمارے گھر کے آس پاس رہنے والے بچے اب اپنے پچیس سالہ کھلنڈرے ساتھی سے محروم ہو جائیں گے۔ میرے دونوں بچے صبوحی اور تسنیم کے ہاتھ فضا میں ان انگلیوں کو تلاش کرتے ہی رہیں گے جنھیں تھام کر وہ اسکول جایا کرتے تھے۔ لیکن وہ ہاتھ محبت سے اب ان کی طرف نہیں بڑھیں گے اور نہ کوئی بڑے پیار سے اپنی پرانی اور بوسیدہ جیبوں سے ان کے لیے مٹھ پیاں نکالے گا۔ جانے وہ کون سی بے درد راہیں ہوں گی جنھوں نے موجی کو ہم سے چھین لیا۔

موجی کا اصل نام سلطان ڈی سوزا تھا۔ وہ ایک بڑے اور مفلس گوانیز خاندان کا فرد تھا۔ موزوں قد و قامت، سانولا سا رنگ، فلمی ہیروؤں کی طرح مونچھیں اور گرد آلود پاؤں۔ میں جب کبھی اکیلے میں موجی کا تصور کرتا تو اس کے وہ گرد آلود پاؤں جیسے اس کی شخصیت پر چھا جاتے۔ اس کے دو پاؤں دراصل دو ایسے پہیے تھے جنھوں نے موجی کو انسان سے شمشیر بنا دیا تھا۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا تھا، چھاؤنی کی خوب صورت سی بستی کے بازاروں اور گلیوں میں گھومتا اور کسی نہ کسی کام میں الجھا ہوا ہی دیکھا تھا۔ نہ جانے وہ کتنے ہی کام ہوں گے جنھیں وہ صبح کے پانچ بجے سے رات کے اس پہر تک انجام دیتا تھا جب سب ہی لوگ آرام سے اپنی اپنی رضائیوں میں جا سوتے ہوں گے۔ وہ ہوا کا ایک ایسا جھونکا تھا جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ جو کبھی آہستہ اور کبھی زور سے نہ جانے کہاں کہاں سر مارتا پھرتا ہے۔ وہ یہاں سے چلا گیا لیکن چھاؤنی کی ایک ایک گلی میں ایک ایک راستے پر آج بھی موجی کے قدموں کے سیکڑوں نشان ہوں گے جہاں سے وہ بڑے موڈ میں کوئی فلمی دھن گنگناتا، مسکراتا اور اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا لے جا کر راہ چلنے والوں کو سلام کرتا ہوا گزرا ہوگا۔ موجی کو چھاؤنی کے لوگوں میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس کی طبیعت کی سادگی، دیوانوں کی طرح اس کا بھولا پن اور اس کے چہرے کی سدا بہار مسکراہٹ نے جیسے اسے سب ہی کا چہیتا بنا دیا تھا۔ وہ ہماری اس بستی میں بے تاج کا ایسا بادشاہ تھا جو لوگوں کے دلوں پر راج کرتا تھا۔ میری اور موجی کی دوستی کی ابتدا میرے اخبار کے دفتر سے ہوئی تھی۔ ہمارے دفتر کا منیجر کچھ خالص تجارتی قسم کا آدمی تھا وہ چاہتا تھا موجی روزانہ دفتر سے اخبار لے جانے سے پہلے ان کی قیمت ادا کر دیا کرے اور موجی کے لیے ان دنوں یہ بالکل ہی ناممکن تھا۔ وہ جب اس معمولی

بات پر پریشان سا میرے پاس آیا اور میں نے اس کے معصوم اور فکر مند چہرے کو دیکھ کر اسے اجازت دے دی کہ وہ اخبار کی کاپیاں فروخت ہونے کے بعد دفتر میں پیسے دے سکتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور اس کے بعد اس کا یہ معمول ہو گیا کہ جب وہ روزانہ شام کو اخبار کی کاپیاں لے کر چلتا تو میرے کمرے کے سامنے رک کر بڑی زور دار آواز میں سلام کرتا اور دوسرے ہی لمحے سیڑھیوں کو پھلانگتا تقریباً دوڑتا ہوا بازار کی طرف چل دیتا اور پلک جھپکتے ہی اس کی آواز دفتر سے نکل کر سڑکوں، چوراہوں اور گلیوں میں پھیلنے لگتی۔ ان ہی دنوں میں نے اپنے دونوں بچوں کو کانونٹ میں شریک کروا دیا تھا لیکن کوئی ایسا آدمی مل ہی نہیں رہا تھا جو انھیں پابندی سے وقت پر اسکول لے جایا اور لایا کرے — دوپہر میں ان کا کھانا پہنچایا کرے۔ میں اور فرحت دونوں اس کے لیے پریشان اور فکر مند تھے اور ان ہی دنوں میں نے جب اپنی پریشانی کا تذکرہ موجی سے کیا تو وہ فوراً اس کام کے لیے راضی ہو گیا اور بڑی پابندی سے دونوں بچوں کو اسکول لے جانے لگا۔ یہی وہ راستہ تھا جس کے ذریعے موجی ہمارے اس چھوٹے سے خاندان کا بہترین دوست بن گیا — بعض وقت جب میں اسکے رہن سہن اور اسکے ان کاموں کے متعلق سوچتا جن کو پورا کرنا وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ نیم پاگل ہے — وہ کون سا کام ہوگا جس کو کرنے سے موجی انکار کر دے۔ صبح کی پہلی کرن اس کے لیے مصروفیت کا انبار لاتی۔ ہوٹلوں کے فرش پر ٹاٹ چلانے، صاحب لوگوں کی موٹروں کو چمکانے، پان والوں کا سودا سلف لانے اور چلا چلا کر اخبار بیچنے سے لے کر فلموں کے آخری شو سے نکلتے ہوئے جوڑوں کے لیے ٹیکسیاں لانے تک نہ جانے کتنے کام ہوں گے جنھیں وہ پورا کرتا تھا — اتنا سب کرنے کے باوجود جب میں اس کے جسم پر بوسیدہ سے انتہائی میلے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑے دیکھتا تو مجھے دکھ ہوتا اور میں سوچتا کہ آخر موجی اپنی محنت اور اپنے کام کا معاوضہ پورا پورا کیوں نہیں لیتا؟ آخر وہ ہر کام انتہائی حقیر رقم کے بدلے کیوں کرتا ہے؟ اور اتنی سخت محنت کرنے کے باوجود اسے خوشی اور سکون میسر کیوں نہیں آتا؟ جب ایسے ہی نہ جانے کتنے سوالات میرے دل و دماغ پر دستک دینے لگتے اور میں موجی کو سامنے کے بڑے سے میدان میں کالونی کے پیارے پیارے بچوں کی خاطر گلی ڈنڈوں کی دوڑ لگاتے ہوئے یا ٹین کے کنستر کی آواز کے ساتھ ساتھ کمر پر ہاتھ رکھے ٹھمک ٹھمک کر ناچتے ہوئے دیکھتا تو مجھے اس کی زندگی اور اس کی شخصیت ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور معلوم ہوتی جس کا کوئی سرا نہ تھا۔ ہر پہلو سے وہ مجھے بڑا عجیب سا لگتا — وہ ایک گوانیز خاندان میں ضرور پیدا ہوا تھا۔ لیکن صحیح معنوں میں اس کا اپنا کوئی مذہب نہ تھا۔ وہ ہر مذہب اور اس کے ماننے والوں کے سامنے اپنا سر جھکاتا تھا۔ میں جہاں اسے لوگوں کی فرمائش پر کالی کملی والے کی شان میں قصیدے گاتے ہوئے سن چکا تھا وہیں میں نے اسے بڑی سریلی آواز میں میرا کے گیت اور گرو نانک کے بھجن گاتے ہوئے بھی سنا تھا۔ اس کے لیے سب ہی اپنے تھے۔ ان کے لیے بھی اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھتا جو لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے نقصان پہنچانے کی سوچا کرتے۔ لیکن سب ہی باتوں کو مسکرا کر برداشت کر لینا جیسے اس نے اپنی زندگی کا شعار بنا لیا تھا۔ یہ پچھلے چند مہینوں ہی کی تو بات تھی جب اسے ایک بڑے کڑے امتحان سے گزرنا پڑا اور اسے اپنی ماں، بھائی بہن اور اس گھر کو چھوڑنا پڑا جس پر وہ جان دیتا تھا۔ ان سب کی خوشی کے لیے کتنی تگ و دو کرنی پڑتی تھی اسے۔ اس کی سدا یہ کوشش رہتی کہ وہ اپنے دوسرے اوباش اور آوارہ بھائیوں کی طرح اپنی ماں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے کبھی بھی غیر ذمے دار ثابت نہ ہو سکے۔ لیکن وہ دن موجی کبھی نہیں بھول سکتا جس دن اسے انھیں نے لوٹ لیا جن کی خاطر وہ اپنے خون کی ایک ایک بوند چند سکوں کے لیے بیچتا رہا تھا — جن کی خاطر اس نے سردیوں کی جان لیوا صبحوں میں، گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہروں میں اور موسلا دھار برستی ہوئی شاموں میں ایک جانور کی طرح محنت کی تھی لیکن اسے انجان اور نا سمجھ جان کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا تھا۔ حادثے کے دن آدھی رات گئے جب پولیس نے اچانک چھاپہ مار کر ان کے گھر میں تیار ہونے والی شراب کی بھٹی پر قبضہ کر لیا تو کچی نیند سے جاگے ہوئے محلے کے لوگ بڑی حیرت سے اپنی آنکھیں مل مل کر یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ اور دوسری صبح جب انھیں معلوم ہوا کہ ان تمام کرتوتوں کے پیچھے موجی کا ہاتھ تھا تو انھوں نے گھبرا گھبرا کر اس طرح کانوں پر ہاتھ رکھ لیے جیسے دنیا میں اب کوئی قابل بھروسہ آدمی نہ رہا اور جیسے اب دنیا کے خاتمے کی گھڑی آ پہنچی ہو — موجی کے "جھگڑی مُنگی" کئی دن موجی جیل کے تاریک اور بند کمرے میں بیٹھا اپنی اس ماں اور ان بھائیوں کے متعلق سوچتا رہا جنھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پولیس والوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا — اور یہ سوچتا رہا کہ کیسے ہیں اس کے اپنے یہ لوگ جنھوں نے اسے کبھی خوشی کے لمحوں میں پلٹ کر نہ دیکھا اور دکھ اور پریشانی آئی تو اسے سونپ دی — اس وقت وہ

اپنی زبان بھی تو نہ ہلا سکا۔ یہ تک نہ کہہ سکا کہ وہ بے قصور ہے —— پھر مقدمہ چلا۔ کئی ہفتوں بعد معصوم اور بے گناہ موجی چھوڑ دیا گیا اور ہتھکڑی کے جوڑے اس کے بدمعاش اور سزا یافتہ بھائی کے ہاتھ میں پہلے گئے —— اس کے بعد کبھی بھی کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ اس راستے پر گیا ہو جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا ——

روزانہ میں ادھر دفتر جانے کی تیاری کرتا ہی رہتا کہ ادھر سے موجی گاتا جھومتا راہ چلتے ہوئے بچوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا تسنیم اور صبوحی کو لینے چلا آتا۔ اگر بچوں کو تیار ہونے میں دیر ہوتی تو وہ دوڑ دوڑ کر فرحت کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگتا اور میں اسے دیکھ کر سوچنے لگتا کہ آخر موجی نے اتنا بڑا وار اپنے دل پر کیسے برداشت کر لیا ہوگا —— کیا اسے اب اپنی اس ماں کا خیال بھی نہ آتا ہوگا جس کی خاطر کبھی وہ اپنے حصے کی بچی کچی روٹی اور دال اپنے دامن تلے چھپا کر گھر لے جایا کرتا تھا —— ان سب کو یاد کرکے اور اس برتاؤ کو یاد کرکے جو انھوں نے اس کے ساتھ کیا تھا اس کے دل میں جو لاوا ابل پڑتا ہوگا وہ اس پر کس طرح قابو پاتا ہوگا؟ ہمیں سوچتا ہی رہ جاتا اور وہ دونوں بچوں کا ہاتھ تھامے اور ہونٹوں کو سکیڑے سیٹی بجاتا ہوا آہستہ آہستہ میری نظروں سے دور چلا جاتا —— اپنا گھر چھوڑنے کے بعد ان دنوں وہ ایک مختصر سے کرسچین خاندان کے ساتھ رہنے لگا تھا جس کے لیے وہ انھیں ہر ماہ کچھ کرایہ بھی ادا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ نہ جانے وہاں وہ کس حال میں رہتا ہو اور دن بھر کی ہڈیاں توڑ دینے والی محنت کے بعد اسے وہاں آرام کی نیند آتی بھی ہوگی یا نہیں، میں نے جب اس سے اپنے گھر اٹھ آنے کے لیے کہا تو اس نے نہ جانے کیوں صاف انکار کر دیا۔ جب بھی وہ ہمارے گھر آتا فرحت اسے کھانا کھلائے بغیر کبھی بھی نہ چھوڑتی۔ اس نے میرے بہت سارے کپڑے موجی کو دے ڈالے تھے۔ جب وہ اس سے بڑی اپنائیت اور بڑے لاڈ سے باتیں کرنے لگتی تو نہ جانے کیوں مجھے بے انتہا خوشی ہوتی۔ میں جب یہ دیکھتا کہ فرحت اپنے دونوں لاڈلوں کو سمجھا رہی ہے کہ وہ اسے نام لے کر نہ پکاریں —— وہ تو ان کا "موجی ماموں" ہے —— یا پاس پڑوس کی اپنی کسی سہیلی کے سامنے جب وہ موجی کی محنت اور معصومیت کی تعریف کرنے لگتی تو میں دل میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم وہ محبت اور شفقت موجی کو دے رہے ہیں جس کا موجی حق دار تھا —— جیسے اس خلاء کو پر کر رہے ہیں جو موجی کی زندگی اور اس کی روح میں ازل سے پڑ گیا تھا ——

پھر اچانک میں نے اور فرحت نے اس میں ایک بڑی تبدیلی محسوس کی۔ وہ موجی جو پہلے کبھی ہفتوں اپنی فکر نہ کرتا، میرے چاہتے اور فرحت کے اسرار کے باوجود اپنے کپڑوں اور اپنے حلیے کی خبر نہ لیتا، وہی موجی اچانک بدل گیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر بالوں کو سلیقے سے جمائے اور گلے میں خوبصورت سا رنگین رومال باندھے جب وہ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا تو مجھے اس کے بھولے پن پر ہنسی آجاتی۔ پہلے روزانہ وہ صبوحی اور تسنیم کو گھر لے آتا تو وہیں آنگن میں پھیل کر بیٹھ جاتا اور فرحت جب اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھما دیتی تو چائے کی چسکیاں لے لے کر زمانے بھر کی باتیں کرنے لگتا۔ لیکن اب تو چائے رہی الگ، اس سے بات کرنا بھی ہمارے لیے ایک مشکل مسئلہ بن گیا۔ ادھر وہ بچوں کو چھوڑتا، ہمارے سوالوں کے اوٹ پٹانگ سے جواب دیتا اور پلک جھپکتے ہی پگڈنڈی پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا نظر آتا۔ اس کی وجہ ہم سے زیادہ دن چھپی نہ رہ سکی۔ اس کے ہاتھوں میں نظر آنے والے خوب صورت سے رنگین کپڑوں، خوش بو کے تیل اور اسنو پاؤڈر کے ڈبوں نے جیسے ہم پر وہ بات ظاہر کر دی جسے شاید موجی ہم سے چھپانا چاہتا تھا۔ ان دنوں اپنے دفتر میں یا گھر کے پرسکون ماحول میں بیٹھ کر میں نے موجی کے متعلق بڑی شدت سے سوچا تھا۔ اور مجھے ان دنوں اور ان راتوں پر بڑا پیار آیا تھا جو موجی کی زندگی میں چپکے سے چلی آئی تھیں۔ ایسے دن اور راتیں جن کا نہ جانے موجی کو کب سے انتظار رہا ہوگا —— پیار اور محبت سے لبریز وہ لمحے اور کسی چاہت میں دل کو دھڑکانے والی وہ گھڑیاں موجی کو کتنی عزیز ہوں گی، اس کا اندازہ میں ان دنوں اس کے دمکتے ہوئے چہرے سے لگا سکتا تھا، لیکن عجیب تھی موجی کی زندگی بھی۔ جانے کیوں اس کی زندگی میں حالات ہر لمحہ جیسے ایک نیا موڑ لینا کہنے پر تلے رہتے تھے۔ اس بار بھی مسرت اور خوشیوں کا چاند موجی کی زندگی میں زیادہ دنوں تک جگمگا نہ سکا۔ حالات نیا رخ اختیار کر گئے اور اس کرسچین لڑکی کی شادی کہیں اور کر دی گئی جس کے پیار کا دیا موجی اپنے سینے میں جلائے پھرتا تھا —— اس کے دل و دماغ پر، اس کے چہرے پر، اس کی خوشیوں اور قہقہوں پر پھر سے تاریکی چھا گئی۔ اس کے پیروں پر گرد اور اس کے کپڑوں پر پھر سے میل کی تہیں چڑھنے لگیں۔ پھر سے لاابالی پن اور اداسیاں اس کی زندگی میں رچ بس گئیں۔ اور میرے دل میں اس کے لیے بلا کا درد سمٹ آیا —— نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر بعض وقت احساس ہوتا کہ یہ سب ناانصافیاں جیسے مجھ سے کی جا رہی ہوں۔ یہ سارے ظلم و ستم جیسے موجی پر نہیں بلکہ میری ذات پر توڑے جا رہے ہوں۔ ان دنوں جب بھی میں اس کی کھوئی کھوئی آنکھوں میں دیکھتا تو

مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے موجی ابھی اسی وقت مجھ سے لپٹ کر رو پڑے گا اور میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا کہ لوگ آخر موجی کے دل کا درد کیوں نہیں سمجھتے۔ آخر وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ موجی کے بھی کچھ ارمان ہوں گے ــــ اسے بھی انسانوں کی طرح جینے کی تمنا ہو گی۔ اس کے خوابوں میں بھی ایک گھر بستا ہو گا ــــ جہاں وہ دن بھر کی کڑی محنت اور تھکن سے چور اپنا جسم لیے رات گئے لوٹے تو دو بے چین نظریں اس کی منتظر ہیں۔ دو ننھے منے بازو اس کی گردن میں جھول جانے کے لیے بے قرار رہیں۔ اس کے گرد سے اٹے ہوئے بالوں میں کوئی پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے ــــ کتنا ٹوٹ کر نہ سوچا ہو گا اس نے اس بارے میں۔ اپنے تصور میں کتنی تصویریں بنائی اور بگاڑی ہوں گی۔ لیکن انسانوں کے اس بھرے پُرے سمندر میں جیسے اس کے دل کی آواز سُننے والا کوئی نہ تھا۔ میں اس لڑکی کا تصور کرتا تو کانپ جاتا جس لڑکی کو اس نے اپنے خیالوں کی راہ گذر پر باہوں میں باہیں ڈال کر اپنے ساتھ چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کو جیون ساتھی بنانے کے خواب اس نے دیکھے تھے۔ کیا کوئی انسان اپنے مقصد اور اپنی خواہشوں کی تکمیل کی خاطر دوسروں کے دل کو، ان کی آرزوں اور خوشیوں کو کھلونا سمجھ کر کھیل بھی سکتا ہے ــــ کتنی کٹھور تھی وہ لڑکی جس نے موجی سے محبت کا اتنا خطرناک ناٹک رچایا تھا ــــ پھر ایک لڑکی کیا ــــ میری نظروں کے سامنے ایک کے بعد ایک سیکڑوں چہرے رقص کرنے لگتے ــــ ایسے بوڑھے لوگ جن کی محفلوں کی جان موجی تھا ــــ ایسے بانکے جوان جن کے سازوں کی لے موجی کی آواز بنا سونی تھی ــــ وہ شرماتی لجاتی کنواریاں جو پنگھٹ پر دلوں تک اتر جانے والی اس کی آواز کے سہارے اپنے ان جانے اور اَن دیکھے پریتم کا تصور کیا کرتی تھیں ــــ اور ایسے بھولے بھالے اور دنیا کی فکروں سے الگ تھلگ بچے جن کا کھیل، جن کے میدان موجی کے کھیل کود اور ناچ رنگ سے آباد تھے ــــ ایک پوری دنیا تو تھی، جن میں وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ گزار رہا تھا۔ لیکن کسی نے بھی اس کے دل کا درد جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کسی نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر آس اور امید کی ان تصویروں کو نہ دیکھا تھا جو نہ جانے کب سے موجی لیے لیے پھر رہا تھا اور جن کی خاطر وہ دن رات مر رہا تھا ــــ اپنے گھروں کے آنگن میں، اپنی بیوی بچوں، بھائی بہن اور ماں باپ میں گھرے بیٹھے اور موجی کی آواز میں ہیر رانجھا کا قصہ سُنتے ہوئے ــــ یا ایک ایسے انسان کی داستان سُنتے ہوئے جو زندگی بھر محبت کی چاہ میں دربدر بھٹکتا پھرا تھا ــــ وہ سب اداس ہو جاتے تھے اس زمانے کا تصور کرتے جب ہیر رانجھا کی محبت جوان ہوئی ہو گی اور ان لمحوں کے متعلق سوچتے جب ان پر ظلم و ستم توڑے گئے ہوں گے۔ لیکن کوئی بھی نظر پھیر کر چند ہی قدم پر بیٹھے ہوئے موجی کی آنکھوں میں لرزتے آنسو نہ دیکھ پاتا ــــ کوئی بھی اس کے دل سے ابلتے ہوئے لاوے کا تصور نہ کر سکتا ــــ ان لمحوں کا تصور نہ کر سکتا جب ایک دن کوئی ہیر اس کے شیشۂ دل کو چکنا چور کر گئی تھی۔

میں نے ان دنوں اسے اپنے گھر کی ایک ایک اینٹ کو بڑی حسرت سے تکتے ہوئے پایا تھا۔ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں کھڑے ہو کر ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں مجھے بلا کی اداسی اور درد سمٹ آتا۔ صبوحی اور تسنیم جب بڑے پیار سے اس کے پیروں سے لپٹ جاتے تو ان دونوں کو وہ اپنے ہاتھوں کے حلقے میں لے کر اپنے سینے سے بھینچ لیتا ــــ یا کبھی مجھے اور فرحت کو کسی معمولی سی بات پر بحث کرتا ہوا پا کر یا کسی بھی بات پر خوش ہوتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مجھ کو آنسوؤں کی چمک سی محسوس ہوتی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر کبھی کبھار میرا دل چاہنے لگتا کہ فرحت کی باہوں میں باہیں ڈال کر اور اپنے دونوں بچوں کی انگلیاں تھامے کہیں دور نکل جاؤں۔ میرے پیچھے میرا بھرا پُرا گھر اسی طرح رہے۔ صحن میں مرغیاں اسی طرح کُڑ کُڑاتی رہیں ــــ باورچی خانے کی چمنی سے روزانہ کی طرح دھواں اٹھتا رہے ــــ ڈرائنگ روم کی خوب صورتی اور گھر کے سامنے لہلہاتے ہوئے چھوٹے سے چمن کے پھول اسی طرح بہار دکھاتے رہیں۔ لیکن ہم سب ایک ایسی راہ پر ہو لیں جو کبھی واپس نہیں آتی اور ہمارے پیچھے ریڈیو سے ابھرتی ہوئی ہلکی ہلکی موسیقی کے درمیان سارے ہنگاموں سے پرے موجی چائے کی میز پر بیٹھا شام کا اخبار دیکھتا رہے اور وہ کرسچین لڑکی آنکھوں میں پیار کے کبھی نہ مٹنے والے نقوش لیے موجی کے لیے چائے کا کپ تیار کرتی رہے۔

ان دنوں میرے ذہن کی عجیب حالت تھی۔ مجھ سے موجی کی یہ پریشانی اور دکھ دیکھے نہ جاتے تھے اور میرے ساتھ ساتھ فرحت بھی اس کے لیے ہلکان ہو رہی تھی۔ پھر اچانک اس الجھن کا ایک سرا جیسے ہمارے ہاتھ آ گیا۔ ہم دونوں نے مل کر ایک سہارا ڈھونڈ نکالنے کے متعلق سوچا جو موجی کی اس مایوس اور گرتی ہوئی حالت کو سنبھال لے اور یہ سب اس کے لیے ہمارے سوا کرتا بھی کون۔ میں نے اور فرحت نے مل کر اس کام کے لیے اسکیمیں بنائیں اور ہم نے موجی کا دامن اپنے محلے میں رہنے والے موٹر مکانک پیٹر کی بیٹی سے باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔ فرحت نے جب موجی سے اس بارے میں پوچھا تو وہ اپنے منھ سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں نے جیسے ہیں سب کچھ

سمجھا دیا۔ اور ایک دن اپنی مصروفیتوں سے چھٹکارا پا کر میں اور فرحت مکانک پیٹر کے گھر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ پیٹر کی بیٹی ان پڑھ اور معمولی شکل و صورت کی ضرور تھی لیکن اس کے سلیقے اور سگھڑ پن سے ہم دونوں کو توقع تھی کہ وہ موجی کی زندگی میں آ کر ضرور ایک اچھی زندگی کی شروعات کرے گی۔ لیکن ان لمحوں میں میرے سارے جسم میں برقی رو دوڑ گئی' جب بڑے ہی سرد لہجے میں پیٹر نے اس شادی سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا لہجہ اتنا کڑوا اور برتاؤ مجھے کچھ اتنا درشت لگا کہ میں آگے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ واپسی میں راہ چلتے ہوئے فرحت کے چہرے کا اتار چڑھاؤ مجھ سے چھپا نہ رہ سکا۔ شاید وہ بھی راستہ بھر میری ہی طرح یہ سوچ رہی تھی کہ اب موجی کو کس منہ سے یہ بات بتائی جائے؟ حالات کا یہ موڑ ہمارے لیے بڑا غیر متوقع تھا۔ ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ پیٹر جیسا مفلس اور شرابی آدمی بھی اپنی معمولی اور جاہل بیٹی کے لیے ایسے 'بر' کا منتظر ہوگا جو پڑھا لکھا ہونے کے علاوہ کسی آفس میں بابو بھی ہو۔ دوسرے دن ہم دونوں ہی نے موجی سے نظریں چرائیں۔ آخر ہم اسے یہ سب کچھ کیسے سمجھا پاتے اور اسے جب یہ معلوم ہوتا کہ پیٹر نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیا ہے تو نہ جانے اس کی کیا حالت ہوتی۔

تیسرے دن موجی دن بھر غائب رہا۔ دونوں بچے اسکول بھی نہ جا سکے اور ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔ فرحت پورا دن اس کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا ــــ اس نے کئی بار موجی کے متعلق مجھے فون کیا لیکن میں بھی مکمل تاریکی میں تھا۔ دفتر چھوڑنے سے پہلے میں نے رات کی ڈیوٹی والے چوکیدار سے بتا دیا کہ جب موجی شام کا "سٹی ایڈیشن" لینے کے لیے دفتر آئے تو وہ موجی کو میرے گھر بھیج دے۔ لیکن شام بھی آئی اور رات نے اپنا سیاہ آنچل پھیلا دیا لیکن اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ رات میں سونے سے پہلے جب میں نے آخری بار دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس روز شام کا اخبار لینے بھی نہیں آیا ــــ دوسرے دن دودھ والے بھیّے کی زبانی پتہ چلا کہ بات کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گئی تھی۔ اس صبح کو جس دن سے موجی غائب تھا مکانک پیٹر نے چھاؤنی کے چوک میں موجی کا گریبان تھام کر اسے خوب ذلیل کیا۔ شراب کے نشے میں دھت وہ موجی کو گالیاں دیتا رہا اور اسے اس کی حالت اور حیثیت سمجھاتا رہا ــــ موجی ایک لفظ بھی تو اپنے منہ سے نہ نکال سکا۔ وہ پیٹر کو جواب بھی کیا دے سکتا تھا ــــ اس نے سوچا ہوگا پیٹر ٹھیک ہی تو کہتا ہے ــــ اس کی طرح پنچ اور گرا ہوا آدمی تو اس پوری بستی میں کوئی نہ ہوگا۔

اس کی اور بھک منگوں کی زندگی میں فرق ہی کیا ہے بھلا ــ سارے جہان کی خاک وہ چھانتا ہے۔ ہوٹلوں میں جھاڑو دینے سے لے کر برتن دھونے تک کو وہ پیچھے نہیں ہٹتا ــــ چند پیسوں کی آس اور امید میں فلمی ہیروؤں اور مسخروں کی نقل وہ اتارتا ہے ــــ بچوں کی خوشی کی خاطر کمر پر ہاتھ رکھے بھانڈوں کی طرح وہ مٹکتا ہے۔ وہ کیا نہیں کرتا۔ پھر ایک ایسا انسان ایک شریف آدمی کی بیٹی کے دامن سے اپنا دامن باندھنے کی بات سوچ کیسے سکتا ہے ــ موجی نے سب کچھ یہی سوچا ہوگا۔ تب ہی تو اس نے پیٹر کی ہزار صلواتوں کا کچھ جواب نہ دیا اور سر جھکائے انسانوں کے ہجوم میں رسوا ہوتا رہا۔ اور شاید یہی وجہ تھی جو دو دن سے اس نے ہمیں صورت تک نہ دکھائی تھی۔ یہ ساری باتیں سوچ کر میں اپنے دل میں بے انتہا تکلیف محسوس کرنے لگا اور مجھے لگا کہ ان ساری باتوں کا ذمے دار میں ہی ہوں۔ میں نے ہی پیٹر جیسے بدمعاش آدمی کا انتخاب کیا تھا ــــ میری ہی وجہ سے یہ ٹھیس موجی کے دل کو پہنچی تھی ــــ وہ پھر دکھی ہوا ہوگا پھر اپنی محرومیوں اور اکیلے پن کا احساس اسے ایک زہریلے سانپ کی طرح ڈس رہا ہوگا۔ ــــ میں نے سوچا وہ اپنے تڑپتے ہوئے زخمی دل کو تھامے نہ جانے کہاں کہاں گھومتا ہوگا۔ دفتر جاتے ہوئے میری نظریں 'بازاروں میں' چوراہوں پر اور گلی کے سروں پر اپنے اپنے کاموں کی طرف جھپٹتے ہوئے انسانوں کے سمندر میں اسے دھونڈتی رہیں۔ لیکن اس کا جانا پہچانا اور مانوس چہرہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آیا۔ شام کو بھی گھر لوٹتے ہوئے دو چار ٹھکانوں پر رک کر میں نے اس کے متعلق پوچھ گچھ کی لیکن میری ساری فکر کا کچھ حاصل نہ تھا۔ گزرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ ساتھ میرے دل کی بے چینی بڑھتی گئی۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا اور اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں کہ وہ اپنے آپ کو تکلیفیں پہنچائے اور سب سے منہ چھپائے چھپائے پھرتا رہے۔ میں چاہتا تھا وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پیٹر کی اس حرکت کو مسکرا کر برداشت کر لے تو ہم ضرور اس رسوائی کا بدلہ لیں گے اور پیٹر کو اور تماشہ دیکھ کر زیر لب مسکرانے والے ان گنت لوگوں کو بتائیں گے کہ موجی کی زندگی میں بھی اچھی اور سگھڑ لڑکی کا گزر ہو سکتا ہے۔ ــــ لیکن وہ نہیں آیا ــ مسلسل تین دن تک ہمارے گھر کی طرف آنے والی پتلی سی پگڈنڈی کی جانب فرحت کی نظریں بار بار اٹھتی رہیں۔ ایک مانوس قدموں کی چاپ اور جانی پہچانی دستک کے لیے اس کے دل و دماغ ہر گھڑی منتظر رہے ــــ لیکن وہ گاتی گنگناتی آواز پھر اس کے قریب نہ آ سکی ــــ اور چوتھے دن

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی فرحت نے مجھے یہ خبر سنائی کہ موجی ہمیشہ کے لیے اورنگ آباد چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے ان راہوں، گلی کوچوں اور بازاروں سے منھ موڑ لیا جس سے اس کا بڑا پرانا یارانہ تھا۔ اس نے ہمارا بھی تو کوئی خیال نہ کیا۔ ہم جو اس پر جان دیتے تھے، اس کی خوشیوں اور اچھے دنوں کے خواہش مند تھے ۔۔۔ وہ ہمیں بھی چھوڑ گیا ۔۔۔ ایلورہ اور اجنتا کی تفریح کو آئی ہوئی کسی پارٹی کے ساتھ وہ گوا چلا گیا۔۔ گوا جہاں اس کے آباد اجداد جاکر آباد ہو گئے تھے اس کے چلے جانے کے بعد ہمارے گھر کا خوش گوار ماحول ایک عجیب سی کیفیت کا مقابلہ کرتا رہا۔ وہی کیفیت ہم سب کی تھی جو ایک اچھے اور عزیز ساتھی کے چھوٹ جانے پر ہوتی ہے اور ہر گزرنے والی گھڑی اور گزرنے والے دن نے ہمیں شدت سے احساس دلایا کہ کتنے دبے قدموں داخل ہو کر اس نے ہمارے دلوں میں گھر کر لیا تھا ۔۔۔ اس کی حرکتیں، اس کا رہن سہن اور اس کی عادتیں بالکل بچوں کی طرح تھیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہر شخص اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی بھی اس کے دل میں ابلتے ہوئے محرومیوں کے سمندر کو نہ دیکھ پاتا تھا۔ چاہت اور اپنائیت کے لیے آواز دیتی خون کی ایک ایک بوند کو محسوس نہ کر سکتا تھا جو اس کے رگ وپے میں دوڑ رہی تھی۔ میں ان باتوں کو سمجھتا اور محسوس کرتا تھا۔ لیکن ان باتوں کا حاصل کچھ نہ تھا ۔۔۔ میں سب کچھ جان کر بھی اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ میں نے اس کے لیے جتنی کوشش کی، اس کی راہ کی دشواریاں اور بڑھ گئیں ۔۔۔ اس کی زندگی کا یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ کسی نے بھی اسے ایک سستے سے کھلونے سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ میں جب بھی اس کے گھر اور اس کے بہن بھائیوں کا خیال کرتا تو میری اداسی اور بڑھ جاتی۔ کوئی بھی تو اس کی پرواہ نہ کرتا تھا ۔۔۔ ان دنوں بھی جب وہ ان سب سے ناراض ہو کر شہر کی سڑکوں پر لاوارثوں کی طرح گھومتا تھا اور اب بھی جب وہ ہم سب کی نظروں سے ہزاروں میل دور تھا تو سب ہی اسے اس بری طرح اپنے ذہنوں سے جھٹک چکے تھے جیسے موجی نام کا کوئی شخص ان کے گھر میں پیدا ہی نہ ہوا ہو ۔۔۔ اس گھر سے اس کے در و دیوار سے اور ان سب سے جیسے اسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو ۔۔۔

میں نے دو تین بار اس کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ۔۔۔ میں اسے واپس بلانا چاہتا تھا۔ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ جب تک موجی کی زندگی میں سکھ اور آسودگیاں نہ آئیں گی مجھے چین نصیب نہ ہو گا۔ لیکن مجھے اس کا پتہ نہ چلا۔ کبھی کبھار مجھے یہ سوچ کر بھی دکھ ہوتا کہ اس نے کبھی ہمیں دو سطر کا خط بھی نہ لکھا۔ ہم نے تو کبھی بھی اس کا دل دکھانے کی کوشش نہ کی تھی۔ کیا اس کے لیے فرحت کا بہنا پا، اس کی چاہت اور بچوں کے معصوم لاڈ و پیار میں اتنی کشش نہ تھی کہ وہ ہمارے متعلق سوچے اور اپنے متعلق لکھ بھیجے۔ پھر بھی جب میں اس کے متعلق سوچتے سوچتے تھک سا جاتا تو مجھے احساس ہونے لگتا جیسے موجی مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ کم از کم ایسی گھڑیوں میں جب وہ ہم سب کے متعلق سوچتا ہو گا تو تصورات میں سب کچھ دیکھ تو سکتا ہو گا ۔۔۔ وہ اپنے آوارہ اور بدمعاش بھائیوں کو رات گئے شراب کے نشے میں چور ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے ۔۔۔ ان ہوٹلوں اور دکانوں کا تصور کر سکتا ہے جہاں وہ دن رات کام کیا کرتا تھا وہ اس ڈرائنگ روم کو بالکل اپنی نگاہوں کے سامنے پاتا ہو گا جہاں فرحت فرصت کے لمحوں میں اون اور اپنی سلائیوں سے جُتی رہتی تھی ۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ وہ میری لائبریری کو کیسے بھول سکتا ہے۔ جہاں وہ مجھے مطالعے میں محو دیکھ کر سگریٹ کی ڈبیاں اڑائے جاتا تھا ۔۔۔ وہ کون سی بات اور اس کی گزری ہوئی زندگی کا وہ کون سا لمحہ ہو گا جس کے متعلق وہ سوچ نہیں پاتا ہو گا ۔۔۔ اور اس کے مقابلے میں میں کتنا بے بس تھا۔ میں سوچ بھی تو نہیں سکتا تھا اس کے متعلق ۔۔۔ میرے لیے وہ راہیں بالکل ہی انجانی تھیں جن پر وہ چلتا ہو گا؟ وہ لوگ کیسے ہوں گے جن میں وہ بیٹھتا ہو گا ۔۔۔ ؟ کیا وہاں بھی اسے کوئی فرحت کی طرح چاہنے والی بہن کا پیار ملا ہو گا؟ کیا وہاں بھی تسنیم اور صبوحی کی طرح وہ کسی کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر محرم کے جلوس اور دسہرے کا تہوار دکھانے لے جاتا ہو گا؟ نہ جانے ایسی کتنی ہی باتیں اور کتنے ہی سوالات تھے جو میرے دماغ میں سر ابھارتے رہتے اور میں کسی اندھے انسان کی طرح اپنے خیالات کے راستوں پر بھٹکتا رہتا۔ اس طرح بہت سے دن اور بہت سے مہینے بیت گئے اور بدلتے ہوئے دنوں کے ساتھ ساتھ ہماری زندگیوں میں بھی بہت سی تبدیلیاں آگئیں۔ ہماری یادوں میں موجی کے لیے وہ شدت نہ رہی جو پہلے کبھی تھی ۔۔۔ کبھی کبھار کسی ایسی چیز کو دیکھ کر جس کا تعلق گزرے ہوئے دنوں میں موجی سے رہا تھا، اس کی بے اختیار یاد آ جاتی ۔۔۔

پھر ایک دن بڑی ہی عجیب بات ہوئی۔ اس رات میں ایک پارٹی سے دیر میں گھر لوٹا تو دور سے ڈرائنگ روم میں روشنی دیکھ کر مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ میں نے سوچا یہ وقت تو فرحت کے آرام کا ہے۔ تو اتنی رات گئے یہ ملاقاتی کون ہو سکتا ہے؟ ڈرائنگ روم سے اٹھتے ہوئے ملے جلے قہقہوں نے بھی میری الجھن دور نہ کی اور جب میں

ڈرائنگ روم کے سامنے جا کھڑا ہوا تو چند لمحوں کے لیے جیسے میرا کلیجہ اچھل کر میرے منہ کو آ گیا — وہ موجی ہی تھا — سو فی صدی موجی — لیکن یہ موجی؟ میں نے ایک ہی پل میں اس کے نئے جوتوں، سفید براق کپڑوں اور چمکیلے بالوں کا جائزہ لے لیا — نہ جانے کیوں میں چاہتے ہوئے بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا جیسے کسی نے میری قوت سلب کر لی ہو — میں سمجھ ہی نہ سکا کہ مجھ پر کس چیز کا اثر ہے — اپنے دہشت اور اپنے عزیز موجی کے واپس آ جانے کا یا چمکتے دمکتے کپڑوں میں ملبوس موجی کو مکمل انسان دیکھنے کا — وہ کچھ لمحے پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر چھلانگ لگا کر مجھ سے لپٹ گیا — اسے اپنے سینے سے لگا کر اور اس کے جسم کو اپنی باہوں میں جکڑ کر مجھے اتنی مسرت اور اتنی خوشی ہوئی کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

دوسرے دن کا اتوار اپنے دامن میں ہمارے لیے لاتعداد مسرتیں لے کر آیا اور ہم نے موجی کی واپسی کی خوشی میں اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا جشن منا ڈالا — ہمارے قہقہے لگاتے اور ہنستے ہوئے چہروں کے درمیان بیٹھ کر موجی ہمیں ان دنوں کے متعلق بتاتا رہا جو وہ ہم سب سے دور گزار آیا تھا — وہ دن جنھوں نے موجی کی زندگی میں نیا موڑ پیدا کیا تھا — گوا کے ایک چھوٹے سے شہر میں اس نے بہت سی کٹھنائیاں جھیل کر اپنی عادت کے مطابق کڑی محنت کی — لیکن وہاں اسے بھوکا پیٹ کبھی نہ سونا پڑا — اسے وہاں وہ سب کچھ مل گیا جو اسے یہاں نہ مل سکا تھا۔ وہ اپنے سیٹھ ڈی میلو کا بہت جلد پیارا بن گیا — اور دن رات کی کڑی محنتوں اور سیٹھ ڈی میلو کی مہربانی کا یہ نتیجہ تھا کہ آج وہ ایک چھوٹی سی بیکری کا مالک تھا — اب اس کے پاس پیسے تھے — سلیقے کے کپڑے تھے — بات کرنے کا سنبھلا سنبھلا اور گمبھیر انداز تھا۔ اس کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر جہاں میرے اور فرحت کے رگ و پے میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں وہیں ہم دونوں کی آنکھوں نے اس کی آنے والی زندگی کے لیے پھر سے وہی خواب دیکھے جو ایک دن مکانک پیٹر کی سرد روی کی وجہ سے پاش پاش ہو گئے تھے — ہم دونوں نے اس کے پاس ہی بیٹھ کر اپنی آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی دیرینہ تمنا کو پورا کرنے کا ایک بار پھر سے فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس کام میں اب کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس لیے میں نے فرحت کے ارادے کو سراہا۔ لیکن اس وقت کی میری اور فرحت کی حالت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا جب ڈرائنگ روم کے مہین پردوں میں اپنی نظریں الجھائے اس نے ہمیں بتایا کہ چار ماہ قبل اس کی شادی ہو گئی ہے۔ میں نے اداس اور خاموش موجی کے دونوں ہاتھ تھام لیے

فرحت نے چٹاچٹ اس کی بہت ساری بلائیں لے ڈالیں اور میں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ وہ اس بات کو اب تک چھپاتا کیوں رہا ہے۔ اپنے اس سوال کا جواب نہ پا کر میں نے اس کے کھوئے کھوئے سے چہرے پر اپنی نظریں جما دیں اور میرے ذہن میں ایک ساتھ کئی سوالیہ نشان ابھر آئے۔ پھر فرحت کے اصرار پر اس نے بتایا کہ وہ اس کے سیٹھ ڈی میلو کی لڑکی ایلی ہے۔ وہ اس پر بے انتہا جان دیتا ہے لیکن ایک ماہ ہوا وہ اس سے ایک معمولی سی بات پر روٹھ کر اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ اس کی کتنی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے وطن ہندستان لائے، اپنی بہن فرحت سے اور مجھ سے، دونوں ایک ساتھ سر جھکا کر ایک خوشگوار آئندہ اور پرسکون زندگی کی دعائیں لیں۔ ایلی کا یہاں نہ آنا اور اس کی ناراضگی کا احساس ہی موجی کی اداسی اور غم کا باعث تھا۔ میں نے اور فرحت نے اسے سمجھایا کہ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ وہ آج نہیں کل مان جائے گی — فرحت نے اس سے ایلی کا پتہ بھی مانگا۔ وہ ایلی کو ایک خط لکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے اپنے بھیا موجی کے متعلق لکھنا چاہتی تھی، موجی کے اس دل کے متعلق لکھنا چاہتی تھی جو پیار سے معمور تھا۔ دوسرے دن میری غیر موجودگی میں موجی ایلی کا پتہ اور اس کی ایک پیاری سی تصویر فرحت کو دے گیا — دلہن بنی مسکراتی ہوئی ایلی کی تصویر دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مکانک پیٹر کی بیٹی سے موجی کا ناطہ نہ جڑ سکا اچھا ہی ہوا — ورنہ موجی کو اتنی معصوم اور اتنی خوب صورت بیوی کہاں ملتی — ان ہی دنوں اچانک ایک صبح مجھے سامان سفر باندھنا پڑا۔ ایک منسٹر سے ایک خصوصی انٹرویو کا پروگرام بن چکا تھا۔ اس کام سے نپٹنے تک دو دن لگ گئے اور جب میں واپس آیا تو مجھے پتہ چلا کہ موجی بالکل پچھلی بار کی طرح چپ چاپ فوراً ہی گوا واپس چلا گیا — مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ بھی آیا اور حالات پر دکھ بھی ہوا۔ اس بار بھی یوں ناراض ہو کر چپ چاپ چلے جانے کی وجہ شاید اس کے گھریلو جھگڑے ہی تھے۔ لیکن اس بار اس کے چلے جانے پر ہم کچھ زیادہ فکرمند نہ تھے۔ موجی اب اس سفر کا آغاز کر چکا تھا جس کے ہم خواہاں تھے۔ ہم نے اس کے خط کا انتظار بھی کیا، ایلی کے پتے پر فرحت نے دو تین خط بھی لکھ ڈالے۔ ہم یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ان دونوں میں کچھ سمجھوتہ ہوا یا نہیں۔ لیکن ادھر سے کوئی خط نہ آیا اور ہم مکمل تاریکی میں رہے۔ ہم نے بھی سوچ لیا کہ میاں بیوی کے ان چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ اب وہ دونوں یقیناً ایک اچھی اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے

رہے ہوں گے۔ پھر وقت اور حالات کے بدلتے زاویوں کے ساتھ ساتھ ہم موجی اور اس کی یاد سے آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے ۔۔۔ کبھی کبھار ہم مل بیٹھتے اور اپنی الجھنوں سے پرے ادھر ادھر کی گفتگو نکل آتی تو ہم موجی کو اور ایلی کو ضرور یاد کر لیا کرتے ۔۔۔ وہ ہمیں یاد نہ کرتے تھے اس کا ہمیں اتنا دکھ بھی نہ تھا ۔۔۔ ازدواجی زندگی کی کشتی اگر خاموش پانیوں میں رواں دواں ہو تو کس کو فرصت ہوتی ہے کہ کنارے کی طرف پلٹ کر دیکھے۔ ہم بھی ان حالات سے گزر چکے تھے اس لیے موجی اور ایلی کی یہ غلطی قابلِ معافی تھی۔ حالات کی ان ہی لہروں پر ہم دو سال تک بہتے رہے ۔۔۔ کوئی اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک بہت اچھا موقع میرے ہاتھ آ گیا۔ گوا کے ہندستان میں شامل ہونے کی پہلی سالگرہ ملک بھر میں زور و شور سے منانے کا انتظام شروع ہوا۔ دوسرے جریدوں کے ساتھ ساتھ ہمارے اخبار نے بھی ایک یادگار نمبر نکالنے کا پروگرام بنا لیا اور مجھے گوا جانے کے احکام ملے تاکہ میں وہاں جا کر مضامین اور انٹرویو کے ذریعے بہت سارا مواد لے آؤں۔ یہ موجی کے ساتھ ہمارے بے لوث رشتے اور خلوص کے بندھن ہی تھے جس کی وجہ سے میں وہاں جانے کے لیے بے چین تھا۔ پھر تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ جاتے وقت فرحت نے موجی کا بہت سارا پسندیدہ حلوہ، ایلی کے لیے تین خوب صورت سی ساریاں متوقع مہمان کے لیے چھوٹے چھوٹے بہت سے خوب صورت کپڑے اور وہ سویٹر اور موزے میرے ساتھ کر دیے جو فرحت نے بڑی محنت اور بڑے پیار سے بنے تھے۔ میں فرحت کی پیار سے لبریز آنکھوں سے محبت کے پیام لے کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا ۔۔۔ سفر بڑا ہی تھکا دینے والا تھا ۔۔۔

میں ایک صبح اس چھوٹے سے شہر میں جا پہنچا جو موجی کا شہر تھا۔ میں اپنے "گوا نمبر" کی کڑیوں کا سلسلہ یہیں سے شروع کرنا چاہتا تھا۔ دن بھر تھکن نے جگہ سے ہلنے کا موقع نہ دیا۔ جب شام آہستہ آہستہ کملانے لگی اور اندھیرا اتر چلا تو میں تیار ہو کر اپنی منزل کی طرف چل پڑا ۔۔۔ اور اس وقت میری سب سے بڑی منزل موجی کا چھوٹا سا مکان تھا۔ خوب صورت دکانوں سے گھری ہوئی صاف ستھری اور بھری پری سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے میں نے دماغ پر زور دے کر پھر سے موجی کا پتہ ٹھکانہ اپنے ذہن میں صاف کیا ۔۔۔ پیراماؤنٹ سنیما کی پشت والی گلی کے اختتام پر ایک چھوٹی سی الائیٹ بیکری تھی جس کا مالک موجی تھا ۔۔۔ اور اس بیکری سے بائیں ہاتھ پر ایک تنگ راستے سے گزرنے کے بعد نئے مکانوں کا ایک سلسلہ تھا اور ان ہی میں ایک جگہ کہیں موجی رہتا تھا ۔۔۔

اندھیرا بہت بڑھ آیا تھا اور سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ میں الائیٹ بیکری کے قریب آ کھڑا ہوا۔ بیکری اور اس کی آس پاس والی دکانوں پر تاریکی کا مکمل راج تھا۔ لگتا تھا غیر معمولی سردی کی وجہ سے لوگ جلد ہی اپنی دکانیں بڑھا گئے ہوں۔ بیکری سے پرے مکانوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میری نظریں جب اندھیرے سے مانوس ہوئیں اور میں نے اپنے آس پاس نظر ڈالی تو دیکھا کہ الائیٹ بیکری کے صحن میں کوئی لپٹا لپٹایا گٹھری بنا بیٹھا ہے ۔۔۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا ۔۔۔ "ارے بھائی کیا تم بتا سکتے ہو کرستان ڈی سوزا کہاں رہتا ہے"

وہ شخص ایسے بیٹھا رہا جیسے اس میں کوئی جان ہی نہ ہو۔ پھر چند لمحوں بعد گٹھری میں حرکت سی ہوئی اور پھر دھیمی سی ایک آواز آئی "آں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں ۔ ۔ " جیسے کوئی بہت دور سے بول رہا ہو ۔۔۔ جب اس نے بیڑی سلگائی تو میں نے اس کے کانوں جھریوں دار اور بیزار بیزار سے چہرے کو دیکھ کر بیکری کی طرف پھیلے ہوئے لاتعداد گھروں کی طرف اشارہ کیا ۔۔۔ "موجی ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے سنتان ڈی سوزا شاید وہیں رہتا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا ۔۔۔ اس نے آہستہ سے کہا ۔۔۔ "وہ وہاں نہیں رہتا۔" پھر ایک لفظ کہے بغیر وہ آگے کی طرف چلنے لگا اور میں نے بھی اس کے پیچھے قدم اٹھائے وہ چپ چاپ آگے آگے چلتا رہا اور میرے دل و دماغ پر ان آنے والے لمحوں کا تصور چھا گیا جب میں موجی، ایلی اور شاید ان کے ننھے کے درمیان رہوں گا ۔۔۔ وہ آگ آج ہمیشہ کے لیے سرد ہو جائے گی جو عرصے سے میرے دل میں موجی کو سکھی دیکھنے کے لیے بھڑک رہی تھی ۔۔۔ ہم بازار کی روشنیوں کو پیچھے چھوڑ کر اندھیرے میں آ چکے تھے۔ میں نے اپنے رہبر سے پوچھا "ابھی اور کتنا چلنا پڑے گا بھائی" ۔۔۔ "تھوڑی دور اور ۔۔۔" اس نے بڑا خشک اور مختصر سا جواب دیا ۔۔۔ یہ بڑا ہی اندھیرا راستہ تھا۔ میں ٹٹولنے کے سے انداز میں قدم اٹھا رہا تھا ۔۔۔ بڑی دیر بعد جب میرا پیش رو ایک جگہ رک گیا تو میں نے انتہائی مہیب اندھیارے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نظریں دوڑائیں ۔۔۔ دور دور تک گھنے اور بڑے بڑے درختوں کا سلسلہ محسوس ہوتا تھا اور ہوا کی آواز سے شور مچاتے پتے بڑا عجیب سماں پیدا کر رہے تھے ۔۔۔ کہیں کوئی دیا بھی نہ ٹمٹاتا تھا کہ کسی جھونپڑے کا گمان ہو۔ میں نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر اپنے رہبر کا کندھا ہلایا ۔۔۔ "ارے بھائی کہاں لے

آئے ہو؟ کیا تم ہوش میں ہو؟" اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ آہستہ سے اپنی ماچس سے ایک تیلی سلگائی اور میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ ہم ایک قبر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے ـــــ تیلی کے بجھنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس کی آواز سنائی دی ـــــ " اب یہی اس کی پناہ گاہ ہے"ـــــ پھر نہ جانے کب وہ وہاں سے چلا گیا اور میں کب تک اس تاریکی میں ڈرے ہوئے قبرستان میں سنتان ڈی سوزا کی قبر پر لگے صلیب کو تھامے بیٹھا رہا ـــــ اور بیوفا موجی سے شکایت کرتا رہا کہ اس نے کیوں ہمیں چھوڑ دیا ـــــ اپنی بہن کے پیار اور تسنیم اور صبوحی کی محبت کا بھی اس نے کوئی خیال نہ کیا ـــــ واپس لوٹ کر میں ہوٹل کے کمرے میں رات بھر بے تحاشہ تڑپتا رہا۔ میرے دل سے امڈتا دکھ اور درد کا ایک طوفان تھا جسے میں دبا نہیں پا رہا تھا ـــــ جی چاہتا کہ چلا چلا کر رو پڑوں۔

دوسرے دن رات بھر جاگنے سے میرا سر بھاری اور طبیعت خراب رہی ـــــ میں اپنے ہوٹل سے بہت دیر میں نکلا اور سیدھے الائیٹ بیکری جا پہنچا۔ بیکری آج بھی بند تھی۔ میں نے آس پاس والوں سے حالات جاننا چاہے تو سوائے اس کے اور کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ بیکری عرصے سے بند ہے۔ موجی مرنے سے پہلے بڑی تکلیف دہ زندگی بسر کرتا رہا اور دو مہینوں سے بیکری کے اس صحن میں اس مدقوق اور بیمار ساتھی کے ساتھ پڑا رہتا تھا جو میرا رہبر بنا تھا ـــــ میں نے الجھے الجھے حالات کو سمجھنے کی کوشش کی ـــــ میں نے سوچا شاید ایسا ہوا ہو گا کہ ہماری طرف سے واپس آنے کے بعد موجی کا اپنی بیوی ایلی سے سمجھوتہ نہ ہو سکا ہو گا اور موجی کی بربادی اور موت کی اس سے بڑھ کر وجہ اور کیا ہو سکتی تھی ـــــ میں نے سوچ لیا کہ میں آج ہی اور اسی وقت ایلی سے ملوں گا ـــــ یہ دیکھنے کے لیے نہیں کہ وہ کتنی خوب صورت ہے ـــــ اور اب کیا کرتی ہے بلکہ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس نے ہم سے ہمارا عزیز دوست ـــــ ہمارا سکھ اور چین چھین لیا ہے ـــــ فرحت سے اس کا بھیا اور میرے بچوں صبوحی اور تسنیم سے ان کا 'موجی ماموں' چھین لیا ہے اور اس کی تمام تر ذمے داری اسی پر ہے ـــــ میں نے ڈائری سے ایلی کا وہ پتہ نکال لیا جو موجی نے ایک بار ہمیں دیا تھا۔ اور جب میں اس پتے پر ایلی سے ملنے پہنچا تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میں ایک بڑے سے چمکتے دمکتے اسٹور کے سامنے کھڑا تھا۔ دکان کی اوپری منزل پر نظریں ڈالتے ہوئے میں نے سوچا ـــــ شاید وہ وہاں رہتی ہو۔ میں اسٹور کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا کاؤنٹر تک جا پہنچا ـــــ

"میں ایلی سنتان ڈی سوزا سے ملنا چاہتا ہوں ـــــ" میں نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی سے کہا ـــــ اس نے چند لمحے میری صورت کی طرف دیکھ کر پوچھا ـــــ

"کیا آپ اورنگ آباد سے آئے ہیں؟"

"ہاں ـــــ لیکن آپ کس طرح؟ آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"وہ دیوانہ پہلے میری ہی اس دکان پر چھوٹے موٹے کام کرتا تھا ـــــ ان دنوں وہ اکثر کچھ ایسے لوگوں کا تذکرہ کیا کرتا تھا جو اسے بے حد چاہتے تھے ـــــ اور شاید آپ . ؟"

"ہاں ـــــ ٹھیک ہی سمجھے آپ ـــــ لیکن وہ مرا کیسے؟ اس کی یہ بے وقت موت . . . ؟"

"میرے ہاں سے جانے کے بعد اس نے الائیٹ بیکری میں ملازمت کر لی ـــــ پھر بیکری بند ہو گئی ـــــ نہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکتا پھرا ـــــ کتنی پریشانی اور تکلیفیں اٹھا کر وہ مر گیا ـــــ"

"لیکن ایلی ـــــ اس کی بیوی ـــــ" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا ـــــ

"کیسی بیوی ـــــ؟" اور اپنے اندر کہیں سے وہ خط نکالے جو فرحت نے ایلی کے نام لکھے تھے ـــــ

"میں کسی ایسی لڑکی کو نہیں جانتا جس کا نام ایلی ہے ـــــ"

"تو پھر کیا یہ ـــــ؟" میں نے اپنی ڈائری سے وہ تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی جو موجی ہمیں دے گیا تھا ـــــ

"یہ ـــــ یہ تو یہاں کی ایک مشہور اسٹیج ڈانسر ورلی کی تصویر ہے ـــــ"

دکان دار نے تصویر پر نظر دوڑاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا ـــــ اور دوسرے ہی لمحے اس نے شوکیس سے ہو بہو ویسی ہی چھوٹی بڑی کئی تصویریں نکال کر کاؤنٹر پر میرے سامنے بکھیر دیں ـــــ اور میں چپ چاپ اسٹور سے نیچے اتر آیا ـــــ



جے جوان، جے کسان

(آں جہانی شری لال بہادر شاستری کا ایک نعرہ)

سلیمان آصف

جے جوان، جے کسان
جے جوان، جے کسان

تم سے ہے وطن کی آن
تم سے ہے وطن کی شان
تم ہو عزیزِ وطن
اے وطن کے پاسبان
جے جوان، جے کسان

تم ہو صبحِ زر نگار
تم ہو شامِ خوش گوار
ختم تمہارے پاؤں پر
انقلابِ روزگار
جے جوان، جے کسان

تم فلک جناب ہو
وقت کا شباب ہو
قالبِ حیات میں
روحِ انقلاب ہو
جے جوان، جے کسان

مرکزِ نگاہ تم
اصلِ عز و جاہ تم
نازشِ مصافِ دہر
فخرِ کارگاہ تم
جے جوان، جے کسان

خوں تمہارا گرم ہے
دل تمہارا نرم ہے
دیش کی سہایتا
سورما کا دھرم ہے
جے جوان، جے کسان

صلح کیش صلح جو
نیک نفس، نیک خو
تم وطن کے پاسباں
تم وطن کی آبرو
جے جوان، جے کسان

تم کو ہے خودی عزیز
روحِ زندگی عزیز
ہر وفا شعار کو
ہے جفاکشی عزیز
جے جوان، جے کسان

رہبرِ زماں ہو تم
میرِ کارواں ہو تم
جذبۂ خلوص کا
بحرِ بے کراں ہو تم
جے جوان، جے کسان

گرم جوش بھی ہو تم
سخت کوش بھی ہو تم
دل نواز ہی نہیں
سرفروش بھی ہو تم
جے جوان، جے کسان

پرچمِ وفا لیے
قسمتِ رسا لیے
راہِ زیست میں بڑھو
فکرِ ارتقا لیے
جے جوان، جے کسان

اُردو مرثیوں میں
ہندوستان کی تہذیب و معاشرت

فردوس فاطمہ

علم الادب [illegible] تخصیص واضح ہو جاتی ہے کہ ان قوموں کا دوسری قوموں سے [illegible] ربط اور تعلق نہیں قائم ہونے پایا اور ان کی شاعری [illegible] تہذیب [illegible] نمایاں ہوتے۔ دعوتِ اسلام سے قبل [illegible] دوسرے ملکوں سے تجارتی [illegible] روابط قائم ہو جانے سے [illegible] دوسری قوموں سے [illegible] تعلقات رہتے تھے۔ [illegible] قوم یہی حال ہندوستان والوں کا [illegible] عربی اور [illegible] شاعری دوسرے ملکوں کی تہذیب [illegible] ہو سکی تھی۔ عربی شاعری کا [illegible] کے زمانے تک [illegible] لیکن [illegible] تعلقات بڑھنے کے [illegible]۔ دوسری طرف فارسی شاعری [illegible] اور دوسری بیرونی زبانوں کا [illegible] تلمیحات، امثال و محاورات اس کثرت سے [illegible] ایک [illegible] بن جائے۔

اردو شاعری کا [illegible] دور حکومت میں ہوا اس میں کوئی شبہ نہیں [illegible] کا بہت بڑا ماخذ ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ عرب و عجم کی تہذیب و تمدن [illegible] تلمیحات داستانوں اور دیگر روایات کی چھاپ اردو [illegible] کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز [illegible] ہندوستان کو [illegible] سے مقدم رکھا۔ [illegible] رسم و رواج، تہذیب و معاشرت [illegible] ہندوستانی ماحول

ہندوستانی طرزِ معاشرت اور ہندوستانی رسم و رواج اس پر اس حد تک اثر انداز ہوئے کہ اردو مرثیے (جس سے خاص طور سے وہ صنفِ سخن مراد ہے جس میں حضرت امام حسن و امام حسین علیہم السلام کی شہادت کا ذکر کیا جاتا ہے اور جو مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات پر مشتمل ہے) پر ہندوستانی ماحول، طرزِ معاشرت، اور رسم و رواج کی چھاپ دکھائی پڑنے لگی۔ ان مرثیوں کو (بالخصوص قدیم مرثیوں کو) دیکھیے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اُردو مرثیہ نگاروں نے چاہے وہ شمال کے ہوں یا جنوب کے، جنگِ کربلا کے عرب نژاد مظلومین کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ طرزِ معاشرت، رسوم و آداب، وضع قطع، رفتار و گفتار سب ہندوستانی ہیں۔

اُردو مرثیوں کے قدیم ترین نمونے دکن میں ملتے ہیں۔ بہمنی حکومت کے زوال کے بعد گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومتوں نے علوم و فنون کی بڑی سرپرستی کی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان کی اس ادب نوازی کی بدولت دکن میں اور اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ مرثیہ گوئی کو بھی بڑا فروغ ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کے علاوہ وجہی، غواصی، لطیف، فضل، عبداللہ قطب شاہ، شاہی، کاظم، مرزا، علی عادل شاہ، ہاشم علی، اصغر، سیدن، غلامی، غمگین، فتح اللہ اور ندیم وغیرہ نے اس صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی اور ان کے مرثیے ہم کو دستیاب ہیں۔ یہ مرثیے بالعموم محرّم کی مجلسوں میں پڑھنے اور لوگوں کے دلوں پر رقت طاری کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ مگر جذبات و خیالات کے اظہار اور واقعہ نگاری میں

جا بجا ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ افرادِ مرثیہ کی سیرت پیش کرنے میں ہندوستانی ماحول اور فطرت کا بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ماں، باپ، بیٹی، بیٹا، بہن، بھائی، بیوی، بہو، ساس سسر اور مختلف اعزّہ و اقارب کے جذبات کی جب ترجمانی کی جاتی ہے یا جب شادی بیاہ اور رخصتی کا بیان آجاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کردار اور ماحول خالص ہندوستانی ہیں۔ یہی غالباً ایک وجہ ہے کہ مرثیہ سننے والے اور پڑھنے والے، سب پر اشخاصِ مرثیہ کے ساتھ خاص ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

دکنی مرثیہ نگاروں نے اپنے بہت سے مرثیوں میں واقعاتِ کربلا کے بیان میں کربلا میں حضرتِ قاسم کی شادی کے موضوع کو بھی شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ شادی کا جب ذکر آتا ہے تو ہندوستان کی ملکی اور مقامی رنگ کو ملحوظ رکھ کر تمام رسموں کی ادائگی دکھائی جاتی ہے۔

کاظم عہدِ قطب شاہی کا ایک مشہور مرثیہ گو ہے جس کے مرثیے خاص طور پر اس لیے قابلِ لحاظ ہیں کہ ان میں مرثیت کے عنصر میں مقامی رنگ بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ "رسمِ دامادی" اور "سہرا باندھنے" کے متعلق وہ اپنے ایک مرثیے میں لکھتا ہے:۔

اے ظالمانِ دل خراب، اے گم رہانِ ناصواب — اس طرح با قہر و عذاب شاہاں پہ تا کب روا
یہ رسمِ دامادی کہاں، یہ صورتِ شادی کہاں — سہرا بندھا کفنی گلے، جلوہ دلانا کب روا

پنڈت شادی کے لیے لگن کی تاریخ جنم پتری کو دیکھ کر مقرر کرتا ہے۔ نیک ساعت میں رسموں کو ادا کیا جاتا ہے۔ اسلام یا عرب میں اس کا سوال نہیں پیدا ہو سکتا۔ لیکن عہدِ قطب شاہی کے ایک اور مرثیہ گو، صغر نے اپنے ایک مرثیے میں حضرت قاسم کی دولھن کی زبان سے لگن کی تاریخ کو منحوس قرار دیا ہے اور "نجومی" کو اس کا ذمے دار ٹھہرایا ہے۔ صغر کہتے ہیں:۔

جب چلے لڑنے کو قاسم تب کہے رو رو دولھن
اے نجومی! سانچ کہہ کس وقت برا کی لگن

قادر دکن کا ایک اور مشہور مرثیہ گو گزرا ہے۔ اس کو انسانی جذبات کی ترجمانی پر بڑا عبور حاصل تھا۔ اس نے ایک مقام پر "منڈپ" کے متعلق لکھا ہے:۔

تارے سب یہ قدساں نے ملا کر سب گگن اوپر
حسین کے عرس کوں باندے منڈپ موتیاں کی جالی کا

سیدن مرثیہ گو نے بھی اپنے ایک مرثیے میں کربلا میں شادی کی تقریب کو باندھا ہے۔ تسلسلِ بیان اور منتخب کرنے مرثیے میں بڑی روانی پیدا کر دی ہے۔ شادی کے موقعے پر مالی کے سہرا لانے، کنگنا باندھنے، اوبٹنا لگانے وغیرہ کی رسم کو اس طرح باندھا گیا ہے۔۔

ماہِ محرم میں دیکھو چندا ہو مالی آیا
تارے گگن کے گوندکر سہرا جو شہ کوں لایا
کنگنا ستم کا باندکر دو دکھ کو روبٹنا تن کوں لا
حسرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سیں تن نہلایا

برات اور براتیں، شادیانے، نفیریاں، دولہا کا مقنع، منڈپ یہ سب خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔ مگر انھیں کس طرح پیش کیا ہے ؎

دولھا حسینا چڑھ ترنگ سر ڈال مکھنا نور کا
سارے براتی سات لے دلھن کوں بھیانے دھایا

باجے بجا دیں مین کے غم کی نفریاں کا ہو غل
ملعون لشکر ل سبھی منڈپ تیروں کا چھایا

مقنعے کے مضمون کو غمگین نے یوں باندھا ہے۔۔

آج نکلا پھر لگن پر غم سوں خم ہو یوں ہلال
کربلا کے حادثے میں ہیں نبی کے پاک آل

تھا حسن کے باغِ جاں کا شاہ قاسم نونہال
تخت جلوہ کے لگن میں جیو جیو مکھنا کہو یہ ڈال

غلامی نے بھی لگن کے مضمون پر ان اشعار میں طبع آزمائی کی ہے:۔

آج بے سر بدن تیرا قاسم — تن میں غلط ہے تن تیرا قاسم
لہو بھرا پیرہن تیرا قاسم — حیف ہے یو کفن تیرا قاسم

شمالی ہندوستان میں میر و سودا کا زمانہ اردو شاعری کا زریں دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس زمانے کے مرثیہ گویوں میں میر، سودا، حزیں، مسکین، غمگین، محمد تقی، علی قلی ندیم، گدا، عاجز، محب، محزوں، جعفر علی حسرت اور سکندر وغیرہ مشہور ہیں۔ ان تمام شعرا نے اپنے مرثیوں میں ہندوستانی ماحول کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔ حضرت قاسم کی شادی ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ میر و سودا نے بھی اس موضوع پر بہت سے مرثیے لکھے۔ میر نے اپنے مرثیوں میں اس شادی کی مختلف تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کا مرثیہ "قاسم کی شادی اس دن رچائی" اسی مضمون پر مشتمل ہے اور اس میں

شادی کے مختلف رسوم مثلاً لگن دھرنا، برات، آتش بازی، سہرا، نیگ اور شگون کی بڑی اچھی مرقع کشی کی گئی ہے ؎

قاسم کی شادی اُس دن رچائی جس دن کہ شہ سے کچھ بن نہ آئی
دلھن سکینہ نے ایسی بنائی وہ بزم جس نے ساری رلائی
دلھن جلتے تھی جوں شمع مجلس ایسی لگن تھی یہ کب بھرائی

دل کے الم سے رُخ زرد جوں زر آنسو کا سہرا چہرے کے اوپر

سہرے کی بندھائی طلب کرنا، نیگ دینا اور لینا بھی ہندوستان ہی کی تہذیب و معاشرت کا جز ہیں۔ اس کے متعلق میر لکھتے ہیں ؎

نیگ کی جس کو رسم تھی اس سے کہتی تھی وہ رو رو کر
رہیں کتنی باقی تیج یہاں سے چلا غمگیں ہو کر
جاتے ہی آنکھیں مند گئیں تب کیا نہ اُٹھا تھا تو سو کر
اک نگاہ حسرت ہی کیا سہرے کی میرے بندھائی ہوئی

ہندوستان میں کسی شادی کے موقعے پر کوئی ناخوش گوار حادثہ پیش آجانے کو منحوس ساعت کے اثرات سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جناں چہ عین شادی ہوتے ہی حضرت قاسم کا شہید ہو جانا منحوس گھڑی کا نتیجہ سمجھا گیا ہے

کس گھڑی بیاہ اٹھایا تھا کہ دولھا دلھن
درد سے دل کے ہم کرنے نہ پائے وہ بات
ایک سجے تھی نوشہ قاسم کیا بیاہ رچایا تھا
کیا ساعت تھی نحس وہ جس میں بیاہنے کو تو آیا تھا

سودا نے بھی اپنے مرثیوں میں جا بجا شادی کی قلمی تصویریں پیش کی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں شادی بیاہ کی تقریبات ... انھیں ہندوؤں کے ساتھ میل جول اور ربط و ضبط کی ... ان میں سے بیش تر کو سودا نے حضرت قاسم کی شادی کے بیان کے موقع پر شامل کر لیا ہے۔ جناں چہ انھوں نے اپنے مرثیوں میں مائیوں بیٹھنے، لگن لگنے، منڈھے تلے بیٹھ کر نہلانے گانے، تیل چڑھانے، دولھا دلھن کے سسرال سے خاص مانگ کے جوڑے بھیجنے، جہیز دینے، پان اور کچے سوت کے لانے، دولھا کے ہاتھوں میں کنگنے کے باندھنے، منھ دکھلائی دینے، ہاتھوں میں مہندی رچانے، سہاگن کے سنگار میں نتھ پہننے، ماتھے پہ بندیا لگانے، ہونٹوں پر پان کی لالی سے مسی ملی صاف کرنے، مہمانوں کی ضیافت میں رس بھوگ پیش کرنے، مالن کے ہار لانے، دروازے پر بندھن وار باندھنے، نیگ لینے یا دینے، بدھاوا گانے، برات میں مٹکیوں کو لے جانے، بدھائی دینے، سمدھنوں کو ہاروں اور پان سے خاطر مدارات کرنے، جشن بارات میں آتش بازی کے چھوٹنے اور منھ دکھلائی کی رسم ادا کرنے کو نہایت موزوں اور مناسب ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ برات میں آتش بازی چھوٹنے کے مضمون کو یوں باندھا ہے :۔

کروں کیا ذکر آتش بازی کا میں انار آسا اگن سے دل بھرے ہیں
اُٹھایا بیاہ ایسا آسماں میں رہی ہر چھوٹ ہر منھ پر ہوائی

لگن اور مائیوں بیٹھنے کو اس طرح بیان کیا ہے :

سنجوگ پہ کچھ باندھا ہی دولھا سو دلھن کا جو تار کفن کا ہی سو ڈورا ہے لگن کا

کوئی دو دلھن جھپٹ اس دولھن کے قضا نے لا کر لگن کی رات
مائیوں بدلے دولھا کے ماتم میں لا بٹھلائی

کنگنے کے مضمون کو یوں باندھا ہے :

دھری تھی بیاہ کی خون سے لگن بھر کٹی کنگنے کے بندھتے ہی کلائی

باندھا کنگنا ترے سکھ کرنے کو ہاتھ کیا میں جانتی تھی ہو یوں بچھڑے گا ساتھ

دان دہیز، پان کچے سوت اور منھ دکھلائی کا ذکر حسب ذیل ڈھنگ سے کیا ہے :

دان دہیز آ کے جو پوچھو ملا نہیں پان کچا سوت
سر دولھا کا تس پہ دھنگانا جیورا مکھ دکھلائی ہے

جشن برات میں سجی ہوئی مٹکیوں پر کلاوا باندھ کر اور کھانچیوں میں مٹھائیاں لے جانے کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

کسی ساچق کا دیکھا ہے یہ آئین کہ غم کے سر کٹا کر مٹکیاں کیں
بنائیں کھانچیاں نیزوں پہ دھرلیں چلے دلھن کے گھر یوں لے مٹھائی

کاٹا ہوا وہ سر تھا جو ساچق کا جتا دا
گردن کا خط زخم تھا مٹکے کا کلاوا

رسول اور اہل بیت رسول کے یہاں شادی کے موقع پر راگ رنگ اور باجے گاجے کا یوں بھی کوئی تصور نہیں ہو سکتا اور پھر کربلا کے المیے کے موقع

پر جب کہ امامؑ اور ان کے اعزّہ اور انصار ایک ایک کر کے شہید ہو رہے ہوں اس کا اور بھی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن مرثیہ گو اس المیہ کو مقامی رنگ دے کر اس میں حزن اور تاثر پیدا کرنے کی فکر میں یہاں تک آگے گئے کہ جناب قاسم کی شادی کو بھی ہندوستانی شادی بنا دیا جس میں نہ صرف ہمارے ملک کی شادیوں کے دیگر لوازمات کو جگہ دی گئی بلکہ باجے گاجے تک لے آئے گئے۔ ملاحظہ ہو:

یہ عجیب بیاہ ہے جس میں نہ کہیں رنگ نہ راگ
ورنہ ہر شادی میں سب گاتے ہیں دولھن کے سہاگ

کہیں یوں بیاہ میں گاوے بدھائے ۔۔۔ کہ ہر اک نوحہ گر نوحے کو آوے

وہ باہم سمدھیانے کو بٹھاوے ۔۔۔ الم ہر اک سے لیوے بدھائی
کوئی کوٹے ہے سینہ کوئی سر کو ۔۔۔ جو نوبت ہے تو یہ نوبت دھرائی

صدا ہر نوحہ گر کے واں بدھاوے اور شہانے تھے
یہ نوبت اور نوبتوں کو شور و غل مچانے تھے

تیل چڑھانے۔ نچھاور دینے۔ ہار اور سہرے گوندھنے۔ بندھن واربا ندھنے۔ منڈھے چھانے اور ضیافت شادی میں رس بھوگ پیش کرنے کو یوں بیان کیا ہے:

یہ شادی دیکھی نہیں کہتے ہوں گے لوگ ۔۔۔ غم دل پہ خلائق کے عوض منڈھے کا چھایا
جس شادی کی رسم میں لوہو رس بھوگ ۔۔۔ سر شہ کا جگہ تیل کے نیزے پہ چڑھایا

یہ بندھن وار شادی کی بندھی دولھا دولھن کے گھر
قبیلہ کٹ گیا زنجیر میں دونوں کا سر تا سر
منڈھا یہ تھا کہ غم چھایا گیا آفاق کے دل پر
چڑھایا تیل دولھا کو لہو سر تا قدم مل کر

غبار اور گرد اس راہ کا نچھاور شاہ کا سر تھا
نہ تھا کچھ بیاہ وہ آفاق میں ایک فتنہ برپا تھا

لا کے مالنیاں رن کی چمن سے پھلوار
گوندھو نوشہ کے لئے آج گل زخم کے ہار
تار گیسو کا کرو سہرے کے لوہو دھار
گاڑ دو دانے پہ تم باندھ کے یہ بندھن وار

منڈھے کا چھانا کب ہو میسّر ۔۔۔ نہیں چادر کسی سمدھن کے سر پر

شادی کے موقع پر کچھ رسمیں ادا کرنے کے بعد نیگ لینے یا دینے کی رسم کا رواج بھی ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہندو مسلمان دونوں ہی کے یہاں رائج ہے۔ اس کے متعلق سودا لکھتے ہیں:

کہیں دیکھا کہ دولھا کی قضا نے ۔۔۔ لیا ہو نیگ سر سہرا بندھائی کا

گھر گھیرے ٹھاڑے سبھی نیگی مانگیں نیگ
دیو پوت کا سیس اب دولھا کی نیگ

دولھن کے قدموں کو مبارک یا منحوس تصور کرنا یا شادی ہوتے ہی شوہر کے مرنے کو بیوی کی نحوست سے تعبیر کرنا بھی عین ہندوستانی وہم ہے۔ خاندان کے لوگ ایسی بدبخت لڑکی کو جو شادی ہوتے ہی بیوہ ہو گئی ہو طعنہ دیتے ہیں اور اس کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اس خیال کی ترجمانی بھی سودا نے کیا ہے:

کوئی تو کہے گا ہے عجیب بھاگ کی دولھن ۔۔۔ بیوہ یہ کہانے لگی ہوتے ہی سہاگن

اب لوگ کٹم کے یہی کہتے ہوں گے باہم ۔۔۔ اس دولھا کو پیرانہ ہوا نیگ دولھن کا

اس تویلی کے غرض ہم نے عجیب دیکھے بھاگ ۔۔۔ نوحہ کرتی ہیں منڈھے تلے بیٹھیں عورات

چھیدے ہیں کلیجے کو مرے خلق کی باتیں
سن سن کے گذرتی ہیں مجھے بیٹھی راتیں
اور خلق سمجھتی نہیں یہ دہر کی گھاتیں
کیا فکر کروں ان کی زباں اور دہن کا

بیٹی کا جلاپا جو ہے کیونکر میں بتاؤں — بن سر تن داماد میں کس کس کو دکھاؤں

آنکھیں کہو کس طرح میں سمدھن سے ملاؤں — اس شادی میں چھپ نور گیا اس کے نین کا

منہ دیکھنا بیٹی کا مری اس کو ہوا ننگ — اس بیاہ میں اب زندگی اپنی سے وہ ہے تنگ

دل میں سمدھن کیا نہ کہتی ہوئے گی — لال سا بیٹا جو اپنا کھوئے گی
بدشگوں کہہ کہہ بہو کو روئے گی — کس طرح کی ہے یہ خواری یا رسول

ہندوستان میں رنگین لباس۔ چوڑیاں۔ نتھ۔ بندیا۔ اور مانگ بھرنا عورت کے سہاگ کے لوازم میں داخل ہے۔ بیوہ ہو جانے پر وہ ان تمام چیزوں کو ترک کر دیتی ہے۔ چوڑیاں توڑ ڈالتی ہے، نتھ اتار دیتی ہے اور مہندی نہیں لگاتی۔ رنگین کپڑے نہیں پہنتی بلکہ سفید یا ملگجے کپڑے پہن لیتی ہے۔ حضرت قاسم کی دلھن شادی ہوتے ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔ سودا نے اس کے رنڈاپے کا جو سراپا کھینچا ہے وہ دیکھئے کس درجہ خالص ہندوستانی سماج سے متاثر ہے:

دلھن کو شبِ عقد جو ہیں مل کے سنوارا — بولا یہ رنڈاپا کہ خدا سے نہیں چارا
جس کے لئے سب کچھ تھا گیا رن میں وہ مارا — کیا فائدہ اب اس کے سنگار اور بدن کا

نتھ کو تو اتار اس سے کرو میرے حوالے — اور خاک کہو اس کو سر اپنے میں یہ ڈالے

دلھن کو بدل جوڑے کے رنڈسالہ پنہایا — ہے خلعت نوشہ کے لئے فکر کفن کا

شادی کے موقع پر دلھن کو سہانی چوڑیاں پہنانے کا رواج بھی ہندوستانی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ سودا نے قاسم کی دلھن کو بھی ہرے ہرے بنگڑے پہنوا دئیے ہیں جن کو وہ شوہر کی موت کی خبر پاتے ہی توڑ دیتی ہیں ؎

بنگڑے توڑ کے دلھن نے پیٹ کر اپنا مونہہ اور سر
نوشہ کے لہو سے اپنے مہندی بھرا ہاتھ لگائی ہے

سودا نے مذکورہ بالا ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی خصوصیات ہی کو اپنے مرثیوں میں شامل کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ بعض موقعوں پر تو افرادِ مرثیہ کو اس درجہ ہندوستانی رنگ میں پیش کیا ہے۔

منتر کا پڑھنا بھی ہندوستانی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس کو بھی سودا نے مرثیوں میں شامل کر لیا ہے۔

منتر پڑھے بہت کئی کبھو نہ دیکھو سکھ
بھرتے آئے ہیں ہمیں جنم جنم کو دکھ

ہندوستان میں کھیرے ککڑی تربوز بہ کثرت پیدا ہوتے ہیں۔ ان چیزوں سے سودا نے اپنے مرثیوں میں تشبیہات پیدا کی ہیں مثالیں ملاحظہ ہوں:

کاٹے اب اس کے اعضا جیسے کہ ککڑی کھیرا
جو بر فلک کبھو بھی اس سے ٹلا کہو تو

فالیز سے زیادہ ہر سمت سر پڑے ہیں
اس طرح کھیت کس کا پھولا پھلا کہو تو

ہندی شاعری میں پپیہے اور کوئل کی اہمیت بہت زیادہ ہے سودا نے اپنے مرثیوں کے بعض اشعار میں نہ صرف انھیں داخل کر لیا ہے، بلکہ بعض ہندوستانی مہینوں، مثلاً ساون، بھادوں، اساڑھ اور جیٹھ تک کا ذکر کر کے ہندوستانی ماحول کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر دی ہے:

پپیہا منھ میں لا کر داں کہیں سے بوند پانی کی
اڑے ہے آ کے ہر اک نعش پہ کہتا ہوا پی پی

نظر کر کو کلا کوکے تھی اس ساون کی اندھیاری
بھرے ہیں جل تھل اور پانی جہاں دیکھو وہاں جاری

کہا اساڑھ نے یوں جیٹھ کے مہینے سے — طپش یہ پوچھ نبی کے سر اور سینے سے

شہنشاہ مرثیہ گویاں میر انیس کا اصلی جوہر جذبات نگاری میں کھلتا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی اور مدارج کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسانی جذبات کی ترجمانی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ کلام میں تاثیر و دل نشینی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس میں ہم کو اپنا عکس نظر آئے۔ میر انیس ایک دقیقہ رس مصور کی طرح اس نکتہ سے بخوبی واقف تھے غالباً اسی وجہ سے انھوں نے جذبات

نگاری میں مقامی رنگ کو شامل کرکے اپنے کلام کو حد درجہ موثر بنا دیا ہے۔ میر انیس کے مرثیوں میں بھی حضرت قاسم کی شادی کا بیان ملتا ہے۔ اس شادی کی مرقع کشی میں اُنھوں نے بہت سے پہلو نکالے ہیں اور اس میں ہندُستانی رسم و رواج مثلاً لگن دھرنا، نیگ دینا یا لینا اور برات کی دھوم دھام وغیرہ کے ذکر نے تعیت کا رنگ بھر دیا ہے —— دیکھیے حضرت قاسم کی دلھن ٹھیٹ ہندستانی دلھن معلوم ہوتی ہے۔ ماتھے پہ صندل، مانگ میں افشاں، ہونٹوں پہ پان کی لالی، ہاتھوں میں مہندی، کلائیوں میں شہانی چوڑیاں، ناک میں نتھ، سر کو شرم سے زانو پر جھکائے اور چہرے کو گھونگھٹ میں چھپائے ہوئے بیٹھی نظر آتی ہے۔ دولھا بھی ہندستان کے تمدن و معاشرت کا مجسمہ بنا، منھ پہ مقنع ڈالے، پیشانی پہ سہرے کی لڑیاں لٹکتی ہوئیں، بیاہ کا مخصوص لباس زیب تن کیے اور ہاتھ میں کنگنا پہنے ہوئے نظر آتا ہے۔

لیکن مسرت و شادمانی کا مرقع رنج و الم میں بدل جاتا ہے جب حضرت قاسمؑ شوق شہادت میں امام حسینؑ اور اہل حرم سے جب میدان کربلا میں جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں تو دلھن کے دل کی دھڑکن میں ہمیں ہندستان کی تہذیب و معاشرت کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ دفعتاً دلھن کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ماتھے کا صندل چھوٹ گیا اس کو اپنی پوشاک میں رنڈسالہ کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ کنگنا رسن معلوم ہونے لگتا ہے، مانگ سے افشاں گر گئی، سہرے کے پھول منتشر ہو گئے، پان کی لالی غائب ہو جاتی ہے اور مہندی لگے ہاتھوں کو مَل مَل کے دل کھونے لگتی ہے۔ یہ ہندوستانی سماج کی پروردہ دلھن نہیں تو اور کیا ہے۔ انیس نے اس کا سراپا اس طرح کھینچا ہے:

تصویر بنی غم کی دلھن بن کے سراپا — پیشانی کا صندل بھی ہوا خاک کا چھاپا

پوشاک سے پیدا تھا کہ رنڈسالہ ہے تن میں — کنگنے سے یہ ثابت تھا کلائی ہے رسن میں

خود ہو گئے سب گندھے ہوئے بال پریشاں — ماتھے سے ستاروں کی طرح گر گئی افشاں

غم تھا کہ کوئی دم میں یہ مسند ہوئی خالی — اب سر پہ رنڈاپے کی بلا چرخ نے ڈالی
کچھ منھ سے نہ کہہ سکتی تھی وہ نازکی پالی — یہ ہونٹھ چبائے کہ اڑی پان کی لالی

آ پڑتے تھے اشک آنکھوں سے رخساروں پہ ڈھل کر
نہ جاتی تھی وہ مہندی لگے ہاتھوں کو مل کر

زانو پہ جھکا جاتا تھا سر شرم کے مارے — سینے سے نکل جاتے تھے آہوں کے شرارے

پھر جب خود حضرت قاسمؑ دلھن سے شہید ہونے کے لیے میدان جنگ میں جانے کی اجازت چاہتے ہیں تو وہ بادل ناخواستہ ان کو اجازت تو دیتی ہے لیکن اپنی بے بسی کا اظہار حسب ذیل طریقہ سے کرتی ہے اور شادی کے راس نہ آنے کو اپنی بدبختی پہ محمول کرتی ہے

سمجھی میں یہ بس مجھ کو نہ سمجھائیے صاحب — کیا نذر مرا خیر چلے جائیے صاحب

ہے آپ کو منظور مرا رانڈ بنانا — راس آیا نہ صاحب کو مجھے بیاہ کے لانا

حضرت قاسم کے میدان جنگ میں جانے کے بعد خیمہ میں ان کے متعلق بڑی تشویش ناک خبریں آ رہی ہیں۔ اہل حرم حواس باختہ ہیں۔ دلھن جو گھونگھٹ کیے زانو پہ سر جھکائے بیٹھی ہے وہ بھی حد سے زیادہ پریشان ہے۔ اس کا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا ہے۔ اس کو یہ خیال بھی ستا رہا ہے کہ اگر اس کا سہاگ اُجڑ گیا تو اس کو لوگ کیا کہیں گے۔ ان کے طعنے اس کے دل پر نشتر زن ہوں گے۔ اس کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ خود شوہر سے پیشتر مر جائے:

یا ربّ دلھن بنے مجھے گزری ہے ایک شب — دولھا جو مر گیا تو مجھے کیا کہیں گے سب
اب تک تو شرم سے نہ ہلائے تھے میں نے لب — پر کیا کروں کہ آ بنی مری روح پر تعب
شبیرؑ کے آفتاب کا وقت غروب ہے
دولھا سے پہلے مجھ کو اُٹھا لے تو خوب ہے

ہندوستانی معاشرت میں شوہر کی زندگی ہی میں بیوی کے مر جانے کو اس کی عین خوش قسمتی اور ایسی موت کو قابل رشک سمجھا جاتا ہے۔ یہی خیال اس بند میں پیش کیا گیا ہے۔

سہرے کے پھول بھی ابھی سوکھے نہیں ہیں آہ — جو آ گیا پیام رنڈاپے کا یا الٰہ
یہ عقد تھا کہ موت تھی ماتم تھا یہ کہ بیاہ — بعد آپ کے ہوگا خلق میں کیونکر مرا نباہ
اٹھوں جہاں سے دلبر شبیرؑ کے سامنے
بیوی کی موت خوب ہے شوہر کے سامنے

امام حسینؑ کے بھائی اور حسینی لشکر کے علم بردار حضرت عباسؑ کی زوجہ بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتی ہیں :

حب تم نہ ہو تو موت ہمارا علاج ہے
صاحب کے ہاتھ۔ ہاتھ پکڑنے کی لاج ہے

حب حضرت قاسمؑ کی شہادت پر یہ شادی کا گھر خانۂ ماتم بن جاتا ہے تو ناموس مصطفیٰؐ کی حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔ خیمہ سے بکا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اہل حرم کی آہ و زاری میں بھی ہندوستان معاشرت کے حزنیہ پہلو کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ بیوہ ہو جانے والی دولھن کے جذبات کی ترجمانی میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کی پروردہ دولھن کی دل دوز چیخ سنائی دیتی ہے۔ ذرا اس حزنیہ تصویر کو بھی انیسؔ کے چند اشعار میں ملاحظہ کیجئے :

بین یوں کرنے لگی لاش پہ پھر وہ دُکھیا　　ہائے اے ابن حسن مجھ سے یہ تم کر گئے کیا
وجہ آزردگی کیا تھی کہ جو منھ موڑ گئے
آپ جنت کو گئے مجھ کو یہاں چھوڑ گئے

میرے والی مرے وارث میں تمہارے قرباں　　مرے بابا کے لئے خوں میں نہائے تم غلطاں
چاند سی چھاتی پہ ہیں گھوڑوں کی ٹاپوں کے نشاں　　کیا کروں ہائے نکلتی نہیں تن سے مری جان
دیکھتی ہو وہ جو قسمت مجھے دکھلاتی ہے
بدنصیبوں کو بھلا موت کہیں آتی ہے

بدتر از موت ہے مجھ رانڈ کا جینا صاحب　　کس طرح کاٹوں گی بچپن کا رنڈاپا صاحب

شوہر کی موت پر سہاگ کی نشانیوں مثلاً نتھ، چوڑی کو اتار کر رنڈسالہ پہننا بھی ہندوستان ہی کی رسم ہے۔ اس کا بھی انیسؔ نے نہ ... ح ... کر کیا ہے

بین یہ ہوتے تھے جو دولھن کی ... آ ...
فضّہ اک کشتی میں رنڈسالے کا جوڑا ... لائی

سامنے لا کے جو رنڈسالے کا جوڑا رکھا　　پیٹ کے سینہ یہ کہنے لگی بنت زہرا
صاحبو اس کو پہنانے سے کہو فائدہ کیا　　رو کے تب مادر ناشاد نے بہو سے کہا
رسم دنیا کی ہوئی اے سکینہ غمناک یہی
پہنو صدقے گئی رانڈوں کی ہے پوشاک یہی

کھینچ کر آہ حزیں بولی یہ ایک شب کی دولھن　　دل کی حالت کہوں کس سے میں گرفتار محن
آتش غم سے پھکا جاتا ہے مجھ رانڈ کا تن　　پہنوں رنڈسالہ میں ہو ہو پھٹے ملے ان کو کفن

وہ کہتی تھی اب ماں سے تم کوئی اتارے　　رو رو کے سکینہ سے یہ کرتی تھی اشارے
کھولو اسے کنگنے سے بس اب ہاتھ اٹھایا　　کیوں ہائے یہ کنگنا مجھے اماں نے پہنایا

شادی میں دولھن کے گھر براتیوں کے جانے، دولھن کی بہنوں کا دولھا پر آنچل ڈالنے اور بیٹی کو جہیز دینے کی رسم بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ انیسؔ نے اس کی مرقع کشی یوں کی ہے :

بہنیں کدھر ہیں اپنے آنچل بنے پہ آئیں　　اب دیر کیا ہے حجرے سے باہر دولھن کو لائیں
رخصت کرو جلد تا کہ براتی بھی چین پائیں　　جاگے ہیں ساری رات کے اپنے گھروں کو جائیں
دل پر ہے بے فراق کی شمشیر تیز کو
ماں سے کہو دولھن کے نکالے جہیز کو

یہ کہہ کے نوچنے لگی سہرا وہ سوگوار　　افشاں چھڑا کے خاک ملی منھ پہ چند بار
کہنے لگی لپٹ کے سکینہ جگر فگار　　ہے ہے بہن بڑھاؤ نہ سہرے کو میں نثار
وہ کہتی تھی کہ جاگ کے تقدیر سو گئی
بی بی نہ پکڑو ہاتھ کہ میں رانڈ ہو گئی

نیگ لینے یا دینے کی ریت بھی ہندوستان میں رائج ہے۔ میر انیس اپنے ایک مرثیہ میں اس وقت جب امام حسینؑ کے بھانجے جناب عون و محمد شہید ہونے کے لئے میدان جنگ میں جاتے ہیں تو حضرت سکینہ کی زبان سے کہلواتے ہیں۔ ؎

گھبرا کے سکینہ نے کہا کیا ہے میں قرباں　　شاید کہ مرے بھائیوں کے بیاہ کا ساماں
اچھا ہوا مدت سے یہی تھا مجھے ارماں　　میں باندھوں گی دستاروں پہ سہرے کو پھوپھی جان
حق ہے مرا جھگڑا میں کئے بن نہ رہوں گی
خوش ہو کہ خفا نیگ لئے بن نہ رہوں گی

شوہر کو اپنا تاجدار تصور کرنا ہندوستانی خیال ہے۔ حضرت بانو علی اکبرؑ کو شہادت کے لئے رخصت کرتے وقت کہتی ہیں۔ ؎

سرورؑ سے مرا راج ہے اکبرؑ سے ہے اقبال
وہ فاطمہؑ کا لال ہے یہ بانو کا ہے لال

بیٹے کی موت کو کوکھ اور شوہر کے انتقال کو مانگ اجڑنے

سے تعبیر کرنا بھی عین ہندوستانی خیال ہے۔ انیسؔ نے حضرت بانو اور حضرت زینبؑ کے بین میں اسے اس طرح باندھا ہے:

ہر طرح کمر غم سے اکھڑ جائے گی میری
یہ مانگ ہویا کوکھ اجڑ جائے گی میری

ماتم میں ترے کوکھ مری جل گئی بیٹا
تو ذبح ہوا مجھ پہ چھری چل گئی بیٹا

حضرت عباسؑ کی شہادت پر میر انیسؔ نے ان کے ایک صاحب زادے کی زبان سے جو کلمات ادا کئے ہیں ان میں بھی مانگ اجڑنے کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اماں کی مانگ اجڑ گئی صدمے گذر گئے
بھیا تمھیں خبر نہیں بابا تو مر گئے

ایک جگہ انیسؔ نے حضرت عباسؑ کی زوجہ کی زبان سے حضرت بانو کے لئے جو دعائیہ کلمے ادا کئے ہیں اور جو دعا حضرت بانو حضرت کبریٰ کو دے رہی ہیں ان میں بھی ہندستانی خیالات و جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے ؎

بانو سے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

کچھ اپنے رنڈاپے کا مجھے غم نہیں مولا
بانو کو سہاگن رکھے حق، ہے یہ تمنا

زہرا کا ترے فرق پہ دامن رہے بیٹی
تو تا صد و سی سال سہاگن رہے بیٹی

انیسؔ کے مرثیوں میں جا بجا بات چیت اور طرز گفتار میں ہندوستانی تمدن و معاشرت کے اثرات نمایاں ہیں۔ ؎

جس ماں نے تمھارے لیے اک جوگ کمایا
خود راتوں کو جاگی تمھیں چھاتی پہ سلایا

رنج میرکانی ہیں دکھ درد کی راتیں گن گن
پالنے والی کو جین آئے گا کیوں کر اس بن

چلائی کہ مرنے کو چلا ہائے مرا لال
فریاد ہے مجھ رانڈ کی کھیتی ہوئی پامال

ہے ماتا کی آنچ کلیجے کو جلاتی
کچھ ایسا قلق ہے کہ پھٹی جاتی ہے چھاتی

مرجھائے جو سبزے کے نکلنے کے دن آئے
رت پھر گئی جب پھولنے پھلنے کے دن آئے

اسی طرح انیسؔ کے یہاں ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ کثرت سے ایسی تشبیہات اور استعارات نظم ہوئے ہیں جن میں ہندوستانیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ؎

بجلی سی جس پرے کی طرف آ کے پھر گئی
ناگن تھی ایک فوج پہ لہرا کے پھر گئی

وہ روپ وہ ترخم وہ دل آویزی وہ نرم گو
ہر ہاتھ میں تھا جام ہی تھی ظفر اس کا

گھر لٹتا تھا، ہرا کا قیامت کی گھڑی تھی
وہ چھا رہی تھی تیروں کی ساون کی جھڑی تھی

سوز غم دوری نے جلا رکھا ہے
آہوں نے کنول دل کا بجھا رکھا ہے

شمالی ہند کے دوسرے عظیم المرتبت مرثیہ نگار مرزا دبیرؔ نے بھی جنگ کربلا کے سب نژاد مظلومین کو ہندوستان کے مقامی رنگ سے متصف کر کے پیش کیا ہے۔ ان کا لباس، وضع قطع، رسوم و آداب، رفتار، گفتار، غرض معاشرت سب ہندوستانی ماحول سے متاثر ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کو پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تیرہ سو سال پیشتر کے شرفائے عرب کی تصویریں ہیں بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ کم و بیش سو سال قبل کے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے نقشے ہیں جن پر اس ملک کی تہذیب و معاشرت کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت قاسمؑ کی شادی کا جہاں کہیں بھی نقشہ کھینچا ہے اس میں ان تمام رسوم کا ذکر کیا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں میں رائج ہیں۔ مثلاً جناب سکینہ کہتی ہیں ؎

پھر سکینہ نے بصد یاس یہ بانو سے کہا
کیسی یہ دولھا کی آمد ہے بتا دو تو ذرا
نہ تو باجوں کی ہے آواز نہ نوبت کی صدا

اسلام میں باجے اور موسیقی کی ممانعت ہے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اہل بیت کی کوئی فرد برات میں باجے کے نہ ہونے پر اظہار تعجب کرے لیکن اسے ہندوستانی رنگ دینے کی کوشش میں دبیرؔ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ جناب سکینہ کو باجوں کی آواز نہ سنائی دینے پر اظہار تعجب کرتے ہوئے دکھایا۔

نیگ و نیبرہ کا ذکر کرتے ہوئے مرزا دبیرؔ کہتے ہیں۔ ؎

کانوں کے گہر صدقہ نوشاہ میں دوں گی
قرباں گئی نیگ بھی میں بیگ لوں گی

نیگ مہندی کا بھی دکھنے کی بھی بندھوائی
چلو گھر میں کہو بے ہوش مری ماں جائی

حضرت کبرا کی شادی کا جو نقشہ دبیر نے کھینچا ہے اس میں ہندوستانی بیٹی کی رخصتی کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کبرا کو در خیمہ سے لے آئی جو آکے مادر — مسند پہ بٹھا کر اُسے بولی وہ ناچار
گھونگھٹ کو نہ سرکاؤ [illegible] — دولھا کو ترے لائے سلامت مرا غفار

[illegible] اب جان ہماری
[illegible] اور [illegible] جان ہماری

صدقے [illegible] شگونی بیاہ میں [illegible] جائے گی [illegible] ماں ایسے [illegible] حوالے [illegible] ہندوستان میں رائج ہے۔ ایک بند میں دبیر نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

کبرا کو بھی اس جوش [illegible] نے بٹھایا — اُس مہ نے گھونگھٹ کھینچ کر اسے ہٹایا
اور پوچھا کہ دولھا کو کیوں ساتھ نہ لایا — [illegible] نے مجھے مہماں نہ بلایا

[illegible] تیر [illegible]
[illegible] گھر میں [illegible] کے

ہندوستان میں شادی کے موقعے پر دولہا [illegible] سلامی لیتا ہے۔ اس رسم کو دبیر نے اس طرح بیان کیا ہے۔

[illegible] ہنستے کھڑی روتی ہے تم [illegible] ہو
کیا سلامی بھی نہیں لینے کے [illegible] خوش خو

[illegible] دولہا دولھن کا وہی سراپا پیش کیا ہے جو [illegible] کے یہاں ملتا ہے۔ دولھن ہندوستانی تہذیب میں ڈوبی ہوئی، گھونگھٹ کاڑھے، بیاہ کا [illegible] پہنے، ہاتھوں میں [illegible] چوڑیاں اور کنگنا، ناک میں نتھ، ماتھے پر صندل لگائے [illegible] نظر آتی ہے۔ دولہا بھی ہندوستانی معاشرت کا پروردہ نظر آتا ہے۔ [illegible] پر مقنع، سر پہ سہرا، ہاتھ میں کنگنا، سسرال سے آیا ہوا [illegible] جسم میں۔ [illegible] شادی دبیر کے یہاں تفصیل سے ملتے ہیں۔ پھر مسدس کا [illegible] گرم ہوتا ہے اور [illegible] ایک ایک کرکے درجہ شہادت پر فائز ہوتے گئے ہیں اور وہی شادی کا گھر خانۂ عزا میں بدل جاتا ہے۔ [illegible] سہاگ [illegible] چھین جاتے ہیں لاش پر آکر نتھ، چوڑیاں [illegible] مرثیہ [illegible] دیا جاتا ہے اور مانگ خاک سے بھر دی جاتی ہے [illegible] نے اس [illegible] میں ہندوستان کے [illegible]

سے بے انتہا کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پھر بانو نے کبرا سے کہا سر کو اُٹھاؤ — مارا گیا نوشاہ بس اب نتھ کو بڑھاؤ
افشاں جبینی پیشانی پہ اب خاک لگاؤ — نوشاہ کے لاشے پہ چلو خاک اُڑاؤ

سُن کر یہ سخن ناک سے نتھ کو بڑھایا — اور خاک کو اس چہرۂ انور پہ لگایا
بے چاری نے منہ اور بھی گھونگھٹ میں چھپایا — زینب نے کہا کہنے یہ کیا غضب آیا

دبیر نے اپنے مرثیوں میں جہاں کہیں بیواؤں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اس میں ہندوستانی بیوہ کے جذبات و احساسات کو اُجاگر کیا ہے۔ شوہر کو اپنا تاج دار، سہارا اور آسرا سمجھنا اور شوہر کی زندگی میں اپنی موت کو خوش بختی جاننا یہ سب ہندوستانی خیالات ہیں۔ ان کا پرتو مرزا صاحب کے مرثیوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔

ارمان تھا کہ پہلے میں دُنیا سے جاؤں گی — والی کا میں داغ جدائی اُٹھاؤں گی

سوچی ہوں اگر نہ رنڈاپے کا ہو تعب — شوہر کی موت سامنے عورت کے ہے غضب

دُنیا سے سہاگن اُٹھنے کی آرزو کرنا، دوسروں کا اس کو اقبال مند سمجھنا، سہاگن موت کو قابلِ رشک جاننا اور سہاگن کی لاش پر سرخ چادر ڈالنا، یہ تمام باتیں ہندوستانی سماج کی ریت اور رسم کی واضح تصویر پیش کرتی ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

حضرت کے سامنے جو نکل جاتا میرا دم — کھاتیں سہاگنیں مرے اقبال کی قسم
پڑتی ردائے سرخ جنازے پہ شان سے
مردہ بھی میرا اُٹھتا سہاگن جہان سے

اسی طرح حضرت قاسم کی ماں کے سینے میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت میں سانس لینے والی ماں کا پُر ارمان دل دھڑکتا نظر آتا ہے اور رنڈسالے میں گیروا لباس پہنانے کا خیال بھی خالص ہندوستانی تصور ہے۔

ارمان تھا تمھیں یہ بہت ہو چکا بیاہ — یہ اب مجھے بتاؤ یہ حالت کرو تباہ
رنڈسالہ ہم پنہائیں جو کبرا کو آج آہ — ہو گیروا لباس کہ ہو جائے سیاہ

ہندوستانی سماج میں بیواؤں کو بہت منحوس سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اُس کے سایے سے دور بھاگتے ہیں۔ مُبارک کاموں سے اس کو دور رکھا جاتا ہے۔ بیاہ شادی کی رسوم کی ادائیگی میں وہ کوئی حصہ نہیں لے سکتی

اپنے سایے کی نحوست کا اس کو خود بھی احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ خود ہی دُور دُور رہتی ہے ۔ مرزا دبیرؔ نے ان کیفیتوں کو اپنے مرثیوں میں جا بجا بیان کیا ہے ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

زینب نے کہا، بیٹھ کے اب شور مچاؤ چھاتی سے علمدار کی بیوہ کو لگاؤ
وہ بولی کہ ہے ہے نہ مرے پاس بلاؤ پرچھائیں سے رانڈوں کے سہاگن کو بچاؤ

یہ وہ موقع ہے جب حضرت عباس شہید ہو چکے ہیں ۔ اُن کی زوجہ کا دورِ غم سے بُرا حال ہے ۔ جناب عباس کی بہن حضرت زینب بیوۂ عباس کو سنبھالتی ہیں اور خاندان کے لوگوں سے کہتی ہیں کہ ان کو چھاتی سے لگا لیں لیکن اس عالمِ اضطراب میں بھی حضرت عباس کی زوجہ کو اپنی نحوست کا احساس ہے اور اپنے سایے سے سہاگنوں کو دور رکھنا چاہتی ہیں ۔

حضرت کبرا بھی ان ہی خیالات کا اظہار کرتی ہیں ۔ اس کی کیفیت مرزا صاحب سے سنیے :—

اب بیاہ جو اکبر کا کوئی دن میں رچے گا مہماں بخوشی بیٹھیں گے اس شادی میں یک جا
صغرا کریں گی کام ہر اک اور سکینا اماں کو مرا بیٹھنا ہوگا نہ گوارا
میں آپ کسی کام میں اب دخل نہ دوں گی
حسرت سے وہ میں دور سے دیکھا ہی کروں گی

گر مجھ سے کسی کام کو فرمائیں گے شبیر میں اُن سے کہوں گی کہ بُری ہے مری تقدیر
لائیں گی بہو بیاہ کے جب زینب دلگیر جو لوگ کہ محفل میں کریں گے وہ یہ تقریر
ایسا نہ ہو سامان جو شادی کا بگڑ جائے
اس بنڑی پہ سایہ کہیں کبرا کا نہ پڑ جائے

مرزا صاحب کے یہاں بیواؤں کی دل دوز آہ و زاری میں ہندستانی بیواؤں کی دردناک چیخیں سنائی دیتی ہیں ۔ انھوں نے بھی بچوں کی موت کو کوکھ اور شوہر کے انتقال کو مانگ اُجڑنے سے تعبیر کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

اُجڑی تھی کوکھ، مانگ بھی میری اجڑ گئی بچوں سے چھوٹی آپ سے بھی اب بچھڑ گئی
دنیا کی آفت آج مرے سر پہ پڑ گئی اب جان پر بنی ہے کہ قسمت بگڑ گئی
تربت پہ فاطمہ کی روانہ نہ کر گئے
بیوہ کے بیٹھنے کا ٹھکانا نہ کر گئے

کوکھ پکڑے ہوئے ہر ایک طرف جاتی ہے
ڈھونڈھتی ہے مگر اصغر کو نہیں پاتی ہے

مانگ اور کوکھ کا سکھ اور دودھوں نہانے اور پوتوں پھلنے کی دعا بھی عین ہندوستانی تصور ہے ۔ ایک جگہ مرزا دبیرؔ نے حضرت عباس کی زوجہ سے حضرت کبرا کو یہی دعا دلوائی ہے :—

سکھ مانگ کا اور کوکھ کا پائے مری بی بی پوتوں پھلے اور دودھوں نہائے مری بی بی

غرض مندرجۂ بالا اقتباسات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اردو ادب کے خمیر میں ہندوستان کے رسم و رواج، تہذیب و معاشرت اور رہن سہن شامل ہیں حتی کہ صنفِ مرثیہ بھی جو واقعۂ کربلا سے تعلق رکھتی ہے اور جس میں امام حسین اور ان کے اعزہ اور احباب اور انصار کی شہادت کا بیان ہوتا ہے اس اثر سے دور نہ رہ سکی اور اس میں بھی ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے ۔



تشنگی

ایس امام

باغِ ہستی کا عالم نہ پوچھو   بے کلی بن گئی ہے مقدر
ہر طرف آرزو، آرزو ہے   آرزو جیسے گاگر میں ساگر
آرزو پیاس ہے آدمی کی
پیاس بجھتی نہیں زندگی کی

آرزو جس کو کہتے ہیں پیارے   ایک شعلہ ہے، شعلہ ہے، شعلہ
یوں اٹھتی ہے کچھ دل میں ایسی   جیسے صحرا میں اٹھے بگولہ
حد نہیں کوئی اس تشنگی کی
پیاس بجھتی نہیں زندگی کی

لاج رکھ لی زمانے کی ہم نے   یاد ہے کچھ تجھے اے شبِ غم
دم جو گھٹنے لگا آدمی کا   زہر ماحول کا پی گئے ہم
انتہا ہو گئی مے کشی کی
پیاس بجھتی نہیں زندگی کی

بیچ ساگر میں ہم آگئے ہیں   اب خوشی کے کنول کیا کھلیں گے
تیر جانا تو [illegible] تھا   ڈوبتے ہیں کہ موتی ملیں گے
آرزو بنیاد ہے ہر سعی کی
پیاس بجھتی نہیں زندگی کی

بوالہوس ہو گیا ہے زمانہ   ہر طرف اک فریبِ وفا ہے
زندہ لاشوں کی حالت نہ پوچھو   زہر رگ رگ میں یوں بھر گیا ہے
شکل باقی نہیں آدمی کی
اک علامت ہے یہ خودکشی کی
زندگی پیاس ہے زندگی کی

• اپریل ۱۹۶۶ء

گینڈا اور دریائی گھوڑا

قیصر سرمست

ماہرین حیوانات نے جانوروں کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا ہے، یہ تقسیم مختلف باتوں اور خصوصیات کے پیش نظر کی گئی ہے یعنی جانوروں کی جسمانی ساخت مشابہت، رہنے سہنے، غذا حاصل کرنے اور افزائش نسل کے طریقوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔

عام طور پر اس درجہ بندی یا جماعت واری تقسیم (CLASSIFICATION) میں حیوانات کو دو بڑی جماعتوں میں بانٹا گیا ہے۔ ایک غیر فقاری (INVERTEBRATE) ہے اور دوسری فقاری (VERTEBRATA)۔

پہلی جماعت یعنی غیر فقاری میں وہ حیوانات شامل کئے گئے ہیں جن کے ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی۔ ہمیں جماعت اول سے نہیں بلکہ جماعت دوم سے اس وقت بحث ہے جن کے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ فقاری جماعت کو بھی مزید سہولت کے لیے پانچ ذیلی جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے ــــ (۲) مچھلیاں FISHES (۲) جل تھلیے INPHIBIA. (۳) ہوام RIPTILIA (۴) پرندے BIRDS OR AVES اور (۵) لپستانیہ MAMMALIA۔

یہی آخری جماعت (یعنی دودھ پلانے والے جانوروں کا زمرہ) سب سے اعلیٰ و ارفع ہے جس میں مشہور علم حیوانات کے ماہر مسٹر کووے (MR. COVIER) کے قول کے مطابق انسان بھی شامل ہے۔ اسی آخری جماعت گھوڑے (ہپوپوٹمس) کا بھی تعلق ہے،

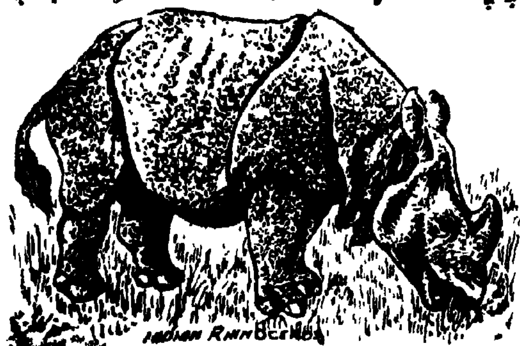
ماہرین کا خیال ہے کہ یہ طاقتور جانور (گینڈا اور ہپو) اس زمانے کی یادگار ہیں جب MEGATHERIUM، MANTODAN، BRONTOSAURUS، DINOSAUR، MAMMOTH اور PLESIOSAURUS وغیرہ جیسے ڈراؤنے قوی ہیکل اور دیو قامت جانوروں کی روئے زمین پر حکومت تھی اور موجودہ زمانے کے خوبصورت، نازک اور خوش اندام جانوروں کا وجود بھی نہ تھا۔ ماہرین کا یہ خیال درست بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان جانوروں کو دیکھنے کے بعد گردش ایام پیچھے کی طرف لوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان دو میں سے پہلا بد شکل بد وضع اور خوفناک جانور ہے گینڈا۔ یہ ایک کینہ پرور جانور ہے۔ جب اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان قریب ہی ہے تو یہ بدخو جانور اس پہ دیوانے کی مانند چڑھ دوڑتا ہے۔ انسان کو اسی وقت امان ملتی ہے جب وہ تیزی سے کسی اونچے اور مضبوط درخت پر چڑھ کر اس کی دسترس سے دور ہو جائے ورنہ انسان کو یہ اپنے تیز سینگ سے ہوا میں اچھال کر اس قدر روندتا اور کچلتا ہے کہ صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔ یہ بد وضع جانور اپنی ذہنی کیفیت کبھی پوری طرح ظاہر نہیں

کرتا۔ اسی لیے اسے کسی بھی مقصد کے لیے پالتو نہیں بنایا جاسکتا ہے[1]

گینڈا اگرچہ پانی کا جانور نہیں ہے لیکن انتہائی گرم مزاج ہونے کے باعث اسے ایسی جگہوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مرطوب اور ٹھنڈی ہوں۔ اسی لئے یہ دریاؤں کے کناروں کی ہموار اور مرطوب زمین پر رہتا ہے۔ اس کی سپردار کھال جسم سے الگ ہی رہتی ہے اور اس قدر دبیز اور سخت ہوتی ہے کہ جھاڑیاں اور کانٹے اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ گینڈا دن بھر آرام کرتا ہے اور رات میں پیٹ کی آگ بجھانے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ صرف سبزی کھاتا ہے۔ پتہ نہیں اس سبزی خور جانور کو اتنی زبردست قوت کہاں سے مل گئی ہے۔ چونکہ یہ شدید گرمی برداشت نہیں کر سکتا اس لئے گرمی سے بچنے کے لیے ٹھنڈے کیچڑ میں لوٹتا رہتا ہے۔ کیچڑ میں جو کیڑے موجود ہوتے ہیں وہ اس کی کھال سے بری طرح چمٹ جاتے ہیں اور اسے تنگ کرتے ہیں قدرت کا انتظام دیکھئے کہ کس طرح وہ ان کیڑوں سے اسے نجات دلاتی ہے۔ ایک قسم کے پرندے جو ان کیڑوں کے بے حد شائق ہوتے ہیں اس کے پاس ہی منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ کرم خوار پرندے ان کیڑوں کو اپنی خوراک بنا کر جہاں گینڈے کو ان سے نجات دلاتے وہاں اسے شکاریوں کی آمد سے بھی باخبر کرتے رہتے ہیں۔ افریقہ کے لوگ گینڈے کا چربی اور کھال کے لئے شکار کرتے ہیں[2]

تفصیل کو چھوڑ کر اس وقت خشکی اور تری کے جو عظیم الجثہ جانور پائے جاتے ہیں جیسے ہاتھی، دریائی گھوڑا اور گینڈا، ان میں ایک بڑی عجیب بات یہ ہے کہ ان تینوں کے ڈھانچے بڑی حد تک ایک دوسرے کے ڈھانچوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لحیم شحیم جسم سے توازن پیدا کرنے کے لئے ان کے پنجے بھی ترقی ہوتے ہیں۔ گینڈے کے پچھلے پیر اس کی نقل و حرکت میں زیادہ معاون اور مناسب ہوتے ہیں[3]

گینڈے کی کئی قسمیں اس وقت افریقہ اور ایشیاء میں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستانی گینڈے کی ناک پر ایک سینگ اور اس کا قد عموماً پانچ فٹ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف سوماترا کا گینڈا نسبتاً چھوٹا



ہند کا گینڈا

ہوتا ہے اور اس کی جلد بھی صاف اور بغیر تہہ دار اور بالوں والی ہوتی ہے۔ افریقہ کے دوسرے جانوروں کی طرح گینڈا بھی اپنے تمام بھائی بندوں سے زیادہ اونچا اور اس کی ناک پر دو سینگ ہوتے ہیں۔ اگلا سینگ بڑا اور پچھلا سینگ نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے[4]

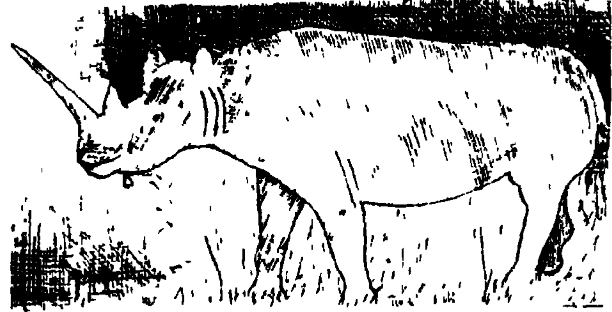
گینڈا خود جیسا عجیب و غریب ہے اسی طرح اس کا سینگ بھی انوکھا ہے۔ اس کے سینگ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام جانوروں کے سینگوں کی طرح یہ ہڈی کا نہیں ہوتا بلکہ بہت سے بال ایک لیس دار مادہ سے آپس میں مل کر سینگ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس پر اس کی دبیز اور سخت جلد چڑھ جاتی ہے۔ اس کی تصدیق اس کا ڈھانچہ دیکھنے کے بعد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کھال اور گوشت کے ہڈیوں سے علاحدہ ہو جانے کے بعد یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ سینگ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سینگ کا تعلق ڈھانچہ سے قطعی نہیں ہوتا بلکہ صرف جلد سے ہوتا ہے۔

گینڈا ایک ایسا جانور ہے جو ایشیا اور افریقہ میں بڑی حد

---

[1] INTRODUCING WILD ANIMALS (جنگلی جانوروں کا تعارف) [2] THE GOLDAN BOOK OF ANIMAL STAMPS (کتاب الاقسام حیوانات) [3] THE LIFE OF VERTEBRATES (فقاری (ریڑھ والے) جانوروں کی زندگیاں) [4] THE MODERN ENCYCLOPEDIA (جدید انسائیکلوپیڈیا)۔

تک جانا پہچانا جاتا ہے۔ ماہرین حیوانات کا خیال ہے کہ گینڈا کبھی زمانے میں فرانس، روس اور جرمنی وغیرہ جیسے سرد ممالک میں بھی پایا جاتا تھا۔ اس کے ثبوت میں وہ ایسے ڈھانچے پیش کرتے



کٹیلوا کا گینڈا

ہیں جو ان سرد ممالک میں برآمد ہوئے ہیں۔ مگر اب یہ ایک قصہ پارینہ ہو چکا ہے اور اب ان ملکوں میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

گینڈے کی کھال بڑی نرالی ہوتی ہے۔ دنیا کے کسی جانور کی جلد ایسی سپر دار اور جسم سے الگ نہیں ہوتی۔ یہ کھال اسے کانٹوں اور جھاڑیوں سے تو محفوظ رکھتی ہے مگر مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے اس کی جھولوں میں گھس کر اسے بے چین کرتے ہیں۔ اس کے جسم میں سب سے مضبوط حصہ اس کا سر ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ کمزور ہوتی ہے۔ دشمنوں سے گینڈے کے محفوظ رہنے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک تو اس کی قوت شامہ اور دوسرے وہ پرندے جو اس کے جسم سے کیڑے چن کر کھاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق کے وقت قدرت نے حسن اور خوبصورتی کو کہیں چھپا کر رکھ دیا تھا۔ کیونکہ اس بے چارے کے جسم میں ایک چیز بھی تو ایسی نہیں جسے خوبصورتی یا تناسب سے دور کا بھی لگاؤ ہو۔ پھر اس کے بد وضع چہرے پر سینگ کی موجودگی نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور دُم کا تو جواب نہیں۔

یوں تو گینڈا سبزی خور جانور ہے مگر درخت کی جڑیں بھی کھاتا ہے۔ جڑیں حاصل کرنے کے لئے زمین اپنے سینگ سے کھودڈالتا ہے۔

ظاہری حالت دیکھنے سے وہ بڑا سست اور آرام طلب معلوم ہوتا ہے مگر اس کی حالت پہ نہ جائیے۔ یہی بظاہر سست اور کاہل جانور وقت پر برق تپاں بھی بن جاتا ہے۔ اگر آپ تیز رفتار گھوڑے پر اس کا تعاقب کریں تو آپ کو اور گھوڑے کو وافر مقدار میں وہ دھول پھانکنی پڑے گی جو اس نے اٹھائی ہے۔

ریچھ کی طرح اس کے مزاج کے بارے میں بھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض ماہرین حیوانات اسے تند خو اور کینہ پرور سمجھتے ہیں اور بعض کے نزدیک وہ انتہائی سیدھا اور نیک مزاج جانور ہے۔ مسٹر سیلوس کا کہنا ہے کہ "چھوٹا ڈھیلا یا کنکری مار دینے سے وہ گھبرا کر کوسوں بھاگ جاتا ہے"[1]۔ لیکن INTRODUCING WILD ANIMALS (جنگلی جانوروں کا تعارف) میں جولیس کو ماریک لکھتے ہیں کہ اس بدمزاج کو آدمی کا پتہ چل جاتا ہے تو یہ دیوانہ کی طرح حملہ آور ہوتا ہے۔ مسٹر سی جے۔ اینڈرسن بھی، جو ایک اچھے شکاری تھے، گینڈے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ گینڈے کی کل چھ قسمیں روئے زمین پر پائی جاتی ہیں۔ تین قسمیں افریقہ میں ملتی ہیں اور باقی تین ایشیا کے مختلف علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی دو قسم کے گینڈے پائے جاتے ہیں — بڑا گینڈا اور چھوٹا گینڈا۔

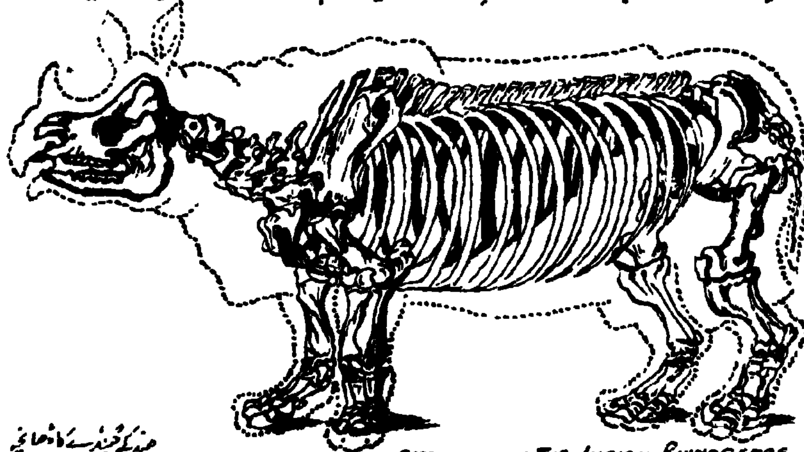
ہند کا بڑا گینڈا۔ اس گینڈے کے ایک ہی سینگ ہوتا ہے۔ اس کا قد کاندھوں تک پانچ فٹ اور جسم کی لمبائی دس فٹ ہوتی ہے۔ سینگ اور دُم کی لمبائی ایک ہوتی ہے یعنی دو فٹ۔ یہ ہندوستان کے ان حصوں میں ملتا ہے جہاں گھنے جنگل اور دلدل ہوں۔ اس کی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ زخمی ہو کر غصہ میں آتا ہے تو اپنی قیامت خیز ٹکروں سے ہاتھی جیسے نحیم شحیم جانور کے پائے ثبات میں بھی لغزش پیدا کر دیتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ خود اس پر اس آویزش کا اثر نہیں نظر آتا۔

ہند کا چھوٹا گینڈا۔ اس کی ناک پر بھی صرف ایک ہی سینگ ہوتا ہے، چونکہ یہ قد اور جسامت میں کم ہوتا ہے اس لیے اسے چھوٹا گینڈا

[1] عالم حیوانی

کہنے لگے۔ ورنہ اس میں اور بڑے گینڈے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ہاں! اس کی کھال میں جھول بھی نہیں ہوتے۔ اونچائی ساڑھے تین فٹ اور جسم کا طول سات یا آٹھ فٹ ہوتا ہے۔ اس نوع کے

لندن کے میوزیم میں اس کا بیس فٹ لمبا ایک سینگ رکھا ہے۔ سینگوں کی تاریخ میں اتنے بڑے سینگ کی مثال شاید ہی مل سکے۔ یہ نڈر جانور انسان سے قطعی خوف نہیں کھاتا۔



ہند کے گینڈے کا ڈھانچہ

گینڈے بنگال، برما، جزیرہ نما ملے، جاوا اور بورنیو میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی غذا اور عادات و اطوار وہی ہیں جو ہند کے بڑے گینڈے کے ہیں۔ البتہ جسم کے ساتھ یہ طاقت میں بھی ہندوستان کے بڑے گینڈے سے کم ہوتا ہے۔

سوماترا کا گینڈا۔ جزیرہ نما بورنیو اور ملے ایسے مقامات ہیں جہاں ہند کے گینڈے کی دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں۔ سوماترا کا گینڈا ایشیا کا واحد گینڈا ہے جس کی ناک پر دو سینگ ہوتے ہیں۔ یہ بھی اپنے قد اور جسامت میں ہند کے بڑے گینڈے سے قدرے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا قد کبھی چار فٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیوں برما کے لوگ اسے "آتش خور" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسے آتش خور کہنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

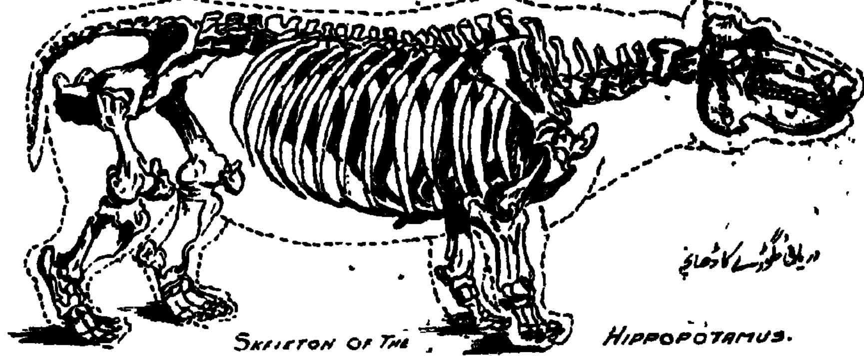


افریقہ میں جتنی قسم کے گینڈے پائے جاتے ہیں ان کی ناک پر دو سینگ ہوتے ہیں۔ ایک آگے اور دوسرا پیچھے۔ بہ نسبت پچھلے سینگ کے اگلا سینگ زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اپنی کھال کے لحاظ سے بھی یہ ہندوستانی گینڈے سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس کی کھال سپردار اور جھول دار نہیں ہوتی بلکہ ہموار اور یکساں ہوتی ہے۔ یہاں کے گینڈوں کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ البتہ یہاں کے بڑے گینڈے کا رنگ سیاہ نہیں ہوتا۔

کیپ اور کٹیلوا کے گینڈوں کی اونچائی پانچ فٹ ہوتی ہے۔ غالباً یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ کٹیلوا کے گینڈے کی مادہ کا سینگ نر کے سینگ کے مقابلے میں بڑا مگر پتلا ہوتا ہے۔ نر کے سینگ کی لمبائی زیادہ سے زیادہ ڈھائی فٹ ہوتی ہے۔ نر کے سینگ چھوٹے ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ نر اپنے سینگ درختوں کے تنوں یا چٹانوں سے رگڑتے رہتے ہیں۔

دریائی گھوڑا (ہیپوپوٹمس HIPPOPOTAMUS)۔ وھیل اور ہاتھی کے بعد دنیا میں دودھ پلانے والے جانوروں میں سب سے بڑا جانور یہی ہے۔ دن بھر صاف ستھری جھیلوں اور گہرے دریاؤں کے کنارے پڑا سستاتا رہتا ہے اور رات ہوتے ہی اس کی جولانی

بھی شباب پہ آجاتی ہے[۵۱]۔ یہ عظیم ترین اور غضب ناک جانور سور کے خاندان کا سب سے بڑا جانور ہے۔ یوں تو پانی کا شیدائی یہ جانور دریا کے کنارے رہتا ہے مگر پانی کے اندر چند منٹ سے زیادہ نہیں



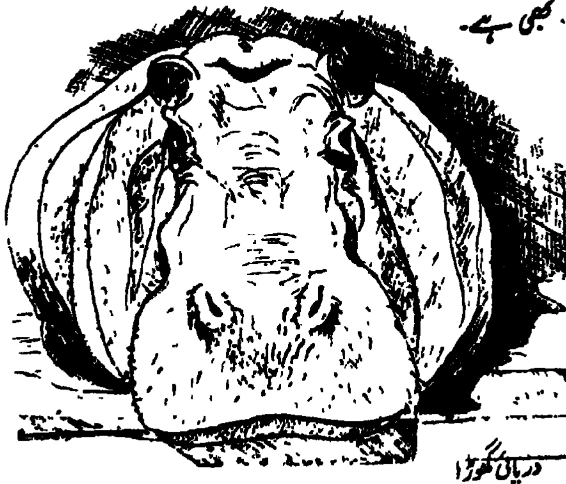
SKELETON OF THE HIPPOPOTAMUS.

رہ سکتا۔ اس کی مادہ صرف ایک بچہ دیتی ہے (تصویر صفحہ ۵ پر) جو پیدائش کے وقت قریب ساٹھ پونڈ وزنی ہوتا ہے اور پیدائش کے فوراً بعد چلنے پھرنے لگتا ہے۔ ایک سال کے اندر اس کے وزن میں کئی سو پونڈ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ سات سال کی عمر میں یہ پوری طرح نشو و نما پالیتا ہے۔ اس وقت اس کا وزن ایک سو بارہ (۱۱۲) من (تقریباً ۸۹۶۰ پونڈ) قد پانچ فٹ اور لمبائی چودہ فٹ ہو جاتی ہے[۵۲]۔ اسی مناسبت سے اس کے پیٹ کا دور بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ اس قد، اس لمبائی اور اتنے وزن کی بہ نسبت اس کے پیر قدرے پتلے ہوتے ہیں[۵۳]۔ اس کی جلد عموماً سیاہی مائل بھوری یا سلیٹی رنگ کی ہوتی ہے۔

اس کی ایک چھوٹی قسم بھی پائی جاتی ہے جسے "بونا دریائی گھوڑا" (PYGMY HIPPOPOTAMUS) کہتے ہیں۔ اگر آپ اس جانور کا تصور کرنا چاہتے ہیں تو ایک موٹے تازے سور کو اپنے ذہن میں لائیے۔ بس وہی چھوٹا دریائی گھوڑا (پگمی ہپوپوٹمیس) ہے۔ یہ چھ فٹ لانبا اور چار سو پونڈ (۱۰..پونڈ) وزنی ہوتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ ہپوپوٹمیس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس قدر لحیم شحیم ہونے کے باوجود عمدہ تیراک ہوتا ہے اور پانی میں اس قدر پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے[۵۴]۔

یہ غریب بھی اپنی چربی اور موٹے چمڑے کی وجہ سے حضرت انسان کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے اور آئے دن اس کا شکار کیا جاتا ہے۔

اس کی ہر بات نرالی ہے۔ مثلاً اس کے دہانے ہی کو لیجیے خشکی کا کوئی دوسرا جانور اتنا کشادہ دہانہ نہیں رکھتا جتنا کہ ہپوپوٹمیس کا ہوتا ہے دانت بھی بڑے خاص ہوتے ہیں۔ جب یہ اپنا بھاڑ سا منہ کھولتا ہے تو بڑا مہیب معلوم ہوتا ہے۔ جسم کے لحاظ سے اس کے کان بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کا اوپری لب آگے کی طرف لٹکا رہتا ہے جو اس کی خوفناکی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے نتھنے تھوتھنی کے عین اوپر ہوتے ہیں جو غوطہ لگاتے وقت بند ہو جاتے ہیں اور یہی حال کانوں کا بھی ہے۔


دریائی گھوڑا

[۵۱] THE GOLDEN BOOK OF ANIMAL STAMPS [۵۲] INTRODUCING WILD ANIMALS [۵۳] THE MODERN ENCYCLOPEDIA [۵۴] THE LIFE OF VERTEBRATES [۵۴]

جیتندر ماشک

۱۰، ۱، ۱۹۴۹ء

اس کے چھوٹے چھوٹے کان دور کی آواز سننے کے لیے ہر وقت متحرک
ہتے ہیں۔ ان کا عموماً گہرے بھورے اور مادہ کسی قدر زردی مائل ہوتی
ے۔ اس کے جسم میں دو انچ موٹی چربی کی تہہ ہوتی ہے۔ کھال اتنی
ز ہوتی ہے کہ اس کا وزن سات من ہوتا ہے۔ ہپو جس طرح ظاہری
ل وصورت میں مکروہ ہے اسی طرح عقل سے بھی عاری ہوتا ہے
ن قدر بڑے سر میں بہت چھوٹا دماغ ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے
اغ میں سوجھ بوجھ کی جتنی بھی صلاحیت ہوتی ہے وہ غذا کی فکر اور



دریائی گھوڑے کی مادہ اور بچہ

تلاش میں صرف ہو جاتی ہے۔ دوسری باتوں کو سوچنے کے لئے اس
بے چارے کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا۔ مگر یہ بھدا، بے عقل جانور بندوق
سے بہت ڈرتا ہے۔ جس دریا یا جھیل میں ہپو رہتے ہیں اگر وہاں شکاریوں
کی آمد و رفت بڑھ جائے تو یہ حفظ ماتقدم کے طور پر فوراً اس جھیل یا دریا کو
خیرباد کہہ دیتے ہیں اور کسی دوسری پُرسکون جگہ بود و باش اختیار کر لیتے ہیں۔

عقل سے معذور یہ جانور بڑا سریع الغیظ ہوتا ہے اگر اسے
اپنے دشمن کی نیت کا ذرا بھی احساس ہو جائے تو پھر یہ مجسم قیامت
بن جاتا ہے بڑی بڑی کشتیوں کو اس کے دھکوں سے پناہ نہیں ملتی۔

ہپو فطرتاً بڑا جنگجو واقع ہوا ہے۔ اس لئے اکثر نر راتوں میں ایک
دوسرے پر دونکتے ہوئے حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس کے مضبوط اور
خطرناک دانتوں اور جبڑوں کی پکڑ کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔
بس یہ سمجھئے کہ کسی چیز کو فولادی شکنجے میں اس طرح کس دیا گیا ہے کہ اس کو
جنبش بھی نہیں ہو سکتی۔

کسی زمانے میں اس کے دانتوں کی ہڈی سے انسان کے مصنوعی
دانت بنائے جاتے تھے کیونکہ اس کی ہڈی میں یہ بڑی خاص بات



دریائی گھوڑے پانی سے کھیل رہے ہیں

ہوتی ہے کہ یہ مدت دراز تک پیلی نہیں ہوتی۔

اسی کے ساتھ ہپو میں ایک خوبی بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپس میں خواہ
کتنا ہی لڑیں مگر کسی دوسرے جانور کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔ یہ
انسان کے بھی دشمن اسی وقت ہوتے ہیں جب وہ ان کی پُرسکون زندگی
میں ہل چل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ
وہ ان مچھیروں کو کبھی ایذا نہیں پہنچاتے جنہیں صرف مچھلیاں پکڑنے
سے کام ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں ہپو پٹمس بھی ان سے کوئی
تعرض نہیں کرتا۔



سلام

سیف بجنوری

لالہ و ریحان و گل کو، لالہ زاروں کو سلام
اے وطن کے گلستاں تیری بہاروں کو سلام
کنج ہائے گل، درختوں کی قطاروں کو سلام
وادیوں کو، جنگلوں کو، کوہساروں کو سلام
جن سے عظمت بڑھ گئی اُن یادگاروں کو سلام
وادیٔ کشمیر کے دل کش نظاروں کو سلام
مسلکِ مہر و وفا کے شاہ کاروں کو سلام
ان شہیدوں کو، وطن کے جاں نثاروں کو سلام
شہ سوارانِ وطن گزرے جہاں سے سر بکف
ان مقدّس منزلوں، ان رہ گزاروں کو سلام
منزلوں نے جن کے خود بڑھ بڑھ کے چومے ہیں قدم
ان جیالے سورماؤں، کام گاروں کو سلام
جن سے ہر ذرّہ زمینِ ہند کا ہے تاب دار
آسمانِ ہند کے ان چاند تاروں کو سلام
وہ ترا رن دیر راجو، وہ ترا پیارا حمید
ہند ماتا تیرے ان دونوں دلاروں کو سلام
جن کی تخلیقوں نے پھونکی ہے دلوں میں روحِ نو
ان ادیبوں، شاعروں، تخلیق کاروں کو سلام
جو تری عزت پہ قرباں ہو گئے اے میرے دیش
ان سبھی والا ہمم، عالی وقاروں کو سلام
دل سے جو تائیدِ بھارت میں رہے گرمِ عمل
سیفؔ اُن حق آشناؤں پاس داروں کو سلام

اپریل ۱۹۶۶ء

یکسوئی

احمد وصی

پھر وہی میں ہوں، وہی زیست کا بے رنگ مآل
وہی ماحول پہ چھائی ہوئی مبہم الجھن
وہی درماندگیٔ دل، وہی زخموں کی جلن
وہی بے ربط سی فکریں، وہی بے کار سوال

وہی انفاس سُلگتے، وہی سانسوں کی تپش
اور یہ شدّتِ احساس کہ جینا ہے وبال
نہ تجھے پانے کی خواہش، نہ تمنائے وصال
کون جذبہ تھا، جو اب بن گیا بے نام خلش

ذہن میں ایک خلا، دل میں اُداسی ہی رہی
ہائے! ایسے میں ترا غم بھی سہارا نہ ہوا
کوئی احساں ہی مقدّر کو گوارا نہ ہوا
روح تسکین کی پیاسی تھی، پیاسی ہی رہی

تیری آنکھوں سے مئے ناب برستی ہی رہی
زندگی لطف و عنایت کو ترستی ہی رہی

چشمۂ اشک

اوّلین اُمور اوّل

سیّد شہنشاہ حسین

بہت سے حضرات سمجھتے ہیں کہ پنشن یافتہ لوگوں کو کوئی کام ہی نہیں اور راوی بس چین ہی چین لکھتا ہے۔ اُنھیں کیسے یقین دلایا جائے کہ ہم گوشہ نشینوں پر یہ سخت اتہام ہے۔ پچپن ۵۵ برس کی عمر تک تو بیل کی طرح جُتتے ہی رہے اور ترسٹھویں سال میں بھی کتنے ہی کام کرنا پڑتے ہیں۔ اپنے تو خیر اپنے، دوسروں کے بھی کبھی کبھی گھر میں بچوں کو کسی لفظ کی انگریزی (یا اردو) آناً فاناً بتانا پڑتی ہے (گویا ہم زندہ لغت ہوں)۔ کبھی لازمی ہوتا ہے کہ کسی مشکل شعر کا مطلب جسے ماسٹر صاحب یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے تھے کہ "یہ تو صاف ہے" سمجھایا جائے۔ کبھی کوئی درخواست لکھوانے چلا آتا ہے تو کوئی ترجمہ کروانے کسی نے سرکاری کاموں میں غلطیاں خود کیں اور جب جواب طلب ہوا تو اسے ہم لکھیں۔ اور یہ تو معمولی بات ہے کہ: "اگر زحمت نہ ہو تو شام کو جب آپ ٹہلنے جائیے تو فلاں چیز لیتے آیئے۔ ذرا گلیوں میں جانا ہوگا مگر زیادہ دور نہیں۔ بھولیے گا نہیں" ـــــ یہ آخری ٹکڑا اس لیے کہ میرا حافظہ بہت بدنام ہے۔ اور میرے ذاتی کام بس دھرے رہ جاتے ہیں چند ہفتے ہوئے ایک دن زعم میں آکر ایسے ذاتی کاموں کی فہرست بنانا شروع کی۔ خدا خدا کر کے جب اُس کی تکمیل ہوئی تو ایک امریکی کہاوت یاد آئی: "FIRST THINGS FIRST" لہذا اس فہرست کو "نمبر شمار" ڈال کر از سرِ نو مرتب کیا۔

سرِ فہرست درج ہوا "بال کٹوانا"۔ نمبر ۲: "مکان کا ٹیکس دینا" (ورنہ بمباکٹ جائے گا)۔ نمبر ۳: "ریڈیو کا لائسنس بنوانا"۔ سب کہاں تک لکھے جائیں بس یوں سمجھ لیجیے کہ فہرست نمبر شمار ۱۳ پر ختم ہوئی تھی۔ دل میں شک پیدا ہوا کہ ایسے منحوس نمبر پر فہرست چھوڑی تو کوئی کام نہ ہوگا یا ہوگا تو بے تکا۔ اس لیے ایک عدد کام بڑھانا لازمی تھا۔ ادھر کچھ سوانح عمریاں پڑھیں تھیں۔ تحت الشعور کا خدا بھلا کرے اس نے لکھوا دیا: "نمبر ۱۴۔ اپنے سوانح حیات لکھنا۔" فہرست مکمل ہوئی تھی کہ حسبِ عادت بیمار پڑ گئے۔ آج کچھ طاقت محسوس ہوئی تو فہرست اُٹھائی۔ سوچا دوڑ دھوپ اور کیو (QUEUE) بنانے والے کام پھر ہوں گے۔ پہلے وہ کام کیے جائیں جو بیٹھے بیٹھے ہو سکتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کمبخت تحت الشعور نے فہرست کے آخری نمبر کی طرف مجھے ڈھکیلا۔ میں نے طے کیا کہ پہلے اسی سے نپٹ لوں۔

ظاہر ہے کہ تقریباً ترسٹھ سال کے کارناموں یعنی کامیابیوں، ناکامیوں اور حماقتوں کے دریا کو اس مضمون کے کوزے میں میں نہ بھر دوں گا، نہ اڈیٹر صاحب چھاپیں گے اور نہ آپ پڑھنے کی زحمت کریں گے۔ لہذا فی الحال ان سوانح کا ایک خاکہ تیار کر لیا جائے۔ یہ کام تو بیٹھے بیٹھے ہو سکتا ہے۔ پھر "فارغ البال" ہونے یعنی بال کٹوانے کی بات سوچی جائے گی۔

اب یہ سوجھی کہ جس طرح آج کل کچھ افسانے آخری واقعات پہلے لکھ کر، فلیش بیک (FLASH BACK) کی تکنیک سے مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح ہم بھی اپنی آخری عمر کے واقعات، جو ابھی ذہن میں تازہ ہیں، پہلے لکھ کر کیوں نہ فارغ ہو جائیں۔ کاہلی اور کام چوری نے یہ بھی سوجھایا کہ اتنا اور کیوں نہ کیا جائے کہ پنج سالہ منصوبہ بندیوں کے اس دور میں اپنی عمر کے پانچ پانچ سال کے ٹکڑے کر لیے جائیں۔ دقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ عمر، اعشاریہ کے جھگڑے میں پڑے بغیر، پانچ سے تقسیم ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کا سہل حل یہ ہے کہ تین سال گھٹا کر سیدھے ساٹھ برس کے واقعات کا خاکہ بنا ڈالیں۔ ان آخری تین سالوں (گھبرائیے نہیں ہمارا مطلب ہے برسوں) کا ذکر ہی کیا جو بیشتر بیماری میں کٹے ہوں۔ اور خاص طور سے اس

صورت میں کہ تمام تفریحات ختم ہو جانے کے بعد، لذت طعام تک سے اس حد تک محروم رہنا پڑتا ہو کہ کبھی ناشتہ لنچ کا کام دے اور کبھی لنچ ڈنر کا۔

ایسی الٹی پلٹی پنج سالہ ترتیب سوانح میں میرے کمزور حافظے پر زور تو کم پڑے گا مگر ممکن ہے بعض قارئین کو، جنھیں تاریخ دیرینہ سے بیر ہے، کچھ زحمت ہو۔ بہرحال اگر اجازت ہو تو ترتیب واقعات یوں کی جائے:

ساٹھ سے چھپن تک کے واقعات کے بعد پچپن سے اکیاون تک کے حالات درج ہوں۔ پھر پچاس سے چھیالیس تک کے ـــ اور یہی معکوس ترتیب قائم رہے حتیٰ کہ بڑھاپے کے بعد جوانی اور پھر بچپن عود کر آئے! (کم از کم کاغذ ہی پر)۔

مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں "قبل مسیح" کی تاریخیں سمجھنے میں شروع میں کسی الجھن ہوتی تھی۔ کچھ آسان تھا یہ سمجھ لینا کہ مہاتما گوتم بدھ چھٹی صدی ق م میں سنہ ۵۵۷ میں پیدا ہوئے۔ یا یہ کہ سکندر اعظم نے ایران پر ۳۳۱ میں حملہ کرنے کے بعد ۳۲۷ میں ہندوستان پر فوج کشی کی۔ یا یہ کہ ایران کے ہخامنشی خاندان نے سنہ ۵۵۸ سے سنہ ۳۳۱ تک حکومت کی۔

آپ کی زحمت بچانے کے لیے ساٹھ سے پچپن سال کا تذکرہ بھی چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ ان میں بھی بیماری کا ذکر لازمی ہے جس طرح چور کا چوری کا مرض نہیں جاتا اسی طرح ایک پرانے مریض کو اپنے امراض میں وقفہ ملنے کے بعد امراض کا تذکرہ کرنے کا مرض ہو جاتا ہے۔ آخری جملہ ایک مرتبہ پھر پڑھ کر سمجھ لیجیے یا سمجھ کر پڑھ لیجیے۔ ہو سکتا ہے آپ بھی کبھی مریض ہو جائیں (خدا نخواستہ) اور لوگ آپ کو دیکھ کر کنّیاں کاٹنے لگیں۔

بس اتنا لکھ دوں کہ ریسرچ کرنے کے لیے بیماری کا زمانہ کچھ موزوں سا ہوتا ہے۔ اگر میری سنیں تو یونیورسٹیوں کے کارکنان لازم کر دیں کہ طلبا اپنی تھیسس (THESIS) کے پہلے ورق پر جہاں بعض مقررہ اطلاعات دیتے ہیں وہاں "ریسرچ کے زمانے میں علالت کی میعاد" بھی تحریر کیا کریں۔ یہ رائے ہم ذاتی تجربے کی بناء پر دے رہے ہیں، کیونکہ تندرستی کے زمانے میں تو کبھی کسی چیز پر ریسرچ کرنے کی توفیق ہوئی نہیں مگر بیماریوں سے مقابلہ کرنے کے زمانے میں لیٹے لیٹے ہم نے کتنے ہی اہم مسئلوں پر ریسرچ کر ڈالی۔ نمونتاً یہاں صرف دو پیش خدمت ہیں:

(۱) اضافۂ اخراجاتِ علاج کا لازمی نتیجہ امراض میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟

(۲) اگر ہمارا کہیں پھر سے جنم ہو تو کیا پیشہ اختیار کرنا بہتر ہوگا: ڈاکٹری؟ رہزنی؟ پالیٹکس (POLITICS)؟ یا اسمگلنگ (SMUGGLING)؟

ان کے خاکے تیار ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پر بھی تھیسس لکھ دی جائے تو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کہیں نہیں گئی ہے، جس کو واپس کر کے ان بڑے آدمیوں کی فہرست میں داخل ہوا جا سکتا ہے جنھوں نے ڈگریاں یا خطابات واپس کر کے اور بھی زیادہ نام حاصل کیا۔ جیسے کچھ عرصہ ہوا، بی ٹلس (BEATLES) کو خطاب کی واپسی کے معاملے میں یورپ اور کینیڈا وغیرہ میں شہرت حاصل ہوئی۔

آپ یہ پورا باب جملۂ معترضہ کی طرح اگر چاہیں تو چھوڑ دیں۔ اگر پڑھ رہے ہیں تو آخری پارہ اور اس پارہ کے درمیان دو دن کا وقفہ تصور فرما کر آگے بڑھیے۔ اس وقفے میں ہمارا حافظہ اور ہم دونوں ستا رہے تھے ـــ ایک آندھی آتی ہے:

"ابھی کل ہی میں نے تمھارا میز ٹھیک کیا تھا۔ پھر گودڑ بنا ڈالا۔"

"ارے بھئی ایک مضمون لکھ رہا تھا جو مل نہیں رہا ہے۔ تمھارا صفائی کا دورہ بھی کتنا بے موقع اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

"لیجیے اپنا مضمون۔ خود ہی تو لغت کے اندر ٹھونس دیا تھا اور بلا وجہ مجھ سے لڑ رہے ہیں۔ میرے دشمنوں کو دورے پڑیں۔ وہ تو کہیے کہ جب سے آپ نے وہ سو کا نوٹ ڈکشنری میں مجھ سے چھپا کر رکھا تھا، میں ہمیشہ آپ کا میز ٹھیک کرتے وقت سب موٹی موٹی کتابوں کو "جھڑ جھڑا کر" دیکھ لیتی ہوں ورنہ آپ ایسے بھلکڑ اتنی جلدی اسے کیا ڈھونڈھ پاتے....." اسی طرح ایک ہی سانس میں اور نہ جانے کیا کیا!

میں اپنے منتشر خیالات کو اکٹھا کر کے کچھ لکھنے ہی والا تھا کہ دوسری لہر
"یہ کیسا لنگوڑا مضمون لکھا جارہا ہے کہ اپنا پول خود ہی کھول رہے ہیں۔ مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"
"دونوں آنکھوں سے دیکھئے"۔
بڑبڑانے کی آواز ۔۔۔ "آندھی کا اکزٹ (EXIT) ۔۔ سکون۔

یہ کیوں نہ کیا جائے کہ خودساختہ پنج سالہ ٹیٹوں کو پھاند کر پچپن ۵۵ سے چھبیس ۲۶ سال کا عرصۂ ملازمت اکٹھا لے کر اپنی اور آپ کی زحمت میں مزید کمی کر دی جائے۔ کوئی امتحان کے پرچے کا جواب تو ہم لکھ نہیں رہے ہیں کہ حدودِ مقررہ کے اندر ہی قلم گردش کرے۔ اس تیس ۳۰ سال کے عرصۂ ملازمت میں آپ کو کیا دلچسپی۔ سب کہاں تک سنئے گا۔ اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ایک پل میں گزر گیا۔ حالانکہ اس وقت تو ہر لحظہ نظر گھڑی پر رہتی تھی یا تعطیلوں کی فہرست پر!

بعض "ماہرین" کا اندازہ ہے کہ سرکاری دفتروں میں اوسطاً دو گھنٹے یومیہ سے زائد کام نہیں ہوتا۔ نہ معلوم ان ماہرین نے اپنے اعداد کیسے نکال لیے ہیں۔ ہم لوگوں کو تو دس سے چار بجانے تک بس پسینے آجاتے تھے۔ ملازمت کے دوران میں کوئی 65,700 گھنٹے کام کیا ہوگا۔ اب یومیہ اوسط آپ خود اولین فرصت میں نکال لیں ہاں تو کم و بیش 10950 دن یونہی کٹ گئے۔ البتہ ان میں سے مختلف چھٹیوں اور لیپ ایئر (LEAP YEAR) کے ایام گھٹا کر آپ کو حساب لگانا ہوگا۔

وہی دن اب اس لا متناہی فرصت کے زمانے میں یاد آتے ہیں۔
کسی نے سچ کہا ہے، اور جو اس نے کہا نہیں تو تصرف و اضافے کے ساتھ ہم کہتے ہیں۔ کہ بہتر ہے کہ انسان ایک "اسپ تازی" کی طرح "زیرِ پالان" "مجروح" ہوتا رہے مگر ایک پرانی موٹر کی طرح کسی گوشے میں پڑے پڑے زنگ آلود نہ ہو۔ ایسے حافظے کو کیا کہا جائے جو عین موقع پر یہ نہ بتا سکے کہ وہ کس نے کہا تھا یا یہ کس نے کہ: "بس سمجھ لو کہ تمھاری زندگی کے دن پورے ہونے کو آئے جب تم "بوریت" (BOREDOM) کا غلاف اپنے جسم سے اتار پھینکنے میں قاصر رہنے لگو"۔ ایسی عمدہ بات اتنے بھونڈے الفاظ میں کہتا کون؟ ہم نے خواہ مخواہ اپنے حافظے کو برا بھلا کہا!

بات میں بات نکلتی ہے۔ وہ پارلیمنٹ کا ڈبیٹ (DEBATE) ہو، میاں بیوی کی چخ چخ یا سوانح کا قلم بند کرنا۔ "اسپ تازی" اور "زنگ آلود" پر دو وارداتیں جو ہم پر گزریں یاد آگئیں۔ مگر کتنی ہی دلچسپ سہی، یہاں ان کی گنجائش کہاں؟ اور پھر ابھی تو مجھے کسی مفت کے وکیل سے رائے بھی لینا پڑے گی کہ "اسپ تازی" والا واقعہ لکھنے سے مجھ پر ہتک عزت کا دعویٰ تو نہیں ہو سکتا۔ رہا "زنگ آلود" والا قصہ اس کو اڈیٹر صاحب چھاپنے سے رہے۔ لہٰذا فی الحال ہماری طرح آپ بھی صبر کیجئے۔
اب یوں سمجھ لیجئے کہ اس پچپن ۵۵ سے چھبیس ۲۶ سال تک کے عرصے کے بہت سے واقعات ہم نے خاکے میں بطور یادداشت نوٹ کیے جو چھپنے سے رہ گئے۔ اس کے لیے اگر آپ بے چارے کاتب کے سہو کی شکایت کریں تو ہم تائید کرنے کے لیے حاضر ہیں۔

اپنے نصف عمر کے واقعات کا خاکہ مکمل کر کے جوانی کے خوش گوار واقعات کچھ اس طرح ہمارے پیش نظر تھے جیسے ایک نفیس کیک سامنے رکھا ہو اور یہ طے کیا جارہا ہو کہ کہاں سے بسم اللہ کی جائے ۔۔ مگر آندھی پھر آ گئی اور زیادہ زور سے ۔۔۔۔۔
"مہینہ بھر سے بال آج کٹ رہے ہیں کل کٹ رہے ہیں۔ سر ہے کہ چھپر ہو رہا ہے۔ میں نے نائی بلوا لیا ہے ۔۔۔ موئی فہرست بنی تھی: "نمبر ۱۔ بال کٹوانا" ۔۔۔ "اٹھیے آپ کو میرے سر کی قسم۔ خشخشی کرا لیجیے گا تاکہ کچھ مہینوں کی چھٹی ہو جائے۔"
ایسے ہی موقعوں پر بیوی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اور نائی کے آگے تو، بقول ظریف مرحوم، سب ہی سر جھکاتے ہیں!



شانتی کا راجدوت

لال بہادر شاستری کی خدماتِ امن
(معاہدۂ تاشقند) کے نام

وقار خلیل

وہ شانتی کا راجدوت، امن کا پیام بر
وہ پاسبانِ رنگ و بو
دیارِ رنگ و نور میں
نویدِ صبحِ مشک بو کلی کلی کو دے گیا !

وہ ایک وعدۂ وفا
بصد خلوص و صد جتن تمام کر چکا تو پھر
ردائے شب میں چادرِ سحر کو رُخ پہ اوڑھ کر
شبِ الم میں اک چراغ آرزو جلا گیا
بڑے ہی چین اور سکون سے شانتی کا راجدوت
کرن کرن کو سونپ کر امانتیں چلا گیا

دھنک کے رنگ کے سمان ارضِ ہند و پاک پر
وہ شانتی کا راجدوت، امن کا پیام بر
مثالِ مطلعِ سحر افق افق بکھر گیا !

رو رہا ہے ترے غم میں ہندوستاں

منہاج دھر

سینۂ ہند سے اُٹھ رہا ہے دھواں
کس قدر ہے کُہر خیز سارا جہاں
تیری فرقت ہے دُنیا پہ بارِ گراں
روس سے لے کے امریکہ تک ہے فغاں
اے بہادر پرستارِ امن و اماں
رو رہا ہے ترے غم میں ہندوستاں

تیرا پیغام تھا صلح اور آشتی
تو نے اس راہ میں جان تک اپنی دی
جگمگا جائے گی تجھ سے تاریخ بھی
مر کے بھی تو امر ہے ہمیشہ یہاں
اے بہادر پرستارِ امن و اماں
رو رہا ہے ترے غم میں ہندوستاں

تجھ سے ہر راہ رو کو سہارا ملا
رہ بری اب کریں گے ترے نقشِ پا
بعد نہرو کے تو رہ برِ قوم تھا
عزم سے تیرے تھا گام زن کارواں
اے بہادر پرستارِ امن و اماں
رو رہا ہے ترے غم میں ہندوستاں

اے جفا کیش، جانِ وطن، مرحبا !
تجھ سے بالا تھی شانِ وطن، مرحبا !
مرحبا ! پاسبانِ وطن، مرحبا !
تیرے دم سے تھا ہر سو چراغاں یہاں
اے بہادر پرستارِ امن و اماں
رو رہا ہے ترے غم میں ہندوستاں

ایک مسافر ایک پیغام

سیّد خورشید افسر بسوانی

اب نہ میدان میں لاشوں کے لگیں گے انبار
گودیں اُجڑیں گی نہ بہنوں کا سہاگ اُجڑے گا
ٹینک چیخیں گے نہ توپوں سے شرر نکلیں گے
بم کے بُرہول دھماکوں کا تصوّر کیسا
اب کسی کو کوئی پتھر بھی نہیں مارے گا
مل گیا آج گلے سبز ترنگا پرچم
ہند و پاک ایک ہوئے دیر و حرم ایک ہوئے
اہلِ فن ایک ہوئے اہلِ قلم ایک ہوئے
ہر طرف جشنِ مسرت ہے کہ ہم ایک ہوئے
آج شعلے نہیں رقصاں ہیں فضا میں نغمے
اب زمیں خون نہیں لعل و گہر اُگلے گی
اب یہاں جنگ نہیں پیار کی باتیں ہوں گی

لیکن افسوس! صد افسوس! وہ مردِ آہن
جس نے ناموسِ وطن کی خاطر
بڑھ کے تلوار اُٹھالی تھی پئے امن و اماں
ایسا گرجا تھا کہ بجلی کی کڑک ہو جیسے
ایک آواز میں جاگ اُٹھے تھے شیرانِ وطن
جیت کر جنگ وہ جب صلح کے میداں میں گیا
اُٹھ گئیں سارے زمانے کی نگاہیں اُس پر
لوگ کہتے تھے کہ اب صلح بڑی مشکل ہے

لیکن اُس مردِ مجاہد نے وہ پیغام دیا ——
ہو گئیں خیرہ و بے تاب نگاہیں جس سے
اُٹھ کے اک بنتِ سیاست نے گلے میں اُس کے
فاتحِ امن کا جے مالا ہی ڈال دیا
ساری دُنیا سے مُبارک کے پیامات آئے
زندگی نغمہ بلب رقص کناں دکھی گئی
اور وہی راہ نما، مردِ جری، شیرِ وطن
جس نے دُنیا کو الاؤ میں جھلسنے نہ دیا
جس نے عالم کو درخشندہ محبّت بخشی
عشق کو عزم دیا، دل کو حرارت بخشی
جس کی آمد پہ یہاں جشنِ طرب ہونا تھا
جس کے دیدار کو بے تاب تھیں لاکھوں آنکھیں
انتظارِ سحرِ نو میں تھا بیدار وطن
[illegible] یکایک مرے کانوں کے قریب
جیسے جبریلؑ سی آواز میں کہتا ہے کوئی
جسم اب آئے گا اُس کا، وہ نہیں آئے گا ——
اُس کا جادہ ہے سکوں، امن ہے منزل اُس کی
اب مسافر ہے وہ اور اُس کو سفر کرنا ہے
اک سفر ختم ہوا، ایک سفر جاری ہے
یہ سفر وہ ہے کہ جو ختم نہیں ہوتا ہے

اے تاشقند کے راہی

فرحت کیفی

مرا سلام لے اے تاشقند کے راہی!
کہ تو نے امن کی راہوں کو بخش دی ہے ثبات
ترا شریر ہمہ جاذبِ نظر نہ سہی
مگر ضرور ہمہ منفرد تھی تیری ذات
کہ تو غنی تھا جہاں اُٹھا زندگی کا سوال
کہ تو اٹل تھا جہاں آ گئی اصول کی بات
کہ تو نے توڑ دیا سارے مذہبوں کا طلسم
کہ تو نے سب کو کیا روشناسِ رازِ حیات
کہ تو نے جیسے کسی معجزے سے کام لیا
کہ تو نے ایسی بدل دی تھی صورتِ حالات
کہ تو نے بخشا تھا محنت کشوں کو ذوقِ عمل
کہ تو نے از سرِ نو پھونک دی تھی روحِ حیات
کہ تو نے معرکے طے کر لیے تگ و دو سے
کہ تو نے مشکلیں جھیلیں بڑے ہی صبر کے ساتھ
کہ تو نے سارے زمانے کی لاج بھی رکھ لی
کہ تو نے کہہ دی زمانے سے طرزِ امن کی بات
کہ تو نے اپنے پرایوں کو ایک سا جانا
کہ تو نے پیار سے اغیار کو بھی دے دی مات
کہ تو نے غیر کے زخموں پہ رکھ دیا پھاہا
کہ تو نے دوش پہ رکھ لی بساطِ تعمیرات
کچھ اس لیے بھی تو مقبولِ خاص و عام ہے آج
عمل ہے گویا عبارت ہیں تری تعلیمات
”عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے“
کہ کونپلیں تو نکل آئیں، پھل نہ پھول نہ پات
مرا سلام لے، اے تاشقند کے راہی!
مرا سلام لے، اے تاشقند کے راہی!

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

مین پوری میں دُہری فصلوں کے رقبۂ کاشت میں اضافہ ـــــ سائنس کی تعلیم کیلئے مالی امداد ـــــ لڑکیوں کے اسکول کو کمروں کی تعمیر کے لیے امداد ـــــ چند دیسی بجلی گھر کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ـــــ رُوس اتر پردیش سے مویشی خریدے گا ـــــ ریاستی سرکاری فارم ـــــ چھوٹی ہائڈل بجلی گھر تقریباً مکمل ـــــ لکھنؤ کا میوزک کالج حکومت کے زیر انتظام ـــــ شہری دفاع کی تربیت پانے والوں کو گورنر نے سندیں دیں ـــــ نجی حلقے میں ۱۰ کروڑ روپے سے صنعتوں کا قیام اور ان کی توسیع ـــــ تیسرے منصوبے میں ۱۳ صنعتی ریاستوں کی تعمیر مکمل ـــــ اسکولوں میں مزید کمروں کی تعمیر کے لیے ۱۰ لاکھ روپے سے زائد کی منظوری ـــــ باغوں کی ترقی سے متعلق کمیٹی کی تشکیل ـــــ قومی بچت سے متعلق تخلیقات پر انعامات ـــــ بے گھروں کو مالی امداد ـــــ امپرومنٹ ٹرسٹوں کی نئے سرے سے تشکیل ـــــ گندے پانی کی اسکیموں کے لیے قرضے ـــــ بھات کھنڈے موسیقی کالج لکھنؤ حکومت کے انتظام میں ـــــ آلو کے کاشت کاروں کو معقول قیمت دینے کے اقدامات ـــــ گرام سیوکوں کے مقابلے کے نتائج ـــــ فروٹ ٹکنالوجی ڈپلوما کے نتائج امتحان ـــــ اسکولوں میں فرنیچر کے لیے مالی امداد ـــــ ریاستی مچھلی کارپوریشن کا قیام ـــــ ترائی اور بھابر سرکاری املاک کے حصہ داروں کے حقوق ختم کرنے کی تجویز ـــــ متفرقات

ضلع مین پوری میں دُہری فصلوں کی کاشت کے رقبے میں جو گزشتہ سال ۲٫۸۰ لاکھ ایکڑ تھا تقریباً ۸۵۰۰ ایکڑ کا اور اضافہ ہوا ہے اور ۱۵۰۰۰ ایکڑ میں ڈبلنگ طریقہ سے بوائی کی گئی۔ اس طریقہ کاشت کے سلسلے میں ربیع کی گزشتہ مہم کے دوران اسکول کے بچوں نے نمایاں حصہ لیا۔ ربیع کے زیر کاشت رقبے میں مزید اضافہ کرنے میں اس ضلع نے آگرہ ڈویژن میں پہلا مقام حاصل کیا اور بیوار بلاک میں دین پور کے شری لال سنگھ کو ریاستی سطح کے مقابلہ میں ۱۰۰۰ روپیہ کا انعام ملا۔ شری سنگھ نے ۵۰٫۹۴ من فی ایکڑ سے زیادہ گیہوں پیدا کیا تھا۔

ضلع کے سلطان گنج بلاک نے بوائی کے ڈبلنگ طریقہ اپنانے میں، مدن پور بلاک نے دوہری فصلیں بونے میں، کیسری بلاک نے آلو کی کاشت کرنے میں اور رخیرہ گڑھ بلاک نے ترکاریاں پیدا کرنے میں پہلا مقام حاصل کیا۔ ضلع کی سطح پر ہونے والے چارہ کے مقابلوں میں نو کسانوں کو ۳۰۰ روپیہ ـ ۲۰۰ روپیہ اور ۱۰۰ ـ ۱۰۰ روپیہ کے انعامات چری، برسیم اور رجکی کی کاشت کے لئے دئے گئے۔

زائد پیداوار کے لئے نئے بازار تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

حکومت اتر پردیش نے انٹرمیڈیٹ درجوں میں سائنس کی تعلیم کے لئے امدادی ہائر سیکنڈری اسکولوں کو ۱۳۰۰۰۰ روپیہ کی غیر متواتر مالی امداد دینا منظور کیا ہے۔ یہ امداد سائنس بلاکوں کی تعمیر اور ضروری ساز و سامان کی خریداری پر صرف کی جائیگی۔

حسب ذیل سات امدادی انٹرمیڈیٹ کالجوں کو ۱۵ـ۱۵ ہزار روپیہ ملے گا۔

راشٹریہ انٹر کالج لوار ـ میرٹھ، سی ـ اے ـ انٹر کالج کرورا بلند شہر، آر ـ این ـ آئی ـ انٹر کالج بھگوان پور سہارنپور، سبھاش انٹر کالج آنولہ ـ بریلی، دامودر انٹر کالج ـ علی پور ـ آگرہ، مردان انٹر کالج تال بھیٹ ـ جھانسی، اور جوہری دیو (گرلس) انٹر کالج ـ کانپور،

گونڈا انٹر کالج سادات غازی پور اور کانپور گرلز ہائر سیکنڈری اسکول اشوک نگر ـ کانپور کو بالترتیب ۱۰ ہزار روپیہ اور ۱۵ ہزار روپیہ ملے گا۔

ریاستی حکومت نے لڑکیوں کے تیرہ اسکولوں کو مزید کمرے تعمیر کرنے کے لئے ۹۷،۵۰۰ روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔ ہر اسکول کو ۷،۵۰۰ روپیہ ملے گا۔

ان اسکولوں کے منتظمین سرکاری امداد کی کم سے کم ایک تہائی رقم اپنے پاس سے ملائیں گے۔ اسکولوں کے نام یہ ہیں ـــ کے۔ بی۔ آر۔ سی۔ کلا کیندر۔ ہائر سیکنڈری اسکول بریلی، میونسپل گرلس انٹر کالج۔ بدایوں، تیواری جوالا پرشاد آریہ کنیا انٹر کالج اٹاوہ، آریہ کنیا ہائر سیکنڈری اسکول باندہ، گرو نانک ودیالیہ ہائر سیکنڈری اسکول۔ کانپور، ودیا مندر مہیلا انٹر کالج کانپور، چندر کماری جوالا شنکر رائے زادہ بالیکا ودیالیہ شمس آباد۔ فرخ آباد، آریہ کنیا انٹر کالج الہ آباد، مارواڑی گرلس ہائر سیکنڈری اسکول دیوریا، آریہ کنیا انٹر کالج۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد، لاریٹو کانوینٹ کالج لکھنؤ، سینٹ ایگنیز لاریٹو ہائر سیکنڈری اسکول لکھنؤ اور ایم۔ ایل۔ این میموریل گرلس انٹر کالج نیو حیدر آباد۔ لکھنؤ۔

ضلع مراد آباد میں چندوسی بھاپ بجلی گھر میں مزید ۶۰۰۰ کے۔ ڈبلو بجلی پیدا کی جائے گی جس سے ریاست کے مغربی اضلاع میں صنعتی زراعتی اور گھریلو کاموں کے لئے بجلی کی بڑھتی ہوئی مانگ پوری ہوسکے گی۔

بجلی گھر میں ۳-۳ ایم۔ ڈبلو۔ کے دو ٹربو جنریٹنگ سیٹ لگا دئے گئے ہیں۔ یہ جنریٹر جوین سے لائے گئے ہیں۔ اب چندوسی بجلی گھر کی بجلی پیدا کرنے کی مجموعی صلاحیت بڑھ کر ۱۵ر۶ ایم۔ ڈبلو ہوگئی ہے۔

روس نے حکومت اتر پردیش کے محکمہ نگہداشت مویشیان سے ۲۹ مویشی جن میں ساہیوال اور مرّہ نسل کے بچھڑے اور بچھیاں شامل ہیں، خریدنا منظور کر لیا ہے۔ یہ مویشی ریاستی مویشی فارم چک گنجریا، لکھنؤ سے سپلائی کئے جائیں گے۔ روس پہلی مرتبہ ہندوستان سے مویشی خرید رہا ہے اور روس کے ماہرین نے اس مقصد کے لئے چک گنجریا فارم کو منتخب کیا ہے۔

ان مویشیوں کی مالیت ایک لاکھ روپیہ ہے۔ ساہیوال نسل کے ہر بچھڑے اور بچھیا کی قیمت بالترتیب ۴۵۰۰ روپیہ اور ۳۵۰۰ روپیہ اور مرّہ نسل کے ہر بچھڑے اور بچھیا کی قیمت بالترتیب ۳۵۰۰ روپیہ اور ۲۰۰۰ روپیہ ہے۔

ریاستی حکومت نے روس کے عوام کے لئے خیرسگالی کے جذبہ کے طور پر ساہیوال نسل کا ایک بیل بطور تحفہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

اتر پردیش میں سرکاری فارم ۱۹۴۹۰ ایکڑ کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں اس وقت ۱۳۹۳۰ ایکڑ آراضی زیر کاشت ہے اس میں سے ۸۰ فیصدی آراضی کو آبپاشی کی سہولتیں دستیاب ہیں اور بقیہ ۲۰ فیصدی آراضی کو دشوار گزار خطے اور بورنگ کے سازو سامان کی کمی کی وجہ سے ابھی تک آبپاشی کی سہولتیں فراہم نہیں جا سکی ہیں۔

ان فارموں میں سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے دوران تقریباً ۲۱۲۵۹ کوئنٹل گیہوں، ۲۶۱۷ر۱۷ کوئنٹل دھان اور ۲،۷۶۲ کوئنٹل چنا پیدا ہوگا۔

جھولی میں ۶۰۰ کے۔ ڈبلو کا ہائیڈل بجلی گھر قریب مکمل ہے اور اس سال چالو ہو جائے گا۔ اس بجلی گھر میں ۲۰۰ - ۲۰۰ کیلوواٹ کے تین جنریٹنگ سیٹ لگائے جا رہے ہیں۔ اس سے جھولی، نندپریاگ اور گوپیشور کے قصبوں کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

سردست جھولی میں ایک چھوٹے ڈیزل بجلی سے ان قصبوں کو بجلی فراہم کی جا رہی ہے۔

بجلی گھر کے بن جانے سے اس علاقہ کی صنعتی اور زراعتی ترقی کے لئے کافی بجلی دستیاب ہوسکے گی۔

جنیرہ ۸۸ تک

ریاستی حکومت نے بھات کھنڈے کالج آف میوزک لکھنؤ کو اپنے انتظام میں لے لیا ہے ۔ یہ ادارہ ابتک یو۔ پی سنگیت ناٹیہ بھارتی کے زیر انتظام چلایا جا رہا تھا۔ حکومت نے ٹکیکر کمیٹی کی سفارش پر یہ فیصلہ کیا ہے ۔

حکومت نے یہ کمیٹی گزشتہ اپریل میں اتر پردیش میں موسیقی کے اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور ان کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کرنے کی غرض سے مقرر کی تھی ۔

ریاست کے مختلف موسیقی کے اداروں کے نصاب اور ان کے امتحانوں کے طریقے کو معیاری بنانے کے لئے ایک بورڈ آف کنٹرول مقرر کرنے کے واسطے بھی حکومت اقدام کر رہی ہے۔

شہری دفاع کی تربیت پانے والوں کے ۲۲ ویں گروپ کو سرٹیفکیٹ دینے کی تقریب لکھنؤ میں ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو شہری دفاع تربیتی مرکز میں منعقد ہوئی ۔ اتر پردیش کے گورنر شری بشوناتھ داس نے اس تقریب کی صدارت کی اور سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ دو تربیت پانے والوں کو "اے"، ۱۱ کو "بی" اور ۳۰ کو "سی" زمرے میں رکھا گیا۔ اس گروپ میں سات تربیت پانے والے کامیاب نہیں ہو سکے۔ تربیت پانے والوں میں شری رام شنکر شکلا کو بہترین امیدوار قرار دیا گیا۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے گورنر نے کہا کہ شہری دفاع کی نہ صرف ہنگامی حالات بلکہ امن کے زمانہ میں بھی نمایاں اہمیت ہے۔ انھوں نے پاکستان اور چین کے خطرے سے آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ تاشقند معاہدے پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے پاکستانی تیار نہیں ہیں۔ گورنر نے کہا کہ عوام صرف مکمل ضبط و نظم اور یگانگی کے ساتھ سرگرم عمل ہو کر اس خطرے کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اتر پردیش کے تیسرے منصوبہ کے دوران نجی حلقہ میں ۱۲۵ بڑی اور درمیانی درجہ کی صنعتوں کے قیام یا توسیع پر ۶۸ء۱۹۵ کروڑ روپیہ لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں صنعتی پروجیکٹ زیر عمل ہیں۔

مذکورہ بالا ۱۲۵ صنعتی واحدوں میں سے ۷۳ کو دوسرے منصوبے اور ۵۲ کو موجودہ منصوبے کے دوران مرکزی حکومت نے لائسنس منظور کئے۔

تیسرے منصوبے کے دوران جو نئی صنعتیں قائم کی گئیں ان میں ۱ کپڑے اور ۹ شکر کے واحدے شامل ہیں۔ ریاست میں جن دوسرے اہم صنعتی واحدوں کا قیام عمل میں آرہا ہے وہ یہ ہیں ـــ کانپور میں فلورسنٹ ٹیوب، مودی نگر میں سوت، ایٹہ، چندوسی اور مراد آباد میں دودھ کے پاؤڈر، لکھنؤ میں ٹیکسٹائل مشینوں اور علی گڑھ میں آکسیجن گیس کے کارخانے ۔

کانپور میں ۳۰ کروڑ روپیہ کی تخمینی لاگت سے کیمیاوی کھاد کا ایک کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے ۔ فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے گوشت خشک کرنے کا ایک کارخانہ آگرہ میں قائم کیا جا رہا ہے ۔

اتر پردیش میں تیسرے منصوبے کے دوران ۷ صنعتی ریاستوں کے ۲۷۷ چھوٹے صنعتی واحدوں میں مال تیار ہونا شروع ہو گیا۔ ان واحدوں نے جن میں ۶۲۱۲ مزدور کام کرتے ہیں سنہ ۱۹۶۴ء میں ۸۶ر۱ کروڑ روپے اور سنہ ۱۹۶۵ء کے پہلے نو مہینوں میں ۶۶ر۲ کروڑ روپے مالیت کا سامان تیار کیا۔

یہ ریاستیں کانپور، آگرہ لموئی (دیوبند) سیہارپوری، بھیت مل بھوجی پورہ ـ علی گڑھ، جھانسی، فتح پور، گورکھپور، سلیم پور، للت پور، پھولپور، خیرآباد، اناؤ اور خلیل آباد میں واقع ہیں۔

دوسرے اور تیسرے پنجسالہ منصوبوں کے دوران مجموعی طور پر ۳۷ صنعتی ریاستوں کی تعمیر کے مقررہ نشانے کے مقابلے میں اب تک ۶۳ بڑی اور چھوٹی ریاستیں تعمیر کی جا چکی ہیں۔

ان ریاستوں میں کل ۸۶۳ فیکٹری شیڈ اور کارخانوں کی تعمیر کے لئے ۹۲۲ قطعات آراضی جن میں پانی اور بجلی وغیرہ کی سہولتیں ہوں مہیا کرنے کی اسکیم تھی ۔ ان میں سے ۸۲۲ شیڈ بن کر تیار ہو گئے ہیں اور کارخانہ داروں کو تقریباً ۷۵۴ شیڈ الاٹ کئے

جا چکے ہیں جن میں سے انھوں نے ۲۴۴۳ شیڈ پر قبضہ لے لیا ہے۔

حکومت اتر پردیش نے لڑکوں کے ۶۰ اور لڑکیوں کے ۳۰ امدادی ہائر سیکنڈری اسکولوں کو کمرے (کلاس روم) کی تعمیر کے لئے مارچ ۱۹۶۶ء میں ختم ہونے والے مالیاتی سال میں ۸۰ر۱ لاکھ روپیہ کی غیر مشروط مالی امداد منظور کی ہے۔ اس رقم میں سے لڑکوں اور لڑکیوں کے ہر اسکول کو بالترتیب ۱۰ ہزار روپیہ اور ۱۵ ہزار روپیہ منظور کیا گیا۔

حکومت اتر پردیش نے شری اے۔ جی۔ کھیر کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو شہری علاقوں میں باغوں، کھیل کے میدانوں اور کھلی جگہوں کی حالت کے بارے میں اپنی رپورٹ دینے کے علاوہ ان کی مناسب دیکھ بھال اور ترقی کے لئے قانون وضع کرنے نیز انتظامات اور مالیات سے متعلق اقدامات تجویز کرے گی۔

شہروں اور قصبوں کی آبادی میں گزشتہ ۲۰ برسوں کے دوران روز افزوں اضافے کے پیش نظر اس کمیٹی کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی گئی۔ آبادی میں اس اضافے سے بیشتر کھلی زمینوں پر عمارتیں تعمیر کی جارہی ہیں۔

قومی بچت کے موضوع پر انعامی مقابلہ میں ۱۲ طلبا کو مجموعی طور پر ۹۰۰ روپیہ بطور انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ سو روپیہ، ۷۵ روپیہ اور ۵۰ روپیہ کا پہلا دوسرا اور تیسرا انعام مختصر افسانہ، نظم مضمون اور ڈرامہ کے لئے دیا گیا ہے۔ یہ انعامات قومی بچت سرٹیفکیٹوں کی صورت میں دئے جائیں گے۔

مختصر افسانہ نظم مضمون اور ڈرامہ کے لئے پہلا دوسرا اور تیسرا انعام پانے والوں کے نام درج ذیل ہیں۔

مختصر افسانہ۔ شری آر بی شنکر ترپاٹھی ہواسیہ کورٹ حضرت گنج لکھنؤ، شری چندر ولبھ پنج کوٹی، ٹونس وون پریاگ۔ اتر کاشی اور شری چھیدی لال بسنت۔ اے۔ ایس جوبلی انٹر کالج مرزا پور۔

نظم۔ شری بھگوت سہائے ورما مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ شری دھر پرشاد دویدی شاردا سنسکرت مہاودیالیہ لال کنواں لکھنؤ، شری ستیندر ناتھ استھانہ تلک دھاری کالج جونپور۔

مضمون نگاری۔ کماری پرتیبھا سکسینہ باغ مظفر خان آگرہ، شری چھیدی پرشاد دشوکرما سنت ونوبا کالج دیوریا اور شری شری نیواس پنت سول لائنز پیلی بھیت۔

ڈرامہ۔ شری جگدیش پرشاد برنوال۔ ویسلی ہائر سیکنڈری اسکول اعظم گڑھ، شری گوپال سرن سنگھ۔ شری نرہے جی ہائر سیکنڈری اسکول نرہی بلیا اور شری منگل سنگھ جنتا ہائر سیکنڈری اسکول بادشاہ پور سرولی میرٹھ۔

حکومت ہند نے پاکستان کے تارکین وطن، ہندوستانی نژاد افراد جو بیرونی ممالک سے ہندوستان واپس آئے ہیں نیز ان ہندوستانی شہریوں کو جو پاکستان کی حالیہ جنگ میں بے گھر بار ہوگئے ہیں مالی امداد دینے کے لئے امدادی اور رفاحی فنڈ قائم کیا ہے۔ ایسے افراد کو مستقبل میں بھی اس فنڈ سے مالی امداد دی جائے گی۔

یہ فنڈ عوام کے عطیات سے قائم کیا جائے گا اور اس کا نظم ونسق وزیر مالیات، نائب وزیر مالیات، ایڈیشنل سکریٹری وزارت مالیات اور جوائنٹ سکریٹری وزارت مالیات پر مشتمل ایک بورڈ کے ذمے ہوگا۔

حکومت اتر پردیش نے میرٹھ، دہرہ دون، بریلی اور گورکھپور کے اسپرومنٹ ٹرسٹوں کی تشکیل کی ہے اور متعلقہ ضلع مجسٹریٹوں کو ان کا چیرمین مقرر کیا ہے۔

مندرجہ ذیل افراد ٹرسٹی مقرر کئے گئے ہیں۔

میرٹھ۔ سرو شری رگھوکل تلک، گوپی ناتھ سنہا، سیٹھ پرتھوی ناتھ حکیم سیف الدین اور میرٹھ کے شہری اور دیہی منصوبہ بندی محکمے کے ایسوشی ایٹ پلانر۔

دہرہ دون۔ سرو شری مہنت اندریش چرن داس، بہادر سنگھ (صدر ضلع پریشد دہرہ دون)، اوم پرکاش، ایم۔ ایس۔ ماتھر اور محکمہ دیہی و شہری منصوبہ بندی ہردوار کے ایسوشی ایٹ پلانر۔

بریلی - سرو شری آنند پرکاش اگروال، جگدیش سرن اگروال، رام سنگھ کھنا، ہریش چندر ورما، اور محکمہ تعمیرات عامہ بریلی کے ایگزیکیٹو انجینیئر۔

گورکھپور - سرو شری سنگھاسن سنگھ، ایم - پی - رادھا رمن داس، ایم - ایل - سی، رام اودھ سنگھ ایم - ایل - اے، کے۔ این لہری اور محکمہ تعمیرات عامہ گورکھپور کے سپرنٹینڈنگ انجینیئر۔

حکومت اتر پردیش نے ہلدوانی اور کاٹھ گودام، رشی کیش اور کوٹ دوارا کے میونسپل بورڈوں کو گندے پانی کو کام میں لانے سے متعلق اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لئے بالترتیب .....۴۰ روپئے ۱۸۳۰۰۰ روپے اور ۲۰۰۰۰۰ روپے کے قرضے منظور کئے ہیں۔

ہلدوانی اور کاٹھ گودام میونسپل بورڈ کی گندے پانی کو کام میں لانے سے متعلق اسکیم پر تخمیناً ۱ر۲۸ لاکھ روپیہ، رشی کیش میونسپل بورڈ کی اسکیم پر ۸۶۰۰۰ روپیہ اور کوٹ دوارا بورڈ کی اسکیم پر ۲۷۴۰۰۰ روپیہ خرچ ہوگا۔

یہ قرضے چھ فیصدی سالانہ سود کے ساتھ ۵ مساوی سالانہ قسطوں میں واجب الادا ہوں گے۔

ریاستی حکومت نے کیسکر کمیٹی کی سفارشات منظور کرلی ہیں جو ریاست میں موسیقی کے اداروں کے طریقہ کار کا مطالعہ کرنے اور ان کو بہتر بنانے کے لئے سفارشات پیش کرنے کے لئے حکومت نے مقرر کی تھی۔

کمیٹی کی سفارشات کے مطابق لکھنؤ میں واقع ہندوستانی موسیقی کے بھات کھنڈے کالج کو اپنے انتظام میں لے لیگی اور اس کو ایک سرکاری ادارہ کی حیثیت سے چلائے گی۔ یہ کالج اب تک یو۔پی سنگیت ناٹیہ بھارتی، لکھنؤ کی نگرانی میں تھا۔

معلوم ہوا ہے کہ مغربی بنگال، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، جموں کشمیر، آندھرا پردیش اور مدراس کی حکومتوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اتر پردیش سے آلو خریدیں۔ حکومت مدراس ۴۳ روپیہ فی کوئنٹل کے نرخ سے ۱۵۰۰۰ ٹن آلو خریدنے کے لئے رضامند ہوگئی ہے۔

چنانچہ پیداوار کے مرکزوں سے آلو بھیجنے کے لئے ریلوے ویگنوں کی فراہمی کے انتظامات بھی کر دئے گئے۔ اس کے علاوہ آلو بھیجنے کے لئے ٹرکوں کے خصوصی پرمٹ جاری کرنے کے انتظامات بھی کر دئے گئے ہیں۔

اس مرتبہ ریاست نے ۲ر۷۵ لاکھ ایکڑ کے رقبہ میں ۱۲ر۹۰ لاکھ ٹن سے زیادہ آلو پیدا کئے۔

ضلع گورکھپور کے بھرہندہ بلاک کے گرام سیوک شری شیام بدن سنگھ کو ریاستی سطح کے مقابلے میں بہترین گرام سیوک قرار دیا گیا ہے اور ان کو ایک ہزار روپیہ کا نقد انعام عطا کیا گیا ہے۔

ضلع وارانسی میں ودیا پیٹھ بلاک کے شری پھلنی ناتھ تیواری کو جنھوں نے قومی سطح کے مقابلے میں پہلا انعام جیتا تھا ڈھائی ہزار روپیہ کی انعامی رقم اور توصیفی سرٹیفکٹ دیا جا چکا ہے۔

ریاستی سطح کے مقابلوں میں ضلع مرادآباد کے بلاری بلاک کے شری ڈی۔ ایس۔ بھٹناگر نے ۷۵۰ روپیہ کا دوسرا انعام اور ضلع مین پوری کے بیوار بلاک کے شری اوم پرکاش تھرمانے ۵۰۰ روپیہ کا تیسرا انعام حاصل کیا۔

ریاستی سطح کے مقابلوں میں انعام حاصل کرنے والوں کو متعلقہ ضلع مجسٹریٹوں کے ذریعے توصیفی سرٹیفکٹ دئے جا چکے ہیں۔

پھلوں کے تحفظ سے متعلق ریاستی نظامت کے زیر اہتمام سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں فروٹ ٹیکنالوجی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس کا جو فائنل امتحان ہوا تھا اس میں حسب ذیل طلبا کامیاب ہوئے ہیں۔ امیدواروں کے نام مع ڈویژن کے بہ اعتبار لیاقت دئے گئے ہیں۔

سروشری اشوک کمار پالیوال (فرسٹ ڈویژن)۔ راجیندر پرشاد جیسوال (فرسٹ)۔ رمیش چندر کٹیار (فرسٹ)۔ اروند کمار گپتا (فرسٹ)۔ سریش سنگھ گہروار (سیکنڈ)۔ کرشن سرن داس کھرے (تھرڈ) اور راجہ رام گپتا (پاس)۔

شری کرپا شنکر ورما (رول نمبر ۵۹) - پیپر "اے" اور شری کرشن کمار سیٹھ (رول نمبر ۵۷) کو پیپر "سی" میں سپلی منٹری امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ہوگی۔

حکومت اترپردیش نے امدادی ہائر سیکنڈری اسکول کو فرنیچر سازوسامان کی کمی کو، طلبا کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے پیش آئی، پورا کرنے کے لئے مارچ ۱۹۶۶ء میں ختم ہونے والے مالیاتی سال کے دوران وارانسی منطقہ میں ۲۶ امدادی ہائر سیکنڈری اسکولوں کو ۳۵ ہزار روپیہ کی غیر متواتر مالی امداد منظور کی۔ اس سلسلے میں لڑکوں کے ہر اسکول کو ۱۲۵۰ روپیہ اور لڑکیوں کے ہر اسکول کو ۱۸۷۵ روپیہ دیا گیا۔

لڑکوں کے اسکول کے نام یہ ہیں ——— جگت پور انٹر کالج وارانسی، سیوا آشرم انٹر کالج سرایا وارانسی، بنگالی ٹولہ انٹر کالج پانڈے حویلی وارانسی، بسنت تھیوسوفیکل اسکول کمچھا وارانسی، راجہ ہرپال سنگھ انٹر کالج سنگرامو۔ جونپور، سروودیا بیٹھ میرگنج۔ جونپور، کسان آدرش راشٹریہ انٹر کالج پرتاپ گنج۔ جونپور، سہکاری انٹر کالج مہراواں۔ جونپور، ناگرک انٹر کالج جنگھئی۔ جونپور، ٹی۔ ڈی۔ انٹر کالج جونپور، سوامی کرشنانند اسکول بیلوار۔ جونپور، ایس۔ بی۔ انٹر کالج بدلاپور۔ جونپور، بی۔ این۔ ڈی انٹر کالج مڑھیاؤں۔ جونپور، گنیش رائے انٹر کالج ڈوبھی۔ جونپور، نیشنل اسکول سید پور۔ غازی پور، آدرش انٹر کالج دلدار نگر۔ غازی پور، شیو پوجن انٹر کالج۔ ملسا غازی پور، گاندھی میموریل اسکول بہادر گنج۔ غازی پور۔ رتسر انٹر کالج رتسر بلیا، رام سترن انٹر کالج شیوپور۔ بسنت پور بلیا، بانسڈیہہ اسکول بانسڈیہہ۔ بلیا اور رود آبہ راشٹریہ اسکول بیریا۔ بلیا۔

لڑکیوں کے اسکول کے نام یہ ہیں ——— ضلع پریشد کنیا انٹر کالج چندولی وارانسی، بسنت کنیا مہاودیالیہ کمچھا وارانسی، گرلز اسکول بھدوہی وارانسی اور رسندر منڈر جیسوال اسکول مرزاپور۔

حکومت اترپردیش نے مچھلیوں کے وسائل کو موثر اور باضابطہ طور پر بروئے کار لانے کے لئے مچھلیوں کے وسائل کو موثر اور باضابطہ طور پر بروئے کار لانے کے لئے مچھلیوں سے متعلق ایک ریاستی کارپوریشن قائم کیا ہے۔

پانچ ڈائرکٹروں پر مشتمل ایک بورڈ اس کارپوریشن کو چلائے گا۔ شری۔ اے۔ آر۔ صدیقی اسپیشل سکریٹری حکومت اترپردیش کارپوریشن کے چیرمین ہونگے۔ دوسرے ڈائرکٹروں کے نام یہ ہیں ——— شری ایچ۔ کے۔ لال اڈیشنل ڈائرکٹر محکمہ نگہداشت مویشیان، شری آر۔ سی۔ بھارگو ڈپٹی سکریٹری محکمہ منصوبہ بندی اور شری وی۔ این۔ پرشاد ڈپٹی سکریٹری محکمہ مالیات۔ شری ایس۔ حامد ڈائرکٹر محکمہ مچھلی پالن اس کے منیجنگ ڈائرکٹر ہوں گے۔

یہ کارپوریشن ۵۰ لاکھ روپیہ کے منظور شدہ سرمایہ سے قائم کیا گیا ہے۔ اس نے مارچ ۱۹۶۶ء میں ختم ہونے والے مالیاتی سال میں ضلع مرزاپور میں تین خزانہ ہائے آب ——— دھنرول، ریہاند اور سرسی کے مچھلی کے وسائل کو کام میں لانے کے لئے دو لاکھ روپیہ خرچ کرنے کی اسکیم بنائی تھی۔

علاوہ ازیں کارپوریشن ریاست میں مچھلیوں وغیرہ کے وسائل کو سائنسی طور پر بروئے کار لانے میں اعانت کرے گا نیز مچھلیوں کے وسائل کو بروئے کار لانے اور مچھلیوں اور دیگر ذیلی مصنوعات کے کاروبار کے لئے تالابوں، ندیوں، جھیلوں اور دوسرے خزانہ ہائے آب کو خریدے گا یا ان کو پٹہ پر لے گا۔ مزید براں کارپوریشن مناسب مقامات پر برف اور مچھلیوں کی ذیلی مصنوعات کے کارخانے بھی تعمیر کرائے گا۔

ریاستی حکومت ضلع نینی تال میں ترائی اور بھابر کی سرکاری املاک کے ۵۸ بندوبستی مواضعات میں حصہ داروں کے حقوق جلد ختم کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔

ترائی اور بھابر کی سرکاری املاک کے ۵۲ مواضعات میں مستاجروں کے حقوق یکم جولائی سنہ ۱۹۶۵ء کو ختم کردئے گئے ہیں۔ سرکاری املاک کے بقیہ مواضعات میں کوئی زمینداری حصہ داری نہیں ہے اس لئے وہاں زمینداری کو ختم کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

متفرقات

اسکولی لائبریریوں کیلئے مالی امداد۔ حکومت اتر پردیش نے الہ آباد اور وارانسی کے منطقوں میں امدادی ہائر سیکنڈری اسکولوں کی لائبریریوں کو کتابوں کی خریداری کے لئے ۸۵ ہزار روپیہ کی غیر متواتر مالی امداد منظور کی ہے۔ لڑکوں کے ہر اسکول کو ۲۵۰۰ روپیہ اور لڑکیوں کے ہر اسکول کو ۲۷۵۰ روپیہ ملے گا۔

سُناروں کے بچّوں کو وظیفے۔ حکومت اتر پردیش نے ایسے سناروں کے بچوں کو جو سونا کنٹرول آرڈر سے متاثر ہوئے ہیں وظیفے دینے کے لئے مزید ایک لاکھ روپیہ منظور کیا ہے۔

حسن کارکردگی کیلئے اسکولوں کو امداد۔ حکومت اتر پردیش نے حسن کی کارکردگی کے پیش نظر مالی امداد دینے کی اسکیم کے تحت ۵۰ امدادی ہائر سیکنڈری اسکولوں کو سنہ ۶۶ - ۱۹۶۵ء کے دوران امتحان کے اچھے نتائج نیز نظم وضبط اور درس وتدریس کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے کے لئے ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔ ان میں سے ۱۰ اسکولوں کو چار چار ہزار روپیہ ۲۰ اسکولوں کو دو دو ہزار روپیہ اور ۲۰ اسکولوں کو ایک ایک ہزار روپیہ ملے گا۔

پاکستانی جریدہ کی ضبطی۔ مرکزی حکومت نے اردو جریدہ "کشمیر" مورخہ ۷ رمئی سنہ ۱۹۶۵ء ضبط کرلیا ہے جس کی ترتیب طباعت اور اشاعت تحسین جعفری نے کی تھی اور جو تعمیر پرنٹنگ پریس، سید پیری روڈ راولپنڈی سے طبع اور راولپنڈی اور مظفر آباد سے شایع کیا گیا تھا۔ اس میں ایسی رپورٹیں موجود ہیں جو قانون دفاع ہندسنہ ۱۹۶۲ء کے قاعدہ ۳۵ کے فقرہ (۷) کے تحت مضرت رساں ہیں۔

جریدہ کا مذکورہ بالا شمارہ معہ اس کے ترجموں اور اقتباسات کے بحق حکومت ضبط کرلیا گیا ہے۔ جس شخص کے پاس اس شمارہ کا کوئی نسخہ ہو وہ اس کو مقامی پولس حکام کے حوالے کردے۔

بستی میں نیا ہائیڈل ڈویژن۔ ریاستی حکومت موجودہ بلرام پور ڈویژن کو ختم کرنے اور بستی میں ایک نیا ہائیڈل ڈویژن قائم کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ ریاستی بجلی بورڈ نے انتظامی سہولت، بہتر کارکردگی اور صارفین کو زیادہ سے زیادہ سہولتوں کی فراہمی کے پیش نظر یہ تجویز پیش کی ہے۔

غازی آباد میں زمین کے حصول و ترقی کیلئے قرضہ۔ حکومت اتر پردیش نے زمین کے حصول اور ترقی کے لئے غازی آباد امپروومنٹ ٹرسٹ کو ایک کروڑ ایک لاکھ روپیہ کا قرضہ منظور کیا۔

اس قرضے سے جن زمینوں کو ترقی دی جائیگی وہ تعمیر مکانات کی مختلف اسکیموں کے تحت مکانوں کی تعمیر کے لئے کام میں لائی جائیں گی۔

الہ آباد میں گنگا پر پل کی تعمیر۔ جھونسی کو آمد ورفت کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے دارا گنج الہ آباد میں ایک پل کی تعمیر اس سال فروری میں شروع کردی گئی ہے۔ اس منصوبہ پر ۲۲۵٫۲۷ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔

ضلع نینی تال میں پل کی تعمیر۔ ضلع نینی تال میں رانی باغ۔ بھیت مل روڈ پر بلیا نالہ پر ایک نیا پل تعمیر کیا جائے گا۔ ریاستی حکومت نے اس کی تعمیر کے لئے ۳۱٫۶۱ لاکھ روپیہ منظور کیا ہے۔

زراعتی کاموں کے لئے بجلی کی شرحیں۔ مرکزی حکومت سے یہ ہدایت موصول ہوئی ہے کہ زراعتی کاموں کے لئے بجلی کی شرح ۱۲ پیسے فی یونٹ سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ جہاں کہیں بجلی کی شرح

اس سے زیادہ ہوگی وہاں اس ہدایت کے مطابق زائد رقم مرکزی اور ریاستی حکومت بحصہ مساوی ادا کرے گی۔

لکھنؤ، گورکھپور، الہ آباد یونیورسٹی کورٹ کے ممبران حسب ذیل پانچ ممبروں کو لکھنؤ یونیورسٹی کورٹ کا رکن منتخب کیا ہے:۔

سروشری کیشری پرشاد پانڈے (جونپور)، گیا پرشاد مہروترا (سیتاپور)، مکندی لال (کوٹ دوار۔ گڑھوال)، بنسی دھر مصرا (کھیری) اور راجہ وجے کمار ترپاٹھی (لکھنؤ)۔

حسب ذیل ممبران کو گورکھپور یونیورسٹی کورٹ کا رکن منتخب کیا گیا ہے:۔

سروشری اُگرسین (دیوریا)، رام سورت پرشاد (گورکھپور)، وششٹ نرائن شرما (غازیپور)، جگن ناتھ راؤ (جونپور) اور شریمتی کملا رانی مصرا (ہردوئی)۔

الہ آباد یونیورسٹی کورٹ کے ممبران:۔

سروشری بابوجی اگروال (آگرہ)، جگن ناتھ سنگھ (فتح پور)، چودھری نونہال سنگھ (الہ آباد)، کلیان چند موہلے (الہ آباد) اور ڈاکٹر راجیندر کماری باجپئی (الہ آباد)۔

اسٹیشن کے نام میں تبدیلی ۔ ضلع وارانسی میں مشرقی ریلوے کے فلیگ اسٹیشن "مہیسوا نونار" کا نام بدل کر "تلسی آشرم" کر دیا گیا ہے۔

اترپردیش میں مکمل نشہ بندی زیر غور ۔ وزیر صحت و آبکاری نے ۲۳ مارچ ۶۶ء کو ودھان سبھا میں بتایا کہ حکومت ریاست میں مکمل نشہ بندی نافذ کرنے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔

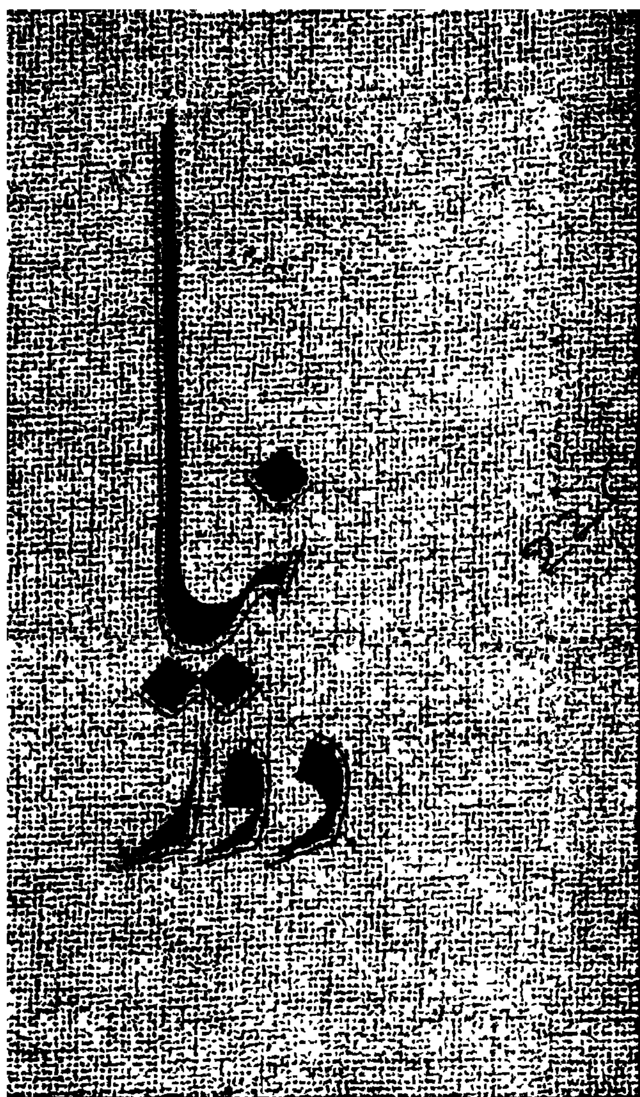
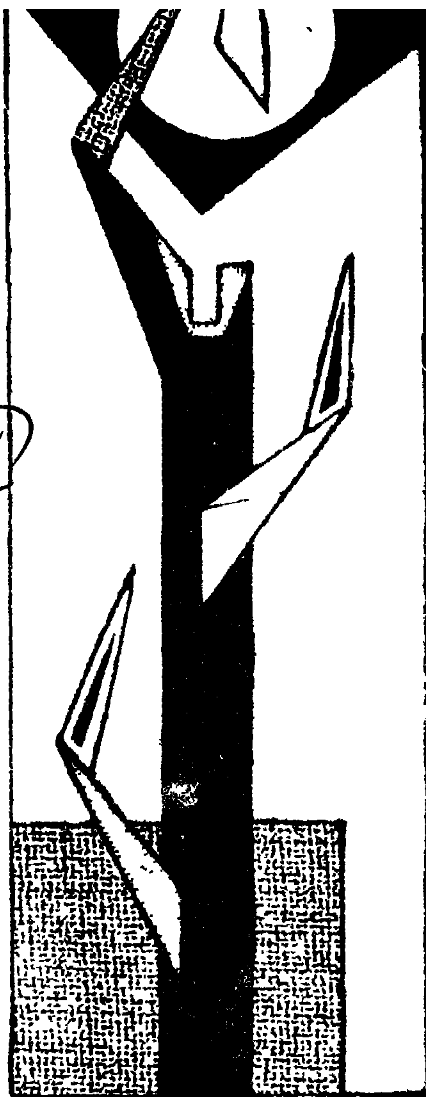
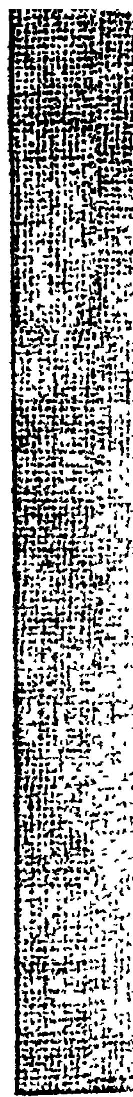
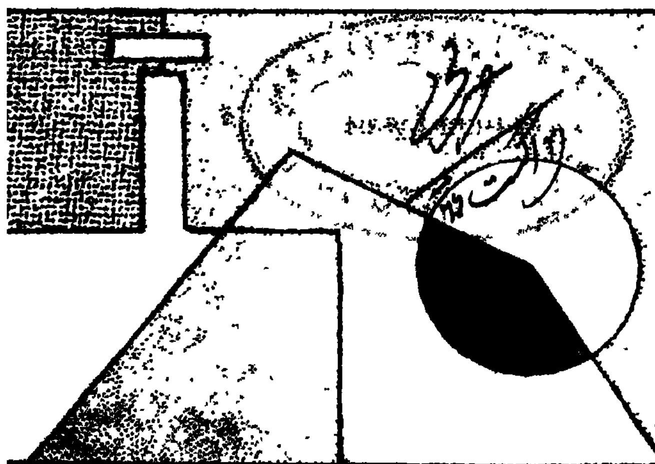
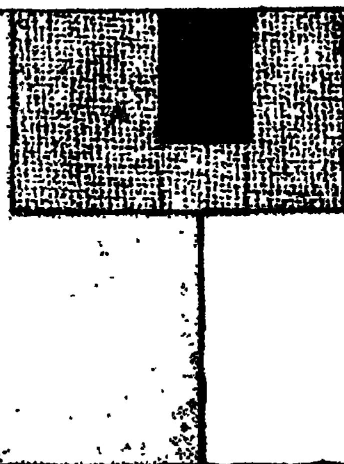
انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ریاست میں شراب اور اسپرٹ کی فروخت سے حکومت کو ۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران ۲،۷۷،۲۹،۶۹۲،۸۶ روپے اور سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے دوران ۲۲،۷۲،۷۶،۱۲۷،۱۰۱ روپے کی آمدنی ہوئی۔

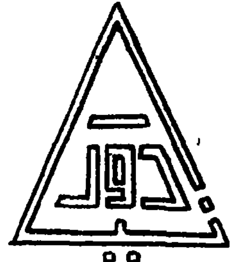
ترقیاتی بلاکوں کے بارے میں ابھی فیصلہ نہیں ہوا ۔ وزیر اجتماعی ترقی نے ۲۲ مارچ ۶۶ء کو ودھان سبھا میں بتایا کہ ضلع حکام اور ضلع پریشدوں کی قراردادوں پر غور و خوض کرنے کے بعد ریاست میں ۲۲۴ ترقیاتی بلاکوں کو ختم کرنے کا معاملہ قطعی فیصلہ کے لئے ہدایات سے متعلق کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اسی لئے اس مرحلہ پر ان بلاکوں کی تعداد اور نام بتانا قبل از وقت ہے جو ختم کئے جائیں گے کیونکہ ابھی اس سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔

تصحیح نیا دور (۲۶ جنوری/فروری ۱۹۶۶ء) کے صفحے ۷ پر ایک مصرع اس طرح شایع ہو گیا ہے "ہر کسے داند نہ داند جام و سنداں باختن"۔ صحیح یہ ہے۔ "ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن"۔

تصحیح ۔ نیا دور بابتہ مارچ ۱۹۶۶ء میں علی جواد زیدی صاحب کا ایک مضمون "درس نظامی" کے عنوان شایع ہوا ہے۔ صفحہ ۲۱ سطر ۲ میں صدرا کی شرح وقایہ کے بجائے صدر الشریعۃ کی شرح وقایہ پڑھا جائے۔ ایڈیٹر



جلد ۲۲ | نمبر ۲

ویشاکھ ۱۸۸۸ اشک
مئی سنہ ۱۹۶۶ عیسوی

چندہ سالانہ پانچ روپے۔
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
آر۔ سی۔ پنت
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

اپنی بات

گوپال کرشن گوکھلے، جن کا صد سالہ یوم پیدائش ملک بھر میں ۹ مئی ۱۹۶۶ء کو منایا جا رہا ہے، ان عہد آفریں شخصیتوں میں تھے جنھوں نے ہندستانیوں میں ایک نئی ذہنی اور جذباتی لہر پیدا کی۔ گوکھلے نے جب پبلک لائف میں قدم رکھا تو انق ہند پر جہاں دادا بھائی نوروجی، مہادیو گووند رانا ڈے، فیروز شاہ مہتا اور لوکمانیہ تلک درخشاں ستارے بن کر چمک رہے تھے۔ وہ زمانہ ہماری تاریخ سیاست کا شاید سب سے ہیجان خیز زمانہ تھا۔ خود کانگریس کے اندر تیزی کے ساتھ بنیادی تبدیلی ہو رہی تھی۔ اعتدال پسندانہ اصلاح پسندی کی جگہ انقلابی آزادی پسندی سے لوگوں کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ سمجھوتے، مراعات، یادداشت اور ریزولیوشن، انہیں مطمئن نہیں کر پاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمانی طرز حکومت کے خواہش مند معتدلین کے خلاف بال گنگا دھر تلک کی قیادت میں انتہا پسندوں کا ایک طبقہ ابھرا اور رفتہ رفتہ ایک خاص گروہ انتہا پسند سیاست کے ماننے والوں کا پیدا ہو گیا۔ اس کے برعکس گوکھلے آئینی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ یہ آئینی اور مصلحانہ طریقہ جدوجہد ان کا پختہ یقین و عمل ہی تھا جس نے انھیں بہت جلد ملک کا ایک ممتاز لیڈر بنا دیا۔ وہ ایک سچے قوم پرور اور محب وطن تھے۔ ان کا صرف یہی خیال نہ تھا کہ عوامی زندگی کو روحانیت سے ہم کنار ہونا چاہیے بلکہ وہ اس کے بھی قائل تھے کہ وطن کی محبت اس طرح رگ رگ میں سرایت کر جانا چاہیے کہ اس کے سامنے ہر چیز ہیچ نظر آئے۔ اور انھوں نے اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ سارا ہندستان ان کا اپنا گھر ہے اور وہ پورے ہندستان کے شہری ہیں۔ ان کے خلوص، ان کی صداقت، وطن کی خدمت کے لیے ان کی لگن، ان کی جمہوریت پسندی، آزادی فکر کی علم برداری، مشکلات و خطرات میں بھی اپنے مقصد و نصب العین پر قائم و برقرار رہنا، خدا کی مرضی و منشا پر ان کا غیر متزلزل یقین، اور وطن کے لیے قربانی کے موقع پر مسرت سے سرشار ہونے کی آرزومندی، یہ وہ اوصاف تھے جن سے گاندھی جی بے حد متاثر ہوئے اور اسی لیے یہ نہ کوئی اتفاق تھا اور نہ اس میں کوئی حیرت کی بات کہ انھوں نے گوکھلے کو اپنا سیاسی گرو تسلیم کیا۔

گوکھلے قدیم بمبئی پریذیڈنسی کے ضلع رتناگری کے ایک گاؤں کوٹ لوک میں ۹ مئی ۱۸۶۶ء کو ایک اوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی ۱۳ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش کا بار ان کے بڑے بھائی پر آ گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں الفنسٹن کالج بمبئی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ فرگوسن کالج میں تاریخ اور پولیٹیکل اکنامی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ فرگوسن کالج ہی میں اس وقت کے عظیم ترین بھارتی جسٹس رانا ڈے سے ان کا گہرا رابطہ قائم ہوا۔ وہ رانا ڈے کا بے حد احترام کرتے تھے اور انھیں اپنا گرو سمجھتے تھے۔ گوکھلے کے کردار کی تعمیر میں رانا ڈے کا بہت ہی اہم حصہ ہے۔ انھیں کے اثرات سے گوکھلے نے اپنی زندگی سیاسی اور سماجی خدمات کے لیے وقف کر دی۔ ۱۸۸۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے۔ نمک ٹیکس کم کرنے کی ایک تجویز کی حمایت میں ان سے کانگریس میں تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس وقت ان کی عمر کل ۲۴ سال کی تھی۔ انھوں نے زبردست اور بے حد اثر انگیز تقریر کی۔ اب ان کی شہرت اتنی بڑھ چکی تھی کہ انھیں ایک ابھرتا ہوا ستارہ کہا جانے لگا۔ ویلبی کمیشن کے سامنے ۱۸۹۶ء میں گواہی دیتے ہوئے انھوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت ملک میں بڑھتی ہوئی غربت کا پردہ فاش کیا۔ اس طرح سیاسی اور اقتصادی حلقوں میں ان کی کل ہند شخصیت مسلم ہو گئی۔ ۱۸۹۹ء میں گوکھلے بمبئی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب کیے گئے۔ کونسل میں انھوں نے بہت اہم مسائل خصوصاً سے متعلق کوڈ، لینڈ ایلی نیشن بل اور میونسپلٹیوں کے طریق کار میں خاص دلچسپی لی۔ پھر ۱۹۰۲ء میں وہ ۳۶ سال کی عمر میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد متواتر تین بار کونسل کی ممبری کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ تھا۔ کونسل میں انھوں نے اپنی تقریروں میں نئے دور، حکومت، عوام کے بنیادی حقوق، تعلیمی ترقی اور اخبارات کی آزادی کی مانگ کی۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ چھ سال سے دس سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم لازمی قرار دی جانا چاہیے۔ جب حکومت نے ان کی تجویز مسترد کی تو انھوں نے مدراس، الہ آباد میں ابتدائی تعلیم کی انجمنیں قائم کیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ملک میں ایک تحریک کی بھی قیادت کی۔ سول سروس کے امتحانات اور تقرریوں میں بے انصافی کا اہم مسئلہ تھا۔ گوکھلے اس دور میں حکومت پر نکتہ چینی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی بنیاد انھوں نے ۱۹۰۵ء میں ڈالی۔ یہ ملک کے لیے گوکھلے کا انتہائی گراں قدر عطیہ تھا۔ سوسائٹی کے آئین میں فرد کے کردار اور صلاحیت کی تعمیر پر زبردست زور دیا گیا تھا۔ اس سے قبل ۱۹۰۵ء میں وہ کانگریس کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ جنوبی افریقہ میں گوکھلے نے بھارتی نسل کے لوگوں کے موقف کی بھی پیروی کی۔ یہیں گاندھی جی سے ان کا قریبی رابطہ پیدا ہوا۔ گوکھلے کی اعتدال پسندی گاندھی جی کی مقاومت مجہول تحریک کے راستے میں حائل نہ تھی۔ ان کے نزدیک اس کی نوعیت یقیناً دفاعی تھی اور وہ اسے اخلاقی اور روحانی ہتھیاروں کی لڑائی سمجھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۰ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں نیٹال کے لیے برطانوی بھارت میں اقرار نامے کے تحت مزدوروں کی بھرتی کو ممنوع قرار دینے کے لیے ایک تحریک پیش کی جسے حکومت نے منظور کر کے اس کی پرزور سفارش کی۔ وہ ۱۹۱۲ء میں رائل کمیشن کے ممبر منتخب ہوئے۔ لیکن سخت محنت کے باعث ان کی صحت جواب دے گئی اور ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کو کل ۴۹ سال کی عمر میں ان کی وفات ہو گئی۔ تلک نے ان کی وفات پر بجا طور سے کہا تھا کہ "ہندستان کا ہیرا، مہاراشٹر کا رتن اور محنت کشوں کا سرتاج ہمارے درمیان نہیں۔" گوکھلے کی مختصر زندگی ترک اور تیاگ اور جہد مسلسل کی زندگی رہی ہے۔ اس موقع پر جب کہ ہم ان کی صد سالہ سالگرہ منانے جا رہے ہیں، ان کے تئیں ہمارا سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہو گا کہ ہم زیادہ محنت، زیادہ تندہی، زیادہ لگن سے کام کریں۔ یہی ملک کے لیے ہماری سچی خدمت بھی ہو گی۔

● پنڈت جواہر لال نہرو کی دوسری برسی ملک بھر میں ۲۷ مئی کو منائی جا رہی ہے۔ اس موقع پر ملک کی مقتدر شخصیتیں، جن میں سیاست داں بھی ہوں گے اور قومی رہنما بھی، ارباب دانش بھی ہوں گے اور مفکر بھی، مصنف بھی ہوں گے اور صحافی بھی، غرض ہر طبقے اور ہر مکتبۂ خیال کے لوگ عظیم نہرو کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ نہرو کی زندگی میں بہت سے لوگ جن میں ان کے کچھ ساتھی بھی شامل تھے، ان کے مخالف تھے اور کھل کر ان پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ لیکن آج حالات بدلے ہوئے ہیں اور وہی لوگ جو جواہر لال جی کی اور ان کی پالیسیوں کی مخالفت اور ان پر اعتراضات کی بوچھار کیا کرتے تھے، یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ نہرو ہمارے تھے۔ یہاں یہ بحث مقصود نہیں ہے کہ نہرو سے اس مخالفت کے اسباب کیا تھے۔ البتہ اس بات پر ہمیں ضرور غور کرنا ہو گا کہ خیالات میں یہ تبدیلی کیوں رونما ہوئی اور اس کا سبب کیا ہے۔ دراصل انسان کے افکار و خیالات، اقدار و تصورات اس کی شخصیت کو عظیم اور اس کی ہستی کو لافانی بناتے ہیں۔ لافانیت کیا ہے، یہی کہ ایک عظیم شخصیت کے خیالات و تصورات باقی رہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کے اٹھ جانے پر کچھ عرصے کے بعد اس کی بہت سی تعلیمات اور اس کے اکثر خیالات یا تو بھلا دیے جاتے ہیں یا نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ایسا کسی فیشن یا عادت کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ رد و قبول کا ایک غیر شعوری سلسلہ جاری رہتا ہے جو اس کے خیالات اور اس کی تعلیمات کو ماند بناتے رہتے ہیں۔ پھر بھی کچھ تصورات اور خیالات ایسے ہوتے ہیں جو ملک کی طرز زندگی اور طرز فکر پر مستقل اثرات چھوڑتے ہیں اور اس کے (ملک کے) ذہنی اور اخلاقی تار و پود کا جز بن جاتے ہیں جس سے نہ صرف وہ شخصیت عظیم بن جاتی ہے بلکہ اس کے خیالات و تصورات اور تعلیمات زندہ رہتے ہیں۔ اور اس حیثیت سے جب ہم نہرو جی کے افکار و خیالات اور ملک کو ان کی دین پر غور کرتے ہیں تو جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے جمہوریت سے ان کی بے پناہ عقیدت، سیکولرزم سے ان کی اٹوٹ وابستگی اور رواداری میں ان کا یقین محکم۔ حقیقتاً یہ تین عظیم ترین ستون ہیں جو انھوں نے اپنے وطن عزیز کو دیے ہیں اور یہی ان کا عظیم ترین ترکہ یا یادگاریں ہیں۔ بقول مسٹر فرینک مارس "جمہوریت، سیکولرزم اور رواداری کا نہرو کا ترکہ ہمارے سامنے طویل اور دشوار راہ پر منزل کے تعین کا نشان فراہم کرتا ہے۔" جیسے جیسے پنڈت نہرو کے افکار و خیالات اور تصورات کا صحیح ادراک ہو گا ہم انھیں اپنے سے قریب تر سمجھیں گے اور محسوس کریں گے کہ نہرو ہمارے تھے، ہمارے ہیں اور ہمارے رہیں گے۔

● لکھنؤ میں ۹ اپریل ۱۹۶۶ء کو انجمن شعرائے لکھنؤ کے زیر اہتمام "جشن اثر" کے نام سے ایک تقریب نواب مرزا جعفر علی خاں اثر کی فکری کاوشوں اور ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد کی گئی۔ ادیبوں اور شاعروں کو خراج تحسین پیش کرنے کی تقریب کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی تقریبیں اور اجتماعات منعقد ہوتے رہے ہیں لیکن جو چیز باعث مسرت ہے وہ یہ کہ اب ہم صرف مرنے والے ادیبوں اور شاعروں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اجتماعات نہیں کرتے بلکہ اب ہم میں یہ صحت مند رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ زندہ ادیبوں اور شاعروں کو بھی ان کی ادبی خدمات کے لیے خراج تحسین پیش کیا جائے۔ چنانچہ "جشن اثر" سے قبل اور بھی کئی زندہ ادیبوں اور شاعروں کے سلسلے میں اجتماعات ہو چکے ہیں۔ جشن اثر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کا انتظام اثر صاحب کے مکان ہی میں کیا گیا تھا تاکہ اثر صاحب بھی جو بوجہ طویل علالت کہیں باہر جانے سے مجبور ہیں، اس میں شرکت فرما سکیں۔ اثر صاحب کی سی جامع اور ہمہ جہتی صلاحیتیں رکھنے والی شخصیت یقیناً اس کی مستحق تھی کہ اس طرح کی تقریب منعقد کی جائے۔ اردو کے ممتاز شاعر پنڈت آنند نرائن ملا نے جلسے میں اثر صاحب کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے بالکل صحیح کہا کہ اثر صاحب جیسی جامع شخصیت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ وہ بیک وقت ادیب، شاعر اور نقاد ہیں جو کہ ساتھ ساتھ عالی کلاسیکی ادب کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے بعد قدآور ادب کی وہ نسل ختم ہو جائے گی جس کی اردو شعر و ادب پر دور تک چھاپ ہے۔ ملا صاحب نے کہا کہ "وہ اردو شعر و ادب کا جز بن چکے ہیں اور اس لیے اردو ادب کی تاریخ میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔" پروفیسر احتشام حسین صاحب کے بقول اثر صاحب کی عظمت کا راز صرف یہی نہیں ہے کہ وہ ایک اچھے اور صاحب طرز شاعر ہیں بلکہ عالمی اور خاص طور سے کلاسیکی ادب اور نئے ادب کا ان کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اور جہاں کہیں انھوں نے جدید شاعری پر اعتراضات کیے ہیں وہ تعمیری ہیں۔ یہی بات سید سجاد ظہیر نے بھی کہی کہ اثر صاحب نے جدید ادب اور شاعری پر جو اعتراضات کیے ہیں انھیں ہم نے ہمیشہ کھلے دل سے قبول کیا ہے کہ ان سے ہماری رہنمائی ہوئی ہے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ یہ تعمیری شعور سے تھے نہ کہ محض نکتہ چینی نہیں۔ انجمن شعرائے لکھنؤ مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے "جشن اثر" کا اہتمام کر کے ایک اہم فریضے کی انجام دہی کی ہے۔ ہمارے اور بھی ممتاز ادیب اور شاعر ہیں، جن کے لیے اس طرح کے اجتماعات اور تقریبوں کا انتظام کیا جانا چاہیے۔

——— ایڈیٹر

غزل

ساغر نظامی

کیا رقصِ سلاسل کا وہ جنوں، زنداں کے طرح داروں میں نہیں
پہلا سا وہ نغموں کا طوفاں زنجیر کی جھنکاروں میں نہیں

کیا عشوہ گرِ آزادی سے، زنداں کی فضا محروم ہوئی
پازیب کے نغموں کی ہلچل زنجیر کی جھنکاروں میں نہیں

آغوشِ سکوتِ ساحل میں، جو شور کناں ہے قرنوں سے
وہ رقصِ تلاطم اے راہی! طوفانوں کے دھاروں میں نہیں

دُنیا سے جو پنجہ کش ہو کر، جینے کا بڑھاوا دیتی تھی
وہ رُوحِ ستم دشمن میں نہیں، وہ خوئے وفا یاروں میں نہیں

یہ پھول ہی کیا اُس کے تن سے وجدان مہک سا اُٹھتا ہے
ہے اس کے پسینے میں خوشبو، جھکے ہوئے ان ہاروں میں نہیں

جب عشق تمنا کرتا ہے، جب دل کے زخم چٹختے ہیں
چپکے سے وہ فرما دیتے ہیں یہ شخص وفاداروں میں نہیں

احباب کے پھول سے ہونٹوں میں جو امرت بن کر پنہاں ہے
اے دوست! وہ زہرابِ کامل تیروں میں نہیں خاروں میں نہیں

جینے سے اگر اُٹھ جائے یقیں، دُنیا ہی علاج اس کا ہو دیں
آزار ہمارا چارہ گرد، جانے ہوئے آزاروں میں نہیں

ورثہ ہے حرامِ جاناں کا، حصہ ہے ہماری قسمت کا
وہ گردش جو تاروں میں نہیں، وہ لوچ جو سیاروں میں نہیں

کہنے کی نہیں یہ بات مگر، کیا کہیے مآل منکر و نظر
وہ عشق ہی کیا اب حُسن کے بھی ہم حاشیہ برداروں میں نہیں

کرتا ہے جنونِ شوق مرا، محرابِ تلاطم میں سجدے
طوفاں پہ عقیدہ رکھتا ہوں، ساحل کے پرستاروں میں نہیں

یہ کس کی نظر نے لوٹ لیا، کردارِ خمستاں، اے ساقی!
پہلا سا خلوصِ بادہ کشی، اس عہد کے مے خواروں میں نہیں

فطرت نے نمایاں کر ہی دیا ان تیری غزالی آنکھوں میں
وہ ہوش جو ہشیاروں میں نہیں، وہ کیف جو مے خواروں میں نہیں

جو تیرے لبوں پہ خنداں ہے اسرار کی اک معصوم کرن
وہ دوشیزہ کلیوں میں نہیں، پھولوں میں نہیں، تاروں میں نہیں

ہے کفر شریعت میں میری، ٹوٹے ہوئے سازوں کا ماتم
میں مطربِ فردا ہوں ساغرؔ ماضی کے عزاداروں میں نہیں

دیتا گھر ۰۰۰ اٹک

۱۹۶۶ء

افغانستان کی ثقافتی سرگرمیاں ـــ ایک جھلک

ڈاکٹر امیر حسن عابدی

مجھے مدت سے ان ہمسایہ ملکوں کے دیکھنے کا شوق رہا ہے جو ہمارے ہندستان کی ملی جلی تہذیب کی تشکیل میں براہ راست شریک ہیں۔ ایک عرصے کے بعد میری یہ آرزو پوری ہوئی کہ میں افغانستان کو بہت قریب سے دیکھ سکوں اور وہاں کی ثقافتی سرگرمیوں کا ایک حد تک مطالعہ کر سکوں۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ محض تفریح کی غرض سے افغانستان جانے والوں کے لیے ممکن ہے یہ ملک بہت دلکش نہ ہو مگر تاریخی نقطۂ نظر سے بیحد جالب اور حاصل خیز ہے۔ بہر حال مجھے وہاں پہنچ کر بہت جلد احساس ہونے لگا کہ یہاں میرے لیے کسی طرح کی اجنبیت نہیں ہے۔

افغانستان میں مئی اور جون میں کھیرے، زرد آلو، شفتالو، آلوچہ، آلو بالو، توت وغیرہ ملتے ہیں۔ جولائی سے انگور، خربوزے اور تربوز کی فصل شروع ہو جاتی ہے۔ روٹی کسی گھر میں نہیں پکتی بلکہ بازار سے لائی جاتی ہے۔ ہوٹلوں میں عام طور سے پلاؤ، چلاؤ، اور قابلی کا رواج ہے۔ سالن بھی ملتا ہے جسے روٹی کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔ ایک سالن کرائی ہوتا ہے جسے انڈا اور کباب ملا کر تیار کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو مصالحہ کی عادت ہوتی ہے جس کی کمی وہاں کے کھانوں میں محسوس ہوتی ہے۔ سبز اور سیاہ دونوں طرح کی چائے کا رواج ہے۔ گھر ہو یا ہوٹل ہر شخص کے سامنے ایک کیتلی مخصوص رکھی جاتی ہے۔ گرمیوں میں آئس کریم کا رواج ہے جسے شیر یخ کہتے ہیں۔ البتہ برف زیادہ تر کچی استعمال ہوتی ہے جو پہاڑوں سے لائی جاتی ہے۔

ان اطراف میں چونکہ زلزلہ برابر آتا رہتا ہے اس لیے زیادہ تر ایک اور زیادہ سے زیادہ دو منزلہ مکانوں کا رواج ہے۔

وہاں تمام دفاتر اور ادارے ۸ بجے صبح سے شروع ہوتے ہیں اور ساڑھے چار بجے تک چلتے ہیں۔ بیچ میں ۱۲ بجے سے ۱½ بجے تک دوپہر کے کھانے کی چھٹی ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ افغانستان کے قیام میں سب سے زیادہ خود کابل جیسے خوبصورت دارالسلطنت کے دیکھنے کا موقع ملا جو پہاڑوں کے درمیان ایک پر کیف خطۂ زمین پر آباد ہے اور جس کے بیچ میں کابل دریا بہتا ہے جس کو ویدنے مقدس دریاؤں میں شمار کیا ہے اور جسے سنسکرت میں KUBHA کہتے ہیں۔

کابل میں آرام دہ بسیں چلتی ہیں ان کے علاوہ بغیر میٹر کی ٹیکسیاں بھی ہیں جو عام طور سے بیس افغانی لیتی ہیں۔

اس ملک میں پردہ رفتہ رفتہ اٹھتا جا رہا ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کا لباس اردپائی ہو چکا ہے۔ البتہ مرد ایک قسم کا افغانی لبادہ اب بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندستانی برقعہ حتماً افغانی برقعہ کی نقل ہے۔ اس لیے کہ ہندستان میں جس طرح کا برقعہ استعمال ہوتا ہے غالباً کسی اور ملک میں اس قسم کے برقعہ کا رواج نہیں ہے بلکہ صرف افغانستان میں دکھائی دیتا ہے۔ تعلیم پھیل رہی ہے، اسکول کھلتے جا رہے ہیں۔ انھیں اسکولوں میں ایک لیسہ خوشحال خاں بھی ہے جو آزاد قبائل کے بچوں کی تعلیم کے لیے دولت (حکومت افغانستان) کی طرف سے بڑے پیمانے پر چلایا جاتا ہے۔

وہاں کی ایک خاص چیز فاتحہ خوانی ہے۔ ریڈیو سے فاتحہ خوانی کا پروگرام

برابر نشر ہوتا رہتا ہے۔ وسط شہر میں شاہ دوشمشیرہ نام کی ایک خوبصورت مسجد ہے جس میں عموماً فاتحہ خوانی ہوتی ہے جو کئی گھنٹے تک چلتی رہتی ہے۔ تقریباً ہر دس منٹ کے بعد قرآن خوانی رک جاتی ہے جس کے بعد کچھ لوگ اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے آنے والے لے لیتے ہیں۔ اس طرح کسی کا وقت زیادہ صرف نہیں ہوتا۔

وہاں عام طور سے محلوں کے نام ہوتے ہیں۔ سڑکوں اور جگہوں کے نام اور مکانوں کے نمبر نہیں ہوتے جس سے کسی کے گھر کو تلاش کرنا اس وقت تک مشکل ہوتا ہے جب تک صاحب خانہ خود مدد نہ کرے۔

ملاقات کے کمرے میں نئی طرز کی میز کرسیاں ملتی ہیں لیکن اب بھی وہاں کے بعض گھروں میں پرانے طریقے سے نشست ہوتی ہے یعنی کمرے میں قالین کا فرش ہوتا ہے اور بڑے بڑے تکیے رکھے ہوتے ہیں جن پر ٹیک لگا کر لوگ آرام سے بیٹھتے ہیں مگر عام طور سے لوگ بیرونی حضرات کو گھروں پر مدعو نہیں کرتے۔ میرے بعض افغانی احباب باوجود میری بڑی خاطر کرنے کے کبھی مجھے کبھی اپنے گھر نہیں لے گئے۔

کابل میں انگریزی میں کابل ٹائمس، فارسی میں انیس، اور پشتو میں اصلاح جیسے روزنامے نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی روزنامے اور جریدے ہیں جو کابل، قندھار، ہرات وغیرہ سے نکلتے ہیں۔

کابل یونیورسٹی شہر سے کچھ دور بیحد پرفضا مقام پر واقع ہے۔ یہاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں اور جن کو صرف مفت تعلیم ہی نہیں دی جاتی بلکہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس وقت ایک خوبصورت ہوسٹل میں تقریباً بارہ سو لڑکے رہتے ہیں جن کے قیام وطعام کا انتظام بھی مفت کیا جاتا ہے۔

میرا تعلق چونکہ شعبۂ (فیکلٹی) ادبیات سے تھا اس لیے میں زیادہ تر اسی شعبے کے حضرات سے مل سکا۔ اس کے پرنسپل غلام حسن مجددی صاحب ہیں جو منطق پڑھاتے ہیں اور بیحد با اخلاق اور با مروت انسان ہیں۔ وائس پرنسپل میر حسین شاہ صاحب ہیں جو لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں اور جن سے پہلے دہلی کی بین الاقوامی مستشرقین کانگریس میں میری ملاقات ہو چکی تھی اور خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ دوران قیام میں موصوف ہر طرح سے میری مدد کرتے رہے۔

فیکلٹی کے ایک معمر استاد پروفیسر محمد علی سے مل کر بیحد خوشی ہوئی جو دوسری جنگ عظیم میں دہلی میں تاج محل کے ایڈیٹر تھے اور مال روڈ پر رہا کرتے تھے۔ یہ سن کر اور بھی خوشی ہوئی کہ ان کی اہلیہ کشمیر کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا یہاں برابر آنا جانا رہتا ہے۔ پروفیسر محمد علی نے A CULTURAL HISTORY OF AFGHANISTAN, THE AFGHANS, A NEW GUIDE TO AFGHANISTAN. وغیرہ جیسی کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ موصوف سے کئی بار ان کے گھر پر بڑی بے تکلفی سے ملنے کا موقع ملا۔ ملک الشعرا بیتاب جیسے شفیق اور بزرگ استاد سے بھی فیکلٹی اور ان کے گھر پر نیاز حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنا کمیاب دیوان بھی عنایت کیا۔ موصوف پچاس سال سے پڑھا رہے ہیں اور بیحد منکسر مزاج انسان ہیں۔

شعبۂ ادبیات سے ہر مہینے مجلہ ادب نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سے کتابیں بھی شایع ہوتی رہتی ہیں، جن میں حدود العالم خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

کابل یونیورسٹی کے علاوہ یہاں دوسرے ادارے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک کابل میوزیم ہے جس میں قلمی کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اس میں خط کوفی میں لکھے ہوئے قرآن ہیں جن کو حضرت عثمان، حضرت علی، امام حسن اور امام حسین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کلیات سنائی کا ایک قلمی نسخہ بھی اس میوزیم میں ہے جو غالباً خود سنائی کے زمانے کا ہے۔ عام طور سے سنائی کی وفات ۵۲۵ ہجری میں بتائی جاتی ہے۔ مگر اس میں ان کا سال وفات ۵۲۹ ہجری دیا ہوا ہے۔ مثنوی مولوی کا وہ قلمی نسخہ بھی (نمبر ۲) ہے۔ جو میر عماد الدین ہروی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک نسخہ خمسۂ امیر خسرو کا ہے (نمبر ۱) جو جلال الدین اکبر بادشاہ کو پیش کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ مدتوں بخارا کے بادشاہوں کے پاس رہا تھا۔ بعد میں سید عالم خاں حاکم بخارا نے اسے امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ افغانستان کو پیش کیا تھا۔ دیوان حافظ (نمبر ۹۸) کا بھی ایک عمدہ نسخہ ہے جس کو ۹۰۷ ہجری میں اس زمانے کے نقاشوں اور خطاطوں نے فریدون حسین مرزا ابن سلطان حسین بایقرا کے لیے تیار کیا تھا۔ دیوان جامی (نمبر ۲۵۵) کا ایک عمدہ نسخہ بھی ہے جس کے متعلق گمان کیا جاتا ہے کہ یہ خود جامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس دیوان کا ایک اور نسخہ (۱۶۶) بھی ہے جو سلطان محمد خنداں کے شاگرد قبلۃ الکتاب شہدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ فرس نامہ کو سید عبد اللہ خاں فیروز جنگ نے شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستانی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا مصور نسخہ (نمبر ۲۱۱) اس میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ میوزیم میں دیوان غزوی کاشی کا نادر نسخہ بھی موجود ہے (۲۲۹)۔ دیوان واقف کے نسخے برٹش میوزیم اور ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں جن پر صادق شہدی کا مقدمہ ہے۔ مگر وہ نسخہ جو کابل میوزیم

ہے (۸۸) اس پر خود راقم کا مقدمہ ہے۔

کابل میوزیم کے علاوہ اور بھی کتب خانے ہیں۔ ابھی حال میں کابل یونیورسٹی کے ایک فرانسیسی استاد دوبورکوی (S. DE LANGIER DE BEAURECUEIL) نے فرانسیسی زبان میں ایک فہرست قاہرہ سے شایع کی ہے جس میں بادشاہ کے کتب خانہ، کابل میوزیم، وزارت مطبوعات، پبلک لائبریری، کابل شعبۂ ادبیات اور موزہ ہرات کے قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

کابل میں پبلک کتب خانوں سے زیادہ شخصی ذخیرے ہیں جن تک عام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی اور نہ عام طور سے ان کا پتہ چلتا ہے۔ بہرحال بعض شخصی ذخیرے کے دیکھنے کا بھی موقع ملا۔

ایران کے ایک مشہور عالم ڈاکٹر مہدی بیانی نے لاہور کے رسالہ ارمغان اور مجلہ دانشکدہ ادبیات تہران میں لکھا تھا کہ رسالہ در عقائد حنفیان نثر فارسی کا سب سے قدیم نمونہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تہران اور ایک ترکی میں ہے۔ ڈاکٹر معین نے برگزیدۂ نثر فارسی (ج ۱، ص ۳۴) اور ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے تاریخ ادبیات در ایران (ج ۱، ص ۶۲۱) میں نیز دوسرے لکھنے والوں نے بھی ڈاکٹر بیانی کے قول پر بھروسہ کرکے اس کو سب سے پرانی نثر بتایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ۲۹۰ ہجری کے قریب ابوالقاسم اسحٰق بن محمد بن اسمٰعیل (م ۳۴۲ ہجری) نے جن کو حکیم سمرقندی بھی کہتے ہیں، عربی میں کتاب السواد الاعظم لکھی جو حنفی مذہب کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ امیر خراسان نوح بن منصور کے حکم سے جنھوں نے ۳۶۶ سے ۴۰۰ ہجری تک حکومت کی، اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے بعد ۹۵ ہجری میں خواجہ محمد پارسا (م ۸۲۲ ہجری) نے اس فارسی کے ترجمہ کو اپنے زمانہ کی رائج فارسی میں دوبارہ لکھا۔ چونکہ اصل فارسی ترجمہ کا وجود نہ تھا اور ترجمہ عربی کتاب کے مطالب خواجہ پارسا کی کتاب میں نقل اور منتخب ہوئے ہیں اس لیے غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ وہی اصل فارسی ترجمہ ہے جو نوح بن منصور کے حکم سے ہوا تھا۔ اور اسی بنا پر اس کو موجودہ نثر میں قدیم ترین مانا گیا جو غلط ہے۔

اب کابل میں وہ اصل فارسی ترجمہ مل گیا ہے۔ فی الحال یہ نسخہ استاد عبدالحی حبیبی کے پاس ہے، جنھوں نے اس کے متعلق مجلہ آریانہ اور مجلہ یغما میں مفصل مضمون بھی لکھا ہے۔ اور اس غلطی کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی ہے۔

ایک صاحب کے پاس سبحۃ الابرار کا وہ نسخہ ہے جو خود جامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک صاحب کے پاس مجموعہ رسائل ہے، جن میں سے اکثر خود مصنف یا اکابرین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ پر جہانگیر اور شاہجہاں کے ہاتھ کی تحریریں اور مہریں ہیں۔ خان اعظم نے انتقال کے وقت اپنی بیوی سے وصیت کی تھی کہ اسے جہانگیر کے سپرد کردے۔ اس میں خواجہ عبدالشہید کے ہاتھ کا لکھا ہوا رسالہ، علاء الدین سمنانی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی حدیثیں، جامی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چہل حدیث ایک آیت قرآنی اور اس کی تفسیر، شمایل نبوی کے حاشیے، اور قاضی خیضری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی حدیث ہے۔

ایک صاحب کے پاس سلطان علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا منطق الطیر کا ایک نسخہ تھا جو ابھی حال میں اٹھارہ ہزار پونڈ میں یورپ میں فروخت ہوا ہے۔

ایک صاحب کے پاس میر علی ہروی کے ہاتھ کا لکھا ہوا خرد نامۂ اسکندری ہے جو کبھی اورنگ زیب کے کتب خانے میں بھی رہ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اختیار اعتماد المسانید فی اختصار اسماء رجال الاسانید کا وہ نسخہ ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ حافظ شیرازی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اربعین مع ترجمہ کے ہے۔ ہمایوں کا ایک رسالہ ہے جو اس نے اکبر کے لیے لکھا تھا۔ ینابیع الاسلام کا واحد نسخہ بھی انھیں کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ شرح تجرید کا وہ نسخہ ہے جو کبھی ابراہیم عادل شاہ کے پاس تھا۔ مزید برآں اظہر ہروی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی گلستاں بھی ہے۔

کابل کا ایک اہم ادارہ انجمن تاریخ افغانستان ہے جہاں سے ہر مہینے میں فارسی میں مجلہ "آریانا" اور انگریزی فرانسیسی میں "افغانستان" نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ طبقات الصوفیہ اور دو جلدوں میں طبقات ناصری یہیں سے ایڈٹ ہو کر شایع ہوئی ہیں۔ اس ادارے کے رئیس ڈاکٹر عبدالرحیم ضیائی ہیں۔ یہاں کے علما میں استاد فکری سلجوقی جیسے محقق، ادیب اور شاعر کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے جو ہرات کے رہنے والے ہیں۔ نیز ان کو ہرات سے غیر معمولی علمی لگاؤ ہے۔ وہ وہاں کے تمام جزئیات سے واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ہرات کی خدمت میں صرف کی ہے۔ ان کی تصنیفات میں خیابان اور گازرگاہ جیسی اہم کتابیں ہیں۔ اس وقت استاد فکری مزارات ہرات کو شایع کروا رہے ہیں۔ مگر سب سے بڑی خصوصیت ان کا غیر معمولی اخلاق، انکسار اور خلوص ہے جو ہر ملنے والے کو گرویدہ بنا لیتا ہے۔

استاد حبیبی کا نام بھی قابل ذکر ہے جنھوں نے سرخ کوتل بغلان کے مشہور کتبہ کو تحلیل کرکے مادر زبان دری جیسی کتاب لکھی ہے جو انجمن تاریخ افغانستان کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ افغانستان میں فارسی کو دری کہتے ہیں اور امسال

بی کا خیال ہے کہ فارسی اُسی زبان سے نکلی ہے جو اس کیتبہ کی زبان ہے اور جو بھی بلخ کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔

ایک اور اہم ادارہ پشتو اکیڈمی ہے جس کے رئیس میرے دوست استاد سدیق اللہ رشتین ہیں۔ اس اکیڈمی سے ایک رسالہ نکلتا ہے نیز پشتو میں برابر مفید یقی اور درسی کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ اس اکیڈمی میں ایسے حضرات بھی ہیں اردو سے پشتو میں ترجمہ کرتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پشتو قاموس (۲ جلد) افغان قاموس (۳ جلد) جیسی اہم فرہنگیں شایع ہوئی ہیں۔ افغانستان میں تو اور فارسی دونوں زبانوں کو مساوی درجہ حاصل ہے البتہ کام زیادہ تر فارسی ہی ں ہوتا ہے۔ اگر فرق ہے تو اتنا کہ بعض علاقوں کی مادری زبان پشتو اور بعض علاقوں ا مادری زبان فارسی ہے۔ پشتو کے بعض الفاظ بہت عام ہو گئے ہیں جیسے یونیورسٹی یے "پوہنتون" کالج کے بجائے "پوہنجی" اسکول کی جگہ "لیسہ" اور اکیڈمی کے یے "تولنہ" کہتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ عورت کو پشتو میں ستی کہتے ہیں۔

پشتو زبان و ادب کا مطالعہ ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ ید مادت، رنگ عشق، عیار دانش وغیرہ جیسی اہم کتابوں کا پشتو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اری گورنمنٹ کی طرف سے پشتو سیکھنے کے لیے برابر طلبا افغانستان بھیجے جاتے ہیں۔

پروفیسر رشتین کا خیال ہے کہ لفظ صوفی پشتو کے لفظ سوپ سے نکلا ہے جو ہاڑ کے سوراخ کو کہتے ہیں۔ چونکہ ابتدائی صوفی ان اطراف میں پہاڑوں کے سوراخوں ں رہا کرتے تھے اس لیے وہ سوپی کہلائے جو بعد میں معرب ہو کر صوفی ہو گیا۔ اسی طرح م خیال یہ ہے کہ برکی سنسکرت لفظ پرمکھ (P.e amukh) سے نکلا ہے۔ مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پشتو میں بھی ایک لفظ برمخ ہے جو اسی معنی میں استعمال تا ہے۔

وزارت معارف کے وزیر ڈاکٹر انس ہیں جو مجھ سے پہلے سے واقف تھے۔ ں وزارت میں کچھ علما بحیثیت مشاور کے کام کرتے ہیں۔ ان میں استاد گویا تمادی اور کہزاد صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ استاد گویا بڑے شفیق اور بکلف انسان ہیں۔ موصوف مجھ سے پہلے سے واقف تھے۔ انھوں نے رسالہ منگ کا بھی ذکر کیا جو کبھی دہلی سے فارسی میں میری نگرانی میں نکلتا تھا۔ ان کی جہ سے مجھے بہت سی سہولتیں حاصل ہوئیں۔ وہ خود اپنے ساتھ مجھے استاد خلیلی کے س لے گئے، جو اس وقت افغانستان کے سب سے بڑے شاعر اور بادشاہ کے مشیر یں۔ احمد علی کہزاد صاحب افغانستان کے سب سے بڑے مورخ ہیں۔ انھوں نے فارسی میں کئی جلدوں میں افغانستان کی تاریخ لکھی ہے جو پشتو میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔

اس وقت وزارت معارف سے بڑے اہتمام کے ساتھ کلیات بیدل شایع ہو رہی ہے جس کی چوتھی اور آخری جلد انھیں گرمیوں میں تمام ہوئی جب میں وہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک جلد میں رباعیات بیدل بھی شایع ہوئی ہیں۔ بیدل شناسی افغانستان کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ وہاں بیدل کو فارسی کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ وزیر عدلیہ مجروح صاحب اور سرمنشی حافظ نور محمد خاں صاحب بیدل شناس کہے جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو اتنا مبالغہ کیا کہ بیدل کی قبر بھی کابل ہی میں پیدا کر دی ہے۔ کیا اچھا ہو اگر ہندوستان میں بھی بیدل شناسی کا احیا کیا جائے۔

وزارت معارف سے اس قسم کی کتابوں کے علاوہ درسی کتابیں وغیرہ بھی شایع ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ فرہنگ جغرافیائی افغانستان بھی شایع ہو رہی ہے۔ اس کی کئی جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ اس وزارت سے ایک ماہنامہ بھی نکلتا ہے جس کا نام عرفان ہے۔

وزارت مطبوعات سے بھی مختلف کتابیں برابر شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم سالنامہ ہے جس میں ملک کے تمام موجودہ حالات کا ذکر ہوتا ہے نیز مختلف موضوعات پر تاریخی اور ادبی مقالے بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔

اس وزارت میں رئیس طبع کتب مایل ہروی صاحب ہیں جو شاعر اور عالم ہونے کے علاوہ بڑے مخلص دوست بھی ہیں۔ ان کا دیوان امواج ہریوا شایع ہو چکا ہے۔ ان کی دوسری کتابیں شرح حال و زندگی و مناظرات امام فخرالدین رازی، معرفی روزنامہ ہا، جراید و مجلات افغانستان اور شرح رباعیات جامی ہیں۔ جناب مایل ہروی ہی کے ساتھ میں استاد صلاح الدین سلجوقی سے مل سکا جو وزارت و سفارت وغیرہ جیسے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ اب چوہتر سال کی عمر میں وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر اب بھی کم از کم آٹھ گھنٹے ضرور تالیف و تصنیف کا کام کرتے ہیں۔ موصوف فارسی کے علاوہ عربی کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کا خاص میدان اخلاق و مذہب ہے اور ان کو افغانستان کا حسین کاظم زادہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ نے ارسطو کی کتاب اخلاق کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی دوسری کتابیں نقد بیدل، مقدمہ علم اخلاق الاضواء، تجلی خدا در آفاق و انفس وغیرہ ہیں۔

کابل کی قابل ذکر علمی شخصیتوں میں عبدالوہاب طرزی کا ذکر ضروری ہے

واس وقت رئیس گرزندوی یعنی ٹورسٹ افسر ہیں۔ ان کے والد افغانستان کے سب سے پہلے محب وطن جرنلسٹ تھے۔ یہ خاندان مدتوں جلاوطن رہا۔ عبدالوہاب طرزی صاحب تیس برس ترکی میں رہے اور اب وطن واپس ہوئے ہیں۔ ان کے والد کے نام سے لیسہ طرزی قائم کیا گیا ہے۔

مولانا خستہ بھی قابل ذکر ہیں جو کسی زمانے میں دہلی کے فتحپوری مدرسے میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ بڑے فقیر منش اور سادہ انسان ہیں۔ انھوں نے معاصرین سخنور اور یادی از رفتگان جیسی کتابیں لکھ کر ہم کو افغانستان کے جدید شعرا سے روشناس کرایا ہے۔

اب وہاں کی عورتیں بھی مردوں کے دوش بہ دوش چل رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محبوب سراج جیسی خاتون قابل ذکر ہیں جو وزارت خارجہ میں کام کرتی ہیں اور جن کو علمی میدان میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے ان کی کتاب مولانائے ملنی دیدہ رش جو ابھی شایع ہوئی ہے ایک نئے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔

کابل کے شعرا اور ادبا میں محمد عثمان صدقی صاحب کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ ان کا ایک مختصر سا دیوان سہ دوہستی شایع ہو چکا ہے۔ ان سے کئی دفعہ ملنے کا موقع ملا۔ البتہ اطمینان سے گفتگو نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ وہ ملک سے باہر جا رہے تھے۔ ان کے علاوہ ضیا قاری زادہ صاحب سے مایل ہروی صاحب کے دفتر میں اور اس کے بعد خود ان کے گھر پہ نیاز حاصل ہوا۔ موصوف نے مجھے وہ تصویر دکھائی جس میں وہ مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو سے نئی دہلی میں ملاقات کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی دو نظمیں "پیام باختر" اور "زبان طبیعت" بھی عنایت کیں۔

جس وقت افغانستان میں میرا قیام تھا وہاں پہلی دفعہ انتخابات ہو رہے تھے جس سے ملک میں ایک غیر معمولی چہل پہل اور بیداری دیکھنے میں آئی۔ انتخابات کی سرگرمی ہی کی وجہ سے کچھ حضرات سے مفصل اور کچھ حضرات سے بالکل ملاقات نہ ہو سکی۔

کابل میں کتاب فروشوں کی دوکانوں میں قدیم طرز کی دینی اور علمی کتابوں میں زیادہ تر ہندوستانی مطبوعات اور جدید ادب میں ایرانی مطبوعات ملتی ہیں۔ فرہنگوں میں غیاث اللغات وہاں بہت مقبول ہے۔ خود افغانستان کی کتابیں گورنمنٹ کی دوکانوں میں ملتی ہیں۔ ہندوستانی مطبوعات خاص کر فارسی کی کتابوں کی وہاں بیحد تلاش رہتی ہے اور یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ہماری چیزیں ان تک اور ان کی چیزیں ہم تک آسانی سے نہیں پہنچ پاتیں۔

کابل کے اردگرد بہت سی فرحت بخش اور خوبصورت جگہیں ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور پغمان ہے جو برفیلے پہاڑوں سے متصل ایک سرد جگہ ہے۔ یہاں لوگ گرمی کے موسم میں اکثر جایا کرتے ہیں۔ جمعہ کو تو وہاں ایک بھیڑ سی لگ جاتی ہے میرے تہران کے دوست کشتیار صاحب جو ٹمیس جنگلات ہیں مجھے اپنے ساتھ پغمان اور دوسری جگہوں کو دکھانے کے لیے لے گئے۔

شہر سے بالکل متصل باغ بابری ہے جس میں بابر کی قبر بھی ہے۔ قبر پر جہانگیر کا لگوایا ہوا کتبہ ہے۔ حکومت نے پرانے کتبہ اور پتھروں کو قبر کے بغل میں رکھوا دیا ہے اور ان کی جگہ نیا کتبہ اور پتھر لگوا دیا ہے۔

کابل سے کچھ دور استیلات ایک بہت خوبصورت چوٹی سی جگہ ہے جہاں انگور کے باغات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ سکندر کو یہ جگہ بہت پسند آئی تھی اور یہ نام اسی کا رکھا ہوا ہے۔ بابر کو بھی یہ جگہ بے حد پسند تھی۔

شہر سے تھوڑے فاصلے پر شاہ افغانستان کا ایک ذاتی باغ اور ڈیری فارم ہے جس کا نام کاریز میر ہے۔ اعلیحضرت اکثر وہاں جایا کرتے ہیں اور ہر چیز خود دیکھتے ہیں۔

افغانستان کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے پورے ملک کا دورہ ضروری ہے اب کابل سے ہرات تک جس کے بیچ میں غزنی اور قندھار پڑتے ہیں، تارکول کی سڑک بن گئی ہے جس پر بہت عمدہ بسیں چلتی ہیں۔ غزنی سے کابل چند گھنٹوں میں بس پہنچ جاتی ہے۔ مگر وہاں جا کر بڑی عبرت ہوتی ہے کہ سوائے مٹی کے گھروں کے پرانے آثار میں صرف چند قبریں اور ایک مینارہ باقی رہ گیا ہے۔ البتہ سنائی کا مقبرہ اب بھی مرجع خلایق ہے جہاں لوگ زیارت کے لیے جایا کرتے ہیں غزنی کی بالائی مشہور ہے جسے قیماق کہتے ہیں۔

کابل سے صبح کی چلی ہوئی بس غزنی ہوتی ہوئی شام کو قندھار پہنچتی ہے راستے میں جگہ جگہ بادام کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ قندھار کا پرانا شہر اب بالکل ویران اور قصر نارنج مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے۔ البتہ پہاڑ پر اب بھی بابر کا کتبہ اچھی حالت میں موجود ہے۔ نیا شہر کافی خوبصورت ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ناجو کے درخت ہیں اور شہر کے بیچ میں احمد شاہ ابدالی کی قبر ہے، جن کو قندھار کے لوگ احتراماً احمد شاہ بابا کہتے ہیں۔ شہر سے کچھ دور ارغنداب دریا ہے جس کے دونوں طرف بکثرت سرسبز و شاداب باغات دکھائی دیتے ہیں۔ قندھار میں انگور کے باغوں کی کثرت ہے نیز کھانے پینے کی چیزوں میں فرنی کا بہت رواج ہے۔ اہم

جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قندھار سنسکرت کے گاندھار (Gandhara) سے مختلف ہے۔ قندھار کے سلسلے میں محمد کرزی صاحب مدیر مطبوعات کا ذکر بھی ضروری ہے جو وہاں کے ایک عالی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے غیر معمولی محبت اور مہمان نوازی کا اظہار کیا اور کسی سے ایک موٹر عاریت لے کر مجھے دور کے مقامات پر لے گئے۔

قندھار سے ہرات تک دن بھر کا سفر ہے اور تقریباً پورے دن چٹیل میدانوں اور بے آب و گیاہ زمینوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہیلمند دریا آتا ہے اور تقریباً ۲۵ کیلومیٹر مسلسل دو رویہ ناجو کے درخت ملتے ہیں۔ ہرات کسی زمانے میں ایک باعظمت شہر تھا جہاں بہزاد جیسے نقاش رہا کرتے تھے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں اب جامی، میر علی شیر نوائی، امام فخر الدین رازی، ملا حسین واعظ کاشفی جیسی شخصیتیں مدفون ہیں۔ ملا جامی کی قبر پر پستہ کے درخت کا سایہ رہتا ہے اور زیارت کے لیے مردوں اور عورتوں کے الگ الگ دن مقرر ہیں۔

یہاں کی تاریخی عمارتوں میں مسجد ہرات قابل دید ہے۔ یہ کاشی کاری کے کاموں سے پر ہے۔ اس کے علاوہ ہفت قلم کی دو قبریں ہیں جو سنگتراشی اور سلطان بایقرا کی ہنر پروری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں سے ایک قبر سلطان بایقرا کی ہے۔ ابھی حال میں ایک قبر سنگ یشب کی بھی تیار ہوئی ہے جو بالکل نئی چیز ہے۔ ہرات میں ایک دخمہ شاہی بھی ہے جس میں تیموری شہزادوں کی قبریں ہیں۔ مگر اب اس کے کاشی کاری کے مینارے گرتے جا رہے ہیں۔

یہاں ایک کلوب ادبی (لٹریری کلب) ہے جہاں نافذ ہروی صاحب مدیر مطبوعات نے مجھے مدعو کیا۔ وہاں مجھے میر محمد طاہر، فقیری، محمد امان منشی، بشیر، ظہوری، مشعل، فصیحی، میر غلام محمد حسینی، عبدالصمد مجددی جیسے علما اور شعرا سے ملاقات کا موقع ملا۔ نیز اس موقع پر مجھے شعرائے معاصر ہرات کا ایک نسخہ ہدیہ کیا گیا جو اب بالکل نایاب ہے۔

ہرات سے کچھ دور گازرگاہ ہے جہاں "پیر ہرات" خواجہ عبداللہ انصاری کا مقبرہ ہے۔ اس کے متولی میر صاحب گازرگاہ جیسی روحانی اور بزرگ ہستی ہیں۔ آپ تمام ملک میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اپنے کو خادم پیر ہرات کہتے ہیں۔ میر صاحب مجھے اپنے ساتھ ایک دیہات میں دوپہر کی دعوت میں لے گئے جہاں مجھے ہرات کی دعوت کے کھانوں کا پوری طرح سے اندازہ ہو سکا۔

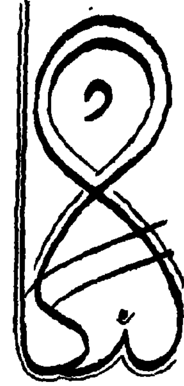
بامیان کابل سے تقریباً دو سو کیلومیٹر ہے اور مسلسل پہاڑوں کے اندر دریائے غوربند کے کنارے چلنا پڑتا ہے۔ سواری کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے اور راستہ بھی پختہ نہیں ہے۔ بہرحال میں پروفیسر رشتین کا شکر گزار ہوں جو مجھے مہمان بنا کر اپنی موٹر میں لے گئے۔ بامیان جا کر مہاتما بدھ کی عظمت کا واقعی اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں بدھ کے مجسمے "سرخ بدھ" اور "خنگ بدھ" پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں جو دنیا میں سب سے بڑے مجسمے ہیں۔ اس جگہ کے انتخاب کی بھی داد دینا پڑتی ہے۔ وادی بامیان میں پہنچ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم دو ہزار برس پہلے کی پرسکون اور خاموش دنیا میں پہنچ گئے ہیں جب کہ مہاتما بدھ نے دنیا کو نروان کا راستہ بتایا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی سرسبز وادی ہے جس میں نہریں بہہ رہی ہیں۔ اس کے ایک طرف مہاتما بدھ کے سر بہ فلک مجسمے ہیں اور دوسری طرف ہوٹل ہے جو اتنی ہی اونچی ایک مقابل کی پہاڑی پر بنایا گیا ہے جہاں سے دونوں مجسموں کی زیارت ہو سکتی ہے۔ شب کو ہوٹل میں قیام تھا مگر دوسرے دن دوپہر کا کھانا ایک افغانی میزبان کے گھر میں ہوا جہاں مجھے افغانی کھانے اور مہمان نوازی کا اندازہ ہو سکا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے بامیان کے مجسموں کی حفاظت کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔

افغانیوں کو اپنے ماضی پر نیز اس بات پر بڑا فخر ہے کہ وہ اسلام سے پہلے بودائی (بدھ مت کے پیرو) رہے ہیں جس کے آثار ملک کے تمام اطراف میں ملتے ہیں۔ کنشک کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے اور کنشکائی کبیر کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی اور افغانی تصوف ایک ہے جس کی نشو و نما بلخ میں ہوئی ہے۔ اس تصوف کے ابتدائی بشیر و ابو اسحٰق ابراہیم بلخی، ابو علی شقیق بلخی، عبدالرحمٰن بلخی وغیرہ ہوئے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی بلخ ہی میں پیدا ہوئے۔ حضرت امیر خسرو کے والد بھی بلخ ہی سے ہندوستان آئے تھے۔ ایک زمانے میں بلخ دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا تھا اور اس کو بلخ البہیہ یعنی بلخ زیبا کہتے تھے۔ بودائیوں (بدھ مذہب کے پیروں) کا سب سے بڑا معبد Nawa Vihara یہیں تھا جس کے سب سے بڑے پجاری برمک کہلاتے تھے۔ مگر اب یہ شہر صرف مٹی کا ڈھیر ہے جس کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ "مزار شریف" اس سے متصل ہے اور وہ نسبتاً زیادہ آباد جگہ ہے۔ نیز وہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ حضرت علی یہیں مدفون ہیں۔

ہندوستان سے افغانیوں کو ایک خاص لگاؤ ہے۔ ہندوستانی موسیقی اور رکارڈوں کا وہاں بیحد رواج ہے۔ یہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ ہندوستانی فلم پسند کی جاتی ہے۔ افغانستان میں ہندوستانیوں کی کافی آبادی ہے جو

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۹ پر)



بدیع الزماں خاور

ایک دریا ہے رواں، صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے گیت، سازِ موج پر گاتا ہوا

دودھ کا گنگوتری سے جب چھلک اٹھتا ہے جام
اُس کا "امرت دھارا" میدانوں میں پڑ جاتا ہے نام
ہے مقدّس، ہند کے دامن پہ گنگا کا خرام
ایک دریا ہے رواں

آریوں کا، اس کی لہروں کو زمانہ یاد ہے
کاروانوں کے اترنے کا فسانہ یاد ہے
قوم کی تہذیب کا پہلا ترانہ یاد ہے
ایک دریا ہے رواں

بہہ رہا ہے، گردشِ ایّام کا رُخ موڑ کر
فطرتِ آدم کی دوری کے فسوں کو توڑ کر
رشتۂ تاریخ کو جغرافیہ سے جوڑ کر
ایک دریا ہے رواں

اس کے دم سے ہے فروزاں آج چہروں[1] کا جمال
کھیتیوں کو آگیا ہے راس نہروں[1] کا جمال
ہنس رہا ہے اس کے آئینے میں شہروں کا جمال
ایک دریا ہے رواں

چھیڑتا جاتا ہے اس انداز سے، سنگم کے راگ
ہوں پرانی لَے میں جیسے اک نئے عالم کے راگ
اس کے لب پر جاوداں ہیں عشرتِ باہم کے راگ
ایک دریا ہے رواں

اس کی زرخیزی پہ نازاں، خود وطن کی خاک ہے
سینۂ ظلمات، اس کی روشنی سے چاک ہے
دیوتاؤں کی طرح، میرا یہ دریا پاک ہے
ایک دریا ہے رواں، صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے گیت، سازِ موج پر گاتا ہوا

---

[1] میں چہروں اور نہروں کے توافق کو جائز سمجھتا ہوں —— (خاور) چہروں کو نہروں کا قافیہ قرار دینا اصولِ قافیہ کے اعتبار سے بہرحال محلِ نظر ہے۔ اس کے جواز کے لیے سند لازم ہے (ایڈیٹر)

اردو شاعری میں منظر نگاری

ڈاکٹر سلام سندیلوی

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس میں جو منظر نگاری ملتی ہے اس کا بیشتر حصہ مصنوعی اور رسمی ہے۔

اردو شاعری کی باقاعدہ ابتدا دکن سے ہوتی ہے۔ اگرچہ دکنی شاعری میں مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ تینوں صنفوں میں منظر نگاری کی جھلک موجود ہے لیکن اس کے سب سے زیادہ نمونے مثنوی میں ملتے ہیں یہ منظر نگاری گو اسلوب کے اعتبار سے صاف ستھری اور مبالغہ اور تصنع سے پاک ہے تاہم زیادہ تر تخیلی ہے۔ دکنی قصائد کی تشبیب میں منظر نگاری پائی جاتی ہے وہ بھی کسی حد تک واضح اور روشن ہے۔ دکنی مرثیوں میں منظر نگاری ملتی تو ہے مگر بہت کم۔

شمالی ہند کی مثنویوں کی منظر نگاری بھی بڑی حد تک تخیلی ہے کیونکہ اکثر مثنوی نگار شعرا نے فرضی ممالک کے مناظر پیش کیے ہیں یا غیر ممالک کے مناظر قدرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ البتہ جن شعرا نے ہندستانی مناظر کی مصوری کی ہے وہ زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ شمالی ہند کے مرثیوں میں بھی جو منظر نگاری ملتی ہے وہ قیاسی ہے۔ اس منظر نگاری میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ مقامیت کا کہیں وجود نہیں۔ جہاں تک شمالی ہند کے قصائد کا تعلق ہے، ان کی منظر نگاری اکثر و بیشتر حالات میں نہایت مبہم ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے اس منظر نگاری میں تکلف، تصنع اور آورد قدم قدم پر موجود ہے۔ پھر یہ منظر نگاری زیادہ تر ایران سے تعلق رکھتی ہے۔ ہندوستان کے مناظر فطرت کے خد و خال ان قصائد میں بہت کم ملتے ہیں۔ لہذا اگر ہم دور قدیم، دور متوسط اور دور متاخر کی منظریہ شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ہم محسوس کریں گے کہ اس شاعری کا بیشتر حصہ منظر نگاری کی اصلی خصوصیات سے محروم ہے۔ اس کے علاوہ یہ ساری منظر نگاری ضمنی ہے۔ اردو شعرا نے خاص طور سے مناظر قدرت پر بہت کم نظمیں کہی ہیں۔ اس خلا کی طرف مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"لیکن با ایں ہمہ قدما و متوسطین بلکہ متاخرین کے زمانے تک مناظر قدرت نے کوئی مستقل حیثیت پیدا نہیں کی۔ بلکہ قصائد کی تشبیبوں اور مثنویوں کے مرثیوں میں واقعات کے سلسلہ میں بہار، خزاں، کوہ، دریا اور صبح و شام کا جہاں ذکر آجاتا تھا وہاں ان کے مناظر بھی دکھائے جاتے تھے۔"[1]

اردو شاعری کے مقابلہ میں انگریزی شاعری میں منظر نگاری کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ انگریزی شعرا نے فطرت برائے فطرت کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے فطرت کو مختلف انداز سے مختلف روپ میں دیکھا۔ انھوں نے بذات خود فطرت کا مطالعہ کیا اور قیاسی اور تخیلی

---

[1] شعر الہند۔ حصہ اوّل۔ مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ [illegible]

منظر نگاری سے گریز کیا۔ اردو میں ایسی منظر نگاری کیوں نہیں ملتی اس کی کئی وجہیں ہیں۔

شیخ محمد اکرام نے حکیم فرزانہ میں اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا ایک سبب یہ بتایا ہے:

"یہ صحیح ہے کہ انگریزی زبان کی کئی بلند پایہ نظمیں قدرتی مناظر کے متعلق ہیں اور انگریزی ادب میں ان مناظر کی شاعری کو ایک خاص درجہ حاصل ہے لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگلستان میں، بالخصوص ان اضلاع میں جہاں کثرت سے جھیلیں ہیں شاندار مناظر قدرت کی جو فراوانی ہے وہ دہلی کے گرد و نواح بلکہ ہندوستان بھر میں میسر نہیں۔ اور اگر کوئی دہلوی شاعر اسی خیال سے مرعوب ہو کر کہ انگریزی شاعری میں مناظر فطرت کے متعلق بہت نظمیں ہیں، خود بھی اونچے پہاڑوں اور خوش نما جھیلوں کے خوبصورت مناظر کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ "اَن نیچرل" یا مصنوعی شاعری کوئی نہ ہوگی کیونکہ شاعر نے خود تو یہ مناظر دیکھے ہی نہیں۔ جو لوگ گرم ملکوں یا چٹیل میدانوں میں رہتے ہیں، انھیں وہ دل فریب مناظر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا جو قدرت نے فیاضی سے کشمیر، سوئٹزرلینڈ، انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے بعض اضلاع میں بہم پہنچائے ہیں۔ انھیں جو خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوئے ہیں وہ نسبتاً محدود ہیں۔ مثلاً چاندنی رات۔ صبح۔ شام۔ شفق کی رنگینی۔ دریا کا کنارہ۔ بسنت۔ بہار۔ برسات۔ اور اردو میں ان مناظر کے متعلق کئی نظمیں ہیں۔[1]"

شیخ محمد اکرام نے یہ بتاتے ہوئے کہ غالب کی شاعری میں منظر نگاری کی کمی کیوں ہے۔ یہ وجہ بیان کی ہے۔ ان کے تبصرے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر صرف "دہلوی شاعر" ہیں، سارے ہندوستان کے نہیں۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کا بتایا ہوا یہ سبب صرف ایک علاقائی حد تک کے لیے تو درست کہا جا سکتا ہے مگر سارے ہندوستان کے لیے نہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے ہم صرف دہلوی شاعر اور نواح دہلی پہ اکتفا نہ کریں بلکہ سارے ہندوستان اور سارے ہندوستان کی اردو شاعری کو پیش نظر رکھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی کے گرد و نواح میں مناظر قدرت کی فراوانی نہیں ہے مگر اتنا تو مسلّم ہے کہ دہلی جمنا کے کنارے واقع ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دور قدیم سے لے کر دور متاخر تک کتنے شعرا نے جمنا پر نظمیں کہیں؟ پھر مناظر قدرت کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ صرف پہاڑ، ندی، اور چشمے پر نظمیں کہی جائیں۔ دہلی کے شعرا چاند، ستارے، سورج، بادل، شفق اور قوس قزح وغیرہ کے بارے میں نظمیں کہہ سکتے تھے اور اس طرح منظر نگاری کا حق ادا کر سکتے تھے مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ شیخ اکرام نے کہا ہے کہ چاندنی رات، صبح، شام، شفق کی رنگینی، دریا کا کنارہ، بسنت، بہار اور برسات کے متعلق اردو میں کئی نظمیں ہیں۔ مگر ایسی نظموں کی تخلیق زیادہ تر دور جدید میں کی گئی ہے۔ دور قدیم میں نظیر اکبرآبادی کے علاوہ بہت کم شعرا نے ان موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ شعرا چاہے دہلی ہی کے ہوں مگر اُن کی ذمہ داری یہ کہہ کر ختم نہیں کی جا سکتی ہے کہ دہلی میں یا دہلی کے گرد و نواح میں مناظر قدرت کی کمی تھی۔ اگر کچھ نہیں تو دہلی میں باغات کی کثرت تھی اور باغات بھی قدرتی مناظر میں شامل ہیں۔ سر سید احمد خاں نے 'آثار الصنادید' میں مختلف باغوں کا ذکر کیا ہے۔ باغ حیات بخش، مہتاب باغ، بیگم باغ، باغ شالا مار، باغ روشن آرا، باغ سرہندی، باغ محلدار خاں، باغ ناظر اور قدسیہ باغ دہلی کے مغلیہ دور میں موجود تھے۔ آخر، دہلی کے شعرا نے ان باغات پر طبع آزمائی کیوں نہیں کی؟

یہ کہنا کسی حد تک ضرور صحیح ہے کہ انگلستان میں جگہ جگہ دل کش قدرتی مناظر کی جو فراوانی ہے وہ ہندوستان میں نہیں ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ ہندوستان[2] میں مناظر قدرت کی کمی ہے۔ اگر پہاڑوں کی بات کی جائے تو ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر کوہ؛ وغیرہ موجود ہیں۔ اتر پردیش کے دل کش اور حسین پہاڑی خطے ہیں سب سے بڑھ کر کشمیر کی وادی جنت نظیر ہے۔ وسطی ہند میں کوہ ارا

[1] حکیم فرزانہ۔ شیخ محمد اکرام۔ ص ۱۵۶

[2] اس مضمون میں جہاں کہیں ہندوستان کا ذکر آیا ہے اس سے مفہوم غیر منقسم ہندوستان ہے۔

کوہ بندھیاچل اور کوہ ست پڑا سینہ تانے کھڑے ہیں۔ دکن میں مشرقی گھاٹ اور مغربی گھاٹ کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ندیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ گنگا، جمنا، گھاگرا، گنڈک، بھاگ متی، کوسی، برہمپتر، چمبل، سون، ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم، سندھ، نربدا، تاپتی، مہاندی، گوداوری، کرشنا اور کاویری ندیاں وغیرہ رقص کر رہی ہیں۔ یہاں جھیلوں کی ضرور کمی ہے تاہم مان سرودر، ڈل، سانبھر، مہوبا کی جھیل اور چِلکا جھیل وغیرہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ یہاں دو مشہور جنگل بھی ہیں بندرابن اور سندربن۔ اس کے علاوہ ہندوستان سمندروں سے بھی گھرا ہوا ہے۔ خلیج بنگال، بحر ہند، اور بحر عرب ہندوستان کے گرد نیم حلقہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں بہار کا بھی موسم آتا ہے بسنت اور برسات کو یہاں کی بہار سمجھئے۔ یہاں مختلف قسم کے طیور اور جانور بھی موجود ہیں۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں مناظر قدرت کی کمی ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر کا اعتراف غیر ملکی مصنفین نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر گستاولی بان لکھتے ہیں:

"رود گنگا کی گھاٹی زرخیزی اور آبادی اور خوبصورتی میں دنیا کے بہترین خطوں میں ہے۔"[1]

دور قدیم، دور متوسط اور دور متاخر کے شعرا نے اس وادی کو تو دیکھا ہی تھا پھر اس پر انھوں نے نظمیں کیوں نہیں کہیں؟ ڈاکٹر گستاولی بان ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"جنوب کی طرف یہ مغربی گھاٹ دفعتاً ایک بلندی پیدا کرتے ہیں یہیں نیلگری کا مشہور پہاڑ ہے جو اپنی آب و ہوا اور خوش منظری کے لحاظ سے دکن کا سوئٹزرلینڈ ہے۔"[2]

ہمارے شعرا دکن میں بھی رہے۔ انھوں نے دکن کے اس سوئٹزرلینڈ پر طبع آزمائی کیوں نہیں کی؟ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر دور قدیم، دور متوسط اور دور متاخر کے شعرا چاہتے تو ان قدرتی مناظر کو موضوع شاعری بنا سکتے تھے۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان میں مناظر قدرت کی کمی تھی تو سنسکرت اور ہندی شاعری میں مناظر قدرت پیدا کیسے کیے گیا۔ اگر ہم سنسکرت کی شاعری پر نظر دوڑائیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ سنسکرت کے شعرا نے ہندوستان کے پہاڑوں، دریاؤں اور دیگر مناظر قدرت کا اپنی شاعری میں کافی کیا ہے۔ ان کے بیانات میں تصنع اور آورد نہیں ہے بلکہ انھوں نے عارض فطرت کے صحیح اور سچے جلوے پیش کیے ہیں۔ چنانچہ رامائن میں جنگل کے جو مناظر ہیں ان کا تعلق اسی ملک سے ہے۔ کالی داس کے ڈراموں میں تو یہ منظر نگاری نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ چنانچہ رگھو ونش، کمار سمبھو، میگھ دوت اور شکنتلا میں فطرت کے مختلف خط و خال اپنے انتہائی حسین انداز میں جلوہ گر ہیں۔ بھو بھوت کے ڈرامے مالتی مادھو میں بھی فطرت کے حسین مرقعے موجود ہیں۔ بھرتری ہری کے شرنگار شتک میں بھی فطرت کی دل کش جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اگر ہندوستان میں مناظر فطرت کی کمی ہوتی تو سنسکرت کے یہ شعرا منظر نگاری کس طرح پیش کر سکتے؟

اپ بھرنش کال میں بھی ہم کو منظر نگاری کے قابل قدر نمونے ملتے ہیں۔ چنانچہ سوانبھو ([illegible]) نے پوم چراؤ ([illegible]) میں مختلف موسموں کے بیانات پیش کیے ہیں۔[3] پشپ دنت ([illegible]) نے مہاپران ([illegible]) میں صبح، شام، ندی اور جھیل کی مصوری کی ہے۔[4] نیندی ([illegible]) نے سودنسنٹ ([illegible]) میں ندی، بسنت اور بھونروں کے گیت کا منظر کھینچا ہے۔[5] دوی درشٹ گھاھل ([illegible]) نے پوم سری چراؤ ([illegible]) میں کوئل کا کوکنا، بھونروں کا گونجنا، اور طلوع ماہ وغیرہ کی منظر کشی حسین انداز میں کی ہے۔[6] غرض ہندی شاعری کے مختلف ادوار میں بھی منظر نگاری کے حسین نمونے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ دیرگا تھا کال کی شاعری کا تعلق خاص طور سے ویر رس سے ہے تاہم اس دور کے شعرا نے بھی اپنے "راسو" میں جابجا ہندوستان کے مناظر کی عکاسی کی ہے

---

[1] تمدن ہند مصنفہ ڈاکٹر گستاولی بان۔ ترجمہ سید علی بلگرامی ص۳ [2] ایضاً ص۱۱۔ [3] اپ بھرنش ساہتیہ۔ ہربنس کوچھڑ ص۵۶۔ [4] ایضاً ص۵۲۔ [5] ایضاً ص۶۷ [6] اپ بھرنش ساہتیہ۔ ہربنس کوچھڑ۔ ص۲۰۵

خاص طور سے "پرتھوی راج راسو" میں جہاں برسات کا سماں پیش کیا گیا ہے، وہ بڑا دل کش ہے بھگتی کال کی شاعری اگرچہ بڑی حد تک مذہبی ہے اور فطرت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی ہے تاہم اس دور کے شعرا نے بھی جہاں کہیں فطرت کا ذکر کیا ہے، وہاں اس کے اصلی رنگ روپ کو جھلکایا ہے۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت میں فطرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس نے مان سرور جھیل کا نقشہ خاص طور سے بہت حسین انداز میں کھینچا ہے[1]۔ تلسی داس نے بھی رام چرت مانس میں فطرت کے حسن کو نمایاں کیا ہے۔ بخصوص کشکندھا کانڈ حصہ میں برسات کی بے مثل مصوری کی ہے[2]۔ ریت کال میں بھی منظر نگاری کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اس دور کے مشہور شاعر سیناپتی نے ہندوستان کے موسموں کا نقشہ بڑے اچھے انداز میں کھینچا ہے۔ ہندی کے دور جدید میں بھارتیندو ہرش چندر، بال مکند گپت، رومانی شعرا میں شری دھر پاٹھک اور متھلی شرن گپت اور چھایا وادی شعرا میں جے شنکر پرشاد، سمترانندن پنت اور سوریہ کانت نرالا ترپاٹھی نے منظریہ شاعری کو بہت فروغ دیا ہے۔

سنسکرت اور ہندی شاعری میں منظر نگاری کی فراوانی دیکھتے ہوئے شیخ محمد اکرام کی یہ توجیہ کہ اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں مناظر قدرت کی قلت ہے، زیادہ وزنی اور معقول نہیں معلوم ہوتی۔ در اصل ہم کو اس سوال پر زیادہ سنجیدگی اور فراخ دلی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کے سبب کا کچھ سراغ ہم کو مولانا شبلی نے دیا ہے۔ موازنۂ انیس و دبیر میں وہ فرماتے ہیں[3]

"عربی اور فارسی میں مناظر قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے اور اردو میں گویا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔"

مولانا شبلی کا یہ جملہ بہت اہم ہے جو قطب نما کا کام کر رہا ہے۔ یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سرسری طور پر عربی اور فارسی شاعری کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ عربی اور فارسی شاعری میں منظر نگاری کی کیا نوعیت رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی میں منظر نگاری کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عرب ایک ریگستانی ملک ہے تاہم دور جاہلیت کے شعرا امرء القیس اور نابغہ وغیرہ نے ریگستان، جھاڑیوں اور بدوؤں کی منظر کشی اچھی خاصی کی ہے۔ جب اسلام کا عروج ہوا تو حسان بن ثابت کعب بن مالک نے مذہبی شاعری کی طرف زیادہ توجہ برتی۔

خلافت راشدہ کے بعد شام میں اموی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ شام عرب کے مقابلہ میں سرسبز و شاداب ملک ہے۔ مگر شام کے شعرا نے اس ملک کے فطری مناظر سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ وہاں کے خلفا کی مدح میں اپنا زور طبع صرف کیا۔ اموی حکومت کے خاتمہ کے بعد عراق میں عباسی حکومت قائم ہوئی۔ عراق دریائے دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے۔ اس لیے یہ ملک بھی زرخیز ہے۔ مگر یہاں کے عربی شعرا نے بھی منظر نگاری کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کی بلکہ خلفائے عباسیہ کی مدح سرائی کو منظر نگاری پر ترجیح دی۔ عہد عباسی کے دوسرے دور میں اندلس میں اموی خلفا کی حکومت قائم ہوئی۔ اندلس جغرافیائی اعتبار سے بہت سرسبز و شاداب اور پُرفضا ملک ہے۔ اس حسین جغرافیائی ماحول کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا اور اندلس کے شعرا نے عربی شاعری میں مناظر قدرت کو جگہ دی خصوصاً ابو سعید احمد ابن زیدون نے اپنی نظموں میں فطرت کے حسن کو جھلکایا۔ مگر عرب، شام اور عراق کی شاعری منظر نگاری سے بڑی حد تک محروم رہی۔ اسی لیے مولانا شبلی کا یہ قول صحیح ہے کہ عربی میں مناظر قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

اب جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے مولانا شبلی کے بہ قول "ایران قدرتی چمن زار ہے"۔ اس لیے ایرانی شعرا اگر چاہتے تو اندلس کے عربی شعرا یا انگریزی شعرا کی طرح اپنے یہاں کے حسین مناظر سے متاثر ہو کر منظر نگاری کے کمالات دکھا سکتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ملک میں

---

[1] جائسی گرنتھاولی۔ مرتبہ رام چندر شکل ص ۲۷ تا ۳۰ [2] رام چرت مانس۔ کشکندھا کانڈ تلسی داس ص ۴۸۹–۴۹۰۔ مطبوعہ گیتا پریس گورکھپور۔
[3] موازنۂ انیس و دبیر۔ مولانا شبلی ص ۱۶۳

جگہ جگہ سبزہ زار، آبِ رواں اور آبشاروں کے پائے جانے کا یہ نتیجہ تو ضرور نکلا کہ مولانا شبلی ہی کے بہ قول "ایران کی انشا پردازی پر رنگینی چھا گئی"۔ مگر ایرانی شعرا نے رنگین نوائی، رنگین سخنی، سبزپوش وغیرہ کے محاورے اور ترکیبیں وضع کرنے کے علاوہ ایران کے پہاڑوں، دریاؤں، وادیوں، پھلوں، پھولوں، پرندوں اور جانوروں پر نظمیں نہیں کہیں۔ کم از کم اس قسم کی نظمیں دورِ قدیم سے لے کر دورِ متاخر تک نظر نہیں آتی ہیں۔

بہرحال فارسی شعرا نے فارسی قصائد کی تشبیب میں عربی منظر نگاری کی تقلید کی لیکن چونکہ خود عربی میں منظر نگاری کے اچھے نمونے نہیں ملتے تھے اس لیے فارسی قصائد کی تشبیب میں بھی مناظرِ قدرت کا بیان فرضی ہو کر رہ گیا۔ البتہ فارسی شعرا نے مثنویوں میں جابجا منظر نگاری کے جو نمونے پیش کیے ہیں، وہ قصائد کی منظر نگاری سے بہتر ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عربی میں مثنوی نگاری کا رواج نہ تھا۔ مثنوی نگاری خاص ایران کی ایجاد ہے۔ چونکہ فارسی شعرا کے سامنے عربی کی مثنویوں کے نمونے موجود نہ تھے اس لیے مثنوی کے میدان میں ان کو عربی شعرا کی تقلید کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی بلکہ انھوں نے خود اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ اس لیے فارسی مثنویوں کی منظر نگاری میں مبالغہ اور آورد کی کمی ہے۔ چنانچہ فردوسی کے شاہنامہ، نظامی کی لیلیٰ مجنوں اور جامی کی یوسف زلیخا وغیرہ میں جہاں کہیں منظر نگاری ملتی ہے وہ زیادہ واضح، روشن اور حقیقی ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو شاعری نے فارسی شاعری کے سایے میں جنم لیا۔ اس لیے اردو شاعری میں فارسی شاعری کی ساری خصوصیات آ گئیں۔ فارسی شاعری میں منظر نگاری کے اصلی نمونے موجود نہیں تھے اس لیے اردو شعرا بھی مناظرِ قدرت کے سچے اور واضح نقشے نہیں کھینچ سکے۔ فارسی قصائد کی تشبیب میں رسمی منظر نگاری موجود تھی، اردو شعرا نے بھی اسی مصنوعی منظر نگاری کی تقلید کی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہندوستان کے مناظرِ قدرت کے بجائے ایران کی بہار کے جلووں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اسی لیے اردو قصائد کی تشبیب میں منظر نگاری آورد، تصنع، تکلف اور مبالغہ کی ایک بھونڈی تصویر بن گئی۔

اگر اردو شعرا فارسی شاعری کے علاوہ سنسکرت بھی پڑھتے اور سنسکرت شاعری سے متاثر ہوتے تو اس کا قوی امکان تھا کہ وہ منظر نگاری کی طرف بھی توجہ کرتے۔ مگر اردو شعرا سنسکرت سے ناواقف تھے۔ اس لیے اردو شاعری کو بھی نقصان پہنچا۔ اس نکتے کی طرف مولوی سید امداد امام اثر نے اشارہ کیا ہے۔

"لاریب اگر اردو کے شعرا شعرائے سنسکرت کا تتبع اختیار فرماتے تو اردو شاعری کا دائرہ وسیع ہو جاتا۔ اسی حالت میں اردو کی شاعری ممتاز تر صورت پیدا کرتی مگر اس عدمِ تتبع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اردو کے شعرا زبانِ سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور چونکہ عموماً صرف فارسی میں مہارت رکھتے تھے، شعرائے فارسی کے سوا انھیں کسی دوسری زبان کے شعرا کے تتبع کا موقع حاصل نہ تھا۔[1]"

غرض، اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ فارسی میں اصلی منظر نگاری کے نمونے موجود نہیں تھے اور چونکہ اردو شعرا فارسی ہی کی تقلید کرتے تھے اس لیے فارسی کی طرح اردو شاعری میں بھی صرف مصنوعی اور رسمی منظر نگاری جگہ پا سکی اور اردو صحیح قسم کی منظر نگاری سے ناآشنا رہی۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا ایک اور اہم سبب یہ ہے کہ بنو امیہ کے دور میں عربی شاعری نے درباری ماحول میں ترقی کی اور قصیدہ گوئی کو فروغ ملا۔ فارسی شاعری نے درباری ماحول عربی شاعری سے حاصل کیا اور ایران میں بھی قصیدہ گوئی کا رواج ہو گیا۔

چونکہ بقول مولانا عبدالسلام ندوی "اردو شاعری من حیث الاغلب فارسی شاعری کا وجود ہی ہے۔[2]" اس لیے اردو شعرا نے فارسی شعرا کی تقلید میں قصیدہ گوئی کا آغاز کیا اور درباری ماحول کے اسیر ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ اردو کے مستند اساتذہ نے قصیدہ گوئی کو باعثِ افتخار گردانا۔ سودا، میر، انشا، ذوق، غالب، مومن، داغ اور امیر مینائی جیسے کہنہ مشق شعرا قصیدہ گوئی میں اپنی شاعری کے جوہر دکھانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان شعرا کو خارجی دنیا کے مطالعہ کا موقع بہت کم ملا۔ انھوں نے یہ سوچا ہی

---

[1] کاشف الحقائق۔ جلد دوم۔ مولوی سید امداد امام اثر ص۲۔ [2] شعر الہند۔ حصہ اول۔ مولانا عبدالسلام ندوی ص۴۵۶

نہیں کہ مناظرِ قدرت کے جلوے دیکھیں اور حسن فطرت کا عکس اپنی شاعری میں اُتاریں۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اردو شاعری میں منظر نگاری کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔

شمالی ہند کے مقابلہ میں دکنی شاعری میں منظر نگاری کے نمونے زیادہ ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دکنی حکومتوں کا دلی کی سلطنت سے چونکہ کوئی تعلق نہ تھا اس لیے وہ فارسی کے اثر سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔ "دکنی شاعری پر فارسی کی بہ نسبت سنسکرت کے اثرات زیادہ پڑے۔ سنسکرت سے اثر پذیر ہونے کی وجہ سے دکنی شاعری میں مناظرِ قدرت کی زیادہ صحیح اور سچی تصویریں ملتی ہیں۔ دکنی قصائد اور دکنی مثنویوں میں بھی منظر نگاری میں اصلیت اور صداقت کے عناصر زیادہ ملتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر محمد قلی قطب شاہ اور نصرتی کے قصائد اور ملا وجہی کی "قطب مشتری" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

اُردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا ایک سبب غزل کی مقبولیت بھی ہے۔ اردو شاعری نے غزل بھی فارسی غزل کے سرمایے سے حاصل کی۔ فارسی شعرا نے غزل کے دامن کو بیش بہا جواہرات سے پُر کر دیا تھا۔ یہ سارے ہیرے جواہرات اردو شعرا کے ہاتھ لگے اور اُنھوں نے اسی نمونے کے اشعار ڈھالنا شروع کر دیے۔ اب اگر ہم غزل کی روح، اس کی اہمیت اور ماہیت پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ غزل داخلی شاعری کے لیے زیادہ موزوں ہے، اس میں خارجیت کی گنجائش بہت کم ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "اردو غزل" میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجہ کی دروں بینی پائی جاتی ہے۔ غزل گو شاعر جو کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے اس کا حیات و کائنات کا نقطۂ نظر خالص موضوعی اور داخلی ہوتا ہے وہ اپنے دل کی دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ذات میں سب کچھ پا لیتا ہے۔[1]"

دراصل غزل گو شاعر کو خارجی عالم کے مشاہدہ کرنے کی نہ فرصت ہوتی ہے اور نہ ضرورت۔ اس لیے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

"غزل میں عام طور پر اندرونی تجربے لالہ و گل کے پیرائے میں بیان کیے جاتے ہیں، اس لیے فطرت اس کا موضوع نہیں۔[2]"

اردو شاعری کا مطالعہ اس بات کو منکشف کرتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غزل پر مشتمل ہے۔ اور غزل میں منظر نگاری کو داخل کرنا اس کے موضوع کے منافی ہے، اس لیے اردو شاعری میں منظر نگاری کی بہت کمی رہی۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا یہ بھی سبب ہے کہ اس کا آغاز متصوفانہ فضا میں ہوا۔ شیخ فریدالدین گنج شکر، امیر خسرو، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت سید محمد جونپوری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ امین الدین اعلیٰ، اور شاہ محمد جیو گام دھنی وغیرہ ابتدائی دور کے صوفی ہیں۔ یہ صوفیائے کرام اگرچہ باقاعدہ شاعر نہ تھے مگر اپنے مریدین کی تلقین کے لیے کچھ ناصحانہ اشعار کہہ لیتے تھے۔ یہ لوگ خانقاہ کے اندر بیٹھنے والے شاعر تھے۔ ان کی زندگی کا خاص مشغلہ عبادت و ریاضت تھا۔ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مناظرِ قدرت کی سیر کرتے اور ان کے نقش و رنگ کو اپنے اشعار میں جگہ دیتے۔ اگر ابتدائی دور کے شعرا مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہوتے اور پھولوں اور پنکھڑیوں کے نظارے کے بعد ان کی سچی تصویریں اپنے اشعار میں آتارتے تو ہمارے یہاں ابتدا ہی میں منظر نگاری کی بنیاد پڑ جاتی۔ پھر بعد کے شعرا اسی بنیاد پر عمارت تعمیر کر سکتے تھے۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا سبب ایک اور ہو سکتا۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد ایک اضطراب و انتشار آیا۔ اس سراسیمگی میں اندرونی بغاوتوں کا بھی ہاتھ ہے اور بیرونی حملوں کا بھی۔ محمد شاہ کے عہد میں نادر شاہ درانی نے ۱۷۳۹ء میں دلی پر حملہ کیا۔ وہ ۵۸ دن تک دلی میں مقیم رہا اور قتل و غارت میں مصروف

---

[1] اردو غزل۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ص ۱۶۱۵ [2] میر تقی میر۔ حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۳۸۶

[illegible]

میر اس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے اس حملہ کا اثر قبول کیا ہوگا۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے مسلسل حملے کیے۔ ان حملوں کا اثر مغل بادشاہوں، دلی کے باشندوں اور اردو شاعروں پر گہرا پڑا۔ خصوصاً احمد شاہ ابدالی کے ۱۷۶۱ء کے حملے نے دلی کی کمر ہی توڑ دی۔ میر اس حملے کے اثرات کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

"خانہا نشستہ، دیوارہا شکستہ، خانقاہ بے صوفی، خرابات بے مست خراب بود...... بازارہا کجا کہ بگویم، طفلان تہ بازار کجا، حسن کو کہ بپرسم، یاماں زرد رخسار کو، جوانان رعنا رفتند۔ پیران پارسا گذشتند۔ محلہا خراب کوچہا نایاب، وحشت ہویدا، انس ناپیدا۔"[۱]

میر کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی کسی نہ کسی انداز میں ان حملوں کے اثر کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔ حاتم نے دلی کے امرا کا حال اپنے اشعار میں پیش کیا۔ سودا نے دلی کے رؤساء کی زبوں حالی اپنے شہر آشوب میں بیان کی۔ میر کی غزل کے بہت سے اشعار اس دور کی سراسیمگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مصحفی نے سلاطین دہلی کی تنگ معاشی کا ذکر کیا ہے۔ جرأت نے ملکی حکمرانوں کی بے سروسامانی کو بے نقاب کیا ہے۔

بہر حال دلی کے شعرا میں گردش زمانہ کی وجہ سے یاسیت اور محزونیت خون بن کر دوڑنے لگی اور انھیں اس بات کا موقع نہ مل سکا کہ وہ فطرت کی کھلی ہوئی آغوش میں کھیل سکیں۔ اگر ان شعرا کو اطمینان قلب حاصل ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ فطرت کے عارض و گیسو سے بھی کھیلتے اور منظریہ شاعری کو فروغ دیتے۔ دکن میں یہ صورت حال نہ تھی اس لیے دکنی شعرا نے مناظر قدرت کی طرف زیادہ توجہ کی مگر افسوس یہ ہے کہ شمالی ہند کے شعرا اس سے متاثر نہ ہو سکے۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ دور قدیم اور دور متوسط میں آمد و رفت کے ذرائع بہت محدود تھے۔ لوگوں کو سفر کرنے میں سخت دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اس کے علاوہ وقت بھی بہت صرف ہوتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اردو شعرا کو ہندوستان کے مناظر قدرت دیکھنے کے مواقع نہیں ملے۔ اگر اس زمانہ میں آمد و رفت کی سہولتیں ہوتیں تو ممکن ہے کہ اردو شعرا ہندوستان کے مختلف مقامات کا سفر کرتے رہتے اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ اور جب انھیں مناظر قدرت دیکھنے کا موقع ملتا تو ان کا ان مناظر سے اثر انداز ہونا بھی یقینی تھا۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اردو شاعروں کو قدرتی نظاروں سے کچھ یوں بھی دلچسپی نہیں رہی۔ مثال کے طور پر میر کے ایک واقعہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں کیا ہے:

"میر صاحب کو بہت تکلیف میں دیکھ کر لکھنؤ کے ایک نواب انھیں معہ عیال اپنے گھر لے گئے۔ اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا۔ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح ان کی طبیعت خوش اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آکر رہے کھڑکیاں بند پڑی تھیں۔ کئی برس گزر گئے اسی طرح بند پڑی رہیں۔ کبھی کھول کر باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے۔ انھوں نے کہا ادھر باغ ہے، آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ میر صاحب بولے۔ کیا ادھر باغ بھی ہے؟ انھوں نے کہا کہ اسی لیے نواب آپ کو یہاں لائے ہیں کہ جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔ یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔"[۲]

اسے میر صاحب کی بے نیازی کہئے یا بد ذوقی کہ گھر کے اندر باغ ہے اور وہ اس سے لطف نہیں حاصل کر رہے ہیں۔ یہی حال زیادہ تر اردو شعرا کا رہا ہے۔ انھیں مناظر قدرت کے مطالعہ سے بہت کم دلچسپی رہی۔ مولوی سید امداد امام اثر فرماتے ہیں:

"وہ شخص جو گھر کے اندر بیٹھا ہوا شعر کہتا ہے یا اس پاشکستگی کے ساتھ استادوں کے کلام کو سمجھا چاہتا ہے وہ ایسے نیچرل اشعار کے لطف کو کیا پا سکتا ہے۔ ممکن نہیں کہ ایسے خانہ نشین عنکبوت سیرت شخص کو نیچرل بیانات سے حظ حاصل ہو سکے۔"[۳]

---

[۱] ذکر میر۔ مرتبہ مولوی عبدالحق صفحہ ۹۹۔ [۲] آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد صفحہ ۲۷۰ [۳] کاشف الحقائق۔ جلد اول۔ مولوی سید امداد امام اثر صفحہ ۲۲۴

حقیقت یہ ہے کہ اردو شعرا زیادہ تر عنکبوت سیرت رہے ہیں۔ اور وہ خیالی اور قیاسی تصویریں کھینچنے کے عادی۔ مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں سر والٹر اسکاٹ کے بارے میں لکھا ہے کہ "جب وہ روکبی کا قصہ لکھ رہا تھا ایک شخص نے اس کو دیکھا کہ پاکٹ بک میں چھوٹے چھوٹے خودرو پھول، پتے اور میوے جو وہاں اُگ رہے تھے اُن کو نوٹ کر رہا ہے۔ ایک دوست نے اُس سے کہا کہ اس دردِ سر سے کیا فائدہ؟ کیا عام پھول کافی نہ تھے جو چھوٹے چھوٹے پھولوں کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت پڑی سر والٹر نے کہا تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں ہیں جو بالکل یکساں ہوں[۱]"۔ سر والٹر اسکاٹ کی طرح دردِ سر مول لینے والے شعرا اردو میں بہت کم گذرے ہیں۔

اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کی ایک اور وجہ ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ھماری شاعری میں لکھا ہے:

"انگریزی شاعری کا عام موضوع ہے کائنات (نیچر) اور اس کا تعلق انسان سے۔ اردو شاعری کا عام موضوع ہے انسان اور اس کا تعلق اپنے بنی نوع اور خدا سے۔ دونوں کی منزلیں جدا جدا اور راستے الگ الگ ہیں پھر حالات سفر کیونکر یکساں ہو سکتے ہیں[۲]۔"

یہ حقیقت ہے کہ انگریزی شاعری کے مقابلہ میں اردو شاعری نے فطرت کو کبھی ایک عام موضوع کی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ قصیدوں میں کسی شخص کی ثنا خوانی ہوتی ہے۔ مرثیوں میں اہلِ کربلا کے غم و رنج کو نمایاں کیا جاتا ہے یا کسی اور مرجانے والے پر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ مثنویوں میں، چاہے وہ رزمیہ ہو یا بزمیہ، انسان ہی کی ہستی کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ ان اصناف میں اگر فطرت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو اس کی حیثیت محض پس منظر کی ہوتی ہے۔ غزل میں فطرت کا جلوہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی کیونکہ یہ داخلیت کے لیے مخصوص ہے۔ رباعی اور قطعہ میں بھی فطرت کی عکاسی خاص طور سے نہیں کی گئی ہے۔ ان سارے اصنافِ سخن کا تعلق انسان سے ہے۔ اردو شعرا نے انسان ہی کو اپنی تخیل کا مرکز قرار دیا ہے۔ پھر اس مرکز سے کبھی کبھی انھوں نے ذاتِ حقیقی کی طرف پرواز کیا ہے۔

غرض یہ ہیں اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کے اسباب۔ مگر جس اردو شاعری کا حوالہ ابھی تک دیا گیا ہے اُس کا تعلق، اردو شاعری کے دورِ قدیم، دورِ متوسط اور دورِ متاخرین سے ہے۔ ان ادوار کی شاعری میں منظر نگاری کی سچی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ البتہ دورِ جدید کی اردو شاعری میں منظر نگاری بڑی حد تک اپنے حسین خد و خال کے ساتھ داخل ہو گئی ہے۔ پروفیسر عبد القادر سروری دورِ جدید کے رسمی نئے رجحان کے متعلق لکھتے ہیں:

"جدید اردو شاعری کا مطالعہ ہم کو ایک اور چیز سے روشناس کراتا ہے یہ کائنات کے رازوں اور فطرت کے حقائق کی تلاش ہے۔ جدید اردو شاعری کے اولین معمار نیچر اور فطرت سے قریب تر ہونے کے لیے جو فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہیں اور پھر جس پرستارانہ عقیدت سے اس کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، اس کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ عرصہ تک انھیں فراقِ فطرت کے صدمے جھیلنے پڑے ہیں۔ فطرت پرستی کے اولین جوش میں بہت سی نظمیں مناظر، وقت اور موسم کی کیفیتوں پر لکھی گئیں۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے[۳]۔"

حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید میں وہ ساری رکاوٹیں تقریباً دور ہو گئیں جو ہمارے اردو شعرا کی راہ میں پہلے حائل تھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جاگیرداری کے خاتمہ کے بعد صنفِ قصیدہ پر بھی خزاں چھا گئی اور تشبیب کی رسمی منظر نگاری اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ انگریزی تعلیم نے اردو شعرا کو ایک نئی قسم کی شاعری سے روشناس کرایا جس میں عروسِ فطرت کے جلووں کی تابانی تھی۔ انگریزی شاعری کی طرف سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد متوجہ ہوئے اور اس سے استفادہ کیا چنانچہ انھوں نے مثنوی شب قدر کہی۔ بقول سید ممتاز علی "یہ پہلا دن تھا جس روز ہمارے ملک کی نئی شاعری کی پہلی اینٹ رکھی گئی[۴]۔" اس کے بعد حالی نے برکھا رت مثنوی کہہ کر منظر نگاری کی بنیادیں اور استوار کیا۔ رفتہ رفتہ منظر نگاری کی

---

[۱] مقدمۂ شعر و شاعری۔ مولانا حالی ص ۵۳۔ [۲] ھماری شاعری۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۲۳۔ [۳] جدید اردو شاعری۔ پروفیسر عبد القادر سروری ص ۵۔ [۴] مجموعۂ نظم آزاد۔ دیباچہ سید ممتاز علی ص ۷

طرف اردو شعرا توجہ کرنے لگے۔ اسمٰعیل میرٹھی اور وحید الدین سلیم پانی پتی، شوق قدوائی اور سرور جہان آبادی وغیرہ نے منظریہ شاعری کو بہت ترقی دی۔

دورِ جدید میں وطن پرستی کا جذبہ بھی عام ہو گیا جس نے منظر نگاری کو بہت فروغ دیا۔ اب اردو شعرا ہندوستان کے دریا، پہاڑ، ساحل سمندر، گل پوش وادیوں، سبھی پر نظمیں کہنے لگے۔ آمد و رفت کی سہولتوں کی بدولت ملازمت، مشاعروں اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں اردو شاعروں کو کشمیر سے راس کماری تک آنے جانے کے مواقع دستیاب ہونے لگے۔ اس نقل و حرکت کی وجہ سے انھیں مناظر قدرت دیکھنے کا موقع ملا اور ان سے جو تاثر پیدا ہوا وہ اشعار کے قالب میں ڈھلنے لگا۔

غرض، دورِ جدید میں اردو شاعری نے منظر نگاری کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ اس دور میں اردو کے چند شعرا نے ایسی منظریہ نظمیں کہی ہیں جو بہت بلند اور وقیع ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی یہ تصویریں ابھی اتنی دلکش جاذبِ نظر اور مکمل نہیں ہیں جو منہ سے بولنے لگیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اردو شعرا کو فطرت میں غرق ہونا ہوگا اور فطرت کو اپنے اندر جذب کرنا ہوگا۔



افغانستان کی ثقافتی سرگرمیاں ـــــ ایک جھلک

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے افغان بھائیوں کے دوش بہ دوش کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے سکھ حضرات ہیں جو اب وہیں کے باشندے ہو گئے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ کی طرف سے ایک امپوریم کھولا گیا ہے جہاں مستقل ہندوستانی مصنوعات کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ وہاں کے بازار ہندوستانی مصنوعات سے بھرے پڑے ہیں۔

میرے قیام کے زمانے میں حسین کی نقاشی کی نمائش ہو رہی تھی۔ محمود مرزا جیسے نوجوان آرٹسٹ وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر نارائن جو بنارس یونی ورسٹی کے انڈالوجی کے پرنسپل ہیں دو ہفتے کے لیے مدعو تھے۔ اناملک اترجی کے ڈاکٹر آیا بھی گئے ہوئے تھے۔ بہت سے ٹیچر بھی گئے ہوئے ہیں جو وہاں کے اسکولوں میں تعلیم دے رہے ہیں۔ میڈیول کے سلسلے میں بھی ایک ٹیم وہاں موجود تھی۔ مردم شماری کے لیے بھی ایک صاحب وہاں گئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح وزارت پلان (منصوبہ بندی) کمیونٹی ڈویلپمنٹ، میڈیکل کالج اور دوسرے اداروں میں ہندوستانی حضرات دکھائی دیتے ہیں۔

ہندوستانی سفارت خانے میں جانے سے ایک خاص خوشی ہوتی تھی۔ وہاں کے حضرات ہندوستان سے جانے والوں کی ہر طرح سے مدد کرنے میں غیر معمولی خوشی کا احساس کرتے ہیں۔ ہندوستان کے سفیر کبیر جنرل تھاپڑ نے جاتے ہی شب کے کھانے پر بڑی محبت اور بے تکلفی سے دعوت دی۔ فرسٹ سکریٹری ورما صاحب اور جوہری صاحب جیسے پرکار اور با اخلاق جوان اور تھڈانی صاحب جیسے محبت کرنے والے ترجمان بھی موجود تھے جن سے پہلے سے غائبانہ تعارف حاصل تھا۔

اس سفر میں ایک بڑی خوش قسمتی یہ رہی کہ خان عبدالغفار خاں صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا، جن کی زیارت کا ایک مدت سے اشتیاق تھا اور جن کی ایک ہلکی سی جھلک بھی انسان میں استحکام، عزم اور ایثار کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔

غزل

صبا جائسی

مجھ کو یقینِ وعدۂ فردا ہے آج تک
سنسان کتنا شہرِ تمنّا ہے آج تک

ہر سانس آرزو کی ہے تفسیرِ بر محل
دل کو گمانِ ترکِ تمنّا ہے آج تک

اِک بار راہِ غم میں وہ کیا مہرباں ہوا
اُس کے ستم پہ دل کو بھروسا ہے آج تک

ہر شے کے ساتھ کچھ نہ ہو پرچھائیاں تو ہیں
دل ایسا بدنصیب ہے تنہا ہے آج تک

کیسے نگاہِ ناز کے پیکر میں ڈھل گیا؟
جو دردِ دل سے ہم نے چھپایا ہے آج تک

ہر چند تجھ پہ روز ہی کتنی نظر پڑی
اے شاہدِ حیات! تو یکتا ہے آج تک

وہ بزم تو اُجڑ چکی، وہ شب گزر گئی
دل کیوں اسیرِ تلخیِ صہبا ہے آج تک؟

ہنگامِ دیدِ یار کبھی ہو گیا تھا کچھ
دل اور نظر میں درد کا پردا ہے آج تک

غزل

حیدر شاہین

مجبوریوں کی گود میں پل کر گزار دے
وہ اختیار کیا جو غمِ اختیار دے

ساقی تمام جام بکف، مے کدہ بدوش
جب چاہے یہ نگاہ سراپا اُتار دے

میری نظر سے دیکھ کہ شیشے کے دل نہیں
یہ وہ نظر ہے جو ترے رُخ کو نکھار دے

اُس جام سے عزیز ہے تشنہ لبی مجھے
ساقی جو مُنہ کو موڑ کے بیگانہ وار دے

ہر خار پہ گماں ہے عقیقِ بہار کا
مجھ آبلہ بہ پا کو خراجِ بہار دے

ڈھلتا ہے اضطراب کے سانچے میں انتظ
کوئی کہاں سے قلب و نظر کو قرار دے

اتنے قریب آ کے نہ چھیڑو خیال میں
شاہین بے خودی میں نہ تم کو پکار دے

ہندوستان ـــ عظیم ایرانی شاعر بہار کی نظر میں

آفتاب اختر

قدیم آریہ جب اپنے آبائی وطن وسطی ایشیا سے جنوب کی طرف روانہ ہوئے تو ان کا ایک گروہ ایران میں رہ پڑا اور دوسرا ہندوستان پہنچ گیا۔ ان آریوں نے ان دونوں ملکوں میں دو بڑی تہذیبوں کے چراغ روشن کیے۔ یہ تہذیبیں ایک دوسرے سے مختلف بھی تھیں اور بعض چیزوں میں مماثلت بھی رکھتی تھیں۔ مثلاً دونوں ملکوں کے بہت سے رسم و رواج ایک تھے، بعض مذہبی کہانیاں یکساں تھیں اور دونوں ملکوں کی زبانوں (فارسی اور سنسکرت) کے متعدد الفاظ ہم معنی تھے۔



ہندوستان میں مسلمانوں، بالخصوص مغلوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

یہ وہ دور تھا جب حکومت کی زبان ہی فارسی نہ تھی بلکہ ہندوستان میں ایرانی شعرا و ادبا کی آمد و رفت کا تانتا بندھ گیا تھا۔ نظیری، عرفی، صائب اور کلیم وغیرہ ان مشہور شعرا میں ہیں جنھیں ہندوستانی سرزمین کی کشش اس دیار میں کھینچ لائی تھی اور جنھوں نے دربار اکبری، دربار جہانگیری اور دربار شاہ جہانی میں ایرانی درباروں کے مقابلہ میں زیادہ قدر و منزلت پائی تھی۔

انگریزوں کے ہندوستان ... تسلط نے ایرانی شعرا و ادبا کی ... سلسلے کو ... کیوں کہ جب انھیں ہندوستان ... ب و شعر سے کوئی ... نہیں ... وہ ایران سے ادب و شعر کی سر ... کیوں کر ... پھر ... ایران و ہند ... ہم نژاد اور کسی حد تک مشترک تہذیب ... ان نے ان کے صدیوں ... ارتباط و یک رنگی کے جذبات ... ختم نہ ہونے دیا اور اندرونی طور ... ان دونوں ممالک کے عوام میں دوستی، بھائی چارے اور باہمی ہمدردی کے جذبات برابر نشوونما پاتے رہے۔ ایرانی شاعروں اور ادیبوں کو خاص طور سے ہندوستان سے محبت رہی۔

یہ انسیت اور دلچسپی دورِ مغلیہ کے اختتام کے بعد بھی باقی رہی

دونوں ملکوں میں ایک قدر مشترک اور بڑھ گئی۔ اور وہ قدر مشترک تھی، جذبۂ آزادی۔ مغلوں کے بعد ایک طرف ہندوستان پر انگریزی حکومت کی عمل داری ہوگئی اور دوسری طرف ایران بھی برطانیہ کے زیر اثر آگیا۔ ہندوستان کے قوم پرور شاعروں اور ادیبوں کی طرح ایران کے قوم پرور شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس غیر ملکی اقتدار کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جو ایران کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو بھی نہیں بھولتے تھے اور جب ایران کی حالت پر گریہ کناں ہوتے تھے تو ہندوستان کی محکومیت و مظلومیت پر بھی ان کا قلم اشکبار رہتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور کے مشہور ایرانی شاعر، ادیب، صحافی، سیاست دان اور دانشور ملک الشعرا میرزا محمد تقی بہار[۱] جسے ایرانی و غیر ایرانی عہد جدید کا کلاسیکی شاعر مانتے ہیں جب انگلستان کے وزیر خارجہ سر اڈورڈ گرے کے ہاتھوں ایران پر کیے گئے مظالم کی مذمت کرتا ہے تو وہ ہندوستان پر ہونے والے مظالم اور تباہی کو بھی یکساں درد و کرب کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ اس کے ایک قصیدے[۲] کے درج ذیل شعر سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے:

نام نیکو بازیں چیست کہ گویند بدہر   ہند و ایران شدہ ویران ز سر ادوارد گری

اسی شاعر سحر بیان نے بانوے[۹۲] اشعار پر مشتمل ایک طویل منظومہ "سلام بہ ہند بزرگ" کے عنوان سے ۲۶ مہر ماہ ۱۳۲۳ شمسی نمبر ۲ (۱۹۴۴ء) کو دانش سرائے عالی تہران میں ہند ایران دوستی سے متعلق قائم ہونے والی "انجمن روابط فرہنگی ایران و ہند" کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے پہلے جلسے میں پڑھا تھا۔ بہار نے اس سے متعلق تمام ضروری تفاصیل کو درج ذیل عبارت میں بیان کر دیا ہے:

"سالہا آرزو داشتم کہ با دوستان ہندوستان دو ترانہ سازان آن بوستان طریق ہم نفسی باز کنیم و از سر ہم نفسی با یکدیگر شکوہ آغاز نمائیم و این دوری و مہجوریہا کہ درمیان آمدہ و حجاب آرزو شدہ بدور اندازیم۔ تا بخواست خدا درین ہفتہ انجمن روابط فرہنگی ایران و ہند باہتمام وزیر فرہنگ و ہمت فضلائی ہند و ایران و موافقت بزرگان ہر دو کشور براہ افتاد و من بندہ را نیز بعضویت آن انجمن سرافراز کردند و امر شد کہ در نخستین جلسۂ انجمن منظومہ ای در شرح اشتیاق و شکایت از افتراق گفتہ آید۔"

بہار کی منقولہ بالا عبارت سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں برسوں سے یہ خواہش تھی کہ وہ کسی موقع پر ہندستانی دوستوں اور شعرا کا تذکرہ کریں، وقت کے ہاتھوں آپس میں دوری و اجنبیت پیدا ہو جانے کا شکوہ کریں اور ایران و ہند کے درمیان پیدا ہو جانے والے ان حجابات کو ختم کرنے کی خواہش بھی کریں جو ان دونوں میں موجود صدیوں پرانی نزدیک تمناؤں کے درمیان حائل ہو گئے تھے۔ اسی لیے مذکورۂ بالا جلسہ میں جیسے ہی بہار کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ملا انھوں نے خلوص و دوستی کے باب کھول دیے۔

محولۂ بالا منظومہ کے تمہیدی اشعار ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں تاکہ اس کے آغاز ہی سے محبت و خلوص کی فضا کا اندازہ ہو جائے:

باز خنگ فکرتم جولان گرفت   فیل طبعم یاد ہندستان گرفت

تا خیالم نقش روی ہند بست   یافت ذوقم، جلوۂ طاؤس مست

بلبل فکرم خوش آوائی نمود   طوطی طبعم شکر خائی نمود

---

[۱] مشہد میں ۲۹ دسمبر ۱۸۸۶ء کو ولادت ہوئی اور ۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو تہران میں وفات ہوگئی۔ والد کا نام محمد کاظم، تخلص صبوری اور خطاب ملک الشعرا تھا۔ بہار ایران کی تحریک "مشروطہ" میں براہ راست شامل تھے اور اپنی شاعری اور مقالوں سے استبدادیت کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ رضا شاہی دور حکومت کے ابتدائی زمانہ میں چند ماہ کے لیے وزیر فرہنگ کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے۔ بعض غلط فہمیوں اور ان کی بے انتہا خودداری و حریت خواہی کی وجہ سے رضا شاہ اول کے زمانہ میں جلاوطنی اور قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ زندگی کے آخری دور میں دانشگاہ تہران سے وابستہ ہو کر خالص علمی و ادبی زندگی بسر کی۔ [۲] بہار نے یہ قصیدہ "پیام بوزیر خارجہ انگلستان" کے عنوان سے ۱۲۹۰ شمسی مطابق ۱۹۱۰ء میں ۱۹۰۷ء کے اس معاہدہ سے متاثر ہو کر مشہد میں کہا تھا جس کی رو سے روس و انگلستان نے ایران کو دو منطقوں میں تقسیم کر لینے کی چال چلی تھی اور قصیدہ کلکتہ سے مرحوم مؤید الاسلام کی زیر ادارت نکلنے والے اخبار حبل المتین میں شایع ہوا تھا۔ اس کا مطلع یہ ہے:

سوی لندن گذر ای پاک نسیم سحری   سخنی از من بر گو بہ سر ادوارد گری

(دیوان اشعار شادروان محمد تقی بہار ملک الشعرا، ۱۳۳۵ شمسی تہران ص ۲۰۵)

بستہ ام پیمانہ وہ بر پائی نیاز   تا شود در ہند آن پیمانہ دہ باز
دل اسیر حلقۂ زنجیر ہند   جان فدائی خاک دامن گیر ہند

بہارؔ نے اپنے اس منظومے میں ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے اسے ملاحت آمیز و ملاحت خیز بتایا ہے اور اسی بنیاد پر اسے کان نمک سے تشبیہ دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان ایک ایسا نمک زار ہے جس کی خاک عنبر رنگ و عنبر بیز ہے، جس کے کانٹے نمک چھپے ہوتے ہیں، جس کے خس و خاشاک پر نیلو فری ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ یہاں کے آب و رنگ میں اس درجہ "نمکینی" پائی جاتی ہے کہ جو بھی یہاں آتا ہے وہ نمک پالود ہو جاتا ہے اور اپنی انفرادیت کھو کر یہیں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار ان خوبیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے اور انھیں اس "سیاہ نمک زار" پر اپنی جان تک فدا نظر آتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

بس ملاحتہا در آن خاک دہ است   ہند را کان نمک خواندن رواست
آں نمک زاری کہ خاکش عنبر است   خار او چیبا خسش نیلوفر است
ہر کہ رفت آنجا نمک پالود شد   سادگی انگند در رنگ آلود شد
جان فدائی آن نمک زار سیاہ   بے نمک آنجا نروید گیاہ

بہارؔ نے اس کے بعد ہندوستانی سرزمین کی عظمت دیرینہ، سادگی، خلوص، بہادری اور وسعت قلب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ہندوستانی سرزمین ہی ہے جہاں سے یونانی لشکر کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی، جہاں عرب حملہ کرنے کے بعد بھی یہاں کی زمین اور یہاں کے عوام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اتحاد و یکجہتی کے اس درجہ قائل ہو گئے کہ انھیں اپنے احساس برتری کے باوجود یہیں کا ہو جانا پڑا۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں ترکوں کو اپنی ترکی زبان تک سے ہاتھ دھونا پڑا اور ان کی انفرادیت گم ہو کر رہ گئی۔ مندرجہ ذیل اشعار سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

لشکر یونان از آنجا رم گرفت   عبرت از کار بنی آدم گرفت
شد عرب در ہند وحدت پی فکند   عاقبت آنجا عرب ہم نی فکند
ترک آنجا ترکی از سر وا گرفت   فارسی بود آنکہ آنجا پا گرفت

بہارؔ کے مذکورۂ بالا اشعار سے یہ نتیجہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی سرزمین اور اس کے آب و رنگ میں ایسی کشش ضرور موجود ہے جس وجہ سے غیر ملکی حضرات کو بیگانگی کا احساس جاتا رہتا ہے۔ وہ یہاں کے سرفراز پہاڑوں، ساکن جھیلوں، گنگ و جمن کی مست خرامیوں، صبح بنارس کی دلکشیوں اور شام اودھ کی سحر طرازیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔

بہارؔ نے ہندوستان کی مذکورہ خوبیوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس سرزمین میں فارسی زبان کی مقبولیت اور ہند و ایران دوستی کو "خدائی عطیہ" قرار دیا ہے۔ بہار کا خیال ہے کہ ہم لوگ (ہندی و ایرانی) پیدائشی طور پر آشنا پیدا ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب فارسی زبان یہاں آئی تو ہندوستانیوں نے اس میں اپنی جھلک دیکھ کر اسے گلے لگالیا۔ درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

ایزدی بود آشنا یہائی ما
آشنا داند صدائی آشنا

بہارؔ نے ہند و ایران کی وابستگی، دوستی و آشنائی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ در اصل یہ دونوں ایک ہی نسل (آریہ) سے تعلق رکھتے ہیں اور فریدون و جمشید کی نسلی شاخوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ آریائی نژاد ہونے کی وجہ سے آپس میں ہوئے مہر و مروت محسوس کرتے ہیں۔

ہند و ایران آشنایان ہمند   ہر دو از نسل فریدون و جمند

بہارؔ نے ہندی و ایرانی تاریخ کی قربت کا سرا ابتدائی نسل آدم سے ملا دیا ہے کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ جب آدم و حوا کو دانۂ گندم کے چکھنے کے جرم میں جنت سے نکلنا پڑا تو انھوں نے ہندوستانی جزیرہ "سرآندیپ" ہی پر قیام کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کی برکت سے سرزمین ہند کو ازل سے "فردوسیت" عطا ہو گئی ہے۔

آنکہ گندم خورد و دور از خلد ماند   در سرآندیپ آمد و گندم فشاند
خاک ہند از خلد دارد بہرہ ہا   رنگ آن گندم عیان بر چہرہ ہا

بہارؔ نے ایرانیوں اور ہندستانیوں میں رنگ کے فرق کے باوجود دونوں کو ایک ہی خمیر سے نکلا ہوا بتایا ہے۔ ؎

گرچہ گندم گون و میگون آمدیم
ہر دو از یک خمرہ بیرون آمدیم

بہارؔ نے ہندوستانی فلسفہ کی اہمیت کا اقرار کرتے ہوئے اس کے فلسفیوں کو مشہور یونانی فلسفیوں فلاطون و دیوجانس کلبی ہی کی صف میں رکھا ہے۔ ہندستانی فلسفہ کو یونانی فلسفہ کے ہم پلہ قرار دیا ہے اور دنیا کو ہندوستان کی "کہنہ عرفانی" سے چند جرعے حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ؎

چون دو تن[1] ختم نشینان حکیم   در "فلاطون" و "دیوژن" اسقیم

سر برون گیر از مئے عرفان ہستند   نوش بادہ[2] پارسی گویان ہند

بہار نے منقولہ بالا اشعار کے دوسرے شعر پر اپنے منظومہ کو نقطہ عروج پر پہنچا کر ان فارسی گو ہندستانی شعرا کے نغموں سے لطف اندوز ہونے کا مشورہ دیا ہے جنھوں نے اپنے نغموں سے ہندستان ہی نہیں بلکہ بیرون ہند میں بھی اپنی عظمت و برتری کے پرچم بلند کر دیے تھے۔

بہار نے ہندستانی شعرا کا تذکرہ کرنے سے قبل بے حد خوب صورت طرز بیان اختیار کیا ہے اور سب سے پہلے مشہور فارسی شاعر مسعود سعد سلمان[3] کا ذکر کیا ہے۔ پھر فوراً ہی دوسرے مصرعہ میں استاد ابوالفرج رونی کی یاد دلا کر ایک دم ہندستان کے شعری سرمایہ کی طرف ذہنوں کو موڑ دیا ہے۔ درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

یادی از مسعود سعد راد کن   بعد یاد (رونی[4]) استاد کن

بہار نے اس کے بعد مشہور صوفی صفت شاعر امیر خسرو کا ذکر چھیڑا ہے (جن کے کلام میں شیخ سعدی کی طرح ندرت پائی جاتی ہے) اور انھیں گلزار دہلی کا بلبل کہہ کر ان کے خمسہ کو حکیم نظامی گنجوی کے خمسہ کی لاثانی تقلید قرار دیا ہے۔ بہار کا خیال ہے کہ خسرو کی پاک طینت اس پائے کے فکر و نظر کی مالک تھی جس نے سیکڑوں ہزاروں تخلیقات پیش کرنے کے باوجود اپنی تازگی و ندرت کو ختم نہیں ہونے دیا تھا۔ ذیل کے اشعار سے اس کی توضیح ہو جاتی ہے۔

آں کہ چون سعدی سخن گوئی نواست   بلبل گلزار دہلی (خسرو) است

خمسۂ (خسرو) کہ تقلیدیست فرد   با حکیم گنجوی جوید نبرد

طبع پاکش [illegible] دار فکر بود   صد ہزاران بچہ زاد و بکر بود

خسرو کے بعد بہار نے حسن دہلوی[5] کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے کلام میں لطف و گرمی کے بے حد خوب صورت امتزاج اور آتش و گل کی آویزش کی طرف اشارہ کیا ہے

با (حسن) صد لطف و گرمی توأم است   در کلامش آتش و گل باہم است

بہار نے اپنے اس منظومہ میں جلال الدین محمد اکبر کے دربار کا ذکر بھی کیا ہے ـــ وہ اکبر جس نے اپنی علم دوستی سے اپنے گرد مشہور زمانہ "نو رتنوں" کو جمع کر رکھا تھا، جو جلال اکبری کے باوجود جود و سخا قدر دانی اور قدر افزائی کے موتی بکھیرتا رہا تھا، جس کے دربار میں فیضی جیسے مشہور زمانہ عالم کو فیض باریابی حاصل تھا اور دکھنی درباروں تک یہ فیضی و ابوالفضل کے طفیل چمک دمک قائم تھی۔

بزم (اکبر) شد ز (فیضی) فیض یاب   دیگر از (بوالفضل) فیضی یافت آب

بہار نے عہد اکبری کے مشہور شاعر عرفی شیرازی[6] کا ذکر بھی بڑے احترام سے کیا ہے اور اس کی مضمون آفرینی کی داد دی ہے۔ بہار کا خیال ہے کہ عرفی نے اپنی شاعری کے ذریعہ فکر و فن کے امتزاج کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا تھا۔

طبع عرفی خوش بہ مضمون راہ جست   داد لفظ و معنی را درست

بہار نے مشہور فارسی شاعر ابو طالب کلیم کی ساحری و معجز نگاری کی بھی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی شاعری میں وہ جادوگری تھی کہ دوسرے سحر طراز و جادو بیان شعرا کو اس سے تاب مقابلہ نہ تھی۔

بہار اس کے بعد نظیری و ظہوری کا ذکر چھیڑتے ہی فوراً سنبھل جاتے ہیں اور اس مصرعہ (ہند و ایران را دگر برہم مزن) ہی میں ہند و ایرانی کشمکش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں اور فوراً ہی دوسرے شعر میں صائب کا ذکر چھیڑ کر محفل کو رنگ پر لے آتے ہیں اور اسے ہندستانی فارسی کا طوطی قرار دے کر خاک آمل سے اٹھنے والے شاعر طالب آملی کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔

از نظیری و ظہوری دم مزن   ہند و ایران را دگر برہم مزن

گر ز تبریز است یا از اصفہان   ہست صائب طوطی ہندی زبان

خاک آمل دامنش از دست داد   لاجرم طالب بہ ہندستان فتاد

بہار نے اس کے بعد اپنے منظومہ کو نیا رخ دے دیا ہے اور شعرا کا تذکرہ کرتے کرتے درج ذیل شعر کے ذریعہ ایران سے ہندستان کی طرف ایرانی شعرا کی ہجرت کی یہ توضیح پیش کی ہے کہ یہ شعرا چوں کہ ماہر فن اور صاحب کمال تھے اور ہندستان میں ماہرین فن کا استقبال اور صاحب کمال حضرات کی قدر دانی ہو رہی تھی اس لیے یہ ہندستان کی طرف تیزی سے آنے لگے تھے۔

---

[1] دیو جانس کلبی۔ [2] ایرانی موسیقی کی ایک لے۔ [3] ولادت لاہور میں، وفات ۵۱۵ھ میں۔ [4] بہار کے منظومے میں جہاں جہاں شعرا کے نام بریکٹ میں درج ہیں غالباً اس سے بہار کی مراد ایران سے باہر کے شعرا سے ہے۔ (ایڈیٹر)۔ [5] معاصر امیر خسرو۔ [6] جمال الدین عرفی (شیرازی)۔ وفات ۱۰۰۴ھ (تقریباً ۳۶ سال عمر پائی)

چون کسے را صنعتی غالب بود　　بشتابد ہر کجا طالب بود

بہار نے ہمایوں سے شاہ جہاں تک کے زمانہ کو ادب و شعر کی ترقی و قدر دانی کا بہترین و زریں زمانہ قرار دیا ہے کیوں کہ اس زمانہ میں شعرا کی قدر و منزلت کا بازار گرم تھا اور شعرا کو ہندستانی سرزمین پرسکون جان محسوس ہوتا تھا۔

از ہمایوں تیز تا شاہ جہاں　　شاعران را بود ہند آرام جان

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ذوق صحیح کا دور دورہ تھا۔ شعر و شاعری سے عام دل چسپی پائی جاتی تھی اور ہندستان مجموعی حیثیت سے سراپا "عشق و شور و شوق" بنا ہوا تھا۔ ذوق و ہنر اور صناعی میں گہرا تال میل پیدا ہو گیا تھا اور چاروں طرف متاع روح و جاں کی فراوانی تھی۔ اسی لیے ایرانی شعرا کے قافلے دہلی کی طرف کھنچے آتے تھے۔

ہند با ذوق خریدار بود　　ہند یک سر عشق و شور و شوق بود
صنعت و ذوق و ہنر ترکیب یافت　　کاروانہا جانب دہلی شتافت
بس روان شد کاروان در کاروان　　تنگہائی دل پر از کالائی جان

عہد اکبری میں شاعر نوازی و شعر فہمی اور ان دونوں کی قدر دانی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ اس دور کو رشک غزنیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ غزنوی عہد کے مشہور شاعر عنصری کی طرح ہزاروں شعرا چاروں طرف نغمہ خواں تھے اور دربار اکبری کو زینت بخش رہے تھے۔

رشک غزنیں گشت بزم اکبری　　نغمہ خوان ہر سو، ہزاران عنصری

عہد اکبری کے بعد بزم جہاں گیری کا بھی یہی عالم تھا اور جہاں گیر کی محبوب بیگم ملکہ نور جہاں تک نے محفل شعر و سخن میں نئی زندگی دوڑا رکھی تھی۔

بزم نور الدین، گلستانی دگر　　در گہ نور جہاں، جانی دگر

بہار کے مطابق اس وقت فن شاعری بے حد برگ و بار لا رہا تھا اور شاعری کے سمندر پر "ایہام و مثل" مثل موجوں کے لہریں مار رہے تھے یہی نہیں بلکہ ان موجوں پر صنعت شعر کی دوسری نکتہ سنجیاں حباب کی طرح پیدا ہو کر تیر رہی تھیں۔ تاریخ نویسی اور حالات کا احاطہ کرنے کا فن بھی تازہ ہو گیا تھا۔ انشا پردازی کا بول بالا تھا۔ لغت کی بہت سی کتابیں تیار ہو گئی تھیں۔ علما و حکما نے دین و حکمت کے بہت سے جوہر بھی دکھا دیے تھے۔ فن مصوری عروج پر پہنچ گیا تھا۔ فن خوش نویسی نے معراج حاصل کر لی تھی۔

فن عمارت سازی نے بھی ترقی کر لی تھی اور فن سنگ تراشی تو بہت زیادہ مقبول ہو گیا تھا۔ ؎

چو شد ایہام و مثل چون موج آب　　نکتہ بر ہر موج خندان چون حباب
کار تاریخ و تتبع تازہ گشت　　صنعت انشا بلند آوازہ گشت
در لغت فرہنگ ہا پرداختند　　علما در دین و حکمت تاختند
کار نقاشی بسی بالا گرفت　　خوش نویسی پایۂ والا گرفت
صنع معماری بسی پیرایہ یافت　　ذوق حجاری فراوان مایہ یافت

بہار نے عہد مذکورۂ بالا کو محولۂ بالا خوبیوں کی فراوانی کی وجہ سے ثروت و جاہ، رفاہ و خرمی، صلح و عیش اور خوش دلی و بے غمی کا زمانہ قرار دیا ہے جسے دیکھ کر حاسدوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں اور ان کی خصومت و دشمنی کا سر نیچا ہو گیا تھا۔ ؎

ثروت و جاہ و رفاہ و خرمی　　صلح و عیش و خوش دلی و بے غمی
چشم شوراختران را خیرہ کرد　　ہر طرف خصمی بر ایشان چیرہ کرد

بہار نے ماضی کے تذکرے کے خاتمہ کے شدید احساس کے باوجود گزشتہ کیف آور محفلوں کی بچی کھچی کیفیت اور ایک طرح کے "نظم" کا احساس بھی کر لیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے واضح انداز میں کہا ہے کہ اگرچہ اب دہلی اکبر کے رہنے کی وجہ سے ایسی پر خروش تو نہیں رہی ہے پھر بھی دیگ تمنا، دہلی ابال جوش مار رہی ہے۔ آج ہر پھول پر سیکڑوں بلبلوں کے چہچہے نہ سہی مگر ویران محفلوں کے غم میں ہر شاخ پر کوئی قمری اپنے پرسوز نغمات تو سنا رہی ہے۔ ؎

نیست گر آن کر و فر نظمی بجاست　　رفت اگر آن کیف، کیفیت بجاست
نیست گر دہلی ز اکبر پر خروش　　میزند ہر گوشہ دیگ علم جوش
در نمیخندد بسر گل صد ہزار　　باز نالد قمری بر شاخسار

بہار نے اگرچہ ہند ماضی کی بہاروں پر خزاں زدگی کا حسرت ناک انداز اور کرب و اندوہ کے لہجے میں تذکرہ کیا ہے تاہم وہ عصر حاضر کی فضا سے مایوس بھی نظر نہیں آتے۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کسی شے کو دوام نہیں ہے۔ شاید بہار اسی خیال کے پیش نظر طالب کے خاتمہ پر غالب کی آمد، غالب کے خاتمہ پر شبلی کی آمد اور بیدل کے خاتمہ پر اقبال کی آمد سے سمجھوتہ کر کے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں اور ماضی کی پرنور شمعوں کے گل ہونے کے شدید احساس کے باوجود نئی انجمن کی تشکیل پر ایمان لے آتے ہیں۔ درج ذیل اشعار اس کا

ثبوت ہیں۔ ؎

(غالبی) آہ اگر شد طالبی — شیبئ ہمت ارنا شد غالبی
(بیدلی) گر رفت (سالی) رسید — بیدلاں را نوبت حالی رسید

بہار نے اس کے بعد بیسویں صدی کا تذکرہ کرتے ہی اسے علامہ اقبال کے لیے وقف کر دیا ہے کیوں کہ وہ ایسے تنہا فرد تھے جو ماضی کے ہزاروں شاعروں پر سبقت لے گئے تھے۔ ؎

قرن حاضر جامۂ اقبال گشت — واحد از صد ہزاران ہر گزشت

بہار نے اقبال سے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ انھوں نے اپنے جاوداں نغمات سے ہندستان میں نئی روح پھونک دی تھی۔ بہار نے اقبال کو اپنے عہد کا پیشوا قرار دے کر ان کی آمد کو ہر دور میں نمودار ہونے والے رہنماؤں کے سلسلے کی ایک متوقع کڑی قرار دیا ہے۔ ؎

عالم از حجت نیماند تہی — فرق ناشد از درم تا فربہی

بہار نے مندرجۂ بالا شعر کے بعد اپنے اس منظومہ کو پھر ایک موڑ دیا ہے اور اس موڑ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ہندستان پر ہونے والے انگریزی مظالم، ہندستان میں چلنے والی تحریک آزادی، ۱۹۴۲ء کی ملک گیر تحریک اور اسے تشدد سے دبائے جانے کی حکومت کی کوششوں اور سختیوں کے رد عمل میں پھیل جانے والی مایوسی و نامرادی کی لہر کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ہندستانیوں سے براہ راست مخاطب ہو کر انھیں شدتِ عمل، بیداری، تیزی اور جوش پیدا کرنے کی تلقین اور باہمت بننے کا مشورہ دیا تھا۔ درج ذیل شعر مثالاً ملاحظہ ہو۔ ؎

تیغ ہمت را کن اے ہند عزیز — بافسانِ جرأت و امید تیز

یہی نہیں بلکہ بہار نے صنعت و حرفت، علم و فن کے ساتھ ساتھ امید و اتحاد پیدا کرنے پر بھی زور دیا تھا تاکہ ہندستان کے رہنے والے علاحدگی و تنہائی سے نجات حاصل کر کے سرافراز ہو سکیں۔ ؎

صنعت و علم امید و اتحاد — کسب کن تا وارہی زین انفراد

بہار نے اس کے بعد ہندستانی عوام کو خود انھیں کے فلسفی شاعر اقبال کے بعض اشعار کا حوالہ دے کر جہد و عمل کا مشورہ دیا ہے اور ان کے ذہنوں میں اقبال کی یہ تلقین بخوبی اتار دی ہے کہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے، حق بغیر کسی کوشش کے نہیں حاصل ہو سکتا اس لیے زندہ رہنے کے لیے انھیں انتھک کوشش کرنا پڑے گی اور اپنے قوتِ بازو پر صرف اعتماد ہی نہیں کرنا پڑے گا بلکہ ان سے کام بھی لینا ہوگا۔

بہار نے اقبال کے اشعار کو "دادین" میں پیش کرنے کے بعد انھیں کے حوالے سے ہندستانیوں کو یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ ناامیدی کو ترک کر دیں کیونکہ یہ شیطان کی طرف سے تباہی کی نشانی اور حربہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس شیطانی وار کو امید کا "آسمانی جوشن" پہن کر ہی روکا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بہار نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ ہر ہندستانی کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس وقت تک کوشش کرتے رہنا چاہیے جب تک اس کے جسم میں جان رہے۔ ؎

ناامیدی حربۂ اہریمن است — بخشش امید، آسمانی جوشن است
جوشن امید را بر خود بپوش — روز و شب تا جان بہ تن داری بکوش

بہار نے درج ذیل اشعار میں یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ ہندستانی اپنے کو کمتر و زبوں نہ سمجھیں اور زندگی کی جد و جہد میں شکست خوردگی کا احساس ترک کر دیں، قناعت پسندی سے پرہیز کریں اور چھوٹی چھوٹی امیدوں کا سہارا لینے کے بجائے اپنی ہمت کے فرس کو تیز تر کر دیں تاکہ وہ کہکشاں تک کی پرواز کر سکیں۔ ؎

خویش را خوار و زبون کس مدان — در نبرد زندگی وا پس ممان
زیں قناعت پیشگی، پرہیز کن — مرکب ہمت بجولان تیز کن
ہمت ار آمال کوچک بار گیر — تا فراز کہکشاں پرواز گیر

بہار نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ہندستانیوں کو موجودہ تن آسانی اور کسالت سے بچنے کی تربیت حاصل کرنا چاہیے کیوں کہ اب نادانی میں کافی زندگی بسر کر چکے ہیں۔ بہار کا خیال ہے کہ زندگی کا حقیقی نام جد و جہد اور تدبیر معاش ہے اس لیے ہندستانیوں کو اگر واقعی زندگی کی طلب ہے انھیں اسے بہادروں کی طرح تلاش کرنا چاہیے۔ کیوں کہ تھک کر بیٹھ رہنا اور قناعت اختیار کر لینا فقر و درویشی کی نشانیاں ہیں جو ہندستانیوں کو دو نوا عالم میں تباہ کر کے رکھ دیں گی۔

این کسالات و تن آسانی بس است — تربیت آموز، نادانی بس است
زندگی جنگست و تدبیر معاش — زندگی خواہی، چون مردان کن تلاش
فقر و درویشی تباہت میکند — در دو عالم روسیاہت میکند

بہار نے اس کے بعد ہندستانی عوام کو جہد زندگی میں نڈر اور بے باک اور بے خوف رہنے کی تلقین کی ہے ورنہ درد و رنج اور غم و الم ان کا

پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ بہار نے ہندوستانیوں کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہاہے کہ اگر انھیں اپنے کو زندگی کی تمام نعمتوں سے مالامال کرنا ہے تو کمر ہمت کس کر میدان عمل میں حرکت شروع کر دینا چاہیے۔ انھیں جنبش و فعالیت کی طرف پیش قدمی کرنا چاہیے جب ہی وہ اپنے اوپر ان خزانوں کے منھ کھول سکتے ہیں جو خود ان کے قدموں کے نیچے ان کے منتظر ہیں۔ ؎

گر بتر سی، در در رنجت در قضاست — خیز و جنبش کن کہ گنجت زیر پاست

اس کے فوراً بعد ہی بہار نے ہندستانی عوام کو اتحاد و یک جہتی کا سبق دیا ہے اور میل ملاپ اور یگانگت وغیرہ کی برکتوں کو بیان کیا ہے تاکہ وہ انھیں اپنا کر اپنی زندگی کو کامیابی و ترقی کی راہ پر گامزن کر سکیں۔

بہار نے اپنے مندرجۂ ذیل اشعار میں اس بات کو مختلف مثالوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اتحاد و یک جہتی کو حقیقی وجود کی نشانی قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں تنہائی پسندی اور علاحدگی سے کامیابی ناممکن ہے، اس لیے ہندستانیوں کو بھی انفرادیت سے نکل کر اجتماعی میل ملاپ و بھائی چارے اور دوستی کے سمندر کو وجود دینا چاہیے۔ ؎

جز یکی نبود سراپائی وجود — قطرہ قطرہ محو دریائی وجود
در جدائی بگذر و مانوس باش — قطرگی بگذار و اقیانوس باش
جز براہ یک دلی سالک مباش — محو یکتائی شو و مشرک مباش
کفر دانی چیست؟ کثرت ساختن — از یکی سوی دوتائی ساختن
سوی وحدت پوی و دست از شرک شوی — متحد باش و بترک کفر گوی

منقولۂ بالا اشعار کے آخری شعر پر بہار کے طویل منظومہ کا ایک حصہ ختم ہو گیا ہے اور اس کے بعد انھوں نے اس کے اختتام کے لیے ایک نئی راہ تلاش کی ہے اور درج ذیل شعر کے ذریعہ دونوں ملکوں میں محبت و مسرت کی ملی جلی فضا پیدا کر دی ہے۔

اے بہار از ہند با من دم مزن — بیش از یں بر آتشم دامن مزن

بہار نے درج ذیل اشعار میں ہندستان سے اپنی محبت، دیکھنے کی خواہش اور پیری و ناتوانی کی وجہ سے ہندستان نہ پہنچ سکنے کے دلی رنج کے جذبات کا اظہار بھی بڑے ہی دل گداز انداز میں کیا ہے۔

کز فراق ہند بس دل خستہ ام — نام ہند است اینکہ بر خود بستہ ام
من بہار کو چکم در ری مقیم — دل طپان از فرقت ہند عظیم
طوطی بازار گانم من مدام — طوطیانِ ہند را گویم سلام
ز آرزوی دیدنِ یارانِ ہند — میچکد از دیدہ ام بارانِ ہند
لاعلاج از دوری بوسم روی ہند — روی گرد مسلم و ہندوی ہند
پس پیامی میفرستم سوی یار — در لطافت چون نسیم [illegible] سار
گویم ای ہندِ گرامی شاد باش — سال و ماہ از بند غم آزاد باش
از سر اخلاص داریم این پیام — من سخن کوتاہ کردم والسلام

ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عصر حاضر کا ہندستان بھی اپنی آب و ہوا، خشت و گل، دوستی و اخوت، امن و آشتی، صلح جوئی اور امن پسندی کے جذبات میں عہد قدیم اور عہد وسطیٰ ہی کی طرح آج بھی جذب و کشش رکھتا ہے اور ماضی کی طرح ہندستان کے تصور سے ایرانی فن کاروں اور دانشوروں کے دل میں مہر و محبت کے جذبات آج بھی موجزن ہو جاتے ہیں۔



تصحیح نیا دور بابۃ ۲۶ جنوری ۱۹۶۶ء (فروری ۱۹۶۶ء) میں میرا ایک مضمون "کچھ خطوط کچھ تصویریں" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ اس میں صفحہ ۴۰ کے فٹ نوٹ نمبر ۳ میں سہواً ممتاز علی آہ کو جاں نثار اختر کا والد درج کر دیا گیا ہے۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں ——— خبیر سہروردی

تلاش

اخلاق حسین عارف

تابانیٔ خورشید و قمر ڈھونڈھ رہا ہوں
بکھری ہوئی آہوں کے شرر ڈھونڈھ رہا ہوں
داغوں میں کوئی زخمِ جگر ڈھونڈھ رہا ہوں
جھرمٹ میں ستاروں کے قمر ڈھونڈھ رہا ہوں
گل چیں نے جسے توڑ لیا کھلنے سے پہلے
احساس کا وہ غنچۂ تر ڈھونڈھ رہا ہوں
شگفتگیٔ ذوقِ نظر جس کے لیے ہے
میں اس کو سرِ راہ گزر ڈھونڈھ رہا ہوں
ہے کیفِ تمنا میں فسوں بے اثری کا
پھر بھی مگر آہوں میں اثر ڈھونڈھ رہا ہوں
ہے جس کا فسوں نقش گرِ عالمِ ہستی
وہ سادگیٔ حسنِ نظر ڈھونڈھ رہا ہوں
کیا سادگیٔ عشق کا عالم ہے کہ عارف
اب تک شبِ فرقت کی سحر ڈھونڈھ رہا ہوں

غزل

سحر اعظمی

حسرتِ منزل نے دکھلائی وہ منزل مجھے
موجِ طوفاں نے کیا آسودۂ ساحل مجھے
رنگ بزمِ حسن کا کچھ اور ہی ہوتا، مگر
آپ سمجھے ہی نہیں شائستۂ محفل مجھے
آپ کا دامن نہ ہاتھ آیا تو کوئی غم نہیں
دست رس اپنے گریباں پر تو ہے حاصل مجھے
وہ تو کہیے بےخودی برمحل کام آ گئی
ہوش نے رکھا نہ تھا ورنہ کسی قابل مجھے
اس سفر کا دیکھیے انجام اب ہوتا ہے کیا
سوئے طوفاں لے چلی ہے حسرتِ ساحل مجھے
بچ کے طوفاں سے نکل آیا تھا لیکن کیا کہوں
خود ڈبو دینی پڑی کشتی سرِ ساحل مجھے
میرے ہی دم سے اجالا ہے زمانے میں سحر
پھر بھی کہتے ہیں چراغِ کشتۂ محفل مجھے

افسانہ

تاشقند کا ہیرو

پرمیش کمار ڈے

وہ رات میں نے جاگ کر کاٹی تھی۔ رات گئے تک میں پڑھتا لکھتا رہا تھا۔ اس لیے صبح ہونے کے قریب میری آنکھ لگ گئی تھی۔

لیکن ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ ایسا لگا جیسے کوئی برآمدے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ برابر کے کمرے میں میری بیوی اپنے بچوں کے ساتھ سو رہی تھی۔

میں نے اسے آواز دی، "نمّو دیکھنا، کون ہے!"

وہ آں، اوں کرتے ہوئے اٹھی اور دروازہ کھولا۔ برآمدے میں رانی کھڑی تھی۔ میرے چھوٹے بھائی کی بیوی۔ ان کا کمرہ ہمارے کمرے کے برابر ہی ہے۔

"کیا ہے رانی؟" نمّو نے اس سے پوچھا۔

"دیدی..." رانی کی آواز بھرّا گئی۔

"کیا ہوا؟" نمّو بھی گھبرا گئی تھی۔

میری نیند غائب ہو گئی اور میں بھی بے چین ہوا تھا کہ رانی صبح صبح نہ جانے کیوں آئی تھی۔

رانی بولی "دیدی، شاستری جی مر گئے! رات کو۔ ریڈیو میں خبر آئی ہے"۔ اتنا کہہ کر رانی شاید چلی گئی تھی، کیوں کہ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس بلڈنگ میں اس افسوس ناک خبر کو سن کر سب سے زیادہ دکھ اس کی جیٹھانی ہی کو ہوگا۔

برآمدے میں مکمل سناٹا تھا۔ پھر نمّو کی سسکیوں کی آواز ابھری۔ وہ پھپک پھپک کر رو رہی تھی۔

میں اپنے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد نمّو میرے کمرے میں آئی اور سر جھکائے میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ میں نے بھی بس ایک بار آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔

پھر نمّو سسک اٹھی، "تم سے کتنی بار کہا کہ اپنا ریڈیو ٹھیک کرا لو، مگر تم میری سنتے ہی کب ہو۔ اگر رانی آکر نہ بتاتی تو مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہوتا!"

"کیوں، ابھی اخبار جو آئے گا۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "ساڑھے پانچ ہو رہے ہیں، اخبار والا آتا ہی ہوگا۔ اخبار میں تمھیں ساری تفصیل مل جائے گی۔"

"نہیں، آج اخبار والا بہت دیر سے آئے گا۔ لیکن اخبار آنے سے بھی کیا ہوگا، شاستری جی تو لوٹ کر آئیں گے نہیں۔" نمّو اپنی ہی دھن میں کہے جا رہی تھی۔

پھر وہ میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی اور دوسرے کمرے میں جا کر چلا چلا کر بچوں کو جگانے لگی۔ بچے جاگنا نہیں چاہتے تھے اور منمنا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ آج اگر وہ تھوڑی دیر اور سوتے رہیں تو کیا ہرج ہے۔ اسکول میں آج چھٹی ہو ہی جائے گی۔

میں نے نمّو کو آواز دی، "بچوں کو نہ جگاؤ۔ انھیں سونے دو!"

"کیسے نہ جگاؤں۔" نمّو تڑپ کر بولی۔ "شاستری جی چلے گئے اور یہ بے خبر سو رہے ہیں۔ میں انھیں ضرور جگاؤں گی۔" اور وہ انھیں دوبارہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے لگی۔

آخر بچے جاگ گئے اور سکڑ سمٹ کر پلنگ پر بیٹھ گئے اور اس غیر متوقع سلوک پر اپنی ماں کو حیران پریشان تکتے رہے۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ باہر روشنی پھیل چکی تھی اور گلی میں دو دو چار چار کی تعداد میں لوگ اکٹھے ہو کر آپس میں بات چیت کرتے ہوئے اخبار والے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

میں ریلنگ پکڑے سگریٹ پی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب مجھے سارا ایڈیٹوریل جسے میں نے گزشتہ رات ہی کو لکھا تھا اور صبح کتابت کے لیے دینے والا تھا، نئے سرے سے لکھنا پڑے گا۔ میرا کام ایک دم بڑھ گیا تھا۔

میرے دماغ میں وہ تمام تصویریں گھوم گئیں جو گزشتہ چند دنوں میں اخباروں میں چھپی تھیں:

شاستری جی تاشقند کا سفر شروع کرنے سے پہلے اپنی دھرم پتنی کے ساتھ پالم کے ہوائی اڈے پر کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

ایک طرف شاستری جی، دوسری طرف وزیر اعظم کوسی گن اور درمیان میں صدر ایوب کھڑے ہیں اور انھوں نے دونوں کی طرف اپنا دوستی کا ہاتھ بڑھا رکھا ہے۔

تاشقند کے ہوائی اڈے پر شاستری جی کا زبردست سواگت ہو رہا ہے۔

تاشقند کے اجلاس میں شاستری جی کی دھواں دھار تقریر صدر ایوب اور وزیر خارجہ بھٹو پریشانی کے عالم میں سن رہے ہیں۔

پانچویں تصویر . . .

یکایک میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا نو ہاتھ میں پانچویں تصویر لیے کھڑی تھی۔ اس تصویر میں وہ شاستری جی کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ شاستری جی ایک دن اس کے نرسنگ ہوم کا اُدگھاٹن کرنے آئے تھے جہاں وہ ریسپشنسٹ ہے۔ نو نے اس یادگار تصویر کو ایک روپہلے فریم میں جڑوا کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجا رکھا تھا۔ تصویر کے برابر ایک گل دان رکھا ہوا تھا جس میں ہمیشہ تازہ پھول کھلے رہتے تھے، اور پھولوں کی ایک ڈالی تصویر کے فریم سے کوئی تین بھر اوپر نکلی رہتی تھی جس کے سرے پر ایک بڑا سا پھول کھلا ہوتا تھا۔ نہ جانے اس پھول سے نو کی کیا مراد تھی۔

ایک دن نو نے مجھے یہ تصویر دکھا کر کہا تھا: "ایسا لگتا ہے جیسے میں شاستری جی کی بیٹی ہوں۔ کتنی مشابہت ہے ہم دونوں میں۔"

اور میں نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔

نو سسکیوں کے درمیان بولی، "ہائے! اب مجھے پردھان منتری کی بیٹی کون کہے گا۔ میں یہ تصویر اپنی سہیلیوں کو دکھا کر کتنا فخر محسوس کرتی تھی۔"

میں نے کچھ پریشان ہو کر نو کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔

پھر یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے شاستری جی کی موت روس میں نہیں ہوئی تھی، تاشقند میں بھی نہیں ہوئی تھی، ہندستان میں بھی نہیں، دلی میں بھی نہیں۔ ——— بلکہ میرے اپنے ہی گھر میں ہوئی تھی! ان کی لاش میری ہی آنکھوں کے سامنے رکھی ہوئی تھی اور نو پچھاڑیں کھا کر رو رہی تھی۔

میرے جسم میں جھرجھری پیدا ہو گئی۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور نو کا بازو پکڑ کر کمرے میں لے آیا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ تصویر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے مضبوط پکڑ رکھا تھا۔

میں اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولا: "نو! ناشتہ تیار کر دو بھئی۔ مجھے دفتر جانا ہے۔"

نو نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا: "تم آج بھی دفتر جاؤ گے؟"

"آج تو مجھے اور دنوں سے زیادہ کام کرنا ہوگا۔ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ تم جانتی ہی ہو کہ ہم اخبار والوں کو مرنے تک کی فرصت نہیں ہوتی۔" میں نے نو کو سمجھایا۔

"لیکن؟" نو نے اس طرح پوچھا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ آج تو ماتم کرنے کا دن ہے اور تم کام کرو گے؟

"ہاں نو، شاستری جی بھی آخر دم تک کام کرتے رہے۔ ان کے گرو نہرو جی نے ایک بار ان سے کام کرنے کے لیے کہا تھا اور شاستری جی نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر انھیں اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ پوچھیں کہ انھیں کون کون سے کام کرنے ہیں۔ وہ تو بس کام کرتے رہے اور کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ پھر انھوں نے ہم سے بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا۔" میں نے نو کے ہاتھ سے تصویر لے لی اور شیلف پر رکھ دی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

میں نے دوبارہ کہا: "دیکھا جائے تو آج ہر شخص کا پہلا فرض ہے کہ وہ اتنا کام کرے جتنا اس نے شاستری جی کے ہوتے ہوئے بھی نہیں کیا تھا۔ یہ شاستری جی کا ماتم کرنے سے کہیں بہتر ہوگا۔" میں نے نو کی پیٹھ تھپکی۔

نو اپنی روزمرہ کی دنیا میں دھیرے دھیرے واپس آ رہی تھی۔

میں بولا: "نو، تم ماں ہو۔ بھارت ماتا ہو۔ تمھارا کام آنسو بہانا نہیں بلکہ اس نئی پود کو اس طرح پروان چڑھانا ہے کہ وہ آگے چل کر ایسا قد آور درخت بنے جس کا آندھی طوفان کے لاکھ تھپیڑے بھی کچھ نہ بگاڑ سکیں۔"

"پھر میں کیا کروں؟" نو نے ایک بچے کی طرح پوچھا۔

"اپنا سارا غم جھٹک دو۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "جا کر جھٹ پٹ ناشتہ تیار کرو۔ دیکھو، تمھارے بچے ابھی تک بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ انھیں اٹھاؤ، نہلاؤ دھلاؤ، ناشتہ کراؤ۔"

اور نو نے رسوئی گھر میں جا کر چولھا سلگا دیا۔ بچے بھی خود اٹھ کھڑے ہوئے اور برش لے کر دانت صاف کرنے لگے۔ میں اخبار لے کر کرسی پر جا بیٹھا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد میری بڑی لڑکی آبھا نے آ کر مجھ سے کہا: "پاپا!"

چائے بن گئی ہے۔ ممی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

میں نے جا کر دیکھا، میرے بچے ـــ بھارت کے نونہال ـــ کھانے کی میز کے گرد بیٹھے مکھن توس کھا رہے تھے اور بڑے خوش نظر آ رہے تھے کیوں کہ آج انھیں اسکول جانا نہیں پڑے گا۔ آج وہ دن بھر کھیل سکیں گے۔

نمّو نے مجھے چائے کا کپ بنا کر دیا۔ میں نے پلیٹ میں سے دو چار کاجو اٹھا لیے اور کھانے لگا۔ مگر کھاتے ہوئے ایک کاجو چھٹک کر فرش پر جا گرا۔ نمّو چپ چاپ چائے پی رہی تھی۔

"دیکھا تم نے ایک دانہ دھرتی پر گر گیا اور ہم نے سمجھ لیا کہ دانہ برباد ہو گیا۔ نہیں، ایک دانے کی قربانی سے سیکڑوں دانے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دانہ ضرور مر جاتا ہے، مگر بہت سے دوسرے دانے زندہ ہو جاتے ہیں۔" میں نے نمّو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب ہم کیا کریں؟ اس اکیلے دانے کا ماتم کریں جو مر چکا ہے یا ان لہلہاتی ہوئی بالیوں کو دیکھ کر خوش ہوں جو اس اکیلے دانے کی دین ہیں؟"

نمّو نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا، مگر منھ سے کچھ نہ بولی۔

لیکن میرے نونہالوں نے میرے اس سوال کا جواب ایک زبان ہو کر دیا، "پاپا، ہمیں ان لہلہاتے ہوئے پودوں کو دیکھ کر خوش ہونا چاہیے!"

"شاباش!" میں خوش ہو کر بولا اور کاجو کی پلیٹ نمّو کی طرف سرکا دی۔

"تو، جب ایک سپاہی لڑتے ہوئے گر جاتا ہے تو کیا لڑائی ختم ہو جاتی ہے؟ نہیں، کوئی دوسرا سپاہی فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے اور لڑائی جاری رہتی ہے۔ پھر لڑائی صرف ایک طرح کی تو ہوتی نہیں۔ اور سپاہی بھی تو ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ آج ہم سب سپاہی ہیں اور لڑائی لڑ رہے ہیں۔

"ہمیں اپنے کھیتوں میں لڑنا ہے، تاکہ غلہ افراط سے پیدا ہو۔ اور آج جو سارے دیش میں پریشانی دکھائی دے رہی ہے، وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ آخر ہم اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دوسروں کی طرف کب تک تکتے رہیں گے؟

"ہمیں ملوں میں، دفتروں میں، کھیتوں میں، کارخانوں میں ـــ ہر جگہ لڑنا ہے۔ دیش میں آج امن ہو گیا ہے، مگر ہمیں پھر بھی ان محاذوں پر لڑتے رہنا ہے، کیوں کہ ہمیں اس امن کی لاج رکھنی ہے۔ اور لاج ہم تبھی رکھ سکیں گے جب ہمارا اپنا گھر بھرا پُرا ہو گا اور ہماری یہ دوسروں کے گھروں کے اندر جھانکنے کی بری عادت ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی ..."

یکایک آبھا نے مجھ سے سوال کیا: "پاپا، اب ہمارے دیش کے پردھان منتری کون بنیں گے؟"

"کوئی بھی بن جائے گا بیٹے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی خاتون بنے!" میرے منھ سے نکل گیا۔

ہندستان کی پردھان منتری کوئی خاتون بنے گی، یہ سن کر نمّو جیسے چونک اٹھی۔

"دیکھو نمّو، اگر کل کوئی خاتون ہندستان کی پردھان منتری بنتی ہے تو تمھاری اپنی ذمے داریاں کتنی بڑھ جائیں گی۔ آخر تم بھی تو مہیلا ہو۔" میں نے نمّو کو برتری کا احساس دلایا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے گھر کا ماحول بدل گیا۔ بچے دوڑتے ہوئے گلی میں کھیلنے چلے گئے۔ میں پریس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ نمّو میرا لنچ کا ڈبہ تیار کرنے کے لیے رسوئی گھر میں چلی گئی۔

شاستری جی کی اس بڑی سی تصویر نے، جو سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی، یکایک مسکرا کر میری طرف دیکھا:

تاشقند کا ہیرو میں نہیں، تم ہو، کیوں کہ تمھیں اب دیش کو لے کر آگے بڑھنا ہے۔ میں امن کے لیے لڑا اور امن ہی کی خاطر اپنی جان دے دی۔ آج اس امن کو برقرار رکھنا تمھارا کام ہے۔

یہ وقت ماتم کرنے کا نہیں، کام کرنے کا ہے۔ تم اس دانے کی طرف کیوں دیکھتے ہو جو دھرتی میں گر کر فنا ہو گیا۔ ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھو جہاں گیہوں کی سنہری بالیاں نئے سورج کی روشنی میں اور زیادہ چمک دار ہو گئی ہیں ...."

میں بھی مسکرانے لگا اور میرے ہاتھ خود بہ خود جڑ گئے۔

میرے منھ سے نکلا: "میرے محترم نیتا! اب تک میں بھی یہی کہہ رہا تھا!"

میں نے نمّو کے ہاتھ سے کھانا لیا اور دفتر کی جانب چل دیا۔



تلوک چند محروم ــــ فکر و فن کا ایک جائزہ

محمد ابراہیم علوی

کسی بھی شاعر کی عظمت کی معراج اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ عوام میں مقبول ہو، خواص اس کے فن کی قدر کریں اور اس کے ہم عصر اس کی فن کاری کے قائل ہوں۔ تلوک چند محروم ان چند خوش نصیب شعرا میں تھے جن کو عوام سے مقبولیت، خواص سے فن کی قدر اور ہم عصروں سے عزت ملی۔ اکبر الہ آبادی جیسے جید شاعر نے ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم　　لفظوں کا جمال اور معنی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز　　ان کی لفظوں کی ہے بجا ملک میں دھوم

حضرت محروم نے خداداد ذوقِ سخن پایا تھا۔ اسی لیے ان کے یہاں بڑی نغمگی، سرور اور پختہ کاری پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی اور پھر معانی کا ہجوم ان کو ایک قادر الکلام شاعر ماننے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اپنے خیالات کو بطور ادا کرنے اور الفاظ کو خیالوں سے ہم آہنگ کرنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ الفاظ کو اس طرح استعمال کرتے تھے کہ خود بخود ایک سحر آفریں فضا پیدا ہو جاتی تھی ؎

خزاں فسردگی کس کی ہے کوئی کیا سمجھے　　بہار کس کا تبسم ہے کوئی کیا جانے

ہو گئے صبر و سکوں دل سے جدا تیرے بعد　　کوئی تسکین کا پہلو نہ رہا تیرے بعد
دل ہوا مرثیہ خوانِ مجہِ ذوقِ جمال　　جاں ہوئی ماتمیِ مہر و وفا تیرے بعد
زندگی یاس کے صحرا میں اڑاتی ہے خاک　　مل گیا خاک میں جینے کا مزا تیرے بعد

ان اشعار کا حسن و خوبی، برجستگی و بے تکلفی، نغمگی و شعریت محروم صاحب کا اپنا فن ہے اور یہی فن ان کی خصوصیت اور خوبی ہے۔ نغمگی اور شعریت کا دامن ان کے ہاتھ سے کسی بھی وقت نہیں چھوٹتا۔ غزل، نظم، قطعہ، رباعی کوئی بھی صنفِ سخن ہو ان کے یہاں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے جو ان کے کلام کے مطالعہ کے لیے ہمیں مجبور کرتی ہے۔ الفاظ سے حسن پیدا کر کے ترنم پیدا کرنا بھی ان کی خوبی ہے۔ انھوں نے پند و نصائح لکھے اور مناظرِ قدرت کا بیان کیا، تصوف اور اخلاق جیسے خشک موضوعات کو مستقل اپنایا مگر کہیں بھی اپنے مخصوص طرزِ کلام کو ترک نہیں کیا۔ انھوں نے جس موضوع کو بھی نظم کیا حدِ کمال تک پہونچا کر دم لیا۔ بہار کا ذکر کیا تو اس انداز میں کہ بہار کی تر و تازگی پیدا ہو گئی۔ تصوف، حمد، معرفت کی بات کی تو ایسا عجز و انکسار دکھایا کہ جواب نہیں ؎

مجرم ہوں، سیہ کار ہوں، رحمت کر　　عاجز ہوں، گنہ گار ہوں رحمت کر
حاضر ترے در پہ اے خداوند کریم　　با دیدۂ اشک بار ہوں رحمت کر

یہ انکساری و عاجزی مصنوعی نہیں دل کی آواز ہے اسی لیے حسن و کشش رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر اثر رکھتی ہے۔ بقول اقبال ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

محروم صاحب کی ایک نظم "تصویرِ بہار" ہے، سرور و انبساط سے بھرپور۔ اس میں الفاظ سے جو سحر پیدا کیا ہے اور جس نغمگی سے بہار کی تصویر کھینچی ہے اس کی نظیر نہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

دامنِ کوہسار سے　　ساحلِ رودبار تک
ساحلِ رودبار سے　　دامنِ کوہسار تک
مسندِ شاہدِ بہار　　تختۂ سبزہ زار ہے
شبنم ترے کشت زار　　تختِ گہر نگار ہے
منظرِ جلوۂ طرب　　ساعتِ روزگار ہے

روح نواز کس قدر　نغمۂ آبشار ہے
منظرِ صافِ سطحِ آب　آئینہ بہار ہے
دشت میں الغرض عیاں　قدرتِ کردگار ہے

دامن کوہسار سے　ساحل رودبار تک
ساحل رودبار سے　دامن کوہسار تک

اسی طرح اور بھی بہت سی نظمیں ہیں جن میں "بادِ بہاری چلی" اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر بڑی معرکۃ الآرا نظم ہے۔ پہلا بند ہے ؎

گلشنِ آفاق میں　پھول کھلاتی ہوئی
ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا　رنگ جماتی ہوئی
عطر اڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

شعر وہی پر تاثیر ہوتا ہے جو معنی اور مطالب کو سمجھے بغیر ذہن و دماغ پر سحر انگیز اثر چھوڑ جائے۔ مخدوم کے یہاں یہ خوبی بہت پائی جاتی ہے۔ ان کی بہاریہ نظمیں اور مناظرِ فطرت کی لاجواب عکاسی میں ان کی یہ خوبی خاص طور سے جلوہ گر رہتی ہے۔

اس سلسلے میں مخدوم نے بسنت کے موضوع پر جو نظمیں کہی ہیں وہ خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ بسنت ان کا خاص موضوعِ سخن معلوم ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے اس پر کئی نظمیں کہی ہیں اور یہ سب اپنی اپنی انفرادیت کے لحاظ سے نہایت دلکش اور سحر آفریں ہیں۔ چند نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سردی گئی بسنت کے ایام آگئے　طائر نویدِ فصلِ بہاراں سنا گئے
عالم نہ پوچھ چاندنی راتوں کے لطف کا　یہ جلوے بجلیاں دل و دیں پر گرا گئے

پھر گلشنِ عالم میں　پیغامِ بسنت آیا
پھر گونجتے ہیں نغمے　سرور فضاؤں میں
اک کیف کا عالم ہے　صحرا کی ہواؤں میں
رعنائیِ دل کش ہے　پھولوں کی اداؤں میں
بیتابیِ الفت ہے　بلبل کی نواؤں میں
بلبل کی نواؤں نے　ہر ذرے کو تڑپایا
صبا نے مژدہ سنایا کہ پھر بسنت آیا　گلوں نے جلوہ دکھایا کہ پھر بسنت آیا
کلی کلی نے چٹک کر "خوش آمدید" کہا　یہ کس نے ان کو بتایا کہ پھر بسنت آیا

یہاں تین نظموں کے اقتباسات دیے گئے ہیں جو ایک موضوع پر ہوتے ہوئے بھی بالکل مختلف ہیں۔ تینوں کا حسن اور لطف جدا جدا ہے۔

حضرت مخدوم کا کوئی شعر کوئی مصرعہ اپنی مخصوص شعریت سے معرا نہیں ہوتا۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ وہ فطری شاعر تھے۔ فطری شاعر اور اکتسابی شاعر میں یہی فرق ہوتا ہے کہ ایک کے یہاں شعریت کے سوتے پھوٹتے معلوم ہوتے ہیں اور دوسرے کے یہاں باوجود انتہائی معنویت اور فن کارانہ مہارت کے بھی شعریت کا فقدان ہوتا ہے۔ مخدوم صاحب کے یہاں جگہ جگہ شعریت کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں حضرت جوش ملسیانی کا کہنا اسی لیے بجا ہے—

"مخدوم صاحب کے کلام میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ ہر ایک مضمون پر شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اظہارِ خیالات کرتے ہیں اور سخن گسترانہ انداز کو کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔"

حضرت مخدوم بڑی وسیع نظر رکھتے تھے ان کے احاطۂ فکر سے کوئی بھی موضوع باہر نہیں۔ انھوں نے ہر اس موضوع پر طبع آزمائی کی جس پر ان کی اچٹتی ہوئی بھی نظر پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا کچھ کہہ گئے کہ اس کو یکجا کر کے اس کا مطالعہ کرنا بھی آسان نہیں۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن کو اپنایا اور اس میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ اسی لیے ان کے یہاں ہر وہ شے ملے گی جس کی تلاش کی جائے۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ہر صنفِ سخن کو اس کی مخصوص روایات کے ساتھ اپنایا۔ غزل کہی تو غزل کی مخصوص روایات کو مدِ نظر رکھا۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:

شہرہ تمھارے حسن کا اب عام ہو گیا　رکھیو معاف، گر کوئی بدنام ہو گیا
اے دل ترے طفیل ہوں مشہور عشق باز　تو نے کیا تھا کام، مرا نام ہو گیا
چشمِ بتاں میں ہے کوئی تسخیر کا عمل　جس پر پڑی نگاہ وہی رام ہو گیا
مر ہی گیا خوشی سے میں سن کر پیامِ دوست　پیغامِ وصل موت کا پیغام ہو گیا
پھرنے میں کس لیے نہیں آتے ہیں دن مرے　کیا بند دورِ گردشِ ایام ہو گیا
اے دل یہ کیا فسردگی آغازِ عشق میں　گل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہو گیا

مخدوم کو بھی طاعتِ خالق پہ ناز تھا
سنتے ہیں اب وہ بندۂ اصنام ہو گیا

شاعر کے لیے یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ اس کے خیالات اعلیٰ و پاکیزہ

ہوں، اس کی تخیل کی پرواز بلند ہو اور اس کے یہاں خلوص بدرجہ اتم ہو۔ مخدوم صاحب کے یہاں اس میں سے کسی بھی خوبی کی کمی نہیں : ان کے خیالات بڑے اعلیٰ پاکیزہ و سنجیدہ ہیں۔ ان کا دل خلوص سے معمور ہے۔ وہ عالمی امن کے شیدائی اور قومی یک جہتی کے علمبردار کی حیثیت سے اپنے فن میں نمودار ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ان کے دل میں محبت کا یکساں جذبہ موجزن ملتا ہے۔ وہ دنیا کو تمام عیوب سے پاک و صاف دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسے اعلیٰ اصولوں اور آدرشوں کی شعری تبلیغ کرنے والا شاعر عظیم شاعر ہوتا ہے۔

مخدوم صاحب جذبات انسانی کا بڑے دلفریب اور پرخلوص انداز میں بیان کرتے ہیں اور اس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں جذبات غم کا بیان خصوصاً بڑا پردرد اور دل فریب ہے جس کا سبب یقیناً سر شیخ عبدالقادر کے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ اپنے تخلص کی مناسبت سے دنیا کی بعض نعمتوں سے محروم رہے اور یہ کہ ان کو بعض بڑے ہی جانکاہ صدموں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر ایک کے بعد ایک غم ٹوٹا اور وہ شکستہ دل ہو کر اس کا ذکر کرنے ہی میں راحت محسوس کرنے لگے۔ ان کا سب سے اعلیٰ اور قابل قدر کلام وہی ہے جس میں انھوں نے جذبات کا پردرد بیان پر اثر انداز میں کیا ہے۔ ان کا غم زیادہ تر ان کا ذاتی غم ہے لیکن انھوں نے کچھ اس طرح اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ آفاقی بن گیا ہے۔ یہی فن کی معراج اور شاعری کی عظمت کی دلیل ہوا کرتی ہے۔

یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں کی ہر شے فانی ہے اور جتنے بھی انسانی رشتے ہیں وہ آج خواہ کتنے ہی پائدار معلوم ہوتے ہوں وہ سب ناپائدار ہیں۔ ملاحظہ کیجیے اسی بات کو مخدوم صاحب نے کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن   رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
مخدوم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم   جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں
کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی   اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

مخدوم صاحب کی سب سے پردرد اور پرتاثیر نظم "اشک حسرت" ہے جو انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات کی رحلت پر کہی تھی۔ اس میں انھوں نے بڑے پردرد انداز میں رفیقۂ حیات کے انتقال کی منظر کشی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم کے سارے بند برجستہ تخلیق پاتے رہے اور کوئی لکھتا چلا گیا۔ چند بند پیش ہیں۔

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری   ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمھاری وہ طرز غمخواری   کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی؟
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی؟

ذرا تو دھیان کرو مرے سوز غم کی طرف   چلے ہو چھاؤں میں تاروں کی کیوں عدم کی طرف
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشم نم کی طرف   بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جان مرے قدم کی طرف

مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے
رکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

نہ کرکے جاؤ مجھے آہ! خانماں برباد   نہ دے کے جاؤ مجھے شغل نالہ و فریاد
رکھا ہے میں نے تمھیں اور تم نے مجھ کو شاد   نہ جھیلی جائے گی ہجر دوام کی افتاد

کیا تھا عہد وفا مجھ سے عمر بھر کے لیے
ابھی سے ہو گئے تیار کیوں اُدھر کے لیے؟

"دردناک منظر" "کسی کے پھول" "نومبر کی ایک صبح" اسی طرح کی دوسری پردرد اور پرتاثیر نظمیں ہیں اور سوز دل تو بالکل سوز دل ہے۔

پھر دل سوختہ مصروف فغاں ہوتا ہے   ذکر سوز غم و اندوہ نہاں ہوتا ہے
کچھ خبر ہے تجھے شمشان کو جانے والے   سوز فرقت سے برا حال یہاں ہوتا ہے
مری آہوں سے بورے داغ جگر آتی ہے   لخت دل ساتھ لیے اشک رواں ہوتا ہے
ہے مرے واسطے اب گلشن عالم گلخن   ہر گل تر پہ شرارے کا گماں ہوتا ہے
آج مخدوم نکالے ہیں بہت گرم اشعار   دل جلوں کا یہی انداز بیاں ہوتا ہے

مخدوم صاحب نے "طوفان غم" کے عنوان کے ماتحت اپنی پردرد نظموں کو اپنے ایک مجموعۂ کلام گنج معانی میں ترتیب دیا ہے۔

مخدوم فن کے بھی استاد تھے۔ انھوں نے تقریباً ہر اچھے اور ممتاز شاعر کے متعدد اشعار کی تضمین کی اور بہت خوب کی۔ تضمینوں کی یہ بہتات مخدوم صاحب کے شعری ذوق و شوق اور مشق کی زندہ نظیر ہے۔ ہر زمین اور ہر طرز میں ادائے جذبات کی خواہش بڑی خوب اور لطیف ہے۔ تضمین شعر غالب "روزے کر سیہ شد سحر و شام ندارد" سے تضمین میں ان کی مہارت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

مخدوم صاحب نے شاعری سے سب سے اچھا کام یہ لیا ہے کہ اس کے ذریعہ اعلیٰ اخلاق و صفات کے درس دیے اور یہ کام انھوں نے خاص طور سے رباعیات و قطعات کے ذریعے سرانجام دیا۔ دراصل ان کو شہرت اپنی اعلیٰ اخلاقی، مذہبی اور وطنی رباعیات کے سبب ہی میسر ہوئی۔ انھوں نے دنیا کی بے ثباتی کا کئی کئی انداز میں ذکر کیا۔ نوجوانوں کو کہیں تلقین کی، کہیں ہدایت دی اور کہیں

ان پر طنز کیا۔

نوجوانانِ دورِ حاضر کا　　قدرتی کاروبار ہے کیا خوب
ذوقِ تزئینِ گیسو و رخسار　　شکلِ لیل و نہار ہے کیا خوب

موجودہ دور کی لڑکیوں کے شوق سینما بینی وغیرہ پر کہتے ہیں ؎

کل سرِ شام تھی اک دوشیزہ　　سینما ہال کی جانب راہی
راہ میں ایک سہیلی جو ملی　　اس کو دینے لگی یوں آگاہی
نئی پکچر ہے نہایت دل کش　　قابلِ دید ہے "میرا ماہی"
مرثیہ شرم و حیا کا تھا یہ　　یا مری فہم کی ہے کوتاہی

حضرت مخدوم کا مطالعہ وسیع تھا۔ انگریزی ادب سے بھی انھیں گہری واقفیت تھی۔ اسی لیے انھوں نے انگریزی کے متعدد شاعروں کی نظموں کے آزاد ترجمے کیے۔ ان کے خیالات کو اپنایا اور بعض اوقات انگریزی طرز کی پُر مقصد مختصر نظمیں بھی کہیں۔ انگریزی شاعری سے ہی متاثر ہو کر انھوں نے "نغمہ" کی کیا خوب تعریف کی ہے ؎

نغمہ کیا ہے؟ شعاعِ حُسنِ ازل　　ظاہری آنکھ سے جو ہے مستور
روح کی آنکھ دیکھتی ہے اسے　　اور پاتی ہے اس سے نور و سرور

مخدوم صاحب کو جذباتِ انسانی کا اظہار کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کی وہ نظمیں بڑی وجد آفریں اور دل نواز ہیں جن میں اس طرح کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً "ایوانِ شاہی میں آخری رات" میں مہاتما بدھ کے جذبات کی جس طرح ترجمانی کی گئی ہے اس کی مثال اردو میں کم ملے گی۔ اس نظم کا ایک بند دیکھیے:

اے فریبِ الفتِ فانی نہ تو بھٹکا مجھے　　آہ اے جھوٹی محبت لے نہ اب دھوکا مجھے
دیدنی ہے روئے گل، پر اس سے مطلب کیا مجھے　　گھر نظر آیا ریاضِ دہر کانٹوں کا مجھے
یہ کشاکش ہائے بے جا ہیں سلاسل کی طرح
توڑ دوں ان کو طلسمِ نقشِ باطل کی طرح

مخدوم صاحب جب بھی جذباتِ انسانی کی ترجمانی کرتے ہیں انسانی نفسیات کے ماہر کی طرح سامنے آتے ہیں۔ موقع محل کے اعتبار سے اس طرح کے الفاظ کو ڈھالتے اور ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو نظم کے موضوع کے عین مطابق ہو۔ ان کی ایک نظم "بچے کی مسکراہٹ" دیکھیے۔ یہ ایک انتہائی پیاری نظم ہے۔ اس میں جس خوبی سے بچوں کی معصوم مسکراہٹ کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس کی مثال کم ملے گی۔ دو بند پیش ہیں:

نہ ہجومِ آرزو ہے　　نہ وہ حسرتوں کا جمگھٹ
وہ نقوشِ داغِ حرماں　　ہوئے دل سے محو جھٹ پٹ
کہ انھیں مٹا گئی ہے
تیری ایک مسکراہٹ

نہ قمر کے نور میں ہے　　نہ سحر کی روشنی میں
نہ شفق کے رنگ میں ہے　　نہ ہے پھول کی ہنسی میں
جو سماں دکھا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ

مخدوم صاحب نے زیادہ تر نظمیں ان موضوعات پر کہی ہیں جن پر اردو میں بہت کم نظمیں ملتی ہیں مثلاً "نیند" "دنیا" اور "بلبلہ" پر بہت کم اردو شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ مخدوم صاحب نے بڑی خوبی سے ان کو موضوعِ سخن بنایا۔ نظم "نیند" کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

راحت افزائے جانِ زار ہے تو　　مرہمِ خاطرِ فگار ہے تو
نکہتِ صبحِ نو بہار ہے تو　　کہ نہایت ہی خوشگوار ہے تو
بس کہ دل کش ادا ملی تجھ کو
چشمِ عالم میں جا ملی تجھ کو

جب پری بن کے شب کو آتی ہے　　کیا عجب شعبدے دکھاتی ہے
گو حیا سے بدن چراتی ہے　　سو کرشمے دکھائے جاتی ہے
تیرے ہوتے نگار پردہ نشیں
پردے مژگاں کے مطلق اٹھتے نہیں

اسی طرح "دنیا" کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے:

نقش بر سطحِ آب ہے دنیا　　بلکہ موجِ سراب ہے دنیا
ہوشیار اس سے بچ کے رہتے ہیں　　کہ نہایت خراب ہے دنیا
ایک حالت پہ رہ نہیں سکتی　　پیکرِ انقلاب ہے دنیا
شبِ غفلت ہے زندگی اپنی　　اس میں نیرنگِ خواب ہے دنیا
چند روزہ ہے اور فانی ہے　　پھر بھی کیا لاجواب ہے دنیا
تا جوانی ہے دلکشی اس میں　　ہیچ بعدِ شباب ہے دنیا

دنیا موجِ سراب ہے، پیکرِ انقلاب ہے، نہایت خراب ہے، پھر بھی

لاجواب ہے، یہ ایک حقیقت ہے جس کو محروم صاحب نے نہایت سادگی اور خوبی سے نظم کیا ہے۔

بلبلہ میں بلبلہ کی جسامت، اس کی مختصر زندگی اور دیدہ زیبی کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے:

پھولا ہوا ہے کس لیے کیا بلبلے میں ہے　　اللہ! کون سی یہ ہوا بلبلے میں ہے
اُف کس قدر غرور بھرا بلبلے میں ہے　　فرعون کوئی آکے چھپا بلبلے میں ہے
کتنا ابھار کتنی اکڑ کیسی شان ہے
پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے

"ہلال عید" محروم صاحب کی بڑی مشہور اور پیاری نظم ہے۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

دیکھو دیکھو! وہ میں نے دیکھ لیا　　قلۂ کوہ سے ذرا اونچا
چھپ گیا چھپ گیا! کہیں دیکھو　　پھر نظر آئے گا وہیں دیکھو
وہ جو ہے سامنے شجر دیکھو　　اس سے اوپر اٹھا نظر دیکھو
اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا
مژدہ! اے شائقیں نظر آیا

"نمود شام" میں آمد شام کی تیاریاں کس خوبی سے بیان کی گئی ہیں ؎

رنگ عشرت کا اہتمام ہوا　　دامنِ چرخ لالہ فام ہوا
دور خورشید کا تمام ہوا　　وقتِ بزم سکوت شام ہوا
سایۂ کوہِ سرفراز بڑھا
صورت گیسوے دراز بڑھا

"کنار راوی" محروم صاحب کے اپنے جذبات غم کا حسین تذکرہ ہے مگر اس کی دل کشی ہر ایک کے لیے یکساں ہے۔

غمِ دل آفتِ سماوی ہے　　زندگی موت کے مساوی ہے
زخمِ پنہاں جگر پہ حاوی ہے　　اشک ریزی جگر تراوی ہے
شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

محروم صاحب کی مذہبی شاعری ان کی انکساری، صدق دلی اور خلوص کا بیّن ثبوت ہے۔ ان کی یہ شاعری دل سے نکلی ہوئی آواز ہے اور چونکہ دل سے نکلی ہوئی بات اثر رکھتی ہے اسی لیے اس قسم کی نظمیں بھی کچھ کم پایہ کی نہیں۔ رامائن کے چند مناظر کے سلسلے میں "عزم صحرا" "ویران کٹیا" "سیتا جی کی فریاد" "اعجاز عصمت" اور "راون کا ماتم" اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

محروم صاحب نے اپنی شاعری سے اہل وطن کو پیام زندگی دے کر اس بات کی کوشش کی کہ ہمارے ذہنوں سے باہمی کدورت دور ہو سکے۔ اور ہم سب مل کر ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کریں۔ ان کی رباعیات اور قطعات ان کے اس منشا کی نشان دہی کرتے ہیں۔

نوجوانوں کو شراب نوشی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور کس انداز سے!

نوجوانو! شراب سے بچنا　　اثر زہر ناب سے بچنا
آب آتش لباس ہے یہ مے　　رنگ مے آب و تاب سے بچنا

جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں تو اس طرح ؎

مطلقاً اپنے واسطے جینا　　باعث ہستی دوام نہیں

"نور جہاں کا مزار" میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے　　کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے　　اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

دنیا کا یہ انجام ہے! دیکھ اے دلِ ناداں　　ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں　　آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اک ساحل راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

محروم کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اگر ان کی رباعیات اور قطعات کو دیکھا جائے تو پڑھنے والا ان کو تصوف اور اخلاق کا شاعر کہے گا، جذبات فطرت سے لبریز نظموں کو پڑھا جائے تو محروم شاعر فطرت نظر آئیں گے، ان کا عاشقانہ کلام دیکھا جائے تو شاعر حسن و عشق کہنے میں کوئی تکلف نہ ہوگا۔ یہ ایک شاعر کا یقیناً کمال فن ہے کہ وہ جو رنگ اختیار کرے اس میں انفرادیت حاصل کر لے۔

حضرت محروم نے نصف صدی سے بھی زیادہ زبان و ادب کی خدمت انتہائی خلوص سے کی۔ اس کے صلے میں ان کو عزت و شہرت بھی ملی۔ مگر وہ فطرتاً انکسار پسند تھے اور اتنے انکسار پسند کہ باوجود نصف صدی تک شاعری کرنے کے بھی

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۰ پر)



ساحل رشید

بدلیں گے پھر اک بار یہ بدلے ہوئے حالات
تم آؤ مرے ساتھ، چلو! آؤ مرے سات
آجاؤ تو سب کچھ ہے یہاں محفلِ غم میں
یہ بزمِ خرابات ہے، یہ بزمِ خرابات

اک تیری نظر سے ہوئے خاموش وگرنہ
ہونٹوں پہ مچلتے رہے کتنے ہی سوالات
خاموش سی نظروں سے کوئی دیکھ رہا ہے
یہ حکمِ زباں بندی ہے نکلے نہ کوئی بات

ہر ایک جبیں پر مرے دامن کی شکن ہے
ہر پھول کی پتی پہ مرے زخم کی آیات
ممکن ہے کئی داغ ہوں دامن میں ہمارے
نظروں کی خرابی ہے زمانے کی شکایات

کس دیدۂ نم ناک نے یہ آگ لگا دی
تا حدِّ نظر پھیلی ہے جلتی ہوئی برسات
مرنے کی تمنا لیے، یہ کون چلا ہے
جینے کی تمنا لیے چلتی ہے اجل سات

دل چونک پڑا، کیا تری نظروں نے پکارا
کیا بات ہے، کیا بات ہے، کیا بات ہے، کیا بات!
گم کردہ خیالوں میں ہیں گم حضرتِ ساحل
ایسے میں نہ چھیڑے کوئی پابندیِ اوقات



قیصر یزدانی

دیدہ نم بھی نہیں، لب پہ تبسم بھی نہیں
میں وہاں ہوں کہ جہاں شاملِ غم، تم بھی نہیں
ہے عبث قلبِ شکستہ کے لیے فکر و نظر
زندگی شیشہ و ساغر کا تصادم بھی نہیں
کل مجھے موجِ سبک سار گراں تھی لیکن
آج اندازۂ طوفان و تلاطم بھی نہیں

منزلِ عینِ یقیں میں ہمہ تن ہوں آزاد
پائے تخئیل میں زنجیرِ توہم بھی نہیں
کم سے کم آس تو ہی نقصِ تجسس کی قسم،
تم جو ملتے نہیں مجھ کو، تو کہیں گم بھی نہیں
مدعائے دلِ مضطر تو ہے چشمِ نم تک
ہائے وہ بات جو ممنونِ تکلم بھی نہیں
نہ مجھے دیکھ سرِ گلشنِ ہستی قیصرؔ
میں وہ غنچہ ہوں، جسے اذنِ تبسم بھی نہیں

سومرسیٹ ماہم

بشریٰ ناہید

انگریزی ادب کے شہرۂ آفاق برطانوی ادیب سومرسٹ ماہم ۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کو اکیانوے برس کی عمر میں اس دنیا سے چلے گئے۔ ماہم کا شمار بیسویں صدی کے کامیاب ترین ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک ناول نگار، ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے عالمی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔

ماہم کی تصانیف ان کی متنوع زندگی اور دنیا کے بیشتر ممالک میں ان کی سیاحت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے ڈراموں کے تراجم دنیا کی بیشتر زندہ زبانوں میں ہو چکے ہیں اور دنیا کے متعدد شہروں میں بارہا کامیابی سے اسٹیج بھی کئے جا چکے ہیں۔ ماہم کی تخلیقات کی تقریباً دس کروڑ جلدیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہیں لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے باوجود نہ تو عام طور سے ناقدین نے کبھی ماہم کو پسند کیا اور نہ خود ماہم نے ناقدین کی کوئی پروا کی۔

ماہم کو خدا یا مذہب پر اعتقاد نہ تھا۔ اپنی موت سے تقریباً ایک سال بیشتر انھوں نے یہ اعلان کر دیا تھا۔

"میرے کلرک ناقدین سے کہہ دو ـــــ کہ وہ یہ خیال ترک کر دیں کہ میں بستر مرگ پر، اپنے آخری لمحات میں، کسی مذہبی عقیدے سے وابستہ ہو جاؤں گا۔ مجھے نہ تو خدا کی طاقت پر اعتماد ہے اور نہ روح کے لافانی ہونے پر ـــــــــ میرے جلوس جنازہ میں بلاوے کا انتظام مت کرو۔ مجھے دفناتے وقت کوئی رسمی تقریب نہیں ہوگی۔ پھول نہیں چڑھائے جائیں گے۔ حمد و مناجات کے گیت نہیں گائے جائیں گے۔"

ماہم کے نزدیک انسانیت اور اخوت ہی سب سے عظیم مذہب تھا۔ اُن کی ایک کتاب THE RAZOR'S EDGE سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں ہندوستانی فلسفۂ نجات سے بھی دلچسپی تھی۔

ولیم سومرسٹ ماہم کی ولادت ۲۵ جنوری ۱۸۷۴ء کو پیرس میں وکلاء کے ایک ممتاز خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے والد پیرس میں برطانوی سفارت خانے میں "سولیسٹر" تھے۔ ان کی والدہ بھی برطانوی تھیں۔ دادا قانون کی بہت سی کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ اِنکارپوریٹیڈ۔ لا سوسائٹی کے بانیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی لارڈ چانسلر اور ہائی کورٹ کے جج رہ چکے تھے۔ تقریباً دس برس کی عمر میں ماہم کے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا۔ حصولِ علم کے لئے وہ انگلینڈ چلے گئے اور کچھ عرصے بعد جرمنی کی ہیڈل برگ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ ان کا ذوق مطالعہ یہیں سے نکھرا۔ ابتداء میں انھوں نے طب کو مستقل ذریعۂ معاش بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بعد میں یہ خیال

ترک کردیا کیونکہ ان کو اس پیشہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

انھوں نے ۱۸۹۷ء میں اپنا پہلا ناول LIZA OF LAMBETH شائع کیا، جس میں علمِ طب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے لندن کی گندی بستیوں میں مریضوں کے علاج و معالجہ کے دوران حاصل کئے گئے اپنے تمام تجربات و مشاہدات بحسن و خوبی پیش کئے تھے۔ اس ناول کی بے پناہ مقبولیت نے ان کے حوصلے بلند کردئے کیونکہ اپنی علمی زندگی کے آغاز پر انھیں اس بات کا یقین نہ تھا کہ وہ ایک کامیاب ادیب اور صاحب طرز مصنف بن سکتے ہیں۔ اس عرصہ میں اگرچہ انھوں نے برطانیہ کے رائل کالج آف فزیشنس اینڈ سرجنس سے ڈاکٹری کی ڈگری بھی حاصل کرلی تھی لیکن LIZA OF LAMBETH کی نمایاں کامیابی کے بعد انھوں نے اپنے ذہنی میلان کے پیش نظر طبی دنیا پر ادبی دنیا کو ترجیح دی اور ڈاکٹری کا پیشہ ترک کرکے ادبی دنیا میں داخل ہوگئے اور مستقل طور پر تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کرلیا۔

ماہم کو سیر و سیاحت سے شروع ہی سے دلچسپی رہی۔ اس سیاحی سے ایک طرف تو ان کے ذوقِ سیاحت کی تکمیل ہوتی تھی اور دوسری طرف انھیں اپنی تصنیفات کیلئے موضوعات و مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مدد ملتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے دنیا کے بیش و کم ہر ملک کی سیاحت کی۔ وہ دوسری جنگ عظیم سے قبل اور بعد کئی بار ہندوستان بھی آئے اور یہاں کے غریب کسانوں کی زندگی سے بے حد متاثر ہوئے۔

انھوں نے اپنے دورۂ ہند کے تاثرات و مشاہدات اپنی ایک مشہور تصنیف A WRITER'S NOTEBOOK (ایک قلم کار کی ڈائری) میں نہایت موثر طریقہ سے پیش کئے ہیں۔ ان کے ناول "استرے کی دھار" یا THE RAZOR'S ADGE نے ہندوستان میں بیحد مقبولیت حاصل کی۔ علاوہ ازیں MOON AND SIX RENCE اور ان کی خودنوشتہ سوانح حیات THE SUMMING UP کو دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی بہت پسند کیا گیا۔

ماہم کی پہلی کتاب نے مقبولیت ضرور حاصل کی تھی مگر ایک ادیب کی حیثیت سے اُن کی زندگی کا ابتدائی دور سخت جد و جہد کا دور تھا۔ پہلی کتاب کے بعد اُنھوں نے اپنی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ڈراموں سے کیا لیکن نہ تو ان کے کسی ڈرامے کو خاطر خواہ مقبولیت مل سکی اور نہ وہ اپنے ناولوں اور مختصر افسانوں کے ذریعہ حصولِ زر کی کوشش میں کامیابی حاصل کرسکے۔ بہر حال ۱۹۰۷ء ان کی بلند اقبالی کا سال ثابت ہوا۔ یہ وہ سال تھا جب لندن کے کورٹ تھیٹر میں ایک ڈرامہ کی بُری طرح ناکامی کی وجہ سے منتظمین نے مجبوراً وہ ڈرامہ دکھانا بند کردیا۔ لیکن اُن کے لئے اس سے زیادہ اُلجھن کی بات یہ پیش ہوگئی کہ وہ اسٹیج پر اب کون سا ڈرامہ پیش کریں کیونکہ اگلا ڈرامہ حسب پروگرام چھ ہفتوں کے بعد پیش کیا جانا تھا اور اتنے قلیل عرصہ کے لئے وہ کسی مشہور ڈرامہ نگار کا ڈرامہ نہیں کھیل سکتے تھے۔ اسی اثنا میں کسی نے ماہم کا ڈرامہ LADY FREDERICK کھیلنے کی تجویز پیش کی۔ تھیٹر کے منتظمین نے کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر یہ تجویز منظور کرلی۔ مگر یہ ڈرامہ نہ صرف کامیاب ہی رہا بلکہ اس نے ماہم کا نام بامِ شہرت پر پہنچادیا اور اس سے انھیں اپنے تین مزید ڈرامے فروخت کرنے میں بھی مدد ملی۔ اس کے بعد سے ماہم کا شمار انگریزی ادب کے صفِ اوّل کے ڈرامہ نگاروں میں ہونے لگا۔

ماہم کی قابلِ ذکر تصنیفات تیس سے زائد ہیں۔ ان میں OF HUMAN BONDAGE اور THE RAZOR'S ADGE مقبول ترین تصانیف ہونے کے علاوہ ان کی بے پناہ شہرت و مقبولیت کا بھی باعث ہیں۔

ماہم نے کئی جگہ ادیب کے فرائض اور دوسرے اہم مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے:

"صاف نہ لکھنے سے بُرا کوئی کام نہیں ہے۔ صداقت و سادگی کے خلاف سوائے روکھے پن کے خدشے کے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جو اُٹھایا ہی جانا چاہئے جب کہ یہ دکھانا

مقصود ہو کہ مصنوعی بال لگانے سے گنجا سر کہیں زیادہ بہتر ہے۔"

ماہم کے نزدیک کوئی فن عظیم اور اہم اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کا سکہ سبھی اُٹھا سکیں۔ جوڑ توڑ کا فن محض ایک کھیل ہے۔ وہ فن کو قدیم و جدید کے پیمانوں میں نہیں دیکھتے کیونکہ سوائے فن کے اور سب بیکار ہے۔ فن زندۂ جاوید ہوتا ہے اور اگر کسی فن کی جاودانی کے لئے تاریخ و تہذیب یا آثار قدیمہ کا سہارا لینا پڑے تو وہ بیکار ہے۔ OF HUMAN BONDAGE کا تعلق ماہم کی زندگی کے ایک عجیب واقعے سے ہے۔ یہ ناول ۱۹۱۵ء میں شایع ہوا تھا۔ اُس کا بیشتر حصہ خود ماہم کی اپنی زندگی کے واقعات پر مبنی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ناول کی اشاعت کے ابتدائی ایام میں کسی نے اس کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ البتہ بیس برس بعد ۱۹۳۵ء میں ایک امریکی مضمون نگار نے برطانوی ناقدین کو یہ احساس دلایا کہ یہ ناول تو ماہم کا شاہکار ہے۔

ماہم نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں فرانس میں ایک ایمبولینس یونٹ میں خدمات انجام دی تھیں۔ انھوں نے فوج میں ایک جاسوس کے فرائض بھی انجام دئے اور بعد میں اسی کام کی انجام دہی کے لئے وہ سوئٹزرلینڈ اور روس بھی بھیجے گئے۔ ایک طویل عرصے کے بعد انھوں نے اپنے ان تجربات و مشاہدات کو اپنی ایک معروف تصنیف ASHENDEN کی بنیاد بنایا۔ جنگ کے بعد انھوں نے چین اور دیگر ممالک کا دورہ بھی کیا۔

ماہم، رومانی اور خیالی خوابوں کے افسانہ گو نہ تھے۔ انھوں نے حقیقتوں اور اُن کی تلخیوں کو چُنا۔ اس کا ثبوت ان کی وہ کہانیاں بھی ہیں جن پر کامیاب فلمیں بنائی گئیں۔ انھوں نے تلخ حقائق کو بھی قابلِ برداشت بنایا —— اتنا جتنا کہ ان سے پیشتر کسی قلم کار نے نہیں بنایا تھا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ کثیر دولت جمع کر لی تھی اور اپنی اس دولت کا صرف بھی وہ بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے اسکول کنگز کالج (کنٹربری) کو وظائف کے لئے دس ہزار پونڈ (تقریباً ایک لاکھ ۳۳ ہزار روپیہ) عطا کئے اور برطانیہ کے نوجوان ادیبوں کے لئے سیر و سیاحت کا ایک وظیفہ مقرر کرنے کے علاوہ ۱۹۶۱ء میں برطانوی قلم کاروں کی انجمن کو مصیبت زدہ اور بیمار قلم کاروں کی مدد کے لئے اپنی لڑکی کے حق میں سے اپنی جائیداد کا کثیر حصہ دیدیا تھا۔ اس سلسلے میں اُنھیں اپنی لڑکی سے ایک ناخوشگوار مقدمہ بھی لڑنا پڑا۔

آج جب کہ ماہم ہماری اس دنیا میں نہیں ہیں، میرے ذہن میں ماہم کے دس سال قبل کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں:

"مجھے جو کرنا تھا میں کر چکا ہوں اور اب خاموش ہوں۔ میری موت کی خبر پڑھ کر جب لوگ کہیں گے کہ ہم نے تو سوچا تھا کہ وہ کب کا مر چکا تب میری روح اُن پر مُسکرائے گی۔"



تلوک چند محروم —— فکر و فن کا ایک جائزہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۳۶)

اپنے کو بس شاعر مانتے تھے، استادی کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔ ان کی مشہور رباعی ہے:

شاعر ہوں، شاعری میں استاد نہیں گو نقدِ سخن پاس ہے نقاد نہیں
سودا کب سے ہے شاعری کا مجھے مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

اپنی انکسار پسند طبیعت کو پس پشت ڈال کر اگر کچھ کہہ سکے تو بس اتنا

شعر پڑھ کر اہلِ فن اکثر کہا کرتے ہیں یوں رنگ یہ دہلی کا ہے یہ لکھنؤ کا رنگ ہے
رنگ لیکن اور ہے محروم کے اشعار کا اے مبصر ان میں خونِ آرزو کا رنگ ہے

لیکن یہ بھی خودستائی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ محروم صاحب کے کلام میں یقیناً خونِ آرزو کا رنگ ہے اور یہی رنگ ان کو صفِ شعرا میں ایک نہایت ممتاز جگہ دلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی شاعر مقبول اور ممتاز ہوتے ہیں اور حیاتِ جاوید پاتے ہیں جو خونِ جگر اور خونِ آرزو کی آمیزش سے پرورشِ لوح و قلم کرتے ہیں۔

دُودھوں نہاؤ پوتوں پھلو

عبدالمجیب سہالوی

نسیم کی شادی ہوئے تین سال ہو گئے تھے لیکن اُس کی گود ابھی خالی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ بانجھ تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ذہنی بانجھ پن کا شکار نہ تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی ذمہ دار بہو تھی۔ وہ ماں کی مقدس اور اہم ذمے داریوں سے واقف تھی اور بچّوں کی ولادت کے بعد ان کی پرورش اور تربیت کو اتنی ہی اہمیت دیتی تھی جتنی کہ اس کی ۰۷ سالہ دادیا ساس اس کی بھری گود دیکھنے کی تمنّا رکھتی تھی۔

آج سردی کچھ زیادہ تھی اس لیے اُس نے سب سے پہلے دادی جان کی کو گرم چائے کی پیالی صبح صبح اُن کے کمرے میں جا کر پیش کی اور نیک بہوؤں کی طرح جھک کر سلام کیا۔ دادی جان نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے پیالی تھام لی اور چائے پی کر گرمی حاصل کرنے کے بجائے بہو کو دعائیں دے کر دل کو ٹھنڈک پہنچانے لگیں۔ "اللہ جیتا رکھے؛ سدا سہاگن رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ جس طرح میرا دل خوش کیا اسی طرح اللہ تیری گود بھرے۔"

نسیم نے کچھ شرما کر اور کچھ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو کی روز روز کی دعاؤں سے چڑ کر کہا: "دادی جان! آپ یہ کیا غضب کرتی ہیں۔ آج کل چائے کے لیے تو دودھ ملنا مشکل ہے اور آپ مجھے دودھ میں نہلانے کے منصوبے بنا رہی ہیں۔"

دادی جان گرم چائے کا گھونٹ جلدی سے حلق کے نیچے اُتارتے ہوئے بولیں: "بیٹی! تو جی میں خالی دودھوں نہانے ہی کی دُعا تھوڑی ہی دے رہی ہوں۔ میں تو تمھاری بھری گود کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔"

"دادی جان سوچیے تو جب دو وقت چائے کے لیے دودھ کی فراہمی دشوار ہے تو بھلا پیدا ہونے والے آپ کے پوتوں کے لیے دودھ کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ آپ کے زمانے میں ٹکے سیر دودھ ملتا تھا اس لیے بڑی بوڑھیاں اپنی بہو بیٹیوں کو دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو کی دعائیں دیتی تھیں۔ اب روپے سیر دودھ بک رہا ہے اور آپ اب بھی دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلوں کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ بھلا بتائیے مرزا غالب کے اس مکان کی طرح جس میں مہمان کے بٹھانے کے لیے بوریا تک نہ ہو نئے مہمان کی آمد کی دُعائیں مانگنا کہاں تک مناسب ہے؟"

دادی جان بگڑ کر بلکہ یوں کہیے بپھر کر بولیں: "لے بس رہنے دو بیٹی! میں تو دعا دے کر پچھتائی۔ میں یہ جانتی کہ تم یہ دکھڑا لے کر بیٹھ جاؤ گی تو میں اپنا مُنھ سی لیتی۔ سینے پر صبر کی سل رکھ لیتی لیکن تمھیں دعا دینے کے لیے مُنھ نہ کھولتی۔ تم نے تو بیٹی، ایسی بدشگونی کی باتیں کیں کہ میں دعا دے کر شرمندہ ہوئی اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔" (ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) "ہاں! بیٹی تمھاری خطا نہیں، زمانے کی بلہاری ہے۔ ہمارے زمانے میں بہو بیٹیاں بڑی بوڑھیوں کی زبان سے یہ دعائیں سُن کر شرم سے سر جھکا لیتی تھیں اور دل ہی دل میں 'آمین' کہہ کر گود میں گدگداہٹ محسوس کرنے لگتی تھیں۔ لیکن اب تو لڑکیوں کی آنکھوں کا پانی بالکل مر گیا ہے، بڑے بوڑھوں کے مُنھ سے کوئی بات نکلی کہ یہ خم ٹھوک کر جواب دینے کے لیے تیار ہو گئیں۔ بی اے، ایم اے کیا پاس ہو گئیں کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتیں۔ دیدوں میں شرم ہی نہیں رہ گئی۔ بھلا کوئی انصاف کرے میں نے انھیں کون سی گالی دے دی تھی کہ یہ جامے سے باہر ہو گئیں۔"

نسیم پہلے تو کچھ شپٹا کر خاموش ہو گئی، لیکن اس نے پھر کچھ سوچ کر ہمت کی اور دھیمے لہجے لیکن تیکھے انداز میں بولی۔ "دادی جان! میں بھلا آپ سے یا آپ کے سامنے غصّہ کر سکتی ہوں۔ میں نے تو سیدھی سی ایک بات بتائی تھی۔ آپ جانتی ہیں کہ اُن کو صرف دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جس میں اپنا پیٹ پالنا مشکل ہو رہا ہے۔ سوچیے تو! نئے لوگوں کی خاطر مدارات کہاں سے ہو گی؟ بچّوں سے گود بھر لینا تو آسان ہے لیکن ڈھنگ سے

انھیں پالنا اور ٹھیک سے ان کی تربیت کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے دادی جان! خدا کا شکر ادا کیجیے کہ ہم لوگوں نے خالی ڈگریاں ہی نہیں حاصل کیں بلکہ ان کے ذریعے زندگی کی ڈگر پر سوچ سمجھ کر چلنا بھی سیکھا ہے، ورنہ آج آپ بچوں کی دعائیں مانگنے کے بجائے بچوں کی ہتات اور ان کی چیخ پکار سے پناہ مانگ رہی ہوتیں۔"

دادی جان نے اس کے جواب میں تڑپ تلا کے کہا: "ارے بیٹی! اللہ وہ دن تو دکھائے۔ سچ کہتی ہوں 'کھیں کھیں' کی آواز سننے کے لیے میرے کان بے تاب ہیں۔ تم نہیں سمجھتیں بیٹی! میری شادی کے دوسرے ہی سال پاس پڑوس کی عورتیں کانا پھوسی کرنے لگی تھیں۔ تمھیں سہاگن بنے تو ماشاءاللہ چار سال بیت گئے۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب تمھارا ڈولا دروازے پر پہنچا ہے اور نندیں ڈولا روکنے کے لیے دروازہ پکڑے کھڑی تھیں اسی وقت، اللہ رکھے شمیم کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اب اللہ نظر بد سے بچائے وہ تین بچوں کی ماں ہے اور تمھاری گود فقیر کی جھولی کی طرح خالی پڑی ہے!"

نسیم سے نہ رہا گیا۔ اُس نے دادی جان کو اپنی بات بھی پوری نہ کرنے دی اور کہا: "گستاخی معاف! دادی جان! آپ یہ بتانا تو بھول ہی گئیں کہ اس چار سال کے عرصے میں شمیم نے کئی بچے ہی نہیں بلکہ کئی امراض بھی پیدا کر لیے۔ شمیم کا سرخ سفید رنگ پیلا اور گٹھا گداز جسم کانٹا ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے بچے مرجھائے ہوئے ہیں۔ اگر آپ یہ سب دیکھنے کے بعد بھی میری خالی جھولی بھرنے کے لیے بے تاب ہیں تو جائیے کسی پیر کے پاس اور مانگ لائیے کوئی ننھا منا سا پیسہ!"

"بیٹی! عورت کی کوکھ فقیر کی جھولی نہیں، جو مانگنے سے بھر جائے اسے تو اللہ ہی بھرے گا۔" دادی بولیں۔

"تو پھر اللہ جب مناسب سمجھے گا بھر دے گا۔ آپ بے وجہ کیوں دعائیں مانگ مانگ کر ہلکان ہو رہی ہیں"؟ نسیم نے کہا۔

"نیک بخت! میں نہ دعائیں مانگوں گی تو کیا ایرے غیرے نتھو خیرے دعائیں مانگنے آئیں گے؟ مجھے تو دن رات اسی کی فکر لگی رہتی ہے۔ اللہ بخشے میری ساس کو، جب میری شادی کو دو سال یوں ہی بیت گئے اور نائیں اور میراثنیں اُن سے میری خیریت پوچھتیں تو اُن کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی کا ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ رات کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگتیں، منتیں مانتیں، سجدے پر سجدے کرتیں، مصلّے پر ناک رگڑتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے لوگ مجھے نہیں انھیں بانجھ ہونے کا ٹھیںا دے رہے ہیں اور وہ شرم سے گڑی جا رہی ہیں۔ وہ اس وقت تک آگ پر لوٹتی رہیں جب تک انھوں نے پوتے کو 'کھیں کھیں' کرتے نہیں سن لیا۔"

"دادی جان! آپ اطمینان رکھیے۔ اب دیر میں بچہ ہونے پر ٹھینا نہیں انعام دیا جاتا ہے۔ اور ایسی عورتیں سوگھڑ اور سمجھ دار خیال کی جاتی ہیں جو اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلاتی ہیں اور اپنی مالی حالت کے لحاظ سے نئے لوگوں کو گھر میں آنے کا بلاوا دیتی ہیں۔"

نسیم کی یہ تقریر دل پذیر سن کر یا تو دادی جان سکتے کے عالم میں ہو گئیں یا مارے غصے کے اُن کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ بہرحال اُن کی اس خاموشی سے نسیم یہ سمجھی کہ دادی جان پر اُن کی دلیلوں کا اثر ہو رہا ہے اس لیے اُس نے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں اور دلیلیں پیش کرنا شروع کر دیں اور کہا کہ "دادی جان! آپ کو پتہ نہیں، دنیا کی آبادی اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اگر روک تھام نہ کی گئی تو بیس سال میں موجودہ آبادی دوگنی ہو جائے گی زمین پر تل رکھنے کی جگہ باقی نہ رہے گی اور لوگ دانے دانے کو ترسیں گے۔"

اب دادی جان کو ضبط کا یارا نہ رہا اور وہ بیچ ہی میں بول اٹھیں:
"نوج! بیٹی ایسی فال بد منہ سے نہ نکالو۔ اللہ نہ کرے لوگ دانے دانے کو ترسیں۔ ہم نے تو سنا ہے جو پیدا ہوتا ہے اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پروردگار نے جہاں انسان کو کھانے کے لیے ایک منہ دیا ہے وہاں رزق پیدا کرنے کو دو ہاتھ بھی دیے ہیں۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے اگر آبادی دوگنی ہو جائے گی تو پیداوار چوگنی ہو جائے گی۔"

دادی جان کے اس جواب پر نسیم بھی کچھ دیر کے لیے دنگ رہ گئی لیکن پھر سنبھل کر بولی: "واہ دادی جان! آپ نے حساب تو خوب لگایا۔ یعنی آبادی بڑھنے سے اگر منہ دوگنے ہوں گے تو ہاتھ چوگنے ہو جائیں گے۔ اس طرح اگر خرچ دوگنا ہوگا تو پیداوار چوگنی ہو جائے گی۔ مگر دادی جان! آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے پیداوار میں اتنا اضافہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے لفظوں میں آبادی اور پیداوار کی اس دوڑ میں آبادی بہت آگے نکل رہی ہے اور پیداوار بہت پیچھے رہی جاتی ہے۔"

دادی جان نسیم کی ان باتوں سے کافی بدمزہ ہوگئیں اور انھوں نے منہ بنا کر کہا: "آخر اس بکواس سے تمھارا مطلب کیا ہے؟ کیا تم چاہتی ہو کہ ہمیں پیدا ہوتے ہی بچوں کا گلا گھونٹ دیا کریں؟ یہ کٹھور پن ہم سے تو ہونے سے رہا۔ بھلا بتاؤ جسے خونِ جگر پلا پلا کر نو مہینے پیٹ میں رکھا پیدا ہوتے ہی اس کا گلا کیسے گھونٹ دیں؟"

"دادی جان! میں بھی تو وہی کہہ رہی ہوں جو آپ کہتی ہیں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے اور نورِ نظر کو عدم سے وجود میں لانے سے پہلے ہم کو سوچ لینا چاہیے کہ ہم اسے بھوک، بیماری، تنگی اور تکلیف کے جہنم میں تو گھسیٹے نہیں لا رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم کو اپنے ماں بننے کے شوق کو دبانا چاہیے اور صبر سے کام لے کر حالات بدلنا اور انھیں خوش گوار بنانا چاہیے تاکہ ان ننھے منوں کو ہماری گود میں آکر کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے، ورنہ وہ ہنستی کلی جسے گھر کی زینت اور دل کا سرور ہونا چاہیے مرجھا کر سوکھ جائے گی، گھر سونا ہو جائے گا اور دل کا سرور ناسور بن کر کسی آن چین نہ لینے دے گا۔"

"تو بی بی خدا کے لیے یہ تو بتاؤ یہ کس کے بس میں ہے کہ جب چاہو بچہ ہو جب چاہو نہ ہو۔ یہ تو اللہ کی دین ہے اس میں ہم بے بس بندوں کو کیا دخل؟"

"دادی جان! جس طرح بیماریوں سے بچنے کے لیے اللہ نے ہمیں دوا بنانا سکھایا ہے اسی طرح بے موقع بچوں کی آمد سے بچنے کا گر بھی خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے بتایا ہے۔ اس لیے آپ گھبرائیں نہیں آپ کو زیادہ دن نہیں صرف تین سو پینسٹھ راتیں انتظار میں تارے گن گن کر کاٹنی ہوں گی، اس کے بعد انشاءاللہ آمدنی میں اضافہ ہوگا، آپ کی دعا قبول ہوگی۔"

دادی جان نے آہ سرد بھر کر کہا: "بیٹی! تمھارا دن پھرنے تک تو شاید میں گور میں پہنچ چکی ہوں گی۔"

نسیم نے ڈھارس دلاتے ہوئے کہا: "آپ یہ کیا بدشگونی کی بات کرتی ہیں۔ آپ کو اللہ جیتا رکھے۔ آپ نہ ہوں گی تو بچوں کو 'آ جا ری نندیا' کہہ کر لوریاں کون دے گا۔"

اس کے بعد دادی جان کچھ بولیں تو نہیں لیکن ان کی آنکھوں سے خوشی کے دو آنسو ان کی گود میں ٹپک پڑے اور چہرے پر امید کی ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔



غزل



قیصر امراؤتی :

ادائے جاں ستاں کو دل ستاں کہنا ہی پڑتا ہے
کبھی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

سناتے بھی تو سنتا کون رودادِ ستم اپنی
حقیقت کو برنگ داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

ذرا مجبوریاں دیکھے تو کوئی اہلِ کشتی کی
مخالف آندھیوں کو بادباں کہنا ہی پڑتا ہے

قفس میں جب سلوکِ اہلِ گلشن یاد آتا ہے
تو پھر ان تیلیوں کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

دمِ رفتار جاگ اٹھتی ہے قسمت ذرّے ذرّے کی
تمھاری رہ گزر کو کہکشاں کہنا ہی پڑتا ہے

دعائیں دے رہے ہیں دل سے آزارِ محبت کو
اسے ہر حال میں آرامِ جاں کہنا ہی پڑتا ہے

ٹھہرنے ہی نہیں دیتی ہماری گرم رفتاری
ہر اک منزل کو گردِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

دعائیں کیا، دعاؤں کا اثر کیا، جانتے ہیں ہم
مگر یوں بھی کبھی سوزِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے

لہو کانٹوں کو دے کر سرخ روئی بخشنے والو!
تمھیں دشتِ جنوں کو گلستاں کہنا ہی پڑتا ہے

میسر ہی نہیں تم کو سکونِ دل تو اے قیصر!
ہمیں طوفِ حرم کو رائگاں کہنا ہی پڑتا ہے

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

ہریجنوں کی فلاحی اسکیموں سے متعلق تخمینہ کمیٹی کی رپورٹ ــــ مینا ہائیڈل اسکیم کا مرحلہ اول تکمیل کے قریب ــــ خریف کے موٹے اناج کی نقل و حرکت پر سے پابندیاں ختم ــــ نہر کی زمینوں کو پٹہ پر دینے میں ہریجنوں کو ترجیح ــــ تعلیمی اداروں کو مالی امداد ــــ سیلس ٹیکس کی شرحوں میں تبدیلی ــــ مزید اسکولوں کو مالی امداد ــــ میڈیکل کالج کے طلبا کو قرضے ــــ ایلوپیتھک ڈسپنسریوں میں آیورویدک کالج کے گریجویٹوں کا تقرر ــــ ٹہری اور اترکاشی میں اضافہ شدہ مال گزاری کی وصولی ملتوی ــــ چھپاوٹ بجلی گھر چالو ــــ ضلع دیہی علاقائی فنڈ کا قیام ــــ ربیع کے بیجوں کی خریداری ــــ سینچائی ورکشاپوں کی تنظیم ــــ متفرقات

ہریجنوں سے متعلق فلاحی اسکیموں کی تخمینہ کمیٹی کے چیرمین شری جگل کشور نے کچھ روز ہوئے لکھنؤ میں ایک جلسے میں کمیٹی کی رپورٹ وزیر اعلیٰ کو پیش کی۔

کمیٹی کے ممبروں سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے ہریجنوں کی فلاح کے لئے منظور کی گئی رقموں کو پوری طرح بروئے کار لانے پر زور دیا۔ انھوں نے افسروں سے کہا کہ وہ سماج سے چھوت کی برائی کو ختم کرنے کے لئے کوشش اٹھا نہ رکھیں۔

وزیر اعلیٰ نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ اس مقصد کے لئے کام کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور افراد چھوت چھات کے بارے میں عوام کے رویہ میں خاطر خواہ تبدیلی لانے میں قاصر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ چھوت چھات دستور ہند کے تحت ایک جرم ہے۔

وزیر اعلیٰ نے یہ امید ظاہر کی کہ کمیٹی کی سفارشیں اس اسکیم پر زیادہ موثر طور پر عملدرآمد میں معاون ہونگی۔

ڈھکوائی اور ڈھالی پور بجلی گھروں میں بالترتیب ۱۱ر۲۵ اور ۱۷ ایم۔ ڈبلو کے دو جنریٹنگ سیٹوں کے چالو ہو جانے سے مارچ میں ضلع نینی تال میں جمنا ہائیڈل اسکیم مرحلہ اول کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت میں ۲۸ر۲۵ میگا ڈبلو کا اضافہ ہوا۔ ان دو بجلی گھروں میں گزشتہ سال اتنی ہی پیداواری صلاحیت کا ایک ایک سیٹ چالو کیا گیا تھا۔

ڈھکوائی بجلی گھر میں ۱۱ر۲۵ - ۱۱ر۲۵ ایم۔ ڈبلو کی تین مشینیں اور ڈھالی پور بجلی گھر میں ۱۷ - ۱۷ ایم۔ ڈبلو کی تین مشینیں لگائی جائیں گی۔ ان تین مشینوں میں سے دونوں بجلی گھروں میں دو دو مشینیں چالو کی جا چکی ہیں اور ان میں سے تقریباً ۵۶ر۵۰ ایم۔ ڈبلو بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ ان بجلی گھروں میں تیسرا اور آخری سیٹ لگانے کے لئے کام جاری ہے اور اس اسکیم کے مرحلہ اول کو موجودہ مالیاتی سال کے آخر تک مکمل کرنے کے واسطے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اس اسکیم کے مرحلہ اوّل کے مکمل ہو جانے پر مجموعی طور پر بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت ۸۴ر۷۵ ایم۔ ڈبلو ہو جائیگی اور امید کی جاتی ہے کہ بجلی کی سالانہ پیداوار ۵۲۵ ملین یونٹ ہو جائیگی۔

ریاستی حکومت نے خریف کے موٹے اناج جوار، باجرہ اور مکا کی ایک ضلع سے دوسرے ضلع کو نقل و حرکت پر سے پابندیاں اٹھالی ہیں جو خریف کے موٹے اناج کے کنٹرول آرڈر سنہ ۱۹۷۵ء کے تحت نافذ کی گئی تھیں۔ یہ پابندیاں مذکورہ حکم میں کی گئی ایک ترمیم کے تحت اٹھائی گئی ہیں جو ۲۲ اپریل کو جاری کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا موٹے اناجوں کی ریاست سے باہر برآمد پر پابندیاں بہرحال جاری رہیں گی۔

یاد ہوگا کہ یہ پابندیاں یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۵ء کو جاری کردہ ایک حکم کے تحت نافذ کی گئی تھیں تاکہ حکومت کو موٹے اناج کی خریداری میں سہولت ہو۔ چونکہ گزشتہ یکم اپریل سے خریداری ختم کردی گئی ہے اس لئے خریف کے موٹے اناج کی ایک ضلع سے دوسرے ضلع کو نقل و حرکت کی پابندی اس ترمیم کے ذریعہ اٹھالی گئی ہے جو مذکورہ حکم میں کی گئی ہے۔

حکومت اترپردیش نے نہر کی تمام زمینوں کو زراعتی اغراض کے لئے پانچ ایکڑ کے لاٹوں میں سرکل ریٹ دگنی شرح پر ابتدا میں پانچ سال کے لئے بدستور پٹہ پر دیتے رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پٹہ کی میعاد میں کوئی بھی فریق مزید پانچ سال توسیع کرا سکے گا۔

پٹہ دار کے قبضہ میں نہر کی زمین کو ملا کر جو اسے پٹہ پر دی جانے والی ہو ۱۰ ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہونا چاہئے۔ پٹہ دار کو اپنی زمین شکمی پر دینے کی اجازت نہیں ہوگی اور ایسا کرنے پر وہ فوراً بیدخل کردیا جاسکے گا۔ پٹہ میں اس امر سے متعلق ایک دفعہ شامل کی جائے گی۔

اگر کسی قطعہ آراضی کے لئے ایک سے زیادہ درخواستیں ہونگی تو محکمۂ آبپاشی کے متعلقہ ایگزیکیٹو انجینیر درخواست دہندگان کو درج ذیل ترتیب سے ترجیح دیتے ہوئے پٹہ منظور کریں گے۔

بے زمین ہریجن، دوسرے ہریجن، بے زمین مزدور نیز ایسے مزدور جن کے پاس دو ایکڑ سے کم آراضی ہوگی۔

حکومت اترپردیش نے مزید ۳۱ سینیر بیسک اسکولوں (جونیر ہائی اسکول اور پانچ پرائیوٹ تربیتی اداروں کو سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے مالیاتی سال سے محکمۂ تعلیم کی اس فہرست میں شامل کرلیا جن کو مالی امداد مل رہی تھی۔ مزید براں حکومت نے ان تعلیمی اداروں کو سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے لئے بالترتیب ۱۰۱۹۵۲ روپیہ اور ۱۳۱۸۰ روپیہ منظور کیا۔

تعلیمی اداروں کو سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے لئے منظور کی گئی دوسری مالی امداد کی تفصیل درج ذیل ہے:

لڑکوں کے ۲۲۸ اور لڑکیوں کے ۴۵ اداروں کو تعمیرات کے لئے... ۱۴۹۲۵۰ روپیہ، لڑکوں کے ۶ اور لڑکیوں کے دو اسکولوں کو تعلیمی درجوں کی تعمیر کے لئے.... ۹ روپیہ چالیس، پرائیوٹ تعلیمی اداروں کو لائبریریوں کے لئے ۱۳۲۲۷۱ روپیہ، دس انٹر کالجوں اور دس ہائی اسکولوں کو سائنس کے ساز و سامان کی خریداری کے لئے... ۴۴ روپیہ اور ۱۲ الٹریکچرل اسکولوں کو بسوں کے لئے.... ۳۷ روپیہ بطور مالی امداد دے ہے۔

حکومت اترپردیش نے اترپردیش سیلس ٹیکس کی شرحوں میں یکم اپریل سنہ ۱۹۶۶ء سے کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔

ربر کے سامان پر سیلس ٹیکس، جو جائے فروخت پر کارخانہ دار یا درآمد کنندہ ۱۰ فیصدی کی شرح سے ادا کرتے تھے، اب گھٹا کر فروخت کے تمام مرحلوں (پوائنٹوں) پر آٹھ فیصدی کردیا گیا ہے۔ ربر کی میٹرس، ربر ہوز اور ربر پیلوز پر لگا سیلس ٹیکس کی شرح میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے اور یہ جو بدستور ایک پوائنٹ پر ۱۰ فیصدی کے حساب سے عائد کیا جائے گا۔

کاسٹک سوڈا کا سیلس ٹیکس جو ایک پوائنٹ پر کارخانہ دار یا درآمد کنندہ سات فیصدی کی شرح سے ادا کرتے تھے اب گھٹا کر تین فیصدی کردیا گیا ہے۔

چھیچڑے پر جس میں اشک لاکھ بسوا الملع بٹن لاکھ سیڑ لاکھ اور کوی شامل ہیں، اب تک دو فیصدی کی شرح سے سیلس ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اب انھیں سیلس ٹیکس سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔

اونی قالین کے دھاگے پر سیلس ٹیکس جو ایک پوائنٹ پر کارخانہ دار یا درآمد کنندہ چار فیصدی کی شرح سے ادا کرتے تھے، اب گھٹا کر دو فیصدی کردیا گیا ہے۔

نقش دار کانچ کی چوڑیوں پر جن میں کٹ گلاس کی چوڑیاں

شامل ہیں، سیلس ٹیکس درآمد کنندہ یا نقش و نگار بنانے والے یا کنٹرایکٹ پوائنٹ پر سات فیصدی کی شرح سے ادا کرتے تھے۔ اب اسے گھٹا کر تین فیصدی کر دیا گیا ہے۔

سبزی، پھل، مچھلی اور گوشت سے تیار کی جانے والی کھانے کی چیزوں پر، جن میں اچار، مربہ، جیلی، جام، شربت اور اسکویش شامل ہیں اس صورت میں جبکہ وہ مہر بند یا ٹین کے ڈبوں میں فروخت کی جائیں، سیلس ٹیکس کئی پوائنٹوں پر ۲ فیصدی کی شرح سے عائد ہوتا تھا۔ اب تین فیصدی کی شرح سے عائد کیا جائے گا۔

آٹا، میدہ اور سوجی کے ان بیوپاریوں کو جن کی بکری ۲۵ ہزار روپیہ تک ہے، آٹا، میدہ اور سوجی کی فروخت پر سیلس ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنی کر دیا گیا ہے۔ آٹا، میدہ اور سوجی پر اب درآمد کنندہ یا رولر آٹا ملیں جن میں چکیاں بھی شامل، جائے فروخت پر دو فیصدی کی شرح سے سیلس ٹیکس ادا کریں گی۔

تیل کی بین ریاستی فروخت پر ڈیڑھ فیصدی کی رعایتی شرح سے سیلس ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اب یہ رعایت واپس لے لی گئی ہے۔ تیلوں کی بین ریاستی فروخت پر اب سیلز ٹیکس رجسٹرڈ بیوپاریوں سے دو فیصدی اور غیر رجسٹرڈ بیوپاریوں سے ۱۰ فیصدی کی شرح سے وصول کیا جائے گا۔

ریاستی حکومت نے باقاعدہ امداد پانے والے اداروں کی فہرست میں مزید دس ہائر سیکنڈری اسکولوں کا اضافہ کیا اور ان اداروں کے لئے ۲۵۷۸۴ روپیہ کی رقم منظور کی۔

اسکولوں کے نام اور ان کو دی جانیوالی امداد حسب ذیل ہے ــــــ

شری پرتاپ ہائر سیکنڈری اسکول کانپور ـ ۱۰۰۰ روپیہ، فیروز گاندھی ہائر سیکنڈری اسکول ـ باپو نگر ـ گاراپور ـ الٰہ آباد ـ ۱۰۰۰ روپیہ، رام دئی ہائر سیکنڈری اسکول سکا سلاور ـ مظفر نگر ـ ۸۶۷۶ روپیہ، شری بھگوان داس ہائر سیکنڈری اسکول ـ ہرچند پور ـ اٹاوہ ـ ۱۷۷۶ روپیہ، کے ـ ایچ ـ آر ـ ہائر سیکنڈری اسکول کھام پور ـ لوہاری ـ میرٹھ ـ ۱۳۳۲ روپیہ، جنتا ہائر سیکنڈری اسکول موجھنا ـ فرخ آباد ـ ۵۲۹۲ روپیہ، راشٹریہ کنیا ہائر سیکنڈری اسکول مہواپار ـ گورکھپور ـ ۳۷۰۸ روپیہ، آریہ ویدک کنیا ہائر سکنڈری اسکول ـ بجنور ـ ۱۰۰۰ روپیہ، ایم ـ بی ـ کملا نہرو ہائر سیکنڈری اسکول کونچ ـ جالون ـ ۱۰۰۰ روپیہ اور ڈاکٹر جی ناتھ جی سنہا گرلس ہائر سکنڈری اسکول سول لائنس ـ اناؤ ـ ۱۰۰۰ روپیہ۔

حکومت نے میڈیکل کالجوں کے ان طلبا کو جن کے سرپرستوں کی ماہانہ آمدنی ۳۰۰ روپیہ سے زیادہ نہیں ہے قرضے دینے کی ایک اسکیم بنائی ہے۔ اس اسکیم کے تحت قواعد بنائے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹروں کی کمی دور کرنے کے لئے چوتھے پنجسالہ منصوبے کی مدت کے دوران میرٹھ، جھانسی اور گورکھپور میں میڈیکل کالج کھولے جا رہے ہیں۔

ریاست کی ۱۱۵ ایلوپیتھک ڈسپنسریوں میں جہاں کوئی ڈاکٹر نہیں تھے آیورویدک کالجوں کے گریجوئیٹوں کو مقرر کیا گیا ہے جنھوں نے آیورویدک اور ایلوپیتھک کے ملے جلے کورس کی تعلیم حاصل کی ہے۔ حکومت نے یہ تقرری اس اعلٰی اختیاری کمیٹی کی سفارش پر کی ہے جو ڈاکٹروں کی کمی کے سوال پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔

یہ کمیٹی ۱۵ جون ۱۹۶۲ء میں مقرر کی گئی تھی لیکن اس نے حکومت کو کوئی عبوری رپورٹ پیش نہیں کی تاہم اس نے کچھ سفارشات کیں جن میں سے کچھ جیسے ڈاکٹروں کی تنخواہ بڑھانے اور پی ـ ایم ـ ایس اول اور پی ـ ایم ـ ایس دوم کو ملانے کی سفارشات پر عملدرآمد ہو گیا ہے۔ سال رواں میں بھی تقریباً ۲۰ - ۲۵ ڈسپنسریوں میں ملے جلے کورس کے ڈاکٹر مقرر کئے جائیں گے۔ اس وقت اتر پردیش میں ۶۸۳ ریاستی آیورویدک اور ۱۰ ہومیوپیتھک ڈسپنسریاں ہیں۔

حکومت اتر پردیش نے ٹہری اور اتر کاشی میں نئے بندوبست کے تحت یکم جولائی سنہ ۶۵ء سے نافذ کی گئی۔ اضافہ شدہ مالگزاری

کی وصولی ملتوی کر دی ہے۔ مزید براں حکومت ان اضلاع میں دیہی شرحوں کو کم کرنے کے سوال پر بھی غور کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں جلد ہی فیصلہ کیا جائے گا۔

حکومت نے یہ اقدام ٹہری اور اتر کاشی کے عوام کی خواہشات کی تکمیل نیز کچھ موقع پرست اشخاص کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے کیا ہے جو وہاں کے مالگزاری کے مسئلے کے سلسلے میں مقامی باشندوں کو ورغلا رہے ہیں۔ یہ اضلاع پہلے سابق ٹہری گڑھوال ریاست کا حصہ تھے اور اتر پردیش میں ضم ہونے کے بعد بھی وہاں ریاست کے زمانہ ہی کی مالگزاری کی شرحیں چل رہی ہیں مقامی اداروں جیسے ضلع کانگریس کمیٹی ضلع پریشد اور ریاستی مجالس قانون ساز اور پارلیمنٹ میں ان کے نمائندے برابر حکومت پر زور ڈال رہے ہیں کہ مالگزاری کی شرحیں کم کر کے جمولی اور پوڑی گڑھوال سے متصل اضلاع کی مالگزاری کی شرحوں کے مساوی کر دی جائیں کیونکہ اس پورے علاقے میں زمین تقریباً ایک جیسی ہے۔

چمپاوت میں دو سو کے ڈبلیو کا پن بجلی گھر چالو ہو گیا ہے جس سے ضلع الموڑہ میں چمپاوت، لوہا گھاٹ اور ناپادتی کے قصبوں کو بجلی سپلائی ہو رہی ہے۔

اس بجلی گھر میں سو سو کیلوواٹ کے دو جنریٹنگ سیٹ ہیں۔ اس پن بجلی کے بن جانے سے مذکورہ تینوں قصبوں کو صنعتی اور زراعتی ترقی کے لیے کافی بجلی بہم پہنچائی جا سکے گی۔

حکومت اتر پردیش نے ریاست میں ہر ضلع پریشد کے لئے ایک ضلع فنڈ اور ہر علاقائی کمیٹی کے لئے ایک علاقائی فنڈ فوری طور پر قائم کیا ہے۔ ان اداروں کو جو رقومات موصول ہونگی نیز وہ تمام قرضے جو یہ ادارے لیں گے یا ان کی جانب سے لئے جائیں گے وہ بالترتیب ان فنڈوں میں جمع کئے جائیں گے۔

ریاستی حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ سابق ڈسٹرکٹ بورڈ ایکٹ کے تحت جو "ضلع فنڈ" قائم ہیں وہ فوری طور پر بند کر دئے جائیں گے اور جنرل اکاؤنٹ، ایجوکیشن اکاؤنٹ یا ضلع بورڈ کے کسی دوسرے اکاؤنٹ میں جو رقمیں موجود ہیں وہ "ضلع فنڈ" میں منتقل کر دی جائیں گی۔ ضلع میں اب محض ایک اکاؤنٹ رکھا جائیگا اور جنرل اکاؤنٹ اور ایجوکیشن اکاؤنٹ جیسے علٰحدہ علٰحدہ اکاؤنٹ نہیں رکھے جائیں گے۔

ریاستی محکمہ زراعت موجودہ سیزن میں رجسٹرڈ کسانوں اور ترقی پسند کاشتکاروں سے ربیع کے پانچ ہزار ٹن بیج خریدے گا۔ گیہوں۔ جو۔ مٹر اور چنا کے بیج بازار بھاؤ پر خریدے جائیں گے اور منافع کی رقم اس کے علاوہ دی جائے گی۔

میدانی علاقوں میں گیہوں کے بیج میں اعلیٰ قسم جیسے میکسیکا گیہوں۔ کے۔ ۶۸۔ این۔ پی۔ ۸۳۰۔ سی۔ ۲۷۳ اور سی ۲۸۱ اور پہاڑی علاقوں میں رڈلے این۔ پی۔ ۷۴۰ اور این۔ پی۔ ۸۰۹ شامل ہوں گے۔ کسانوں کو قا[illegible] کے گیہوں کے لئے بازار بھاؤ پر ادائے گی کی جائے گی۔ مزید براں انھیں قیمت خریداری پر ۱۲٫۵ فیصدی کے [illegible] بھی دیا جائے گا۔ ایک کوئنٹل گیہوں پر منافع کی رقم ۴٫۰۸ روپیہ ہوگی۔

جو، چنا اور مٹر کی قیمت خریداری مناسب اوسط کوالٹی شرح میں ۱۲٫۵ فیصدی منافع شامل کرنے کے بعد مقرر کی جائے گی۔ منافع کی یہ رقم ۴٫۰۸ روپیہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں قیمت خرید میں کوالٹی کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید رقم جوڑی جائے گی۔ جو اور چنا کے لئے یہ رقم دو روپیہ فی کوئنٹل اور مٹر کے لئے ۳ روپیہ فی کوئنٹل ہوگی۔

تمام بیج مصدقہ کوالٹی اور شرحیں ۳۱ مئی سنہ ۱۹۶۶ء یا ۲۱ مئی سے ایک ہفتہ پہلے کی ہونا چاہئیں۔

ماہرین زراعت کی ایک جماعت سودے کو قطعی کریگی۔

نظامت صنعت ایک عوامی لمیٹڈ کارپوریشن کے تحت آبپاشی

کمزور کشاپنکے کے واحد ذیلی نو تنظیم کی ایک اسکیم کی تفصیلات تیار کررہا ہے۔

مجوزہ کارپوریشن موجودہ د... ...ں کو ہلکے فولاد کے ڈھانچے تیار کرنے کے لیے جن کی ریاست کے مختلف محکموں کو جن میں آب پاشی، ہائیڈل اور تعمیرات عامہ کے محکمے شامل ہیں، ضرورت پڑتی ہے، بروئے کار لائے گا۔ مزید براں کارپوریشن سرمایہ کی فراہمی کی دقتوں کو دور کرنے کے لیے صنعتی مالیاتی کارپوریشن یا حکومت ہند سے مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

متفرقات

بچوں کے تعطیلاتی کیمپ۔ مرکزی سماجی فلاحی بورڈ نے اس سال گرمی کی تعطیل کے دوران بچوں کا ایک ۱۵ روزہ کیمپ منعقد کرنے کے لیے ۳۰۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔

یہ رقم کسی پہاڑی یا ساحلی مقام پر عملہ کے تین ممبروں کے ساتھ کم آمدنی والے خاندانوں کے پچاس بچوں کو آب و ہوا کی تبدیلی اور سیر و تفریح کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے ایک تعطیلاتی کیمپ منعقد کرنے کی غرض سے منظور کی گئی ہے۔

خواتین ٹیچروں کے لیے مزید کوارٹر منظور۔ ریاستی حکومت نے چوتھے منصوبے کے تحت دیہی علاقوں میں جونیر اور سینیر بیسک اسکولوں کی خواتین ٹیچروں کے واسطے مزید ۱۰۷۶ رہائشی کوارٹروں کی تعمیر کے لیے ۲۶۹۰۰۰۰ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

لکھنؤ کارپوریشن کو ۱۰ لاکھ کا قرضہ۔ ریاستی حکومت نے درمیانی آمدنی والوں کے لیے تعمیر مکانات کی اسکیم کے تحت لکھنؤ نگر مہاپالیکا کو ۱۰ لاکھ روپیہ کا قرضہ منظور کیا ہے۔

یہ قرضہ مذکورہ اسکیم کے تحت زیر تعمیر مکانوں ہی کی تکمیل پر خرچ کیا جائے گا۔

وکاس پریشد کا صدر دفتر لکھنؤ میں۔ اترپردیش آواس اور وکاس پریشد ایکٹ ۱۹۶۵ء کے تحت تشکیل کیے گئے۔ اترپردیش آواس اور وکاس پریشد کا صدر دفتر لکھنؤ میں قائم کیا گیا ہے۔ پریشد کے صدر اور ہاؤسنگ کمشنر سے جملہ خط و کتابت حسب ذیل پتہ پر کی جا سکتی ہے۔

شری سکریٹری ادھیکش اور ہاؤسنگ کمشنر یو۔ پی آواس یوم وکاس پریشد معرفت سکریٹری حکومت اترپردیش لوکل سیلف گورنمنٹ ڈپارٹمنٹ کونسل ہاؤس لکھنؤ۔

دہرہ دون میں دفاعی نمائش۔ دہرہ دون میں آیندہ ۲ اکتوبر سے دس روزہ دفاعی نمائش "قوم تیار ہے" منعقد کی جائے گی۔ اس میں فوٹو، نقشوں اور اسلحہ جات کی نمائش سے فوجی اور شہری دونوں ہی مورچوں پر ملک کو مستحکم بنانے کے تمام طریقہ ہائے کار سے روشناس کیا جائے گا اور کسی بھی غیر ملکی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک کی روز افزوں بڑھتی ہوئی طاقت کی جھلکیاں پیش کی جائیں گی۔

یہ نمائش اترپردیش شہری ریاستی کونسل اور مرکزی وزارت دفاع نیز اطلاعات اور نشریات کے اشتراک سے منعقد کی جائے گی۔

اس موقع پر ڈرامہ کی ایک تقریب بھی منعقد ہوگی۔

دیوپریاگ کو بجلی کی فراہمی۔ ضلع پوڑی گڑھوال میں دیوپریاگ قصبہ کو پوڑی ڈیزل بجلی گھر سے بجلی فراہم کی گئی ہے۔

دیوپریاگ اور اس کے قرب و جوار کی بستیوں کو اب بجلی کی سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں۔

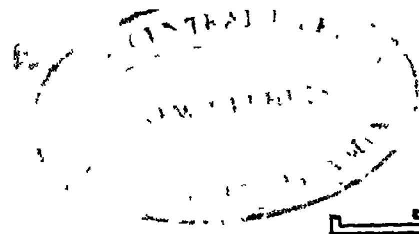
قومی دفاع فنڈ میں تعلیمی اداروں کے عطیات۔ اترپردیش میں تعلیمی اداروں اور دفاتر نے قومی دفاع فنڈ میں ۷،۳۹۵۵ روپیہ بطور عطیہ دیا ہے۔ اس طرح قومی دفاع فنڈ میں تعلیمی اداروں اور دفتروں کے مجموعی عطیات کی رقم بڑھ کر ۲۶۲۴۳۶۵۶ روپیہ ہو گئی۔

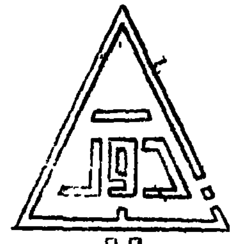
مزید براں تعلیمی اداروں اور دفتروں نے گزشتہ ۱۶ مارچ تک قومی بچت اسکیم میں ۹۵۷۶۴۳۶ روپیہ لگایا۔

ذخیرہ بازوں کے خلاف کارروائی۔ اترپردیش میں ۳۱ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ختم ہونے والی مدت میں ریاست میں قانون دفاع ہند کے تحت گرفتار کیے گئے افراد کی مجموعی تعداد ۲۷،۳۰۰ تھی۔ ان میں سے ۱۴۰۷ افراد ذخیرہ بازی اور ناجائز منافع خوری اور ۳۰۸۶ دیگر جرائم کے لیے گرفتار کیے گئے۔ زیر نظر مدت میں ذخیرہ بازی اور ناجائز منافع خوری کے الزام میں ۳۳۰۵ افراد کے خلاف مقدمے چلائے گئے۔ ان میں سے ۱۰۲۰ سزایاب ہوئے۔ دوسرے الزامات میں ۲۷۲۶ افراد کے خلاف مقدمے چلائے گئے جن میں ۱۲۱۵ سزایاب ہوئے۔









جلد ۲۲ | نمبر ۳

جیشٹھ ۱۸۸۸ ساکا
جون ۱۹۶۶ عیسوی

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
آر۔ سی۔ پنت
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

اپنی باتیں

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور اس سلسلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آزادی کی خوشیوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہونا اسی وقت ممکن ہے جب اقتصادی اور معاشی اعتبار سے ہم مستحکم ہوں، اشیائے صرف اور غذائی پیداوار کے معاملے میں خود کفیل ہوں اور ان کے لیے بیرونی ملکوں کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر آزادی ملنے کے بعد ہم نے اپنے لیے راہ عمل متعین کی اور پنج سالہ منصوبے بنا کر اس مقصد کے حصول کے لیے چل پڑے۔ اس سلسلے میں صنعتی ترقی اور زرعی پیداوار کے بڑھانے پر کہ یہی دونوں ہماری اقتصادی اور معاشی ترقی کی اصل بنیاد ہیں، خاص طور سے زور دیا گیا اور دیا جا رہا ہے۔ اتر پردیش بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہا اور یہاں ریاست کو صنعتی اور غذائی اعتبار سے ایک فلاحی اور ترقی یافتہ ریاست بنانے کے لیے جو زبردست کوششیں کی گئیں ان کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے جن کا ثبوت وہ متعدد کارخانے، ملیں، صنعتی بستیاں، فیکٹریاں وغیرہ ہیں جو حصول آزادی کے بعد سے وجود میں آئی ہیں۔ اسی طرح غذائی محاذ پر بھی ہماری کامیابی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ آزادی سے پہلے کے مقابلے میں خود ہماری ریاست میں غذائی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم مطمئن ہو گئے ہیں یا ہم نے اپنی کوششوں میں ڈھیل دے دی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت صنعتی اور غذائی دونوں محاذوں پر ہماری سرگرمیاں جاری ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غیر معمولی خشک سالی کے باوجود اس سال غذائی پیداوار سال گزشتہ کی پیداوار کی سطح پر رہی، غذائی محاذ پر ہماری کوششوں اور سرگرمیوں کی آپ دلیل ہے۔ جہاں تک صنعتی محاذ پر ریاست کی سرگرمیوں کا تعلق ہے اس کا اندازہ اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ کے اس حالیہ دورے سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے بمبئی کا اس غرض سے کیا کہ ریاست میں نئی صنعتوں اور کارخانوں کے قیام سے ملک کے صنعت کاروں کو دلچسپی پیدا کرائی جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ وزیر اعلیٰ کے دوسری ریاست کے اس دورے سے جو اپنی نوعیت کا پہلا دورہ تھا، پردیش کے باہر کے صنعت کاروں کو یو۔ پی میں صنعت کاری کے مواقع کی صحیح صورت حال کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

صنعت کاری اور صنعتی ترقی کے لیے چند بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً وافر زمین، وافر پانی، بجلی، تربیت یافتہ عملہ اور اشیائے صارفین کی کھپت کے لیے وسیع مواقع اور بازار۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اتر پردیش ان ریاستوں میں ہے جہاں صنعتی مقاصد کے لیے زمین کی کمی ہے اور نہ پانی کی۔ بجلی کی پیداوار تیسرے پنج سالہ منصوبے میں تگنی ہو گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں الکٹرک سٹی پاور بے انتہا سستی شرح پر دستیاب ہے۔ پھر تربیت یافتہ عملے کی روز افزوں تعداد اور اشیائے صارفین کی نکاسی کے وسیع امکانات اتر پردیش میں صنعتی ترقی اور کامیاب و مستحکم صنعت کاری کے ضامن ہیں۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب کی نشر و اشاعت کا باقاعدہ اور ٹھوس انتظام کیا جائے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ حکومت یو۔ پی کو اس ضرورت کا احساس ہے اور اس نے بمبئی میں ایک اطلاعاتی دفتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ یو۔ پی سکریٹریٹ میں ایک شعبہ (سیل) قائم کیا گیا ہے جو تنہا ان لوگوں کے معاملات کو نپٹائے گا جو پردیش میں صنعتیں قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم نہ صرف صنعتی ترقی اور غذائی خود کفالتی کا احساس رکھتے ہیں بلکہ اس سمت سرگرمی کے ساتھ ٹھوس قدم بھی اٹھا رہے ہیں۔

● اس سے پہلے بھی ہم ان صفحات میں ہندستان کے خلاف چین کی معاندانہ سرگرمیوں پر روشنی ڈال چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ وہ نہیں چاہتا کہ ہند۔ پاک علاقے میں امن برقرار رہے بلکہ وہ ایک غیر یقینی اور غیر مستحکم صورت حال برقرار رکھنے کے در پے ہے۔ اور یہ در اصل اس کی ان کوششوں کی ایک کڑی ہے جو وہ ایشیا میں امن و امان کو درہم برہم کرنے کے لیے مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔ چین کی یہ معاندانہ سرگرمیاں اس وقت تک ختم نہیں ہوں گی اور اس کے رویے میں اس وقت تک تبدیلی نہ آئے گی جب تک کمیونسٹ چین کے موجودہ حکمراں اپنے جارحانہ مقاصد کو ترک کر کے اور اپنی توسیع پسندانہ پالیسی سے دست بردار ہو کر پنچ شیل یعنی ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کے احترام، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے، ایک دوسرے کے علاقے پر جارحانہ اقدام نہ کرنے، اختلاف نظریات کے باوجود ایک دوسرے سے خوش گوار تعلقات قائم رکھنے اور ایک دوسرے کے مفاد اور بہبود کو پیش نظر رکھنے کے اصولوں کو نہ اپنائیں گے جن پر یہی چینی حکمراں سنہ ۱۹۶۲ء میں ہندستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے تک کامل اعتماد کا اظہار کرتے چلے آئے تھے۔ بہر حال چین کی موجودہ روش سے توقع نہیں کہ مستقبل قریب میں ان کے اندر اس طرح کی کوئی تبدیلی رونما ہوگی۔ اور جب صورت حال یہ ہو تو بائیں بازو کے کمیونسٹوں کے علاوہ ایک حلقے کی یہ تجویز کہ ہندستان چین سے گفت و شنید کی ابتدا کرے اور اپنے اختلافات بات چیت کے ذریعے طے کرے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حیرت چینی مفاد سے دلچسپی رکھنے والے اور چینیوں کو عوام کی ذریت قرار دینے والے کمیونسٹوں پر نہیں ہوتی۔ البتہ ایسے لوگ جو قومیات میں غیر معروف نہیں ہیں اور جن کی عمر کا بڑا حصہ ملکی سیاسیات میں گزرا ہے جب چینیوں سے گفت و شنید کی وکالت کرتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں کسی نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ یہ حلقہ اسی طرح کی تجویز پیش کرتے ہوئے صرف اس امر کو نظر انداز نہیں کر رہا ہے کہ اس کا لازمی اثر ذہنوں پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ یہ ہندستان ہی ہے جو چین سے بات چیت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے بلکہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ موجودہ صورت حال ہندستان کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ جہاں تک چین سے گفت و شنید کا تعلق ہے ہم نے کبھی بھی سرحدی تنازعات کو بات چیت کے ذریعے طے کرنے سے گریز نہیں کیا۔ جب بھی اس طرح کا کوئی سوال اٹھا ہم نے یہی کہا کہ ہم اس کے واسطے تیار ہیں بشرطیکہ اس کے لیے کوئی معقول بنیاد ہو۔ جنگجو چین نے نہ صرف ہمارا ہزاروں مربع میل کا علاقہ دبا رکھا ہے اور اس نے ہمیں جنگ میں زبردستی گھسیٹا بلکہ آج بھی چینی جنگی رویہ اختیار کرتے ہیں اور ہماری سرحدوں پر کچھ نہ کچھ حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں گفت و شنید کا مطلب اپنی کمزوری اور صورت حال سے عہدہ برآ ہونے میں اپنے عجز کے اعتراف سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ چین کا رویہ لازمی طور سے زیادہ درشت اور تہدید آمیز ہو جائے گا۔ ہم نے نہ کبھی جنگ کی ہمت کی اور نہ جنگی ماحول پیدا کرتے ہیں۔ ہم تو امن اصول کو ماننے والے ہیں کہ سرحدی تنازعات ہوں یا دوسرے اختلافی مسائل سب بات چیت ہی کے ذریعے طے پانا چاہیے۔ کیونکہ ہم جنگ کو مسائل کا حل نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امن ہو یا دوستی یک طرفہ عمل سے اس کا قیام ممکن نہیں ہے۔

● حال ہی میں آنجہانی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی اہلیہ محترمہ للیتا شاستری نے گاؤں کے رہنے والوں کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے اور انھوں نے لال بہادر شاستری سیوا نکیتن کے ذریعہ مظلوموں اور زندگی کی آسائشوں سے محروم لاکھوں افراد کی فلاح و بہبود کے واسطے کام کرنے کا اعلان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح وہ اپنے مرحوم شوہر کے ادھورے کاموں کو آگے بڑھائیں گی۔ لال بہادر جی کی زندگی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر تھی۔ اور اس شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھا ان کی انسان دوستی اور انسانیت نوازی جس نے انھیں منکسر مزاج اور رقیق القلب بنا دیا تھا۔ انھیں عام کی بھلائی کے کاموں میں بے حد لذت محسوس ہوتی تھی اور اس سلسلے میں ہر طرح کی قربانی اور ہر طرح کے ایثار کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ جب انھوں نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تو ملک ایک نازک دور سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف اندرون ملک غذا، زبان، بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مسئلہ، آپس کے اختلافات وغیرہ کے مسائل شدت اختیار کر رہے تھے اور دوسری طرف ملک کی سالمیت اور بیرونی حملے سے ملک کے بچاؤ کا اہم سوال در پیش تھا۔ قدرتی طور پر لال بہادر جی کو فوراً ان مسائل کا حل ڈھونڈھنے نکالنے اور ملک کے دفاع کے انتظامات کرنے کی جانب متوجہ ہو جانا پڑا اور لاکھوں دکھی عوام کی فلاح و بہبود کا کام جو انھیں دل سے پیارا تھا، ان کی پوری توجہ نہ حاصل کر سکا۔ توقع تھی کہ حالات کے اعتدال پر آتے ہی وہ پوری قوت سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں گے اور ان کی قیادت و رہنمائی میں جہاں عوام آزادی کی نعمتوں اور مسرتوں سے بیش از بیش مستفید ہوں گے وہاں ملک خوش حال تر اور مستحکم تر ہوگا۔ لیکن موت نے مہلت نہ دی اور شاستری جی کا مشن ادھورا رہ گیا۔ ان کے اسی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے سیوا نکیتن کا قیام عمل میں آیا ہے اور اس نے گاؤں کی ترقی کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس پروگرام میں بچوں کی تعلیم، عورتوں کی اصلاح و تربیت اور عوام کے لیے ترقیاتی اور فلاحی کام کرنے والوں کی ایک جماعت کی تنظیم شامل ہے۔ اس سلسلے میں شری جے پی نراین، ڈاکٹر سمپورنانند، شری وشوناتھ داس، شری پی این سنگھ، رائے امرناتھ اگروال، شری نونہال سنگھ، شری للت سیون، کرن بھائی اور شری وی پی این سنگھ کے دستخط سے ایک اپیل شائع کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محبوب رہنما اور وزیر اعظم آنجہانی شری لال بہادر شاستری کی زندگی کی یاد تازہ اور ان کے کام کو باقی رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ملک کے لیے ان کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے لیے سیوا نکیتن نے جو عظیم کام اپنے ذمے لیا ہے اسے پورا کرنے میں ان کے چاہنے والوں اور عقیدت مندوں کو دل کھول کر مدد کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک مقدس کام ہے جس میں حصہ لینا اگر ایک طرف حب الوطنی اور انسانیت دوستی کی دلیل ہوگی تو دوسری طرف قوم کے اس مایہ ناز سپوت کی یاد کو باقی رکھنے کی بہترین صورت جس نے ایک ایسے نازک مرحلے میں جب کہ ملک پر ایک طاقتور دشمن نے جنگ چھیڑ دی تھی اپنی اولوالعزم قیادت سے سارے ملک میں مقابلے، مدافعت اور یکجہتی کی لہر دوڑا دی اور ایک نئی ہندستانی قوم اور ایک نئے ہندستان کو جنم دیا۔

ایڈیٹر ———

غزل

فراق گورکھپوری

کم کہاں گل سے خار ہے اے دوست
خانہ زادِ بہار ہے اے دوست

مردِ آگاہ ہوں، پہ یہ نہ کھلا
تجھ سے کیوں مجھ کو پیار ہے اے دوست

بس اُسی کی، دیا تھا تو نے جو غم
زندگی یادگار ہے اے دوست

جو کبھی پی چکے تھے، یہ ہستی
اُسی مے کا خمار ہے اے دوست

عرش سے ہے بلند، یوں تو بشر
ایک مشتِ غبار ہے اے دوست

دیکھیں جس رخ سے بھی، ہر اک رخ میں
شانِ روئے نگار ہے اے دوست

میرے غم سے حجاب کیوں ہو تجھے
یہ بھی اپنا ہی یار ہے اے دوست

جو کھٹکتا ہے میرے سینے میں
ہر کوئی گل کہ خار ہے اے دوست

کار فرما ہے جو زمانے میں
جبر یا اختیار ہے اے دوست

اب نہیں زندگی میں کوئی کمی
بس ترا انتظار ہے اے دوست

عشق ہے بے نیازِ سود و زیاں
یہ عجب کاروبار ہے اے دوست

پہلے ہی کب سکون تھا دل کو
اب بہت بے قرار ہے اے دوست

دل جو کل تک چراغِ محفل تھا
اک چراغِ مزار ہے اے دوست

کیوں سمجھتے ہیں اُس کو دشمنِ جاں
غم تو یاروں کا یار ہے اے دوست

درد بھی کم ہے، تم بھی ہو، لیکن
دل بہت بے قرار ہے اے دوست

تمتمائی ہوئی جبینِ بشر
مطلعِ روزگار ہے اے دوست

یہ الگ بات اُسے نہ تو برتے
تجھ کو سب اختیار ہے اے دوست

تیرے وعدے پہ شک گزرتا ہے
اور کچھ اعتبار ہے اے دوست

از ازل تا ابد ہر اک عالم
عالمِ انتظار ہے اے دوست

تجھ سے تیری شکایتیں کرکے
دل بہت شرمسار ہے اے دوست

کبھی آیا تو ہوگا ذکرِ فراق
وہ یہی خاکسار ہے اے دوست

جون ۱۹۶۶ء

جیشٹھ ۱۸۸۸ شک

قلم کاری ــــــ تحریر کی صنفی ساخت

سیّدہ محمّد حسنین

ادب کو اب ہمیں ایک نئے پہلو سے دیکھنا ہے۔ یعنی ادبی نگارشات کا وہ رخ جس سے ایک طرف ان کے مزاج یا سیرت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ان کے حلیہ یا صورت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک متعلم ادب کے لیے ادبی تحریروں کی نفسی اور جسدی نوعیت کی شناخت بھی لازمی ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہماری قومی تہذیب و معاشرت کے وسیع پس منظر میں ادب کا وجود نگارشات کے ایک شاداب خطہ جیسا ہے۔ مگر یہ خطہ کرۂ ارض کا وہ سرسبز و سدا بہار خط استوائی علاقہ نہیں جس میں قوی ہیکل و دیو قامت خود رو نباتات کی اژدہام بالیدگی نظر آتی ہے ــــ ادب کو ہم "تحریروں کا جنگل" تصور نہیں کر سکتے۔ یہ تحریروں کا گلستان ہے، پرسکون اور کیف بخش، دیدہ زیب، خوبصورت اور مجسم تحریروں کا ایک مہتم بالشان اور پُر رونق گلستاں ہے۔ اس گلستان کے خوش رنگ اور خوشبودار پھولوں سے ڈھکے ہوئے انواع و اقسام کے خوش رو نباتات سیر کرنے والوں کو دعوت گل گشت دیتے ہیں۔ ہر درخت، ہر پودا اور ہر بیل بوٹا ایک امتیازی مقام رکھتا ہے اور حسن و کشش بھی۔ جسے گلستان سے محبت ہے، اسے ان پیڑ پودوں سے پیار ہوتا ہے۔ وہ گلستان کی ہر بیل اور ہر بوٹے کو پہچانتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت جانتا ہے اور اسے برباد ہونے سے بچاتا ہے۔ پیڑ پودوں کی سرسبزی، بالیدگی اور سارے نباتات کی بامراد نشوونما دیکھ کر شیدائے گلستاں کے دل پر بھی بہار ٹوٹنے لگتی ہے۔

ایک کوردہ دہقانی، جس نے کسی شہر کی صورت نہیں دیکھی، کسی اچھے موڈرن شہر میں آتا ہے۔ وہ بازاروں کی سیر کرتا ہے، سڑکوں پر گھومتا ہے۔ شہر کے مختلف حصوں کے چکر لگاتا ہے۔ بڑی بڑی عمارتوں، قسم قسم کے مکانوں اور سجی سجائی دکانوں کو دیکھ کر وہ ششدر رہ جاتا ہے کہ یہ سب کیا ہیں؟ وہ ہیجان خیز تجربہ سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان عمارتوں میں انسان ہی رہتے ہیں، پر حیران ہوتا ہے کہ ہر عمارت میں ہر انسان آتا جاتا نظر نہیں آتا۔ کچھ خاص قسم کے لوگ کچھ خاص قسم کے مکانوں میں کسی خاص وقت میں آتے اور جاتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟ ــــ آپ غور کریں، اس معصوم دہقانی کے لئے عمارت عمارت کا فرق فی الحقیقت سمجھ میں نہ آنے والا ایک تماشہ ہی ہے۔ اسکول اور اسپتال، ہوسٹل اور کچہری، کلب اور جائے گھر، سرائے اور لائبریری، ہوٹل اور کالج، ڈاکخانہ اور چائے خانہ، یہ تمام عمارتیں ہی ہیں۔ ان میں آنے جانے والے شہروں میں بسنے والے ہی ہیں۔ پر عمارتوں کی یہ مختلف النوع شکلیں، ان کی مخصوص ساخت اور ان کی منفرد حیثیت اس دہقانی کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہوتا ہے ــــ اس کے برخلاف ہم شہریوں کا عمارت کو اس کی وضع و ساخت سے اور مکین کو اس کے مکان سے پہچاننا چنداں دشوار نہیں۔ یہ بات بتانے کی نہیں کہ ہوٹل کے بیرے سے ہم قانونی مشورہ نہیں لیتے یا وکیل خانے میں خون کی

کی جانچ کرانے نہیں جاتے!

یہی حال اور تقریباً کچھ ایسا ہی نقشہ ادب کا بھی ہے۔ ادبی تحریریں اپنی شکل وصورت اور اپنا امتیازی رنگ روپ رکھتی ہیں۔ بے وضع اور بے شکل گھٹائیں ابر جیسا وجود نہیں رکھتیں، جن کی زندگی ہواؤں کے رحم وکرم پر موقوف ہوتی ہے۔ ادبی تحریریں خوش روئی اور جامہ زیبی کی مثال ہوتی ہیں۔ ان کی جاذبیت، تشکیلی خوش سلیقگی اور حسن تجسیم ان کی فنی پختہ کاری کی ضامن ہوتی ہے۔

ادب ہمارے افکار وتاثر کی تحریری صورت ہے۔ مشاہدات وتجربات ادب کے جوہر ہیں۔ انشار پردازی ادیب کا ایک عمدہ وصف ہے۔ پر، ان اساسی خصوصیات کا حامل تحریر بھی بزم ادب کی شمع نہیں بن سکتی ــــــ کپڑے تن پوشی کے کام آتے ہیں۔ ان سے طرح طرح کے لباس وپوشاک تیار کئے جاتے ہیں۔ مگر، آپ اس حقیقت سے ہرگز ناواقف نہیں کہ تھان میں لپیٹے ہوئے کپڑے کی کسی خاص پوشاک میں تبدیلی نہایت باسلیقہ کارکردگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کپڑے کے "تھان" کو ہم "ملبوسات" قرار نہیں دیتے ــــــ

یہ بات ادب پر بھی صادق آتی ہے۔ ہر قلم بندبات ادب نہیں ہوتی۔ تحریر کی کسی پارۂ ادب میں "تبدیلی" بھی نہایت سوچے سمجھے عمل یا باشعور کارکردگی کا حاصل ہوتی ہے۔ یہ کارکردگی افکار وتاثر کی محض "قلم بندی" نہیں۔ یہ افکار وتاثر کی "حسن کارانہ صورت گری" یعنی AESTHETIC MOULDING ہے۔ یہ ایسی باکمال تحریری صورت گری ہے جس کا نہایت موزوں نام "قلم کاری" ہے ــــــ

قلم کاری ادیب کا آرٹ ہے۔ یہ واقعات، خیالات یا کوائف کی صنفی تشکیل ہے۔ یہ ادب پارہ یا فن پارہ کی تکمیل وتعمیر کا ذریعہ ہے۔

ادیب کے اعلیٰ شعور کارکردگی کا عملی نتیجہ ادب پارہ ہے۔

ادب پارہ کی تشکیل وتکمیل کی کہانی چند حسی اور ذہنی عمل ورد عمل کی نہایت پے چیدہ کہانی ہے، ہزار راتیں بھی جس کے بیان کے لئے ناکافی ہیں ــــــ دماغ میں خیال کی آمد، بےساختہ آمد، اس کہانی کا نقطۂ آغاز ہے اور اس کی نمو و بالیدگی کہانی کی دوسری منزل۔ خیال کی پختگی کہانی کی تیسری منزل ہے اور خیال کی قلم بندی یا صورت گری اس کہانی کی آخری منزل ہوتی ہے۔ ہر وہ بات یا خیال جو ادیب کے دماغ میں جنم لیتا ہے، بہت جلد اپنا ایک مخصوص مزاج اختیار کر لیتا ہے۔ شدید داخلی قوتیں اس خیال کو پکاتی ہیں۔ یہ گھلتا ہے، پھیلتا ہے، بڑھتا ہے اور اس کا سراپا تیار ہو جاتا ہے۔ زیادہ مدت نہیں گذرتی کہ یہ نومولود نرم خیال ایک تحریر مجسم بن کر صفحۂ قرطاس پر اُتر آتا ہے ؎

تصور رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جاتا ہے   وہ اک شے جو مجھی میں ہے مجسم ہوتی جاتی ہے

خیال ادیب کے دماغ میں پھوٹتا ہے۔ پڑھنے والے اس سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔ ادیب کی قلم کاری خیال کو تحریری ملبوسات عطا کر دیتی ہے۔ یہ خیال پھر بصورتِ ادب پارہ عالم موہوم سے عالم شہود میں منتقل ہو جاتا ہے اور ادب میں نقش دوام ہونے کی بضاعت پا لیتا ہے۔

تو، ادبی تحریریں مخصوص شکل وصورت اور امتیازی رنگ روپ کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ افکار وتاثر کی قلم بند خوبرو مجسم صورتیں ہیں۔ یہ مخصوص نفسی اور جسدی نوعیت رکھتی ہیں۔ ادب میں یہ مختلف ناموں سے موسوم ہیں اور ہر تحریر چند خصوصیات سے مملو ہوتی ہے۔ یہ تحریریں، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، رباعی، ریختی، گیت، نظم (پابند و آزاد) ہیں۔ یہ تمام تحریریں ہمارے شعری ادب سے متعلق ہیں۔ اسی طرح حکایت، تمثیلیہ، داستان، مراسلہ، مقالہ، تذکرہ، سوانح، ناول ڈراما، کیفیہ، افسانہ، انشائیہ، روزنامچہ، خاکہ اور رپورتاژ ہمارے نثری ادب کی مختلف قسمیں ہیں۔ یہ تمام شعری اور نثری تحریریں عام طور پر اصنافِ ادب[1] یعنی LITERARY FORMS سے معروف ہیں۔ ان میں سے ہر تحریر ادب پارہ یا فن پارہ

[1] ایک عرصہ تک ادب اور شاعری مترادف الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نثر کو نظم کی ضد خیال کرتے تھے اور نظم اور شاعری میں کوئی
(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

کا مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ تحریریں ادب کی قلم کاری کا حاصل ہیں۔ یہ ہماری مہذب زندگی کی علامت ہیں۔ یہ ہمارے ادب کی رونق ہیں اور اسے رشک گلزار بناتی ہیں ـــــ اس جگہ اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان تحریروں کو کسی کاریگر نے نہیں بنایا نہ کسی فیکٹری یا دبستان سے ان کی درآمد ہوئی ہے۔ یہ ہماری تہذیبی ترقی اور ادبی ارتقا کی پیداوار ہیں۔

ہر فن پارہ کی ادب میں ایک منفرد حیثیت ہے اور اس کا اپنا خاص مقام۔ جو اہل ادب ہیں وہ ہر فن پارہ کی صورت پہچانتے ہیں۔ جو اہل قلم ہیں وہ فن پارہ کی صورت گری کی لیاقت رکھتے ہیں۔ جو اہل نقد و نظر ہیں وہ ہر فن پارہ کی صورت گری کے گُر جانتے ہیں ـــــ آپ کے مطالعہ میں ایسی تحریریں ضرور آئی ہوں گی جو اپنے مصنفین کے فنی شعور کے معذوری کا نمونہ ہیں، مثلاً ایسی نظمیں (نہایت خوبصورت اشعار میں منسلک نظمیں) جن کا مزاج غزل کا ہے اور جن میں تاثراتی وحدت عنقا ہوتی ہے۔ یا ایسے افسانے (نہایت دلکش افسانے) جن کا نفس انشائیہ کا ہے اور جن میں افکار پریشاں کی پر لطف نیرنگی کی بہار میں چلتی ہوتی ہیں ـــــ آپ غور کریں، اس قسم کی نظمیں یا افسانے دراصل وہ مسخ کردہ فن پارے ہیں جس کی وجہ یہی ناقص صورت گری ہے۔ یہ بد ترتیب ادبی تحریریں ادب اور ذوق ادب پر داغ ہیں۔ افکار و تاثر کی یہ مضحک صورت گری اپنے اہل قلم کی بد مذاقی کی مظہر ہے ـــــ ایسے درزی کو آپ کیا کہیں گے جو مدراسی کوٹ کو شیروانی بنا کر لایا ہے؟ ـــــ ایسے عطر فروش سے کیا سلوک کریں گے جو روغن سبز کو عطر گلاب بتاتا ہے؟ ـــــ

اس نوع کے اہل قلم، ہمارا یہ اظہار بے جا نہ ہوگا، بنیادی طور پر MAL-ADJUSTED ہیں۔ یہ مصنفین اپنی منزل سے ناآشنا ہوتے ہیں اور اگر آشنا ہوتے بھی ہیں تو اس کی راہ پر چلنا انھیں پسند نہیں۔ قدرت سے انھیں شاعر یا افسانہ نگار یا دوسرے قلم کار کا دل دماغ ملا ہوتا ہے، مگر ادبی تحریروں کی تشکیل وتکمیل کے صنفی تقاضوں سے دانستہ یا غیر دانستہ بے نیازی ان کی خامہ فرسائی کو فن کے مرتبہ تک نہیں لے جاتی۔ ان شاعر و نثار کی خامہ فرسائی زیادہ سے زیادہ 'ادب نما قلم بندی' قرار دی جائے گی۔ یہ قلم کاری کا اعزاز نہیں پا سکتی۔ یہ باشعور مگر نیم ہوشمند اہل قلم بلاشبہ ہماری زبان کے وہ افراد ہیں جو اپنی طبعی سرحدوں کو توڑ پھوڑ کر ادب کے غیر موافق خطوں میں گھومتے پھرتے ہیں ـــــ ان کی اس بے راہ روی کی ذمہ داری، مجھے کہنے دیجئے، بڑی حد تک آپ اور ہم اہل نظر و اہل ادب پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ان کی تصنیفات کو ہم ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ ان مصنفین کی خامہ فرسائی پر سر دُھنتے ہیں۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ عطر خس کو عطر گلاب کہا جا رہا ہے اور ناقص مدراسی کوٹ کو ہم جدید تراش کی شیروانی قرار دے رہے ہیں ـــــ

ـــــ یہ انداز مطالعہ ادبی تحریروں کی شناخت کے لئے سراسر مہمل ہے۔ یہ ہماری غفلت ہے کہ ہم قلم بندی اور قلم کاری کے مابین کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم تحریر کی صنفی وجسدی نوعیت پر نگاہ نہیں ڈالتے۔ تحریر کی تخصیصی باریکیوں پر اور اس کی مخصوص ساخت وتشکیل پر توجہ نہیں دیتے۔ خیالات وواقعات کی محض قلم بندی کو ہم ادب سمجھ لیتے ہیں۔ افکار و تاثر کے شعری طریقہ اظہار کو ہم ادب عالیہ قرار دیتے ہیں اور انشا پردازی

حاشیہ بسلسلہ صفحہ گزشتہ

نمایاں فرق محسوس نہ کرتے تھے۔ یہ خیال ان دنوں بے معنی معلوم ہوتا تھا کہ شاعری کی ضد نثر ہے اور نظم شاعری کی ایک مخصوص شکل ہے ـــــ ـــــ دراصل ان دنوں ہمارا ادبی شعور عالم نیم بیداری میں تھا۔ شعری ادب سے ہماری آگہی، کچھ حد تک، اطمینان بخش تھی کہ شاعری کی مختلف شکلوں کو ہم "اصناف سخن" سے نامزد کر لیتے تھے۔ پر، نثری ادب کی مختلف شکلیں ہمارے لئے غیر واضح تھیں اور نثر پاروں کی تمیز میں ہمارے سامنے گہرا دھندلکا حائل تھا۔

وعبارت آرائی کو ہم آرٹ یا فن کا منصب بخشتے ہیں ——
مطالعۂ ادب میں اس حقیقت کو ہمیں ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ تحریریں ادبی بو باس کے باوجود، شعری رنگ روغن کے باوجود فن پارہ یا صنف ادب کا مرتبہ نہیں پا سکتیں۔ فن پارہ قلم کاری کا حاصل ہے، یہ خامہ فرسائی یا قلم بندی کا نتیجہ نہیں۔

ہر تحریر جو ادب میں صنفی حیثیت رکھتی ہے، اس کا اپنا اہم مقام ہوتا ہے اس لئے کہ یہ اہم کام کے لئے وقف ہوتی ہے۔ ان تحریروں کی قدر و قیمت ان پیمانوں جیسی ہوتی ہے جن سے مختلف کیفیت حیات کی پیمائش کی جاتی ہے۔ آپ نے یہ فقرہ بار بار سُنا ہے کہ ادیب کا کام زندگی کی ترجمانی ہے —— زندگی —— پانچ نرم صوتی حروف کا یہ چھوٹا سا سبک لفظ، عام بول چال میں کتنا سہل ہے! لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ زندگی ——

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی کی ترجمانی، اور وہ بھی کامیاب ترجمانی، بلاشبہ یہ آسان کام نہیں۔ اس دشوار کام میں ان فن پاروں سے مدد لی جاتی ہے۔

ہر فن پارہ ایک کیمرا ہے۔ یہ تمام شعری اور نثری اصناف ادبی کیمرے ہیں۔ یہ ایسے کارآمد کیمرے ہیں جن سے خاص خاص تصویریں اُتاری جاتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر کیمرا، ہر تصویر کشی کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ یہ کیمرے کے لینس اور لینس کی قوت پر منحصر ہے کہ کونسی فوٹو گرافی کے لئے کونسا کیمرا مناسب ہے ——
یہ تمام شعری اور نثری اصناف بھی اسی طرح زندگی کی خاص خاص اداؤں اور جلوؤں کی تصویر کشی کے لئے وقف ہیں۔ یہ وہ پیمانے ہیں جن سے مخصوص کیفیت حیات کی پیمائش کی جاتی ہے۔ ادیب، ہوشمند و باشعور ادیب، ان پیمانوں سے زندگی کی شدت و رفت، تیزی و شور، سختی و حدّت، نرمی و نزاکت، رفعت و جلال، لطافت و رعنائی اور تنوع و تضاد کی جانچ پڑتال اور ناپ تول کرتا رہتا ہے۔ ان اصناف کے ذریعہ وہ حیات کی نیرنگیوں کو علحدہ کرتا ہے۔ ان کی مدد سے وہ مسائل حیات کی تفسیر و تشریح میں بامراد ہوتا ہے۔ ان اصناف کے سہارے وہ نسخۂ کائنات کے رازہائے سربستہ کو بے حجاب کرتا ہے۔

قلم کاری ایک آرٹ ہے۔ یہ کسی ماہر اہل قلم کی اعلیٰ لیاقت ہے، افکار و تاثر کی حسن کارانہ صورت گری کی باکمال صلاحیت۔ یہ ایک فن ہے، واقعات، خیالات یا کوائف کی تنظیمی صورت گری۔ ہماری وہ تمام حسی و ذہنی کاوشیں جو بے وضع و بے تشکل تحریری صورتوں میں نمودار ہوتی ہیں، تحریروں کا جنگل تیار کر سکتی ہیں، نگارستان یا گلستان تعمیر نہیں کر سکتیں۔



غزل

نذیر بنارسی

ہم کبھی ہنس نہ سکے آپ کی محفل کی طرح
ہوک کی طرح اُٹھے بیٹھ گئے دل کی طرح

ڈوبتی تھی مری کشتی بھی مرے دل کی طرح
پھر بھی ہنستا ہی رہا میں لبِ ساحل کی طرح

ہم کو جب تک نہ ملی آپ کے آنے کی خبر
ہم بھٹکتے رہے گردِ رہِ منزل کی طرح

زندگی عقدۂ دشوار بنے گی مجھ بن
تجھ کو بھی حل نہ ملے گا مری مشکل کی طرح

جن کی آواز پہ طوفان اُٹھا کرتے تھے
آج خاموش ہیں وہ بھی لبِ ساحل کی طرح

اشک آنکھوں میں نظر آتے ہیں کیوں خیر تو ہے
تم تو بے درد نظر آتے تھے قاتل کی طرح

آئیے آپ کے چہرے کی بلائیں لے لوں
آج تاباں ہے مرے آئینۂ دل کی طرح

کیا ستم ہے کہ جب آتا ہے مسیحا کوئی
دیکھنے لگتی ہے دُنیا اُسے قاتل کی طرح

اے نذیر اس لیے گنگا سے محبت ہے مجھے
اس کی ہر موج دھڑکتی ہے مرے دل کی طرح

نظامی بدایونی

محمد اسمٰعیل بدایونی

نظامی کون ہے کیا ہے ٹھکانا ہے کہاں اس کا   مفصل تو نہیں معلوم پر معلوم ہے اتنا
نہیں مذہب کوئی اُس کا مگر اللہ والا ہے   بدایوں ہے وطن اُس کا مگر پھرتا ہے آوارا

مولانا نظام الدین حسین المتخلص بہ نظامی ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں ایک معزز صدیقی خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولانا فخرالدین تھا۔ عہد سلاطین مغلیہ سے آپ کے خاندان کو متولی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولانا نظامی یو۔پی ہی نہیں ہندوستان کی اُن مایۂ ناز معروف ہستیوں میں تھے جن کا شمار انگلیوں پر ہوتا ہے۔ آپ کو مردم خیز خطہ بدایوں کے سلسلۂ مشاہیر کی آخری کڑی سمجھنا چاہئے۔ پڑھی لکھی دنیا میں شاذ و نادر ہی کوئی ہو جو نظامی بدایونی کے نام نامی سے نا آشنا ہو۔ ملک و قوم کے سچے اور بے لوث خادم حضرت نظامی جیسے یادگار زمانہ لوگ کم ہوتے ہیں۔ النادر کالمعدوم۔ سچ ہے ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نظامی کے خاندان کے لوگ کافی تعلیم یافتہ اور اونچی سرکاری ملازمتوں پر تھے۔ خود نظامی بھی ۱۸۹۲ء میں ہائی اسکول پاس کر کے علی گڑھ پڑھنے گئے۔ وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن اُس زمانے میں انگریزی تعلیم کی مخالفت ہو رہی تھی غالباً اسی لئے بزرگوں نے جلدی ہی بلا لیا اور تعلیم ختم ہوگئی۔ ان کے دادا کے چچا زاد بھائی مولوی حمیدالدین (ڈپٹی کلکٹر) کی لڑکی سے شادی ہوگئی اور انھیں کی رائے سے خاندانی رواج کے مطابق ملازمت کی چکی چلانے لگے اور اس کا سلسلہ ۱۹۰۲ء تک جاری رہا۔ اس وقت وہ محافظ خانہ مال و فوجداری شاہجہانپور میں محکمہ نقل کے منصرم تھے۔ اپنی جفاکشی و ذکاوت سے کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے اس لئے حکام کی نظروں میں ایک قابل قدر اہلکار سمجھے جاتے تھے۔ نظامی نہایت آزاد طبع اور ایماندار انسان تھے۔ بڑی سے بڑی ہستی سے وہ کبھی مرعوب نہ ہوئے اور ہمیشہ صاف صاف اور کھری کھری کہی۔ جوں توں کر کے ملازمت میں سات آٹھ برس گزارے۔ آپ کی ترک ملازمت کا واقعہ صفحاتِ نظامی بدایونی میں درج ہے۔

ملازمت سے چھٹکارہ پاکر ۱۹۰۲ء ہی میں انھوں نے اخبار "ذوالقرنین" نکالا جو وکٹوریہ پریس میں چھپتا تھا۔ اس کے مالک ایک تجربہ کار اور باوضع انسان منشی آغا خاں لکھنوی تھے۔ وہ ذوالقرنین میں شریک بھی تھے۔ رفتہ رفتہ پریس کا سامان فراہم کر کے نظامی بدایونی نے ۱۹۰۵ء میں خود اپنا مطبع 'نظامی پریس' کے نام سے قائم کیا اور 'ذوالقرنین' اپنے پریس میں چھپنے لگا۔ منشی آغا خاں صاحب کی شرکت بھی ختم ہوگئی۔ اس مطبع میں سب سے پہلے بدایوں کی تاریخ کنز التاریخ مصنفہ مولوی رضی الدین صاحب طبع ہوئی۔

تعلیمی اور علمی تحریکوں میں حصہ لینے کی انھیں بڑی لگن تھی۔ ان تحریکوں کو کامیاب بنانے میں وہ قلم ہی سے نہیں بلکہ تن من دھن سبھی طرح سے مدد دیتے۔ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ عالم وجود میں آئی تو انھوں نے اُس میں عملی حصہ لیا اور تاحیات اُس کو کامیاب بنانے میں کوشاں رہے۔ تقریباً اٹھارہ سال تک پراونشیل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ کئی سال تک آنریری سکریٹری کے فرائض بھی انجام دئے۔ قصبہ آنولہ کے اجلاس منعقدہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو کامیاب بنانے کی خاطر وہ ضعیفی اور علالت کی حالت میں بھی شریک ہوئے۔

آپ ہی کی تحریک اور جد و جہد سے بدایوں میں مسلم اسلامیہ ہائی

اسکول ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا جو آج حافظ صدیق میسٹن اسلامیہ انٹر کالج ہے۔ آپ بحیثیت بانی، اس کے دوامی ٹرسٹی تھے اور پریسیڈنٹ، وائس پریسیڈنٹ، جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے فرائض بھی وقت ضرورت انجام دیئے۔ بریلی اور اٹاوہ کے اسلامیہ کالجوں کے بھی آپ ٹرسٹی تھے۔

جب ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو نظامی بدایونی کی تحریک پر ایک جلسہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کی صدارت میں مشن اسکول بدایوں میں کیا گیا اور یونیورسٹی کے واسطے ایک گرانقدر رقم چندہ سے بھیجی گئی۔ آپ نے یونیورسٹی کی فلاح واستقامت کے لئے مسلسل مضامین لکھے اور پمفلٹ شائع کئے۔ اسی طرح ۱۹۳۹ء میں جب کانگریس کی وزارتیں قائم تھیں، کانگریس گورنمنٹ کی طرف سے ایجوکیشن ریکمنڈیشن کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا تو اس کمیٹی میں بھی آپ نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔

یو۔ پی جج کمیٹی کے سوال پر اُس کی پُر زور تائید اور سُنّی سنٹرل وقف بورڈ کے قیام کے لئے دل وجان سے کوشش کی۔ بالآخر یہ کام بھی ہوگیا۔ بورڈ قائم ہونے پر آپ نے سب سے پہلے وقف قانون کا اُردو ترجمہ کرکے شائع کیا۔ آپ سنی وقف بورڈ کے ممبر بھی مقرر ہوئے۔ نظامی مرحوم ہر کام کو بڑی دلچسپی، محنت وجانفشانی اور دیانتداری سے کرنے کے عادی تھے۔ نام ونمود کی باتوں سے بہت دور رہتے تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپل بورڈ اور کونسلوں کی ممبری کی کبھی تمنا نہ کی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کاموں سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ خان بہادر مولوی فصیح الدین مرحوم (ریٹائرڈ کلکٹر) ایم۔ ایل۔ سی ان کے بڑے مخلص دوست اور بدایوں پبلک کاموں کے سچے رہنما ہی نہیں بلکہ بدایوں پالٹکس کے روح رواں تھے۔ خان بہادر صاحب کے مشیر خاص مولانا نظامی تھے۔ گویا خان بہادر کے قالب میں روحِ نظامی کارفرما تھی۔ جب ۱۹۳۸ء میں خان بہادر صاحب کا انتقال ہوگیا تو مولانا نظامی اس صدمۂ جانکاہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اور مقامی سیاسیات سے الگ ہوکر گوشہ نشین ہوگئے۔

ادبی سرگرمیوں میں پریس کی بڑی اہمیت ہے۔ چوں کہ کارساز عالم کو نظامی مرحوم کے کارنامۂ حیات کو زندہ اور باقی رکھنا منظور تھا اس لیے ان کو پریس عطا فرماکر علمی اور ادبی دلچسپیوں کو علمی جامہ پہنانے کا وسیلہ مہیا کردیا اور ان کے جواہر پارے نہایت سرعت کے ساتھ منظر عام پر آنے لگے۔ طبیعت میں بلا کی موزونی اور روانی تھی۔ اس کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ مطبع کے عملہ اور کاتب کو مضمون وغیرہ کے انتظار میں بیٹھنا نہیں پڑتا تھا بلکہ اس کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا اور کام میں رکاوٹ نہیں ہونے پاتی تھی۔

نیک نیتی کا پھل کہئے یا فضل ربانی کہ ایک معمولی نادار پریس نے بدایوں جیسی چھوٹی جگہ میں علمی وادبی کتابوں کے اعلیٰ اور معیاری نمونوں کی اشاعت اور نفاست کار سے جو نام آوری وشہرت حاصل کی وہ بڑے بڑے پریس باوجود کوشش کے بھی حاصل نہ کرسکے۔ مولانا نظامی نے اپنے رفیق سراس مسعود کی تحریک سے دیوان غالب جدید سائز پر نرالی طرز سے شایع کیا۔ اب تک اس کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مدت ہوئی ساتواں ایڈیشن بھی ختم ہوگیا جو اس کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے

مولانا کو اردو ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ نصف صدی کے قریب قوم اور ادب کی خدمت کی۔ شاعر بھی تھے اور نثار ومصنف بھی۔ عربی وفارسی کے مشکل الفاظ سے نفرت تھی۔ موجودہ دور کی معیاری زبان چاہتے تھے۔ تحریروں میں ادبی ذوق کی جھلک ہے۔ تقریباً ۳۰ کتب کے مصنف ومولف ہیں۔ انسانی اوہام کے نام سے پیری مریدی کے خلاف ایک کتاب لکھی جو لاہور میں چھپی ہے۔ قاموس المشاہیر دو جلدوں میں لکھی۔ اردو ادب میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ تصنیف لائبریری کی زینت کے لیے نہیں بلکہ ہر اردو خواں کی میز پر رہنے کے لیے ہے۔ اپنی آخری تصنیف سوانح حیات مولانا سید طفیل احمد صاحب پر نظر ثانی نہ کرسکے۔ یہ کام آپ کے دوست خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب، علی گڑھ کر رہے ہیں۔

مولانا کے سوانح حیات کا سرسری مطالعہ ہی ہمیں بتاتا ہے کہ مرحوم کا نصب العین کتنا ارفع واعلیٰ، پاکیزہ اور قابلِ تقلید ہے، اور کس طرح آپ نے آخری سانس تک اس پر کاربند وعمل پیرا رہ کر لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کی صداقت کا ثبوت دیا۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے چلنے کے لیے اپنی قوتِ بازو اور محنتِ شاقہ سے راستہ خود بناتے ہیں جو دوسروں کے لیے کام دیتا ہے۔

ماہرین تعلیم میں مولانا نظامی کا ایک خاص مقام ہے تعلیم ہی پر قومی ترقی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ترقی تعلیم کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اخبار ذوالقرنین بدایوں اور اخبار البشیر اٹاوہ کے جاری کرنیوالے یہی نظامی صوبہ کی تعلیمی مجلس کے بانی تھے۔ یو۔پی کے سبھی بڑے شہروں میں اس کانفرنس کے جلسے ہوئے اور یہ قوم کا دیوانہ شہر در شہر مارا مارا پھرا خود فرماتے ہیں ع بدایوں ہے وطن اس کا مگر پھرتا ہے آوارا۔ اس ذیل میں نظامی مرحوم اور ان کے دست راست سید طفیل احمد مرحوم کے کارنامے قومی ترقی کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے اور ہمیشہ فخر سے پڑھے جائیں گے۔ تعلیمی کام کرنے والوں میں آپ جلد گھل مل جاتے تھے۔ تعلقات کو اچھی طرح نبھاتے تھے۔ خان بہادر مولوی فصیح الدین، سید طفیل احمد، سر راس مسعود، حسرت موہانی، خان بہادر حبیب اللہ خاں، حاجی محمد عبید الرحمن خاں، پروفیسر عبدالمجید قریشی جیسے حضرات سے گہرے تعلقات تھے۔ آپ حد درجہ مخلص، بیدار مغز، معاملہ فہم، مستقل مزاج، ذکی و ذہین، پختہ کار، سادہ مزاج، ملنسار، وضع دار، قومی خدمات کے جذبات سے سرشار، خاموشی سے ٹھوس کام کرنے والے انسان تھے۔ جن کو ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ آپ کو خطاب یابی سے بھی نفرت تھی۔ ایک خطاب یافتہ کی زبانی فرما بھی گئے ہیں ع خاں صاحبی نے اور بھی مٹی خراب کی۔ علیل اور طبیعت کے ناساز ہونے پر بھی اکثر قلمی و تحریری کام میں شام کو صبح کر دیتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ راحت پسند نہیں تھے۔ عالم ضعیفی اور بیماری کی حالت میں بھی نوجوانوں کی سی ہمت مردانہ رکھتے تھے۔

ہندو مسلم اتحاد کے دل سے حامی تھے لیگ کے مخالفوں میں آپ کا شمار تھا۔ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی اور ملک الموت نے مہلت نہ دی۔ آزادی کی نیلم پری کا دیدار مقدر نہ تھا۔ یہ حسرت ساتھ لے گئے اور ۲۰؍ جون سنہ ۱۹۴۷ء کو ۱۲½ بجے رات میں طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ۔ مولانا سید آصف علی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ماتم کی صف بچھ گئی ملک کے گوشہ گوشہ سے تعزیتی خطوط و تار موصول ہوئے جو صف ماتم میں جمع ہیں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مولانا احید الدین ایڈیٹر و مالک ذوالقرنین و نظامی پریس، مرحوم کے اکلوتے مایۂ ناز فرزند [illegible] سے صحیح جانشین ہیں۔ آپ نے نظامی مرحوم کے کلام کو لمعات نظامی کے نام سے شایع کر دیا ہے۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات علمی و ادبی دونوں لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ مرحوم نے غزل، نعت، قطعہ، مخمس، مسدس، وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ سہرے اور نوحے بھی لکھے ہیں۔ قومی، سیاسی، اخلاقی اور اصلاحی ہر رنگ کی نظمیں ہر صنف سخن میں موجود ہیں۔ آپ غزل کے لیے فٹ نہیں تھے۔ کلام کے بارے میں حضرت جگر بریلوی کی رائے صائب ہے:

"غزل میں محض قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ اخلاقی نکات ہیں تغزل بھی ہے لیکن اعتدال لیے ہوئے۔ نظموں میں بیشتر حالی کا سا مصلحانہ رنگ ہے۔ بڑی خوبی خلوص ہے یعنی شاعر نے وہی کہا ہے جو اس نے محسوس کیا ہے۔ جس پر اس کا ایمان ہے جس پر اس کا عمل ہے۔ کلام میں استادانہ پختگی، صفائی اور روانی ہے۔"

آپ کی شاعری قلبی و داخلی ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار آزادانہ، بے دھڑک اور صاف صاف کرتے تھے چنانچہ سرکار انگلشیہ کی سخت نکتہ چینی کرنے پر دستور زباں بندی کے ماتحت اگست ۱۹۴۲ء میں ذوالقرنین حکماً بند کر دیا گیا اور مولانا کے ایڈیٹری سے علٰحدہ ہونے پر بہ دقت تمام دوبارہ جاری ہوا۔ لیکن مرحوم نے مرتے دم تک اپنے نظریہ کو نہ بدلا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں مولانا کے سیاسی اور سماجی کلام کا انتخاب درج کیا جا رہا ہے۔

۱۹۳۰ء　ہیں وطن میں بے وطن اب یہ ہماری بے کسی　یہ ہمارا غم کدہ غیروں کا عشرت خانہ ہے

۱۹۳۲ء　نہ لکھنے کی اجازت ہے نہ درد دل سنانے کی　گھٹا جاتا ہے دم تحریر و تقریر مشکل ہے

۱۹۴۰ء　ہے انصاف کی اس سے امید بے جا　وہ منصف نہیں ہے وہ عادل نہیں ہے

۱۹۴۰ء　حکم ہے یہ کہ کوئی اف نہ کرے　قفل منھ پر لگائے جاتے ہیں

تھا جہاں اتحاد کا منظر　اب وہاں سر کٹائے جاتے ہیں

جہاں بہتے تھے امن کے دریا　اب وہاں خوں بہائے جاتے ہیں

جلد دنیا پلٹنے والی ہے　ایسے آثار پائے جاتے ہیں

سن کے اس کی کھری کھری باتیں　وہ نظامی کو کھائے جاتے ہیں

۱۳؍ جولائی ۱۹۴۰ء　ہم آزاد ہوں گے ہم آزاد ہوں گے　قفس سے یہ آتی صدا ہے چمن میں

وہ صیاد خود ہی قفس میں آ گیا ہے　چمن سے خبر آئی ہے یہ وطن میں

ستمبر ۱۹۴۳ء　سنا ہے آج قاصد آخری پیغام لایا ہے　وہ کہتے ہیں تمہارا عزم پورا ہو نہیں سکتا

نظامی نے جو شرطیں پیش کیں عہد محبت میں　خفا ہو کر وہ بولے تم سے سودا ہو نہیں سکتا

اکتوبر ۱۹۴۰ء غلط ہے کہ وہ قول پورا کریں گے — وہ دیکھے ہوئے آزمائے ہوئے ہیں

دسمبر ۱۹۴۱ء جو وعدے انہوں نے کیے تھے وہ ہوگئے غائب — فضا میں کارواں کا کچھ غبار باقی ہے

۱۱ ستمبر ۱۹۴۲ء وعدے جو کل کیے تھے فراموش ہوگئے — کہتے ہیں آج ہم سے یہ اہلِ جفا کچھ اور

کچھ قول و فعل میں نہیں اس کے مطابقت — کہنے کی بات اور تھی اس نے کیا کچھ اور

۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء جب جفاؤں کی ہو چکی بھرمار — میں نے پوچھا کوئی حساب بھی ہے

لفظ قانون کی ہے مٹی خوار — مستند عدل کی کتاب بھی ہے

۰ فروری ۱۹۴۴ء میں زنجیروں کی جھنکار دل کا نغمہ سمجھتا ہوں — جنونِ عشق کا یہ معجزہ معلوم ہوتا ہے

یہ اچھا ہے نظامی قید میں گھٹ گھٹ کے مرجائے — یہی بس رہ کے ان کا مدعا معلوم ہوتا ہے

۲۰ مارچ ۱۹۴۶ء بارہا خواب میں دیکھا کیے آزادی کو — پر ہوا خواب نہ شرمندۂ تعبیر کبھی

میری آزادی کی عجلت ہے انہیں خیر تو ہے — یہ وہی ہیں جو روا رکھتے تھے تاخیر کبھی

"کاشتکاروں سے خطاب" میں فرماتے ہیں ؎

اے کاشتکار دل میں کچھ غور کر خدارا — اس کشمکش میں ہوگا کیوں کر ترا گزارا

یا تو ترے ہی بل پہ چلتی تھی ساری دنیا — یا تو ہی ڈھونڈتا ہے اب اور کا سہارا

سب آگے بڑھ رہے ہیں تو پیچھے ہٹ رہا ہے — ہاں اب ذرا سنبھل جا دیکھ آگیا کنارا

عزت گری ہے رہنا قرضہ سے دو ہی جا کو — یہ سوچ لو اسی میں ہے اب بھلا تمہارا

لمعات نظامی میں جو قطعات اور نظمیں درج ہیں ان میں سے بعض کے عنوانات یہ ہیں :

ایک پکٹنگ کرنے والی خاتون کو دیکھ کر، غریب کسانوں کی فریاد، عیش پرست زمین داروں سے، دہقان، دس بنیادی حقوق، یوم نجات کے متعلق قائد اعظم سے دو باتیں، خاں صاحب کی صدا، (خاں صاحب نے کس طرح مٹی خراب کی) جنگ کے بعد ہماری امیدیں، ووٹ کا فیصلہ، مسٹر جناح کا غصہ، قطعات، ایفائے وعدہ کا جواب، دشمن کی بے شعوری، عقل میں فتور، سمجھ کا قصور، صوبوں کی وزارتوں کے استعفے کے بعد، ہندوستان کی قومی زندگی کے تین اجزاء، مغرب کے نقالی، مسلم لیگ کی پالیسی، جنگ عظیم کے منصوبے، مسلم لیگ کے فتاوے، عید، عید الفطر، ایک دوست سے خطاب، ۱۹۴۰ کی انفرادی نافرمانی، دشمن سے خطاب، ولایتی نہیں، زندہ دلی، مسلم لیگ کی نہیں، زندگی کا راز، زندگی کا فلسفہ وغیرہ۔

ایک نظم کا عنوان ہے: ووٹروں کی ذہنیت کا نوحہ۔ اس نظم میں ووٹروں کی ذہنیت کا تجزیہ کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ ایک امیدوار کو ووٹروں سے کس کس طرح کے جواب ملتے ہیں۔

چند متفرق اشعار اور ملاحظہ کیجیے ؎

جس کو اسلام کے کلچر کی ہوا بھی نہ لگی — اس نے مسلم کی قیادت کی ہے ٹوپی پہنی

قوم کے پاس ہے موجود حدیث و قرآں — کیوں ہو قائد کی حضرت وہ نہیں ہے اندھی

مسئلہ ہند کی آزادی کا — آخری مرحلہ پہ جب آیا

لیگ کہنے لگی گھبراؤ نہیں — میں بھی اٹکاؤں گی اپنا روڑا

کیا ڈر ہے آپ شوق سے لیڈر بنا کریں — لکچر سنائیں ملک کے ٹکڑے کیا کریں

جس طرح چاہیں قوم کو دیتے رہیں فریب — آزادی کا مگر نہ کبھی تذکرہ کریں

گرے پڑتے ہو ناحق صاحب تاب و تواں ہو کر — نظر آنے لگے تم پیر، مرد نوجواں ہو کر

رفاقت چھوڑ دی اس نے جسے تم دست کہتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

کہاں اب ہم میں جرأت جو مظالم ان کے دہرائیں — ہمیں کاٹا ہے جب سے سانپ نے رسی سے ڈرتے ہیں

وہ کہتے ہیں نہیں پورا ہوا تو آپ کی قسمت — ہمیں عدے سے کب انکار ہے ہم کب مکرتے تھے



مرے سجدوں سے حسنِ آستاں کچھ اور بڑھ جاتا

افقر موہانی

مکاں سے میں جو سوئے لامکاں کچھ اور بڑھ جاتا
خیالِ سجدۂ بے آستاں کچھ اور بڑھ جاتا

بہار آتے ہی جورِ باغباں کچھ اور بڑھ جاتا
یوں ہی وقتِ بنائے آشیاں کچھ اور بڑھ جاتا

اگر منزل سے آگے کارواں کچھ اور بڑھ جاتا
نشانِ نقشِ پائے رفتگاں کچھ اور بڑھ جاتا

جو مے نوشی کا مے خانے میں اذنِ عام ہو جاتا
وقارِ مے کدہ پیرِ مغاں کچھ اور بڑھ جاتا

یہ منظر دیکھنے والا تھا اپنی نارسائی کا
کہ ہم کو دیکھتے ہی کارواں کچھ اور بڑھ جاتا

ابھی دورِ صبوحی چل رہا ہے بزمِ رنداں میں
زہے قسمت اگر وقتِ اذاں کچھ اور بڑھ جاتا

جو ہم جاتے جبیں پر اُن کی خاکِ آستاں مل کر
فروغِ محفلِ روحانیاں کچھ اور بڑھ جاتا

مرے بختِ سیہ کی گردشیں جس وقت تھم جاتیں
تو پھر دورِ زمین و آسماں کچھ اور بڑھ جاتا

فرشتے بھی طوافِ مے کدہ کرنے جب آ جاتے
ہجومِ حلقۂ پیرِ مغاں کچھ اور بڑھ جاتا

جلا دیتی جو ہم راہِ نشیمن مجھ کو بھی بجلی
تماشائے بہارِ گلستاں کچھ اور بڑھ جاتا

جنابِ شیخ اگر آ کر نہ سدِّ راہ ہو جاتے
حرم سے میں سوئے دیرِ بُتاں کچھ اور بڑھ جاتا

مٹا ڈالا اسی ضد نے تو گلشن کی بہاروں کو
کہ وقتِ فصلِ گل دورِ خزاں کچھ اور بڑھ جاتا

اسی سے تو سنا غیروں سے اُس نے میرا افسانہ
مرے کہنے سے طولِ داستاں کچھ اور بڑھ جاتا

وہ جیسے سامنے بیٹھے ہیں، میں ہوں محوِ نظارہ
الٰہی یہ مرا خوابِ گراں کچھ اور بڑھ جاتا

بہت نزدیک ہو جاتیں یقیں کی منزلیں پھر تو
جو سوئے دیر اُن کا آستاں کچھ اور بڑھ جاتا

سہارا لے کے شاخِ آشیاں کا برق اگر گرتی
مرے جلتے نشیمن کا دھواں کچھ اور بڑھ جاتا

مجھے مرنے نہ دے گی لذتِ دردِ نہاں افقرؔ
یہی ہے آرزو دردِ نہاں کچھ اور بڑھ جاتا

مُردہ کھی

سودیش دیپک

ڈاکٹر مس کے۔ مہرہ کے سامنے مریضوں کی کافی لمبی قطار لگی تھی اور میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہمارے شہر کے اسپتال میں نئی نئی آئی تھیں۔ ڈاکٹروں سے مجھے ہمیشہ سے وحشت رہی ہے، جب چاہیں چیر پھاڑ کر دیں۔ ذرا سی کھانسی کے لئے ماں کئی دنوں سے ڈانٹ رہی تھیں۔ اسی لیے مجبوراً دکھانے کے لیے آنا پڑا۔

ڈاکٹر کے۔ مہرہ کی پشت کی طرف والی دیوار پر ایک کیلنڈر لگا ہوا ہے۔ جس میں یونانی طرز کے کپڑے پہنے کوئی ڈاکٹر ایک بچہ پر جھکا ہوا ہے۔ کیلنڈر پر ایک دوا کا اشتہار ہے۔ بہت کوشش کرنے پر بھی اُس دوا کا ٹیڑھا نام نہیں پڑھ سکا۔ پھر تاریخیں پڑھنے لگا اور سال بھر کی چھٹیوں کی فہرست تک پڑھ ڈالی۔

اب کیا کیا جائے؟

ابھی تو لائن میں اور کئی مریض لگے ہیں۔ اچھا! "کے" سے کیا نام ہوگا؟ کُنتا، کملا یا کلاونتی؟ یہ کوئی نام اچھا نہیں۔ ڈاکٹر مہرہ پر تیسری بار نگاہ ڈالی — ہونہہ! یہ بے چاری کیا خاک علاج کرتی ہوگی۔ پاکٹ ایڈیشن۔ اسے تو خود اپنے علاج کی ضرورت ہے۔

خدا خدا کر کے میری باری آئی۔ میں ان کے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"جی!" انھوں نے پوچھا۔

"جی! مجھے تھوڑی بہت کھانسی کی شکایت ہے۔ کبھی کبھی حرارت بھی محسوس ہوتی ہے۔ میری ماں کا خیال ہے کہ مجھے آپ سے کنسلٹ کرنا چاہیے۔"

انھوں نے اسٹیتھسکوپ اٹھا کر میری پیٹھ اور چھاتی کا معائنہ شروع کر دیا۔ واقعی پکّی ڈاکٹر ہیں۔ میری بات پر مسکرائیں تک نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بولیں "اسکریننگ کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گی۔"

ایکسرے روم سے واپس لوٹ کر انھوں نے بتایا "ویسے سب ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو کچھ پری کاشن لینا چاہیے۔" پھر میری زردی مائل انگلیوں کی طرف دیکھ کر کہا — "آپ اسموکنگ زیادہ کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ پینے والی سب چیزیں بہت پی لیتا ہوں۔ ویسے اگر 'پری کاشن' نہ لوں تو کب تک کام چل سکے گا؟"

"آپ سے کہا نا کہ کوئی خاص بات نہیں لیکن دو تین سال کے بعد تکلیف بڑھ سکتی ہے۔"

"تھینک یو ڈاکٹر! پھر دو تین سال کے بعد ہی آکر آپ کو تکلیف دوں گا۔"

ڈاکٹر "کے" مہرہ نے اب پہلی بار میری طرف دھیان سے دیکھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ محسوس کی۔

"ڈاکٹر کے پاس جو بھی آتا ہے، گھبرایا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کو ڈر نہیں محسوس ہوتا؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا — "جی نہیں۔ اتنا کمزور ہوتے ہوئے بھی جب آپ کو ڈر نہیں لگتا تو میں کیوں ڈرنے لگا۔"

ان کے چہرے پر ہنسی پھیل گئی۔

"آپ کی تعریف؟"

"کے جینتی۔"

پہلے وہ بُری طرح چونک گئیں۔ پھر کھل کر ہنس پڑی تھیں۔

اس کے بعد گاہے ماہے اُن سے ملاقات ہو جایا کرتی۔ ایک دن انھوں نے کہا۔ "سرکلر آیا ہے کہ سب سرکاری ملازموں کو ہندی سیکھنی پڑے گی۔ ہو سکے تو آپ پڑھا دیا کریں۔"

اب روزانہ ڈاکٹر مہرہ کی کوٹھی پر جانا پڑتا۔ پڑھائی کم ہوتی، کافی زیادہ پی جاتی۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک گونہ مسرت ہوئی کہ مہرہ کا کمرہ میرے کمرے سے بھی زیادہ بے ترتیب رہتا۔ کرسیاں، کتابوں اور رسالوں سے بھری رہتیں۔ پہلے کچھ دن تو وہ میرے بیٹھنے کے لائق جگہ بنا دیا کرتی تھیں۔ پھر یہ کام بھی مجھے خود ہی کرنا پڑتا۔ کئی بار پڑھتے ہوئے یا کافی پیتے ہوئے انھیں اٹھ کر اسپتال جانا پڑتا۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا کہ ڈاکٹروں کی زندگی مزے کی ہوتی ہے۔

اس دن شام کو پہنچا تو نوکرانی نے بتایا۔ "ڈاکٹر صاحب کی طبیعت خراب ہے۔"

انھوں نے میری آواز پہچان کر مجھے اپنے سونے کے کمرے میں ہی بلا لیا۔ دیکھا، بستر پر پڑے سے تکیئے کے سہارے ادھ لیٹی سی پڑی ہیں۔ کمرے کی دیواروں پر کہیں کچھ نہیں۔ نہ کیلنڈر نہ کوئی تصویر۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ کمرہ ننگا ننگا سا ہے۔ ان کے چہرے پر سستی سی طاری تھی۔

"کیوں! طبیعت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ مسکرائیں۔ پھر بستر اور کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر آہستہ سے کہا۔ "سچ، بالکل مریضوں والا کمرہ ہی ہے۔"

میں چپ ہی رہا۔ پھر انھوں نے ہی خاموشی توڑی۔ "اچھا جینتی! ایک بات پوچھوں۔ یہ تم اپنی جانب سے اتنے لاپرواہ کیسے رہ لیتے ہو؟"

مجھ سے جب بھی کوئی اس طرح کا سوال کرتا ہے تو گھبرا جاتا ہوں۔ سگرٹ جلا کر سوال ٹالنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔ لیکن مہرہ ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ جواب لیے بغیر ٹلنے کی نہیں۔

"نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھا اگر پرواہ کی بھی جائے تو کیا فرق پڑ جائے گا؟"

مہرہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"سر میں درد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر ایک طویل خاموشی۔

اس خاموشی کے دوران میں بے سر پیر کی باتیں سوچنے لگا۔ ولایت جا کر مہرہ نے اپنی تعلیم پوری کی ہے۔ عمر بھی تیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس معمولی سے شہر میں کیوں اپنے ٹیلنٹ کا خون کر رہی ہے۔ کیوں اپنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اور کیوں.... کیوں؟

پھر مجھے اپنی اس بُری عادت پر غصہ آنے لگا۔ یہ قیاس آرائیوں کی عادت بھی بھلا کیا ہوئی۔ اور خود اپنی سرزنش کرتے ہوئے میں اٹھا اور نوکرانی سے کافی بنوا کر لے آیا۔

"سچ، تمھیں کافی تکلیف دیتی ہوں۔"

"نہیں تو۔ آپ تو کافی دیتی ہیں۔" مہرہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میری نگاہ پلنگ کے پاس رکھے ہوئے چھوٹے سے ٹیبل پر پڑی۔ ایک تصویر اس پر پڑی تھی۔ کھلے کالر کی قمیص پہنے ایک نوجوان مسکرائے جا رہا تھا۔ جانے کون ہوگا؟

پھر وہی قیاس آرائی! اور میں نے سر جھٹک دیا۔

"ڈاکٹر مہرہ! کبھی مُردہ گھر تو دکھائیے جہاں آپ پوسٹ مارٹم کرتی ہیں۔ میں نے کبھی مرا ہوا آدمی نہیں دیکھا۔"

"ہونا جھکی۔" وہاں کیا دیکھنا؟ بدبو سے سر نہ پھٹ جائے گا۔" پھر ذرا رک کر کہا۔ "اچھا، کوئی کیس آنے دو۔"

اور اُسی وقت وارڈ اردلی نے آکر بتایا کہ کوئی کیس آیا ہے۔ وہ کپڑے بدل کر آ گئیں۔ میں بھی اسپتال تک ساتھ گیا۔

برساتی میں سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ بولیں۔ "یہ ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب کیا رٹتے رہتے ہو؟ مہرہ ہی کہہ لینے سے کام نہیں چلتا کیا؟"

رات کو اُس تصویر والے نوجوان کی صورت آنکھوں کے آگے پھرتی رہی جو لگاتار مسکرائے جا رہا تھا۔

پھر شہر میں زوروں سے فلو پھیل گیا۔ صبح سات بجے سے گئی رات تک وہ مریضوں کو دیکھتی رہتی۔ کئی دن تک میں اُس سے مل نہ سکا۔ ایک شام کو اسپتال ہی چلا گیا۔ آخری مریض کو دیکھ کر وہ اُٹھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے جسم کا ہر حصہ جُڑ سا گیا ہے۔

گھر پہنچ کر وہ اسی مریض سے نظر آنے والے کمرے میں آ لیٹی۔

"آپ اتنا کام کرتی ہیں۔ صبح سے شاید کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس طرح بیمار نہ پڑ جائیں گی؟"

مہرہ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "کوئی اور بات کرو۔"

میں نے اٹھ کر سامنے والی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کے قریب کھڑے پیڑ کے پتے ہوا کے جھونکوں سے آہستہ آہستہ نیچے گر رہے تھے۔ اور بجلیاں ایسا محسوس ہوا کہ دھیرے دھیرے کانپ رہی ہیں۔ بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا خراماں خراماں فلک کی سڑک پر ٹہل رہا تھا۔

میں نے باہر سے نظر ہٹا کر سگریٹ سلگائی۔ مہرہ نے آہستہ سے میرا کندھا چھوا۔ اُدھر مُڑ کر دیکھا۔ چھوٹی سی میز کے قریب دو کرسیاں رکھی تھیں اور میز پر اسکاچ کی بوتل۔

میں نے بوتل سے کاگ الگ کیا اور دو پیگ بنا ڈالے۔ میرے کچھ نہ بولنے پر اس نے صفائی پیش کرنا شاید ضروری سمجھا اور رودیے ہوے لہجہ میں بولی۔ "بہت تھک جاتی ہوں تو استعمال کر لیتی ہوں۔ تمھیں عجیب تو لگ رہا ہوگا؟"

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ میں کچھ اداس سا ہو گیا۔ یہ لڑکی ــ وہ مجھے شروع سے ہی لڑکی ہی نظر آتی رہی ہے ــ کیوں اپنے کو مارے ڈال رہی ہے؟ دوسرے ڈاکٹر آخر کتنا کام کرتے ہیں؟

"لاؤ تمھیں کچھ ریکارڈ سنواؤں۔ انگلینڈ سے ساتھ لائی تھی۔"

سنگیت کبھی اپنے پلے نہیں پڑا۔ لیکن شاید ماحول ایسا تھا یا میرے من کے کسی کونے میں دفن چند حسین لمحے اٹھ کر جھانکنے لگے ــ کوئی تھکی تھکی، بسمل سی دُھن شروع ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے کندھے پر منہ ٹکائے گا رہا ہے اور سانسوں کا ملسا در مہک میرے جسم میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ لَے اونچی اٹھتی اور ٹوٹ جانے کی حد سے پہلے ہی دھیمی ہو جاتی۔ تھکی تھکی سی۔

ریکارڈ ختم ہوا کہ ایک طلسم ٹوٹ گیا۔

کھڑکی کے راستے پت جھڑ کی غمگین ٹھنڈی ہوا برابر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

مہرہ اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔

"کھڑکی بند کر دوں۔ ہوا تیز ہو رہی ہے۔" میں نے مہرہ سے پوچھا۔

"کر دو۔ تم اور لونا! کہتے تھے پینے والی چیزوں سے تھکتا نہیں۔"

بہت پہلے شراب اور جذبات کو میں اپنے سے الگ کر چکا تھا۔ مگر اس وقت انکار ممکن نہ ہو سکا۔ بس آدھا گلاس بھر ہی تو لیا۔

"اچھا بتاؤ۔" مہرہ نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا۔ "آدمی جینا کیوں چھوڑ دیتا ہے۔ بس ایک مشین کی طرح چلتا رہتا ہے۔"

میں کیا جواب دیتا؟ ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"کیا بات ہے؟ آج چپ چپ ہو۔"

کے۔ مہرہ کا ایک ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹک آیا تھا۔ میں نے پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے کہا "آپ نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ اتنے بے پروا کیوں ہو؟ آپ سے وہی سوال پوچھوں تو؟"

کے۔ مہرہ نے بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے کے نقوش کچھ ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔ نچلا ہونٹ بھی ذرا کانپا۔ لیکن اگلے ہی پل اس چہرے پر ڈاکٹر کے۔ مہرہ کا چہرہ حاوی ہو گیا۔

"اب آپ جائیے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

اور انھوں نے کروٹ بدل لی۔

میں ان کی کوٹھی سے نکل کر گھر کے بجائے بار میں جا بیٹھا۔ تیسرے پیگ پر پہنچ کر سوچنے لگا۔ میں کس لیے بار بار ڈاکٹر مہرہ کی کوٹھی پر پہنچ جاتا ہوں۔ پہلے ہی کیا کم چرکے کھائے ہیں جو پھر...... بے وقوف کہیں کا۔

اُسی دن سے میں نے وہاں جانا قطعی بند کر دیا۔ لیکن وہ بیمار سا کمرہ، تھکی تھکی اور بیمار سی ڈاکٹر کے۔ مہرہ کی یاد کو دل سے نہیں کھرچ پایا۔

اور عمر بھی شاید بیت چکی تھی کہ کوئی ارادہ کرکے پھر پھسل جاؤں۔

سڑک کے کنارے ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔ رکشا میرے بدن سے چھو کر رکی ۔۔ کے۔ مہرہ تھی۔ ساتھ بیٹھ گیا۔

"اچھا تو تم اس دن کی بات سے ناراض ہو۔ میں بیوقوف جو ٹھہری۔ سمجھتی نہیں کہ لوگ اتنی جلدی بُرا مان جاتے ہیں۔"

اُس کا جھکا کندھا میرے کندھے کو چھو رہا تھا۔ جی میں آیا اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اُس کا یہ جھکا کندھا سدھا کر دوں۔

رکشا اسٹیشن پر آ رکا۔

"ایک سہیلی دہلی جا رہی ہے۔ سوچا دو چار منٹ کی ملاقات ہی سہی۔" کے۔ مہرہ نے بتایا۔

میں چائے کے اسٹال پر ٹھہر گیا۔ گاڑی پہنچنے کی آواز آنے لگی۔

"آپ سہیلی سے مل لیجئے۔ میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔" اور میں وہیں کھڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔

گاڑی پلیٹ فارم پر آلگی۔ اسے اتفاق ہی کہئے کہ سامنے والے ڈبے سے ایک عورت نے رومال ہلایا۔ کے۔ مہرہ دروازے کے پاس پہنچ کر ٹھہر گئی۔ ٹھیک اُسی وقت میری نگاہ اُس عورت کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد پر پڑی۔

پھر گاڑی چل پڑی۔ ڈاکٹر مہرہ واپس آکر تھوڑی دیر چپ رہی اور بولی ۔۔ "کیا اچھا ہو آدمی ہمیشہ گاڑی پر ہی سوار رہے۔"

میں اب بھی چپ ہی رہا۔

ہم پیدل ہی چل پڑے۔ اسپتال والی سڑک خالی تھی۔ دونوں طرف گل مہر کے پیڑ۔ درختوں پر کھلے پھول، جیسے اُن پر آگ لگی ہو۔ دل میں آیا، کے۔ مہرہ کے کندھوں کو جھٹک کر اُس کا مُنہ اپنی طرف موڑ کر پوچھوں ۔۔ "تمھیں کیا ہو رہا ہے؟ یہ تمھارے اندر کی کون سی کے۔ مہرہ ہے جو اس باہر کی کے۔ مہرہ کو جینے نہیں دے رہی ہے؟"

لیکن میں ہمیشہ سے بزدل ہوں۔ اتنا کچھ سوچتا رہتا ہوں لیکن کہہ کچھ بھی نہیں پاتا۔

پھر گاڑی میں اُس عورت کے ساتھ بیٹھے مرد کا چہرہ یاد آنے لگا۔ شاید کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں، نہیں یہ میرا واہمہ ہی ہے۔

کمرے میں پہنچے ہی تھے کہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے وارڈ اردلی آگیا۔

"کیا ہے؟" ڈاکٹر مہرہ کے لہجہ میں ایک اجنبی سی سختی تھی۔

"جی! ایک آدمی کا ہاتھ کچل گیا ہے۔ اسے چار میل دور گاؤں سے لائے ہیں۔" وارڈ اردلی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اتنی دور سے جب یہاں پہنچ گیا تو کیا اب مر جائے گا؟ جاؤ نرس سے کہو انجکشن لگا کر پٹی باندھ دے۔"

بے چارہ اردلی حیران سا اُن کا چہرہ تکنے لگا۔

"ناؤ۔ گیٹ آؤٹ۔ چلے جاؤ۔"

یہ وہی مہرہ ہے جو مریضوں کی وجہ سے کھانا تک چھوڑ دیا کرتی تھی!

"کیوں مہرہ! تمھاری اُس سہیلی کے ساتھ جو مرد بیٹھا تھا شاید اُسے کہیں دیکھا ہے۔"

کے۔ مہرہ اُٹھی۔ اس مریض لگنے والے کمرے میں گئی اور اُس لگاتار مسکراتے ہوئے نوجوان کا فوٹو لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"ارے! یہی آدمی تو اُس گاڑی میں......"

اور ڈاکٹر مہرہ نے بتایا "میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ میں انگلینڈ میں ہی تھی کہ اُس کی شادی ہو گئی۔ میں شرکت بھی نہ کر سکی تھی۔" پھر کچھ دیر رک کر بولی ۔۔ "میں بھی ایک ہی بیوقوف ہوں۔ بھلا یہ فوٹو کس لیے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے میں نے؟"

اس نے فریم کھول کر فوٹو باہر نکال لیا۔ میں نے دیکھا اُس ہلکی سی تصویر کے بوجھ سے اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ پھر ایک دم سارا زور ڈال کر فوٹو کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اور پھر ٹکڑوں کے ٹکڑے۔ جھٹ کر کھڑکی کھولی اور ٹکڑے باہر پھینک دیے۔ پھر دھڑاک سے کھڑکی بند کر دی کتنی دیر تک اس کی سانس پھولتی رہی۔

اس نے الماری کھول کر بوتل نکالی۔ دونوں گلاس لبالب بھرے ایک بار میں آدھا گلاس ختم کرکے اس نے دوسرا گلاس میری طرف بڑھایا۔

میں نے دونوں گلاس اور بوتل اُٹھا کر باہر پھینک دیے۔

کے۔ مہرہ حیران نظروں سے میری جانب تکنے لگی

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

پھر شہر میں زوروں سے فلو پھیل گیا۔ صبح سات بجے سے گئی رات تک وہ مریضوں کو دیکھتی رہتی۔ کئی دن تک میں اُس سے مل نہ سکا۔ ایک شام کو اسپتال ہی چلا گیا۔ آخری مریض کو دیکھ کر وہ اُٹھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے جسم کا ہر حصہ جُڑ سا گیا ہے۔

گھر پہنچ کر وہ اسی مریض سے نظر آنے والے کمرے میں آ لیٹی۔

"آپ اتنا کام کرتی ہیں۔ صبح سے شاید کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس طرح بیمار نہ پڑ جائیں گی؟"

مہرہ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "کوئی اور بات کرو۔"

میں نے اٹھ کر سامنے والی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کے قریب کھڑے پیڑ کے پتّے ہوا کے جھونکوں سے آہستہ آہستہ نیچے گر رہے تھے۔ اور بتیاں، ایسا محسوس ہوا کہ دھیرے دھیرے کانپ رہی ہیں۔ بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا خراماں خراماں فلک کی سڑک پہ ٹہل رہا تھا۔

میں نے باہر سے نظر ہٹا کر سگرٹ سلگائی۔ مہرہ نے آہستہ سے میرا کندھا چھوا۔ اُدھر مڑ کر دیکھا۔ چھوٹی سی میز کے قریب دو کرسیاں رکھی تھیں اور میز پر اسکارچ کی بوتل۔

میں نے بوتل سے کاگ الگ کیا اور دو پیگ بنا ڈالے۔ میرے کچھ نہ بولنے پر اس نے صفائی پیش کرنا شاید ضروری سمجھا اور ذرا دبے ہوئے لہجہ میں بولی "بہت تھک جاتی ہوں تو استعمال کر لیتی ہوں۔ تمھیں عجیب تو لگ رہا ہوگا؟"

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ میں کچھ اداس سا ہو گیا۔ یہ لڑکی — وہ مجھے شروع سے ہی لڑکی ہی نظر آتی رہی ہے — کیوں اپنے کو مارے ڈال رہی ہے؟ دوسرے ڈاکٹر آخر کتنا کام کرتے ہیں؟

"لاؤ تمھیں کچھ ریکارڈ سنواؤں۔ انگلینڈ سے ساتھ لائی تھی۔"

سنگیت کبھی اپنے پلّے نہیں پڑا۔ لیکن شاید ماحول ایسا تھا یا میرے من کے کسی کونے میں دفن چند حسین لمحے اٹھ کر جھانکنے لگے — کوئی تھکی تھکی، بسمل سی دھن شروع ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے کندھے پر منہ ٹکائے گا رہا ہے اور سانسوں کا لمس اور مہک میرے جسم میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ لے اونچی اٹھتی اور ٹوٹ جانے کی حد سے پہلے ہی دھیمی ہو جاتی۔ تھکی تھکی سی۔

ریکارڈ ختم ہوا کہ ایک طلسم ٹوٹ گیا۔

کھڑکی کے راستے پت جھڑ کی غمگین ٹھنڈی ہوا برابر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

مہرہ اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔

"کھڑکی بند کر دوں۔ ہوا تیز ہو رہی ہے۔" میں نے مہرہ سے پوچھا۔

"کر دو۔ تم اور لو نا! کہتے تھے پینے والی چیزوں سے تھکتا نہیں۔"

بہت پہلے شراب اور جذبات کو میں اپنے سے الگ کر چکا تھا۔ مگر اس وقت انکار ممکن نہ ہو سکا۔ بس آدھا گلاس بھر ہی تو لیا۔

"اچھا بتاؤ۔" مہرہ نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا "آدمی جینا کیوں چھوڑ دیتا ہے۔ بس ایک مشین کی طرح چلتا رہتا ہے۔"

میں کیا جواب دیتا؟ ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"کیا بات ہے؟ آج چپ چپ ہو۔"

کہے۔ مہرہ کا ایک ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹک آیا تھا۔ میں نے پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے کہا "آپ نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ اتنے بے پروا کیوں ہو؟ آپ سے وہی سوال پوچھوں تو؟"

کہے۔ مہرہ نے بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے کے نقوش کچھ ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔ نچلا ہونٹ بھی ذرا کانپا۔ لیکن اگلے ہی پل اس چہرے پر ڈاکٹر کہے۔ مہرہ کا چہرہ حاوی ہو گیا۔

"اب آپ جائیے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

اور انھوں نے کروٹ بدل لی۔

میں ان کی کوٹھی سے نکل کر گھر کے بجائے بار میں جا بیٹھا۔ تیسرے پیگ پر پہنچ کر سوچنے لگا۔ میں کس لیے بار بار ڈاکٹر مہرہ کی کوٹھی پر پہنچ جاتا ہوں۔ پہلے ہی کیا کم چرکے کھائے ہیں جو پھر.............. بے وقوف کہیں کا۔

اُسی دن سے میں نے وہاں جانا قطعی بند کر دیا۔ لیکن وہ بیمار سا کمرہ، تھکی تھکی اور بیمار سی ڈاکٹر کہے۔ مہرہ کی یاد کو دل سے نہیں کھرچ پایا۔

اور میری عمر بھی شاید بیت چکی تھی کہ کوئی ارادہ کر کے پھر پھسل جاؤں۔

سڑک کے کنارے ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔ رکشا میرے بدن سے چھو کر رکی۔۔ کے۔ مہرہ تھی۔ ساتھ بیٹھ گیا۔

"اچھا تو تم اس دن کی بات سے ناراض ہو۔ میں بیوقوف جو ٹھہری۔ سمجھتی نہیں کہ لوگ اتنی جلدی بُرا مان جاتے ہیں۔"

اُس کا جھکا جھکا کندھا میرے کندھے کو چھو رہا تھا۔ جی میں آیا اُس کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر اُس کا یہ جھکا کندھا سیدھا کر دوں۔

رکشا اسٹیشن پہ آ رکا۔

"ایک سہیلی دہلی جا رہی ہے۔ سوچا دو چار منٹ کی ملاقات ہی سہی۔" کے۔ مہرہ نے بتایا۔

میں چائے کے اسٹال پہ ٹھہر گیا۔ گاڑی پہنچنے کی آواز آنے لگی۔

"آپ سہیلی سے مل لیجئے۔ میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔" اور میں وہیں کھڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔

گاڑی پلیٹ فارم پہ آ لگی۔ اسے اتفاق ہی کہیئے کہ سامنے والے ڈبے سے ایک عورت نے رومال ہلایا۔ کے۔ مہرہ دروازے کے پاس پہنچ کر ٹھہر گئی۔ ٹھیک اُسی وقت میری نگاہ اُس عورت کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد پہ پڑی۔

پھر گاڑی چل پڑی۔ ڈاکٹر مہرہ واپس آ کر تھوڑی دیر چپ رہی اور بولی ۔۔ "کیا اچھا ہو آدمی ہمیشہ گاڑی پہ ہی سوار رہے۔"

میں اب بھی چپ ہی رہا۔

ہم پیدل ہی چل پڑے۔ اسپتال والی سڑک خالی تھی۔ دونوں طرف گل مہر کے پیڑ۔ درختوں پہ کھلے پھول، جیسے اُن پہ آگ لگی ہو۔ دل میں آیا۔ کے۔ مہرہ کے کندھوں کو جھٹک کر اُس کا مُنہ اپنی طرف موڑ کر پوچھوں ۔۔ "تمھیں کیا ہوا ہے؟ یہ تمھارے اندر کی کون سی کے۔ مہرہ ہے جو اس باہر کی کے۔ مہرہ کو جینے نہیں دے رہی ہے؟"

لیکن میں ہمیشہ سے بزدل ہوں۔ اتنا کچھ سوچتا رہتا ہوں لیکن کہہ کچھ بھی نہیں پاتا۔

پھر گاڑی میں اُس عورت کے ساتھ بیٹھے مرد کا چہرہ یاد آنے لگا۔ شاید کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں، ہونہہ، یہ میرا واہمہ ہی ہے۔

کمرے میں پہنچے ہی تھے کہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے وارڈ بوائے آ گیا۔

"کیا ہے؟" ڈاکٹر مہرہ کے لہجے میں ایک اجنبی سی سختی تھی۔

"جی! ایک آدمی کا ہاتھ کچلا گیا ہے۔ اسے چار میل دور گاؤں سے لائے ہیں۔" وارڈ بوائے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اتنی دور سے جب یہاں پہنچ گیا تو کیا اب مر جائے گا؟ جاؤ نرس سے کہو انجکشن لگا کر پٹی باندھ دے۔"

بے چارہ وارڈ بوائے حیران سا اُن کا چہرہ تکنے لگا۔

"ناؤ۔ گیٹ آؤٹ۔ چلے جاؤ۔"

یہ وہی مہرہ ہے جو مریضوں کی وجہ سے کھانا تک چھوڑ دیا کرتی تھی!

"کیوں مہرہ! تمھاری اُس سہیلی کے ساتھ جو مرد بیٹھا تھا شاید اُسے کہیں دیکھا ہے۔"

کے۔ مہرہ اُٹھی۔ اس مریض لگنے والے کمرے میں گئی اور اُس لگاتار مسکراتے ہوئے نوجوان کا فوٹو لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"ارے! یہی آدمی تو اُس گاڑی میں......"

اور ڈاکٹر مہرہ نے بتایا ۔۔ "میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ میں انگلینڈ میں ہی تھی کہ اُس کی شادی ہو گئی۔ میں شرکت بھی نہ کر سکی تھی۔" پھر کچھ دیر رک کر بولی ۔۔ "میں بھی ایک ہی بیوقوف ہوں۔ بھلا یہ فوٹو کس لیے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے میں نے؟"

اس نے فریم کھول کر فوٹو باہر نکال لیا۔ میں نے دیکھا اُس ہلکی سی تصویر کے بوجھ سے اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ پھر ایک دم سارا زور ڈال کر فوٹو کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اور پھر ٹکڑوں کے ٹکڑے۔ جھپٹ کر کھڑکی کھولی اور ٹکڑے باہر پھینک دیے۔ پھر دھڑاک سے کھڑکی بند کر دی کتنی دیر تک اس کی سانس پھولتی رہی۔

اس نے الماری کھول کر بوتل نکالی۔ دونوں گلاس لبالب بھرے ایک بار میں آدھا گلاس ختم کر کے اس نے دوسرا گلاس میری طرف بڑھایا۔

میں نے دونوں گلاس اور بوتل اُٹھا کر باہر پھینک دیے۔ کے۔ مہرہ حیران نظروں سے میری جانب تکنے لگی

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

پریشانیٔ زلفِ جاناں۔ یہ سارے جلوہ ہائے حیات اپنے اندر نشاط کا پہلو بھی رکھتے ہیں اور غم کا بھی۔ میرؔ کی طبیعت میں صرف غم انجامی اور یاس و حسرت نہیں۔ وہ نشاطِ حسن و محبت سے لطف بھی لیتے ہیں اور فنا ہو جانے والے جلوؤں کو اور زیادہ ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں نظاروں سے بھیک مانگتی ہیں تاکہ وہ حسنِ گریزاں کو دل کے خلوت خانوں میں چھپا رکھیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ دل دیر تک نہیں دھڑکنے والا ہے اور بیماریٔ محبت آخر اس کا کام تمام کرنے والی ہے۔ مگر وہ محبت اور زندگی کو فانی کی طرح دیوانہ کا خواب نہیں سمجھتے نہ غالبؔ کی طرح قطرۂ شبنم کی اس حسین لرزش کو دیکھ کر سرمست ہو جاتے ہیں جو نوکِ خار پر لرز رہا ہو اور تجلیٔ خورشید کا منتظر ہو۔ آفتاب کی کرن چمکی اور قطرہ فنا ہوا۔ مگر فنا کا ماتم کرنے سے بہتر ہے کہ ہم لمحاتی حسن و محبت کی نشاط افروزی پر وجد کریں۔ صرف مسرت میں ڈوب جانا حیات کا ایک سطحی مطالعہ ہے۔ حسن کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ سمجھیں کہ ہر چیز فنا انجام ہے۔ میرؔ کی یاس و حسرت، اس کا دردو گداز، اس کا فقیرانہ لب و لہجہ ہمارے اندر گدازِ دل بھی پیدا کرتا ہے اور عمقِ شعورِ حیات بھی۔ زندگی نیرنگ ساماں حقیقت ہے، ایک قوسِ قزح ہے، برسات کی ایک سنہری سرمئی شام۔ لیکن دھنک کی رنگینیاں بہت جلد ختم ہو جاتی ہیں اور شام پر ظلمتِ شب کی یلغار ہوتی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں ہمیں زندگی کی ہزار سطحیں نظر آنے لگتی ہیں اور ہم اُن کی شاعری کے مطالعہ سے گہرا جذباتی سرور اور تسکین حاصل کرتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری یاس و حسرت نشاط کی شاعری بھی ہے۔ وہ مریضانہ طور پر صرف رونے اور بسورنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ مریضانہ یاس انگیزی ہمیں بڑی حد تک فانیؔ بدایونی کے یہاں ملتی ہے۔ وہ تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ "بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے"؛ میرؔ اس کے برخلاف بہار کے حسن کو ایک پس منظر دیتے ہیں اور یہ پس منظر یقیناً فنا کا پس منظر ہے۔ لیکن فنا کا احساس تلخ بہار کی لذتوں سے انھیں کنارہ کش ہونے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ اسے اور پیار کرنے پر اکساتا ہے۔

شاعری میں ہمیں نزاکتِ احساس اور نزاکتِ تجربہ و پیش کش کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔ میرؔ نازک خیال اور نازک ادا بھی ہیں۔ ان کے لب و لہجہ اور اسلوب کی نزاکت ان کے تشبیہات و استعارات کی نزاکت ان کے احساس و خیال کی نزاکت، ان کی شخصیت اور مزاج کی نزاکت کی پروردہ ہے۔ میرؔ کی شاعری میں انفرادیت ہے اور یہ ان کے اکثر کامیاب اشعار میں کسی نہ کسی طرح جلوہ گر ہے۔ میرؔ صاحب کو زندگی کی شیشگی کا احساس تھا۔ کہتے ہیں۔ ؎

میر صاحب زمانہ نازک ہے ۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

پھر فرماتے ہیں۔ ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

غور فرمائیے میرؔ صاحب زندگی کے متعلق محض یاس انگیز ردِ عمل تو پیش نہیں کرتے۔ انھیں اس کی نزاکت اور شیشگی کا احساس ہے اور وہ کیسی نازک بات کہتے ہیں کہ کہیں شیشۂ حیات میں بال نہ پڑے۔ لہٰذا سانس بھی آہستہ لینی چاہیئے۔ لطافت، نفاست اور نزاکت کا کتنا اچھا بیان ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

لیکن میرؔ آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری سے فرار اور گریز کے قائل نہیں۔ وہ زندگی کو برتنے کی تعلیم دیتے ہیں، احتیاط سے، نرمی سے۔ یہ تو نہیں کہتے کہ ہم آغوشِ تمنا مت ہو۔ وہ ترکِ تمنا کی تعلیم نہیں دیتے لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ تمنا اور قرب کی لذتوں کو مستقل حیثیت مت دو۔ کیونکہ یہ چیزیں بہرحال زندگیٔ گریزاں کا ایک جزو ہیں اور تمنا کی کلی شگفتہ ہو کر مرجھا بھی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ میرؔ کی شاعری کے متعلق ہمیں زیادہ وسیع النظری اور فراخدلی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ تب ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کی شاعری میں زندگی کی وسعتوں کے مختلف تجربے موجود ہیں اور ان تجربوں کے متعلق میرؔ کا ردِ عمل بھی یک سطحی نہیں بلکہ تہہ دار ہے جس میں ہمیں نشاط و مسرت کے ساتھ ساتھ یاس و غم کی آمیزش ملتی ہے۔



بنجارہ

وصی سیتاپوری

میں جیون کی گٹھری لادے
بستی بستی، نگری نگری
جانے کب سے گھوم رہا ہوں
میں اک آوارہ بنجارہ
میرے پاس دھرا ہی کیا ہے
لیکن میرے دل کی جھولی
خالی کب ہے، اس میں یارو!
بیتے لمحوں کی یادیں ہیں
کچھ سہمی سہمی آہیں ہیں
ہنستے اور غمگیں آنسو ہیں
میرے ہونٹوں سے لپٹے ہیں
ماضی کے رنگین ترانے
اور کچھ گیت بہاروں کے
جن کو گاتا، جی بہلاتا
میں آگے بڑھتا جاتا ہوں
ڈر ہے تو بس اتنا ڈر ہے
جیون کی سنسان ڈگر پر
صحرا صحرا، جنگل جنگل
گھات میں بیٹھے چور لٹیرے
میری یہ آہیں نہ چرا لیں
ماضی کی یادیں نہ چرا لیں
چھین نہ لیں رنگین ترانے
لوٹ نہ لیں جیون کی گٹھری
جس کو اک مدت سے اٹھائے
اور اپنے سینے سے لگائے
میں اب تک ہر موڑ سے گزرا
جب اک بازو تھک جاتا ہے
جیون کی یہ بھاری گٹھری
دوسرے بازو پر لیتا ہوں
لیکن کب تک ایسا ہوگا
کب تک یوں ہی چلتا ہوں گا
آخر اک دن تھک جاؤں گا
اور جیون کی بھاری گٹھری
میرے ہاتھ سے گر جائے گی

غزل

سعید عارفی

کہیں میرِ بزمِ الم رہا، کہیں حادثات پہ چھا گیا
یہ تری نگاہ کا فیض ہے، جو میں کائنات پہ چھا گیا

وہ نہ آئے پھر بھی بھرا کیے، شبِ وعدہ میری نگاہ میں
یہ فریبِ ذوقِ نگاہ تھا جو تخیلات پہ چھا گیا

رہِ جستجو کے وہ پیچ و خم، جہاں خضر کی بھی نہ چل سکی
مرے عزمِ پختہ کی رہبری تھی کہ مشکلات پہ چھا گیا

نہ گلہ سیاہیِ بخت کا، نہ خیال گردشِ وقت کا
ترے ایک غم کے طفیل میں، غمِ کائنات پہ چھا گیا

نہ وہ رعب ہے، نہ وہ بے رخی، نہ جلال ہے، نہ وہ برہمی
یہ اثر ہے میرے خلوص کا جو میں التفات پہ چھا گیا

یہ مقامِ نقد و نظر نہیں جو سعید رشکِ چمن بنا
ترے ربطِ خاص کا تھا کرم جو تجلیات پہ چھا گیا

چند فقرا کے تجربات

جگر بریلوی

مرحومہ والد کے پاس اکثر درویش اور ولی اللہ آیا کرتے تھے کہ وہ خود بھی درویش تھے اور روشن ضمیر۔ ان میں سے پہلے بزرگ جن کی بابت مجھے کچھ یاد ہے بیا شاہ تھے۔ لانبا قد، سیاہ فام، لاغر جسم، ہڈیاں ابھری ہوئیں، کتابی چہرہ، کچیا داڑھی، کوئی ستر بہتر سال کا سن۔ ایک پاؤں میں لوہے کا کڑا پہنے رہتے تھے۔ ہر دم بڑبڑاتے تھے، کبھی آہستہ آہستہ جیسے کسی سے سرگوشیاں کر رہے ہیں، کبھی زور زور سے غصہ میں جیسے کسی سے لڑ رہے ہیں۔ چراغ جلنے کے بعد رات کو ان کا پھیرا ہوا کرتا تھا، مہینہ بیس دن بعد۔ والد اکثر ان کے کرشمے بیان کیا کرتے تھے۔ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے بیان کرتا ہوں۔ میری عمر اس وقت نو دس سال کی ہوگی جاڑے کا موسم تھا، سردی زوروں پر تھی۔ والد دیوان خانہ میں پلنگ پر لیٹے ہوئے حقے کے مزے لے رہے تھے۔ میں بھی اسی پلنگ پر لیٹا تھا۔ سامنے کے دروں پر روئی کے موٹے موٹے پردے پڑے تھے۔ اچانک ایک پردہ ہٹا اور بیا شاہ داخل ہو گئے۔ پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے اور بڑبڑانے لگے۔ والد سے کچھ باتیں بھی ہوتی جاتی تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹہ بیٹھے پھر اٹھ کر چل دیے۔ شاہ صاحب کا معمول تھا کہ آتے ہی ذرا زور سے کہا کرتے تھے "بے منگوائے گا" چنانچہ فوراً ایک نوکر بازار جاتا اور ان کے لیے پاؤ بھر شراب اور ایک پڑیا چرس کی لے آتا۔ شراب یہ وہیں پی لیتے، پڑیا جیب میں ڈال لیتے اور تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چل دیتے۔ آج انھوں نے "بے منگوائے گا" کی صدا نہیں لگائی۔ حسب معمول تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ والد نے بڑے بھائی صاحب سے کہ وہ بھی موجود تھے مخاطب ہو کر فرمایا "کچھ سمجھے آج انھوں نے 'بے منگوائے گا' کیوں نہیں کہا؟" انھوں نے کہا میں کچھ نہیں سمجھا۔ فرمایا کہ اس وقت کوئی نوکر موجود نہیں ہے۔ اس کا ان کو علم ہو گیا۔

دوبارہ ان کا پھیرا رات کے وقت پھر ہوا۔ پردے کے اندر داخل ہوتے ہی کہا "آج تو آپکے نوکر موجود ہیں۔ بے آج تو منگوائے گا؟" یہاں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ نوکر ایسی جگہ بیٹھتے تھے جو بالکل علیحدہ ایک طرف تھی۔ شاہ صاحب کی یا کسی باہر سے آنے والے کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ بیا شاہ سے کوئی اپنا دکھ درد کہتا تو فرماتے: "میں دعا کروں گا، اللہ فضل کرے گا۔" اور والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان کی دعائیں اثر تھا۔ اور دوسری ایک عورت تھی جو علی گڑھ کے کسی اچھے خاندان کی لڑکی بتائی جاتی تھی۔ میانہ قد، سیاہ فام، گول چہرہ بڑے بڑے گھنے الجھے الجھائے بال، کوئی پچاس پچپن سال کی عمر، بہت تندرست ہندو اسے چپاکلی اور مسلمان مستان شاہ کہتے تھے۔ بالکل برہنہ رہتی تھی۔ کوئی کپڑا اگر اس کے جسم میں ڈال دیا جاتا تو تھوڑی دیر بعد اتار کر پھینک دیتی یا تار تار کر ڈالتی۔ ہر دم خاموش رہتی، مگر آپے میں نہیں۔ لوگ اسے برہنہ شمشیر کہتے تھے۔ اس لیے کہ اس کے منہ سے اکثر و بیشتر بری بات نکلتی تھی اور بیٹ نہیں پڑتی تھی، یعنی تیر خالی نہیں جاتا تھا۔ اس سے بات کرتے لوگ ڈرتے تھے۔

میرے گھر اس کا بھی پھیرا ہوا کرتا تھا۔ دوسرے تیسرے مہینے جب بھی وہ آتی سیدھے زنان خانے کا رخ کرتی اور ڈیوڑھی میں جا کر بیٹھ جاتی۔ میری جنت نصیب ماں اس کو بہت مانتی تھیں۔ سو کام چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھتیں۔ جو کچھ کھانا پکا ہوتا ایک پتیل میں لا کر اس کے سامنے رکھ دیتیں اور ایک آبخورہ میں شراب۔ وہ کھانا پینا شروع کر دیتی۔ اسی دوران میں انھیں اس سے جو بات کرنا ہوتی کرتی جاتیں۔

ایک بار والد کو میعادی تپ ہوئی، اور نہایت شدید جس سے کم و بیش اکتالیس دن میں نجات ملی۔ اس دوران میں کئی بار ان کی حالت نازک ہو گئی۔ اسی زمانے میں چپاکلی کا پھیرا ہوا۔ میری مرحومہ ماں نے کھانا کھلاتے وقت اس سے والد کی بیماری اور اپنی پریشانی کا حال کہا۔ اس نے کہا "اچھے ہو جائیں گے۔" چنانچہ انھیں افاقہ ہو چلا اور صحتیاب ہوتے گئے۔

کچھ دنوں بعد پھر اس کا پھیرا ہوا۔ والد اچھے ہو گئے تھے اور چلنے پھرنے لگے تھے۔

والدہ نے بہت خوش ہوکر اس کی آؤ بھگت کی۔ حسب معمول کھانے کی تھالی اور شراب کا آبخورہ اس کے آگے لاکر رکھ دیا اور باتیں کرنے لگیں کہنے لگیں: "یہ تو اب تمھاری دعا سے بالکل اچھے ہیں۔ مجھے اب صرف ایک ابھلاشا (آرزو) ہے دعا دو کہ وہ بھی پوری ہوجائے۔ مجھے سب طرح کا سکھ نصیب ہے، سہاگ، بیٹے، بیٹیاں، بہو، دولت سب کچھ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اب ان کے کندھوں پر سوار ہوکر دنیا سے اٹھ جاؤں"۔ وہ بولی "ایسو ہی ہوئیگو"۔ انھوں نے پوچھا کب تک۔ اس کے منھ سے نکلا "چھٹے مہینے"۔ وہ اتنی خوش ہوئیں کہ اپنا ایک عمدہ جوڑا نکال لائیں۔ وہ کھا پی چکی تو خوشامد کرکے اسے پہنا دیا اور اس کے پاؤں چھوئے وہ چلی گئی۔ اس کی بات کا اثر شروع ہوا۔ وہ اس طرح کہ چند دنوں بعد والدہ کو دستوں کا روگ لگا۔ والد نے پہلے اپنا علاج شروع کیا کہ وہ بڑے زبردست طبیب تھے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ پھر ڈاکٹری علاج ہوا۔ کچھ نہ ہوا۔ والدہ کی حالت روز بروز زبوں تر ہوتی گئی۔ آخر غالباً چھٹے ہی مہینے بیکنٹھ باسی ہوگئیں۔

تیسرے بزرگ نسکل جی تھے۔ بریلی میں شہر سے باہر ایک تالاب ہے جو چودھری کا تالاب کہلاتا ہے۔ اس تالاب کے گرد بڑا میدان اور ایک جانب آم کا باغ ہے۔ رام لیلا کا میلہ دسہرہ میں یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس تالاب کے کنارے پورب رُخ دیوی کا ایک مندر ہے۔ مندر سے ملی ہوئی بائیں طرف ایک کوٹھری ہے۔ نسکل جی اسی کوٹھری میں رہتے تھے، کوئی ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر ہوگی۔ بہت لمبے چوڑے، جسیم، بلکہ بھیم شحیم، گورا چٹا رنگ۔ بڑے بڑے مگر خوبصورت کان، ناک اور آنکھیں، کشادہ پیشانی، گھٹا ہوا سر، داڑھی مونچھ، بھویں بھی صاف۔ آنکھیں ہر دم سرخ۔ جلال کی یہ کیفیت کہ چہرے پر آفتاب روشن۔ صرف ایک کوپن باندھے رہتے اور کوئی کپڑا بدن پر نہیں۔ ایک کھڑی چارپائی پر پڑے پڑے بڑبڑانا کرتے تھے۔ ایک نائی ان کا چیلا سرسوں کا تیل بدن پر ملتا رہتا تھا۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا اسی حالت میں دیکھا۔

والد جب علیل تھے تو ہم لوگ ان کی دعائیں لینے بھی جایا کرتے تھے۔ ایک شام کا ذکر ہے میں اور میرے بڑے بھائی جب چودھری کے تالاب پر پہنچے، دیکھا کہ نسکل جی مندر کے داہنی جانب کے چبوترے پر کھڑاؤں پہنے پورب پچھم ٹہل رہے ہیں جیسے کوئی شیر، اور بڑے جذبے کی حالت میں زور زور سے بڑبڑا رہے ہیں۔ ہم دونوں ان سے کوئی پچیس قدم کے فاصلے پر ٹھٹھک کر ایک جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوگئے، آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پانچ سات منٹ بعد ان کی نظر ہم لوگوں پر پڑی۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ ہم دونوں لپک کر ان کے سامنے پہنچے۔ بھائی صاحب نے جلدی سے شراب کا ادھا ان کے ہاتھ میں دیا۔ ایک مٹی کے آبخورے میں کلیجی تھی وہ بھی دے دیا۔ اور کہا کہ پتا جی کی طبیعت بہت خراب ہے انھیں اچھا کر دیجئے۔ انھوں نے ادھا منہ سے لگایا اور غٹ غٹ پی گئے۔ پھر ان کے منھ سے جلدی جلدی یہ لفظ نکلے "اچھے ہوجائیں گے۔ اچھے ہوجائیں گے ایک عورت گھر میں سے جائے گی۔ ایک عورت گھر میں سے جائے گی"۔ ہم دونوں نیچے سر ڈالے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ دونوں ہی باتیں صحیح ہوئیں۔

چوتھے اور آخری بزرگ جن کے کرشمے کل کی سی بات کی طرح یاد ہیں بابا کبیر داس تھے۔ بریلی میں ایک محلہ کالی باڑی ہے۔ وہیں ایک کوٹھری میں پڑے رہتے تھے۔ ستر بہتر کا سن، پستہ قد، چھریرا خمیدہ بدن، گول چہرہ، گورا رنگ، سر پر پٹے، بینائی کچھ کم ہوگئی تھی۔ کئی کئی کپڑے پہنے رہتے تھے۔ شراب اور چرس وہ بھی پیتے تھے۔ کچھ سلوک اور کچھ جذب کی حالت تھی۔ کبھی گھنٹوں بالکل خاموش رہتے کبھی بڑبڑانے لگتے، دھیمی آواز میں۔ لوگ ان کے معتقد تھے۔ میرے بڑے بھائی اور رشتے کے ایک چچا بھی معتقدین میں سے تھے اور دسویں پندرھویں ان کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ بھائی صاحب اس وقت کمشنری بریلی میں اپرنٹس تھے اور مستقل ملازمت کے کوشاں۔ ان کی بڑی تمنا نائب تحصیلدار ہوجانے کی تھی۔ اسی سلسلے میں بورڈ مال کے یہاں ان کا میموریل گیا ہوا تھا۔ انٹرویو ہو چکا تھا اس میں کامیابی کے لیے وہ بابا جی سے درخواست کیا کرتے تھے۔ بابا جی اکثر ٹال جاتے۔ ایک دن ان کے یہاں سے آکے بھائی صاحب نے کہا کہ آج بابا جی نے حکم دے دیا کہ تمھیں نوکری مل جائے گی مگر گاؤں گاؤں مارے مارے پھرنا پڑے گا۔ تھوڑے دن بعد بورڈ مال کا حکم آیا کہ تم اکسائز انسپکٹری کے لیے منظور کرلیے گئے۔ بابا جی کے الفاظ کے معنی صاحب کی سمجھ میں آگئے۔ گاؤں گاؤں پھرنے سے مراد یہی ملازمت تھی۔ اس میں بھائی صاحب کو بیس پچیس دن دورے پر رہنا پڑتا تھا۔

ایک دن چچا صاحب اور بھائی صاحب نے بابا جی کے یہاں سے واپس آکر والد سے کہا کہ بابا جی نے فرمایا ہے "ہم گنگا اشنان کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دن اپنی گاڑی پر اشنان کرا لاؤ"۔ والد نے فرمایا کہ بابا جی سے کہنا انھیں گنگا اشنان تو گاڑی پر لے جاکر ضرور کرا دیا جائے گا۔ مگر واپسی میں میرے گھر آنا ہوگا اور دو چار روز رہنا بھی ہے۔

جب بابا جی کو یہ جواب پہنچا تو انھوں نے گنگا اشنان کا دن مقرر کردیا اور ہمارے گھر آنے کے لیے راضی ہوگئے۔ بھائی صاحب اور چچا صاحب اسی دن سواری

لے کر گئے اور گنگا اشنان کرا کے انھیں ہمارے گھر لے آئے۔ ہم لوگ اس زمانے میں بریلی سول لائنس میں ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ موسم گرما کا آغاز تھا۔ باباجی کے لیے ایک چارپائی پچھم رخ کے برآمدے میں ڈلوا دی گئی۔ والدہ سے اور ان سے کبھی کبھی بڑے راز کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ باباجی کا معمول تھا جب کھانا کھاتے میرے چھوٹے بھائی کو جس کی عمر اس وقت تین چار سال کی تھی ضرور اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے۔ انھیں رہتے ہوئے پانچ سات دن ہوئے ہوں گے کہ چھوٹے بھائی کے سیون کے مقام پر کچھ سوجن پیدا ہوئی اور جلد دو پھوڑے نمودار ہو گئے۔ بڑے بھائی صاحب ایک دن اسے ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے بڑے اسپتال لے گئے۔ اسی اثنا میں باباجی کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانا ان کے سامنے لا کر رکھا گیا۔ انھوں نے حسب معمول للوا کو پکارا (وہ چھوٹے بھائی کو للوا ہی کہا کرتے تھے)۔ ان سے کہا گیا کہ اس کے پھوڑے نکل آئے ہیں، دکھانے کے لیے اسپتال بھیجا گیا ہے۔ باباجی بہت جھلائے۔ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کہنے لگے: "تم سب ہتیارے ہو۔ چیر پھاڑ کر کے للوا کی جان لیو گے۔ ابھی بلا لو اسے"۔ فوراً آدمی اسپتال دوڑا گیا کہ للوا کو واپس بلا لائے۔ آتے ہی باباجی کے پاس آ کر ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ باباجی نے اس سے پوچھا: "کہاں ہے پھوڑا" اور اپنا ہاتھ دیر تک پھوڑوں پر پھیرتے رہے۔ ایک آبخورے میں شراب کھانے کے ساتھ رکھی گئی تھی۔ اس میں انگلیاں ڈبو کر پھوڑے پر مل دیں۔ جب للوا ان کے ساتھ کھانے پر بیٹھتا یہ اپنا ہاتھ اور انگلیاں اسی طرح پھوڑے پر پھیرتے تھے۔ تین چار دن میں پھوڑے غائب ہو گئے۔

باباجی کے برآمدے کے سامنے کوئی پندرہ بیس قدم پر ایک کھجور کا درخت تھا اس کے نیچے ایک بڑا سا گڑھا تھا۔ اس میں نوکر چاکر جھاڑو لگانے اور صفائی کرنے کے بعد کوڑا اکرکٹ ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک دن اس میں کسی طرح کچھ آگ پہنچ گئی اور سلگتی رہی۔ دس گیارہ بجے دن کا وقت ہوگا، آگ بھڑک اٹھی۔ شعلے نکلنے لگے۔ ایک مجگادری کالا سانپ اس میں سے نکل کر بھاگا وہ برابر کی پگڈنڈی پار کر رہا تھا، شور مچا "سانپ سانپ" مارنا مارنا۔ نوکر لاٹھیاں لے کر جھپٹے۔ باباجی نے جو یہ سنا تو چلائے: "خبردار کوئی مت مارنا"۔ سب جہاں کے تہاں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ پھر فوراً ہی فرمایا: "دو۔ آپہی مر جائیگو"۔ اتنا ان کے منہ سے نکلنا تھا کہ سانپ نے اپنا سر گڑھے کی طرف گھمایا۔ اسی آگ میں رینگ گیا اور جل کر بھسم ہو گیا۔ یہ کل کی بات اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

ل بریلی میں جو دریا ہے وہ رام گنگا کہلاتا ہے اور گنگا جی کی طرح وہاں مانا جاتا ہے۔

مردہ گھر

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

"تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"کیوں؟ ڈاکٹر کے۔ مہرہ۔"

"میں نے نام پوچھا ہے۔ انی شیل نہیں۔"

"کامنی۔"

"شنو کامنی! اب یہ بکواس نہیں چلے گی۔ آج سے سب کچھ بند۔ سُنا۔"

میرے کندھے پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ سارا کندھا بھیگ گیا۔ میں اس کے نرم نرم بالوں کو سہلانے لگا۔

ایک جھٹکے سے کامنی مجھ سے الگ ہو گئی اور کرسی پر جا بیٹھی۔ اس کے چہرے کے نقوش جو نرم پڑ گئے تھے پھر سخت ہونے لگے۔

"یہ کیا ہے جیبتی! مجھے معاف کر دو۔"

مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ یہی کچھ کہے گی۔ کسی کی تین سطروں کی نظم یاد آ گئی:۔

"اس رات وہ کسی اور کے غم میں
میرے گلے لپٹ کر
پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔"

میں اُٹھا اور ایک بھی لفظ کہے بغیر چلنے لگا۔ وہ آہستہ سے بولی "سنو! کبھی آنا پوسٹ مارٹم کروں گی تو تمھیں مردہ گھر دکھاؤں گی۔"

میں نے اُس مریض نظر آنے والے کمرے کی طرف دیکھا، مریض جیسی ڈاکٹر کے۔ مہرہ کی طرف دیکھا، کمرے کی ننگی ننگی دیواروں کو دیکھا، بستر پہ بڑے بڑے تکیوں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "نہیں ڈاکٹر کے۔ مہرہ! مجھے اور کوئی مُردہ گھر نہیں دیکھنا ہے۔"



آس کی کلیاں

اوم پرکاش بجاج

نوراج اور پشپا دونوں ہی کو ادب سے گہری دل چسپی تھی۔ دراصل ان کا یہی ادبی شوق ان کے درمیان محبت کی کڑی بن گیا تھا اور جس نے بالآخر انھیں ازدواجی رشتے میں پرو دیا۔ یہ شوق تو ان کی روحوں میں سمایا ہوا تھا۔ وہ گپیں ہانکنے کی بجائے ناول یا کہانیوں کے مجموعے اور نئی کتابیں پڑھنا پسند کرتے۔ اچھے پکوانوں کے لیے ان کی طبیعت اس قدر نہ مچلتی جتنی نئی کتابوں کے لیے بے قرار رہتی۔ گھر کی ضروری چیزوں کے لیے بازار جاتے اور واپسی میں کتابوں اور رسالوں کے بنڈل لے آتے۔ میاں بیوی شرطیں لگا کر پڑھتے۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین کتابوں کی نذر ہو جاتا۔ اس دھن میں کھانا پینا تک بھول جاتا۔ لوگوں سے رشتہ داروں سے ملنا یاد نہ رہتا۔ کتابیں پڑھنے کے بعد بحث کا دور شروع ہوتا۔ کتاب اور مصنف دونوں کا پوسٹ مارٹم بڑی بے دردی سے ہوتا۔ ناول یا افسانے میں عورتوں کی کردار نگاری کے سلسلے میں اگر مصنف سے چوک ہو جاتی تو پشپا بھڑک اٹھتی اور اگر مردوں کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا جاتا تو نوراج کی زبان سے زہر ٹپکتا۔ البتہ اس بحث میں متانت اور تہذیب کا دامن نہ چھوٹنے پاتا۔ ہاں طنز کے تیروں سے مفر نہ تھا۔ میاں بیوی ہوٹل یا سینما میں شام گزارنا پسند نہ کرتے بلکہ گھر ہی پر بیٹھ کر کتابوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر انھیں ذہنی اور دماغی راحت اور لذت حاصل ہوتی۔ انھیں کھانے کے بغیر چین تھا، لیکن مطالعہ کے بنا چین اور سکون نہ تھا۔ گویا مطالعہ کا یہ شوق ان کی زندگی کا ایک اہم جز بن گیا تھا۔

نوراج کا ادبی شوق مطالعہ تک ہی محدود نہ تھا۔ وہ کچھ نہ کچھ لکھتا بھی رہتا تھا۔ اس کا یہ شوق شروع شروع میں تراجم تک محدود تھا۔ ان تراجم کا ایک مقصد تھا۔ جب کبھی نوراج کوئی خوبصورت اور ولولہ انگیز ادبی تخلیق پڑھتا تو وہ اپنے دوستوں کو بھی سنانا چاہتا تاکہ وہ بھی اس ادبی کیفیت میں شریک ہو سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کئی ادبی شہ پاروں کو اپنی زبان میں منتقل کیا تھا۔ اور جب یہ ترجمہ کسی جریدے میں چھپتا تو اسے کس قدر خوشی ہوتی تھی، اس کا اندازہ مشکل ہے۔ وہ خوش ہو ہو کر یہ چیزیں اپنے دوستوں کو، اپنی بیوی پشپا کو سناتا۔ اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر اسے کتنی مسرت ہوتی، اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے، اور پھر اس کے ذہن کے ایک گوشے میں یہ خیال ابھرتا کہ ایک زمانہ آئے گا جب وہ اپنی طبعزاد چیزیں دنیائے ادب کے سامنے پیش کرے گا، اس کی تخلیقات رسالوں میں اس کی تصویر کے ساتھ شایع ہوں گی، دور دور سے تعریفی خطوط آئیں گے، ناشر اس کی خوشامدیں کریں گے اور ادب میں اس کا اپنا ایک مقام ہوگا۔

اور نوراج نے پوری لگن اور جوش کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی کئی چیزیں مختلف موقر جرائد میں چھپ کر منصۂ شہود پر بھی آ چکی تھیں۔ روز بروز اس کا تخلیقی ذوق بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تو ادبی تخلیق کا یہ شوق زندگی سے متعلق اس کے خوابوں پر بھی حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس کے پاس پڑھنے لکھنے کے لیے ایک خوبصورت کمرہ ہو، اسپرنگ دار کرسی ہو، میز ہو اور ایک اچھا سا بجلی کا لیمپ۔ بکھری ہوئی کتابوں کو رکھنے کے لیے خوبصورت الماریاں۔ لیکن اس کے پاس گھریلو اخراجات سے کبھی اتنے پیسے اکٹھے نہ ہو سکے کہ وہ اپنی ان آرزوؤں کو شرمندۂ تکمیل کر سکتا۔

کچھ عرصے بعد اس کی زندگی میں ایک چھوٹا سا انقلاب آیا۔ پشپا جو پڑھنے لکھنے میں اپنے پتی کی شریک تھی، دھیرے دھیرے اس راہ سے ہٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ اس

کی توجہ کا مرکز اس کے بچے ہو گئے تھے، جو ماں کی ممتا کے متلاشی تھے اور اس کی دیکھ بھال کے متمنی۔ ماں کو فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اپنا وقت مطالعے اور ادبی مباحثوں میں صرف کرے۔ البتہ کبھی کبھار وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر ایک آدھ کتاب پڑھ لیتی۔ مگر اب اس کے دل میں پہلا سا ولولہ نہ رہا تھا۔ یہ شوق روز بروز گھٹ کر صفر رہ گیا تھا۔ وہ کتابوں کے بجائے بچوں کی اور ان کے لیے پھلوں اور کپڑوں کی بات سوچنے لگی تھی۔ ہاں نوراج بدستور اپنی ڈگر پر رواں تھا۔ اس کی ساری توجہ گھر گرہستی سے ہٹ کر لکھنے پڑھنے پر مرکوز ہو گئی تھی۔ وہ لکھے جا رہا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ اسے کوئی مالی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کے پاس اپنی لکھی ہوئی کہانیوں کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا تھا جو اسے پشپا اور بچوں سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ دو ناولوں کے مسودے بھی تھے جو کسی ناشر نے نہ چھاپے تھے۔ لیکن ناکامیوں نے اسے مایوس نہ کیا تھا بلکہ اس کے شوق نگارش کو اور تازیانے لگائے تھے۔ اور وہ اس آس پر جی رہا تھا کہ اس کی ادبی زندگی میں بھی بہار آئے گی۔ امیدوں کی کلیاں مسکائیں گی۔

نوراج کی مشغولیتیں اگر یہیں تک محدود رہتیں تو شاید گھر کی پرسکون فضا میں ہلچل نہ ہوتی۔ مگر اس کے شوق نے اور ہی رنگ اختیار کر لیا۔ وہ اپنے ادیب دوستوں کو گھر لانے لگا۔ سارا دن گھر میں قہقہے لگتے رہتے، گپیں ہوتی رہتیں۔ چائے اور کھانے کے دور چلتے۔ ادیب کم اور ادب کے نام پر وقت گزاری کرنے والے لوگ زیادہ، نوراج کے ارد گرد بے تکلف ہو کر جمع ہو رہے تھے۔ ان کی گنتی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ کوئی آتا اور پرانے کپڑے اتار کر نئے پہن جاتا۔ کوئی آتا اور ادھار پیسے لے جاتا۔ کوئی آتا کتابوں کی گٹھری باندھ کر چلا جاتا۔ انھیں ہنگاموں نے، اسی افراتفری نے، اسی طوفانِ بدتمیزی نے پشپا کو صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ پہلے تو اس نے اشاروں سے احتجاج کیا پھر وہ گِلا کرنے لگی اور اب گِلا برملا شکایت ہو گیا تھا۔ یہ پڑھنا لکھنا جو کسی زمانے میں دونوں کے درمیان محبت کی کڑی تھا، اب فساد کی جڑ بنتا جا رہا تھا۔ اور آئے دن پشپا اور نوراج الجھتے رہتے۔

اس دن نوراج نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ ایک نئی کہانی لکھنے کے لیے ایسی کہانی جس کا پلاٹ پچھلے دس برسوں سے اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ ایک عظیم کہانی۔ اس شاہکار کو وجود میں لانے کی اس نے پہلے بھی ایک دو بار کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس کہانی کی تکمیل کی آرزو نے اسے بیقرار کر رکھا تھا۔ اور آج اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اسے بہر صورت مکمل کرے گا۔ ابھی اس نے کہانی لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہی تھا کہ اس کا دوست موتی رام غنچۂ آدھمکا۔ موتی رام جو گپی ہونے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، جو جھوٹ بولنے میں بے نظیر تھا۔ تانگے والے کو نوراج سے پیسے دلواتا، تین تین گھنٹے گپیں ہانکتا، چائے پیتا، سگریٹ پھونکتا اور پھر دوسرے اڈے کے لیے چل دیتا۔ اس دن جتنی دیر وہ نوراج کے پاس بیٹھا رہا، نوراج پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس کے دماغ میں ہتھوڑے چلتے رہے اور وہ دل ہی دل میں دعائیں کرتا رہا کہ کسی طرح یہ چلا جائے۔ آج اسے اپنی کہانی بہرحال مکمل کرنا تھی۔ اس لیے جونہی موتی رام وہاں سے اٹھا، نوراج کو محسوس ہوا جیسے بہت بڑا بوجھ اس کے دل و دماغ سے اتر گیا ہے، کوئی کانٹا تھا جو اس کے سینے سے نکل گیا ہے، کوئی درد تھا جو کافور ہو گیا ہے۔

رام کے چلے جانے کے بعد ایک بار پھر نوراج نے قلم اٹھایا۔ ابھی اس نے پہلا ہی فقرہ لکھا تھا کہ پشپا آگئی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ آج وہ برس کر رہے گی۔ اس طوفان کو ٹالنے کے لیے نوراج نے مزاحاً کہا، "اوہ! آپ تشریف لائی ہیں۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں میں؟"

"کیوں؟ میرا یہاں آنا برا لگتا ہے؟" پشپا نے تنک کر جواب دیا۔

"برا تو نہیں مگر میرا موڈ ..... !"

"اوہو! میرے آنے سے آپ کا موڈ خراب ہونے لگا۔ وہ آپ کا دوست دو گھنٹے اور بیٹھا رہتا تو آپ کو اور آپ کے موڈ کو کوئی خطرہ نہ تھا۔" پشپا نے ایک پوری تلخی سے وار کیا:

"دیکھو پشپا، اس وقت نہیں، پھر کبھی بحث کریں گے، تھوڑی دیر کے لیے مجھے معاف کر دو، صرف تھوڑی دیر کے لیے تو میں اپنی یہ نئی کہانی مکمل کر لوں۔" نوراج نے بڑی نرمی سے جواب دیا اور اس کا قلم کاغذ پر جنبش کرنے لگا۔

لیکن پشپا آج طنز کے ہزاروں تیر اپنے ترکش میں لے کر آئی تھی۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ "پہلے ہزاروں صفحے سیاہ کر کے کون سے پہاڑ ڈھا لیے ہیں جو یہ مزید صفحات لکھنے کی دھن سمائی ہے؟ سارا دن لکھنا، سارا دن پڑھنا۔ سارا دن خود غرض اور بے کار لوگوں کی خاطر تواضع۔ تم نے سارا گھر تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"پشپا!" نوراج یکا یک غصے سے کانپ اٹھا۔ لیکن اسے کہانی مکمل کرنا تھی۔ اس لیے اس نے اپنے غصہ پر قابو پانے کی آخری کوشش کی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج پشپا نے ... اور آخری فیصلے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس نے پورے عزم کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو؟ لیکن اب میں ڈروں گی نہیں۔ میں اب تمھیں اس راہ پر چلنے نہ دوں گی۔ تمھاری یہ باتیں، تمھاری یہ مہمان نوازیاں، آدھی سے زیادہ تنخواہ صاف کر دیتی ہیں۔ گھر میں ایک منٹ کے لیے خاموشی نہیں رہتی۔ رات کے بارہ بارہ بجے

تک بجلی جلتی ہے‘ قہقہے گونجتے ہیں۔ یہ گھر گھر نہیں رہا سرائے اور چوپال بن گیا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس گھر میں یا تو کتابیں اور تمھارے دوست رہیں گے یا میں اور میرے بچے۔“

”پشپا!“ حیرت زدہ نوراج نے آنکھیں پھاڑ کر پشپا کی طرف دیکھا۔ اس پشپا کی طرف جو کبھی خود کتابوں کی شائق تھی۔ مطالعہ کی دلدادہ تھی۔ ادیبوں کی مداح تھی۔

”ہاں اس گھر میں ایک ہی رہ سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں تمھیں میری باتوں پر غصے سے زیادہ حیرت کیوں ہوئی ہے لیکن نہ اس میں حیرت کی بات ہے اور نہ غصے کی۔ پہلے میں محض بیوی تھی۔ میری زندگی میں محض تم تھے اور میں تھی۔ اور میں تمھارے اور اپنے شوق کی خاطر بھوکی رہ سکتی تھی۔ لیکن اب میں ماں ہوں‘ دو بچوں کی ماں‘ وہ ماں جو اپنے بچوں کو بھوکا ننگا اور گندا نہیں دیکھ سکتی۔ میں زیادہ بچے پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر اس کی نہ گنجائش ہے اور نہ عقل مندی۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جو بچے ہیں وہ ننگے بھوکے‘ جاہل اور مریض نہ رہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش و پرداخت اچھے عنوان سے ہو۔ تم ان بچوں کو دیکھو۔ تمھاری ادب اور ادیب نوازی نے ان معصوموں کو معقول پرورش اور نگہداشت سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ کسی اچھے سکول میں نہیں جاتے۔ ان کی صحت‘ ان کی خوشی ان کی تعلیم . . . سب تمھارے شوق‘ تمھاری احباب نوازیوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔ تم ان کے لیے ایک باپ نہیں ہو . . . ایک . . .“

”پشپا!“ نوراج نے تقریباً تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اسے پشپا دکھائی نہ دی۔ اسے ایک ماں دکھائی دی‘ جو اپنے بچوں کی آسودگی‘ خوشی اور بہتر مستقبل کے لیے اپنے شوہر سے باغی ہو رہی تھی۔ ایک پھل دار شاخ نظر آئی جس نے اپنی زندگی کے رس کو محض پھلوں کی پرورش کے لیے وقف کر دیا تھا اور بھلا دیا تھا اس لذت کو جو اسے کبھی بھونرے کو دیکھ کر اور اس کے گیت سن کر حاصل ہوتی تھی اور پہلی مرتبہ نوراج نے محسوس کیا کہ پشپا کا خیال درست ہے۔ اس نے مجھ سے بغاوت نہیں کی۔ قدرت کے تقاضے کے آگے سر جھکایا ہے اس نے۔

اور پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ زندگی کی جس ڈگر پر وہ چل رہا ہے‘ اس نے اپنے گرد جو حلقہ بنا رکھا ہے‘ وہ نہ صرف ایک خوشگوار گھریلو زندگی کے لیے بلکہ ان بچوں کے جو اس کی زندہ تخلیق ہیں‘ ان کے مفاد کے منافی ہے۔ اور جیسے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے جیسے حقیقت کو پا لیا اور ندامت سے اس کی گردن جھک گئی۔

”پشپا!“ اس نے پشیمانی کے بھیگے ہوئے لہجہ میں کہا ”اب اور کچھ نہ کہو پشپا۔ اب تمھیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ آج سے میں . .“

اور یہ کہتے کہتے وہ میز پر رکھے ہوئے کتابوں اور مسودوں کے انبار کی طرف بڑھا۔ وہ انھیں کھڑکی سے باہر پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ رک گیا۔ کاغذات اور کتابوں کے اس بنڈل کو جو اس کے ہاتھ میں تھا میز کے کونے پر رکھ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اور جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ جونہی اس کی نظر اندر کے کاغذ پر پڑی ایک روشنی سی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

”پشپا! چیک! ـــــ پانچ ـــــ سو کا چیک!! ـــــ میرا ناول بک گیا پشپا بالآخر میرا ناول بک گیا ہے۔“

اور چیک کو ہوا میں اچھالتے ہوئے اس نے بڑھ کر پشپا کو اپنی باہوں میں بھر لیا اور اتنے جوش سے کمرے میں گھوم گیا کہ پشپا کی تقریباً چیخ نکل گئی۔

”مجھے چھوڑو۔ یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھے چیک تو دیکھنے دو۔“ اس نے نوراج کو باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اور جب نوراج نے پشپا کو چھوڑ دیا تو اس نے جھپٹ کر ناول کی منظوری کی چھٹی اور رائلٹی کا چیک دیکھا۔ پہلے تو اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ لیکن پھر فوراً ہی اس پر ایک پرچھائیں‘ ایک سیاہی سی آ گئی۔ اس نے گردن جھکا لی۔ لیکن نوراج نے بڑے پیار سے بڑی نرمی سے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھایا اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: ”پشیمان نہ ہو پشپا! تم نے جو کچھ کہا وہ سو فی صدی درست ہے۔ تم نے مجھے بر وقت یاد دلایا کہ میں ایک باپ ہوں اور میرا فرض بچوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش و پرداخت ہے۔ آج اگر مجھے کامیابی ہوئی ہے تو اس سے تمھاری بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس مجھے یہ احساس ہو گیا ہے کہ میری تخلیقات سے جو کچھ بھی مجھے ملے اس کا صحیح استعمال میرے بچوں کی تعلیم و تربیت ہے‘ چائے اور سگرٹ نوشی نہیں۔

خجالت اور شرمندگی کے گہرے پانی میں ڈوبتی ہوئی پشپا جیسے ابھر آئی اور سیلاب کی رو میں بے پرواہ بہتا ہوا نوراج جیسے لنگر انداز کشتی کی طرح ٹھہراؤ پا گیا اور جب دونوں نے اپنا توازن پا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو انھیں محسوس ہوا سیلاب اتر گیا ہے محبت کا سورج نکل آیا ہے اور مستقبل کا آسمان امید اور مسرت کے نور سے جگمگا اٹھا ہے۔



غزل

ثمر بسوانی

مرے دل میں اگر سوزِ نہاں کچھ اور بڑھ جاتا
تو پھر سرمایۂ اشکِ رواں کچھ اور بڑھ جاتا

وہ کہیے اشک میرے ابرِ نیساں بن گئے ورنہ
سُلگتی آرزودں کا دھواں کچھ اور بڑھ جاتا

محبت دردِ و غم کی آنچ میں تپ کر نکھرتی ہے
مزا تو جب تھا یہ آزارِ جاں کچھ اور بڑھ جاتا

زباں کو خشک کر رکھا ہے صبح وقت نے ورنہ
صدائے مُرغ سے شورِ اذاں کچھ اور بڑھ جاتا

وہ کہیے نامرادی ہی مقدر بن گئی اپنا
وگرنہ دامنِ حرصِ جہاں کچھ اور بڑھ جاتا

اُفق گر خاک کے قدموں پہ سر اپنا نہ رکھ دیتا
تو رفعت میں زمیں سے آسماں کچھ اور بڑھ جاتا

ہمارے دم قدم سے ہی ثمرؔ رونق ہے گلشن میں
نہ ہم ہوتے اگر رنگِ خزاں کچھ اور بڑھ جاتا

جیشٹھ ۱۸۸۸ شک

غزل

شیو پرتاپ بھٹناگر کشل لکھنوی

مے نوش جو آدابِ رندانہ سمجھتے ہیں
ساقی اُنھیں ہم فخرِ مے خانہ سمجھتے ہیں
گردش میں ہیں ان آنکھوں کا پیمانہ سمجھتے ہیں
مے کش تری دُنیا کو مے خانہ سمجھتے ہیں

اے حسن وفا داری' ہم تیری نزاکت کو
کیا کیا نہ سمجھتے تھے' کیا کیا نہ سمجھتے ہیں
کیا فائدہ' اے ناصح ! اس تیری نصیحت سے
دیوانے تو تجھ کو بھی دیوانہ سمجھتے ہیں
محرابِ حرم کے بھی جلوے ہیں نگاہوں میں
ہم عظمتِ ابروے جانانہ سمجھتے ہیں
جو دوریِ منزل سے مایوس نہیں ہوتا
اس عزم کو ہم عزمِ مردانہ سمجھتے ہیں
تھم جائے جو پلکوں پر اُس اشک کے موتی کو
شمعِ حرمِ دل کا پروانہ سمجھتے ہیں
ہم رونقِ محفل کو' ہم جشنِ بہاراں کو
اُجڑی ہوئی نظروں کا ویرانہ سمجھتے ہیں
کیا اس سے سوا ہوگا ' اعزازِ جنوں اپنا
وہ بھی تو کشلؔ ہم کو دیوانہ سمجھتے ہیں

جون ۱۹۶۶ء

میر خلیق لکھنوی اور اُن کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

سید سلیمان حسین

[نیا دور کی ۲۶ جنوری ۱۹۶۱ء (فروری) کی اشاعت میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک مضمون میر خلیق پر شایع ہو چکا ہے۔ میر خلیق پر یہ مضمون اس لیے شایع کیا جا رہا ہے کہ اس میں ڈاکٹر سلیمان صاحب نے ایک ایسے مرثیے کا ذکر کیا ہے جو انھیں لکھنؤ یونیورسٹی کے قلمی کتب کے ذخیرے میں ملا ہے اور بالعموم لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔ ایڈیٹر]

میر مستحسن نام خلیق تخلص، میر حسن کے نامور فرزند تھے فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شاعری کے متعلق ان کے شفیق استاد مصحفی کا قول ہے کہ سولہ سال کی عمر سے مشق شروع کی ابتدا میں اپنا کلام اپنے والد ہی کو دکھاتے تھے لیکن اس زمانہ میں میر حسن مثنوی سحر البیان کے نظم کرنے اور دوسرے مشاغل میں اتنا مصروف تھے کہ حسب دل خواہ مدد نہ کر سکتے تھے چنانچہ وہ ایک دن اپنے ہونہار بیٹے کو میر تقی میر کی خدمت میں لے گئے لیکن میر صاحب نے شاگرد بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "اپنی ہی دلاد تربیت نہیں ہوتی غیر کی اصلاح کا کسے دماغ ہے"[1]

جب ۱۱۹۸ھ میں مصحفی لکھنؤ آئے تو میر حسن بیٹے کو ساتھ لیے ہوئے مصحفی کی خدمت میں پہنچے بقول آزاد "اپنی کم فرصتی کا حال بیان کیا اور اصلاح کے لیے شیخ موصوف کے سپرد کر دیا۔"[2] اس واقعہ کو مصحفی نے یوں بیان کیا ہے:

"آں عزیز را پیش من فرستاد و آموختہ کرد کہ ایشاں دریں فن نظیر ندارند، اکنوں کہ فرصت وقت است تا میتوانی چیزے از ایشاں بیاموز، موحیٰ الیہ انقیاد امر والد ماجد را واجب شمردہ بر ہمونی شوق روز افزوں حاضر می ماند و مشورہ از من میگرفت، بندہ مناسب طبعش شعر در یافتہ در ہماں ایام گفتہ بودم کہ اگر زمانہ فرصت خواہد دہد خوب خواہد گفت ....."[3]

مصحفی کے بیان کے مطابق میر خلیق نے سولہ برس کے سن سے شاعری کی مشق شروع کر دی تھی۔ اگر شاگردی کے وقت یعنی ۱۱۹۸ھ میں خلیق کی عمر سترہ اٹھارہ سال تصور کر لیں تو ان کا سال ولادت ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔

بیش تر تذکرے اس بات پر متفق ہیں کہ خلیق بڑے پر گو اور اپنے زمانے کے باکمال غزل گو تھے۔ چنانچہ اسی زمانے کا ایک واقعہ صاحب تاریخ ادب اردو نے لکھا ہے کہ:

"ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے یہاں فیض آباد میں مشاعرہ تھا جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی بلائے گئے تھے اور خیال تھا کہ وہ وہیں روک لیے جائیں گے۔ جب شروع جلسہ میں خلیق نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

تو آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے"[4]

---

۱ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا قلمی ۲ آب حیات ۳ تذکرۂ ہندی ص ۹۰-۱ ۴ تاریخ ادب اردو ص ۲۱۳ بار اول۔

بھیا نظر آتا نہیں جینے کا قرینہ　　فرقت کی حرارت سے جلا جاتا ہے سینہ
گذرا مجھے دن گنتے محرم کا مہینہ　　ویران ہے آباد کرو آ کے مدینہ
ہمراہ بنے تو شہ والا کو بھی لاؤ
اماں کو بھی لاؤ مرے بابا کو بھی لاؤ

دیر آنے میں ہو ان کے تو تم تو نہ کرو دیر　　غم کھایا ہے اتنا کہ بہن جینے سے ہے سیر
ہے سر پہ جدائی مری کھینچے ہوئے شمشیر　　آہوں کے دھوئیں سے ہے چھپا آنکھوں میں اندھیر
تنہائی کا جینا مجھے اب جبر ہے بھائی
معلوم یہ ہوتا ہے کہ گھر قبر ہے بھائی

فرقت میں ہے بیمار کو جینے کا مزا تلخ　　ہر چیز ہے یاد لب شیریں کے سوا تلخ
غم کھانے سے منھ تلخ دوا تلخ غذا تلخ　　ان روزوں مری زیست بسر ہوتی ہے کیا تلخ
نیند آنکھوں میں اب تو کوئی پل بھی نہیں آتی
تم کیا نہیں آتے کہ اجل بھی نہیں آتی

اے بھائی بُرے وقت میں کام آؤ ہمارے　　دوری سے ہے بیمار بہن گور کنارے
جیتی ہوں فقط آپ کے وعدہ کے سہارے　　تم ماں کے بھی ہو لاڈلے بابا کے بھی پیارے
ہمراہ سفر میں ہیں سبھی پہ نہیں صغرا
اماں کی کنیزوں کے برابر نہیں صغرا

ہمجولیوں سے اپنی کہا کرتی ہوں اکثر　　اب آئینگے لینے ہمیں بھیا علی اکبر
واں جائینگے ہم بھی ہے جہاں بابا کا لشکر　　لے جائینگے بھیا ہمیں محمل میں چڑھا کر
جی جائینگے جب اپنے مسیحا سے ملینگے
بھیا کی بدولت شہ والا سے ملینگے

اب دیر جو ہوتی ہے تو شرماتی ہوں بھائی　　جو آتی ہے آنکھ اس سے چرا جاتی ہوں بھائی
ہر بات میں سر زانو پہ نہوڑاتی ہوں بھائی　　مایوسی سے اشک آنکھوں میں بھر لاتی ہوں بھائی
کچھ آپ کے آنے کی نہ صورت ہوئی افسوس
ہمجولیوں سے مجھکو خجالت ہوئی افسوس

اب بھی اگر آؤ مجھے لینے تو ہے بہتر　　رہ جائے مری بات بہن صدقہ ہو تم پر
ورنہ میں دو چار ان سے نہیں ہونے کی اکبر　　ہمجولیاں ایک روز کہیں گی یہ مقرر
سب پیارے ہیں تم باپ کو پیاری نہیں صغرا
اکبر کو بھی کچھ چاہ تمہاری نہیں صغرا

جس دن مجھے یہ لڑکیوں نے بات سُنائی　　سن لیجو کہ مر جاؤں گی اس روز میں بھائی
کٹتے ہیں تڑپتے مجھے ایام جدائی　　تم آپ آئے نہ اور آہ ہماری اجل آئی

امید یہی ہے کہ اب آتے ہو سفر سے
تا شام کھڑی رہتی ہوں چوکھٹ پہ سحر سے

بستر پہ بھی آنکھیں سوئے در رہتی ہیں نگراں　　جس راہ سے آئیگے میں اس راہ کے قربان
ڈر ہے کہ نہ گھبرا کے نکل جائے مری جان　　پھر قبر میں لیے جائیں ملاقات کا ارمان
دیکھو گے مجھے آن کے جب جانو گے بھائی
یہ زار ہوئی ہوں کہ نہ پہچانو گے بھائی

بے چین ہوں میں جینے سے ہے سارا زمانا　　آہیں کبھی بھرنا ہے کبھی اشک بہانا
تپ بدیہہ ہے موقوف ہوئی چھٹ گیا کھانا　　ہم جی سے چلے اور نہ تمہارا ہوا آنا
سب کہتے ہیں دنیا سے گذر جائے گی صغرا
تم کو نہ خیال آیا کہ مر جائے گی صغرا

اماں یہ نہ سمجھیں کہ کسے چھوڑا ہے گھر میں　　بابا کو بھی اللہ یہ غفلت ہے سفر میں
وہ بھولے ہیں اور مرتے ہیں ہم یاد پدر میں　　نشتر سی کھٹکتی ہے ہر اک سانس جگر میں
جو عارضے میں چھوڑ کے جاتا ہے کسی کو
حیران ہوں کس طرح قرار آتا ہے جی کو

ایسا مجھے بھولے کہ کسی نے نہ کیا یاد　　بے بس ہوں پہنچتی نہیں تم تک مری فریاد
جو ہم پہ بنی خیر خدا سب کو رکھے شاد　　پر حیف یہ بیمار بہن ہو گئی برباد
اب زیست کا صغرا کے سہارا نہیں کوئی
کہنے کو تو سب ہیں پہ ہمارا نہیں کوئی

مرتے ہوئے جی اٹھتی ہوں تم اب بھی جو چاہو　　اقرار جو کچھ کر گئے ہو اسکو نباہو
تسکین تصور کی ملاقات سے کیا ہو　　تم دلبر فرزند شہ عقدہ کشا ہو
اس خواہر دل خستہ پہ احساں کرو بھائی
آ کر مری مشکل کو اب آساں کرو بھائی

دادا نے تمہارے تو ہے مُردوں کو جلایا　　صحت دی شفا کا کوئی طالب گر آیا
دکھ درد میں فیض ان سے ہر اک شخص نے پایا　　پنجے سے اجل کے ہمیں تم نے نہ چھڑایا
جلد آن کے دیدار تو اے بھائی دکھا دو
تم بھی ہمیں اعجاز مسیحائی دکھا دو

دن بھر تو بہن روتی ہے منھ پر لئے آنچل　　اور چار پہر رات یہ دل رہتا ہے بے کل
باشندوں سے آبادی تھی گھر ہو گیا جنگل　　تنہائی میں رہتا ہے تصور یہی ہر پل
پردیسی پھرینگے مرا دل شاد کبھی ہوگا ؟
ویران یہ گھر پھر کبھی آباد بھی ہوگا ؟

س گھر میں بچھے گی کبھی پھر مسندِ شبیر؟ — پھر ماں سے ملائے گا کبھی مالکِ تقدیر؟
کبرا کبھی پھر آئے گی صغرا سے بغل گیر؟ — پھر کھیلے گی ساتھ آکے سکینہ مری ہمشیر؟
کب ہاتھ مجھے دیکھ کے پھیلائیں گے اصغر؟
گودی میں ہمک کر مری کب آئیں گے اصغر؟

ہے ان دنوں حالت مری گھر سے بھی بدتر — دیکھوں مجھے پہچانتے ہیں یا نہیں اصغر
بہنا کی طرف سے انہیں بھیا علی اکبر — چھاتی سے لگایا کرو صدقے ہو یہ خواہر
جب تک تری ہو یاد اشکوں سے منہ دھوتی ہوں بھائی
پہروں علی اصغر کے لئے روتی ہوں بھائی

وہ بالوں میں بو مشک کی وہ چاند سا ماتھا — وہ نرگسی آنکھیں وہ بھویں گل سا وہ چہرا
غنچہ سا دہن کھولکے وہ دودھ کا پینا — یاد آتا ہے جس دم الٹ جاتا ہے جی میرا
صدقے ہوں جو ان پاؤں کو اور ہاتھوں کو پاؤں
چین آئے جو تلووں کو آنکھوں سے لگاؤں

چھاتی پہ مری دھر دیتی تھی منہ پیار سے جس دم — ہنس ہنس دیا تھا ہو جاتی تھی میں بھی خوش و خرم
گرمی کا ہے موسم یہی رہتا ہے مجھے غم — پردیس میں کیا جانئے کیا ہوئیگا عالم
اماں بھی گئی ہیں مری روتی ہوئی گھر سے
گھٹ جائے کہیں دودھ نہ ایذائے سفر سے

یہ گود لئے گھر میں وہ پردیس سے آئیں — کبرا بھی ہو اور ساتھ سکینہ کو بھی لائیں
[illegible] کی کریں سال گرہ دودھ بڑھائیں — پر فاطمہ بیمار کو دل سے نہ بھلائیں
طاقت غم دوری کی نہیں رنج و تعب کی
حق سب کو رکھے شاد دعا گو ہوں میں سب کی

نانی نے سنی جس گھڑی صغرا کی یہ گفتار — گھبرا کے کہا خیر ہے اے فاطمہ بیمار
اکبر ہیں کہاں اور کہاں ہیں شہ ابرار — اس وقت تو کس سے مخاطب ہے مری دلدار
اتنا دل مضطر کو سنبھالے تو سنبھل جائے
تن سے انہیں باتوں میں کہیں دم نہ نکل جائے

کرتی ہے سخن جن سے وہ ملتے ہیں سفر میں — پردیسیوں کو لائے خدا خیر سے گھر میں
دن رات کہاں رونے کی طاقت ہے جگر میں — بس صدقے گئی درد زیادہ ہو نہ سر میں
اوقات تو بے روئے گذرتے نہیں اک دم
باعث ہے یہی تپ جو اترتی نہیں اک دم

کیوں روتی ہو دل کھینچ میں پھیلاؤں میں واری — آجاتی ہے اب بی بی کے بابا کی سواری
آزار میں لازم نہیں یہ گریہ و زاری — پہچانے گا کاہے کو کوئی شکل تمہاری

منہ آنسوؤں کا آنکھوں سے برساتی ہو صغرا
پیتی ہو دوا کچھ نہ غذا کھاتی ہو صغرا

لو جو کہو تم آج وہ کھانا میں پکاؤں — پی لو یہ ٹھنڈائی تو خبر لینے کو جاؤں
صغرا نے کہا کھانے کو کیا خاک میں کھاؤں — پی لوں یہ دوا ہاں جو خبر باپ کی پاؤں
کچھ دکھ میں ہیں وہ لوگ مجھے عشق ہے جن سے
پانی تو اٹکتا ہے گلے میں کئی دن سے

یہ وجہ نہیں یہ علی اکبر کا نہ آنا — اب پانی کا ساغر نہ مرے سامنے لانا
بابا سے مرے پھر گیا ہے سارا زمانہ — دل کہتا ہے جب گھر مرے لاتی ہو کھانا
ہے ہے تجھے کیونکر یہ غذا بھاتی ہے صغرا
شبیر تو فاقے سے ہیں تو کھاتی ہے صغرا

نانی سے یہ صغرا ابھی کہتی تھی کہ یکبار — یوں مادر عباسؑ نے کی آن کے گفتار
حاکم کے گھر آیا ہے کوئی پرچۂ اخبار — ہوتا ہے منادی کی یہ تقریر سے اظہار
خلقت کی طلب ہے کوئی گھر میں نہ رہے گا
سب جاتے ہیں قاصد وہ خبر سب سے کہے گا

یہ سنتے ہی رنگ اڑ گیا امّ سلمہ کا — سر جب سے تو تکیہ پہ دھرے روتی تھی صغرا
اٹھ بیٹھی شتاب اور کہا ہے ہے میں کروں کیا — حاکم کو خبر آئی یہاں کوئی نہ آیا
کیسی ہے خبر جی میرا گھبراتا ہے لوگو
سینے سے جگر منہ کو چلا آتا ہے لوگو

عباسؑ کی مادر نے کہا خیر ہے واری — ہر بات میں رو دینا تو عادت ہے تمہاری
پردیسیوں کے پیچھے مناسب نہیں زاری — جو ہوئیگا میں جا کے خبر لاؤں گی ساری
زہرا کے کلیجہ کا تو پیوند ہے شبیر
صدقے گئی میرا بھی تو فرزند ہے شبیر

فرما کے یہ اوڑھی سر پر نور پہ چادر — پر دونوں قدم کانپتے تھے ضعف سے تھر تھر
نکلیں جو ہیں بوڑھی بھی عصا ہاتھ میں لے کر — عورات محلہ بھی چلیں مضطر و ششدر
رستے میں یہ تھا ذکر کہ کچھ ہمکو خوشی ہو
یارب خبر خیریت سبط نبی ہو

پہنچیں در حاکم پہ تو کثرت نظر آئی — تھی کشمکش اس طرح کی جو راہ نہ پائی
ٹھیری جو عصا ٹیک کے وہ غم کی ستائی — عورت کوئی تب بڑھ کے سخن لب پہ یہ لائی
سن لیں خبر سبط رسول دو جہاں کو
اے خلق خدا راہ دو عباسؑ کی ماں کو

سنکر یہ سخن جلد انھیں لوگوں نے دی راہ   کیا دیکھتی ہیں جا کے اس انبوہ میں ناگاہ
منبر پہ بیاں کرتا ہے قاصد یہ بصد آہ   اے خلق خدا حکم سے حاکم کے ہو آگاہ

اخبار سنو فتح کا دل شاد ہو سب کا
بھجوایا ہے مژدہ یہ ہمیں عیش و طرب کا

گھبرا کے یہ عباسؑ کی مادر نے پکارا   اے قاصد غمگین ابھی خاموش خدارا
جلد آنے کا واں مجھ میں نہیں ضعف سے یارا   منبر تلک آؤں میں تو کہہ ساتھ سارا

صغرا غم فرقت سے چراغ سحری ہے
کیا فاطمہ کے لال کی کچھ خوش خبری ہے

یہ کہتے ہوئے پاس جو پہنچی وہ دل افگار   قاصد نے کہا کس کی خبر کی ہو طلبگار
کیا ساتھ تھا حضرت کے تمہارا کوئی دلدار   فرمایا بیاں کر خبر سید ابرار

ساتھ ان کے اگر ہیں مرے بیٹے بھی تو کیا ہیں
سو ایسے پسر لال پہ زہرا کے فدا ہیں

قاصد نے کہا رو کے سن اے بیکس و پُر غم   تھی دوسری تاریخ کہ پہنچے شہ عالم
اترا ہوا تھا نہر پہ واں لشکر اظلم   آرام تھکے ماندوں نے پایا نہ کوئی دم

پنجم کو محرم کی اک آفت ہوئی برپا
تاریخ چھٹی تھی کہ قیامت ہوئی برپا

بس بند ہوا ساتویں تاریخ سے پانی   دو روز رہی فاقہ کشی تشنہ دہانی
دسویں کو صف آرا ہوئے سب ظلم کے بانی   لڑنے کو چڑھا حیدرِ کرار کا جانی

مارے گئے پیاسے رفقا شاہ زمن کے
ٹکڑے نہ ملے لاشۂ فرزند حسنؑ کے

عباسؑ کی ماں سن کے لگی کانپنے تھر تھر   چلائی کہ اس وقت چھری چل گئی دل پر
مارا گیا افسوس جگر گوشۂ شبّر   کیا ساتھ نہ تھا شاہ کے عباسؑ دلاور

کیوں پہلے نہ لی رن کی رضا شاہ زمن سے
شرمندہ کیا اس نے مجھے روحِ حسنؑ سے

سائے کی طرح ساتھ رہا کرتا تھا دن رات   کیا راہ میں بھائی سے جدا ہو گیا ہیہات
کیا قہر کیا ایسی بھی کرتا ہے کوئی بات   مارا گیا داماد شہنشاہِ خوش اوقات

میں صدقے ہوں اس پر جو شایستۂ دیں ہے
بخشوں گی نہ دودھ اب میرا کوئی نہیں ہے

اس نے کہا عباسؑ کی تو کون ہے بتلا   بولا کوئی عباسؑ کی مادر ہے یہ دکھیا
رو رو کے کہا قاصد نے کہ حال اسکا کہوں کیا   تھے اپنے علمدار کے عاشق شہ والا

میداں کی رضا جب طلب کرتا تھا آ کر
شبیر اسے رو دیتے تھے چھاتی سے لگا کر

جب پیاس سے مرنے لگی شبیر کی جائی   تب رن کی رضا حضرت عباسؑ نے پائی
دریا پہ دلاور نے شجاعت یہ دکھائی   سب فوج کو یاد آ گئی حیدر کی لڑائی

جب نہر پہ ہاتھ اسکے کٹے تیغ دو دم سے
حضرت کی کمر ٹوٹ گئی بھائی کے غم سے

عباسؑ کی ماں نے کہا المنت واللہ   سو ایسے پسر ہوں تو نثار شہ ذی جاہ
اکبر تو ہے صحت سے مرا چودہویں کا ماہ   سر پیٹ کے تب قاصد پرغم نے کہا آہ

پیاسے تھے بہت جانب کوثر گئے وہ بھی
چھاتی پہ سناں کھا کے جواں مر گئے وہ بھی

پھر تیر سے زخمی ہوا اک ننھا سا بچہ   لاشوں میں لٹا کر اسے روئے شہ والا
جب اس تن تنہا پہ ہوا فوج کا نرغا   زخمی ہوا تیغوں سے تن پاک سراپا

غش کھا کے گرے خاک پہ جب خانۂ زیں سے
تب شمر نے سر کاٹ لیا خنجر کیں سے

یہ سنتے ہی قاصد سے ہوا شور قیامت   عباسؑ کی مادر کی دگرگوں ہوئی حالت
قاصد سے کہا گرچہ نہیں سننے کی طاقت   کچھ کہہ بخدا زینب بیکس کی حقیقت

اتنا تو بتا جیتی ہے یا مر گئی زینب
اس نے کہا کوفے کو کھلے سر گئی زینب

یہ سن کے چلی پیٹتی عباسؑ کی مادر   ہمسائیاں بھی ساتھ تھیں سب کھولے ہوئے سر
دروازہ پہ صغرا تھی پریشاں مضطر و ششدر   رونے کا سنا شور تو چلائی وہ بے پر

لوٹا ہے کیوں حشر یہ برپا ہوا لوگو
جلدی کہو کیا آئی خبر کیا ہوا لوگو

پاس آن کے عباسؑ کی مادر یہ پکاری   سر پیٹو کہ بن باپ کے تم ہو گئیں واری
فردوس میں پہنچی ترے بابا کی سواری   زہرا کی جو دولت تھی وہ لوٹی گئی ساری

سب قتل ہوئے ساتھ شہنشاہِ امم کے
سجاد فقط قید میں ہے پاس حرم کے

غش ہو گئی صغرا تو یہ سنکر خبر غم   گھر میں گئیں لیکے اسے سب بی بیاں باہم
عباسؑ کی مادر نے بچھائی صف ماتم   منہ سب نے جو ڈھانکے تو ہوا حشر کا عالم

تھا شور خلیق اس گھڑی یہ سینہ زنی کا
تھرّاتا تھا روضہ بھی رسول مدنی کا

عشقِ برقی

زہرہ جبیں

ٹن ۔ ٹن ۔ ۔ ۔ ٹننٹن ۔۔۔ ٹن ۔۔ ٹن ۔۔۔

" افوہ ! صبح کام کا وقت اور یہ ٹیلیفون کے سریلے بول ؟ مجھے ذرا نہیں بھاتے ۔ بجنے دو کم بخت کو ۔ کوئی نکمّا ہی ہوگا "

ٹن ٹن ۔ ۔ ۔ ۔

" اب تو دماغ میں بھی گھنٹیاں بج رہی ہیں ۔ دفع کرنا پڑے گا "

رفیعہ نے کڑھائی چولھے سے اُتار کر نیچے پٹکی اور کمرے کی طرف بھاگی ۔ اُس نے ریسیور اُٹھا لیا ۔

" ہلو ! کون ہے ؟ "

" جی ' وہ تو میں سمجھتی ہوں اگر آپ انسان ہوتے تو فون پر بات نہ کرتے ہوتے ۔ ۔ ۔ آپ کا اسم شریف ؟ ۔ ۔ ۔ بعد میں بتلائیے گا ؟ کیوں ؟ ۔ ۔ ۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ مجھی سے بات کرنا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا اجازت ہے ' فرمائیے ۔ ۔ ۔ کیا کہا ۔ ۔ ۔ پھر کہیے ۔ ۔ ۔ بدتمیز ! لوفر ! ۔ ۔ ۔ آپ شریف آدمی ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ اسم شریف ؟ ۔ ۔ ۔ چولھے میں جائیے " اور رفیعہ نے غصّے میں ریسیور کو اسٹینڈ پر رکھ دیا ۔ " لیجیے صاحب نہ نام بتلائیں نہ نشان اور فون پر عشق فرما رہے ہیں ۔ مجھے دیکھا بھی ہے ! جانتا بھی ہے ! اور باتیں بھی کی ہیں ! ایسی آواز تو یاد نہیں کہ تھی یونہی موٹی بھونڈی ! جیسے گلے میں نوالہ اٹک گیا ہو یا بلغم ! کیا زمانے کے اخلاق گرتے جاتے ہیں ۔ اب گھر دن میں فون رکھنا بھی گناہ ہو گیا ! "

ٹن ۔ ۔ ۔ ٹن ۔ ۔ ۔ ٹننٹن ۔ ۔ ۔ ٹن ۔ ۔ ۔

" پھر آ گیا کم بخت ۔ آپ ہی جھک مار کر چلا جائے گا "

ٹن ۔ ۔ ۔ ٹن ۔

" اب تو برداشت نہیں ہوتا ۔ منو ! منو ! کدھر ہو بیٹا جلدی ادھر آؤ "

" جی ۔ امّی ! " منّو بے تحاشا بھاگتا ہوا آیا ۔

" دیکھو بیٹا فون پر کون بلاتا ہے ؟ "

" میں دیکھوں امّی ! " منّو ' جسے رفیعہ کبھی فون کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی ' خوشی سے ناچتا ہوا فون کی طرف بھاگا ۔

" ہلو ۔ ہلو ۔ ہلو ۔ کون ہے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کون بولتا ہے بھئی ؟ نام بتلاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہو ! آج تو امّی نے اجازت دے دی ہے ہمیں بات کریں گے ۔ تم کام کی بات ہم کو بول دو ' ہم امّی کو بول دیں گے ۔ ۔ ۔ پاس ہی تو بیٹھی ہیں آرام کرسی پر ۔ ۔ ۔ اچھا آپ سلام شوق عرض کرتے ہیں ' اور حالِ دل بیان کرنا چاہتے ہیں " منّو نے ٹیلیفون منھ سے الگ کر کے کہا : " امّی ! یہ صاحب سلام شوق ۔ ۔ ۔ "

رفیعہ نے جھپٹ کر فون بند کر دیا ۔ " ہائے امّی کتنا مزہ آ رہا تھا تم نے سب کرکرا کر دیا " منّو بسورنے لگا

" کم بخت کی زبان گدّی سے کھینچ لوں ۔ آنکھیں نوچ لوں " رفیعہ بولی ۔

" امّی وہ تو تمھیں سلام کر رہا تھا ۔ اور تم اُس کو گالیاں دے

ہو رہی ہو ؟"

"بھاگ جاؤ ۔ جاؤ کھیلو جا کر۔"

"کھیل ہی تو رہے تھے ۔ بے کار بلا لیا ۔ بات بھی پوری نہ کرنے دی ۔ اب ہم نصّو کو ادھوری بات کیا بتلائیں ۔" اور منّو ماں سے خفا ہو کر چلا گیا ۔ رفیعہ اُس کی اس معصومیت پر کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔" اِس گندی فضا اور ماحول میں بچّوں کی تربیت کرنا بھی کس قدر مشکل ہے ۔ اب اس لوفر کے جملے اس کے دماغ میں جم جائیں گے ۔ اُسے دُہراتا پھرے گا ۔ نصیرن ! او نصیرن ! برتن دھو لیے یا نہیں ۔ یہاں آؤ ! دیکھو نصیرن یہاں بیٹھ جاؤ اور اس فون کی گھنٹی بجے گی نا' تو اس طرح اٹھانا اور رکھ دینا ۔ اور اگر کوئی بے کار بکواس کرے تو پھر رکھ دینا ۔ سمجھیں ! کتنی ہی مرتبہ بجے اسی طرح بند کر دینا ۔"

"اچھا مالکن ۔" نصیرن نے کہا ۔

"میں ذرا اوپر کے کمرے کی صفائی کرنے جا رہی ہوں ۔ اگر کوئی اپنا نام بتلائے اور کوئی میری سہیلی یا اُن کا کوئی دوست ہو تو مجھ کو بُلا لینا ۔"

نصیرن نے جس کے ہاتھ برتن ملتے ملتے دکھنے لگے تھے ، اس خوشگوار کام کو بہت خوشی سے قبول کیا ۔ تقریباً دس منٹ تک وہ اس خوب صورت اور عجیب برتن بھانڈے سے کھیلتی رہی جسے وہ ہمیشہ دور ہی سے حسرت سے دیکھتی تھی اور جسے چھوتے بھی اُسے ڈر لگتا تھا ۔ "گھنٹی تو بجتی ہی نہیں ۔" اس کا دل اس نئے تجربے کے لیے بے قرار تھا ۔ یکایک گھنٹی بجنے لگی ۔ اُس نے ماؤتھ پیس کو کان پر لگا لیا اور سننے کی کوشش کرنے لگی ۔ "نجانے نگوڑا کیا بولتا ہے ۔ مجھے تو کچھ سننے میں نہیں آتا ۔ ۔ ۔" اس کے منھ میں کچھ آواز گھسنے لگی اور اُس نے گھبرا کر ٹیلیفون پلٹا دیا ۔

"یہ کیا کر رہی ہو نصیرن !" احمد کی گرج دار آواز کمرے میں گونج گئی اور نصیرن بوا کے ہاتھ سے آلہ چھوٹ پڑا ۔

"کیا حماقت ہے ۔ یہ تمھاری مالکن کدھر گئیں ؟"

نصیرن سر پر پیر رکھ کر بھاگی ۔ اُس کے منھ سے ایک بات بھی نہیں پھوٹی ۔ احمد نے ریسیور اٹھا لیا ۔ "ہلو ۔ ۔ ۔ آپ ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ بالکل اچھی ہے طبیعت ۔ ۔ ۔ آپ کس قدر خیال رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ میں تو ابھی باہر سے آ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ اور مجھے ذرا جلد ہی جانا خود گفتگو کر لیجیے نا ۔ ۔ ۔ میں ابھی بلاتا ہوں ۔" اس نے آلۂ د سے اپنا منھ الگ کیا "رفیعہ ! رفیعہ !"

وہ پھر فون کی طرف متوجہ ہوا ۔ "بھابھی تو ٹھیک ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ میں خود آنے والا تھا ۔ پر جانتے ہو مصروف انسان ہوں ۔ ۔ ۔ معافی مانگ لینا ۔ وہ رفیعہ آ گئی ۔ ۔ ۔ اچھا گڈ بائی ۔"

"ڈاکٹر صاحب تمھارے لیے پریشان ہو رہے ہیں اور تم نے نصیرن کو فون کا تجربہ کرنے کے لیے بٹھا دیا ۔ بھئی ! ایسی کیا مصروفیت ہے کو سنبھالو !"

"ذرا ٹھہریے ! مجھے آپ سے ایک پُرلطف بات بتانی ہے ۔"

"نہیں پھر سنوں گا !" احمد نے جواب دیا اور جس بادِ پائی کے ساتھ وہ وارد ہوا تھا' اُسی طرح غائب ہو گیا ۔

"ہلو ڈاکٹر صاحب ! ۔ ۔ ۔ میری طبیعت اب بہتر ہے ۔ ۔ ۔ آج درد سر نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ بالکل اچھی ہوں ۔ ۔ ۔ معاف کیجیے گا' اوپر کام کر رہی تھی ۔ سکینہ سے کہیے آج دوپہر کو میرے گھر آئے ۔ ۔ ۔ میں ! میں تو کل ہی آئی تھی ۔ ۔ ۔ میں نے نصیرن کو اس لیے بٹھایا تھا کہ ایک بدمعاش مجھے پریشان کر رکھا تھا ۔ کنکشن آف نہیں کیا کیوں کہ خیال تھا کہ آپ یا سکینہ ضرور فون کریں گے ۔ ۔ ۔ بتلایا نا کہ کوئی گنڈا تھا ۔ ۔ ۔ ارے یہی تو آواز تھی ۔ ۔ ۔ آپ تھے ؟ معاف کیجیے گا آپ کو گنڈا کہا ۔ اُف ! یہ کیا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ۔ آپ سے ایسی اُمید نہ تھی ۔ ۔ ۔ میں سب کچھ احمد کو بتلا دوں گی ۔ ۔ ۔ سامنے تو آپ اس قدر شریفانہ باتیں کرتے ہیں اور فون پر عشق فرماتے ہیں ۔ ۔ ۔ آپ کے قلب کا علاج میں کروں ۔ ۔ ۔ خوب ! میں سکینہ سے اس بیماری کا ذکر کروں گی ۔ آپ کا علاج ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ میری بدنامی کیوں ہو گی ؟ ۔ ۔ ۔ ثبوت ! مگر یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ۔ آپ کو ہمارے دوستانہ تعلقات کا بھی خیال نہیں ۔ ۔ ۔ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے ۔ ۔ ۔ سارے تعلقات درہم برہم ہو جائیں گے ۔ ۔ ۔ مہربانی کر کے آپ تشریف نہ لائیے گا ۔ ۔ ۔ میں آپ کے یہاں آؤں ! بس میں آپ سے بالکل گفتگو کرنا نہیں

چاہتی ؟" اور رفیعہ نے نہایت درجہ پریشان ہو کر اور گھبرا کر فون بند کر دیا۔ وہ بہت کھوئی کھوئی اور دل گرفتہ رہی۔ غصے سے بار بار اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ ہر کام وہ اُلٹا سیدھا کرتی رہی۔ کھانے کی میز پر رکھنے کے لیے جب اُس نے چینی کی پلیٹیں اُٹھائیں تو اُس کے ہاتھ سے ایک جھٹکے کے ساتھ فرش پر گر کر چور چور ہو گئیں۔

"اِن بے چاریوں کو کیوں شہید کر دیا!" احمد اچانک اندر داخل ہوا۔

"آپ تشریف لے آئے! گھر میں کچھ بھی ہوتا رہے آپ کو کیا پرواہ ہے صاحب؟ ہم بھی شہید ہو جائیں تو آپ کو غم نہ ہو۔"

"ہم بھی لہو لگا کر شہیدوں میں شریک ہو جائیں گے۔ بیگم صاحبہ!" وہ ہنس پڑا۔ احمد کی اس بذلہ سنجی پر اُس کا جی جل کر خاک ہو گیا۔

"اگر گنڈے اور بدمعاش اس گھر پر حملہ کر دیں تب بھی آپ قہقہہ لگاتے رہیں گے۔"

"اچھا! تو اس کی گنجائش کہاں اور کیسے نکل آئی؟"

"صاحب ٹیلیفون پر۔"

"آپ تو پہیلی بجھانے لگیں، پر میں تو کوئی پہیلی نہیں ہوں۔"

"پہیلی جائے جہنم میں۔"

"سکینہ بھی۔"

"مع اپنے ڈاکٹر کے۔"

"اس ڈاکٹر بے چارے کی کیوں شامت آ گئی؟"

"اس لیے کہ اُس نے بیہودگی شروع کر دی ہے۔ آپ تو کوئی بات سنجیدگی سے سنتے ہی نہیں۔ آج صبح سے وہ بیہودہ واہی تباہی بک رہا ہے۔ پہلے تو آواز بدل کر اُس نے گندگی اُگلی اور پھر کھل کے واہیات باتیں شروع کر دیں۔"

"یقین تو نہیں آتا۔"!

"تو کیا میں آپ سے کبھی جھوٹ بھی بولتی ہوں؟"

"معلوم نہیں۔"

"تو آپ کا جگری دوست ہی سچا ہو گا!"

"میں نے یہ کب کہا؟"

"وہ کہتا تھا اگر تم نے میرا کہا نہ مانا تو میں تم پر الزام لگا کر تم کو بدنام کر دوں گا۔ تم اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتیں اور احمد میرا جگری دوست ہے کبھی بدگمان نہ ہو گا۔"

"سچ تو کہتا ہے۔"

"تو آپ اُس کی باتوں پر یقین کریں گے؟"

"ارے! جانے بھی دو۔ ان بے کار باتوں میں کیا رکھا ہے۔ آؤ! کھانا کھائیں۔" سارے کھانے کے درمیان رفیعہ منہ پھلائے رہی۔ وہ حیران تھی کہ اُسے کیسے یقین دلائے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ آخر ایک مصمم ارادے کے ساتھ وہ ڈاکٹر محمود اور سکینہ کا انتظار کرنے لگی۔

"آؤ یار محمود! آئیے نا بھابھی!" احمد نے دونوں کو بہت تپاک سے بٹھایا پھر رفیعہ کی طرف مخاطب ہوا۔ "رفو! محمود کے لیے چائے منگواؤ نا!"

"جی! چائے سے پہلے میں فیصلہ کر لینا چاہتی ہوں۔ ہاں! ڈاکٹر صاحب! آج آپ فون پر اس قدر لغو اور بیہودہ باتیں کیوں کر رہے تھے۔ سکینہ تمہیں اپنے شوہر صاحب کے کرتوت معلوم ہیں؟ تم پر جان چھڑکنے والے مسٹر محمود اب مجھ پر عاشق ہو گئے۔"

"بھابھی! کہیں تمہارا بلڈ پریشر تو نہیں بڑھ گیا ہے۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"جی! میرا پریشر بالکل درست ہے۔ میں وہی کہہ رہی ہوں جو آپ سن رہے ہیں۔"

"سچ مچ رفیعہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ بہت کمزور معلوم ہو رہی ہو۔" سکینہ نے ہنس کر کہا۔ "ڈاکٹر تو سب کا بھائی ہوتا ہے۔ وہ کسی قسم کے بُرے خیال اپنے دل میں کیسے لا سکتا ہے۔" اُس نے اپنے شوہر کی صفائی دیتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

"بے شک! جب تک ایک ڈاکٹر کا اخلاق اعلیٰ نہ ہو وہ کیوں کر کامیاب ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔ کیوں دوست! تم تو اس نکتے کو خوب سمجھتے ہو۔" محمود نے احمد کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ پھر وہ رفیعہ کی طرف پلٹا۔

"بھئی بات تلخ ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رفیعہ ہی تو کچھ میرا خیال رکھنے لگی ہے۔ ادھر کئی مہینے سے یہ تبدیلی میں ان میں دیکھ رہا ہوں۔ دراصل یہ بیماری وغیرہ سب بہانہ ہے۔"

رفیعہ تلملا گئی۔ "شرم نہیں آتی تمہیں اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے۔

میں اِسے ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔ اس گھر میں اب تمھاری کوئی گنجائش نہیں۔ بے حیائی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

پھر وہ احمد سے مخاطب ہوئی۔ "آپ بیٹھے یہ سب سُن رہے ہیں۔ ان سے کہیے فوراً چلے جائیں یہاں سے۔ ابھی چلے جائیں!"

"تم میرے شوہر کو اس قدر ذلیل کرنے کا کیا حق رکھتی ہو؟"

سکینہ چلائی۔ "وہ سچ کہتے ہیں۔ تم ہی ان کے پیچھے پڑی ہوئی ہو!"

رفیعہ نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔ "آپ اب بھی خاموش ہیں۔ کیا آپ بھی . . . ."

"یہ تو لاجواب ہیں۔ اب تو سکینہ کی بھی شہادت موجود ہے"! ڈاکٹر نے ایک قہقہہ لگایا۔ رفیعہ کا چہرہ ایک بار پھر غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے اپنا مُنھ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

"آپ کو میرا جواب چاہیے۔ مسٹر محمود؟ تو لیجیے۔ سنیے"! اور احمد نے کونے کی ٹیبل سے ایک ٹیپ ریکارڈ اُٹھایا اور اُسے مشین میں فٹ کر دیا۔ گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر کی آواز سُنائی دی۔ پھر رفیعہ کی۔ اور صبح کا مکالمہ دوہرایا جانے لگا۔ رفیعہ نے حیران ہو کر سر اُٹھایا۔ سکینہ اور ڈاکٹر سکتے کے عالم میں آنکھیں پھاڑے سُن رہے تھے۔ محمود گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ پژمردہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی کیفیت تھی۔

"تشریف رکھیے صاحب! پُرلطف مکالمہ ہے۔ سُن کر جائیے۔ بھابھی صاحبہ آپ کی شہادت کیسی رہی!" احمد کا دل نشیں قہقہہ بلند ہوا۔ "ڈاکٹر تو باپ اور بھائی ہوتا ہے!" ڈاکٹر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "اگر میں اس ریکارڈ کو گھر گھر لے جا کر بجانا شروع کر دوں تو خاصی آمدنی ہو جائے۔ اور لوگوں کو ڈاکٹر محمود . . . ."

محمود کا سر احمد کے قدموں کی طرف جھکنے لگا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ یہ ٹیپ ریکارڈ ایسا دوسرا موقع آنے تک مقفل رہے گا۔ اور اُمید ہے کہ آپ بھی اب ایسا موقع نہ آنے دیں گے۔ اب آپ دونوں تشریف لے جا سکتے ہیں۔ کیوں رفیعہ! اب تو ان کی پوری خاطر ہو گئی؟"

اور رفیعہ کے جواب دینے سے پہلے ہی دونوں کمرے سے نکل گئے۔

رفیعہ دوڑ کر احمد سے لپٹ گئی۔ "میں گھر کے معاملات سے اتنا بے خبر نہیں جتنا تم سمجھتی ہو، رفیعہ!"

"آپ نے نیچے کے کمرے کے کنکشن پر اسے لگایا تھا؟"

"ہاں ڈیر!"

"آپ کو کیا معلوم کہ یہ ڈاکٹر آج کس طرح کی گفتگو کرے گا؟"

"میں نے اس کے چہرے اور اس کی نظروں سے پہچان لیا تھا۔ اس کے پہلے بھی میں نے اس کی گفتگو ریکارڈ کی ہے جو بہت شریفانہ تھی۔"

"لیکن آپ کو شک کیوں ہوا؟"

"روزانہ ہی تو ملاقات ہوتی ہے۔ پھر فون پر گفتگو کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں تو اتنی گہرائی تک نہ گئی۔"

"اگر تم بھی اس معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتیں تو یہ افسانہ کیسے بنتا۔"



کوثری اور اُن کا نعتیہ کلام

مناظر عاشق ہرگانوی

دلو رام تخلص کوثری، ضلع حصار (پنجاب) کے قصبہ ماندڑی میں پورنماشی شدی پوہ سمت ۱۹۳۹ بکرمی، وقت شام، ساعت طلوع بدر، شب سہ شنبہ کو پیدا ہوئے۔ یہ بشنوئی برادری کے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ دلو رام کے آبا و اجداد کا سلسلۂ نسب چوہان خاندان کے راجپوتوں سے ملتا ہے۔ بعد میں ان کے رشتے جاٹوں میں اور پھر جاٹوں سے بشنوئی برادری میں استوار ہوئے اور اس طرح یہ لوگ بشنوئی برادری میں شامل ہو گئے۔ کوثری کی تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اس شوق نے اتنی شدت اختیار کی کہ تعلیم ترک کر دی۔ ان کے والد کبھو رام ان کی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے طبی تعلیم کے لیے انھیں لاہور کے ایک کالج میں داخل کرا دیا۔ لیکن یہاں بھی ان کی طبیعت نہ لگ سکی اور کالج چھوڑ کر سارا وقت شاعری میں صرف کرنے لگے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔

شروع شروع میں جب وہ لاہور کے مشاعروں میں شریک ہوئے تو عروضی خامیوں کے باعث ان کا کلام قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ لاہور ہی کے ایک مشاعرے میں جب انھوں نے اپنی وہ غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

پہلے نہ سوجھتی تھیں، یہ چالیں صبا تجھے
کوچۂ صنم کی لگ گئی شاید ہوا تجھے

تو ایک شاعر نے غزل کے دوسرے اشعار کو بحر اور وزن سے خارج بتلا کر انھیں مشورہ دیا کہ پہلے وہ فن عروض پر عبور حاصل کریں اور اس کے بعد مشاعروں میں شریک ہوں۔ اس بظاہر چھوٹے سے واقعے نے ان کی شاعرانہ زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ انھوں نے وہیں لاہور میں ایک عالم اور عروض داں سے علم عروض پڑھنا شروع کر دیا۔ غالباً یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ لیکن یہاں جب طبیعت کو سیری نہ ہوئی اور علم کی پیاس اور بڑھی تو کوثری شہر سامانہ ریاست پٹیالہ جا پہنچے۔ یہاں انھوں نے ایک جید عالم اور مجتہد مولانا سید عنایت علی کی خدمت میں دس بارہ برس حاضر رہ کر فارسی اور علم عروض و فن شعر کی متعدد کتابیں پڑھیں اور انتیس (۲۹) سال کی عمر میں بعد تحصیل فن شعر و ادب، وطن واپس ہوئے۔

کوثری کی شاعری کی ابتدا بھی اس زمانے کے دستور کے مطابق غزل گوئی سے ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے حافظ شیرازی کی بعض غزلوں اور ہفت بند کاشی پر فارسی میں تضمین بھی کی لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کی شاعری کا رنگ بدل گیا۔ اور انھوں نے غزل گوئی کے کوچے سے نکل کر نظم گوئی کے میدان میں قدم رکھا اور مختلف موضوعات پر نظمیں خصوصاً نعت لکھنے لگے۔ اسلامی روایات پر کثرت سے نظمیں لکھی ہیں۔ محمدؐ و آل محمدؐ کی مدح و ثنا میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں۔ صحابہ کی تعریف میں بھی متعدد نظمیں کہی ہیں۔ ہندوؤں، سکھوں، مرہٹوں اور آریاؤں وغیرہ کے بارے میں بھی چند منظوم کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

حیدرآباد دکن، بھوپال، رام پور، بہاول پور اور پٹیالہ کے درباروں میں کوثری کی رسائی تھی۔ ان ریاستوں میں وہ متعدد بار گئے

بھی رہے تھے۔ والیانِ ریاست نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر انھیں انعام واکرام اور صلہ وخلعت سے نوازا۔

حیدرآباد دکن میں مہاراجہ بہادر سرکشن پرشاد سے کوثری کو نیاز حاصل تھا یہاں انھیں دادِ سخن کے ساتھ انعام بھی ملا۔ ایک دن مہاراجہ بہادر نے خوش ہو کر اپنے دست وقلم سے یہ شعر لکھ کر دیا تھا؎

بے سخن گوئی میں فردِ منتخب — کوثری بھی انوری سے کم نہیں

بھوپال میں کوثری دو مرتبہ مہمان ریاست ہوئے۔ سرکار عالیہ بیگم نے پس پردہ بیٹھ کر ان سے نعتیہ کلام سنا اور ان کی بے حد قدردانی کی۔

رام پور میں کوثری سات مرتبہ مہمان ریاست ہوئے ایک مرتبہ دربار میں نواب صاحب نے خود بآوازِ بلند ان کے کلام کی داد دی۔

بہاول پور اور پٹیالہ میں کوثری کی اتنی قدر ومنزلت نہیں ہوئی جتنی دوسری ریاستوں میں ہوئی۔ وجہ کیا تھی یہ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ ان دونوں ریاستوں کے درباروں میں بھی ان کی رسائی تھی۔

رسالہ صوفی اور بعض دوسرے رسائل اور اخبارات میں ان کے نام کے ساتھ "فردوسیِ ہند" اور "قادر الکلام" کے خطاب بھی نظر آتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوثری نے صفِ شعرا میں نہ صرف اپنے لیے ایک ممتاز جگہ پیدا کر لی تھی بلکہ ان کی شاعرانہ عظمت کا عام طور سے اعتراف کیا جانے لگا تھا۔

شاعری میں کوثری نے کسی کی شاگردی قبول نہیں کی تھی۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: "میں نے علماء سے فن شعر، علم عروض، اردو فارسی لٹریچر برسوں تک پڑھا ہے مگر شاعری میں کسی شاعر کو استاد نہیں مانا۔ کیونکہ ایک عالم ذی علم نے مجھے ہدایت فرمائی کہ کسی شاعر کو استاد نہ بناؤ۔ تم قدرتی ایک بہت بڑے شاعر ہوگے۔ اس لیے کسی شاعر سے اصلاح نہ لی۔ حالانکہ میری ابتدائی شاعری کے زمانہ میں حالیؔ، داغؔ، امیرؔ جیسے اساتذۂ باکمال موجود تھے۔ اخبارات میں نظمیں دیکھ دیکھ کر نادیدہ قدردانوں نے میرے پاس تقریباً پانچ ہزار خطوط...... دس سال کے عرصہ میں روانہ فرمائے.... دیگر ممالک تک بھی میری نظمیں پہنچی ہیں اور وہاں سے بھی خطوط داد وتحسین حاصل ہوئے ہیں..... شروع شاعری میں میں نے ایک خواب دیکھا کہ "میں سخت تشنہ لب ہوں، اپنی والدہ صاحبہ سے میں نے پانی مانگا، انھوں نے پانی دیا مگر وہ پانی سرخ رنگ کا تھا۔ میں نے نہیں پیا اور اپنی والدہ صاحبہ سے عرض کی کہ میں دعا کرتا ہوں ابھی بارش ہوگی۔ چنانچہ بارش شروع ہوئی اور بڑے بڑے قطرے سفید رنگ کے آسمان سے گرے اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اوپر کا اوپر پانی لے کر خوب پیا اور سیر ہوگیا۔ ایک عالم نے اس کی تعبیر بتائی کہ تم خوب تحصیل علم کروگے اور رحمت الٰہی تم پر نازل ہوگی ...... کوثری تخلص میں نے خود دہلی میں برف کی سرائے کے سامنے ٹہلتے ہوئے سوچا تھا۔ یہ تخلص نیا ہے۔ فردوسی کا ہم سایہ ہوں، فردوس اور کوثر آس پاس ہیں۔"

مختصر یہ کہ دلو رام کوثری، صوبۂ پنجاب کے ایک کامیاب نعت گو شاعر تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی تھیں مگر ان کا ابتدائی کلام نایاب ہے البتہ صوفی وغیرہ رسائل میں ان کا نعتیہ کلام مل جاتا ہے۔ کوثری کی سب سے بڑی خوبی جو مجھے نظر آئی وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں مضامین تمام نئے ہیں اور انھوں نے پامال اور پیش پا افتادہ مضامین بہت کم باندھے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ابھی کوثری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ حالانکہ وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور عظمتوں پر بھرپور روشنی ڈالی جائے۔

افسوس ہے کہ باوجود سعی وکوشش کوثری کا سن وفات معلوم نہ ہوسکا۔ ممکن ہے کسی صاحب نظر کی توجہ سے اس کا پتہ چل جائے اور کوثری کے سوانح حیات کا سلسلہ پورا ہوجائے۔

ذیل میں کوثری کے نعتیہ کلام کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

ذرا نقشہ نعت کا کر نظارہ — ہے کیا نقش بہزاد و مانی میں رکھا
بہار ریاض ثنائے نبیؐ نے — دہن کو مرے گل فشانی میں رکھا

نہ کھولوں گا برق تجلی سے آنکھیں — تصور رہے تیرا سدا یا محمدؐ
خدا تیرا عاشق، تو عاشق خدا کا — میں تم دونوں پر ہوں فدا یا محمدؐ
خدا کی خدائی میں تجھ سا نہیں ہے — تو یکتا ہے بعد از خدا یا محمدؐ

نبیؐ کے واسطے سب کچھ بنا ہے — بڑی ہے قیمتی جانِ محمدؐ
شریعت اور طریقت اور حقیقت — یہ تینوں ہیں کنیزانِ محمدؐ
نبیؐ کا نطق ہے نطق الٰہی — کلام حق ہے فرمانِ محمدؐ

زباں کا یہی ہے اشارہ لبوں کو — کہیں مل کے باہم محمدؐ محمدؐ
صلہ ہو یہی نعت گوئی کا میری — خدا خوش ہو، خرم محمدؐ محمدؐ

آیا ہے حدیثوں میں نبیؐ نور خدا ہے — اللہ کا دیدار ہے دیدار محمدؐ
کچھ عشق پیمبرؐ میں نہیں شرط مسلماں — ہے کوثری ہندو بھی طلبگار محمدؐ

جدا کیا لام دلو رام سے میم محمدؐ سے — تعلق سو طرح کا ہے مشدّد سے مشدّد کا
محمدؐ اور دلو رام میں نقطہ نہیں کوئی — کہ ہے مداح اور ممدوح میں یہ ربط کس حد کا
کبھی گنگا میں آ ڈوبا کبھی کوثر پہ جا نکلا — پتہ کچھ بھی نہیں مخصوص دردیش مجرد کا
یہی ہر چار عنصر کا اشارا ہے کہ لے رستہ
مدینے کا، نجف کا، کربلا کا اور مشہد کا

لے کے دلو رام کو حضرت گئے جنت میں جب
غل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے

محشر میں دی فرشتوں نے داور کو یہ خبر
ہندو ہے ایک احمدؐ مرسل کا مدح گر
ہے بت پرست اگرچہ وہ لیکن ہے نعت گو
احمدؐ کی نعت لکھتا ہے دنیا میں بیشتر
ہے نام دلو رام تخلص ہے کوثری
لے جائیں اس کو خلد میں یا جانب سقر
سنتے ہی یہ ملائکہ سے اک انوکھی بات
فرمایا ذوالجلال نے جنت ہے اس کا گھر
اللہ اکبر احمدؐ مرسل کا یہ لحاظ
کی حق نے لطف کی سگ دنیا پہ بھی نظر

کوثری نے حمد بھی کہی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کبھی زمزم میں جا ڈوبا کبھی گنگا میں آ نکلا — کہ ہندو اور مسلماں میں تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے
مسدس میں مخمس میں رباعی میں تغزل میں — غرض ہر ایک دیواں میں تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے
جو ڈھونڈا کوثری نے تجھ کو پایا ہر جگہ یا رب — عیاں میں اور نہاں میں تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے



ریہانداور اوبرا کو بڑے بجلی گھروں سے ملانے کا پروجیکٹ

اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ ریاست کے شمالی منطقوں کے بڑے بجلی گھروں کو ریہانداور اوبرا کے بجلی گھروں سے ملانے کے ۱۲ء۶۶ کروڑ روپیہ کے پروجیکٹ کو قطعی شکل دے رہا ہے۔

اس پروجیکٹ کے تحت اوبرا تھرمل بجلی گھر اور سلطان پور نیز سلطان پور اور لکھنؤ کے درمیان ۴۰۰ کے۔وی کی ڈبل سرکٹ لائن بچھانے کے ساتھ ہی سلطان پور اور لکھنؤ میں ۴۰۰۔۲۲۰ کے۔وی کا ایک ذیلی بجلی گھر بنانے کی بھی تجویز ہے۔

امید ہے کہ یہ پروجیکٹ چوتھے منصوبہ کے دوران مکمل ہو جائے گا اور اس سے سنہ ۱۹۷۳-۷۴ء سے اس پر لگائی گئی اصل پونجی کے ۱۰ء۷۹ فی صدی کے برابر آمدنی ہونے لگے گی۔

اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی

ڈاکٹر عباس عمار

[ذیل میں ڈاکٹر عباس عمار، سابق پروفیسر سوشل انتھراپالوجی، قاہرہ یونیورسٹی، مصر اور سابق وزیر برائے سماجی امور و تعلیمات، حکومت مصر کے ایک مضمون " خاندانی منصوبہ بندی کے نفسیاتی اور سماجی پہلو — ایک عرب مسلم کا نقطۂ نظر" کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔]

ایک ایسے ملک میں جہاں کی آبادی کی غالب اکثریت کا سرکاری مذہب اسلام ہو اور خاص کر ایسی صورت میں کہ کرسچین سوسائٹی میں بھی ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کے مبلغوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو، ہمیں اس کا احساس ہونا بالکل قدرتی امر تھا کہ شیوخ، جن کا اثر عوام الناس پر ہمیشہ بہت زیادہ رہا ہے، اس معاملے میں کتنے زود حس ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان شیوخ نے خود کھلم کھلا اس مسئلے کو اٹھایا ہی نہیں بلکہ ان میں سے بہتوں نے اس خیال کی مخالفت یہ کہہ کر کی کہ یہ تعلیمات اسلام کے منافی ہے لیکن خوش قسمتی سے اسلام کا رویہ اس طرح کے معاملات میں کبھی بھی غیر استدلالی نہیں رہا ہے، اور خاندانی منصوبہ بندی کے مبلغوں کو قرآن کریم اور رسول مقبول کے اقوال کی بے لوچ تفسیر کرنے والوں کے استدلال بہت زیادہ متاثر نہیں کر سکے ہیں۔ پھر ان شیوخ میں بھی خاصی تعداد ایسوں کی ہے جن کا نظریہ اس معاملے میں بالکل مختلف ہے۔ مصر کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا نے جو فتویٰ دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحت کی خرابی، معاشی دشواری حتیٰ کہ سماجی ضرورت کے پیش نظر ضبط تولید پر عمل کرنے کا اسلام مخالف نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس سلسلے میں بعض شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے اور یہ کہ اس حق کا بیجا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ بعض آزاد خیال مسلم مفکرین نے اس سے بھی کہیں زیادہ ترقی پسندانہ رویہ اپنایا ہے۔ ممتاز ترین مسلم فیلسوف الغزالی نے ضبط تولید پر عامل ہونے کے لیے من جملہ دیگر وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ اس سے رفیقۂ حیات کا حسن و جمال برقرار رہتا ہے۔

غرض یہ کہ ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔ بہرحال شیوخ کی ایک چھوٹی سی رجعت پسند اقلیت کو چھوڑ کر اُن کی اکثریت مذکورۂ بالا فتوے سے متفق ہے۔ اس کے باوجود اس سلسلے میں اب بھی جو الجھن پائی جاتی ہے اس کی وجہ دراصل خاندانی منصوبہ بندی کے اصول کے اطلاق کے بارے میں بعض غلط فہمیاں ہیں۔ بعض مخالفین اس حق کو کسی قانون کے ذریعے نافذ کیے جانے کے شدید مخالف ہیں اور کچھ لوگ اس کے مخالف ہیں کہ افراد خاندان کے سلسلے میں کوئی تعداد مقرر کی جائے، لیکن خاندانی منصوبہ بندی کے مبلغوں کے ذہنوں میں اس طرح کا کوئی تصور کبھی نہیں رہا۔ وہ واضح طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی بھی سماجی تبدیلی ہو، خاص طور سے جہاں خاندان کا سوال پیدا ہوتا ہو، اس کا تعلق ذہنی تربیت سے ہے۔ وہ "حد بندی" نہیں بلکہ "کنٹرول" پر زور دیتے ہیں کیوں کہ خاندان کے سائز کا تعین ہر فرد کے مخصوص حالات ہی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے اس کی طرف مذکورہ بالا سطور میں رہ

کیا جا چکا ہے۔ پھر بھی موجودہ فیملی پلاننگ کلینکوں کی سرگرمیوں کے بارے میں دستیاب اعداد و شمار اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ عوام کو ان کلینکوں سے کتنی گہری دلچسپی ہے۔ لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اُس مسئلے کو جو برسوں سے ان کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا، حل کرنے میں مدد دینے کے لیے اس طرح کے کلینک کتنے ضروری ہیں۔

فتوے کا متن

[مفتی مصر شیخ عبدالمجید سلیم کا اصل فتوی (نمبر ۸) جو دارالافتا سے ۱۲ ذیقعد ۱۳۵۶ھ (۲۵ فروری ۱۹۳۷ء) کو جاری کیا گیا۔ رجسٹر نمبر ۴۳]

سوال: ایک شادی شدہ مرد کے ایک بچہ ہے۔ اسے خوف ہے کہ اگر اس کے متعدد اولادیں ہوں گی تو وہ ان کی پرورش و پرداخت اور ان کی دیکھ بھال میں قاصر رہنے کے باعث ذہنی اُلجھنوں میں مبتلا رہے گا، یا یہ کہ بچوں کے سلسلے میں جو ذمے داریاں اور فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو انجام نہ دے سکنے کی صورت میں اس کی صحت پر خراب اثر پڑے گا اور وہ اعصابی ہیجان میں مبتلا ہو جائے گا یا یہ کہ اس کی زوجہ کی صحت پر بار بار حمل قرار پانے اور بچہ کشی کے باعث آرام کا وقفہ اور زمانۂ حمل میں اس کی جو قوت اور اُس کے جسم کی جو توانائی زائل ہوتی ہے اس کو بحال کرنے کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے مضر اثر پڑے گا۔

ایسی صورت میں کیا اُس شخص کو یا اُس کی زوجہ کو یہ حق ہے کہ وہ کسی ڈاکٹر کے مشورے سے ایسی سائنسی تدبیریں اختیار کرے جن سے حمل کے درمیان کا وقفہ بڑھ جائے تاکہ ماں کو آرام ملے اور اس کی صحت بحال ہو سکے اور باپ کی صحت پر بُرا اثر نہ پڑے اور وہ اقتصادی یا سماجی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہو۔

جواب: سوال میں جو حالات درج کیے گئے ہیں ان میں حمل کو روکنے کے لیے بعض تدبیریں اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ عزل کیا جائے یا یہ کہ عورت رحم کا منھ بند کرنے کے لیے کوئی چیز اندر رکھ لے تاکہ مادۂ تولید اندر نہ پہنچ سکے۔

اصول یہ ہے کہ مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ عزل کرے الّا یہ کہ زوجہ اس کی اجازت دے اور اسی طرح عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے رحم کا منھ بند کرے سوائے اس صورت میں کہ شوہر اس کی اجازت دے۔

لیکن مرد کو زوجہ کی اجازت کے بغیر عزل کی اجازت ہے اگر اس کو خوف ہے کہ ناقص رہن سہن کے حالات کی وجہ سے غیر صحت مند اولاد ہوگی یا یہ کہ دور دراز کے سفر پہ رہنے کے باعث بچوں کی پرورش و پرداخت پر اثر پڑے گا۔

اسی نہج پر عورت کو شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے رحم کا منھ بند کرنے کی اجازت ہو سکتی ہے اگر اس کے پاس اس کے وجوہ ہیں۔

مختصر یہ کہ شوہر کو یا زوجہ کو ایک دوسرے کی مرضی سے ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کی تدبیر کے طور پر مادۂ تولید کو رحم کے اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے اقدامات کرنے کی اجازت ہے اور اگر مذکورہ یا اسی قبیل کی وجہیں ہوں تو زن و شو میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی اجازت کے بغیر اس طرح کی تدبیریں اختیار کر سکتا ہے۔

کیا دواؤں کے ذریعے حمل کا ساقط کیا جانا جائز ہے؟ ممتاز علمائے اسلام کے نزدیک حاملہ کے لیے بشرطے کہ اس کی صحت کو خطرہ درپیش ہو، ابتدائے زمانۂ حمل میں جب کہ جنین میں حرکت نہ پیدا ہوئی ہو، اسقاطِ حمل جائز ہے۔



اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

ایک لاکھ ایکڑ کے رقبے میں ہری کھاد تیار کرنے کا پروگرام —— سڑک کی تعمیر اور جنگل لگانے کی اسکیم —— انجینیرنگ کی تعلیم کے لیے نئے وظائف —— شکر فیکٹریوں کے علاقے میں نجی نل کنوؤں کی تعمیر —— محکمۂ غذا کے قواعد کے مطالعے کے لیے نگراں کمیشن کا فیصلہ —— تکنیکی تعلیم کے لیے قرضوں کے واسطے مزید چھ لاکھ کا بندوبست —— برما سے آئے ہوئے ہندستانیوں کے بچوں کے لیے تعلیمی مراعات —— اپریل میں روزگار دفتروں نے ۶۴۵۰ افراد کو روزگار مہیا کیے —— خریف میں زیادہ پیداوار دینے والے دھان کی کاشت کا پروگرام —— گنے پر خریداری ٹیکس میں چھوٹ —— قومی دفاعی فنڈ میں ۳ر۳۸ کروڑ کا عطیہ —— متفرقات

خریف مہم کے تحت اتر پردیش کے ہر ضلع میں کم سے کم ایک لاکھ ایکڑ کے رقبہ میں ہری کھاد تیار کی جائے گی۔ مزید براں شہری اور دیہی علاقوں میں بڑے پیمانے پر کمپوسٹ کھاد تیار کرنے کا بھرپور پروگرام شروع کیا جائے گا۔

اس اندیشے کے پیش نظر کہ کیمیاوی کھاد کی تمام ضروریات مالیاتی سال رواں میں شاید پوری نہ ہو سکیں گی، کمپوسٹ کھاد تیار کرنے اور ہری کھاد کے پروگرام کی رفتار تیز تر کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔

سدا بہار درخت کی پتیوں وغیرہ کو توڑ کر کمپوسٹ کے گڑھوں میں ڈالنے کے لیے ایک خصوصی مہم شروع کی جائے گی۔ متعلقہ عملہ کو خاص طور پر ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ وہ ہر بلاک میں اگلے بوائی کے سیزن سے پہلے کسانوں کو بیجوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے ہری کھاد کے پیکٹ تقسیم کریں۔

ایسے علاقوں میں جہاں کسی وجہ سے ہری کھاد تیار نہ کی جا سکتی ہو مناسب پھلی دار فصلوں کی کاشت کرنا چاہیے جن سے عوام کو غذا اور زمین کو کھاد مل سکے۔ چوماس کے علاقوں میں لوبیا، مونگ ٹی۔۱ اور ۴۴ نیز اُڑد ٹی۔۹ کی کاشت بہت مناسب ہوگی۔ اس کے علاوہ باجرہ کے ساتھ مونگ پھلی بھی بوئی جا سکتی ہے۔ اس سے باجرہ کی پیداوار پر کوئی اثر پڑے بغیر مونگ پھلی کی مزید پیداوار ہوگی۔

ریاستی محکمۂ جنگلات نے سڑک کی تعمیر اور جنگل لگانے کی ایک اسکیم شروع کی ہے جس سے گڑھ مکتیشور اور رڑکی کا درمیانی فاصلہ ۲۰ میل کم ہو جائے گا اور سڑک کے دونوں کنارے گھنے جنگل کے لگ جانے سے اس بنجر علاقہ میں سفر بھی انتہائی خوش گوار ہو جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت گڑھ مکتیشور (ضلع میرٹھ) سے سکر پور (ضلع مظفر نگر) کے درمیان جو رڑکی سے نہر کی سڑک سے ۱۴ میل دور ہے ۶۰ میل لمبی ایک سڑک تعمیر کرنے کی بھی تجویز ہے۔

مجوزہ سڑک کے دونوں کنارے گھنے جنگل کی پٹی ہوگی۔ یہ پٹی ہستنا پور اور بھوپا شہروں نیز بڑے مواضعات سے ہو کر گزرے گی جہاں مسافر آرام کرنے کے ساتھ ہی ضروریات زندگی کی اشیا بھی حاصل کر سکیں گے۔ سڑک کے کنارے کنارے ٹیلی فون لائن بھی دوڑائی جائے گی جو جنگل کی چوکیوں سے ہو کر گزرے گی۔ فوری ضرورت کے وقت عوام اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

تکنیکی تعلیم کی نظامت اتر پردیش میں آیندہ تعلیمی سال سے انجینیرنگ اور تکنیکی تعلیم کے لیے وظیفوں کی ایک اسکیم شروع کر رہی ہے۔

ابتدا میں اس اسکیم کے تحت ریاست کے مختلف انجینیرنگ کالجوں یا پالی ٹیکنیک اداروں کے مجموعی طور پر ۱۰ فیصدی طلبا کو وظیفے دینے کی تجویز ہے۔

اس مقصد کے لیے موجودہ سال کے بجٹ میں مجموعی طور پر ۱۲ لاکھ روپیہ

رکھا گیا ہے۔

یہ وظیفے ڈگری نصابوں کے لیے ۱۰۰ روپیہ ماہانہ اور ڈپلوما نصابوں کے لیے ۵۰ روپیہ ماہانہ کی شرح سے متعلقہ نصاب کی پوری مدت تک دیے جائیں گے۔

اس ضمن میں اگرچہ تفصیلی قواعد وضع کیے جا رہے ہیں تاہم موٹے طور پر یہ وظیفے لیاقت اور وسائل کی بنیاد پر صرف اتر پردیش کے طلبا کو ہی دیے جائیں گے۔ ان وظیفوں کے مستحق ایسے طلبا ہوں گے جو لیاقت کے امتحان میں فرسٹ کلاس یا کم سے کم ۶۰ فیصدی نمبر حاصل کریں گے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی مدت میں محکمہ گنّا کے زیر سرپرستی گنّا ترقیاتی کونسلوں اور یونینوں کی مدد سے اتر پردیش کے شکر فیکٹری علاقوں میں ۱۷۰۹۴ بجلی ٹیوب ویلوں کی تعمیر کی گئی۔

مذکورہ مدت میں ۱۰۰۰۰ کنوؤں کی تعمیر کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔

تیسرے منصوبہ کے آخری سال کے دوران سب سے زیادہ یعنی ۶۶۰۰ کنوؤں کی تعمیر کی گئی۔

ان کنوؤں کی تعمیر ریاست میں گنّا اور غلّہ کی پیداوار بڑھانے میں معاون ہو رہی ہے۔

نگران کمیشن نے محکمہ غذا اور رسد کے زیر نگرانی منطقہ، ضلع اور دوسری سطحوں پر غلہ اور دوسری ضروری اشیاء کی سپلائی اور تقسیم سے متعلق قواعد، طریقہ کار کا مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ اس ضمن میں تاخیر کو روکا جا سکے اور خامیوں کو دور کیا جا سکے جس کے باعث بدعنوانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

عوام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ کمیشن کو ان دشواریوں سے آگاہ کریں جو مذکورہ محکمہ سے کام کے سلسلہ میں ان کو پیش آتی ہیں اور اس طرح وہ کمیشن سے تعاون کریں۔ کمیشن نے عوام سے ایسی تجاویز پیش کرنے کے لیے بھی درخواست کی ہے جن میں بدعنوانی دور کرنے کے لیے ذرایع اور طریقے بتائے گئے ہوں۔

تکنیکی تعلیم کے لیے قرضوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے ریاست کے موجودہ سال کے بجٹ میں اس مد کے تحت ۳۱٫۰۸ لاکھ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔ یہ رقم تکنیکی تعلیم کے لیے ۱٫۲۱ کروڑ روپیہ کی مقررہ مجموعی رقم میں سے فراہم کی گئی ہے۔ تکنیکی تعلیم کے قرضوں کے لیے اس سال جو رقم مقرر کی گئی ہے وہ اس اسکیم کے آغاز سے لیکر اب تک سب سے بڑی رقم ہے۔

گزشتہ مالیاتی سال کے دوران مجموعی طور پر ۲۵٫۰۱ لاکھ روپیہ کے قرضے تکنیکی تعلیم کے لیے دیے گئے جس میں ۱۲ لاکھ روپیہ نئے درخواست دہندگان کو دیا گیا۔ اعلیٰ تکنیکی تعلیم کے لیے ۱۱۲۲ نئے درخواست دہندگان قرضے منظور کیے گئے۔ ان میں سے ۵۶ درخواست دہندگان نے غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے قرضے لیے۔

حکومت اتر پردیش نے برما سے آئے ہوئے ہندوستانی شہریوں کے بچوں کو یکم جولائی سنہ ۱۹۶۶ء سے پوری تعلیمی فیس اور مہنگائی بھتہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ایسے بچوں کو یہ رعایت پرائمری سے پوسٹ گریجویٹ مرحلہ تک مل سکے گی۔ اس سے پہلے سیشن میں یہ رعایت صرف ہائی اسکول کے مرحلہ تک دی گئی تھی۔ مزید براں انھیں کتابوں کے لیے امداد اور وظیفے بھی دیے جائیں گے۔

اتر پردیش میں روزگار دفتروں نے اپریل سنہ ۱۹۶۶ء کے دوران ۶۴۵۰ افراد کو کام دلایا۔ ان میں مندرج فہرست اقوام کے ۱۰۷۲ افراد، ۸۷ سنار، ۲۸۷ خواتین، دبے گھر اشخاص، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ۶۸ تخفیف شدہ ملازمین اور ۱۵۰ سابق فوجی شامل تھے۔

زیر نظر مدت میں ۱۰۲۸۱ خالی جگہوں کا اعلان کیا گیا جب کہ مارچ میں یہ تعداد ۹۱۰۸ تھی۔ ان میں سے کانپور منطقہ میں ۲۶۸۶، میرٹھ منطقہ میں ۱۸۱۲، الہ آباد منطقہ میں ۱۱۴۹، لکھنؤ منطقہ میں ۹۰۰، بریلی منطقہ میں ۷۰۶، گورکھپور منطقہ میں ۸۸۸، جھانسی منطقہ میں ۵۹۳ اور پہاڑی ضلعوں میں ۳۲۳ خالی جگہوں کا اعلان کیا گیا۔

اعلیٰ سند یافتہ درخواست دہندگان میں سے جنھوں نے اپنے نام درج رجسٹر کرائے تھے چھ کو بہ حیثیت ویٹرنری اسسٹنٹ سرجن ملازمت دی

گئی۔ ان میں ایک لیڈی سرجن بھی شامل تھیں۔

اتر پردیش میں اگلی خریف کی فصل میں دھان، جوار، باجرہ اور مکّا کی وہ قسمیں بونے کا پروگرام ہے جن کی پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ قسمیں منتخب علاقوں میں ۱۵ء۵ لاکھ ایکڑ کے رقبے تک بوئی جائیں گی۔

پیوندی مکّا، جوار اور باجرہ ... اتر پردیش میں جو تجربات کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلا کہ ان کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دھان کی تائی چنگ نیٹو نمبر ا قسم، جو باہر سے لائی گئی ہے زیادہ مقدار میں کیمیاوی کھاد برداشت کر سکتی ہے اور موجودہ فی ایکڑ اوسط پیداوار کے مقابلے میں ۲۵ کوئنٹل فی ایکڑ تک پیداوار ہوتی ہے۔

آئندہ خریف میں جن علاقوں میں زیادہ پیداوار والی قسمیں بونے کی تجویز ہے وہاں مٹی کی جانچ کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ چنانچہ مٹی کے نمونے حاصل کر کے متعلقہ تجربہ گاہوں کو بھیجے جائیں گے اور جو نتائج برآمد ہوں گے انھیں خریف کی بوائی شروع ہونے سے پہلے ہی کسانوں تک پہنچایا جائے گا اور ان کی وضاحت کی جائے گی۔

حکومت اتر پردیش نے گنے کی خریداری ٹیکس میں جو شکر فیکٹریاں ادا کرتی ہیں ۶۶-۱۹۶۵ء کے پورے تخفیفی سال کے لیے ۶ پیسے فی کوئنٹل کی چھوٹ منظور کی ہے۔

یہ چھوٹ یو۔ پی گنّا (خریداری ٹیکس) ایکٹ ۱۹۶۱ء کی دفعہ ۱۴ کی تحتی دفعہ (۱) کے ماتحت گنے کی خریداری کے لیے شکر فیکٹریوں کی ہمت افزائی کے خیال سے منظور کی گئی ہے۔

پاکستانی حملے کے بعد سے ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء تک اتر پردیش میں قومی دفاعی فنڈ میں ۳،۳۳،۰۹،۲۶۵ روپے جمع ہوئے۔

سب سے زیادہ عطیات یعنی ۸۲،۳۰،۸۵۵ روپے لکھنؤ ڈویزن سے موصول ہوئے۔ اس کے بعد الہ آباد ڈویزن کا نمبر ہے جس نے ۴۱،۳۹،۸۶۲ روپے جمع کیے۔ پھر بہ لحاظ ترتیب میرٹھ ڈویزن (۳۸،۲۹،۰۰۶ روپے)، وارانسی ڈویزن (۳۵،۵۹،۸۶۵ روپے) اور روہیلکھنڈ ڈویزن (۳۵،۰۴،۷۷۹ روپے)

آتے ہیں۔ دوسرے ڈویزنوں میں آگرہ نے ۲۷،۰۰،۲۰۶ روپے، گورکھپور نے ۲۳،۸۰،۴۶۴ روپے، فیض آباد نے ۲۲،۱۴،۸۲۷ روپے، جھانسی نے ۱۹،۹۱،۸۹۲ روپے، کمایوں نے ۹،۴۴،۶۳۵ روپے اور اتراکھنڈ نے ۱،۹۹،۰۴۲ روپے جمع کیے۔

ضلعوں میں اول نمبر پر لکھنؤ رہا جس نے ۵۵،۶۲،۲۱۶ روپے جمع کیے۔ اس کے بعد کانپور کا نمبر ہے جس نے ۱۴،۸۴،۵۰۵ روپے اکٹھا کیے۔ دوسرے ضلعوں میں گورکھپور نے ۱۳،۸۴،۱۴۰ روپے، الہ آباد نے ۱۲،۲۵،۲۲۲ روپے، میرٹھ نے ۱۰،۳۹،۶۴۱ روپے، دہرہ دون نے ۹۶،۲۳۵ روپے اور وارانسی نے ۹،۸۱،۶۶۲ روپے کی رقم اس فنڈ میں دی۔

پردیش کے تعلیمی اداروں اور دفتروں نے مزید ۸،۴۳،۰۷ روپے اس فنڈ میں دیے ہیں۔ اس طرح ان اداروں اور دفتروں سے ۳۰ اپریل ۱۹۶۶ء تک مجموعی طور پر ۲۰،۰۸،۹۶۳ روپے موصول ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ تعلیمی اداروں اور دفتروں نے ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء تک قومی بچت اسکیم میں ۲۰،۳۶،۰۶۸ روپے لگائے۔

متفرقات

نو ڈاکو ہلاک اور ۳ گرفتار ۔ دیہی دفاعی انجمنوں کے ممبروں نے گزشتہ اپریل کے دوسرے پندرہ واڑہ کے دوران چار ڈاکوؤں کو ہلاک اور پانچ کو گرفتار کیا۔ پولیس نے اس مدت میں پانچ ڈاکوؤں کو ہلاک اور ۳۲ کو گرفتار کیا اور ان کے قبضہ سے بڑی تعداد میں اسلحہ اور کارتوس برآمد کیے۔

گاؤں والوں نے ۴۴ موقعوں پر ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا۔ ان مڈبھیڑوں میں تین گاؤں والے ہلاک اور ۳۶ زخمی ہوئے۔

رشوت ستانی میں سزائیں ۔ اتر پردیش میں گزشتہ اپریل کے دوران ایک سرکل انسپکٹر، چار سب انسپکٹروں اور سات ہیڈ کانسٹبلوں کو رشوت ستانی، ڈیوٹی کی انجام دہی میں غفلت یا کوتاہی برتنے، اختیارات کے ناجائز استعمال وغیرہ کے الزامات پر معطل کر دیا گیا۔ زیر نظر مدت میں چار سب انسپکٹروں، چار ہیڈ کانسٹبلوں اور نو کانسٹبلوں کو اسی قسم کے الزامات پر ملازمت سے برطرف یا برخواست کر دیا گیا۔

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

مفید زرعی معلومات

زراعت اور کھیتی باڑی سے متعلق ملک کے مختلف تحقیقاتی اور تجرباتی اداروں میں جو کام ہو رہا ہے اور جو نتائج برآمد ہوئے ہیں ان میں سے کچھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جو نہ صرف دلچسپ بلکہ مفید بھی ہیں۔

گہری جوتائی سے مکّا کی پیداوار میں اضافہ۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کھڑگ پور (مغربی بنگال) میں جو تجربات حال ہی میں کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ مکّا کے لیے کھیت کماتے وقت گہری جوتائی کر کے مکّا کی پیداوار کافی بڑھائی جا سکتی ہے۔

تجربات کے دوران ۲۵ سنٹی میٹر گہری جوتائی کرنے پر ۱۳ سنٹی میٹر گہری یعنی اوسط جوتائی کے مقابلے میں مکّا کی فی ہکٹر ۴۹۹ کیلو اور ۷ سنٹی میٹر گہری یعنی ادھلی جوتائی کے مقابلے میں ۱۰۰ کیلو زیادہ پیداوار ہوئی۔ اس کے علاوہ گہری جوتائی سے کھر اور گھاس وغیرہ بھی بڑی حد تک نکل گئی۔

گہری جوتائی سے چکنی مٹی، دومٹ مٹی اور سخت مٹی والی زمین میں بوئی جانے والی مکّا کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔

پوسا گھانی (ٹھیک)۔ انڈین ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں اناج کو کیڑوں، چوہوں اور نمی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک نئے قسم کی گھانی (ٹھیک) تیار کی گئی ہے جس کا نام "پوسا گھانی" رکھا گیا ہے۔ اس میں ایک ہزار سے تین ہزار کیلو تک اناج بھرا جا سکتا ہے۔

گھانی (اناج رکھنے کی ٹھیک) کی دیوار مٹی یا کچی اینٹوں کی دہری ہوتی ہے۔ دہری دیوار کے بیچ میں پالی تھین لگا دی جاتی ہے۔ چوہوں سے حفاظت کے لیے باہری دیوار کا نچلا حصہ پکی اینٹوں کا بنایا جاتا ہے یا اس پر پرانے کنستروں کا ٹین چڑھا دیتے ہیں۔

پوسا گھانی کو اب تک گیہوں اور چنا کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں آزما کر دیکھا گیا ہے۔ لیکن اب دوسرے اناجوں کے سلسلے میں بھی اس کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔

۲ و ۴۔ ڈی کھرپات مارنے کی دوا۔ انڈین ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں کیے جانے والے تجربات سے پتہ چلا ہے کہ گیہوں، جو اور چنے کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے بتھوا، ہرن کھری، پوہلی وغیرہ جیسے کھرپات کو ۲، ۴ ڈی نامی دوا چھڑک کر ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس دوا کا چھڑکاؤ بوائی کے ڈیڑھ مہینے بعد کرنا چاہیے۔ پہلی سنچائی کرنے کے بعد دوا چھڑکنا مفید ہوتا ہے۔ دوا چھڑکنے کے بعد دس دن تک سنچائی نہیں کرنا چاہیے۔

ایک ہکٹر میں چھڑکنے کے لیے ۴۵۰ گرام تیز دوا کافی ہے۔ اس کا محلول (گھول) بنانے کے لیے ۳۶۵ لیٹر پانی میں (یعنی ایک ایکڑ کے لیے ۸۰ گیلن پانی میں ایک پونڈ دوا) اچھی طرح حل کریں۔ گھول تیار کرنے کے لیے اگرچہ ۲، ۴۔ ڈی کا سفوف اور عرق دونوں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن عرق زیادہ بہتر رہتا ہے۔

دوا چھڑکتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کھرپات کی پتیوں پر ضرور پڑ جائے۔

بیزر (کیمیاوی کھاد) ڈالنے کی مشین۔ دارواڑ (میسور) کے زراعتی کالج میں حال ہی میں زیادہ مقدار میں کیمیاوی کھاد ڈالنے کی ایک چھوٹی مشین بنائی گئی ہے۔

اس مشین کی قیمت صرف ۳۰ روپے ہے۔ اسے چلانے کے لیے ایک جوڑی بیل کی ضرورت ہے اور اسے بوائی کے کسی بھی اوزار میں فٹ کیا جا سکتا ہے۔ اس مشین کا استعمال قطاروں میں بوئی گئی فصلوں، ملی جلی فصلوں اور جلد تیار ہونے والی فصلوں میں کیمیاوی کھاد دینے کے لیے کیا جاتا ہے۔

اس مشین کی مدد سے ساری کی ساری کھاد برابر سے مطلوبہ گہرائی تک اور جتنے فاصلے پر چاہیں ڈال سکتے ہیں بہرحال تجربات سے پتہ چلا ہے کہ قطاروں میں بوئی گئی فصلوں میں دو انچ کی گہرائی تک اور قطاروں سے دو انچ کی دوری پر کیمیاوی کھاد ڈالنا سب سے بہتر ہوتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ اس مشین کا بنانا بہت آسان ہے۔ اس کے لیے صرف جی۔ آئی پائپ اور لکڑی کی ضرورت ہے۔ اس مشین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانا لے جانا بھی آسان ہے کیوں کہ یہ توڑ پر بنی ہوتی ہے اور استعمال کے بعد موڑ کر آسانی سے جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں۔

کیلے کی گچھا ما بیماری۔ کیلے کے پودوں کو گچھا ما بیماری سے بچانے کے لیے باغبانوں کو ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ ایک بار بیماری پیدا ہو جانے کے بعد اس کی روک تھام نہیں کی جا سکتی۔

اگر آپ کو کیلے کے پتوں کے نچلے حصے پر گہرے ہرے رنگ کے دھبے اور دھاریاں دکھائی دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ گچھا ما بیماری کا حملہ ہو گیا ہے۔ بیماری کے بڑھنے پر پودے کی باڑھ یعنی نشو و نما ماری جاتی ہے اور پتے مڑ جاتے ہیں۔ پتوں کے بالائی حصے میں پتوں کا گچھا سا بن جاتا ہے۔

کیلے کے پودوں کو یہ بیماری کسی وقت بھی لگ سکتی ہے۔ اس لیے کیلے کے کسی پودے پر جیسے ہی اس بیماری کا اثر دکھائی دے پہلے مٹی کا تیل چھڑکیں اور پھر اسے کاٹ کر گہرے گڑھے میں دبا دیں۔

اس بیماری سے بچنے کے لیے کیلے کے صرف صحت مند کلے لگانے چاہییں کیلا لگانے کے لیے اس کے کلے صرف ان علاقوں سے حاصل کرنا چاہییے جہاں اس بیماری کا اثر نہ ہوا ہو۔

گچھا ما بیماری کی چھوت بڑی تیزی سے پھیلتی ہے۔ اس لیے باغبانوں کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ان کے کیلے کے کھیت میں بیمار پودے کا کوئی گچھا یا پتہ اور کلا نہ آنے پائے۔



اُتّر پردیش شاہ راہ ترقی پر

(بہ سلسلہ صفحہ ۴۶)

اردو ہفتہ وار کی ضبطی۔ ریاستی حکومت نے اردو ہفتہ وار "ندائے ملت" کے ۲۳ اور ۳۰ جولائی کے شمارے اور ۶ اگست ۱۹۶۵ء کا مسلم یونی ورسٹی خاص نمبر ضبط کر لیا ہے جسے محمد آصف قدوائی نے ایڈٹ اور شری حفیظ الرحمان نعمانی نے تنویر پریس لکھنؤ سے طبع اور شایع کیا تھا۔

مذکورہ بالا شماروں میں ایسی رپورٹیں ہیں جو قانون دفاع ہند ۱۹۶۲ء کے تحت مضرت رساں ہیں۔

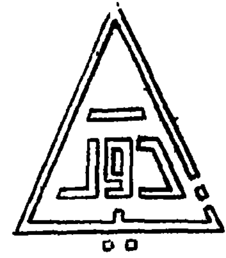
مذکورہ بالا شماروں کے تمام نسخے ان کے ترجموں اور اقتباسات کے ساتھ بحق حکومت ضبط کر لیے گئے ہیں۔



ضروری

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک مضمون "میر حسن خلیق اور میر احسان مخلوق" نیا دور کی اشاعت ۲۶ جنوری ۱۹۶۶ء میں شایع ہوا ہے۔ مضمون کی سرخی میں "میر احسان مخلوق" کی جگہ "میر احسان اللہ مخلوق" شایع ہو گیا ہے جو غلط ہے۔ اس کے لیے ہم محترم مسعود حسن صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔ —— ایڈیٹر





جلد ۲۲ | نمبر ۴

اساڑھ ۱۸۸۸ ساکھ
جولائی سنہ ۱۹۶۶ عیسوی

چندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
آر. سی. پنت
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

پرنٹر
جے. ڈبلو. ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنو

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش،

عنوانات

اپنی بات

یوپی، پردیش کے اقتصادی اعتبار سے کمزور اور ترقی کی راہ میں پچھڑے علاقوں کو ترقی دینے اور خوش حال بنانے کی جو کوششیں حصول آزادی کے بعد سے کی جا رہی ہیں ان میں ایودھیا میں دریائے سرو پر عظیم الشان پل کی تعمیر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پل جو ابھی حال میں ۳۰ میل لمبے دریائے سرو پر لوہے اور کنکریٹ سے بن کر تیار ہوا ہے، پردیش میں سب سے لمبا اور گہرا ہے۔ دریائے سرو پر یہ واحد پل ہے جو سال کے بارہ مہینے آمد و رفت اور نقل و حمل کے لیے استعمال ہو سکے گا۔ سچ پوچھا جائے تو دیوریا، گورکھپور، بستی اور گونڈے کے غریب اور کم ترقی یافتہ اضلاع کو پردیش کے دارالحکومت لکھنؤ سے ملانے والے ۳۲۰۰ فٹ لمبے اس پل کی تعمیر نے ایک اتنی ہی قدیم ضرورت پوری کر دی ہے جتنی کہ خود تاریخ قدیم ہے۔ اس پل کے فوائد کا مختصراً اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے قبل ایودھیا کے پیپوں کے پل کے ذریعے جو برسات کے موسم میں ناقابل استعمال ہوتا تھا، جہاں ۸۰ بسیں اور ٹرکیں بدقت دریا کو عبور کرتی تھیں وہاں اب نئے پل پر سے ۴۰۰ بسیں اور ٹرک گزرنے لگے ہیں۔ پھر چھوٹی گنڈک ندی پر گھنٹی کے مقام پر پل بن جانے کے بعد، جس کے تقریباً چار ماہ میں مکمل ہو جانے کی توقع ہے، ایودھیا کا یہ پل برونی (بہار) کو دلی سے بھی ملا دے گا۔ اس کے علاوہ اس پل کی تعمیر سے مغربی اور مشرقی اترپردیش کے درمیان کا فاصلہ بھی بہ قدر ۱۰۰ میل کم ہو گیا ہے۔ یعنی لکھنؤ سے گورکھپور تک ریل کے ذریعے سفر میں (اس لیے کہ اس پل کی تعمیر سے قبل براہ راست سڑک کے ذریعے سفر کا کوئی وسیلہ ہی نہیں تھا) ۱۰ گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ لیکن اب اس پل کے بن جانے کی وجہ سے سڑک کے ذریعے ہی سفر کل چھ گھنٹے میں تمام ہو جائے گا۔ اس ترقی کے دور میں جب کہ ایک ایک منٹ بڑا قیمتی ہوتا ہے، چار گھنٹے کی یہ بچت یقیناً بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ دریائے سرو کے دونوں طرف کے علاقوں کی دشواریوں اور تکلیفوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نئے پل کی تعمیر سے قبل دونوں طرف کے علاقوں کے درمیان آمد و رفت اور باربرداری کا تنہا ذریعہ ایودھیا کا ۱۲ فٹ چوڑا پیپوں کا سابقہ پل تھا جو صرف غیر برسات میں کام آتا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اس پر سے خالی بسیں اور ٹرک گزرتے تھے، سواریوں کو پیدل عبور کرنا پڑتا تھا۔ برسات کا موسم شروع ہوتے ہی یہ پل توڑ دیا جاتا تھا اور آمد و رفت وغیرہ کشتیوں کے ذریعے یا اسٹیمر سے ہوتی تھی جو ایودھیا سے لکڑ منڈی تک مسافروں کو لاتا لے جاتا تھا۔ اب اس پل کی تعمیر سے، جس کے مکمل ہونے میں ساڑھے چار سال لگے ہیں اور جس پر سواریوں کے گزرنے کے لیے ۲۴ فٹ چوڑی سڑک اور دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لیے پانچ فٹ چوڑا راستہ ہے، یہ تمام دشواریاں اور تکلیفیں دور ہو گئی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس نئے پل کی تعمیر سے مشرقی اترپردیش کے آئندہ وسائل کو جن کی اب تک پوری طرح کھوج بھی نہیں کی گئی تھی، کام میں لانے اور اس علاقے میں مختلف قسم کی صنعتوں کو فروغ دینے کے وسیع امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور اس طرح ان اضلاع کا مستقبل یقیناً روشن اور تابناک دکھائی دیتا ہے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۲ر جون سنہ ۱۹۶۶ء کو پل کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ اس مقدس سرزمین پر پہنچ کر رام راجیہ کی ـــــ وہ مثالی ریاست جس کے ہم سب خواب دیکھ رہے ہیں اور ملک میں جس کے قیام کے ہم سب آرزومند ہیں، یاد تازہ ہو گئی۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ہمارے سامنے بڑے بڑے اور مشکل کام ہیں۔ ان کی تکمیل میں بڑھتی ہوئی قیمتوں نے یقیناً دشواریاں پیدا کر دی ہیں لیکن مایوس اور بددل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ وقت آئے گا جب پیداوار میں اضافے کے باعث چڑھتی ہوئی قیمتوں میں توازن پیدا ہو گا۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب مل کر اس ضمن میں پوری لگن سے کام کریں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہم محنت، دیانتداری اور مستحکم عزم و ارادے کے ساتھ مل جل کر کام کریں تو ان مشکلات پر قابو نہ پایا جا سکے اور ہمارے سامنے جو بڑے بڑے کام ہیں انھیں پورا نہ کیا جا سکے۔

حکومت ہند نے ۳۰ر مئی کو ایک تحریر پیکنگ کو بھیجی ہے جس میں اس کے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہ ہندستان تبت میں چین کے "اندرونی معاملات" میں مداخلت کر رہا ہے، کہا ہے کہ تبت میں جو کچھ ہو رہا ہے اور وہاں جو بے چینی پائی جاتی ہے اس کی تمام تر ذمے داری خود چینی حکومت پر ہے نیز یہ کہ اس کو سمجھنا چاہیے کہ "ظلم و تشدد سے بغاوت ہوتی ہی ہے"۔ واضح رہے کہ حکومت ہند کی یہ تحریر پیکنگ کے ۲ر جنوری کے اس مراسلے کے جواب میں ہے جس میں متحدہ اقوام کے گزشتہ دسمبر کے رزولیوشن کی ہندستان کی جانب سے حمایت پر احتجاج کیا گیا ہے۔ متحدہ اقوام کے رزولیوشن میں چین کو تبت کے عوام کے بنیادی حقوق اور ان کی آزادی کی پامالی کا قصوروار ٹھہرایا گیا ہے۔ حکومت ہند نے اپنی تحریر میں کہا ہے کہ ہندستان پر الزام لگاتے وقت چین یہ بھول جاتا ہے کہ متحدہ اقوام کا رزولیوشن تبت کی خودمختاری کو بتدریج اور منظم طریقے پر ختم کرنے کی چینی پالیسی کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ جہاں تک دوسروں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے چینی الزام کا تعلق ہے اس میں وزن اس وقت ہوتا جب خود چین اس کا مرتکب نہ ہوتا۔ کیا بنڈونگ کے عہد نامے کے برخلاف جس پر خود چین کے دستخط ہیں، کشمیر میں جو ہندستان کا اٹوٹ حصہ ہے، حق خود ارادیت کا چینی مطالبہ ہندستان کے معاملات میں ایک کھلی ہوئی اور سنگین مداخلت نہیں ہے؟ اسی طرح چینی حکومت کا ہندستان کے خلاف زبردست پروپیگنڈا اور اس کا ہندستان کی عارضی اقتصادی کشمکش کو انتہائی بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا کیا ہندستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا مزید ثبوت نہیں ہے؟ پھر وہ جو اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت کا ہندستان کے سر الزام تھوپتا ہے تو اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ؎

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے   ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

بہرحال ایک طرف تو چین اس طرح کی الزام تراشیوں اور غلط پروپیگنڈے سے کام لے رہا ہے اور دوسری طرف اس نے پاکستان کو مگ ہوائی جہاز، ٹینک اور دوسرا اسلحہ فراہم کیے ہیں، مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے لیے اپنے فوجی ماہرین بھیجے ہیں اور ناجائز طور پر قبضہ کیے ہوئے چترال اور گلگت کے علاقوں میں چین اور پاکستان کے درمیان رسل و رسائل کے نئے وسائل مہیا کیے ہیں۔ ان کوششوں اور چالوں سے غالباً اس کا مقصد ہندستان کو مرعوب کرنا، جمہوری ذرائع سے سوشلزم لانے کی ہندستان کی کوششوں کو ناکامیاب بنانا اور یہاں ہمیشہ ایک غیر یقینی صورت حال برقرار رکھنا ہے۔ لیکن چینی حکمرانوں اور توسیع پسندوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندستان ہر خطرے کا مقابلہ کرنے اور ہر صورت حال سے نپٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اسے کوئی طاقت نہ مرعوب کر سکتی ہے نہ جھکا سکتی ہے۔ ہم میں ایک قوم کی آن ہے جو ہمیں اپنی آزادی اور سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے مر مٹنے کی تعلیم دیتی ہے وقت آنے پر نہ ہم کبھی میدان سے ہٹے ہیں اور نہ ہٹیں گے۔ اس کا تجربہ چین کو ہو بھی چکا ہے۔

ـــــ ایڈیٹر

جعفر حسن خاں فیضؔ

محمد مطیع الرحمن

انیسویں صدی عیسوی کے شرفائے عظیم آباد میں نواب جعفر حسن خاں فیضؔ نہایت ہی نامور رئیس گزرے ہیں۔ دولت و ثروت اور علم و فضل دونوں میں قدرت نے ان کے ساتھ بڑی فیاضی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے معزز و ممتاز اور بہت ہی باکمال انسان تھے۔ ان کی ذات بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ فیضؔ کا شمار اپنے دور کے کامیاب شاعروں میں تھا۔ وہ مصحفیؔ[1] کے شاگرد تھے اور شعر و شاعری کا نہایت ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ انھیں دوسرے فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ فیضؔ کے حالات اور ان کے کلام پر روشنی ڈالنے سے قبل مناسب ہو گا کہ ان کے اجداد کا تذکرہ بھی مختصراً کر دیا جائے۔

فیضؔ کا تعلق بہار کے ایک ایسے مشہور خاندان سے ہے جس کے مختلف افراد نہ صرف معزز عہدوں پر فائز رہے ہیں بلکہ ان کی خدمات بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ[2] حضرت شاہ شمس الدین فریاد رسؒ غیاث الدین بلبنؔ[3] کے عہد حکومت میں ۶۷۰ھ / ۱۲۷۲ء میں ہندوستان آئے اور اجودھیا کے قریب موضع کولا[4] پرگنہ منگلسی ضلع فیض آباد میں سکونت اختیار کی۔ شاہ شمس الدین[5] فریاد رسؒ کے والد کا نام نظام الدین بن محمد مکی رومی تھا اور ان کی والدہ غزنی اور ہرات کے ترک بادشاہ ملک شمس الدین کرت[6] (۱۲۷۸ - ۱۳۰۵ء) کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت شمس الدین فریاد رسؒ کے بیٹے حضرت نجم شہید اودھ میں حکومت کے اچھے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کی شادی سید شمس الدین میاپوری (ضلع فیض آباد) کی نواسی سے ہوئی تھی۔ یہ اودھ سے بہار کی طرف آئے لیکن راہ میں شہید ہو گئے۔ آپ کی اہلیہ اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر شیخ پورہ ضلع مونگیر چلی آئیں۔ ان کے لڑکے شیخ جنید کی شادی حضرت مخدوم شعیبؒ[7] کی پوتی سے ہوئی۔

نواب جعفر حسن خاں فیضؔ کے پردادا حاجی احمد علی قیامتؔ کے چچا ملا محمد نصیرؒ[8] اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ ملا محمد نصیر حضرت مخدوم شعیبؒ کے نواسے کے نواسے ہیں۔ نواب غلام حسین خاں طباطبائی نے سیر المتاخرین میں، آقا احمد البہبہانی نے مرات الاحوال جہاں نما میں اور شاد عظیم آبادی نے نقش پائدار میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ ملا محمد نصیر نے ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ فیضؔ کے پردادا جناب حاجی احمد علی

---

[1] جگت استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ ۱۱۴۴ - ۱۲۴۰ھ / ۱۷۵۰ - ۱۸۲۴ء [2] ریاض الانساب۔ محمود علی خاں صبا عظیم آبادی۔ غیر مطبوعہ [3] سلطان غیاث الدین بلبن۔ غلام خاندان کا پانچواں بادشاہ ۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء سے ۶۸۶ھ / ۱۲۸۶ء تک [4] موضع کولا ضلع فیض آباد میں اجودھیا سے دس میل پچھم لکھنؤ سے تقریباً ۷۰ میل پورب ریلوے لائن کے دکھن واقع ہے۔ اور منگلسی موضع کولا سے چار میل اتر سرجو کے کنارے ہے۔ پرگنہ منگلسی میں کولا اور علاء الدین پور کے رؤسا حضرت فریاد رسؒ کی اولاد میں ہیں۔ [5] حضرت شمس الدین فریاد رسؒ حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے چہیتے مرید اور خلیفہ ہیں۔ حضرت فریاد رسؒ نے ۹ محرم ۷۰۰ھ کو انتقال کیا اور اجودھیا میں تالاب ایبٹو کے اتر ایک ٹیلہ پر آپ کا مزار ہے۔ [6] [7] حضرت مخدوم شعیبؒ حضرت امام تاج فقیہ دردانی کی اولاد میں ہیں اور حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاریؒ کے چچا زاد بھائی ہیں۔ مزار آپ کا شیخ پورہ ضلع مونگیر میں ہے۔ مناقب الاصفیا آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ [8] ملا محمد نصیر کا مزار باغ پاتو پٹنہ سیٹی میں ہے۔

قیامت بھی اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ سات بار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ترہت کے علاقے میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ دیوان مکمل تھا لیکن ضائع ہو گیا۔ ان کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۱۹۲ھ ۱۷۷۸ء کو ہوا۔ امام باڑہ سنگی دالان میں دفن ہوئے۔ نجات حسین خاں اشکی صاحب تذکرۃ الاکابر نے اپنے تذکرے میں قیامت کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۶ ۱۵ اہے۔

تذکرہ گلزار ابراہیم کے مصنف اور مشہور شاعر و انشا پرداز نواب علی ابراہیم خاں خلیل، جعفر حسن خاں فیض کے دادا خادم حسین خاں خادم کے چچا زاد بھائی ہیں، یہ شیخ پورہ ضلع مونگیر کے رہنے والے اور نواب میر قاسم علی خاں[1] عالی جاہ نواب ناظم بنگال کے وزیر تھے۔ کچھ دنوں پٹنہ عظیم آباد کے نائب ناظم رہے۔ لارڈ ہسٹنگز کے زمانے میں بنارس میں عدالت دیوانی کے حاکم اعلیٰ اور لارڈ کارنوالس کے عہد میں وہاں کے گورنر بھی رہے۔ ملا محمد نصیر کے نواسے اور شاہ اسد اللہ کے بیٹے تھے۔ گلزار ابراہیم کو انھوں نے ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء میں مکمل کیا۔ صحف ابراہیم، خلاصۃ الکلام اور وقائع جنگ مرہٹہ ان کی دوسری کتابیں ہیں۔

جعفر حسن خاں فیض کے دادا خادم حسین خاں خادم عربی فارسی ادب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور اپنے والد حاجی احمد علی قیامت سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ نواب ابراہیم خاں خلیل نے گلزار ابراہیم[2] میں اور وجیہ الدین عشقی نے اپنے تذکرے[3] میں ان کا ذکر کیا ہے۔ عشقی کے لکھنے کے مطابق خادم ان کے والد شیخ غلام حسین مجرم کے شاگرد تھے۔ خادم کا ۱۲۰۱ھ میں انتقال ہوا غلام حسین شورش نے اپنے تذکرے میں خادم کے پانچ اشعار نقل کیے ہیں۔ خادم کی ایک فارسی غزل بھی ملی ہے۔ خادم حسین خاں کے چھوٹے بھائی ہدایت حسین خاں بھی شاعر تھے۔ مومن تخلص کرتے تھے اور اساس دیوہرہ ضلع گیا کے شاہ کمال علی کمال سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ مومن نے ۴ ذی الحجہ ۱۲۰۷ھ کو انتقال کیا۔ تذکرۃ الاکابر میں آپ کی ایک فارسی غزل نقل کی گئی ہے

• جعفر حسن خاں فیض کے والد محمد علی خاں شاعر تھے۔ اور بقول محمود علی خاں صبا عظیم آبادی ان کا تخلص حیرتی تھا اور وہ راجہ پیارے لال الفتی اور میر وزیر علی عبرتی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ محمد علی خاں کے شاعر ہونے میں شک نہیں لیکن یہ صحیح نہیں کہ ان کا تخلص حیرتی تھا اور وہ عبرتی کے شاگرد تھے مصنف تاریخ شعرائے بہار نے حیرتی تخلص کے جس شاعر کا ذکر کیا ہے وہ کوئی دوسرے صاحب ہیں۔ صاحب تذکرۃ الاکابر جو محمد علی خاں کے اپنے بھتیجے ہیں انھوں نے محمد علی خاں کا تخلص نہیں لکھا ہے اور عبرتی[4] نے اپنا تذکرہ معراج الخیال ان کے انتقال کے ۲۷ سال بعد ۱۲۵۷ھ میں مرتب کیا اس میں بھی محمد علی خاں کا ذکر نہیں ہے۔ صاحب تذکرۃ الاکابر نے ان کے دو اشعار نقل کیے ہیں۔ محمد علی خاں ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۲۹ھ کو حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۵ جمادی الآخر ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء کو بحرین کے قریب جہاز پر ان کا انتقال ہوا۔ محمد علی خاں کے بھائی محمد حسن خاں رشکی وجیہ الدین عشقی کے شاگرد تھے۔ عشقی نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ محمد حسن خاں رشکی نجات حسین خاں اشکی صاحب تذکرۃ الاکابر کے والد تھے۔ رشکی نے ۴ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ کو شیخ پورہ ضلع مونگیر کے پاس حسین آباد میں انتقال کیا۔ تذکرۃ الاکابر میں ان کے ۷۴ اردو اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

جعفر حسن خاں فیض کے بڑے بھائی نور الحسن خاں نواب جان کے نام سے مشہور تھے۔ یہ زیادہ تر اپنے نانا علی عظیم خاں کے ساتھ گلزار باغ میں رہے۔ نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں جعفر حسن خاں فیض کے ساتھ لکھنؤ گئے اور دو برس وہاں مقیم رہے۔ استعداد اچھی تھی۔ شاعری کی طرف خاص توجہ نہ تھی۔ ۱۵ رمضان المبارک ۱۲۴۷ھ ۱۸۳۱ء کو ان کا گلزار باغ میں انتقال ہوا۔ صاحب تذکرۃ الاکابر نے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ محمد علی خاں کے ایک بیٹے حامد حسین خاں عابد بھی شاعر اور مرزا احمد منشا[5] کے شاگرد تھے

نواب جعفر حسن خاں فیض عرف کلوجان نواب محمد علی خاں کے چھوٹے

---

[1] نصیر الملک اعتماد الدولہ نواب میر قاسم علی خاں عالی جاہ نصرت جنگ۔ میر جعفر خاں کے داماد اور بنگال بہار اور اڑیسہ کے نواب ناظم ۱۱۷۴ھ سے ۱۱۷۷ھ [2] تذکرہ گلزار ابراہیم خلیل صفحہ ۱۲۹ [3] تذکرۂ عشقی۔ وجیہ الدین عشقی۔ بوڈلین لائبریری اوکسفورڈ۔ دو تذکرے کلیم الدین احمد صفحہ ۲۴۶-۲۴۸ [4] ناظر وزیر علی عبرتی۔ راجہ پیارے لال الفتی کے شاگرد۔ ریاض الافکار اور معراج الخیال کے مصنف۔ وفات ۱۹ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ [5] انشاء اللہ خاں دہلوی کے داماد اور مرزا محمد حسن قتیل کے شاگرد۔ لکھنؤ سے پٹنہ آئے اور ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء میں انتقال کیا۔ شاہ ارزاں کے مقبرے میں مدفون ہیں۔ معراج الخیال۔ عبرتی (قلمی) صفحہ ۱۳۶، نقش پائدار۔ شاد عظیم آبادی صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۳

صاحبزادے تھے۔ آٹھ واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت شمس الدین فریادرس[۱] تک پہنچتا ہے۔ ان کے نانا علی عظیم خاں، سعداللہ خاں عاشق کے بیٹے فضل علی خاں کے بھتیجے اور شیخ عبداللہ ناظم سرکار غازی پور کے پوتے تھے۔ علی عظیم خاں کا انتقال سنہ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں ہوا۔ شیخ عبداللہ نواب سعادت[۲] خاں برہان الملک اور نواب صفدر جنگ[۳] کے عہد حکومت میں سرکار غازی پور کی نظامت پر مامور تھے اور راجگان بھوج پور سے اس علاقے کو محفوظ رکھا تھا۔ انھوں نے سنہ ۱۱۵۷ھ میں انتقال کیا۔ شیخ عبداللہ کے انتقال کے بعد فضل علی[۴] خاں باپ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کے زمانے میں سعداللہ خاں عاشق[۵] علاقہ غازی پور میں بڑی شان و شوکت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ان کی زمینداری ضبط کرلی گئی۔ ضبط شدہ زمینداری کی آمدنی چار لاکھ ۶۴ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ جب ۵ رمئی سنہ ۱۸۸۹ء کو واپسی زمینداری کا مطالبہ نامنظور ہوا اور غازی پور کے پرانے قلعہ اور باغ کے علاوہ دس ہزار روپیہ سالانہ ان کے لیے مقرر ہوا تو یہ پٹنہ عظیم آباد چلے آئے اور سلسلہ ابوالعلائیہ کے مشہور بزرگ اور صوفی شاعر حضرت رکن الدین[۶] عشق رح کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ ان[۷] کے دو فارسی دیوان[۸] یادگار ہیں۔

جعفر حسن خاں فیض کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال کے وقت ۱۶ سال کے تھے۔ ان کے والد نے سنہ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں انتقال کیا۔ اس طرح ان کی پیدائش کا سال سنہ ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء قرار دیا جاتا ہے۔ جعفر حسن خاں فیض کو علم و ادب کی خدمت اور شعر و شاعری کا ذوق اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا تھا۔

جب ان کے نانا علی عظیم خاں نے اپنی ساری جائداد ان کے بڑے بھائی نورالحسن خاں کو لکھ دی[۹] تو یہ کبیدہ خاطر ہو کر گلزار باغ سے ٹیڑھی گھاٹ اور خواجہ کلاں کے قریب محلہ سنگی دالان چلے آئے اور سنہ ۱۲۵۰ھ میں وہاں ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ فیض خانوادہ سنگی دالان کے مورث اعلیٰ ہیں۔

جعفر حسن خاں فیض نے لکھنؤ میں سید حسین صاحب مجتہد ابن علامہ غفران مآب دلدار علی صاحب سے باضابطہ علم دین حاصل کیا۔ شاعری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اعلیٰ پایہ کے خوشنویس تھے اور خط تعلیق، نسخ، شفیعا اور شکست بہت اچھا لکھتے تھے۔ ریاضی، موسیقی، فن تعمیر، تمثال کشی، شہسواری اور تیر اکی وغیرہ علوم و فنون میں پوری مہارت حاصل تھی۔ دوبار لکھنؤ گئے۔ ایک بار نواب غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں اپنے بھائی نورالحسن خاں کے ساتھ اور دوسری بار سنہ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے زمانے میں۔ اخیر عمر میں زیادہ تر فقہ، حدیث اور دوسری مذہبی تصانیف زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

جعفر حسن خاں فیض کے چچا زاد بھائی نجات حسین خاں نجاتی ان کے متعلق تذکرۃ الاکابر میں لکھتے ہیں: "فنے از فنون ... و علمی از علوم ... نیست کہ حاصل وجود باکمال آں جناب نہ شد ... با وجود کمال باطن حسن تقریر و خلق دل پذیر بمرتبہ ایست کہ ہر صغیر و کبیر ... خود متلذذ مسگرد و خطوط پاکیزہ ... ارقام می فرمائند خصوصاً نستعلیق و شفیعا و رقاع خیلی مطبوع طرح دادہ اند کہ تا آں زمان احدی از استادان سلف خطی باں خوبی ایجاد نہ ساختہ اند و عبارت متین و اشعار بلیغ پروردۂ فصحائی ریختہ گویاں حال از خاصہ ... آنجناب جلوۂ ظہور می یابد ... و در تمثال کشی و علم موسیقی و ریاضی نیز مہارت رسا داشتند ... چنانچہ شبیہ دست خاص بہ نظر راقم در آمد ... و در فن سواری اسپ و تعمیر مکان و شناوری و پختن طعام دخل تمام دارند۔ اما بعضی را از فرط پاس شرع و لحاظ ورع و پرہیز را از قلت فرصت باکتساب اعمال خیر بشمول دیگر لہو و لعب ایام جوانی یک قلم ترک نمودہ الحال او قات ... خود را بہ مطالعہ کتب فقہ و احادیث و تفسیر و تنزیہ روح و تزکیہ نفس بریاضت حقہ می پردازند۔ چنانچہ نفس از برائے تحصیل دنیہ بکمال سعی بے مزہ سامان امارت در سنہ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و شش ہجری بار دیگر روانہ لکھنؤ شدہ

---

[۱] خاندان اودھ کے بانی۔ اول صوبہ دار اودھ۔ سنہ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء سے سنہ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء تک۔ [۲] مرزا مقیم ابوالمنصور خاں نواب صفدر جنگ۔ نواب برہان الملک کے بھانجے اور داماد۔ نواب وزیر اودھ ۱۱۵۶ھ-۱۱۶۷ھ/۱۷۳۹ء-۱۷۵۴ء [۳] سیف جنگ ممتاز الملک شیخ فضل علی خاں۔ ناظم سرکار غازی پور۔ نواب صفدر جنگ کے معتمد سرداروں میں تھے۔ سنہ ۱۱۸۸ھ میں انتقال ہوا اور سنہ ۱۲۶۰ھ میں مزار پر شان دار عمارت تعمیر کی گئی۔ تاریخ بنارس، غلام حسین خاں اور غازی پور گزیٹیر۔ بحوالہ مضمون قاضی عبدالودود صاحب معاصر پٹنہ، ع ۱۵، صفحہ ۱۵۱ [۴] حضرت رکن الدین عشق عرف شاہ گھسیٹا ابوالعلائی ۱۱۳۰-۱۲۰۳ھ [۵] سعداللہ خاں عاشق۔ تذکرۂ مسرت افزا (ابوالحسن) اور غازی پور گزیٹیر۔ بحوالہ مضمون قاضی عبدالودود صاحب معاصر ع ۱۵، ص ۱۵۱ [۶] دونوں دیوان بحالت نا خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی میں ہیں۔ معاصر ع ۱۵ [۷] تذکرۃ الاکابر نجات حسین خاں معاصر پٹنہ ع ۱۵، ص ۱

... وبعد چندے مراجعت نمودند۔ الحاصل از عرصہ چند سال درمحلہ سنگی دالان در عین شارع راہ ... عقب امام باڑہ ... حاجی صاحب ... بغایت حسن سلیقہ دولت خانہ عالی ساختہ ... استقامت دارند۔ تاریخ مکان "قصر اقبال شدہ شد ازیں" ودر امام باڑہ مذکور بسر خود تعزیہ داری سپرد ازند[۵]"

خان بہادر علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی نے اپنی مختلف تصانیف میں نواب جعفر حسن خان فیض اور ان کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ حیات فریاد میں لکھتے ہیں :

"اپنے وقت میں رکن رکین شہر تھے۔ بہت عالی خاندان اور دولت مند تھے۔ عربی فارسی کے بڑے عالم اور شاعر تھے۔ خط نستعلیق وشفیعا کے استاد بے بدل تھے۔ تہذیب وآداب میں یگانۂ روزگار۔ باوجود دولت وثروت کے طالبان علم کو بہ شوق خود پڑھایا کرتے تھے۔ لکھنؤ جا کر مصحفی کے شاگرد ہوئے تھے۔ آتش وناسخ کے مشاعروں اور معرکوں میں شریک رہے۔ لکھنؤ میں برسوں مقیم رہے۔ ان کے فرزند نواب مہدی علی خاں مرحوم بھی نہایت باسواد رئیس تھے[۲]"

نقش پائدار میں لکھتے ہیں :

"نامی امرائے باعلم وباکمال کے تیسرے طبقہ میں (جن کی زیارت سے راقم بھی فیض یاب ہوا) نواب مستطاب جعفر حسن خاں فیض تخلص اور ان کے خلف الرشید نواب مہدی علی خاں مغفور تھے۔ امارت وریاست وتہذیب وآداب میں حضرت فیض کی رفتار وگفتار اس زمانے کے رئیسوں میں دستور العمل تھی۔ آپ کی ذات برتر صفات پر لوگوں کو ناز تھا[۳]"

اور نوائے وطن میں نواب جعفر حسن خاں فیض کے متعلق لکھتے ہیں :

"اس نامی گرامی باکمال کا تخلص فیض در سنگی دالان عظیم آباد مسکن۔ نواب عبداللہ خاں مرحوم کے (جن کا ذکر تقریب صوبہ داری فخر الدولہ وروشن الدولہ صوبہ داران بہار کی تاریخوں میں ملتا ہے) کے خاندان سے تھے۔ اکثر فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ طب میں بھی دخل کامل تھا۔ خط شفیعا کے استاد بے بدل تھے۔ شاعری میں بھی اپنے وقت کے مسلم الثبوت مانے جاتے تھے۔ ان مرحوم کے جوہر ذاتی کو خلقی متانت وبردباری وانکساری نے ایسا فروغ بخشا تھا کہ امیروں سے لے کر غریبوں تک ان کے حسن اخلاق اور تہذیب وآداب وکمالات کے قائل تھے۔ عہد شباب میں لکھنؤ جا کر میاں مصحفی کے شاگرد ہوئے اور مشق سخن کو درجہ قابلیت تک پہنچایا۔ زبان بہت شستہ ورفتہ تھی۔ غزلوں میں بھی ایک طرح کا مذاق خاص تھا جس کا ذائقہ جوانوں سے لے کر بوڑھوں تک کو تڑپا دیتا تھا۔ غزلوں کے پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے محو ہو جاتے تھے۔ ایک ہی ترکیب اور ایک ہی وضع سے اپنی بسر کی۔ معاش کی آمدنی کو ایسے سلیقہ سے صرف کرتے تھے کہ ان کے خوان فیض سے بہتیرے غریب دوست آشنا فیض یاب ہوتے تھے[۴]"

عبدالغفور نساخ اور عزیز الدین بلخی نے بھی اپنے تذکروں میں نواب جعفر حسن خاں فیض کا ذکر کیا ہے۔ نساخ لکھتے ہیں: "فیض تخلص نواب جعفر حسن خاں خلف نواب محمد علی خاں۔ رئیس عظیم آباد شاگرد مصحفی[۵]" بلخی لکھتے ہیں: "فیض ـــ نواب جعفر حسن خاں خلف نواب محمد علی خاں۔ رئیس عظیم آباد شاگرد مصحفی۔ خط نستعلیق وشفیعا میں اچھی مہارت رکھتے تھے"

محترم قاضی عبدالودود صاحب نے بیاض[۶] حسین آباد سے نواب جعفر حسن خاں فیض کے جو حالات نقل کر کے رسالہ شاعر بمبئی کے خاص نمبر ۱۹۵۹ء میں شائع کرایا تھا اُن سے بھی نواب صاحب کی صلاحیت، قابلیت اور مختلف علوم وفنون سے اُن کی دلچسپی ثابت ہوتی ہے

"جعفر حسن خاں عرف کلو جان تخلص فیض ابن محمد علی خاں ساکن محلہ سنگی دالان پٹنہ۔ خط نستعلیق وشفیعا کے استاد بے بدل تھے۔ آغا رشید کی وصلیوں سے اپنی وصلیاں ملادیں۔ تہذیب وآداب کی گھٹی میں تھے۔ امارت وریاست میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ استعداد علمی میں آپ کا اس وقت کوئی مدمقابل نہ تھا۔ معقولات، ادب، ریاضی اور کون وہ انسانی فن تھا جس میں آپ صاحب کمال نہ تھے۔ عنایت حسین خاں عرف بنا میاں، حاجی گنج پٹنہ سیٹی کے پاس فن حکمت

---

۱ خلاصۃ تذکرۃ الاکابر۔ نجات حسین خاں۔ قاضی عبدالودود صاحب۔ معاصر ۸ صفحہ ۱ و صفحہ ۲ ۔ ۲ حیات فریاد۔ شاد عظیم آبادی ۱۹۲۷ء صفحہ ۳ ۔ ۳ نقش پائدار۔ شاد عظیم آبادی ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۳ ۔ ۴ نوائے وطن۔ شاد عظیم آبادی۔ ۱۸۸۸ء حاشیہ صفحہ ۱۰۳ ۔ ۵ تذکرہ سخن شعرا۔ عبدالغفور نساخ ۱۸۷۴ء صفحہ ۳۷۶ ۔ ۶ تاریخ شعرائے بہار۔ عزیز الدین بلخی راز ۱۹۳۱ء صفحہ ۸۰ ۔ ۷ بیاض از جابر علی خاں مرحوم۔ حسین آباد نزد شیخ پورہ ضلع مونگیر۔ یہ نواب علی ابراہیم خاں صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم کے بھائی علی قاسم خاں کی اولاد میں ہیں۔

میں آپ کا قلمی رسالہ لکھا ہوا اب تک موجود ہے جس میں ہر مرض کے مجرب نسخے درج ہیں۔ طلاب کے سبق کا ایک وقت مقرر تھا۔ فنون مذکورہ بالا کی انتہائی کتابیں آپ ہی عظیم آباد میں پڑھاتے تھے۔ دو دفعہ لکھنؤ گئے اور برسوں رہے اور بحال خدمت مجتہد العصر جناب سید حسین تحصیل علوم کیا۔ شاعری میں مصحفی سے تلمذ تھا۔ ناسخ و آتش کے معرکوں میں شریک رہے۔ اپنے نانا و نانی سے رنج ہو کر اپنے بڑے بھائی کو گلزار باغ میں چھوڑ کر خود مع اہلیہ سنگی دالان چلے آئے۔ کچھ دنوں امام باڑے میں رہے۔ اس کے بعد اسی محلہ میں نہایت نفیس، کشادہ اور خوبصورت مکان بنوایا۔"[1]

جعفر حسن خاں فیض نے چہار شنبہ ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۲ اگست ۱۸۶۶ء کو پٹنہ عظیم آباد میں انتقال کیا[2] اور امام باڑہ سنگی دالان[3] کے احاطے میں دفن ہوئے۔ اس احاطے میں اس خاندان کے اور بہت سے دوسرے اصحاب کی قبریں ہیں۔ نواب جعفر حسن خاں فیض کی قبر پر اُن کے فرزند رشید نواب مہدی علی خاں مہدی کے قطعۂ تاریخ کا کتبہ لگا ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب والدم جعفر حسن خاں جوار رحمت حق را قرین شد
پی تاریخ سالش کلک مہدی رقم زد او سوئے خلد بریں شد

۱۲۸۳ھ

رسالہ شاعر بمبئی کے خاص نمبر ۱۹۵۹ء میں جناب قاضی عبدالودود صاحب نے جو اس قطعۂ تاریخ کو نقل کیا ہے، اُس کے پہلے اور چوتھے مصرعے میں غلطیاں ہوگئی ہیں۔ پہلے مصرعہ میں والدم کی "میم" چھوٹ گئی ہے اور چوتھے مصرعہ میں "رقم زد او" کی جگہ "رقم آں زد" لکھا ہے۔ "او سوئے خلد بریں شد" سے ٹھیک ۱۲۸۳ھ نکلتا ہے۔

محترم قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ جعفر حسن خاں فیض اور اُن کے خاندان کے دوسرے افراد کے ناموں کے ساتھ نواب اور خان کے الفاظ شاہی خطابات نہیں ہیں۔ اُن کو محمود علی خاں صبا عظیم آبادی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ کربلائے معلیٰ سے واپسی کے بعد شاہ عالم بادشاہ نے حاجی احمد علی قیامت کو "خلعتہائے فاخرہ اور خطاب ہائے خان بہادری اور نوابی سے سرفراز فرما کر جاگیروں کا پروانہ عطا کیا۔" نجات حسین خاں صاحب تذکرۃ الاکابر نے حاجی احمد علی قیامت کے نام کے ساتھ نواب اور خان کے الفاظ نہیں لکھے ہیں۔ ابوالحسن صاحب تذکرہ مسرت افزا نے پہلی بار نادانستہ طور پر خادم حسین خاں خادم کی امارت و ریاست کے باعث اُن کے نام کے ساتھ لفظ خان استعمال کیا ہے۔ تذکرہ شورش، تذکرہ عشقی، تذکرہ مسرت افزا اور علی ابراہیم خاں کے خطوط میں حاجی احمد علی قیامت کے نام آئے ہیں لیکن کسی نے نواب اور خان نہیں لکھا ہے۔ صاحب تذکرۃ الاکابر نے حاجی احمد علی قیامت کے بعد اپنے خاندان کے تمام افراد کے ناموں کے ساتھ لفظ 'خان' استعمال کیا ہے لیکن نواب نہیں لکھا۔ اس لئے کسی سند اور ثبوت کے بغیر ان الفاظ کو شاہی خطاب تسلیم کر لینا اور صحیح سمجھنا مناسب نہیں ہے۔[4]

جعفر حسن خاں فیض کو جابر حسین خاں، صاحب بیاض حسین آباد و عبدالغفور نساخ اور شاد عظیم آبادی نے مصحفی کا شاگرد لکھا ہے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا زمانہ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء سے ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء تک ہے۔ وہ پہلی بار نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں تلاش معاش میں لکھنؤ آئے تھے۔ دوسری بار نواب آصف الدولہ (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء — ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء) کے عہد حکومت میں ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء کے قریب لکھنؤ آئے اور مستقل طور پر یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔[5] جعفر حسن خاں فیض کے والد نے ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں انتقال کیا۔ اُس وقت وہ سولہ سال کے تھے۔ وہ نواب غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں اپنے بڑے بھائی نور الحسن خاں کے ساتھ لکھنؤ گئے اور دو سال تک وہاں مقیم رہے۔ نواب غازی الدین حیدر کا عہد حکومت ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء سے ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء

---

[1] رسالہ شاعر بمبئی خاص نمبر ۱۹۵۹ء جلد نمبر ۳۰، شمارہ نمبر ۳ و نمبر ۴، "متفرقات" "قاضی عبدالودود صاحب ص ۴۳-۴۲۔ [2] دبامں الانساب۔ غیر مطبوعہ۔ محمود علی خاں صبا سنگی دالان پٹنہ سٹی۔ [3] امام باڑہ سنگی دالان پٹنہ سٹی میں خواجہ کلاں تھانہ کی عمارت سے کچھ ہی دور پورب خاص سڑک (قومی شاہ راہ نمبر ۳۰) کے کنارے واقع ہے۔ اس احاطہ میں پورب سے سب سے اونچی قبر فیض کے پردادا حاجی احمد علی قیامت کی ہے۔ نواب جعفر حسن فیض کے مزار سے پچھم اُن کے بیٹے نواب مہدی علی خاں کی قبر ہے۔ اسی احاطے میں نواب ابوالحسن خاں بخشی، الاں بھی مدفون ہیں۔ [4] حواشی از قاضی عبدالودود۔ معاصر پٹنہ نمبر ۱۰ جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۲۶۔ [5] لکھنؤ کا دبستان شاعری ابواللیث صدیقی۔ صفحہ ۷۶ - ۱۷۴۔

تک ہے۔ مصحفی تقریباً گیارہ سال غازی الدین حیدر کے زمانے میں زندہ رہے اور ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں انتقال کیا۔ مصحفی کے انتقال کے وقت جعفر حسن خاں فیض کی عمر ۲۶ سال ہوتی ہے۔ اس طرح معاصرانہ تذکروں اور تاریخ کی روشنی میں اُن کا مصحفی کا شاگرد ہونا ثابت ہوتا ہے۔

قیاس غالب ہے کہ فیض نے لکھنؤ میں انشاؔ کا دور نہیں دیکھا کیوں کہ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ تقریباً تیس سال کی عمر میں ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں لکھنؤ آ چکے تھے۔ اس لئے آتشؔ و ناسخؔ کے شاعرانہ اور ادبی معرکوں میں فیض کا شریک ہونا بھی صحیح ہے۔ دوسری بار جب وہ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں لکھنؤ تشریف لے گئے تو اُس وقت ناسخؔ کا انتقال[۱] ہو چکا تھا۔ لیکن خواجہ حیدر علی آتشؔ زندہ تھے۔ فیضؔ اُس وقت تقریباً بیالیس سال کے تھے۔ ممکن ہے کہ قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں وہ خواجہ صاحب کی صحبتوں سے مستفید ہوئے ہوں۔

عبدالغفور نساخ نے تذکرہ سخن شعرا میں فیض کے پانچ اشعار نقل کئے ہیں جو تذکرۃ الاکابر میں موجود ہیں۔ تذکرۃ الاکابر میں فیض کی تیس غزلیں کے کل ۲۶۹ اشعار پیش کئے گئے ہیں جن میں ایک شعر دوبارہ لکھ دیا گیا ہے۔ دو مخمس ہیں جن میں کل بیس اشعار ہیں اور مخمس کے پانچوں مصرعوں کو شامل کرکے اشعار کی تعداد چوبیس ہوتی ہے۔ اس طرح تذکرۃ الاکابر میں فیض کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۹۳ ہے۔ زیادہ تر غزلیں سات، آٹھ، نو اور دس اشعار کی ہیں۔

جعفر حسن خاں فیض نے اپنے دور کے اکثر اُمرا کی طرح صرف دل بہلانے کے لئے شعر نہیں کہے بلکہ وہ شاعری کو فنِ لطیف کی طرح برتتے ہیں اور اُسے ذریعۂ کمال سمجھتے ہیں۔ فیض نے غزلوں کے سوا دوسرے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی کی یا دوسرے اصناف ضائع ہو گئے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کے یہاں زبان و بیان کی لطافت پائی جاتی ہے اور واردات شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ شعرائے عظیم آباد مثلاً عشقؔ، فدویؔ، ضیاء الدین ضیاؔ اور اشرف علی خاں فغاںؔ وغیرہ مہاجرین شعرائے دہلی کے ذریعے دلّی کے اثرات شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ مصحفی نے ریختی، ابتذال، نسائیت، عریانی اور معاملہ بندی کے ماحول میں داخلی اور واردات شاعری کے چراغ کو روشن رکھا تھا۔ فیض کے یہاں مصحفی کے فیوض و برکات ملتے ہیں۔ فیض نوجوانی کے عالم میں اُس وقت لکھنؤ گئے تھے جب غازی الدین حیدر کے اعلان آزادی کے بعد دلی کی روایات شاعری سے بغاوت کی تحریک شروع ہو گئی تھی لیکن اپنے اُستاد کی طرح اُنھوں نے بھی ناسخ کے متروکات کو قبول نہیں کیا۔

فیض نے صرف غزلیں کہی ہیں۔ غزل کی فضا عاشقانہ ہوتی ہے اور شاعر عشق و محبت کے پس منظر میں اپنے دلی جذبات اور واردات قلب کی ترجمانی کرتا ہے۔ فیض کے یہاں رنگ تغزل پوری طرح موجود ہے۔ وصال یار اور فراق جاناں کی باتیں ہیں۔ محبوب کے لب و رخسار، چشم و ابرو، زلف و گیسو اور دیگر مظاہر حسن کا بھی ذکر ہے۔ لیکن شاعر ان مظاہر حسن کی صرف خارجی پیش کش میں اُلجھ کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس سلسلے میں اس نے اپنے داخلی جذبات کو بھی متانت اور سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔

فیض کے کلام میں خلوص اور درد و اثر ہے۔ اُن کے یہاں تصوف، فلسفہ اور اخلاق کی بھی کچھ باتیں ملتی ہیں۔ شعرائے دلی کی طرح اُن کے کلام میں بھی یاس، ناامیدی اور قنوطیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان اُن کی صاف، شستہ اور رواں ہے۔ محاورات کو خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں میر تقی کا وہ سوز و گداز، دلسوزی اور جگر کاوی نہیں ہے جو غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ فیض کے یہاں نیرنگیٔ کائنات کا ذکر ہے اور محبوب حقیقی کی طرف اشارا بھی۔ لیکن اُن کے یہاں تصوف و معرفت کا وہ رنگ نہیں جو خواجہ میر دردؔ، مظہر جانجاناں اور مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری کے یہاں موجود ہے۔ پھر اُن کے فلسفیانہ نکتوں میں وہ گہرائی بھی نہیں جو ان کے ہم عصر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے یہاں ہے۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے فیض ایک کامیاب شاعر تھے۔ نمونے کے طور پر اُن کی دو غزلیں اور دوسری غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

غزل نمبر ۱

گلشن میں کل جو مائل نظارہ یار تھا — جلوہ گلوں کا دیدۂ بلبل میں خار تھا
دوری کو فرط گریہ سے عین وصال میں — گو سامنے تھا یار پہ دریا کے پار تھا
مر کر ہوا جو دامنِ زیں کا یہ تیرے زیب — اے ترک صید بند وہ کیسا شکار تھا
بلبل کی آنکھ لگ گئی گلشن میں ہائے گل — جھونکا نسیم صبح کا کیا خوش گوار تھا
دامن تلک بھی تیرے نہ پہنچی ہماری خاک — ہم سے صبا کے دل میں بھی کیا غبار تھا

[۱] وفات ناسخ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء

سودائے زلفِ یار میں جبتک کٹی گفتگو　　جو سلسلۂ سخن کا تھا وہ پیچدار تھا
دل بستگی خزاں سے جو اپنی ہوئی ہے فیضؔ　　اب یاد بھی نہیں ہے کہ ذوقِ بہار تھا

غزل نمبر ۲

منہ اور ترے رُخ کی ضیا اور ہی کچھ ہے　　مشک اور تری زلف رسا اور ہی کچھ ہے
نے گل میں نہ مرجاں میں یہ سرخی و شفق میں　　ہاتھوں کا ترے رنگ حنا اور ہی کچھ ہے
ٹوٹے ہوئے دل کے بھی سنو نالہ جاں سوز　　اس سازِ شکستہ کی صدا اور ہی کچھ ہے
وا شد دلِ دیوانہ کو گل گشت سے کیا ہو　　باغ اور ہے صحرا کی فضا اور ہی کچھ ہے
گلشن کی نسیم سحری راحت جاں ہے　　پر کوچۂ جاناں کی ہوا اور ہی کچھ ہے
جیتا ہوا زنداں محبت سے چھٹا کون　　اس قید کا سامان رہا اور ہی کچھ ہے
ہے وصل کا کس دل کو نہیں ذوق مگر فیضؔ　　غم کھانے کا ہجراں میں مزا اور ہی کچھ ہے

فیضؔ نے چھوٹی بحروں میں بھی ایک دو غزلیں لکھی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

غم کے آزار نے ہمیں مارا　　اس دلِ زار نے ہمیں مارا
زخم شمشیر کا بہانہ تھا　　ابروئے یار نے ہمیں مارا

تصوف و معرفت

خود نمائی پہ تری محو ہے عالم پیارے　　آئینہ بھی اسی عالم کا تماشائی ہے
تماشائی در و دیوار ہے گلشن میں اس رو کا　　جدھر دیکھو باں آئینہ عالم ہے حیرت کا
اس دل میں دل آرا کا جلوہ نظر آتا ہے　　مانند محیط اب یہ قطرہ نظر آتا ہے

نیرنگیٔ کائنات

صفحۂ عالم پہ ہیں کیا کیا بے نقش و نگار　　کون سا ہے نقش جس میں رنگ گوناگوں نہیں
چشم صنعت بیں سے یہ گلزارِ عالم دیکھ کر　　مثل گل آنکھوں میں ہر خار چمن ہو جائے گا

حسن یار

آمد یار کی گلشن میں خبر پائی ہے　　کاش آ جائے تو گل کی بڑی رسوائی ہے
جلوہ دیا چمن کو جو کل حسن یار نے　　کھینچی عجب طرح کی خجالت بہار نے

محبوب کے مظاہر حسن

لب سنگ میں ہے ڈھنگ ترے لب کے برابر　　ہونٹوں کو ترے لعل بدخشاں نہیں کہتے

یار کے قامت سے ہم کب سرو کو تشبیہہ دیں　　گو سہی ہے سرو لیکن قامت موزوں نہیں
اس کے رخِ زیبا سے گلِ تر نہیں ملتا　　اور قامت رعنا سے صنوبر نہیں ملتا
قد کی آنکھوں کی دہن کی زلف کی تشبیہہ کیا　　اک الف اک صاد ہے اک میم ہے اک لام ہے

داغ دل

داغوں سے ہوا ہے یہ تماشا گہہ عالم　　یہ دل ہے اسے سرو چراغاں نہیں کہتے
اشک خونیں دل کا گر داغ کہن ہو جائے گا　　ہوں گے گل قطرے ہر اک دامن چمن ہو جائے گا
یہ دل کے داغ کی رہی مرقد پہ روشنی　　پایا فروغ کچھ نہ چراغ مزار نے

محرومی و ناکامی

بخت برگشتہ وہ ہوں گر آرزو ہو مرگ کی　　ہاتھ میں قاتل کے وقتِ ذبح خنجر ٹوٹ جائے
طاقت پرواز جاتے وہ تڑپ کے مر جائیں　　اس قدر بھی ہم قفس میں بال و پر پاتے نہیں
مرے ہم آرزو میں فیضؔ اس گل کی مگر اس کو　　نہ آنا تھا نہ آنا تھا نہ آنا تھا نہ آنا تھا

عشق اور کیفیت عشق

صبر و خرد و ہوش و تواں تاب و تحمل　　کھنے یہ ترے شوخ ہیں کیا کیا نہیں جاتے
پروانے کو ہے شوق کہ آغوش میں لوں شمع　　اور شمع ہے سرگرم کہ جل جائے تو اچھا
چپکے جل جانے سے پروانے کا اتنا نام ہے　　شمع کو آغوش میں لے کیا کسی کا کام ہے

شوخی

تم کھل کے تو کچھ بات مری جاں نہیں کہتے　　چپ رہتے ہو شرما کے مگر ہاں نہیں کہتے
کس ادا کو کہیں کس ناز کو کس چلبل کو　　بے طرح دلبری آتی ہے طرح داروں کو

ناقدری سخن

سو برابر اب نہیں عالم میں قدرِ شعر فیضؔ　　کوئی دن میں اور یہ متروک فن ہو جائے گا
ہم فیضؔ غزل کہہ کے پڑھیں سامنے کس کے　　صحبت نہیں مجمع نہیں محفل نہیں افسوس

محاورہ

دل میں اب یہ ہے کہ اپنے گھر میں چپکے بیٹھئے　　جائیں کس کے گھر کسی کے دل میں گھر پاتے نہیں
تو نے مشتاقِ سخن سے کبھی بات نہ کی　　منہ لگایا نہیں بوسے کے طلبگاروں کو
گر ملیں گے فیضؔ تو پوچھیں گے ان سے کیا سبب　　آپ کو ہم آپ میں اب بیشتر پاتے نہیں

شاگرد

نساخؔ نے نواب جعفر حسن نہاں فیضؔ کے ایک شاگرد وزیر علی خاں متخلص بہ

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

لہ تذکرۂ سخن شعرا۔ نساخ صفحہ ۵۵۲ اور تاریخ شعرائے بہار جلد ۱ صفحہ ۱۵

غزل

نازش پرتاپ گڑھی

غربت میں پوچھتے پھرے ایک اک بشر سے ہم
کیوں! کتنی دور ہوں گے بھلا اپنے گھر سے ہم

اس شوق میں کہ بچ کے چلیں سنگِ در سے ہم
اُٹھے قدم قدم پہ خود اپنے ہی سر سے ہم

کچھ یوں اُٹے غبارِ سرِ رہ گزر سے ہم
منزل پہ آ کے ہو گئے نامعتبر سے ہم

چُپ ہیں کہ یہ وقارِ چمن کا سوال ہے
واقف ہیں ورنہ موسمِ دیوانہ گر سے ہم

ذوقِ جنوں، یقینِ محبّت، خلوصِ غم
کس کس کو ساتھ لے کے اُٹھیں تیرے در سے ہم

ہے صرف پاسِ وضع کہ چلتے ہیں ساتھ ساتھ
ورنہ بہت بلند ہیں شام و سحر سے ہم

آتا نہیں ہے یاد بیابانِ زیست میں
کچھ تو ضرور سوچ کے نکلے تھے گھر سے ہم

دُنیا نے کاروبارِ پرستش دیا قرار
کچھ کہہ رہے تھے جھک کے ترے سنگِ در سے ہم

حیراں کھڑے ہیں مصلحتِ وقت کے حضور
کیوں اے جنوں! اسی لیے نکلے تھے گھر سے ہم

آوارۂ حیاتِ ستم ہو کے رہ گئے
دو ہی قدم ہٹے تھے تری رہ گزر سے ہم

ترکِ تعلقات کے بعد اب یہ حال ہے
بیگانہ ہو چلے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

بھٹکے ہیں یوں کہ راہ بروں کا بھرم رہے
نا آشنا نہیں ہیں تری رہ گزر سے ہم

سو بار اس فرار سے بہتر ہے خودکشی
کیا گلستاں کو چھوڑ دیں بجلی کے ڈر سے ہم

یارو! اُٹھو کہ تیشۂ عزمِ حیات سے
غنچے تراش لیں انھیں برق و شرر سے ہم

نازش! گِلہ تو خیر کسی سے نہیں، مگر
بھر پائے اپنی کاوشِ عرضِ ہنر سے ہم

غالب اور حسن و عشق

مرزا صفدر علی بیگ

حسن و عشق کا موضوع ادنیٰ اور اعلیٰ، جاہل اور عالم، فلسفی اور شاعر سب ہی کا مرکزِ توجہ بنا رہا۔ قدیم یونانی مفکرین سے لے کر جدید مغربی حکما، اسلامی مفکرین اور صوفیا نیز شعرائے فارسی اور اردو کا یہ خاص موضوعِ سخن رہا۔ غزل کے قالب میں تو اس کی حیثیت رُوح کی سی ہے۔

حُسن افلاطون کے نزدیک ایک نرم اور ملائم شے ہے جو رُوح کے اندر جگہ پیدا کر لیتی ہے۔ وہ بجائے خود ایک خیر ہے۔ حُسن کی حقیقت کو جاننے کے لیے تقریباً تمام حکما نے دماغ سوزی کی ہے لیکن غالبؔ کا خیال ہے کہ باوجود فکر و نظر اور کد و کاوش کے حسن کی حقیقت سمجھنا مشکل ہے۔

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں　　　کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

حسن کی ایک صفت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور صرف ظاہر کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ داد و تحسین بھی چاہتا ہے۔ حُسن مجازی بھی ہوتا ہے اور حقیقی بھی۔ کائناتِ ہستی کے ذرے ذرے میں حسن نظر آتا ہے اور حسنِ مجازی کہلاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حسنِ حقیقی کیا ہے؟ بعض حکما اور صوفیا کا خیال ہے کہ ذاتِ خداوندی ایک لامحدود لافانی اور لاثانی حسن و جمال کی حامل ہے۔ اسی حسنِ ایزدی کو حسنِ مطلق یا جمالِ مطلق کہا جاتا ہے۔ حسنِ مطلق پر بحث کرتے ہوئے افلاطون کہتا ہے کہ جہانِ رنگ و بو میں آنے سے پہلے بھی حسن کو ہم نے کہیں دیکھا ہے اور اب صفحۂ ہستی پر اس کو ہم نے حواس کے ذریعے پایا ہے۔ مصر کا مشہور نو فلاطونی فلسفی فلاطینوس پوچھتا ہے کہ وہ کون سی شے ہے جو مادی اشکال کو جاذبیت عطا کرتی ہے اور کانوں کو آوازوں کی مٹھاس کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس تمام حسن و جمال کا راز کیا ہے؟ کیا کوئی ایسا حسن ہے جو کبھی مادی اشکال اور کبھی غیر مادی اشیا کے لیے مخصوص ہے؟ وہ خود کہتا ہے کہ ہم کو 'اصل سرچشمے کی طرف رجوع ہونا چاہیے اور اُس اصل کی طرف اشارہ کرنا چاہیے جو تمام مادی اشیا کو حسن سے سرفراز کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ سارے جہان کی جاذبیت محض اسی حسن کے سبب ہے جس کی وجہ سے مادی اشیا خوبصورت ہو جاتی ہیں۔ صوفیا کے نزدیک عالمِ ہستی کا تمام حسن و جمال صرف حسنِ مطلق کا پرتو اور جلوہ ہے۔ اصل سرچشمہ حسنِ مطلق ہے جس سے تمام سوتے پھوٹتے ہیں۔ جس طرح حسنِ مجازی عام انسانوں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے اسی طرح حسنِ مطلق بھی اہلِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ صاحبِ جمال ہے تو ظاہر ہے کہ جس شخص پر اس کا جمال ظاہر ہوگا اس کے نزدیک خدائے تعالیٰ محبوب ہوگا۔ کیونکہ محبت کا سبب خود حسن و جمال ہے۔

صوفیا کا خیال ہے کہ ذاتِ خداوندی نے اپنے حسن کو ظاہر کرنا چاہا اور اپنے حسن کا آپ مشاہدہ کرنا چاہا۔ اس لیے کائنات کی تخلیق کی اور کائنات میں اپنے حسن کو ظاہر کرنا شروع کیا۔ بلکہ عالمِ ہستی کو اپنے لیے آئینہ بنا کر اس میں خود اپنے عکسِ جمال کا مشاہدہ کرنے میں

مصروف ہے۔ اپنے حسن و جمال کی داد و تحسین کے لیے ذاتِ خداوندی نے ذی حیات و ذی شعور مخلوقات کو احساس و ادراکِ جمال عطا کیا۔

ہر ذرۂ کائنات میں حسنِ ایزدی کی جلوہ گری کے مضمون کو اردو کے اکثر اساتذۂ سخن نے رنگا رنگ اسالیب میں باندھا ہے مثلاً

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا　　خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

اس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور　　شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

ہر ایک شے میں سمجھ تو ظہور کس کا ہے　　(اسوا) شرر میں روشنی شعلے میں نور کس کا ہے

اس مضمون کو غالبؔ نے نہایت عمدگی سے باندھا ہے۔ ایک شعر میں حدیثِ قدسی "کُنتُ کنزاً مخفیاً فاَحبَبتُ اَن اعرف فخلقت الخلق۔ یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوقات کو پیدا کیا۔" سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کائنات کی ہر شے جلوۂ الٰہی کی تجلی ہے۔ اس لیے اس اشکال و صور کی کثرت میں بھی ایک وحدت ہے۔ کہتے ہیں ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

حسن کی ایک تمنا یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا مشاہدہ کرنے والا مسحور اور مرعوب بلکہ والہ و شیدا اور پرستار بن جائے۔ حسن نہ صرف اپنا عاشق بلکہ عشق کا خالق ہے۔ وہ مجازی ہو کہ حقیقی یکساں صفات کا حامل ہے۔ حسنِ مجازی کی طرح حسنِ مطلق بھی اہلِ دل کو اپنا شیدائی بنا لیتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مسحور اور مسرور کرنے کے لیے نت نئے روپ میں اپنے آپ کو سنوار کر ظاہر کرتا اور نو بہ نو نقوش بناتا چلا جاتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں۔۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالبؔ کا یہ بھی خیال ہے کہ حسن اپنے آپ کو ظاہر تو کرنا چاہتا ہے، لیکن انسان کی کم نگاہی اس کے راستے میں حائل ہو جاتی اور اس کو محروم نظارہ کر دیتی ہے۔ ؎

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

جمالِ مطلق سے غالبؔ کو شکایت یہ ہے کہ جب نگاہِ انسانی میں اتنی تاب طاقت ہی نہیں کہ اس کا مشاہدہ کر سکے تو پھر اس نے کائنات کا پردہ اپنے اوپر کیوں ڈال لیا ہے اور اپنے آپ کو اس پردے میں کیوں چھپا لیا ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دنیا کی ہر مہذب قوم کے حکما نے حقیقتِ عشق پر غور و فکر کر کے اس سے متعلق نہایت بلند افکار ظاہر کیے ہیں۔ افلاطون اس کو "ایزدی جنون" (DEVINE MADNESS) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک محبت ایک بڑی نعمت اور عطیۂ الٰہی ہے۔ غالبؔ کا خیال ہے کہ عشق ایک متاعِ بے بہا ہے جو انسان کو فی الحقیقت غنی اور مستغنی بنا دیتا ہے۔ اور اس کی ذات کو لامحدود و لافانی کر دیتا ہے۔ اس لیے انسان اپنے جذبۂ عشق پر بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ ؎

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عشق　　ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

غالبؔ کے نزدیک انجمنِ وجود کی ساری ہنگامہ آرائی اور چہل پہل جذبۂ عشق کی مرہونِ منت ہے۔ اگر زندگی عشق سے عاری ہو جائے تو بے کیف و بے مزہ اور ویران و سنسان ہو جائے۔ عناصر میں باہمی جذب و اتصال عشق کے سبب ہے۔ کُل نظامِ ہستی اس کے ربط و کشش ہی کا نتیجہ ہے۔ بغیر عشق کے زندگی خشک، بے لطف اور اجیرن ہو جاتی ہے۔ اسی سے تمام لطافت و رنگینی ہے۔ ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا　　درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

عشق کی ہنگامہ آرائی کو اقبالؔ نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

قلبِ انسانی میں ہزاروں خواہشیں پیدا ہوتی ہیں بعض پوری ہوتی ہیں اور بعض نہ ہو سکنے کی وجہ سے عالمِ یاس پیدا کر دیتی ہیں۔ ساز و سامان کی فکر اور لذائذِ جسمانی کی خواہش دل کو بے تاب اور بے چین کرتی ہے اور انسانی نفس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ہر شخص سرگرداں اور حیران و پریشان نظر آتا ہے۔ لیکن عشق کی عجیب صفت یہ ہے کہ وہ خانہ ویرانی اور بے سر و سامانی کا باعث بن جاتا ہے۔ عاشقِ صادق وہی ہے جو بے سر و سامانی کو باعثِ رنج و محن نہیں سمجھتا۔ عشقِ مجازی اور

عشقِ حقیقی دونوں میں یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ غرض عشق ہر رنگ میں رقیبِ سروسامان بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام جلیل القدر انبیاء، آئمہ اور اہل اللہ فقر شعار تھے بلکہ فقیری پر فخر کرتے تھے۔ متاعِ عشق دولتِ دنیا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ عشقِ مجازی کی اس کیفیت کو قیس کی مثال واضح کرتی ہے۔ قیس عشقِ مجازی میں سب سے اونچا درجہ رکھتا تھا۔ لیلیٰ کے عشق میں اُس نے دنیا و دین کو فراموش کر دیا تھا۔ لباس سے بھی ہمیشہ بے پروا رہتا تھا۔ شہر اور قبیلے کی زندگی ترک کر دی تھی۔ صحرا صحرا گھومتا اور نحیف و ناتواں اور مجنون ہو گیا تھا۔ وہ تصویروں میں بھی عریاں بتایا جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک شعر میں یہ لطافت پیدا کی ہے اور مجنوں کے عشق کی انتہا بے سروسامانی کی انتہا بتائی ہے جو ایسی عریانی تک پہنچ گئی ہے کہ تصویروں میں بھی وہ عریاں رہتا ہے یعنی یہ عشق کی انتہا ہے کہ عشق تصویروں میں بھی عاشق کو بے سروسامان اور برہنہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا　　قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

غالبؔ کہتے ہیں کہ میں عشق کا سراپا رہینِ منت ہوں۔ متاعِ عشق حاصل ہونے کے بعد کونین اور دولتِ کونین نظروں میں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن یہاں ایک چیز نہایت دلچسپ اور غور طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ غالبؔ کی نظر انسانی نفسیات کے ہر پہلو پر ہوتی تھی اس لیے نفسیاتِ انسانی کو پیش نظر رکھ کر وہ کہتے ہیں کہ انسان ایک طرف متاعِ عشق کے حصول پر فخر کر سکتا ہے تو دوسری طرف عشق کی اس صفت کی وجہ سے کہ وہ خانہ ویرانی اور بے سروسامانی کا باعث ہوتا ہے، تاسف بھی کر سکتا ہے۔ نفسِ انسانی ہستی و مافیہا سے محبت کرتا اور لذائذ کی طرف کشاں کشاں جاتا ہے اس لیے ایک اُلجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسان دولتِ دین و ایمان کے باوجود دنیا کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور حقیقت میں یہ امر انسان کے لیے غیر فطری ہے کہ وہ تارک الدنیا ہو جائے۔ بعض مذہبی عقائد کی رو سے رہبانیت پسند اور تارک الدنیا ہونا مستحسن سہی لیکن اسلام نے ایسے تصورات کی نفی کی ہے۔ ایمان و عشق کے ساتھ اُس نے کائناتِ ہستی سے رشتہ قائم رکھنے کا درس دیا ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ　　مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

غالبؔ بھی کہتے ہیں کہ اگرچہ عشق کا تقاضا بے سروسامانی ہے پھر بھی مجھے اپنی مادی زندگی سے محبت ہے اور عشق پر جان نچھاور کرنے کے باوجود میں دنیا سے الگ اور دور رہنا نہیں چاہتا۔ وہ عشق و ایمان اور دنیا و مافیہا دونوں سے ربط رکھنا چاہتے ہیں اور ایک کے لیے دوسرے کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ کہتے ہیں۔ ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی　　عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

صوفیا کے نزدیک عشقِ حقیقی کے لیے فنائیت زیادہ ضروری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسی فنا ہی سے بقائے دوام نصیب ہوتا ہے۔ سراج اورنگ آبادی کہتے ہیں۔ ؎

تو فنا ہو اگر بقا چاہے　　نیستی میں تو دیکھ ہستی ہے

عشق میں اول فنا درکار ہے　　دل سے ترکِ ماسوا درکار ہے

عام طور سے فنا کا مطلب جان سے ہاتھ دھونا اور اپنے وجود یا ہستی کو مٹا دینا سمجھا گیا ہے۔ لیکن صوفیا کے نزدیک فنا سے مراد بشری صفات کو مٹا کر اپنے اندر مکمل طور پر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرنا اور خدا کے ساتھ باقی ہو جانا ہے۔ اس خیال کی کافی وضاحت ابوالقاسم قشیری اور ابوالحسن علی ہجویری نے کی ہے۔ فنائیت کا ایسا ہی تصور غالبؔ نے بھی پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح تنکا آگ میں اپنے آپ کو فنا کر کے یا اپنی صفات کو مٹا کر آگ کی ساری صفات اپنے اندر پیدا کرتا اور آگ کے ساتھ بقا حاصل کر لیتا ہے اسی طرح سالک کو بھی چاہیے کہ اپنے صفات کو مٹا کر صفاتِ الٰہیہ اپنے اندر پیدا کر لے۔ اس فنا و بقا کو غالبؔ یوں سمجھاتے ہیں۔ ؎

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت پر　　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

غالبؔ کا یہ اندازِ فکر ان کے اور بھی اشعار میں ملتا ہے۔ ؎

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیٔ اربابِ چمن　　سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

عشق اور ایمان دونوں کی پہلی شرط وفاداری ہے جس کے بغیر دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ وفاداری بھی مستقل اور دائمی ہو تب ہی

عشق یا ایمان مکمل اور پختہ کہلا سکتا ہے۔ یہی معیار میر اور غالب کے نزدیک بھی ہے۔ ؎

سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط
کیا پوچھتے ہو عاشقی میں ذات کے تئیں۔ میر

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔ غالب

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے۔ غالب

عشق کی راہیں تیرہ و تار، ناہموار، پیچیدہ اور دشوار گزار بلکہ اکثر خطرناک ہوتی ہیں۔ سفینۂ عشق طوفانِ بلا اور گردابِ فنا سے گزر کر ساحلِ مراد پر پہنچتا ہے۔ عشق کی صداقت آشکار نہیں ہوتی جب تک کہ انواع و اقسام کی آفتوں، بلاؤں اور اذیتوں سے امتحان و آزمائش نہ ہو کیونکہ ہر کس و ناکس دعوائے عشق کر سکتا ہے لیکن محبوب کسی طرح کی اذیت تو برداشت نہیں کر سکتا۔ برعکس اس کے سچا عاشق آفتوں میں لذت اور راحت پاتا ہے۔ وہ بلبل کی طرح نالہ و فریاد نہیں کرتا بلکہ بقول سعدی شیرازی پروانے کی طرح خموشی سے جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ سعدی کہتے ہیں۔ ؎

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

آفاتِ عشق پر صبر کرنے اور خوش رہنے کی تعلیم اکثر صوفیا اور شعرا نے دی ہے۔ عشق مجازی اور حقیقی دونوں میں اذیتیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس خیال کو اکثر شعرائے اردو نے پیش کیا ہے:-

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا۔ درد

تھی مسلکِ الفت کی مشہور خطرناکی
میں دیدہ و دانستہ کس رہ میں قدم رکھا۔ میر

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا۔ مضموںؔ

غالب نے نہایت بلیغ انداز میں اکثر اشعار میں اس طرح کے مضامین باندھے ہیں۔ ؎

غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

ہے ننگِ سینۂ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہ ہو
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

غالب کے نزدیک عشق ایک لامتناہی اور لافانی شے ہے۔ اختتامِ حیات خاتمۂ عشق نہیں۔ عاشق کے لیے زندگی کی شام ہی صبحِ عشق ہے۔ عاشق کی موت اُسے عشق سے فراغت نہیں دیتی اور نہ اجل کی پھونک اس کی "آرزوئے ناز" کو مٹا سکتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز
ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز



یاد

راجہ نرائن راز

مرے گھر کے آنگن میں یہ پیڑ گھنیرا کیسا ہے!
اس کی شاخوں سے ہر لحہ زہر ٹپکتا رہتا ہے!

خونِ جگر سے ننھّی ننھّی کلیاں جب بھی آتی ہیں،
اُن کا خوں ہو جاتا ہے، پل بھر میں مُرجھا جاتی ہیں

— اس کی شاخوں سے ہر لحہ زہر ٹپکتا رہتا ہے!
سخت پریشاں، حیراں ہوں، کس صورت سے چھٹکارا ہے!

•

اس کو کاٹ کے دیکھ چکا ہوں، یہ ویسے کا ویسا ہے!
میرے گھر کے آنگن میں یہ پیڑ گھنیرا کیسا ہے!

رفتارِ جنون

چین کے تیسرے ایٹمی تجربے سے متاثر ہو کر



ساحل صدیقی

کیوں رواں ہے مرے احساس کے زخموں سے لہو
کرب سا روح میں، یہ دل میں چبھن کیسی ہے
کیا دہک اُٹھیں چتائیں مرے ارمانوں کی
یہ تعفن، یہ فضاؤں میں گھٹن کیسی ہے

چشمِ گریاں کو ابھی اور بہو رونا ہے
دل میں رہ رہ کے یونہی دردِ تپاں اُٹھے گا
زہر پھیلائیں گے توپوں کے دہانے پیہم
جانے کب تک ابھی سینوں سے دھواں اُٹھے گا

شورشِ گردشِ دوراں میں کمی کیا ہوگی
حادثے راہ میں کچھ اور نمایاں ہوں گے
زہر آلود ہوا سانس نہ لینے دے گی
اپنی لاشوں کو اُٹھائے ہوئے انساں ہوں گے

ہر طرف دہر میں اک شورِ قیامت ہوگا
اور چیخوں سے زمانے کی فضا گونجے گی
دب کے رہ جائے گی سب ٹوٹتے دلوں کی آواز
ایٹمی بم کے دھماکوں کی صدا گونجے گی

غیر ممکن ہے سبِ غم کا سویرا ہونا
ہے یہی رنگ تو بھٹکے گا یہ انساں تا دیر
کس کو معلوم ہے کب پھٹ کے بکھر جائے زمیں
آج ہر سمت نظر آتے ہیں بارود کے ڈھیر

کیسے اس دَور کو میں دورِ ترقی کہہ دوں
خشک آنسو کوئی اب تک سرِ مژگاں نہ ہوا
آج وہ لوگ خلاؤں میں سکوں ڈھونڈھتے ہیں
جن سے دُنیا میں علاجِ غمِ پنہاں نہ ہوا

چند دیوانے جَلا دیں نہ کہیں دُنیا کو
دل لرزتا ہے کہ خطرے میں ہر انساں ہے یہاں
کاش اِن عقل کے ماروں سے کوئی یہ کہہ دے
اب بھی ہر ذرہ مثالِ مہِ تاباں ہے یہاں

روپے کی قیمت میں کمی
اور اُس کے نتائج

سی۔ سبرامنیم

(مرکزی وزیر خوراک و زراعت، اجتماعی ترقی اور امداد باہمی)

کسی ملک کا سکہ بنیادی طور پر اس دیش کے اندرونی لین دین کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بھارت میں اس طرح کہیں گے کہ اس کپڑے کی قیمت اتنے روپے ہے۔ گویا یہ اشخاص کے درمیان اشیاء کے تبادلے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن جب ہم غیر ملکوں میں رہنے والوں کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں یا ان سے سامان خریدتے ہیں تو وہ روپے کی شکل میں قیمت نہیں قبول کرتے۔ ہمیں یہ معاملہ یا تو سونے کی شکل میں یا کسی معیاری بین الاقوامی اکائی کے حوالے سے طے کرنا پڑتا ہے۔ ہم وضاحت کرتے ہیں کہ اسٹرلنگ یا ڈالر کتنے روپے کے مساوی ہے اور اس طرح یہ ہمارا معاملہ طے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم برطانیہ سے مال خریدیں تو بالعموم قیمتوں کے تعین میں پونڈ کا حوالہ دیا جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک پونڈ کس قدر روپوں کے برابر ہے اس لیے ہم پونڈ کو روپوں کی صورت میں تبدیل کر لیتے ہیں اور اس طرح سے اندرون ملک ہماری قیمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ملکوں کو سامان فروخت کرنے کی صورت میں، اگرچہ ہم اپنے مال کی قیمت روپوں میں بتاتے ہیں، تاہم اس کی قیمت ڈالر، پونڈ یا روبل میں، جیسی بھی ضرورت ہو تبدیل کر کے واضح کرنا ہوتی ہے۔ زیادہ تر ملکوں میں سرکاری شرح تبادلہ کے حساب سے یہ وضاحت کی جاتی ہے۔ غرض مختلف ملکوں کے درمیان تجارت کے لیے یہ شرح تبادلہ بڑی اہم چیز ہے۔

ہماری شرح تبادلہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۶ء تک یہ رہی ہے: ۴٫۷۶ روپے = ایک ڈالر۔ ۱۳٫۳۰ روپے = ایک پونڈ۔ لیکن ۶ جون ۱۹۶۶ء سے ہم نے غیر ملکوں سے ہونے والی تجارت کے ضمن میں یہ شرح تبادلہ بدل دی ہے۔ اب ایک ڈالر ۷٫۵۰ روپے اور ایک پونڈ ۲۱٫۰۰ روپے کے برابر ہے۔ اس تبدیلی کو روپے کی قدر میں کمی (DEVALUATION) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس تبدیلی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دیش کے اندر بھی روپے کی قیمت میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اگر روپے کی قیمت میں اضافہ کر دیا گیا ہوتا تو اس کے نتائج کیا ہوتے۔ ظاہر ہے کہ شرح تبادلہ کی قیمت میں اضافے سے روپے کی گنجائش میں اضافہ نہ ہو گیا ہوتا۔ اسی طرح سکے کی قیمت میں کمی سے خود ملک کے اندر روپے کی قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں بینگن، کھیرا، دھان اور گندم کی قیمتوں میں جو اندرون ملک پیدا ہوتے ہیں کوئی اضافہ صرف اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ بیرونی منڈیوں میں روپے کی قیمت میں تبدیلی آئی ہو۔

توازن ادائیگی

ہم ایک ملک کی حیثیت سے اپنا سامان غیر ملکوں کی منڈیوں میں فروخت کرتے ہیں جسے ہم "برآمدات" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی طرح غیر ملکوں سے

جو سامان ہم خریدتے ہیں اسے ہم "درآمدات" کا نام دیتے ہیں۔ ہم درآمدات کی قیمت اس غیر ملکی کرنسی کے ذریعے ادا کرتے ہیں جو ہم برآمدات سے کماتے ہیں۔ کئی برسوں سے ہم برآمد کے مقابلے میں زیادہ سامان درآمد کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس درآمد اور برآمد ہونے والے سامان کی قیمت میں جو فرق پڑتا ہے اسے ہم دیگر ملکوں سے اور دیگر ملکوں کے بینکوں سے قرض لے کر ادا کرتے ہیں۔ اس کام کو ہم اسی ذریعے سے کرتے ہیں جس کا نام "امداد" ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ ابھی ہم اپنی معیشت کی تعمیر میں لگے ہیں اور اس کے لیے سامان اور خام مال بڑی مقدار میں ضروری ہوتا ہے۔ اس کی قیمت ہم صرف اس سامان کی قیمت سے ادا نہیں کر سکتے جو ہم برآمد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں دیگر ممالک ہماری مدد کے لیے تیار ہیں۔ مگر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے ہم نے بھی دو باتوں کی کوشش کی ہے:

(۱) مختلف ذرائع سے اپنے برآمدات کا فروغ۔

(۲) درآمد پر کڑی نگاہ اور درآمد کیے جانے والے سامان کی جگہ اپنے ملک میں اس کا بدل فراہم کرنے کی کوشش۔

اس کے بعد بھی برآمدات اور درآمدات میں فرق باقی رہتا ہے۔ اسی کو اقتصادیات کے ماہرین توازن ادائیگی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سادہ لفظوں میں غیر ملکی کرنسی کی ہماری ضرورت ہماری رسد سے زیادہ ہو۔

جب کوئی شے اپنی رسد کے اعتبار سے کم پڑ جاتی ہے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ بھارت میں غیر ملکی زرمبادلہ کی کمی ہے جس کے سبب روپے کی شکل میں اس کی قیمت بڑھ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہانگ کانگ اور سنگاپور کے بازاروں میں ایک ڈالر دس روپے کے عوض بک رہا تھا اور ایک پونڈ ۲۵ سے لے کر ۳۰ روپے تک کے عوض مل رہا تھا۔ تاہم اس تمام عرصے میں ہم نے کوشش کی کہ سرکاری شرح تبادلہ یعنی ایک ڈالر = ۴،۷۶ روپے اور ایک پونڈ = ۱۳،۳۳ روپے) برقرار رہے۔ لیکن یہ مصنوعی اور کم شرح تبادلہ اور اس کے نتیجے میں پایا جانے والا عدم توازن اگر زیادہ عرصے قائم رہتا تو اس کے نتائج برے ہوتے۔

بیشتر ملکوں کی طرح بھارت کے وہ باشندے جو غیر ملکوں میں مقیم ہیں بھارت کے لیے غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ ہیں۔ لیکن گزشتہ چند برسوں سے غیر ملکوں میں مقیم بھارتی باشندوں کی آمدنیاں سرکاری ذرائع سے بھارت نہیں آتی تھیں۔ غیر سرکاری طرح سے ایک ڈالر کے ۸ سے لے کر ۹ روپے تک مل جاتے تھے۔ اس طرح سے غیر سرکاری لین دین نے نہ صرف غیر ملکی زرمبادلہ کی قلت میں اضافے کی صورت اختیار کرنا شروع کی بلکہ اس سے "اسمگلنگ" جیسی سرگرمیوں کو بھی فروغ ہوا۔ گویا ایک طرف اپنا دیش غیر ملکوں میں اپنی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے غیر ملکی کرنسی قرض لے رہا تھا اور دوسری طرف اسمگلر ملک میں سونا اور دیگر سامانِ تعیش لا رہے تھے۔ سرکاری اور غیر سرکاری شرح تبادلہ کے فرق کے پیش نظر اس خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

نیشنل ڈیفنس ریمی ٹینس اسکیم کے حالیہ تجربات نے بھی یہ ثابت کر دیا تھا کہ مناسب محرکات کی موجودگی میں غیر ملکوں میں ہمارے باشندوں کی کمائی کا دراز حصہ بھارت آئے گا۔

ریمی ٹینس اسکیم مختصراً یہ تھی کہ غیر ملکوں میں آباد کوئی بھی بھارتی جو غیر ملکی زرمبادلہ بھارت بھیجنا چاہتا' وہ اس رقم کا ایک حصہ پریمیم پر فروخت کر سکتا تھا جس سے اشیاء کی چند مخصوص اقسام درآمد ہو سکتی تھیں۔ دراصل اس طرح سے ہم نے جو کچھ کیا اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ بھیجنے والے کو ایک ڈالر یا پونڈ اسٹرلنگ کے عوض اس تعداد سے زیادہ روپے مل سکیں جو اسے کسی اور طرح مل پاتے۔ چنانچہ بہت سے ایسے صنعت کاروں نے جو زرمبادلہ کی اشد ضرورت محسوس کر رہے تھے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس اسکیم پر عمل درآمد کی مدت میں بھارت سرکار کو اس کے توسط سے ۳۰ کروڑ کے لگ بھگ زرمبادلہ ملا۔ اس سے روپے کی قیمت میں کمی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

ہمارے برآمدات کی گرانی

بیرونی منڈیوں میں ہماری برآمدات گراں ہونے کے سبب دوسرے ملکوں کی اشیاء کے مقابلے میں فروخت نہیں ہو پاتی تھیں۔ چائے، پٹ سن اور کافی جیسی اجناس کو چھوڑ کر دوسرے برآمدات مالی امداد کے بغیر کافی مقدار میں کھپ نہیں سکتے۔ چنانچہ اپنے برآمدات کو برقرار رکھنے کے لیے اشیاء کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف صورتوں میں مالی سہاروں کا اہتمام کیا گیا۔ درحقیقت برآمد کے لیے مالی امداد کا مطلب ہے سرکاری شرح کی نسبت روپے کی کم شرح پر زرمبادلہ میں مالیت کو تسلیم کرنا۔ مختلف برآمدات کو

دی گئی مالی امداد کئی حالتوں میں ۵۰ تا ۶۰ فی صد تک تھیں۔ جن صورتوں میں مالی امداد دی گئی اُن سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا جانے لگا۔ تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ روپے کی قیمت میں تخفیف سے قبل برآمدات کے لیے امداد کی اسکیم سے غیر ملکی کرنسیوں کے ضمن میں روپے کی قیمت میں کمی کو بالفعل تسلیم کر لیا گیا تھا۔

عملی طور پر ہم ۶ رجون ۱۹۶۶ء سے قبل ہی دوسرے ذرائع سے روپے کی قیمت کم کر رہے تھے۔ ہم نے درآمدی محصولات میں اضافہ کر دیا تھا تاکہ درآمدات محصولات کے سبب پہلے کی نسبت گراں ہو جائیں۔ چنانچہ دوسرے ملکوں میں سو روپے کے برابر قیمت والی مخصوص اشیاء پر تقریباً ۵۵ روپے کا محصول عائد کیا جانے لگا۔ اس طرح ملک میں ایسی اشیاء کی قیمت ۱۵۵ روپے ہو گئی جب کہ دوسرے ملکوں میں اس کی قیمت سو روپے ہی رہی۔ چند اشیاء پر اس سے بھی زیادہ شرح کے محصولات عائد کیے گئے۔ یہ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا کہ اگر کوئی محصولات نہ ہوں تو غیر ملکی اشیاء ملک میں تیار کی ہوئی اشیاء کی نسبت زیادہ بکنے لگیں۔ اس کے برعکس یوں کہا جا سکتا ہے کہ غیر ملکی اشیاء کے لیے قوت خرید کے معاملے میں روپے کی قیمت کو سرکاری شرح کی نسبت کم تسلیم کر لیا گیا تھا۔

سرکار نے اس عدم توازن کو دور کرنے کے لیے ۶ رجون ۱۹۶۶ء کو روپے کی قیمت میں تخفیف کا اعلان کیا۔ یہ اقدام بذات خود اس مرض کا علاج نہیں ہے بلکہ اسے دور کرنے کے معاملے میں ایک پہلا قدم ہے۔ اس سے برآمدات مقابلے کی قیمتوں پر فروخت کی جا سکتی ہیں جس سے غیر ضروری اشیاء کی روپوں میں قیمت بڑھنے سے ان کی درآمد کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

اشیاء کی قیمتیں

کیا روپے کی قیمت میں تخفیف سے ملک کے اندر قیمتوں میں اضافہ ہوگا؟ جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے جہاں تک خالص دیسی چیزوں کا تعلق ہے ان کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک درآمد کردہ خوراک، فرٹیلائزر اور پیٹرولیم کی مصنوعات کا تعلق ہے ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ نہیں ہوگا کیوں کہ سرکار روپوں میں ان کی درآمدات پر آنے والی زیادہ لاگتوں کے حصے کی مالی امداد دینے کا اعلان کر چکی ہے۔ ان میں کارین، ریفریجیٹر صنعتی سامان اور صنعتی خام مال جو یا تو مکمل طور پر یا خام مال اور حصوں کی صورت میں درآمد کیا جا سکتا ہے، شامل نہیں ہے۔

ہمارے خاص خاص مسئلوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ہماری بہت سی صنعتوں میں ہماری صلاحیت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ہم اسے معمولی درآمدات سے برقرار رکھنے میں دقت محسوس کرنے لگے ہیں۔ خام مال کی قلت کے سبب ہماری چھوٹے پیمانے کی صنعتیں اپنی صرف ۲۰ تا ۳۰ فی صد صلاحیت سے کام لے پا رہی ہیں۔ ہمارے بہت سے بڑے کارخانوں میں بھی یہی صورت حال ہے۔ دوسرے ملکوں سے کافی مقدار میں خام مال اور مشینری کے حصول کی دستیابی سے اگرچہ روپوں میں اس کی قیمت ہمیں زیادہ ادا کرنی پڑے گی، یہ کارخانے اپنی مکمل تر صلاحیت کو بروئے کار لا سکیں گے جس سے ملک میں زیادہ دولت پیدا ہوگی اور زیادہ لوگوں کو روزگار ملے گا۔ بالواسطہ طور پر چوں کہ پلانٹوں سے مکمل طور پر کام لیا جائے گا اس لیے بالائی اخراجات تیار کردہ یونٹوں کی زیادہ مقدار پر بٹ جائیں گے جس سے لاگتوں میں کمی واقع ہوگی۔ چنانچہ ایک طرف تو درآمدات کی زیادہ قیمتوں سے لاگتوں میں اضافہ ہونے کا امکان ہے اور دوسری طرف آزادانہ درآمدات کی بنا پر صلاحیت کے مکمل تر استعمال سے لاگتوں میں کمی کی توقع بھی کی جا سکتی ہے۔ جب روپے کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے تو اس کا مطلب محض یہ ہوتا ہے کہ ہمارے برآمد کنندگان جو کچھ پہلے حاصل کر رہے تھے اس کی نسبت زیادہ روپیہ حاصل کرنے لگیں گے اور اس سبب سے وہ دوسرے ملکوں کی اشیاء کی قیمتوں کے مقابلے میں اپنی چیزیں فروخت کر سکیں گے۔ مثلاً کا ہو کے دام اگر گھٹا دیے جائیں تو باہر کے ملکوں میں اس کی کھپت اور مانگ کافی بڑھ سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم برآمدات سے اپنی مجموعی کمائی بڑھا سکتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے تاجر گاہک کو جیتنے کی کوشش کرتے ہیں اور بالعموم اس میں وہ کامیاب رہتے ہیں کیوں کہ قیمت میں قدرے کمی سے وہ اکثر زیادہ گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کی بکری میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

اشیاء کے بعض دیگر زمروں میں قیمتوں کی تبدیلی سے مانگ کے بڑھنے میں اتنی لچک پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہاں قیمتوں کو کم کر کے مانگ میں اضافہ کرنے کا کوئی زیادہ امکان نہیں ہے۔ روپے کی قیمت میں تخفیف کے نتیجے میں

عموماً چائے کے برآمد کنندگان نے شرح تبادلہ کی رد و بدل کی حدود کے اندر بڑا منافع حاصل کیا ہوگا۔ انھیں برآمد کی ہوئی چائے کے ہر ٹن پر زیادہ روپے حاصل ہوئے ہوں گے۔ ایسے غیر متوقع منافعوں کو روکنے کے لیے سرکار نے برآمداتی ٹیکس لگانے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔ یہ ٹیکس چند دیگر روایتی برآمدات مثلاً پٹ سن، کافی، کھالوں اور چمڑوں وغیرہ پر بھی عاید کیے گئے ہیں۔ لیکن فولاد مشینری خام مال مثلاً خام لوہے وغیرہ جیسی ہماری غیر روایتی برآمداتی مدوں کے ضمن میں کھپت کی منڈیوں کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان منڈیوں میں قیمتوں کی کمی بیشی کا شعور بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے روپے کی بین الاقوامی قیمت میں تخفیف کو برآمدات کے فروغ کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔

ایک عام خدشہ یہ ہے کہ روپے کی قیمت میں تخفیف سے ہمارے غیر ملکی قرضوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ فرض کیجیے کہ تخفیف سے پہلے ہمارے قرضے روپے کی شکل میں ۶۰، ۴ کروڑ روپے کے تھے۔ ہم نے ان قرضوں کا معاہدہ روپے کی شکل میں نہیں بلکہ غیر ملکی سکّے کی یونٹوں کی شکل میں کیا تھا۔ روپے کی گنتی میں تبدیلی سے اس کل قرضے میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔

روپے کی قیمت میں تخفیف کیوں ؟

بسا اوقات یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ہمیں اپنے روپے کی قیمت کم کیوں کرنی پڑی ؟ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ۱۸ سال سے ہم نے اپنی معیشت کی تعمیر کی ہے۔ ترقی کے اس عمل میں معیشت میں کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ ان خرابیوں کو دور کرنا، ترقی کی رفتار کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر وقار کے غلط تصور کے تحت ہم نے عدم توازن کو دور نہ کیا تو ہماری مسلسل ترقی دشوار ہو جائے گی۔

اس ضمن میں ایک ظاہری تضاد نظر آتا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ ایک طرف ہم کہتے ہیں ہم خود کفالتی کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا کہنا ہے کہ آیندہ چند برسوں میں معیشت کو ترقی پذیر رکھنے کے لیے ہمیں زیادہ امداد کی ضرورت ہوگی۔ ان دونوں باتوں میں کیا مطابقت پائی جاتی ہے ؟ اس کے لیے اناج ہی کی مثال لے لیجیے۔ ہمیں اپنی ضرورت کے لیے تقریباً ۱۲ کروڑ میٹرک ٹن اناج ہر سال پیدا کرنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ضرورت بھر اناج پیدا کرنے کے لیے کافی مقدار میں کیمیاوی کھادوں کی ضرورت ہوگی۔ یعنی ہمیں تقریباً دس لاکھ میٹرک ٹن کھادیں جن کی قیمت ۳۰ کروڑ ڈالر ہوگی، درآمد کرنا پڑے گی۔ لیکن اگر ہم کھادیں درآمد نہ کریں تو تقریباً ایک کروڑ میٹرک ٹن اناج کی پیداوار سے ہم محروم رہیں گے جسے خریدنے کے لیے، اگر کہیں سے اتنی مقدار میں اناج خریدا بھی جا سکے، تو ۱۰۰ کروڑ ڈالر کی ضرورت ہوگی۔ اب ظاہر ہے کہ ۳۰ کروڑ ڈالر کی کھادیں درآمد کرنے، ۱۰۰ کروڑ ڈالر کا اناج درآمد کرنے اور کھادیں یا خوراک بالکل درآمد نہ کرنے کی تین ممکن صورتوں میں سے واحد قابل ترجیح صورت پہلی والی ہی ہے۔ نسبتاً طویل فاصلے والا ہمارا مقصد خود مکتفی ہونا ہے لیکن ہماری فوری منزل بقا ہے۔ یہ دونوں واضح طور پر لازمی ہیں۔ ایک طاقت ور اور عظیم ملک کی حیثیت سے ہمیں صورت حال کا مقابلہ جرأت کے ساتھ کرنا چاہیے اور ملک کے عوام کو سرکار کے جرأت مندانہ فیصلوں میں اس سے تعاون کرنا چاہیے۔

کچھ لوگ ایسے نفسیاتی خوف کو ہوا دے رہے ہیں کہ روپے کی قیمت میں تخفیف سے قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، سرکار نے خوراک، مٹی کے تیل، کھادوں وغیرہ کی فراہمی میں امداد دینے کے جو فیصلے کیے ہیں ان سے اس طرح کی نکتہ چینی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ملک ہی میں تیار ہونے والی چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو۔ ہم سب کا یہ فرض ہے خواہ ہم تیار کنندگان ہوں یا صارفین، کہ قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے کی سعی کریں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں صارفین کی کواپریٹو تنظیموں کو مضبوط تر بنانا چاہیے۔

ہم بھارت کے اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل نو کے زبردست کام میں مصروف ہیں اور ہمیں چند دشواریوں یا مسئلوں سے گھبرا جانا نہیں چاہیے۔



غزل

سحر رامپوری

اور وقفِ عذاب کیا کرتا
ایک جام شراب کیا کرتا

وقت کے پیچ و تاب میں آکر
ظرفِ گنگ و چناب کیا کرتا

مرحبا! سو طرح کے اندیشو!
اک طرح کا عتاب کیا کرتا

مفت میں جیسے بہہ گئیں نہریں
محتسب، احتساب کیا کرتا

رات اور مرگِ ناگہاں کی گھٹا
زیست کا ماہتاب کیا کرتا

ظلم کا دل ہی جانتا ہو گا
پیار کا سدِ باب کیا کرتا

آج کی دوزخی حقیقت میں
کل کی جنت کا خواب کیا کرتا

یہ کہن سال حادثوں کا غرور
احترامِ شباب کیا کرتا

زد پہ ہوتے ہوئے بھی دستِ جنوں
حسن کو بے نقاب کیا کرتا

جاں نثارِ چمن کے نام سہی
صرف خط کا جواب کیا کرتا

اپنے ماحول سے سحر ہی نہیں
کوئی بھی اجتناب کیا کرتا

غزل

میکش کانپوری

جو زندگی کے تلخ تقاضوں سے ڈر گئے
وہ بدنصیب موت سے پہلے ہی مر گئے

اللہ! ترکِ عشق کی یہ دل فریبیاں
جب یاد آگئے اور بھی بے چین کر گئے

شفاف آنسوؤں کے ٹپکنے کی بازگشت
اتنی حسین تھی کہ زمانے ٹھہر گئے

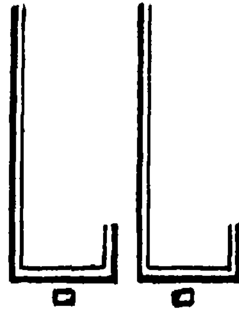
عنوانِ داستانِ الم ہی زباں پہ تھا
یہ کیا! عروسِ وقت کے گیسو بکھر گئے

تاریخ کہہ رہی ہے شہیدانِ عشق کی
تصویرِ زندگی میں نیا رنگ بھر گئے

ناقوسِ دیر چپ ہے اذانِ حرم خموش
اے انقلابِ وقت! یہ انسان کدھر گئے

راہِ وفا میں عشق ہے مجبوریوں کا نام
آئی جو یادِ دوست تو آنسو بکھر گئے

میکش وہی ہیں پیچ و خمِ راہِ زندگی
کیسے کہوں کہ بگڑے مقدر سنور گئے



بابا

شیام کنول

دسمبر کی وہ رات ابھی جوان نہ ہوئی تھی لیکن سردی پورے شباب پر تھی جس کے باعث دس بجنے سے پہلے ہی شہر کی اکثر سڑکیں ویران ہو گئی تھیں صرف تلک روڈ پر کچھ چہل پہل تھی۔ زمرد تھیٹر کے سامنے کچھ رکشے کھڑے تھے اور کچھ آجا رہے تھے۔ تلک روڈ جہاں ختم ہوتی تھی اس سے کچھ پہلے بائیں ہاتھ کو مین روڈ سے ایک پتلی سی سڑک جسے گلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا شروع ہو کر بل کھاتی ہوئی بستی میں چلی گئی تھی۔ اسی گلی کے نکڑ پر پان کی دکان سے ذرا ہٹ کر پانچ "کاؤبوائے" قسم کے نوجوان آپس میں کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ یہ پانچ نوجوان جدید فیشن کے بال بنائے ہوئے اور چست لباس اور نفیس جوتے پہنے انتہائی شائستہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے بے حد شریف اور اعلیٰ خیالات کے حامل نظر آتے ہیں۔ لیکن — حقیقتاً یہ "پانچ شریف" گنڈے ہیں۔ ایسے گنڈے جن کے نام سے پورا علاقہ لرزتا ہے۔ پولیس ہیلو بچاتی ہے اور شریف آدمی ان کے راستے سے اس طرح ہٹ جاتے ہیں جس طرح . . . سود خور مہاجن پر نظر پڑتے ہی مجبور و بے بس قرض دار۔ ان میں ایک جیکب ہے جو قتل کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا دھنو جو اغوا کی وارداتوں کا ماہر مانا جاتا ہے۔ تیسرا سردار ہے جو اس صفائی سے فساد کراتا ہے کہ اس کی لگائی سے بچنا محال ہے۔ چوتھا پریتا ہے جسے ہر فن مولا کہا جاتا ہے اور پانچواں گر ہے جو صرف پیسے کو خدا مانتا اور کسی بھی "معاملے" میں اپنے کسی بھی ساتھی کا معاون بن جاتا ہے۔ پورے علاقے میں یہ "پانچ شریف" کہلاتے ہیں۔ دوسرے علاقے کے گنڈے بھی پانچ شریفوں کا راستہ کاٹنے سے گھبراتے ہیں اور اگر کبھی کوئی ایسی جسارت کرتا تو گر یا جیکب کا ہاتھ کسی گنجان شاہراہ یا ویران سڑک پر اس طرح چلتا کہ اسے سوچنے سمجھنے کی بھی مہلت نہ ملتی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا۔

نکڑ کی پان کی دکان ایک طرح سے ان کا اڈہ تھا۔ اکثر "ضرورت مند" یہیں ان سے معاملات طے کرتے۔ غروب آفتاب کے بعد بالعموم وہ اسی نکڑ پر نظر آتے۔ گویا ان کے فرصت کے لمحات یہیں گزرتے۔ اس وقت بھی وہ اس طرح کھڑے باتوں میں مصروف ہیں جیسے اپنے فرصت کے لمحات گزار رہے ہوں لیکن ان کی بے چین اور متجسس نگاہیں بتا رہی ہیں کہ وہ کسی کی منتظر ہیں، کسی خاص شخص کی یا کسی خاص واقعے کی۔ گزرتے ہوئے لمحات کے دوران گلی کے اس نکڑ پر ایک رکشا آکر رکا اور پانچ شریفوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ رکشا سے ایک سیم تن، ماڈرن لڑکی اتری۔ یہ لڑکی — ارملا ہے۔ رکشا سے اتر کر اس نے ایک نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی جو رات کے گیارہ بجا رہی تھی۔ اس نے دوسری نظر اردگرد کے ماحول پر ڈالی جو سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف پان کی دکان کے قریب کچھ لوگ کھڑے تھے۔ اس نے ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور رکشا والے کو کرایہ دے کر وہ پرس سنبھالے ہوئے بستی میں جانے والی گلی میں داخل ہو گئی۔

ارملا ایک خوش شکل، خوش پوش، ہنس مکھ، متناسب الاعضا اور انتہائی آزاد خیال لڑکی ہے۔ اعلیٰ تعلیم نے اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ کلب، سینما گھر اور تفریح کی دوسری جگہوں میں اس کی فرصت کا بیشتر وقت گزرتا ہے۔ والدین کے سائے سے محروم اپنے اکیلے بڑے بھائی کے زیر سایہ پرورش پانے والی یہ حسین و جمیل لڑکی بڑی حد تک خود سر اور مغرور بھی ہے۔ گھر سے نکل کر اس

اس پتلی سی گلی سے ہوتے ہوئے سڑک تک پہنچنے میں کئی انگلیاں اس کی طرف اٹھتیں۔ بیک وقت کئی تیز اور چبھتی ہوئی نگاہیں جو اس کے جسم کو تحلیل کر کے اپنے آپ میں جذب کر لینے کی خواہاں ہوتیں اس پر جم جاتیں۔ بسا اوقات سرگوشی کرتے ہوئے کچھ فقرے اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل جاتے۔ لیکن وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ایک بے نیاز سی مسکراہٹ تلے ان سب کو روندتی آگے بڑھ جاتی۔ اس کی نگاہ التفات کے خواہاں اس کی اس بے اعتنائی پر جھنجھلا جاتے۔ اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں گڑھی جاتیں مشہور ہوتیں اور پھر اپنی موت آپ مر جاتیں۔ ارملا نے ان کہانیوں پر کبھی دھیان دیا نہ اس کے معمولات میں کوئی فرق آیا۔ وہ اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے ملتی۔ دل کھول کر قہقہے لگاتی اور کہانیاں گڑھنے والے جھلس کر رہ جاتے۔ ایک بار اس کے بھائی نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ارمی! تو جانتی ہے کہ کیا کر رہی ہے؟" "کیا کر رہی ہوں بھیا!" اس نے معصومیت سے پوچھا۔ "یہ... یہ بستی کے لوگ ملنے جلنے والے کیا کہتے ہیں.. جانتی ہے؟" بھائی کو شاید کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ "بھیا" ارمی ایک دم سنجیدہ ہو گئی "وہ لوگ جن کے کردار تباہ ہو چکے ہوں، جو خود دلدل میں پھنس چکے ہوں اور جن کے ذہن گندگی کی آماجگاہ بن چکے ہوں، ہر ایک کو اپنے ہی جیسا سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں تصنع زندگی کی حقیقت بن کر رہ گئی ہے۔ اس دور میں لوگ اصلی دھات کو بھی ملمع سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ خود ان کی اپنی زندگی ملمع بنی ہوئی ہے۔ ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جس میں تقدیس ایک بے معنی لفظ بن گیا ہے۔ اس میں قصور نکتہ چینوں کا نہیں معاشرے کا ہے۔ عورت کو تربیت کے بغیر اور کسی منزل کے یقین کے بغیر ایک ایسی آزادی عطا کر دی گئی ہے جسے وہ خود سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسے ایک ایسی راہ پر لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے جس کے بارے میں وہ نہیں جانتی کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی۔ اس راہ پر چلتے ہوئے اس کے کمزور اور نازک قدموں کا لڑکھڑا جانا ناممکن نہیں۔ اور جب وہ لڑکھڑاتی ہے تو اسے اس راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دینے والے ہی انگشت نمائی پر اتر آتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اسے اس راہ پر اس منزل کی سمت رواں کس نے کیا! لیکن —— ایسا ہر ایک کے ساتھ تو نہیں ہوتا —؟ ہر ایک کے قدم تو نہیں لڑکھڑاتے۔ ؟؟ بھیا ذرا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہیے کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔!

پھر —!! آپ ایسے لوگوں کی انگشت نمائی پر توجہ کیوں دیتے ہیں جو اخلاق و کردار کے اعتبار سے خود دیوالیے ہو چکے ہیں۔" اور اس کے بعد پھر کبھی بھائی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسے سمجھاتا۔ ویسے خود اسے اپنی بہن پر فرشتوں کے تقدس سے کم اعتماد اور بھروسہ نہ تھا۔

ارملا رکشے سے اتر کر گلی میں داخل ہونے کے بعد چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ اسے اپنے پیچھے کئی دبے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور فوراً ہی اسے شدید خطرے کا احساس ہوا کیونکہ وہی پانچ شریف اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ ان سے بخوبی واقف تھی خطرے کے احساس کے ساتھ ہی اُس کے قدم تیز اٹھنے لگے اور اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ وہ آنے والے پُرخطر لمحات کے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔ اس کوشش میں اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ عورت کے لیے حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی خطرے سے خالی نہیں۔ اس نے سوچا کہ گھر تک پہنچنے کے لیے اسے ایک اور نسبتاً ویران اور تنگ گلی سے گزرنا ہے۔ اس سنسان گلی میں تنہا پا کر یہ پانچ شریف ..... اور اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ گئی۔ مگر خطرہ جس قدر بڑھتا جا رہا تھا اس کا ذہن اتنی ہی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ چنانچہ گھر کی طرف مڑنے والی گلی میں جانے کے بجائے وہ زیادہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور کسی نہ کسی طرح سیدھی گلی پار کر کے دوسری سڑک پر پہنچ گئی۔ سڑک بھی ویران ہی تھی۔ دو رویہ کھڑے پوسٹ لیمپوں کی روشنی میں اسے دور ایک ٹھیلہ نظر آیا اور اس کی سلب ہوتی ہوئی قوت عود کر آئی۔ اس نے سوچا ٹھیلہ بابا ہی کا ہوگا اور اس پر بابا ضرور ہوگا۔ پانچ شریف اس سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔ اور پھر وہ دوڑنے لگی۔ ایک بار پوری قوت سمیٹ کر وہ چلائی۔

"بابا——"

سر پر گھنے الجھے ہوئے بڑے بڑے بال، لانبی گھنی بے ترتیب ڈاڑھی، چوڑی چھاتی اور بوسیدہ لباس میں لپٹے قوی ہیکل جسامت کا نام تھا۔ بابا۔ کوئی پندرہ برس قبل اسی چھوٹی سڑک کے فٹ پاتھ پر ایک اجنبی سردی سے بچنے کی کوشش میں گھٹنے پیٹ میں دیے اور گھٹنوں میں ہاتھ دبائے ایک گٹھری کی طرح پڑا سسک رہا تھا۔ فٹ پاتھ سے کچھ پرے دکانوں کے چھجوں کے نیچے بہت سے لوگ اسی طرح رات کاٹنے کے لیے پڑے رہتے تھے۔ لیکن یہ اجنبی نہ تھے۔ چھجوں کے نیچے بنے ہوئے چبوتروں میں سے ہر چبوترہ کسی نہ کسی کا ٹھکانہ تھا۔ یہ ایسے

ٹھکانے تھے جنھیں کوئی دوسرا استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ یہ فٹ پاتھ کا اور فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والوں کا اصول تھا جس پر وہ سختی سے پابندی کرتے۔ رات تقریباً آدھی ڈھل چکی تھی۔ کچھ سائے جھومتے ہوئے ایک طرف سے آئے۔ ان میں سے ایک اس اجنبی کے پاس رکا اور باقی آگے بڑھتے رہے۔ "ابے او موالی! باپ کی جاگیر سمجھا ہے اس جگہ کو جو تان کر پڑا ہے؟" سائے کی آواز ابھری لیکن اجنبی کے جسم میں جنبش تک نہ ہوئی۔ "ابے اٹھتا ہے کہ دوں ایک ٹھوکر؟" سائے کی شراب میں ڈوبی آواز پھر ابھری۔ لیکن اجنبی اس کی آواز سے بے نیاز ہی رہا اور پھر ــــ اس کی ٹانگوں پر ایک ٹھوکر پڑی۔ پھر دوسری، تیسری، اور جیسے ٹھوکروں کی بارش ہونے لگی۔ اجنبی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک آدھ ٹھوکر شائد اجنبی کی پیشانی پر بھی پڑی تھی کیونکہ اس سے خون بہہ بہہ کر چہرے پر پھیل رہا تھا۔ ٹھوکریں پڑتی رہیں لیکن اجنبی کی زبان گنگ ہی رہی۔ "ابے او بلو دادا! کیوں مفت میں غریب کی جان لے رہا ہے۔ چل چھوڑ اسے پڑا رہنے دے۔" فاصلے سے ایک آواز بلند ہوئی اور ٹھوکروں کی بارش رک گئی۔ "دیکھ بے عبدل! تو میرے علاقے میں میرے معاملوں میں دخل نہ دیا کر۔ میں پوچھتا ہوں یہ۔۔ ہے کون ہمارے ادھر کا ہے کہ کہیں۔۔۔ جاسوس واسوس ہے۔" "ابے ہوا بھی نوکیا؟ اس فٹ پاتھ پر کیا دھرا ہے؟؟ دیکھتا نہیں کہ سردی میں اکڑا جا رہا ہے۔" "سب جانتا ہوں۔ ابے تو بھی تو۔۔۔ "موالی ہے"۔ عبدل نے بلبیر کے قریب پہنچ کر لہراتے ہوئے کہا اور بلبیر کو ہنسی آگئی۔ "ہاں بے تو بھی موالی میں بھی موالی۔ ہم دونوں کی ذات برادری ایک خدا ایمان ایک۔۔۔" بلبیر نے جھومتے ہوئے کہا اور عبدل کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس طرح آگے بڑھ گیا جیسے وہ چند سکنڈ پہلے ایک انسان کو نہیں کتے کے پلے کو ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ اجنبی عبدل اور بلبیر کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے اپنی پیشانی کے زخم تک کا احساس نہ رہا۔ جب عبدل اور بلبیر کے سائے دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کون کہتا ہے انسانیت مرگئی؟ ہاں وہ مجروح ضرور ہے اور اس کے زخم ناسور بنتے جا رہے ہیں۔" وہ زیر لب بڑبڑایا اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر پھیلے ہوئے خون کو صاف کیا پھر اسی طرح فٹ پاتھ پر لیٹ گیا۔ اور ــــ وہ اس کا "اڈہ" بن گیا۔

اجنبی جلد ہی محنت مزدوری کرنے لگا۔ ہر شام جب وہ اپنے کام سے لوٹتا تو سڑک سے متصل محلے کی گلی میں ایک چبوترے پر کچھ دیر سستانے کے لیے بیٹھ جاتا۔ کچھ دنوں تک گلی کے بچے اس کے چہرے پر بکھری ڈاڑھی، اور گرد میں اٹے الجھے ہوئے بال دیکھ کر وحشت سے دور بھاگتے رہے۔ لیکن پھر بچے اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب وہ ان کے لیے ٹافیاں، چاکلیٹ یا اسی قسم کی چیزیں لے کر آیا کرتا۔ وہ جیسے ہی گلی کے نکڑ پر نظر آتا بچے "بابا آگیا۔ بابا آگیا" چیختے ہوئے دوڑتے اور جب اس سے لپٹ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلاتے "بابا ہماری مٹھائی" کہتے تو اس کی بے نور آنکھوں میں اور مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک انوکھا رنگ، انوکھا نکھار آجاتا اور وہ ایک عجیب سی خوشی، ایک عجیب سی مسرت محسوس کرتا۔ رفتہ رفتہ اجنبی اس گلی میں فٹ پاتھ پر اور ہر اس جگہ جہاں کوئی اس کا جاننے والا تھا "بابا" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ لیکن بابا کے بارے میں کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ اس بستی میں صرف مالا ہی ایک ایسی ہستی تھی جو بابا کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ بابا شاید اسے بھی کچھ نہ بتاتا لیکن اسے مالا کے اس بچے سے بے انتہا محبت تھی جس کے باپ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ حتیٰ کہ مالا بھی نہیں جانتی تھی۔ جس وقت بابا فٹ پاتھ پر اپنا اڈہ اور گلی میں ایک ٹوٹے ہوئے چبوترے پر اپنی بیٹھک بنانے میں مصروف تھا، اس وقت مالا کی گود میں یہ بچہ ایک سال کا تھا اور محلے کے لوگ اس بچے کو اور اس کی ماں کو بڑی نفرت سے دیکھا کرتے تھے۔ لیکن مالا اس نفرت و حقارت سے بے نیاز اپنی کرایہ کی کھولی میں اپنے بیٹے کو پیار کے آنچل میں لیے پالتی رہی۔ مالا کی کوکھ کو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں حیاتِ انسانی کا ایک بیج ملا تھا جو عالم وجود میں آکر گناہ کا پیڑ کہلانے لگا۔ گناہ کس نے کیا؟ نفرت کا مستحق کون ہے؟ کبھی مالا نے ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی سعی نہ کی۔ بلکہ کبھی اس کے ذہن میں ایسے سوال ابھرے ہی نہیں۔ اس کے پاس ذہن تھا نہ دل اور نہ جذبات۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش تھی۔ وہ جی رہی تھی صرف اس لیے کہ جینا فرض تھا۔ وہ جی رہی تھی اس بچے کے لیے جو بہر حال اس کا بچہ تھا۔ بابا کی انسانیت اور بے لوث محبت نے مالا کے دل کو پگھلا دیا اور اس نے اسے اپنی دکھ بھری کہانی سنا دی اور بابا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مالا کی طرف دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا "بیٹی تو نے ایک بیٹا پایا اور میں نے تین بیٹے اس شیطان کو بھینٹ کیے۔ تین معصوم زندگیاں۔ ان کی خون میں لتھڑی لاشیں سامنے پڑی تھیں اور میں بے بس تھا۔ معلوم نہیں دونوں طرف لوگوں کو ایسی کتنی لاشیں دیکھنا پڑی ہوں گی۔" بس۔ اتنا کہہ کر بابا چپ ہو گیا تھا۔ پھر کبھی اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اب بابا کی توجہ مالا اور بچے پر اور بڑھ گئی۔ وہ بچے کی دیکھ بھال اس طرح کرتا جیسے

وہ مالا کا نہیں خود اس کا بچہ ہو۔ بچہ جب کچھ بڑا ہوا تو بابا نے اسے ایک ہوٹل میں ملازم رکھوا دیا کہ ماں کا کچھ بوجھ کم ہو۔ محلے کے لوگ اکثر اسے چھیڑنے کے لیے اس سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور وہ بے بسی سے رو دیتا۔ ان چھیڑنے والوں میں پانچ شریف بھی ہوتے جو بچے ہی تھے۔ پھر جب مالا کا بچہ پندرہ سولہ برس کا ہوا تو چھیڑنے والوں سے الجھنے لگا۔ جہاں کسی نے باپ کا نام پوچھا وہ آپے سے باہر ہو کر چیخنے لگتا۔ گویا باپ کا نام اس کے لیے ایک چڑ بن گیا تھا۔ بابا ہمیشہ لوگوں کو سمجھاتا "اس سے نفرت نہ کرو۔ اسے جینے دو۔ اس سے نفرت کروگے تو وہ سماج کے رگوں میں زہر بھر دے گا اور پھر پورا سماج۔"اور بابا بات ادھوری چھوڑ کر سوچنے لگتا۔ سوچتا رہتا!

محلے کے لوگوں کو احساس ہو گیا تھا کہ بابا کوئی معمولی آدمی نہیں۔ بات رہنے کا اس کا انداز، اس کی باتوں میں پنہاں گہرائی، فہم و فراست، سنجیدگی، خودداری اور ہر انسان سے بے پناہ خلوص و محبت، اپنی شخصیت اور زندگی سے اس کی بے نیازی، ان سب نے مل کر لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ بابا کا احترام کریں۔

پانچ شریف" بھی جو بچپن کی وادی سے نکل کر نوجوانی کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے اور اپنے "جوہر" کے سبب شہرت پا گئے تھے، بابا کے آگے سر اٹھاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ایک بار۔ پانچ شریفوں نے مل کر بابا کو گھیر لیا۔ "بابا کرمو اپنے باپ کا نام کیوں نہیں بتاتا؟" بابا نے بڑی گہری نگاہ سے ایک ایک کے چہرے کو ٹٹولا۔ اس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ "اس لیے کہ وہ جانتا نہیں"۔ اس نے بڑے مدہم لہجے میں جواب دیا۔ "تو پھر اس کا باپ کون ہے؟" یہی سوال...؟ بابا کے کانوں کی لوئیں جیسے جلنے لگیں، آنکھیں سرخ ہو گئیں، شدت جذبات سے ہونٹ لرزنے لگے اور مٹھیاں بھنچ گئیں۔ کچھ دیر تک بابا اسی عالم میں رہا۔ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ پانچ شریفوں کی طاقت سے ڈر گیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ پاکباز مالا کی مجبوری اور بے بسی کو اس کے بچے کا باپ تسلیم کرانے میں ناکام رہا تھا۔ بے بسی کے اس دلدل میں پھنسے پھنسے وہ چلایا۔ "کرم چند کا باپ... ایک شیطان تھا... خونخوار بھیڑیا... لیکن... کرم چند کا باپ کون تھا یہ دیکھنے کی ضرورت کیوں ہے؟ کیا تم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ خود کرم چند آج کیا ہے؟ تم جو شریف کہلاتے ہو، قتل کرتے ہو، فساد کراتے ہو، جیب کاٹتے ہو، چور بازاری کرتے ہو بلکہ وہ سب کچھ کرتے ہو جو ایک قوم دشمن اور سماج دشمن کرتا ہے، پھر بھی تم شریف ہو؟ سماج کے بہی خواہ ہو؟؟ اور کرم چند۔۔! جو ایمان داری سے محنت مزدوری کر کے زندہ ہے تمھاری اور تمھارے سماج کی نگاہ میں قابل نفرت ہے؟ سماج کے ماتھے کا کلنک ہے۔ کیوں؟ اور اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کا نام نہیں جانتا؟ کیا تمھارے ہی جیسے لوگ کرم چندوں کی پیدائش کا سبب نہیں بنتے؟ پھر۔! کرم چند پر، ایسے معصوم اور بے گناہ پر تمھارا عتاب کیوں۔۔؟" وہ بابا کی بات کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے اور چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلے گئے۔

بابا جب اس فٹ پاتھ پر آیا تو پہلے وہ ایک مزدور بنا۔ لیکن وہ زیادہ عرصے تک اس پیشے میں نہیں رہا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک صبح جب وہ ایک نئے ٹھیلے پر ترکاریاں سجائے گلی میں داخل ہوا تو لوگ بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور بابا مسکرا مسکرا کر ترکاریاں بیچنے میں محو ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کبھی بابا نے مزدوری نہیں کی۔ بابا کے ٹھیلے پر ہمیشہ تازی ترکاریاں اور پھل بھی نظر آتے۔ بابا کا ٹھیلہ گلی اور محلے والوں کے لیے ایک نعمت ثابت ہوا کیونکہ بابا کے ٹھیلے پر ہر چیز کے دام مناسب ہوا کرتے۔ بابا کی اس ادا نے بھی لوگوں کے دل کو موہ لیا اور بابا کا احترام اور زیادہ ہونے لگا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن بابا نے کبھی ایک گھر یا ایک کھولی کی نہ تمنا کی اور نہ کوشش کی۔ بس اپنے ٹھیلے ہی پر رات گزارتا۔ جب محلے والے کہتے "بابا کم از کم ایک کمرہ ہی لے لو۔ سردی اور برسات میں سر چھپانے کو جگہ تو ہو جائے گی"۔ تو بابا مسکرا کر کہتا "اب گھر کس کے لیے؟ کیا تم لوگوں کے دل میں میرے لیے جگہ نہیں۔۔؟ تم ایک کھولی کی بات کرتے ہو! اب تو یہ پورا محلہ، یہ پورا دیش میرا گھر ہے۔ پھر ایک کھولی کو لے کر کیا کروں؟ مجھے کھولی نہیں صرف تھوڑی سی جگہ چاہیے۔ تم لوگوں کے دلوں میں"۔ اور لوگ عقیدت سے اپنے سر جھکا دیتے۔۔۔ اور بابا کے دن سڑکوں پر، راتیں ٹھیلے پر گزرتی رہیں۔

"بابا۔ بابا" کی خوفزدہ آوازوں نے بابا کو جھنجھوڑا تو ہڑبڑا کر وہ ٹھیلے پر اٹھ بیٹھا۔ "کون ہے؟" بابا کی بھاری آواز فضا میں تیر گئی اور اس کی نظر اپنی طرف بڑھتی ہوئی ارملا پر مرکوز ہو گئی۔ پھر بابا کی نظر ان سایوں تک پہنچی جو ارملا کے پیچھے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ خطرہ محسوس کر کے بابا ٹھیلے سے اتر آیا۔ ارملا اب قریب آ چکی تھی۔ "اوہ! بیچ میں یہ حرامخور کہاں سے آ گیا؟ اب کام بننا مشکل ہے"۔ دھن راج رکتے ہوئے بڑبڑایا۔ دوسرے ساتھی بھی رک گئے۔ "بابا۔ بابا بچاؤ"۔ ارملا نے بابا کی پشت پر پناہ لیتے ہوئے لرزتی آواز میں کہا۔ "گھبراؤ نہیں بیٹی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ بابا کی گمبھیر آواز ابھری۔ "یہ حرامخور ہمیشہ

ہمارے کاموں میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ کہتا ہے میری آواز پہچانو۔ میں انسان ہوں۔ سور کا بچہ" ۔ پرتیا بڑبڑایا "ختم کر دوں حرامخور کو؟ موقع اچھا ہے۔ جھگڑا ہی مٹ جائے گا" گلر نے چاقو پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ " نہیں! اسے ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تمھیں اس کی قوت کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ اس طرح ختم نہیں ہوگا۔" " تو پھر؟" — " واپس چلو"۔ اور پانچ شریف اپنے مقصد میں ناکام لوٹ گئے۔

بچے رنگ برنگے اسکول ڈریس پہنے کتابوں کے بیگ سنبھالے ٹولیوں کی شکل میں یا ایک ایک دو دو گلی میں داخل ہو رہے تھے۔ دور گلی کے آخری سرے پر بابا کا ٹھیلہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ بچے بابا کو گھیرے کھڑے تھے۔ اچانک گلی سے پرے سڑک پر شور ہونے لگا۔ بابا کچھ دیر اس مجمع کی طرف دیکھتا رہا جو شور کر رہا تھا۔ پھر وہ ٹھیلہ چھوڑ کر اس طرف دوڑ پڑا۔ مجمع میں کوئی کہہ رہا تھا " بدکار کی اولاد! ناہنجار!! تیری یہ ہمت کہ شریفوں کی بیٹیوں کو چھیڑے۔ مارو۔ مارو بدمعاش کو ختم کر دو" اور پھر ہاتھ چلنے لگے۔ مجمع میں گھری گلی کی ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی جس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ جوانی ننگی کھڑی تھی۔ حیرت و خوف سے پھٹی آنکھیں اس مجمع کو دیکھ رہی تھیں جیسے اس کی آبرو کا خیال نہ تھا۔ " نہیں... نہیں... مجھے مت مارو... کیلے کا چھلکا میں نے نہیں سردارے نے پھینکا ہے"۔ کرم چند کی فریاد کرتی ہوئی آواز ابھری اور بابا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ہجوم کو چیرتا کرم چند کے پاس پہنچ گیا۔ بابا کو دیکھ کر لوگ خود بخود پیچھے ہٹنے لگے۔ کرم چند کو پانچ شریف گھیرے ہوئے پیٹ رہے تھے۔ " اس کا گناہ کیا ہے؟ " بابا کی گرجدار آواز بلند ہوئی اور چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ " لو اس کا حمایتی بھی آگیا۔ پہلے اسے ختم کرو" کئی ہاتھ ایک ساتھ بابا پر پڑے۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں میں ایک پل کے لیے گلر کے ہاتھ میں چاقو چمکا اور بابا کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ خون ابل پڑا۔ اور اس میں بابا کا بدن بھیگتا گیا۔ پھر وہ لمحہ بہت جلد آگیا جب بابا کے جسم سے بہتے ہوئے خون نے مجمع کو مشتعل کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ شریف پٹنے لگے۔ لیکن بابا نڈھال ہو کر نیچے گر چکا تھا۔ خون میں لت پت بابا کے پہلو میں ہاتھوں سے منہ چھپائے کرم چند بیٹھا سسک رہا تھا۔ کئی بچے بابا کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ بابا کے جسم سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں جب ان کی ہچکیاں تیز ہو گئیں تو بابا نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ " تم... تم رو رہے ہو میرے بچو؟ ہاں... تم لوگ... تم لوگ میری موت پر رونے کے سوا کیا کر سکتے ہو" بابا نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ " نہیں... نہیں بابا ہم تمھیں مرنے نہیں دیں گے۔ تم زندہ رہو گے بابا۔ رہتی دنیا تک زندہ رہو گے۔ ہمیں تمھاری ضرورت ہے" کئی بچے چلائے۔ ایک شور سا اٹھا اور کئی بچے بابا سے لپٹ گئے۔ " اگر... اگر تم لوگ چاہو گے... کوشش کرو گے تو میں ضرور زندہ رہوں گا۔ اب... اب میری زندگی... میرا وجود تم لوگوں کے ہاتھ ہے..." بابا نے اپنے لبوں پر مسکراہٹ ابھارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور لرزتے ہاتھوں سے کرم چند کے ساتھ کئی بچوں کو سمیٹ کر اپنے زخمی سینے سے لپٹا لیا۔

★

جعفر حسن خاں فیض ——— (بسلسلہ ص۹)

یر کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ان کے چار اشعار نقل کیے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اس شخص کو موسیقی میں اچھا دخل ہے۔

فیض کے بڑے بھائی نور الحسن خاں کے بیٹے سعادت حسین خاں تمکین اور فیض کے بیٹے مہدی علی خاں مہدی بھی شاعر تھے۔ تمکین نے ۱۲۵۵ھ میں اور مہدی نے ۸۲ سال کی عمر میں ۲۸ رشوال ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) کو انتقال کیا۔ ناسخ نے تذکرۂ سخن شعرا (ص۴۶۴) میں اور نجی نے تاریخ شعرائے بہار (ص۸) میں مہدی علی کا تخلص مہدی اور ان کو راسخ عظیم آبادی کا شاگرد لکھا ہے یہ سراسر غلط ہے۔

ملاحظہ ہو مضمون راقم الحروف نیا دور بابت دسمبر ۱۹۶۵ء ص۳۲

مہدی خاں کے تین بیٹوں میں ہادی علی خاں فائز شاعر تھے اور پروفیسر جمیل کے دادا سید مظہر حسین صاحب مظہر سے مشورہ کرتے تھے۔ ہادی علی خاں فائز کے پوتے اور جناب احمد علی خاں کے صاحبزادے الحاج محمود علی خاں صبا عظیم آبادی شاد عظیم آبادی کے تلامذہ میں ہیں۔ صبا نے ۱۹۲۳ء میں نیو کالج پٹنہ میں بزم ادب کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۵۸ء میں اپنا کلام موج صبا کے نام سے شایع کیا۔ صبا عظیم آبادی غزلوں میں بڑی شگفتگی اور پیاری زبان استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندانی حالات کا ایک تذکرہ ریاض الانساب کے نام سے مرتب کیا ہے۔

مشورہ

انتخاب سید

مدّتوں سوچ کے صحراؤں کو اپنایا ہے
بڑی مشکل سے خموشی کی زباں سیکھی ہے
دل کی ہر خواہش معلوم کو تنہائی میں
زندہ رہنے کی ادا بخشی ہے
دوستو! شہر کے ہنگاموں سے آواز نہ دو
اب مرا شہر کے احساس سے جی ڈرتا ہے

آج کی رات تو کچھ دیر کو سو لینے دو
اپنی آوازوں کے نشتر نہ اُتارو دل میں
آج میں دور، بہت دور چلا آیا ہوں
زلف کے سایوں سے، آنکھوں کے اشارات سے دور
حسن اور عشق کی فرسودہ روایات سے دور
آرزوؤں سے، تمناؤں سے افکار سے دور

یعنی
دیکھے ہوئے اک شہر طلسمات
سے بھی دور چلا آیا ہوں
آج کی رات تو تنہائی کے سینے سے لپٹ لینے دو
دل کے ویرانے میں سوئی ہوئی یادوں کو
جگاتے کیوں ہو
میرے ماضی کو مرے سامنے لاتے کیوں ہو
چیخ اُٹھے نہ مری قوت برداشت کہیں
کھل نہ جائے کہیں برسوں کی رفاقت کا بھرم
ہو سکے تو مجھے آواز نہ دو
ورنہ شرمندہ نظر آؤ گے!!

غزل

ذکاء الدین شایاں

کب سے بیٹھے ہیں لیے زخم دل و جاں ہم بھی
کیا کہیں تجھ سے اے لطف گریزاں! ہم بھی

کس جگہ مرحلۂ زلف سیہ پہنچا ہے
اب چھپائے ہوئے پھرتے ہیں گریباں ہم بھی

موج گل، موج صبا کو ذرا بیدار کرے
چھو کے آئے ہیں ترا گوشۂ داماں ہم بھی

اپنی بربادیِ دل پہ تھے بہت ہی نازاں
تم کو دیکھا تو ہوے آج پشیماں ہم بھی

آج تو خوش تھے، مگر اے نگہ غم افروز
تیری خاطر ہوئے جاتے ہیں پریشاں ہم بھی

آج تو اے نگہ دوست! ہمیں بھی رُولے
آج تو بے کسی دل پہ ہیں خنداں ہم بھی

اُس کے جلووں کی سحر دیکھیے کس حال میں ہو
ایک مدّت سے نہیں چاک گریباں ہم بھی

راڈار — فضائی عکس کا عجیب و غریب آلہ

اندرجیت لال

آج سائنس کی دنیا میں راڈر کو بڑی اہمیت حاصل ہو چکی ہے اِس کے ذریعے کسی دور کی شے کا بیرونی خاکہ محصل کے پردے پر بنتا ہے۔ راڈر اندھیرے میں یا گھرے بادل کے باوجود چیزوں کو یا فضائی راہ کی رکاوٹوں کو "دیکھنے" کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہوائی جہاز جس میں راڈر لگا ہوا ہو اور جو رات کو اڑ رہا ہو، اس کا ہوا باز دور کی اونچی عمارتیں اور خطرناک پہاڑ کی چوٹیاں میلوں پہلے سے راڈر کے محصل کے (دیکھنے والے) پردے پر دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ راڈر اندھیری رات میں طیاروں کی رہنمائی کر کے ان کو منزل تک پہنچانے کے کام آسکتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں راڈر بمبار جہازوں کو رات میں اور گھرے بادلوں میں اپنے ہدف کو ڈھونڈنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ زمین پر لگا ہوا راڈر غنیم کے ہوائی جہازوں کو بہت فاصلے سے اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے۔

راڈر گونج کے اصولوں پر کام کرتا ہے۔ اگر آپ کسی پہاڑی سے آدھ میل کی دوری پر کھڑے ہوں اور زور کی آواز لگائیں اور اس کے بعد دیکھیں کہ ٹھیک کتنی دیر بعد آواز گونجتی ہے تو آپ یہ پتا چلا سکتے ہیں کہ پہاڑی کتنی دوری پر تھی۔ کچھ اسی طرح راڈر لاسلکی موجیں بھیجتا ہے اور پھر اسی موج کے واپس آنے کے وقت کو بتاتا ہے۔

راڈر میں آلہ نشر اور محصل دونوں ہوتے ہیں۔ اول الذکر تو ریڈیو کی نشرگاہ کی طرح کام کرتا ہے لیکن محصل دور کی چیزوں کو بتانے کا کام دیتا ہے۔ یہ لاسلکی موجوں کی گونج کو ایک تصویر کی شکل میں پیش کرتا ہے اور مقررہ وقفوں سے بہت تیز لاسلکی موجوں کی لہر چھوٹی چھوٹی باڑھ کی صورت میں بھیجتا ہے۔ یہ لہریں تیز شعاع کی صورت میں جاتی ہیں۔ لہروں کی یہ باڑھ ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے تک رہتی ہیں۔ اس کے بعد دوسری باڑھ ایک سیکنڈ کے ہزار دیں حصے کے بعد پھینکی جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں آلہ نشر لاسلکی موجیں ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے تک بھیجتا ہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک راڈر کام کرتا رہتا ہے۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ لاسلکی موجیں بادلوں میں سے گزر سکتی ہیں یا یوں سمجھیے کہ تاریکی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ موجیں خط مستقیم میں اس وقت تک سفر کرتی رہتی ہیں جب تک ان کے راستے میں کوئی ٹھوس چیز مثلاً کوئی عمارت وغیرہ نہیں حائل ہوتی۔ جب شعاع کسی چیز سے ٹکراتی ہے تو منعکس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ واپس منعکس بھی ہوتی ہے۔ منعکس شعاعیں جب راڈر کی طرف جاتی ہیں تو محصل ان کو وصول کرتا ہے جہاں یہ منفی شعاعی نلی میں چھوٹے چھوٹے دھبوں کی صورت میں بدل جاتی ہیں۔ اگر بھیجی جانے والی شعاعوں کا رُخ صرف ایک ہی طرف ہو تو محصل آگے کے منظر کا زیادہ حصہ پیش کرنے سے معذور ہوگا۔ مثال کے طور پر ہوائی جہاز کے راڈر میں آلہ نشر کا ہوائیہ تیزی سے گھومتا رہتا ہے اور اس طرح وہ نیچے کے علاقے کا عکس بار بار قبول کرتا رہتا ہے۔ عکس قبول کرنے کا عمل دور نمائی کے آلہ نشر کے کیمرے کی نلی میں مسلسل ہوتا رہتا ہے۔

اگر ہوائی جہاز کے نیچے کی زمین ہموار ہو تو لاسلکی موجوں کی ہر باڑھ برابر مقدار میں منعکس ہوگی اور محصل میں منفی شعاعی نلی پر جگہ یکساں روشن ہوگی۔ لیکن اگر

ہوائی جہاز ایک اونچی عمارت کے اوپر پرواز کر رہا ہو تو لاسلکی شعاعی موجوں کو جو اس عمارت پر پڑیں گی، ہوائی جہاز تک واپس آنے میں کم فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ چوں کہ یہ شعاعی موجیں عمارت سے منعکس ہوں گی، اس لیے ان شعاعوں سے پہلے واپس آئیں گی جو اس کے (عمارت کے) اطراف کی زمین سے آ رہی ہیں۔ اس طرح عمارت سے منعکس ہونے والی روشنی کے دھبے سے منفی شعاعی نلی کے پردے پر ایک تصویر بنتی ہے جو اس عمارت کا بھدا سا نقشہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پردے کے بیچوں بیچ ایک دھبہ نظر آتا ہے جو ہوائی جہاز کی جگہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے ہوا باز کو عمارت کی صحیح جگہ اور اس سے ہوائی جہاز کا فاصلہ معلوم ہو جاتا ہے اور وہ عمارت سے ہوائی جہاز کی ٹکر کو بچانے کے لیے عمارت کے اوپر سے اڑ سکتا ہے یا اس سے کترا کر نکل سکتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آلہ ہوائی جہازوں کی پرواز میں کتنا کارآمد ہے۔ یہی نہیں بلکہ پانی کے جہاز کے کپتان کے لیے بھی راڈر رات کے وقت برف کے تودوں کے درمیان سے گزرنے میں معاون ہوتا ہے۔

راڈر کو گم شدہ ہوائی جہازوں کو ڈھونڈنے میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہوائی جہاز راڈر کے پردے پر روشنی کا ایک دھبہ نظر آتا ہے اس لیے تلاش کے دوران راڈر کے پردے پر جب اس طرح کا دھبہ دکھائی دیتا ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ ہوائی جہاز فلاں جگہ پر ہے اسی طرح راڈر کو کہر کے موسم میں ہوائی جہازوں کے اتارنے کے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہوائی اڈے کا متعلقہ زمینی عملہ راڈر کے ذریعے ہوائی جہاز کو کہر کے باوجود دیکھ سکتا ہے اور ہوا باز کو ریڈیو کے ذریعے ہدایت دے کر ہوائی جہاز نیچے اتار سکتا ہے۔

آج کل دنیا کی بڑی طاقتیں ایک دوسرے کے پیغامات اسی آلے کے ذریعے سن لیتی ہیں۔ ویسے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ان پیغامات کو ELECTRONICS کے ذریعے کنٹرول کیا جائے تاکہ حریف درمیان سے ان پیغامات کو نہ لے اڑے۔ مگر مزا یہ ہے کہ یہ ملک ایک دوسرے کے پیغامات کا پتہ راڈر کے ذریعے چلا ہی لیتے ہیں۔ ان دنوں کچھ ایسے "نیولہ نما" جہاز بن گئے ہیں جو اپنے مخالف کی سرحدوں پر منڈلاتے رہتے ہیں اور اس ملک کے ہوائی جہازوں کے ٹھکانوں، ان کی رفتار اور اڑان وغیرہ کی جاسوسی کرتے رہتے ہیں۔ ان جہازوں میں اس طرح کا ساز و سامان ہوتا ہے جو مخالف کے پیغامات کا پتہ لگا سکتا ہے لیکن ان پیغامات کو معلوم کر لینے کی تفصیلات کسی پر روشن نہیں ہوتیں۔ بہر حال اس ضمن میں کوّے کی شکل سے ملتے جلتے جہاز کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ جہاز فضا میں پھیلی ہوئی ہر ہلکی سے ہلکی آواز کو جذب کر کے اسے ٹیپ ریکارڈ کر لیتا ہے۔ پھر اسے ماہرین کے پاس بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کے کوڈ (رموزی تحریر) کو حل کر سکیں۔

کوّے نما جہاز میں یہ خوبی ہے کہ یہ خفیہ پیغام کو تو معلوم کر سکتا ہے لیکن خود اس کی اپنی حرکت اور مقام کا مخالف کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ عام طور پر راڈر اسٹیشن فضا میں لہر چھوڑتا ہے اور پھر خود اپنے آلے کے ذریعے فضا میں منتشر آواز کو جذب کر لیتا ہے۔ کوّا نما جہاز فضا کی لہروں سے آواز کو راڈر کے مقابلے میں کہیں جلد اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ راڈر کو ہر وقت چالو حالت میں نہیں رکھتے بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق جاسوسی کرنے یا پیغام بھیجنے کے لیے کچھ گھنٹے مقرر کر لیتے ہیں اور راڈر اپنا کام انہی معینہ گھنٹوں میں انجام دیتے ہیں۔ ہر وقت راڈر کو چالو رکھنے کی صورت میں فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹے راڈر چلتا رہے تو دشمن گمراہ کن اشاروں، آوازوں اور فضائی لہروں سے الجھن میں ڈال سکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایسے کئی دلچسپ واقعے دیکھنے میں آئے۔ ایک بار جرمنی نے راڈر سے لیس کچھ جہازوں میں اپنے کچھ آدمی اڑائے تاکہ وہ لندن کے اوپر پرواز کرتے ہوئے اپنے ہوائی جہازوں سے رابطہ پیدا کر سکیں۔ ادھر لندن کے جہاز رانوں نے اس کا توڑ کرنے کے لیے ایسے گمراہ کن پیغامات بھیجے کہ جرمنی کے جہاز دھوکا کھا کر لندن کے ہوائی اڈوں پر اتر آئے۔

فضا میں ایک قوی لہر پیدا کر کے راڈر کے عمل کو منجمد بھی کر سکتے ہیں۔ مزا یہ ہے کہ اس سے راڈر چلانے والے کی کچھ سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ کس طرف سے راڈر کے عمل کو منجمد کیا جا رہا ہے۔ ہاں کچھ ایسے راڈر بھی ہیں جن میں اس طرح کی مداخلت ممکن نہیں۔ راڈر کے پیغام کو منجمد کرنے کے بجائے اس میں گمراہی کا ساز و سامان مہیا کر دینا زیادہ دلچسپ ہوتا ہے تاکہ دشمن اپنے راستے سے بھٹک جائے۔ ایک عجیب و غریب طریقہ جسے گمراہی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کو SPOOFER کہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اپنا جہاز دشمن

شکستِ نو ہر بار

مقبول حسین

جیل کے سنتری نے جوتے بنانے والے وارڈ کا دروازہ کھولا، جہاں پرکاش بہت انہماک سے فرمے پر چڑھے ہوئے جوتے کے اُپر اور سول کی سلائی میں مصروف تھا۔

وہ پرکاش کو وارڈن کے کمرے میں لے گیا۔ وارڈن صاحب نے پرکاش کو گورنر صاحب کا معافی نامہ تھماتے ہوئے کہا کہ وہ کل صبح آزاد کر دیا جائے گا۔

پرکاش نے چار سال کی قید میں ابھی چار ماہ گذارے تھے۔ مردہ دلی سے معافی نامہ اس نے انگلیوں میں دبا لیا اور بڑبڑایا۔ ”اتنے دنوں بعد معافی نامہ ملا۔ ہنہ! اسے تو بہت پہلے ملنا چاہیے تھا۔“

”آپ ایک اچھے اور ہونہار نوجوان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آزاد ہو کر آپ الماریاں اور تجوریاں توڑنے کے بجائے ایک باعزت زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے۔“ وارڈن نے پرکاش کو نصیحت کی۔

”مگر میں نے آج تک کوئی الماری یا تجوری نہیں توڑی۔“ پرکاش نے احتجاج کیا۔

”ہو سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ جس اچھے خاندان سے آپ کا تعلق ہے اس میں کی کسی فرد کے نام کو کوئی بٹہ لگنے سے بچانے کے لیے آپ نے یہ ذمے داری اپنے سر اوڑھ لی ہو یا یہ کہ آپ ٹھیک طریقے سے اپنی صفائی نہ پیش کر سکے ہوں۔ قانون تو اپنا کام کرے ہی گا۔ جیل کی اس طویل ملازمت میں کتنی ہی مثالیں ایسی دیکھنے میں آئیں کہ لوگوں نے دوسروں کے جرم اپنے سر اوڑھ کر قانون کا ہاتھ صحیح مجرم تک نہ پہنچنے دیا۔ پھر بھی آئندہ زندگی میں نیک چلنی کا میں اب بھی مشورہ دوں گا۔ جائیے خزانچی سے اپنی پس انداز کی ہوئی اجرت حاصل کر لیجیے اور ہاں اسٹور سے اپنے جمع شدہ کپڑے بھی۔ میں نے آپ کے کاغذات روانہ کر دیے ہیں۔“

دوسرے دن ساڑھے سات بجے صبح اپنے سرج کے سوٹ میں ملبوس اکاون روپے پچھتر پیسے کی رقم کا لفافہ ہاتھ میں لیے پرکاش سابق قیدی نمبر ۲۶۲، جیل کے بڑے پھاٹک کے سامنے آزاد فضا میں سانس لے رہا تھا۔ ہوا سے لہراتی ہوئی سبز ڈالیوں اور پرندوں کی خوش الحانی سے بے نیاز اس نے آنے والی بس کا ہینڈل پکڑ لیا اور شہر پہنچ کر ایک کھلے ہوئے ریستوران میں بیٹھ کر پہلے اُس نے ڈٹ کر اچھے قسم کا ناشتہ کیا۔ سگرٹ جلائی۔ چار ماہ کی شدید گھٹن کے بعد آزاد زندگی کی یہ صبح اس کو بہت پیاری اور سہانی معلوم ہوئی اور وہ یادِ رفتہ کی رَو میں گم ہو گیا۔

چند ساعت آرام کرنے کے بعد پرکاش نے ایک دوسری بس پکڑی اور ایک گھنٹہ کی مسافرت کے بعد وہ حلیم بلڈنگ کے سامنے اُتر گیا۔ دوسری منزل کے آخری کمرے کے گرد آلود تالے میں اُس نے چابی لگائی۔ کمرے کی ہر چیز اُسی حالت میں تھی جس حالت میں وہ چھوڑ گیا تھا۔ فرش پر اس کو قمیص کا وہ بٹن بھی ملا جو اس کی گرفتاری کی پکڑ دھکڑ میں ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ فولڈنگ مسہری ہٹا کر اس نے دیوار کی خفیہ دراز سے ایک سیاہ رنگ کا سوٹ کیس نکالا اور کھول کر اس میں سجائے ہوئے سائنٹیفک چوری کرنے والے بدیسی ساخت کے اوزاروں کو پیار بھری

نظروں سے دیکھا۔ اس نے ایک ایک اوزار ہاتھ میں لے کر جانچا۔ یہ مغربی تہذیب کا پٹارہ تھا جس کو ہزاروں روپیہ صرف کر کے یورپ سے اسمگل کیا گیا تھا۔ ان میں بہترین پانی کی ٹمپرڈ اسٹیل کی اصلی ہیرہ لگی ہوئی ریتی بھی شامل تھی۔ اس ریتی کو اس نے چوما اور رومال سے صاف کر کے نچلے خانہ میں رکھ کر سوٹ کیس بند کر کے رکھ دیا۔ ایک دوسری خفیہ دراز کھولی اور ایک بنڈل نوٹوں کا نکال کر جیب میں ڈال لیا۔ باہری دروازہ بند کرتے وقت اس کی ملاقات ہم پیشہ حمید سے ہو گئی۔

"کہو یار پرکاش۔ بڑے گھر سے کب آئے؟ مجھ کو اپنے آنے کی خبر تک نہ دی۔"

"خبر دینے کا وقت کہاں ملا۔ ابھی ابھی تو چلا آ رہا ہوں۔ ہاں۔ اور سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"کوئی دھندا کرنے کا ارادہ ہے کیا۔ جو اٹیچی لے کر جا رہے ہو۔" حمید نے کھیسیں نکال کر دریافت کیا۔

"نا بابا۔ نا۔ دھندے کا خیال تو میں جیل ہی میں دفن کر آیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ جیل میں حاصل کیے ہوئے ہنر سے فائدہ اٹھاؤں اور بچی کھچی رقم لگا کر ایک جوتے کا کارخانہ کھول لوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"خیال تو ٹھیک ہے مگر مجھے امید کم ہے کہ یہ دھیل دھاپ کا غیر شاعرانہ مشغلہ تمہاری چنچل افتادِ طبع کو راس آسکے گا۔ ٹرائی کر دیکھو۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ کوشش کرنے میں کوئی دانده نہیں۔"

"تمہارے نیک مشورہ کا بہت بہت شکریہ" پرکاش نے تشکر آمیز لہجہ میں جواب دیا اور اٹیچی اٹھا کر زینہ سے نیچے اتر گیا۔

ایک گھنٹہ کے اندر نئے سوٹ اور پالش کی ہوئی اٹیچی کے ساتھ پرکاش کی کایا کلپ ہو گئی تھی جس کو پرانے پرکاش سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اس نے اسٹیشن جا کر الکٹرک ٹرین کا ایک ٹکٹ خریدا اور ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد شہر سے دور مضافات میں اتر کر پلازہ ہوٹل میں پنٹو پرکاش کے نام سے ایک کمرہ ریزرو کروا لیا۔ ہوٹل کے ملازم کو ہٹا کر اپنی وزنی اٹیچی اس نے خود اٹھالی۔

ایک ہفتے کی چھان بین کے باوجود وہ مجوزہ جوتے کے کارخانے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ طے کر پایا۔ اس کوشش میں ایک سہ پہر کو وہ اس مضافاتی علاقے میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ یونین بینک کے سامنے اس نے ایک نہایت جامہ زیب لڑکی کو دیکھا جو اتفاق سے سڑک پار کر کے بینک کی طرف جا رہی تھی۔ خوش بختی کے اس موقع پر پرکاش یہ بھول گیا کہ پیشے کے لحاظ سے وہ سماج کا ایک مفلوج عضو ہے۔ لڑکی نے غیر ارادی طور پر اس کا طائرانہ جائزہ لیا اور جلدی سے چہرہ گھما لیا۔ نسوانی حیا کی ایک ہلکی سی سرخی آئی اور گئی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ پرکاش جیسے ٹیڈی بوائے اس علاقے میں کم نظر آتے تھے۔ لڑکی نے تیز رفتاری سے سڑک پار کی اور بینک کے اندر چلی گئی۔ موقع شناس پرکاش نے فوراً ہی پاس کے فٹ پاتھ پر منڈلاتے ہوئے ایک گداگر لڑکے کے ہاتھ پر چمکتا ہوا چھوٹا سکہ رکھ کر دریافت کیا۔

"وہ کون تھی؟"

"وہ! وہ!! وہ لڑکی جو ابھی بنک میں گئی ہے وہ تو سدھا رانی ہے۔ بنک کے منیجر کی لڑکی۔ اور کون!"

لڑکے نے سوال کی نوعیت سے دلیر ہو کر پرکاش کے فارغ البال چہرہ پر حاسدانہ نظریں دوڑائیں قیمتی سوٹ پر اپنا لاغر ہاتھ پھیر کر بولا:

"مجھے ایک ڈبل روٹی خریدنا ہے صاب پلیز۔ کیا آپ کی گھڑی کی چین اصلی سونے کی ہے۔ خوب چمکتی ہے آپ کی چوڑی کلائی پر۔" کچھ لوہا۔ پیسے لوہے کو کاٹ رہا تھا۔ سانبھر نمک لاہوری نمک کو کھا رہا تھا۔

پرکاش نے مسکرا کر ایک جواہر لعل والا نیا سکہ لڑکے کی میلی کچیلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کا شانہ تھپ تھپا کر تیز قدم رکھتا ہوا بینک میں داخل ہو گیا۔

"کیا میں آپ کا کچھ قیمتی وقت لے سکتا ہوں؟" بینک منیجر سے اس نے کہا۔

"مجھے خوشی ہوگی۔ تشریف رکھیئے۔" خوش پوش چمکتی چندیا والے بینک منیجر نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ پھر پرکاش سے آنے کی غرض سن کر منیجر نے کہا "جی ہاں! اس جگہ کوئی اچھا شو روم نہیں ہے۔ دس پانچ میل دور تک کوئی نہیں ہے اور یوں بھی ہر طرح کے کاروبار کے لیے یہاں بہتر مواقع ہیں۔ سوسائٹی اور آب و ہوا بھی

اچھی ہے۔ مناسب جگہ کے لیے بھی ہم ضرور کوشش کریں گے۔"

متذبذب پرکاش کو بینک میں جاتی ہوئی محبت کی اس چنگاری نے جو اب اس کے دل میں شعلہ جوالہ بن گئی تھی حتمی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ بینک مینیجر کی مدد سے اس نے بڑے پیمانے پر ایک کارخانہ کھول دیا جو تھوڑے ہی عرصہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ مگر کارخانے کی آمدنی بینک مینیجر مسٹر ڈھگے کے خاندانی افراد سے پرکاش کے بڑھتے ہوئے تعلقات سدھا کی محبت اور خوش آیند مستقبل کے تصورات اور اسی کے باعث پارہ کی سی سرعت کے ساتھ بڑھتے ہوئے اخراجات کی متحمل نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سینے میں سوئے ہوئے شیطان نے انگڑائی لی اور شکست توبہ کا خیال بھوت کی طرح اس پہ مسلط ہو گیا۔

ایک بار۔ صرف ایک بار! اور پھر ہمیشہ کی توبہ......... ہاں۔ ہاں۔ ہمیشہ ہمیشہ کی توبہ:

صرف ایک بار! ایک بار۔ سُدھا کے لیے ہیرے کا جڑاؤ نکلس۔ ضمیر کی آواز۔ اور ہوس کی جنگ نے اس کے کان بہرے کر دیے — آخر ہوس کی فتح ہوئی۔

اس شیطانی فیصلے کے بعد پرکاش نے وہ خط جو اُس نے اپنے دیرینہ دوست حمید کو اُن نادر اوزاروں کو تحفتہً دینے کے لیے لکھا تھا نذرِ آتش کر دیا۔ ایک ہفتے کے اندر رتھا نال گلزاری مل جوہری کی دکان میں ایسی زبردست چوری ہوئی جس کی مثال نہ ملتی تھی۔ آہنی تجوریاں اس صفائی سے کاٹی گئی تھیں گویا پنیر کے ٹکڑے کاٹے گئے ہوں۔ جواہرات کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ کی نقدی اور کرنسی تلف ہوئی تھی۔ دستاویزوں، ہنڈیوں اور مختلف کمپنیوں کے حصص کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔

گھنٹی کی آواز پر آنے والے ملازم سے بلا سر اُٹھائے ہوئے ڈاکٹر تانگڑی نے صرف دو الفاظ کہے: "کافی۔ سگرٹ" —— ایش ٹرے کو بھرا ہوا اور سگرٹ کیس کو خالی پا کر ڈاکٹر تانگڑی کی جھنجھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کرسی چھوڑ کر اس نے کمرہ میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

وہ بے ربط جملے بڑبڑاتا اور ٹہلتا رہا۔" اونچی چھت۔ لمبی دوڑ۔ بندر کی پھرتی۔ پارہ کی لچک۔ دستانوں کا استعمال۔ سائنٹفک اوزار۔ کسی حد تک کامیاب شکاری۔ آسودہ لیٹرا۔ خیر! دیکھا جائے گا!!"

اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد یونین بینک کی عمارت کے سامنے ایک ٹرک آکر رکی۔ اس پر یونین بینک کے لیے چور پروف سٹ آٹومیٹک لاکر، معہ کئی بڑے خانوں کے مکمل لدا ہوا تھا۔ بینک مینیجر ڈھگے صاحب نے بہت سے مزدوروں اور کرین کی مدد سے اُسے اتروایا۔

بدیشی لاکر لانے والا تیس پینتیس سال کا ایک ولایتی نمائندہ معلوم ہوتا تھا جس کی آنکھوں پر گہرے پولنگ کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اُس نے لاکر کو اتروانے اور بینک کے اندر بحفاظت تمام فٹ کرانے کا نمایاں پارٹ ادا کیا۔ اس مخصوص موقعے پر ڈھگے صاحب کے گھر کے کل افراد مع پرکاش کے وہاں موجود تھے۔ لاکر کی بے مثال بناوٹ، کریم کی جگمگاتی ہوئی پالش اور اُس کے لاجواب کھلنے اور بند ہونے کا میکانکی طریقہ دیکھ کر سبھی کے چہروں پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات نمایاں تھے۔

ڈھگے صاحب اور ان کی سیدھی سادھی اہلیہ اس شاندار موقعے پر ایک راجہ رانی کا پارٹ ادا کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

لاکر کے نمائندے نے اُس کے کھلنے اور بند ہونے کے خفیہ نمبر کئی بار ڈھگے صاحب کو سمجھائے جس کا تجربہ لڑکیوں اور بچوں نے کرنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی وقفے کے بعد ایک چیخ سنائی دی اور ایک ساتھ بچوں کے کہرام کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پتہ چلا کہ جس وقت سدھا رانی لاکر کے اندرونی بناوٹ کا مشاہدہ کر رہی تھی، کسی ناسمجھ بچی نے لاکر کا دروازہ آٹومیٹک نمبر سٹ کیے بغیر بند کر دیا۔ اب وہ دروازہ کھل نہیں رہا ہے۔

بدیشی نمائندے کا کہنا تھا کہ چوں کہ دروازہ بغیر نمبر ملائے ہوئے بند کر دیا گیا ہے اس لیے اب وہ بلا توڑے ہوئے نہیں کھل سکتا۔

سدھا کی ماں کے دل دوز بین، "میری پالی پوسی لاڈلی کی ننھی سی جان! ہائے بھگوان! اب کیا ہوگا؟" ڈھگے صاحب کا بار بار رومال سے آنکھیں پوچھنا اور نیتھنے صاف کرنا، دوسرے بچوں کی دل خراش چیخیں، غلطی کرنے والی چھوٹی بہن کی سہمی سہمی صورت، ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں، سدھا کا اندر سے لاکر پیٹنا۔ ایک عجب خلفشار اور ہنگامہ برپا تھا۔ کوئی کہتا تھا لوہار کو بلاؤ۔ کوئی زیادہ عقل مند ڈائنامیٹ سے اڑانے کی صلاح دیتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

ایاٹ پریی کے لیے اس سے زیادہ آزمایش کا اور کون سا وقت ہو سکتا تھا۔ پرکاش ایسے محتاط اور دور اندیش انسان سے بھی اپنی محبوبہ کی بے بسی کی موت دیکھی نہ گئی۔ وہ سب کو ڈھارس دلاتا دوڑتا ہوا بینک سے باہر نکل گیا چند منٹ کے اندر وہ ہانپتا ہوا واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا اٹیچی تھا۔ پرکاش نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُسے کھولا اور سب اوزار میز پر جلدی سے ڈھیر کر دیے وقت بچانے کے لیے اُس نے بجلی سے کام کرنے والا برما لے کر لاکر کے تالے میں سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ چھید ہوتے ہی اس نے ایک بہت چمکیلی پتی نکالی، پہلے اُس کو چوما بعدازاں سوراخ سے ابتدا کر کے منٹوں میں لاکر کے تالے کو ہینڈل سمیت کاٹ کر علیحدہ کر دیا اور جھپٹ کر لاکر کا پٹ کھولا اور غشی کی حالت میں پسینے سے شرابور سدھا رانی کو ہاتھوں پر اٹھا کر میز پر پنکھے کے نیچے لٹا دیا۔ اس دوران سدھا کے کندھے سے اٹکے ہوئے سٹریپ میں آکسیجن کا فلاسک میز کے نیچے گر کر لڑھک گیا جس کا خیال کسی نے نہ کیا۔

لاکر کے کھولنے میں اُس نے جس سرعت اور پھرتی سے کام لیا تھا اُس سے اُس نے دُنیا کے تمام ریکارڈوں کو جس میں خود اُس کا بھی پچھلا ریکارڈ شامل تھا پریم کی لگن میں مات کر دیا تھا۔

رنگین عینک لگائے ہوئے "بدیشی نمائندے" نے اُس کو مبارکباد دیتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ اسی لمحے لاکر کے کرٹے کی کرومیم پالش کی طرح چمکتا ہوا ایک سفید کڑا جھٹکے کے ساتھ اس کی کلائی میں پھنس گیا۔ پھر اس کی سیٹی پر نصف درجن رائفل بردار سپاہیوں نے کمرے کو گھیر کر پرکاش کو حلقے میں لے لیا جو بدیشی نمائندے کی پستول کی زد میں اپنا ہتھکڑی لگا ہوا نیز دوسرا آزاد ہاتھ اُٹھائے ہوئے بھونچکا ہو کر سب کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"اپنی بیٹی کی جان جوکھم میں ڈال کر جس طرح آپ نے ہماری مدد کی ہے اُس کا میں بے حد شکر گزار ہوں۔" ڈاکٹر تانگڑوی نے رنگین عینک آنکھوں سے اُتارتے ہوئے بینک منیجر سے کہا: "اور ہاں! کچھ وقت ضرور لگے گا مگر بینک کو نیا لاکر سپلائی کرنا گورنمنٹ کی ذمے داری ہوگی۔ میں سرکاری ہدایت کی بنا پر یہ اطلاع آپ کو دے رہا ہوں۔"

"شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے میری سدھا کو ایک جرائم پیشہ کے چنگل سے چھڑا کر میرے اوپر احسانِ عظیم کیا۔" ڈگھے صاحب خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے بولے۔

پرکاش کی یہ خود فریبی کہ صول زندگی ایک ایسا جامہ ہے جس کو جب اور جس طرح جی چاہے اُلٹ پلٹ کر پہنا جا سکتا ہے، ضابطۂ حیاتِ انسانی کے ساتھ ایک ایسا مذاق تھا جس کا خمیازہ دیر یا سویر اُسے بھگتنا ہی چاہیے تھا!



راڈر

(بسلسلۂ صفحہ ۱۵۱)

کے جہاز کے متوازی اڑاتے ہیں۔ اور دشمن کے راڈر کی چھوڑی ہوئی پیغاماتی لہروں کو جذب کر کے اور پھر انھیں تفصیل کے ساتھ پھیلا کر اپنے راڈر اسٹیشن کو بھیج دیتے ہیں لیکن اس میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پیغام دشمن بھی اپنے راڈر کے ذریعے معلوم کر لے اس لیے SPOOFER وقت کی خاص رفتار کے ساتھ ساتھ غلط اور صحیح دونوں پیغامات بھیجتا رہتا ہے۔ چوں کہ اس کے کوڈ سے اپنے آدمی بہ خوبی واقف ہوتے ہیں لہٰذا وہ تو غلط اور صحیح پیغامات کو "نتھار" لیتے ہیں۔ البتہ ایسا پیغام دشمن کے لیے ضرور معمہ بن جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ راڈر نے اپنے کرشموں سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ سائنس ماہر کا خیال ہے کہ آنے والے زمانے میں نیوکلیائی جہاز راڈر کی بدولت دنیا کے ہر کونے سے خبر لانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ لطف یہ ہے کہ یہ ہوائی جہاز گولہ بارود سے بھی اتنی جلد نہیں اڑائے جا سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سطح زمین کے قریب اس جہاز کی اڑان کے دوران اس کے راڈر کے عمل کو کسی حد تک منجمد کیا جا سکتا ہے اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب یہ جہاز واپس لوٹے تو اس کی جھولی میں گمراہ کن پیغامات یا منجمد لہروں کے سوا کچھ نہ ہو۔

غزل

ابرِ احسنی گنوری

جانتا ہے اُن کے در کو اپنا کاشانہ ابھی
ہوش کی حد سے نہیں گزرا ہے دیوانہ ابھی

ختم کر دو روز کے شکووں کا افسانہ ابھی
حکم دو مجھ کو ہوا جاتا ہوں دیوانہ ابھی

میں نے اُس کا عہد سمجھا، اُس نے جانا میرا دل
باتوں ہی باتوں میں اِک ٹوٹا ہے پیمانہ ابھی

ہے جنوں ناپختہ، جاتا ہے جو صحرا کی طرف
دشت و در میں فرق کر سکتا ہے دیوانہ ابھی

عظمتِ دیوانگی سمجھا تو ہوش آجائے گا
اپنی دُھن میں مست ہے ہر ایک فرزانہ ابھی

جل کے اوروں کو جلا دینا بہت اونچی ہے بات
شمع کی حکمت کہاں سمجھا ہے پروانہ ابھی

ہو گیا دل کا تصادم کیا نگاہِ ناز سے
ابر اک شیشے سے ٹکرایا ہے پیمانہ ابھی

غزل

فصیحہ اکمل قادری

مرے تصوّرات بھی فقط خیال و خواب تھے
جہاں جہاں نظر پڑی، وہاں وہاں سراب تھے

تمھاری چشمِ شوق میں جو اجنبی سے خواب تھے
ہماری آرزو نہ تھی تو ہم سے کیوں حجاب تھے

خوشا وہ دن کہ زندگی نہ تھی اسیرِ عہدِ عشق،
وہ ہم سے بے حجاب تھے، ہم اُن سے بے حجاب تھے

کبھی جو یاد آگئی پرانے واقعات کی
تو یوں لگا وہ حادثے بھی جیسے کوئی خواب تھے

ہمارے شکوۂ جفا ہوئے صدائے بازگشت
خود آپ ہی سوال تھے، خود آپ ہی جواب تھے

ہمارے دستِ شوق سے چمک رہی ہے کائنات
جہاں جہاں تھی روشنی، وہاں وہاں نقاب تھے

غمِ حیات دل شکن، شکستِ عہدِ آرزو
شبِ فراق سب مگر چراغِ عکسِ آب تھے

کیا چاند پر زندگی ممکن ہے؟

کے۔ پی۔ سکسینہ

چاند پر زندگی ممکن ہے یا نہیں۔ اِس پر برابر بحث ہوتی چلی آ رہی ہے۔ سب سے اہم سوال اس سلسلے میں کیا جاتا ہے کہ کیا چاند پر ہوا اور پانی موجود ہے کیونکہ ہوا اور پانی کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ اب اگر چاند پر ہوا اور پانی کا وجود نہیں ہے تو وہاں زندگی تو کیا زندگی کی علامتیں بھی نہ ملیں گی یعنی وہاں ہر شے ساکت و جامد ہوگی اور گھاس کے تنکے تک کا نام و نشان نہیں ہوگا۔

جب ہم چاند پر ہوا کی غیر موجودگی کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہاں ایسی ہوا نہیں ہے جیسی زمین پر ہے۔ یعنی وہ ہوا جس میں سانس لی جا سکے اور حرکت ممکن ہو۔ لیکن چاند پر مکمل طور پر خلا ہی ہو، یہ بھی نہیں ہے۔ اپنی تجربہ گاہوں میں عام طور پر ہم جس حد تک خلا پیدا کر سکتے ہیں یا بجلی کے بلب کے اندر جتنی خلا ہوتی ہے، اُس سے کچھ زیادہ خلا چاند کے ماحول میں پائی جاتی ہے۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ آسمان میں جو ستارے ٹوٹتے ہیں وہ جس طرح زمین کے ماحول میں داخل ہونے کے قبل ہی کافی اونچائی پر رگڑ کھا کر جل اُٹھتے ہیں، ٹھیک اُسی طرح آسمان میں ٹوٹ کر چاند کے ماحول میں داخل ہونے والے ستارے بھی کافی بلندی پر ہی جل کر خاک ہو جاتے ہیں اور چاند کے ماحول تک نہیں پہنچ پاتے۔ چونکہ کسی شے کے جلنے کے لئے آکسیجن اشد ضروری ہے، اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چاند پر کم از کم اتنی مقدار میں تو آکسیجن ضرور ہی موجود ہے جتنی زمین پر پچاس ساٹھ میل کی بلندی پر مل سکتی ہے۔ پچاس ساٹھ میل اس لئے کہا گیا کہ زمین کی جانب ٹوٹ کر گرنے والے ستارے تقریباً اتنی ہی بلندی پر جل کر راکھ ہو جاتے ہیں اور فقط چمکیلی خاک ہی ہمیں زمین پر گرتی محسوس ہوتی ہے جسے ہم جلتا ہوا ستارہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ بہر حال اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ چاند پر سانس لینے کے لائق ہوا تو نہیں ہے مگر اتنی ضرور ہے جو ستاروں کو بھسم کرنے کے لئے کافی ہو۔

چاند کی سطح پر کچھ گڈھے، سوراخ یا گول میدان نظر آتے ہیں (جنھیں "آتش فشاں" کا نام دے دیا گیا ہے)۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کیسے وجود میں آئے ہونگے؟ چاند پر زندگی کے امکانات سے اس سوال کا گہرا تعلق ہے۔

حال میں امریکی راکٹ میرینر (MARINER) کے ذریعے چاند کی تصویریں لی گئی ہیں اُن سے یہ بڑی حد تک ثابت ہو گیا ہے کہ چاند کی سطح پر واقع پہاڑ، گھاٹیاں، درّے اور دیگر جغرافیائی وقوعات، زمین پر واقع ایسی ہی گھاٹیوں اور پہاڑیوں سے مشابہ ہیں۔ دونوں (چاند اور زمین) کے جغرافیائی حالات میں فقط ایک اہم فرق نمایاں طور پر واضح ہوا ہے — یعنی چاند کی سطح پر ایک خاص قسم کی گول پہاڑیاں پائی جاتی ہیں۔

ان پہاڑیوں کے سلسلے میں پچھلی دو صدیوں میں سائنس دانوں نے بڑے دلچسپ نظریات پیش کئے ہیں۔ اِن نظریات کو موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا تعلق 'برف' سے ہے، دوسرے کا آندھیوں سے اور تیسرے کا 'ایٹمی بموں' سے۔

برف کے نظریے کے بموجب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ چاند کی سطح پر واقع گہری گھاٹیاں دراصل برف کی منجمد جھیلیں ہیں۔ ان جھیلوں کے کنارے واقع

پہاڑیاں بھی برف کی ہی بنی ہوئی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چاند کی سطح پر تقریباً سو میل کی گہرائی تک برف کا ایک دبیز خول چڑھا ہے۔ گویا سارا چاند برف ہی برف ہے۔ یہ نظریہ پہلے چاہے تسلیم کر لیا گیا ہو مگر اب اسے صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ دن کے وقت چاند کی سطح پر درجہ حرارت اُبلتے پانی جیسا ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں چاند کی سطح پر برف کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔

جہاں تک دوسرے نظریے کا تعلق ہے آسٹریا کے ایک سائنسداں نے تو یہ کہہ کر سارا جھگڑا ہی ختم کر دیا کہ چاند کی سطح پر گھاٹیاں پہاڑیاں وغیرہ کچھ ہیں ہی نہیں۔ مکمل سطح ایک ہموار میدان ہے اور دوربین سے دیکھنے پر جو دھبے پہاڑیوں اور گھاٹیوں کی شکل میں اُبھرتے ہیں وہ دراصل 'آندھیاں' ہیں جو چاند کے ماحول میں نہایت ہیبت ناک شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی آج غلط ثابت ہو گیا ہے۔

اسپین کے ایک انجینیر نے دنیا کے سامنے ایک نئی تھیوری رکھی۔ وہ یہ کہ چاند کی سطح پر کسی دور میں گھنی آبادی تھی۔ چاند کے باشندوں نے اُسی دور میں اس درجہ سائنسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ ایٹمی بم کو ایجاد کر کے وہ آپس میں جنگ کرنے لگے۔ اس ایٹمی جنگ کے باعث اُن کی تہذیب، اُن کا تمدن، اُن کا فن اور وہ خود خاک میں مل گئے۔ چنانچہ آج چاند کی سطح پر جو بے شمار سوراخ نظر آتے ہیں وہ دراصل اُسی ایٹمی جنگ کے نشانات ہیں۔ اُس جنگ عظیم میں چاند کی سطح پر ہی نہیں، سمندروں میں بھی آگ لگ گئی اور اُن کا سارا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا۔ اس بھاپ کے کچھ تاثرات زمین تک آ پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمین پر ایک ایسا تباہ کن سیلاب آیا کہ کئی صدیوں تک زمین غرقاب رہی۔

ظاہر ہے کہ انجینیر مذکور کا یہ مضحکہ خیز نظریہ آج کے ایٹمی دور میں کسی طنزیہ مضمون کا ایک حصہ ہی سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ تو ماننا ہی پڑیگا کہ ایک زمانے تک یہ خیال عام رہا کہ چاند بھی زمین کی طرح آباد ہے۔ تین سو برس قبل، دوربین کی ایجاد نے بھی اس عقیدے کو کافی تقویت بخشی۔ سائنس دانوں نے دوربین کے ذریعے چاند دیکھا تو وہاں کی گھاٹیاں وغیرہ دیکھ کر اُنھیں یہ یقین ہو گیا کہ چاند پر ہماری ہی دنیا جیسی ایک اور دنیا آباد ہے۔ پچھلی صدی کے آغاز میں ایک جرمن سائنسداں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا کہ اُس نے چاند کی خلیج کے وسط میں ایک ایسا شہر ڈھونڈھ نکالا ہے جہاں گھنی آبادی ہے۔ شہر کے مکانات پتھر کے بنے ہیں اور شہر کے بیچوں بیچ ایک لمبی دیوار بنی ہے۔ اس دیوار میں بے شمار چھوٹی چھوٹی دیواریں آ کر مل گئی ہیں اور پورا شہر مچھلی کی ریڑھ کے کانٹے جیسا نظر آتا ہے۔ جرمن سائنسداں کے اس دعوے نے پورے سائنسی عالم میں ہلچل برپا کر دی۔ لیکن سات سال بعد عمدہ دوربینوں کے ایجاد ہوتے ہی ثابت ہو گیا کہ مچھلی کی ریڑھ کے کانٹے جیسا چاند کا شہر محض ایک تخیل تھا۔ دراصل وہاں ٹیڑھی میڑھی پہاڑیوں اور دراروں کا ایک سلسلہ تھا جسے جرمن سائنسداں ایک شہر سمجھ بیٹھا۔

مشہور ماہر فلکیات جان ہرشل نے ۱۸۴۰ء میں ایک نئے قسم کی دوربین سے چاند کی سطح کا مختلف زاویوں سے معائنہ کیا۔ اُس کی تحریروں کے مطابق چاند کی دنیا رنگ برنگے ہیروں کی چٹانوں اور جواہرات کا مخزن ہے۔ چاند کی وادیوں میں انواع و اقسام کے جانوروں، پرندوں اور چمگادڑ جیسے پیروں والے نصف انسانی جانوروں کی بستی ہے۔ یہاں کے سمندری ساحلوں پر مچھلیاں تیز رفتاری سے لڑھکتی پھرتی ہیں۔ جس امریکی اخبار نے ہرشل کی یہ رپورٹ شایع کی اُس کی اشاعت راتوں رات چوگنی ہو گئی۔ بین اقوامی سائنسدانوں میں اس انوکھی رپورٹ نے ہلچل برپا کر دی مگر جلد ہی یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سب تخیل کی کارفرمائیاں تھیں۔

سائنسی تحقیقات سے اتنا تو معلوم ہی ہو گیا ہے کہ چاند کی سطح پر فقط ایسے ہی پیڑ پودے پنپ سکتے ہیں جو ہوا کی کمی، درجۂ حرارت کی شدت اور نمی کی غیر موجودگی برداشت کر سکیں۔ اپنی دنیا میں ہم ایسے کسی پیڑ پودے سے متعارف نہیں ہیں جو ان شرائط کو پورا کر سکے۔ مگر ہم یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ پیڑ پودے غیر معمولی حالات میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ ہماری دنیا کے پیڑ پودوں سے ملتی جلتی نباتات نے خود کو چاند کے ماحول کے مطابق بنا لیا ہو اور وہاں سرسبز ہو رہی ہو۔

بہر حال، قصے کہانیوں اور خیالی پلاؤ کے دائرے سے نکل کر آج کا انسان بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اپنی غیر معمولی ترقی کا ثبوت اس نے ان راکٹوں اور

ایٹمی دوربینوں کی شکل میں پیش کیا ہے جن سے چاند کی تصاویر فراہم کی گئی ہیں۔ کیمبرج ریسرچ سینٹر کے ایر فورس شعبے نے لونر ایکسپلوریشن پروگرام (LUNAR EXPLORATION PROGRAMME) کے زیر تحت چاند کی پانچ ہزار تصاویر فراہم کی ہیں۔ ان تصاویر کو مختلف زاویوں سے کھینچا گیا ہے اور ٹائم ریکارڈنگ آلات کی بھی مدد لی گئی ہے۔ ان تصاویر کو بارکی سے پرکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ چاند کی سطح اتنی کھردری اور غیر ہموار نہیں ہے جتنا اسے پہلے تصور کیا جاتا تھا۔ شعبے کے ڈائریکٹر چارلس۔ ایف کیمپن کے بیانات کے مطابق ان تصاویر سے پتہ چلتا ہے کہ نہ تو چاند کی سطح پر ڈھالو چٹانوں کا وجود ہے نہ نوکیلی برف پوش پہاڑیوں کا۔ ڈاکٹر کیمپن کا کہنا ہے کہ چاند کی سطح پر کسی گوشے سے بھی ہماری دنیا کا وجود دیکھا جا سکتا ہے اور اس نظارے میں کوئی شے حائل نہیں ہو سکتی۔ قدیم ماہرین فلکیات کا یہ خیال اب غلط ثابت ہو چکا ہے کہ نوکیلی برف پوش پہاڑیوں کا وجود زمین کے نظارے میں حائل ہو جاتا ہے۔ اب یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ چاند کی سطح محض اتنی ہی غیر ہموار ہے جتنی زمین کی۔ لندن کالج آف اسٹرانومی اور فرانس کی ملاؤز آبزرویٹری نے بھی ڈاکٹر کیمپن کے بیانات کی تائید کی ہے۔

ایک روسی سائنس داں ڈاکٹر اگچارونگی نے اپنے حالیہ تجربات کی بنا پر چاند کی تفصیل یوں پیش کی ہے: "چاند کی بالائی سطح پرانی روئی جیسی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ساخت بے ترتیب ریشوں سے ہوئی ہے۔ روسی شمشی مطالعہ کے زیر تحت بھیجا گیا مشینی صندوق اس سلسلے میں کافی معلومات فراہم کر سکا ہے۔ پورا چاند آسمان پر ایک پیلے سورج کی طرح نظر آتا ہے۔ مگر یہ بالکل سورج کی طرح نہیں ہے۔ یہ گیسوں کا چمکتا دمکتا کرہ نہیں ہے۔ اس کی چمک تو صرف سورج کی چمک کی مرہون منت ہے۔ چاند جسامت میں سورج جتنا بڑا نظر آتا ہے مگر اصل میں یہ بہت زیادہ چھوٹا ہے۔ اتنا بڑا اس لیے نظر آتا ہے کہ یہ سورج کی نسبت ہم سے بہت قریب ہے اور صرف دو لاکھ پینتیس ہزار میل دور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چاند زمین سے بھی بہت چھوٹا ہے۔ ہماری زمین میں ایسے تقریباً پچاس چاند سما سکتے ہیں۔ چاند کی ساری سطح چمکدار نہیں۔ وہ سیاہ داغ جو ہم اس کی سطح پر دیکھتے ہیں درحقیقت وسیع و عریض میدان میں غار نما دہانے پھیلے ہوئے ہیں۔ وہاں ہوا تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ پانی بھی نہیں ہے۔ سورج کی تپش سے یہ جتنا گرم ہو جاتا ہے (سورج کی روشنی نہ پاکر) تاریکی میں اتنا ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ چاند پر حیوانات ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں ابھی ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ تاہم نباتات کے بارے میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ لائیکنس (LICHENS) قسم کے پودے وہاں پنپ سکتے ہیں۔ لائیکنس میں یہ خاص وصف ہے کہ یہ ٹنڈرا کی منجمد وادیوں میں بھی اگ سکتے ہیں اور سہارا کی شدید گرمی میں بھی۔"

اب سوال پانی کا آتا ہے۔ امریکہ کے ٹیکساس کیمیاوی کارخانے کے ایک انجینیر ڈاکٹر رائے میک گچین نے سائنٹفک جرنل میں دعویٰ کیا ہے کہ ایٹم بم کے استعمال سے چاند کی چٹانوں میں پانی کا عظیم ذخیرہ سیراب ہو سکے گا۔ چٹانوں میں مقید پانی کا یہ ذخیرہ برسوں تک انسانی استعمال کے لیے کافی ہو گا۔ پانی کے ساتھ ساتھ ایٹمی استعمال کی بدولت، چاند کی چٹانوں سے کافی مقدار میں گندھک بھی فراہم ہو سکے گی۔ گندھک کا یہ عجیب و غریب خزانہ دیگر کیمیاوی مرکبات بنانے میں مدد دے گا۔ ڈاکٹر میک گچین کی معلومات کے مطابق چاند پر انسان کا مستقبل نہایت پرسکون و دلچسپ ہو گا۔ اس کا خیال ہے کہ ۱۹۷۰ء کے اختتام تک چاند پر انسانی رہائش گاہیں قائم ہو سکیں گی اور ایٹمی سپلائی کا اسٹیشن بھی قائم ہو جائے گا۔ اسی اثنا میں وہاں چند کارخانے اور بجلی گھر بھی تعمیر ہو جائیں گے۔ اس کا یہ قیاس بھی ہے کہ ۱۹۸۰ء کے ابتدائی دور میں چاند پر کافی مقدار میں آکسیجن اور پانی سپلائی کرنے کا انتظام ممکن ہو جائے گا۔ اس وقت تک لوگ شاید یہ بھی بھول چکے ہوں گے کہ وہ ایسی جگہ مقیم ہیں جہاں کبھی پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

چاند تک پہنچنے اور وہاں رہنے کے سلسلے میں عوام بالخصوص سائنس دانوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی چند ماہ قبل امریکہ کے اسپیس ایڈمنسٹریشن گروپ (SPACE ADMINISTRATION GROUP) نے چاند کے سفر کے لیے چھ سائنس داں مسافروں کی ایک ٹولی بنائی ہے جن کا خیال ہے کہ وہ ۱۹۶۹ء تک چاند پر پہنچ جائے گی۔ اس ٹولی میں دو ڈاکٹر، دو پروفیسر، ایک خلاباز اور ایک ارضیاتی ماہر شامل ہے۔ ان چھ خوش نصیب مسافروں کا چناؤ ہزاروں درخواستوں پر غور کرنے کے بعد ہوا ہے۔ فی الحال چاند کے یہ چھ مسافر نیشنل ایروناٹکس سینٹر (NATIONAL AERONAUTICS CENTRE) کی لیبارٹریوں میں چھان بین میں مصروف ہیں۔ اگر یہ سائنس داں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو آنیوالی نسل کے شیر خوار بچوں کیلئے "چندا ماما دور کے ..." کی لوری کی جگہ کوئی دوسری لوری بنانا پڑیگی۔

عوام قیمتوں کے بڑھنے سے روکنے میں

کس طرح مدد دے سکتے ہیں

حکومت نے ہندوستانی روپئے کے تبادلہ کی شرح میں کمی کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کے بعد لوگوں میں عام طور پر یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ اب ایک روپئے کی قیمت محض ۶۴ پیسے ہوگی

یہ غلط فہمی ہندوستان کے ناخواندہ افراد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تعلیمی طبقے میں بھی کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ شبہہ پیدا ہوگیا ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ بینک اور بیمہ اکاؤنٹ وغیرہ میں ان کا جو روپیہ جمع ہے اس کی مالیت حکومت کے فیصلے کے بعد کہیں کم تو نہیں ہوگئی ہے۔

ان شبہات کے پیش نظر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ حکومت کے اقدام اور اس کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ حکومت نے ۶ رجون کو جس فیصلے کا اعلان کیا ہے اس کا مقصد محض غیر ملکی کرنسی کے سلسلے میں ہندوستانی روپئے کی شرح تبادلہ کو تبدیل کرنا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب ایک ڈالر یا ایک پونڈ حاصل کرنے کے لئے پہلے کے مقابلے میں زیادہ روپیوں کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح حکومت کے فیصلے کے نتیجے میں بیرونی ممالک کی کرنسی یا غیر ملکی تبادلہ زر کے حصول کیلئے اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ روپیہ ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اس فیصلے کا ملک کے اندر روپئے کی قیمت پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں پڑے گا اور اس کی پرانی قیمت برقرار رہے گی۔ مثال کے طور پر ۶ رجون سے پہلے سو روپیوں کی بچت اب بھی ۱۰۰ روپے ہی کے برابر رہے گی۔

ملک کے اندر روپئے کی مالیت پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ روپیہ صرف تبادلہ کا ایک وسیلہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کا ہم روپئے سے تبادلہ کر لیتے ہیں۔ روپے کی اندرونی قیمت پر چونکہ حکومت کے فیصلے کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے اس لئے ملک کے اندر ہم روپئے کے بدلے میں پہلے جتنی اشیا خرید سکتے تھے ان میں روپئے کی قیمت گھٹانے کے فیصلے سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوگا لیکن اس کا انحصار محض روپئے کی مالیت پر نہیں بلکہ چیزوں کی قیمتوں کی سطح پر ہوگا یعنی چیزوں وغیرہ کی قیمتیں اگر بڑھتی ہیں تو قدرتی طور پر روپئے سے، چاہے اس کی جو بھی قیمت ہو، پہلے کے مقابلے میں کم چیزیں ملیں گی۔ لہذا ملک کے اندر روپئے کی مالیت کے تحفظ کے لئے قیمتیں نمایاں اہمیت رکھتی ہیں جبتک قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوتا ملک کے اندر ہمارے روپئے کی قیمت پہلی جیسی رہے گی۔ اس لئے ملک کے اندر روپئے کی مالیت کے تحفظ کے لئے قیمتوں میں اضافے کی روک تھام کرنا اشد ضروری ہے۔

ضروری اشیا کے لئے امداد۔ یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ روپئے کی قیمت گھٹانے کے نتیجے میں ان اشیا کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوسکتا جو کم آمدنی والا طبقہ عام طور پر استعمال کرتا ہے۔

اس طبقے کے استعمال میں آنے والی بیشتر اشیا ملک کے اندر ہی تیار ہوتی ہیں اس لئے ان کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم بعض اشیائے صارفین جیسے درآمد شدہ غذا، کیمیاوی کھاد اور مٹی کے تیل کے سلسلے میں اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے انھیں کچھ مقدار میں باہر سے منگاتے ہیں۔ اب ہمیں ان چیزوں کو باہر سے منگانے پہلے کے مقابلے میں زیادہ روپیہ ادا کرنا

ہوگا۔ اس لئے ان کی قیمتیں پہلے کے بہ نسبت ضرور زیادہ ہونگی۔ لیکن ان اشیا کو عوام کو مناسب دام پر بہم پہنچانے کی اہمیت کے پیش نظر حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ چیزیں عوام کو انھیں قیمتوں پر فروخت کی جائیں گی جو روپے کی قیمت کے گھٹائے جانے سے پہلے رائج تھیں۔ حکومت ان قیمتوں کے فرق کو مالی امداد دے کر پورا کرے گی۔

ان باتوں کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اُن اشیا کی قیمتیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ وصول کرنے سے باز نہیں رہیں گے جو ملک کے اندر تیار ہوتی ہیں۔ پروڈیوسر اور بسا اوقات تقسیم کنندگان ملک کے اندر تیار ہونے والی اشیا کی زیادہ قیمتیں وصول کر سکتے ہیں۔

قیمتوں میں ایسے غیر فطری اضافے پہلے بھی ہو چکے ہیں اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ ایسا پھر ہو سکتا ہے، لوگ روپے کی قیمت گھٹانے کے فیصلے کی دانشمندی کے بارے میں شک وشبہہ کرتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ صورت حال کچھ مختلف ہے۔ جیسا کہ وزیر اعظم نے ۱۲ر جون کو عوام کے نام اپنی نشری تقریر میں کہا ہے: "سماج دشمن حرکتوں سے لازمی اشیا سے متعلق قانون کے تحت سختی سے نپٹا جائے گا۔ حکومت ضرورت پڑنے پر قانون بنانے کے مزید اختیارات حاصل کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں کرے گی۔ میں تمام شہریوں، صارفوں اور پروڈیوسروں سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ قیمتوں میں کوئی نامناسب اضافہ نہ ہونے دیں۔"

کارخانے داروں کی یقین دہانی۔ اس مرتبہ ایک اچھی بات یہ ہے کہ بہت سے ذمے دار کارخانے داروں نے حکومت کو یقین دلایا ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کی قیمت نہیں بڑھائیں گے۔ ان یقین دہانیوں سے اگر وہ پوری کی گئیں، عام اشیائے صارفین کی قیمتوں میں اضافے کی روک تھام میں بہت مدد ملے گی۔

دوسری بات جس پر کڑی نظر رکھنا چاہیے وہ اشیا کی تقسیم ہے۔ بیوپاری اس سلسلے میں گڑبڑ کر سکتے ہیں جبکہ کارخانہ دار غالباً ایسا کرنا پسند نہ کریں۔

اس مسئلے کو دو طرح سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ بڑی تعداد میں صارفین کے امداد باہمی اسٹور اور مناسب دام کی دُکانیں کھولی جائیں جہاں سے عوام غذا، بناسپتی اور مٹی کا تیل جیسی روزمرہ کی ضروری چیزیں مقررہ دام پر حاصل کر سکیں۔ جہاں کہیں امداد باہمی اسٹور فوری طور پر نہ کھولے جا سکتے ہوں دوسری ایجنسیاں اور خود حکومت ایسی دُکانیں کھولے گی اور ان کو چلائے گی۔

بہرحال ان کوششوں میں پوری کامیابی کے لئے صارفین کو بھی ہاتھ بٹانا ہوگا اور صارفین کو حریص بیوپاریوں کے استحصال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیوپاری کے ہتھکنڈوں کے آسانی سے شکار نہیں بنیں گے۔

"بعد میں خریدئے اور زیادہ خریدئے"

"وہی خریدئے جس کی آپ کو ضرورت ہو"

"وہی خریدئے جس کا خریدنا لازمی ہو"

ناجائز منافع خوری اور بیوپاریوں کے ہاتھوں صارفین کے استحصال کو روکنے کے لئے ان نعروں کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر اور مضبوط تحریک چلانا اشد ضروری ہے۔

وزیر اعظم نے ۱۲ر جون کو اپنی نشری تقریر میں پورے ملک میں لازمی اشیا کی قیمتوں کی رپورٹیں جمع کرنے کے لئے ایک کنٹرول روم کی تنظیم سے متعلق حکومت کے فیصلے کا جو اعلان کیا تھا وہ اسی جانب ایک دوسرا اہم قدم ہے۔ اس سے حکومت کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ کہاں گڑبڑی پیدا ہونے کا امکان ہے جس سے وہ ناجائز منافع خوری اور کسی شے کی مقامی قلت کے سدباب کے لئے فوری طور پر اقدام کر سکے گی۔



موتیابند اور اُس کا علاج

اے۔ دمیتریوا

" موتیابند" آنکھوں کی ایک خطرناک بیماری ہے جس کا شکار زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اس بیماری کو لوگ "زرد پانی" اور "سبز پانی" کی بیماری بھی کہتے ہیں۔

علامت۔ اس بیماری کی سب سے اہم علامت یہ ہے کہ آنکھ کی پتلیوں پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس بیماری کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ورنہ بینائی متاثر ہونے لگتی ہے اور آدمی اندھا بھی ہو جاتا ہے۔

اکثر لوگ اس بیماری کے اس طرح بھی شکار ہوتے ہیں کہ مرض ایک ہی سطح پہ ٹھہرا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں بینائی وقتاً فوقتاً کمزور ہو جاتی ہے۔ مریض محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں بھاری ہو گئی ہیں، دور سے وہ مختلف چیزوں میں اچھی طرح امتیاز نہیں کر سکتا اور رات میں اسے چراغ کے گرد رنگین حلقے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس مرض کی ابتدا میں عام طور پر کسی ناخوشگوار تجربے کے بعد یہ ساری علامات ظاہر ہوتی ہیں یا دماغی اور جسمانی تھکن کے بعد اس طرح کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت جلد ہی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ حملے زیادہ تیزی سے ہونے لگتے ہیں۔

اس بیماری کی ایک اور قسم ہوتی ہے جو عام طور پر بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس صورت میں یہ بیماری کوئی بھاری تبدیلی یا سنسنی پیدا نہیں کرتی، بلکہ غیر محسوس طریقے پر مریض کو متاثر کرتی ہے۔ مریض کو اندازہ تک نہیں ہوتا کہ اس کی ایک آنکھ اس بیماری سے متاثر ہو چکی ہے۔ لیکن جب وہ اپنی ایک آنکھ اور وہ بھی صحت مند آنکھ کو کسی وجہ سے بند کرتا ہے تو اسے غیر متوقع طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دوسری آنکھ اس بیماری کا شکار ہو گئی ہے۔

بعض اوقات موتیابند کا اچانک حملہ ہو جاتا ہے۔ مریض کی آنکھوں میں، آنکھ کی پتلی میں اور سر میں شدید درد ہونے لگتا ہے۔ یہ درد عام طور پر رات میں یا صبح کے ابتدائی حصے میں ہوتا ہے۔ درد سر کے ساتھ ساتھ متلی، قے، عام کمزوری اور ٹمپریچر میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ آنکھ کے پپوٹوں میں سوجن پیدا ہو جاتی ہے، آنکھ سے آنسو بہنے لگتے ہیں، آنکھ کے اندر کے سفید حصے میں سرخی پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں بھی سوجن آ جاتی ہے۔ پتلیاں کمزور ہو جاتی ہیں اور بینائی بہت زیادہ متاثر ہو جاتی ہے۔

علاج۔ علاج کے کامیاب ہونے کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ مریض کتنی جلدی ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہے۔ جس قدر جلد علاج شروع ہو جائے اس کے اتنے ہی اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے جیسے ہی یہ محسوس ہو کہ بینائی میں کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے، فوراً ڈاکٹر سے صلاح لینی چاہیے۔

ہمیں اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ موتیابند کی بیماری غیر محسوس طریقے پر بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے ۴۰ سے ۴۵ سال کی عمر کے لوگوں کو عام طور پر وقتاً فوقتاً ڈاکٹر سے رجوع کرتے رہنا چاہیے۔ آنکھ کی پتلیوں پر دباؤ کو کم کرنے کے لیے مریض کو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق جو بھی عرق (لوشن) ملے وہ ہر روز اپنی آنکھوں میں ڈالتے رہنا چاہیے۔ یہ عرق آنکھ کی بیماریوں کے علاج کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔

موتیابند صرف آنکھوں سے تعلق رکھنے والی بیماری نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق قلبی شریانوں اور اعصابی نظام کے مختلف حصوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے آنکھ کے علاج کے ساتھ ساتھ قلبی شریانوں اور اعصابی نظام کی خرابیوں کے علاج کی جانب بھی توجہ کرنا چاہیے۔ عام اثر ڈالنے والی دواؤں میں وٹامن اے، بی ایک، بی دو، بی ۶، سی اور دوسرے وٹامن اور برومائین کے مرکبات خاص طور پر بہت مفید ہوتے ہیں۔

مریض کے لیے ہدایات ۔ مریض کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ ایک مقررہ پروگرام پر سختی سے عمل کرے ۔ انھیں پریشان ہونے اور دماغی اور جسمانی طور پر تھکن سے بھی بچنا چاہیے ۔ مریض کو نہ تو بھاری وزن اٹھانا چاہیے نہ کوئی محنت طلب کام کرنا چاہیے اس کے علاوہ کوئی ایسا کام جس سے جسم میں خم پیدا ہوتا ہو جیسے کپڑے دھونا، فرش صاف کرنا، زمین کھودنا یا باڑوں کی صفائی وغیرہ سے بھی گریز کرنا چاہیے ۔

دوسری طرف ہلکا جسمانی کام وقفے وقفے سے آرام کرتے ہوئے کیا جائے ۔ کھلی ہوا میں رہنا بہت ضروری اور مفید ہے ۔ اگر روشنی اچھی ہے تو مطالعہ، لکھنے یا ایمبرائڈری کا کام بھی مریض کے لیے نقصان دہ نہیں ۔

موتیا بند کے شکار مریض کو خاص قسم کی خوراک استعمال کرنا چاہیے ۔ اسے دن بھر میں ۵، ۶ گلاس سے زیادہ محلول یا مشروب استعمال نہیں کرنا چاہیے اور زیادہ تر دودھ دہی کی چیزیں اور ترکاریوں کا استعمال کرنا چاہیے ۔ گوشت اور مچھلی بھی کبھی کبھار کھائی جا سکتی ہے مگر صرف ابال کر ۔ نمکین اشیا اور بھنا ہوا گوشت وغیرہ خوراک میں شامل نہیں کرنا چاہیے اور نہ تلخ کافی یا چائے کا استعمال کرنا چاہیے ۔ الکحل آمیز مشروبات (بشمول بیئر) اور تمباکو نوشی قطعاً ممنوع ہے ۔

موتیا بند کے مریض کو روزانہ کم از کم ۸ گھنٹے سونا چاہیے اور ایسے تکیوں پر سونا چاہیے جو بہت اونچے ہوں ۔ اگر مریض کو بے خوابی کی شکایت ہو تو ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی خواب آور دوا استعمال کرنا چاہیے ۔

ایسے مریضوں کے لیے گرم غسل خانوں میں غسل کرنا خاص طور پر بھاپ لینا بہت نقصان دہ ہے ۔ نیز انھیں زیادہ عرصے تک تاریکی میں بھی نہیں رہنا چاہیے ۔

مریض کو ہر ڈیڑھ دو مہینے کے وقفے سے باقاعدگی کے ساتھ ڈاکٹر سے ملتے اور معائنہ کرواتے رہنا چاہیے ۔ اگر آنکھ کی حالت خراب ہو جائے تو فوراً ڈاکٹر کو طلب کر لینا چاہیے ۔ اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو آنکھوں کے لیے ڈاکٹر نے جو دوا دی ہے اس کا زیادہ استعمال کرنا چاہیے ۔ کوئی ملیّن چیز استعمال کرنا چاہیے، پیروں کو گرم پانی سے دھونا چاہیے اور سر کے پچھلے حصے میں رائی کا پلاسٹر لگانا چاہیے ۔

اگر علاج بر وقت شروع کر دیا جائے تو مریض کی بینائی بھی باقی رہ سکتی ہے اور کام کرنے کی قوت بھی ۔



رباعیات

جناب جامؔ

اشعار میں اذکار و وقائع بھی ہوں
تشبیہ و صنائع و بدائع بھی ہوں
شاعر ہے وہی جس کی نظر میں اے جامؔ!
تکمیل سخن کے یہ ذرائع بھی ہوں

ماحول بدلنے کا نظارا دیکھو
حالات بدلنے کا تماشا دیکھو
یہ کش مکش حال کہ رنگِ ماحول
آئینۂ مستقبلِ دنیا دیکھو

اک شے تھی عقیدت وہ عقیدت بھی گئی
اک شے تھی محبت وہ محبت بھی گئی
ہے پیشِ نظر عالمِ مرگِ احساس
صد حیف کہ احساس کی دولت بھی گئی

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

صباح الدین عمر ـــــــــــــــ نادم سیتاپوری

جگر کی غزلیہ شاعری

از: اشفاق علی خاں۔ ناشر: مجلس ادارہ ثقافت. علی گڑھ۔ ملنے کا پتہ: اشفاق منزل۔ مارہ خیل۔ شاہ جہاں پور۔

قیمت: تین روپے پچاس پیسے۔

جگر مراد آبادی کے مرنے کے بعد ان پر متعدد کتابیں لکھی گئیں اور اردو کے تقریباً ہر رسالے میں ان پر مضامین شایع ہوئے۔ ان تمام کتابوں اور مضامین میں جگر کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ رسالہ نگار (لکھنؤ) کے ایک پورے شمارے میں البتہ ان کے کلام پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اس کے جوابات بھی دوسرے رسائل اور اخبارات میں شایع ہوتے رہے۔ جگر کی غزلیہ شاعری پہلی کتاب ہے جس میں نگار سے کہیں زیادہ شد و مد کے ساتھ جگر کے کلام پر مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے شدید ترین اعتراضات وارد کیے گئے ہیں اور فن شاعری کا کوئی عیب ایسا نہیں رہ گیا ہے جس سے جگر کا کلام داغ دار نہ دکھایا گیا ہو۔

اشفاق علی خاں صاحب خود بھی لکھتے ہیں: "علمائے فن نے اغلاط و عیوب کی جتنی قسمیں بیان کی ہیں اور جتنی ان سے رہ گئی ہیں، ان دونوں کی اکثریت آپ کو جگر کے کلام میں مل جائے گی۔" ان کے پیش کردہ عیوب کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

جگر کو "مشاہیر کی ہم سری کا شوق ہے۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ان کی طرحی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔" جگر کے تغزل پر داغ، حسرت اور جگر کا مستقل اثر ہے۔ تخیل اور زبان دونوں کمزور ہیں۔ الفاظ و اسالیب کے انتخاب کا سلیقہ نہیں۔ لفظ 'پیارے' کا استعمال بہت کیا ہے۔ کلام میں ناہمواری ہے۔ صرف و نحو کی غلطیاں ہیں (اسمائے ظرف اور افعال کا استعمال غلط کیا ہے۔) ترکیبیں غلط ہیں۔ بہت سے اشعار مہمل ہیں یا بیکار۔ سستی اور ابتذال بھی پایا جاتا ہے۔ غیر شاعرانہ انداز بیان ہے۔ متروکات کا استعمال کیا ہے۔ بعض الفاظ یا ٹکڑے اس کثرت سے آئے ہیں گویا ان کا تکیہ کلام ہوں، ان کے اشعار میں عروضی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور متعدد اشعار یا تو ناموزوں ہیں یا مختلف البحر وغیرہ۔

جہاں تک فنی غلطیوں کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جگر کے کلام کو ان سے یکسر پاک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اشفاق صاحب کے بعض دوسرے اعتراضات میں بھی وزن ہے اور انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انھوں نے اعتراضات کی جو طویل فہرست پیش کی ہے جگر ان کے سزاوار نہیں ہیں۔ اشفاق صاحب عربی، فارسی اردو اور انگریزی ادبیات کے بڑے ماہر، علم عروض کے زبردست واقف کار اور ایک کامیاب وکیل ہیں۔ ان کی یہ کتاب ان کے تبحر علمی کا ثبوت ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وہ کردار جو وکیل کا تھا ان کے اس کردار پر جو ادیب اور نقد نگار کا تھا، غالب آگیا ہے اور جس طرح کوئی "پراسیکیوٹنگ انسپکٹر" کسی ملزم کو مجرم اور گردن زدنی ثابت کرنے کے لیے اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اور معمولی سے معمولی پہلو بھی انتہائی بھیانک روپ میں پیش کرتا ہے اسی طرح اشفاق صاحب نے جگر کے کلام میں ہر عیب تلاش کر لیا ہے چاہے وہ سرے سے عیب ہی نہ ہو یا ہو بھی تو نظر انداز کر دینے کے قابل۔ مثلاً وہ جگر پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھیں "مشاہیر کی ہم سری کا شوق ہے" اور اپنے ثبوت میں یہ کہتے ہیں کہ "اس شوق کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ان کی طرحی غزلوں پر غزلیں کہیں۔"

اب اسے کیا کہیئے گا کہ طرحی مشاعروں میں جو "طرح" دی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی مشہور شاعر کا ایک مصرع ہوتا ہے۔ اگر جگرؔ کو اس مشاعرے میں شریک ہونا تھا تو وہ اس کے بھی پابند تھے کہ اس "طرح" پر غزل کہیں۔ بغیر کسی طرحی مشاعرے کے یوں بھی شاعر، اساتذہ کی طرح پر غزل کہتے چلے آئے ہیں۔ ایسی صورت میں جگرؔ پر یہ اعتراض کیوں کیا جائے کہ انھیں "مشاہیر کی ہم سری کا شوق ہے"۔ اشفاق صاحب کا اعتراض ہے کہ جگرؔ پر داغؔ، حسرتؔ، اور اصغرؔ کا مستقل اثر ہے۔ یہ اعتراض کی کون بات ہوئی۔ خود جگرؔ کی زندگی میں ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا گیا اور جگرؔ نے اس سے انکار نہیں کیا۔

اشفاق صاحب نے ایک جگہ جگرؔ کے متعدد اشعار کو "ناتمام اشعار" قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ان میں کچھ ایسے ضروری الفاظ یا قرائن چھوٹ گئے ہیں کہ ان کے بغیر شعر نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ چند ایسے اشعار پیش ہیں:

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد، درد تنہا، مرا غم، غم زمانہ

ہے فیصلۂ عشق ہی منظور تو اٹھے اغیار بھی موجود ہیں حاضر ہے جگرؔ بھی
ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

پہلے شعر پر اعتراض ہے "معلوم نہیں "تجھ" کس کے لیے ہے"۔ دوسرے پر اعتراض ہے "کون اٹھے؟" تیسرے پر اعتراض ہے "کون پی گیا؟"۔ ظاہر ہے کہ پہلے شعر میں "تجھ" سے مراد عام مخاطب ہے، دوسرے میں "کون اٹھے" کا جواب محبوب ہے اور تیسرے میں "پینے والا" "میں" خود شاعر ہے۔ اس طرح اعتراض کیا جائے تو شاید کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ غالبؔ ہی کے دو شعر لے لیجئے۔

(۱) موت کا ایک دن معین ہے ؛ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
(۲) آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ؛ اب کسی بات پر نہیں آتی

پہلے شعر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "نیند کس کو نہیں آتی؟ غالبؔ کو، ان کے محبوب کو یا ان کے گھر میں یا پڑوس میں کسی مریض کو؟" دوسرے شعر کے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے کہ "کس کو ہنسی آتی تھی؟ غالبؔ کو، ان کے محبوب کو یا ان کے دوستوں کو؟"

آخر میں اشفاق صاحب نے ایک بڑی فاضلانہ عروضی بحث کر کے جگرؔ کے تیس بتیس اشعار درج کیے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ اشعار سب کے سب ناموزوں ہیں۔ سہو کاتب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ آتش گل (کراچی ایڈیشن) اور آتش گل (لکھنؤ ایڈیشن) دونوں میں ہی غلطیاں موجود ہیں۔ اگر پہلے ایڈیشن میں کتابت کی غلطیاں تھیں تو دوسرے میں کیوں ٹھیک نہیں کی گئیں۔ اشفاق صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض اشعار میں صرف ایک لفظ کی کمی بیشی نہیں بلکہ دو دو لفظوں کی ہے تو اسے سہو کاتب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بظاہر یہ اعتراض بالکل صحیح ہے۔ لیکن تبصرہ نگار کو اس کا ذاتی علم ہے کہ کراچی ایڈیشن کا پروف بھی جگرؔ نے نہیں دیکھا اور لکھنؤ ایڈیشن کا پروف دیکھنے کی بھی تمام و کمال ذمہ داری پریس نے اپنے سر لے لی تھی، معلوم نہیں وہ کون پروف ریڈر تھے جنھیں ان اشعار کے ناموزوں ہونے کا احساس ہی نہ ہوا ورنہ ان میں تو ایسی کھلی ہوئی ناموزونی تھی کہ فوراً پکڑ میں آ سکتی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جگرؔ کے متعلق یہ سمجھنا کہ انھیں موزوں شعر کہنے کی بھی صلاحیت نہ تھی (اور ناموزونی بھی اس حد تک جو پیش کردہ اشعار میں پائی جاتی ہے) ان کے ساتھ سخت بے انصافی بلکہ زیادتی ہوگی۔

اشفاق صاحب نے جگرؔ کے کامیاب ہونے کا راز یہ بتایا ہے کہ ان کا ترنم بہت اچھا تھا۔ آج کل تو بہت سے نوجوان اور کم عمر شعرا نہایت ہی اچھے ترنم سے شعر سناتے ہیں۔ کیا ان میں کا ہر فرد جگرؔ بن سکتا ہے یا بن جائے گا؟

ص۔ع

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

از: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ دہلی۔ قیمت: چھ روپے

اس کتاب کو شایع ہوئے اگرچہ چار سال ہو چکے ہیں اور اس پر تبصرے بھی کثرت سے نکل چکے ہیں لیکن کتاب کی افادیت نیز اس کی تیاری میں جس تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا ہے اس کے پیش نظر نیا دور کے ان پڑھنے والوں کے لیے جنھیں اس کی اشاعت کا ابھی تک علم نہیں ہے، اتنی مدت کے بعد بھی کتاب کا ایک مختصر سا تعارف بے جا نہیں معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی، اردو شاعری کی ایک بڑی اہم صنف ہے اور اردو کے ابتدائی دور سے اب تک، غزل کی طرح وہ اردو شعرا کی محبوب جولاں گاہ رہی ہے۔ اردو مثنوی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ زیادہ تر مثنویاں، ہندستان کی مشترکہ تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں اور ان کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے رہن سہن،

فکر و نظر، تاریخ و ادب، حتیٰ کہ ایک دوسرے کے مذہب سے کتنا اثر قبول لیا اور مقامی ماحول اردو شاعری پر کس حد تک اثر انداز ہوتا رہا۔ ان مثنویوں کی کئی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً: ۱۔ وہ مثنویاں جن کا موضوع مذہبی ہے؛ ۲۔ وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کی کسی تاریخی شخصیت یا تاریخی واقعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ۳۔ وہ مثنویاں جن میں ہندوستانی معاشرت کے کسی پہلو پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ۴۔ وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے مظاہر فطرت یا کسی موسم پر گہرافشانی کی گئی ہے۔ ۵۔ وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے کسی شہر کی تعریف کی گئی ہے یا اپنے وطن سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ۶۔ وہ مثنویاں جو کسی ہندوستانی قصے یا ہندوستان کی کسی قدیم روایت یا لوک (عوامی) کہانی کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (ریڈر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے جو اردو کے ایک ممتاز محقق ہیں، آخر الذکر مثنویوں کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے۔

فاضل محقق نے اپنی کتاب میں ان مثنویوں کو بھی ان ابواب میں تقسیم کر دیا ہے:۔
(۱) پورانک قصے ـــ ایسی مثنویاں جن کا تعلق رامائن، مہابھارت اور پورانوں کے قصوں سے ہے۔ (۲) لوک کہانیاں ـــ ایسی مثنویاں جن کا ماخذ پنچ تنتر، سنگھاسن بتیسی، کتھا سرت ساگر، جاتک کہانیاں اور دوسری قدیم عوامی داستانیں اور روایات ہیں۔ (۳) نیم تاریخی قصے ـــ ایسی مثنویاں جن کی بنیاد وہ قصے ہیں جن کا کسی تاریخی واقعے سے کچھ تعلق ضرور ہے مگر جن میں عوامی روایات بھی شامل ہیں۔ (۴) ہند ایرانی قصے ـــ ایسی مثنویاں جن کے کردار یا مقامات غیر ہندی ہیں مگر قصوں کا مقامی رنگ ہندوستان ہی کا ہے۔ کتاب میں ہر باب کے تحت ہر مثنوی پر تاریخی ترتیب سے بحث کی گئی ہے۔ اگر ایک ہی موضوع پر کئی مثنویاں ہیں تو سب کے اختلافات دکھائے گئے ہیں۔ ماخذوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پوری تحقیق کے بعد سن تصنیف و تالیف بتائے گئے ہیں۔ مصنف کے حالات دیے گئے ہیں وغیرہ۔ ان تمام مثنویوں کو (جن میں سے بہتوں کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ پایا جاتا ہے) تمام لائبریریوں کی خاک چھان کر ڈھونڈ نکالنا، ان کے سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا، ان کے ماخذ معلوم کرنا، وغیرہ بے انتہا تلاش و جستجو اور محنت و عرق ریزی کے طلب گار تھے۔ پھر ان تمام مثنویوں کو ایک ترتیب سے پیش کرنے کے لیے بڑے سلیقے کی بھی ضرورت تھی۔ لیکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان تمام مشکل مراحل سے عہدہ برآ ہوئے اور تحقیق و تفتیش نیز ترتیب و سلیقے کا جو نمونہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ ہر تحقیقی کام کرنے والے کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا
ص۔ ع

سازِ بیخودی

از: عمر انصاری : ناشر : مکتبۂ فردوس ادب (۲۰۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ) قیمت : چھ روپے۔

یہ مجموعہ ہے جناب عمر انصاری کی نظموں اور رباعیات کا۔ عمر انصاری اردو کے جانے پہچانے اور لکھنؤ کے ان مشہور شعرا میں ہیں جن کے اشعار میں ایک طرف لکھنؤ کی زبان و بیان کی لطافتیں ملتی ہیں اور دوسری طرف ان کی شاعری عہد حاضر کے سیاسی اور معاشرتی تغیرات اور بدلتی ہوئی قدروں سے بھی متاثر نظر آتی ہے۔ چناں چہ اس مجموعے میں قومی نظمیں بھی پائی جاتی ہیں اور رومانی نظمیں بھی۔ سیاسی رہ نماؤں کی وفات پر مرثیے بھی نظر آتے ہیں اور ایسی نظمیں بھی جن میں موجودہ سماج پر تنقید کی گئی ہے۔

نظم "بوڑھا مالی" کا جو گاندھی جی کی یاد میں کہی گئی ہے ایک بند ملاحظہ ہو:

جب گرم ہوائیں چلتی تھیں امید نہ تھی ہریالی کی
تھی سوئی ہوئی اندھیلے میں ہر ایک کرن اجیالی کی
یہ پھول، یہ کلیاں، یہ پودے، تصویر تھے جب پامالی کی
ہمت تھی اسی رکھوالے کی اس وقت بھی جو رکھوالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

"جنت کشمیر" کا ایک بند ہے۔

ذرہ ذرہ جلوۂ صد رنگ کا آئینہ دار
نغمہ زن ہر موج دریا، زمزمہ زن ہر آبشار
غنچہ و گل صد ادائے ناز و عشوہ در کنار
یہ نگارِ جلوہ ارزاں، وہ عروسِ نوبہار
موسموں کے ٹھاٹ جیسے بھیرویں، دیپک، ملار

اس مجموعے کی رباعیاں بھی بڑی دل کش اور ایک خاص رنگ کی حامل ہیں جس کے پیش رو (خود عمر انصاری کے بہ قول) حضرت فراق گورکھپوری ہیں۔ ایک رباعی "یاد ماضی" یہیں ہے۔

آئے ہوئے حادثات ٹل جاتے ہیں
خم زلفِ حیات کے نکل جاتے ہیں
اٹھتی ہے جدھر جدھر نگاہِ ساقی
صدیوں کے بجھے چراغ جل جاتے ہیں

مجموعے میں دو ایک نظمیں البتہ ایسی ہیں جن کی شانِ نزول سمجھ میں نہیں آتی

یہ نظمیں غالباً حصول آزادی سے قبل کہی گئی تھیں ۔ بہتر ہوتا کہ مجموعے میں یا تو یہ نظمیں شامل ہی نہ کی جاتیں یا سن تصنیف لکھ دیا جاتا ۔

(ص ع)

شیر کیا سوچتا ہوگا

مصنف ۔ سید رفیق حسین ۔ صفحات ۔ ۱۰۷
قیمت ۔ ڈھائی روپیہ ۔ ناشر ۔ کتاب کار ۔ رام پور (یوپی)

جانوروں کی نفسیات پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے ۔ قدیم و جدید شکارناموں میں جانوروں کے عادات و خصائل پر جو کچھ ملتا ہے اسے صحیح معنوں میں جانوروں کا نفسیاتی تجزیہ کہنا دشوار ہے ۔ سید رفیق حسین نے اس کمی کو پورا کرنے کی ایک اچھی کوشش کرکے اردو زبان میں ایک دلچسپ کتاب کا اضافہ کیا ہے ۔ "شیر کیا سوچتا ہوگا" محض شیروں کے عادات و خصائل کا نفسیاتی تجزیہ نہیں ہے بلکہ اس میں بندر، ہاتھی، بارہ سنگھے اور کئی دوسرے جانوروں کا دلچسپ نفسیاتی جائزہ آسان، عام فہم اور دلچسپ انداز میں لیا گیا ہے ۔ کتاب چھوٹی بڑی کئی کہانیوں پر مشتمل ہے جنھیں پڑھنے والا کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں ایک فطری سکون کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اوسط درجے کی ہے ۔

چچا چھکن

مصنف ۔ سید امتیاز علی تاج ۔ صفحات ۔ ۱۲۷
قیمت ۔ ایک روپیہ پچیس پیسے ۔ ناشر ۔ کتاب کار ۔ رام پور (یوپی)

اس صدی کی تیسری دہائی میں طنز و مزاح نے جو نئی کروٹ لی اس نے فرحت اللہ بیگ دہلوی، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی اور امتیاز علی تاج وغیرہ کو جنم دے کر طنز و مزاح کی ان زندہ قدروں کو بھرپور اجاگر کر دیا جن کے بغیر شاید اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ۔

سید امتیاز علی تاج کا یہ مزاحیہ کردار "چچا چھکن" رتن ناتھ سرشار کے اس خصوصی کردار کی یاد تازہ کرتا ہے جسے انھوں نے ایک صدی قبل فسانۂ آزاد میں پیش کیا تھا ۔ چچا چھکن کی روائتی زندگی کے یہ دس نقوش اپنے معاشرے کی وہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں جو بدلے ہوئے انداز میں آج بھی ہماری سوسائٹی اور ماحول میں نظر آجاتی ہیں ۔ چچا چھکن نے جھگڑا چکایا، چچا چھکن نوچندی دیکھنے چلے، چچا چھکن نے تیمارداری کی، چچا چھکن نے ایک خط لکھا، چچا چھکن نے تصویر ٹانگی ! ایک ہی تصویر کے یہ تمام رُخ ایسے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد ہم اپنی روزمرہ زندگی کا ایک دلچسپ جائزہ لے سکتے ہیں !

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں ۔ اب "کتاب کار" نے ارزاں اور سستی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کرکے اس کتاب کو بھی جو روز بروز کمیاب ہوتی جارہی ہے، "حیات ثانیہ" دے دی ۔

رسوم دہلی

مصنف ۔ سید احمد دہلوی ۔ صفحات ۔ ۱۰۸ ۔ قیمت ۔ ایک روپیہ
ناشر ۔ کتاب کار ۔ رام پور (یو ۔ پی)

"فرہنگ آصفیہ" والے سید احمد دہلوی جن کی تین درجن کتابیں ایک زمانے میں قبول عام حاصل کرچکی ہیں، گزشتہ صدی کی ان اہم شخصیات سے تعلق رکھتے ہیں جن کے میر کارواں سر سید تھے ۔ انقلاب سن ستاون کے بعد جب مسلمانوں کی مجلسی، تعلیمی، تمدنی اور معاشرتی تنظیم کا نیا دور شروع ہوا تو اصلاحی تحریکوں کا زور بھی بڑھا اور تاریخ و روایات کی جدید تدوین کا آغاز بھی ہوا ۔ لٹی ہوئی دلی اور اجڑے ہوئے لکھنؤ کے دامن پر ماضی کے ان گنت اور انمٹ نقوش باقی تھے اور سسکیاں لیتا ہوا وہ عہد بھی جو ہمارا عظیم تہذیبی اور سماجی ورثہ تھا ۔ ہندو مسلمانوں کے میل جول اور اتحاد و اتفاق نے نہ صرف اردو جیسی زبان کو جنم دیا تھا بلکہ ہندوستان کے لیے ایک متحدہ قومیت کا تصور بھی بخشا تھا ۔۔۔ اور وہ تھے یہی ریت رسوم جو ہماری ملی جلی تہذیب نے مختلف رنگ روپ میں بکھیر دیے تھے !

ہندوستانی سماجیات پر جن گنے چنے لوگوں نے ایمانداری کے ساتھ کام کیا ہے، سید احمد دہلوی ان میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں جنھوں نے اپنی تصنیف رسوم دہلی میں ان تمام ریت رسوم کو جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے دلی کے مسلمانوں میں رائج تھیں ۔ یہ کتاب عرصے سے ناپید تھی ۔ اب اسی کتاب کو "کتاب کار" رام پور نے ارزاں کتابوں کے اشاعتی پروگرام میں جگہ دے کر شائقین کے لیے دوبارہ فراہم کر دیا ہے ۔ کتاب دلچسپ اور قابل دید ہے ۔

نوائے پریشاں

از ۔ جگن ناتھ آزاد ۔ صفحات ۔ ۱۹۲
ناشر ۔ ادارہ انیس اردو ۔ الہ آباد ۔ ۳

نوائے پریشاں مجموعہ ہے جگن ناتھ آزاد کی نظموں و غزلوں کا اور بقول پروفیسر احتشام حسین

"اس مجموعے کے ذریعے آزاد نے اپنے من کی دنیا میں جھانکنے کا موقع بھی فراہم کیا اور اپنے دماغ کے دریچے بھی کھول دیے ہیں ۔ اپنے شعور فن کا پتہ بھی دیا ہے اور اپنے سوز دروں کی حرارت بھی ظاہر کر دی ہے" ۔

آزاد اس لحاظ سے خوش فکر شاعر ہے جس نے حوادث روزگار کو قنوطیت پسندی کا بہانہ نہیں بنایا، جس نے غریب الوطنی نے تنگ نظری اور تعصب میں مبتلا نہیں کیا اور جس کے فن کی بنیاد محض انسان دوستی اور انسانیت پر ہے ! آزاد میں جو چیز فن کی ہو پختگی نہ ہو جس کا تعلق سن و سال سے ہے لیکن ان کے زور بیان میں آہستہ آہستہ گہرائی اور گیرائی کی وہ تمام قدریں موجود ہیں جو ایک فنکار کو عظیم بنانے کے لیے ضروری ہوتی ہیں ۔

اس مجموعے میں محض شاعرانہ اور محسوساتی اثر انگیزی کی کارفرمائیاں نہیں ہیں بلکہ تنوع، جدت تخیل اور جذبات نگاری کے حسن کا پرتو بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے ۔

—— نادم سیتاپوری

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

صنعتی کارخانوں میں مزدوروں کی حفاظت کا مسئلہ ــــــ تیسرے منصوبے میں تکنیکی تعلیم کے لیے منظور شدہ قرضے کی کل رقم تقسیم ہو چکی ــــــ دیہی علاقوں کے لائق طلبا کو وظیفے ــــــ محکمۂ غذا و رسد کے طریقۂ کار کی خامیوں کو دور کرنے کے اقدامات ــــــ کھانا پکانے کے جدید سائنسی طریقوں کی ٹریننگ ــــــ اتر پردیش میں چونے کے پتھر کے ذخیرے ــــــ متفرقات

جدید دور کی روز افزوں تکنیکی ترقی نے ان مزدوروں کے لیے نئے خطرات پیدا کر دیے ہیں جن کو آئے دن انتہائی پیچیدہ مشینوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔ کارخانوں میں حفاظت کا مسئلہ آج اور زیادہ اہم ہو گیا ہے کیونکہ اس کا براہِ راست تعلق ملک کی رفتار ترقی سے ہے۔ اس لیے مزدوروں میں مشینوں پر کام کرتے وقت اپنی حفاظت کا احساس پیدا کرانا' پیداوار میں اضافے کے لیے بہت ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیکٹریوں کے قانون کے تحت کارخانوں میں حفاظتی اقدامات کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن جب تک آجر اور مزدور ایک دوسرے سے تعاون نہ کریں اُس وقت تک تنہا قانون کے نفاذ سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔

حادثوں کے معاشی سماجی اور نفسیاتی اثرات ہوتے ہیں جو پیداوار کے مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جانی اور مالی نقصان کے علاوہ ان حادثوں سے مزدوروں کو روزگار کی فراہمی اور مال کی تیاری پر بھی' جس پر کسی قوم کی فلاح اور ترقی منحصر ہوتی ہے اثر پڑتا ہے۔

حادثات سے نہ صرف آجروں کو بلکہ زخمی مزدوروں' ان کے کنبوں اور سماج کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نقصان زخمی مزدوروں ہی کا ہوتا ہے کیونکہ انھیں زخموں کی تکلیف اور پریشانیاں بھی سہنا پڑتی ہیں۔

ہر حادثے سے براہ راست یا بالواسطہ مالی نقصان ہوتا ہے لیکن کارخانوں کے منتظمین حادثات سے ہونے والے براہ راست نقصانات ہی کو دیکھتے ہیں اور ان کے دور رس مضمرات کو محسوس نہیں کرتے۔ یہ قطعی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے کہ حادثات سے براہ راست نقصانات کے مقابلے میں کہیں زیادہ بالواسطہ نقصانات ہوتے ہیں۔ مزید براں یہ مزدوروں کے حوصلے اور اُمنگ پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں جو ان کی بہتر کارکردگی کے لیے بہت ضروری ہیں۔

صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والوں کے تحفظ کے اقدامات کے ذمہ داروں کو اتر پردیش کے وزیر محنت شری بنارسی داس کی اس بات کو اچھی طرح ملحوظ رکھنا چاہیے جو انھوں نے ۳۰ نومبر ۱۹۶۵ء کو لکھنؤ میں منعقدہ آجروں اور مزدوروں کے ایک جلسہ میں کہی تھی۔

اُنھوں نے اُس وقت پر کہا تھا کہ "کارخانوں میں بہت زیادہ حادثات ہو رہے ہیں۔ ملک کے کارخانوں میں سنہ ۱۹۶۱ء میں سب سے زیادہ تعداد یعنی ۴۷۴ مزدور ہلاک اور ۵۹۷۴۵ ا زخمی ہوئے۔ پچھلے سات برسوں میں یہ تعداد سب سے زیادہ تھی۔ صرف اتر پردیش کے پانچ ہزار کارخانوں میں ایک سال میں کُل ۱۲۰۰۰ حادثات ہوئے جن میں ۵۰ سے ۷۰ مہلک تھے۔ حادثات کی تعداد سنہ ۱۹۶۵ء میں ۱۱۹۵۲ تھی جن میں ۱۵ حادثات مہلک تھے اور سنہ ۱۹۶۴ء میں یہ تعداد ۱۱۷۴۵ تھی جن میں ۶۷ مہلک تھے۔

"حادثات کی یہ تعداد بہت زیادہ تشویش ناک ہے۔ حفاظت

کے مسئلہ پر مناسب توجہ دے کر ہی ان حادثات کا سدباب کیا جا سکتا ہے مگر اس مسئلے کو اس وقت تک موثر طور پر حل نہیں کیا جا سکے گا جب تک آجرین، مزدور اور عوام پوری سنجیدگی سے اسے حل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

آجر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کارخانے میں نہ صرف کام کرنے کے لیے حفاظتی حالات پیدا کرے بلکہ یہ بھی دیکھے کہ وہاں کام کرنے کے محفوظ طریقے اپنائے گئے ہیں۔ اگرچہ فیکٹریوں سے متعلق قانون میں مشینوں کے خطرناک پرزوں کی دیکھ بھال، صفائی اور روشنی وغیرہ کے بارے میں ضروری ہدایات دی گئی ہیں لیکن انسان سے ہونے والی بھول چوک اور غلطیوں کے بارے میں جن کے باعث اکثر حادثات ہوتے ہیں، ایکٹ میں کوئی ہدایت نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے اس ضمن میں مزدوروں کی تربیت اور تعلیم بہت اہم ہو جاتی ہے۔

لہٰذا اس سلسلے میں نگران عملہ پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور جب تک منتظمین حادثوں سے متعلق حفاظتی اقدامات کو عملی جامہ پہنانے میں پورا پورا تعاون نہ کریں اُس وقت تک زیادہ کامیابی کی امید نہیں کی جا سکتی۔

ظاہر ہے کہ یہ دقت طلب کام ہے لیکن مستقل مزاجی اور لگن سے بڑی حد تک کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ حادثوں کا مقابلہ کرنے اور حفاظت کا احساس پیدا کرنے کے پیش نظر مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے حفاظت کے عملی طریقوں کی ایک اسکیم شروع کی ہے۔ اترپردیش میں حفاظتی کونسلیں بنائی گئی ہیں جو دیگر امور کے علاوہ حفاظتی تدابیر کو فروغ دینے کے لیے مہمیں چلاتی ہیں۔

اس کے علاوہ کارخانوں کو ایسی حفاظتی کمیٹیوں کی تکمیل کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے جن میں مزدوروں اور آجروں کے نمائندے برابر تعداد میں ہوں۔ یہ کمیٹیاں حفاظتی تدابیر سے متعلق روزمرہ کے مسائل پر غور و خوض کرتی ہیں۔ ریاست میں اب تک مختلف کارخانوں میں ایسی ۱۲۲۵ کمیٹیاں بنائی جا چکی ہیں۔

ان کمیٹیوں کی بہتر کارکردگی اور ان کے ممبروں کی رہنمائی کے لیے حال ہی میں فیکٹریوں کے چیف انسپکٹر کی تنظیم نے ایک مہم شروع کی ہے۔ اس مہم کے تحت ان کمیٹیوں کے ممبروں سے وقتاً فوقتاً رابطہ قائم کر کے انھیں ضروری ہدایات دی جاتی ہیں۔

اترپردیش میں طلبا کو تکنیکی تعلیم کے لیے تیسرے منصوبے کی پوری مدت میں مجموعی طور پر ۱۹۱٫۴۲ لاکھ روپے کے قرضے تقسیم کیے گئے۔ اس طرح تیسرے منصوبے میں اس مقصد کے لیے مقررہ کُل رقم بروئے کار لائی گئی۔

ریاست میں کُل ۱۴۶۴ طلبا کو ہندستان اور بیرونی ممالک میں اعلیٰ تکنیکی تعلیم کے لیے قرضے دیے گئے۔ ان میں سے ۲۹۶ طلبا کو بیرونی ممالک میں حصول تعلیم کے لیے قرضے منظور کیے گئے۔

اس اسکیم کے تحت جو سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں شروع کی گئی تھی اب تک مجموعی طور پر ۱۱۶٫۱۶ لاکھ روپیہ بطور قرضہ تقسیم کیا جا چکا ہے۔ ان قرضوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں اس مقصد کے لیے محض ایک لاکھ روپے کی رقم مقرر کی گئی تھی اور مالیاتی سال رواں میں ان قرضوں کے لیے ۱۳۱ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔

ان قرضوں کی وصولی بھی تسلی بخش ہے۔ اس اسکیم کے آغاز یعنی سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء سے اس سال ۳۱ مارچ تک ۱۹٫۴۹ لاکھ روپے کی رقم واجب الادا ہوئی جس میں سے صرف ۲٫۵۲ لاکھ روپیہ باقی ہے۔

حکومت اترپردیش نے دیہی علاقوں کے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم اہل اور لائق طلبا کو وظیفے دینے کی ایک نئی اسکیم شروع کی ہے۔ اس مقصد کے لیے مالیاتی سال رواں میں پانچ لاکھ روپے کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

یہ اسکیم اس وجہ سے شروع کی جا رہی ہے کہ موجودہ وظیفوں سے دیہی علاقوں کے مقابلے میں شہری علاقوں کے طلبا زیادہ تعداد میں مستفید ہو رہے ہیں اور دیہی علاقوں کے طلبا ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔

اس اسکیم کے تحت ڈگری کلاسوں میں دو سال کے لیے ۲۰ روپے ماہانہ کے ۴۵، ہائی اسکول کے درجوں میں دو سال کے لیے ۱۰ روپے ماہانہ کے ۲۰۰۰، انٹر کلاسوں میں ۱۶ روپے ماہانہ کے ۱۱۰۰ اور جونیئر ہائی اسکول کے درجوں میں تین سال کے لیے پانچ روپے ماہانہ کے ۴۸۰۰ وظیفے دیے

ئیں گے۔

ریاست کے نگراں کمیشن نے عوام سے درخواست کی ہے کہ وہ
بی ان دقتوں سے کمیشن کو آگاہ کریں جو انھیں محکمہ غذا اور رسد سے کام
لینے میں پیش آتی ہیں اور ایسے طریقے بتائیں جو ان کی رائے میں بدعنوانیو
کے مواقع ختم کر دیں گے اور ان کی دشواریاں دور کر دیں گے۔

مذکورہ محکمہ کے طریقۂ کار کی خامیوں کو دور کرنے کے پیش نظر
یشن محکمے کے قواعد اور طریقۂ کار کا مطالعہ کرنے کی تجویز بھی رکھتا ہے
اس سلسلے میں کمیشن نے ایک پریس نوٹ جاری کیا ہے جس میں
ا گیا ہے کہ "آج کل غذائی قلت اور عمارتوں نیز عمارتی سامان کی
ی نے ایک سنگین مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اس کمی کے علاوہ محکمۂ غذا و
سد کے قواعد اور طریقۂ کار میں خامیاں ہو سکتی ہیں جس کے نتیجے میں
محکمے میں بدعنوانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور غلط طریقہ رائج ہو گئے ہیں۔
ن خامیوں کو دور کرنے کے پیش نظر کمیشن اس محکمے کے قواعد اور طریقۂ
کار کا مطالعہ کرنے کی تجویز رکھتا ہے۔ عوام جنھیں اس محکمے کے دفتروں
ور ملازمین سے براہ راست سابقہ ہوتا ہے کمیشن کو اپنی واقعی مشکلات
سے مطلع کر سکتے ہیں اور ان کو دور کرنے کے طریقے تجویز کر سکتے ہیں۔
مید کی جاتی ہے کہ اس عظیم مہم میں عوام کمیشن سے تعاون کریں گے
ن سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مذکورہ محکمے سے کام لینے کے سلسلے
یں پیش آنے والی اپنی مشکلات سے کمیشن کو آگاہ کریں۔ عوام ایسے طریقے
بھی بتا سکتے ہیں جو ان کے خیال میں بدعنوانی اور بددیانتی کے مواقع ختم
کر دیں گے اور اس طرح انھیں ان کی مشکلات سے نجات دلائیں گے۔"

ریاستی محکمہ صحت کے تغذیہ بخش غذا کے پروگرام کے تحت ۲۶
فراد کے پہلے گروپ نے کھانا پکانے کے جدید طریقوں کی ٹریننگ ابھی
حال ہی میں پوری کی ہے۔ یہ ٹریننگ لکھنؤ کے پرادنشل ہائی جین انسٹی ٹیوٹ
میں ایک رہبر منصوبے کے طور پر شروع کی گئی ہے۔ ٹریننگ کا کورس
ایک ہفتے کا ہوتا ہے جس میں تربیت پانے والوں کو مختلف کھانوں کے
غذائیت بخش عناصر کو محفوظ رکھنے کی تربیت کے ساتھ ہی یہ تربیت بھی
دی جاتی ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو اپنی غذائی عادتیں بدلنے پر کس
طرح آمادہ کر سکتے ہیں۔

پہلے گروپ میں سماج کے مختلف طبقوں کے افراد تھے۔ ان میں
ایک بیرسٹر، محکمہ ڈاک کا ایک سبکدوش افسر، ایک ہوم سائنس ٹیچر،
طالبات اور یونیورسٹی کے پروفیسر کی شریک حیات شامل تھیں۔
انھیں کھانا پکانے کی نظریاتی اور عملی دونوں ٹریننگ دی گئی اور محکمۂ
صحت کے ماہرین نے اس کے عملی مظاہرے بھی کیے۔ تربیت پانے
والوں کو یہ بات خاص طور پر بتائی گئی کہ کھانا پکانے کے صحیح طریقوں کو نہ
جاننے کی وجہ سے لوگ غذائی اشیاء کو بہت زیادہ دھوتے ہیں یا
بہت دیر تک پکاتے ہیں جس سے ان کی بیشتر غذائیت ضائع ہو جاتی
ہے۔ غذا کی اہمیت مختلف عمر کے افراد کے لیے غذائی ضروریات،
متوازن غذا کو محفوظ رکھنے کے طریقوں اور مختلف پھلوں اور ترکاریوں
کی غذائیت وغیرہ موضوعات پر لکچر دیے گئے۔ اس کے علاوہ ایسی غذائی
اشیاء کی جگہ جو کمیاب ہیں اور عام آدمی کی دسترس سے باہر ہیں، اتنی ہی
غذائیت کے دوسرے کھانوں کے بارے میں مفید معلومات بہم
پہنچائی گئیں۔

ریاستی تغذیہ افسر نے ایک انٹرویو میں گھر والیوں کو غذائی
سائنس کی بنیادی باتوں اور کھانا پکانے کے جدید طریقوں سے واقف
کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ سوال کیا کہ غذائی قلت اور
بڑھتی ہوئی قیمتوں کے موجودہ دور میں لوگ آخر کب تک کھانا پکانے
کے روایتی طریقوں پر کاربند رہیں گے جن سے کھانے کے تغذیہ بخش
عناصر کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم میں سے کتنے
لوگ یہ جانتے ہیں کہ پکانے سے پہلے چاول کو بہت زیادہ دھونے
اور آدھے پکے ہوئے چاول سے پیچ نکالنے سے اس کی ساری غذائیت
ضائع ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس طرح بہت کم گھر والیاں
یہ جانتی ہیں کہ پتے دار ترکاریوں کو کاٹنے کے بعد دھونے سے اس کا
غذائیت بخش رس ناواقفیت کی بنا پر نالیوں میں بہا دیا جاتا ہے۔

انھوں نے مزید کہا کہ صحت اور قوت کے لیے مناسب اور متوازن
غذا اشد ضروری ہے۔ لہٰذا ہر مالکۂ خانہ کو کھانا پکانے کے ایسے طریقوں کو

ترک کرنے پر خاص توجہ دینا چاہیے جن سے کھانے کی غذائیت ضائع یا کم ہو جاتی ہے۔

پہلے گروپ نے ٹریننگ میں جو گہری دلچسپی لی اس سے ریاستی تغذیہ افسر بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ لکھنؤ جیسے شہر میں اگر ایسے ۵ گروپوں کو ٹریننگ دے دی جائے تو کھانا پکانے کے طریقوں اور لوگوں کی غذائی عادتوں میں انقلابی تبدیلی آسکتی ہے جس سے نہ صرف صحت بہتر ہوگی بلکہ کام کرنے کی صلاحیت میں بھی نمایاں اضافہ ہوگا۔

اتر پردیش کے دو اضلاع مرزاپور اور دہرہ دون میں چونے کے پتھر کے جن ذخیروں کا پتہ لگ چکا ہے ان سے تخمیناً ۴۰ کروڑ ٹن چونے کا پتھر حاصل کیا جا سکے گا۔

ان ذخیروں کی بنیاد پر ریاست میں سالانہ تخمیناً ۲۵ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار کرنے کا پلان بنایا جا سکے گا۔

مرزاپور کے علاقے میں چونے کے پتھر کے ذخیروں سے سالانہ ۱۵ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار کی جا سکے گی۔ اس کے علاوہ دہرہ دون کے علاقے میں ذخیروں سے استفادہ کیے بغیر سالانہ چار لاکھ ٹن اور ان کو کام میں لانے کے بعد اتنی ہی مقدار میں مزید سیمنٹ بہ آسانی تیار کی جا سکے گی۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اتر پردیش میں چوتھے منصوبے کے آخر تک مجموعی طور پر سالانہ ۴۰ لاکھ ٹن سیمنٹ کی ضرورت ہوگی۔

مُتفرقات

خاتمہ زمینداری کے معاوضہ' بانڈوں کا اجرا۔ رزرو بینک آف انڈیا کے پبلک ڈیٹ آفس نے لکھنؤ سے یو۔ پی شہری علاقہ خاتمہ زمینداری معاوضہ بانڈوں کا اجرا گذشتہ ۷ اپریل سے شروع کیا تھا۔ لیکن یہ آفس کانپور منتقل ہو گیا ہے اس لیے اب یہ بانڈ کانپور سے جاری کیے جائیں گے۔

یہ بانڈ جو ۵۰ روپیہ سے ۱۰۰۰ روپیہ تک کی مالیت کے ہیں پرامیسری نوٹ کی شکل میں ہوں گے جنھیں دوسرے کے نام منتقل کیا جا سکتا ہے۔

ان بانڈوں پر ڈھائی فی صدی سالانہ کی شرح سے سود دیا جائے گا۔

ان بانڈوں اور اصل رقم پر واجب الادا سود اجرا کی تاریخ سے دس سال کے اندر سالانہ مساوی قسطوں میں دیا جائے گا لیکن یہ پابندی آخری قسط پر عائد نہیں ہوگی۔ یہ قسطیں اتر پردیش میں ایسے خزانوں اور ذیلی خزانوں سے ادا کی جائیں گی جن کے نام بانڈوں پر درج ہوں گے۔

گنا مقابلے کے انعامات۔ اتر پردیش میں سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے اٹھارھویں گنا مقابلے میں چہری گنا فارم، آنند نگر، گورکھپور کی فی ایکڑ پیداوار سب سے زیادہ یعنی ۸۳۲٫۶۸ کوئنٹل تھی۔ اس کے علاوہ ضلع رامپور میں بلاس پور علاقے کے ایک ترقی یافتہ کسان شری گرپریت سنگھ نے پہلے تیار ہونے والا گنا ۵۷۰٫۶۷ کوئنٹل فی ایکڑ پیدا کیا اور ضلع دہرہ دون میں رانی والا کے شری گھنشیام گری نے ۵۹٫۵۸ کوئنٹل فی ایکڑ گنا پیدا کیا۔

گنا مقابلہ سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء سے ہر سال منعقد ہو رہا ہے اور اس کا مقصد ریاست کے گنا کاشتکاروں میں فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کے لیے مقابلے کا صحت مند جذبہ پیدا کرنا ہے۔

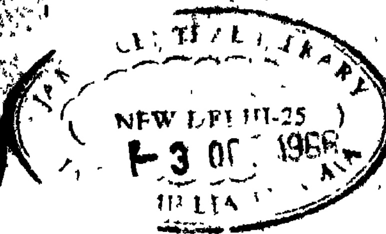


Regd. No. L. 319....

جولائی تا دسمبر ۶۶ء جولائی و اکتوبر ۶۶ء غائب ہے

اگست ۱۹۶۶ء

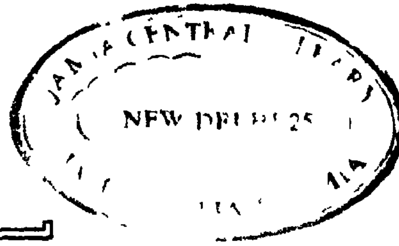


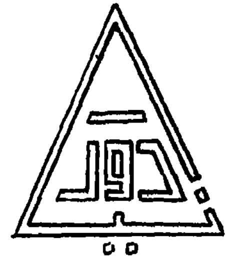


نیا دور









جلد ۲۲ | نمبر ۵

شراونڑ ۱۸۸۸ شک
اگست ۱۹۶۶ عیسوی

چندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

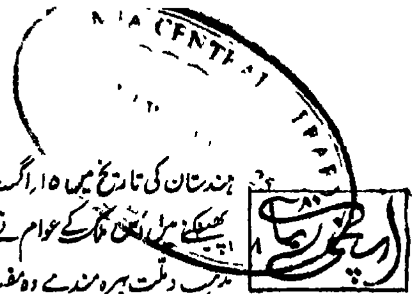
پبلشر
آر. سی. پنت
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

پرنٹر
جے. ڈبلو. ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

عنوانات



ہندستان کی تاریخ میں ۱۵ اگست کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی دن ۱۹۴۷ء میں ایک لمبے عرصے کی غیر ملکی غلامی کا جوا اتار پھینکنے میں اس ملک کے عوام نے کامیابی حاصل کی۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آزادی کی نعمت جس سے آج بھارت کا ہر شہری بلا تفریق مذہب و ملت بہرہ مند ہے وہ مفت میں یا بغیر کسی محنت و مشقت اور جانفشانی کے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لیے طولانی جدوجہد کرنا پڑی ہے اور زبردست قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ اپنی قومی آن بان اور عزت و وقار کو واپس لانے کے لیے جوان تھک کوششیں اور مسلسل کاوشیں کی گئی ہیں ان کی ولولہ انگیز داستان ہر زمانے میں ہمارے لیے امنگ اور ولولے کا نہ صرف سرچشمہ ہوگی بلکہ مادر وطن کی آزادی کی خاطر دی جانے والی عظیم قربانیوں کی یاد تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہم میں وہ عزم و حوصلہ اور طاقت پیدا کرتی رہے گی جس سے ہم اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب بھی ہو سکیں گے اور اگر ہماری طرف کوئی نگاہ بد سے دیکھے گا تو ہم اس کا منہ توڑ جواب بھی دے سکیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی ترقی اور خود کفالتی کی منزل مقصود تک پہنچنے میں ہمیں وقت لگے گا کیونکہ یہ ایک عظیم کام ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج اس ملک کا ہر شہری امید اور یقین کے ساتھ اپنے روشن اور تابناک مستقبل کی جانب گامزن ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی کے ۱۹ برسوں میں ہندستان نے اپنی قومی معیشت کے استحکام کے سلسلے میں سائنس، کلچر، صحت اور تعلیم کی ترقی کے میدان میں عظیم اور ناقابل انکار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یہ آزادی ہی کا فیض ہے کہ ملک کی حقیقی ترقی کے لیے بنیادی چیز — صنعت کی توسیع و ترقی کے ضمن میں ہم نے نمایاں کام انجام دیے ہیں اور بھاری صنعت کی بنیاد ڈالی جا چکی ہے۔ دھات سازی، بھاری مشین سازی اور آلات سازی جیسی اہم صنعتی شاخوں کو جنم دینے کے ساتھ ساتھ ملک نے خود اپنا برقی مرکز تیار کر لیا ہے۔ بھاری صنعتوں کے سلسلے میں ہم سے زائد پروجیکٹ جن میں بھلائی کا لوہے اور فولاد کا کارخانہ بھی شامل ہے، تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ رانچی میں مشین سازی کا کارخانہ، کوئلے کی کان کنی کے لیے درگاپور میں مشین سازی کا کارخانہ نیز کوئلے وغیرہ کی کانیں، متعدد بجلی گھر، باندھ اور ذخیرہ ہائے آب بن کر تیار ہو چکے ہیں اور کچھ بن رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد ہندستان میں بیداری کی زبردست لہر پیدا ہوئی ہے اور وہ پوری لگن کے ساتھ نئے ہندستان کی تعمیر میں منہمک ہے۔ ملک کی اسی بیداری کی جانب آج سے ۱۹ سال پہلے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو پہلی بار لال قلعے پر ہندستان کا قومی پرچم لہراتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ ہندستان زندگی اور آزادی کے ساتھ بیدار ہو رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آزادی کے ان ۱۹ برسوں میں ہمیں بہت سے اندرونی اور بیرونی مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا جس کی وجہ سے ہمارے ترقیاتی منصوبوں کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا مگر ہم نے تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود مستحکم ارادوں کے ساتھ نہ صرف اپنی رفتار ترقی کو مدھم نہ ہونے دیا بلکہ جدید ہندستان کی تعمیر و استحکام کے لیے پانچ سالہ منصوبے بھی شروع کیے۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس وقت تک ہم تین پانچ سالہ منصوبوں پر کامیابی کے ساتھ کام کر چکے ہیں اور اب ہم نے چوتھے منصوبے میں قدم رکھا ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا آزادی کی اس مختصر مدت میں ہمیں بہت سے اندرونی اور بیرونی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ بیرونی مسائل میں ملک کی حفاظت اور سالمیت اور بیرونی حملے سے مدافعت کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے نے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں اس وقت انتہائی سنگین صورت اختیار کر لی جب ایک طاقت ور اور بے شرم دشمن — چین نے جسے امن اور پرامن طریقوں کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہے اچانک بغیر کسی اشتعال کے انتہائی دغا بازی سے ہمارے ملک پر شرمناک حملہ کر دیا۔ دوبارہ یہی سنگین صورت حال اس وقت رونما ہوئی جب ہمارے دوسرے پڑوسی ملک نے چین سے ساز باز کر کے پہلے تو ہندستان کے رن کچھ علاقے میں جارحانہ اقدام کیا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد پہلی ستمبر ۱۹۶۵ء کو پوری ایک بریگیڈ سے ٹینکوں کے چھمب علاقے میں ہم پر زبردست حملہ کر دیا۔ لیکن ہر موقع پر ہمارے جوانوں نے جس ہمت و جرأت، شجاعت و مردانگی، بے جگری و پامردی سے اور ہمارے عوام نے جس اتحاد و اتفاق، عزم و استقلال اور مضبوط دل کے ساتھ ان چیلنجوں کا مقابلہ کیا اس نے دشمنوں کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے اور ہمیں سرخروئی نصیب ہوئی۔ اور جب بھارت جیسی قوم اپنی آزادی اور علاقائی سالمیت کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی تو اس کے سوا اور کوئی نتیجہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن ہمیں کسی طرح کی سہل پسندی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ خطرہ ٹل ضرور گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا ہے۔ دشمن اب بھی سر پر موجود ہے اور اس کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ پھر غذا وغیرہ جیسے اندرونی مسائل بھی ہیں۔ ہمیں فولادی ارادوں کے ساتھ ایک دوسرے کا رفیق بن کر اور کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم ان مشکلات اور دشواریوں پر قابو پا سکتے ہیں جو ملک کے سامنے ہیں نیز دشمن، خواہ وہ کوئی اور کیسا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، اس کے مقابلے کے لیے اپنے میں قوت پیدا کر سکتے ہیں۔ ۱۵ اگست کا دن ہمیں ملک کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد اور ہر قیمت پر ملک کی آزادی اور اس کی سالمیت کی حفاظت کا عہد دہرانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ آئیے اس عہد کو دہرائیں اور اسے پورا کرنے کے لیے دل سے کوشش کریں۔ ———

سدا بہار لہو

فضا ابن فیضی

یہ مضطرب لہو، شوخ اور بے قرار لہو
یہ نیم سوز لہو، گرم و تاب دار لہو
یہ باوقار، یہ خود دار و وضع دار لہو
یہ گل فروش، یہ پیغمبر بہار لہو

اِسی لہو سے ہوئی زینت حیات بشر
اِسی لہو کا چراغ جسم و جاں ہے زندگی کی سحر
یہی علامت منزل، نشانِ راہ گزر

اِسی لہو کی تراوش ہے چشمۂ حیواں
یہی فسانہ، یہی خود فسانے کا عنواں
یہی لہو ہے زلیخا، یہی مہِ کنعاں

یہی لہو ہے جسارت، یہی لہو تگ و تاز
یہی صبا کا تنفس ہے، پھول کی پرواز
اِسی لہو سے ہے شاداب "شعلۂ آواز"

اِسی لہو سے ہے بالیدہ زندگی کا شعور
اِسی سے ذہن تر و تازہ ہے، نظر مخمور
یہی لہو ہے چراغِ حریم کیف و سرور

اِسی لہو سے زر افشاں ہے صبح ذوقِ عمل
سلگ رہے ہیں چمن میں اسی لہو کے کنول
اِسی لہو سے ہے دیبا فروش تاج محل

اِسی لہو کی تجلی، بہار ہو جیسے
یہی شراب ہو جیسے، خمار ہو جیسے
یہی لہو "شجرِ سایہ دار" ہو جیسے

یہ دل فروز و روان بخش و سینہ تاب لہو
غزل کی شمع لہو، فکر کا گلاب لہو
نزاکت و نشۂ نغمگی و خواب لہو
مری نظر میں ہے جذبات کا شباب لہو

یہی لہو ہے شبِ برشگال کا آغاز
یہی حدیقۂ گل ہے، یہی سفینۂ ناز
یہی ہے فکر کی شوخی، خیال کی پرواز

اِسی لہو سے چراغاں ہے محفلِ دانش
اِسی لہو سے ہے لوح و قلم کی آرائش
اِسی کی دین ہے فکر و نگاہ کی تابش

اِسی لہو سے مہکتے ہیں حافظے میں کنول
اِسی کا کیف ہے پیمانۂ شعور میں حل
یہی لہو ہے قصیدہ، یہی لہو ہے غزل

یہی ہے عشق کا وجدان، حسن کا عرفان
یہی حرارتِ جذبِ دروں کی ہے پہچان
اِسی سے ہے مرا پندارِ شاعرانہ جوان

یہی لہو ہے تکلم، یہی لبِ گفتار
اِسی لہو کا کرشمہ ہے شوخیِ افکار
اِسی لہو کے شناور ہیں آج کے فن کار

اِسی لہو کی ہے وہ موج، جس سے ہے شاداب
مری نظر کا تبسم، مرے نفس کا شباب
مرے سخن کا گلستاں، مرے قلم کا گلاب

اگست ۱۹۶۶ء

شرارونم ۱۰۸۸ اشک

یہ مہ جبیں لہو، یہ پیکرِ جمال لہو
یہ سرخیِ لب و تنویرِ خط و خال لہو
لہو عبیر، لہو زعفراں، گلال لہو
فروغِ چہرۂ گیتی ہے لال لال لہو

اِسی لہو کی ہے لرزش صبا کی آہٹ میں
اِسی کا نور ہے تاروں کی جگمگاہٹ میں
اِسی کا حسن ہے بچوں کی مسکراہٹ میں

یہی ہے مانگ کی افشاں، سہاگ کی لالی
اِسی لہو سے ہے کشتِ طرب کی ہریالی
یہی منڈیروں کی رونق ہے، گھر کی اُجیالی

اِسی لہو سے ہے آنچل کی اوٹ میں مُسکان
اِسی لہو سے ہے چنچل جوانیوں کی اُٹھان
اِسی کے دم سے تنی ہے یہ ابرؤوں کی کمان

اِسی کے دم سے چھلکتے ہیں راحتوں کے ایاغ
اِسی لہو سے ملا مجھ کو زندگی کا سراغ
یہ آنگنوں کا کنول ہے، یہ ڈیوڑھیوں کا چراغ

اِسی لہو سے فروزاں ہے ماںتا کی کرن
یہی ہے بہنوں کے انمول پیار کا درپن
یہی ہے ماتھے کا جھومر، کلائی کا کنگن

اِسی لہو سے ہیں آباد گاؤں کے چوپال
اِسی سے شہر ہیں گل چہرہ و پری تمثال
اِسی سے سپنے سُہانے، جواں ہیں ماہ و سال

یہ کامراں لہو، جاں باز و سرفراز لہو
یہ شمع در کفِ وطناز و شیشہ باز لہو
یہ ہوش مند، یہ چالاک و یکہ تاز لہو
ستیزہ کار لہو، ہاں! یہ عہد ساز لہو

یہ عہد ساز لہو، زندگی کی عظمت ہے
یہ شوخ و شنگ لہو، قوم کی امانت ہے
یہ سرفروش لہو، وقت کی ضرورت ہے

اِسی لہو سے ہیں تاریخ کے ورق گلنار
اِسی لہو سے ہے اونچی یہ عزم کی دیوار
یہی لہو ہے مری عظمتوں کا نقش و نگار

یہ شورشوں کا مصاحب، یہ بجلیوں کا ندیم
نگاہِ مردِ جری میں یہی لہو ہے عظیم
یہی لہو ہے زمانے میں "فاتحِ اقلیم"

یہی لہو کبھی زخموں میں مسکراتا ہے
کبھی سپاہی کے ماتھے پہ جگمگاتا ہے
کبھی چراغ کی لَو بن کے تھرتھراتا ہے

اِسی لہو سے ہے قوموں کی روح تابندہ
اِسی لہو سے ہے ملت کی آبرو زندہ
اِسی لہو سے بنا ہے وطن ہے پائندہ

یہی لہو، مری تہذیب کی نشانی ہے
یہی لہو، مرے جذبوں کی ترجمانی ہے
اِسی لہو سے مرتب مری کہانی ہے

چند نوادر

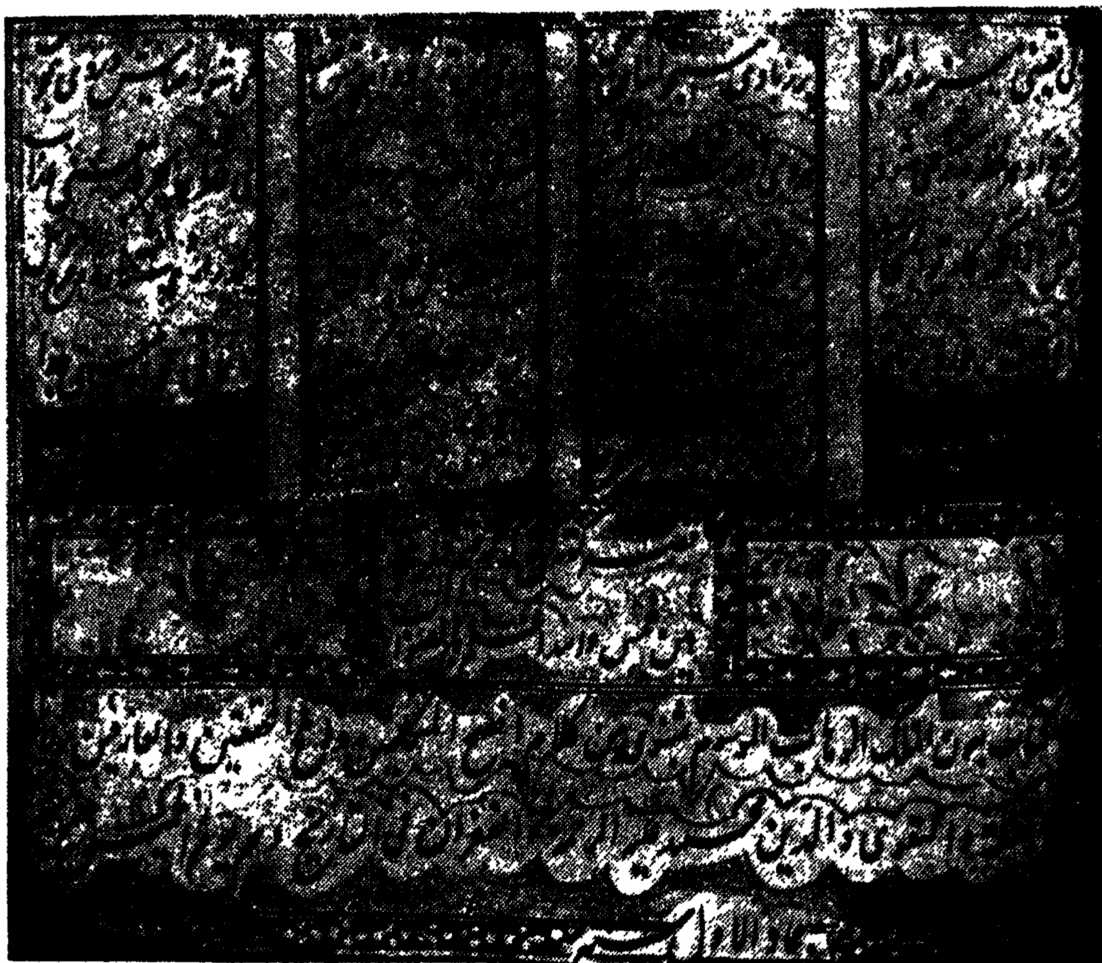
خبیرؔ قصوری

قیمتی پتھر ہوں یا قدیم سکے، پرانی کتابیں ہوں یا تصویریں ان کی تلاش، ان تک رسائی اور ان پر دسترس آسان کہہ لیجیے لیکن ان کی حفاظت اور نظرِ بد سے بچانے کے لیے سیکڑوں جتن کرنے پڑتے ہیں۔
مجھے قلمی کتابوں اور موقلم کی تصویروں کے جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔



نگہداشت آسان نہیں ہے۔ برسات کی نم ہوائیں نہ لگنے پائیں، دھوپ کا اثر نہ ہو، گرمی نہ پہنچے، سال میں ایک دو بار جھاڑ پونچھ کی جائے۔ اور پھر، ایک زمانے میں تو یہ شوق اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ آج اسی زمانے کی یادگار چند نوادر کا تعارف مقصود ہے جو اس وقت میرے سامنے بکھرے پڑے

ہیں ۔ میرے پاس قلمی کتابوں کے علاوہ بعض ایسی مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جو کم یاب ہیں اور ان کے دوبارہ چھپنے کی نوبت اب شاید ہی آئے گی۔ انھیں کتابوں میں خسرو کی خالق باری کا ایک نسخہ بھی ہے جو ہندی رسم خط میں لیتھو سے چھپا ہوا ہے اور تقریباً ڈھائی سو برس پرانا ہے۔ ایک ناقص نسخہ کلیات میر کا بھی ہے جو میر صاحب کی وفات کے سال بعد ۱۸۱۱ء



میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے نستعلیق ٹائپ میں چھپا تھا۔ یہ نسخہ[۱] پروفیسر کیپٹن جے۔ ڈبلیو۔ ٹیلر نے ہندوستانی طلبا کے لیے مرتب کرایا تھا۔ اس کے مرتبین میں منشی تارینی سترا، مرزا کاظم علی جوان اور غلام اکبر شامل تھے۔ خدا

میرے اس "ذخیرۂ نوادر" کو نظر بد سے بچائے۔ ایک بار ایک بزرگ کی نظر لگ چکی ہے۔ خالق باری اور کلیات میر کے علاوہ دوسرے نوادر میں سے بعض کا مختصراً ذکر آئندہ سطور میں کیا جاتا ہے۔

مثنوی مولانا روم

عارف رومی کی مثنوی کا یہ نسخہ تین سو پچاسی (۳۸۵) برس پرانا ہے۔ اس کی کتابت ۲ جمادی الاول سنہ ۱۰ھ پنجشنبہ کو ختم ہوئی ہے۔ کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ مثنوی کا ہر دفتر جہاں سے شروع ہوا ہے مطلا اور فن مصوری کا شاہ کار ہے۔ پوری مثنوی کے اوراق کا حاشیہ سنہری اور بیل

۱؎ بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات صفحہ ۱۴۶

بوٹوں سے مزین ہے۔

دیوان صائغ

صائغ تخلص۔ نام نظام الدین احمد، وطن بلگرام۔ صائغ کے بارے میں غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرۂ شعرائے فارسی گویاں عقد ثریا[1] میں صرف اس قدر لکھا ہے:

"صائغ بلگرامی کہ شیخ نظام الدین احمد نام دارد بارے فقیر او را در لکھنؤ دیدہ بود۔ بعد چندے بہ کلکتہ رفتہ مسموم شدہ رخت حیات در نوشت"۔

دیوان ردیف وار مکمل ہے۔ کہیں کہیں کیڑوں نے کھا لیا ہے۔ کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن کاغذ سے پتا چلتا ہے کہ نسخہ قدیم ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک غزل درج ذیل ہے:

تو اے خرد نہ دیدم چو کشاد کار خود را　　بہ جنوں حوالہ کردم ہمہ کار و بار خود را

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

تبسمے نہ لطفے نہ تکلمے نہ حرفے　　بچہ ساں کنم تسلی دل بے قرار خود را

ذلت ار زسنگ باشد نشود کہ خوں نہ گردد　　صنما اگر بہ گویم بہ تو حال زار خود را

من اگر بہ طوف کویت نہ رسم بہ گیر برمن　　ز ادب نمی پسندم بہ درت غبار خود را

ز تو چشم ایں نہ بودم کہ کنی کنارا از من　　بہ تو دادہ بودم اے دل ہمہ اختیار خود را

من اگر بہ خوں بہ غلطم نہ خروشم و نہ گریم　　بہ چہ شغل روز سازم شب انتظار خود را

بہ مزاج نازکے تو خلشے رسد مبادا　　من ازاں نہ گفتم اے گل بہ تو خار خار خود را

نہ بہ خود گمان جرات نہ از و خیال شفقت　　بہ کدام امید گیرم سر راہ یار خود را

دم آخر است صائغ کہ بہ گوید آں صنم را

کہ بیا دمے بہ بالیں تو امید دار خود را

ہدایت الرمی

فن تیر اندازی سے متعلق ایک رسالہ ہے جو شاہ عالم کے عہد میں ابوالمظفر حسین شاہ السلطان کے لیے لکھا گیا ہے۔ مصنف کا نام محمد بدہا عرف سید میر علوی ہے۔ پہلے صفحے پر یا فتاح کے نیچے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور اس کے نیچے یہ عبارت ہے:

"حمد و ثنا و شکر خدائے جل و علی آں توانائے را کہ تیر چرخ اعلا ہمیشہ در قبضۂ قدرت والا است چوں خمیدہ کمان در کشش زہ از تقدیم محکم او ست شکر بسیار و مدح بے شمار بہ پروردگار تبارک و تعالی آں دانائے را کہ دانش علم تیر اندازی شست عظمت شاہی و سرافرازی از تعناد قدر او میسرم درود غیر محدود بر رسول حبیب اللہ الودود المنزل الی الثقلین صاحب مقام قاب قوسین خاتم انبیا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم و بر کافۂ آل و جمہور اصحاب او ہر یک در تقدیم دین قویم و تشدید شرع مستقیم بہ درستی و راستی خامہ ولد گوشۂ قناعت در زاویہ (۲) طاعت رجہ روشت داشت و از ہدف مقصود غرض مجہود (۳) و در اعلاء کلمۂ حق در میدان مجاہدہ برائے رضاءات (۴) و فضائل اخرویہ 'للحرب رجال' اقامت نمودہ اما بعد میگوید بندہ خاندان نبوی محمد بدہا عرف سید میر علوی"۔

اس سے آگے کی عبارت کرم خوردہ ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ ایک جگہ نواب محتشم الدولہ محمد غوث خاں حشمت جنگ بھی لکھا ہوا ہے۔

---

[1] صفحہ ۲۰۔ مطبوعہ جامع برقی پریس، دہلی ۱۹۳۴ء مرتبہ بابائے اردو شائع کردہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن [2] کرم خوردہ ہے۔ صاف پڑھا نہیں گیا [3] صاف پڑھا نہیں گیا [4] صاف پڑھا نہیں گیا۔

میر مونس کا ایک مرثیہ

"جب شاہ کے سفر کا زمانہ گزر گیا" —— اس مرثیے کا مسودہ میر مونس مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جس پر میر انیس مرحوم کی اصلاح ہے۔ آج سے ایک سو گیارہ برس پہلے ۱۲۷۵ھ میں میر مونس نے یہ مسودہ نواب سید ولایت علی خاں رئیس پٹنہ کو تحفتاً مرحمت فرمایا تھا —— یہی مسودہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ کو نصیر حسین خیال نے مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد وزیر اعظم حیدرآباد دکن کی خدمت میں ہدیہ کیا تھا۔ یہ نادر مسودہ لکھنؤ سے پٹنہ، پٹنہ سے حیدرآباد، حیدرآباد سے دہلی ہوتا ہوا پھر لکھنؤ پہنچا ہے۔ یہاں سے کہاں جائے گا کوئی نہیں بتا سکتا۔ ایسے نوادر کو پر لگ جاتے ہیں اور وہ مختلف مقامات کی سیر کرتے رہتے ہیں۔ کہیں کوئی قدر شناس مل جاتا ہے تو اس کے پاس ٹھہر بھی جاتے ہیں جس



کی میعاد متعین نہیں ہوتی۔ ذاتی اور عوامی کتب خانوں کے نوادر کے پیچھے اسی قسم کی تاریخ چھپی ہوئی ملتی ہے۔ میر مونس کے زیر نظر مرثیے پر میر انیس نے جو اصلاحیں کی ہیں ان کے نمونے کہیں کہیں سے درج کیے جاتے ہیں۔

ماتھے پہ ہاتھ پھیر کے بولے شہ امم   کیوں چلتے چلتے رک گیا اے اسپ تیز دم

دوسرے مصرعے کی اصلاح "رک" کی جگہ "تھم"۔

کیوں چلتے چلتے تھم گیا اے اسپ تیز دم

جن و بشر سمجھتے ہیں مجھ کو پری نژاد   حیدر نے میری پشت پہ کیے بارہا جہاد

دوسرے مصرعے کی اصلاح "کیے بارہا جہاد" کی جگہ "اکثر جہاد"

حیدر نے میری پشت پہ اکثر کیے جہاد

کھائیں گے برچھیاں علی اکبر اسی جگہ   تڑپیں گے خوں میں قاسم بے پر اسی جگہ

پورے شعر کی اصلاح :

رہ رہ کے کریں گی کھلے سر اسی جگہ   تڑپیں گے دل کو تھام کے شبر اسی جگہ

تیغوں سے ٹکڑے ہوں گے برادر اسی جگہ   روئیں گے ہم کو آ کے پیمبر اسی جگہ

پہلے مصرعے کی اصلاح :

ماتم میں خاک اڑائیں گے حیدر اسی جگہ

تڑپے گی یہاں سکینہ پدر کی جدائی سے زینب اسی زمیں پہ بچھڑے گی بھائی سے
پہلے مصرعے کی اصلاح :
تھرائے گا یہ دشت حرم کی دہائی سے

تازہ کنول ہے پانی سے ہر ذی حیات کا اے فخر خضر قرب ہے بہتر فرات کا
دوسرے مصرعے کی اصلاح : "اے فخر خضر" کی جگہ "گرمی کے دن ہیں":
گرمی کے دن ہیں قرب ہے بہتر فرات کا

ناگاہ سامنے سے اٹھی گرد ایک بار اس گرد سے نمود ہوئے دو شتر سوار
پہلے مصرعے کی اصلاح : "ناگاہ" کی جگہ "میداں میں"۔
میداں میں سامنے سے اٹھی گرد ایک بار

سمجھا چکے بہن کو جو حضرت بہ چشم تر بولے یہ دیکھ کر سوئے عباس نامور
پہلے مصرعے کی اصلاح :
زیں سے اتر پڑے شہ والا بہ چشم تر

"کچھ ڈر نہیں" سپاہ عدو کی چڑھائی سے ضیغم ہٹے ہیں اور نہ ہٹیں گے ترائی سے
پہلے مصرعے کی اصلاح : "کچھ ڈر نہیں" کی جگہ "ہوتا ہے کیا":
ہوتا ہے کیا سپاہ عدو کی چڑھائی سے

عباس بھی جلال میں چیں بر جبیں بڑھے گویا ستم گروں پہ علی خشمگیں بڑھے
دوسرے مصرعے کی اصلاح :
گویا علی چڑھائے ہوئے آستیں بڑھے

ناقوں سے کانپتے ہوئے اترے حرم تمام رویا کیے حسین کی غربت پہ تا بہ شام
پورے شعر کی اصلاح :
صحن اس کا سب صفا ہوا اترے حرم تمام آئینہ بن گئی وہ زمین فلک مقام

ماتم سرا کا طور جو پیش نگاہ تھا زنگاری خیمہ سب کی نظر میں سیاہ تھا
پورے شعر کی اصلاح :
ٹکڑوں سرا س کے در پہ یہ کیوں ان کو شوق تھا کرسی سے اس مکان معلیٰ کو فوق تھا

اس دن کے بعد اور بڑھا فوج کا ہجوم آئے بہ صد حشم پسر سعد و شمر شوم
پہلے مصرعے کی اصلاح :
"مقتل میں پانچویں سے ہوا" فوج کا ہجوم

چشمے پہ یوں امام سے آنکھیں پھراتے ہیں دیکھو تو کیسے خون کے دریا بہاتے ہیں
پورے شعر کی اصلاح :
جس کو گھمنڈ ہو وہ لڑے آ کے گھاٹ پر پل باندھ دوں گا لاشوں کا دریا کے گھاٹ پر

گرمی میں آب سرد نہم تک رہا جو بند تڑپا کیے حسین کے فرزند ارجمند
پہلے مصرعے کی اصلاح : "گرمی میں" کی جگہ "ہفتم سے"۔
ہفتم سے آب سرد نہم تک رہا جو بند

پیدل جلو میں جن و ملک تھے زہے خدم حوریں نثار کرتی تھیں گوہر خوشا حشم
پہلے مصرعے کی اصلاح : "پیدل جلو میں" کی جگہ "گھوڑے کے گرد":
گھوڑے کے گرد جن و ملک تھے زہے خدم

لے لے کے پھر تو حکم شہ نامدار سے اک اک جری نے جنگ و جدل کی ہزار سے
پہلے مصرعے کی اصلاح : "پھر تو حکم" کی جگہ "حکم جنگ"۔
لے لے کے حکم جنگ شہ نامدار سے

قاسم تھے بڑے بھائی جو صف شکن تیغوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے وہ بھی گل بدن
دوسرے مصرعے کی اصلاح : "تیغوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے" کی جگہ "سوئے ریاض خلد گئے":
سوئے ریاض خلد گئے وہ بھی گل بدن

ان پر کبھی نظر کبھی ان پر نگاہ تھی جاری تھا خون آنکھوں سے اور لب پہ آہ تھی

دوسرے مصرعے کی اصلاح :

"آنکھوں سے خوں ٹپکتا تھا اور لب پہ آہ تھی

کس شغل میں ہیں آپ کہ بھولے ہمارا دھیان   صدمہ جو روح پر ہے اسے کیا کروں بیان

دوسرے مصرعے کی اصلاح : "روح پر" کی جگہ "پیاس کا"

صدمہ جو "پیاس کا" ہے اسے کیا کروں بیاں

اعضا میں سرد جان ہے بچی کی آب میں   اتنا ہے دم کہ جان ہو جیسے حباب میں

دوسرے مصرعے کی اصلاح : "جان ہو جیسے" کی جگہ "جیسے ہوا ہو"

اتنا ہے دم کہ "جیسے ہوا ہو" حباب میں

کثرت پہ اپنی ہے عبث اس فوج کو غرور   پھر چھین لوں گا نہر کہ ہے پیاس کا وفور

پورے شعر کی اصلاح :

بھر لاؤں مشک آب سے ہے پیاس کا وفور   لشکر کے سرکشوں کا مٹا دوں ابھی غرور

بھروں گا خالی کر کے صفیں مشکِ آب کو   گر فرق ہو تو منہ نہ دکھاؤں جناب کو

پورے شعر کی اصلاح :

دریا کا گھاٹ کھینچ کے تلوار چھین لوں   سو بار نہر چھوڑ دوں سو بار چھین لوں

سسکے سکینہ پیاس کے صدمے سے بار بار   خاک ایسی زندگی پہ کہ منہ دیکھے خاکسار

پہلے مصرعے کی اصلاح : "سسکے" کی جگہ "تڑپے"

تڑپے سکینہ پیاس کے صدمے سے بار بار

مرثیے کا مسودہ میلے کاغذ پر ہے اور کاغذ اتنا خستہ ہو گیا ہے کہ جہاں سے مڑتا ہے ٹوٹ جاتا ہے۔ رسم خط وہی ہے جو آج سے نو برس پہلے رائج تھا۔ مسودے کے کئی ورق پر نواب صاحب کی مہر لگی ہوئی ہے۔ کئی بند قلم زد کر دیے گئے ہیں اور کئی بند مرثیہ حر کے بھی شامل ہیں۔ صفحات کی تعداد ۲۳ ہے۔ پہلے اور آخر کے صفحے پر لکھا ہوا ہے :

" مالک ایں مرثیہ سید محمد اسماعیل خاں رضوی نبیرہ زادہ جناب نواب بہادر قبلہ و کعبہ "

اس عبارت کے نیچے نصیر حسین خیال کی یہ تحریر ہے۔

ہدیہ

سنہ ۱۲۷۵ھ میں جناب میر مونس مرحوم نے اپنے اس مرثیہ "جب شاہ کے سفر کا زمانہ گزر گیا" کا مسودہ جو اُن مرحوم کا تحریر کردہ ہے اور جس پر میر انیس کی اصلاح ہے، جناب مرحوم نواب بہادر سید ولایت علی خاں سی۔ آئی۔ ای رئیس عظیم آباد (پٹنہ) کو تحفتاً مرحمت فرمایا تھا اور جب سے وہ فقیر کے خاندان میں محفوظ رہا۔ یہ ناچیز بصد ادب حضرت اجل اکرم عالی جناب مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر جی۔ سی۔ آئی۔ ای کی خدمتِ مبارک میں اب اس یادگار کے پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

نیاز مند قدیم۔ خیال

(سید نصیر حسین خاں)

حیدرآباد دکن۔ ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۵ ہجری

"مرثیے" کے ساتھ "غزل" کا ذکر بے جوڑ سہی لیکن کیا ہرج ہے اگر آپ کی معلومات میں اتنا اور اضافہ ہو جائے کہ میر مونس صرف مرثیہ ہی نہیں غزل بھی کہتے تھے اور خاص لکھنوی رنگ کی غزل جس کو میں مرثیے ہی کی ایک قسم سمجھتا ہوں۔ لیجیے دو چار سنیے۔

یہ سب مکاں اسی کے ہیں جس کا مکاں نہیں   دیکھو کہیں نہیں ہے وہ اور پھر کہاں نہیں

وہ سوختہ نصیب ہوں میں گل تو اک طرف   بجلی کے بھی پسند مرا آشیاں نہیں

غیروں کے سامنے مجھے تم گالیاں نہ دو   میں بھی کہوں گا کیا مرے منہ میں زباں نہیں

کیوں نالے کر رہا ہے جرس ٹھہر ہمرہاں   کوئی تھکا ہوا تو پسِ کارواں نہیں

لالا کے گل چُنتے ہیں خیاباں سے اس قدر   گل دستہ بن گیا ہے مرا آشیاں نہیں

مونس بھرا ہوا ہے ہر اک شعر ترمیں رنگ

گویا ہے برگِ گل ترے منہ میں زباں نہیں

خدا جانے گندھے ہیں ان کے گیسو یا پریشاں ہیں   کئی راتوں سے ہم اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں

مزا ہے نیچے میں طرفہ اس کانِ ملاحت کے   کہ جتنے زخم ہیں تن پر مرے گویا نمکداں ہیں

خدا ہی جانے کیا بوسے میں اس بت کے مزا ہوگا   کہ جس شیریں سخن کی گالیاں مصری کی ڈلیاں ہیں

خزاں جب تھی تو آزادوں میں تھے ہم وا ہ ری قسمت

چمن میں جب بہار آئی تو اب محبوس زنداں ہیں

شکوۂ جور وجفائے آسماں کرتا نہیں میں زمیں پر نقشِ حیرت ہوں فغاں کرتا نہیں
پوچھیے اہلِ سخن سے اس خموشی کا مزا "کچھ تو ہے گویا جو میں اپنی زباں کرتا نہیں"
ہر غزل میں اخترِ مضمونِ نو یاں جلوہ گر کب زمینِ شعر کو میں آسماں کرتا نہیں
وصل کا اقرار کیسا واں سوا انکار کے "یہ نہیں کہ اس کو عادت ہے کہ ہاں کرتا نہیں"

ہو گیا ہے ضعف کی تصویر یوں بس عشق میں
اب کسی سے بات بھی یہ ناتواں کرتا نہیں

یہ اشعار جن غزلوں سے منتخب ہوئے ہیں وہ اخبار سحر نامہ[1] میں چھپ چکی ہیں۔ اخبار سحر نامہ ۱۸۶۵ء میں پہلے نجم العلوم فرنگی محل لکھنؤ سے اور اس کے بعد مطبع کارنامہ گولا گنج لکھنؤ سے شایع ہوتا تھا۔

دیوان راجا

یہ دیوان بنارس کے راجہ چیت سنگھ کے بیٹے بلوان سنگھ کا ہے، جن کا تخلص راجا تھا۔ چیت سنگھ جب وارن ہسٹنگز کے مالی مطالبوں سے تنگ آ گئے تو بنارس چھوڑ کر گوالیار چلے گئے۔ بلوان سنگھ وہیں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ غالب نے انھیں بلوان سنگھ کے بارے میں اپنے شاگرد منشی شیو نراین کو لکھا تو کر "آگرے میں راجہ[2] بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے"۔ بلوان سنگھ مرزا غالب سے دو سال چھوٹے تھے اور اپنی والدہ کے ساتھ آگرے میں رہتے تھے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔ دیوان راجا قلمی ہے۔ غالباً شایع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ کوئی مطبوعہ نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔ کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں ہے۔

نمونۂ کلام ——

یہ پست طالعی نے ملایا ہے خاک میں سر سے کہیں بلند میرا نقشِ پا ہوا
عقل و حواس و مدرکہ و ذہن اے کریم کیا کیا نہ تیری ذات سے مجھ کو عطا ہوا

لب و دنداں کے تصور میں جو نالا نکلا آگ سینے میں لگی، چشم سے دریا نکلا
چتر ہے داغِ جنوں سر پہ تو نالہ ہے نقیب دشت وحشت میں عجب دھوم سے راجا نکلا

قبضے میں تو رہے گی فقط دو ہی گز زمین کیا فائدہ جہان اگر سب کا سب ملا

حاصل ہوا یہ زلفِ پریشاں کے عشق میں راجا خطاب تھا مرا، وحشی لقب ہوا

لٹا دیتی ہے صف کی صف نظر پڑتے ہی محفل میں نشیلی آنکھ تیری کام کرتی ہے بیبائی کا
ستارے پھول، گل دستہ ثریا، کہکشاں گجرا فلک بھی اک نمونہ ہے ترے پھولوں کی ڈالی کا

شیخ صاحب کہو کیا طوفِ حرم سے حاصل دل میں گھر کیجیے اے قبلہ و کعبہ پیدا
ہو زمینِ شعر کی بھی تحتِ حکومت جس کے نہ ہوا جز میرے ایسا کوئی راجا پیدا

قطرے شبنم کے ٹپکتے نہیں برگِ گل سے پھیرتا ہے یہ ترے نام کی سمرن پتا
گلشنِ عالمِ ایجاد میں ہوں نخلِ چنار پھول ہیں داغ، رگیں نس ہیں مرا تن پتا

کعبے نہ گئے دیر سے تکفیر کے باعث اللہ کو بھولے بتِ بے پیر کے باعث

میں نہیں زمزمۂ مرغِ چمن کا محتاج ایک عالم ہے مرے طرزِ سخن کا محتاج

سیہ ہی ہوئی نہ زلفِ مسلسل کسی طرح اس روسیاہ کا نہ کیا بل کسی طرح

عاشق کا رنگ زرد ہے پوشاکِ یار زرد پھولا بسنت باغ میں آئی بہار زرد

کیا موسمِ گل آ گیا صیاد چمن میں آپے سے ہر اک مرغِ گرفتار ہے باہر

وہ سیہ بخت ہوں، روشن ہو اگر شمع مزار جمع پروانہ ہوں، گل کر دیں اسے مارکے پر
شش جہت میں سے یہی ظلم عنادل کے نصیب دو کے پر باندھ گئے، کتر گئے چار کے پر
شیخ ناراض ہو ہم سے کہ برہمن روٹھے ہوں گے پابند نہ ہم سبحہ و زنار کے پر

میر و سودا و حزیں ناسخ و آتش ہوتے رو برو ان کے تھا راجا ترے اشعار کا خط

---

[1] تاریخ بنارس [2] اسد معلیٰ صفحہ ۲۶۴ بہ حوالہ ذکر غالب مالک رام صفحہ ۲۳

شاید ہے بہار آئی کہ مرغانِ گرفتار منقار سے اڑنے کے لیے کرتے ہیں پر صاف

کشتۂ ابرو کو کیجیے دفن بیت اللہ میں قیدئ گیسو کو صاحب کالے پانی بھیجیے

گلزار فراست معروف بہ مجربات بہادری

یہ کتاب گھوڑوں کی شناخت، ان کی بیماریوں، طریق ہائے علاج اور نسخوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے مولف نے لکھا ہے کہ

"شیخ بہادر علی ولد شیخ خدا بخش سوار ابن تراب علی چابک سوار ساکن موضع کلپی پرگنہ کشوار ضلع خاص بنارس مظہر حال ہے کہ شیخ تراب علی مرحوم در فن اسپاں استادِ کامل تھے ——— کچھ بخشش خداوند کریم کی تھی کہ آج تک جو کوئی بیمار گھوڑے کو ان کی قبر کے پاس لے جاوے اور تھوڑی سی خاک اٹھا کر کسی چیز میں ملا کر گھوڑے کو کھلادے تو بہ بخشش خداوند کریم اس گھوڑے کو فوراً آرام ہو جاوے ——— بندہ ہر چند نالایق و کم استعداد ہے اپنا حال کیا بیان کرے۔ ——— طبیعت میں یہ سمائی کہ جو رسالہ و نسخہ جات بزرگوں اور قدیم استادوں کے ہیں ——— ان کو چن کر ایک جگہ کرے اور جو تدبیریں و ترکیبیں اپنی آزمودہ ہیں اور بزرگوں سے حاصل ہوئی ہیں ان کو لکھ کر اس کا نام گلزار فراست معروف بہ مجربات بہادری رکھ کر اور چند نسخہ جات اور دس فصلوں کے تمام کیا۔"

کتاب پرانی اور خط معمولی ہے۔ شاید مولف ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۰۸ ہے۔ کئی جگہ بچکانہ خط میں "برج بھوکن داس" لکھا ہوا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ "——— تیج سنگھ صاحب نے ہم کو عنایت کیا۔"

حاشیے پر حمد، نعت، صفت چار یار، مناجات بہ جناب قاضی الحاجات سبب تالیف کتاب اور علامات وغیرہ نظم میں بھی مرقوم ہیں۔ نظم کے اشعار کچھ اس طرح کے ہیں:

پر اس جا تک مرا جب دھیان پہنچا یکایک لکھنؤ میں آن پہنچا
میاں چھجو یہاں اک مہرباں ہیں تو اپنے سب طرح سے مہرباں ہیں
محمد بخش نام ان کا ہے مشہور میاں چھجو ہے عرف ان کا بدستور
میاں قادر ہیں ان کے چھوٹے بھائی انھوں میں خوبی ہے ان سے سوائی
قضارا ایک دن وہ میرا دیواں لگے پڑھنے اٹھا کر وہ سخنداں
فرس نامہ نکل پہلے ہی آیا نہایت طور اس کا ان کو بھایا
زبس گھوڑے سے تھا ان کو بہت ذوق سواری کا وہ رکھتے تھے بہت شوق
لگے وہ مجھ سے کہنے ہنس کے یوں جی کہ نثر اس کو کیا ہے تم نے کیوں جی
ہماری خاطر اس کو کیجیے نظم بہر صورت اسے کر دیجیے نظم

مہا بھارت

دنیا کی لکھی جانے والی زبانوں میں شاید ہی کوئی زبان ایسی ہوگی جس میں مہا بھارت کا کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ موجود نہ ہو۔ اس کے علاوہ ان بولیوں میں بھی مہا بھارت محفوظ ہے، جن کے بولنے والوں کی تعداد محدود ہے اور جو کسی خاص قوم، برادری یا طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مہا بھارت کا زیرِ نظر قلمی نسخہ میواتی زبان میں ہے جس میں برج بھاشا اور اردو ملی ہوئی ہے۔ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے نسخہ ناقص ہوگیا ہے۔ اس کے مصنف کا نام سعد اللہ ہے جو موضع ایکڑہ تحصیل نرح ضلع گوڑگانوہ کے رہنے والے تھے۔ رسم خط فارسی ہے۔ نمونہ کہیں کہیں سے درج کیا جاتا ہے:

ارجن کی زبان سے دوہا

اب چھل[۱] چلے نہ بل گرز[۲] چلے نہ بان[۳] جو لکھی بھگوان نے وہی چڑھے پروان[۴]

اب نہ تو مکر و سیاست کام کر سکتی ہے، نہ طاقت نہ گرز نہ تیر کمان۔ اب تو جو خدا نے لکھا ہے وہی پورا ہوگا۔

پانچو پانڈو دروپدی کے ساتھ اپنے گرو درون آچاریہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں جن کا قیام اس وقت گرو گرام (گوڑگانوہ) میں تھا اور اپنی داستان بیان کرتے ہیں۔ گرو افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور ان کو نصیحت فرماتے ہیں۔

دوہرا بہ طرز چھپے چوپائی

تم ستوادی[۵] راے گرد میں دھوم تمھارو[۶] کہوں بات سمجھائے من میں سوچ بچارو

---

۱ مکر اور حکمت عملی ۲ گرز (ہتھیار) ۳ تیر ۴ پورا ہونا۔

۵ حق پرست۔ ۶ استاد (درون آچاریہ کا ایک لقب)

ہو رہیے آدھین[1] دھنی کا نام جو لیجے بستر[2] پہن ملین[3] کائی سو بوجھ[4] نہ کیجے

تم حق پرست راجہ ہو اور میں تمھارا گرو ہوں تم کو ایک بات سمجھاتا ہوں۔ اس پر غور کرو۔ جب خدائے غنی کا نام لو تو انتہائی طاعت گزاری اور عاجزی کے ساتھ، معمولی قسم کے کپڑے پہن لو جس سے خاکساری ظاہر ہو اور کسی سے جھگڑا نہ کرو۔

دوہا

تمک[5] تمک گمان[6] کو پُر ہر[7] یجے رائے اپنوں تن مار کے نون[8] بیاپت[9] کائی جائے

اے راجہ غصہ، گناہ اور تکبر کو چھوڑ دو، اور اپنی خواہشات جسمانی ونفسانی کو ختم کر دو۔ اس سے نو قسم کی مصیبتیں جو آدمی کو پیش آتی ہیں ان سے بچ جاؤ گے۔

دوہا

سعد اللہ دھنی[10] بھیم[11] ایکچک[12] مار دین چور جار[13] مارے بھلے جا سو ہوئے جگت میں چین

اے سعد اللہ بھیم لایق مبارکباد ہے جس نے رات کے وقت کیچک کو مار ڈالا۔ چوروں اور زناکاروں کو مار ڈالنا ہی اچھا ہے۔ تاکہ دنیا پرامن ہو جائے۔

بیاض غزلیات برہم

برہم تخلص، نام عبد الکریم، ذات کے پٹھان، وطن فتح پور، امیر مینائی کے ارشد تلامذہ ریاض، سرشار، شرر، جلیل، ممتاز علی آہ کے ہم عصر۔ بھوپال میں کسی بڑے عہدے پر مامور تھے۔ کسی بات پر بگڑ کر سنہ ۱۹۰۲ء میں گورکھپور چلے آئے۔ اس وقت گورکھپور میں ریاض کا طوطی بول رہا تھا اور ریاض الاخبار کے ساتھ ساتھ دو ننھے منے پرچے فتنہ اور عطر فتنہ ریاض[14] کے قلم کے سائے میں نکل رہے تھے۔ برہم طبیب بھی تھے۔ گورکھپور میں چارج ڈسپنسری انھیں نے قائم کی تھی جہاں سے مریضوں کو دوائیں مفت ملتی تھیں۔ لیکن ان کی شہرت زیادہ تر اخبار مشرق کی وجہ سے ہوئی جو ان کی ادارت میں ہفتہ وار شایع ہوتا تھا۔ برہم کا شمار قلم کے بڑے دھنی لوگوں میں کیا جاتا تھا۔ ان کے قلم نے "معرکہ چکبست و شرر" میں بھی حصہ لیا تھا۔ برہم کا انتقال گورکھپور میں ۲۳ر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو چہارشنبہ کی رات میں ہوا۔ دفن اسی احاطے کے ایک حصے میں کیے گئے جہاں ان کا مشرق پریس تھا۔ "بیاض" میں غزلوں کے علاوہ ایک مخمس، تین قطعہ تاریخ، دو سہرے کچھ متفرق اشعار اور کئی نامکمل غزلیں ہیں۔ کاتب بیاض کا نام درج نہیں ہے۔ چند غزلیں اور کچھ اشعار حکیم صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ بقیہ غزلیں کسی خوش نویس کی لکھی ہوئی ہیں۔ اشعار کی تعداد تقریباً ۶۳۱ ہے۔

نمونہ کلام ــــ !

خدا انگ یہ بت بھی ہیں پہنچے ہوئے کہ جو کچھ زباں سے کہا ہو گیا
خموشی سہی، بے نیازی سہی تو کیا اس سے کچھ بت خدا ہو گیا
وہ برہم کی پہلی سی حالت نہیں سُنا ہے بڑا پارسا ہو گیا

جلوہ سما گیا ہے کسی جلوہ گاہ کا کیا پوچھنا ہے آج ہماری نگاہ کا
دل ہو گیا ہے واقف اسرار حسن و عشق دیر و حرم میں گھر ہے ہماری نگاہ کا

اللہ رے قدر مرے گناہوں کی روز حشر رحمت بھی ڈھونڈھتی ہے گنہگار کیا ہوا

اس غزل کا مقطع نہیں ہے۔

میں کچھ کہتا ہوں وہ سنتے ہی ہیں کچھ اور مجھے اپنی، انھیں اپنی پڑی ہے

بتاؤں کیا تمھیں اپنی حقیقت مجھے خود ہی نہیں معلوم کیا ہوں

نقاب الٹی ہے رُخِ آتشیں سے کس نے گلشن میں لگی ہے آگ برقِ حسن سے بلبل کے خرمن میں

---

[1] مطیع [2] کپڑا [3] ایسا لباس جس سے عاجزی اور خاکساری ظاہر ہو [4] لڑائی [5] گناہ کے کام [6] غصہ [7] تکبر [8] ترک کرنا [9] نو قسم کی مصیبتیں [10] لایق مبارکباد [11] بھیم۔ پانڈو پانچ بھائی تھے۔ دوسرے بھائی کا نام بھیم تھا [12] ایک مشہور پہلوان جو اس راجہ کا سالا تھا جہاں پانڈو بھیس بدل کر پناہ گزیں تھے۔ کیچک نہایت ہی بدکار، بدچلن اور فسادی تھا۔ [13] زناکار۔ [14] ریاض لکھنؤ چلے آئے تو یہ دونوں پرچے عرصے تک برہم کی ادارت میں نکلتے رہے۔ فتنہ کی پیشانی پر ریاض کا یہ شعر لکھا ہوتا تھا۔ ؎ فتنے کو پوچھتا ہے کوئی کس ادا کے ساتھ ۔۔۔ چھوٹا سا وہ ریاض اخبار کیا ہوا۔ عطر فتنہ کی پیشانی کا طغرا یہ شعر ہوتا تھا۔ ؎ چھا تا وہ دل کہ جس کی بو زلف میں موجود تھی ۔۔۔ پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی

لکھا تقدیر کا دیکھو، سوالِ وصل تھا جس میں وہی خط ہم نے دیکھا آج برسم دستِ دشمن میں

نتیجہ کچھ نہیں یہ میں بھی لے قاصد سمجھتا ہوں مگر اک بات پیدا شکوۂ باطل میں ہوتی ہے

در سے سرِ سودا زدہ اٹھتا ہی نہیں آپ دربان بھی پریشان ہے اس آشفتہ سری سے
وہ چھیڑ کے کہتے ہیں کہاں رہتے ہو برہم آتے ہوئے ملتے ہیں جو دشمن کی گلی سے

آنسو ہوئے آنکھوں سے رواں دل سے نکل کر یہ موج کہاں جائے گی ساحل سے نکل کر
وہ کہتے ہیں ہو جائے گی برہم مری محفل برہم سے کہو جائے نہ محفل سے نکل کر

مے خانے میں آج آتے ہیں حضرتِ برہم کل تک تو بہت جھومتے تھے یادِ خدا میں

اپنے دل ہی میں ملا وہ بے نشاں جابجا برہم جسے ڈھونڈھا کیے

یہاں آنسو نہیں تھمتے، وہاں نظریں نہیں اٹھتیں ہماری ان کی رسوائی بھری محفل میں ہوتی ہے

قبر میں جی بھر کے برہم سو لیے تھے بہت ترسے ہوئے آرام کے

[illegible]

کلیاتِ میر کا ایک صفحہ (دیکھیے صفحہ ۶)



غزل

تسکین قریشی

ہر چند تمنّا و طلب کچھ بھی نہیں ہے
بے چین ہو دل اور سبب کچھ بھی نہیں ہے

اُس انجمنِ ناز میں سب کچھ سہی، لیکن
جب ہو نہ کوئی آہ بہ لب، کچھ بھی نہیں ہے

بے نور اگر دل ہو تو کیسی رہ و منزل
یہ شوقِ سفر، ذوقِ طلب، کچھ بھی نہیں ہے

سب ٹوٹ گئے زندگیِ دل کے سہارے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ اب کچھ بھی نہیں ہے

محفل سے الگ شاہدِ محفل کی طرف دیکھ
جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب کچھ بھی نہیں ہے

پایانِ طلب یہ ہے کہ تسکیں طلب اپنی
جز حسرتِ توفیقِ طلب کچھ بھی نہیں ہے

ایکتا

سعادت نظیر

اپنے وطن میں بسنے والے
سب ہیں بہادر، سب ہیں جیالے
سب ہیں سخت پہاڑوں جیسے
وقت پہ تیز کلہاڑوں جیسے
پھول یہ سب ہیں ایک چمن کے
اور ستارے ایک گگن کے
ان کا دل ہے جیسے درپن
ان میں نہیں کچھ ذات کا بندھن
سکھ اپنے، عیسائی اپنے
ہندو، مسلم، بھائی اپنے
کھانے دیں گے، پینے دیں گے
خود جی کر یہ جینے دیں گے
ایک کا دُکھ کیا، سب کا دُکھ ہے
ایک کا سُکھ بھی، سب کا سُکھ ہے
عید وہی، ہولی بھی وہی ہے
جو بھی خوشی ہو، سب کی خوشی ہے
ایک یہ سب ہیں، ایک رہیں گے
پریم کے ساگر ان سے بہیں گے

نواب تفضل حسین خاں بنگش والیِ فرخ آباد

منظر سلیم

اتر پردیش کو پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران نہایت ہی نمایاں کارنامے انجام دینے کا فخر حاصل ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے انقلابی سپاہیوں نے بیرونی اقتدار کے خلاف اجتماعی طور پر سب سے پہلے پرچم بغاوت بلند کیا، بلکہ قومی پیمانے پر اس جنگِ آزادی کے زیادہ تر چوٹی کے رہنما مثلاً نانا صاحب، رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، بیگم حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ، رانا بینی مادھو سنگھ، نواب باندہ، راجا جیالال وغیرہ اسی ریاست نے فراہم کیے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تحریکِ آزادی کے سلسلے میں سب سے سنگین اور زیادہ دنوں تک جاری رہنے والے فوجی معرکے بھی اسی ریاست میں ہوئے۔ تقریباً تمام بڑے شہروں میں انگریزی اقتدار کے خلاف منظم اور مسلح جدوجہد ہوئی، عوام اور خواص نے یکساں طور پر جان و مال کی زبردست قربانیاں پیش کیں اور جنتا کے، جن میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے، پہلو بہ پہلو راجپوتوں، نوابوں، جاگیرداروں اور زمین داروں نے بھی اپنے خون سے تاریخ کے صفحات پر جاں بازی اور سرفروشی کی ولولہ انگیز داستانیں رقم کیں۔ اس میں شک نہیں کہ آخر الذکر طبقے کی ممتاز شخصیتوں کو علاقوں، جاگیروں، جانشینی یا بعض دوسرے معاملات کے سلسلے میں انگریزوں سے نجی شکایات بھی تھیں اور ان کے انقلابی رویّے کی تشکیل میں ان نجی شکایات اور کھوئے ہوئے اقتدار کی بحالی کی توقعات کا بھی ہاتھ تھا مگر متعصب مورخین تک نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ یہ لوگ ملک کے دوسرے بے شمار لوگوں کی طرح حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھے اور دل سے چاہتے تھے انگریزوں کا تسلط باقی نہ رہے۔

والیِ فرخ آباد نواب تفضل حسین خاں بنگش بھی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے سورماؤں میں نمایاں اہمیت رکھتے ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ فتح گڑھ اور فرخ آباد کے علاقوں میں انگریزی اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجادی بلکہ سات ماہ تک حسن و خوبی کے ساتھ اپنے علاقے کا نظم و نسق چلایا۔ وہ بنگش پٹھانوں کے جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس کے بزرگ محمد خاں بنگش کوہاٹ سے آکر فرخ آباد میں آباد ہوگئے تھے۔ محمد خاں بنگش کچھ عرصے تک عہد اورنگ زیب میں گھوڑسوار دستے کے افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد فرخ سیر کے عہد میں انھوں نے فوجی خدمات انجام دیں جنھوں نے انھیں منصب چار ہزاری عطا کیا اور کالپی اور کونچ میں جاگیریں بھی دیں۔ بعد میں دہلی حکومت کی مزید خدمات کے صلے میں انھیں غضنفر جنگ کا خطاب، دوسرے ۱۷۱۰ء اور فرخ آباد ضلع میں کچھ اور جاگیر عطا کی گئی۔ نواب غضنفر جنگ بنگش کا انتقال ۸۰ برس کی عمر میں ۱۷۴۳ء میں ہوا۔

اودھ کے نواب وزیر کو ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء کے معاہدہ کے تحت اودھ کے کچھ علاقوں، فرخ آباد میں اپنے پرگنوں اور ساڑھے چار لاکھ روپے سالانہ کی اس رقم سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں دست بردار ہونا پڑا جو والیانِ فرخ آباد سے اودھ کے خزانے کو ملا کرتی تھی۔ اس کے بعد فرخ آباد کے نواب ناصر جنگ بھی ۱۸۰۲ء میں اپنا سارا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے صلے میں کمپنی نے انھیں اور ان کے متعلقین کو ایک لاکھ ۸ ہزار روپے سالانہ بطور گذارہ دینا منظور کیا۔ اب نواب فرخ آباد کے پاس صرف تھوڑی سی

جاگیر رہ گئی، باقی سارا علاقہ نکل گیا۔ وہ صرف نام کو نواب رہ گئے اور انھیں اپنے تمام علاقوں پر کسی قسم کا حق و اختیار باقی نہ رہا۔ ناصر جنگ نے ۱۸۱۳ء میں خودکشی کر لی۔ ان کے نابالغ بیٹے خادم حسین خاں مگش جانشین ہوئے۔ لیکن جوانی ہی میں ان کا دہلی میں چیچک کے مرض میں انتقال ہو گیا۔ اب ان کے بیٹے نواب تجمل حسین خاں جانشین ہوئے۔ تجمل حسین خاں بڑے علم دوست نواب تھے۔ علما، فضلا اور اہلِ کمال ان کے دربار سے فیضیاب ہوتے تھے۔ مرزا غالب بھی ان کی دعوت پر فرخ آباد آئے تھے۔ انھوں نے غالب کی ذاتی قدر کی اور غالب کا یہ مشہور شعر ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

انھیں کے متعلق ہے۔ نواب تجمل حسین خاں کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لیے ان کے چچا زاد بھائی تفضل حسین خاں ۴ دسمبر ۱۸۴۶ء کو ان کے جانشین ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے : ۔

"نواب تفضل حسین خاں ابن نواب عنایت حسین ابن نواب خادم حسین ابن نواب حسین خاں ابن دلیر ہمت خاں ابن احمد خاں ابن امام خاں ابن قائم خاں ابن نواب غضنفر جنگ بنگش۔

نواب تفضل حسین خاں ۵ ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ (۳۱ اکتوبر ۱۸۲۷ء) کو پیدا ہوئے تھے۔"[2]

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے آغاز کے وقت فرخ آباد سے چند میل کے فاصلے پر فتح گڑھ میں دسویں رجمنٹ (TENTH NATIVE INFANTRY) مامور تھی جس کے کمانڈر کرنل اسمتھ تھے۔ انھوں نے بغاوت کے امکانات کی افواہوں کی بنا پر احتیاطی اقدام کے طور پر جون ۱۸۵۷ء کے ابتدائی ایام میں انگریز عورتوں، بچوں اور لڑائی میں حصہ نہ لے سکنے والے افراد کو جن کی مجموعی تعداد ۱۱۵ تھی، کان پور روانہ کر دیا تھا۔ راستے میں ان میں سے کچھ افراد نے ایک زمین دار کے یہاں پناہ لی جو انگریزوں کا دوست تھا اور بعد میں فتح گڑھ واپس آگئے۔ باقی افراد جن کی تعداد ۱۰۵ تھی کان پور کے مضافاتی علاقہ نواب گنج تک پہنچ گئے۔ یہاں مجاہدین آزادی نے انھیں پکڑ لیا، کان پور لے گئے اور وہاں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

قلعہ فتح گڑھ پر حملہ

ہندستانی سپاہیوں نے ۱۸ جون ۱۸۵۷ء کو انگریزی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر کے فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں کو اپنا حاکم بنا لیا۔ عوام کے جذبات بے حد مشتعل تھے۔ چناں چہ ہومز نے اقرار کیا ہے کہ صوبے کے شمال مغرب کے کسی علاقے میں اتنے جوشیلے اور "امن دشمن" لوگ موجود نہ تھے جتنے کہ فرخ آباد میں تھے۔[3]

اکتالیسویں رجمنٹ کے کمانڈر آغا حسین ۱۹ جون کو سپاہیوں کے ساتھ کشتیوں کے ذریعے دریا سے اتر آئے۔ نواب تفضل حسین خاں نے ان کی مدد کی۔ کچھ سپاہی، اسلحہ اور روپیہ پیسہ انھیں دیا۔ فتح گڑھ کی دسویں رجمنٹ کے سپاہی بھی اکتالیسویں رجمنٹ کے سپاہیوں سے مل گئے اور جیل توڑ کر قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ نواب تفضل حسین خاں کو ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ کرنل اسمتھ اور دوسرے انگریزوں نے قلعہ فتح گڑھ میں پناہ لی۔ اس قلعہ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں ۱۹ جون سے ۲۵ جون تک انقلابی سربراہوں میں مشورے ہوتے رہے۔ آخر ۲۵ جون کو قلعہ پر حملہ کر دیا گیا۔ حملے کا سلسلہ ۱۴ روز تک مسلسل جاری رہا۔ انقلابی سپاہی برابر کے مکانات کی چھتوں پر سے قلعہ پر مسلسل گولہ باری کرتے رہے۔ یہاں تک کہ قلعہ کے بندرہ بروزہ محاصرے میں ایک طرف تو قلعہ کی دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگیں اور دوسری طرف روز بروز اہلِ قلعہ کی تعداد اور سامان رسد گھٹنے لگا۔ آخر کار کرنل اسمتھ نے فیصلہ کیا کہ اب قلعہ کے دفاع کی کوئی صورت باقی نہیں ہے اور یہاں سے بھاگ کھڑے ہونا چاہیے۔ قلعہ کے نیچے دریا میں تین کشتیاں کھڑی تھیں ۳ اور ۴ جولائی کی رات میں ۲ بجے انگریزوں نے ان کشتیوں پر سوار ہونا شروع کیا۔ امداد صابری صاحب نے تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ کے حوالے سے اس فرار کی تفصیل یوں بیان کی ہے :

"تین کرنل تھے۔ تینوں نے ایک ایک کشتی میں سواریوں کو بٹھایا۔ کرنل گولی ڈائی کی کشتی موضع سنگھی رام میں بخیریت پہنچ گئی لیکن میجر رو برٹس کی کشتی ریت میں آگئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ دو کشتیاں مسلح سپاہیوں کی

---

[1] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از مصطفیٰ خورشید رضوی۔ [2] ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا از امداد صابری۔ [3] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

"آتش فشانی کرنے لگیں مسٹر... برٹس زخمی ہوئے۔ انھوں نے سبوں کو کہا کہ وہ کشتی سے کود جائیں۔ بعض خود اور بعض اور آدمیوں کی مدد سے تیریں۔ آخرکار ان میں سے کچھ ڈوب گئیں، کچھ ماری گئیں اور کچھ گرفتار ہوئیں۔ یہی حشر کرنل اسمتھ کی کشتی کا ہوا۔"

مسٹر آنند سروپ سرانے اپنی انگریزی تصنیف ناناصاحب پیشوا میں اس واقعے کے متعلق لکھا ہے کہ کرنل اسمتھ رات کو اپنے ساتھیوں کو لے کر کشتیوں کے ذریعے کان پور کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں انقلابی سپاہیوں نے ان کشتیوں پر گولی باری کی اور بہت سے افراد مارے گئے۔ جو بچ گئے ان میں کچھ کو بٹھور میں گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس سے قبل فتح گڑھ میں انقلابی سپاہیوں نے کچھ انگریزوں کو پکڑ لیا تھا۔ ان میں سے آٹھ نو عورتیں اور بچے نواب تفضل حسین خاں کے محل کے اس باہری حصے میں قید تھے جو خادموں کی رہائش گاہ کا کام دیتا تھا۔ ان عورتوں اور بچوں کو کچھ دوسرے یورپی باشندوں کے ساتھ جو فرخ آباد میں ان جگہوں سے پکڑے گئے تھے جہاں وہ روپوش تھے ۲۳ جولائی کو نواب تفضل حسین خاں کی مرضی کے خلاف قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ "عورتوں اور بچوں کا یہ قتل دوسری جگہوں کی طرح فرخ آباد میں بھی اس احمقانہ خیال کے تحت ہوا کہ ہندستان میں مقیم انگریزوں کو مار دینے کا مطلب پوری انگریز قوم کو نیست و نابود کرنا ہے۔"[1]

سات ماہ تک حکومت

نواب تفضل حسین خاں نے سات ماہ تک ضلع پر حکومت کی۔ انھوں نے ۱۸ جون کو قومی حکومت قائم کی تھی۔ فرخ آباد ضلع کے علاوہ ایٹہ ضلع کے کچھ علاقے بھی ان کے قبضے میں تھے۔ انھوں نے اس علاقے کو مشرقی اور مغربی منطقوں میں بانٹ رکھا تھا اور انھیں ناظموں یا کلکٹروں کی نگرانی میں دے دیا تھا۔ انھوں نے عدالتیں بھی قائم کیں۔ عدالت عالیہ اپیلوں کی سماعت کے لیے قائم کی گئی۔ عدالت عالیہ کے ماتحت تین مفتیوں پر مشتمل ایک عدالت تھی جو سول مقدمات کے فیصلے کرتی تھی۔ چھوٹے مقدمات کے فیصلے تحصیل داروں کے سپرد تھے۔ نواب تفضل حسین خاں نے انگریزی حکومت کے تحصیل اور پولیس سے متعلق نظام کو جوں کا توں برقرار رہنے دیا۔ کرایہ اور مال گزاری سے متعلق مقدمات کا فیصلہ بھی انگریزی دور کی طرح تحصیل داروں ہی کے ہاتھ میں رہا۔

نواب تفضل حسین خاں کے دور حکومت میں انگریزی دور کی طرح آمدنی کا خاص ذریعہ مال گزاری ہی تھا۔ اس کے علاوہ چنگیوں اور کشتیوں وغیرہ پر محصول لینے کا طریقہ بھی رائج کیا گیا تاکہ آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔

فرخ آباد کی قومی فوج شروع شروع میں زیادہ تر سیتاپور کی اکتالیسویں رجمنٹ (41ST. NATIVE INFANTRY) ہی پر مشتمل تھی۔ سیتاپور میں مامور کچھ اور سپاہی بھی آکر اس میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ مقامی طور پر ایک گھوڑسوار دستہ منظم کیا گیا۔ ان سب کی مجموعی تعداد تقریباً ۲۲۰۰ تھی۔ بعد میں نواب تفضل حسین خاں نے پیدل اور گھوڑسوار فوج کی مزید ۱۱ رجمنٹیں تیار کیں اور ۲۴ توپوں اور ۲۰۰ افراد پر مشتمل ایک توپ خانہ قائم کیا۔ آغا حسین کمانڈر انچیف تھے۔

نواب تفضل حسین خاں کی صلاحیتوں کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ انگریز مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کے علاقے کا نظم و نسق دوسرے پڑوسی اضلاع کے مقامی حکمرانوں کے نظم و نسق سے بہتر تھا۔

انگریزوں کی چڑھائی

اس اثنا میں مختلف اسباب کی بنا پر ملک کی آزادی کی اس پہلی لڑائی میں ناکامی کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور چاروں طرف دوبارہ انگریزوں کا تسلط ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریز دہلی پر قابض ہو گئے اور نومبر کے آخری دنوں میں لکھنؤ میں انگریزی اقتدار بحال ہو گیا۔ لکھنؤ سے انگریز کمانڈر انچیف کان پور آیا اور یہاں تاتیا ٹوپے کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دہلی، لکھنؤ اور کان پور کے بعد فتح گڑھ پر دوبارہ تسلط کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ دہلی سے فتح گڑھ کے لیے انگریز فوج روانہ ہو گئی اور کمانڈر انچیف سر کولن کیمپبل (SIR COLIN CAMP BELL) کان پور سے گرینڈ ٹرنک روڈ کے راستے فتح گڑھ کی طرف بڑھے۔ نواب تفضل حسین خاں نے اپنی ساری فوج انگریزوں کے مقابلے کے لیے روانہ کی مگر ۲ جنوری ۱۸۵۸ء کو خدا گنج نامی مقام کے قریب اس فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ نواب کے ایک فوجی کمانڈر ٹھاکر پانڈے میدان جنگ میں

---

[1] فرخ آباد گزیٹیر (۱۹۱۱ء) صفحہ ۱۶۲

شہید ہوئے۔ ٹھاکر پانڈے کے مارے جانے کے بعد فوج کے جو سپاہی بچ گئے تھے فرخ آباد واپس آگئے۔ ادھر انگریزی فوج کی فرخ آباد کی طرف پیش قدمی جاری رہی۔ مگر اس فوج کے فرخ آباد پہنچنے سے قبل ہی نواب تفضل حسین خاں، شہزادہ فیروز شاہ اور کچھ دوسرے لوگ گنگا پار کرکے عارضی طور پر بریلی میں خان بہادر خاں کے دربار میں پناہ گزیں ہوگئے۔

انگریز کمانڈر انچیف ۳ جنوری ۱۸۵۸ء کو قلعہ فتح گڑھ میں داخل ہوا اور یہاں اسے دس لاکھ روپے کی مالیت کا سامان، مختلف قسم کی توپیں، کپڑے، خیمے اور دوسرا فوجی سامان ملا۔ نواب تفضل حسین خاں نے قلعے میں توپیں، گولے اور بارود وغیرہ تیار کرنے کا بھی ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ مگر قلعے کو خالی کرتے وقت کسی کو اسے اڑا دینے کا خیال نہ آیا ورنہ انگریزوں کو یہ قیمتی اشیا نہ ملتیں۔

بربریت کے مظاہرے

فتح گڑھ اور فرخ آباد پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بے پناہ ظلم وستم ڈھائے۔ قریبی علاقوں کو ایک فوجی دستہ روانہ کیا گیا جس کا مقصد لوگوں کو پکڑنا اور پھانسی دینا تھا۔ جہاں جہاں یہ دستہ رکتا تھا لوگ پکڑ کر لائے جاتے، ان پر جون ۱۸۵۷ء میں فتح گڑھ میں انگریزوں پر مظالم کرنے کے فرضی الزامات لگائے جاتے اور "گشتی" "عدالت" انھیں موت کی سزا کا حکم سناتی۔ ان قیدیوں کو درختوں پر لٹکا کر پھانسی دی جاتی تھی۔ بڑے پیمانے پر اس طرح پھانسی دیے جانے کے ایک نہایت دردناک منظر کی تصویرکشی نوبس مچل نے اپنی تصنیف (REMINISCENCES) میں کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پالا موئیں جہاں انقلابیوں کا بہت زور تھا کمشنر نے اپنی عدالت فوجی نگرانی میں تھانے میں لگائی۔ یہاں گرفتار کیے جانے والوں کو جتھوں میں اس کے سامنے پیش کیا جاتا اور ذرا ہی دیر بعد انھیں برگد کی قسم کے ایک درخت (پیپل) کے پاس لے جایا جاتا جو تھانے کے صحن میں واقع تھا۔ یہاں ان لوگوں کو اسی درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دی جاتی۔ "یہ سلسلہ ۳ بجے شام سے اگلے روز صبح تک جاری رہا جب کہ اسے اطلاع دی گئی کہ اب درخت پر جگہ باقی نہیں رہی۔ اس وقت تک درخت کی شاخوں میں ۱۳۰ افراد لٹکائے جا چکے تھے۔ یہ واقعی بڑا دردناک منظر تھا۔"

نواب تفضل حسین خاں کے محل کو منہدم کر دیا گیا۔ اب اس محل کی جگہ تحصیل اور ٹاؤن ہال کی عمارتیں ہیں۔ نواب کی اہلیہ بلقیس زمانیہ بیگم کے پاس جو کچھ تھا چھین لیا گیا اور انھیں اپنی زندگی کے آخری ایام اس جگہ کے قریب ہی کاٹنے پڑے جہاں کبھی محل تھا۔ نواب کے خاندان کے متعدد مردوں کو اپنی جانوں کی قربانی دینی پڑی۔ ان میں نواب تجمل حسین خاں کے حقیقی بھائی نواب غضنفر حسین خاں بھی تھے جو شاعر تھے اور سعید تخلص تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ سنسکرت میں بھی وہ کافی دخل رکھتے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا اور فرخ آباد کے پیپل کے درخت میں پھانسی دی گئی۔ ناصر خاں ناصر فرخ آبادی جو نواب قائم علی کے داماد تھے اور ناصر تخلص کرتے تھے۔ وہ انگریز فوج کے فرخ آباد میں داخل ہونے کے بعد گرفتار ہوئے اور ان کو بھی پھانسی دی گئی۔ ناصر خاں انتہائی جری تھے ان کا دم نہیں نکلتا تھا جب ٹخنے کی نس کاٹی گئی تو دم نکلا[1]۔ ان کے علاوہ نواب اقبال مند خاں کو بھی پھانسی دی گئی۔

گرفتاری کے لیے انعام

نواب تفضل حسین خاں کی گرفتاری کے لیے گورنر جنرل نے دس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں ۴ مئی ۱۸۵۸ء کے گزٹ میں ایک اعلان بھی شایع کیا گیا۔ ان دنوں نواب تفضل حسین خاں اور جنگ آزادی کے دوسرے لیڈر جن کو شکست کی بنا پر اپنے علاقوں کو چھوڑ دینا پڑا تھا، نیپال کی سرحد پر ترائی کی ایک تنگ پٹی میں اکٹھا تھے۔ سر کولین کیمپ بل (SIR COLIN CAMPBELL) ان لیڈروں کے تعاقب میں تھے اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ انھیں آگے ڈھکیل کر نیپال میں پہنچا دیا جائے اور رانا جنگ بہادر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے جن کو ان لیڈروں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ سر کولین اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد لکھنؤ واپس آگئے مگر اس اثنا میں متعدد قوم پرست لیڈروں نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا۔ نواب فرخ آباد تفضل حسین خاں بنگش ان میں سے ایک تھے۔ انھوں نے خود کو میجر بیرو (MAJOR BARROW) کے حوالے اس شرط پر کیا کہ ان کی جان نہ لی جائے گی۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۹ پر)

[1] سن ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا

(افسانہ)

عید کارڈ

اختر اورینوی

"بے بی! بٹیا! آؤ! عید کارڈ لو! دیکھو کیسے اچھے اچھے کارڈ ہیں!"

"آئی اّتی! مُنّے کو سویّاں کھلا رہی ہوں۔ ہائے اللہ مُنّے ری کھاتا بھی نہیں۔ میرے عید کارڈ! میرے عید کارڈ!"

"یہ سارے عید کارڈ میری بٹیا کے ہیں۔"

اپنی کوٹھری سے نکل کر دالان میں آ گیا اور بے بی کو بڑی محبت کی رسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ بے بی جلد جلد آخری چمچیاں مُنّے منہ میں ڈال رہی تھی۔ سویّوں کے لچھے مُنّے کے لبوں سے اُلجھے ہوئے ۔ دودھ کی اُجلی اُجلی بوندیں ٹپکی پڑتی تھیں۔ گالوں پر بھی اُجلے جلے دھبّے تھے۔ بے بی کی نظریں رنگ برنگے عید کارڈوں کی طرف تھیں

"بے بی مُنّے کو کھلا کر ذرا گلّو بابو کو گود میں اُٹھا لو۔ بڑا رو رہا ہے۔ باورچی خانے میں کام کر رہی ہوں۔" امّی پکاریں۔

بے بی کا جی رُندھ گیا۔ وہ تو عید کارڈوں کی تصویروں سے کھیلنا رہی تھی۔ زندگی چاروں طرف بہت پھیکی، بہت بوجھل تھی۔ وہ اپنے عید کارڈوں کی جنّت میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ مُنّے کو آخری چمچی کھلا کر یابانہ اپنی جنّت کی طرف دوڑ پڑی۔

"بے بی! گلّو بہت رو رہا ہے۔"

ی خانے سے دُھوئیں میں لپٹی ہوئی آواز آئی۔ بے بی بے بسی سے اپنے د دیکھنے لگی اور دو عید کارڈ اُس کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے سے۔ اّبی نے کارڈ اُٹھا کر بے بی کو دئیے اُسے بہت پیار کیا اور خود جا کر گلّو بابو کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ اپنی بے بی سے باتیں کرتا اور بچّے کو ٹہلاتا رہا۔ بے بی اپنے رنگ محل میں خوش فعلیاں کرتی رہی۔ سبز گنبد، سفید مینار، سُرخ بُرجیاں، شاندار محراب، سُنہرے کلس، نیلا آسمان، روپہلا ہلال، ہرے ہرے سرو و شمشاد، لہراتی ہوئی بیلیں، رنگ برنگ کے پھول، مصافحہ کرتے ہوئے خوبصورت ہاتھ، مصری کی ڈلی کی طرح اُنگلیاں اور نہ جانے کتنی خوابناک چیزیں جو نظروں سے اوجھل تھیں، بے بی کو اپنی طرف بُلا رہی تھیں۔

وہ ایک قصباتی اسکول ماسٹر تھا۔ بیس سال کی عمر میں اُس نے اعزاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا مگر آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ زوال رسیدہ زمیندار گھرانے کا وہ چشم و چراغ تھا۔ ماں باپ بوڑھے ہو چکے تھے۔ بڑا بھائی شہر جا بسا تھا۔ وہ عدالت میں منشی ہو گیا تھا اور مشکل سے اپنے بال بچّوں کو پال رہا تھا۔ منجھلا بھائی پاکستان کو سدھارا۔ چھوٹی بہن اللہ کو پیاری ہو گئی اور بڑی کو شوہر نے اس جُرم میں طلاق دے دی کہ وہ میکے سے اس کے شایان شان جہیز نہیں لائی۔ مختصر یہ کہ چار افراد کے خاندان کا بوجھ اس کے اپنے سر آ پڑا تھا۔ اُس نے قصبے کے اسکول میں ملازمت اختیار کر لی اور سب کے پیٹ پالنے لگا۔

پندرہ سال قبل پچاس روپوں کی نوکری ایسی بُری نہ تھی۔ دن بھلے بُرے گزرتے رہے۔ ماں کے کہنے سے اُس نے پانچ سال بعد شادی کر لی۔ مشاہرہ تو دو روپے سالانہ کے حساب سے بڑھتا تھا لیکن خرچ میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ شادی کے ایک سال بعد بے بی پیدا ہوئی۔ اس کے پانچ سال بعد مُنّے اور مُنّے سے گلّو دو سال چھوٹا تھا۔ گھر میں کوئی ملازمہ نہ تھی۔ ایک تن بھرن تھی جو دو وقتہ پانی بھر جاتی تھی۔ سودا سلف وہ خود کر لیتا تھا۔ اس زمانے میں اُنسٹھ روپے کی بساط ہی کیا۔ خانہ داری کا خرچ مشکلوں سے چلتا تھا۔ موٹا جھوٹا کھانا پہننا۔ کڑی گزران تھی۔

وہ اپنے بچّوں کو بہت چاہتا تھا۔ خصوصاً بے بی پر تو جان چھڑکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی بٹیا کو شہزادیوں کی طرح رکھے۔ ٹوٹی ہوئی حویلی میں محل سرا کے خواب تو دیکھے جا سکتے ہیں، مگر خوابوں کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ بے بی گھر کے کام کاج میں امّی کی مدد کرتی تھی۔ اُسے اسکول بھیجنا بھی ناممکن تھا، وہ خود صبح شام اپنی بچّی کو پڑھاتا لکھاتا تھا۔ اُسے کہانیاں سُناتا، دنیا بھر کی باتیں کرتا، اُسی کے ساتھ بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتا اور اپنے پاس کے پلنگ پر اُسے سُلاتا۔ باپ بیٹی دونوں میں

بڑی گہری دوستی بھی ہو گئی تھی۔

بے بی نہایت ہی سادہ مزاج، نیک فطرت اور کم گو لڑکی تھی۔ اُس نے ماں باپ سے کبھی کوئی فرمائش نہ کی۔ اُس کے ابّی کے بہت سے ارمان تھے لیکن وہ کب پورے ہو سکتے تھے۔ وہ اکثر عیدوں میں بھی اپنی بیوی اور بچوں کے لیے نئے کپڑے خرید کر نہیں لا سکتا تھا۔ اُس کا دل خون ہو کر رہ جاتا جب وہ بے بی کو عید کے دن معمولی کپڑوں میں دیکھتا تو اُس کا پُرانا رفیق رُمال آنسوؤں سے بھیگ جاتا اور اُس کی عیدیں تجدیدِ غم کا عنوان بن جاتیں۔

پینتیس سال کا اسکول ماسٹر دکھوں کے بوجھ سے بہت ہی قبل از وقت بوڑھا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ اُس نے پندرہ سال مسلسل قصبے کے لڑکوں کو علم سکھایا تھا۔ یہ کم قدر دانی تھی کہ اُس کے شہروں میں ملازمت کرنے والے شاگردوں میں سے چند اُسے تہواروں میں رنگین اور رونقی عید کارڈ بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ سارے عید کارڈ وہ سنبھال کر رکھتا اور عید کی شام کو بڑے چاؤ سے بے بی کو دے دیتا۔ کئی برسوں سے وہ اسی طرح اپنی غربت کا کفّارہ ادا کر رہا تھا۔ جب وہ بے بی کو آئے ہوئے عید کارڈوں کا تحفہ دیتا تو اُسے بڑی تسکین ہوتی۔ شاید یہ رنگ برنگے کارڈ نئے رنگین کپڑوں کا بدل بن جاتے۔

بے بی عید کارڈوں کی رنگین تتلیوں سے کھیل رہی تھی اور وہ فریبِ مسرّت کھا رہا تھا۔ رنگ و نور کے غبارے اُڑ رہے تھے۔ نقش و رنگ سے مزیّن کارڈ صد رنگ پتنگ بن کر نیلے آسمان میں بلند ہونے لگتے اور بہت اونچے کھل جاتے۔ بے بی اپنے خیالی فردوس میں مگن تھی۔ اُس کے ابّی کے پتنگ کبھی کٹ کٹ کر زمین پر گر جاتے اور پھر اوپر اُڑنے لگتے۔ اُس کی بے بی خوش تو تھی، اُس کی پیاری پیاری آنکھوں میں مسرّت کی چمک تھی، محبّت کا سرور تھا۔ بے بی سالوں سال سے ان عید کارڈوں کو سنبھال سنبھال کر اپنی پٹاری میں رکھے ہوئے تھی۔ اُس کے رنگ محل کی دیواریں اونچی اٹھتی جا رہی تھیں۔ اُس کی جادو کی پٹاری کا خزانہ بھرپور ہوتا جا رہا تھا۔

چند سال اور اسی طرح گزر گئے، عیدیں آتی رہیں، گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ حقیقتیں تلخ تر ہوتی رہیں، فریبِ مسرّت کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا، مگر فریبِ نشاط کھانا بھی روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مصیبتوں کے سوا ہر شے مہنگی تھی۔

"میری بٹیا! بے بی! بے بی! بھاگ کر آؤ! دیکھو آ کر کیسے نرالے انوکھے عید کارڈ آئے ہیں...... کہاں ہو بٹیا؟ بولتیں کیوں نہیں؟ بے بی!...... بے بی!"

بے بی کوٹھری سے باہر آئی۔ بولی۔ "آ گئی ابّی" مگر اس کی آواز میں بے دلی سی تھی۔ باپ نے اس کیفیت کو محسوس کیا۔

"بے بی! کیا بات ہے بٹیا؟ بڑی اُداس معلوم ہو رہی ہو۔ یہ لو! کیسے اچھے عید کارڈ ہیں۔ لفافہ بھی رنگین اور دوہرے عید کارڈ بھی خوش رنگ۔ اور یہ دیکھو! اس کے اندر سے پیچ و خم کا گلدستہ نکلا۔ اور یہ تاج محل اور یہ قطب مینار اور مسجد۔ واہ واہ! کیا تماشہ ہے! سب سمٹتے بھی ہیں اور پھیلتے بھی ہیں۔ لو میری بے بی! یہ سب تمھارے ہیں۔ گلدستہ اور تاج محل اور قطب مینار!" وہ عید کارڈ دیتے ہوئے بولا۔

"ابّی! آپ نے کبھی نئے عید کارڈ مجھے نہیں دیے۔ یہ سب تو آپ کے نام آئے ہوئے ہیں۔ سب پر بھیجنے والوں نے کچھ لکھ رکھا ہے۔ میں بھی تو کبھی نئے عید کارڈ کسی کو بھیجتی۔" بے بی نے عید کارڈ لیتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

اُس کا دل بجھ گیا۔ وہ بے بی کو بڑی دردمندی اور غمناک محبّت کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ بے بی ماشاء اللہ تیرہ سال کی ہو گئی تھی۔ اب طفل تسلیاں ممکن نہ تھیں۔ وہ بے بی کے پُرانے کپڑوں، پریدہ رنگ عید کارڈوں اور اُس کی شادی کے ناقابلِ حصول رنگین و قیمتی جوڑوں کے بارے میں سوچتا رہا، سوچتا رہا۔



نغمۂ بیداری

ایم، اے حفیظ بنارسی

زندگی اور زندگی کے بانکپن کے گیت گا   سانبھل پر وادیِ گنگ و جمن کے گیت گا
خلد سے بھی جو حسیں ہے اُس چمن کے گیت گا   جگمگاتی جاگتی بزمِ وطن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

کرشن نے پیغام گیتا کا سُنایا جس جگہ   نانک و چشتی نے حق کا گیت گایا جس جگہ
نغمۂ ٹیگور نے جادو جگایا جس جگہ   اُس منوّر اُس مقدس انجمن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

جادۂ منزل کی، لطفِ جستجو کی بات کر   گلشنِ ہندوستاں کے رنگ و بو کی بات کر
صبحِ کاشی، حسنِ شامِ لکھنؤ کی بات کر   دہلی و پنجاب و گجرات و دکن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

سوزِ دل کی، دیدۂ پُرنم کی باتیں چھوڑ دے   عارضوں کی، کاکلِ پُرخم کی باتیں چھوڑ دے
چھوڑ دے یہ پریت اور پریتم کی باتیں چھوڑ دے   مت بلم کے گیت گا، اب مت سجن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

ساقیِ ایّام سے زندہ دلی کا جام لے   وقت جد و جہد ہے آرام کا مت نام لے
مرد ہے تو اُٹھ کے اپنے بازوؤں سے کام لے   شیشہ و ساغر نہیں دار و رسن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

رام کی دھرتی پہ اب بھی راونوں کے ہیں قدم[1]   دیش ماتا کے نین ہیں آج بھی اشکوں سے نم
جنگ کی ٹھانے ہیں اپنے جی میں یہ اہلِ ستم   دھرتی اپنی خطرے میں ہے مت گگن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

جھوم اُٹھے ہر دیش واسی، جاگ اُٹھے ہندوستاں   جو مٹا دے ظلم و استبداد کے نام و نشاں
جوش میں آجائے سُن کر، جن کو ہر پیر و جواں   ایسے قومی شاعرانِ شعلہ زن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

شمعِ آزادی ہے روشن جن سے اس طوفان میں   جو اضافہ کرتے جاتے ہیں وطن کی شان میں
سر ہتھیلی پر لیے آئے تھے جو میدان میں   اُن بہادر جاں نثارانِ وطن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

جن کا اندازِ شجاعت دہر میں مشہور ہے   یہ جبینِ وقت جن کے نور سے پُرنور ہے
لرزہ براندام جن سے دشمنِ جمہور ہے   ان دلیرانِ جوان و صف شکن کے گیت گا
گیت گانا ہے تو گا اٹُک جاگرن کے گیت گا

---

[1] چینی حکمراں اپنی جارحانہ سازشوں سے باز نہیں آتے۔ اور صرف یہی نہیں کہ انھوں نے ہندستان کا کئی ہزار مربع میل علاقہ اب تک دبائے رکھا ہے بلکہ بعض ملکوں سے ان کی سانٹھ گانٹھ کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس بند میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ٹینک

محمد اسحاق صدیقی

ٹینک ایک ایسا چلتا پھرتا فولادی قلعہ ہے جو اونچی نیچی، قطعاً ناہموار، غرض کہ ہر طرح کی زمین پر چل سکتا ہے اور خندقوں کو بھی آسانی سے پار کر سکتا ہے۔ ٹینک کی توپیں دشمن پر گولہ باری کرکے اسے تو بھاری نقصان پہنچا سکتی ہیں مگر خود ٹینک پر معمولی گولہ باری کا اثر نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسی گاڑی کے لیے جو ہر طرح کی زمین پر چل سکے، خاص طرح کے پہیوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اور گاڑیوں کے برخلاف ٹینک کے لیے خاص طرح کے پہیے بنائے جاتے ہیں اور ان پہیوں کی مدد سے ٹینک خود اپنا راستہ بچھاتا ہوا چلتا ہے۔ ٹینک کے پہیوں پر فولاد کی موٹی تختیوں کا ایک زنجیرہ (چین CHAIN) چڑھا ہوتا ہے پہیوں کے گھومنے سے چین گھومنے لگتی ہے اور ٹینک آگے بڑھتا ہے۔ یہی چین ٹینک کا بچھایا ہوا راستہ بن جاتا ہے۔ اسے "کیٹر پلر ٹریک" (CATERPILLAR TRACK) کہتے ہیں۔ اگر زمین ناہموار ہو اور اس پر مضبوط تختے بچھا دیے جائیں تو آپ اس پر کوئی بھی گاڑی چلا سکتے ہیں۔ ٹینک کی چین بھی ناہموار زمین کو ڈھکنے کے لیے تختوں کا کام کرتی ہے۔ ٹینک وہاں بھی چل سکتا ہے، جہاں مضبوط سے مضبوط ٹائروں والا ٹرک نہیں چل سکتا۔ اس لیے کہ ٹائر میں لوہے کے کیلے تاروں اور شیشے کے ٹکڑوں سے برسٹ ہو سکتا ہے۔ لیکن ٹینک ان معمولی رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ انھیں کچلتا ہوا دیو کی طرح گزر جاتا ہے۔ ٹینک پٹرول یا ڈیزل انجن کی مدد سے چلتا ہے۔ یہ انجن جتنا طاقت ور ہوتا ہے اسی قدر تیز ٹینک کی رفتار ہوتی ہے (اس طاقت کا مقابلہ "ہارس پاور" یعنی گھوڑے کی طاقت سے کیا جاتا ہے) لیکن ٹینک کی رفتار محض انجن کی طاقت پر نہیں بلکہ ٹینک کے وزن پر بھی منحصر ہے۔ ٹینک جتنا بھاری ہوتا ہے، اس کی رفتار اتنی ہی سست ہوتی ہے۔ (ٹینک کی رفتار اور دوسرے ضروری اعداد و شمار کے لیے مضمون کے آخر میں دیا ہوا نقشہ دیکھیے۔)

وزن کے لحاظ سے ٹینک تین طرح کے ہوتے ہیں: ہلکے (LIGHT) درمیانی وزن والے (MEDIUM) اور بھاری (HEAVY)۔

دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے ٹینک میں بھاری توپیں لگائی جاتی ہیں جن کے گولے کافی بڑے ہوتے ہیں۔ بھاری توپوں اور بھاری گولوں کی وجہ سے ٹینک کا وزن بہت بڑھ جاتا ہے۔ ٹینک میں ایک یا دو توپیں اور ایک سے لے کر تین تک مشین گنیں ہوتی ہیں۔ توپیں ایک چاروں طرف گھوم سکنے والی برجی (TURRET) پر لگی ہوتی ہیں تاکہ توپ ہر سمت فائر کر سکے۔ اس خیال سے کہ دشمن کی توپوں سے ٹینک کو کم سے کم نقصان پہنچے، اسے فولاد کی موٹی چادر سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ اس چادر کو اردو میں بکتر اور انگریزی میں آرمر (ARMOUR) کہتے ہیں۔

ٹینک وہی اچھا سمجھا جاتا ہے جو ہلکا ہو، تیز رفتار ہو اور اس پر سے گولہ باری کرنا آسان ہو۔ اسی لیے بھاری ٹینکوں پر ہلکے ٹینکوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بھاری ٹینکوں میں کئی نقص ہوتے ہیں۔ ان کے زمین میں دھنسنے اور دلدل میں پھنسنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ان کی رفتار سست ہوتی ہے۔ وہ آسانی سے مڑ بھی نہیں سکتے جب کہ دشمن پر وار کرنے یا دشمن کے وار سے بچنے کے لیے ٹینک کا تیزی سے مڑنا نہایت ضروری ہے۔

چھوٹے ٹینک میں دو اور بڑے ٹینک میں دس بارہ آدمی رہ سکتے ہیں۔ عموماً ایک کمانڈر، ایک ڈرائیور، ایک توپچی (GUNNER) اور ایک ریڈیو آپریٹر ہوتا ہے۔ اگر دو آدمی ہوتے ہیں تو وہ آپس میں کام بانٹ لیتے ہیں۔ دوسرے ٹینکوں کے عملے اور ہیڈکوارٹر سے بات کرنے کے لیے ہر ٹینک میں ایک وائرلیس سیٹ ہوتا ہے۔ چونکہ ٹینک ہر طرف سے بند ہوتا ہے اس لیے باہر کی چیزیں دیکھنے کے لیے ایک خاص آلہ ہوتا ہے جسے پیری اسکوپ (PERI SCOPE) کہتے ہیں۔ اس آلے کی مدد سے اندر بیٹھے بیٹھے باہر کی چیزیں صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ کل پرزوں کے چلنے سے پیدا ہونے والی گرمی کو دور کرنے اور اندر تازہ ہوا جانے کے لیے بھی سائنسی آلات کی مدد سے معقول انتظام ہوتا ہے۔ اگر یہ تدبیر نہ کی جائے تو ٹینک کے عملے کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ ٹینک میں داخل ہونے کا راستہ اوپر سے ہوتا ہے۔ اندر جانے کے بعد اسے بند کر لیا جاتا ہے۔

ٹینک کی ایجاد۔

ٹینک کی ایجاد انگلستان میں پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں ہوئی تھی جب ٹینک بننا شروع ہوئے تو اس خیال سے کہ کہیں دشمن کو پتہ نہ چل جائے، یہ مشہور کر دیا گیا کہ زخمی فوجیوں کو پانی پہنچانے کے لیے خاص طرح کی گاڑیاں بنائی جا رہی ہیں پہلے انھیں سسٹرن (CISTERN) یعنی "پانی کے خزانے" کا نام دیا گیا۔ بعد میں یہ نام بدل کر ٹینک (TANK) یعنی "تالاب" کر دیا گیا۔ یہ نام جلد ہی مقبول ہو گیا۔ اسے سب سے پہلے ستمبر ۱۹۱۵ء میں جنرل سوئنٹن (GENE-RAL SWINTON) نے استعمال کیا تھا۔

ٹینک کے پہلے ماڈل کا نام لٹل ولی (LITTLE WILLIE) تھا جس میں ۶ پونڈ وزنی گولے پھینکنے والی دو توپیں اور چار مشین گنیں تھیں۔ اس کا وزن ۲۸ ٹن تھا اور یہ ۱۰۵ ہارس پاور کے انجن کی مدد سے دو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتا تھا۔ مگر یہ ٹینک میدان جنگ میں زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ ایسے ۴۹ ٹینکوں نے ۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء کو فرانس میں دریائے سوم کی لڑائی میں حصہ لیا۔ ان میں سے بہت سے ٹینک دلدل میں پھنس گئے اور باقی خراب ہو گئے۔ صرف پانچ ٹینک لڑائی میں کام دے سکے۔ پھر بھی ان آگ اگلنے والے فولادی دیوؤں کو دیکھ کر جرمن فوج میں دہشت پھیل گئی۔

لٹل ولی کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۱۶ء سے ایک دوسرے ٹینک پر کام شروع ہوا جس کا نام بگ ولی (BIG WILLIE) رکھا گیا یہ ایک اعلیٰ درجے کا ٹینک تھا جس کی لمبائی ۲۶ فٹ، چوڑائی ۱۱ فٹ، اونچائی ۸ فٹ اور وزن ۲۸ ٹن تھا۔ اس کی چادر ½ انچ سے لے کر ½۲ انچ تک موٹی تھی۔ اس میں ۶ پونڈ وزنی گولے پھینکنے والی دو توپیں اور دو مشین گنیں تھیں۔ اس میں دس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ یہ ۱۰ فٹ چوڑی خندق اور ½۴ فٹ اونچی رکاوٹ پار کر سکتا تھا۔ اس کی رفتار پونے چار میل فی گھنٹہ تھی۔

انگلستان میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء تک تقریباً ۲۰۰ ٹینک بنائے گئے۔ یہ ٹینک مختلف نمونوں کے تھے۔ ہر نمونہ ایک کوڈ نمبر سے موسوم تھا جیسے مارک[۱]، مارک ۲ وغیرہ۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان میں سے بعض ٹینک "نر" سمجھے جاتے تھے بعض مادہ اور بعض دونوں۔ اگر ٹینک میں دو توپیں اور چار مشین گنیں ہوتیں اسے "نر" (MALE) کہتے۔ اگر صرف چھ مشین گنیں (توپ کوئی نہیں) ہوتیں تو مادہ (FEMALE) اور اگر ایک توپ اور پانچ مشین گنیں ہوتیں تو نر مادہ دونوں۔ (HLRAMAPHRODITE)۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی نے ٹینک بنانے کی طرف توجہ نہ کی۔ زیادہ تر انگریزوں کے بنائے ہوئے ٹینک ہتھیا لیے بعد میں ان کی مشینری کو سمجھا اور خود بھی ٹینک بنانے لگے۔ جرمنی کے بعد بالترتیب روس اور امریکا نے ٹینک بنانا شروع کیے۔ فرانس نے جرمنی سے پہلے ٹینک سازی کی طرف توجہ کی تھی۔ چنانچہ ۱۸ جولائی ۱۹۱۸ء کو ۴۷۵ فرانسیسی ٹینکوں نے لڑائی میں حصہ لیا۔ جن میں سے ۲۵۵ رینالٹ (RE-NAULT) نامی تھے (اس ٹینک کے بارے میں ضروری معلومات مضمون کے آخر میں دیئے ہوئے نقشے میں دیکھیے۔ اس نقشے کے دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کون کون سے ٹینکوں نے حصہ لیا اور ان کی کیا خصوصیات تھیں۔)

دوسری جنگ عظیم میں۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ نے تقریباً ۲۴۰۰۰ ٹینک خود بنائے، ۲۵۶۰۰ ٹینک امریکا سے اور ۳۶۰۰ ٹینک کناڈا سے حاصل کیے، جبکہ جرمنی نے تنہا ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء کے درمیان ۲۴۰۰۰ ٹینک بنائے۔ روس کے پاس ۱۹۳۹ء میں ۲۱۰۰۰ ٹینک تھے، فرانس کے پاس ۳۵۰۰ اور جرمنی کے پاس ۲۸۰۰۔ جرمنی نے ۱۹۴۱ء میں روس پر ۲۰۰۰ ٹینکوں سے حملہ کیا اور اپنی جنگی چالوں سے روس کو بھاری نقصان پہنچایا۔ پہلے تین مہینوں میں دس کے تقریباً ۷۰۰۰ ٹینک برباد ہوئے جب کہ جرمنی کے صرف ۵۰۰ ضائع ہوئے۔

---

[۱] یہ لٹل ولی کا نمبر تھا۔

اپنے نقصان کی تلافی کرنے کے لیے روس نے کافی ٹینک بنا ڈالے۔ دوسری جنگ عظیم میں روس کے بنائے ہوئے کل ٹینکوں کی تعداد تقریباً ۴۰۰۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طویل اور بڑے پیمانے کی جنگ میں کتنے زیادہ ٹینکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی نے کافی بھاری ٹینک استعمال کیے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران تیار ہونے والا سب سے بھاری ٹینک جرمنی کا ماس (MAUS) ٹینک تھا جس کا وزن ۱۸۰ ٹن تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اسے میدان جنگ میں اتارا جاتا جرمنی کو شکست ہو گئی۔

جرمنی کا سب سے بھاری ٹینک جسے لڑائی میں استعمال کیا گیا ٹائگر ماڈل بی (TIGER MODEL B) یا رائل ٹائگر (ROYAL TIGER) تھا۔ اس کا وزن ۶۷ ٹن اور اس کی توپ کا دہانہ ۸۸ ملی میٹر تھا۔ وہ ۷۰۰ ہارس پاور کے انجن سے چلتا تھا۔[1] فرانس کا چار تھری سی (CHAR 3 C) ٹینک اس سے بھی بھاری تھا۔ اسے ۱۹۲۰ء میں استعمال کیا گیا۔ اس کا وزن ۷۰ ٹن تھا۔ اس میں ۱۳ آدمی بیٹھتے تھے۔ اس کے توپ کے دہانے کی ناپ ۱۵۵ ملی میٹر تھی۔ اس میں ۲۵۰ ہارس پاور کے دو انجن تھے جن کی مدد سے یہ ۸ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتا تھا۔

سب سے بھاری برٹش ٹینک جسے اب تک بنایا گیا ہے ٹارٹائز (TORTOISE) ٹینک ہے جس کا وزن ۷۶ ٹن ہوتا ہے۔ اس میں سات آدمی رہتے ہیں اور یہ ۱۲ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتا ہے۔

ہندستان ــ پاکستان جنگ

ہندستان اور پاکستان کی حالیہ جنگ (ستمبر ۱۹۶۵ء) میں چھمب اور سیالکوٹ کے منطقوں میں ہمارے جوانوں نے پاکستان کے سینکڑوں ٹینک یا تو تباہ کر دیے یا ناکارہ بنا دیے یا ان پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے تقریباً ایک سو ٹینک ضایع ہوئے جبکہ پاکستان کو تقریباً ۵۰۰ ٹینکوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان میں سے زیادہ تر ٹینک انگلستان اور امریکا کے بنے ہوئے تھے۔ ذیل کی سطروں میں ان مشہور ٹینکوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔

(۱) شرمن ٹینک

یہ امریکا کا اوسط وزن والا ٹینک ہے جو امریکا کے ایک جنرل، جنرل شرمن (GENERAL SHERMAN) کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا وزن ۳۰ ٹن ہوتا ہے۔ بکتر کی موٹائی ۷۶ ملی میٹر (تقریباً ۳ انچ) ہوتی ہے۔ اس کی توپ کا دہانہ ۷۵ ملی میٹر کا ہوتا ہے۔ اس میں دو مشین گنیں ہوتی ہیں۔ ٹینک میں پانچ آدمی رہتے ہیں اور ۴۰۰ ہارس پاور کے انجن کی مدد سے یہ ۲۴ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے خلاف سب سے زیادہ یہی ٹینک استعمال کیے گئے تھے۔ پاکستان اور ہندستان کی حالیہ جنگ میں دونوں کے پاس یہ ٹینک کافی تعداد میں موجود تھے۔

(۲) پیٹن ٹینک۔

یہ امریکا کا بھاری ٹینک ہے جو جنرل پیٹن (GENERAL PATTON) کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا وزن ۴۹ ٹن ہوتا ہے۔ اس میں ۹۰ ملی میٹر کے دہانے کی ایک توپ اور تین مشین گنیں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ اس ٹینک پر پونے تیرہ ملی میٹر دہانے والی ایک طیارہ شکن توپ بھی چڑھائی جا سکتی ہے۔ چار آدمیوں کا عملہ ہوتا ہے۔ ۸۱۰ ہارس پاور کے انجن کی مدد سے یہ ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے۔

پاکستان نے یہ ٹینک کافی تعداد میں امریکا سے حاصل کر لیے تھے ہمارے پاس نہیں تھے۔ یہ ٹینک کوریا کی لڑائی (۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۳ء) میں بڑا کامیاب ثابت ہوا تھا اسی لیے امریکا کو اپنے اس ٹینک پر بڑا ناز تھا۔ اسے وہ ناقابل تسخیر چلتا پھرتا قلعہ کہتے تھے۔ لیکن ہمارے جوانوں نے کافی پیٹن ٹینک برباد کر دیے اور بہتوں پر قبضہ کر لیا۔ ماہرین جنگ کا کہنا ہے کہ پاکستان کی شکست کا خاص سبب یہ تھا کہ ان کے جوان امریکا کے اس پیچیدہ ٹینک کو چلانے کی پوری مہارت نہ رکھتے تھے جبکہ ہمارے جوانوں کی تربیت اعلیٰ درجے کی تھی۔

(۳) سنچورین ٹینک (CENTURIAN TANK)

یہ برٹش ٹینک ۱۹۴۹ء کا ماڈل ہے۔ اس کا وزن ۵۰ ٹن ہوتا ہے۔ اس میں ۸۳ ملی میٹر کے دہانے کی ایک توپ اور دو مشین گنیں ہوتی ہیں۔ ۶۰۰ ہارس پاور کا انجن ہوتا ہے۔ ہموار زمین پر اس کی رفتار ۲۲ میل فی گھنٹہ ہوتی

---

[1] ۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو ماسکو کی سالانہ فوجی پریڈ میں ایک ٹینک کا مظاہرہ کیا گیا تھا جو غالباً رائل ٹائگر سے بھاری تھا۔ وہ روس کے بھاری ٹینک اسٹیلن سوم (STALIN III) سے یقیناً بھاری تھا جس کا وزن ۵۶ ٹن ہوتا ہے اور جس میں ۱۲۲ ملی میٹر کے دہانے والی توپ لگی ہوتی ہے۔

ہے۔ اس کا عملہ چار آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ٹینک بھی کوریا کی لڑائی میں بڑا کامیاب ثابت ہوا تھا۔ جب پاکستان سے جنگ ہوئی تو یہ ٹینک ہمارے پاس کافی تعداد میں موجود تھے۔ لڑائی کے میدان میں یہ ٹینک امریکا کے پیٹن ٹینک سے بہتر ثابت ہوئے۔

چند نئے ٹینک

چند نئے ٹینک جن کا ہند پاکستان کی جنگ سے کوئی تعلق نہیں، یہ ہیں:

برطانیہ کا چیفٹین (CHIEFTAIN) ٹینک۔ اس کا وزن ۵۱ ٹن ہوتا ہے۔ اس میں ۱۲۰ ملی میٹر کے دہانے کی توپ ہوتی ہے۔ یہ ڈیزل انجن سے چلتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء سے فوج کے استعمال میں ہے۔

روس کا ٹی ۵۴ (T-54) ٹینک جس کا وزن ۴۳ ٹن ہوتا ہے۔ اس میں ۱۰۰ ملی میٹر کے دہانے کی توپ ہوتی ہے۔ یہ بھی ڈیزل انجن سے چلتا ہے اور ۳۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے ایک بار میں ۲۵۰ میل تک جا سکتا ہے۔ امریکی ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ٹینک ان کے پیٹن ٹینک سے بہتر ہے۔ چونکہ یہ ٹینک کافی بھاری ہوتا ہے لہٰذا خود روس ایک تیز رفتار ہلکا (۳۰ ٹن وزنی) ٹینک بنانے کی فکر میں ہے۔ روس کا جدید ٹینک ٹی ۶۲ (T-62) ہے جس کی توپ کا دہانہ ۱۱۵ ملی میٹر ہوتا ہے۔ چین نے اپنے ایک ٹینک کا نام ٹی ۵۹ (T-59) رکھا ہے۔

امریکا کا جدید ٹینک ایم ۶۰ (M-60) اور مغربی جرمنی کا لیوپرڈ (LEOPARD) ہے۔ ان دونوں میں ۱۰۵ ملی میٹر کے دہانے کی توپیں ہوتی ہیں۔ فرانس کا ایک ہلکا پھلکا ٹینک اے ایم ایکس ۳۰ (AMX 30) ہے جس کا وزن صرف ۳۲ ٹن ہوتا ہے۔ موجودہ ٹینکوں میں یہ سب سے ہلکا ہے۔

ہندستان میں بننے والا پہلا ٹینک اوادی (مدراس) کے کارخانے سے ۲۹ دسمبر ۱۹۶۵ء کو برآمد ہوا۔ عام طور پر تیاری کا خاکہ بننے اور ٹینک کی مکمل تیاری میں پانچ سے لے کر سات سال تک کا عرصہ لگتا ہے لیکن ہمارے انجنیروں نے یہ کارنامہ ۳½ سال میں انجام دیا۔

ٹینک بعض ضروریات کو پیش نظر رکھ کر بھی بنائے جاتے ہیں۔ بعض اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ہوائی جہازوں کے ذریعے ڈھوئے جا سکتے ہیں۔ کچھ "جل تھلے" (AMPHIBIOUS) ہوتے ہیں یعنی خشکی پر اور پانی میں دونوں جگہ چل سکتے ہیں۔ ان میں تو بے لگے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ دریا تیر کر پار کر سکتے ہیں۔ خشکی پر چلانے کے لیے اس کے تو بے ہٹا دیے جاتے ہیں۔

بعض ٹینک اپنے ساتھ لکڑی کے لٹھے لے جاتے ہیں۔ ان سے وہ بڑی خندقوں کو پاٹ دیتے ہیں۔ پھر ان لٹھوں پر بکتر بند بل ڈوزر مٹی کر پیٹتے ہیں۔ اس طرح دوسرے وزنی اور بڑے ٹینکوں کے لیے راستہ بن جاتا ہے۔

بعض ٹینک اپنے ساتھ ناریل کی مضبوط چٹائیاں لے جاتے ہیں جن میں تار پھیے ہوتے ہیں۔ یہ ٹینک دلدلی زمین پر چٹائی بچھاتے جاتے ہیں۔ اس چٹائی پر سے ہو کر بڑے اور وزنی ٹینک اور دوسری گاڑیاں گزر جاتی ہیں۔ بعض ٹینک اپنے ساتھ ٹوٹ کے پل لے جاتے ہیں، جن کی مدد سے چھوٹے دریا پار کیے جا سکتے ہیں۔

ٹینک شکن ہتھیار

ٹینک کی موٹی فولادی چادر پر معمولی گولوں اور توپوں کی مار کارگر نہیں ہو سکتی اور جب تک یہ چادر پھٹ نہ جائے ٹینک اپنی تباہ کاریاں پھیلاتا رہے گا۔ اس کے لیے ایسے طاقت ور گولوں اور بموں کی ضرورت ہوتی ہے جو ٹینک کی فولادی چادر کو پھاڑ کر اس کی اندرونی مشینری کو نقصان پہنچائیں۔ توپیں بھی ایسی ہوں جن کی مار بڑی موثر ہو اور جو کافی دور سے گولہ باری کر سکیں۔ چنانچہ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاص طرح کے گولے، بم، توپیں اور دوسرے ہتھیار تیار کیے گئے۔ ان ہتھیاروں کو ٹینک شکن ہتھیار (ANTI TANK WEAPONS) کہتے ہیں۔

ٹینک شکن توپوں کے سلسلے میں سب سے پہلے "بے دھچکے کی توپ" (RECOILLESS GUN) کا ذکر ضروری ہے۔ یہ توپ ۶۰۰ گز کی دوری سے ٹینک پر مار کر سکتی ہے۔ ایسی ہی ایک توپ سے فخر ہندستان حولدار عبدالحمید نے قصور کے علاقے میں دو پاکستانی ٹینک تباہ کر دیے تھے، تیسرے کو نقصان پہنچایا تھا جو تھے کو نشانہ بنانے والے تھے کہ خود اس کے گولے کا نشانہ بن گئے۔ (یہ ستمبر ۱۹۶۵ء کا واقعہ ہے)۔ اس غیر معمولی بہادری نے انھیں امر بنا دیا اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے انھیں فوج کا سب سے بڑا اعزاز یعنی پرم ویر چکر دیا گیا۔

ٹینکوں کو توڑنے کے لیے امریکا نے ایک خاص توپ ایجاد کی جسے بازوکا (BAZOOKA) کہتے ہیں۔ اسے دوسری جنگ عظیم میں جرمن ٹینکوں کے خلاف بعد ازاں کوریا کی جنگ میں استعمال کیا گیا۔ اس توپ کا گولہ راکٹ کے اصول پر چلتا ہے۔ اس کا ٹیوب جو دھات کا بنا ہوتا ہے تقریباً دو گز لمبا ہوتا ہے جسے کندھے پر رکھ کر چلانے کے لیے کھٹکا دبانا ہوتا ہے۔ اسے دو آدمی مل کر چلاتے

ہیں۔ ایک آدمی اسے بھرتا ہے اور نشانہ لگاتا ہے اور دوسرا اسے کندھے پر رکھتا ہے اور چلانے کے لیے کھٹکا دباتا ہے۔ اس کے گولے کا قطر ۲½ انچ اور لمبائی دو فٹ ہوتی ہے۔ یہ گولہ ٹینک سے ۲۵۰۰ فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے جا کر ٹکراتا ہے اور اس میں چھید کر دیتا ہے۔

عام طور پر ٹینکوں کو ہوائی جہازوں کی مدد سے تباہ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ٹینکوں میں ہوائی جہازوں کو گرانے کے لیے طیارہ شکن توپیں (ANTI AIRCRAFT GNUS) لگا دی جاتی ہیں۔ ٹینکوں کو ہری بھری شاخوں سے ڈھانک لیتے ہیں تاکہ وہ آسانی سے نظر نہ آسکیں۔ ان کی حفاظت کے لیے اکثر جنگی ہوائی جہازوں کا ایک دستہ بھی ساتھ رہتا ہے جن کے سائے میں ٹینک آگے بڑھتے ہیں۔ یہ ہوائی جہاز دشمن کے جہازوں کو ٹینک کے پاس نہیں آنے دیتے۔ اگر وہ قریب آتے ہیں تو انھیں مار بھگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمن ٹینکوں کو توڑنے کے لیے روسیوں نے خاص طرح کے بم استعمال کیے تھے۔ جنھیں وہ الٹے بم (UPSIDE DOWN BOMBS) کہتے تھے۔ دیکھنے میں یہ معمولی بموں جیسے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے پچھلے حصے کی بناوٹ راکٹ جیسی تھی۔ یہ بم ہوائی جہاز اپنے بازوؤں کے نیچے لے جاتے تھے۔ جہاز ٹینک پر ۵۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے غوطہ مارتا۔ اس رفتار اور زمین کی کشش کی وجہ سے بم کی طاقت دگنی ہو جاتی۔ وہ ٹینک کی چھت کو چھید کر اندر گھس جاتا اور اندر جا کر پھٹ جاتا۔

ٹینک کو برباد کرنے کے لیے سرنگیں بھی بچھائی جاتی ہیں۔ جب ٹینک کسی سرنگ پر سے گزرتا ہے تو وہ اڑ جاتی ہے جس سے ٹینک کو بھاری نقصان پہنچتا ہے۔ ان سرنگوں سے بچنے کے لیے بعض ٹینکوں کے سامنے زنجیروں والا رولر لگا یا جاتا ہے، جسے فلیل (FLAIL) کہتے ہیں۔ یہ رولر ٹینک کے سامنے کی زمین کو پیٹتا ہوا چلتا ہے تاکہ اگر کوئی سرنگ بچھی ہو تو پھٹ جائے اور ٹینک بلا کھٹکے آگے بڑھ سکیں۔

ٹینک کے خلاف ایک نیا ہتھیار ٹینک شکن مزائلس (ANTI — TANK MISSILES) ہیں۔ مزائل اس ہتھیار کو کہتے ہیں جسے پھینک کر مارا جائے۔ ٹینک توڑ مزائلوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں: ہلکی (۲۵ پونڈ تک وزنی) اوسط وزن والی (۵۰ پونڈ تک وزنی) اور بھاری (۵۰ پونڈ سے زیادہ وزنی)۔ یہ سب ٹھوس ایندھن سے چلنے والے راکٹ ہوتے ہیں جن کے اگلے حصہ میں بم رہتا ہے۔ عموماً ان کی دم سے چھوٹنے کے بعد ایک تار بل کھاتا ہوا نکلتا ہے، جس پر برقی اشارے بھیج کر مزائل کا راستہ درست کیا جاتا ہے۔ مزائلوں کے ذریعے ٹینک ہی نہیں بلکہ ریل گاڑیاں، بکتر بند گاڑیاں، قلعے اور دشمن کے توپ خانے کو بھی تباہ کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ٹینک میں بیٹھ کر یا جیپ پر سوار ہو کر ہاتھ سے پھینکا جا سکتا ہے۔ ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز سے بھی مزائل گرائے جا سکتے ہیں۔

فرانس کی ایجاد کردہ مزائل نارڈ ایس ایس ۱۰ (NORD SS.10)۔ ۱۶۰۰ گز تک مار کرتی ہے اور نارڈ ایس ایس ۱۱ (NORD SS-11) ۳۸۰۰ گز تک۔ یہ دونوں مزائلیں موجودہ ٹینکوں میں سے ہر ایک کو بے کار کرنے کے قابل ہیں۔

مغربی جرمنی کی ایجاد کردہ ٹینک شکن مزائل کوبرا (COBRA) ۱۸۰۰ گز تک مار کرتی ہے۔ اس کی لمبائی ۳۲ انچ، قطر ۴ انچ اور وزن ۲۲½ پونڈ ہوتا ہے۔

امریکی مزائل ڈارٹ (DART) ۲۰۰۰ گز سے کچھ زیادہ دور تک مار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکا نے سال گزشتہ ایک خود کار ٹینک شکن مزائل بھی ایجاد کی ہے جو ایک میل فاصلے سے ٹینک کے برابر کسی بھی چیز کو خود ہی نشانہ لے کر مار سکتی ہے۔ توپچی کو صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ لگی ہوئی دوربین پر نشانے کو دیکھے اور نشانے کو دوربین میں لگے ہوئے تاروں پر رکھے۔ اس کو نہ فاصلے کا اندازہ کرنا ہے نہ زاویہ کا، نہ مزائل کی رفتار کا۔ اس مزائل کو سپاہی لے کر چل سکتے ہیں اور اس کو ایک تپائی پر رکھ کر داغ سکتے ہیں۔ اسے بکتر بند گاڑیوں یا دوسری گاڑیوں پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ٹینک شکن مزائلوں کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے اور جلد ہی انھیں زیادہ تعداد میں بنایا جانے لگے گا۔

مزائلوں کی ایجاد نے ٹینک کے مستقبل کو تاریک بنا دیا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ جنگوں میں ان کا استعمال جاری رہے گا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں مزائل سے بچنے کے لیے تبدیلیاں کی جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مستقبل میں ایسے ٹینک بنائے جائیں جو ایٹمی قوت سے چلیں، انھیں ریڈیو کے ذریعے کنٹرول کیا جائے یعنی انھیں انسان نہ چلائیں بلکہ وہ ریڈیائی اشاروں پر چلیں، ان میں برقی دماغ لگائے جائیں جو خود ہی میدان جنگ کے بارے میں معلومات فراہم کریں، فیصلہ کریں اور موقع محل کا لحاظ کرتے ہوئے دشمن سے جنگ کریں۔

ٹینک — سنہ۱۹۱۶ء سے سنہ۱۹۵ء تک

(اس نقشے میں اُن تمام ٹینکوں کے نام اور دوسری تفصیلات دی گئی ہیں جو سنہ۱۹۱۶ء سے لے کر اب تک تیار کیے گئے ہیں۔)

ٹینک کا نام	زمانۂ تعمیر	قومیت	وزن ٹن	عملہ	توپوں کی تعداد	دہانے کی ناپ ملی میٹر	گولہ نکلنے کی رفتار فٹ فی سکنڈ	مشین گنوں کی تعداد	بکتر کی موٹائی ملی میٹر	انجن کی قوت ہارس پاور	رفتار میل فی گھنٹہ
ٹینک جو سنہ۱۹۱۴ء سے سنہ۱۹۱۸ء تک کی جنگِ عظیم میں استعمال ہوئے											
مارک ۴	سنہ۱۹۱۶ء	برٹش	۲۸	۸	۲	۵۷	۱۳۵۰	۴	۱۲	۱۲۵	۴
رینالٹ	سنہ۱۹۱۶ء	فرینچ	۶¾	۲	۱	۳۷	۱۳۲۰	..	۱۶	۳۹	۵
مارک ۵	سنہ۱۹۱۷ء	برٹش	۲۹	۸	۲	۵۰	۱۳۵۰	۴	۱۴	۱۵۰	۴½
میڈیم اے	سنہ۱۹۱۷ء	برٹش	۱۴	۳	..	..	..	۴	۱۴	۹۰	۸
سنہ۱۹۲۰ء سے سنہ۱۹۳۳ء تک کے ٹینک جو لڑائی میں استعمال نہیں کیے گئے											
وکرس میڈیم	سنہ۱۹۲۳ء	برٹش	۱۲	۵	۱	۴۷	۱۷۵۰	۴	۱۲	۹۰	۲۰
انڈیپنڈنٹ	سنہ۱۹۲۶ء	برٹش	۳۲	۹	۱	۴۷	۱۸۵۰	۴	۱۴	۳۵	۱۷
وکرس	سنہ۱۹۲۹ء	برٹش	۱۸	۴	۱	۴۷	۱۸۵۰	۳	۲۰	۱۸۰	۳۰
کرسٹی ایم	سنہ۱۹۳۱ء	امریکی	۱۰½	۲	۱	۳۷	۱۵۲۵	۱	۶۰	۳۰۰	۴۰
ٹینک جو سنہ۱۹۳۹ء سے سنہ۱۹۴۵ء تک کی جنگِ عظیم میں استعمال ہوئے											
وکرس لائٹ	سنہ۱۹۳۵ء	برٹش	۵½	۳	..	..	..	۲	۱۲	۸۸	۳۵
چار بی	سنہ۱۹۳۶ء	فرینچ	۳۱	۴	۱ ۱	۷۵ ۴۷	۱۲۰۰ ۱۵۷۰	۲	۶۰	۲۷۰	۱۷
پینزر کیمف واگین ۳	سنہ۱۹۳۶ء	جرمن	۲۲	۵	۱	۵۰	۲۰۰۰	۲	۶۰	۳۰۰	۳۰
پینزر کیمف واگین ۴	سنہ۱۹۳۶ء	جرمن	۲۳	۵	۱	۷۵	۱۲۶۰	۲	۶۵	۳۰۰	۲۵
مے ٹلڈا۔۱	سنہ۱۹۳۶ء	برٹش	۱۱	۲	..		.	۱	۲۵	۷۰	۷
کروزر مارک ۱	سنہ۱۹۳۸ء	برٹش	۱۲¾	۶	۱	۴۰	۲۶۵۰	۳	۱۴	۱۵۰	۱۸
ٹی ۳۴	سنہ۱۹۳۹ء	روسی	۲۶¾	۴	۱	۷۶.۲	۲۲۰۰	۲	۶۵	۵۰۰	۳۲
مے ٹلڈا۔۲	سنہ۱۹۳۹ء	برٹش	۲۵	۴	۱	۴۰	۲۶۵۰	۱	۷۵	۱۹۰	۱۵
کروزر مارک ۳	سنہ۱۹۳۹ء	برٹش	۱۴	۴	۱	۴۰	۲۶۵۰	۱	۱۴	۳۴۰	۴۰
ویلنٹائن ۱	سنہ۱۹۴۰ء	برٹش	۱۶	۳	۱	۴۰	۲۶۵۰	۱	۶۵	۱۵۰	۱۶
جنرل لی	سنہ۱۹۴۰ء	امریکی	۲۶¾	۷	۱ ۱	۷۵ ۳۷	۱۹۳۰ ۲۹۰۰	۴	۵۷	۳۲۵	۲۰
جنرل اسٹورٹ	سنہ۱۹۴۱ء	امریکی	۱۲¾	۴	۱	۳۷	۲۹۰۰	۲	۳۸	۲۵۰	۳۱
چرچیل۔۱	سنہ۱۹۴۱ء	برٹش	۴۰	۵	۱ ۱	۴۰ ۷۶.۲	۲۶۵۰ ۹۰۰	۱	۱۰۲	۳۴۰	۱۸
کروسیڈر۔۳	سنہ۱۹۴۱ء	برٹش	۱۸	۵	۱	۵۷	۲۷۲۵	۱	۵۱	۳۴۰	۲۷

ٹینک کا نام	زمانۂ تعمیر	قومیت	وزن ٹن	عملہ	توپوں کی تعداد	دہانے کی ناپ ملی میٹر	گولہ نکلنے کی رفتار فٹ فی سکنڈ	مشین گنوں کی تعداد	بکتر کی موٹائی ملی میٹر	انجن کی قوت ہارس پاور	رفتار میل فی گھنٹہ
ٹائیگر ماڈل ای	۱۹۴۱ء	جرمن	۵۶	۵	۱	۸۸	۲۶۰۰	۲	۱۱۰	۶۰۰	۲۵
جنرل شرمن	۱۹۴۲ء	امریکی	۳۰	۵	۱	۷۵	۲۰۳۰	۲	۷۶	۴۰۰	۲۴
کرامویل	۱۹۴۲ء	برٹش	۲۸	۵	۱	۷۵	۲۰۳۰	۲	۱۰۲	۶۰۰	۳۲
پینتھر	۱۹۴۲ء	جرمن	۴۴½	۵	۱	۷۵	۳۰۷۰	۱	۱۸۵	۷۰۰	۳۰
چیلینجر	۱۹۴۳ء	برٹش	۳۲½	۵	۱	۷۶.۲	۲۹۰۰	۱	۸۹	۶۰۰	۳۲
ٹائیگر ماڈل بی	۱۹۴۳ء	جرمن	۶۷	۵	۱	۸۸	۳۳۴۰	۲	۲۰۰	۷۰۰	۲۵
کامیٹ	۱۹۴۴ء	برٹش	۳۲¾	۵	۱	۷۶.۲	۲۵۷۵	۲	۱۰۲	۶۰۰	۳۲
دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے ٹینک											
سنچورین	۱۹۴۹ء	برٹش	۴۹	۴	۱	۸۳	..	۲	..	۶۰۰	۲۲
مارک ۴۶[1]	۱۹۴۹ء	امریکی	۴۳	۵	۱	۹۰	..	۳	..	۸۱۰	۳۰
مارک ۴۷	۱۹۵۰ء	امریکی	۴۳	۵	۱	۹۰	..	۳	.	۸۱۰	۲۷
مارک ۴۸	۱۹۵۰ء	امریکی	۴۸	۴	۱	۹۰	..	۳	..	۸۱۰	۳۰

لہ مارک ۴۸-۴۶ پیٹن ٹینک کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔

نوابِ تفضّل حسین خاں بنگش والی فرخ آباد

(بہ سلسلۂ صفحہ ۱۹)

نواب تفضل حسین خاں پر ایک اسپشل کمشنر کے سامنے مختلف الزامات میں مقدمہ چلا۔ خاص الزام یہ تھا کہ انھوں نے بغاوت اور انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کی، لوگوں کو اشتعال دلایا اور ان کی قیادت کی۔ انھیں سزائے موت اور ان کی تمام املاک و جائیداد کی ضبطی کی سزا دی گئی۔ مگر مقدمے کے دوران پتہ چلا کہ میجر بیروؔ نے جو کمانڈر انچیف کے کیمپ میں اسپشل کمشنر تھے، نواب تفضل حسین خاں کو ایک خط کے ذریعے خود کو انگریزوں کے سپرد کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس خط میں نواب کو میجر بیروؔ نے مطلع کیا تھا کہ جن لوگوں نے ذاتی طور پر انگریزوں کے قتل میں حصہ نہیں لیا انھیں معافی دی جا رہی ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اگر نواب صاحب نے ذاتی طور پر کسی انگریز کو قتل نہیں کیا تو وہ کسی اندیشے کے بغیر خود کو حکومت کے ذمے داروں کے حوالے کر سکتے ہیں۔ حکومت نے میجر بیروؔ کے اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی مذمت کی مگر اسی خط کی بنا پر نواب تفضل حسین خاں کو پھانسی نہیں دی گئی۔ البتہ یہ شرط رکھی گئی کہ نواب صاحب فوری طور پر انگریزی علاقے سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں چنانچہ انھیں عدن لے جایا گیا جہاں سے سرحد پار کرا کے مکۂ معظمہ پہنچا دیا گیا۔

بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں حج کے دوران مکۂ معظمہ میں ان سے ملے تھے اور ان کے بہ قول یہ فقیری لباس میں مست تھے۔ آخر اسی مقدس سرزمین پر ۱۹ر فروری سنہ ۱۸۸۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح آزادیٔ وطن کا یہ شیدائی وطن سے دور عالمِ غربت میں ابدی نیند سو گیا۔

غزل

فنا نظامی

وہ خانماں خراب نہ کیوں در بدر پھرے
جس سے تری نگاہ ملے یا نظر پھرے

رفتارِ یار کا اگر انداز بھول جائے
گلشن میں خاک اڑاتی نسیمِ سحر پھرے

ترکِ وطن کے بعد ہی قدرِ وطن ہوئی
برسوں مری نگاہ میں دیوار و در پھرے

رہ جائے چند روز جو بیمارِ غم کے پاس
خود اپنا دل دبائے ہوئے چارہ گر پھرے

ساقی کو بھی سکھاتے ہیں آدابِ مے کشی
ملتے ہیں مے کدے میں کچھ ایسے بھی سر پھرے

چاہے فریب ہو مگر ایسا جواب دے
مجھ کو تلاش کرتا ہوا نامہ بر پھرے

کوئی ملا ہمیں نہ خریدارِ اشکِ[1] غم
ہم اپنے ساتھ لے کے دکانِ گہر پھرے

یوں ہے رواں دواں مری دیوانگی کی بات
اڑتی ہوئی بہار کی جیسے خبر پھرے

میں اپنا رقصِ جام تجھے بھی دکھاؤں گا
اے گردشِ زمانہ! مرے دن اگر پھرے

میری نگاہ میں تو غزل ہے وہی غزل
جس کی رگوں میں دوڑتا خونِ جگر پھرے

قیدِ غمِ حیات بھی کیا چیز ہے فنا
راہِ فرار مل نہ سکی عمر بھر پھرے

---

[1] استادی حضرت جگر مراد آبادی

ترانۂ شاعر

سیفی الاعظمی

فردوسِ ایشیا ہے ہندوستاں ہمارا — ہر گوشۂ وطن ہے جنت نشاں ہمارا
ہم حامیِ اہنسا، ہیں آشتی کے بانی — ہے عدل کی نشانی قومی نشاں ہمارا
ہم امن کے نگہباں، انسانیت کے شیدا — یہ جذبۂ شرافت ہے پاسباں ہمارا
ہم ہیں وطن کے شاعر، سیف و قلم کے ماہر — ہر فرد ہے مجاہد اور نکتہ داں ہمارا
گنگ و جمن ہمارے، کوہ و دمن ہمارے — یہ سرزمیں ہماری، یہ آسماں ہمارا
ہم شوکتِ معابد، ہم عظمتِ مساجد — رفعت نشاں ہمالہ افسانہ خواں ہمارا
دھرتی کا ذرہ ذرہ زیرِ نگیں ہمارے — بھارت وطن ہے لیکن سارا جہاں ہمارا
ہم بھیم کے سپوت اور ارجن کے نام لیوا — صد شانِ غزنوی ہے عزمِ جواں ہمارا
فاروقیت کے حامل، کراریت میں کامل — کیسے نہ ہو زمانہ پھر قدر داں ہمارا
اس آستاں پہ جھک کر، ملتی ہے سربلندی — میزانِ حق و باطل ہے آستاں ہمارا
ٹیپو کی شان ہیں ہم، بابر کی آن ہیں ہم — ہے جذبۂ شجاعت آرامِ جاں ہمارا
سو پیار سے بھرا دل پہلو میں ہے ہمارے — راہِ وفا کا رہرو، ہے کارواں ہمارا
خودداریاں ہماری فطرت کا بانکپن ہیں — نازک سا حوصلہ بھی کوہِ گراں ہمارا
ہم نازِ آتش و نم، ہم رشکِ لالہ و گل — ہے رودکش بہاراں قلبِ تپاں ہمارا
ہم خوگرِ تحمل، جیسے سکوتِ ساحل — بپھرا تو پھر ہے طوفاں خلبِ نہاں ہمارا
تاریخ کی روانی، لکھتی گئی کہانی — بنتا رہا فسانہ یوں جاوداں ہمارا

فکر و عمل کا دریا، اب موج زن ہے سیفی
روکے نہ رک سکے گا سیلِ رواں ہمارا

(افسانہ)

ٹارگٹ

آمنہ ابوالحسن

میں ایک ٹارگٹ ہوں۔ ابد کی دیوار پر ازل سے لٹکا ہوا۔ میں نے ہمیشہ چوٹ برداشت کی ہے۔ گھاؤ اپنے سینے میں چھپائے ہیں اور ہمیشہ مسکراتا رہا ہوں۔ کیونکہ مسکراہٹ میں طاقت ہوتی ہے کشش اور حوصلہ۔

پہلے میں ایک بچی تھی —

جب میں بچی تھی تو بڑی شریر تھی۔ میرا سارا دن مٹی سے کھیلتے اور نل کے نیچے پانی میں بھیگتے گذر جاتا تھا۔ ان دو باتوں کی وجہ سے میں ہمیشہ اپنے بزرگوں سے مار کھاتی رہی۔ مگر اپنی عادتوں سے باز نہ آئی کیونکہ انھیں چھوڑ دینے کا اُس وقت میرے پاس کوئی جواز نہ تھا۔

پھر میں لڑکی بنی —

اُس وقت کتابیں میری اچھی ساتھی تھیں۔ مجھے پڑھنے سے دل چسپی نہیں تھی لیکن تصویریں دیکھنے اور ان میں رنگ بھرنے کے شوق نے مجھے اُن سے بے حد قریب کردیا۔ کتابوں سے یہ قربت پھر میری عادت بن گئی۔ جب تک مجھے تحریروں سے دل چسپی نہیں تھی اس وقت تک میں اسکول میں خوب پٹتی رہی لیکن جب تحریریں خود بخود میری سمجھ میں آنے لگیں تو اپنے استادوں سے میری نفرت بھی یک لخت ختم ہوگئی اور میں ان کی بڑی اچھی شاگرد بن گئی۔ میں نے خوب جی لگا کے پڑھا اور سب کو خوش کردیا۔ مگر سب کی خوشی نے میری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ میں ہنوز تشنہ تھی۔ میرے اندر کا خلاء کوئی ایسی چیز مانگتا تھا جس سے میری شخصیت لبالب بھر جائے اور مجھے اپنے دنیا میں آنے کا مقصد پورا ہوتا نظر آئے۔ لیکن مشکل یہ بھی تھی کہ میں خود نہیں جانتی تھی وہ کیا چیز ہے — کیسی طلب —؟؟

پھر پڑھ لکھ کر جس دن میں ملازم ہوئی اور دنیا والوں کے مطابق جب میں نے نہایت کم عمری میں اپنے سارے گھر کو ایک بڑے سہارے کی طرح سنبھال لیا تو عزت و توقیر کی ایک بلند دیوار خود بخود میرے اطراف کھنچ گئی۔ ہر آدمی مجھے وقعت کی نگاہ سے دیکھتا، میرا احترام کرتا، میرا ہر ہر طرح خیال کرتا، مجھے بڑا سمجھتا لیکن مجھے ان سب آدمیوں سے شدید نفرت تھی۔ مجھے ان کی زبان سے اپنی تعریفیں بھلی معلوم نہ ہوتی تھیں بلکہ جب جب تعریفوں کے پھول میرے اطراف بکھر جاتے، مجھے اپنا آپ ایک خول میں بند ہوتا ہوا محسوس ہوتا جیسے جو میں بننا چاہتی ہوں اس میں یہ پھول خواہ مخواہ رکاوٹ بن رہے ہیں، خواہ مخواہ مجھے لبھا کر اپنی طرف متوجہ کرکے میرے راستے سے بھٹکانا چاہتے ہیں۔

تب میں یک لخت تنہائی پسند بن گئی۔

جب میں اکیلی رہتی تو بے حد خوش رہتی۔ مجھے اپنی ذات بڑی قیمتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی حفاظت کے ہر وہ طریقے سوچ ڈالتی جو اسے ایک خزانے کی طرح باقی رکھے لیکن مشکل یہی تھی کہ میں بہت دیر اکیلی بھی نہ رہ سکتی تھی۔ کوئی نہ کوئی میری تنہائی کے احساس سے بوکھلا کر میری تنہائی ختم کرنے آجاتا اور میں پھر اپنے آپ کو کھو بیٹھتی۔ میں دونوں کو

ڈانٹ کر بھگا دینا چاہتی، انھیں جھڑک دینا، ان سے برا سلوک کرنا چاہتی لیکن نہ کر سکتی اور یہی سوچتی رہ جاتی کہ جانے وہ کیسے لوگ ہوتے ہوں گے جو ڈانٹ سکتے ہیں، جھڑک سکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جانوروں کی طرح پیش آسکتے ہیں۔ پھر لوگوں کی موجودگی میں دنیا کی وہ ساری باتیں چھڑ جاتیں جو کسی طرح میری باتیں نہ تھیں۔

اپنے آپ سے اس دوری نے اور اپنے مزاج کے اس مرنجاں مرنج رویے نے میری ذات کو ایک مستقل الم سے دوچار کر دیا۔ جب میں آئینہ دیکھتی تو مجھے صاف نظر آتا کہ میرا اصلی چہرہ کہیں دب گیا ہے اور ایک خوبصورت بوجھ سوگواری کا نقاب پہن کر میرے چہرے پر حاوی ہو گیا ہے۔ میں جو اندر سے ایک قہقہہ تھی، پھلجھڑی کی طرح مچل جانے کو بے قرار۔ میں جو طوفانی ہوا کا ایک جھونکا تھی، سنسناٹے سے گذر جانے کا اہل۔ میں جو ایک بگولہ تھی جو اپنی زد کی ہر چیز سمیٹ لے جانے والا ـــ محض خاشاک بن کر رہ گئی ہوں۔ جیسے لوگ فرنیچر سے دھول جھٹکتے ہیں، جیسے گھر میں صفائی کے لیے جھاڑو لگائی جاتی ہے، جیسے گندگی دور کرنے کے لیے فرش دھویا جاتا ہے، بالکل اسی طرح میں بھی اپنی ذات سے دھیرے دھیرے دیس نکالا پا رہی ہوں۔ کوڑے کچرے کی طرح۔ مگر میرے اس وجود کو جو کچرا نہیں بلکہ میرا اصلی وجود ہے مٹنے سے کون بچائے۔

کون جو میرے اندر اس کی حفاظت کرے ـ ؟

کیا میرا دل۔ میرا دماغ۔ میری فہم ـ ؟ ؟ ؟

تب میں نے سوچا دل بن کے دیکھوں اور میں دل بن گئی ـــ

لوگوں کا دائرہ میرے اطراف زیادہ وسیع ہو گیا۔ پہلے سے بہت زیادہ پھیل گیا۔ میں اپنی نادانی اور بھول پر پچھتانے لگی۔ یہ میں نے کیا کیا کہیں خود کو بچانے کے پھیر میں میں نے خود کو بالکل گنوا تو نہیں دیا ـ ؟

میں ایک کمرے میں چھپ کر خوب روئی۔ جب لوگوں کو میرے آنسوؤں کے بارے میں معلوم ہوا تو تقریباً سب اپنی اپنی دستیاں لے کر دوڑ پڑے۔ میرے آگے پھیلے ہوئے ہاتھوں اور دستیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ مگر میں نے ان میں سے ایک دستی بھی نہیں چھوئی کیونکہ دستیوں کا وہ ڈھیر مجھے خوشامد کے اس پہاڑ کی طرح لگا جو میری شخصیت کو بالکل ہی پامال کرنے کو میرے آس پاس جمع کر دیا گیا ہو۔ میں نفرت اور غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے اس رویے پر جھنجھلانے کی بجائے لوگوں نے اپنی اپنی دستیاں اٹھا لیں اور میرے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ دیر تک وہ میرے ساتھ آئے۔ دور تک وہ میرے ساتھ آئے لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں خاموش چلتی رہی حتیٰ کہ سب سے بچ کر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں کوئی نہ تھا۔ ایک اجڑے ہوئے باغ میں۔ مہوے کے ایک بڑے پیڑ کے نیچے ایک شکستہ بنچ میری طرح اپنی شخصیت میں گم خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ میں بنچ پر بیٹھ گئی۔ مجھے اس کی سختی اچھی محسوس ہوئی۔ شاید اس لیے کہ ملائمتوں اور لطافتوں کی کثرت نے مجھے ان کی نزاکتوں سے بے حس کر دیا تھا یا شاید اس لیے کہ سختی سے ٹکرا کر ہی کوئی خول ٹوٹ سکتا ہے۔ شکستگی ہی سے اس کے اندر جو کچھ ہے باہر آسکتا ہے، یا شاید اس لیے کہ اس بنچ کے اطراف بھیڑ نہ تھی۔ ہجوم نہ تھا۔ گڑبڑ نہ تھی۔

"تو بڑی خوش قسمت ہے بنچ"۔ میں نے بنچ سے کہا۔

اس نے اپنی لنگڑی ٹانگ ہلائی اور حیرت سے بولی "پاگل۔ کہیں تم پاگل تو نہیں۔ اکیلا پن تو ایک زخم ہے جو ہمیشہ رِستا رہتا ہے۔ ایک ناگ جو ہمیشہ ڈستا رہتا ہے۔"

میں ڈر گئی "کیا میں کہیں اور جا کر بیٹھوں ـــ ؟" میں نے بنچ سے پوچھا۔

بنچ کو شاید مجھ پر ترس آگیا۔ اس نے ناصحانہ کہا "چھوٹی لڑکی یہیں بیٹھ جاؤ۔ تم کافی معصوم لگتی ہو۔"

ہمت کر کے میں نے اپنا وجود بنچ پر کسی قدر پھیلا دیا۔

"کیا تم اکیلی ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ـــ ؟" بنچ نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے لوگوں کے ساتھ سے نفرت ہے۔ میں اکیلی ہی وہ سب کرنا چاہتی ہوں جو ایک انسان کر سکتا ہے۔"

بنچ قہقہہ مار کر ہنس پڑی ـــ "ویری گڈ ـــ تم بے حد غیر متوقع ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنے مختصر وجود میں اتنی امید، اتنا حوصلہ ہو سکتا ہے۔"

جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ "پھر تو اسے بنچ تم خود بھی بے وقوف ہو۔"

بنچ نے اپنے وجود کو ہلا کر مجھے نیچے گرا دینا چاہا۔

میں سنبھل گئی۔

مجھے گرنا پسند نہیں ــــ

میں فوراً بنچ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں ناپسندیدہ وجود کبھی نہیں بننا چاہتی تھی۔ لیکن بنچ کے ایک شکستہ کونے نے میرا آنچل پکڑ لیا۔ میں نے رک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ بنچ کی ساری ہستی سے نمائل وہ کونا چپکے چپکے مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس پر پیار آگیا۔ مجھے اس میں اپنے اُس چہرے کی جھلک نظر آئی جو بظاہر چھپا ہوا رہتا ہے۔ لہٰذا میں بے ساختہ دوبارہ بنچ پر ٹک گئی۔ میں نے بنچ کی بقیہ ہستی سے چھپا کر دھیرے دھیرے اس شکستہ کونے پر ہاتھ پھیرا اور اس لمس نے میری ہتھیلی، میری اُنگلیوں کو کچھ وہی احساس بخشا جو بچپن سے ماں کے سینے، ماں کی لوری کا بخشتا تھا۔ شرارتوں پر پٹنے کے بعد ماں کے سینے میں منہ چھپا لینے کا مزہ دفعتہً مجھے یاد آگیا اور سکون سے میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں۔ کوئی بھولا بسرا گیت میری ٹوٹی پھوٹی شخصیت کے نہاں خانے سے اُبل کر یک لخت باہر آگیا اور میرے ہونٹ اس کی تکرار کرنے لگے۔

دفعتہً دور دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے میں ایک روشنی چمکی اور ایک دبنگ آواز نے قریب آکر مجھے چونکا دیا۔ "کون ہو۔ کیا تم گا رہی ہو ــــ؟"

میں چونک کر آنکھیں ملنے لگی۔

"میں ایک لڑکی ہوں اور میں ہی گا رہی ہوں۔"

"کیا تم اکیلی ہو ــــ؟" آواز نے تحکمانہ پوچھا۔

"ہاں میں اکیلی ہوں۔"

آواز یک لخت نرم پڑ گئی۔ "تم کون ہو اور اس ویران جگہ میں اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔ کیا تمھیں شام سے، اندھیرے سے، تنہائی سے ڈر نہیں لگتا ــــ؟؟؟"

"مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا سوائے اس دنیا کے جو میرے وجود کو ناحق پامال کرنا چاہتی ہے۔"

دفعتہً ایک قہقہہ دھماکے کی طرح گونج گیا۔

"تم شاعر ہو یا کہانیاں لکھنے والی ــ؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"مگر تم بہت اچھی ہو۔ چلو میں تمھیں اپنے گھر والوں سے ملاؤں میرا گھر یہیں ہے۔ اسی ویران باغ کے اگلے کونے پر۔ جب یہ باغ ہرا بھرا تھا میں اس کا مالی تھا۔ اِسے بسانے والوں کا ملازم۔ اس باغ کے بسانے والے اجڑ چکے ہیں۔ لیکن میری چھوٹی سی چار دیواری اب تک اس کونے میں کھڑی ہوئی ہے۔ آؤ چلیں ــــ" مضبوط بھاری بھرکم وجود نے پھر روشنی جلائی اور میں خواہش نہ ہونے پر بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ مجھے اس کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آئی تھی لیکن پھر اس عجیب و غریب وجود نے اس سچائی کو آپ ہی جھٹلا دیا۔ میں ڈرڈر کے چلتی رہی۔

کہیں یہ سانپ نہ ہو۔

بچھو نہ ہو۔

کوئی ایسا زہریلا کیڑا نہ ہو جو میرے خون میں زہر گھول دے۔

پہلی بار مجھے اپنی بے وقوفی پر غصّہ اور بنچ کی دانش مندی پر اعتبار آیا۔ بنچ کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی ــ کیا تم اکیلی ہو ــ کیا تم اکیلی ہو ــ

اور میں نے محسوس کیا، مجھے اکیلا نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی ذات کی تمام جلوتوں، تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو میرا محافظ میرا نگہبان رہے۔ شاید اس طرح میں اپنی ذات کے اُس حصّے کو بھی تلف ہونے سے بچا سکوں جس پر ایک عرصے سے دنیا قابض ہے۔

یہ خیال مسرت کی ایک لہر بن کر میرے سارے وجود میں پھیل گیا۔

ٹھیک اُسی وقت ہم ایک دروازے کے آگے رُک گئے۔ بھاری بھرکم وجود نے دھکیل کر دروازہ کھولا اور بولا "آؤ ــ"

اندر پڑے ہوئے گہرے سناٹے کو محسوس کر کے میں نے ایک بار پھر لمبی قلانچ بھری اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا، دور نکل گئی۔ دبنگ آواز کی غصّہ بھری چیخیں دیر تک میرے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ لیکن

میں نے رکنے کا نام نہ لیا۔

اب مجھے ساتھی کی فکر تھی لیکن میں اُسے کہاں ڈھونڈھوں ۔؟

اُس وقت پہلی بار میں نے دنیا میں دلچسپی لی ۔۔ ریت میں کہیں نہ کہیں وہ ذرہ ضرور ملا ہوگا جو اپنی انفرادی چمک کے باعث دیر تک چھپا نہ رہ سکے گا۔

اور لوگ میرے اس بدلے ہوئے رجحان پر خوش ہو ہو گئے۔

دعوتیں ۔۔۔ تقریبیں ۔۔۔ اہتمام ۔۔۔!!!

قہقہے ۔۔۔ مسکراہٹیں ۔۔۔ چہرے ۔۔۔؟؟؟

میں ان سب میں ایک تنکے کی طرح ڈولتی رہی مجھے ان سب کو دیکھنا تھا کہ انھیں دیکھے بغیر ان کے قریب گئے بغیر میں انھیں کھوج نہیں سکتی تھی۔

بہت سے دن جلد جلد گذر گئے ۔۔

پھر ایک دن دفعتہً میں اخلاق سے ٹکرا گئی ۔۔

اخلاق کے چہرے پر سراسیمگی نہیں تھی ۔ برہمی نہیں تھی۔ وہ بڑا اٹل اور ملائم چہرہ تھا۔ گمبھیر سا ۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے ۔ میری گمبھیرتا بھی جاگ گئی ۔ میں نے ایک بار اپنی شخصیت کی پوری قوت' پوری ملائمیت' پوری چاہ سے اخلاق کو گھورا ۔ پھر دور دور تک چراغ سے جلتے چلے گئے اور سارا اندھیرا ایک تیز روشنی میں تبدیل ہو گیا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور ایک ہی قہقہہ ہم دونوں کے سینوں سے نکل کر ساری فضا پر دور دور تک پھیل گئی ۔

اُس دن آئینہ میں مجھے اپنا چہرہ بڑا بھلا لگا مسرور اور معصوم ۔ اُس پر تنی ہوئی ردا کھسک کر کہیں گر چکی تھی ۔ میں اسے ڈھونڈھنا بھی نہ چاہتی تھی کیونکہ راستے تو آگے لے جاتے ہیں اور بوجھ آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔

پھر دھیرے دھیرے میں محسوس کرنے لگی کہ دل کا روپ کوئی مناسب روپ نہیں اس میں اگرچہ ہر جگہ جیت نصیب ہوتی ہے لیکن اس جیت میں سخت مقابلے کا مزہ نہیں گھمسان کا رن نہیں اور آسانی سے حاصل ہونے والی چیز تو بے مول کنکر پتھر ہی ہوا کرتی ہے ۔

تو زندگی کا مول کس طرح ملے ۔۔؟

محض اپنی ذات کی فتح میں سکون نہیں۔ آگے بڑھنا چاہیے ۔ کچھ اور بننا چاہیے جو خود کو مکمل کرے ۔ دنیا کو تسخیر کرے۔

تب میں عقل بنی ۔۔

عقل بننے کے بعد سارے گڈمڈ فاصلے سمٹ کر ایک ہموار سطح پر آ گئے ۔ اجنبیت ۔ اقدار ۔ لحاظ جنھوں نے مرد عورت اور آدمی آدمی کے درمیان حدیں کھینچ رکھی تھیں سب ٹوٹ گئیں ۔ یہ پہلا یہاں پہنچ کر انسان صرف انسان رہ جاتا ہے ۔ مٹ مٹ کر بننے والا ایک خالص وجود ۔۔ زمانے کے ہاتھ کا ایک قیمتی جوہر ۔۔ وقت کا ایک اٹل حصہ ۔۔ تب میں نے خود سے پوچھا ۔۔ بن سکو گی انسان ؟ جہاں تک پہنچتے پہنچتے جانے کتنے وجود ریزہ ریزہ ہو گئے ۔ ریزہ جو دنیا کا اقل ترین وزن ٹھہرا ۔ اور مجھ میں چھپی ہوئی جستجو اور تمنا نے ہنس کر کہا ۔

"روشنی بننے کے لیے جلنا ضروری ہے ۔۔"

دل مسکرایا ۔۔

اخلاق نے سنجیدگی سے مجھے دیکھا ۔

جاہ و حشمت کے مہیب اژدھے نے پھنکار بھری ۔۔ "بے وقوف لوٹ آ ۔ میری غذا نہ بن ۔۔" لیکن میں نے اپنی تمنا ۔ اپنی جستجو سے کہا ۔ "شکریہ" اور آگے بڑھ گئی ۔۔

میں یقیناً وہ شکستہ بیج نہیں جو محض ویرانے کا حصہ ہو بلکہ ایک جھرنا جو پتھر کے سینے سے رستا اور لگاتار بہتا رہے ۔ کوئی اس کا گیت سنے نہ سنے ۔

لوگ میری سادہ لوحی پر ہنس پڑے ۔

اب سب کہتے ہیں میں ایک ٹارگٹ ہوں اور دنیا بڑی اچھی نشانہ باز ۔۔ کون جانے ۔۔؟

میں نے تو وقت کا ہنسنا مسکرانا اپنے سینے میں چھپا رکھا ہے ۔

ایک آنسو ۔۔ ایک موتی کی طرح ۔۔!!



ہماری آزادی کے رہ نما



ہندستان پر انگریزوں نے جس طرح تسلط قائم کیا وہ محتاج تعارف نہیں۔ اس کا ردعمل ہندستانی عوام پر ہونا بالکل قدرتی تھا۔ انگریزی تسلط کے خلاف لوگوں میں آہستہ آہستہ بددلی اور بے اطمینانی پیدا ہوئی اور لوگ غلامی کی لعنت سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ یوں تو آزادی کے اس خواب کی تکمیل کے لئے اِکّا دُکّا بہت سی کوششیں کی گئیں لیکن بدیشی تسلط کے خلاف ہندستانی عوام کا پہلا بڑا اندولن ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ اس انقلاب کا خاص مرکز ویسے تو اتر پردیش، بہار اور دلی کے گرد و پیش کا علاقہ تھا لیکن درحقیقت اس نے سارے بھارت کے عوام میں ایک نئی گرمی اور ایک نئی حرارت پیدا کر دی۔ اس تحریک میں فوج کے دوش بدوش ملکی راجے اور عوام بھی انگریزی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس اندولن کی قیادت نانا دُھندھو پنت جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تانتیا توپے، رانا بینی مادھو، مولوی احمد اللہ شاہ، بیگم حضرت محل، بابو کنور سنگھ اور نواب خان بہادر خاں نے کی اور انگریزوں سے ڈٹ کر لڑے۔

اس میں شک نہیں کہ آخری نتائج کے اعتبار سے ہندستانی ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی ہار گئے لیکن اس شکست کے بعد انگریزی حکومت نے ظلم و ستم اور جور و تشدد کا جو بازار گرم کیا اور جس طرح لوگوں کی غربت و افلاس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اس نے سبھی کی آنکھیں کھول دیں اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ جب تک ملک سے بدیشی حکومت کا خاتمہ نہیں ہوتا اس وقت تک نہ چین نصیب ہو سکتا ہے اور نہ عوام اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ مسلح انقلاب ناکام ہو چکا تھا اس لئے ملک کی آزادی کے حصول کے لئے دوسری تدبیروں سے کام لینے کی بات سوچی جانے لگی۔ چنانچہ اُس وقت ملک میں ہمیں افکار کے دو دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک طبقہ تو سیاست کے ذریعے ملک کو آزاد کرانا چاہتا تھا اور دوسرا گروہ سماجی اصلاح کے ذریعے عوام میں خودداری اور خود اعتمادی کے جذبے کو بیدار کرنے اور انھیں مستحکم اتحاد کے رشتے میں پرونے کے لئے کوشاں تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء اور انڈین نیشنل کانگریس کے قیام ۱۸۸۵ء کے دوران ملک میں جو تحریکیں چلیں وہ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ بنگال میں راجہ رام موہن رائے اور کیشو چندر سین اُبھرے۔ اُنھوں نے اپنی سرگرمیوں کو سماجی اور مذہبی اصلاح تک محدود رکھا لیکن ان کی ولولہ انگیز تقریروں اور تحریروں نے ملک میں بیداری کی لہر پیدا کر دی۔ سوامی دیانند نے ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ ان کے افکار و خیالات نے لوگوں میں نئے احساسات و جذبات پیدا کئے۔ رام کرشن پرم ہنس اور ان کے چیلے سوامی ویویکانند نے ہندستانی عوام کے جذبۂ خودداری و خود اعتمادی کو جسے سامراجی برطانیہ نے کچل کر رکھ دیا تھا، از سرِ نو اُبھارنے میں اہم رول ادا کیا۔ ان مصلحین نے ہندستانی عوام میں گویا نئی روح پھونک دی۔

آئینی طریقوں سے ہندستان کو آزادی دلانے کے حق میں جو اصحاب تھے ان میں دادا بھائی نوروجی، طیب جی، سرسریندرناتھ بنرجی اور تلک کے نام خاص طور سے



قابل ذکر ہیں۔ ان رہنماؤں نے انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک ہندستان گیر تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس میں مسٹر اے۔ سی۔ ہیوم ایسے انگریزوں نے بھی مدد کی۔ اس کے بعد سے ہندستان کی آزادی کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ملک کی تاریخ بھی کانگریس کی تاریخ بن گئی۔ کانگریس جو ابتدا میں چند دانشور قوم پرستوں کی ایک جماعت تھی، رفتہ رفتہ عوامی تنظیم بن گئی۔ دیش کے تقریباً سبھی لیڈر اس میں شامل ہو گئے۔ تحریک آزادی نے فوجی انقلاب کا روپ ترک کر کے پُرامن اور راہنما پرمبنی ستیاگرہ کا روپ اختیار کر لیا۔ اور ایک دن وہ بھی آیا جب حق کے سامنے ناحق کو اور عدم تشدد کے آگے تشدد کو جھکنا پڑا اور مختصر سی جماعت نے جو ۱۸۸۵ء میں تشکیل پائی تھی، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو تلک کے اس قول کو "سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے" سچ ثابت کر دیا۔ ذیل میں ان عظیم رہنماؤں کا سوانحی خاکہ دیا جا رہا ہے جن کے تیاگ اور قربانی کی بدولت ہمیں یہ روز سعید نصیب ہوا اور جن کی جانکاہیاں اور جانفشانیاں، اٹل ارادے اور مستحکم عزائم آنے والی نسلوں کے دلوں میں جوش اور گرمی، خودداری و خود اعتمادی، مقصد پر پختہ یقین اور ایثار و قربانی کے جذبات پیدا کرتے رہیں گے۔

دادا بھائی نوروجی



دادا بھائی ایک سرخیل خاندان کی طرح ہندستانی قوم کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ آپ ۴ ستمبر ۱۸۲۵ء کو بمبئی میں ایک پارسی خاندان میں جسے مذہبی نیابت بھی حاصل تھی، پیدا ہوئے۔ بمبئی کی پہلی سیاسی جماعت کے قیام میں آپ نے نہایت اہم حصہ لیا تھا۔ آپ انگلینڈ بھی گئے تھے جہاں آپ نے انگریز عوام کو بتایا کہ ہندستان میں غربت اور افلاس کا باعث برطانی حکومت ہی ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے مختلف طریقوں سے ہندستان کے معاملے کی وکالت کی اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ برطانیہ میں ہندستان کے سب سے کامیاب سفیر ثابت ہوئے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بانی دادا بھائی نوروجی بھی تھے۔ دوسرے بانیوں میں مسٹر ہیوم، رمیش چندر بنرجی اور بدرالدین طیب جی تھے۔ آپ ۱۸۸۶ء کے کلکتہ کانگریس سیشن اور ۱۸۹۳ء کے لاہور کانگریس سیشن کے صدر منتخب ہوئے۔ دادا بھائی صرف یہی نہیں کہتے تھے کہ ہندستان میں انگریزی حکومت ناانصافی پر مبنی ہے بلکہ آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ اس حکومت کی خرابیاں اسی وقت دور ہو سکتی ہیں جب اندرونی معاملوں میں ہندستانیوں کو اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ہندستان میں قومی احساس پیدا کرنے اور سوراج کی بنیاد رکھنے والی اس عظیم ہستی کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا۔

فیروز شاہ مہتا



فیروز شاہ مہتا کا شمار اُن ممتاز رہنماؤں میں تھا جن کی عوام ہی نہیں بلکہ انگریزی حکومت بھی عزت و توقیر کرتی تھی۔ ان کی قابلیت، سوجھ بوجھ اور دوراندیشی کا سکّہ ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ آپ ۴ اگست ۱۸۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جب بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے لئے انگلینڈ گئے تو وہیں دادا بھائی نوروجی اور رمیش چندر بنرجی سے ملاقات ہوئی۔ فیروز شاہ بھی ۱۸۸۴ء کے بعد، جب بمبئی پریسی ڈینسی ایسوسی ایشن اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا، ہندستانی سیاست میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد سے آپ سیاسی جنگ میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ بہت سے معاملوں میں انھوں نے حکومت سے ٹکر لی۔ ہندستانی عوام کی نیابت اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے میں آپ نے ہمیشہ بے باکی سے کام لیا۔

سرسریندرناتھ بنرجی

دادا بھائی نوروجی کے ہمعصر شری سرسریندرناتھ بنرجی ان گنے

چنے لوگوں میں تھے جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے پہلے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ سارے ہندستانیوں کو اتحاد کے رشتے میں پرونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو ہندستانی کہنے اور سمجھنے میں فخر محسوس کریں۔ اتحاد کے اس مقصد کی تکمیل کے لئے سریندر ناتھ بنرجی نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔

شری بنرجی ١٨٤٨ء میں پیدا ہوئے۔ آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ تھوڑے ہی دنوں ملازمت کر پائے تھے کہ انگریزوں کی رنگ و نسل کی پالیسی کے باعث ملازمت سے علٰحدہ کر دیئے گئے۔ رنگ و نسل کی انگریزوں کی پالیسی کا ایک تجربہ انھیں اور بھی ہوا جب ان کو بیرسٹری کی ڈگری نہیں دی گئی۔ اس طرح انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ انگریزی حکومت میں ہندستانیوں کے لئے ترقی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے طے کر لیا کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں ہندستانیوں کو بیدار کرنے میں صرف کریں گے تاکہ رائے عامہ اتنی مضبوط اور طاقتور ہو جائے کہ بدیشی حکومت کو اس کے سامنے جھکنا ہی پڑے۔

کانگریس سے انھیں شروع ہی سے دلچسپی رہی۔ ان کا تعلق کانگریس کے نرم دَل سے تھا۔ ہندستانیوں کے مفاد کی وکالت کے لئے انھوں نے "بنگالی" نام کا ایک اخبار بھی نکالا تھا۔ انگریزوں نے انھیں دو بار قید کی سزا بھی دی لیکن وہ اپنے نصب العین پر اٹل رہے۔ تقسیم بنگال کے خلاف ١٩٠٥ء کی تحریک میں انھوں نے پُرزور حصہ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان میں عوامی تحریک کو آئینی ہونا چاہئے اور سوراج کی طرف ملک کو تعمیری ڈھنگ سے آہستہ آہستہ بڑھنا چاہئے۔ ہندستان کے قومی معماروں میں سریندر ناتھ بنرجی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مہادیو گووند رانا ڈے

رانا ڈے نے تقریباً ٣٥ سال تک اس زمانے میں ملک کی خدمت کی جب بیداری کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ کل ہند کانگریس کے قیام میں ان کا بھی قابل قدر حصہ ہے۔

مہادیو گووند رانا ڈے کا جنم ١٨ فروری ١٨٤٢ء میں پونا کے ایک متوسط گھرانے میں ہوا۔ ملک میں چلنے والی سماج سدھار تحریکوں مثلاً آریا سماج، برھمو سماج وغیرہ سے آپ بہت متاثر ہوئے۔ نئے ہندستان کی تعمیر کے کاموں میں رانا ڈے سیاسی اور سماجی اصلاح دونوں ہی کو مساوی درجہ دینے کے حق میں تھے اور دونوں ہی میدانوں میں انھوں نے ٹھوس کام کئے۔ رانا ڈے کا انتقال ١٦ جنوری ١٩٠١ء میں ہوا۔

گوپال کرشن گوکھلے



گوکھلے ضلع رتناگیری کے کاٹ لوک نامی گاؤں کے ایک غریب برہمن گھرانے میں ٩ مئی ١٨٦٦ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی وہ کل تیرہ برس کے تھے کہ ان کے والد شری کرشن راؤ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے انتقال اور خاندان کی مالی حالت خراب ہونے کے باعث گوکھلے کا تعلیمی دَور بڑی پریشانیوں میں گزرا لیکن انھوں نے اپنی محنت، ذہانت، حصول علم سے فطری لگاؤ اور اپنے بڑے بھائی کی محبت و ہمدردی اور توجہ سے ١٨ سال کی عمر میں بی۔ اے پاس کر لیا اور نیو انگلش اسکول پونا میں ماسٹر ہو گئے۔

ملک کی تاریخ میں یہ غیر معمولی بیداری کا زمانہ تھا۔ تعلیم اور اصلاحات کی ایک زبردست تحریک چل پڑی تھی۔ نوجوان گوکھلے اس ولولہ انگیز ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ رانا ڈے سے انھیں دنوں ان کا تعارف ہوا اور دونوں کے درمیان گرو اور چیلے کا رشتہ قائم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ وہ ہندستان کی سیاست کی طرف کھنچتے گئے اور ١٩٠٨ء میں امپیریل کونسل میں پہلی بار بجٹ کے سلسلے میں ان کی جو تقریر ہوئی اس نے انھیں چوٹی کے قومی رہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ وہ سیاست میں اخلاق کی بلندی اور مقصد کے نیک ہونے کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے انھیں اپنا سیاسی گرو تسلیم کیا تھا۔ بہرحال گوکھلے کے ذہن میں مستقبل کے ہندستان کا بہت واضح خاکہ تھا۔ وہ ہندستان کو آزاد قوموں کی برادری میں ایک باعزت جگہ دلانا اور ہندستان کے عوام کو خوش حال اور سکھی دیکھنا چاہتے تھے۔ ملک کی خدمت کے سلسلے میں سخت محنت کے باعث کل ٤٩ برس کی عمر میں ١٩ فروری ١٩١٥ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

بال گنگا دھر تلک

دیش میں انقلاب کا صور پھونکنے والی ہستی اور کانگریس میں گرم

دل کے خاص ستون، بال گنگا دھر تلک کی پیدائش ۲۳ جولائی ۱۸۵۶ء کو رتنا گری، مہاراشٹر میں ہوئی۔ شروع ہی سے انھیں ملکی مسائل سے دلچسپی اور عوام کی حالت سدھارنے کی فکر رہی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے افکار و خیالات کو عوام تک پہنچانے اور ہندستان کے مفاد کی وکالت کرنے کے لیے "کیسری" اور "مرا ٹھا" نامی اخبار نکالے اور اس طرح ان کی پبلک زندگی کا آغاز ہوا۔

تلک تحریر و تقریر دونوں ہی کے دھنی تھے۔ ملک میں بیداری پیدا کرنے کی انھیں دھن سی رہا کرتی تھی۔ اتفاق سے انھیں دنوں مہاراشٹر میں قحط پڑا اور زبردست پلیگ پھیلا۔ انھیں موقع مل گیا اور ان کا قلم آگ اگلنے لگا۔ انگریزی حکومت نے انھیں بغاوت پھیلانے کے جرم میں ۱۹۰۸ء میں گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلا کر ۱۹۰۸ء میں چھ سال کالے پانی کی سزا دے دی اور مانڈلے جیل (برما) بھیج دیا۔

ان کا قول تھا کہ "بھیک مانگنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ انگریزوں کو اگر کوئی طاقت جھکا سکتی ہے تو وہ ہے عوام کی طاقت انگریزی حکومت کی مشین میں روڑے اٹکانا چاہیے۔"

پہلی جنگ عظیم کے دوران تلک نے ایسا وہ انمول نعرہ دیا جس نے ہر ہندستانی کے دل کو گرما دیا اور جو آج بھی ہندستان کی فضا میں گونجا ہوا ہے۔ وہ نعرہ تھا "سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اسے ہم لے کر ہی رہیں گے۔" اس اعلان کے جرم میں ان پر مقدمہ چلایا گیا مگر وہ مقدمہ جیت گئے اور عدالت نے سوراج کی مانگ کو قانونی قرار دیا۔ اس کے بعد کانگریس کے نصب العین میں سوراج شامل ہو گیا اور اسے عوامی تحریک کا روپ ملا۔

اس عظیم رہنما کا جس نے ہندستان میں قومی احساس پیدا کر دیا تھا پہلی اگست ۱۹۲۰ء کو بمبئی میں انتقال ہوا۔ یہ گاندھی جی سے پہلے دیش کے سب سے بڑے رہنما مانے جاتے تھے۔

لالہ لاجپت رائے



لالہ لاجپت رائے پنجاب کے ڈھڈی گاؤں میں ۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے جو ایک اسکول ٹیچر تھے انھیں اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی۔

لالہ جی طالب علمی کے زمانے ہی سے سماج سیوا کے کاموں میں حصّہ لینے لگے تھے کیوں کہ ان کے والد کی یہی خواہش اور ان کی تعلیم کا یہی مقصد تھا۔ وکالت کے زمانے میں وہ ساری آمدنی سماج سیوا کے کاموں پر صرف کر دیتے تھے۔ حصار میں آریہ سماج کی شاخ قائم کرنے کے علاوہ انھوں نے اچھوتوں کی بہبود کا کام بھی زور و شور سے شروع کیا۔ لالہ جی بڑے انقلابی خیالات رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر انگریزوں نے انھیں بھی گرفتار کر کے مانڈلے (برما) بھیج دیا۔ وہ ابتداء ہی سے کانگریس میں شریک رہے اور کلکتہ سیشن کے صدر منتخب ہوئے۔ لالہ جی ہی نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم کی تھی۔ وہ ۱۹۲۸ء میں لاہور میں سائمن کمیشن کے خلاف ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے پولیس کی لاٹھیوں سے سخت زخمی ہوئے جس سے وہ پھر کبھی سنبھل نہ سکے اور ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو وفات پا گئے۔

مدن موہن مالویہ



ملک کی آزادی اور نوجوانوں کے ذہنی اور اخلاقی تعمیر کے لیے مالوی جی کے خدمات تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ باقی رہیں گے۔ دوسروں کے لیے جینا اور دوسروں کے لئے مرجانا ان کی زندگی کا وہ نصب العین تھا جو نہ صرف اس عہد کیلئے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی ایک بیش بہا سبق ہے۔ مالوی جی ۲۵ دسمبر ۱۸۶۱ء کو پریاگ میں ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی طالب علمی کا زمانہ بڑے افلاس میں گزرا۔ لیکن تمام مشکلات کے باوجود انھوں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور بی۔ اے پاس کر لیا۔

سماج سیوا کے جذبے اور سیاسیات سے دلچسپی کے باعث وہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام ہے۔ انھیں غریب طلبا کے مسائل کا پوری طرح احساس تھا اور چاہتے تھے کہ ملک میں ایک ایسی یونیورسٹی ہونا چاہیے جس میں غریب سے غریب طالب علم پڑھ سکے اور جو مغربی تہذیب کے

اثرات سے پاک ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے بنارس یونیورسٹی قائم کی۔

سیاسیات میں بھی مالوی جی کو ایک ممتاز جگہ حاصل تھی۔ وہ سنہ ۱۹۰۹ء میں لاہور کانگریس اور سنہ ۱۹۱۸ء میں دلی کانگریس کے پردھان چُنے گئے۔ نان کوآپریشن تحریک میں متعدد بار وہ جیل بھی گئے۔ گول میز کانفرنس میں ہندستان کے نمایندے کی حیثیت سے انگلینڈ بھی گئے تھے۔ مالوی جی کانگریس کے گرم اور نرم دل کے درمیان ایک پل کا کام کرتے تھے۔ آخر میں کانگریس سے اختلاف ہو جانے کی بنا پر سنہ ۱۹۳۴ء میں وہ اس سے علاحدہ ہو گئے۔ مالوی جی جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس پر آخر وقت تک قائم رہتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کے ساتھ ہے یا نہیں۔ اس عظیم ہستی کا انتقال سنہ ۱۹۴۶ء میں ہوا۔

موتی لال نہرو



ہندستان کی جنگ آزادی جن رہنماؤں کی قیادت میں منزل بہ منزل آگے بڑھی اور بالآخر سنہ ۱۹۴۷ء میں فتح ہوئی، ان میں موتی لال نہرو کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ موتی لال ۶ رمئی سنہ ۱۸۶۱ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور وکالت پاس کرکے الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ جلد ہی ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔

موتی لال جی جب سنہ ۱۸۸۸ء میں کانگریس میں شامل ہوئے تو اس وقت اس میں نرم دل کا زور تھا۔ یہ بھی نرم خیالات رکھتے تھے لیکن گاندھی جی سے رابطہ پیدا ہونے کے بعد ان کے حامی بن گئے۔ انھوں نے نہ صرف ستیہ گرہ تحریک میں تعاون کیا بلکہ اس وقت سے مرتے دم تک برطانی حکومت سے ٹکر لیتے رہے۔ انھوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی بھی کھل کر ہمت افزائی کی۔ انھوں نے ایک آل پارٹی کانفرنس بلائی جس نے نہرو رپورٹ تیار کی۔

پنڈت موتی لال نہرو کانگریس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ انھیں کئی بار جیل کی بھی سزا ہوئی۔ موتی لال جی صحیح معنوں میں جنگ آزادی کے

ایک نڈر سپاہی تھے اور جب کوئی مصیبت آتی تھی تو ان کا یہ رویہ اور بھی نکھر کر سامنے آجاتا تھا۔ ملک کی آزادی اور ترقی کی خاطر اپنے آرام و آسائش اور امیرانہ زندگی کو قربان کر دینے والے اس رہنما کا انتقال ۶ر فروری ۱۹۳۱ء کو ہوا۔

چترنجن داس



سیاست میں چترنجن داس پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے لگ بھگ ہمعصر تھے۔ وہ ۵ر نومبر سنہ ۱۸۷۰ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ جب وہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے کے لیے انگلینڈ گئے تو وہاں دادا بھائی نوروجی سے ان کی ملاقات ہوئی اور وہ سیاسیات کی طرف مائل ہو گئے۔ وہیں انھوں نے انگریزوں کے ہندستان دشمن پروپیگنڈے کا منھ توڑ جواب دینا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس میں پاس نہیں کیے گئے۔ مجبوراً بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندستان واپس آئے۔

بنگال صوبہ پولیٹکل کانفرنس کے سنہ ۱۹۱۷ء میں صدر چنے جانے کے بعد سے وہ سیاست میں زور و شور کے ساتھ حصہ لینے لگے اور کانگریس کے ممتاز کارکن بن گئے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی نان کوآپریشن تحریک میں حصہ لینے کے لیے وکالت ترک کر دی۔ یہ چترنجن داس ہی تھے جنھوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف سب سے پہلے امرت سر کانگریس میں نان کوآپریشن تجویز کی تائید کی۔ ان کی قربانیوں کے پیش نظر ملک والوں نے انھیں دیش بندھو کا خطاب دیا۔ وہ سنہ ۱۹۲۱ء میں نان کوآپریشن اور خلافت موومنٹ کے صوبۂ بنگال کے صدر رہے۔ موتی لال نہرو کے اشتراک میں سنہ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے سوراج پارٹی قائم کی جس نے سنہ ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد سے وہ سیاسیات پر پوری طرح چھا گئے۔ ان کی وفات کل پچپن سال کی عمر میں سنہ ۱۹۲۵ء میں دارجلنگ میں ہوئی۔

مہاتما گاندھی



تلک کے بعد سے حصول آزادی تک ہندستان کی جنگ آزادی کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی ہی تھے۔ قوم کے باپو موہن داس

کرم چند گاندھی کا جنم ۲؍اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پوربندر کاٹھیاواڑ میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ انگلینڈ گئے اور ۱۸۹۱ء میں بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندستان واپس ہوئے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں جب وہ ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ گئے تو وہاں انھیں ہندستانیوں کی حالتِ زار اور ان کے ساتھ جو ذلت آمیز سلوک ہوتا تھا اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ جنوبی افریقہ میں کئی واقعات اور پیش آئے جنھوں نے گاندھی جی کو انگریزی حکومت کا مخالف بنا دیا۔ اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ جنوبی افریقہ میں انھوں نے ہندستانیوں کے حقوق کے لیے جنوبی افریقہ کی حکومت سے جنگ کرنے کا جو طریقہ وضع کیا اس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ وہاں کے دوران قیام میں وہ ہندستان بھی آتے رہے اور تلک، گوکھلے وغیرہ لیڈروں سے ان کا ربط ضبط بڑھتا گیا۔

گاندھی جی جب ۱۹۱۵ء میں مستقل طور سے ہندستان واپس آئے تو یہاں آزادی کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ چنانچہ وہ بھی اس میں پھاند پڑے۔ ان کے میدان میں آتے ہی ہندستانی سیاسیات کا رخ بدل گیا۔ جنوبی افریقہ سے واپسی کے تھوڑے دنوں بعد رولٹ بل پیش ہوا اور جلیان والا باغ کا خونیں حادثہ پیش آیا۔ اس سے قبل گاندھی جی چمپارن کے کسانوں کی ستیہ گرہ وغیرہ میں حصہ لے چکے تھے لیکن ہندستان گیر سطح پر انھوں نے حکومت کے خلاف ابھی تک کوئی تحریک نہیں شروع کی تھی۔ لیکن برطانیہ کی وعدہ خلافیوں اور ہندستان میں اس کے رویے نے گاندھی جی کو حکومتِ ہند کی مخالفت پر کمربستہ کر دیا اور ان کی قیادت اور ہدایت میں سارے ملک میں عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی۔ گاندھی جی کی ساری تحریک عدم تعاون پر مبنی تھی۔ اسی لیے جب چوری چورا میں تشدد کا ایک واقعہ پیش آیا تو گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی لیکن ۱۰؍مارچ ۱۹۲۲ء کو انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا۔

لاہور کانگریس میں مکمل آزادی کی تجویز پاس ہونے پر آندولن کی باگ ڈور گاندھی جی کو سونپ دی گئی۔ انھوں نے کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے انگلینڈ میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ وہاں سے واپس ہوتے ہی ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ستیہ گرہ کا نعرہ بلند کیا۔ اس پر حکومت نے کانگریس کو غیر قانونی قرار دے کر لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔

جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑی اور انگریزوں نے ہندستانیوں کی مرضی کے خلاف ہندستان کو اس جنگ میں شامل کر لیا تو کانگریس نے اس کی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی۔ کانگریس کی مشہور و معروف 'بھارت چھوڑو' قرارداد گاندھی جی کے سمجھاؤ پر پاس ہوئی۔ خود گاندھی جی اور دوسرے لیڈر ۹؍اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار کر لیے گئے لیکن ان لیڈروں کی عدم موجودگی میں بھی آندولن چلتا رہا۔ بالآخر ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کی قیادت اور رہنمائی میں ہندستان کو آزادی نصیب ہوئی اور ان کا خواب پورا ہوا۔ ملک کی بدقسمتی سے ایک سرپھرے کی گولی نے ۳۰؍جنوری ۱۹۴۸ء کو اس عظیم المرتبت لیڈر اور ہندستان کے محسن کی شمع حیات گل کر دی۔

جواہر لال نہرو



گاندھی جی کی قیادت اور ہدایت میں کاروان آزادی کو منزل بہ منزل آگے بڑھانے اور آزادی کے خواب کو پورا کرنے والوں میں گاندھی جی کے محبوب شاگرد پنڈت جواہر لال نہرو کا نام سرفہرست ہے۔ نہرو جی ۱۴؍نومبر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ لائق اور امیر باپ کے اس اکلوتے لائق فرزند کی تعلیم انگلینڈ کے ہیرو یونیورسٹی اور ٹرنٹی کالج کیمبرج میں ہوئی۔ کیمبرج ہی سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر وہ ۱۹۱۲ء میں ہندستان واپس آئے اور الہ آباد میں وکالت شروع کی۔

گاندھی جی سے ان کی ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ وہ گاندھی جی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں یقین ہو گیا کہ ہندستان کو آزادی گاندھی جی ہی کی قیادت اور ہدایت میں حاصل ہو گی۔

جواہر لال کانگریس کی نرم پالیسی سے مطمئن نہیں تھے اسی لیے جب گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک شروع کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد سے وہ گاندھی جی سے قریب تر ہوتے گئے۔ امرتسر کانگریس اجلاس ۱۹۱۹ء سے تلک وغیرہ پرانے لیڈروں کا اثر کم ہو گیا اور کانگریس کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کے بعد سے جواہر لال جی بھی کانگریس کی ہر تحریک میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک رہے۔

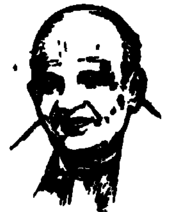
شہزادہ ۔۔۔ اشک

دسمبر ۱۹۲۹ء کے لاہور کانگریس سیشن کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی تاریخی
بلاس میں آزادی کامل کی تجویز پاس ہوئی۔ لاہور سیشن کے بعد سے جواہر لال
، اسمان شہرت پر سورج بن کر چمکنے لگے۔ گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا ۱۹۳۰ء
، بعد الہ آباد میں وہ گرفتار کر لیے گئے۔ کانگریس نے ۱۹۴۲ء میں بھارت
ھوڑو کا نعرہ بلند کیا تو دوسرے لیڈروں کے ساتھ یہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ کل
اکردہ نو بار جیل گئے۔

جب ۱۹۴۶ء میں عارضی حکومت قائم ہوئی تو جواہر لال جی سے حکومت
شکیل کرنے کو کہا گیا۔ اور انھوں نے ۲ ستمبر کو اس حکومت کے نائب صدر کی
یثیت سے حلف وفاداری اٹھایا۔ حصول آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں وہ
زیر اعظم ہوئے اور آخر دم تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ ان کی وفات
۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ہوئی۔ جنگ آزادی کے اس سورما نے زندگی بھر سخت دشواریوں
ور مشکلوں کا سامنا کیا۔ بڑے بڑے پیچیدہ مسائل اس کے سامنے آئے لیکن نہ
س کے چہرے پر کبھی شکن آئی اور نہ اس کے پائے استقلال میں کوئی جنبش۔

انھوں نے انسانیت کو امن و آشتی اور بھائی چارے کا سندیش سنایا۔
ن کی قیادت میں ملک اقتصادی ترقی اور سوشلسٹ سماج کے قیام کی طرف
سلسل آگے بڑھتا رہا۔ نا فرقہ واریت، جمہوریت اور سوشلسٹ طرز کا سماج ان
کی زندگی کا نصب العین تھے۔ محبت ان کی فطرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ہندستان
ور ہندستان کے عوام ہی سے پیار نہیں تھا بلکہ بنی نوع انسان سے ان کو محبت
تھی اور اسی محبت نے انھیں صرف ہندستان ہی کا محبوب رہنما نہیں بنا دیا
تھا بلکہ ساری دنیا میں انھوں نے شہرت اور عزت حاصل کر لی تھی۔

سردار پٹیل



ہندستان کے اس مرد آہن کا جسے بھارت کا
بسمارک بھی کہا جاتا ہے، جنم ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء
کو ہوا تھا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نہ صرف
ایک کام یاب سیاست داں بلکہ آزادی کے
ایک بے نظیر مجاہد تھے۔ ان کی پبلک لائف
کا آغاز ۱۹۱۶ء سے ہوا۔

۔ کانگریس میں شامل ہونے کے بعد وہ کئی بار جیل گئے۔ باردولی ستیہ گرہ
میں ان کا زبردست ہاتھ تھا۔ کانگریس کے ۱۹۳۱ء کے کراچی سیشن کے وہ پردھان
چنے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں ہندستان کی عارضی حکومت میں وہ وزیر داخلہ ہوئے اور
آزادی کے بعد نائب وزیر اعظم مقرر کیے گئے۔ ان کی وفات ۱۶ جنوری ۱۹۵۱ء
کو ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ دیسی ریاستوں کا ہندستان سے انضمام ہے۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس

سبھاش چندر بوس، نہرو، پٹیل اور راجیندر پرشاد کے ساتھ آسمانِ
سیاست پر طلوع ہوئے۔ وہ بنگال کے چوبیس پرگنے کے ایک چھوٹے سے گاؤں
میں ۲۲ جنوری ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے اُن کے دل میں انگریزوں
کے خلاف زبردست بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ اس لیے آئی، سی، ایس ہونے
کے باوجود اُنھوں نے ملازمت نہیں کی اور ملک کی خدمت اور اُس کی آزادی
کے لیے تن من سے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور آزادی کی جد و جہد میں کئی بار
جیل گئے۔ ہری پور کانگریس منعقدہ ۱۹۳۸ء کے وہ صدر چنے گئے۔ دوسرے
سال پھر تری پورا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے لیکن جب گاندھی جی نے
اس کی مخالفت کی تو اُنھوں نے استعفیٰ دے دیا اور کانگریس سے علیحدہ ہو کر
فارورڈ بلاک کے نام سے اپنی پارٹی الگ بنائی۔ جنگ عظیم شروع ہونے پر حکومت
نے اُنھیں خانہ قید کر دیا لیکن اس کی آنکھ میں دُھول جھونک کر وہ ہندستان
سے نکل جانے میں کام یاب ہو گئے۔ مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے
وہ جرمنی پہنچے۔ وہاں سے جاپان گئے۔ جاپان میں اُنھوں نے راس بہاری بوس
کے اشتراک سے آزاد ہند فوج کی تشکیل کی اور رنگون میں آزاد ہند حکومت
قائم کی۔ جرمنی کی شکست کے بعد آزاد ہند فوج کے لوگ بھی قید کر لیے گئے۔
اس سے کچھ دن پہلے سُبھاش چندر بوس ایک ہوائی جہاز میں جاپان کے لیے
روانہ ہوئے تھے لیکن اس میں آگ لگ گئی اور دوسرے مسافروں کے ساتھ کہا جاتا
ہے کہ وہ بھی جل کر ختم ہو گئے۔ اس طرح آزادی کا دیوانہ آخری دم تک نہ صرف آزادی
کے لیے جنگ کرتا رہا بلکہ مادرِ وطن پر اپنی جان بھی قربان کر دی۔

ڈاکٹر راجیندر پرشاد



بھارت رتن ڈاکٹر راجیندر پرشاد ۳ دسمبر ۱۸۸۴ء
کو ضلع سارن (شمالی بہار) میں پیدا ہوئے۔
سیاست میں انھوں نے قدم چمپارن ستیہ گرہ سے
رکھا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کے زمانے میں اُنھوں نے
وکالت ترک کر دی اور گاندھی جی کے ساتھ

سیاست میں پورے جوش و خروش سے حصہ لینے لگے۔ آزادی کی لڑائی میں وہ کئی مرتبہ جیل گئے۔ ۱۹۳۵ء کے بمبئی کانگریس اجلاس اور اس کے بعد ریپورا کانگریس کے صدر ہوئے۔ ہندستان چھوڑ دو' تجویز پاس ہونے پر ۱۹۴۲ء میں وہ بھی گرفتار کر لیے گئے اور ۱۹۴۵ء تک جیل میں رہے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ دستور ساز اسمبلی کے صدر اور حکومت ہند میں وزیر خوراک رہے۔ دستور کے نافذ ہونے کے بعد وہ اتفاق رائے سے جمہوریۂ ہند کے پہلے صدر چُنے گئے۔ ان کی وفات صداقت آشرم پٹنہ بہار میں ۲۸ فروری ۱۹۶۳ء کو ہوئی۔ ان کی سادگی، انکساری اور حق و صداقت اور اہنسا پر ان کا یقین کامل آئندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتا رہے گا۔

مولانا آزاد



شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہندستان کی آزادی کے سب سے فصیح بیان وکیل تھے۔ یہ مولانا کی عالی ظرفی، وسیع القلبی اور بالغ نظری تھی جس نے سخت سے سخت مخالف کے لیے بھی ان کے دل میں نفرت و حقارت کا جذبہ نہ پیدا ہونے دیا بلکہ ہندستانی قومیت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالنے والوں کے لیے بھی مولانا کے دل میں صبر و شکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ بقول جواہر لال جی مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کی نشو و نما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی۔ انھوں نے قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے اور ان میں حصہ لیا۔ وہ اس کی جد و جہد، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے منتہائے مقصد کی تکمیل میں شریک رہے۔ وہ اس تحریک کا ایک جز تھے اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ اس طویل مدت میں انھوں نے قومی تحریک کی جو رہ نمائی کی صرف اسی کی وجہ سے انھیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔ مولانا ایک جید عالم اور صحافی تھے۔ مولانا کی ولادت دسمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ میں ہوئی۔ ایک سال بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ ہندستان آگئے۔ سیاست میں قدم رکھنے کے بعد وہ کانگریس میں شامل ہو گئے اور آخر وقت تک اس سے وابستہ رہے۔ کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ کئی بار جیل گئے۔ آخری مرتبہ ہندستان چھوڑ دو اندولن کے سلسلے میں ۱۹۴۲ء میں قید کی سزا ہوئی۔ ملک کے آزاد ہونے پر وہ ہندستان کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے اور آخر آخر تک وزارت تعلیم کا قلمدان ان کے پاس رہا۔ اس مرد مجاہد اور سچے قوم پرست اور محب وطن کی رحلت ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔

گووند بلبھ پنت



کانگریس کے ایک اہم ستون پنڈت گووند بلبھ پنت کا جنم ۱۰ ستمبر ۱۸۸۷ء کو الموڑا میں ہوا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد پنت جی نے نینی تال میں وکالت شروع کی اور ساتھ ہی سیاسیات میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ کانگریس میں شامل ہونے کے بعد وہ اس کی تحریکوں میں پیش پیش رہنے لگے۔ پنت جی نے سائمن کمیشن کی پرزور مخالفت کی۔ جب صوبوں میں پہلی کانگریس وزارت بنی تو پنت جی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک اترپردیش کے وزیر اعلیٰ رہے۔ پھر جنگ کے سوال پر آپ نے بھی استعفیٰ دے دیا اور ستیہ گرہ کی۔ ملک کے دوسرے لیڈروں کی طرح ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک پنت جی بھی قید رہے۔ ۱۹۴۶ء میں آپ دوبارہ اترپردیش کے وزیر اعلیٰ ہوئے اور مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ ہو کر جانے تک آپ نے اس عہدے پر کام کیا۔ پنت جی کا انتقال دلی میں ۷ مارچ ۱۹۶۱ء کو ہوا۔
اترپردیش میں خاتمۂ زمینداری، نظم و نسق میں اصلاح اور حکومت و محکمۂ تعلیم میں ہندی کو مناسب مقام دلانے کا سہرا پنت جی ہی کے سر ہے۔

لال بہادر شاستری



میدان جنگ اور عرصۂ امن دونوں میں شجاعت، فراست اور قیادت کا ثبوت دینے والے اور ہندستان کے دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی ولادت ۲ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو بنارس میں ہوئی۔ ان کی ساری زندگی سادگی

اور خاکساری میں گزری۔ گاندھی جی سے ان کی ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور وہ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ۱۹۲۱ء میں انٹرنس کا امتحان چھوڑ کر تحریکِ آزادی میں شریک ہو گئے اور اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ وہ سات مرتبہ تحریکِ آزادی میں شریک ہوئے اور کل ملا کر ۹ سال قید کاٹی۔ جواہر لال جی سے رابطہ قائم ہونے کے بعد وہ کانگریس کا کام کرنے لگے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۶ء میں اترپردیش اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ دوسری مرتبہ ممبر منتخب ہونے کے بعد پنت جی نے انھیں پارلیمنٹری سکریٹری بنایا اور ایک سال کے بعد وزیر پولیس اور نقل و حمل بنا دیے گئے۔ آپ مرکزی حکومت میں بھی وزیر ریلوے اور وزیر نقل و حمل و مواصلات رہے۔ شاستری جی کی ذہانت، اصابت رائے اور تنظیمی صلاحیت کے پیش نظر ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء کے انتخابات میں کانگریسی امیدواروں کے الیکشن کو کامیاب بنانے کا کام اور ذمے داری انھیں سونپ دی گئی۔ شاستری جی نے اپنے فرائض اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیے کہ سارے ملک میں ان کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں وہ وزیر تجارت و صنعت بنائے گئے اور پنڈت پنت کے انتقال پر ۴ اپریل ۱۹۶۱ء کو وزیر داخلہ کا عہدہ ان کے سپرد کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد ۹ جون ۱۹۶۴ء کو وہ ہندستان کے وزیر اعظم منتخب







کر لیے گئے۔ انیس مہینے وزیر اعظم رہ کر ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند میں پاکستان سے سمجھوتہ کرنے کے چند گھنٹے بعد وفات پا گئے۔

شاستری جی فولادی عزم کے مالک تھے جس کا ثبوت انھوں نے ہندستان۔ پاکستان کے مسلح تصادم کے دوران دیا۔ انھوں نے اپنی ولولہ انگیز قیادت سے سارے ملک میں مقابلے، مدافعت اور یکجہتی کی لہر دوڑا دی اور ہر طبقے اور فرقے کے لوگوں کو حریف کے مقابلے پر ایک مستحکم دیوار بنا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن شاستری جی فطرتاً امن پسند واقع ہوئے تھے۔ اسی لیے پاکستان سے ایک باعزت سمجھوتہ کرنے میں بھی وہ ہچکچائے نہیں۔ یہ ان کی زندگی کا یقیناً درخشندہ کارنامہ تھا اور اسی وجہ سے ساری دنیا نے ان کی امن پسندی پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔



جنگ آزادی کے رہنماؤں کا ذکر کرتے وقت اور بھی بہت سے چہرے نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، شری متی سروجنی نائیڈو، شری متی اینی بیسنٹ، سی۔ ایف۔ اینڈریوز، رفیع احمد قدوائی، گرو دیو رویندر ناتھ ٹھاکر، بنکم چندر چٹرجی، پرشوتم داس ٹنڈن، آچاریہ نریندر دیو وغیرہ کی یاد تو ہمیشہ باقی رہے گی اور ان کی قربانیاں آیندہ نسلوں میں نہ صرف وطن کی حفاظت کے لیے جان تک کی قربانیاں پیش کرنے کا ولولہ اور اُمنگ پیدا کرتی رہیں گی بلکہ ان سے حوصلہ پا کر ہم اقتصادی آزادی اور سوشلسٹ طرز کے سماج کے قیام کے مقصد میں بھی یقیناً کامیاب ہوں گے۔



پرچمِ ہندوستان

کیف احمد صدیقی

اے ترنگے، اے حقیقی پرچمِ ہندوستاں
تیرے ہر اک رنگ سے ہے رنگِ یکجہتی عیاں
تو شہیدوں کی امانت ہے، وطن کی آبرو
تیری نظروں میں نہیں کچھ امتیازِ رنگ و بو
کر رہا ہے تو وطن کی پاس بانی آج بھی
عزم سے تیرے ٹپکتی ہے جوانی آج بھی
ہند کی ساکن فضاؤں میں تری پرواز ہے
تیری ہر جنبش سے پیدا وقت کی آواز ہے
ہند کا ایوانِ آزادی تری تعمیر ہے
تو شہیدانِ وطن کے خواب کی تعبیر ہے
تیرا استقبال کرتے ہیں ستارے عرش پر
قوم اِدھر آنکھیں بچھا دیتی ہے اپنی فرش پر
آج ہر اہلِ وطن کے دل میں عزت ہے تری
جس پہ ساری عظمتیں قرباں وہ عظمت ہے تری
جو دلوں پر کر رہا ہے اُس حکومت کی قسم!
ہر بلندی میں ہے پستی تیری رفعت کی قسم!
تو ہی جب بیدار کر دیتا ہے فکرِ آب و گِل
ایک ٹھوکر میں ہلا دیتا ہے کہسار وں کے دل
مردہ قوموں میں تجھی سے زندگی پیدا ہوئی
جہل کی تاریکیوں میں روشنی پیدا ہوئی
وقف ہے ہر ہر نفس تیری سلامی کے لیے
سب دعا گو ہیں تری عمرِ دوامی کے لیے
اپنی آزادی امانت، اور تو اُس کا امیں
جان بھی دے کر نہ جھکنے دیں گے ہم تیری جبیں

جمالِ تیشہ

مہدی بیتاب گڑھی

محنت سے زندگی کے چمن میں بہار ہے
گُل پیرہن زمیں ہے فلک زرنگار ہے
آباد اس کے دم ہی سے ہر اک دیار ہے
ہر ذرہ اس کے فیض سے ہی سیم بار ہے
محنت نے زندگی کو اُبھرنا سکھا دیا
محنت نے پتھروں کو اجنتا بنا دیا

محنت رہی ہے تیشۂ فرہاد کا جمال
محنت نے روپ تاج کو بخشا ہے لازوال
محنت ہے لال قلعے کی دیوار کا جلال
محنت کے دستِ شوق کا دیکھو ذرا کمال
دھرتی پہ اس نے ماتھے سے ٹپکا کے جب عرق
پھوٹی ہے کشت زارِ عمل سے نئی شفق

محنت ہی نے حیات کو بخشا ہے رنگ و نور
محنت ہی نے دیا ہے ہمیں زیست کا شعور
ہر مرحلے کو اس کے ہی بل پر کیا عبور
پایا ہے ہم نے اس سے محبت کا بھی سرور
محنت نے دشت و در کو خیاباں بنا دیا
کانٹوں کو بھی بہار بداماں بنا دیا

اس کے ہی دم سے انجمن آرا ہے زندگی
اس کے طفیل بزمِ جہاں میں ہے روشنی
اس کے سبب ہے عالمِ امکاں میں دلکشی
اس نے ہی کی ازل سے زمانے کی رہبری
جو تھک کے جھک چکے تھے ان کو نیا حوصلہ دیا
منزل نئی دکھائی، نیا راستہ دیا

محنت، کلیدِ بابِ ترقی ہے دوستو!
محنت کے دم سے گلشنِ ہستی ہے دوستو!
محنت ہی سے حیات دُلہن سی ہے دوستو!
محنت سے مہر و مہ نے چمک لی ہے دوستو!
محنت بنائے دانش و علم و کمال ہے
محنت سے فکر و فن کی جبیں پر جمال ہے

بیگم حضرت محل

حسین عبّاس عابدی

تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں معمولی طبقے کے جوہر قابل نے اکثر نامساعد حالات میں بھی وقت کی پشت پر اپنے نقش قدم ثبت کیے ہیں اور تاریخ کے دھارے کو نیا موڑ دیا ہے۔ انسانی عزائم کی صلابت کے ان زندۂ جاوید مظاہر کی فہرست میں بیگم حضرت محل کا نام جلی حرفوں میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے غربت سے لے کر امارت تک، کھپریلوں سے لے کر محل شاہی کی وسعت تک، بزم سے لے کر میدان رزم میں شمشیر بکف سپہ سالار تک زندگی کے ہر موڑ پر اپنے عزم کی بلندی، ارادے کی پختگی اور فطری دانشمندی کی بہ دولت نہ صرف نمایاں کامیابی حاصل کی بلکہ تاریخ کے ممتاز ترین افراد کے درمیان ایک اہم جگہ کی مالک بن گئیں۔ بیگم حضرت محل لکھنؤ کے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کا گھریلو نام امراؤ تھا۔ واجد علی شاہ کے حرم میں داخل ہو کر انھوں نے نہ صرف عزت و توقیر حاصل کی بلکہ کچھ عرصے بعد جب ان کے بطن سے واجد علی شاہ کا چوتھا شاہزادہ پیدا ہوا تو وہ بادشاہ کی بیگمات میں سب سے زیادہ منظور نظر ہو گئیں۔ واجد علی شاہ نے امراؤ کو حضرت محل کا خطاب عطا کیا اور دو ہزار روپیہ ماہانہ مشاہرہ ذاتی مصارف کے لیے مقرر کیا۔ حضرت محل کی زندگی کا یہ دور جو ایک محبوب اور وفاشعار بیوی اور ایک مشفق ماں کی حیثیت سے گزرا عوامی نقطۂ نظر سے کوئی زیادہ اہم نہیں بلکہ جس دور میں ان کی وہ خداداد صلاحیتیں بروئے کار آئیں جنھوں نے انھیں حیات دوام بخشی، وہ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

واجد علی شاہ جب ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے مٹیا برج بھیجے گئے، تو حضرت محل ان کے ساتھ کلکتہ نہ گئیں اور لکھنؤ ہی میں مقیم رہیں۔ تنخواہ دو ہزار سے گھٹا کر پانچ سو روپیہ ماہوار کر دی گئی۔ آمدنی میں تخفیف کی وجہ سے اگرچہ زمانۂ شاہی کا تزک و احتشام ختم ہو گیا تھا مگر محفوظ زر و جواہر کی وجہ سے بسر اوقات میں کوئی دقت نہ تھی۔ ممو خاں حضرت محل کے داروغہ اور ٹھاکر پرشاد دیوان تھے۔ یہ لوگ نمک خوار قدیم اور بیگم کے جاں نثاروں میں تھے۔ انھیں کی معرفت محل کا انتظام حسن و خوبی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں ۹ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں ہندستانی سپاہیوں نے علم آزادی بلند کیا اور لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئی۔ جب ۲۴ر جون ۱۸۵۷ء کو ہندستانی فوج لکھنؤ کے نواح میں داخل ہوئی تو لکھنؤ کے گنسز بزعم خود" باغیوں" کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے مگر مقابلے کی تاب نہ لا کر ریذیڈنسی (بیلی گارد) میں واپس آ گئے۔ فوج نے تعاقب کیا اور بیلی گارد اور قلعہ مچھی بھون کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کا نظم و نسق درہم و برہم ہو گیا۔ یہ صورت حال دوسری جولائی تک قائم رہی۔ لیکن ۲ر جولائی کو فوجی افسروں نے باہم صلاح و مشورہ کر کے شہزادہ برجیس قدر کو تخت حکومت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۳ر جولائی کو راجہ جے لال سنگھ پسر راجہ درشن سنگھ ملازم شاہی کے توسط سے حضرت محل سے مدعا بیان کیا گیا۔ انھوں نے کچھ پس و پیش کے بعد درخواست منظور کر لی اور ۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین کی تحریک اور ممو خاں کی تائید سے شہزادہ رمضان علی (برجیس قدر) شہنشاہ دہلی بہادر شاہ کے وزیر کی حیثیت سے تخت واجدی پر متمکن ہوئے۔ سید برکات احمد رسالدار اور شہاب الدین نے رسم تاجپوشی ادا کی۔ مثنوی حزن اختر مصنفۂ واجد علی شاہ کے بموجب اس وقت برجیس قدر کی عمر ۱۴ سال اور مولوی نجم الغنی مصنف تاریخ اودھ کے بقول ۱۱ سال تھی۔[۱] بہرحال تخت نشینی کے وقت چونکہ شاہزادہ نابالغ تھا اس لیے حضرت محل مشیر قرار پائیں۔ جملہ افسروں نے نذریں دیں۔ اکیس توپوں کی سلامی دی گئی اور شہر میں منادی ہوئی کہ "خلق خدا کی ملک شاہ دلی کا۔ حکم برجیس قدر کا۔" اگلے روز عام دربار ہوا جس میں تمام عہدیدار حاضر ہوئے۔ سب کی نذریں قبول ہوئیں اور سابق عہدوں پر بحال ہوئے۔[۲] ممو خاں کو ناصر الدولہ کا خطاب ملا اور نائب ریاست بنائے گئے۔ جنس و نقد اور اسباب جنگ کی فراہمی کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ مہاراجہ بال کرشن کو خلعت دیوانی ملا اور نواب شرف الدولہ نائب دیوان بنائے گئے۔

۱؎ تاریخ اودھ صفحہ ۲۵۷ ۲؎ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۷

شروع ہی سے ملکہ حضرت محل کو سخت دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اول یہ کہ واجد علی شاہ کی دوسری بیگمات اور شاہی خاندان کی مستورات برجیس قدر کی بادشاہت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں اور یہ نہیں چاہتی تھیں کہ تمام اختیارات حضرت محل کو حاصل ہوں۔ اس لیے حضرت محل کو ان سازشانہ سرگرمیوں کا توڑ کرنا پڑا جس کے لیے بڑی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک دور اندیش خاتون کی حیثیت سے انھوں نے تمام شہری اور فوجی کاموں کی دیکھ بھال اور نگرانی خود اپنے ذمے لے لی۔ اور اس طرح محل کی سازشوں کو انھوں نے بے اثر کر دیا۔ دوسرے شہر میں ضبط و نظم کو برقرار رکھنے کا بھی مسئلہ تھا جو شہر سے انگریزوں کی عملداری کے اچانک اٹھ جانے کی وجہ سے اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔ ملکہ نے تمام عناصر کا اشتراک و تعاون حاصل کرنے کی غرض سے مشیروں کی ایک کونسل تشکیل کی اس کونسل کا جلسہ ہفتے میں دو یا تین بار تاروالی کوٹھی میں جس میں اس وقت اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی قیام گاہ ہے منعقد ہوتا تھا[1]

نظم و نسق کی بحالی کے لیے بیگم نے فوراً فرمان جاری کیا کہ "اب کوئی کسی کو نہ لوٹے ورنہ سزا پائے گا"۔ اس حکم کے بعد شہر میں مکمل امن و امان قائم ہو گیا جس سے اہالیان شہر تو مطمئن ہوئے مگر اشیائے خورد و نوش کی سخت تنگی اور روپیہ ناپید تھا۔ حضرت محل نے یہ دیکھ کر گھر کا تمام اثاثہ مع زر و جواہر کے عطا کر دیا جس کی مالیت تقریباً ۴ لاکھ روپیہ تھی۔ نئی ٹکسال بنی اور برجیس قدر کے نام کا سکہ ڈھلنے لگا[2] ایک سکے پر یہ شعر کندہ تھا ؎

سکہ زد از فضل حق بر اشرفی مہر و ماہ

اختر سلطان عالم میرزا برجیس قدر

ایک دوسرے سکہ پر یہ شعر کندہ تھا ؎

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر و ماہ

نیر دیں میرزا برجیس قدر

اخراجات کے لیے نواب حضور عالم اور دوسرے امرا سے جو روپیہ بیگم کو ملا اس کی تفصیل قیصر التواریخ صفحہ ۲۲۶ پر یوں درج ہے:

(۱) سامان نقد و جنس۔ ۱۸ لاکھ روپیہ۔ (۲) جواہرات۔ ۲ لاکھ روپیہ۔ (۳) متفرقات۔ ۱ لاکھ روپیہ (۴) اچھے صاحب۔ ۵۰ ہزار روپیہ۔ (۵) میر احسان علی خاں ۲۵ ہزار روپیہ (۶) منجھلی بیگم دس ہزار روپیہ (۷) محمد بخش داروغہ۔ ۵ ہزار روپیہ (۸) چندی صاحب دیوان ۵ لاکھ روپیہ اور (۹) اہل شہر سے۔ ۵۵ لاکھ روپیہ۔

انگریزوں کو ملک بدر کرنے کے لیے حضرت محل نے فوج اور سامان جنگ فراہم کرنا شروع کیا۔ تمام رؤسا اور تعلقہ داروں کو برجیس قدر کی طرف سے حسب ذیل پروانہ طلبی بھیجا گیا:

"بفضل خدا سے بتاریخ سعید روز نیک ما بدولت و اقبال سند نے مسند آبائی پر جلوس فرمایا۔ تمھیں لکھا جاتا ہے کہ کوئی انگریز مع فوج و اہلکار کسی گھاٹ سے تمھارے علاقے میں اترنے نہ پائے جس طرح سے ہو مقابلہ کرنا اور بعور دیکھنے حکم نامہ ہذا مع فوج و توپ در دولت پر حاضر ہونا۔ تاکید جانو"۔ اکثر امرا مثلاً حشمت علی سندیلہ، کلو خاں تانپارہ، درگیج سنگھ، نواب علی خاں رئیس محمود آباد، راجہ سکھ درشن سنگھ، بابو گلاب سنگھ تعلقہ دار نرول وغیرہ فوج انگریزی سے خوب لڑے۔ بعض راجگان اپنی فوج لے کر لکھنؤ آئے، شریک جنگ ہوئے اور اپنے سپاہیوں کی خوراک کا بھی خود انتظام کرتے تھے[3] مگر بعض زمانہ ساز امرا مثلاً ہردیو بخش، میر غلام جعفر، میر غلام علی وغیرہ حاضر ہوئے اور غیر حاضری کے سبب سے مطلع کیا۔ کچھ تعلقہ داروں نے حسن تدبیر سے کام لیا۔ مثال کے طور پر زبرت سنگھ تعلقدار روہیا طلب کیے جانے پر حاضر نہ ہوا لیکن یہ خط لکھ کر بھیج دیا: "پروانہ کرامت نشانہ حضور شعرا جلاس فرمائی آیا سرفراز و ممتاز کیا۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ خانہ زاد کی گڑھی سے علاقہ انگریزی قریب ہے فقط دریائے گنگ درمیان ہے۔ خانہ زاد کا آنا مصلحت وقت نہیں ہے۔ انشاء اللہ اگر کفار قصد عبور گنگ کریں گے اقبال سرکار سے مقابلہ کر کے قتل کروں گا۔ واجب تھا عرض کیا"۔ جن تعلقداروں سے کمک ملی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) راجہ دیبی بخش سنگھ راجہ گونڈا۔ ۳ ہزار سپاہی (۲) آنندی اور خوشحال وغیرہ تعلقدار گوشائیں گنج۔ ۲۰ ہزار سپاہی (۳) راجہ سکھ درشن سنگھ زمیندار ۷ ہزار سپاہی (۴) سجرام بخش زمیندار ۲ ہزار سپاہی، ۲ ضرب توپ (۵) راجہ لال مادھو سنگھ تعلقدار امیٹھی ۵ ہزار سپاہی، ۴ ضرب توپ ۲۰۰ سوار (۶) رانا بینی

---

[1] نانا صاحب پیشوا از آنند سروپ سراصفحہ ۳۶، ۲۶۱ [2] قیصر التواریخ صفحہ ۲۲۵، صفحہ ۲۲۶ [3] قیصر التواریخ

مادھو سنگھ ۵ ہزار سپاہی، ۵ ضرب توپ (۷) حشمت علی چودھری تعلقدار سندیلہ ۴ ہزار سپاہی (۸) میر منصب علی تعلقدار رسول آباد، ۱ ہزار سپاہی (۹) رگھوناتھ سنگھ تعلقدار کھجور گاؤں۔ ۲ ہزار سپاہی، ۴ ضرب توپ (۱۰) کلو خاں کارندہ نانپارہ ۱۰ ہزار سپاہی۔

حضرت محل کو ملنے والی مندرجہ بالا کمک انگریزوں کے وسائل اور والیان ریاست سے ملنے والی امداد کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی۔ مگر حضرت محل نے ہمت نہ ہاری اور تمام دشواریوں کے باوجود انگریزوں سے جنگ شروع کردی۔ چنانچہ مولوی احمد اللہ شاہ شاہجہانپوری کی قیادت میں ۳۱ جولائی کو بیلی گارد پر پہلا حملہ ہوا مگر ریذیڈنسی پر قبضہ نہ ہو سکا۔ بیگم فوجوں کی کمان خود کرتی تھیں۔ وہ خود میدان جنگ میں بے مثال بہادری کا مظاہرہ کرتی تھیں جس سے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھتا تھا اور ان کے استقلال جرات سے فوجیوں کے جوش و ولولے میں اضافہ ہوتا تھا۔ بے جگری سے لڑنے والوں اور کارنمایاں انجام دینے والوں کی وہ انعام و اکرام سے ہمت افزائی کرتی تھیں۔ عالم باغ کے معرکے میں راجہ مان سنگھ کو ان کی خدمات کے صلے میں "فرزند خاص" کے خطاب سے نوازا، رومال و دو شالے کی خلعت کے علاوہ ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت فرمایا اور بعد فتح زر کثیر اور جاگیر دار دینے کا وعدہ کیا۔[1]

جنگ کے دوران بیگم کا قیام چونکھی میں تھا۔ وہیں دربار ہوتا تھا اور امور مملکت انجام پاتے تھے۔[2] وسط اگست میں کانپور میں فرنگی اقتدار کی بحالی کے بعد وہاں کی شکست خوردہ فوج فدا حسین رسالہ دار کی سرکردگی میں مع توپ خانہ لکھنؤ آگئی۔ اس کمک کے آجانے سے لڑائی کا زور بہت بڑھ گیا۔ جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے بیلی گارد پر حملہ کیا۔ تباہ حال انگریزوں نے مورچوں میں پناہ لی۔ گھمسان لڑائی کے بعد دست بدست تلوار چلنے کی نوبت آئی۔ اس معرکہ میں انگریزوں کا زبردست نقصان ہوا اور لکھنؤ سے ان کا تسلط بالکل اٹھ گیا۔ حضرت محل نے جنگ کا نقشہ کچھ اس خوبی سے ترتیب دیا تھا کہ "صرف گیارہ روز میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزوں کی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی۔"[3]

مگر یہ سب کب تک چلتا۔ وسائل کی کمی، آپس کے افتراق اور مفسدوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے انگریزوں نے پھر لکھنؤ کا محاصرہ کرلیا اور برٹش فوجیں کئی طرف سے لکھنؤ میں داخل ہوئیں۔ انگریزوں اور نیپالیوں کا پہلا متحدہ حملہ عالم باغ پر ہوا۔ اس کو فتح کرنے کے بعد بیگم کوٹھی پر حملہ ہوا۔ بہت سخت لڑائی ہوئی۔ آٹھ نو گھنٹے تک مسلسل گولہ باری ہونے پر دیوار میں ایک دراز پیدا ہوگئی جس پر یورش کرکے نے پیر (NAPIER) نے قبضہ کرلیا۔ ہر چند کہ بیگم جانتی تھیں کہ حملہ کا سب سے زیادہ زد چونکھی پر ہے تاہم وہ اسے چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں اور میدان جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہونا چاہتی تھیں۔ عن قریب تھا کہ انگریز فتحیاب ہو جائے کہ خان علی خاں مع ایک ہزار فوج آگئے۔ انھوں نے بیگم کو چونکھی چھوڑنے پر راضی کرلیا۔ حضرت محل دیگر بیگمات اور ملازمین کے ہمراہ برجیس قدر کو لے کر نکلیں اور ٹیلہ پیر شاہ جلیل سے گزر کر مولوی گنج کے پل پر پہنچیں۔ رات غلام رضا کے گھر پر گزار کر پھر وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں اور وہاں سے محلسرائے حسین آباد گئیں۔ اس درمیان میں انگریزوں نے چونکھی پر قبضہ کرلیا۔ اس معرکے میں ۵ سو ہندوستانی مجاہدین کام آئے۔ انگریز ۲۰ مقتول اور ۱۱۳ مجروح ہوئے۔ جنرل اوٹرم نے ۱۴ مارچ کو مین ہاؤس، چھتر منزل، تارا کوٹھی اور قیصر باغ پر قبضہ کرلیا۔ مولوی ذکاء اللہ جیسے انگریز دوست مورخ نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں میں جوش و بہادری کی کمی نہ تھی۔ انگریزوں کی فتح کا سبب توپ خانہ کی برتری اور سامان جنگ کی فراوانی تھی جس کی بنا میں بیگم کے گرد و پیش جملہ اہلکار و خدمت پیشہ لوگ نیز بچی کھچی فوج اکٹھا ہوگئی۔ ارادہ ہوا کہ شمال کے پہاڑوں میں جاکے پناہ حاصل کرکے اپنی قوت کو از سر نو مجتمع اور منظم کرنے کے بعد دوبارہ جنگ شروع کی جائے۔ جب اس ارادے کی خبر جنرل اوٹرم کو ہوئی تو اس نے حضرت محل کو پیغام بھیجا کہ جنگ سے دستبردار ہو جایئے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم واجد علی شاہ کا ملک بدستور آپ کے حوالہ کردیں گے۔"[4] مگر حضرت محل رضامند نہ ہوئیں اور اسے صرف دھوکہ اور فریب تصور کیا۔ وہ ترک وطن کے ارادے پر مستقل رہیں۔ پھر ایک لاکھ ساتھیوں کے ہمراہ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر نیپال کی سرحد پر جا پہنچیں، اور کوہ بٹول پر واقع نواب آصف الدولہ کی بارہ دری میں فروکش

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۲۱۶ [2] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۵۶ [3] قیصر التواریخ صفحہ ۲۲۰ [4] قیصر التواریخ صفحہ ۳۲۲

ہوئیں۔ گردش تقدیر کی بدولت وہاں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ نیپال کے رانا جنگ بہادر نے نرنجن مانجھی کی معرفت کہلوایا کہ "انگریزوں سے صلح کیجئے یا اقامت اختیار کیجیے۔ ہم سے امداد و اعانت کی توقع نہ رکھیے۔" ادھر ہندستان میں جنگ آزادی کی تحریک تقریباً کچلی جا چکی تھی۔ سرکردہ افراد یا تو روپوش ہو گئے تھے یا پھانسی پا چکے تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجبوراً حضرت محل نے جنگ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا اور اس طرح دس مہینے تک کامیابی سے جاری رہنے والی جنگ کا نتیجہ شکست کی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرت محل کو تو نیپال میں پناہ مل گئی مگر ان کے ہمراہیوں کو نیپال میں داخلے کی اجازت نہ ملی اور وہ سب ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ بیگم کو تمام جواہرات اور قیمتی اسباب دربار میں نذر کرنا پڑے اور وہاں سے کچھ روپیہ گزارے کے لیے مقرر ہو گیا۔ چمن لکھنؤ کا پھول جس کی خوشبو نے ایک عالم کو مسحور کر لیا تھا اور جس کی شہرت دور دور تک تھی، بالآخر کٹھمنڈو کے ویرانے میں اپریل ۱۸۷۹ء میں مرجھا گیا۔

اس باہمت خاتون کی ہمت و دلیری کا اندازہ جنگ کے دوران کے بے شمار واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں پھر بھی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مجاہدین آزادی کی ہمت و حوصلہ بڑھانے کی غرض سے حضرت محل اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میدان جنگ میں بہ نفس نفیس پہنچ جاتی تھیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ عالم باغ کے مورچے میں پیش آیا۔ عالم باغ پر کل ملا کر چھ حملے انگریزوں کے ہوئے۔ ان میں سے ایک حملے کے دوران ۲۵ ر فروری ۱۸۵۸ء کو دفاعی انتظامات اور لڑائی کے بندوبست کے لیے ہاتھی پر سوار ملکہ خود میدان جنگ میں پہنچ گئیں جس سے قومی فوج کے حوصلے بے حد بلند ہو گئے اور اس طرح اس سرفروش ہندستانی خاتون نے اپنی جانبازی اور جرات و ہمت کی قابل فخر مثال تاریخ کے صفحے میں محفوظ کر دی۔

لکھنؤ فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے جس وحشت و بربریت کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ کانپور اور دہلی میں ہونے والے مظالم کا یہاں بھی اعادہ کیا گیا۔ بے شمار ناکردہ گناہ قتل کئے گئے۔ سڑکوں پر دو رویہ سولیاں گاڑ کر بے گناہ شہریوں کو ذرا ذرا سے شبے پر پھانسی دی گئی۔ عوام کو بری طرح پندرہ روز تک مسلسل لوٹا گیا۔ تمام املاک شاہی مع اوقاف وغیرہ کے ضبط کر لی گئی۔ درگاہ کا اسباب لوٹ لیا گیا۔ مستورات کی کھلے عام بے آبروئی کی گئی۔ سیکڑوں عورتوں نے گوروں کے ڈر سے کنوؤں میں کود کر خودکشی کر لی۔ متعدد شاہی عمارتیں کھدوا کر زمین کے برابر کر دی گئیں۔ شاہی سامان کوڑیوں کے مول انگریزوں نے فروخت کیا اور مہاجنوں کے ہاتھ لوٹ کا سونا ایک روپیہ تولہ کے حساب سے بیچا۔[2]

ان انسانیت سوز مظالم سے عوام مجبور و بے بس بنا دیے گئے اور بظاہر آزادیٔ وطن کی تحریک کو بے رحمی سے کچل دیا گیا اور "غدر" فرو ہو گیا مگر جذبۂ آزادی کو نہ کچلا جا سکا۔ یہ جذبہ عوام کے دلوں میں نہ صرف کارفرما رہا بلکہ چنگاری سے شرارہ بن کر غیر ملکی تسلط کے خرمن پر گرنے کے لیے بے چین رہا۔ یہی جذبہ تھا جو بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کی شکل میں ظاہر ہوا اور طویل آئینی جدوجہد کے بعد جس میں بیش قیمت کو بیش بہا قربانیاں دینا پڑیں، وہ دن آیا جب ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کے لہو سے سینچا ہوا حریت و آزادی کا یہ پودا ایک گھنا اور سایہ دار درخت بن گیا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم بیرونی اقتدار سے آزاد ہو گئے۔

★

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۰۵ [2] قیصر التواریخ ص۳۲۲

۱۵ اگست ـــ یومِ آزادی

مفتوںؔ کوٹوی

مست ہے باغ میں ہر سرو سمن آج کے دن
رنگ کیا لایا ہے گلزارِ وطن آج کے دن

اس کے ہر ذرّے سے خوش بوئے وفا آتی ہے
ہے ہمیں خاکِ وطن، مشکِ ختن آج کے دن

تھا غلامی کا اندھیرا ہی اندھیرا ہر سو،
دل میں پھوٹی تھی امیدوں کی کرن آج کے دن

ہم بھلائیں نہ فدایانِ وطن کی یادیں
رہیں نظروں میں وہی دار و رسن آج کے دن

جاں نثاروں ہی کے صدقے میں ملی آزادی
اُن کے صدقے ہی میں ہیں مہکتے چمن آج کے دن

عہدِ تعمیرِ وطن، وعدۂ تزئینِ وطن
ہر جگہ ہو یہی موضوعِ سخن آج کے دن

دیکھیں اور دیکھ کے سب شیر و شکر ہو جائیں
اختلاطِ بہم گنگ و جمن آج کے دن

قحط ہو یا ہو گرانی، کہ ہو جنگی ماحول،
لاؤ ہمت ـــ جو ہو طوفان شکن آج کے دن

جس اخوت سے ہوئی کوششِ آزادیٔ ملک
اُس اخوت کا ہو پھر تازہ چلن آج کے دن

جس لگن نے ہمیں بخشا ہے یہ انعامِ بہار
پھر وہی زندہ کریں دل میں لگن آج کے دن

کارخانوں کی یہ بہتات، کلوں کی کثرت،
فخر کر سکتے ہیں اربابِ وطن آج کے دن

اور بھی ہم کو ترقی کی طرف لے جائے!
ارتقائے چمن و دشت و دمن آج کے دن

ادب و شعر ہو مفتوںؔ کا فن اور موسیقی
ہو ہر اک بات بہ عنوانِ وطن آج کے دن

روشنی تیز کرو

زبیدہ بیگم شمعؔ

لَو عزائم کے چراغوں کی کچھ اور تیز کرو
چہرۂ عہدِ مشقت کو عرق ریز کرو

چپے چپے پہ نئے دور کے روشن ہوں ایاغ
رہ گزاروں کو ابھی اور بھی گل بیز کرو

دیدۂ ارضِ خرابات کو دو خواب نئے
ذوقِ تعمیر کے رہوار کو مہمیز کرو

بڑھ رہے ہیں رہِ ہستی کی طرف سائے کئی
گردشِ جامِ مے و مہر کچھ اور تیز کرو

منتظر وادیٔ گل ہے لیے مینائے خوشی
جادۂ شوق کے صدمات کو انگیز کرو

مٹ کے بن جاؤ ضیائے رُخِ فردائے چمن
ہر نفس موجِ تمنا کو جنوں خیز کرو

بڑھ رہی ہے دلِ ماحول کی بے رنگی اور
سُرخیٔ بادۂ اخلاص و وفا تیز کرو

کھول دو نقرئی تہذیب کا تابندہ ورق
شیشۂ دل مے اخلاق سے لب ریز کرو

گردشِ وقت ہی لائی تھی بہاروں کی سحر
ساتھیو! اس کی کڑی دھوپ بھی انگیز کرو

بن کے خوش بوئے گل تر رہو گلشن میں سدا
فتنہ و شر کے ہر اک گام سے پرہیز کرو

تشنگیٔ عشق کی دراصل ہے اک سیرابی
شعلۂ عشق و جنوں دے کے ہوا تیز کرو

شمعؔ ہر موجِ تمنا کو بنانا ہے دلہن
دامنِ دل کے ہر اک تار کو خوں ریز کرو

اُتّر پردیش میں گوداموں کی اسکیم

بنارسی داس

گوداموں کی تعمیر کی اسکیم ایک نیا اقدام ہے جس کو تقریباً نو سال پہلے شروع کیا گیا تھا۔ اس کا اثر ہندوستان جیسے عظیم ملک کی معاشیات پر کچھ عرصہ بعد محسوس کیا جا سکے گا۔ ملک میں غلے کی کمی اور اس کے نتیجے میں مرکزی اور ریاستی گودام کارپوریشنوں کے ذریعے غلہ کو محفوظ طور پر ذخیرہ کرنے کی ضرورت کے پیش نظر اس کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا کیا جائے بلکہ جو کچھ پیدا ہو اس کو محفوظ بھی رکھا جائے۔

موٹے طور پر تخمینہ لگایا گیا ہے کہ غلے کو ذخیرہ کرنے کے دوران پانچ سے ۱۰ فی صدی تک غلے کا نقصان ہوتا ہے اور اگر کارپوریشن اس کا محض نصف غلہ ضائع ہونے سے بچا سکیں تو اس سے عملی طور پر غلے کی کمی دور ہو جائے گی۔ وزن کے لحاظ سے تقریباً ۴۰ لاکھ ٹن غلہ ضائع ہوتا ہے۔ غلے کے علاوہ دوسری زراعتی پیداوار کو بھی ذخیرہ کرنے کے دوران کافی نقصان پہنچتا ہے۔ ان میں سے اکثر اجناس ہماری قومی معاشیات کے لیے بہت اہم ہیں اور بعض سے تو بیرونی زرمبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ نہایت ضروری ہے کہ ان اجناس کو سائنسی طریقوں سے ذخیرہ کیا جائے اور انھیں ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

رزرو بینک آف انڈیا کے مشورہ پر حکومت ہند کی طرف سے مقرر کی ہوئی کل ہند دیہی قرضہ جائزہ کمیٹی کی سفارشات کے نتیجے میں زراعتی پیداوار ترقی اور گودام کارپوریشن ایکٹ سنہ ۱۹۵۶ء کے نفاذ سے ہندوستان میں گوداموں میں مال رکھنے کی سہولتوں کو ایک ٹھوس شکل دی گئی۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سنہ ۱۹۶۲ء میں مذکورہ بالا قانون کی جگہ پر قومی امداد باہمی ترقیاتی ایکٹ سنہ ۱۹۶۲ء نافذ کیا گیا۔

مرکزی گودام کارپوریشن

مرکزی گودام کارپوریشن کا قیام مارچ سنہ ۱۹۵۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ کارپوریشن نے ۷۰۰۰۰ ٹن غلے کے ذخیرہ سے اپنا کام شروع کیا تھا۔ یہ ذخیرہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے اختتام تک بڑھ کر ۸۰۰۰۰ ٹن تک پہنچ گیا اور سنہ ۱۹۵۵ء کے دوران اس میں مزید ڈھائی لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا۔ غلے کی اس مقدار میں ۱۴ ریاستی گودام کارپوریشنوں کی طرف سے قائم کیے ہوئے گوداموں کی وجہ سے مزید چار لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا۔

اتر پردیش ریاستی گودام کارپوریشن

حکومت اتر پردیش نے مرکزی قانون کے تحت مارچ سنہ ۱۹۵۸ء میں اتر پردیش ریاستی گودام کارپوریشن قائم کیا تھا۔ مرکزی اور ریاستی گودام کارپوریشن کا طریقۂ کار یکساں ہے۔ اتر پردیش ریاستی گودام کارپوریشن کے دو حصے دار ہیں۔ یہ حصے دار مرکزی گودام کارپوریشن اور حکومت اتر پردیش ہیں جن کا سرمایۂ حصص برابر ہے۔

کارپوریشن کو جون سنہ ۱۹۶۶ء کے آخر تک ذخیرہ کے لیے ۵،۶۳،۷ لاکھ کوئنٹل مختلف اجناس موصول ہوئیں۔ اس وقت اتر پردیش میں ۱۴۱ ریاستی

گودام اور ۷ اذیلی گودام کام کر رہے ہیں۔ کارپوریشن کے کام میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔ کارپوریشن کو سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے دوران ایک لاکھ روپیہ کا منافع ہونے کی امید ہے۔

اترپردیش میں گزشتہ برسوں کے مقابلے میں سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے دوران گوداموں میں مال جمع کرانے والے کسانوں اور امداد باہمی انجمنوں کی تعداد میں ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ ویرہاؤسنگ ایک تین مرحلوں والی اسکیم ہے جس میں امداد باہمی انجمنوں کو تحصیل اور تعلقے کی سطح پر ریاستی ویرہاؤسنگ کارپوریشنوں کو ریاستی اہمیت کی منڈیوں کی سطح پر اور مرکزی ویرہاؤسنگ کارپوریشن کو قومی اہمیت کی منڈیوں کی سطح پر گودام قائم کرنا پڑتے ہیں۔

مال کیسے جمع کیا جاتا ہے

مال جمع کرنے والے کو اپنی پیداوار گودام میں لانا پڑتی ہے۔ گوداموں میں مال تولا جاتا ہے۔ مال جمع کرنے والے کو ایک مہربند نمونہ دے دیا جاتا ہے اور اس طرح کے دو نمونے گودام میں رکھے جاتے ہیں تاکہ ان کا کسی وقت بھی جمع شدہ اسٹاک سے مقابلہ کیا جا سکے۔ مال کو سائنسی طریقے سے گودام میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔

گودام کی رسیدیں

گودام میں جمع مال وصول ہو جانے کے بعد مال جمع کرنے والے کو ایک رسید دی جاتی ہے جس میں مال کی مقدار اور کوالٹی کے متعلق تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ رسید کے ساتھ مال کو آگ۔ چوری اور نقب زنی کے خطرات کے خلاف بیمہ کرانے کا ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے۔

اسٹیٹ بینک آف انڈیا اور دوسرے منظور شدہ فہرست بینک گودام کی رسید قبول کرتے ہیں۔ اگر چہ مال گودام میں جمع ہوتا ہے۔ تاہم رسید پیش کرنے پر بینک اس مال کو گروی رکھ سکتا ہے۔ بینک گودام میں رکھے ہوئے مال کی مالیت پر جو سود وصول کرتے ہیں وہ ان کی واقعی شرح سود سے ایک سے ڈیڑھ فی صدی تک کم ہوتی ہے۔

درجہ بندی اور تجربہ

خرید و فروخت کے لیے زراعتی پیداوار کی درجہ بندی بہت اہم ہے۔ اس سلسلے میں مناسب تجزیہ کے لیے ایک ضروری سازوسامان سے آراستہ تجربہ گاہ بہت ضروری ہے تاکہ معیار کے مطابق اسٹاک کی درجہ بندی کی جا سکے۔ گودام کارپوریشن نے تجزیہ اور درجہ بندی کے لیے تمام گوداموں میں ضروری سازوسامان اور تربیت یافتہ عملہ فراہم کیا ہے۔

گوداموں میں رکھے ہوئے اسٹاک کی پوری مالیت کا بیمہ کیا جاتا ہے۔ آگ۔ چوری اور نقب زنی کے خطرات کے پیش نظر اسٹاک کا جو بیمہ کیا جاتا ہے اس کے لیے مال جمع کرانے والے سے کوئی رقم نہیں لی جاتی۔ اس کو صرف مال کو گودام میں ذخیرہ کرنے کے لیے رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر مال جمع کرانے والے سیلاب اور شہر میں پیش آنے والی گڑبڑی وغیرہ کے خطرات کے پیش نظر اپنی پیداوار کا بیمہ کرانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بھی انتظامات موجود ہیں مگر اس کی بیمہ قسط ان کو خود ادا کرنا پڑتی ہے۔

ٹریننگ پروگرام

اجناس کی مناسب درجہ بندی ان کو ذخیرہ کرنے اور کافی عرصہ تک ان کو محفوظ رکھنے اور اسی مقدار اور معیار کے ساتھ ان کو مالک کو واپس کرنے کی ذمے داری گوداموں کے فیلڈ کے عملے پر عائد ہوتی ہے۔ اس طرح اس عملے کے لیے بھرپور عملی تربیت اشد ضروری ہے۔ گودام اسکیم کی توسیع کے سلسلے میں پیش آنے والی بڑی مشکلات میں سے ایک مشکل مناسب طور پر تربیت یافتہ عملے کی کمی ہے۔ مرکزی اور ریاستی گودام کارپوریشن کے ذریعے ہر سال یا سال میں ایک یا زیادہ مرتبہ مقررہ وقفے سے تربیتی کورسوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔



مشکلات کے باوجود آگے بڑھنے کا عزم
قدرتی آفتوں کا پورے اعتماد کے ساتھ مقابلہ
آزادی کا انیسواں سال زرعی پیداوار میں اضافے کی کوششوں کا سال رہا

آزادی کا انیسواں سال قومی اہمیت کے بیشتر واقعات کے لیے یادگار رہے گا۔ زراعتی پیداوار کے ضمن میں بھی اس کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے جبکہ مرحوم وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری نے پاکستانی حملے کے پس منظر میں قوم کو "جے جوان جے کسان" کا نعرہ دیا تھا۔ اس نعرے کا عوام اور بالخصوص کسانوں پر گہرا اثر ہوا اور وہ غذائی پیداوار بڑھانے میں تن من سے لگ گئے۔

زراعتی پیداوار بڑھانے کے لیے بھرپور مہمیں شروع کی گئیں۔ اقتصادی طور پر پسماندہ مشرقی، پہاڑی اور بندیل کھنڈ منطقوں کی کھیتی باڑی کی ضروریات پوری کرنے کی جانب خاص توجہ دی گئی۔ زیر نظر مدت میں زیادہ پیداوار دینے والی فصلوں کی کاشت کا حوصلہ مندانہ پروگرام شروع کیا گیا۔ علاوہ ازیں کسانوں سے یہ کہا گیا کہ وہ آب پاشی کے ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ ریاست بھر میں آلو اور ترکاری کی کاشت پر بہت زور دیا گیا جس سے تسلی بخش نتائج برآمد ہوئے اور ہزاروں ایکڑ کے سبزہ زاروں اور عمارتوں سے ملحق زمینوں میں آلو اور ترکاری کی کاشت ہونے لگی۔

اترپردیش میں زیر نظر سال کے دوران گیہوں، تلہن، آلو اور ترکاریوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اناج کی پیداوار میں جو سنہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں ۱۵۰٫۳۰ لاکھ ٹن تھی دھان کے سیزن میں ریاست بھر میں خشک سالی کی بنا پر معمولی کمی ہو گئی۔ اکتوبر میں بروقت بارش سے گیہوں کی پیداوار ایک مناسب سطح پر برقرار رکھی جا سکی۔

آلو کی پیداوار جو سنہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں ۱۰٫۵۰ لاکھ ٹن تھی سنہ ۱۹۶۵-۶۶ء میں بڑھ کر تقریباً ۱۴ لاکھ ٹن ہو گئی اور آلو کے زیر کاشت رقبہ بھی ۵۰ ہزار ایکڑ سے بڑھ کر ۳٫۵۲ لاکھ ایکڑ ہو گیا۔

ترکاریوں کے زیر کاشت رقبے میں بھی ۹۲۰۰۰ ایکڑ کا اضافہ ہوا۔ زیر نظر مدت میں ۳٫۵۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ ترکاری کے بیج اور تقریباً ۴۰۰ لاکھ پودے تقسیم کیے گئے۔

اناج میں خود کفالت کے حصول کے لیے سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ۱۶۲٫۹۲ لاکھ ٹن اناج پیدا کرنے کا جو نشانہ مقرر کیا گیا ہے، اسے چوتھے منصوبے کے آخر تک بڑھا کر ۱۹۱٫۵۰ لاکھ ٹن کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ۵۳٫۵۵ لاکھ ٹن گنا، ۱۵٫۹۰ لاکھ ٹن تلہن اور ۶۰ ہزار گانٹھیں کپاس بھی پیدا کرنے کی تجویز ہے۔ زراعتی ترقی کے پروگراموں پر سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں تقریباً ۳۶ کروڑ روپیہ اجتماعی ترقی اور امداد باہمی پر، ۷٫۰۰ کروڑ روپیہ اور بجلی اور آب پاشی پر ۶۱٫۶۷ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

توسیعی تنظیم کو مستحکم کرنے، زراعت سے متعلق تجربات اور ریسرچ، کھیتی کے جدید طریقوں اور بہتر بیجوں اور کیمیاوی کھاد کے استعمال ہی کی بدولت زیر نظر سال میں یہ کامیابی حاصل کی جا سکی ہے۔

آئندہ ربیع کے سیزن کے دوران ۳٫۵۰ لاکھ ایکڑ کے رقبے میں زیادہ پیداوار والے گیہوں کی کاشت کی جائے گی۔ زراعتی یونیورسٹی، پنت نگر، نینی تال نے نجی کاشت کاروں کے تعاون سے مکا اور میکسیکو کے گیہوں کے اقسام کی کاشت سے متعلق قابل تعریف کام کیا ہے۔

اترپردیش میں دُہری فصلوں کا زیر کاشت رقبہ جو سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۵۲ و ۱۱۹ لاکھ ایکڑ تھا سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں بڑھ کر ۸۰ و ۱۳۰ لاکھ ایکڑ تک پہنچ گیا۔ اسی طرح بہتر بیجوں کا زیر کاشت رقبہ بھی ۲۱ و ۲۳۴ ایکڑ سے بڑھ کر ۳۶ و ۲۵۵ لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ زیر نظر سال میں ۴۰ و ۲۱۱ لاکھ ایکڑ کے رقبے کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں اور تقریباً ۲۰ و ۶ لاکھ ٹن کیمیادی کھاد تقسیم کی گئی اس کے علاوہ مزید ۲۰ لاکھ ایکڑ میں ہری کھاد بوئی گئی اور پانچ کروڑ ٹن کمپوسٹ کھاد تیار کی گئی۔ زیر نظر مدت میں ۹۲ و ۶۱ لاکھ ایکڑ کے رقبے میں پودوں اور ۵۴ و ۷ لاکھ ایکڑ میں مٹی کے تحفظ کے اقدامات کیے گئے۔ کاشت کاروں کو ۵۰ و ۳ لاکھ جدید زرعی آلات تقسیم کیے گئے۔

ہردوئی، بدایوں، مراد آباد، فرخ آباد اور سیتاپور کے اضلاع میں مونگ پھلی کی کاشت کے پیکیج پروگرام شروع کیے گئے۔ ترکاریوں کی کاشت کے تیز رفتار پروگرام لکھنؤ، کان پور، الہ آباد، وارانسی اور آگرہ کے گرد و پیش کے قصبوں میں شروع کیے گئے۔ آلو کو محفوظ رکھنے کے لیے کولڈ اسٹوریج کی تعداد بڑھا کر ۱۹۰ کر دی گئی۔

کسانوں کو خود اپنے اسٹوریج قائم کرنے کے لیے قرضے کی سہولتیں دی گئیں۔ تقاوی کی درخواستوں پر بلا تاخیر فیصلہ کرنے کے لیے متعلقہ قواعد میں ترمیم کی گئی۔

مٹی کے تحفظ کے کام کے لیے تربیت یافتہ عملے کی فراہمی کے لیے سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں رحمان کھیڑہ ضلع لکھنؤ میں اوورسیروں کا ٹریننگ کورس شروع کیا گیا۔ سن ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۱۳۵ افراد کے پہلے گروپ نے یہ ٹریننگ مکمل کی۔ مٹی کے تحفظ کے پروگرام کی سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران ۷۰ و ۲۱ لاکھ ایکڑ کے رقبے میں توسیع کی جائے گی اور ۶۷ و ۱ لاکھ ایکڑ گھاٹیوں کی زمین اور ۱۰ ہزار ایکڑ اوسر زمین قابلِ کاشت بنائی جائے گی۔

بستی اور سہارنپور میں انگور کی کاشت کے تجربے کیے گئے۔ انگور کی کاشت کا ایک نیا مرکز اس سال لکھنؤ میں کھولا گیا۔ زیر نظر سال میں ۳۱۰۹۰ ایکڑ کے رقبے میں نئے باغات لگائے گئے اور ۳۶۱۲۰ ایکڑ کے رقبے کے پرانے باغات کی درستی کی گئی۔ علاوہ ازیں ۲۰ و ۱۱ لاکھ پپیتے کے پودے اور ۷۵ و ۲ لاکھ کیلے کے پودے تقسیم کیے گئے۔

ریاستی فارموں کو بہتر بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے تاکہ وہ گرد و پیش کے کسانوں کے لیے مثال بن سکیں۔ ریاست کے ۲۰۳ موجودہ ریاستی زراعتی فارموں نے جن کو سنہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۴۲ و ۳ لاکھ روپے کا خسارہ ہوا تھا سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۳ لاکھ روپے کا منافع ہوا۔ کسانوں کو کھیتی کے جدید طریقوں، بہتر بیجوں اور کیمیادی کھاد کے استعمال اور پودوں کے تحفظ کی تدبیروں سے آگاہ کرنے کے لیے سیمینار اور کیمپ منعقد کیے گئے۔

آب پاشی

اترپردیش میں گزشتہ مارچ کے آخر تک آبپاشی کی متعدد بڑی اور درمیانی اسکیموں پر عملدرآمد سے تقریباً ۸۲ ر ۸ لاکھ ایکڑ کے لئے آبپاشی کے مزید ذرائع مہیا کئے گئے۔ اس کے علاوہ زیر نظر مدت میں مزید ۸ ر ۴ لاکھ ایکڑ کے لئے آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔

اس سال جو چوتھے منصوبے کا پہلا سال ہے کوئی نئی اسکیم شروع نہیں کی گئی ہے لیکن پہلے کی نامکمل اسکیموں پر کام جاری ہے۔ ان اسکیموں میں رام گنگا ندی منصوبہ، گنڈک نہر منصوبہ، میجا خزانہ آب، نرور اپشتے کی نو تعمیر، تمریا توسیعی اسکیم اور جنوبی اترپردیش میں بندھیوں کی تعمیر شامل ہیں۔

سرکاری ٹیوب ویلوں نے گزشتہ مالیاتی سال میں بہت وسیع رقبے کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کیں۔ ان ٹیوب ویلوں نے سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۲۰۳۹۱۸۱ ایکڑ کی آبپاشی کی تھی جبکہ گزشتہ سال ان کے ذریعے ۲۹۱۰۶۱۵ ایکڑ کی آبپاشی کی گئی۔

تیسرے منصوبے کی مدت میں انسداد سیلاب کے اقدامات پر ۵۰ ر ۶ کروڑ روپیہ صرف کیا گیا اور اس طرح تقریباً ۴۳ ر ۱ لاکھ ایکڑ آراضی محفوظ کر لی گئی۔ ریاست کے چار مشرقی اضلاع جونپور، غازی پور، اعظم گڑھ اور دیوریا میں تقریباً ۱۲۰۰ ایکڑ کے رقبے کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے تیسرے منصوبے کے آخری دو برسوں میں تقریباً ۴۵ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا۔

چوتھے منصوبے کے پہلے سال میں انسداد سیلاب کے اقدامات پر ایک کروڑ روپیہ صرف کرنے کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ پانی کی نکاسی کو بہتر بنانے کے لئے مالیاتی سال میں ۴۵ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا۔

امداد باہمی

امداد باہمی میں سرکاری حکام کے دخل کو کم کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔ زیر نظر مدت میں نیا امداد باہمی انجمن بل منظور کیا گیا۔ اترپردیش کا یہ

پہلا جامع امداد باہمی قانون ہے جو تحریک کو صحیح نہج پر چلانے میں ایک تاریخی رول ادا کرے گا۔

امداد باہمی انجمنوں کے ممبروں۔ سرمایہ حصص اور امانت کی رقم میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اس بات کا خاص دھیان رکھا گیا کہ تمام قسم کے امداد باہمی قرضے صرف ممبروں کو پیداواری اغراض کے لئے دیئے جائیں۔

اتر پردیش امداد باہمی بنک نے ۲۱ کروڑ روپیہ بطور زر امانت جمع کیا تاکہ وہ کسانوں کی ضروریات کو پوری کر سکیں۔ ریاستی امداد باہمی اراضی ترقیاتی بنک نے اب تک ۵۰ر۷ کروڑ روپئے کے قرضے کے لئے درخواستیں منظور کی ہیں اور ۱۰ر۴ کروڑ روپئے سے زیادہ کے قرضے تقسیم کئے ہیں۔
اشیائے صارفین کو تھوک اور پرائمری اسٹوروں سے مناسب نرخ پر فروخت کرنے کے حصول کے لئے ریاست کی سطح پر ایک امداد باہمی صارفین فیڈریشن قائم کیا گیا۔

تمام امداد باہمی انجمنوں اور ان کے ممبروں نے قومی ہنگامی حالات میں پوری مستعدی سے کام کیا۔ زراعتی انجمنوں۔ دودھ یونینوں اور خدمتی امداد باہمی انجمنوں نے اناج اور دودھ کی پیداوار بڑھانے کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز تر کردیں۔ امداد باہمی خرید و فروخت انجمنوں اور پروسسنگ واحدوں نے قیمتوں کی روک تھام میں اہم رول ادا کیا۔ ریاست کے امداد باہمی اداروں نے قومی دفاع فنڈ میں بھی نمایاں حصہ لیا۔

زیر نظر مدت میں تحریک امداد باہمی کا دوسرا اہم کارنامہ ضلع مرادآباد میں امداد باہمی بے بی فوڈ فیکٹری اور ضلع بلند شہر میں ٹکسٹائل مل کے ضمن میں مزید اقدام تھے۔ اس مل سے آگرہ اور میرٹھ ڈویژنوں میں کپاس کے تقریباً ۱۸۰۰۰ کاشتکار مستفید ہوں گے۔

غذا و رسد

ریاست بدستور مشکل غذائی صورت حال سے دوچار رہی۔ بازار میں اناج کی آمد اگرچہ تسلی بخش رہی تاہم اناج کی قیمتوں میں جو گزشتہ ربیع کی فصل کے بعد کم ہوگئی تھیں بعد میں اضافے کا رجحان پیدا ہوا۔

بڑے شہروں میں کھپت کو ضابطے کے تحت لانے کی قومی پالیسی کے مطابق نیز دوسرے علاقوں کو آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے کانپور میں گزشتہ ۱۶ فروری سے قانونی راشننگ نافذ کی گئی۔

اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں، فیض آباد، وارانسی اور گورکھپور ڈویژنوں کے شہری علاقوں نیز ۵۰ ہزار سے زیادہ آبادی والے دوسرے شہری علاقوں میں جزوی راشننگ نافذ رہی۔ اتر پردیش میں مالیاتی سال رواں میں گزشتہ جون تک سستے اناج کی دکانوں کی مجموعی تعداد ۵۰۰۰۰ تھی جس کے ذریعے ۸۸۰۰۰ ٹن اناج تقسیم کیا گیا۔ کم آمدنی والوں کو آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے ۳۰ ہزار سے ۵۰ ہزار تک کی آبادی والے شہری علاقوں میں آٹا کی تقسیم کی اسکیم شروع کی گئی۔ اتر پردیش کا درآمدی گیہوں کا کوٹہ گزشتہ سال کے ۵۰ ہزار ٹن سے گھٹا کر ۴۰ ہزار ٹن کردیا گیا۔

اناج کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے حکومت نے شادی، غمی اور سماجی تقریبات کے موقعوں پر ۲۵ سے زیادہ افراد کو جن میں میزبان اور اس کے خاندان کے افراد بھی شامل ہیں گیہوں، چاول اور اُن سے بنی ہوئی اشیا پیش کرنے کی ممانعت کردی۔ اسی طرح ہوٹلوں پر بھی یہ پابندی لگادی گئی کہ وہ اپنے گاہکوں کو جمعرات کے دن چاول اور دوشنبہ کے دن تین بجے سہ پہر کے بعد گیہوں اور چاول اور ان سے بنی ہوئی چیزیں پیش نہ کریں اور نہ کسی کو تین سے زیادہ قسم کے کھانے پیش کریں۔

حکومت نے قیمتوں میں اضافے کی روک تھام اور چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کرنیوالوں کو سزا دینے کیلئے ضروری اشیاء سے متعلق قانون کے تحت احکام جاری کردیے ہیں۔ مزید برآں حکومت مناسب نرخ پر ضروری اشیا بہم پہنچانے کے لئے صارفین کے اسٹور قائم کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔

ریاستی حکومت نے گزشتہ یکم جنوری سے سیمنٹ کی قیمت اور تقسیم پر کنٹرول ہٹا لیا۔

ضلع حکام کو ہدایات جاری کردی گئی ہیں کہ وہ زراعتی اغراض کے لئے مٹی کے تیل کی ضروریات کو اولیت دیں۔ صنعتوں کے لئے مٹی کے تیل کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی ضروری انتظامات کئے گئے ہیں۔

ریاست میں زیر نظر مدت کے دوران لوہا (ٹین کی چادروں کو چھوڑ کر) شکر، کھانڈ ساری، کپڑے اور کوئلے کی صورت حال تسلی بخش رہی۔ گزشتہ ۲۲ مئی تک ۲۳۰۶۰ ٹن کھانڈ ساری کی برآمد کے لئے پرمٹ جاری کئے گئے۔ شکر کا کوٹہ جو مئی سنہ ۱۹۶۵ء میں ۲۰ ہزار ٹن تھا گزشتہ اپریل میں بڑھا کر ۲۸۰۸۰ ٹن کردیا گیا۔

صنعتی ترقی

غیر ملکی تبادلہ زر کی تشکیل صورت حال اور ہند اور پاکستان کی جنگ کے بعد درآمد شدہ خام مال کی زبردست کمی کے باوجود سنہ ۶۷ - ۱۹۶۶ء میں صنعتی ترقی کے مقررہ نشانوں کی تکمیل کے لئے انتھک کوشش کی گئی۔ مرکزی پبلک سیکٹر میں جو نئی بھاری صنعتیں اترپردیش کو الاٹ کی گئیں ان میں ۵۵ کروڑ روپئے کی لاگت کی نینی انڈسٹریل کیبلس، ہردوار کے تقریب ۳۸ کروڑ روپئے کی فاؤنڈری فورج پلانٹ، وارانسی میں ۲۰ کروڑ روپئے کی لاگت کا ٹریکٹر کے پرزے جوڑنے کا کارخانہ، ۱۲ کروڑ روپئے کی لاگت کا کیبلس فیکٹری، کانپور میں ۳۰ کروڑ روپئے کی لاگت کا کیمیاوی کھاد کا کارخانہ، ۲ کروڑ روپئے کی لاگت کا اخباری کاغذ کا کارخانہ، ۵۰ کروڑ روپئے کی لاگت کا ڈیزل انجن کا توسیعی پروجیکٹ، آگرہ میں تین کروڑ روپئے کی لاگت کا خشک گوشت کا کارخانہ اور دو کروڑ روپئے کی لاگت کی ٹیکنیکل لیدر شو فیکٹری شامل ہے۔ یہ صنعتیں چوتھے منصوبے میں اترپردیش کی سریع صنعتی ترقی کی ضامن ہیں۔

مرکزی حکومت نے سنہ ۶۶ - ۱۹۶۵ء کے دوران نئے واحدے قائم کرنے یا موجودہ واحدوں کی توسیع کے لئے ۷۴ لائسنس جاری کئے جن سے تیسرے منصوبے میں جاری کئے گئے لائسنسوں کی مجموعی تعداد ۲۰۷ تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ ۳۸ درخواستوں میں سے ۲۷ پارٹیوں کو غیر ملکی اشتراک کی اجازت دیدی گئی۔

وزیر اعلیٰ نے دوسری ریاستوں کو اترپردیش میں صنعتی واحدے قائم کرنے کے لئے ہر قسم کی سہولتیں دینے کی پیشکش کی۔

نظامت صنعت کے یہاں سنہ ۶۶ - ۱۹۶۵ء میں ۱۶۹۴ واحدے درج رجسٹر کئے گئے جن سے سنہ ۶۶ - ۱۹۶۵ء کے آخر میں ان کی مجموعی تعداد بڑھ کر ۱۱۷۲۲ ہو گئی۔ اترپردیش میں چھوٹے پیمانہ کے تقریباً ۳۰ واحدے دفاعی سامان تیار اور سپلائی کر رہے ہیں۔

مرکزی پبلک سیکٹر کے موجودہ کارخانوں میں سے گورکھپور کے کیمیاوی کھاد کے کارخانہ کو چھوڑ کر تمام کارخانوں میں مال تیار ہونے لگا ہے۔ سرکاری سیمنٹ فیکٹری چرک نے زیر نظر سال میں ۴ر۲۵ لاکھ ٹن سیمنٹ اور گورنمنٹ پریسیزن انسٹرومنٹس فیکٹری نے ۴۹۷۶۴ واٹر میٹر، ۸۱ تھوڑ بینیں اور ۲ر۱۲۵ دباؤ ناپنے کے آلات تیار کئے۔

ضلع مرزاپور میں ڈلا میں ایک نئی سرکاری سیمنٹ فیکٹری، بجلی سے چلنے والے کولھو کے کارخانے اور راورائی ضلع وارانسی میں پانچویں امداد باہمی شکر مل کے قیام کے ابتدائی کام شروع کئے گئے۔

زیر نظر سال میں آٹھ صنعتی واحدے خورجہ، مظفر نگر، فیروز آباد، لکھیم پور کھیری، شاہجہانپور، مہوبہ، فیض آباد اور رام پور میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اس طرح اب تک جو واحدے مکمل ہو چکے ہیں ان کی تعداد بڑھ کر ۶۳ ہو گئی۔

ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی پر خصوصی توجہ دی اور دس مقامات پر پنچایت ادیوگ پروجیکٹ شروع کئے گئے۔ اس کے علاوہ دیہی صنعت کاری کی علاقائی مہموں کے دوران آگرہ اور جھانسی ڈویژنوں میں ۱۰۱۶ نئے واحدے قائم کئے گئے۔

اترپردیش کے چار اضلاع میں سریع ترقیاتی پروگرام کے تحت زیر نظر سال میں ۲۸۳ نئے صنعتی واحدے قائم کئے گئے۔ ریاست میں پانچ دیہی صنعتی پروجیکٹ کے علاقوں میں مزید ۱۱ چھوٹے صنعتی واحدے اور ۴ر۲۵ گھریلو صنعت کے واحدے قائم کئے گئے۔

بجلی

اترپردیش میں تیسرے منصوبے کے آخر تک کی امکانی پیداواری صلاحیت ۰۰ر۹۱۰ ایم۔ ڈبلو ہو گئی۔ ریاست کے سب سے بڑے ہائیڈل پاور اسٹیشن میں جو یکم فروری سنہ ۱۹۶۲ء کو چالو کیا گیا تھا اس سال ۵۰ ایم۔ ڈبلو۔ کے ایک سیٹ کا اضافہ کیا گیا۔ ریاستی بجلی بورڈ کی پانچ پن بجلی اسکیموں یعنی ماتاٹیلہ، جمنا مرحلہ اول، جمنا مرحلہ دوئم، رام گنگا اور راوبرا پر تسلی بخش طور پر کام جاری رہا۔ گذشتہ ستمبر میں ماتاٹیلہ بجلی گھر پورے طور پر چالو کیا گیا۔ یہ بجلی گھر تب سے معاہدہ کے تحت ۳۲ فیصدی بجلی مدھیہ پردیش کو سپلائی کر رہا ہے۔ اس بجلی گھر سے اترپردیش میں جھانسی، جالون، ہمیرپور اور باندہ کو بجلی سپلائی کی جاتی ہے۔ حال میں ۱۳۲ کے۔ وی۔ کی اکہری لائن کے ذریعے کانپور کو جھانسی سے ملا دیا گیا ہے۔ ڈھکرانی بجلی گھر میں تین جنریٹنگ سیٹوں میں سے دو چالو ہو گئے ہیں۔ ڈھالی پور بجلی گھر میں بھی تین میں سے دو جنریٹنگ سیٹ

چالو ہوگئی۔ ریہاند پروجیکٹ میں ۵۰ ایم۔ ڈبلو۔ کی چھٹی مشین بھی چالو کردی گئی۔ مئو اور گورکھپور میں واقع دونوں تھرمل بجلی گھروں کو ریہاند سسٹم سے ملانے کا کام مکمل ہوگیا ہے۔ گذشتہ ۲۰ رمئی کو ۱۳۲ کے۔ وی۔ لائن کے ذریعے کانپور کو ریہاند پاور گرڈ سے مربوط کر دیا گیا ہے۔

ضلع پوڑی گڑھوال میں ۲۰۰ کے۔ ڈبلو بجلی گھر مکمل ہوگیا۔ زیر نظر سال میں ضلع المورڑا میں ۲۰۰ کے۔ ڈبلو کا چھاوت ہائیڈل پروجیکٹ مکمل ہوگیا اور اس بجلی گھر کو چالو کر دیا گیا۔

دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے کی اسکیم کے تحت تیسرے منصوبے کے آخر تک ۴۹۲، ۷ دیہی بستیوں، ۲۸۴، ۸ نجی ٹیوب ویلوں اور ۹۹۹ پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کی گئی۔ دیوریا، اعظم گڑھ، غازی پور اور جونپور اضلاع میں بجلی کی فراہمی کے پروگرام کے تحت گذشتہ جون تک ۵، ۷ بستیوں اور ۲۸۲ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی دی گئی۔ محکمہ منصوبہ بندی نے ۳۸۰۰ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا تھا لیکن تنہا سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ہی ۴۰۰۲ نجی ٹیوب ویلوں اور ۲۷، پمپنگ سیٹوں کو چالو کیا گیا۔

تعلیم

اترپردیش میں زیر نظر مدت کے دوران پرائمری سے یونیورسٹی تک کی تعلیم میں نمایاں توسیع ہوئی۔ ریاست میں دو اور یونیورسٹیاں میرٹھ اور کانپور میں کھل گئیں۔ اس سے ریاست میں یونیورسٹیوں کی کل تعداد ۱۱ ہو گئی۔ سائنس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی اور ٹیچروں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے اقدامات کیے گئے۔

پرائمری اسکولوں میں داخلہ کرانے کے لیے مہمیں چلائی گئیں جن کے نتیجے میں چھ سے ۱۱ سال کی عمر کے گروپ کے مزید ۹۱ر۵۹ لاکھ بچوں نے اسکولوں میں داخلہ لیا۔ جبکہ تیسرے منصوبے میں مقررہ نشانہ ۷، ۶ لاکھ تھا۔ بچوں کی اس بڑھی ہوئی تعداد کے لیے مزید ۴۳۵، ۱ ٹیچر مقرر کیے گئے، ۸، ۷ ۱۳ نئے پرائمری اسکول کھولے گئے اور ۶۷۰۰ اسکول ماتائیں مقرر کی گئیں۔

پرائمری اسکولوں میں تربیت یافتہ ٹیچروں کی کمی دور کرنے کے لیے آٹھ سرکاری نارمل اسکول اور تربیتی مرکز کھولے گئے۔

اسکولی بچوں کو دودھ کی فراہمی کا پروگرام گزشتہ اکتوبر میں شروع کیا گیا جس سے تین لاکھ بچے مستفید ہوئے۔

ثانوی تعلیم کے ضمن میں ۳۲ سرکاری سینیر بیسک اسکول کھولے گئے اور لڑکیوں کے مزید ۱۳۵ اسکولوں کو امداد پانے والے اداروں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ پانچ ہزار لڑکوں کو کتابوں کی خریداری کے لیے مالی امداد دی گئی۔ علاوہ ازیں چار گورنمنٹ جونیر ٹریننگ کالج بھی کھولے گئے۔

زیر نظر مدت میں ۲۲۷ ہائر سیکنڈری اسکولوں کو سائنس کے سازوسامان کی خریداری کے لیے مالی امداد دی گئی۔ علاوہ ازیں ۹۵ ۲ غیر سرکاری اسکولوں کو سائنس لیبارٹیریوں کو ٹھیک حالت میں رکھنے کے لیے مالی امداد دی گئی۔

زراعتی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے کثیر مقصدی ہائر سیکنڈری اسکولوں میں ایک نئی اسکیم شروع کی گئی اور ۱۰۵ اسکولوں کو اس اسکیم کے تحت مالی امداد منظور کی گئی۔

ٹیچروں کی فلاح۔

ریاستی حکومت نے ٹیچروں کی تنخواہ اور مہنگائی بھتے میں اضافے کے اقدامات کیے۔ پرائمری سے ڈگری کے مرحلے تک کے ٹیچروں کی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے تیسرے منصوبے کی مدت میں تقریباً ۱۶ کروڑ روپیہ صرف کیا گیا۔

آٹھ ٹیچروں کو نمایاں کارگذاری پر گزشتہ مالیاتی سال میں ریاستی انعامات دیئے گئے۔

قومی ہنگامی حالات کے زمانے میں تعلیمی اداروں کے لیے دفاع کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک پانچ نکاتی پروگرام شروع کیا گیا اور فوجی اور جسمانی تعلیم کے پروگراموں کی توسیع کی گئی۔ پانچ نکاتی پروگرام کا مقصد طلبا میں حب الوطنی اور ملک کے دفاع کا جذبہ بیدار کرنا ہے۔





آگرہ کے ایک گاؤں میں رہٹ کے ذریعے آب پاشی



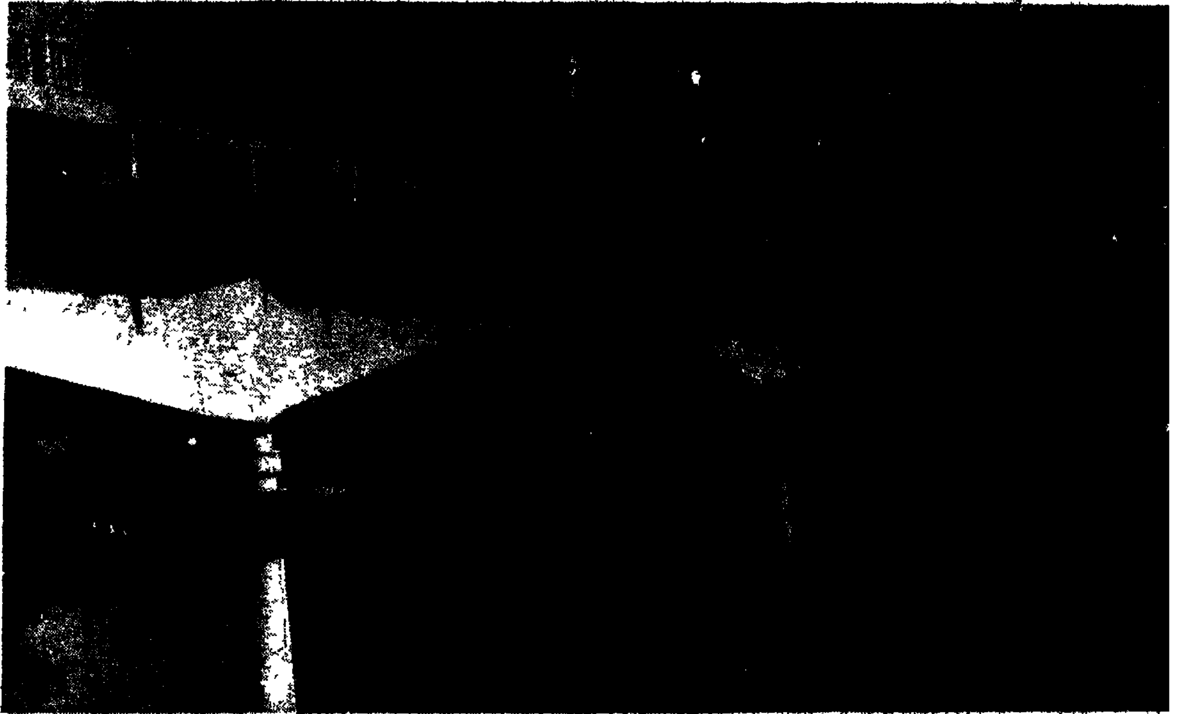
اودر پور (نینی تال) میں گرام سیویکاؤں کا تربیتی مرکز

میرٹھ کی صنعتی بستی میں کاروں کے ایکسل تیار ہو رہے ہیں



رشی کیش سے شری بدری ناتھ کی یاترا پر جانے والوں کے لیے نئی بسیں



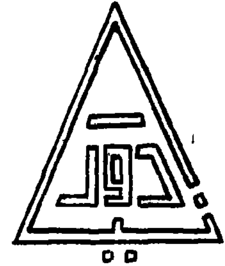


ایودھیا میں دریائے سرو پر زیر تعمیر ۳۲۰ فٹ لمبے پل کا منظر

ایودھیا کا نیا پل

پل پر سواریوں کی آمد و رفت کے لیے ۲۲ فٹ چوڑی سڑک اور دونوں جانب ۵ فٹ چوڑی پٹری





جلد ۲۲ نمبر ۶

بھادر ۱۸۸۸ شک
ستمبر سنہ ۱۹۶۶ عیسوی

چندہ سالانہ۔ پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
آر۔ سی۔ پنت
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۵ اگست کو دہلی کے تاریخی لال قلعے کی فصیل سے پہلی بار اس زبردست اجتماع کو جو سخت بارش کے باوجود آزادی کی انیسویں سالگرہ کی تقریبات میں حصہ لینے اور وزیر اعظم کی تقریر سننے کے لیے اکٹھا ہوا تھا' خطاب کرتے ہوئے ملک کے اندرونی مسائل مثلاً جمہوریت پر مبنی سوشلزم کے حصول کے لیے ہمارے عزم و ارادے' موجودہ مشکلات اور کسانوں' فیکٹری مزدوروں تجارت پیشہ لوگوں اور دانشوروں کی ضروریات کا ذکر کیا اور کہا کہ ملک کے سامنے بڑے بڑے مسائل اور دشواریاں ہیں لیکن ان سے بردا شتہ خاطر نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ بہر حال عارضی ہیں اور انھیں یقیناً عبور کر لیا جائے گا۔ اندرا جی نے قدرے تفصیل سے بعض عناصر کی طرف سے بدنظمی پھیلانے اور ملک کے بعض حصوں میں تشدد کا ماحول پیدا کرنے کی کوششوں کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ سرگرمیاں مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو اور دوسرے قومی رہنماؤں کی' جنھوں نے جنگ آزادی کی قیادت کی' تعلیمات کی روح کے منافی ہیں۔ انھوں نے بالکل درست اور برمحل آگاہی دی کہ اگر تشدد پسندوں اور تخریب کاروں کو چھوٹ ملی تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ وزیر اعظم نے دوران تقریر میں اس واقعے کو یاد دلایا جب جواہر لال جی نے گاندھی جی کو ایک جادوگر کہا تھا اور فرمایا کہ مجھے نہرو جی کی یہ بات اکثر یاد آتی ہے۔ یوں تو پنڈت جی سائنس اور عصر جدید کے قائل تھے لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ مہاتما گاندھی کا دکھایا ہوا راستہ ہی صحیح راستہ ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ عدم تشدد صداقت اور سودیشی گاندھی جی کا اصلِ پیغام تھا اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ پیغام آج بھی تمام مشکلات اور دشواریوں' الجھنوں اور کش مکشوں کا مداوا بن سکتا ہے۔ عدم تشدد کا مطلب یہ ہے کہ ہم امن و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کے خیالات کا احترام کریں۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ ہم ان قوموں کا بھی احترام کریں جو مختلف نظریات رکھتی ہیں۔ یہی ہماری طرز فکر کی میزان اور کسوٹی ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں دوسرے ملکوں سے دوستانہ تعلقات کے لیے ہندستان کی خواہش کا ذکر مختصر طور سے کیا اور کہا کہ ہم سبھی ملکوں سے دوستانہ تعلقات کے خواہش مند اور سامراج اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جنگ کرنے والے ملکوں کی حمایت کرنے کو تیار ہیں۔ وزیر اعظم نے دوسرے ملکوں سے دوستانہ تعلقات کا ذکر جو مختصر طور سے کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندستان اپنے موقف سے ہٹ رہا ہے یا اس کی یہ خواہش مدھم پڑ گئی ہے' بلکہ اس کا سبب صرف ان مشکلات' بحرانی حالات اور بیرونی خطرات کی اہمیت ہے جن سے ملک اس وقت دوچار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر اعظم نے نسبتاً کم اہم مسائل کا ذکر تو سرسری طور سے کیا لیکن اندرونی مسائل کا جائزہ تفصیل کے ساتھ لیا اور کہا کہ ان مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے اور نئے ہندستان کی تعمیر کے عظیم کاموں کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسی عزم' ولولے' جوش' خلوص' تیاگ اور لگن کی ضرورت ہے جس کا مظاہرہ ہمارے مجاہدین آزادی اور رہنمایانِ قوم نے کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جنگ آزادی کے ان قائدین میں سے اکثر ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں لیکن ان کا دکھایا ہوا راستہ ہمارے سامنے ہے جس پر چل کر ہم منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ شریمتی گاندھی نے یاد دلایا کہ جہاں تک ملک کی سرحدوں کا تعلق ہے ہمارے جیالے اور بہادر جوانوں نے جان کی بازی لگا کر ان کی حفاظت کی ہے اور اب بھی ہر قیمت پر ان کی حفاظت کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن آزادی کی حفاظت اور وطن کی سالمیت کا مسئلہ صرف سرحدوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہر گاؤں' ہر قریے' ہر شہر اور ہر فیکٹری سے ہے۔ قوم اسی وقت طاقت ور' خطرات کے مقابلے کے لیے تیار اور وطن کی حفاظت کرنے کے لائق ہو سکتی ہے جب ہم میں سے ہر فرد زندگی کے ہر شعبے میں ان فرائض کو جو اس کے ذمے ہیں' دیانت داری' خلوص اور انہماک کے ساتھ انجام دے۔

● اگست کا نیا دور ناظرین اور شائقین نیا دور تک پہنچ چکا ہے۔ اس شمارے کی اہمیت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ یہ جشن آزادی (۱۵ اگست) کے موقعے پر شایع ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہ جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ہمارے احساسات و جذبات' جنگ آزادی کے سورماؤں کی جاں فشانیوں اور قربانیوں' ان کے تئیں ہماری عقیدت اور ہمارے جذبۂ شکر گزاری' نئے ہندستان کی تعمیر کے سلسلے میں ہماری کوششوں اور کاوشوں کا زیادہ سے زیادہ آئینہ دار ہو۔ اس ضمن میں ہم جتنا کچھ بھی کامیاب ہوتے ہیں اس میں ہمارے قلمی معاونین کا بہت کچھ ہاتھ ہوتا ہے۔ اس مرتبہ بھی ہمیں حسب سابق ملک کے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل ہوا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اگست کا شمارہ عام اشاعتوں کے مقابلے میں ضخیم ہوتا تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ عین وقت پر بعض ناگزیر اسباب کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے صفحات کم کر دینا پڑے اور اس طرح بہت سے مضامین اور نظمیں اس میں شامل نہ کی جا سکیں۔ اس کے لیے ہم ان ادیبوں اور فن کاروں سے معذرت خواہ ہیں۔ بہر حال ان میں سے کچھ تخلیقات زیر نظر شمارے میں شایع کی جا رہی ہیں۔

——— ایڈیٹر



روش صدیقی

یہ ترا مژدۂ اعجاز، مسیحا! کیا ہے
بوالہوس! تو نے مرے درد کو سمجھا کیا ہے

کون اُٹھائے گا، رُخِ شاہدِ وحدت کا نقاب
قطرہ، گر اصل میں دریا ہے تو دریا کیا ہے

ہم نشیں! خواب نہ ہو جائے تری نیند کہیں
کیا کہوں، دیدۂ بے خواب نے دیکھا کیا ہے

منزلِ ترکِ تمنّا سے گزر کر، اے دوست!
اب یہ سمجھا ہوں کہ آغازِ تمنّا کیا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا نہیں کچھ مجھ سے الگ
تجھ کو لاحق ہے یہ تشویش کہ دُنیا کیا ہے

خُلد اِک وعدۂ فردا ہے مگر اے واعظ!
جو نہ امروز میں شامل ہو، وہ فردا کیا ہے

میرا دامن تو ازل ہی سے ہے صد چاک، روشؔ!
جانتا ہوں کہ تقاضائے زلیخا کیا ہے

ستمبر ۱۹۶۶ء

بھادر بہہ اشک

میر کی رومانی تخئیل

شہید صفی پوری

سید مسیح الحسن صاحب رضوی لیکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنے ایک مقالے "میر کے نہاں خانے" میں میر کی شاعری سے اُن کے عشق اور جنون کے ارتباط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

" شیکسپیر نے اپنے ذہن کی تالیفی خصوصیت کی بناء پر شاعر، عاشق اور مجنوں کے درمیان میں ایک مشترک قدر دریافت کرلی تھی اس قدر سے چاہے ہمیں مکمل طرح اتفاق نہ ہو لیکن اس مثلث کے درمیان میں کوئی ایسا مشترک علاقہ ضرور موجود ہے جو انھیں آپس میں مربوط رکھتا ہے۔"

شیکسپیر کو شاعر، عاشق اور مجنون میں ایک بات یکساں نظر آئی تھی اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کی قوت تخئیل نہایت قوی ہوتی ہے۔ شاعر اپنی قوت تخئیل کی مدد سے نئی نئی دنیاؤں کی تخلیق کرتا ہے۔ اُسے حُسن کے نئے نئے پہلو اور عشق کے نئے نئے زاویے نظر آتے ہیں۔ جو چیز عام انسان کو حسن وشعریت سے بالکل معرا نظر آتی ہے، شاعر اُس میں حُسن کے بے شمار جلوے دیکھ لیتا ہے۔ گرے (GRAY) نے اپنی ماں کو فرانس اور اٹلی کے سفر کے دوران لکھا تھا:

"——NOT A PRECIPICE, NOT A TORRENT NOT A CLIFF, BUT IS PREGNANT WITH RELIGION AND POETRY."

" پہاڑ کی کوئی چوٹی، کوئی چشمہ، کوئی بلند چٹان ایسی نہیں ہے جس میں مذہب اور شاعری کے حُسن کی جلوہ گری نہ ہو۔"

عاشق کی بھی قوت تخئیل نہایت قوی ہوتی ہے۔ اس کا تصور خلوت میں جلوت اور جدائی میں وصل کا عالم دکھا دیتا ہے۔ جب وہ پھول سونگھتا ہے تو اسے محبوب کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، جب وہ چاند دیکھتا ہے تو اسے اس میں محبوب کا چہرہ نظر آتا ہے۔ یہی حال مجنون کا ہے، اُس کا جنون اسے عالم حقیقی سے ماورا ایک خیالی دنیا میں لے جاتا ہے، اس لئے جب اُسے ہنسنا چاہیے تب وہ روتا ہے، جب رونا چاہیے تب ہنستا ہے، جب خوف کا مقام ہوتا ہے تو وہ پرسکون رہتا ہے، جب خوف کی کوئی بات نہیں ہوتی تو وہ خوف زدہ نظر آتا ہے۔

مگر شاعر، عاشق اور مجنون میں اس یکسانیت کے باوجود فرق ہوتا ہے۔ مجنون کی تخئیل میں پراگندگی اور بے ربطی ہوتی ہے۔ عاشق کی تخئیل صرف محبوب کے محور کے گرد گھومتی ہے اور اُس میں بھی انتشار کی ایسی کیفیت پائی جاتی ہے کہ عشق کو بھی جنون ہی کی ایک قسم سمجھا جانے لگا اور دنیا کے مشہور عشاق اکثر جنون کا شکار ہو گئے۔ عاشق اور مجنون کے برعکس شاعر کی تخئیل تعمیری اور تخلیقی ہوتی ہے اور اس میں بے ربطی کی جگہ ارتباط اور انتشار کے بجائے تنظم پایا جاتا ہے۔ بلکہ شاعرانہ تخئیل میں ربط و تنظم اس درجے کا ہوتا ہے کہ وہ اشیاء اور حقائق کے مختلف اور متضاد پہلوؤں میں بھی یکسانیت اور یکرنگی کو تلاش کر لیتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عشقیہ شاعری کی تخلیق کے لیے عشق کا ہونا لازمی ہے، اس لیے کہ شاعری کا سوتا زندگی ہی سے پھوٹتا ہے لیکن عشق کی تیز و تند شراب کو اشعار کے حسین پیمانوں میں ڈھالنے کے لئے شاعرانہ تخیل کا محتاج ہونا ہے۔ بغیر شاعرانہ تخیل کے دلی جذبات کی ترجمانی میں حسن کاری ممکن نہیں اور نہ کلام میں شعریت، اثر انگیزی اور آفاقیت پیدا ہو سکتی ہے جو اعلا درجے کی شاعری کے لوازم ہیں۔

ممکن ہے کہ شاعر عشق کی اُس منزل میں پہنچ جائے جسے جنون کہا جاتا ہے، لیکن شاعر کا جنون اُس کی شخصیت میں جذب ہو کر اُس کے بنیادی الٰہی جنون (DIVINE MADNESS) کا ایک جز بن جاتا ہے۔ اس سے اس کی شاعری میں پستی نہیں بلندی پیدا ہوتی ہے اور ایسی بلندی پیدا ہوتی ہے کہ اُس کی شاعری ہمیں عالم فطرت سے بالاتر نظر آنے لگتی ہے اور بجائے اس کے ہم اسے عالم اسباب کا نتیجہ سمجھیں، الہامی سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میر کے حالات زندگی پر ماضی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کی زندگی کے جو حالات ہمیں معلوم ہیں اُن میں اُن کے عشق و جنون کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ہم تفصیلات سے واقف نہیں ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو ہمیں ان کے عشق و جنون سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی اگر وہ شاعر نہ ہوتے۔ اگر ان کی سوانح حیات موجود نہیں ہے تو تاسف کا کوئی محل نہیں ہے، اُن کا دیوان تو موجود ہے۔ ہمیں اُن کی سوانح عمری میں صرف خارجی واقعات و حالات کا ذکر ملتا لیکن ان کی روح کی گہرائیوں میں برپا ہونے والے طوفانوں اور اُن کے ذہن میں پیدا ہونے والی کشمکش کا صحیح نقشہ نہ ملتا۔ اُن کے دیوان کے اوراق میں ہم اُن کی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق دیکھ سکتے ہیں۔ ہر عظیم شاعر کی طرح جس کا کلام براہ راست زندگی سے جنم لیتا ہے، ہم میر کے دیوان میں اُن کی روح کی سرگزشت اور اُن کے جذبات کی داستان پڑھ سکتے ہیں۔ اگر ہمیں تاریخ میں اُن کے حالات زندگی کا مطلق سراغ نہ ملتا تب بھی ان کے کلام کی تاثیر اور اُن کے جذبے کی صداقت سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ میر کو ضرور عشق تھا ورنہ اُن کے کلام میں گداز و خستگی کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ اُن کے اشعار کیسے ہی کیوں نہ ہوتے مگر وہ اس طرح کے اشعار کبھی نہ کہہ سکتے:

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ — دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے اشعار مضمون آفرینی اور ندرت خیال کا نمونہ نہیں ہیں بلکہ شاعر کے جذبۂ صادق کی فطری، بے ساختہ اور براہ راست ترجمانی کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی نمود اُسی طرح فطری طور پر ہوتی ہے جیسے شدت غم میں آہ سرد کا بے اختیار منہ سے نکل جانا، یا آگ لگنے پر کسی شے سے دھوئیں کا بلند ہونا۔ اور ہم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے تھے کہ ان کا عشق بلندی کی اُس منزل تک پہنچ گیا تھا جہاں جنون کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ عشق اُن کی شاعری کو تیز و تند شراب تو بنا سکتا تھا لیکن بغیر جنون کے وہ شراب دو آتشہ نہیں بن سکتی تھی۔ میر کے عشق میں ہمیں جنون کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور اُن کے عشق کے پیدا کردہ سوز و گداز میں وحشت، آوارگی اور آشفتہ سری کی آمیزش بار بار نظر آتی ہے:

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں — میر کو تم عبث اداس کیا

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منھ — کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

اٹھ گیا پردہ نصیحت گر کے لگ پڑنے سے میر — پھاڑ ڈالا میں گریباں رات کو داماں سمیت

میر کے عشق کی گہرائی اور گیرائی اور اُن کے جذبے کی شدت، ہمہ گیری اور وسعت نے جہاں ایک طرف اُن کی شاعرانہ تخیل کو نہایت اثر انگیز مواد فراہم کیا وہاں اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کو بھی محل آزمائش میں ڈال دیا۔ جذبہ جتنا وسیع اور شدید ہوگا اُتنا ہی اس کا اظہار مشکل ہوگا، اس لیے کہ جذبات کے طوفانوں کو فن کی بندشوں میں مقید کرنا آسان کام نہیں ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ زیادہ شدید جذباتی ہیجان کے وقت زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حقیقی عشق بے زبان ہوتا ہے مگر میر اپنے جذبے کی شدت کو پوری طرح نمایاں کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میر کو اپنے محبوب سے جتنا گہرا عشق تھا اُس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ محبوب سے ملنے کے وقت

اُن کے دل و دماغ میں طوفان برپا ہو جائے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اُن کی زبان پر فرطِ جذبات سے خاموشی کی مہر لگ جائے۔ ؂

جی میں تھا اُس سے ملئے کہ کیا کیا نہ کہئے میرؔ پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

ایک عاشق کی حیثیت سے ممکن ہے کہ میرؔ اپنے محبوب سے اپنے دل کا حال نہ کہہ سکے ہوں لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی بے زبانی کی حقیقی ترجمانی کر کے بالواسطہ اپنے شدید جذبے کا اظہار کر دیا۔

میرؔ کی عظمت اُن کے عشق کی وجہ سے نہیں ہے نہ اُن کے جنون کی بناء پر ہے بلکہ اُن کی شاعرانہ تخئیل کی مرہونِ منّت ہے جس نے اُن کے جنون کو عشق کی حدوں میں مقید رکھا اور اُن کے عشق کو شعریت کے سانچے میں ڈھال دیا۔ ممکن ہے کہ اُن کی شاعرانہ تخئیل کو وسیع کرنے میں اُن کے جنون کا بھی حصہ ہو لیکن قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اُن کی تخئیل جنون کی دستوں میں گُم ہو جانے کے بجائے اُس پر محیط ہو گئی اور اُس نے جنون میں خرد کے ایسے پہلو تلاش کر لیے کہ ہمیں اُس پر خرد کا دھوکا ہونے لگا اور یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ان کا جنون محض حسن کی کرشمہ سازی کا نتیجہ اور اُن کے عشق کا محض ایک پہلو ہے۔ بقول حسرتؔ موہانی۔ ؂

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

میرؔ کی شاعرانہ تخئیل اگر اُن کے جنون پر محیط نہ ہو گئی ہوتی تو وہ ایسے شعر کبھی نہ کہہ پاتے :

وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میرؔ اب جا رہوں گا وان کوئی دیوانہ جہاں ہو

اک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

شاعرانہ تخئیل کا دامن نہایت وسیع ہوتا ہے۔ وہ مواد اور ہیئت دونوں پر حاوی ہوتی ہے۔ وہ خود شناسی کا ذریعہ بھی ہے اور خود شناسی کا ذریعۂ اظہار بھی۔ ایک طرف وہ جذبات کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر انسانی فطرت کے ایسے اسرار کو منکشف کرتی ہے جو شاعر کی انفرادی زندگی سے مخصوص ہونے کے باوجود ہمہ گیر حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ داخلیت اور خارجیت کے فرق کو مٹا دیتی ہے یا بہت کم کر دیتی ہے، دوسری طرف وہ ان کی تصویر کشی میں لفظوں سے بیک وقت وہ کام لیتی ہے جو مصور رنگوں سے اور موسیقار آواز کے آہنگ سے لیتا ہے۔ اس طرح تخلیقی تخئیل شعر میں جمالیاتی تاثر پیدا کر دیتی ہے۔ اس جمالیاتی نشاط کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس کا مواد اور ہیئت سے یکساں تعلق ہوتا ہے۔ جو شاعر خود شناسی کی منزل طے کر لیتا ہے اُس کے کلام کے آئینے میں ہم اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں اور اُس کا کلام ہمارے لیے بھی خود شناسی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس طرح شاعر کے روحانی تجربات اور اُس کے جذبات میں بھی ہم شریک ہو جاتے ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے کلام میں ہمارے دل کو زبان مل گئی ہے تو ہم ایک ایسا نشاط محسوس کرتے ہیں جو شاعری ہی سے مخصوص ہے۔ اس جمالیاتی نشاط میں الفاظ کی تصویر نگاری اور اُن کے ترنم کی مفہوم کے ساتھ ہم آہنگی سے اور اضافہ ہو جاتا ہے اور ہم وجد و سرمستی کی ایک ایسی کیفیت محسوس کرتے ہیں جو ہمیں عالمِ حقیقی سے بلند کر کے حسن و جمال کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔

میرؔ ایک رومانی شاعر تھے۔ اُن کا عشق اُن کی شاعری کی روحِ رواں ہے۔ اُن کا دیوان اُن کے تجرباتِ زندگی کا نچوڑ ہے۔ ؂

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

یہ داخلیت رومانی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔ رومانی شاعر اپنی تخئیل کی پیدا کردہ دنیا میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اس کا عالمِ خارجی سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تصوریت (IDEALISM) اور روحانیت میں بہت زیادہ مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس دنیا میں اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے یہ دنیا اُس کے قابل نہ تھی۔ ؂

جائے بود و باش تو نہ تھی دنیائے دوں اتفاقاً اپنا آنا ہو گیا

میرؔ کی بد دماغی کا سبب غالباً اتنی ان کی پریشاں حالی نہ تھی جتنی ان کی رومانی اُفتادِ طبع۔ رومانی شاعر اپنے منفرد رجحانات کی بناء پر عام لوگوں کے درمیان اجنبیت محسوس کرتا ہے اور اس کا نتیجہ گوشہ نشینی اور ایک طرح کی بد دماغی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ؂

صحبت کسی سے رکھنے کا اُس کو نہ تھا دماغ تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے غم کی آگ میں تنہا جلتا رہتا ہے اور اُس کے سوز و الم میں احساس تنہائی کا درد بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ـہ

محو بیکسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا   میں جوں چراغ گور اکیلا جلا کیا

یک بیاباں ہے مری بیکسی و تنہائی   شکل آواز جرس سب سے جدا جاتا ہوں

وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے رجحانات و احساسات کو سمجھنے والا کوئی نہیں ؎

نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

رومانی شاعر کے درد و الم کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے اُتنی مسرتوں کا خواہش مند ہوتا ہے جتنی وہ اُسے نہیں دے سکتی۔ اُس کو ان چیزوں کی جستجو رہتی ہے جو دنیا میں موجود ہی نہیں ہیں۔ اس کی فلک پیما تخئیل، اُس کی باریک بیں اور دوربیں نگاہیں، اس کا جمالیاتی احساس اس کے گہرے اور قوی جذبات اور اُس کے لطیف و نازک احساسات اس کی رہنمائی کر کے اُسے حقیقت شناس بنا دیتے ہیں۔ وہ زندگی کے اسرار کے پردے کو چاک کر دیتا ہے اور اُس کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو اچھی طرح دیکھ لیتا ہے۔ حسن کا کوئی جلوہ ایسا نہیں ہوتا جو اس کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب نہ ہو جائے اور مسرت و سکون کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جس کی لذت سے [illegible] نا آشنا رہے۔ لیکن دنیا کا حسن اور دنیا کی مسرتیں اس کے یہاں [illegible] سرمستی کی مستقل کیفیت پیدا کرنے کے بجائے غم و اندوہ اور آشفتگی و سرگشتگی پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی جذباتی افتادِ طبع اور بلند تخئیل کی بنا پر وہ دنیا کی ہر حسین اور پُرکشش شے کو کمال کی بلندی پر فائز دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن دنیا کا حسن کمال کا تصور تو عطا کر سکتا ہے مگر خود نقص سے بری نہیں ہو سکتا۔ وہ شوق و جستجو تو پیدا کر سکتا ہے لیکن ان کی تسکین نہیں کر سکتا۔ یہاں کی بہار پر خزاں، وصل پر فراق اور مسرت پر غم سایہ فگن رہتا ہے۔ بے ثباتی، تغیر اور فنا کے قانون سے دنیا کی کوئی شے بالاتر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رومانی شاعر کے حساس دل پر زندگی کے تاریک پہلو کا زیادہ گہرا نقش ثبت ہو جاتا ہے۔ وہ مسرت کا جویا ہوتا ہے اور اس کو نہایت شدت سے محسوس کرتا ہے اسی لیے اس کے چھن جانے پر اُس کو غم بھی زیادہ ہوتا ہے۔ وہ حسن کی دل فریبیوں سے پوری طرح لذت اندوز ہوتا ہے اسی لیے وہ حسن کی بے ثباتی کے غم کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے مسرت اور کیف و سرمستی کے لمحات زندگی میں بہت کم آتے ہیں اور ان کا احساس شدید نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس غم و آلام کے طوفان انسان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیتے ہیں اور ان کا اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ جس طرح زخم کے مندمل ہو جانے کے بعد اس کا نشان باقی رہ جاتا ہے اسی طرح غم کے لمحات گزر جانے کے بعد بھی دل پر اپنے گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے یہاں تشنگی، ناکامی، محرومی اور ناآسودگی کا ایک مستقل احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ میر کی شاعری میں نشاط ہے، جوش ہے، سرمستی ہے، حسن سے لذت اندوزی ہے لیکن اس کے نشاط پر اس کے کلام کا الم انگیز عنصر اُسی طرح غالب آگیا ہے جس طرح خود میر کی زندگی میں غم مسرت پر حاوی ہو گیا تھا اور وہ اُن کے درد و غم، سوز و گداز، خستگی و بر شتگی، حرمان و یاس، آشفتگی و سرگشتگی اور وحشت و پراگندگی طبع کے نیچے ایسا دب گیا ہے کہ ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔

میر اپنے محبوب کی نیم باز اور نیم خوابیدہ آنکھوں کی سرمستی سے اُسی طرح سرشار ہو سکتے تھے جس طرح ایک شرابی جام شراب سے ہوتا ہے۔ ـہ

میر اُن نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے   اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

اگر وہ اُس کی آنکھوں کی اس کیفیت کی نشاط انگیزی کی لذت سے واقف نہ ہوتے تو وہ ایسا الم انگیز شعر نہ کہہ سکتے۔ ـہ

سحر گہ عید میں دَورِ سبو تھا   پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

وہ حسن کے پرستار تھے اور وہ اُن کے لیے ایک مستقل سرمایۂ نشاط تھا۔ ـہ

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا   جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

لیکن یہی نشاط جوئی ان کے لیے حرمان و حسرت کا سبب بن گئی۔ ـہ

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ   سو تم ہم سے منھ ہی چھپا کر چلے

وہ جب اپنے شہرِ دل کے اجڑنے کا حال بیان کرتے ہیں تو اُس کا تاثر اس لیے بڑھ جاتا ہے کہ کبھی وہ بہت پُر رونق اور آباد تھا۔ ـہ

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے   ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

یہ بات قابل غور ہے کہ "ایسا" اجڑا کہہ کر اجڑنے پہ جتنا زور دیا گیا ہے اتنا ہی زور "عجیب" جائے کہہ کر اس کی رونق اور آبادی پر بھی دیا گیا ہے۔

میر کے رونے کا سبب یاس نہیں آرزوئے نشاط تھی۔ ؎

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

اپنے گل رو اور گل اندام محبوب کے گلشن جمال کے اگر وہ خوشہ چیں نہ ہوتے تو ان کی زندگی ایک مسلسل خلش بن کر رہ جاتی۔ ؎

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

اگر چمن کا اس کی دل فریبیوں، بہاروں اور نشاط انگیزیوں سمیت ان کے ذہن میں کوئی نہایت کامل تصور موجود نہ ہوتا تو دنیا انھیں قفس نظر نہ آتی۔ کہتے ہیں۔ ؎

چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

لیکن قفس میں گرفتار ہونے اور بے بال و پری کے باوجود ان کے سر سے ہوائے چمن نہ گئی۔ ؎

بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میر جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

اب کی بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی

یہ سیر گلزار کی آرزو ہی تھی جس نے انھیں گرفتار کیا۔ ؎

سیر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے

میر کے شوق کی انتہا یہ ہے کہ وہ عالم تصور میں بعد فنا بھی یاس کا شکار نہیں ہونا چاہتے۔ ؎

مدت سے ہیں اک مشت پر آوارہ چمن میں نکلی ہے یہ کس کی ہوس بال فشانی

زندگی کے تضاد کو سمجھ لینا اور محسوس کر لینا اور اپنے جذبات کا تجزیہ کر کے ان کے متضاد پہلوؤں سے واقف ہو جانا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایسی دشوار گزار منزل ہے جہاں صرف دنیا کے عظیم شعرا ہی کا گزر ہو سکا ہے جب کہ بہت بڑے بڑے فلسفی مجرد فکر کی پُر پیچ راہوں میں بھٹکتے ہی رہ گئے اور وہاں تک ان کی رسائی نہ ہو سکی بقول شیکسپیئر

"THERE ARE MORE THINGS IN HEAVEN AND
EARTH HORATIO THAN ARE DREAMT OF IN
YOUR PHILOSOPHY." (HAMLET)

اسی لیے شیکسپیر نے کہا تھا:

"THERE IS A SOUL OF GOODNESS IN
THINGS ELIL"

اور ولیم بلیک (WILLIAM BLAKE) نے کہا تھا:

"JOY AND WOE ARE WOWEN FINE,
A CLOTHING FOR THE SOUL DIVINE,
UNDER EVERY GRIEF AND PAIN
RUNS A JOY WITH SILKEN TWINE."

اور شیلی (SHELLEY) نے کہا تھا:

"WE LOOK BEFORE AND AFTER
AND PINE FOR WHAT IS NOT,
OUR SINCEREST LAUGHTER,
WITH SOME PAIN IS FRAUGHT,
OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT
TELL OF SADDEST THOUGHT

میر نے بھی خیر میں شر اور شر میں خیر کے پہلوؤں کو دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے بھی غم کی نشاط انگیزی اور نشاط کی الم انگیزی کو محسوس کر لیا تھا اور یہی ان کی عظمت کا ثبوت ہے۔ شیلی (SHELLEY) نے ٹھیک کہا تھا کہ سب سے میٹھے گیت وہ ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ الم ناک ہوں۔ سوز و گداز میر کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف ہے اور اس میں ان کو اردو کے تمام غزل گو شعرا پر فوقیت حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری بھی اپنی اثر انگیزی میں تمام شعرا کی شاعری سے ممتاز نظر آتی ہے لیکن ان کے سوز و گداز اور درد و غم کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے اجزائے ترکیبی میں ہمیں نشاط و غم کا ایسا امتزاج نظر آئے گا کہ دونوں میں امتیاز کرنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ میر کا سوز و گداز ان کے عشق ہی کی پیداوار ہے اس لیے اگر ہم ان کے اشعار کی روشنی میں ان کے عشق کے تصور کا جائزہ لیں تو ان کے سوز و گداز کی نوعیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

میر ایک رومانی شاعر تھے اس لیے ان کا عشق تمام انسانوں کے

عشق سے مختلف تھا۔ عورت کے ساتھ جنسی عشق کا مقصد جسمانی وصل ہوتا ہے۔ رومانی عشق کا نفسیاتی پس منظر کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر اس کا مرکزِ کشش محض حُسن ہی ہوتا ہے۔ حسن اگرچہ محبوب کے مادی وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رومانی شاعر اپنے محبوب کے حسن میں اتنا گُم ہو جاتا ہے کہ اس کی نظر میں اس کا مادی وجود بھی اس کے حسن کے مجرد تصور ہی کی طرح غیر مرئی اور غیر مادی بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رومانی عشق کا کوئی قابلِ حصول مقصد باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ معشوق کے وصل سے بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ اس ناآسودگی کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اگر جسمانی اتصال عشق کا مقصد ہو تو وصل کے بعد سکون مل جائے گا لیکن جب شاعر کی پوری توجہ محبوب کے حسن پر مرکوز ہو تو وصل سے کبھی اس کی بے چینی میں کمی نہ ہو گی۔ جب روحانی اتصال کے لیے اُس کی روح بے چین رہتی ہے اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا اس لیے وصل سے سکون کے بجائے زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ بیتابیوں میں اضافہ ہو جائے۔ حسرت موہانی نے مندرجہ ذیل شعر میں اسی خیال کو نظم کیا ہے۔ ؎

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

میر کے عشق کا مقصد بھی وصل نہ تھا۔ اگر ان کے حالاتِ زندگی میں ان کے عشق کی تفصیلات نہیں ملتیں تو نہ سہی۔ اُن کا اپنے معشوق سے وصل ہوا یا نہیں اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ اس سے اُن کی شاعری پر کوئی اثر نہیں پڑا اس لیے کہ ان کا عشق وصل و ہجر کی کیفیتوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی اُن سے بالاتر تھا۔ میر کے عشق کو اُن کے والد کے تصوف سے بھی کوئی ربط نہ تھا۔ اگر ان کے والد صوفی نہ ہوتے تب بھی میر کی رومانیت ان کو میر بنا دینے کے لیے کافی تھی۔ اور اگر وہ رومانی شاعر نہ ہوتے اور انھیں شاعرانہ تخئیل فطرت نے عطا نہ کی ہوتی تو اپنے والد کے صوفی ہونے کے باوجود وہ شاعر نہ بن سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح تصوف ایک مسلک ہے اسی طرح عشق بھی ایک مذہب ہے۔ شاعر خواہ کسی بھی مذہب کے پیرو کے یہاں پیدا ہوا ہو وہ اپنے ہی مذہب کا سالک رہتا ہے اور اپنے ہی دل کی پیروی کرتا ہے۔ میر بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہ نہ مسلمان تھے نہ صوفی۔ وہ شاعر تھے۔ حسن پرستی ان کا شیوہ تھا اور عشق اُن کا مذہب۔ میر نے یہ ضرور کہا تھا کہ ؎

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر مذہبِ عشق اختیار کیا

لیکن یہی کفران کا مذہب تھا اور جب انھوں نے کہا کہ ؎

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

تو حقیقتاً انھوں نے مذہبِ عشق اختیار کر لینے ہی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ حسن کے پجاری تھے اور حسن کی دیوی کا مندر ہی اُن کا بُت کدہ تھا۔ ؎

اب تو جاتے ہیں بُت کدے سے میر پھر ملیں گے اگر خدا لایا

مندرجہ ذیل شعر میں انھوں نے کھُل کر اپنے مذہب کا اعلان کر دیا ہے۔ ؎

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

اگر وہ حسن کی پرستش نہ کرتے ہوتے تو وہ یہ اشعار کبھی نہ کہہ سکتے۔ ؎

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا

ہے پریشاں دشت میں کس کا غبارِ ناتواں گرد کچھ گرد ناقہ آتی ہے چلی محمل کے پاس

ادب اور گستاخی کا یہ تصور پرستشِ حسن ہی کا نتیجہ ہے۔

عشق ان کا مذہب ہی نہیں تھا، عشق اُن کی زندگی تھا۔ اسی لیے، ہمیں اُن کے عشق میں زندگی کے سارے خصوصیات نظر آتے ہیں۔ وہی تڑپ وہی حرکت، وہی کشمکش، وہی جستجو اور وہی ناقابلِ حصول کے حصول کی خواہش! اور اگر زندگی کے ساتھ دائمی بقا کا تصور کیا جا سکتا ہے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا عشق لافانی تھا۔

ان کا عشق وہ تھا جس کی کھٹک زندگی بھر باقی رہی۔ موت کے بغیر وہ دور نہیں ہو سکتی تھی۔ ؎

مرے ہے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

ہوش و صبر و تاب و تواں سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن عشق ان سے جُدا نہ ہو سکا۔ ؎

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں لیکن اے داغ! دل سے تو نہ گیا

وہ جب تک زندہ رہے کوچۂ دلدار ہی میں رہے۔ ؎

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا اس کی دیوار کا سر سے مِرے سایا نہ گیا

"جیتے جی" کی معنویت قابلِ توجہ ہے۔

محبوب کے کوچے سے جانا میر کے لیے ویسا ہی تھا جیسے اس عالمِ فانی سے رخصت ہو جانا۔ کہتے ہیں۔ ؎

یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم   جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

عشق کا تیر اتنا گہرا اُن کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ وہ جان ہی کے ساتھ نکل سکتا تھا۔ ـہ

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت   تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت

میر کا کاروانِ شوق اتنا تیز رفتار تھا کہ وہ کاروانِ حیات کو بھی پیچھے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ ـہ

جفا اُٹھتی وفا جو عمر کرتی   سو کی اُس رفتنی نے بے وفائی

لیکن عمر کی بے وفائی کے بعد بھی عشق کی شوریدہ سری نہ گئی۔ ـہ

خاکِ مجنوں جہاں ہے صحرا میں   واں سے اُٹھتا ہے اک غبار ہنوز

اب تلک بھی مزارِ مجنوں سے   ناتواں اک غبار اُٹھتا ہے

موت ان کی شوق کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ ـہ

قیدِ قفس میں مرنا کب شوق کا ہے مانع   پہنچیں گے مشتِ پر بھی اڑ کر یہ گلستاں تک

جب عشق کی شدت کا یہ عالم ہو تو ظاہر ہے کہ محبوب کی جدائی کا شاعر پہ کیا اثر پڑے گا۔ ـہ

فراقِ یار کو آساں نہ سمجھو   کہ جان و تن کی مشکل ہے جدائی

جدائی کی تڑپ کی نہایت موثر تصویر کشی میر نے ان اشعار میں کی ہے:

جب کہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے   درد بے اختیار اُٹھتا ہے

جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ   رات گزرے گی کس خرابی سے

غالب یہ دلِ خستہ شبِ ہجر میں مر جائے   یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے

لیکن میر وصل کی خواہش اور ہجر کے غم کا ذکر محض اپنے عشق کے جذبات کے مختلف پیرائے میں اظہار کے لیے کرتے ہیں، ورنہ اُن کا وصل اور ہجر کا تصور عام تصورات سے بہت مختلف تھا اور اُن کے خوشی اور غم کو ناپنے کے پیمانے دوسرے تھے۔ وہ وصل و جدائی کے بارے میں کہتے ہیں۔ ـہ

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو   قرب و بُعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

وصل و جدائی سے مبرا وہ کام جاں   معلوم کچھ ہوا نہ ہمیں یاں سوائے شوق

کیا پوچھتے ہو شوق کہاں تک ہے ہم کو میر   مرنا ہی اہلِ درد کا ہے انتہائے شوق

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نظر میں وصل و جدائی میں کوئی فرق نہ تھا اور نہ ان کے عشق کا کوئی مقصد تھا سوا اس کے کہ وہ جب تک زندہ رہیں عشق ہی کرتے رہیں۔ ـہ

اور تدبیر کو نہیں ہے دخل   عشق کے درد کی دوا ہے عشق

کون مقصد کو عشق بن پہنچا   آرزو عشق مدعا ہے عشق

ان کی زندگی عشق تھی اور اُن کا عشق ایک مسلسل اضطراب۔ ـہ

مدت ہوئی کہ دل سے قرار و سکوں گئے   رہتا ہے اب تو آٹھ پہر اضطراب سا

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ ہے دل پر   خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ   دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ

کیا کروں ناچار مرنے کو ہوا تیار میں   دل کی روز و شب کی بیتابی سے جی گھبرا گیا

میر نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "دل کی روز و شب کی بے تابی سے جی گھبرا گیا" لیکن وہ کبھی اس بے تابی سے نہیں گھبرائے اور گھبرا تے کیوں۔ عشق اُن کے لیے اگر تکلیف کا باعث تھا تو وہی ان کے سکون کا سبب بھی تھا۔ ـہ

اے عشق ترے سایہ کے تلے تکلیف میں راحت تھی   جس دن سے مری تکلیف گئی اس دن سے مرا آرام گیا

اگرچہ عشق نے ان کے دل کو خون کر دیا تھا لیکن وہی ان کے لیے کیف و نشاط اور سرور و مستی کا ذریعہ بھی تھا۔ ـہ

دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے   عمر بھر ہم رہے شرابی سے

وہ عشق کے درد کی لذت سے واقف تھے۔ ـہ

نہیں عشق کا درد لذت سے خالی   جسے ذوق ہو وہ مزا جانتا ہے

میر خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کے عشق کی کیا حقیقت ہے۔ ـہ

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں   اندر ہی اندر سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے

انھوں نے اپنے درد کی دوا مدتوں تلاش کی لیکن انھیں مایوسی ہوئی۔ ـہ

مایوس ہی رہتے ہیں بیمار محبت کے   اس درد کی مدت تک ہم نے بھی دوا کی ہے

لیکن اُن کی مایوسی حقیقتاً مایوسی نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے مایوسی

گُہر ہونے تک

دانش فرازی

اک اندھیرا، ایک سناٹے کا بحرِ بیکراں ـــــــ

نغمہ پابندِ خموشی، جلوہ محرومِ نمود
آہٹوں کی نرم موسیقی، نہ سمتوں کا وجود

اِک ہیولا رفعتِ ذوقِ نظر سے ناشناس
اِک تمنّا بے نیازِ شکوہ، محرومِ سپاس

جلوہ زارِ ماہ و انجم، کہکشاں کی سرزمیں
صفحۂ سادہ پہ مبہم سے خطوطِ دل نشیں

ہر طرف سمٹی ہوئی پہنائیِ دشت و دمن
نقطۂ آغازِ ہستی، رفعتِ چرخِ کہن

بحر محتاجِ تموّج، ساز بے صوت و سرُود
منجمد اپنی جگہ پر آبشاروں کے وفود

فطرتِ بوئے چمن نا آشنائے اضطراب
لذّتِ جنبش سے نا آگاہ دامانِ سحاب

چاند کے سینے میں داغِ جلوہ پیرائی نہ تھا
تھا پسِ پردہ کوئی لیکن تماشائی نہ تھا

زیرِ لب گم تھا ایاغِ تبسّم کا فسوں
سر بزانو دیو مالا کے خداؤں کا جنوں

بے اثر سارے اساطیرِ کہن کی دل بری
سعی ناشکور تھی صناع کی صنعت گری

زندگی کا ہر تصوّر نا تراشیدہ صنم
بُت کدہ تو بت کدہ ناپید آہنگِ حرم

عرصۂ ہستی سراپا ایک ناکردہ گناہ
صبح بے سوزِ تجلّی، شام بے زلفِ سیاہ

سو رہا تھا ایک گہری نیند صدیوں کا شعور ـــــــ

خول سے اپنے مگر نکلا جمالِ کائنات
بج اُٹھا دھیمے سُروں میں دفعتاً سازِ حیات

سینۂ نَے سے بھی ٹپکا دل نشیں گیتوں کا رس
چھڑ گیا ہر گام پر افسانۂ دام و قفس

خلوتِ غنچہ سے گھبرانے لگی بوئے چمن
برہمی سے اپنی شرمندہ تھا گیسوئے چمن

پاؤں ذوقِ آگہی آہستہ پھیلانے لگا
خیمۂ گُل تک سفیرِ رنگ و بو آنے لگا

معبدِ آفاق میں روشن ہوئے لاکھوں چراغ
اور چھلکے ہر طرف محکم ارادوں کے ایاغ

سوزشِ پنہاں سے خود گلتی گئی زنجیرِ زیست
ہو گئی دل کش، لہو کے رنگ سے تصویرِ زیست

خوں خوار پودے

رفیعہ منظور الامین

نباتاتی دنیا ہم انسانوں کی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع تر ہے۔ اس کے خاموش اور گم سم باسی نہ منہہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں پھر بھی ان کی بھائی چارگی اور آپس کا میل جول ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے چلا آرہا ہے۔ پاؤں کے نیچے روندی جانے والی گھاس اور کائی کے برابر برابر دیودار اور اشوک کے سربلند قد آور درخت بھی نظر آتے ہیں۔ مگر اُن کی دنیا میں آج تک نہ خانہ جنگی ہوئی، نہ کسی بغاوت نے سر اُٹھایا اور نہ اُنھوں نے کبھی ملک گیری کے لئے کوئی قدم اُٹھایا۔ لیکن اِس پُرامن زندگی گذارنے اور بقائے باہم کے اُصول پر عمل کرنے کے باوجود ایک زمانہ اُن کا دشمن ہے جس میں پیش پیش ہم ہی انسان ہیں ——— مجموعہ اضداد، سدا کے فتنہ پرور اور قتل وغارت کے شیدائی! اگر ہم نے سبزہ اُگایا اور درخت لگائے تو ہمارے گھوڑوں نے سبزہ کو روندا بھی اور جنگل کے جنگل بھی ہم نے صاف کر دئے۔

شاید انسان کے اسی ظلم وستم کے خلاف نباتاتی دنیا کے ایک خاص طبقہ نے (جسے انسان نے "خونخوار پودے" کا لقب دیا ہے) آواز اُٹھائی۔ چناں چہ پودوں کی چند نسلیں ایسی بھی ہیں جو دوسرے جانداروں کو کھا کر اپنی زندگی گذارتی ہیں۔ لیکن ان پودوں کی "خونخواری" "آدم خوری" تک نہیں پہنچ پائی ہے۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے، کوڑے، کھیاں، تتلیاں اور بعض مرتبہ چڑیاں اور چوہے تک ان کا نوالہ بن جاتے ہیں مگر انسان اُن کا شکار نہیں ہونے پاتے۔ ایسے غیر معمولی پودے کہیں کہیں ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن بہت کم۔ اپنی رہائش کے لئے انھوں نے آسٹریلیا، امریکہ، برطانیہ اور افریقہ کو زیادہ پسند کیا ہے

اس طرح کے پودوں کو "کرم خور" پودے (INSECTIVOR-OUS PLANTS) یا پھر "خونخوار" پودے (CARNIVOROUS PLANTS) بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر میں پودوں کا سبز مادہ یعنی کلوروفِل (CHLOROPHYLL) موجود ہوتا ہے جس کی مدد سے یہ عام پودوں کی طرح سورج کی روشنی میں اپنی غذا اختیار کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن جن جگہوں پر یہ اُگتے ہیں وہاں ان کی بعض اہم غذائی ضروریات مثلاً نائٹروجن اور پروٹین میسر نہیں آتیں۔ لہذا اپنے ناسازگار نباتی ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے ان پودوں میں خود بخود ایسے "ہتھیار" نشوونما پا جاتے ہیں جن کے بل بوتے پر وہ "خوں خواری" پر اُتر آتے ہیں۔

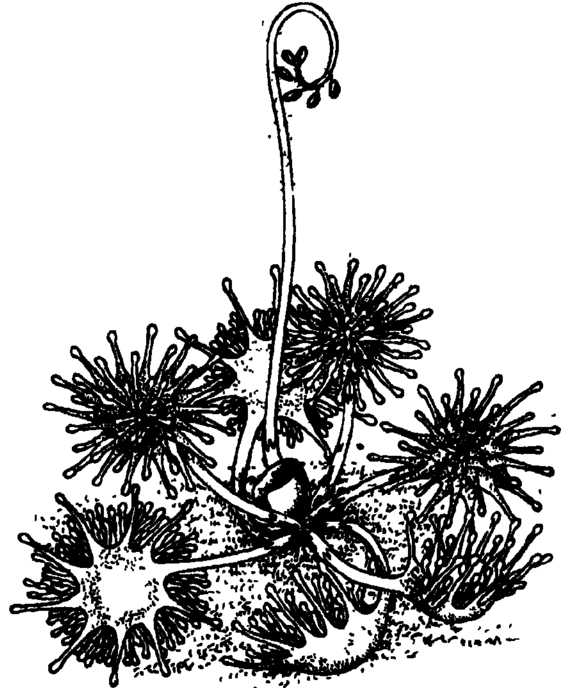
نم علاقوں میں کرم خور پودوں کی چند خاص نسلیں ملتی ہیں جو زمین سے حاصل ہونے والی غذا مثلاً معدنی نمکیات، پانی وغیرہ کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع سے بھی اپنے پیٹ کی آگ بجھاتی ہیں۔ ہاضمے کے لئے ایسے کچھ پودوں کے پتوں میں بکٹیریا (BACTERIA) موجود ہوتے ہیں جن سے خاص ہاضمی مائع یعنی خامرے (ENZYMES) رستے ہیں اور بعض صورتوں میں پتوں کی اندرونی دیواروں کے خلیے (CELLS) خود اپنے لئے خامرے تیار کرتے ہیں۔ دِلچسپ بات یہ ہے کہ ایسی غذا جس میں پروٹین

موجود نہ ہو وہ ان پودوں کے لیے قابلِ قبول ہی نہیں ہوتی

آیئے چند ایسے خاص پودوں کا مشاہدہ کریں۔

۱۔ سن ڈیو (SUN DEW)

اِس چھوٹے سے معصوم اور خوبصورت پودے کے ارادے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اس کے گلابی پتے چھوٹے چھوٹے گدر کی شکل کی حساس ساختوں سے چھپے ہوتے ہیں جنھیں TENTACLES (چنگل) کہا جاتا ہے۔ یہ (چنگل) TENTACLES درمیان میں چھوٹے اور کناروں



سن ڈیو (SUNDEW)

پر بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے بیرونی سروں پر شیرہ نما گوندیلا مادہ ہوتا ہے جو روشنی میں بڑی آبداری سے چمکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پودے کا نام SUN DEW (سورج کی شبنم) رکھا گیا ہے۔ یہی نکھرا ہوا حسین مادہ بھولے بھالے کیڑوں، پتنگوں کی موت کا باعث ہوتا ہے۔ جو نہی کوئی کیڑا اپنی پیاس بجھانے کے لئے اس پر آ بیٹھتا ہے شیرہ نما مادے میں پھنس جاتا ہے۔ جیسے جیسے وہ خود کو اس ناگہانی قید سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے اور بھی زیادہ اس میں پھنستا جاتا ہے۔ اس دوران میں TENTACLES کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ وہ کیڑے کی زندگی تنگ سے تنگ تر کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ کیڑے کو دور جو TENTACLES (چنگل) ہوتے ہیں وہ بھی مڑنے لگتے ہیں۔ جب کیڑا اس شکنجے میں بری طرح پھنس جاتا ہے تو TENTACLES سے ایک خاص قسم کا مائع خارج ہوتا ہے جس میں خامرے (ENZYMES) ہوتے ہیں۔ اس مائع میں کیڑا ڈوب جاتا ہے اور اس کی فرار کی راہیں بالکل مسدود ہو جاتی ہیں۔ وہ وہیں دم توڑ دیتا ہے۔ چند دنوں بعد TENTACLES



بٹر ورٹس (BUTTER WORTS)

دھیرے دھیرے کھُل جاتے ہیں اور کیڑے کا سوکھا پنجر باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اور سن ڈیو کا "شیش محل" نئے شکار کی تلاش میں چمکنے لگتا ہے۔

۲۔ بٹر ورٹس (BUTTER WORTS)

یہ پودا "سن ڈیو" سے جسامت میں کچھ ہی بڑا ہوتا ہے اور کوہ ہمالیہ کی بلندیوں پر پایا جاتا ہے۔

اس میں TENTACLES (چنگل) نہیں ہوتے بلکہ تقریباً ۱۲ بکتی نما

پتے ہوتے ہیں جنکی ترتیب گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ہوتی ہے۔ بیرونی پتے زمین کو چھوتے ہیں اور اندرونی پتوں کے سرے اوپر کو مُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بھٹکتی ہوئی نظر اُن پر سے یوں ہی گزر جاتی ہے۔ لیکن ان پتوں کو اُکھیڑ کر اگر خوردبینی مشاہدہ کیا جائے تو نظروں میں یکایک ایک چھوٹی سی دنیا اُبھر آتی ہے۔ ہر پتے پر ہزاروں باریک باریک بال ہوتے ہیں جنکے سروں پر لیس دار مادہ خارج کرنے والے غدود ہوتے ہیں اور کبھی اُن میں ننھے ننھے کیڑے بھی پھنسے ہوتے ہیں۔ جونہی یہ پتے اندر مُڑتے ہیں غدودوں سے لیس دار مادہ نکل آتا ہے۔ کیڑے اس مادے سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور پتے اندر مڑنے لگتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ عمل بدنصیب کیڑے کے لئے موت کا پروانہ ہوتا ہے۔

BUTTER WORTS میں ہاضمے کی رفتار کافی سُست ہوتی ہے لیکن بہرحال کیڑے کے نرم حصے ہضم کر لئے جاتے ہیں اور بھوسی خارج کردی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لیپ لینڈ کے لوگ بٹر ورٹس کے پتوں کے رس کو دودھ میں ملاتے ہیں اور جب دودھ پھٹ جاتا ہے تو اس کے پانی سے ایک خاص قسم کی شراب بناتے ہیں۔

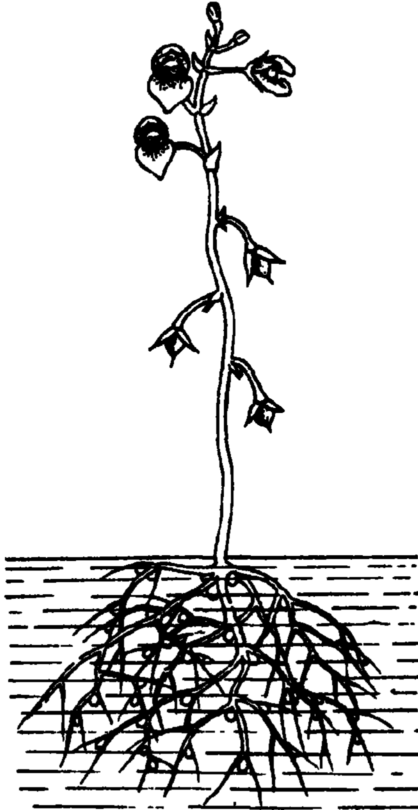
بعض جگہوں پر اس پودے کے پتوں کو کیڑے مار کاغذ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ بلیڈر ورٹ (BLADDER WORT)

اس کا پودا سن ڈیو اور بٹر ورٹس سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ ان دونوں کی طرح یہ زمین پر نہیں بلکہ تالابوں اور گڑھوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بعض دوسرے پانی والے پودوں کی طرح اس کے پتے بھی دھاگے نما ہوتے ہیں۔ کچھ پتے فٹ بال کے اندر کی ربر کی تھیلی کی طرح چھوٹے چھوٹے بلیڈر (BLADDER) ہوتے ہیں۔ ان کی لمبائی تقریباً $\frac{1}{10}$ انچ ہوتی ہے۔ یہ تھیلیاں ایک قاتل مائع سے بھری رہتی ہیں اور خاص بات یہ ہوتی ہے کہ ان کا راستہ صرف اندر ہی کو کھلتا ہے جیسے پرانے فیشن کے چوہے دان کا دروازہ۔ پانی میں تیرتے ہوئے ننھے سے کیڑے جب اس پودے کی گھنی بالوں والی ساخت میں آپھنستے ہیں تو تھیلی کے منہ پر پائے جانے والے بال انہیں مسلسل اندر ہی اندر کو دھکیلنے لگتے ہیں حتیٰ کہ یہ اندر زبردستی پہنچائے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے دروازہ بند ہو جاتا ہے اور یہ بیچارے وہاں موجود مائع میں تیرتے تیرتے مرجاتے ہیں۔ اس کے بعد بیکٹیریا کے اثر سے جب یہ سڑگل جاتے ہیں تو انہیں بلاڈر کی خلوی دیواریں جذب کر لیتی ہیں

۴۔ پچر پلانٹ (PITCHER PLANT)

کرم خور پودوں کی یہ قسم ہندوستان اور ملایا میں پائی جاتی ہے اور امریکہ میں بھی۔ ہندوستان میں پائے جانے والے پودے کو نیپنتھیز



بلیڈر ورٹ (BLADDER WORT)

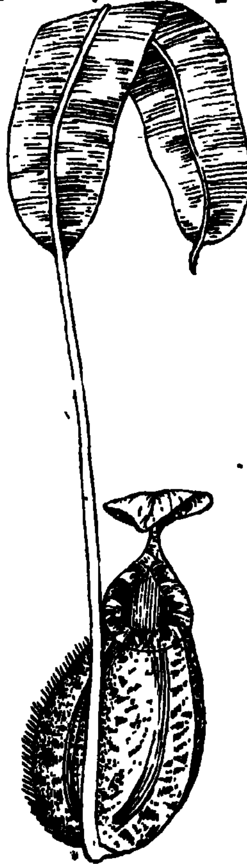
(NEPENTHES) کہتے ہیں۔ یہ جھاڑیوں میں بیل کی طرح سہارا لیکر اوپر چڑھتے ہیں اور جا بجا ایک نما مضبوط دھاگوں سے جنھیں ٹنڈرل (TENDRIL) کہا جاتا ہے بڑے اور چپٹے نما پتے لٹکتے رہتے ہیں۔ اس دھاگے نما ساخت کو جب سہارا ملتا ہے تو پھول کر لوٹے کو زہ (PITCHER) کی شکل اختیار کر لیتی ہے ——— اور یہی ساخت اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ یہ کوزہ کبھی اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس میں دو پیالے پانی آجائے

اور کبھی انگشتانے جتنا چھوٹا۔ اس کے دہانے پر ایک ڈھکن بھی ہوتا ہے جو بارش کو کوزے میں جانے سے حتی الامکان روکتا ہے۔ کوزے کی اندرونی دیواریں بھی سیدھی سادی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ساری دیوار ایسے غدودی خلیوں سے بنی ہوتی ہیں جن سے خارجے رستے رہتے ہیں" اور کوزہ ہمیشہ تقریباً آدھا بھرا رہتا ہے۔ قدرے تنگ دہانے کے پاس نیکٹر (NECTOR) غدود ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے شکار خود بخود کھنچا چلا آتا ہے۔ جونہی وہ منہ پر پہنچتا ہے پھسل کر اندر گر پڑتا ہے اور نیچے ہی نیچے پھسلتا جاتا ہے کیونکہ اندر کی سطح اتنی بالوں دار اور ڈھالو ہوتی ہے کہ کیڑے کے قدم جمنے نہیں پاتے اور وہ مائع میں تیرنے لگتا ہے۔ لیکن پچر پلانٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ مائع میں موجود بیکٹیریا شکار کو سڑاتے نہیں کیونکہ یہی مائع دافع زہر بھی ہوتا ہے اور خامروں کی موجودگی کی وجہ سے ہاضم بھی ـــــ لہذا غذا کافی عرصے تک تازہ رہتی ہے اور پودا دھیرے دھیرے کیڑے کو کھاتا رہتا ہے۔

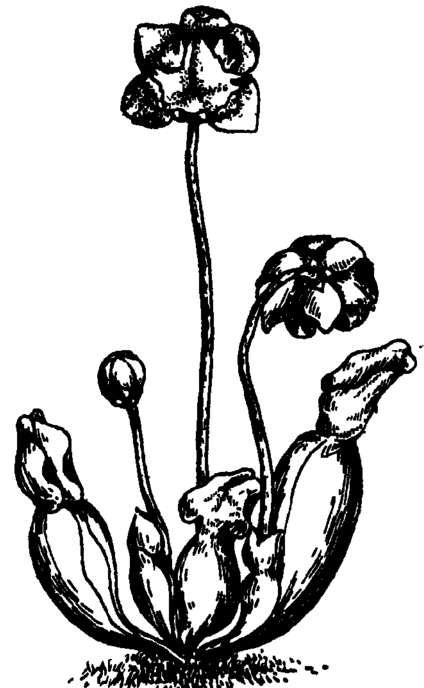
یہ پودا کیڑوں، پتنگوں کے علاوہ بعض اوقات نسبتاً بڑے جانداروں کا بھی شکار کر لیتا ہے۔ چنانچہ بعض مرتبہ پچر پلانٹ میں چڑیاں اور چوہے تک پائے گئے ہیں۔



وینس فلائی ٹریپ (VENUS FLY TRAP)



انڈین پچر پلانٹ

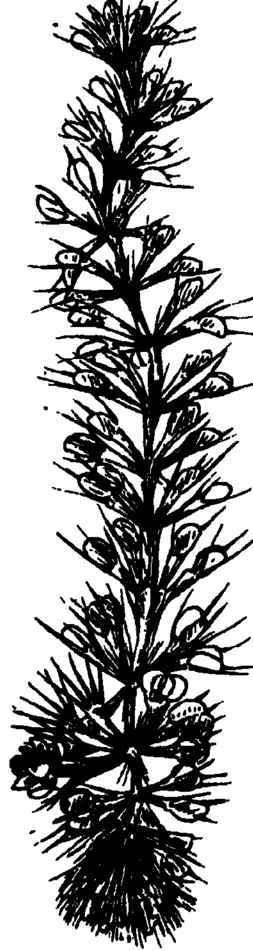


امریکن پچر پلانٹ

۵۔ وینس فلائی ٹریپ (VENUS FLY TRAP)

کرم خور پودوں میں سب سے انوکھا پودا یہی ہے۔ عمل کے اعتبار سے اسے سن ڈیو کا رشتے دار مانا جاتا ہے۔ یہ صرف امریکہ میں ملتا ہے۔ اس کے پتے جسامت میں ایک انچ سے کچھ زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ دو سیپ پتیوں کی مانند ایک ڈنٹھل پر لگے ہوتے ہیں۔ ان میں خارے

پیدا کرنے والے غدود ہوتے ہیں۔ ہر پتے کی سرخ اوپری سطح پر تین نمایاں کانٹے اور کناروں کی ساخت بھی کانٹوں نما ہوتی ہے۔ اگر کوئی بدنصیب کیڑا ان کانٹوں سے ذرا سا بھی چھو جائے تو یہہ دونوں پتے آدھے سیکنڈ کے اندر تالی سی بجاتے ہیں، کناروں کی کانٹوں دار بناوٹ کے



ملکا جھانجی (الڈروونڈا) (MALACCA JHANJI—ALDROVANDA)

دونوں سِرے چوہے دان کی طرح ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور شکار گرفتار ہو جاتا ہے۔ دونوں پتے جب ملتے ہیں تو بالکل ہمارے رگ اور پٹھوں کا عمل دُہرایا جاتا ہے۔ جیسے ہی شکار پھنس جائے پتوں میں موجود غدودوں سے خامرے نچوڑے جاتے ہیں جو اتنی زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں کہ دندانے دار ساخت سے باہر ٹپکنے لگتے ہیں۔ اب ہاضمے اور غذا کو جذب کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد دونوں پتے اپنے آپ کھل جاتے ہیں اور زمانہ اپنی رفتار چلتا رہتا ہے۔

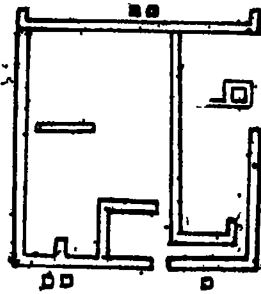
کلکتہ کے آس پاس بھی اس انوکھے پودے کی ایک قسم ملتی ہے جسے ملکا جھانجی (الڈروونڈا) (MALACCA JHANJI(ALDROVANDA کہتے ہیں۔ لیکن وینس فلائی ٹریپ VENUS' FLY TRAP اور اس میں فرق یہہ ہے کہ درمیانی کانٹے دار ساخت اس میں چھ کی بجائے لاتعداد ہوتی ہے اور یہ پودا پانی میں تیرتا رہتا ہے۔ اس میں پتے نچلی سطح پر نہیں ہوتے بلکہ گھیر دار شکل میں پورے پودے پر پائے جاتے ہیں۔

ہولناک اور رونگٹے کھڑی کرنے والی داستانیں اکثر افریقہ سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ افریقہ کے آدم خور درختوں کے دل ہلا دینے والے قصے کافی مشہور ہیں کہ کس طرح وہاں کے بعض درخت بے خبر مسافروں کو اپنی باہنوں میں جکڑ لیتے ہیں اور ان کا خون پی جاتے ہیں۔ یہ کہانیں بے بنیاد تو ہیں ہی لیکن وسطی افریقہ میں ایک ایسا کرم خور پودا ARAUGIA ALBENS ضرور پایا جاتا ہے جس کی دلپسند غذا تتلیاں ہیں۔ اس کے پھول سفید، کافی بڑے اور شہد آگیں خوشبو والے ہوتے ہیں جو تتلیوں کو کھینچ لیتے ہیں۔ لیکن یہہ رنگ اور یہہ خوشبو دنیا کے چھوٹے چھوٹے فریب ہیں چنانچہ جونہی تتلی پتیوں کے درمیان جھکتی ہے، کھٹ سے اسے دو سخت اور سیاہ دندان نما چمٹوں کے درمیان دبوچ لیا جاتا ہے۔ یہہ بظاہر آہنی دانت اتنے سخت اور تیز ہوتے ہیں کہ انسانی انگلی کو بھی زخمی کر سکتے ہیں۔

اس دنیا میں جہاں نرم و نازک پھول تک ہتھیار بند ہوتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے جو "پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر" مصرع کیسا ہی ہو مگر سچ کہا ہے کسی نے ؎

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی!





نذیر بنارسی

ساون کی جھڑی اور یہ برسات کی رات — یاد آتی ہے اک بھولی ملاقات کی رات
اس آگ کو پوچھے کوئی دل والوں سے — جو آگ لگا جاتی ہے برسات کی رات

پینگ آگے محبت کے بڑھا جاتا ہے — ارمانوں کو جھولا سا جھلا جاتا ہے
چلتا ہے جو برسات کا چنچل جھونکا — آنچل کی طرح ہوش اڑا جاتا ہے

آتا ہو لٹاتا ہو خوشبو جیسے — گزرے کوئی کھولے ہوئے گیسو جیسے
اس طرح سے چلتا ہے ہوا کا جھونکا — بنگال کا چلتا ہوا جادو جیسے

دیکھو تو کدھر جام جہاں آرا ہے — لاؤ کہاں پگھلا ہوا انگارا ہے
بادل کے گرجنے کی نہیں یہ آواز — ہم رندوں کو برسات نے للکارا ہے

ہیروز کے جگر نے جسے مارا ہے — وہ گنبد گرداں کا جگر پارا ہے
صہبائے شفق رنگ میں کیوں ڈوب نہ جائے — سورج بھی تو دن بھر کا تھکا ہارا ہے

بادل کبھی گرجا کبھی بجلی چمکی — موسم نے کئی رخ سے مجھے دی دھمکی
خوش بو کسی جوڑے سے اڑا لائی تھی — کل رات بہت رات کی رانی مہکی

دن بھر کے تھکے ماندے ہو ستاؤ نا — کیا حرج ٹھہرنے میں ہے بتلاؤ نا
یہ کوندتی بجلی، یہ برستے بادل — سب کہتے ہیں رک جانے کو رک جاؤ نا

وہ رات گھٹاؤں کا برسنا جھم کے — چلتی ہوئی وہ شوخ ہوا تھم تھم کے
آتی ہوئی رہ رہ کے وہ سوندھی خوشبو — جیسے کہیں بھرپور جوانی گمکے

پربت نے جو برسات کا روکا پانی — پتھر کا جگر کاٹ کے نکلا پانی
انگڑائیاں لینے لگے ندی نالے — جی کھول کے بہنے لگا دریا پانی

حالت کبھی بگڑے تو سنورنے کے لیے — چڑھتا ہیں بھی ڈوبو تو ابھرنے کے لیے
بے کار ہر اک ناؤ ہے ہمت کے بغیر — دل چاہیے طوفاں سے گزرنے کے لیے

جیون کو کسی بھاگ سے کھلواڑ نہ کر — تیاگی ہوں مرے تیاگ سے کھلواڑ نہ کر
جو کہنا ہو کہہ مجھ سے مرا جام نہ چھو — تو مجھ سے الجھ آگ سے کھلواڑ نہ کر

افسانہ

بسرام راجو

حامد اللہ افسر

انیسویں صدی کے رُبع اوّل کا زمانہ تھا۔ راجپوتانے کی قریب قریب سبھی ریاستوں کی حالت ابتر تھی۔ مرہٹوں اور پٹھانوں کی پریشان کُن دخل اندازیوں کے علاوہ آپس کے اختلافات نے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا اثر اور رسوخ بڑھا رہی تھی۔ ریاست اودے پور بھی اور ریاستوں کی طرح بہت کم زور پڑ گئی تھی اور اس کا بہت سا علاقہ آس پاس کے حکمرانوں اور جاگیرداروں نے دبا لیا تھا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایک ملٹری افسر کرنل بروس کو مہارانا کی خدمت میں بھیج دیا تھا اور اس افسر کے مشورے اور امداد سے مہارانا کو اپنا بہت سا علاقہ واپس مل گیا تھا۔

اس ملٹری افسر کا ایک انگریز دوست جارج ہربرٹ ہیراڈ ایک سال جاڑے میں اس کے پاس اودے پور آ کر مقیم ہوا۔ ہیراڈ کو یہ کوہستانی ریاست اتنی پسند آئی کہ وہ اکثر ریاست کے مضافات میں دور دور نکل جاتا تھا۔

اودے پور اصل میں راج پیپلی کے جنگل میں ایک پہاڑی پر بسا ہوا ہے۔ یہ پہاڑی کردلی پہاڑوں کے سلسلے میں ہے۔ یہ سلسلہ جنوب مغرب کی سمت دل گڑھ سے بُندی کے علاقے میں ہوتا ہوا اندر گڑھ تک چلا گیا ہے جو کوٹہ میں ہے۔ یہ پہاڑیاں سات آٹھ سو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہیں لیکن پھیلاؤ اچھا خاصا ہے۔ ان کے اندر بڑے لمبے لمبے درے اور گھاٹیاں اور دور تک پھیلی ہوئی کھوہیں اور وادیاں ہیں اور چاروں طرف خوف ناک جنگل ہیں جو اکثر اوقات ڈاکوؤں کو پناہ دینے کا کام دیتے ہیں۔

ہیراڈ ایک روز شکار کھیلنے کے لیے پہاڑیوں میں دور تک نکل گیا مگر جن شکارگاہوں میں وہ شکار کھیلنا چاہتا تھا ان سے بھٹک گیا۔ ادھر اُدھر پھرتے پھراتے شام ہو گئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ رات پھر اسی طرح مارا مارا پھرنا پڑے گا۔ آخر اسے بہت فاصلے پر ایک دھیمی سی روشنی دکھائی پڑی۔ ہیراڈ اسی طرف کو ہو لیا۔ یہ روشنی پہاڑ کی ایک کھوہ سے آ رہی تھی۔ ہیراڈ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی آگ روشن کیے بیٹھے ہیں۔ ہیراڈ نے انھیں مخاطب کیا اور پوچھا: "یہاں آس پاس کوئی گاؤں ہو تو بتاؤ، میں شکار کھیلنے آیا تھا، راستہ بھول گیا ہوں۔"

ہیراڈ نے راجستھانی زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی، لیکن ان دونوں کی بولی سمجھنے میں اسے دقت پڑی۔ پھر بھی مطلب سمجھ گیا۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا تھا: "یہیں کھوہ میں لیٹ کر سو جاؤ، صبح چلے جانا، یہاں اور کہیں ٹھکانا ملنا مشکل ہے۔"

ہیراڈ نے یہی مناسب سمجھا۔ گھوڑے کو کھوہ کے قریب ہی باندھ دیا اور کھوہ میں لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی غافل پڑ کر سو گیا لیکن صبح کو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ رسیوں سے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں اور وہ دونوں آدمی غائب ہیں۔ اس نے رسیوں کو کھولنے کی بہتیری کوشش کی مگر کچھ بس نہ چلا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نیم وحشی اَن گھڑ قسم کا آدمی آیا اور سلام کر کے بولا: "مالک کا حکم ہے کہ آپ کو پیش کیا جائے۔" ہیراڈ کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے پے در پے بہت سے سوال کر ڈالے:

"مجھے کس نے رسیوں سے باندھا ہے؟" "وہ آدمی جو رات یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہاں ہیں؟" "تم کون ہو؟" "مالک کون ہے؟"

مگر اس نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ صرف یہ کہتا رہا: "میں کچھ نہیں جانتا۔ مالک کا حکم ہے کہ آپ کو پیش کیا جائے۔"

ہیراڈ نے کہا: "میں اودے پور جانا چاہتا ہوں۔ میں اور کہیں نہیں جاؤں گا۔"

اس آدمی نے جواب دیا: "مالک کے حکم کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب حکم ملتا ہے تو اس کو بجا لانا پڑتا ہے۔"

ہیراڈ نے پوچھا: "تمھارا مالک کون ہے؟"

آدمی نے جواب دیا: "پہاڑوں میں مالک کا نام کوئی نہیں جانتا۔"

اسی دوران میں دو اور آدمی، اسی ڈھنگ کے مگر ان سے بھی زیادہ درشت اور ان سے بھی زیادہ ان گھڑ، کھوہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے بغیر کچھ کہے سنے ہیرالڈ کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور باقی دو نے اسے اٹھایا اور باہر لے جا کر ہی کے گھوڑے کی پیٹھ پر لٹا کر رسیوں سے باندھ دیا۔ اس کے بعد یہ مختصر قافلہ روانہ ہوا۔ راستے میں دو اور آدمی مل گئے۔ آپس میں کچھ اشارے ہوئے اور وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ گو ہیرالڈ کچھ بول نہ سکتا تھا لیکن اس کے حواس بجا تھے۔ سارا دن وہ ایک ناہموار اور پیچ در پیچ راستے پر چلتے رہے اور تاریک وادیوں اور خوفناک گھاٹیوں سے گزرتے رہے۔

(۲)

"ڈاکو" بسرام راجو نے سارے میواڑ میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس کا نام کانوں میں پڑتے ہی مختلف طبقوں کے لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے اثرات مترتب ہوتے تھے۔ امرا اور جاگیردار، بڑے بڑے آڑھتی اور سوداگر اس کا نام سنتے ہی خوف سے کانپنے لگتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ غریبوں اور ناداروں کے دلوں میں یہ نام بڑی خوش گوار امیدیں پیدا کر دیتا تھا۔ شہروں سے دور کی بستیوں میں سارے میواڑ میں بہ مشکل کوئی آدمی ایسا ملے گا جس نے بسرام راجو کی فیاضیوں سے فیض نہ اٹھایا ہو۔ وہ ایک ہاتھ سے لیتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے لٹا دیتا تھا۔ جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مال و متاع تھا ان سے لے کر ایسے غریبوں تک پہنچا دیتا تھا جن کو اپنی روزمرہ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بھی کچھ میسر نہ تھا۔

ہیرالڈ اسی بسرام راجو کے سامنے پیش کیا گیا۔ بسرام نے ہیرالڈ کو دیکھتے ہی کہا: "میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ آج آپ نے مجھے اپنی میزبانی کا فخر بخشا۔"

ہیرالڈ: "لیکن اس فخر کے لیے تمھیں بہت پچھتانا پڑے گا، تم شاید جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں۔"

بسرام: "بے شک میں ابھی تک نہیں جانتا کہ میرا معزز مہمان کون ہے۔ کیا آپ اس سوال پر روشنی ڈالیں گے؟"

ہیرالڈ: "میں ایک انگریز تاجر ہوں اور کمپنی بہادر کا ایک حصہ دار ہوں۔ میرا نام جارج ہربرٹ ہیرالڈ ہے۔"

بسرام: "مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرا مہمان اتنا بڑا آدمی ہے۔ مجھے کسی انگریز سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ تمنا آج پوری ہو گئی۔"

ہیرالڈ: "لیکن میں پھر جتائے دیتا ہوں کہ تمھیں اس تمنا کے نتیجے سے ڈرنا چاہیے۔ یہ تمھیں بڑی مہنگی پڑے گی۔"

بسرام: "بجا فرمایا صاحب بہادر! لیکن میں کیا کروں۔ ڈرنا مجھے بالکل نہیں آتا۔ مجھے اپنے بزرگوں سے صرف ایک چیز ورثے میں ملی ہے ــــ نڈر اور بے خوف روح۔ نتیجے کے متعلق آپ کچھ فکر نہ کیجیے۔ ہاں اب معاملے کی باتیں ہو جانا چاہئیں۔ جس طرح آپ کا کاروبار ہے اسی طرح میرا بھی کاروبار ہے۔"

یہ کہہ کر بسرام نے ایک موٹی سی کتاب کھولی اور قلم اٹھا کر بولا: "ذرا ایک بار اپنا نام پھر بتائیے گا۔ کچھ عجیب سا نام ہے آپ کا۔"

ہیرالڈ: "جارج ہربرٹ ہیرالڈ۔"

بسرام: (لکھتے ہوئے) "ٹھیک ہے۔ آپ کا پیشہ؟"

ہیرالڈ: "میں نے تمھیں بتایا تو کہ میں ایک کاروباری آدمی اور کمپنی بہادر کا حصے دار ہوں۔"

بسرام: (لکھتے ہوئے) "ٹھیک ہے۔ آپ کی آمدنی کتنی ہے؟"

ہیرالڈ کو اس سوال پر غصہ آ گیا لیکن وہ ضبط کر کے بولا: "اس سے تمھیں کیا واسطہ؟"

بسرام: "صاحب بہادر! اسی سے تو مجھے واسطہ ہے! میں اصل میں انصاف کو کبھی ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ آپ کی آمدنی کیا ہے اس وقت تک میں صحیح طور پر ڈنڈ کا تعین نہیں کر سکتا۔"

ہیرالڈ: "ڈنڈ! اگر تم یہ بھی جانتے ہو کہ جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ تم نے مجھے گرفتار کر لیا ہے تو ملک بھر میں غل مچ جائے گا۔ اور پھر تمھاری خیر نہیں ہے، بہتر یہی ہے کہ تم مجھے جانے دو، تم اس صورت میں بھی گرفتار تو کیے ہی جاؤ گے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تم مجھے فوراً چھوڑ دو تو میں تمھاری سفارش کر دوں اور تمھاری سزا کچھ کم ہو جائے۔"

اب تک بسرام بڑی بردباری سے کام لے رہا تھا لیکن ہیرالڈ کے ان جملوں سے اسے کچھ غصہ آ گیا اور اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ پھر بھی اپنی

زبان کو اس نے بے لگام نہیں ہونے دیا۔ کہنے لگا: "سُنتے تھے انگریز بڑے عقل مند ہوتے ہیں، مگر تعجب ہے کہ اتنی موٹی سی بات آپ نہیں سمجھے کہ ان پہاڑیوں میں بسرام کی حکومت ہے۔ یہاں کسی کا گزر ممکن نہیں۔ جہاں اس وقت آپ تشریف رکھتے ہیں وہاں تک پہنچنا تو بہت بڑی بات ہے، راج پیپلی کے کنارے پر قدم رکھتے ہوئے بڑی بڑی فوجوں کے حواس جاتے رہتے ہیں۔ شاید یہ بہتر ہوگا کہ اس بیش بہا کتاب کے اندراجات میں سے دو تین تازہ اندراجات میں آپ کو سنا دوں:

"۶ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء سنگرام سیسودیہ، کمانڈر افواج گوالیار قوم راجپوت۔ گرفتار کردہ دستہ نمبر ۲ (ب)۔ ڈنڈ دس ہزار روپیہ جس کی آخری تاریخ ۹ اپریل تھی، ۸ اپریل کو ڈنڈ وصول ہوگیا۔ یہ کمانڈر بہت خوش اخلاق آدمی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ دن اور قیام کرے۔"

"۲۰ اگست سنہ ۱۸۶۵ء۔ گال دی موسے۔ قوم فرانسیسی۔ گرفتار کردہ دستہ نمبر ۶۔ ڈنڈ پندرہ ہزار روپیہ جو ۲۴ ستمبر تک ادا ہو جانا چاہیے تھا۔ ڈنڈ بروقت وصول ہوگیا۔ بڑا اچھا شکاری تھا۔ مجھے اس نے ایک فرانسیسی رائفل تحفہ میں دی تھی۔ اس کے چلے جانے سے ایک دوست مجھ سے چھوٹ گیا۔"

بسرام: "آپ نے دیکھا صاحب! میں ڈنڈ وصول ہوئے بغیر کسی کو نہیں چھوڑتا۔"

ہیراڈ: "لیکن ڈنڈ نہ دیا جائے؟"

بسرام: "اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے — سب خوشی سے ڈنڈ دیتے ہیں۔ پھر میں ڈنڈ کی رقم کبھی حیثیت سے زیادہ مقرر نہیں کرتا۔ بہر طور گفتگو کی اس ظاہری درشتی کے لیے مجھے معاف فرمائیے اور مجھے بتائیے کہ آپ کی آمدنی کتنی ہے؟"

ہیراڈ نے کہا: "میری آمدنی یہاں کے سکہ کے حساب سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ سے کچھ زیادہ ہے۔"

بسرام: "تو آپ کے لیے میرے نزدیک اتنا ہی ڈنڈ مناسب رہے گا۔ یہ روپیہ ایک مہینے کے اندر آ جانا چاہیے۔ یہ ہے قلم دان اور کاغذ۔ جس قدر جلد آپ کا خط پہاڑوں سے گزر کر چلا جائے اتنی ہی جلد روپیہ آ جائے گا اور آپ خوشی سے اودے پور یا جہاں آپ کا جی چاہے جا سکیں گے۔

"اچھا۔ اب ناخوش گوار باتیں تو ختم ہوگئیں۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ دو آدمی ہر وقت آپ کی خدمت کے لیے موجود رہیں گے۔ کھانے کے متعلق جو ہدایتیں آپ کرنا چاہیں کر دیجیے۔ ایک خان ساماں جو انگریزی کھانے اچھے تیار کرتا ہے آپ کے لیے موجود ہے۔ جو تھوڑی بہت تکلیف آپ کو ہوئی اسے بھول جائیے اور آرام سے زندگی بسر کیجیے۔ یہاں کی آب و ہوا بہت خوش گوار ہے۔"

(۳)

شروع شروع میں تو ہیراڈ کا مزاج کچھ برافروختہ سا رہا لیکن پھر وہ وہاں کے ماحول سے مانوس ہوگیا۔ اب اس نے اندازہ کیا کہ بسرام سے زیادہ خلیق، ملنسار اور خوش طبع آدمی ملنا مشکل ہے۔ ہیراڈ کو اب سے پہلے اس قدر شایستہ اور ذہین آدمی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

ہیراڈ پر یہاں کوئی بندش نہیں تھی۔ وہ آس پاس کے پہاڑوں میں آزادی کے ساتھ گھوم سکتا تھا اور جہاں تک اس کا اندازہ تھا، بظاہر اس کی دیکھ بھال بھی نہیں کی جاتی تھی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہاں سے چھپ کر بھاگ جانا کسی طرح ممکن نہیں اس لیے اب وہ جس حال میں تھا اسی میں مطمئن ہو کر انتظار کرنے لگا کہ واقعات کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔

اس اثنا میں ہیراڈ کی اس گرفتاری کی خبر سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مہارانا اودے پور کو ہیراڈ کے اس طرح گرفتار ہونے پر ایک نہایت سخت نوٹ بھیجا تھا اور کلکتہ اور مدراس کے بعض انگریزی اخباروں نے ریاست کے انتظام کے خلاف مضامین شایع کیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسرام کی گرفتاری اور ہیراڈ کو رہا کرانے کے لیے انگریزی اور ہندوستانی سپاہی اور زیادہ تگ و دو کرنے لگے۔

بسرام کا خبر رسانی کا انتظام نہایت مکمل تھا۔ اسے اطلاعیں ملنی شروع ہوئیں کہ راج پیپلی کے جنگل میں فوجیں گشت کر رہی ہیں۔ ان فوجوں کی ہر جنبش کی خبریں بسرام کو مل رہی تھیں مگر وہ بالکل بے فکر تھا۔ پہلے بھی بارہا یہ تماشا ہو چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ پہاڑوں کے پیچ در پیچ دروں

اور طول طویل گھاٹیوں میں فوجوں کا پہنچنا قریب قریب ناممکن تھا۔ بسرام نے اس کا ذکر ہیراڈ سے بھی کیا۔ اس نے کہا: "صاحب معلوم ہوتا ہے کہ مجھے آپ کی میزبانی کی عزت سے محروم کرنے کے لیے بڑی زبردست کوششیں ہو رہی ہیں۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہے اور تو خیر کوئی حرج نہیں ہے، ہاں اس ناشائستہ حرکت کا آپ پر برا اثر پڑے گا۔"

ہیراڈ: "اس حرکت کا برُا اثر مجھ پر کیوں پڑے گا، میرا اس میں کیا قصور ہے؟"

بسرام: "بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو ڈنڈ کی رقم کا جلد سے جلد انتظام کر دینا چاہیے تھا۔ اس کے بجائے وہ راج پیپلی میں بہت سے گڈّے بٹھا رہے ہیں۔ ان گڈّوں کو وہ فوجی سپاہی کہتے ہیں۔ یہ سب کیا تماشا ہے؟ ٹھیک ہے، آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو اس بیکار فوجی اچھل کود کو روک ضرور سکتے ہیں۔ یہ چیز خود ان لوگوں کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میرے ایک اشارے پر نہایت آسانی کے ساتھ سب کا صفایا کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ کرنل بروس کو ایک خط لکھیں کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ ان کو لکھیے ڈنڈ کا سونا جس قدر جلد ممکن ہو بھیج دیں تاکہ آپ کو رہائی نصیب ہو۔ ڈنڈ ادا کرنے کی آخری تاریخ بہت قریب ہے۔ جمعہ کے دن رات کے بارہ بجے تک لازمی طور پر ڈنڈ وصول ہو جانا چاہیے۔ سارا ڈنڈ سونے کی شکل میں ہو گا۔ ایک خچر پر اسے لادا جائے گا۔ وہ خچر پورب والی کالی پہاڑی کی پہلی کھوہ تک لایا جائے گا۔ صرف ایک آدمی خچر کے ساتھ ہو گا۔ کھوہ کے سامنے جو پتھر پڑا ہے یہ خچر اس سے باندھ دیا جائے گا اور جو آدمی ساتھ آیا ہے وہ فوراً واپس چلا جائے گا۔"

ہیراڈ اب اس امر سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا کہ بسرام بہت باخبر رہتا ہے اور اسے منٹ منٹ کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں۔ پھر بھی اسے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ بسرام کرنل بروس کا نام جانتا ہے۔ اس نے جواب دیا: "فرض کرو کہ کمپنی بہادر اور مہارانا میرے خط کا کچھ خیال نہ کریں؟"

بسرام: "صاحب وہ خیال کریں یا نہ کریں۔ جمعہ کی رات کو بارہ بجے تک ڈنڈ وصول ہو جانا بالکل ضروری ہے ورنہ پھر ڈنڈ منسوخ کر دیا جائے گا اور دوسری کارروائی کی جائے گی۔"

ہیراڈ بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے بسرام کے ساتھ تین ہفتے گزارے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ڈنڈ کا روپیہ بروقت موصول نہ ہوا تو اس کی جان کی خیر نہیں ہے۔ اس نے کرنل بروس کے نام ایک خط لکھا کہ "خدا کے لیے بسرام کی تمام ہدایتوں پر فوراً عمل کرو اور جس طرح ہو سکے ڈنڈ کا سونا وقت سے پہلے پہنچا دو۔" یہ خط اس نے بسرام کو دکھایا تو وہ بولا: "بہت خوب، آپ نے سارا مطلب بہت مختصر لفظوں میں ادا کر دیا۔"

(۴)

اودے پور میں ہیراڈ کے واقعے نے اچھا خاصا کہرام مچا دیا تھا۔ مہارانا بھیم سنگھ بہ ذات خود اس معاملے میں بڑی گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ کلکتہ سے لارڈ ہیسٹنگز نے ایک بڑے افسر کو اودے پور بھیجا تھا کہ وہ ہیراڈ کو ڈاکوؤں کے پنجے سے چھڑانے کے انتظامات کرے۔ یہ افسر ابھی راستے ہی میں تھا کہ ڈنڈ کے ادا کرنے کی آخری تاریخ آ گئی۔

کرنل بروس اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہیراڈ کا خط پہنچ چکا تھا اور اس وقت ان کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ عین اسی وقت بلبیر سنگھ راوت کرنل سے ملنے کے لیے آیا۔ راوت مہارانا کی فوج کا ایک بڑا افسر تھا اور ہیراڈ کی رہائی کا کام خاص طور پر اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا: "کرنل صاحب کوئی تازہ خبر؟"

کرنل: "ہاں یہ خط موصول ہوا ہے، سنیے۔" (پڑھ کر سناتا ہے)

راوت: "اس کا جواب آپ نے بھیج دیا؟"

کرنل: "ہاں بھیج دیا۔ وہ شاید پہنچ بھی گیا ہو؟"

راوت: "کیا جواب دیا آپ نے؟"

کرنل: "میں نے لکھ دیا ہے کہ ڈنڈ وقت پر پہنچ جائے گا، اس کے سوا اور کوئی جواب دینا خطرناک ہوتا۔ اگر ہیراڈ کا بال بیکا ہو گیا تو پھر آپ کی اور میری دونوں کی خیر نہیں ہے۔ ریاست پر جو کچھ بیتے وہ تو بیتے ہی گی۔"

راوت: "اس مقصد کے لیے جس قدر سونے کی ضرورت ہے آپ نے اس کا انتظام کر لیا ہے؟"

کرنل: "ہاں سب انتظام ہو گیا ہے۔"

راوت: "خیر جو آپ کی مرضی۔ مگر یہ تو بتائیے خچر کے ساتھ کس کو بھیجیے گا؟"

کرنل: "میں خود خچر کے ساتھ جا رہا ہوں۔ یہ معاملہ بہت ہی نازک ہے، میں اسے کسی اور کے سپرد کرنا نہیں چاہتا۔"

راوت: "اگر بسرام کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ آپ کون ہیں تو مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ آپ کو گرفتار کرے گا۔ اور پھر آپ کے ڈنڈ کے لیے اس سے بھی بڑی رقم کا مطالبہ ہوگا۔"

کرنل: "میں اودے پور میں کئی سال سے ہوں۔ اس دوران میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ بسرام نے کسی ایلچی کو ستایا ہو۔ یہ عجیب سی بات ضرور ہے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بھی اپنے مخصوص اصول رکھتا ہے اور ہمیشہ پختگی کے ساتھ ان پر عمل کرتا ہے۔"

راوت: "معلوم ہوتا ہے آپ خچر کے ساتھ خود جانے کا پکا ارادہ کر چکے ہیں۔"

کرنل: "بے شک۔"

راوت: "آپ کی مرضی، لیکن میں یہ بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کی رائے سے بالکل متفق نہیں ہوں اور آپ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی ذمے داری پر کر رہے ہیں، میں اس معاملے سے بالکل الگ ہوں۔"

کرنل: "بالکل ٹھیک ہے، یہی مناسب بھی ہے۔"

راوت بہت خوب کہہ کر چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ماتحت افسروں کو طلب کر کے کہا: "کرنل بردس نے ڈنڈ دینے کا ارادہ کر لیا ہے اور ڈنڈ کا سونا لے کر وہ خود جا رہے ہیں۔ یہ ڈنڈ جس جگہ دیا جائے گا وہ لاندرہ گاؤں سے تین میل اوپر ہے۔" پھر اس نے کپتان سمیر سنگھ کو خاص طور پر مخاطب کر کے کہا: "تم اپنے دو سو تیز دست اور بہادر سپاہیوں کو ساتھ لے کر پہلے ہی سے اس مقام کو گھیر لو۔ مجھے یقین ہے کہ بسرام خود یہ ڈنڈ لینے آئے گا اور اگر تم نے احتیاط اور ہمت سے کام لیا تو پھر نام آوری اور ترقی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔"

کپتان نے فوجی سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔

جمعہ کی رات تھی۔ نئے چاند کی ہلکی ہلکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دو خچر سوار پہاڑوں پر سے گزر رہے تھے۔ اگلے خچر پر کرنل بردس تھے۔ اس کے پیچھے والے خچر پر ان کا معتمد راج پوت ملازم تھا۔ کرنل بردس کو قطعاً معلوم نہیں تھا کہ راوت نے کیا انتظامات کیے ہیں۔ وہ یہ سوچ کر چلے تھے کہ سورج غروب ہونے کے قریب وہ منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ لیکن راستے کی ناہمواری اور چڑھائی کی دشواری اندازے سے زیادہ سخت نکلی۔ ابھی کافی فاصلہ طے کرنا تھا کہ سورج غروب ہو گیا۔ پھر بھی وقت کافی تھا کیوں کہ انھیں رات کے بارہ بجے سے پہلے پہنچنا تھا۔ اگلے دو تین میل کی چڑھائی اور زیادہ سخت تھی۔ اس میں زیادہ وقت لگ گیا۔ اس چڑھائی کو طے کرنے کے بعد ہی ایک موڑ تھا۔ جیسے ہی کرنل اور ان کا ملازم اس موڑ سے آگے بڑھے انھیں اپنے دونوں طرف سایے میں کچھ لوگ حرکت کرتے ہوئے معلوم ہوئے اور اس کے فوراً ہی بعد دس بارہ آدمیوں نے انھیں گھیر لیا۔ یہ سب لوگ مختلف قسم کے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ کرنل نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "تم کون ہو؟" اس پر ایک شخص جو پاؤں تک کا سیاہ جبہ پہنے ہوئے تھا منھ پر سے نقاب اٹھا کر آگے بڑھا، کرنل بردس کے منھ سے نکلا "کون بسرام!"

بسرام کے چہرے مہرے میں بعض ایسی نمایاں خصوصیات تھیں جن سے اودے پور کا بچہ بچہ واقف تھا۔ اس کے علاوہ کرنل بردس نے اس سے پہلے اسے دیکھا بھی تھا اور ایسے موقعے پر دیکھا تھا کہ وہ بھول نہیں سکتا تھا کرنل نے بسرام کو پہچان کر اپنے حواس کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"مگر یہ تو وہ جگہ نہیں ہے۔"

بسرام: "آج وہاں ڈنڈ نہیں وصول کیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا اور کہا: "کرنل بردس کو گرفتار کر لو۔"

کرنل: "لیکن میں تو ایک ایلچی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ہمیشہ ایلچیوں کی حفاظت کرتے ہو اور انھیں اپنا کام انجام دے کر واپس جانے کا موقع دیتے ہو۔ کیا تم اپنے اس قاعدے کو توڑنا چاہتے ہو؟"

بسرام: "اس قاعدے کو تم نے خود توڑ دیا۔"

کرنل: "میں نے! میں نے ہرگز کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے تمھیں اپنے کسی اصول اور قاعدے کو توڑنے کی ضرورت پڑتی۔"

بسرام: "تم نے ایک شریف اور معزز اور ذمے دار انسان کی طرح برتاؤ نہیں کیا۔ جس مقام پر ڈنڈ وصول کیا جانا چاہیے تھا وہاں تم نے اپنے پہنچنے سے پہلے کافی تعداد میں فوج کے سپاہی بھیج دیے ہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا تمھیں اس دھوکے بازی کی سزا نہیں ملنی چاہیے؟"

کرنل: "کیسے فوج کے سپاہی! میں نے ایک سپاہی بھی کہیں نہیں بھیجا ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں یہ سب کیا تماشا ہے؟"

بسرام: "پھر خاص اس وقت جب کہ ڈنڈ دینا تھا فوج وہاں کیونکر پہنچ گئی؟"

کرنل: "میں نے تمھیں بتایا تو کہ مجھے اس کا قطعاً علم نہیں۔ مجھے تو خود حیرت ہے کہ یہ کیا بات ہوئی، فوج وہاں کس نے بھیج دی؟"

بسرام: "کیا تم نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا تھا کہ تم مجھے اس طرح آج ڈنڈ دو گے؟"

کرنل: "ہاں میں نے ذکر کیا تھا۔"

بسرام: "کس سے؟"

کرنل: "یہ میں نہیں بتاؤں گا۔"

بسرام: "اچھا خیر، میں چاہتا بھی نہیں کہ تم مجھے بتاؤ۔ لیکن اگر واقعی تمھیں فوج کے آنے کا علم نہیں ہے تو تم ہیراڈ صاحب کا ڈنڈ لائے ہو گے؟"

کرنل: "ہاں میں ڈنڈ لایا ہوں۔ اگر ڈنڈ نہ لاتا تو میں آتا کیوں؟ میں نے ہیراڈ کے خط کے جواب میں لکھ دیا تھا کہ ڈنڈ وقت پر پہنچا دوں گا۔"

بسرام: "اچھا آؤ، ان (اشارہ کرکے) پتھروں پر بیٹھ کر معاملہ طے کریں۔"

جب بسرام کو معلوم ہو گیا کہ وہ واقعی ڈنڈ لے کر آیا ہے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کیا ہے تو اس نے کرنل سے کہا: "کرنل! میں آپ سے بہت ادب کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے جو کچھ آپ سے کہا اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے اب یقین ہے کہ جو لوگ وہاں موجود ہیں جہاں یہ ڈنڈ ادا کیا جانے والا تھا انھیں آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری بدگمانی کے لیے مجھے معاف فرمائیں گے۔"

کرنل: "بسرام! میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں بہ شرطیکہ چارج ہربرٹ ہیراڈ کو میرے سپرد کر دیا جائے۔"

بسرام: "یہ لیجیے ہیراڈ صاحب موجود ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ایک نہایت شریف اور خلیق انسان کی رفاقت سے محروم ہو جاؤں گا۔"

ہیراڈ آگے بڑھ کر کرنل بردس سے بغل گیر ہوئے اور بولے "میں نے آپ لوگوں کو بہت پریشان کیا۔"

کرنل: "اس میں تو شک نہیں لیکن آپ کے مل جانے سے وہ ساری پریشانیاں مسرتوں میں تبدیل ہو گئیں۔"

بسرام یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ "اب آپ لوگ مجھے اجازت دیجیے۔ وہاں فوج میرا انتظار کر رہی ہے، اس کی خاطر کرنا بھی میرا فرض ہے۔"

لاندرہ گاؤں سے تین میل اوپر والی کھوہ پر ایک آدمی خچر کو لے کر چڑھتا ہوا نظر آیا۔ کھوہ پر پہنچ کر اس نے خچر کو ایک بڑے پتھر سے باندھا اور غائب ہو گیا۔ اس آدمی کو پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اور خچر کو باندھتے ہوئے ڈھائی سو آنکھوں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں سے دیکھا۔

کپتان سمیر سنگھ اور ان کے ساتھی انتظار کرتے رہے کہ بسرام اس خچر کا بوجھ ہلکا کرنے آتا ہو گا۔ ان کے نزدیک وہ خچر اس بکری کی طرح تھا جس کو شکاری اس لیے باندھ دیتے ہیں کہ شیر اس پر حملہ کرے اور انھیں خود شیر کے شکار کا موقع ملے۔ لیکن ساری رات گزر گئی اور بسرام یا اس کا کوئی آدمی خچر پر سے ڈنڈ کا سونا اتارنے نہیں آیا۔

جب صبح نمودار ہوئی تو کپتان سمیر سنگھ پہاڑ پر چڑھے اور خچر کے پاس پہنچے اور اس پر سے بوریاں اتروا کر کھولیں۔ سب بوریوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔ ایک بوری میں پتھروں کے نیچے سے ایک خط نکلا۔ کپتان کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ خط خود اسی کے نام تھا۔

شری مان کپتان سمیر سنگھ جی!

امید ہے کہ آپ نے رات بہت آرام سے گزاری ہو گی گو رات ہوا میں ذرا خنکی زیادہ تھی، بہر طور میں آپ جیسے بہادر کپتان اور آپ کے دلیر ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے اجاڑ علاقے میں قدم رنجہ فرما کر مجھ پر احسان کیا گو مجھے اس کا بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی خاطر نہ کر سکا۔

بسرام راجو



میرا وطن

احسان اکبرآبادی

"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

نرالی ہے یہاں کی شانِ شوکت — ہے تابندہ یہاں روئے سیاست
سکوں پرور فضائیں ہیں یہاں کی — طرب افزا ہوائیں ہیں یہاں کی
یہ امن و آشتی کا پاسباں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

ہمالہ اس کے ماتھے کا ہے ٹیکا — ہے اس کی گود میں تاج و اجنتا
مچلتی ہے یہاں جھیلوں میں چاندی — رواں نہروں میں ہے سونے کا پانی
ہر اک نظارہ عکسِ جناں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

یہاں پر تازگی ہی تازگی ہے — یہاں کی دھوپ جیسے چاندنی ہے
درخشاں ہیں یہاں رنگیں اُجالے — جبیں پر اُس کی روشن ہیں ستارے
یہاں کا ذرّہ ذرّہ ضوفشاں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

تمدّن نے یہاں پر آنکھ کھولی — اسی کی گود میں تہذیب جاگی
یہ گہوارہ رہا ہے علم و فن کا — یہاں انسانیت کا روپ نکھرا
حیاتِ نَو کا یہ رُوحِ رواں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

یہاں پر میگھ برساتے ہیں امرت — دھنک دیتی ہے اس دھرتی کو رنگت
خس و خاشاک میں بھی بانکپن ہے — یہاں صحرا بھی صد رشکِ چمن ہے
یہ تصویرِ بہارِ جاوداں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

کھنکتے ہیں یہاں جامِ اخوّت — فضاؤں میں بسی ہے بوئے اُلفت
یہاں آئینۂ گنگ و جمن ہے — ہر اک سو ایکتا جلوہ فگن ہے
محبّت کا یہاں دریا رواں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

سجا کر مانگ میں کرنوں کے گوہر — سحر آتی ہے سج دھج کر یہاں پر
شرابِ نو چھلکتی ہے گلوں سے — ترنم پھوٹتا ہے زمزموں سے
یہاں فطرت ہمیشہ نغمہ خواں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

حیات افزا ہیں اس کے کارخانے — مشینیں گنگناتی ہیں ترانے
ترقی اس کے آنگن میں ہے رقصاں — مہکتے ہیں مسرّت کے گلستاں
یہاں پر زندگانی شادماں ہے
"مرا پیارا وطن ہندوستاں ہے"

بنواری لال شعلہ علی گڑھی

ویریندر پرشاد سکسینہ

ہندوؤں نے اردو ادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کا سلسلہ اردو کے جنم دن سے آج تک چلا آرہا ہے۔ کائستھوں کو اس باب میں خاص امتیاز حاصل رہا ہے اور منشی جوالا پرشاد برقؔ، نوبت رائے نظرؔ، دوارکا پرشاد افقؔ، ہرگوپال تفتہؔ اور بالمکند بے صبرؔ کی نسل معنوی آج تک بدستور سرگرم کار ہے۔ اس مقالے میں ایسے ہی گھرانے کے ایک ایسے اردو شاعر بنواری لال شعلہؔ کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے کرشن بھگتی اور رام بھگتی پر اردو میں ایسی بلند پایہ نظمیں کہی ہیں جن کا جواب ہندستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں مشکل سے ہی مل سکے گا۔

بنواری لال شعلہ کے بزرگوں کا وطن حصار صوبہ پنجاب تھا اور ان کے یہاں قانون گوئی کا عہدہ وراثتاً چلا آتا تھا۔ ان کا تمام خاندان علم دوست تھا۔ ان میں سے بعض اہل تصنیف بھی گزرے ہیں۔ بنواری لال شعلہ کی ولادت ۲۵ر جولائی سنہ ۱۸۴۷ء کو بمقام سہارن پور ہوئی۔ وہاں ان کے والد منشی موتی لال محکمۂ کلکٹری میں صدر ناظر کے عہدے پر فائز تھے۔ عشرتؔ لکھنوی مرحوم تذکرۂ ہندو شعرا میں صفحہ ۱۳۰ پر رقمطراز ہیں کہ بنواری لال شعلہؔ بریلی کے رہنے والے تھے جو صحیح نہیں ہے۔ برقؔ سیتاپوری نے تذکرہ بہار سخن میں ان کا سال ولادت ۱۸۴۲ء تحریر کیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ شعلہؔ صاحب کے حقیقی بھتیجے کا ایک مقالہ بنواری لال شعلہؔ کے سلسلے میں کایستھ سماچار جنوری سنہ ۱۹۰۲ء میں شایع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے شعلہؔ صاحب کی تاریخ ولادت ۲۵ر جولائی سنہ ۱۸۴۷ء تحریر کی ہے اور یہی صحیح تاریخ ولادت ہے۔ شعلہ کا بچپن، جوانی اور پیری کا زمانہ علی گڑھ میں گزرا۔ اسی نسبت سے وہ شعلہؔ علی گڑھی کہلاتے ہیں۔

اوائل عمری میں شعلہؔ کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ان کی تعلیم مکتب سے آگے نہ بڑھ سکی۔ انتظام خانہ داری اور معیشت کی فکریں دامنگیر ہو گئیں۔ آخر سنہ ۱۸۷۳ء میں دفتر بندوبست علی گڑھ میں ملازم ہو گئے۔ لیکن ملازمت کی پابندیوں کو طبیعت سے مناسبت نہ تھی اس لیے اس کو خیرباد کہہ دیا اور وکالت کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ ہی میں وکالت کرنا شروع کر دی۔ ابتدا میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی لیکن آخر زمانے میں ان کا شمار علی گڑھ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ جب فارغ البالی ہوئی تو محلہ بجے گنج علی گڑھ میں ایک مکان بنوا لیا اور اس مکان کے سامنے ہی سنہ ۱۸۹۹ء میں ایک مندر بنوا دیا۔ شعلہؔ کرشن بھگت تھے لیکن انھوں نے اس مندر میں شری گوپیشور ناتھ مہادیو جی کی مورتی کی استھاپنا کرائی تھی۔ عین رام نومی کے دن سنہ ۱۹۰۳ء میں دس بجے دن کو درد نقرس میں انتقال فرمایا۔ اولاد میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ ایک لڑکی تھی جو جناب کرشن گوپال ورما مرحوم بی۔ اے رئیس علی گڑھ کو منسوب تھی۔ اس کا انتقال بھی شعلہؔ مرحوم کی وفات کے تین سال بعد ہو گیا۔ شعلہؔ مرحوم کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا اور ان شاگردوں میں منشی کندن لال شررؔ سہاورپوری کا شمار اساتذہ

سخن میں ہوتا ہے ۔ شترؔ سہارنپوری نے اپنے استاد کے مرنے کے بعد ان کی یاد میں انھیں کے نام پر ایک رسالہ شعلہ بھی جنوری سنہ ۱۹۰۲ء میں سیل گڑھ ریاست گوالیار سے نکالا تھا ۔ اس رسالے کے تین ابتدائی شمارے میری لائبریری میں محفوظ ہیں ۔

شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے ہی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا کیونکہ ان کے آبا و اجداد شرابِ سخن کے متوالے تھے ۔ باقاعدہ شاعری شروع کرنے کے بعد ابتدا میں منشی بالمکند بے صبرؔ شاگرد غالبؔ کو اپنا کلام دکھایا ۔ کبھی کبھی مرزا غالبؔ کے مایۂ ناز شاگرد حضرت تفتہؔ سے بھی مشورۂ سخن کیا کرتے تھے ۔ ضیغم حیدرآبادی، دیا نرائن نگمؔ، طالبؔ دہلوی اور مولانا حسرتؔ موہانی نے شعلہؔ کو غالبؔ کے شاگردوں میں دھوکے سے شمار کر لیا ہے جو صحیح نہیں ہے ۔ شعلہؔ مرزا غالبؔ نہیں بلکہ ان کے شاگرد تفتہؔ اور بے صبرؔ کے شاگرد تھے ۔

شعلہؔ کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ منشی امیر اللہ تسلیمؔ سنہ ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ تشریف لائے ۔ ان کی آمد پر علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا ۔ اس مشاعرے کی اطلاع شعلہؔ مرحوم کو مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے دی گئی تھی ۔ شعلہؔ صاحب مشاعرے میں گئے لیکن انھوں نے غزل نہیں پڑھی ۔ بعد اختتامِ مشاعرہ حضرت تسلیمؔ سے ملاقات کی اور فرمایا کہ آپ ایسے صاحب کمال علی گڑھ تشریف لائیں اور شہر کے اہلِ ذوق و ادب اس سے محروم رہیں ۔ اس لیے شہر میں کل بزم مشاعرہ منعقد کر دی گئی ہے ۔ دوسرے دن حضرت تسلیمؔ نے مشاعرے میں جس وقت شعلہؔ صاحب کی غزل سنی تو بے اختیار ہو کر فرمایا : "آپ ایسے باکمال اور ایسے پوشیدہ"

اردو اور ہندی کے بعض نقادوں اور ادیبوں کا یہ خیال غلط ہے کہ شعلہؔ کا دیوان اب بالکل نایاب ہو چکا ہے اور صرف کچھ غزلیں اور کچھ اشعار محفوظ رہ گئے ہیں ۔ شعلہؔ صاحب کا دیوان اور ان کی حسبِ ذیل دوسری تصنیفیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں :

(۱) کلیاتِ شعلہ (طبع اول) ۔ یہ منشی بنواری لال شعلہؔ کے کلام کا مجموعہ ہے جسے منشی کرشن گوپال ورما بی۔ اے رئیس علی گڑھ نے مرتب کر کے اس کا پہلا اڈیشن سنہ ۱۹۱۴ء میں شایع کرایا تھا ۔ اس مجموعے میں شعلہؔ مرحوم کا ہر صنف کا کلام موجود ہے اور سارا کلام شاعرانہ محاسن سے آراستہ ہے ۔ اس مجموعے کی ضخامت دو سو صفحات سے زیادہ ہے ۔ اس اڈیشن میں ایک کمی بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں حضرت شعلہؔ کے سوانحی حالات بھی تمہید کے طور پر نہیں ملتے ۔ اس مجموعے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی اور اس کے پبلشر بھی منشی کرشن گوپال ورما ہی تھے ۔

(۲) کلیاتِ شعلہ (طبع دوم) اس دوسرے اڈیشن کے مرتب بھی منشی کرشن گوپال ورما ہیں ۔ پہلے اڈیشن میں کتاب دو حصوں میں تقسیم تھی لیکن طبع دوم میں بجائے دو کے تین حصوں میں منقسم کی گئی ہے ۔ پہلے حصے میں مذہبی نظمیں ہیں اور دوسرے حصے میں غزلیات اور متفرق نظمیں ہیں ۔ تیسرے حصے میں قومی نظمیں ہیں ۔ اس اڈیشن میں شعلہؔ مرحوم کی سوانح عمری بھی منشی کرشن گوپال ورما نے لکھ کر شامل کر دی ہے اور شعلہؔ صاحب کا فوٹو بھی کتاب میں شامل ہے ۔ دوسرا اڈیشن سنہ ۱۹۲۴ء میں انصاری پریس علی گڑھ سے بہ اہتمام محمد ذوالفقار الدین انصاری شایع ہوا تھا ۔

(۳) بزمِ بندرابن ۔ اس کتاب میں شعلہؔ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو انھوں نے مرلی والے کی بھگتی میں میرا بائی اور سورداس کے رنگ میں لکھے ہیں ۔ اس میں گوپیوں کے ہجر و غم، راس منڈل کی دل فریبیوں اور بنسی کی شیریں نوائیوں کے تذکرے ہیں جن کو پڑھ کر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے ۔ بزمِ بندرابن میں مثنوی کا انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ لاکھوں کی تعداد میں کرشن بھگت اس مثنوی کا پاٹھ صبح اور شام مندروں اور گھروں میں کرتے ہیں ۔ بزمِ بندرابن کے اردو اور ہندی میں پندرہ اڈیشن میری نظر سے گزر چکے ہیں ۔ اس کتاب کے سلسلے میں طالبؔ دہلوی منظوماتِ شعلہؔ پر مقالہ لکھتے ہوئے رسالہ آج کل ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء کے شمارے میں رقمطراز ہیں :

"بزمِ بندرابن نے تو شعلہؔ کو زندہ جاوید کر دیا ہے ۔ اردو داں سناتن دھرمی ہندو تو رامائن اور گیتا کی طرح اسے متبرک سمجھ کر اس کا روزانہ پاٹھ کرتے ہیں ۔ بعض کا یہاں تک عقیدہ ہے کہ تلسیؔ کے رامائن چرتر کی طرح شعلہؔ کی بزمِ بندرابن بھی انسان کو دنیوی اور دینی اسباب راحت فراہم کرنے میں بہت ممد و معاون ہوتی ہے ۔"

(۴) شری کرشن استتی ۔ اس میں شعلہؔ مرحوم کی وہ شاہکار نظمیں

کرشن بھگتی کے سلسلے میں شامل ہیں جن کا پاٹھ صبح کے وقت اب بھی عقیدت سے سیکڑوں کرشن بھگت کرتے ہیں۔ کرشن استتی کے پچاس سے زیادہ اڈیشن اردو اور ہندی میں اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ کئی سال ہوئے اس کا ایک ہندی اڈیشن علی گڑھ کے ایک کرشن بھگت نے راگھوب پرنٹنگ پریس علی گڑھ سے شایع کرایا تھا اس میں "دو شبد" کے عنوان سے یہ لکھا ہوا ہے:

" ان کی کرشن استتی آج بھارت کے ہزاروں آدمیوں کو کنٹھ (زبانی یاد) ہے اور پربھات کی بوڑیہ ([illegible]) بیلا میں سیکڑوں گھر ان کی دھیان سے گونج اٹھتے ہیں "

(۵) جنگ منڈلی۔ یہ شعلہ مرحوم کا وہ قابل ذکر مسدس ہے جس میں انھوں نے مریادا پرشوتم بھگوان رام چندر جی کو گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں۔ یہ مسدس کئی بار اردو اور ہندی میں شایع ہو چکا ہے۔ اس کے دو اردو اڈیشن میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ میرے خیال میں چکبست کا "رامائن کا ایک سین" اس مسدس کے مقابلے میں کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتا۔

اردو کے بعض ادیبوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اردو میں راماین اور مہا بھارت کی داستانیں تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔ اگر اردو کے منظوم لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو صرف رامائن اور مہا بھارت کی داستانوں پر مشتمل پانچ پانچ ہزار کے دو انتخابات شایع کیے جا سکتے ہیں۔ اس انتخاب میں شعلہ علی گڑھی کی منظومات کو بڑا امتیاز مقام حاصل رہے گا۔ کرشن بھگتی اور رام بھگتی کے سلسلے میں نظمیں کہنے والوں میں گور سہائے ملتجی، نظیر اکبر آبادی، فرحت لکھنوی، خوشتر لکھنوی، برق دہلوی، سرور جہان آبادی کا خاص مرتبہ ہے لیکن جو مقبولیت شعلہ کو حاصل ہوئی وہ اور کسی کو نہیں ہوئی کیونکہ شعلہ کے یہاں جو والہانہ عقیدت اور شدت جذبات ملتی ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ حضرت جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں شعلہ کی کرشن بھگتی کی نظموں کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"ہندوؤں میں آپ کے کلام کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ اس کا راز آپ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو آپ نے اقلیم حسن کے تاجدار مرلی والے کی شان میں گائے ہیں۔ ایک دیوان غزلوں کا بھی ہے جس میں کم و بیش دو ہزار اشعار ہیں۔ مگر جس چیز نے اب تک آپ کا نام زندہ رکھا ہے وہ کرشن کنھیا کی جاں بخش شیریں کاریوں اور سرور انگیز کافرما جرائیوں کے راگ ہیں "

کرشن بھگتی کے سلسلے میں آپ کی شاہکار مثنوی بزم بندرابن اردو ادب میں یقیناً ایک یادگار کارنامہ ہے۔ بزم بندرابن اردو مثنوی نگاری میں بھگتی اسکول کا آغاز کرتی ہے جس کے نمائندے برق دہلوی، رونق دہلوی، مہر دہلوی، شیدا دہلوی، جگر بریلوی، منور لکھنوی وغیرہ ہیں شعلہ کی مثنوی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں بیانیہ شاعری میں استادی کا درجہ حاصل تھا۔ پوری مثنوی میں بڑی پختگی شگفتگی اور روانی ہے۔ حضرت جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں اس مثنوی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

" شری کرشن جی کی بھگتی میں بالکل رنگ گئے۔ ڈوب ڈوب کے قلبی کیفیتوں اور حسن عالم افروز کی کرشمہ سازیوں کے ترانے سنانے لگے ـــــ وہ ترانے جن پر روح وجد کرتی ہے۔ اس رنگ کی آپ کی ایک مستقل تصنیف بزم بندرابن ہے جسے پریم کے پجاری حرزِ جاں بنائے رکھتے ہیں اور اس کے بعض حصوں کا بڑی عقیدت سے روزانہ پاٹھ کرتے ہیں۔ شاعری کے تمام جوہر اصلی آب و تاب کے ساتھ اس تصنیف میں نمایاں ہیں۔ جوش، رنگینی مصوری، برجستگی، شدت و لطافت جذبات سبھی کچھ ہے۔ البتہ زبان میں ہندی کی آمیزش زیادہ ہے۔ بزم بندرابن کی ابتدا اس جوش سے ہوتی ہے جیسے پہاڑ سے آبشار ابلتا ہے "

اب اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شری جگدیش برندابن بہاری ــ شری رادھا رمن مادھو مراری
شری گوبند رادھا کرشن گوپال ــ مدن موہن شری گھنشام نند لال
شری مرلی منوہر شیام سندر ــ شری بھگوان گوپی ناتھ گردھر
شری جیت شری بانکے بہاری ــ چتر بھج شیام مورت چکر دھاری
مکٹ دھاری مدن گوپال موہن ــ نول سندر چھبیلے لال موہن
تو ہی ہے حسن رخسار حقیقت ــ تو ہی ہے پردہ بردار حقیقت
تو ہی ہے جلوہ فرمائے دو عالم ــ تو ہی ہے خود تماشائے دو عالم
تو ہی پروانہ تو ہی شمع محفل ــ تو ہی گلبن تو ہی شورِ عنادل

بت[1] چت چور ماکھن کے لٹیرے حیات و موت دونوں کھیل تیرے
نمود آفرینش ہے تجھی سے وجود آفرینش ہے تجھی سے
الگ کب تجھ سے تیری گفتگو ہے غرض اک تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے

"عرضداشت" کے عنوان سے بنسی والے کے چرنوں میں نویدن کرتے ہیں:

عجب ہے کچھ مری حالت کا اظہار سراسر ہوں ادھم پاپی گنہگار
نہ لایق التماس و التجا کے نہ قابل اپنی عرض مدعا کے
ندامت نامۂ اعمال سے ہے خجالت آپ اپنے حال سے ہے
نکما ہوں نکمی زندگی ہے مری ہستی کو خود شرمندگی ہے
وہ آوارہ وطن جس نے نہ دیکھا وہ بلبل ہوں چمن جس نے نہ دیکھا
الگ ہوں دور ہوں سب سے جدا ہوں عجب بیکس ہوں بے برگ و نوا ہوں
نہ کوئی چھوڑ جانے کی نشانی نہ کوئی یادگار زندگانی
نہیں چھونے کے قابل جسم ناپاک ملے گی کس طرح سے خاک میں خاک
غرض جو کچھ ہوں سب تجھ کو خبر ہے مرا انجام کیا مد نظر ہے؟
ہمیشہ ہے گنہگاروں پہ رحمت ہمیشہ ہے تری بخشش کی عادت
برا ہے وقت وہ جس کا کہ ڈر ہے سماں یہ ہے کہ جو پیش نظر ہے
دم آخر رواں آنکھوں میں ہوگا کئی دن یہ سماں آنکھوں میں ہوگا
بدلتی ہوں محبت کی نگاہیں ہر اک جانب ہوں حسرت کی نگاہیں
ہجوم اہل ماتم ہوں سرہانے عزیز و اقربا، خویش اور یگانے
مرے ہر کام باہم بٹ رہے ہوں اٹھانے والے بھائی چھٹ رہے ہوں
غرض سامان رخصت جب ہو تیار پڑے جان اور اجل میں آکے تکرار
اسے تعجیل ہو حکم قضا کی اسے ہو ڈھیل عرض مدعا کی
وہ بیچری ہو کہ آگے دھڑکے نکلوں یہ مچلی ہو کہ درشن کرکے نکلوں
پڑا جھگڑا ہو کچھ آپس میں بھاری وہ کیا بس اک تمہاری انتظاری
نظر آجائے چھب بانکی ادا کی مندیں آنکھیں تو ہو جھانکی ادا کی
تصور رشتۂ جاں میں جکڑ لوں چھٹے تب نبض جب دامن پکڑ لوں
جب آئے آنکھ میں دم پران پیارے لگا ہو دھیان چرنوں میں تمہارے

نظم "جھانکی" میں شعلہ نے مرلی والے سے درشن دینے کی تمنا اس صورت سے ظاہر کی ہے۔

کدم کی چھاؤں ہو جمنا کا تٹ ہو ادھر مرلی ہو ماتھے پر مکٹ ہو
کھڑے ہوں آپ اک بانکی ادا سے مکٹ جھونکوں میں ہو موج ہوا سے
کسی نازک کمر ہو کاچھن سے بندھی بنسی ہو جامے کی تنی سے
بھری گجروں سے ہو نازک کلائی بنے ہوں برگ گل دست حنائی
برابر ہوں شری رادھا کشوری مدھر سر بانس کی بجتی ہو پوری
تبسم ہو دم نظارہ باہم عیاں اک چھب میں ہو حسن دو عالم
جدا ہوں گو، برائے نام دونوں بنے ہوں ایک رادھا شیام دونوں

ہم دیگر ہو عکس حسن زیبا
کنھیا رادھا ہوں رادھا کنھیا

شعلہ نے مریادا پرشوتم بھگوان رامچندر جی کے حالات کو اپنے ایک مسدس "جنک نندنی" میں اس خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ ان کا یہ مسدس اردو ادب میں ایک شعری شاہکار ہے۔ سیتا جی رام چندر جی کے ساتھ بن جانے کے لیے اصرار کرتی ہیں۔ شعلہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

ہر دم رہے گا نقش کف پا نگاہ میں
آنکھیں بچھاتی جاؤں گی صحرا کی راہ میں

رام چندر جی، لکشمن جی اور سیتا جی بن جانے کے لیے اجودھیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو ان کی ماتاؤں کے دل پر کیا گزرتی ہے:

سنبھلے بدن نہ ضعف سے گر گر کے رہ گئیں
نکلی نہ جان پتلیاں پھر پھر کے رہ گئیں

دشرتھ کی قلبی کیفیات کی آئینہ داری دیکھئے:

پتروں کو دیکھ آتما آنند ہو گئی
آشیر باد دے کے زباں بند ہو گئی

بن باس کے زمانے کے رام چندر جی، سیتا جی اور لکشمن جی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اسے ملاحظہ کیجیے:

رام اور لکھن کے ساتھ میں سیتا جی یوں رواں جس طرح برھم جیو کے مایا ہو درمیاں

---

[1] اس ترکیب پر بعض حضرات مسکرائیں گے لیکن اس شعر کی لذت کرشن بھگتوں سے پوچھیے۔

یوں پر یہ جانکی تھیں رخور کے بیچ میں جیسے ہو پریم بھگت اور ایشور کے بیچ میں

شری رام چندر جی لکشمن جی اور سیتا جی کو سرو ندی کو پار کرنا ہے اور کشتی کا انتظار ہے۔ شعلہ صاحب نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

بے ناؤ کر رہے ہیں جو بر ہانڈ بھر کو پار — اپنے لیے ہے آج انھیں کشتی کا انتظار
پل مارتے ہی ناؤ کنارے پہ آ گئی
ابرو کی طرح کشتی اشارے پہ آ گئی

بن باس میں سیتا جی سے بن کی باسی عورتیں ان کا حال دریافت کرتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ یہ دو جوان مرد جو اُن کے ہمراہ ہیں کون ہیں۔ سیتا جی فرماتی ہیں ؎

دیور لکھن کو رشتے میں بتلا کے رہ گئیں — رگھبر کا ناتا پوچھا تو مُسکا کے رہ گئیں

جنگل کے رہنے والوں نے شری رام چندر جی، سیتا جی اور لکشمن جی کا استقبال بڑے زور و شور کے ساتھ کیا تھا:

تل بھر جگہ نہ پائی کہیں گرد راہ نے — چرنوں کو ڈھک لیا تھا ہجومِ نگاہ نے

مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ کپورتھلہ نے بزم رامائن کی بڑی قدر کی۔ متھرا، بندرابن، بنارس وغیرہ دھارمک استھانوں پر بھارت دھرم مہا منڈل کے جلسوں میں شعلہ بھی اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ وہاں وہ لاکھوں کرشن بھگتوں اور رام بھگتوں کے سامنے اپنی بزم رامائن اور "جنک نندنی" سناتے اور ان سے خراجِ تحسین وصول کرتے۔ بھارت دھرم مہا منڈل نے "جنک نندنی" اور بزم رامائن ہندی اور اردو رسم الخط میں شایع کرا کے سارے ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کو مفت تقسیم کرایا تھا۔

شعلہ اردو کے غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے کرشن بھومی متھرا کی شان میں "برج راج" کے عنوان سے پورا ایک مسدس لکھا ہے۔ اس مسدس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے:

یہ وہ ہے زمیں جس کو زمیں کہہ نہیں سکتے — اونچا سہی پر عرش بریں کہہ نہیں سکتے
تاباں سہی پر مہ کی جبیں کہہ نہیں سکتے — چپ ہیں کہ چناں اور چنیں کہہ نہیں سکتے
روشن ہے کہ سجدہ گہہ اہلِ یقیں ہے
جو ذرہ ہے یاں خاتمِ قدرت کا نگیں ہے

اٹھتے ہیں آ کے نقابِ رخِ توحید — ہر وقت نظر آتا ہے یاں جلوۂ جاوید
چھپتا نہیں ہے شام کو بھی برج کا خورشید — ایک ماہ میں یاں تیس نکلتے ہیں مہِ عید
آتی ہے ہنسی ذروں کو تاروں کی جھلک پر
یہ وہ ہے زمیں پاؤں نہ رکھے جو فلک پر

شعلہ نے پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی لیکن دوسری بیوی بھی چند ہی سال کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ دونوں صدمے آپ کو بہت شاق گزرے۔ دونوں کی یاد میں آپ نے نوحے لکھے ہیں جو بڑے دردناک ہیں اور جذبات کا ایک دفتر لیے ہوئے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

تاثیر دوا میں نہ دعاؤں میں اثر ہے — سر کا ہوا زانو سے مرے کس لیے سر ہے
کیا سچ ہے کہ مرنے کی تمھیں اپنے خبر ہے — کیوں میری طرف دیکھ کے حسرت کی نظر ہے
کیا جی پہ بنی آ کے جو دم توڑ رہے ہو
کیا میں نے کہا تھا کہ یہ کیوں جوڑ رہے ہو

شعلہ اپنے وقت کے ایک بڑے اچھے غزل گو بھی تھے۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام ادبی محاسن اور روایات ملتی ہیں، جو اُن کے دور کے دہلی اسکول کے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ متانت و سنجیدگی، شگفتگی اور ترنم کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں بلند پردازی، نازک خیالی اور انداز بیان کی ندرت کے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ حضرت جگر بریلوی "یادِ رفتگاں" میں رقم طراز ہیں:

"آپ کی غزلوں میں بلند پردازی، معنی آفرینی، نازک خیالی، ولولہ انگیزی اور جوش کے بہت نمونے ملتے ہیں۔ طرزِ ادا میں شوکت و تجمل، برجستگی و دل کشی ہے۔ تشبیہات و استعارات بھی پختہ ہیں۔ بعض اوقات خوب صورت بندشوں اور رنگین ترکیبوں کے شعر میں عالمِ تصویر پیدا کر دیتے ہیں اور جب صاف کہتے ہیں تو بڑے مزے دار اور پُر اثر شعر کہتے ہیں۔"

شعلہ کے چند اشعار یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں کوئی شاعرانہ بلند پردازی کی مثال ہے، کسی میں تناسبِ لفظی ملتا ہے، کسی میں معنی آفرینی اور نازک خیالی ہے، کہیں رنگینی اور معنویت ہے اور کہیں بے ساختگی اور آمد۔

میں جبہ سا ہوں اس درِ عالی مقام کا — کعبہ جہاں جواب نہ پائے سلام کا
سکہ رواں ہے کس بتِ محشر خرام کا — نقشِ قدم نگیں ہے قیامت کے نام کا

آ ملی صبحِ ازل چاک گریبانوں میں — ورنہ پہلے تو یہیں تھے ترے دیوانوں میں

ناتوانی میں سخت جانی ہے — ضعف بھی طاقت آزما نکلا

خورشید آسماں پہ گیا تو زمیں پہ ہے — میزانِ حسن میں ترا پلّہ گراں رہا

محشر بھی کوئی درد ہے جو اٹھ کے رہ گیا — شکوہ بھی کوئی غم ہے جو دل میں نہاں رہا
جینے میں کیا مزا جو نہیں موت کا یقیں — مرنے میں لطف کیا ہے جو وہ بدگماں رہا

خنجر پہ نظر ہے کبھی اس پہ نظر ہے — کون آتا ہے محشر میں وہ گھبرائے ہوئے ہیں

چھپا ہوا سا ہے طرزِ حجاب شوخی میں — کھلی کھلی ہوئی شوخی ترے حجاب میں ہے

وہ چھپتے پھرتے ہیں گھبرائے کیا قیامت ہے — یہ کون عرصۂ محشر میں بیقرار آیا

خاکِ عاشق ہے کہ اٹھ اٹھ کے قدم لیتی ہے — اور وہ جاتا ہے اٹھائے ہوئے داماں کینا

کیا زیست دو روزہ کے لیے آئے عدم سے — اس جینے میں مرنے کا بھی ساماں نہیں ہوتا

نہ کفن ہے نہ لحد ہے، نہ جنازہ، نہ مزار — شمع! کیا ماتمِ پروانہ کا ساماں ہوگا

یہ بیتابی نہیں تھوڑی یہ بیچینی نہیں تھوڑی — کرے گا درد جانے اور کیا اس سے سوا ہوکر

شعلہؔ کو کایستھ کان فرنسوں کے موقعوں پر بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ شعلہؔ کے دل میں اپنے فرقے کا بڑا درد تھا۔ اس لیے وہ ان کان فرنسوں میں کایستھوں کے سلسلے میں اکثر اپنے تصنیف مسدس سنایا کرتے تھے۔ یہ مسدس ان کے کلمات میں بھی ملتے ہیں۔



میرؔ کی رومانی تخئیل

(بسلسلہ صفحہ ۱۰)

میں بھی امید اور اپنے "تئیں" تھانے میں کلی لذت کا ایک پہلو تلاش کر لیا تھا جسے بوالہوس کی نگاہیں کبھی نہیں دیکھ سکتیں ؎

اپنے تئیں بھی کھانا تھالی نہیں لذت سے — کیا جانے بوس پیشہ چکھے تو مزا جانے

یہی وجہ تھی کہ اُن کی شکستہ پائی نے اُن کو سر کے بل گرانے کے بجائے سنبھال لیا۔ ؎

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی — شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

اور یہی سبب ہے کہ انھوں نے ناکامیوں سے کام لے کر محبت کو نبھا دیا۔ ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ یاس و امید، ناکامی و کامرانی، تکلیف و آرام اور غم و مسرت کا فرق مٹا دینے میں کامیاب ہو گئے اسی لیے انھوں نے اپنی ناتوانی کے باوجود عشق کے بارِ گراں کو اٹھا لیا۔ ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

چنانچہ میرؔ کی شاعری میں یاس و حرماں کے بار بار تذکرے کے باوجود فانیؔ کی قنوطیت نہیں ہے اور انتہائی سوز و گداز کے باوصف وہ نشاط انگیزی اور کیف و سرمستی ہے جو صرف درد و غم اور سوز و گداز ہی میں پایا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے میرؔ کا کلام تاثیر کی معراج پر پہنچ گیا اور اُس پر دوام اور آفاقیت کی مہر لگ گئی۔ میرؔ کی خودشناسی لائقِ داد ہے کہ وہ اپنے کلام کی اس بلندی سے پوری طرح واقف تھے۔ ؎

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا



آزادیٔ وطن کا کمال

روشن پٹیالوی

ہیں شادمانی کی دولت سے آج مالا مال
ہوئے تھے جو کہ غلامی کی وجہ سے بے حال

نئے ارادے اُبھر آئے اُن کے سینوں میں
جو ہو رہے تھے مصائب سے بے طرح پامال

چمک رہا ہے ضیائے نشاط سے یکسر
نہیں ہے شیشۂ ہستی پہ گردِ رنج و ملال

دلوں میں روشنیٔ اُمید کی ہوئی پیدا!
ہوا ہے دُور الم، حسرتیں ہوئیں پامال

ادائے زندگی دیتی ہے لُطف کا پیغام
نہیں ہے بار طبیعت پہ زیست کا جنجال

خوشی کی روشنی پھیلی، مٹی ہے ظلمتِ غم
رُخِ حیات کا نکھرا ہے اور رنگِ جمال

حیاتِ نَو کے ہیں آثار خشک چہروں پر
دکھائی دیتا ہے آزادیٔ وطن کا کمال

عروجِ ماضی کا جذبہ پھر عود کر آیا
دلوں سے ہو گئی ہے محو داستانِ زوال

کئی مسائلِ پیچیدہ حل طلب ہیں ابھی
ہے اپنے سامنے تعمیرِ نَو کا ٹیڑھا سوال

حیاتِ جاوداں بخشے گا وقت کا ہر ساز
پیامِ لُطف و مسرّت کا لائے گا ہر سال

خلوصِ دل سے سعی کرنے کا ہے یہ انجام
ہر ایک فرد نظر آ رہا ہے اب خوش حال

چمک خوشی کی ہے آزادیٔ وطن کے طفیل
اور اُس کے دم سے یہ روشن ہوئی ہے بزمِ خیال

پیامِ آزادی

ماتا پرشاد نزہت دہلوی

انقلابات کا آغاز سمجھنا ہے ابھی — حُسنِ انجام کا اعجاز سمجھنا ہے ابھی
محفلِ قوم کا انداز سمجھنا ہے ابھی — وقت اور وقت کی آواز سمجھنا ہے ابھی

ہو گی تعمیرِ وطن، قوم و وطن کے غم سے
زندگی آئے گی مشربِ مبیں ہمارے دم سے

چھٹ چکی جانبِ مشرق سے سیاہی جاگو! — منزلِ عیش ہے سوئے ہوئے راہی جاگو!
نظمِ جمہور ہے اب مٹ چکی شاہی جاگو! — مادرِ ہند کی عظمت کے سپاہی جاگو!

جشنِ آزادیٔ قومی کے منانے کے لیے
نغمۂ حُبِّ وطن سازِ پہ گانے کے لیے

شمعِ تعمیر تعاون سے درخشاں ہو گی — محفلِ قوم تعاون سے فروزاں ہو گی
اقلیتِ ہند کی دنیا میں نمایاں ہو گی — زندگی ملک میں انوار بداماں ہو گی

انقلاب آئے گا دُنیا میں ہمارے دم سے
انجمن پر نکھار آئے گی ہمارے غم سے

سامنے قوم کی تعمیر کا زینا ہو گا — اُس پہ چلنے کے لیے ساتھیو جینا ہو گا
ساغرِ بادۂ ایثار بھی پینا ہو گا — چاکِ دامانِ خیالات بھی سینا ہو گا

اس پیمبر نے کناروں سے سکوں مانگا ہے
انقلابات کے دھاروں سے سکوں مانگا ہے

شاخِ امید پیامات سے پھل جائے گی — مشعلِ ہوش خیالات سے جل جائے گی
آرزو جذبۂ احساس میں ڈھل جائے گی — زندگی صورتِ حالات بدل جائے گی

حسنِ تعمیر سے مٹ جائے گا رنگِ تخریب
منظرِ عام پہ آئے گی ہماری تہذیب

لنگڑی بیٹی کا خط

فکر تونسوی

بدنصیب بیٹی کے خوش نصیب ڈیڈی!

میں نہیں جانتی کہ آپ مجھے فراموش کر چکے ہیں یا میری یاد کی کوئی چنگاری کپور خاندان کی یادگار راکھ تلے دبی ہوئی ابھی تک چمک رہی ہے۔ شاید میرا یہ خط آپ کو وہ راکھ ٹٹولنے پر مجبور کر دے جس کے نیچے میری زندگی کی چنگاری بائیس برس تک سلگتی رہی۔

اور آج جب میں آپ کو خط لکھنے بیٹھی ہوں تو ان بائیس برسوں کی یادوں کے سبھی بوجھل پردے تہہ در تہہ میری آنکھوں کے سامنے اٹھ رہے ہیں۔ کپور خاندان میں میری پیدائش کا پہلا دن ہی منحوس ثابت ہوا۔ اسی دن مجھ سے آٹھ سال بڑے بھائی نارائن پر نمونیے کا خطرناک حملہ ہوا اور وہ چل بسا۔ نارائن سے آپ کو بے پناہ محبت تھی۔ اور اگر نارائن زندہ رہتا تو میں بھی اس کی کلائی میں راکھی باندھ کر اپنی محبت کا ثبوت دیا کرتی۔ لیکن میں آئی تو وہ چلا گیا۔

دونوں سانحے چونکہ ایک ہی دن ہوئے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر آپ کے دل میں خیال آیا کہ میں نے ہی آ کر آپ سے نارائن کی محبت چھین لی۔ لیکن ڈیڈی! آپ کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ میں بھی تو راکھی باندھنے کی مسرت سے محروم ہو گئی۔ مگر...... آپ کو یہ خیال آتا بھی کیوں؟ میری مسرتوں کا پھول آپ کے دل کے ویرانے میں بائیس برس تک نہیں کھل سکا۔ یہ صحیح ہے کہ میں لڑکی تھی، لڑکا نہیں تھی۔ لڑکی ہونا آپ کے مہذب سماج میں جرم سہی لیکن میرا جنم بیتا تو جرم نہیں تھا جس نے میری بدنصیب روح کو جسم عطا کرنے کے لیے کپور خاندان کو چنا۔ جہاں گزشتہ پانچ نسلوں سے کوئی لنگڑی لڑکی پیدا نہیں ہوئی تھی ——

ہاں ڈیڈی! میں سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ جنم کے پہلے دن مجھے قطعی محسوس نہیں ہوا تھا کہ میں لنگڑی ہوں۔ یہ تو اسی دن آپ کو ہی سوچنا چاہیے تھا کہ میں لنگڑی ہوں۔ اس لیے میرا گلا گھونٹ دینا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ سانپ پھن اٹھائے اسے کچل دینا ہی دانش مندی سمجھی جاتی ہے لیکن آپ شاید لوک لاج سے ڈر گئے یا شاید آپ نے سوچا کہ اس منحوس لڑکی پر دھیرے دھیرے ہی موت کا سایہ اتارا جائے۔

میں نہیں جانتی بھگوان نے مجھے لنگڑی کیوں پیدا کیا۔ لیکن ڈیڈی! میں یہ بھی تو نہیں جانتی کہ بھگوان نے میرے جسم کے دوسرے اعضا انتہائی دلکش اور حسین کیوں بنا دیے۔ مجھے یاد ہے جب میں آٹھویں میں تعلیم پاتی تھی تو مجھ پر ایک دم شباب ٹوٹ پڑا تھا۔ جیسے ایک دم بے شمار ستارے، بے شمار چاند، بے شمار سورج، پھول، خوشبوئیں اور نغمے میرے انگ انگ میں بکھر گئے تھے۔ شاید آپ سوچا کرتے تھے کپور خاندان میں یہ منحوس پودا کیوں پھوٹ پڑا۔ وہ پودا جس پر نگاہیں نہیں ٹھہرتیں لیکن جیسے لنگڑے پن کا گہرا، پورا، سیاہ داغ بھی لگا ہوا ہے —— کون لے گا اس منحوس لنگڑی لڑکی کو؟ کہیں اس کے کارن کپور خاندان پر کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے۔ پانچ نسلوں کی کمائی ہوئی عزت کو یہ گھن چاٹ نہ جائے۔

پتا جی! آپ کا یہ شبہ صحیح تھا کیونکہ کبھی کبھی شاہی خاندانوں میں

ایسی نحوست بھری نشانی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے راج سنگھاسن اُلٹ جاتے ہیں۔ کپور خاندان کا سنگھاسن بھی میری خوبصورتی اور لنگڑے پاؤں کے سبب خطرے میں تھا۔

ہاں، میں لنگڑی تھی۔ ہمارے گھر میں کوئی بھی لنگڑا نہیں تھا۔ اس لیے سارا گھر مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ کنبے کے کچھ افراد مجھ پر ترس کھاتے اور اپنی نفرت کو ترس کے انسان دوست پردے میں چھپا لیتے تھے۔ میں خوبصورت بھی تھی ہمارے گھر میں اگر میری طرح کوئی لنگڑا نہیں تھا تو میری طرح کوئی خوبصورت بھی نہیں تھا۔ اس لیے سارا کنبہ مجھ سے حسد کرتا تھا۔ کنبے کے کچھ افراد میرے حسن پر ٹھنڈی آہیں بھرتے اور کہتے —— "نہ جانے بیچاری کو ان سے جنم کے کرموں کا پھل بھوگنا پڑ رہا ہے کہ بھگوان نے حسن کی اس بیل پر لنگڑے پن کا سانپ لپیٹ دیا ——" اور اس طرح وہ کرموں کی آڑ میں اپنی نفرت اور اپنے حسد کو چھپانے کی مکاری کیا کرتے۔

اور پھر ڈیڈی! فطرت نے مجھ پر ایک اور ستم بھی توڑھایا تھا —— کہ مجھے بے حد ذہین بنا دیا تھا۔ ایمان سے بتائیے کہ کیا کپور خاندان کا کوئی لڑکا یا لڑکی کبھی بھی، کسی نسل میں بھی، میری طرح اسکول میں فرسٹ آیا کرتے تھے؟ میں جانتی ہوں کہ میری ذہانت طبع پر آپ خوش ہوا کرتے تھے مگر صرف رات کے ٹھنڈے، یخ، اُداس اندھیرے میں ہی چھپ چھپ کر ہی خوش ہوا کرتے تھے۔ سورج کی کھلی روشنی میں آپ میری ذہانت کو تسلیم کرنے سے گھبراتے تھے۔ شاید اس لیے کہ اُداس اور یخ اندھیرے میں آپ کو یہ موقع مل جاتا تھا کہ میری ذہانت پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ میرے لنگڑے مستقبل پر چوری چوری آنسو بھی بہا سکیں۔ آپ اپنے آنسوؤں اور میری مسرتوں دونوں سے خوف زدہ تھے۔ اور خوف کو صرف اندھیرا ہی پناہ دے سکتا ہے ——

آپ کو یاد ہوگا، جب میں ڈھائی برس کی تھی تو میں نے پہلی بار منہ سے دو لفظ کہنا سیکھے —— ممی اور ڈیڈی۔ لیکن عین اُسی مبارک دن پر مکان کی تیسری منزل گر پڑی جس میں میری دادی دب کر مر گئی۔ اس وقت میں آپ کی گود میں بیٹھی تھی اور آپ میرے منہ سے "ممی، ڈیڈی" کے الفاظ سن کر مست ہو رہے تھے کہ اچانک ممی نے آکر یہ اطلاع دی۔ اور ڈیڈی! ہائے، آپ کی وہ حقارت انگیز نگاہ مجھے آج تک یاد ہے جس سے آپ نے مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ آپ نے مجھے گود سے اُچھال کر نیچے پٹخ دیا جیسے گلی میں کوئی کوڑا کرکٹ پھینک دیتا ہے۔ وہ نگاہ مجھ سے کہہ رہی تھی —

"تم ہی دادی کی قاتل ہو، تم ہی، تم ہی ......"

آج میں سوچتی ہوں، کاش! میں وہ دو لفظ نہ سیکھتی، عمر بھر گونگی رہتی۔ دو لفظ سیکھنے کی مسرت کتنی بھیانک ثابت ہوئی۔ کہ دادی چل بسی۔ حالانکہ اسی دادی نے ہی مجھے وہ دو لفظ بولنا سکھائے تھے۔ بڑے چاؤ سے، بڑے پیار سے۔ میرا پیار اُس پر چھت بن کر گر پڑا۔ میری خوشی آپ پر غم بن کر ٹوٹی۔ اور آپ اور سارا کنبہ ہر ایک سے یہی کہتے پھرے "یہ لڑکی تو یم دوت بن کر ہمارے گھر گھس آئی ہے۔"

اور ڈیڈی! میں آپ پر یہ الزام نہیں لگاتی کہ آپ نے میرے متعلق ایک وہم پال رکھا تھا کہ میں منحوس ہوں۔ موت تو اٹل ہے، سب پر آتی ہے، نارائن بھیا پر بھی آگئی، جیسے دنیا کے دوسرے "نارائنوں" پر آتی ہے۔ دادی انتقال کر گئی، کیا دوسرے خاندانوں میں دادیاں نہیں مرتیں؟ —— سچ یہ ہے ڈیڈی! کہ آپ درحقیقت میرے لنگڑے پن سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن منہ سے کہتے نہیں تھے۔ نفرت کے اس جذبے کو آپ لوگوں نے وہم کا رُوپ دے رکھا تھا، سچ بتائیے اگر میں لنگڑی نہ ہوتی تو کیا پھر بھی نارائن اور دادی کی موت پر آپ کی اُنگلی مجھ پر ہی اٹھتی؟ نہیں ڈیڈی! میری نحوست صرف میرا لنگڑا پن تھا۔ اور اس لنگڑے پن کے ساتھ لپٹ کر آپ کا وہم بھی لنگڑا ہو گیا تھا۔

اور ایک دن آپ کا وہم کلائمکس پر جا پہنچا ——

جب میں نے پانچویں جماعت پاس کی تو فرسٹ آنے پر مجھے اسکول سے چاندی کا کپ انعام میں ملا۔ میں اُچھلتی کودتی گھر آئی۔ تو میرا دل دھک سے رہ گیا، جب میں نے سُنا کہ آج ممی پر اچانک گُردے کے درد کا شدید حملہ ہوا ہے اور اُسے اسپتال میں اپریشن کے لیے بھیج دیا گیا ہے، جی میں آیا، بھاگ کر اسپتال جاؤں اور ممی کو جا کر اپنا انعامی کپ دکھاؤں اس سے آشیرواد لوں۔ لیکن بڑی بھابی نے مجھے روک دیا اور گالیوں اور تھپڑوں کی زبان میں کہا: "منحوس! کل موہی! ماں کو جا کر اپنی شکل مت دکھا، نہیں تو تیری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گی۔ پہلے بھیا اور دادی کو کھا گئی ہے اور اب ماں پر موت کی پرچھائیں ڈال رہی ہے۔ ان کی بجائے تو مر جاتی

تو کیا بُرا تھا۔"

ہائے ڈیڈی! میرے چاندی کے کپ کی طرف کسی نے بھی تو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جب آپ اسپتال سے لوٹے تو آپ نے بھی نہیں دیکھا میں بھی ڈر کے مارے آپ کو نہ دکھا سکی۔ کس منہ سے دکھاتی؟ میں نے کیول سہمے، ڈبکے ہوئے الفاظ میں اتنا آپ سے ضرور پوچھا تھا: "ممی اب کیسی ہیں؟"

لیکن آپ کچھ نہ بولے، ایک زہر آلود نظر ڈال کر آپ نے منہ پھیر لیا۔ شاید آپ کو کسی نے بتا دیا تھا کہ مجھے آج انعامی کپ ملا ہے اور آج میں خوش ہوں۔ آپ میری خوشی سے ہمیشہ ڈرتے تھے اس لیے آپ کا وہم اُس دن کلائمکس پر پہنچ گیا کہ ہمیشہ میری خوشی ہی خاندان کے غم کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے خاندان کی خوشی اسی میں ہے کہ مجھے انعام نہ ملے، میں الفاظ نہ سیکھوں، میں حسین نہ رہوں، مجھے چیچک ہو جائے مجھے نا اہل قرار دے کر اسکول سے نکال دیا جائے، میری ہرنی ایسی آنکھوں میں انگارے جھونک دیے جائیں۔ اور ڈیڈی! میں یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور من ہی من کراہتی تھی مگر بے بس تھی۔ میں کیا کر سکتی تھی، میں نے تو صرف یہ کیا کہ اس انعامی کپ کو جو کونے میں پڑے پڑے دھول مٹی سے اَٹ گیا تھا، ایک دن سب کی آنکھ بچا کر قریبی گندے نالے میں پھینک آئی اور آپ میں سے کوئی بھی نہ جان سکا کہ خاندان کی خوشی کی خاطر میں اپنی خوشی کو کس طرح ملیا میٹ کر آئی ہوں۔

اس کے بعد ڈیڈی! آپ اس دن کا انتظار کرنے لگے جب میں اس گھر سے دفع ہو جاؤں اور اس گھر کا سورج نحوست کے گرہن کی گرفت سے چھوٹ جائے۔ اس کے دو طریقے تھے —— یا تو میں خود گھر سے بھاگ جاتی اور کپور خاندان کے چہرے پر ایک اَمِٹ کلنک لگا جاتی۔ لیکن بدقسمتی سے میرے اندر خاندان کی عزت کا جذبہ آپ سب سے زیادہ تھا۔ اس لیے میں ظلم سہتی رہی اور گھر میں پڑی رہی، بھاگ نہ سکی۔

اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ مجھے کسی کے گلے مڑھ دیتے۔

لیکن —— میں لنگڑی تھی، پورے پاؤں والا سماج مجھے اپنے گلے کیسے مڑھتا۔ صرف میرا حسن اور ذہانت سماج کی ناک رکھنے کے لیے کافی نہیں تھے۔ اس لیے میں برابر دیکھ رہی تھی کہ آپ جگہ جگہ میرے ہاتھ میں مہندی رچانے کے لیے بھاگتے پھرتے تھے۔ اخباروں میں آپ نے اشتہار دیے۔ کئی گھرانوں میں فوٹو بھیجے۔ کئی لوگوں کو بھاری جہیز کے لالچ دیے۔ کہیں کہیں میرے حسن اور عقل کا ہتھیار بھی پھینکا۔ ایک بار تو آپ مجھے ایک مہذب غنڈے کے حوالے کرنے پر بھی تیار ہو گئے تھے لیکن آپ کی بدنصیبی وہ غنڈا ایک طوائف کے کوٹھے پر پستول کا نشانہ بن گیا، ورنہ ڈیڈی! میں تو غنڈے کی رفیقۂ حیات بننے پر بھی آمادہ تھی۔ کپور خاندان کی رگوں میں میری نحوست کا جو زہر پھیلا ہوا تھا اگر اسے ایک غنڈا چوس لینے پر تیار تھا تو میرے لیے تو وہ دیوتا سے کم نہیں تھا۔

لیکن آہ! آپ ہر جگہ ناکام رہے اور آپ جب بھی ناکام ہو کر گھر لوٹتے تو سارا گھر ٹھنڈی آہوں سے بھر جاتا اور اس طرح میرے خلاف سارے کنبے میں نفرت اور حسد بڑھتا گیا۔ کوئی مجھ سے کھل کر نہ بولتا۔ میرے جوان لہو میں صبح شام جھڑکیاں، کوسنے اور طعنے انجکٹ (I N J E C T) کیے جانے لگے۔ ماں کا پیار، باپ کا سایہ، بھائی بہنوں کی محبت، ماموں، بابا اور بہنوئی سبھی رشتہ دار —— ہر وہ چیز مجھ سے چھین لی گئی جس کے سہارے انسان سانس لیتا ہے۔

میں نے ایک دن حوصلہ پا کر آپ سے کہا: "ڈیڈی! میں بیاہ نہیں کروں گی، مجھے ٹریننگ دلا دیجیے، ٹیچر بن کر زندگی بھر بچے پڑھایا کروں گی۔"

آپ برسوں کے بعد پہلی بار میری بات سن کر آبدیدہ ہو گئے۔ آپ نے سب کی نظر بچا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا: "نہیں بیٹی! میں تیرا بیاہ کروں گا اور ٹھاٹھ باٹھ سے کروں گا۔"

میں نے کہا: "نہیں ڈیڈی! لنگڑی بیوی لے کر کوئی اپنی زندگی تباہ نہیں کرے گا اور نہ کسی کو تباہ کرنی چاہیے۔"

آپ نے جذبات انگیز لہجے میں کہا: "تمہارے لنگڑے پاؤں کا آپریشن کرائیں گے۔" میں نہیں جانتی آپریشن کا خیال اس پیار کے کارن پیدا ہوا تھا جو ایک باپ کو اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔ یا آپ نے سوچا کہ یہ بزدل لڑکی خودکشی تو کر نہیں سکتی (ورنہ ٹنٹا ہی ختم ہو جاتا) اس لیے اس مشین کے پرزے کی مرمت کرا کے ہی اسے اونے پونے بیچ دیا جائے۔ ڈیڈی! میں آپریشن کے حق میں نہیں تھی کیونکہ مجھے غصہ تھا۔ میں اس سماج کے کسی

بھی شخص سے بیاہ نہیں کرنا چاہتی تھی جو میرے پاؤں کو شادی کی بنیاد بناتا تھا جہاں پاؤں کو ہی دلہن مانا جاتا تھا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ اسی لنگڑے پاؤں کے ساتھ سماج میں جی کر دکھاؤں گی۔ اسی لنگڑے پاؤں پر تن تنہا کھڑی ہو جاؤں گی اور اپنی صلاحیتوں سے عزت اور وقار حاصل کروں گی۔ عزت اور وقار کے لیے شادی کرنا لازمی تو نہیں ہوتا۔ جب ڈھور ڈنگر تک شادی کے بغیر جی سکتے ہیں اور سماج میں اپنا مقام حاصل کر لیتے ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتی؟

لیکن ڈیڈی! میں اپنا غصہ آپ کے سامنے چھپا گئی۔ آپ کی نافرمانی کرنے سے مجھے ذہنی اذیت ہوتی تھی۔ اس لیے میں نے اپنے عہد کو آپ کی خوشی کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ اور آپریشن کرانے پر رضامند ہو گئی لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ پاؤں ٹھیک ہونے پر بھی میں بیاہ نہیں کروں گی۔ سماج سے بدلہ لینے کا جذبہ میرے اندر مکمل طور پر مرا نہیں تھا۔

آپریشن کے تصور سے گھر بھر کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ سارا گھر امید بیم کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ نفرت اور حسد کی زہریلی ہواؤں میں سے پیار کے سہمے سہمے جھونکے میری طرف آنے لگے۔ یوں لگتا تھا، خاندان کا نصیب بدلنے والا ہے۔ نحوست کا انجام قریب ہے۔ مجھ سے کبھی کبھی ایک آدھ میٹھا بول بولنے میں برائی نہیں سمجھی جانے لگی تھی۔ ان کے تخیل کے تاریک ترین آسمان پر ہلکے ہلکے تارے ٹمٹماتے ہوئے مجھے صاف دکھائی دینے لگے۔ اب میرا حسن، ذہانت اور سگھڑاپا ان کی آنکھوں کا کاجل بننے لگا۔ اور لنگڑا پاؤں آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا۔

یہ ایک نئی صورت حالات تھی جس پر میں بوکھلا گئی، حیران ہوئی، بلکہ کسی حد تک خوش بھی۔ بائیس برس میں پہلی بار مجھے گھر کی دیواروں سے سینک آنا بند ہوا۔ اور دل میں کلی کی طرح یہ خیال کھلنے لگا ——— "تشی! پاؤں ٹھیک ہو جائے تو بیاہ کر لینا۔ تمہارے دن پھرنے والے ہیں۔ اور دنوں کے اس پھیر کو اپنی ہٹ اور بدلے کے جذبات سے روک نہیں سکو گی۔"

اور پھر مجھے اڑتی اڑتی خبر ملی کہ آپ اور ممی نے میرے لیے ایک لڑکا بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ لڑکے کے ماں باپ نے یہ شرط لگا دی ہے۔ کہ آپریشن کے بعد لڑکی ہمیں قبول ہو گی۔

مشروط شادی ——— شاید ہندوستانی تہذیب میں اس قسم کی شادی کا پہلا حادثہ تھا جس پر میں دل ہی دل میں خوب ہنسی۔ اس ہنسی میں جو زہر تھا اس سے میرے ہونٹ بھی کالے ہو گئے۔

چنانچہ شرط اور خوف کی اس کیفیت میں آپ مجھے اسپتال لے گئے۔ آپ نے ایک نہایت قابل ڈاکٹر کو میرے حسین مستقبل کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے چُنا۔ آپریشن والے دن سارا خاندان اسپتال میں آیا اور شاید وہ لڑکا بھی۔ میرے حسن پر لٹو ہونے اور میرے لنگڑے پاؤں کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لیے۔ میں اُسے دیکھ کر جھینپ گئی تھی۔ میں کیوں جھینپی تھی؟ کیا اس لیے کہ میں نے من ہی من میں اسے اپنا شوہر بنا لیا تھا؟ کیا اس لیے کہ اس کے نین نقش بھونڈے تھے؟ کیا اس لیے کہ مجھے صرف آپ کی خوشی منظور تھی ——— میں جو بائیس برس تک آپ کو غم دیتی رہی، اپنی قربانی دے کر اپنے سارے پچھلے گناہ دھو دینا چاہتی تھی۔ پہلی بار میں ایک غم خرید رہی تھی، سارے خاندان میں خوشی بانٹنے کے لیے۔

اور پھر مجھے آپریشن کی میز پر لٹا دیا گیا۔ آپریشن کی میز پر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے تخیل کی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ بھونڈا لڑکا دانت نکال کر ہنس رہا ہے۔ میں کانپ اٹھی۔

اس کے بعد ڈاکٹر آیا اُس نے مجھے کلوروفارم سنگھایا۔

اس کے بعد ڈیڈی! کیا ہوا؟ مجھے کچھ علم نہیں کیونکہ میں نے آپ کی وہ چیخ نہیں سُنی جو ایک باپ کے منہ سے بے اختیار نکل جاتی ہے، جب اس کی بیٹی پران تیاگ دے۔

اور میں لنگڑے پاؤں کے ساتھ پھر وہاں پہنچ گئی جہاں سے میں کپور خاندان کی خوشیوں میں غم کا زہر گھولنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔

اور یہ خط میں وہیں سے لکھ رہی ہوں۔ اور اس امید کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ شاید میرا یہ خط آپ کو وہ راکھ ٹٹولنے پر مجبور کر دے جس کے تلے میری زندگی کی چنگاری بائیس برس تک سلگتی رہی۔ اور اس امید کے ساتھ کہ میرے لنگڑے پاؤں سے نجات پا کر آپ کا خاندان اور اس کے ارد گرد پھیلا ہوا سماج اب دونوں پاؤں سے چل رہا ہو گا۔



غزل

نظیر بزمی رتلامی

تھا اجل کا خوف جہاں جہاں میں وہاں وہاں سے گزر گیا
میں تری تلاش میں بارہا، حدِ لامکاں سے گزر گیا

چلیں آندھیاں، گریں بجلیاں، مگر اُس نے چھوڑا نہ گلستاں
جو وفا شعارِ چمن تھا وہ ہر اک امتحاں سے گزر گیا

نہ بہار کا رہا مستحق، نہ رہا چمن پہ پھر اُس کا حق
جو خزاں کے دَور میں باغباں ترے گلستاں سے گزر گیا

کوئی لاکھ اُس پہ ستم کرے، کوئی لاکھ اس پہ جفا کرے
کسی غم کی فکر نہیں اُسے، جو غمِ جہاں سے گزر گیا

میں رہِ وفا میں جو مٹ گیا، مجھے تجھ سے اس کا نہیں گلا
یہ وفورِ جذبۂ عشق تھا کہ میں اپنی جاں سے گزر گیا

وہ اسیرِ پنجۂ غم رہی، نہ شگوں کے ساتھ رہا کبھی
ترے آستاں کو جو چھوڑ کر ترے آستاں سے گزر گیا

مری بے خودی نے پتہ دیا، وہ نظیر کوچۂ یار تھا
بخدا مجھے تو نہیں خبر کہ یہ میں کہاں سے گزر گیا

غزل

میر فراست علی خاں فریس

دل کی راہوں میں کئی اور بھی دل دار ملے
غم کے طوفان ملے، وقت کے آزار ملے

ہر جگہ دھوپ ہے، ہر سمت ہے صحرائے الم
کاش ایسے میں ترا سایۂ دیوار ملے

گرد آلود در و بام نظر آئے ہیں
یا اُمیدوں کے سُلگتے ہوئے بازار ملے

دل کی بجھتی ہوئی قندیل جلالوں پھر سے
میری راتوں کو اگر شعلۂ رفتار ملے

ہم سے بچھڑے ہوئے کچھ خوابِ حسیں راتوں کے
صبح کے وقت ملے ہیں تو سرِ دار ملے

اپنا غم وہ ہے کہ اظہار بھی ناممکن ہو
ورنہ ملنے کو یہاں سیکڑوں غم خوار ملے

جن سے ملنے کی تمنا تھی وہی مل نہ سکے
یوں تو ہر موڑ پہ کتنے ہی طرح دار ملے

میرے نغموں کی زباں تو وہی سمجھے گا فریس
جس کو اس دَورِ ہوس میں مرا معیار ملے

مینا بازار

طاہرہ عظمت

مینا بازار کا نام آتے ہی ذہن ایک طلسماتی بازار کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جس میں ہر سمت شان و شوکت ہے، رنگ و نور ہے، نفاست و لطافت ہے، زیب و زینت ہے، مسرت و انبساط کی فضا ہے، ضیاء پاش ریشمی ملبوسات اور گلہائے صد رنگ ہیں۔ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد کی تمام تر رنگینیاں سمٹ کر مینا بازار کے احاطے میں آ جاتی تھیں۔ درحقیقت مینا بازار شاہان مغلیہ کے جمالیاتی ذوق اور ثقافتی سرگرمیوں سے ان کی دلچسپی کا ایک واضح تاریخی ثبوت ہے۔

یوں تو سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کی ہندوستان میں آمد ہندوستان اور وسط ایشیا کے ثقافتی اور معاشرتی تعلقات کی ایک اہم کڑی ثابت ہوئی، لیکن اس کا زیادہ تر وقت سیاسی استحکام میں صرف ہوا اور اپنے مختصر دور حکومت (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء) میں بابر کو اتنا وقت نہ مل سکا کہ وہ ثقافتی تحریکوں اور سرگرمیوں میں کوئی خاص حصہ لے۔ البتہ ہمایوں کی تخت نشینی (۱۵۳۰ء) کے وقت مغلیہ حکومت کو وہ تھوڑا بہت استحکام حاصل ہو چکا تھا جو ثقافتی اور معاشرتی تحریکوں کے لیے ضروری ہے۔

ہندوستان میں مینا بازار کا آغاز ہمایوں کے عہد سے ہوتا ہے مینا بازار کے متعلق دربار اکبری کے مصنف محمد حسین آزاد نہایت دلچسپ پیرایے میں رقم طراز ہیں:

"ترکستان میں دستور ہے کہ ہفتے میں دو دفعہ یا ایک دفعہ ہر شہر میں اور اکثر دیہات میں بازار لگتے ہیں۔ اس آبادی کے اور اکثر پانچ پانچ چھ چھ کوس کے آس پاس کے لوگ پچھلی رات سے گھروں سے نکلتے ہیں دن نکلے مقررہ مقام پر آ کر جمع ہوتے ہیں۔ عورتیں برقع سروں پر، نقابیں منہ پر، ابریشم، سوت، ٹوپیاں، رومال پھلکاری اپنی دستکاری یا ضرورت کی ماری جو کچھ ہو بیچنے کو لاتی ہیں۔ مرد ہر قسم کے پیشہ ور اپنی جنس سے بازار کو گرم کرتے ہیں۔ مرغی اور انڈے سے لے کر گراں بہا گھوڑوں تک اور گزی گاڑھے سے لیکر قیمتی قالین تک۔ میوہ جات سے لیکر اقسام غلہ بھس اور گھاس تک، تیل، گھی، مستری، نجاری لہاری کے کام یہاں تک کہ مٹی کے باسن تک سب موجود ہوتے اور دوپہر میں سب بک جاتے ہیں۔ اکثر لین دین مبادلے میں ہوتے ہیں۔"[۱]

آزاد کے بیان کردہ ترکستانی طرز کے یہ بازار ہندوستان کے دیہی علاقوں کے ہاٹوں اور بازاروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مغلوں نے اس ترکستانی بازار میں اپنے جمالیاتی ذوق کو سمو کر اسے مینا بازار بنا دیا۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگرچہ مغلوں سے قبل سلاطین دہلی ترک تھے اور وسط ایشیا سے ان کے تعلقات بھی قائم تھے لیکن ان کے دور میں اس قسم کے بازاروں کو فروغ حاصل نہیں ہو سکا۔ مغل اپنے ہمراہ نئی تہذیب اور معاشرتی قدریں ہندوستان

---

[۱] محمد حسین آزاد۔ دربار اکبری صفحہ ۱۵۳

میں لائے اور ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس میں تزک واحتشام اور جاہ وجلال کے ساتھ عیش پرستانہ زندگی بھی تھی۔ شہنشاہ ہمایوں کی سیاسی زندگی بھی پرسکون نہ تھی۔ ہر سمت خطرات کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ایک طرف اگر افغانوں کا غلبہ تھا تو دوسری طرف اس کے اپنے بھائی بھی کچھ کم مصیبت نہ تھے۔ لیکن ان حالات کے باوجود ہمایوں نے محل کی معاشرتی زندگی میں عملی دلچسپی لی۔

وہ خود ذوق سلیم کا مالک اور ادب کا شیدائی تھا۔ 'ہمایوں نامہ' کی مصنفہ اور بادشاہ کی بہن شہزادی گلبدن بیگم لکھتی ہے کہ ہر شخص ہمایوں کی اختراع پسندی اور جدت طبع پر محو حیرت تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ ہمایوں نے ایک سہ منزلہ قصر رواں تعمیر کروایا اور لوہے ولکڑی کا ایک متحرک پل بنوایا۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے کشتیوں پر ایک چمن لگوایا اور دریائے جمنا میں کشتیوں ہی پر مربع شکل کی چار عمارتیں تعمیر کروائیں۔ قانون ہمایونی کے مصنف خواند میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت خوشنمائی اور نفاست سے آراستہ پیراستہ کشتیوں پر ایک زنانہ بازار (جو بعد کے مینا بازار سے ملتا جلتا تھا۔) سجایا جاتا تھا۔ یہ بازار عمارت طلسم میں ہونے والی دوشان دار ضیافتوں کے بعد جن میں حسین دوشیزائیں اور دوسری بہت سی اعلیٰ طبقے کی خواتین شامل ہوتی تھیں، منعقد ہوتا تھا[له] ہمایوں کو اپنی بیگمات اور شاہی محل کی دیگر خواتین کی زندگی سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے دریائے جمنا کے کنارے بہت سے دالان تعمیر کروائے جہاں شام کو منعقد ہونے والی رقص وسرود اور دیگر تفریحی محافل میں وہ بیگمات اور شاہی محل سے متعلق خواتین کو شامل ہونے کی دعوت دیتا۔

ایک ایسے دور میں جبکہ محلات شاہی کی مکینوں اور دیگر خواتین کی مجلسی زندگی کا دائرہ وسیع نہ تھا، زنانہ بازار یا مینا بازار کا انعقاد مغل بیگمات، شہزادیوں اور امراء اور منصب داروں کی بیویوں کے لیے مژدہ جانفزا ثابت ہوا ہوگا۔ مینا بازار نے ان کو یقیناً ایسے مواقع فراہم کیے کہ وہ آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل سکیں اور اپنے تجربات اور معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مینا بازار کے انعقاد کا اصل مقصد کیا تھا۔ اس ضمن میں چند دلچسپ بیانات ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ حقایق پر مبنی ہیں جبکہ دوسرے محض فرضی داستانیں ہیں جن کا سنجیدہ تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اکبر کا درباری مورخ ابوالفضل بتاتا ہے کہ عام طور سے عورتیں قید وبند کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی اس تنہائی کو کم کرنے کے لیے ہر ماہ مینا بازار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ (ان بازاروں میں) وہ تجارت اور صنعت وحرفت کی نمائش دیکھ سکیں۔ اس کے برعکس مینا بازار کے مقاصد سے بعض غلط روایات منسوب کی گئی ہیں۔ چنانچہ کچھ یورپی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں لکھا ہے کہ مینا بازار مغل شہنشاہوں کے اخلاق سوز عیاشی اور وحشیانہ شہوت پرستی کے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے لیے ہوتے تھے۔ اگرچہ مغل تاجدار حامل یک زوجگی نہیں تھے اور نہ ہی وہ اخلاقی عیوب سے یکسر پاک تھے لیکن وہ انسانیت اور اخلاق کے ایسے ناقص اور پست نمونے بھی ہرگز نہیں تھے جیسا کہ ان معاصر یورپی سیاحوں کے روزنامچوں میں انھیں پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ نہ صرف مینا بازار ان سیاحوں کے ذاتی مشاہدہ سے دور تھے بلکہ ان کے ان اہانت آمیز بیانات اور غیر منصفانہ خیال آرائیوں کے لیے کسی مصدقہ تاریخی ثبوت کا فراہم ہونا مشکل ہے

مینا بازار کے منعقد کرنے کے لیے غالباً کوئی میعاد یا وقفہ مقرر نہیں تھا۔ ابوالفضل کے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بازار ہر ماہ لگتا تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں ہر تہوار اور جشن کے موقع پر مینا بازار کا انتظام ہوتا تھا۔ عام طور پر جشن نوروز کے بعد ہی مینا بازار سجایا جاتا تھا۔ اکبر کا دور مغل عہد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دل میں رنگ ونسل کے امتیاز اور مذہب وملت کی تفریق کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ جس نئے ہندوستان اور ہندوستانی قومیت کی تشکیل کرنا چاہتا تھا اس کے لیے ہر شعبۂ زندگی میں اس کی یہی کوشش تھی کہ ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جن سے ہندوستان کا ہر فرد رنگ ونسل کے فرق کو بھول کر ہم آہنگ ہو جائے۔ اس مقصد کے ماتحت اس نے مینا بازار کو بھی کافی فروغ دیا اور اسے جشن سال نو کے بجائے جشن بہاراں کا ایک جز بنا دیا۔ موسم بہار کا میلا اس نے پہلی بار ۱۵۸۵ء میں لگایا جو انیس دن تک جاری رہا۔ شاہانہ پرتکلف ضیافتیں، چراغاں اور رقص وموسیقی کی محفلیں اس بزم عیش وطرب کے خاص پہلو ہوتے۔ اس جشن کے تیسرے روز ایک زنانہ مینا بازار لگتا تھا جس میں صرف شادی شدہ خواتین کو آنے کی اجازت تھی۔ مردوں میں صرف بادشاہ موجود ہوتا تھا۔ اس رنگین

له QANUNI- HUMAYUNI, KHWANDAMIR. BIBLOTHECA INDICA. PP. 55-57.

میلے کو اور بھی زیادہ پرکیف بنانے کی ہر امکانی کوشش کی جاتی تھی۔ ان موقعوں پر شاہی خاندان کی خواتین نہ صرف میلے کی رنگین اور پربہار فضا سے لطف اندوز ہوتیں بلکہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ بادشاہ تک اپنی شکایات اور عرضداشت بھی پہنچاتیں۔ خواتین کے مینا بازار کے بعد ارکین دربار کے لیے ایک مردانہ بازار لگتا تھا۔ اس قسم کے مینا بازاروں میں ہی بادشاہ کی توجہ خرید و فروخت سے متعلق مختلف بدعنوانیوں کی طرف مبذول ہوئی۔ چنانچہ جولائی ۱۵۸۲ء میں اس نے بازار کی نگرانی کے لیے چند ضوابط وضع کیے اور کچھ پابندیاں عائد کیں۔ اس سلسلے میں ایک سرکاری کمیٹی کی بھی تشکیل کی گئی۔ مینا بازار کے متعلق ابوالفضل آئین اکبری میں "آئین خوش روز" کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

"گیتی خداوند بہ پژوہش آگہی وشناسا آمدن شگرفکاری روزگار سومین روز جشن ہر ماہ والا انجمنی آراید۔ سوداگر زمان برفراز گرم بازاری تشنید و کالای ہر کشور بہ دکان پیدائی درآید۔ پرستاران مشکوی اقبال فراہم آیند و پرد گیان گوناگوں مردم راہ یابند۔ خرید و فروخت را ہنگامہ شوذ۔ گروہا گروہ کامیاب خواہش گردند۔ شہریار دوربین نیز بگزیدن کالا و برنہادن نرخ تازہ نقابے برسازد و بدیں روش شناسائی اندوزد۔ نہفتگی ملک و بیگونگی مردم زاد و بد و نیک ہر کارخانہ دریابد۔ و این روز را بدیں نام خوانند و نوید خوش دلی بخشند۔ و زپس بازار مرداں انتظام یابد۔ بازرگان ہر بوم را کام دل برآید۔ خدیو عالم داد و ستد را عیار برگیرد و باریافتگان عشرت خریدار نمایند و ہر گروہے دو ربائش چاد نشان در دل برخوانند و متاع آرائی را دستمایۂ گزارش حال گردانند۔ نیکاں را روز مراد بر دمد و بداں را باد افراہ سامان یابد۔ و از فروغ دیدہ وری بدیں کارگنجورے دفترے جداگانہ باشد ہماں زماں بے رنج انتظار زر یابند فراواں سود بر دارند۔"[1]

(خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہر ماہ ایک جشن منعقد ہوتا تھا۔ جشن کے تیسرے دن بادشاہ ایک انجمن (مینا بازار) سجاتے تھے تاکہ انھیں اور بیگمات شاہی کو عجائبات روزگار سے واقفیت حاصل ہو۔ اس میں دور دور سے سوداگر سامان لاکر سجاتے تھے۔ بادشاہ کے محل کے مکین اس میں آتے تھے اور (امرا و جاگیرداروں وغیرہ) کی عورتیں بھی مدعو کی جاتی تھیں۔ خرید و فروخت کا ہنگامہ گرم ہوتا تھا۔ بادشاہ جو چیزیں خریدنا چاہتے تھے ان کا انتخاب کرتے اور قیمتیں معین کرتے تھے۔ ان موقعوں پر جو خوش دلی کے ذریعے ہوتے تھے لوگ اپنی شکایتیں بھی (عصا برداروں کے توسط کے بغیر) خود بادشاہ کے حضور پیش کرتے تھے اور اپنا حال سنا سکتے تھے۔ جو نیک اور مستحق ہوتے ان کی مرادیں برآتیں اور نااہلوں کی بازپرس ہوتی۔ زنانہ بازار کے بعد مردوں کے لیے بھی ایک بازار لگتا تھا جس میں سوداگروں کو خاص نفع ہوتا تھا۔)

محمد حسین آزاد عہد اکبری کے ان زنانہ مینا بازاروں کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل و شعور کے بازار تھے زنانہ ہوجاتا۔ وہاں محل کی بیگمات آتی تھیں کہ ذرا ان کی آنکھیں کھلیں اور سلیقہ کی آنکھوں پر سگھڑاپے کا سرمہ لگائیں۔ امرا و شرفا کی بیبیوں کو بھی اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشہ دیکھے۔ دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں۔ سوداگری اور سودا زیادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا۔ خواجہ سرا، قلماقنیاں، اردہ بیگنیاں اسلحہ جنگ سجے انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں۔ عورتیں ہی پہرے پر ہوتی تھیں۔ مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں۔ اس کا نام خوش روز تھا۔ نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ بیگم، بہنیں بیٹیاں پاس بیٹھی تھیں۔ امرا کی بیٹیاں آکر سلام کرتی تھیں۔ نذریں دیتی تھیں۔ بچوں کو سامنے کرتیں ان کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں۔"[2]

ملا عبدالقادر بدایونی نے مینا بازاروں کی رونق کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"... ملک معظم نے حکم دیا کہ مینا بازاروں (جو کہ نوروز کے زمانے میں ہوتے ہیں) کی دکانیں ایک معینہ مدت کے لیے بیگمات و حرم کی دیگر عورتوں اور دوسری شادی شدہ خواتین کی سیر و تفریح کے لیے دے دی جائیں۔ ایسے موقعوں پر ملک معظم زر کثیر صرف کرتے اور حرم کے مکینوں کے اہم مسائل، شادی کے

---

[1] آئین اکبری (جلد اول)۔ صفحات ۱۳۲، ۱۳۳ [2] محمد حسین آزاد، دربار اکبری

سلسلے اور لڑکے لڑکیوں کی نسبتیں ایسی انجمنوں میں طے کی جاتی تھیں"۔

اکبر کا نصب العین محض سیاسی یکجہتی کا حصول ہی نہیں تھا، بلکہ وہ مشترکہ تہذیبی قدروں کی داغ بیل ڈالنا اور مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان جذباتی اتحاد بھی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت پسند اکبر ہندو مسلم اتحاد کو صرف اصولی حیثیت سے نہیں مانتا تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ اسے ایک عمل پیہم ہونا چاہیے۔ چنانچہ مختلف حوالوں سے بیگمات شاہی اور محل کی دوسری خواتین کے ساتھ راجپوت امراء، اعیان سلطنت اور منصب داروں کی بیویوں کی بھی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن بعض غیر ملکی سیاحوں نے مینا بازاروں میں راجپوت سرداروں کی بیویوں کی اس موجودگی کو اکبر کی عیش پرستی سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ لفٹننٹ کرنل جیمس ٹاڈ نے اپنی کتاب ANNALS. AND ANTIQUITIES OF RAJASTHAN میں بغیر کسی تحقیق کے میواڑ کے ایک راجپوت پرتھوی راج کی ایک نظم بھی نقل کی ہے۔ ٹاڈ کے بیان سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مینا بازاروں اور جشن نوروز پر اکبر راجپوت سرداروں کی عزت کا سودا کرتا تھا۔ مگر ٹاڈ اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی جامع تاریخی حوالہ دینے سے قاصر رہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ٹاڈ کا یہ بیان محض قیاس پر مبنی اور اکبر پر ایک بے بنیاد الزام ہے۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ بدایونی جو اکبر کا سخت مخالف تھا وہ بھی اپنے بیانات میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ دیکھئے:

JOURNAL OF INDIAN HISTORY, AUG. 1964.

جہانگیر کے عہد (۱۶۲۷ء ۔ ۱۶۰۵ء) میں بھی مینا بازاروں کو نہایت فروغ اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ چند یورپی سیاحوں کے مطابق یہ زنانہ مینا بازار شہنشاہ کے عیش و عشرت کے ذریعے تھے۔ ایک فرانسیسی سیاح (THOMAS CORYAT) جو ۱۶۱۳ء میں ہندستان آیا لکھتا ہے کہ سال میں ایک دن بادشاہ کی بیگمات و دیگر خواتین کی، بجوائی کی خاطر تاجروں کی بیویاں محل کے میلے میں اپنا مال تجارت فروخت کرنے کی غرض سے جمع ہوتیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ان میلوں میں بادشاہ شہر کی حسیناؤں کا نظارہ کرتا۔ مینا بازار کے اس بیان میں نور جہاں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ایسے ہی ایک میلے میں مارچ ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے مہرالنسا کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوا اور چند ماہ بعد (مئی) اس نے مہرالنسا سے شادی کرلی[۱]۔

اقبال نامہ جہانگیری کے مصنف نے بھی جہانگیر اور نور جہاں کی شادی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جشن نوروز ہی میں جہانگیر نے نورجہاں کو دیکھ کر اسے پسند کیا اور اس سے شادی کرلی۔ اس کے بیان سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ بادشاہ مینا بازاروں میں شہر کی حسیناؤں کا نظارہ کرتا تھا یا ان کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف ہوتا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس جشن کے موقع پر بادشاہ کو نورجہاں پسند آئی اور وہ اس کو باقاعدہ اپنے عقد میں لایا۔ چنانچہ پہلے اس نے مہرالنسا کا نام نور محل اور بعد میں نورجہاں رکھا۔ وہ لکھتا ہے:

"۔۔۔ روزی در جشن نوروز جہاں افروز بنظر دور بین آنحضرت مقبول آمدہ در سلک پرستاران حرم سرای خلافت انتظام یافت و آناً فاناً پایہ عزت و قبول او ارتقاء و اعتلا پذیرفت نخست نور محل نام کردند و پس از روزے چند خطاب نور جہاں بیگم عنایت شد"[۱]

شاہ جہاں کا عہد مغل اقتدار کا سنہرا دور تھا۔ شہنشاہ فنونِ لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ مغلیہ دربار کا جاہ و جلال اور شان و شوکت عروج پر تھی۔ ہر تہوار اور جشن کے موقع پر مینا بازار لگتا تھا۔ نوروز کے جشن کے بعد عام طور پر مینا بازار منعقد ہوتا تھا برنیر (BERNIER) لکھتا ہے:

"بعض اوقات ان جشنوں کے دوران محل شاہی یا حرم سرا میں ایک انوکھا میلا لگتا تھا جس کا اہتمام امراء اور خاص منصب داروں کی خوب رو اور خوش ادا بیویاں کرتی ہیں۔ جن اشیاء کی نمائش ہوتی ہے وہ ہیں خوبصورت زربفت، جدید ترین وضع کی اعلیٰ زردوزی، کمخواب پر نفاست سے بنائے ہوئے عمامے، اعلیٰ طبقے کی خواتین کے زیب تن کرنے والی حسین ململ اور دیگر بیش قیمت اشیاء۔ یہ دلربا خواتین تاجروں کے فرائض انجام دیتی ہیں جبکہ خریدار بادشاہ، بیگمات یا شہزادیاں اور حرم سرا کی دیگر ممتاز خواتین ہوتی ہیں۔ اتفاق سے اگر کسی امیر کی بیوی

---

[۱] PRASAD. BENI, HISTORY OF JAHANGIR P' 162 - THE INDIAN PRESS. ALLAHABAD 1962

[۱] اقبال نامہ جہانگیری۔ معتمد خاں، صفحہ ۵۶ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ کلکتہ ۱۸۶۵ء

کے حسین وجمیل بیٹی ہوتی تو وہ اپنی ماں کے ہمراہ آنا کبھی نہیں بھولتی تاکہ بادشاہ اسس کو دیکھ لے اور بیگمات اس سے واقف ہوجائیں۔ جس مضحکہ خیز انداز میں ایک ایک پیسے کی قیمت کے لیے حجت کرتے ہوئے بادشاہ سودا طے کرتا ہے وہ میلے کی ایک دلچسپی ہے۔"[۵۱]

ایک دوسرا سیاح منوچی لکھتا ہے کہ بادشاہ کو صرف ایک بات کی فکر رہتی اور وہ تھی اپنی عیاشی کے لیے عورتوں کی تلاش۔ اس غرض سے اس نے اپنے دربار میں ایک میلے کو رواج دیا جو ہر سال آٹھ یوم تک جاری رہتا۔ علاوہ عورتوں کے کسی کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ عورتیں ہر طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اعلیٰ و ادنیٰ متمول و نادار۔ لیکن سب حسین وجمیل ہوتیں۔ بادشاہ ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھ کر جس کو تاتار عورتیں اٹھائے ہوتیں دن میں دو مرتبہ ان دکانوں پر جاتا۔[۵۲]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکی سیاح مینا بازار کے بانی اور ان کو فروغ دینے والے مغل بادشاہوں کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے بیانات میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ بعض مورخین نے بھی غالباً ان سیاحوں کے بیانات ہی پر اکتفا کرلیا۔ بہرحال یورپی سیاحوں کے یہ بیانات قیاسی اور فرضی ہی ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مینا بازاروں تک ان سیاحوں کی رسائی نہیں تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان معتبر شہادتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان مینا بازاروں میں بجز بادشاہ کے کسی دوسرے مرد حتی کہ شاہی خاندان کے مردوں کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ مینا بازاروں کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ابوالفضل بتاتا ہے کہ عام طور سے شاہی محل کی عورتیں قید و بند کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی اسس تنہائی کو کم کرنے کے لیے ہر ماہ مینا بازار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ وہ تجارت اور صنعت و حرفت کی نمائش دیکھ سکیں۔ ایسی صورت میں مینا بازاروں کو مغل شہنشاہوں کی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کے ذریعے قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

قلعہ آگرہ میں نگینہ مسجد کے صحن کا ایک دروازہ جس چھوٹے سے کمرے میں کھلتا ہے اس کا ایک دروازہ ایک سنگی دالان میں کھلتا ہے۔ اس دالان کے نیچے سامنے ہی مینا بازار لگتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ زنانہ بازار مچھی بھون کی عمارت میں لگتا تھا۔ بہرحال یہ عمارت بھی اپنے محراب دار دالانوں اور خاص محل سے ملحق ہونے کے سبب مینا بازار کے لیے موزوں رہی ہوگی۔



---

۵۱ BERNIER, FRANCOIS, TRAVELS IN THE MOGHUL EMPIRE A.D. 1615-1688 P 272 - ARCHIBALD CONSTABLE & COMPANY, 14 PARLIAMENT STREET S.W. MDCCCXCI

۵۲ MANUCCI, NICCOLAO, STORIA DO MOGOR (TRANSLATED BY WILLIAM IRVINE, 1906)

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

چھوٹے پیمانے کی منظم صنعتوں میں ایک ہزار نئے واحدوں کا قیام ــــ سائنس ٹیچروں کے لیے مختصر کورس ــــ چھوٹی بچت مہم کی رفتار بڑھانے کے لیے اپیل ــــ سہارن پور میں ہندوستان کا پہلا ٹکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ ــــ آب پاشی کے چھوٹے وسائل کی تعمیر میں اضافہ ــــ اُتّر پردیش میں سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں شکر کی ریکارڈ پیداوار ــــ آب پاشی کیلئے بجلی کے کنکشنوں کی سہولت ــــ متفرقات

اتر پردیش میں تیسرے پنجسالہ منصوبے کی مدت کے دوران چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے منظم سیکٹر میں ایک ہزار سے زیادہ نئے واحدے قائم کئے گئے ہیں جن سے ۷۰ کروڑ روپئے کی مالیت کا مزید سامان تیار ہو رہا ہے اور ۶۰ ہزار افراد کو روزگار ملا ہے۔ یہ تخمینہ چھوٹے پیمانے کے ان واحدوں کے اعداد و شمار کی بنا پر لگایا گیا ہے جو اتر پردیش میں کارخانوں سے متعلق ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہوئے ہیں۔

تیسرے منصوبے کی مدت میں اس طرح چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے سیکٹر میں پیداوار اور روزگار میں بالترتیب ۱۸۰ اور ۸۱٫۸ فیصدی اضافہ ہوا ہے۔

تیسرے منصوبے کے آخر میں ۲۷۵۳ چھوٹے پیمانے کے واحدے سالانہ تقریباً ۹۰٫۶۷ کروڑ روپئے کی مالیت کا سامان تیار کر رہے تھے جب کہ منصوبے کے شروع میں ۱۷۱۳ واحدوں کی مجموعی پیداوار کی مالیت ۲۹٫۱۶ کروڑ روپئے تھی۔ اس مدت میں برسر روزگار افراد کی تعداد بھی ۵۰۵۹۵ سے بڑھ کر ۱۱۱۰۶۷۷ ہو گئی۔

اس منظم صنعت میں لگے ہوئے کل افراد میں سے ۲۴ فیصدی اشخاص اس وقت چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں کام پر لگے ہوتے ہیں جب کہ سنہ ۱۹۶۰ء کے آخر میں پیداوار اور روزگار کی فراہمی میں ان واحدوں کا حصہ بالترتیب ۱۳ اور ۲۱ فیصدی تھا۔

انٹرمیڈیٹ کلاسوں کے لئے سائنس ٹیچروں کی کمی دور کرنے کے واسطے مالیاتی سال رواں میں ۲۷۹ ٹیچروں کو ایک سال کے مختصر کورس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ گزشتہ یکم جنوری تک ۲۶۷ ٹیچر اس کورس کی تعلیم پوری کر چکے تھے۔

حکومت نے ان کورسوں کی تعلیم پر سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۲۶۷۷۵۴ روپئے سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۲۸۵۶۳۲ روپئے اور سنہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۱۷۰۰۶ روپئے خرچ کیا۔ ان ٹیچروں کیلئے ۱۲۵-۳۵۰ روپئے کا گریڈ منظور کیا گیا۔ مختصر کورس کی تعلیم [illegible] کرنے والے ۲۷۹ ٹیچروں میں سے ۷۵ لکھنؤ یونیورسٹی، ۵۱ الہ آباد یونیورسٹی، ۳۱ گورکھپور یونیورسٹی، ۴۳ میرٹھ کالج، ۵۵ آگرہ کالج اور ۲۴ ڈی۔ ایس۔ بی کالج نینی تال میں زیر تعلیم ہیں۔

ریاستی حکومت نے صنعتی کارخانوں اور تجارتی اداروں سے چھوٹی بچت کو آگے بڑھانے میں رضاکارانہ طور پر مدد دینے کے لئے اپیل کی ہے۔

مزید براں نجی کارخانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اپنے اشتہاروں میں چھوٹی بچت کی اہمیت سے متعلق دو ایک جملوں کا اضافہ کر دیں۔ اس سے حکومت کے خرچ میں کمی ہو گی اور اسکیم کے لئے رقم حاصل ہو سکے گی۔

حکومت نے ان تنظیموں سے یہ بھی اپیل کی ہے کہ وہ اپنے یہاں

ملازمین میں تنخواہ سے چھوٹی بچت میں روپیہ جمع کرنے کی اسکیم نیز اجتماعی میعادی ڈیپازٹ اسکیم شروع کریں۔

سہارنپور کا اسکول آف پیپر ٹیکنالوجی ہندستان کا پہلا ادارہ ہے جہاں لبدی اور کاغذ سازی کی تکنیک نیز متعلقہ طریقوں کی ٹریننگ کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اسکول کے چند بلاکوں کی تکمیل کے بعد ہی اس اسکول میں پورے طور پر کام شروع ہو سکے گا تاہم اسکول میں محدود پیمانے پر ٹریننگ دی جانے لگی ہے۔

اس اسکول کے قیام کی تجویز سنہ ۱۹۶۲ء سے ریاستی حکومت کے زیر غور تھی اور بالآخر حکومت اس کے لئے سوئیڈن اور مرکزی حکومت کی فیاضانہ تکنیکی اور مالی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ ادارہ جو ٹکنیکل جمنیزیم سوئیڈن اور آسکو وان میلو پالی ٹیکنیکم جرمنی کے نہج پر قائم کیا گیا ہے۔ کل ہند نوعیت کا ہوگا اور ملک کی لبدی اور کاغذ کی صنعت کے قریبی اشتراک سے کام کرے گا۔

حکومت سوئیڈن نے اس ادارہ کے لئے اب تک ۲۵ لاکھ روپئے کی مالیت کا ساز و سامان بطور تحفہ دیا ہے نیز ایک مشیر خاص پانچ انسٹرکٹروں پر مشتمل ماہرین کی ایک جماعت پانچ سال کیلئے بھیجی ہے۔ یہ جماعت ٹریننگ دینے نیز مختلف لیباریٹریوں کے قیام میں مدد دے گی۔ ٹریننگ سے متعلق عملہ نے سوئیڈن میں تعلیم حاصل کی ہے۔ سوئیڈن سے اس سال ۱۰ لاکھ روپئے کی مالیت کے ساز و سامان کے موصول ہونے کی توقع ہے۔

اس اسکول کے دوسرے متواتر اور غیر متواتر اخراجات مرکزی اور ریاستی حکومت برابر برداشت کرے گی۔

ہمارے ملک میں کاغذ کی صنعت کی ترقی کے روشن ترین امکانات ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ کاغذ زندگی کے تمام شعبوں میں جدید ترقی کے بنیادی وسیلوں میں سے ایک ہے اس کی کھپت میں روز افزوں اضافہ ہوگا۔ دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں ہمارے یہاں کاغذ کی کھپت کتنی کم ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندستان میں کاغذ کی فی کس کھپت محض ۲ ر۱ کیلوگرام ہے جبکہ امریکہ میں اس کی فی کس کھپت ۲۲۶ کیلوگرام سوئیڈن میں ۱۴۱ کیلوگرام برطانیہ میں ۱۱۶ کیلوگرام اور جاپان میں ۶۳ کیلوگرام ہے۔ ہندستان میں ۱۵ برسوں کے اندر کاغذ کی فی کس کھپت بڑھا کر ۷ کیلوگرام کرنے کے لئے کاغذ کی صنعت میں اتنی توسیع کرنا ہوگی کہ سالانہ ۵۰ لاکھ ٹن کاغذ تیار کیا جا سکے۔ ملک کے اندر سنہ ۱۹۶۶ء میں مجموعی طور پر ۷ لاکھ ٹن کاغذ تیار ہونے کی توقع ہے۔ سالانہ پانچ لاکھ ٹن کاغذ تیار کرنے کے لئے کاغذ کی صنعت کو کم سے کم مزید پانچ ہزار ٹیکنیکل ماہرین آپریٹروں اور میکینک کی ضرورت ہوگی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کے عملہ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ٹریننگ دی جائے۔

لہذا کاغذ کی صنعت کی آئندہ توسیع کے لئے عملہ کی فراہمی کے واسطے اس اسکول میں اس قسم کے عملہ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ٹریننگ دی جائیگی۔

اس وقت اسکول میں پیپر ٹیکنالوجی میں سائنس گریجویٹوں کیلئے دو سال کے ڈپلوما کورس اور میٹرک پاس افراد کے لئے تین سال کے سرٹیفکٹ کورس کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں سالانہ بالترتیب ۲۰ اور ۳۰ امیدواروں کا داخلہ کیا جاتا ہے۔ ٹریننگ کے دوران امیدواروں کو کاغذ کے کارخانے میں عملی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔

کاغذ کی صنعت میں لگے ہوئے افراد کے لئے ۷ سے ۱۸ مہینے کے مختصر مدت کے ڈپلوما اور سرٹیفکٹ کورسوں کی ٹریننگ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مزید براں پیشہ وارانہ تربیت یافتہ افراد کے لئے ۱۸ مہینے کا اسپشلسٹ میکنک کورس بھی شروع کیا جائے گا۔

فی الحال پورے وقت کے کورسوں میں سالانہ تقریباً ۱۰۰ داخلے کئے جائیں گے بعد ازاں صنعت کی ضرورتوں کے مطابق یہ تعداد بڑھا کر یا اس سے زیادہ کر دی جائے گی۔

یہ ادارہ جو ۲۵ ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے تین علیحدہ حصے اسکول کی عمارتوں طلبا کے ہوسٹل اور رہائشی اقامت گاہوں نیز ایک آڈیٹوریم اور ایک ڈائننگ ہال پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہوسٹلوں کے پانچ بلاک ٹکنیکل بلاک اقامت گاہوں اور ڈائننگ ہال کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور بقیہ قریب تکمیل ہے۔ اس ادارہ کا طرز تعمیر بے نظیر اور حد درجہ دلنشیں ہے۔

ریاستی حکومت اور حکومت سوئیڈن کے حکام کے درمیان حال ہی میں سوئیڈن میں اس مشترکہ اقدام کے لئے مزید مالی امداد کے حصول کے واسطے بات چیت ہوئی تھی۔ لبدی اور کاغذ سازی کا ایک رہبر پلانٹ لگانے

اسکیم زیر غور ہے جو اس اسکول کی ملحقہ یونٹ ہوگی۔

اتر پردیش میں آبپاشی کے چھوٹے وسائل کی تعمیر کے گراف کے رقبے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے کسان اپنے کھیتوں کو برابر پانی کی سپلائی کے لئے آبپاشی کے ذرائع بہم پہنچانے کے واسطے جوش وخروش سے سرگرم عمل ہے۔

جیسا گراف سے ظاہر ہے تیسرے منصوبے کی مدت میں آبپاشی کے چھوٹے ذرائع کی تعمیر کی رفتار تیز تر ہوگئی جس سے آبپاشی کے وسائل نیز ان کی صلاحیت میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ پہلے اور دوسرے منصوبے میں اس سلسلے میں مجموعی طور پر جتنا کام ہوا اس کے دوگنے سے آٹھ گنا تک کام تیسرے منصوبے میں ہوا۔ نجی ٹیوب ویلوں، پمپنگ سیٹوں، رہٹوں اور پکے کنووں کے معاملے میں بالترتیب آٹھ سات پانچ اور تین گنا سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی طرح آبپاشی کے وسائل اور کسانوں کو دئے گئے قرضوں کی رقم میں بھی پہلے اور دوسرے منصوبے کے مقابلے میں تیسرے منصوبے میں چار گنا اضافہ ہوا۔

آبپاشی کے لئے کسانوں کے تعمیر کردہ پکے کنووں کی تعداد تیسرے منصوبے کے دوران بڑھ کر ۲۲۰۴۹۳ تک پہنچ گئی جبکہ پہلے اور دوسرے منصوبے میں یہ تعداد بالترتیب ۲۵۹۰۴ اور ۲۶۸۵۳ تھی۔ کسانوں نے تیسرے منصوبے میں ۱۳۹۲۸۰ رہٹیں بھی لگائیں جبکہ پہلے اور دوسرے منصوبے میں انھوں نے بالترتیب ۶۷۷ اور ۲۱۷۴۲ رہٹیں لگائی تھیں۔ اس طرح ایسے کنوؤں کی تعداد جن میں بورنگ کی گئی تیسرے منصوبے میں بڑھ کر ۱۰۵۸۲۵ ہوگئی جبکہ پہلے اور دوسرے منصوبے میں یہ تعداد بالترتیب ۱۷۲۴۶ اور ۲۳۵۹۴ تھی۔ نجی ٹیوب ویلوں کی تعداد بھی جو پہلے اور دوسرے منصوبے میں بالترتیب ۸۵۸ اور ۱۸۲۷ تھی تیسرے منصوبے میں بڑھ کر ۲۱۶۵۹ تک پہنچ گئی۔ کسانوں نے تیسرے منصوبے میں ۱۹۶۹۰ پمپنگ سیٹ لگائے جبکہ انھوں نے پہلے اور دوسرے منصوبے میں بالترتیب ۱۳۵ اور ۲۶۴۸ پمپنگ سیٹ لگائے تھے۔

ان کاموں کی تکمیل کے لئے کسانوں کو تیسرے منصوبے میں ۱۱،۴۰ کروڑ روپئے کے قرضے دئے گئے جبکہ پہلے اور دوسرے منصوبے میں بالترتیب ۲۶،۲ کروڑ روپے اور ۲۳،۷ کروڑ روپئے کے قرضے دئے گئے تھے۔

ان اقدامات کے نتیجے میں تیسرے منصوبے میں ۳۲ لاکھ ایکڑ کی آبپاشی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی گئیں جب کہ پہلے اور دوسرے منصوبے میں بالترتیب ۸۹،۱ لاکھ اور ۵۸،۳ لاکھ ایکڑ کے رقبے کے لئے آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔

اتر پردیش میں سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے دوران ۶۱-۱۹۶۰ء کو چھوڑ کر شکر کی سب سے زیادہ پیداوار یعنی ۷۱،۱۳ لاکھ ٹن پیداوار ہوئی۔ سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ریاست میں ۲۶،۱۴ لاکھ ٹن شکر پیدا ہوئی تھی۔

شکر کے سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے سیزن کے مقابلے میں سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں پیداوار گنے کی پیرائی اور شکر کے حصول کے تناسب میں نمایاں اضافہ ہوا۔ یہ اعداد وشمار سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے ۵۱،۱۲ لاکھ ٹن ۳۷،۱۳۵ لاکھ ٹن اور ۲۴،۹ فیصدی کے مقابلے میں سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں بالترتیب ۷۱،۱۲ لاکھ ٹن ۸۹،۱۴۴ لاکھ ٹن اور ۷۴،۹ فیصدی تھے۔

اس امر کے پیش نظر کہ شکر ملوں میں تاخیر سے کام شروع ہوا۔ مئی اور جون کے مہینوں میں شکر کے حصول کے فیصد میں کمی کا رجحان تھا۔ سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ قابل تعریف ہے۔ تین ملوں میں جولائی تک کام ہوا۔ ملوں میں دیر تک کام ہونے سے تمام دستیاب گنے کی کھپت ہوگئی جس سے گنا کاشتکاروں کی پریشانی بڑی حد تک دور ہوگئی۔ ایسی ملوں کو خریداری ٹیکس نیز آبکاری ڈیوٹی میں چھوٹ دی گئی تاکہ غیر منفعت بخش سیزن میں گنے کی پیرائی سے ان کو جو نقصان ہوا اس کی تلافی کی جاسکے۔

زیر نظر سال میں مجموعی طور پر ۷۱ شکر ملوں میں کام ہوا جن میں مجھولا (ضلع پیلی بھیت) کی نئی امدادباہمی شکر مل بھی شامل ہے جو نومبر سنہ ۱۹۶۵ء میں چالو کی گئی۔ بیشتر شکر ملوں میں نومبر کے دوسرے پندرھواڑہ اور تین ملوں میں ۳۰ نومبر کے بعد پیرائی شروع کی گئی۔ محض ۲۳ یونٹوں میں ۳۰ اپریل تک کام بند ہوگیا جبکہ ۴۸ ملوں میں مئی، آٹھ میں جون اور تین میں جولائی تک کام ہوتا رہا۔

ناسازگار موسمی حالات کی وجہ سے شکر ملوں کو گنے کی سپلائی کی صورت حال سیزن کے شروع میں اچھی نہیں تھی لیکن اکتوبر میں بارش ہوجانے سے پوزیشن بہتر ہوگئی۔ گڑ اور کھنڈسار ی کی قیمتوں میں کمی ہوجانے سے

کچھ ملوں کے علاقوں میں بہت زیادہ گنا فاضل ہوگیا۔ لہٰذا کئی لاکھ کوئنٹل گنا دوسری شکر ملوں کو بھیجنا پڑا۔

حکومت اترپردیش نے سرکاری نہروں اور ٹیوب ویلوں کے قرب وجوار کے نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کے لئے بجلی کنکشن کی منظوری میں مزید آسانیاں فراہم کی ہیں۔ حکومت کے اس اقدام کا مقصد ریاست میں زراعتی ترقی کی رفتار تیز تر کرنا ہے۔

اب ایسے نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی کے کنکشن دئے جائیں گے جو سرکاری نہروں سے ۲۰۰ میٹر سے زیادہ فاصلے پر ہوں گے اور جن کے اوپری حصے کی چوڑائی ۲۵ میٹر یا اس سے زیادہ ہوگی مزید برآں ایسے ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کے لئے بھی بجلی کنکشن دئے جائیں گے جو سرکاری نہروں سے ۱۰۰ میٹر یا اس سے زیادہ دوری پر ہوں گے اور جن کے اوپری حصے کی چوڑائی ۲۵ میٹر سے کم ہوگی۔

نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو کتنی بجلی دی جائے اس کا تعین متعلقہ کاشتکار کے زیر کاشت رقبے کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ تین ایکڑ سے زیادہ ۱۲ ایکڑ تک آراضی کے کاشتکاروں کو دو ہارس پاور، ۱۲ سے ۲۵ ایکڑ تک آراضی کے کاشتکاروں کو تین ہارس پاور اور ۲۵ ایکڑ سے زیادہ آراضی کے کاشتکاروں کو پانچ ہارس پاور بجلی دی جائے گی۔ ایسے کاشتکاروں کو جنکے پاس تین ایکڑ سے کم آراضی ہوگی کوئی بجلی کنکشن نہیں دیا جائے گا۔

کسی نجی ٹیوب ویل کو سرکاری ٹیوب ویل سے ۶۰۰ میٹر کے اندر کوئی بجلی کنکشن نہیں دیا جائے گا لیکن اگر یہ ٹیوب ویل ۶۰۰ میٹر سے زیادہ دوری پر ہوگا تو اسے سیراب کئے جانے والے مجوزہ رقبہ کے مطابق بجلی دی جا سکے گی۔

آبپاشی کے سرکاری ذرائع کے علاقے کے اندر نجی ٹیوب ویلوں یا پمپنگ سیٹوں سے پانی کی فروخت ممنوع قرار دیدی گئی ہے۔

کسی ایسے نجی ٹیوب ویل کو کوئی تقاوی نہیں دی جائے گی جو آبپاشی کے سرکاری ذرائع کے علاقے میں ہوگا اور بجلی سے چلایا جاتا ہوگا۔

متفرقات

پوسٹ آفس ایکٹ میں ترمیم۔ قانون کمیشن انڈین پوسٹ آفس ایکٹ سنہ ۱۸۹۸ء پر غور کرنے کے بعد اس میں ضروری ترمیمات کرنے سے متعلق اپنی سفارشات پیش کرے گا۔

کمیشن نے اس موضوع میں دلچسپی رکھنے والے افراد اور اداروں سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے مشورے قانون کمیشن، حکومت ہند نمبر ۵ جور باغ نئی دہلی۔ ۳۔ کے پتے پر بھیجدیں۔

اٹھاون سال کے بعد ملازمت میں توسیع۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران ریاستی حکومت کے ۳۳ سرکاری ملازمین کو ۵۸ سال کی عمر کے بعد ملازمت میں توسیع منظور کی گئی۔ مذکورہ مدت کے دوران درجہ اول کے چھ افسروں، درجہ دوم کے ۲۰ افسروں اور درجہ سوم کے ۲۲۸ ملازمین کو ۵۸ سال کی عمر کے بعد ان کی ملازمتوں سے سبکدوش کیا گیا۔

مذکورہ معاملوں میں ملازمت میں تین سے لیکر ساڑھے تین سال تک کی توسیع کی گئی ہے۔

گاؤں سبھاؤں کے چناؤ اگلے سال۔ حکومت اترپردیش نے گاؤں سبھاؤں کے آئندہ چناؤ ستمبر۔ دسمبر سنہ ۱۹۶۷ء میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ چناؤ عام چناؤ کے لئے تیار کی گئی رائے دہندگان کی فہرستوں کی بنیاد پر کئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے اترپردیش پنچایت راج ایکٹ میں ضروری ترمیم کی جارہی ہے۔ حکومت گاؤں سبھاؤں کی تعداد میں کوئی تبدیلی کرنے کی تجویز نہیں رکھتی۔

تفریحی ٹیکس سے چھوٹ۔ تفریحی ٹیکس سے صرف تعلیمی اور سماجی اہمیت کی فلموں کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے اور وہ بھی مختصر مدت کے لئے۔ اسطرح کی فلموں کو محض خوبی کی بنیاد پر تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے پر غور کیا جاتا ہے اور چند ہی فلموں کو تفریحی ٹیکس سے چھوٹ دی جاتی ہے۔ اب تک کابلی والا، ہمارا گھر، ہمارا اسنسار، شہید، آسمان محل اور نئی عمر کی نئی فصل فلموں کو تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔



تصحیح۔ نیا دور بابت جون ۶۶ء میں "بنجارہ" کے عنوان سے ایک نظم شایع ہوئی ہے جس میں شاعر کا نام وصی سیتاپوری شایع ہوگیا ہے نظم دراصل احمد وصی صاحب کی ہے۔

تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

علی جواد زیدی

کربل کتھا : مصنفہ فضل علی فضلی ۔ مرتبہ : مالک رام و مختار الدین احمد ۔ ضخامت : ۳۴۸ صفحات ۔ قیمت : ساڑھے سات روپے قسم اعلیٰ : بارہ روپے ناشر : ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ

اردو ادبیات کی دنیا میں کربل کتھا کی بازیافت موجودہ صدی کے نصف آخر کا اہم کارنامہ ہے ۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ دہلوی نثر کا اس سے قدیم کوئی نمونہ یا تو وجود ہی میں نہیں آیا یا کم از کم محققین اس کے وجود سے اب تک بے خبر ہیں ۔ اگرچہ مرتبین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا ایک ہی نسخہ موجود تھا جو کریم الدین کی وساطت سے اشپرنگر کے پاس پہنچا اور پھر موخر الذکر کے ہمراہ یورپ چلا گیا لیکن کریم الدین کے نسخے اور اشپرنگر والے نسخے کے ایک اقتباس کا تقابلی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ کریم الدین اور اشپرنگر کے نسخے الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں ۔ بہر حال کریم الدین کا نسخہ اگر ہو بھی تو مفقود الخبر ہے ۔ یورپ نے اشپرنگر والے نسخے کو قیمتی امانت کی طرح سنبھال کر رکھا اور سنہ ۱۷۳۲-۳۳ء کی اس تصنیف کی سنہ ۱۹۵۵ء تک حفاظت کی اور زمانے کی دستبرد و حوادث کی دست رس سے دور رکھا ۔ لیکن یورپ میں بھی اس اہم کتاب کو گوشۂ گم نامی ہی نصیب ہوا ۔ اگر کریم الدین اور محمد حسین آزاد نے اس کا ذکر نہ کیا ہوتا تو شاید ہمارے صاحبان نظر کو بھی اس کے وجود کا علم نہ ہوتا ۔ حد یہ ہے کہ فہرست ذخیرۂ اشپرنگر کے مرتب نے بھی اسے دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور تذکرہ طبقات الشعراء ہی کے مواد کی تکرار پر اکتفا کر لی ۔

قاضی عبدالودود کے ذہن میں یہ کتاب اپنی تاریخی اہمیت کی وجہ سے گونج رہی تھی ۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ مختار الدین احمد کو شوق تحقیق یورپ لیے جا رہا ہے تو انھوں نے ان سے یہ فرمایش کی کہ وہ اس کتاب کا سراغ لگائیں ۔ مختار الدین احمد آرزو بھی دھن کے پکے لوگوں میں ہیں ۔ انھوں نے یورپ کے کتب خانے چھان مارے اور بالآخر ٹوبن گن یونیورسٹی کے دور افتادہ کتب خانے سے اسے ڈھونڈھ نکالا اور اس کا عکس اتروا لائے ۔

اب اسی عکس کی بنا پر یہ نسخہ ایک تفصیلی اور عالمانہ مقدمے، مفصل حواشی، فرہنگ، فہرستوں اور استدراکات کے ساتھ نہایت ہی آب و تاب اور خوش سلیقگی سے طبع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آیا ہے ۔ اسی نسخہ کی ایک عکسی نقل دلی یونیورسٹی نے بھی حاصل کی تھی اور اسے شایع کرنے کا اعلان بھی کیا تھا ۔ غالباً اس کے کچھ اجزا چھپ بھی گئے تھے، لیکن مکمل کتاب ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئی ۔ مالک رام اور مختار الدین احمد ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ نادر کتاب مناسب ہی نہیں احسن طریقے سے ہم تک پہنچا دی ہے ۔

جو لوگ مالک رام اور مختار الدین احمد کے تحقیقی مزاج سے واقف ہیں وہ میرے کہے بغیر بھی یہ یقین کر لیں گے کہ ان حضرات نے تحقیق کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے ۔ اس کتاب کا صرف ایک ہی نسخہ موجود تھا اس لیے تطابق کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ لیکن انھوں نے متن کو بغور دیکھا، اغلاط درست کیے، فارسی اصل سے مقابلہ کیا، مفصل حواشی دیے، عربی عبارت کی الگ فرہنگ دی ۔ حواشی کے مآخذ اور متن میں مذکور کتابوں، اقوال و حکم، احادیث، آیات قرآنی، بلاد و اماکن، امم و قبایل اور اعلام کی فہرستیں دیں اور مفید استدراکات

اور تصیحات کا اضافہ کیا۔ حق یہ ہے کہ جتنی دیدہ ریزی ان مرتبین نے کی ہے وہ شاید ہی کوئی اور کرتا اور کرتا بھی تو اس کی محنت ایسی جامع و مانع نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ یہ کام صرف عرق ریزی سے نہیں بلکہ وسعت مطالعہ، تحقیقی تجربہ اور ذوق سلیم کے بغیر انجام ہی نہیں پا سکتا تھا۔ ان حضرات نے محققین ادب کے لیے ایک شمع روشن کر دی ہے، جس کے نور سے آنے والے آگے کی راہیں اور ان راہوں کے نشیب و فراز دیکھ سکتے ہیں۔

کربل کتھا۔ (جسے بعض حضرات غلطی سے دہ مجلس بھی لکھتے آئے ہیں) ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضتہ الشہداء کے کسی لا معلوم خلاصے پر مبنی ہے۔ فضل علی فضلی، مؤلف و مترجم نے لکھا ہے کہ انھوں نے خلاصِ روضۃ الشہداء کا ترجمہ کیا ہے، لیکن اس بات کی تحقیق نہیں ہو پائی ہے کہ یہ کس مخصوص خلاصے کا ترجمہ ہے۔ اس کا علم نہ ہونے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کربل کتھا اور روضۃ الشہداء کے مابین جو اختلافات اور کمیاں اور زیادتیاں ملتی ہیں، ان کی ذمہ داری خلاصہ کرنے والے پر ہے یا فضلی پر۔ مرتبین نے ان تبدیلیوں کو مترجم سے منسوب کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ " بہ حیثیت مجموعی کربل کتھا کی عبارت روضۃ الشہداء سے اتنی مختلف ہے کہ اسے بجا طور پر فضلی کی مستقل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے "۔ امکان قوی یہی ہے کہ مرتبین کا قیاس صحیح ہو، لیکن بہت زیادہ قطعیت سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ خود فضلی نے صرف مترجم ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ نفس مضمون اور محمد شاہی دور میں اردو زبان کی ارتقائی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ ترجمہ حیرت انگیز حد تک رواں اور سلیس ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ بقول فضلی محمد شاہی دور تک فارسی سے "عبارت ہندی" میں ترجمہ سنا نہیں گیا تھا۔

مرتبین نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ " قدیم تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے، یہاں تک کہ میر حسن دہلوی نے بھی کربل کتھا کا ذکر نہیں کیا"۔ فضلی کے اس بیان کے پیش نظر کہ یہ ترجمہ جن مجلسوں میں پڑھا جاتا تھا وہ نواب کے محل کے اندر پوشیدہ طور سے منعقد کی جاتی تھیں، یہ بات بہت زیادہ حیرت کی نہیں رہ جاتی۔ غالباً اس کتاب کا علم ایک مخصوص حلقے کے باہر نہیں ہوا اور پھر اس کے گرد گم نامی کا ایک ہالہ پڑ گیا۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجالس کا پوشیدہ انعقاد صاحب مجلس کے ذاتی مصالح پر مبنی تھا۔ بہر حال جو بھی سبب رہا ہو اس میں شک نہیں ہے کہ کتاب کے وجود کا علم بہت کم لوگوں کو تھا اور اسی وجہ سے اکثر تذکرہ نویس بھی اس سے لاعلم رہے ہوں گے! اگر کریم الدین کو نسخہ ہاتھ نہ آ گیا ہوتا تو آج اس کے وجود کا بھی کسی کو پتہ نہ ہوتا۔

مرتبین نے مقدمے میں کربل کتھا کی لسانی اہمیت پر بڑے فاضلانہ انداز میں بحث کی ہے اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ بعض الفاظ کے بارے میں ان حضرات نے خالص پنجابی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ مثلاً "کھلیان" کلھ (کل، فردا، دوش) کاڑھنا (بمعنی نکالنا)، بھوئیں (بھومی، زمین)، "بھویا" "جھوٹھ" (جھوٹ)، چونا (بمعنی ٹپکنا)۔ یہ لہجے اور الفاظ خالص پنجابی نہیں ہیں بلکہ پوربی اتر پردیش میں بھی رائج ہیں اور ان الفاظ کا علم پنجابی دانی پر دلالت نہیں کرتا۔ "گیارنہ" (گیارہ) بھی خالص پنجابی نہیں ہے۔ لکھنوی بھی عام گفتگو میں "گیاراں" "باراں" بول جاتے ہیں۔ اردو دلی کی مخلوط زبان تھی۔ اس میں بھی بولیاں اور زبانیں اپنے الفاظ عاریتہً دیتی رہتی تھیں۔ "سٹ" اور "نال" (ساتھ) البتہ ایسے الفاظ ہیں جن کا رواج پنجابی تک محدود ہے لیکن دلی میں بھی یہ الفاظ کلیتہً اجنبی نہیں تھے۔ "سار" (بمعنی کیفیت) ہندی میں ہمیشہ سے مستعمل ہے اور اس کو خالص پنجابی کہنا غالباً درست نہ ہوگا۔ اسی طرح بعض الفاظ میں نون غنہ کا اضافہ بھی دکنی تک محدود نہیں ہے بلکہ پوربی اتر پردیش تک دائر و سائر ہے۔ "ڑ" کی جگہ "ڈ" کا استعمال املا میں عام تھا اور اس کا تلفظ سے براہ راست علاقہ نہیں تھا۔ مثلاً علی گڑھ، اعظم گڑھ کا املا اکثر علی گڈھ، اعظم گڈھ کرتے تھے۔ بعض اوقات معمولی پڑھے لکھے لوگ تلفظ بھی ڈال ہی کا کرتے تھے۔ یہ صورت حال بھی پوربی اضلاع اتر پردیش میں پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ "ڑھ" کے تلفظ کو ثقیل ہی نہیں، غیر ثقہ سمجھتے تھے اور جب کوئی پڑھا لکھا "ڑھ" کا صحیح تلفظ کرتا تو یہ کان کھڑے کرتے تھے۔

بعض تصیحات کی صحت میں شبہ معلوم ہوتا ہے، مثلاً اس شعر میں۔

بس برساں (تھند) سرے راجبریل
شوید غبار گیسوش از آب سلسبیل

"تھند" کا اضافہ بظاہر مصرعۂ اولیٰ کو موزوں کرنے کے لیے کیا گیا ہے، لیکن اس اضافے کے بعد بھی مصرعہ غیر موزوں رہ گیا۔ اگر صرف موزوں ہی کرنا ہو تو 'جبرئیل' کے پہلے 'دا' کا اضافہ اور کرنا پڑے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ان اضافوں کے بعد بھی مصرعہ سست رہ جاتا ہے۔ ایک اور مصرعہ کو 'استدراکات' میں ناموزوں کہا گیا ہے۔ مصرعہ یوں ہے ؏ انا اللہ میں تجھ لے پڑھوں تجھ سے

جبرئیل ـ یہ مصرعہ ناموزوں نہیں ہے۔ اس پر ناموزونیت کا شبہ اس لیے ہوتا ہے کہ "بجھولے" "مجھولے" کو "بجھولیے" یا "مجھولیے" پڑھ لیا گیا۔ یہ دراصل "بجھولے" بروزن "بجھ سے" ہے۔ 'لے' بمعنی "واسطے" اب بھی مشرقی اضلاع کی بولیوں میں مستعمل ہے۔ اسی طرح "کھیل" کے معنی "خفیف" سا تھوڑا سا" لکھا ہے۔ یہ مجازی معنی ہیں۔ 'کھیل' لیا کے ایک جوے کو کہتے ہیں اور اسی سے خفیف سا وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا ہے۔ اس مصرعہ (ص ۱۳۰: ۶) میں لفظ "کھیل" اپنے لغوی معنوں ہی میں آیا ہے اور جزو محاورہ ہے۔ استدراکا میں "ہتھولنے" پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے اور (ص ۱۵) کے حاشیے پر اسے لفظ نامانوس بتایا گیا ہے۔ یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوتا رہا ہے اور اس مقام پر اصل فارسی عبارت کا صحیح ترجمہ ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے "تلوار ہتھوانا" بھی نظم ہوا ہے اور یہ عام فوجیوں کی اصطلاح معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ص ۱۶۲ پر بیت "ہائے کن انجھوں بکن مرادوں سے" میں "انجھوں" "بجھوں" (دلکشوں) ہے۔ بکش (مقصد امید حقیقی) کی جمع۔ اس کی بکش یا بجھن سے علاقہ نہیں معلوم ہوتا۔

ایک اور تسامح کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی اس روایت کو کہ من بکیٰ علیٰ الحسین (او ابکا) او تباکی وجبت لہ الجنۃ (جو متن کتاب میں پانچ مقامات پر آئی ہے) مرتبین نے حضرت رسول اللہؐ سے منسوب کر لیا ہے (ص ۲۸۹) اور پھر اس مفروضہ کو بنیاد بنا کر جو اظہار خیال کیا گیا ہے وہ غلط مبحث کی نشانی بن کر رہ گیا ہے۔ مثلاً صفحہ، کے حاشیے میں لکھا ہے کہ "صحاح ستہ، مسند دارمی، مسند امام حنبل اور موطا و امام مالک میں اس حدیث کا پتہ نہیں"۔ اور فہرست احادیث نبوی کے ذیل میں شامل کرنے کے بعد اس کو قوسین میں موضوع ظاہر کیا گیا ہے۔ شاید یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہو گئی کہ مترجم نے امام جعفر صادقؑ کے اس قول کو حدیث کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ حدیث، فرمودات نبوی کے لیے مخصوص ہو گیا ہے لیکن کبھی کبھی اس لفظ کا استعمال حدیث رسول کے علاوہ اقوال ائمہ کے لیے بھی ہوا ہے۔ خود اسی کتاب میں آیات قرآنی کو بھی حدیث کہا گیا ہے۔ مثلاً دیباچے میں (ص ۲۱) انی اعلم ما لا تعلمون کو جو آیت قرآنی (البقرہ ۲: ۳۰) ہے مترجم نے حدیث کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ من بکیٰ الخ والی حدیث اگر حدیث رسول ہے ہی نہیں تو صحاح ستہ مسانید و موطا میں اس کی تلاش بے سود ہے اور اس کے وضعی یا حدیث صحیح ہونے کا فیصلہ خشت اول کی کجی کے ثریا تک پہنچنے کی مثال ہے۔

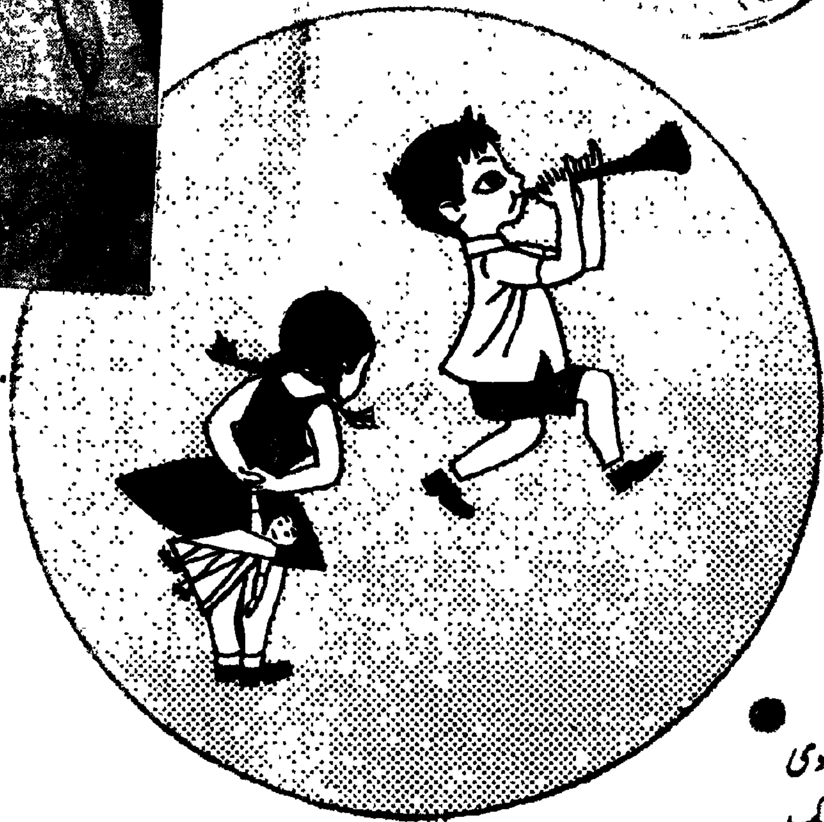
میں نے ان چند باتوں کی طرف رواروی میں اشارہ کر دیا ہے تاکہ اگر مرتبین میرے معروضات سے متفق ہوں تو آیندہ اشاعتوں میں اس کی تلافی کر دیں۔ لیکن ان جزدی تسامحات سے اصل کتاب کی اہمیت یا مرتبین کی محنت، دیدہ ریزی، بے پایاں صلاحیت اور ان کی غیر معمولی وسعت معلومات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انھوں نے کوئی گوشۂ تاریکی میں نہیں رہنے دیا ہے۔ ہر جگہ چراغ لے کر گئے ہیں اور اندھیرے میں روشنی کی جوت پھیلائی ہے۔ جہاں یقین نہیں تھا وہاں بھی بات کو گول مول انداز میں پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مرتبین نے اپنی دوٹوک رائے دے دی ہے اور آنے والے محققین کے لیے راہ کھول دی ہے۔ ان کی محنت اور اہمیت کا صرف اس بات سے اندازہ لگا ہے کہ انھوں نے متن کی درستی اور حواشی کو فہارس کے لیے اسّی سے زیادہ مستند کتابوں سے مدد لی ہے اور متعدد ماہرین خصوصی اور اہل علم سے شکوک کے دفع کرنے کے لیے رجوع کیا ہے۔ فرہنگ کی تیاری میں آیات و احادیث کی نشان دہی میں بھی ذوق و کاوش سے کام لیا ہے اور عام کام کرنے والوں کے لیے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے کہ ترتیب و تحقیق کا کام یوں کیا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لسانیات، ادبیات اور دینیات سے دلچسپی رکھنے والے یکساں طور پر اس کتاب کی جانب توجہ کریں گے، مرتبین کی محنت کی داد دیں گے اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

★

REGD No. L-319

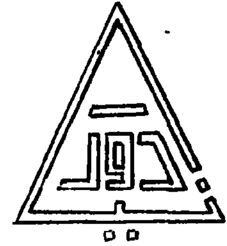


کچھ عرصے قبل راجستھان کے دورے کے موقع پر (وزیر اعظم) شریمتی اندرا گاندھی ایک راجستھانی مہیلا کے ساتھ



.۵۰

سنہ ۱۹۶ عیسوی
۱۰۰۰ اشک



جلد ۲۲ نمبر ۸

کارتک ۱۸۸۸ شک
نومبر ۱۹۶۶ عیسوی

چندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
ششی کانت بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہاج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

اپنی بات

ہندستان میں جن مہینوں نے خصوصیت حاصل کرلی ہے ان میں اکتوبر اور نومبر کے مہینے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اکتوبر میں ہم گاندھی جینتی مناتے ہیں اور نومبر میں جواہر جینتی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی پیدائش الہ آباد میں ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو ہوئی تھی۔ ملکی سیاسیات میں قدم رکھنے کے بعد سے انھوں نے ہندستان کی جدوجہد آزادی میں جس طرح حصّہ، اس سلسلے میں انھوں نے جو قربانیاں دیں، اپنی سوجھ بوجھ، فہم و فراست، آہنی عزم اور مستحکم ارادے سے کام لے کر منزل آزادی کی جانب جس طرح قوم کی رہ نمائی کی، پھر حصول آزادی کے بعد عمر کے آخری لمحے تک آزادی کی بقا، ہندستان کی تعمیر اور جمہوریت کے فروغ کی جو جدوجہد کی، تنگ نظری اور فرقہ واریت، رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی بنیاد پر امتیازات کے خلاف جو جہاد کیا اور امن عالم، بین اقوامی مفاہمت، اور ایک ایسی دنیا کے خواب کی تکمیل کے لیے جو خوف اور نفرت و حقارت سے پاک ہو، جس طرح کوشاں رہے اس نے انھیں نہ صرف ہندستان کا محبوب ترین لیڈر اور رہ نما بنا دیا تھا بلکہ دنیا کے لیے وہ ایک محبوب شخصیت بن گئے تھے۔ بہ قول پرل بک "اس کرۂ ارض پر نسل انسانی کی تاریخ کے ہر صد سالہ دور میں ایسی ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں جو ہم سب کی زندگیوں کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ جواہر لال نہرو ایک ایسی ہی ہستی تھے جنھوں نے گزشتہ برسوں میں مشرق و مغرب کے ملکوں کے بھی باشندوں کو جس قدر متاثر کیا ہے اور جس طرح ہمیشہ ہماری بھلائی کے لیے ہم پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں دی جاسکتی۔ . . . ان کی آزادروی، امانت داری اور منفرد شخصیت کی یہ دولت آج دنیا بھر میں ان کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔" پنڈت نہرو کو اپنی رائے اور فیصلے پر جو یقین اور بھروسہ تھا اور دوسروں کے لیے عزت و احترام کے باوجود وہ اس پر جس طرح قائم رہتے تھے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پرل بک لکھتی ہیں کہ "جواہر لال نہرو نے اس زمانے میں بھی جب وہ گاندھی جی کے ایک نوجوان پیروکار تھے، مہاتما گاندھی کے لیے ہر طرح کا عزت و احترام، گہرا لگاؤ اور خلوص و محبت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذہنی اور ارادی انفرادیت کو کیسے برقرار رکھا!" چنانچہ وہ لکھتی ہیں کہ "کسی کا احترام کرنا اور پاس و لحاظ رکھنا اور پھر اپنی بات پر بھی قائم رہنا ایک ایسی قابلیت ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ نہایت واضح طور پر ان کی عظمت کی مظہر ہے۔"

جواہر لال نہرو اس میں شک نہیں کہ فطرت کی طرف سے ایک بڑے قائد و رہبر کی صلاحیتیں لے کر آئے تھے اور جب ان صلاحیتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملا تو نہرو کی شخصیت کے وہ تمام گوشے جو اس وقت تک تاریکی میں تھے روشن ہوگئے۔ یوں تو آزادی ملنے سے پہلے ہی جواہر لال کی شخصیت کا فن ابھر آئی تھی اور ایک متنفس بھی ایسا نہیں تھا جو ان کی قابلیت و ذہانت، فہم و فراست اور ان کے قومی اور وطنی خدمت کے جذبے کا معترف نہ رہا ہو لیکن جن حالات میں ہندستان کو آزادی ملی اور آزادی ملنے کے بعد ہی ملک کو جن دشواریوں سے گزرنا پڑا اور جو اہم اور پیچیدہ مسائل اس کے سامنے آئے ان کا مقابلہ جواہر لال نہرو نے جس آن بان، جس عزم و استقلال اور جس سوجھ بوجھ سے کیا اور ملک کو سوشلزم کے راستے پر لے جانے اور ممتاز برطانوی فلسفی لارڈ برٹرنڈ رسل کے بہ قول "ہندستان میں جمہوریت کو محفوظ کرنے اور اس طرح ایشیا اور افریقہ کے دوسرے حصوں میں اسے ایک حقیقی امکان بنانے" میں وہ جس طرح کامیاب ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر کتنی عظیم الشان شخصیت چھپی ہوئی تھی۔

یہ سچ ہے کہ اپنی ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے بھی جواہر لال کافی کشش رکھتے تھے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان کی کامیابی کا اصل راز ان کی فطری اور طبعی مقناطیسیت میں چھپا ہوا ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ وہ کسی ملک کا سربراہ بن جائے، کسی بہت بڑے عہدے پر فائض ہو جائے یا اس کے پاس دولت کی فراوانی ہو۔ دراصل بڑا انسان وہ ہوتا ہے جس کا ظاہر و باطن ایک ہو، جس کے قول و عمل ایک ہوں اور جس کے قلب و زبان میں ہم آہنگی ہو۔ ایسے لوگ جن کے کردار و گفتار و حدانی ہوں کم پائے جاتے ہیں۔ جواہر لال نہرو اس سلسلے میں بڑی زبردست انفرادیت رکھتے تھے۔ روزمرہ کی زندگی کا تو ذکر ہی کیا خود سیاست میں بھی جسے "وقت و ضرورت کے زیر اثر قول و فعل کی ناآہنگی کا دوسرا نام" دیا جاتا ہے، وہ ڈپلومیسی یا حکمت عملی کے قائل نہ تھے۔ جواہر لال جی صداقت و خلوص، دیانتداری اور سچائی کے پجاری تھے۔ یہ جذبہ انھوں نے گاندھی جی سے سیکھا اور اس پر جس سچائی اور مضبوطی کے ساتھ عمل کیا اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ چنانچہ خود جواہر لال جی نے ایک بار پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر میں نے اپنی گزشتہ تیس چالیس برس کی پبلک زندگی میں کوئی تجربہ حاصل کیا ہے یا اپنے اس رہ نما سے جس نے ہمیں بہت سی باتیں سکھائی ہیں، کوئی بات سیکھی ہے تو وہ یہ ہے کہ ٹیڑھے میڑھے طریق عمل یا پالیسی سے انجام کار کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی فائدہ ہوتا بھی ہے تو وہ محض عارضی ہوتا ہے۔" جواہر لال جی بڑے جذباتی بھی تھے لیکن اسی کے ساتھ ان میں ایک بہت بڑی صفت یہ بھی تھی کہ جذبات کی رو میں نہ وہ بہہ جاتے تھے اور نہ ان کے قدم کبھی ڈگمگاتے تھے۔ ان کی فطری استقلال پسندی اور متانت و سنجیدگی انھیں جذباتی مواقع پر بھی صبر و ضبط اور تحمل سے کام لینے پر آمادہ کر دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ڈسپلن پر بے انتہا زور دیتے تھے اور کسی ایسی

بات کو جو ضبط و نظم اور ڈسپلن کے خلاف ہو ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ ضبط و نظم اور ڈسپلن کی خلاف ورزی اکثر تشدد کا راستہ اختیار کرلیتی ہے۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ ملک کا ہر فرد خصوصاً نوجوان اور طلبا ہر قیمت پر ضبط و نظم اور ڈسپلن کو برقرار رکھیں تاکہ محنتوں اور قربانیوں سے حاصل کی ہوئی ہماری آزادی محفوظ رہ سکے۔ الٰہ آباد میں سنگم پر ۱۲ فروری ۱۹۴۸ء کو مہاتما گاندھی کے پھول سیرانے کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "تشدد کی راہ خطرناک ہے اور جہاں تشدد ہوتا ہے وہاں آزادی زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہتی"۔ ہمارے طلبا ملک کے مستقبل کے معمار اور آزادی کے محافظ ہیں اس لیے ان پر خاص طور سے ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ پنڈت نہرو اپنی دل کش شخصیت، خدمت، وطن، فرض شناسی، وسیع النظری، حسن تدبر، حق گوئی، امن پسندی، انسان دوستی، خلوص و محبت اور دردمندی کے باعث نہ صرف کروڑوں ہندستانیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے بلکہ انھیں بین الاقوامی شہرت و مقبولیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ طلبا بھی انھیں اپنا ہیرو تصور کرتے تھے اور ان پر جان چھڑکتے تھے۔ اس لیے طلبا سے یہ توقع رکھنا ہے کہ وہ اپنے اس ہیرو اور محبوب رہنما کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے آزادی کے استحکام اور ملک و قوم کی ترقی کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہوجائے، بالکل قدرتی بات ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ادھر کچھ دنوں سے طلبا کی تحریک نے ایک سنگین صورت حال پیدا کردی ہے۔ سوال مقصد کا نہیں حصول مقصد کے ذریعے کا ہے۔ اس لیے کہ مقصد کتنا ہی نیک اور درست کیوں نہ ہو اگر اس کے حصول کا ذریعہ ٹھیک اور صحت مند نہیں ہے تو مقصد کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وطن کی آزادی کا مقصد نیک اور صالح نہیں تھا۔ پھر اگر اس مقصد کے حصول کے لیے اس اصول پر کہ جب مقصد نیک ہے تو ہر طریقہ کار اپنایا جاسکتا ہے، تشدد، بدنظمی اور لاقانونیت کا سہارا لیا جاتا تو بے جا اور غلط نہ ہوتا۔ لیکن ہمارے عظیم رہنما اور مشاق و پختہ کار نباض مہاتما گاندھی نے ہمیں یہی سکھایا کہ ٹیڑھے میڑھے طریق عمل یا پالیسی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مقصد کو خواہ وہ کتنا ہی صالح کیوں نہ ہو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ورنہ ہندستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جس طرح قومی احساس بیدار ہوچکا تھا اور جذبہ آزادی میں جو حرارت اور گرمی پیدا ہوچکی تھی اس میں عوام کو تشدد اور لاقانونیت پر آمادہ کردینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ لیکن نہیں گاندھی جی نے اس راستے کو سرے سے غلط قرار دیا اور آزادی کی عظیم لڑائی انھوں نے عدم تشدد کے حربے سے لڑی اور بالآخر کامیاب ہوئے اور ثابت کردیا کہ یہی ذریعہ یا یہی راستہ ٹھیک اور درست تھا۔ طلبا کو بھی یہ سوچنا پڑے گا کہ انھوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے جو راستہ اختیار کیا ہے کیا وہ ٹھیک ہے اور کیا یہ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کا بتایا ہوا راستہ ہے؟ ہر تحریک اور ہر احتجاج جس میں غیر آئینی اور غیر جمہوری طریقے اپنائے جاتے ہیں اور تشدد سے کام لیا جاتا ہے اس کے بہت جلد تحریک چلانے والوں کے ہاتھوں سے نکل کر سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں میں پہنچ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ طلبا کی موجودہ تحریک کے سلسلے میں بھی یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر صورتوں میں سماج دشمن عناصر آگے آگئے ہیں اور انھوں نے تحریک کو تشدد اور لاقانونیت کی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ طلبا کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ بہت سے یونیورسٹی اور کالج کے طلبا یقیناً کل کے رہنما ہیں۔ ایک جمہوری نظام میں وہ غیر شعوری طور پر آج جو کچھ بو رہے ہیں کل وہی کاٹیں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آئینی اور جمہوری طریقوں کے مطابق اور تمام تنظیم اور ضبط و نظم کے ساتھ چلنے والی تحریکیں اور احتجاج موثر اور انجام کار کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہوجائے انھیں اپنی تحریک، اس کے طریقہ کار اور اثرات مابعد کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا ورنہ شاید آیندہ نسلیں انھیں معاف نہ کریں گی کیونکہ ملک اس وقت جن مشکلات سے گزر رہا ہے اور اسے جو خطرات درپیش ہیں ان کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ کوئی تحریک ایسی لائنوں پر چلائی جائے جن سے ملک کی مشکلات اور بڑھ جائیں، اس کے اتحاد کو نقصان پہنچے اور دشمن اس صورت حال سے فائدہ اٹھائے۔ اندرونی مسئلوں میں اس وقت سب سے اہم غذائی مسئلہ ہے۔ بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے اس نے غیر معمولی سنگینی اختیار کرلی ہے۔ پھر بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مسئلہ ہے۔ بیرونی مسائل میں چین کا خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ ایشیا میں اور خصوصاً پڑوسی ملکوں کے خلاف چین کے جارحانہ رویے اور پاکستان سے اس کے گٹھ جوڑ نے صورت حال کو اور زیادہ پیچیدہ بنا رکھا ہے۔ ہندستان کی مسلسل کوشش یہ رہی ہے کہ ان دونوں پڑوسی ملکوں کو عقل سے کام لینے پر آمادہ کرے لیکن ابھی اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔ اس لیے وقت کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ ان خطرات کا مقابلہ کرنے اور ملک کی مشکلات کو کم کرنے کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان میں ہم اشتراک و تعاون کریں اور اپنی جانب سے کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں جو خطرات اور مشکلات کو بڑھا دیں۔

رہبران و رہنمایان قوم کی سالگرہ کی تقریبات کے سلسلے میں موثر تقریریں کرلینا یا سن لینا اس کے اوصاف اور خوبیاں بیان کردینا یا اپنی شکر گزاری و احسان مندی کا اظہار کردینا ہی کافی نہیں ہے۔ اگر ہم ان کے سچے ماننے والے ہیں تو ہمیں سالگرہ مناتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کی جلائی ہوئی شمع گل تو نہیں ہو رہی ہے، ان کے بتائے ہوئے راستے سے ہم دور تو نہیں ہو رہے ہیں، ان کی تعلیمات کہیں فراموش تو نہیں کی جارہی ہیں؟ ۱۴ نومبر کو ہم پنڈت نہرو کی سالگرہ منا رہے ہیں۔ دوسری تقریبوں اور دلچسپیوں کے ساتھ ہم میں سے ہر ایک کو خصوصاً طالب علموں کو جن پر مستقبل کی ذمے داری عائد ہوتی ہے، چاہیے کہ پنڈت جی کے نصب العینوں کو اپنانے، اپنے قول و فعل میں ہم آہنگی پیدا کرنے، اپنے کردار کو مثالی بنانے، اپنے اندر سپاہیانہ ڈسپلن پیدا کرنے، معاملات کو سنجیدگی اور تحمل کے ساتھ نپٹانے اور قوم کی مشکلات کو دور کرنے اور اسے خوش حال بنانے کے عزم کا اعادہ کریں۔ سال گرہ منانے کی صحیح اسپرٹ یہی ہوگی۔

● ہمیں افسوس ہے کہ بعض اتفاقی اسباب کی بنا پر ادھر نیا دور کی کئی اشاعتوں میں تاخیر ہوگئی۔ بہرحال ہم برابر کوشاں رہے کہ اس کی اشاعت جلد سے جلد معمول پر آجائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری کوششیں بار آور ہوئیں اور نیا دور کا نومبر کا شمارہ وقت پر شایع ہو رہا ہے۔ اشاعتوں میں تاخیر کی وجہ سے قدر دانان نیا دور کو جو تکلیف اور زحمت ہوئی اس کے لیے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ نیا دور وقت سے شایع ہوگا۔ ——— — ایڈیٹر



منوّر لکھنوی

شکستوں نے نشاطِ کامرانی ختم کر ڈالی
غمِ دل نے مسرّت کی کہانی ختم کر ڈالی

ابھی سے منتشر ہے سلسلہ اوراقِ ہستی کا
ابھی سے داستانِ زندگانی ختم کر ڈالی

ہجومِ بے کسی میں پتھروں سے سر کو ٹکرایا
کسی صورت سے اپنی سرگرانی ختم کر ڈالی

اُڑا دی خاک بھی میری فنا پرور ہواؤں نے
جو باقی تھی مرے دل کی نشانی ختم کر ڈالی

بڑھاپے کا ہو کیا انجام دیکھیں ہم نے غفلت میں
لڑکپن ختم کر ڈالا، جوانی ختم کر ڈالی

بجھائی ہے جگر کی آگ پیہم چشمِ گریاں سے
یہ سوزش، ڈال کر اشکوں کا پانی ختم کر ڈالی

لباسِ زندگی کی کہنگی سے دل اُلجھتا ہے
نئی پوشاک بدلی جب پُرانی ختم کر ڈالی

دلی جذبات کا اظہار بھی مشکل سے ہوتا ہے
مصیبت نے طبیعت کی روانی ختم کر ڈالی

جنوں کس منہ سے اب ہنگامہ آرائی پہ مائل ہو
خرد نے شدّتِ جوشِ نہانی ختم کر ڈالی

اُٹھایا جب قلم، افکار کے دریا بہا ڈالے
زباں کھولی تو ساری خوش بیانی ختم کر ڈالی

نئے طرزِ ادا کی شعر گوئی نے خزاں بن کر
بہارِ گلشنِ حرف و معانی ختم کر ڈالی

مآل اندیش تھے، یارانِ شب کا ساتھ دینا تھا
چراغوں نے سحر تک گُل فشانی ختم کر ڈالی

منوّر میرے افکارِ حسیں پر خندہ زن ہو کر
کسی نے اپنی ساری نکتہ دانی ختم کر ڈالی

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا

راہی معصوم رضا

اس وقت میں اپنے ذاتی غالبؔ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ "ذاتی غالبؔ" کی ترکیب پر آپ خفا نہ ہوں کیونکہ بڑا فن کار الگ الگ ہر آدمی کا بھی ہوتا ہے۔ غالبؔ اس رکشے والے کے بھی ہیں جو سہراب مودی کی فلم "مرزا غالب" میں ثریا یا محمد رفیع کی گائی ہوئی غالبؔ کی غزل کو خاص اسی دُھن میں گانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی آواز میں اتری ہوئی اس غزل سے لطف اندوز ہوتا ہے حالانکہ نہ تو اس کا تلفظ درست ہوتا ہے اور نہ اس کے سُر ہی ٹھیک لگتے ہیں۔ غالبؔ سرورؔ صاحب، مجنوںؔ صاحب اور خورشیدؔ الاسلام صاحب کے بھی ہیں اور عبدالرحمٰن بجنوری کے بھی۔ یہ حضرات کسی میوزک ڈائرکٹر اور پلے بیک گانے والے کی مدد کے بغیر غالبؔ سے لطف اندوز ہوئے ہیں۔ لیکن رکشے والے کے لیے غالبؔ، داغؔ اور حسرتؔ جے پوری عظیم المرتبت ہیں کیونکہ وہ ان سبھی کے اشعار گنگنا کر یا گا کر اپنی تنہائی کا دل بہلاتا ہے۔ لیکن سرورؔ صاحب اور احتشامؔ صاحب غالبؔ اور حسرتؔ جے پوری میں فرق کرتے ہیں۔ یہ لوگ شعر کی داخلی موسیقی کے پرستار ہیں اور شعر سے کئی نہایت ہی سخت اور "غیر شاعرانہ" تقاضے بھی کرتے ہیں۔ میں نہ رکشے والا ہوں اور نہ مولانا الطاف حسین حالیؔ پانی پتی۔ لیکن ہر شاعر پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا۔ چنانچہ اس وقت میں اس غالبؔ کی بات کرنا نہیں چاہتا جو ڈاک اور تار کی وزارت سے اپنے نام کے ٹکٹ نکلوا تا ہے۔ میں اپنے نجی غالبؔ کی بات کرنا چاہتا ہوں جس نے میرے غموں میں میرا ساتھ دیا ہے اور جو میری خوشی میں برابر کا شریک ہے۔ اس غالبؔ کے خد و خال آپ کے غالبؔ کے خد و خال سے مل بھی سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کو قطعاً اجنبی نظر آئے۔

میں ان حضرات سے سخت عاجز ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے شعروں کی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹ جاتی ہے، معنی یکسر اور یک لخت تبدیل ہو جاتے ہیں اور میں آنکھیں پھاڑے ان لفظوں کو دیکھتا رہ جاتا ہوں جو معنوی انقلاب سے بالکل بے پروا نظر آتے ہیں تب جا کر مجھ پر یہ راز کھلا کہ شعر کا لفظ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا کیونکہ لفظ تو بڑی محنت اور بڑے سلیقے کے ساتھ لغات میں اکٹھا کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن لغت پڑھنے میں ذرا لطف نہیں آتا۔ لغت میں الفاظ بالکل مردہ اور سپاٹ نظر آتے ہیں مگر جہاں انھیں کسی تخلیقی فن کار نے چھوا بس ان میں جان پڑ جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ واقف کاران لغت نہ غالبؔ کو کل سمجھ پائے اور نہ آج سمجھ پا رہے ہیں۔ وہ لفظوں کی مدد سے اشعار کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اشعار سے لطف اندوز ہونا نہیں چاہتے۔ اسی لیے ان کے یہاں صحت الفاظ کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن زبان کو شعر سمجھ لینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے۔ زبان تو صرف ایک ذریعہ ہے، صرف ایک راستہ ہے جس پر شعر سفر کرتا ہے اور اسی لیے زبان کے تقاضوں کو شعری تقاضوں پر ترجیح دینا درست نہیں ہے۔ چنانچہ

اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں کہ 'غلطی' اردو کی لفظ ہے اس لیے اُس کی جمع 'غلطیاں' یا 'غلطیوں' بنے گی 'غلطی ہا' نہیں۔ غالبؔ ہمیں جمع بنانے کے قاعدے نہیں بتا رہے ہیں۔ اصل بات یہ نہیں یہ ہے کہ ع

لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

شاعر لفظ کو لامحدود بنا کر استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے کوئی بڑا شاعر مومنؔ کی طرح لفظی بازی گری سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ تو میرؔ کی طرح یہ کہتا ملے گا۔

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں، کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

یا وہ اقبالؔ کی طرح یہ کہتا ملے گا۔ ؎

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلنشیں صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

یا پھر وہ غالبؔ کی طرح کندھے سکوڑ کر نہایت حقارت سے یہ کہتا نظر آئے گا۔ ؎

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس لیے قواعد زبان کا ڈنکا پیٹنے سے کام نہیں چلے گا کیونکہ اگر آپ 'غلطی' 'غلطیوں' اور 'غلطی ہا' کے چکر میں پھنس گئے تو دوسرے مصرعے تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا۔

لیکن میں یہیں یہ اعتراف کر لینا چاہتا ہوں کہ "ان تہایت ذاتی ظلمیت" تجھے شعر اپر لکھنا جان جوکھم کا کام ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے میرا غالبؔ آپ کے غالبؔ سے اتنا ہی مختلف ہو جتنا مختلف آپ کا غالبؔ میرے غالبؔ سے ہے! کیونکہ خود بہ قول غالبؔ:

"گفتار موزوں کہ آں را شعر نامند، در ہر دل جائے دیگر، وہ در ہر دیدہ رنگے دیگر، وسخن سرایاں را ہر زمزمہ جنبشے دیگر وہ ہر ساز آہنگے دیگر دارد۔"

اس لیے اگر ان کا کوئی شعر مجھے کچھ کمیونیکیٹ کرے اور آپ کو کچھ تو مجھ سے خفا نہ ہو جائیے۔ آپ چاہیں تو مجھے کم فہم سمجھ کر مطمئن یا خوش یا رنجیدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور عرض کر دوں کہ غالبؔ چیستاں گو نہیں تھے کہ ان کے معمہ کا ایک ہی صحیح حل ہو۔ وہ "صنعتی" یا "رعایتی" بھی نہیں تھے کہ کوئی ان پہلوؤں کو دیکھ سکے اور کوئی نہ دیکھ سکے۔ ان بے چارے نے تو خود کہہ دیا تھا کہ وہ "جادۂ صنائع" کے "آبلہ پا" نہیں ہیں۔ انھیں نے یہ بھی کہا تھا کہ "اسد اور شیر اور بت اور خدا اور جفا اور وفا" یہ میری طرزِ گفتار نہیں۔" اور چونکہ یہ ان کی طرزِ گفتار نہیں اسی لیے ان کی شاعری خود ان کے عہد میں وہ تمام باتیں کمیونیکیٹ نہ کر سکی جو اس میں تھیں۔ اس زمانے میں تو شعر صرف ذریعۂ عزت اور ذریعۂ معاش ہو کر رہ گیا تھا۔ غالبؔ نے بھی اسے ذریعۂ عزت اور ذریعۂ معاش بنایا، حالانکہ وہ کہتے یہی رہے۔ ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

لیکن ظاہر ہے کہ غالبؔ مثال کے طور پر سپہ گری اور شاعری میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو "پیشۂ آبا" کو ترک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انھوں نے تو سپہ گری کو اس قابل بھی نہ جانا کہ میرؔ کی طرح گھر سے سیف لگا کر نکلتے۔ لیکن غالبؔ کے لیے شاعری ذریعۂ عزت اور ذریعۂ معاش ہی نہیں تھی۔ چنانچہ جب میسور کے شہزادے نے دیوان کی قیمت پوچھی تو لوٹتی ڈاک سے خط کو تار سمجھ کر جواب دیا گیا۔ "سخن درم۔ نہ سخن فروشم"۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بات اسی غالبؔ کی ہے جس نے ایک خط میں یہ لکھا: "جو دوسروں کو بھیک مانگتا نہ دیکھ سکے اور خود در در بھیک مانگے وہ میں ہوں۔" —— ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ پہلا وا لاخط اس غالبؔ کا ہے جو زمانے کے ہاتھوں مارا گیا لیکن جس کا بانکپن پھر بھی قائم رہا۔ ع

مار از مانے نے اسد اللہ خاں تمھیں

یہ جو اسدؔ کی جگہ اسد اللہ خاں نظم کیا گیا ہے عجزِ کلام کی علامت نہیں ہے کہ مصرعہ پورا نہیں ہو رہا تھا تو "اللہ خاں" بڑھا دیا گیا! جی نہیں یہ شاعر کی شخصیت ہے۔ دوسرا وا لاخط اس غالبؔ کا نہیں بلکہ اُس غالبؔ کا ہے جس نے عید والی مثنوی صرف اس لیے لکھی تھی کہ "بیس آدمیوں کی روٹی چلانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔" یہی وہ غالبؔ ہے جس نے اپنے دوست اور محسن آزردہ کی بیوہ کی درخواست کے مقابلے میں نواب رام پور کے حضور میں اپنی درخواست گزاردی تھی یہی وہ غالبؔ ہے جو اپنی غزلوں تک میں یہ لکھتا ہے۔ ع

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

یہی وہ غالب ہے جو صاحب کے کفِ دست پر چکنی ڈلی دیکھ کر پھسل گیا تھا اور جسے لاٹ صاحب کے دربار میں شرکت کا بڑا ارمان تھا۔ مجھے اس غالب میں کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ اس غالب کی شاعری تو وہ آدھی شاعری ہے جو غالب ہی کے قول کے مطابق نااہلوں کی تعریف میں ضائع ہو گئی۔ اس شاعری کی دنیا تو لغت کے کسی لفظ کی طرح محدود اور بے معنی ہے۔ لیکن جس بیدادگر کو میں پوجتا ہوں وہ سخن ور ہے، سخن فروش نہیں ہے۔ اس کی دنیا کی وسعت کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے :

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

جنت نہ کند چارۂ افسردگئ دل — تعمیر بہ اندازۂ ویرانئ ما نیست

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

سوال یہ ہے کہ غالب کو وسعت کا یہ تصور کہاں سے ملا۔ ظاہر ہے کہ اپنی دنیا کی تنگی سے ملا۔ ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ — صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا — دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

اس منزل پر تھوڑی دیر کے لیے رک جائیے کیونکہ غالب کی عظمت کا سراغ یہیں سے ملے گا۔

غالب کے ایک طرف ایک سورج غروب ہو رہا تھا اور دوسری طرف ایک سورج طلوع۔ غالب کی زندگی انھیں دونوں سورجوں کو دیکھنے میں گزر گئی۔ ان کی شاعری میں یہ دونوں آفتاب موجود ہیں۔ آفتابِ مضمحل بھی اور آفتابِ تازہ بھی۔ غالب نے ایک کا ماتم کیا اور دوسرے کا استقبال۔ ؎

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ ؎

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

ایک طبقہ کا زوال زندگی کا زوال نہیں ہے۔ اسی لیے غالب اپنے آپ کو شاہِ دلی کے مصاحبین کی صف میں بٹھلانا نہیں چاہتے۔ چنانچہ انھوں نے ایک "گلشن ناآفریدہ" کا ذکر چھیڑ دیا۔ ؎

ہوں گرمئ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

یہی "نشاطِ تصور" انھیں ان کے ہم عصروں سے بلند کرتا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں کوئی زندگی سے اتنی شدید محبت نہ کر سکا جتنی غالب نے کی۔ ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ غم کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

غالب نے زندگی بھر اپنے اس احساسِ جمال کی حفاظت کی۔ ٹھوکریں کھاتے رہے، قرض کی پیتے رہے، لیکن قصیدۂ حسن و حیات لکھتے رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھیں اپنی ذاتی زندگی کی شکستوں کا احساس نہ رہا ہو۔ نہیں۔ یہ احساس تھا اور بہت شدید تھا۔ ایک بار تو وہ جھلا کر یہاں تک کہہ گئے کہ۔ ع

غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

اور ایک خط میں لکھا :

"میاں کیا باتیں کرتے ہو۔ کتابیں کہاں چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔"

ایک اور خط میں یہ لکھا کہ :

"کیا معلوم ہولی اب کب ہوتی ہے۔ آگے تو پھاگن میں ہوا کرتی تھی۔"

لیکن بہ قول علی سردار جعفری انھوں نے "طنز و ظرافت کی ہتھیلی میں آنسوؤں کو یوں چھپانا کہ ہتھیلی کے بھیگے ہوئے سوراخوں پر بے شمار مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا گمان ہونے لگا۔" غالب کو ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ اس دلی کا چہرہ مسخ ہونے لگا تھا جو صرف ایک بستی نہیں تھی بلکہ ایک تہذیب بھی تھی۔ سلطنت برائے نام رہ گئی تھی لیکن رہ گئی تھی۔ سلطنت کا یہی رہ جانا دلی کا المیہ ہے۔ سلطنت چونکہ تھی اس لیے وہ تمام قدریں جو سلطنت سے وابستہ ہوتی ہیں عصائے سلیمان کی طرح کھڑی تھیں اور لوگوں کو یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ دلی مر چکی ہے۔ یہ نیم جان دلی بھی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ شہر اور قلعہ۔ بہادر شاہ

بہر حال ظلّ اللہ اور صاحبقران ابنِ صاحبقران تھے۔ قلعہ کی دیوار کا پتھر اب بھی اتنا ہی سرخ تھا۔ دیوانِ خاص کا مرمر اب بھی اتنا ہی شفاف تھا۔ لیکن قلعہ والوں کو یہ معلوم تھا کہ ان کی گزر بسر انگریزی پنشن اور مکانوں کے کرایہ پر ہو رہی ہے! جب یہ حقیقت ادب میں ظاہر ہوئی تو یہ نظر آیا کہ غالبؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ جیسے شعرا کی موجودگی میں قلعہ کو میاں ابراہیم ذوقؔ نے فتح کر لیا ــــــ یعنی قلعہ ہیئتِ محض کے قبضے میں تھا۔ چونکہ قلعہ کے پاس ظاہر داری کے سوا کچھ اور تھا ہی نہیں اس لیے ذوقؔ جو تکمیلِ ہیئت کی علامت ہیں، استادِ شاہ بن گئے! اور دوسری طرف چونکہ قلعہ نہیں تھا اس لیے وہاں بہ یک وقت شیفتہؔ کی سادہ، غالبؔ کی فکر انگیز اور مومنؔ کی چیستانی شاعری وجود میں آئی۔ چنانچہ شہر کو بھی ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک طرف غالبؔ اور دوسری طرف باقی تمام شعرا۔ غالبؔ تنہا اس لیے نظر آ رہے ہیں کہ انھوں نے امروز سے بلند ہو کر فردا کی طرف دیکھنے کا حوصلہ کیا۔ دلی کے دوسرے شعرا کے پاس زبان کے علاوہ کوئی اور قابلِ قدر چیز نہ تھی۔ اس لیے وہ مختلف زاویوں سے زبان ہی کی طرف متوجہ رہے لیکن جب ہی زبان مروجہ شعری ہیئتوں کے ساتھ غالبؔ کے سامنے آئی تو غالبؔ نے شکوہ کیا : ؎

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

یہی وہ منزل ہے جہاں سے غالبؔ کا کلام ان کے ہم عصروں کے لیے ناقابلِ فہم ہونے لگتا ہے، حالانکہ غالبؔ اجنبی الفاظ استعمال نہیں کر رہے تھے۔ الفاظ تو وہی تھے۔ انھوں نے تو صرف اتنا کیا کہ محاورہ کا خول اتار کر لفظ کو پھر استعارہ بنا لیا۔

ابتدا کی شاعری ایک اندازِ بیان کی تلاش ہے۔ اس راستے میں غالبؔ نے کئی بت توڑے اور کئی دیواریں گرائیں۔ وہ ایک ایک لفظ ٹھوک کر اور سجا کر دیکھ لینے کے بعد ہی استعمال کرتے تھے کیونکہ

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

غالبؔ نے ان محاوروں کو تقریباً نظر انداز کر دیا جو سرد و گرمِ زمانہ تحلیل کر کے ان کے پاس آئے تھے۔ وہ استعاروں کی نازک اور وسیع دنیا میں تھے۔ غزل کا اسلوب دل کی آنچ برداشت کر سکتا ہے لیکن فکر کی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے غزل کے اسلوب میں توسیع کی۔ یہ قول آلِ احمد سرور کا ہے: "بیدلؔ کے رنگ میں صرف معنی آفرینی اور مشکل پسندی نہیں۔ یہ ایک سیلانی کی نئے دشت و در کی تلاش بھی ہے"۔ دورِ آخر کی غزلیں اسی قول کی صداقت پر گواہ ہیں۔ دورِ آخر میں جب غالبؔ نے بڑی حد تک روایتی اسلوب اپنا لیا تو ان کی شاعری میں فکری عناصر کم ہو گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی باغی شخصیت وہاں بھی جلوہ گری سے باز نہیں آئی۔ لیکن مجموعی طور پر دورِ آخر کی غزلیں سلسلۂ غزلِ اردو ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ کہاں یہ لہجہ اور یہ بات کہ :

شوخیٔ حسن و عشق ہے آئینہ دارِ ہم دگر
خار کو بے نیام جان، ہم کو برہنہ پا سمجھ

اور

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

اور کہاں یہ انداز کہ :

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

وغیرہ وغیرہ۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ دورِ آخر کی شاعری قابلِ احترام نہیں۔ قابلِ احترام تو ہے کیونکہ اسی دور میں غالبؔ نے اپنا زنگا رنگ تجربوں کا عطر کشید کیا ہے۔ لیکن اب 'مسیحا' وہی 'مسیحا' ہے جسے ہم صدیوں سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں! اب لفظ رقص نہیں کرتے، تصویریں متحرک نہیں ہیں! خیالوں میں دریاؤں کا شور نہیں ہے۔ اسی لیے مجھے دورِ آخر کے کلام میں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہاں غالبؔ تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے اب وہ فردوس میں دوزخ کو ملانے کی بات نہیں کرتے ورنہ ہم جانتے ہیں کہ غالبؔ نے یہ حوصلہ کیا تھا تاکہ ان کی جنت کے کندھوں پر لدے ہوئے آسمان اور جھکی

پڑتی ہوئی دیواروں سے نجات مل جائے۔ میری باتوں پر یقین نہ آرہا ہو تو غالب سے پوچھ لیجیے۔ جواب آئے گا۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آئے

یہ آبلہ پا غالب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن زندگی کی یہ قیمت دینا آسان نہیں ہے۔ اور غالب نے زندگی کو انھیں داموں پر لیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جہان لامحدود بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ لیلیٰ تو خیر پابند محمل ہے، مگر ہم آپ جب چاہیں اس دنیا میں داخل ہو سکتے ہیں۔

لیکن اسی عظیم کائنات کی تخلیق نے غالب کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا۔ حیات مختصر، کائناتِ وسیع۔ اس تضاد نے ان کی شاعری میں سراب و دریا کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ جینے سے ان کا جی نہیں بھرتا۔ پینے سے انھیں تسکین نہیں ہوتی۔ ع

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ ہوس نہیں ہے۔ حوصلہ ہے۔ اور یہ حوصلہ مقدس ہے۔

کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ
بہ رنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

جب تک آنکھوں میں روشنی ہے کوئی دیکھنے سے باز کیسے آ جائے کیونکہ یہ عالم دوبارہ نیست! زندگی کی کمی، کائنات کی وسعت اور ہوسِ دید نے غالب کی شاعری میں ایک عجیب و غریب حرکت پیدا کر دی ہے۔ غالب ٹھہری ہوئی تصویریں نہیں بناتے، چاہے وہ کتنی ہی خوب صورت اور مکمل کیوں نہ ہوں۔ غالب سے پہلے اسی ٹھہری ہوئی مکمل مصوری کا رواج تھا جیسے:

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اُن سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یہ ایک مکمل اور بے حد دل کش تصویر ہے۔ رنگوں کے تناسب اور لکیروں کے امتزاج کا جواب نہیں لیکن یہ ایک SNAP SHOT ہے جس میں رنگ بھر دیے گئے ہیں۔ اس میں ایک لمحہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس لیے گزر جانے والے اور آنے والے لمحوں سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔

اس شعر کے منظر میں کوئی تبدیلی یا ارتقا ممکن نہیں۔ لیکن غالب ایسی تصویریں نہیں بناتے۔ وہ متحرک تصویریں بناتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کو گرفتار نہیں کرتے بلکہ اسی لمحے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ چنانچہ منظر تبدیل ہوتا ہے لیکن یہ تبدیلی منظر کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہوتی!

نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
خود بہ خود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

پینس پہ گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس گل بدن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد میں کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

بہ رشکانِ نگرشیہ عاشق ہو دیکھا چاہیے — کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار — گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

میں بھی معذورِ جنوں ہوں، اسدؔ، اے خانہ خراب
پیشوا لینے مجھے گھر سے بیاباں نکلا

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

خوابِ جمعیتِ محمل ہے پریشاں مجھ سے — رگِ بستر کو ملی شوخیٔ مژگاں مجھ سے

وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے کوئی شعر نامکمل نہیں۔ ہر تصویر مکمل ہے۔ لیکن مناظر متحرک ہیں۔ یہاں یہ بات نہیں کہ غبار بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا۔ بستر کی شکن کو رگِ بستر کہہ دینے سے دنیا ہی بدل جاتی ہے کیونکہ اب وہ شکن کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذرا بستر کو جھاڑنا چاہیے۔ اور غالبؔ نے تو رگِ بستر کہنے پر بھی اکتفا نہ کی انھوں نے تو رگِ بستر کو بھی شوخیِ مژگاں دے دی۔ چنانچہ بستر آنکھ بن گیا۔ یعنی تین آنکھیں خواب دیکھنے میں مصروف ہیں۔ 'شوخیِ مژگاں' مسلسل حرکت اور سعیِ تلاشِ دید' کی علامت ہے۔ یہ تیز رفتاری' یہ چلتی پھرتی تصویریں' غالبؔ کو ان کے ہم عصروں ہی سے نہیں بلکہ گزشتہ ادوار کے عظیم المرتبت شعرا سے بھی بلند کر دیتی ہے۔ جنوں کے استقبال کے لیے صرف دیوانِ غالب میں صحرا اپنے گھر سے باہر تک آتا ہے! اور غالبؔ ہی کے یہاں وحشت کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ع

اس سال کے شمار کو برق آفتاب ہے،

اس جہانِ متحرک کے لیے غزل کا بندھا ٹکا سانچہ ناکافی تھا۔ چنانچہ کمیونیکیشن کی دشواریاں سامنے آئیں۔ غالبؔ نے لفظوں کے کندھوں سے رعایتوں اور صنعتوں کا بوجھ اتارنے کی بھر سک کوشش کی۔ لیکن یہ کام بہت آسان نہیں تھا کیونکہ ان کے فکر کی آنچ لفظوں کو پگھلائے دے رہی تھی ؎

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں   کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے   آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اسی لیے مطالعہ غالب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ صورت حال دراصل یہ نہیں کہ :۔

جلا تھا جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا   کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

کیونکہ لفظوں کی راکھ کریدے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔

غالبؔ نے چونکہ روایت شکنی کی ہے اس لیے تفہیم غالبؔ کے لیے روایت شکنی ضروری ہے۔ خود غالبؔ بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ:

با من کہ عاشقم، سخن از ننگ نام چیست
در امرِ خاص حجتِ دستورِ عام چیست

چشم بے خونِ دل و دل تہی از جوشش نگاہ
بہ زباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند

بیگانۂ رسومِ جہاں ہے مذاقِ عشق
طرزِ جدیدِ ظلم کچھ ایجاد کیجیے

اور آخر میں وہ مشہور شعر بھی آتا ہے ؎

عشق و مزدوریِ عشرت گہہِ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامیِ فرہاد نہیں

تھوڑی دیر کے لیے اس فرہاد کو محقق اور ماہرِ قواعدِ زبان فرض کر لیجیے۔ تفہیمِ غالبؔ کے سلسلے میں یہ خضر صفت بزرگ کام نہیں آتے کیوں کہ ع کیا کیا خضر نے سکندر سے اور غالبؔ کو تو آبِ حیات میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں ہے۔ وہ تو زہرِ حیات کے رسیا ہیں۔ اسی لیے محققین اور ماہرینِ قواعدِ اردو حصہ اول اور حصہ دوم کو غالبؔ ہی کا ایک شعر سنا کر آگے بڑھ جائیے ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں   جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

تفہیمِ شعر کے راستے پر کوئی کسی کے ساتھ نہیں جاتا کیونکہ ہر آدمی کی اپنی وضع ہوتی ہے' اپنا مزاج ہوتا ہے' پسند و ناپسند کے اپنے قوانین ہوتے ہیں اور اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ فنِ لطیف دو آدمیوں کے اجتماع کو مجمع سمجھتا ہے اور آہٹ سنتے ہی بیر بہوٹی کی طرح اپنے مخملی غلاف میں سمٹ جاتا ہے۔ چنانچہ ساحوں کے ہاتھ صرف مردہ الفاظ آتے ہیں جن پر ماہ و سال کی گرد کی تہیں ہوتی ہیں۔

تفہیمِ شعر کی منزل پر ہر آدمی کو تنہا جانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شارحین اچھے لگتے لگتے یک لخت نہایت بورنگ اور بوڑھے پھوس نظر آنے لگتے ہیں کیوں کہ وہ ہمارے سر اپنا تجربہ منڈھنے کی فکر میں ہوتے ہیں! — اور یوں شرحیں پیروڈی بن جاتی ہیں! شعر کپڑے کا تھان نہیں ہوتا کہ اس کی تہیں کھولی جائیں۔ شعر ایک اکائی ہوتا ہے۔ اس طرح خود غالبؔ نے

بھی ایک جگہ اشارہ کیا ہے جس کی طرف ہم نے زیادہ دھیان نہیں دیا ہے ؎

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب　　حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

غالب نے اپنے خیالات کے ساتھ کبھی وہ سلوک نہیں کیا جو حمزۂ صاحبقران اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ تصورات غالب کے دشمن نہیں محبوب ہیں، کیونکہ جس زمانے میں وہ زندگی سے پیار کر رہے تھے اس زمانے میں تصور کے علاوہ کوئی مثبت قدر تھی ہی نہیں اور انھوں نے اس تصوّر کے سہارے شامِ دلی کی شفق کی دیواروں کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے ؎

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا　　وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غالب نے اس حسرتِ تعمیر کو جراتِ تعمیر بنا لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام دشوار تھا۔ لیکن غالب نے ہمت نہ ہاری ؎

یارِ تشنگیِ شوق کے مضموں چاہے　　ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

دریا کو ساحل باندھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ کسی ذوقؔ یا مومنؔ ——— یا میر تقی میرؔ تک کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ میرؔ تک میں اس کے دامن کو حریفانہ کھینچنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ تو اس کے ساعدِ سیمیں ہاتھ میں لے کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ دریا کو ساحل باندھنے کا حوصلہ صرف غالب نے کیا اور انھوں نے اس حوصلے کی بھاری قیمت ادا کی۔ ہوا یہ کہ انگلیاں فگار ہو گئیں اور نامہ خوں چکاں ہو گیا۔ لیکن اس صورتِ حال نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا اور غالب نے جھوم کر مبارز طلبی کی ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں　　ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ایسی بات نہیں کہ یہ جرأت ان سے انجانے میں سرزد ہو گئی ہو۔ جی نہیں۔ انھیں خوب معلوم تھا اور اسی لیے وہ مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ یہ کہتے ہوئے ملتے ہیں ؎

ہر چند سبک سیر ہوئے بت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس　　ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستم

لیکن

میں اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

چنانچہ یہ آفت کا ٹکڑا بے خطر آتشِ نمرود میں پھاند پڑا ؎

نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن　　ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے　　کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں　　اگر یہی عرقِ فتنہ ہے، مکرر کھینچ

بے خودی فرمانروائے حیرت آبادِ جنوں　　زخم دوزی جرم، پیراہن دریدن منع ہے

بچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے　　وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کیوں کہ اصل چیز آرزو ہے ع نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے

شاعر کا کام اپنے عہد کے لیے خواب فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ اسے ہمارے زیادہ اثبات بہار میں دلچسپی ہوتی ہے اور ان مواقع پر وہ اپنی ذاتی زندگی کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا مرثیہ خواں نہیں رہ جاتا کیونکہ اس منزل پر وہ فرد نہیں رہ جاتا بلکہ سماج بن جاتا ہے۔ ورنہ سچ پوچھیے تو اس کا عالم یہ ہے:

نصیب ہو جسے روزِ سیاہ میرا سا　　وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

نہ گفتہ ام ستم از جانبِ خداست ولے　　خدا بہ عہدِ تو بر خلق مہرباں نہ شود

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی　　زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشگال
ہے نظر کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

رات ذرا بھی مدد نہیں کرتی۔ ہر طرف سخت اندھیرا ہے۔ لیکن غالب میں اپنے ذاتی غموں سے بلند ہو جانے کی سکت ہے۔ اس لیے وہ یہ کہہ سکے کہ ؎

کیوں کر نہ کھلے کہ ہوا ہے بہار کی

اور وہ اپنے آپ کو نظر انداز کر کے تشنگیٔ شوق کے مضمون باندھتے رہے۔ ایک زبان ناکافی معلوم ہوئی تو انھوں نے کئی اور زبانیں پیدا کرلیں ؎

جگر سے ٹوٹے ہوئے ہو گئی ہے سناں پیدا　　دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

اسی زبانِ زخم سے انھوں نے انسان کا رزمیہ لکھا اور اس نہ مٹنے والی پیاس کا قصیدہ لکھا جس کا ایک نام زندگی بھی ہے۔

دادہ بر تشنگیِ شوق گواہی غالب　　دہنِ ما بہ زبانِ خطِ پیمانۂ ما

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ　　لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

غالب نے جس چیز کو حرص کہا ہے اس پر ہزار پرہیزگاریاں نثار کیونکہ یہ حرص ایک مثبت طاقت ہے اور یہی طاقت انھیں زندگی سے بد دل نہیں ہونے دیتی ؎

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

گرفتہ ام ز کوئے تو آساں نہ رفتہ ام　　ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد

یہی وہ منزل ہے جہاں تصور کی ضرورت پیش آتی ہے اور تصور فرار نہیں بلکہ جہدِ حیات کی علامت بن جاتا ہے ؎

اچھلا ہے سرِ انگشت حنائی کا تصور　　دل میں نظر آئی تو ہے اک بوند لہو کی

یہ بیداریٔ وصال ہی کی طرح فراق کو بھی ایک مثبت رویہ بنا دیتی ہے ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد　　ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

لیکن شاعر مافوق البشر نہیں ہے۔ اس لیے کبھی کبھی یہ بلک بھی جاتا ہے، کیونکہ شاعر تمام عام آدمیوں کی طرح ایک عام آدمی ہے ؎

درازیٔ شبِ ہجراں ز حد گذشت، بیا　　فدائے روئے تو عمرِ ہزار سالۂ ما

لیکن اسے ہمت ہار جانے کی منزل سمجھ لینا درست نہیں ہے۔ یہ ہجر کی شدت کے اظہار سے زیادہ شاعر کے انسان ہونے کا مظہر ہے اس قسم کے اشعار جب دیوان سے الگ کر کے پڑھے جاتے ہیں تو قاری دھوکا کھا جاتا ہے اور غالب قنوطی نظر آنے لگتے ہیں — جب کہ زندگی اور اس کی پیاس کا شاعر سب کچھ ہو سکتا ہے قنوطی نہیں ہو سکتا۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ ؎

کس زبانِ مرا نہ می فہمد　　از عزیزاں چہ التماس کنم

چنانچہ میں غالب میں قنوطیت اور گرامر کی غلطیاں نکالنے والوں کو غالب ہی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں ؎

خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر　　پھرے ہم دربدر ناقبیلی سے





ساغر مہدی

پنڈت دیا شنکر نسیمؔ سے ایک صاحب نے دریافت کیا: "کیوں پنڈت جی! 'گلزارِ نسیم' میں آپ نے ہندو ہو کر حمد و نعت سے ابتدا کی۔ رشی، مُنی اور دیوتاؤں کا ذکر تک نہ کیا؟"

پنڈت دیا شنکر نسیمؔ نے سنجیدہ لہجے میں فرمایا: "میں نے تو سب سے پہلے شعر ہی میں ہَا کا متبرک نام لیا ہے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری"

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور فیض الحسن فیضؔ سہارن پوری دلّی میں اِک رات کسی مشاعرے سے لوٹ رہے تھے۔ ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک گدھا راستہ روکے کھڑا تھا۔ فیض الحسن فیضؔ سہارن پوری نے از راہِ مذاق غالبؔ سے کہا: "مرزا صاحب دلّی میں گدھے بہت ہیں۔" غالبؔ نے برجستہ فرمایا: "جی ہاں! باہر سے آجاتے ہیں۔"

میر انیسؔ کئی روز سے بخار میں مبتلا تھے۔ احباب اور قدر دانوں کی عیادت و مزاج پُرسی کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک روز ایک صاحب عیادت کو آئے۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "میر صاحب بخار تو اب بہت خفیف ہو گیا ہے۔" میر انیسؔ نے فرمایا: "جی ہاں! میری ناتوانی دیکھ کر ایسا خفیف ہوا ہے کہ اب شاید مُنھ نہ دکھائے۔"

فصیح الملک حضرت داغؔ نماز میں مصروف تھے۔ ایک صاحب ملاقات کو آئے۔ مگر شاید حضرت داغؔ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر واپس لوٹنا چاہا۔ حضرت داغؔ نے سلام پھیر کر پوچھا۔ "کیوں حضرت آپ لوٹے کہاں جا رہے ہیں؟"۔ "حضور نماز پڑھ رہے تھے۔ اس لیے واپس جا رہا تھا۔"

داغؔ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا۔"

منیرؔ شکوہ آبادی حقّے کے بے انتہا شائق تھے۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب موصوف کالے پانی میں تھے۔ برسات کا زمانہ، شدید گرمی اور پھر تمباکو کی نایابی۔ دست یاب بھی ہوا تو بہت گھٹیا قسم کا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر ایک رباعی لکھی اور اربابِ حل و عقد کی خدمت میں پیش کی:

تمباکو بھی ہوا ہے کڑوا ہم سے | رُک رُک کے بڑھتا ہے حقّا ہم سے
برسات میں کس غضب کی گرمی ہے منیرؔ | جھلوانے لگی آگ بھی پنکھا ہم سے

اودھ پنچ کے عروج کا زمانہ تھا۔ حضرت اکبرؔ الٰہ آبادی لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ ایک شام اساتذۂ لکھنؤ ملاقات کو آئے۔ اُنھوں نے (اساتذۂ لکھنؤ) اُس دور کے مخصوص رنگ میں غزلیں سُنائیں۔ اکبرؔ الٰہ آبادی اخلاقاً داد بھی دیتے رہے۔ مگر ان کی طبیعت کچھ بے مزہ ہو گئی۔ وہی زلف و کمر اور گُل و بُلبل کی فرسودہ شاعری۔ آخر اُن حضرات نے اکبرؔ سے کلام سننے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت اکبرؔ نے معذرت چاہی اور فوراً ایک شعر موزوں فرمایا:

تم سے اُستادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لیے دشوار ہے

میر انیس سے کچھ حضرات نے ایک روز کہا: "میر صاحب! مرزا دبیر نے ایک ایسا مرثیہ تصنیف فرمایا ہے کہ سارے مرثیے میں کہیں نقطہ نہیں آیا۔" میر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "تو یوں کہیے کہ سراپا مہملہ ہے۔"

مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنے چند مخصوص احباب کے ہمراہ احاطۂ کالے خاں والے مکان کی بیٹھک میں تشریف فرما تھے اور کچھ اہم مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب وارد ہوئے اور بے انتہا عجلت کا اظہار کرتے ہوئے بولے: "حضرت! میرا اور میرے والد کا سجع یا رباعی کہہ دیجیے۔" مرزا صاحب اُس وقت موڈ میں نہ تھے، اور احباب کے خیال سے بھی ان حضرت کو ٹالنا چاہا مگر وہ بضد ہو گئے۔ ان کے شدید اصرار پر فرمایا: "اچھا! نام بتائیے۔" اُنھوں نے کہا: "میرا نام غلام قنبر، باپ کا نام غلام حیدر۔" مرزا غالب نے برجستہ فرمایا:

"من غلام قنبرم، قنبر غلام حیدر است"

فتح الملک بہادر سے ملاقات کی غرض سے ایک بار مرزا غالب تشریف لے گئے۔ جب غلام گردش میں پہنچے تو چوبدار نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ تشریف لائے ہیں۔ صاحب عالم کسی کام میں مصروف تھے۔ فوراً نہ بلا سکے۔ مرزا غالب وہیں انتظار میں ٹہلتے رہے۔ چند لمحوں میں صاحب عالم نے چوبدار کو آواز دیتے ہوئے فرمایا: "دیکھو! مرزا صاحب کہاں ہیں؟" مرزا غالب وہیں سے پکارے: "غلام گردش میں ہے۔"

مفتی صدرالدین آزردہ مرزا صاحب سے کچھ کشیدہ تھے۔ اتفاق سے اُسی عرصے میں غالب نے اپنے تمام احباب کی دعوت کی اور دعوت نامے جاری کیے۔ مفتی صدرالدین آزردہ کو بھی دعوت نامہ بھیجا اور پھر احتیاطاً خود اُن کو مدعو کرنے گئے۔ آزردہ نے کہا: "دعوت نامہ تو آپ بھیج چکے ہیں پھر خود کیوں زحمت فرمائی؟" مرزا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: "اس لیے کہ آپ آزردہ ہیں۔"

آخری عمر میں مرزا غالب گراں گوشی میں مبتلا تھے۔ چند احباب نے کہا: "حضور اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟" فرمایا: "دو وجہوں سے، ایک یہ کہ جیتے جی اس دنیا میں بہشتی بن گیا۔ دوسرے مرنے کے بعد جب نکیرین سوال کریں گے 'مَن رَبُّکَ' 'مَن نَبِیُّکَ' تو عذر گراں گوشی سہل چھٹکارا دلا دے گی۔"

حضرت اکبر الہ آبادی شدید آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ اس عرصے میں جس قدر رسائل و جرائد اور تازہ مطبوعات آئیں اُن میں سے کوئی بھی زیر مطالعہ نہ آ سکی۔ ادھر مدیران رسائل اور مصنفین کا شدید تقاضہ کہ اپنی رائے بھیجیے۔ آخر مجبوراً ایک قطعہ کہا اور تمام حضرات کو اس کی نقلیں بھجوا دیں:

کونسل سے ہر طرح کا قانون آ رہا ہے — مطبع سے ہر طرح کا مضمون آ رہا ہے
لیکن پڑھوں میں کیوں کر آنکھوں کی یہ حالت — اشک آ رہے تھے پہلے اب خون آ رہا ہے

جارج برنارڈ شا کے ایک مہمان نے جو اُن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے پوچھا کہ "یہاں کمرے میں کوئی گلدستہ نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا آپ پھولوں کو بہت پسند کرتے ہوں گے۔" شا نے برجستہ جواب دیا: "میں واقعی پھولوں سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے بچے بھی بے حد انتہا پیارے ہیں۔ مگر میں اُن کے سروں کو کاٹ کر گھر کی دیواریں نہیں سجاتا۔"

مولانا حسرت موہانی کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ یکے بعد دیگرے شعرا اپنا کلام سنا رہے تھے کہ ایک شاعر نے جب غزل شروع کی تو سامعین کی صف سے ایک آواز اُبھری: "جناب صدر! یہ غزل میری ہے۔" مولانا حسرت موہانی نے اسے آداب محفل کے خلاف تصور کرتے ہوئے معترض سے خاموش رہنے کی درخ

لہ مہملہ (ح) غیر منقوطہ

کی۔ شاعر صاحب غزل پڑھتے رہے اور اپنے ترنم کے ذریعے داد و فریاد وصول کرتے رہے۔ جیسے ہی غزل تمام ہوئی۔ ایک اور' ایک اور ــــــ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ شاعر مذکور نے سامعین اور صدر سے معذرت چاہتے ہوئے کہا: "حضرات! اب میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی ایک اور جلسے میں تلاوتِ کلام مجید کے لیے پہنچنا ہے۔" مولانا حسرت موہانی نے مسکراتے ہوئے پوچھا: "آپ قاری بھی ہیں۔ تو یوں کہیے کہ جب اللہ پاک کا کلام آپ سے محفوظ نہیں تو بندوں کا کلام کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔"

ایک مرتبہ جگر مراد آبادی ایک شہر میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک سیاسی جماعت والوں نے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جگر صاحب نے شرکت کی اور ایک غزل سنائی:

"پھول کھلے ہیں گلشن گلشن — لیکن اپنا اپنا دامن"

جب غزل سنا چکے تو جماعت کے سکریٹری نے جگر صاحب سے کہا: "حضور! کچھ ہماری جماعت کے بارے میں بھی کہا آپ نے"۔ جگر صاحب مسکراتے ہوئے بولے: "بھئی! اسی غزل کا ایک شعر اور سن لیجیے جس سے میرے نظریات کی وضاحت ہو جائے گی ؎

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن — جھاڑ کے اُٹھے اپنا دامن

مغربی تہذیب اور نئی روشنی کے موضوع پر ایک مذاکرے میں سرسید احمد خاں اور مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ اکبر الہ آبادی بھی شریک تھے۔ طبیعت میں مغربی تہذیب سے عام بیزاری کا جذبہ سر اُٹھا رہا تھا اور چاہتے تھے کہ اس موضوع کی بارے میں کچھ نہ کہیں، لیکن لوگوں کے اصرار پر چار مصرع ارشاد فرمائے:

چالیس سال سے ہے نئی روشنی کا دَور — کیونکر اسے کہوں کہ سراسر فضول ہے
البتہ ایک بات کہوں گا دبی زبان — گو خوشنما بہت ہے مگر بے اصول ہے

نواب صاحب لوہارو غالب کے مربّی اور محسن تھے۔ ریاست سے ان کا وظیفہ بھی مقرر تھا۔ غالب اپنے مربّی سے ملنے اکثر لوہارو جایا کرتے تھے۔ سید اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی ناقل ہیں کہ ایک مرتبہ جب غالب نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نواب صاحب نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا: "بھئی! اب ہم لوگوں کا سن ایسا آگیا ہے کہ ہمیں کچھ ریاضت کرنا چاہیے۔ میں نے شروع کر دی ہے۔ آپ بھی اس جانب توجہ کریں تو کیا اچھا ہو۔" غالب نے جواب دیا کہ "پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل انشاء اللہ ہوگی۔"

کچھ عرصے کے بعد جب پھر غالب لوہارو گئے تو نواب نے غالب کو ریاضت والی بات یاد دلائی اور پوچھا کہ "آپ نے اس سلسلے میں کچھ کیا بھی یا نہیں؟" غالب نے جواب دیا کہ "جی ہاں! میں نے ریاضت شروع کر دی ہے اور اب تو میں خواب بھی دیکھنے لگا ہوں۔" نواب نے حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا کہ "کیسا خواب؟ میں بھی کچھ سنوں۔" غالب نے کہا، "ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم دونوں ایک جنگل میں چلے جا رہے ہیں۔ پیاس کی شدت ہے۔ پانی کی تلاش میں ہم دونوں حیران و پریشان ہیں کچھ دور چلنے کے بعد شہد کا ایک حوض نظر پڑا۔ ہم دونوں اس طرف لپکے۔ حوض تک رسائی کیچڑ کے ایک بڑے گڑھے کے کنارے کنارے چل کر ممکن تھی۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں، میں اس گڑھے میں گر پڑا۔ البتہ حضور حوض تک پہنچ گئے۔ لیکن جب شہد کے لیے جھکے تو حوض میں جا پڑے۔ ہم دونوں بدقت تمام باہر آئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میں آپ کو چاٹ رہا ہوں اور آپ مجھے چاٹ رہے ہیں۔"



غزل

نہال رضوی

زاہد کے ہاتھ میری طرح جام تک گئے
یہ محترم بھی جرأت اقدام تک گئے

صحنِ حرم سے کوئے مے و جام تک گئے
کچھ خود پرست آج رہِ عام تک گئے

میں نے کسی کرن کا بھی احساں نہیں لیا
اکثر کچھ آفتاب مری شام تک گئے

نظروں کے ساتھ ہم رُخ و گیسو کے شہر میں
ان کو تلاش کرنے ہر اک بام تک گئے

مغرورِ حُسن جو تھے وہ آئینہ دیکھ کے
دیوانہ وار عشق کے الزام تک گئے

وہ مہربانیوں کی تجلّی بکھیرنے
اپنی سحر سے اُٹھ کے مری شام تک گئے

طے کر کے راہِ دار و رسن سر سے اے نہالؔ
ہم کائناتِ عشرتِ بے نام تک گئے

غزل

نقی علی خاں ثاقب

پیار کے مرحلے ہیں سخت بہت
تھک گیا ہے شعورِ وقت بہت

روشنیوں کے شہر میں ہوں گے
اور بھی تو سیاہ بخت بہت

خوب صورت دکھائی دیتی ہے
آج مجھ کو مری شکست بہت

زندگی بن کے سامنے آئے
زندگی کے بلند و پست بہت

ہو سکے تو یہ سوچ لو تم بھی
امتحانِ وفا ہے سخت بہت

وقت کے انتظار میں ثاقب
کاش ملتا کسی کو وقت بہت

محروم اور اُن کی برجستہ گوئی

نریش کمار شاد

اُردو کے نامور شاعر تلوک چند محروم وطن اور انسانیت کی خدمت کے جذبے سے معمور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے کلام کے ذریعے انسان دوستی، امن، محبت، رواداری اور قومی یک جہتی کا نہ صرف پیغام دیا بلکہ اپنی شاعری کو اُن کے پرچار اور لوگوں میں صالح افکار و نظریات پیدا کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔

حضرتِ محروم کو قدرت کی طرف سے ذوقِ سخن ودیعت ہوا تھا اور بچپن ہی سے طبیعت موزوں تھی۔ طبیعت کی اس موزونی نے انھیں اوائل عمر سے جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ کیفیت یہ تھی کہ اس زمانے میں بھی جس واقعے سے متاثر ہوتے اُس پر فوراً نظم کہہ ڈالتے۔ ایک خاص بات اس سلسلے میں یہ ہے اور جس کا ذکر محروم صاحب نے اپنی آپ بیتی میں کیا ہے کہ بالکل ابتدا ہی سے نظمیں اوزان کے اعتبار سے درست ہوتی تھیں۔ یقیناً یہ ان کی فطری موزونیٔ طبع کی دلیل ہے۔ شاید اسی چیز نے انھیں کسی کے آگے زانوے تلمذ تہہ کرنے سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ اُنھوں نے صرف اپنے وجدان کو اپنا رہبر بنایا اور اساتذہ کے کلام اور اعلیٰ ادبی تصانیف سے استفادہ کیا۔

تلوک چند محروم نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں اور مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور جس موضوع کو نظم کیا ہے اُسے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی محروم صاحب کے کلام میں "لفظوں کا جمال" اور "معنی کا ہجوم" ہی نہیں پایا جاتا بلکہ "ان کا سخن مفید د دانش افروز" بھی ہے۔ خیالات کو دل نشیں اور موثر انداز میں ادا کرنے میں اور الفاظ کو خیالوں سے ہم آہنگ بنانے میں انھیں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔

حضرت محروم بڑے زود گو بھی تھے۔ اس کا ثبوت ان کے کلام کے وہ چھ مجموعے ہیں جو اُن کی زندگی ہی میں چھپ کر منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ ان کا خاصا شعری سرمایہ ایسا ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

بہرحال یہاں محروم صاحب کی شخصیت اور فن کا جائزہ لینا مقصود نہیں۔ اس قادر الکلام شاعر پر ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا اور اس کی سادہ اور پُر وقار شخصیت، شاعری اور فنی کمالات کا صحیح پس منظر میں جائزہ لیا جائے گا۔ یہاں حضرت محروم کی ایک خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور وہ ہے اُن کی برجستہ گوئی۔ اگر تلاش و جستجو کی جائے تو ان کے یہاں برجستہ گوئی کی سیکڑوں ہی مثالیں مل جائیں گی۔ اس سے اگر ایک طرف اُن کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت ملتا ہے تو دوسری طرف ان کے وسیع النظر، وسیع المطالعہ اور فطری شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی زبردست قوتِ مشاہدہ رکھتے تھے۔ ذیل میں اُن کی برجستہ گوئی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

تلوک چند محروم اپنی طالب علمی کے زمانے میں مڈل اسکول کا امتحان دینے بنوں گئے تھے اور امتحان کے دوران میں جب آپ کسی پرچے کے جواب لکھ رہے تھے تو ایک نگراں صاحب جو شعر سے دلچسپی رکھتے تھے اور محروم کا شاعر ہونا بھی جنھیں معلوم ہو چکا تھا،

محروم صاحب کے پاس آئے اور ایک چٹ پر یہ مصرعہ لکھ کر ان کے سامنے رکھ دیا اور خود ٹہلتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ع

ہر کہ محروم از ازل محروم ماند تا ابد

جب چند لمحوں کے بعد وہ محروم کے قریب پھر آئے تو وہ چٹ پر یہ مصرعہ لکھ چکے تھے۔ ع ایں غلط گفتی بہ محروماں عنایت میرسد

محروم صاحب کا وطنِ مالوف عیسیٰ خیل ایک بار جب دریا برد ہونے لگا تو انھوں نے یہ قطعہ موزوں کیا۔ ؎

بہالے جا مرا کاشانہ اے سندھ
ترا ذوقِ تباہی گر ہے بے تاب
حقیقت کیا ہے میرے جھونپڑے کی
سمجھتا ہوں جہاں کو نقش بر آب

پہلی بار جب تلوک چند محروم کو لاہور آنے کا اتفاق ہوا اور سینما کے بڑے بڑے رومانی پوسٹر دیواروں پر نظر آئے تو یہ قطعہ اسی وقت موزوں ہو گیا۔ ؎

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر — آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں
خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا — منظرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

کسی مشاعرے میں حفیظ جالندھری نے جب اپنی وہ غزل سنائی جس کا ایک شعر ہے۔ ؎

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

تو غزل سننے کے فوراً بعد تحسین کے طور پر محروم صاحب نے یہ تین شعر کہہ کر حفیظ کو دیے۔ ؎

حفیظِ خوش نوا بزمِ سخن میں — قیامت تک رہے گی یاد تیری
سرور آمیز ہیں تیرے ترانے — جنوں انگیز ہے فریاد تیری
کیا پابندِ نے نالے کو تو نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری

شملہ میں ۱۹۲۵ء میں ایک مشاعرہ ہوا۔ تلوک چند محروم بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ سر عبدالقادر نے دوسرے مہمان شعرا کے علاوہ محروم صاحب کو بھی مسلم ہوٹل میں چائے پر مدعو کر لیا۔ وہاں گوشت کی بھرمار دیکھ کر محروم صاحب کی طبیعت مکدر ہو گئی اور وہ دوسرے شاعروں سے دور الگ جا کر بیٹھ گئے۔ شیخ صاحب نے جب چائے کی میز پر انھیں بلایا تو انھوں نے معذرت کے طور پر اسی وقت یہ شعر کہہ کر سنایا۔ ؎

چائے کی عادت نہیں اور مے سے نفرت ہے مجھے
بزم میں کافی ہے خالی واہ وا میرے لیے

اسی مشاعرے میں اپنی نظم سنانے سے چند منٹ پہلے محروم نے یہ قطعہ کہا اور نظم سے پہلے تمہیداً پڑھا۔ ؎

کہاں ہم اور کہاں بزمِ ادیبانِ سخن پرور — طریقِ نغز گوئی را چہ داند مردِ صحرائی
کہاں شملہ کہاں دشتِ بیابانِ میانوالی — تعجب خیز گویا میں ہوے سامانِ سرمائی
دلِ افسردہ میں ذوقِ تماشا بھی کہاں اتنا — کہ بے برگ و نوائی کو نہ ہوتا وہم رسوائی
پہاڑوں کی بلندی دیکھنے گھر سے نکلتے کیوں — تخیل کو میسر کب نہیں تھی عرش پیمائی

نہیں محروم باعث اور کوئی شملے آنے کا
محبت شیخ صاحب کی یہاں تک کھینچ کر لائی

کئی سال پہلے کی بات ہے کہ محروم صاحب لاہور میں حفیظ جالندھری سے ملنے ان کی بیٹھک واقع انار کلی پہنچے تو حفیظ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ انھوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ لکھ کر ان کی میز پر رکھ دیا۔ ؎

دفتر جو بالاخانے میں دیکھا حفیظ کا — محروم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا
رونق ہوئی انار کلی کی چہار چند — بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا
جن منزلوں میں حسن کبھی نغمہ ریز تھا — اب عشق ان میں مائلِ فریاد ہو گیا

"سوز و ساز" حفیظ کے مجموعۂ کلام کا نام ہے اور انار کلی کے بالاخانے کسی زمانے میں طوائفوں سے آباد تھے۔

مشہور اردو صحافی وقار انبالوی، محروم صاحب کے بے تکلف دوستوں میں سے ہیں۔ جب وقار صاحب روزنامہ پرتاپ سے نوکری چھوڑ کر روزنامہ احسان سے منسلک ہو گئے اور اتفاقاً ایک جگہ محروم صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے (محروم) چند لمحوں کے بعد

ہی یہ رباعی موزوں کرکے سنائی :

جس دن سے اُدھر سے تو اِدھر آیا ہے — چشمِ بینا کو کم نظر آیا ہے
احسان یہ احساں بھی ضروری تھا مگر — پرتاپ کو بے وقار کر آیا ہے

سر عبدالقادر کی صدارت میں حفیظ جالندھری انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں اپنی ایک نظم پڑھ رہے تھے جس میں انجمن کے لیے چندہ دینے کی اپیل کی گئی تھی ۔ سامعین میں اتفاق سے تلوک چند محروم بھی موجود تھے۔ انھوں نے حفیظ کی نظم سن کر اسی وقت یہ شعر موزوں کیا۔ ؎

حفیظ کہتے تھے احباب جس کو بندہ نواز
بنے ہیں گردشِ دوراں سے اب وہ چندہ نواز

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ایک دن وقار انبالوی نے باتوں باتوں میں محروم صاحب سے پوچھا کہ آپ کو اس جنگ کا انجام کیا نظر آرہا ہے۔ محروم صاحب نے چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد یہ رباعی موزوں کرکے سنائی

ہو لاکھ مئے خودی سے ہٹلر سرمست — ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی — کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

تقسیم وطن کے بعد حاجی لق لق نے اخبار زمیندار لاہور میں "یادِ رفتگان" کے عنوان سے چند شعرِ ہند دشعرا کے ترکِ وطن کرنے پر اپنے مزاحیہ انداز میں لکھے جن میں ہمدردی کا عنصر بھی شامل تھا۔ دوسرے ہندو شعرا کے علاوہ ان میں محروم صاحب کا ذکر بھی موجود تھا جواب میں محروم صاحب نے لق لق کو یہ قطعہ لکھ کر بھیج دیا۔ ؎

لق لق! خوش رکھے خدا تجھ کو — پاک لوگوں کے درمیاں ہی سہی
شکر ہے یاد تو کیا ہم کو — از رہِ یادِ رفتگاں ہی سہی

فوح ناروی سے جب محروم صاحب پہلی بار ملے تو ملاقات کے دوران ہی میں انھوں نے یہ شعر کہہ کر فوح صاحب کو سنایا۔ ؎

محروم کا جی خوش تو ہوا فوح سے مل کر
ڈر ہے کہ یہ حضرت کہیں طوفاں نہ اٹھادیں

ماہنامہ الحمرا لاہور کے کسی شمارے میں جب محروم صاحب کی ایک فارسی غزل جوش ملسیانی صاحب کی نظر سے گزری تو انھوں نے اپنی قیام گاہ نکودر ہی سے محروم صاحب کو ایک خط لکھ کر اس غزل کی بھرپور داد دی۔ انھوں نے خط پڑھنے کے فوراً بعد یہ رباعی موزوں کی اور جوش صاحب کی خدمت میں بھیج دی۔ ؎

با جوش دمے کہ شد میسر ما را
از عمرِ عزیز بود خوشتر ما را
کم یافتہ ایم از نکو تر تحسیں
دادِ سخن آمد از نکودر ما را

آل انڈیا ریڈیو جالندھر سے اردو مشاعرہ نشر ہو رہا تھا۔ محروم صاحب کے پڑھنے کی باری آئی تو اناؤنسر نے اعلان کیا: "اب منشی تلوک چند مرحوم سے ان کا کلام سنئے۔" غزل سنانے سے پہلے محروم صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر سنایا۔ ؎

کہا محروم کو اس شوخ نے مرحوم جیتے جی
حروف لے وائے بے دردی سے میرے نام کے بدلے

سونی پت ضلع رہتک میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا جس میں دوسرے شعرا کے علاوہ قبلۂ رنداں حضرت جوش ملیح آبادی بھی مدعو تھے۔ وہاں سرکاری طور پر شراب کی ممانعت ہے۔ محروم صاحب جب اسٹیج پر کلام سنانے کے لیے آئے تو جوش سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "جوش صاحب اگر اجازت ہو تو غزل عرض کرنے سے پہلے ایک رباعی آپ کے متعلق سناؤں۔"

"ہاں ہاں ضرور" جوش صاحب نے گوش بر آواز ہوتے ہوئے کہا اور محروم صاحب نے اسی وقت کہی ہوئی اپنی یہ رباعی سنائی۔ ؎

جب آئے جناب جوش سونی پت میں
برپا ہوا اک خروش سونی پت میں
سن کر اڑے ان کے ہوش سونی پت میں
ممنوع ہے نا و نوش سونی پت میں

اُفقِ نو

باوا کرشن گوپال
مغموم

بہارِ تازہ کا ہر لطف اُٹھا رہے ہیں ہم
میانِ صحنِ چمن مُسکرا رہے ہیں ہم

تمیزِ مذہب و ملت مٹا رہے ہیں ہم
عناد و بغض کا جھگڑا چکا رہے ہیں ہم

زمانے بھر کی نگاہیں ہمیں پہ ہیں مرکوز
خود اپنے آپ میں جس دن سے آرہے ہیں ہم

بہر روش گل و لالہ سے صحنِ گلشن کو
مذاقِ نَو کے مطابق سجا رہے ہیں ہم

اُبھار کر اُفقِ نو پہ علم کا سورج
جہالتوں کا اندھیرا مٹا رہے ہیں ہم

جلا کے شمع ہر اک دل میں حبِّ انساں کی
تعصبات کی ظلمت مٹا رہے ہیں ہم

بایں غرض کہ سکونِ جہاں نہ برہم ہو
پیامِ امن برابر سُنا رہے ہیں ہم

وہ گیت جن سے محبت کا نام روشن ہے
وہ گیت صبحِ ازل سے سُنا رہے ہیں ہم

اب اس سے بڑھ کے ثبوتِ خلوص کیا ہوگا
کہ دشمنوں کو گلے سے لگا رہے ہیں ہم

ہزار منزلیں ہر چند گردِ راہ ہوئیں
مذاقِ سیر و سفر آزما رہے ہیں ہم

رہے گی سامنے اک ایک راہِ مستقبل
دماغ و دل کی وہ شمعیں جلا رہے ہیں ہم

وہ انقلاب جو روحِ شباب ہوتا ہے
اُس انقلاب کا پرچم اُڑا رہے ہیں ہم

وہ جس کا نام ہے تاریخ میں سُنہرا دَور
خدا کے فضل سے وہ دَور لا رہے ہیں ہم

ہمارے خواب کی تعبیر ہے یہی مغموم
تمام عالمِ ہستی پہ چھا رہے ہیں ہم

میرا وطن

نظر برنی

کوئی دیکھے مرے گلستاں کی پھبن
ہر روش پر لہکتا ہوا بانکپن
ڈالی ڈالی ہے اپنی ادا میں دلہن
لہلہائے بہاروں سے سرو و سمن
سارا گلشن ستاروں بھری انجمن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

کوہ و صحرا میں بجتی ہیں شہنائیاں
دور تک ہیں ہمالہ کی پرچھائیاں
انجمن خود، ایلورا کی تنہائیاں
نیلے ساگر میں بہتی ہیں رعنائیاں
پھوٹ نکلا اجنتا سے اک بانکپن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

ہے مسرت کا ہر موڑ پر اک نشاں
کونپلیں ہیں مگن، ڈالیاں نغمہ خواں
میرے کھیتوں کی بالوں کا رنگیں سماں
جیسے بالک کوئی ہو رہا ہو جواں
اک حسیں نرم و نازک ہے سیمیں بدن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

میرے گلشن میں جنت کی سوغات ہے
اس میں کشمیر، بنگال، گجرات ہے
جو نہیں ہے زمانے میں وہ بات ہے
ہر گھڑی اس میں خوشیوں کی برسات ہے
اس کی ہر اک ادا نازِ گنگ و جمن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

صاحبِ ہوش و ادراک، بالغ نظر
میری دھرتی نے اُگلے ہیں لعل و گہر
شانتی اور اہنسا کا دیکھو ثمر
کچھ شہیدوں کی قربانیوں کا اثر
یہ ہے گہوارۂ نازشِ علم و فن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

(افسانہ)

شاموں

[illegible]

ابھی اچھی طرح شام ہوئی نہیں ہے۔ میں نے اپنا خوبصورت ترین لباس پہن لیا ہے۔ آج سنیچر ہے اور سنیچر کی شام لکھنؤ میں بہت مشہور ہے۔ لوگ اسے دیکھنے اور شام اودھ کا لطف اٹھانے دور دور سے آتے ہیں۔ میں بھی اسی شام سے ملنے جا رہا ہوں۔

میں نے اپنی سائیکل نکالی ہے۔ اب چوراہے سے سیدھے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد امین آباد پہنچ جاؤں گا۔ پھر وہاں سے قیصر باغ اور لال باغ ہوتا ہوا حضرت گنج کی گود میں ڈوب جاؤں گا۔ اب میری سائیکل پوری رفتار سے دوڑ رہی ہے اور میں وہاں کے سحر انگیز ماحول میں گھر گیا ہوں۔

مال روڈ جس کا نام اب بدل چکا ہے اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی شام بڑی خوب صورت ہوتی ہے۔ لوگ اپنے بہترین ملبوسات میں یہاں اپنی فکر و پریشانی کو ماحول کی رنگینی میں ڈبو دینے آتے ہیں۔ آپ یہاں کسی کو بھی نہ پہچان سکیں گے کہ کون اے کلاس فیملی سے اور کون ڈی کلاس فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں سب ہی سفید پوش ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی جیبوں میں دو پیسے بھی نہیں ہوتے کہ کسی سینما کے سامنے کھڑے ٹھنڈے پانی والے سے ایک گلاس پانی ہی خرید سکیں لیکن پھر بھی وہ آتے ہیں تاکہ چند لمحوں ہی کے لیے اپنے غموں، اپنی پریشانیوں اور اپنے دکھوں کو دوسروں کی مسکراہٹ میں تحلیل کر سکیں۔ اور ان کی پرچھائیوں میں چند لمحوں کے لیے خود کو بھلا سکیں۔

اب میں امین آباد پہنچ چکا ہوں۔ یہاں کی گہما گہمی اپنے عروج پر ہے۔ لوگ پارک میں داخل ہو رہے ہیں، نکل رہے ہیں۔ یہ امین آباد پارک کہلاتا ہے۔ اسے شاید نواب امین الدولہ نے بنوایا تھا۔ پارک میں ایک شاندار مندر بھی ہے۔ لوگ مندر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور مندر سے جو لوگ واپس ہو رہے ہیں ان کے ہاتھوں میں مٹھائی کے دونے ہیں جن میں بھگوان کا پرشاد ہے۔ وہ اسے کھا رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ اس کے کھانے سے ان کے دلوں میں ایک عقیدت جاگ رہی ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ بھگوان ابھی ہے۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں۔

اب میں پارک سے آگے بڑھ گیا ہوں اور اب میری سائیکل نظیر آباد کے چوراہے پر آ کر پھنس گئی ہے۔ بھیڑ بہت ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ شاید مجھے بھی اپنی سائیکل کسی کی ٹانگ پر چڑھا دینی پڑے گی۔ تبھی وہ کچھ چونک کر مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر فٹ پاتھ پر چڑھ جائے گا۔ ورنہ کوئی صورت نظر نہیں آتی کیوں کہ یہ لوگ سڑک پر اس طرح چلتے ہیں جیسے یہ سڑکیں نہ ہوں بلکہ ان کے گھروں کے آنگن ہوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ یہ بچارے بھی تو مجبور ہیں۔ فٹ پاتھ پر کیسے چلیں؟ وہاں تو لوگ دکانیں لگاتے ہیں۔

بائیں طرف ایک ریستوراں میں ریڈیوگرام سے موسیقی ابھر رہی ہے۔ کچھ لوگ جو ہمیشہ کی طرح آج بھی قلاش ہیں اور جو بغیر پیسوں کے اندر داخل نہیں ہو سکتے، ریستوراں کے مالک سے ڈرتے ہیں، وہ باہر ہی کھڑے کسی تازہ ہندستانی فلم کی دھندلی دھندلی گیت نما غزل سن رہے ہیں۔

لیکن میری سائیکل بڑھ رہی ہے۔ بغیر کسی حادثے کے بغیر کسی رکاوٹ کے۔ حالاں کہ میں ایک عجیب دنیا میں گم ہوں میرا

دماغ نہ جانے کہاں ہے۔ اب حضرت گنج بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ شام اپنی جوانی میں قدم رکھ چکی ہے۔ یہ قیصر باغ کا چوراہا ہے۔ یہاں نظیر آباد کے چوراہے سے قدرے کم بھیڑ ہے۔ بڑی بڑی بسیں، لوگوں سے بھری ہوئی، آہستہ آہستہ، بھیڑ کو بچاتے ہوئے گزر رہی ہیں۔ بسوں کی اگلی سیٹوں سے خوب صورت چہرے جھانک رہے ہیں معلوم نہیں یہ اصلی ہیں یا نقلی۔ چہرے اصلی اور نقلی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔

یہ سڑک لال باغ ہوتی ہوئی حضرت گنج جاتی ہے۔ مجھے گنج جانا ہے۔ یہاں لوگ حضرت گنج کو صرف گنج بھی کہتے ہیں اور وہاں کی تفریح کو گنجنگ کہتے ہیں۔ میں گنجنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ اب میں جس تراہے پر کھڑا ہوں یہ بہت ہی خطرناک ہے۔ یہاں کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا ہی رہتا ہے۔

ان سڑکوں میں سے ناک کی سیدھ میں جلنے والی سڑک ایک مقامی کالج ہوتی ہوئی سکریٹریٹ جاتی ہے پھر وہاں سے حضرت گنج اور بائیں طرف والی سڑک لال باغ ہوتے ہوئے گنج پہنچتی ہے۔ پھر یہ دونوں بہنیں جو یہاں سے بچھڑ جاتی ہیں، وہاں جاکر مل جاتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ بے زبان ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی اتنی دیر کی آپ بیتی نہ تو سن سکتی ہیں اور نہ تو سنا سکتی ہیں۔ ہم اپنی باتیں دوسروں کو سنا سکتے ہیں

یہ لال باغ کا پارک ہے۔ یہاں آج کل کوئی بڑا سرکس آیا ہوا ہے۔ میں یہاں تھوڑی دیر کے لیے رک گیا ہوں۔ میری نظریں اسی درخت پر رک گئی ہیں جہاں سرکس والوں نے مختلف قسم کے بلب لگا رکھے ہیں۔ مجھے وہ روشنی بہت پیاری لگ رہی ہے۔ رنگ برنگ کے بلب اندھیرے کی آغوش میں لپٹے ہوئے، جھولتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں، لوگ تیزی سے آ جا رہے ہیں۔ شاید تین بجے شروع ہونے والا شو ختم ہوا ہے۔ اچانک میری نظر ایک خوب صورت جوڑے پر ٹھہر گئی ہے، جو شاید کسی رکشے کا منتظر ہے۔ لڑکی بہت معصوم اور حسین ہے۔ ایسے چہرے آج کل عنقا ہو گئے ہیں۔ آجکل تمام چہرے نقلی ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے، میری بھابی جو شام کو بہترین میک اپ کرکے، ہونٹوں پر عمدہ سی مسکراہٹ لیے ہوئے حضرت گنج میں ہزاروں پر برق گرانے آتی ہیں، وہی دوسری صبح سو کر اٹھتے وقت پہچانی نہیں جاتیں۔ میک اپ ختم ہو جاتا ہے۔ چہرے کے داغ اور دانے ابھر آتے ہیں۔ ان کا چہرہ دیکھ کر مجھے گھن آتی ہے لیکن میرے بھائی جان، جو کسی دفتر میں کلرک ہیں، ڈبل ایم۔ اے ہیں اور جو بھابی سے ہزار گنا خوب صورت ہیں، بھابی کو بہت پیار کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ بھابی انھیں اپنی اسکول کی استانی سہیلی سے ملاتی ہیں یا پھر وہ سگریٹ کا نیا ڈبہ خرید کر بھابی کی کسی نئی سہیلی کے ساتھ کہیں گھومنے چلے جاتے ہیں اور میں اس کاروبار کو کھولتے ہوئے دماغ سے نکال پھینکتا ہوں۔

اب میرا دماغ پھر سے خالی ہو گیا ہے۔ وہ جوڑا کسی رکشے میں بیٹھ کر کہیں جا چکا ہے۔ وہ لڑکی میرے دماغ کے کسی گوشے میں چھپ گئی ہے۔ شاید ہمیشہ یاد آنے کے لیے۔ میرا دل بوجھل ہو گیا ہے اور نہ جانے کیوں میں اچانک ہی اداس ہو گیا ہوں۔ مجھے شاید کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہے جسے میں خود بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔

میری سائیکل اب گنج میں داخل ہو چکی ہے۔ مجھے داہنے بازو مڑنا ہے۔ جہاں سائیکل اسٹینڈ پر سائیکل رکھنی ہے۔ یہیں لکھنؤ کا خوب صورت ترین سینما ہال ہے۔ یہاں عموماً انگریزی فلمیں آتی ہیں اور جنھیں ہماری بہنیں، بہوئیں اور مائیں کالج، شاعرہ یا کسی دوسرے جلسے کا بہانہ کرکے دیکھنے آتی ہیں۔ اس ہال کے ایک پہلو میں ایک ریستوراں بھی ہے۔ جہاں گنجنگ کے بعد مجھے آکر ایک پیالی کافی پینی ہے۔ سامنے سے میرا دوست "خان" آرہا ہے۔ یہ لائف انشورنس کارپوریشن میں کام کرتا ہے۔ اسے شاید یقین تھا کہ میں آج کی شام یہاں ضرور آؤں گا۔

"بھئی! تم نے بہت دیر کر دی۔ تم بہت بور ہو" وہ اپنی عادت کے مطابق شکایت کرتا ہے۔ میں صرف مسکرا دیتا ہوں۔ سائیکل والا کوپن میری طرف بڑھاتا ہے۔ پھر میں اور خان بائیں ہاتھ سڑک پر اس نقطے تک بڑھتے ہیں جہاں دکانوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہیں سے ہم اپنی تفریح شروع کریں گے۔ تفریح سے آپ لڑکیوں کو چھیڑنا، ان پر گندے فقرے کسنا جو آج کل کے نوجوانوں کا شغلہ ہے، نہ سمجھ لیجیے گا۔ ہم صرف ٹہلیں گے اور ادب، فلسفے، سیاست اور دوسرے دنیا بھر کے موضوع پر بحث کرینگے۔

شام اب پوری طرح جوان ہو چکی ہے۔ ہمارے آگے پیچھے سیکڑوں لوگ ہنستے مسکراتے گزر رہے ہیں، لڑکیاں، لڑکوں کو اور

لڑکے، لڑکیوں کو گھورتے ہوئے، گزر رہے ہیں۔ خان اپنے دوست پیٹرک سے باتیں کرنے لگا ہے۔ بظاہر پیٹرک اس کی باتوں میں دلچسپی تو لے رہا ہے لیکن اس کی نگاہیں سامنے کی دکان میں کھڑی کرنل کی حسین لڑکی پر جمی ہوئی ہیں۔ لڑکی کے لبوں پر ایک سحر انگیز مسکراہٹ ہے اور وہ کبھی کبھی ایک جان لیوا انداز کے ساتھ پیٹرک کی طرف بھی دیکھ لیتی ہے۔ پیٹرک کے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے یا شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ میں خان کا ہاتھ پکڑ کر آگے کھینچتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ کھڑا رہنا پسند نہیں۔ مجھے چلنا پسند ہے۔ مجھے تبدیلی پسند ہے یکسانیت سے آدمی اکتا جاتا ہے نا؟

اندھیرا اتنا نہیں ہے کہ آنے جانے والوں کے چہرے نہ دکھائی دیں۔ اس تراہے سے، جہاں لال باغ سے آنے والی سڑک حضرت گنج کی سڑک سے ملتی ہے، کافی دور تک حسن ہی حسن بکھرا پڑا ہے۔ ہماری طرح دوسرے بھی شام کی جوانی سے کھیل رہے ہیں۔ شام کی جوانی ڈھل جائے گی۔ لوگ لوٹ جائیں گے۔ یہ عمل کبھی بھی نہیں ختم ہوگا

سڑک پر چلنے والی لڑکیوں کے آنچل ہوا میں لہرا رہے ہیں اور ان کے جسم ایک عجیب انداز سے بل کھا رہے ہیں۔ لوگوں کی نظریں ان کے لباسوں کو چیر کر اُن کی کمر کے بل گن رہی ہیں۔ لیکن وہ اس سے لاپرواہ کھلکھلاتی ہوئی، ہنسی اور مچلتے ہوئے قہقہوں کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ شاید یہ خوب صورت اور زندگی سے بھرپور ہنسی اور قہقہے زندگی کے غم کی پرچھائیوں سے ہو کر نہیں گزرے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ سب اسی طرح ہنسیں اور قہقہے لگائیں لیکن میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟

لڑکیوں کے نازک ہاتھوں میں رنگین ڈبے ہیں۔ ڈبوں کے سنبھالنے میں بھی ایک ادا شامل ہے۔ ان کے سامنے سے آتے ہوئے یونیورسٹی کے نوجوان ہنستے مسکراتے، فقرے کستے آگے بڑھ رہے ہیں۔ فقرے وہ کستے ہیں لیکن مجھ جاہل کو ایسا لگتا ہے کہ جیسے اخلاق کی گرتی ہوئی دیواریں سیدھی میرے اوپر آگریں گی۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، نہ جانے کیوں ایک گہرے خوف کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ خوف د پھر اس وقت حیرت میں بدل جاتا ہے جب لڑکیاں مسکراتی ہیں۔ جب ان کی آنکھوں میں دعوت ہوتی ہے ــــ لیکن ــــ اے ہاں آج بھی ان میں وہ لڑکی موجود ہے جو بہت سنجیدہ رہتی ہے، باوقار کسی ملک کی شہزادی کی طرح۔

اب سب کی نگاہیں آتی ہوئی لڑکیوں کی ایک دوسری ٹولی پر جم گئی ہیں۔ میں ان میں سے دو کو جانتا ہوں وہ میری کزن ہیں اور لڑکیوں کے انگلش اسکول میں پڑھتی ہیں۔ انھوں نے "مجھے ہیلو" کہا میں نے جواب دیا ہے اور آگے بڑھ گیا ہوں، کچھ لوگ رشک بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے ہیں۔ نہ جانے کیوں؟

خان نے ان لڑکوں کو گھورنا شروع کر دیا ہے جو ان لڑکیوں کے پیچھے جا رہے ہیں۔ یہ شہر کے "اونچے لڑکوں" کی پارٹی ہے۔ یہ اونچے اس لیے کہلاتے ہیں کہ ان کے باپ یہاں کے بڑے لوگ ہیں۔ ان لڑکوں کو کسی کا خوف نہیں ہے۔ وہ جو جی چاہے کر سکتے ہیں شرارت کر سکتے ہیں۔ غنڈہ گردی کر سکتے ہیں اور لڑکیوں کو بے دھڑک چھیڑ سکتے ہیں کیوں کہ اس پارٹی میں چند ایسے لڑکے بھی ہیں جن کے باپ یہاں کے بڑے بااثر لوگوں میں ہیں۔

وہ لڑکے آپس میں انگریزی میں اس طرح باتیں کرتے جا رہے ہیں جیسے انھیں اس بات کا بھی احساس نہ ہو کہ انھیں کے باپوں میں سے کئی باپ انگریزی کی روک تھام اور انگریزی کے خلاف مہم چلاتے ہیں۔ ہندی کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن لڑکوں کو تعلیم انگریزی اسکولوں میں دلواتے ہیں۔ یعنی جڑوں میں پانی ڈالتے ہیں اور شاخوں کو تراشتے ہیں۔ وہ لڑکے باتوں میں خود کو اس طرح مشغول دکھا رہے ہیں جیسے انھیں اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ ان کے سامنے کچھ ایسی قوتیں بھی جا رہی ہیں جو انھیں اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ لڑکیاں بھی اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتی ہیں لیکن نظر انداز کرتی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ اگلی سنیچر کی شام کو انھیں جنیوں میں سے کئی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس طرح بے تکلفی سے ٹہلتے نظر آئیں گے جیسے جنم جنم کے ساتھی ہوں۔

داہنی طرف "لکھنؤ" کا سب سے اونچا اور شاندار ہوٹل ہے اور اس کے قریب ہی یہاں کا سب سے بلند سنیما گھر۔ یہاں

ایک غیر معمولی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ میرے اور خان کے دل میں بھی راز جاننے کی خواہش جاگتی ہے۔ ہم اس طرف بڑھتے ہیں لیکن پھر حیران رہ جاتے ہیں۔ سین بہت ہی ڈرامائی ہے۔ ایک طرف چند لڑکے چوڑی دار پتلونیں پہنے کھڑے ہیں۔ ان میں سے کئی کانپ رہے ہیں۔ نہ جانے ڈر سے یا غصے سے، اور ڈھٹائی سے۔ ان کے سامنے ایک دوسری پارٹی کھڑی ہے، خوب صورت لڑکیوں کی پارٹی۔ یہ وہی لڑکیاں ہیں جو ابھی ہمارے پاس سے گزری تھیں۔ ان کے چہرے اب سپاٹ تھے۔ اب نہ تو ان پر وہ مسکراہٹ تھی اور نہ آنکھوں میں وہ دعوت جو کچھ دیر پہلے ناچ رہی تھی۔ ان کی جھرمٹ سے دو قدم آگے، وہی لڑکی جو ان میں بے حد سنجیدہ اور باوقار تھی، اپنے داہنے ہاتھ میں ایک نازک سی خوب صورت چپل اور بائیں ہاتھ میں ایک دُبلے پتلے نوجوان کی نیلی نیلی بشرٹ تھامے اس کی مرمت کر رہی ہے۔ میرے دل میں لڑکے کے لیے ذرا سی ہمدردی جاگتی ہے لیکن اس جذبے پر اچانک ہی نہ جانے دماغ کے کس گوشے سے خوشی کی ایک لہر آکر غالب ہو جاتی ہے۔ میں خوش ہوتا ہوں اور اخلاق کی اس گرتی ہوئی دیوار کو تصور میں دیکھتا ہوں جو بہت ہی کمزور ہو چکی ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے اس میں، پھر کچھ قوت اُمنڈ آئی ہے۔ پھر میرے کانوں سے کسی لڑکے کی آواز ٹکراتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زیادتی لڑکی کی ہے ورنہ پٹنے والے لڑکے نے تو صرف اس لڑکی کے لازوال حسن کو "اڈمائر" کیا تھا، داد دی تھی۔

اب میں کچھ اکتا گیا ہوں۔ مجھے ایک اداسی نے گھیر لیا ہے۔ اب مجھے یہ شام اچھی نہیں لگتی ہے۔ میں اپنا ہاتھ خان کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں اور اس ریستوراں کی طرف لوٹ آتا ہوں جہاں میں معمولاً کافی پیا کرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ کی طرح یہاں ایک پیالی کافی پینی ہے۔ لگاتار کئی سگریٹ پینے ہیں۔

ریستوراں میں معمول کے مطابق چاروں طرف رنگینی بکھری پڑی ہے۔ ایرکنڈیشنڈ ہال میں، خوب صورت آرام دہ صوفوں پر لوگ بیٹھے دھیمی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا قہقہہ بھی ابھرتا ہے جو دھیمی دھیمی ہنسیوں پر غالب آجاتا ہے۔ میں دروازے ہی پر کھڑا ہو کر ہال کا جائزہ لیتا ہوں۔ داہنی طرف کی تمام میزیں بھری پڑی ہیں۔ اُدھر بیروں کی تعداد زیادہ ہے۔ بائیں طرف بھی تمام میزیں بھری ہوئی ہیں لیکن اس طرف بیروں کی تعداد دوسری طرف سے کم ہے۔ مجھے جاننے والے بیرے سلام کرتے ہیں۔ میں مسکرا کر، سر کے اشارے سے انھیں جواب دیتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر اچانک ہی ہیڈ ویٹر میری طرف بڑھتا ہے۔

"آئیے راجیش صاحب" وہ قریب آکر ادب سے کہتا ہے "آپ کی مخصوص میز آپ کی منتظر ہے"۔ اس خالص لکھنوی بیرے کو معلوم ہے کہ میں ہر سنیچر کی شام وہیں گزارتا ہوں اور میری میز کے پاس آکر بار بار خاکساری کا اظہار کرتا ہے۔

میں اپنی میز پر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ میری مخصوص میز ہے۔ یہاں سے میں پورے ہال کا جائزہ لے سکتا ہوں۔ سب لوگوں کے چہرے پڑھ سکتا ہوں۔ پھر میں سگریٹ سلگا کر ہال کا جائزہ لینے لگتا ہوں۔ خان خود کو سردار کہلواتا ہے۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا ہے میں کثرت سے سگریٹ پیتا ہوں۔

ہمارے داہنے بازو والی میز پر جو لڑکی بیٹھی ہے یہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس کا تراشا ہوا شفاف بدن مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اور جب وہ اپنی نازک سی گردن پر پڑے ڈھیلے ڈھالے جوڑے میں گجرا لپیٹ کر دوسری طرف دیکھتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے کالے آسمان پر بہت سارے ستارے جھلمل جھلمل کر رہے ہوں۔ میں اسے بہت چاہتا ہوں لیکن وہ میری دسترس سے اسی قدر دور ہے جس قدر آسمان، زمین سے۔

اور پھر میری میز سے چوتھے ٹیبل پر ــــ ارے یہ تو کوئی نیا چہرہ ہے! میں چونک پڑتا ہوں۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ میں پھر بوکھلا جاتا ہوں۔ وہ اکیلی ہے اور میری طرف دیکھ کر اس طرح مسکراتی ہے جیسے مجھے پہچانتی ہو۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں لڑکیوں سے بہت دور رہتا ہوں اور یہ تو بہت ہی خوب صورت لڑکی ہے۔

کہتے ہیں لڑکی جس قدر خوب صورت ہوتی ہے اسی قدر خطرناک بھی ہوتی۔ نہ جانے یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ میں پھر اس کی طرف دیکھتا ہوں وہ اپنی پیالی پر جھکی چائے سپ کر رہی ہے۔ وہ بہت ہی خوب صورت ہے۔ اس کے بال سمیٹ کر کچھ اس طرح باندھے گئے ہیں کہ اس کی لانبی گردن بہت حسین لگ رہی ہے۔ گلابی چہرے پر اس کی چمپئی رنگ کی قمیص کا عکس اس کے رنگ کو اور خوب صورت بنا رہا ہے۔ جدید طرز کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے چوڑی دار پیجامے اور لکھنوی ناگرے میں وہ کوئی حال کی مغل شہزادی لگ رہی ہے۔ اس کے گلابی ہونٹ' بڑی بڑی کجلوٹی آنکھیں' پتلے ہونٹ' ستواں ناک اور گھنگریالے بال جو سنہرے لگ رہے ہیں' اس کی شخصیت کو اور پرکشش بنا رہے ہیں۔ وہ پھر میری طرف دیکھتی ہے۔ اس بار اس بات کو خان بھی محسوس کرتا ہے اور مجھے مخاطب کرتا ہے:

"راجو لڑکی بہت پیاری ہے۔"

میں خاموش اس کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھتا ہوں' جیسے کچھ سمجھ نہ پایا ہوں۔ پھر میرے دل میں ایک خواہش جاگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں' میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکراؤں' لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھے وہ اب بھی گھور رہی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کیا میں واقعی خوب صورت ہوں۔ دوستوں نے جب بھی میرے حسین و جمیل ہونے کے وجوہ پیش کیے ہیں میں نے سمجھا ہے کہ انھیں چائے کی ضرورت ہے یا پھر کچھ روپے انھیں چاہییے جو وہ پھر کبھی نہ لوٹا سکیں گے۔

لیکن اب مجھے احساس ہو چلا ہے کہ میں واقعی خوب صورت ہوں۔ مجھ میں حقیقتاً کوئی کشش ہے تبھی تو اس قدر حسین لڑکی مجھے اس بے باکی سے گھور رہی ہے۔ لیکن اسی وقت مجھے ان لڑکیوں کا خیال بھی آجاتا ہے جو اسی طرح دوسروں کو گھور گھور کر اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ان سے لفٹ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اور جب وہ بے چارے رات گئے گھر لوٹتے ہیں تو ان کا پرس خالی ہو چکا ہوتا ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں نے دوسری سگریٹ سلگا کر خان سے باتیں شروع کر دی ہیں۔ لیکن دماغ اب بھی اس لڑکی کے بارے میں الجھ رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بار میں پھر اس کی طرف دیکھوں۔ میں دل سے مجبور ہو کر اس کی طرف مڑتا ہوں لیکن پھر میرا دل دھڑک اٹھتا ہے۔ وہ اپنی میز سے اٹھتی ہے۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی رہتی ہیں۔ وہ اپنا خوب صورت پرس لے کر میری طرف بڑھتی ہے اور میرا دل چند لمحوں کے لیے دھڑکنا بند کر دیتا ہے جب وہ میری میز کے قریب پہنچ کر درخواست کرتی ہے:

"کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتی ہوں؟"

اس کی آواز میں بلا کا ترنم ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوب صورت اور عجیب سی کشش ہے جسے میں جذبات کے کسی بھی خانے میں نہیں رکھ سکتا ہوں۔ غیر شعوری طور پر اس کی آنکھوں میں ڈوب جاتا ہوں لیکن وہ دوبارہ مجھے چونکا دیتی ہے۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔"

لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی خان بول اٹھتا ہے۔

"تشریف رکھیے بھلا ہمیں کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔"

وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی بیٹھ جاتی ہے اور مسکراتی ہوئی میری طرف گھورنے لگتی ہے۔ اس کی اس بے حیائی پر میرا دل کھول اٹھتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں لوگ میری طرف عجیب عجیب نظروں سے گھور رہے ہیں۔ اچانک وہ پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہتی ہے:

"میرا نام سریتا ہے۔"

میں چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں۔ اس میں ایک دعوت ہوتی ہے۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ وہ مجھے کوئی آوارہ سمجھتی ہے' کوئی لوفر سمجھتی ہے۔ میں ذرا سخت لہجے میں کہتا ہوں:

"بیٹھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ ہم سے رسم و راہ بھی پیدا کریں۔"

چند لمحوں کے لیے وہ اداس ہو جاتی ہے۔ اس کی یہ اداسی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی لیکن پھر بھی میں اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اس سے کہتا ہوں۔ میرا لہجہ حد درجہ تلخ ہو جاتا ہے:

"آپ اگر خاموشی سے بیٹھنا چاہیں تو ٹھیک ہے ورنہ دوسری میزیں بھی تو خالی ہیں۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے میں اور خان بوکھلا جاتے ہیں۔ یقیناً دوسروں کا بھی یہی حال ہوگا۔ میری ڈانٹ اور سخت لہجے پر وہ اچانک ہی رو پڑتی ہے۔ اس کا نازک جسم ہلکے ہلکے کانپتا ہے۔ اس کی غزالی آنکھوں سے ایک ساتھ ہی کئی موتی میز پر رکھے ہوئے پرس پر گر کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ سسکیوں کے درمیان کہتی ہے:

"آپ ــ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہیے۔" میں موم کی طرح پگھلنے لگتا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ہمدردی حاصل کرنے کا یہ پرانا طریقہ ہے۔ عورت کے آنسو میں تو سلطنتیں ڈوب گئیں، میری کیا حقیقت ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک میز کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر اپنا ننھا مُنّا رومال نکال کر رخساروں پر آہستہ آہستہ رگڑتی ہے اور کہتی ہے:

"کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں؟"

"کیوں؟" میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ میرے لہجے میں تلخی نہ آنے پائے۔ "آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو بتایئے۔ نام معلوم کر کے کیا کیجیے گا؟"

وہ دھیرے سے اپنی آنکھیں میری طرف اٹھاتی ہے۔ میں چونک پڑتا ہوں۔ ننھے ننھے پسینے کے قطرے میری پیشانی پر ابھر آتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھے نہ دیکھ رہی ہو بلکہ میرے چہرے کے اس پار کسی کے خیال میں غرق ہو۔ اس کی آنکھوں میں مجھے وہی چمک دکھائی دیتی ہے جسے میں نے بارہا ممی کی آنکھوں میں ڈیڈی کے لیے دیکھی ہے اور بھابی کی آنکھوں میں بھائی جان کے لیے پائی ہے ــ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ میں غلطی پر ہوں۔ یہ وہ چمک نہیں ہے، اس سے مختلف ہے۔ پھر وہ اچانک ہی بہت جذباتی لہجے میں بہت ہی دھیرے سے کہتی ہے:

"میرے ساتھ باہر چلیے۔ میں آپ کی پیشانی کو چومنا چاہتی ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے جیسے مجھے بجلی چھو جاتی ہے۔ میں بہت کوشش کے باوجود بھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھ سکتا ہوں اور دبے دبے لہجے میں جھنجھلا کر اور غصے میں کہتا ہوں:

"آپ ہوش میں ہیں یا نہیں؟"

لیکن وہ جیسے واقعی بے ہوش رہتی ہے۔ اور اسی عالم میں بولتی چلی جاتی ہے۔ اسے شاید اس کا بھی احساس نہیں کہ تمام لوگ بہت کچھ بھولے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ کہتی ہی رہتی ہے۔ اس کا لہجہ حد درجہ جذباتی رہتا ہے:

"وہ ابھی پچھلے سال ہی مرا ہے۔ وہ میری جان تھا۔ میں اسے ہر وقت سینے سے لگائے رکھتی تھی لیکن وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اب اکیلی بھٹکتی ہوں۔ ماں کہتی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ اس کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ ہم دونوں جڑواں تھے۔"

اب وہ پھر رو رہی ہے۔ میں بھی بڑی مشکلوں سے اپنے آنسو روک پا رہا ہوں۔ اس کے ہونٹ پھر ہلتے ہیں:

"تمھاری شکل اس سے ہو بہو ملتی ہے۔ تم بالکل وہی لگتے ہو۔ تم میری وجہ سے بہت پریشان ہوئے۔ مجھے معاف کر دینا۔"

وہ یہ کہتی ہوئی تیزی سے باہر نکل جاتی ہے اور میں سکتے کے عالم، اس کے پرس سے رومال نکالتے وقت اس کا گرا ہوا کارڈ دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ وہ کارڈ اس کی لاعلمی میں گرا تھا۔ میں پڑھتا ہوں۔ لکھا ہے:

سریتا بنرجی۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ۔

اب میں گھر لوٹ رہا ہوں۔ شہر کی تمام رونق ختم ہو چکی ہے۔ سڑکیں ویران ہو گئی ہیں۔ کہیں کہیں مدھم مدھم روشنی دکھائی دے رہی ہے لیکن ایسے جیسے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی ہو۔

اب میں امین آباد پارک کے سامنے پہنچ گیا ہوں۔ اب مندر میں کوئی آ جا نہیں رہا ہے۔ میں مندر کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھنا چاہتا ہوں لیکن نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ میں مندر کے اندر جانا چاہتا ہوں لیکن نہیں جا سکتا ہوں۔ میں بھگوان کا سامنا کرنا چاہتا ہوں لیکن نہیں کر سکتا ہوں۔ پھر نہ جانے کیوں میرا دل رونے کو چاہتا ہے۔

پھوٹ پھوٹ کر رونے کو!

بلک بلک کر رونے کو!!

آؤ! عہد کریں

تنویر سامانی

عظیم تاج! اے شہ کارِ صنعتِ تعمیر!
خیال میں تری پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
ترے جمال کی کیف آفریں حسیں کرنیں
تصورات کی وادی میں رقص کرتی ہیں

مرے وطن کی حسین و جمیل دھرتی پر
ترا وجود بھی اس امر کی علامت ہے
جہاں میں اہلِ محبت کی داستانِ حیات
فقط طلسمِ تصور نہیں، حقیقت ہے

یہاں تمدّن و تہذیب کے بلند منار
پکارتے ہیں ہمارے قریب آجاؤ
جنونِ فرقہ پرستی اتھاہ پستی ہے
اب اتحاد کے پرچم فضا میں لہراؤ

کرشن و رام کے خوابوں کی جنتِ ارضی
یہ سارناتھ، یہ متھرا، یہ کاشی و پریاگ
اسی مقدس و مشہور دیش میں گونجے
سکون و امن کے نغماتِ شانتی کے راگ

انھیں فضاؤں میں گوتم نے آنکھ کھولی تھی
یہیں سے پھیلی تھی دُنیا میں روشنی کی کرن
ہم ایسے دیش کے باسی ہیں جس کی دھرتی پر
عظیم کوہ ہمالہ ہے اور گنگ و جمن

تمھارے فکر و نظر کی تمھیں قسم، اُٹھو!
وطن کا واسطہ، اب ایکتا کو اپنائیں
دلوں میں شمعِ محبت کو یوں کریں روشن
کہ نفرتوں کے اندھیرے سمٹ کے رہ جائیں

جو انتشار پسندی کو دے رہے تھے ہوا
وہ ملک و قوم کے تخریب کار تھے، یارو!
وہ راہِ امن و صداقت تو کیا دکھا سکتے
جو خود ہی تیرہ شبی کے شکار تھے، یارو!

جو قومی یک جہتی کے تصورات یہاں
بیاں کیے تھے جہانگیر اور اکبر نے
اسی شعور کی تبلیغ و ارتقا کے لیے
پیامِ امن دیے گاندھی و جواہر نے

اے ہندو، مسلم و عیسائی! آؤ، عہد کریں
کبھی نہ فرقہ پرستی میں مبتلا ہوں گے
ہم آج ایک ہیں، اب ایک ہی سدا رہ کر
وطن کی عزت و ناموس پر فدا ہوں گے

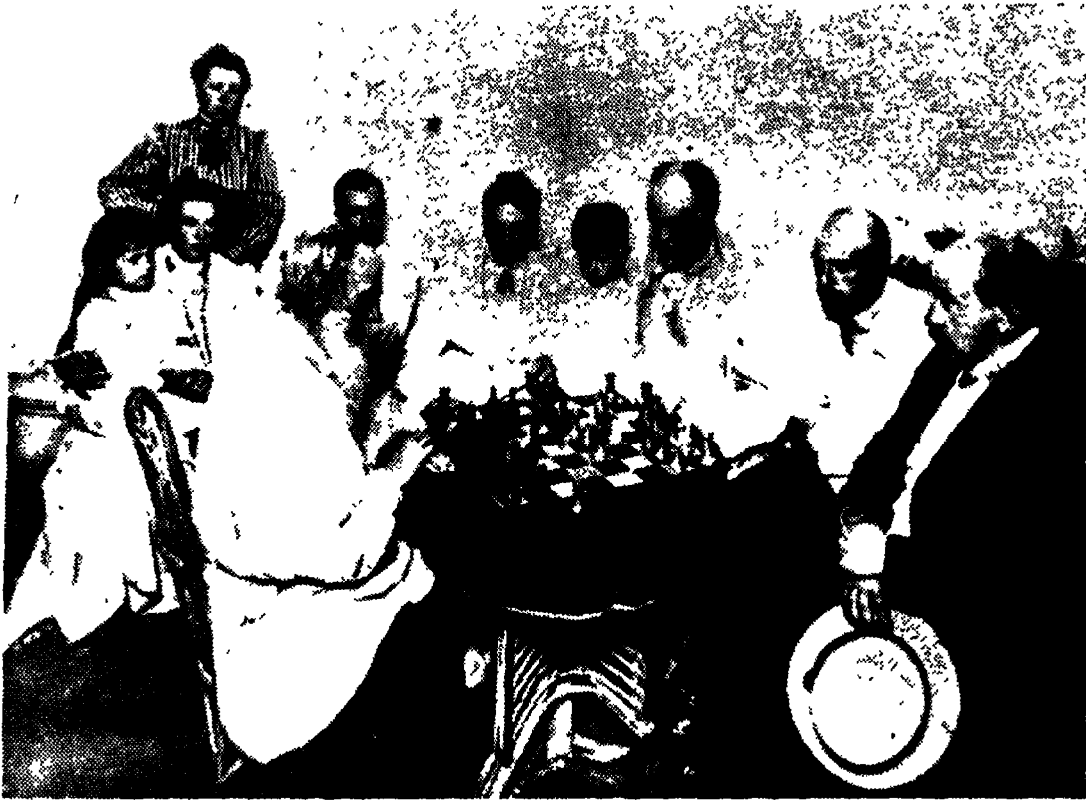
اکیلی دھند

تاج مہجور

ہوئی ہے تم سے ملاقات اجنبی کی طرح
شرابِ دید ملی بھی تو، تشنگی کی طرح

تمھارے ذہن میں بکھرے نہ رنگِ عہدِ وفا
نہ چمکی نظروں میں ماضی کی کوئی پرچھائیں
نہ ابھرا مین سرودر سے کوئی پیار کا چاند
کھلے نہ ہونٹوں پہ اقرار کے مہکتے پھول
نہ کانپ اُٹھی سرِ مژگاں خلوص کی شبنم
نہ جھلملائے خیالوں میں یاد کے دیپک
نہ شوقِ لمس کی بجلی سے چھو گئیں باہیں
نہ چیخ اٹھا غمِ ویرانیِ تہی آغوش
نہ دھڑکنوں کی نہ سرگوشیوں کی یاد آئی
بجی نہ دور کہیں آرزو کی شہنائی
تمھیں یقین نہ تھا، میں مگر نہ کہتا تھا!
کہ گردِ وقتِ گریزاں میں ڈوب جاتے ہیں
ہزاروں پیار، ہزاروں وفا کے ساغرِ جم
شعورِ آذرِ دل کے نظر نواز صنم

ہوئی ہے تم سے ملاقات اجنبی کی طرح
شرابِ دید ملی بھی تو، تشنگی کی طرح



تالستائی شطرنج کھیلتے ہوئے

تالستائی اور ہندستان

روس کے عظیم مفکر اور ممتاز ادیب لیو تالستائی، جن کی ۱۳۸ ویں سال گرہ ۹ر ستمبر کو منائی گئی۔ ایک جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ یوں تو اس گھرانے کو پیٹر اعظم کی بدولت زبردست شہرت نصیب ہوئی لیکن اس کی اس شہرت و مقبولیت میں اس خاندان کے افراد کا بھی بڑا ہاتھ رہا جنھوں نے اپنے علمی و ادبی ذوق و شوق کے باعث بڑا نام پیدا کیا۔ چناں چہ لیو تالستائی کے چچا زاد بھائی الکی تالستائی کا بھی اس عہد کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتا تھا۔

لیو اپنی خاندانی جاگیر یاسنایا پولیانہ میں جو ماسکو سے ۱۲۰ میل جنوب میں تولا کے قریب واقع تھی۔ ۲۸ر اگست ۱۸۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی وہ سن تمیز کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ ان کی ماں شہزادی میریا ولکنسکا اور ان کے والد شہزادہ نکولس تالستائی دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح ان کی اور ان کے بھائیوں کی تعلیم کے جاری رہنے کا اہم سوال پیدا ہو گیا۔ لیکن اس کی ذمے داری پہلے ان کی بڑی پھوپھی نے اور بعد میں چھوٹی پھوپھی نے اپنے سر لے لی اور لیو تالستائی کی تعلیم کے لیے ایک فرانسیسی معلم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پھر وہ ایک کالج میں داخل کیے گئے۔ لیکن کالج میں ان کی زندگی کچھ کامیاب نہیں رہی۔ والگا سے ۴۰۰ میل مشرق میں کازان یونیورسٹی میں بھی اپنے طور پر جو انھوں نے ہنگامہ خیز زندگی بسر کی اس سے وہ خود

بھی مطمئن نہ تھے۔

بالآخر ۲۳ برس کی عمر میں وہ قفقاز کی فوج میں ایک افسر کی حیثیت سے شامل ہوگئے اور اس کے دوسرے سال انھوں نے اپنی پہلی کتاب بچپن لکھی۔ یہ کتاب اگرچہ بڑی حد تک ان کے بچپن کے واقعات اور تاثرات پر مشتمل تھی لیکن اس نے یہ واضح کر دیا کہ وہ زبردست تخلیقی اور تنقیدی قوت کے مالک ہیں اور اس کتاب کی دھوم مچ گئی۔ وہ کریمیا کی جنگ میں لڑائی کے محاذ پر



یاسناپولیانا کے عجائب گھر میں تالستائی کے سونے کے کمرے کی ایک تصویر

باقاعدہ لڑے۔ جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں سے متاثر ہو کر انھوں نے (۱۸۵۵ء میں) سیواسٹوپول اسٹوریز کے عنوان سے تین افسانے لکھے۔ اس کے دس برس بعد انھوں نے اپنا مشہور ناول جنگ اور امن لکھا۔

سینٹ پیٹرس برگ میں چند سال قیام کرنے کے بعد تالستائی نے اپنی ریاست میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہاں کے کسانوں کی بہبودی کے کاموں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ یہیں سے ان کے فکر و احساس کی شعوری تبدیلی اور باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری زمانے میں تالستائی نے ایک کسان کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی لیکن ایک عالمی شہرت رکھنے والے مصنف کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ ان کی بیوی کو جو اگرچہ بڑی وفادار تھیں تالستائی کے بہت سے خیالات اور نظریات سے اتفاق نہ تھا۔ اس صورت حال سے پریشان ہو کر تالستائی نے مفقود الخبر ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے اور اسی اثنا میں بیمار پڑ گئے۔ بیماری ہی کی حالت میں ایک ریلوے اسٹیشن پر ۸۲ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

یہ ہے اس عظیم مفکر اور ممتاز ادیب کی زندگی کا ایک خاکہ جس نے اپنی خداداد ذہانت اور تخلیقی قوت کی بدولت انیسویں صدی کے عظیم ادیبوں، مفکروں اور دانشوروں کی صف میں ایک ممتاز جگہ بنالی۔

تالستائی کو ہندستان اور ہندستان کی عوامی زندگی سے ابتدا ہی سے گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ جب ۱۹ برس کے تھے تو کازان میں ایک بودھ بھکشو سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسی وقت سے تالستائی ہندستان کی زندگی سے گہری دلچسپی لینے لگے اور ہندستانی فلسفے، ادب اور مذہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ہندستان کی ممتاز عوامی شخصیتوں سے یوں تالستائی کی خط و کتابت ۱۹۰۱ء میں شروع ہوئی۔ انھوں نے ہندستانی مصنف اے۔ رلما شیشن کے خطوں کا بھی جواب دیا تھا۔ رلما شیشن نے انھیں لکھا تھا: "میرے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت آپ کے نام سے واقف ہے۔ آپ کے افسانوں سے انھیں گہری دلچسپی ہے۔"

تالستائی نے ۱۹۰۳ء۔۱۹۰۴ء میں مذہبی امور سے متعلق ان خطوں کا جواب دیا تھا جو انھیں ہندستانی مسلمانوں کے لیڈر مفتی محمد صادق صاحب نے لکھے تھے۔ انھوں نے مشہور ہندستانی فلسفی بابو پریانند بھارتی کو بھی ان کے خطوں کے جواب میں خطوط لکھے جو ۱۹۰۵ء-۱۹۰۷ء رسالہ لائٹ آف انڈیا میں شایع ہوتے رہے۔ پروفیسر

راما دیوا ایڈیٹر وید ک میگزین اور ڈی گوپال چیٹی ایڈیٹر نیو ریفارمر مدراس سے بھی تالستائی کی خط و کتابت تھی۔ تالستائی کو عام ہندستانیوں کے خط بھی وصول ہوتے تھے جو اپنے افلاس، بھوک اور برطانوی حاکموں کی حکومت کے خلاف شکایت کرتے تھے۔

تالستائی کے مشہور مخالفِ حکومت پمفلٹ میں چپ نہیں رہ سکتا کی دنیا کے مختلف اخبارات میں اشاعت کے بعد ہندستان سے موصول ہونے والے خطوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اسی زمانے میں تالستائی نے ہندستانی عوام کو ایک پیغام دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ دوستی کا پیغام تھا جس میں ہندستانیوں کی قومی آزادی کی جد و جہد سے ہمدردی ظاہر کی گئی تھی۔ اس پیغام کا لوک ایک خط تھا جو تالستائی کو مشہور ہندستانی اخبار ولیس ترک ناتھ داس نے لکھا تھا شری داس اس وقت امریکہ سے ایک سالہ اخبار ہندستان شایع کر رہے تھے۔

تالستائی نے جون ۱۹۰۸ء میں ہندستان سے متعلق ایک جامع مضمون لکھنا شروع کیا جو اسی سال دسمبر میں مکمل ہو گیا۔ اس عرصے میں تالستائی نے ہندستانی فلاسفروں کی کتابیں اور شاعروں کا کلام دوبارہ پڑھا اور ہندستانی لوک گیتوں کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ اس مضمون میں بھی ہندستان کے مقدس ویدوں، اپنیشد اور سوامی ویویکا انھوں نے ہندو کے نام خط میں نوآبادیاتی نظام کا پردہ چاک کیا۔ اس خط میں تالستائی نے لکھا تھا کہ "ایک تجارتی کمپنی نے ۲۰ کروڑ عوام کو غلام بنا لیا ہے۔ یہ بات اگر کسی ایسے شخص سے کہی جائے جو تعصب سے پاک ہو تو اس کی سمجھ میں اس کا مطلب نہیں آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۳۰ ہزار افراد نے جو بہادر نہیں بلکہ کمزور اور برے لوگ ہیں ۲۰ کروڑ لوگوں کو جو زندہ، ہوشیار اور طاقتور ہیں اور جو آزادی کے شیدائی ہیں غلام بنا دیا ہے" اور یہ کہ ہندستان میں یہ بات خاص طور پر عجیب دکھائی دیتی ہے کیونکہ ..... یہ (ہندستانی) لوگ زبردست ذہنی اور جسمانی طاقت کے مالک ہیں مگر ایسے مٹھی بھر لوگوں کے محکوم ہیں جو ان لوگوں کے مقابلے میں جن پر وہ حکومت کرتے ہیں بے انتہا گھٹیا ہیں۔"

اس خط نے مہاتما گاندھی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ پہلی بار تالستائی کو جن کے خیالات اور اکثر تصانیف سے وہ اس وقت تک (۱۹۰۹ء) واقف ہو چکے تھے خط لکھیں۔

تالستائی اور مہاتما گاندھی کی خط و کتابت تالستائی اور مشرق نامی کتاب کی صورت میں ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ شایع کی گئی۔ گاندھی جی نے تالستائی کو پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لندن سے لکھا تھا۔ تالستائی نے گاندھی جی کے خط کا ۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو جواب دیا اور اس کے ساتھ دوستی کا پیغام بھی بھیجا جس میں جبر و تشدد کے خلاف ان کی (گاندھی جی کی) جد و جہد سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔



ہندوستان کا اہم کردار

آزاد ہندوستان کے وسائل وسیع ہیں اور وہ دنیا اور انسانیت کے لیے بڑی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ ہماری قسمت میں بڑی باتیں ہیں۔ اگر ہم گرتے ہیں تو نیچے گرتے ہیں، اگر اٹھتے ہیں تو لازمی طور پر دنیا کے ناٹک میں اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں ___ جواہر لال نہرو

غزل

ندرت کان پوری

اسرار پہ ساقی کے، وہ کم سخنی میری
نظّارے کے قابل تھی تو بے شکنی میری

پوشاک پہ کلیوں کی، کچھ عکس پڑا میرا
غنچوں کے بھی کام آئی، گل پیرہنی میری

میں تشنہ بہ لب اُٹھتا، پھر آج اُسی در سے
ساقی کو گراں گزری، کچھ طعنہ زنی میری

غربت میں قدم رکھ کر، اغیار پھلیں پھولیں
مجھ کو تو مبارک ہو، حبّ الوطنی میری

گو نیم نگاہی سے تکلیفِ توجّہ کی
محسوس تو کی اُس نے کچھ دل شکنی میری

کیا تیری حقیقت ہے، اے قطرۂ بے مایہ
طوفاں کی موجوں سے، سو بار ٹھنی میری

اخلاق مرا شیوہ، تہذیب مرا حصہ
کچھ عیب اسی میں تھا جس سے نہ بنی میری

آہوں سے نہ بدلے گا، دستورِ تغافل کا
کچھ کام نہ آئے گی، ناوک فگنی میری

نسبت ہے مجھے کوئی، اُس جانِ گلستاں سے
تعظیم کرے ندرتؔ، سروِ چمنی میری

غزل

قیصر قلندر

تری نگاہ سے کھلتے ہیں آرزو کے گلاب
مہکنے لگتے ہیں خاموش گفتگو کے گلاب

ترے دیار سے آئی ہے پھر نسیمِ خیال
تری ادا کو ترستے ہیں جستجو کے گلاب

خلوصِ فکر کی خوشبو چمن چمن رقصاں
نکھار پر ہیں ترے شہر میں نمو کے گلاب

بس اِک ادا سے اُٹھا شور مے کدوں میں یہاں
بہار آئی، کھلے پھر سبو سبو کے گلاب

شبِ فراق تھی صحرا کی طرح بے پایاں
دہک رہے ہیں ابھی حسنِ روبرو کے گلاب

بھٹک رہا ہوں ابھی اجنبی دیاروں میں
کہاں کہاں پہ کھلے، یادِ رنگ و بو کے گلاب

وہ ایک لمحہ جو تھا حاصلِ بہارِ وفا
اُس ایک لمحے کو ترسے ہیں آرزو کے گلاب

وفا کی شمع بجھی، خوں ہوا تمنّا کا
نگاہِ درد میں مہکے لہو لہو کے گلاب

جمالِ فکر ہے قیصرؔ گلاب سی یہ غزل
نگارِ شعر نے پہنا دیے گلو کے گلاب

ادب اور ماحول

معراج احمد

ادب اور ماحول کے بیچ جو رشتہ ہے اس کو واضح کرنے کے لیے ہم کو تحقیق کے جدید طریقے کو بروئے کار لاتے ہوئے اس امر کو متعین کرنا ہوگا کہ ماحول کسے کہتے ہیں اور وہ کس حد تک ادب کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن صرف اتنا ہی واضح کر دینا کافی نہیں ہوگا کیونکہ ادب اور ماحول کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ایک طرفہ نہیں ہے۔ صرف ماحول ہی ادب کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ادب بھی ماحول کو متاثر کرتا ہے۔ ماحول اگر ادب پر اثر انداز ہوتا ہے تو خود بھی ادب سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ادب ماحول پر اثر ڈالتا ہے تو خود بھی ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ ادب اور ماحول کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ایک "انحصار باہمی" کا رشتہ ہے۔ اس مقالے میں ہم صرف اس امر سے بحث کریں گے کہ ماحول کسے کہتے ہیں، ماحول کن عناصر کے مجموعے کا نام ہے اور وہ کس طرح اور کس حد تک ادب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

آئیے، اب ہم یہ تجزیہ کریں کہ ادب کسے کہتے ہیں اور اس کے اجزائے ترکیبی اور عناصر کیا ہیں۔ گسبرٹ (GISBERT) نے ماحول کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: " ماحول کوئی بھی ایسی شے ہو سکتی ہے جو کسی شے کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور اس پر براہ راست اثر ڈال رہی ہو۔"[1]

راس (ROSS) نے ماحول کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: "ماحول کوئی بھی باہری قوت یا طاقت ہے جو ہم پر اثر ڈالتی ہو۔"[2] انسان کے چاروں طرف دو قسم کا ماحول ہوتا ہے۔ (۱) فطری ماحول اور (۲) انسان کا تعمیر کردہ سماجی، تہذیبی و ثقافتی ماحول۔ فطری ماحول میں ہم زمین کی سطح (معہ اپنی تمام اشکال اور قدرتی ذرائع کے) زمین اور پانی کی تقسیم، پہاڑ اور میدان، معدنیات، حیوانات اور نباتات، آب و ہوا اور تمام دوسری کائناتی (COSMIC) قوتوں کو شامل کرتے ہیں جو فرد کی زندگی اور اس کے سماج کی تنظیم کو متاثر کرتی ہیں۔ سماجی، تہذیبی و ثقافتی ماحول (جس کو ہم کسی قوم کے تہذیبی سرمایے یا ورثے کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں) سے ہماری مراد کسی دور میں کسی قوم یا سماج کے تہذیبی اقدار، سیاسی رجحانات، سماجی کیفیات و انقلابات، رسم و رواج فنون لطیفہ، قوانین، معیار زندگی، سائنس اور تکنیک سے

---

[1] ENVIRONMENT IS ANYTHING IMMEDIATELY SURROUNDING AN OBJECT AND EXERTING DIRECT INFLUENCE ON IT. [2] ENVIRONMENT IS ANY EXTERNAL FORCE WHICH INFLUENCES US.

ہوتی ہے جن کی تخلیق و تشکیل انسان خود کرتا ہے ۔ یہ دونوں قسم کے ماحول فرد کی زندگی، اس کے سماجی رشتوں، اس کی سماجی تنظیم اور اس کے ادب اور آرٹ کو متاثر کرتے ہیں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں اقسام کے ماحول کے اثرات قوموں کے ادب پر کیا پڑتے ہیں۔

فطری ماحول اور ادب ۔ کوئی بھی فن کار چاہے وہ شاعر ہو یا نثر نگار یا تنج یا ڈرامہ نگار یا ناولسٹ یہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ، بلکہ یہ سب ہونے سے قبل، ایک انسان ہوتا ہے ۔ وہ ایک مخصوص فطری ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے ۔ وہ جس فطری ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور پرورش پاتا ہے اس کا اثر اس کے جسم کی بناوٹ، اس کی جلد کے رنگ، اس کی ذہانت، اس کی قوت متخیلہ، اس کے عادات و اطوار، اس کے رہن سہن، رکھ رکھاؤ، لباس اور پیشے پر پڑتا ہے۔ وہ ایک مخصوص فطری ماحول کا عادی ہو جاتا ہے اور اس ماحول کے لیے اس کے دل میں ایک فطری لگاؤ اور جذبۂ محبت پیدا ہو جاتا ہے جس کو ہم "حب الوطنی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ ہندوستانی ادب میں ہمالہ کی عظمت و جمال کا ذکر، وادیٔ گنگ و جمن کا تذکرہ، گاؤں کے مناظر کی عکاسی، برکھا رت کی تصویر کشی جگہ جگہ موجود ہے۔ اس کی فطری وجہ یہی ہے کہ ہمارے چاروں طرف جو قدرتی ماحول ہے اس سے ہمیں ایک گہرا فطری لگاؤ ہے ۔ ہم اسی ماحول میں پلے ہیں ۔ یہ ماحول ہماری روح، ہماری فکر و نظر میں رچا ہوا ہے۔ اسی لیے ہم اپنی نظموں میں، کہانیوں میں، ڈراموں میں، ناولوں میں اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جو ہمارا اپنا ماحول ہے، جو ہماری رگ و پے میں، ہماری شریانوں میں جاری و ساری ہے ۔ ہماری نظموں، کہانیوں، ڈراموں اور ناولوں کا پس منظر وہی ہوتا ہے جو ہمارا، ہمارے خاندان کا، ہمارے سماج کا پس منظر ہے۔ یعنی ہمارا اپنا وطن، ہمارا قدرتی ماحول، ہمارے پہاڑ، ندیاں، میدان، چشمے، آبشار، پیڑ پودے، پھول، پتے اور جانور ـــــ ہماری طرح ہر قوم اپنے ادب میں اپنے ہی مخصوص فطری اور جغرافیائی ماحول کی عکاسی کرتی ہے اس لیے کہ ہر قوم کے افراد کو اپنے قدرتی ماحول سے ایک فطری و نفسیاتی لگاؤ ہوتا ہے اور اسی ماحول کی آغوش میں ان کی زندگی پروان چڑھتی ہے اور اسی فطری ماحول کی دھوپ چھاؤں میں ان کی فکر و نظر اور شعور کی پرورش ہوتی ہے ۔ ہندوستانی ادب میں نرگس، یاسمن، نسرین و نسترن، بیلا، جوہی، گلاب اور اسی قسم کے دوسرے ہندوستانی پھولوں کا تذکرہ جگہ جگہ ملتا ہے جب کہ انگریزی ادب میں ان پھولوں کے بجائے ڈیزی (DAISY) ڈیفوڈلس (DAFFODILS) اور وائلٹس (VIOLETS) کا تذکرہ عام ہے جو اس فطری ماحول کے پھول ہیں۔ ہمارے یہاں اگر کوئل، پپیہے، قمری اور عندلیب کا تذکرہ عام ہے تو وہاں اسکائی لارک (SKY LORK) لنٹ (LINNET) اور رابن (ROBIN) کا، عربی ادب میں ریگستان، اونٹ، نخلستان کی ہریالی و شادابی اور کھجور کا تذکرہ عام ہے کیونکہ یہ عربوں کا مخصوص اور فطری ماحول ہے۔ غرض دنیا کی کوئی بھی دو قومیں ہوں، ان کے ادب کا فطری پس منظر شاید ہی ایک سا ملے چنانچہ اوڈیسی (ODYSSEY) اور ایلیڈ (ILIAD) کا فطری پس منظر رامائن اور شکنتلا کے پس منظر سے مختلف ہے۔ شکسپیر کے ڈراموں کا فطری ماحول اور پس منظر کالی داس اور آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کے پس منظر سے بالکل ہی الگ اور جداگانہ ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں بھی گاؤں کے ماحول کی عکاسی ہے اور جین آسٹن (JANE AUSTIN) اور ٹامس ہارڈی (THOMAS HARDY) کے ناولوں میں بھی ۔ لیکن پریم چند کے ناولوں کا پس منظر ہندوستانی گاؤں ہیں ـــ یہاں کے بھولے بھالے کسان، ہل اور کھیت، مندر اور کنویں، پنگھٹ اور باغات ـــ جب کہ جین آسٹن اور ہارڈی کے ناولوں کا پس منظر انگلینڈ کے دیہاتوں کا پس منظر ہے۔ شکسپیر، ملٹن، ورڈسورتھ، شیلی، کیٹس اور بائرن نے جو تشبیہات و استعارات استعمال کیے ہیں ان پر واضح طور پر انگلینڈ کے قدرتی اور جغرافیائی ماحول کی گہری چھاپ ہے اور وہیں کے فطری پس منظر اور ماحول سے وہ تشبیہات و استعارات لیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس میر، سودا، مومن، غالب اور انیس نے جو تشبیہات و استعارات استعمال کیے ہیں وہ ہندوستان کے فطری ماحول کی جانی پہچانی چیزیں

ہیں ۔ انگریزی ادب میں ورڈس ورتھ کو "شاعر فطرت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

اس نے فطرت کے جن مناظر کی عکاسی اپنی شاعری میں کی ہے وہ اس کے ملک انگلستان کی ہیں ۔ وہیں کے مناظر کا ، وہیں کے صبح و شام کا ، وہیں کی بہار کا ، وہیں کے پھولوں اور پرندوں کا تذکرہ اس کی شہرۂ آفاق نظموں میں ملتا ہے ۔ اس کے برعکس اردو کے شعرا کے یہاں ہم کو ہمالہ ، وادیٔ گنگ و جمن گاؤں کے مناظر ، برکھا رت ، پنگھٹ ، باغات اور پھولوں کی تصویر کشی و عکاسی ملتی ہے جو ہندوستان کے فطری ماحول کی خاص چیزیں ہیں ۔

اسی قسم کی سیکڑوں مثالیں یہ واضح کرنے کے لیے دی جا سکتی ہیں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر اپنی نثر اور نظم میں اپنے ہی قدرتی ماحول کی عکاسی اور مدح سرائی کرتے ہیں ، اسی کو اپنے ڈراموں ، ناولوں اور کہانیوں کا پس منظر بناتے ہیں اور اسی سے تشبیہات و استعارات لیتے ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک یا قوم کے فطری یا جغرافیائی ماحول کی وہاں کے ادب پر گہری چھاپ ہوتی ہے ۔ یعنی فطری ماحول براہ راست اور بالواسطہ انسان کی فطرت ، احساسات ، فکر و شعور اور قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے اور پھر اسی کے وسیلے سے اس ملک یا قوم کے ادب اور فنون لطیفہ پر اثر انداز ہوتا ہے ۔

سماجی و تہذیبی ماحول اور ادب ۔ فطری ماحول کے ساتھ ہی ساتھ کسی قوم کا تہذیبی اور سماجی ماحول بھی ادب کو متاثر کرتا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ کسی قوم کا ادب اس کے تہذیبی سرمائے کا ہی ایک جز ہوتا ہے ۔ اس تہذیبی ماحول کے رسم و رواج ، علوم ، عقائد ، قوانین ، نگار ، طرز زندگی ، طرز فکر ، رہن سہن ، کام کرنے اور سوچنے سمجھنے کے طریقے اس تہذیب کے افراد کی شخصیت کا (جن میں ادیب کی شخصیت بھی شامل ہوتی ہے) ایک اہم جز بن جاتے ہیں ۔ ایک نثر نگار ، شاعر ، ڈرامہ نگار ، ناول نگار اور مورخ کے ذہنی رجحانات (اگر اس کی پرورش نارمل لائنوں پر ہوئی ہے) اپنے سماج کے تہذیبی اور سماجی رجحانات سے مختلف نہیں ہوتے کیونکہ ایک ادیب بھی

اور افراد کی طرح بچپن ہی سے اپنے سماج کے تہذیبی اقدار سے تعلیم و تربیت ، رہن سہن ، ربط وضبط وغیرہ کے عمل کے ذریعے متاثر ہونے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے یہ تہذیبی اقدار اس کی شخصیت اور عادات و اطوار کا ایک فطری اور بنیادی جز بن جاتے ہیں اور انھیں کی بنیاد پر اس کی شخصیت کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف سماجوں اور مختلف تہذیبوں کی پروردہ شخصیتیں بھی بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہیں ۔ ہندوستانی لوگوں کی بنیادی شخصیت ، ان کے رجحانات ، عقائد ، اقدار ، سوچنے اور کام کرنے کے ڈھنگ انگلینڈ ، فرانس ، جاپان اور برما کے لوگوں سے مختلف ہیں ۔ تہذیبی اقدار کی بنیادوں پر نشوونما ہونے کے باعث ہم دو ملکوں کے افراد کی شخصیات کو ایک سا نہیں پا سکتے اور یہی بنیادی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کا ادب بھی یکساں سماجی اور تہذیبی اقدار کا حامل نہیں ہوتا ہے ۔ انگریزی شاعری میں شاعر اپنے محبوب کو کھلم کھلا جنس مخالف کے ایک فرد کی حیثیت سے مخاطب کرتا ہے ، واضح الفاظ میں جذبۂ عشق اور خواہش وصل کا اظہار کرتا ہے ، اس کے سراپا کی بالکل ہی کھلے الفاظ میں تعریف کرتا ہے ۔ اس کے پیکر کے ہر عضو کی نمایاں طور پر تصویر کشی کرتا ہے ، جگہ جگہ بوس و کنار کا تذکرہ کرتا ہے ۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انگریزی تہذیب کے اقدار یہی ہیں ۔ وہاں صدہا سال سے دونوں جنسوں کے افراد کو آپس میں ملنے جلنے کی آزادی رہی ہے اور جنسی مساوات اور آزادی انگریزی تہذیب کا ایک خاصہ رہی ہے ۔ اس کے برخلاف ایک ہندوستانی شاعر کبھی اتنی بے باکی سے اپنے محبوب کے خد و خال اور اپنی خواہش وصل کا تذکرہ نہیں کرتا بلکہ اشارات و کنایات سے کام لیتا ہے اس لیے کہ ہندوستانی تہذیب نے کبھی عورتوں اور مردوں کے آزادانہ ملنے جلنے کو بہ نظر تحسین نہیں دیکھا اور عورت کے لیے شرم و حیا کے نظریات صدیوں سے ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم جز رہے ہیں ۔

کسی خاص دور کے سیاسی رجحانات ، معاشی الجھنیں اور سماجی کیفیات بھی ادب کو متاثر کرتی ہیں ۔ ملٹن کی شاعری میں اس کے دور

کے سیاسی رجحانات اور سماجی نظریات جھلکتے ہیں۔ ملٹن کے دور میں انگلینڈ میں مذہبی اور اخلاقی معاملات میں احتیاط پسندی (PURITANISM) کا غلبہ تھا۔ سادگی پسند زندگی، رسم و رواج کی اندھی تقلید اور غلامی سے آزادی کا جذبہ، کلیسا کے مادّہ پرست اور جاہ و حشمت پر مبنی رجحانات سے تنفر — یہ تمام چیزیں جو ملٹن کے دور کے انگلینڈ کے تہذیبی اور سماجی ماحول پر طاری تھیں اس کی تحریروں میں نمایاں طور پر جھلکتی ہیں۔ شیلی (SHELLEY) رومانی احیا (ROMANTIC REVIVAL) کے دور کا شاعر تھا۔ اس وقت کا انگریزی سماج فرانسیسی انقلاب کے محرکات اور نتائج سے بہت متاثر تھا۔ اصلاحی تحریک زوروں پر تھی۔ "آزادی، مساوات اور اخوت" فرانسیسی انقلاب کا ایک ایسا نعرہ تھا جس سے شیلی کے دور کے انگلینڈ کا ماحول گونج رہا تھا۔ یہ تمام رجحانات اور محرکات شیلی کی شاعری میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ شیلی کو انقلاب کا شاعر کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ فرانسیسی انقلاب کے محرکات، نتائج اور اثرات کا بہترین مغنی اور مطرب تھا۔ موریس (MORRIS) کے زمانے میں انگلینڈ میں سوشلسٹ نظریات زور پکڑ رہے تھے۔ سماج کے ہر طبقے میں سماجی اور معاشی برابری، مزدوروں کے استحصال کے خاتمے، سماجی انصاف اور رواداری، وغیرہ کے نعرے لگ رہے تھے۔ چناں چہ موریس کی تحریروں پر اس دور کے تہذیبی اور سماجی ماحول کی گہری چھاپ ہے۔

میر تقی میرؔ بنیادی طور پر ایک غزل گو تھے اور غزل ایک ایسی صنف ادب ہے جس کا تعلق سماجی حقایق سے کم اور قوت متخیلہ اور ذاتیات سے زیادہ ہے۔ پھر بھی میرؔ کے یہاں اکثر مقامات پر ہم کو اس دور کی سماجی کش مکش، افراتفری اور بے اطمینانی کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ غالبؔ کے یہاں بھی ہم کو اکثر مقامات پر اس دور کی سیاسی اور سماجی کش مکش اور اس کش مکش سے بے زاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ معاصرین میں بھی ہر ایک کے یہاں ہم کو موجودہ دور کی سماجی ناانصافی، کش مکش، کس مپرسی، بے اطمینانی اور انتشار کی عکاسی ملتی ہے۔ یہ عکاسی کہیں بالکل واضح ہے اور کہیں علامتی اور اشاراتی۔ صورت یہ ہے کہ اگر کوئی ادیب شعوری طور پر اس بات کی کوشش بھی کرے کہ وہ اپنی تحریروں میں تہذیبی اقدار، سیاسی رجحانات اور سماجی کیفیات کو قطعی داخل نہیں ہونے دے گا تو یہ ناممکن ہے کیوں کہ ادیب کے تہذیبی ماحول اور سماجی اور طبقاتی پس منظر کے نقوش غیر شعوری طور پر اس کی تحریروں میں منعکس ہو جاتے ہیں اور یہ عمل چونکہ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اس لیے یہ بہت ہی اشاراتی (SYMBOLIC) ہوتا ہے۔ ادیب لاکھ کوشش کرے لیکن وہ اپنے تہذیبی اور سماجی ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتا کیوں کہ اس کی زندگی بھی اور افراد کی طرح اس کے سماج کا ایک جز ہوتی ہے۔

غرض، کسی بھی قوم یا کسی بھی دور کا ادب اس قوم یا دور کے تہذیبی ماحول کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس تہذیبی و سماجی ماحول کا ادب پر کس قدر گہرا اثر ہوتا ہے اس کو ہم اس امر سے سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کسی قوم کے عروج یا زوال کے کسی دور کی جامع تاریخ موجود نہ ہو تو بھی ہم اس قوم کے اس مخصوص دور کے ادب کا بہ غور مطالعہ کرکے یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ اس دور میں اس قوم کے سماجی اور سیاسی حالات کیا رہے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں، ادب کسی قوم یا ملک کے تہذیبی سرمائے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

ان باتوں کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کسی بھی قوم کا تہذیبی اور سماجی ماحول ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ اس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کتنی ہی سست رفتاری سے کیوں نہ ہوں لیکن ہوتی ضرور ہیں کیوں کہ تغیر قانونِ کائنات ہے۔ تہذیبی و سماجی ماحول میں ہونے والی تبدیلیاں ادب کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی قوم کے مختلف ادوار کا ادب اپنے رجحانات، اقدار، اسٹائل اور فکر کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتا۔ ادب کے موضوعات بھی سماجی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس اور تکنیک کی ترقی کا بھی ادب پر اثر پڑتا ہے۔ اگر ہم تیرھویں صدی کے انگریزی ادب کا مقابلہ اٹھارھویں صدی کے انگریزی ادب سے کریں تو ہم کو ان دونوں ادوار کے ادب میں ایک نمایاں فرق نظر آئے گا۔

اس فرق کو ہم دونوں ادوار کے تہذیبی اور سماجی ماحول کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ جیسے جیسے سماجی اور تہذیبی ماحول بدلتا ہے، سماجی اقدار، سیاسی رجحانات، قوانین، رسم و رواج اور نظریات بدلتے ہیں ویسے ویسے ادب کے ظاہری اور باطنی اشکال میں بھی تبدیلی ہوتی ہے، ادب کے موضوعات بدلتے ہیں، عنوانات بدلتے ہیں، ہیئت بدلتی ہے، اسٹائل بدلتا ہے۔ چین اور پاکستان کے حالیہ حملوں کے بعد ہندوستان کے سماجی ماحول میں یکایک ایک زبردست تبدیلی آگئی تھی۔ قوم کے امن و آزادی کو زبردست خطرہ لاحق ہوگیا تھا اور پوری قوم میں حب الوطنی کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی تھی۔ ملک کے ہر حصے کے لوگ اپنے علاقائی، لسانی اور صوبائی اختلافات اور جھگڑوں کو بھول کر اتحاد اور ایکتا کے مضبوط رشتے میں بندھ گئے تھے۔ رنگ و نسل کی تفریق، ذات پات کا بھید بھاؤ، اونچ نیچ اور طبقاتی امتیاز سب ختم ہوگئے تھے اور پوری قوم ایک آہنی دیوار کی مانند دشمن کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس بدلے ہوئے سماجی ماحول کا ہندوستان کے ادب پر بھی زبردست اثر پڑا تھا۔ ادب کے ہر شعبے اور ہر صنف کا ایک ہی موضوع تھا اور وہ تھا حب الوطنی۔ ہندی شاعری میں سنگھار رس کی جگہ "ویر رس" نے اور اردو شاعری میں جمالیاتی اور عشقیہ شاعری کی جگہ "رزمیہ شاعری" نے لے لی تھی۔ فوج کے بہادر سپوتوں کی شان میں نظمیں، قصیدے، کہانیاں، افسانے اور مضامین ان گنت تعداد میں ہندوستان کی ہر زبان میں لکھے گئے۔ ادب نے قوم کو متحد کرنے، رنگ و نسل پر نیز علاقائی اور لسانی امتیازات کو مٹانے اور بہادر فوجیوں کی ہمت افزائی کرنے کا مقدس اور قومی فرض سنبھال لیا تھا چنانچہ بدلتے ہوئے سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ ادب بھی بڑی تیزی سے بدلا تھا۔

اردو ادب میں سو سال قبل "ترقی پسند ادب" نام کی کوئی شے نہیں تھی اس لیے کہ اس وقت ملک و قوم کا جو سماجی اور سیاسی ماحول تھا اس پر مارکسزم، سوشلزم اور کمیونزم جیسے فلسفہ ہائے حیات اور سیاسی رجحانات کا غلبہ نہیں تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جب قوموں میں روح آزادی بیدار ہوئی اور کارل مارکس کی تحریروں کے ساتھ سوشلزم اور اشتراکیت کے نظریات پھیلے تو پرانا تہذیبی اور سماجی ماحول بھی تغیر پذیر ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی نئی نئی تحریکوں نے سر ابھارا۔ اردو ادب میں مارکسزم کی تحریک اور ترقی پسند رجحانات، سماجی ماحول میں نئے تغیرات کا ہی نتیجہ ہیں۔ کل ادب کا جو رنگ روپ تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ سماجی ماحول بدلے گا اور اس کے ساتھ ادب بھی بدلتا رہیگا۔



تشدد کی راہ خطرناک

"تشدد کی راہ خطرناک ہے اور جہاں تشدد ہوتا ہے وہاں آزادی زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہتی"

——— جواہر لال نہرو

غزل

افتخار احمد فخر دھولیاوی

حُسن تھا حُسن کہاں ؟ حُسنِ نظر سے پہلے
بے خبر آپ تھے خود ، اپنی خبر سے پہلے

چھن کے نکلی جو ضیا پردۂ در سے پہلے
اک اُجالا ہوا تنویرِ سحر سے پہلے

مے کدہ بھی ہے سرِ راہِ حرم ، اے زاہد!
کیوں نہ ہم ہو کے چلیں آج اِدھر سے پہلے

رونقِ عالمِ امکاں ہے ہمیں سے ورنہ
ایک سناٹا تھا تخلیقِ بشر سے پہلے

کشتِ غم تب کہیں سیراب ہوئی ہے یارو!
خون برسا ہے بہت دیدۂ تر سے پہلے

چارہ تنکے بھی کہاں ؟ باغ میں اے آتشِ گل!
آشیاں جل اُٹھا طوفانِ شرر سے پہلے

بے خبر قطرۂ نیساں سے ہے آغوشِ صدف
مرحلے اور ہیں تکمیلِ گہر سے پہلے

جب بھی گردوں نے کوئی تازہ غم ایجاد کیا
ابتدا اُس کی ہوئی میرے جگر سے پہلے

باغِ ہستی سے اگر ہم کو سفر لازم ہے
زادِ رہ کچھ تو ضروری ہے سفر سے پہلے

ہوگی شاداب نہ کیوں کشتِ تمنّا اپنی ؟
ہم نے سینچا ہے اگر خونِ جگر سے پہلے

شوق اک شرط ہے بس راہِ طلب میں اے دل!
منزلیں زیرِ قدم ہوں گی سفر سے پہلے

سخت ہے اُن کے لیے جادۂ دشوارِ حیات
ہوں جو واقف نہ تری راہ گزر سے پہلے

اب زمانے میں کہاں قدرِ ہنر باقی
سوچ لو فخر یہاں عرضِ ہنر سے پہلے

غزل

عالی جعفری

اُس دل سے پوچھو ، پالیا جس نے ستم کا راز
تم خود سمجھ نہ پاؤگے اپنے کرم کا راز

یہ دل کہ رہ چکا ہے صنم خانہ مژدۂ تو سن
اِس دل میں گونجتا ہے مآلِ صنم کا راز

دامن میں جذب ہو کے خیالوں میں گم ہوا
کس طرح کوئی پائے مری چشمِ نم کا راز

جب رات کے اندھیرے میں کلیاں مہک اٹھیں
تب پایا ہم نے گیسوئے پُرپیچ و خم کا راز

مے پی کے شوقِ رقص ، سرِ مے کدہ ، نہیں
دُنیا پہ کھُل نہ جائے کہیں کیف و کم کا راز

اِک جستجو لیے پھری ہم کو کشاں کشاں
لو آج تم سے کہہ دیا اپنے الم کا راز

عالؔی کو مل گئی ہے محبّت کی تازگی
بس اس قدر ہے اُس کے دلِ تازہ دم کا راز

ہندستان کی صنعتِ فلم سازی

اور

بچّوں کی فلمیں

دورِ حاضر میں سینما تفریح کا سب سے اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ یہ ہر عمر کے لوگوں کے لئے اپنے اندر یکساں کشش اور جذب رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی کشش بچے ہوں یا نوجوان یا ادھیڑ عمر کے لوگ، سبھی کو کشاں کشاں سینما گھروں میں لے جاتی ہے۔ ہندستان میں بھی فلم بینی اسی طرح مقبول اور محبوب مشغلہ ہے جس طرح دنیا کے دوسرے حصوں میں ہے۔

ہندستان میں سینما کا رواج دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بعد میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی صنعت فل... ابھی کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخ ۱۹۱۳ء سے شروع ہوتی ہے جب ہندستان میں "راجہ ہریش چندر" کے نام سے پہلی خاموش فلم تیار کی گئی۔ اگرچہ یہ صنعت ابھی چھوٹے پیمانے پر اور عہد طفولیت میں تھی لیکن ۱۹۲۲-۲۳ء تک بنگال اور بمبئی کے صوبوں میں سینما کے ٹکٹوں کی فروخت سے حاصل ہونے والا مالیہ اس صنعت کی ترقی کا ایک اہم جز بن گیا۔ اس کے بعد کے چند برسوں میں ہندستان کی صنعت فلم سازی نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور ۱۹۳۱ء میں پہلی بولتی ہوئی فلم "عالم آرا" منظرِ عام پر آئی۔ اس فلم کے منظرِ عام پر آنے سے صنعت فلم سازی میں ایک انقلاب آ گیا اور اس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں چار چاند لگ گئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چار برس کے اندر یعنی ۱۹۳۵ء تک بولتی ہوئی فلموں کی تیاری کی تعداد ۲۳۳ تک پہنچ گئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے ہی نہیں کہ سینما شہروں اور قصبوں میں تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا تھا بلکہ اس صنعت نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ سینما کی فلمیں بنانے والے دنیا کے دوسرے ملکوں میں ہندستان کو تیسرا درجہ حاصل ہو گیا۔ جنگ کے دوران اگرچہ فلموں کی سالانہ پیداوار گھٹ کر سو کے قریب ہو گئی تھی پھر بھی سینما گھروں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہا۔ جنگ کے بعد فلموں کی سالانہ پیداوار میں ایک بار پھر اضافہ ہوا اور اس وقت سے ہندستان میں تیار ہونے والی فلموں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔

ایک غیر سرکاری جائزے کے مطابق ہندستان کی صنعت فلم سازی سرمایہ کاری کے معاملے میں ملک کی درمیانہ سائز کی صنعتوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اُجرت کی ادائیگی کے لحاظ سے یہ چوتھی بڑی صنعت ہے۔ جہاں تک اس صنعت میں کام کرنے والے ملازمین کا تعلق ہے اس کے لحاظ سے یہ پانچویں نمبر پر ہے۔ اس صنعت میں لگا ہوا سرمایہ اندازاً ۸۵ کروڑ روپے ہے۔ سینما گھروں، اسٹوڈیو اور تجربہ گاہوں وغیرہ میں تقریباً ایک لاکھ افراد ملازم ہیں۔ اگر ہم ۱۹۶۲ء تک کے اعداد و شمار لے لیں تو پتہ چلے گا کہ ۱۹۶۲ء میں ہندستان میں سینما گھروں کی تعداد ۵۰۶۲ اور فلم اسٹوڈیو کی تعداد ۶۰ تھی۔ فلم اسٹوڈیو زیادہ تر بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں واقع ہیں۔ فلم سازی کے دوسرے اہم مرکز پونا، کوئمبٹور، حیدرآباد، میسور اور تریویندرم ہیں۔

ہندستان میں پہلے پہل ۱۹۱۶ء کے سینیمٹوگراف ایکٹ کی رو سے

فلموں کی نمائش کو ضابطے میں لایا گیا اور عوامی نمائش کے لئے موزوں فلموں کی جانچ اور تصدیق کا کام صوبائی حکومتوں کو سونپ دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں سینیمٹوگراف ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور موزوں فلموں کی جانچ اور تصدیق کے لئے کسی اتھارٹی کی تشکیل کا کام مرکزی سرکار کی ذمہ داری قرار پایا۔ پھر ۱۹۵۲ء میں سینیمٹوگراف ایکٹ پاس ہوا جس نے ۱۹۱۸ء کے سینیمٹوگراف ایکٹ کو منسوخ کر دیا۔ اس نئے قانون کی رو سے موزوں فلموں کی تصدیق کی جاتی ہے۔ اس کے لئے مرکزی حکومت فلم سنسر بورڈ کی تشکیل کرتی ہے جس میں ایک چیرمین اور زیادہ سے زیادہ نو ممبران ہوتے ہیں۔

تعلیمی مقاصد کی فلموں کو چھوڑ کر باقی فلمیں تفریح کی غرض سے دکھائی جاتی ہیں یا پھر ایسی فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں جن کا مقصد تفریح کے علاوہ معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ ایسی فلموں کو فیچر فلم کہتے ہیں۔ ہندستان میں ہر سال تین سو سے زائد فیچر فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ہندستان میں ۳۰۵ فیچر فلمیں تیار ہوئیں جن میں ۹۲ ہندی میں، ۵۶ تامل میں، ۴۶ تیلگو میں، ۳۹ بنگالی میں اور باقی دوسری علاقائی زبانوں میں تھیں۔ ہندستان میں ۱۹۶۴ء سے رنگین فلموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ رنگین فلمیں چونکہ زیادہ مقبول ہو رہی ہیں اس لئے ان کی تیاری کی جانب بھی زیادہ توجہ دی جا رہی ہے اور ان فلموں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔

سرکاری امداد

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۵۵ء میں فلم سیمینار کا جو سنگیت ناٹک اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا، افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا: "اخباروں، کتابوں، جریدوں وغیرہ کے مقابلے میں سینما اور فلم کا اثر بہت زیادہ گہرا ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جس کا اثر ہمہ گیر ہو یا ہو سکتا ہے، اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا اس کی اس غیر معمولی اہمیت کے سبب حکومت کو اس سے تعلق ہونا چاہئے۔" اب سوال یہ ہے کہ یہ تعلق کس طرح کا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلق دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک تو فلموں پر کنٹرول اور نگرانی کا اور دوسرے فلمی صنعت کی مالی اور دیگر طریقوں سے امداد کا۔ موشن پکچر عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس طرح فلمیں سماج کے ہر طبقے کے سامنے پہنچ سکتی ہیں اور پہنچتی ہیں اور چونکہ سماج میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سبھی طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں اس لئے فلموں کی نمائش پر ریاست کی بہبود مثلاً ملک کے تحفظ غیر ملکوں سے دوستانہ تعلقات، امن عامہ نیز اخلاق عامہ کے مفاد کی خاطر حکومت کے لئے فلموں پر مناسب پابندیاں لگانا اور ان پر کنٹرول اور نگرانی رکھنا ضروری ہے۔ جہاں تک دوسرے تعلق یعنی سرکاری امداد کا سوال ہے موشن پکچر کی تیاری ایک صنعتی کاروبار ہونے کے علاوہ تعلیمی، معلوماتی اور اصلاحی مقاصد کی تکمیل میں بھی معاون ہوتی ہے۔ چنانچہ حکومت نے ملک میں اچھی اور صحت مند فلموں کی تیاری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ اس ذیل میں ۱۹۵۴ء میں سرکاری انعامات کی ایک اسکیم شروع کی گئی جس کے تحت صرف امتیازی فیچر فلموں، ڈاکومینٹریوں، تعلیمی اور بچوں کی فلموں کے لئے انعامات دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلم سازی کے ٹیکنیکل اور دوسرے شعبوں میں باقاعدہ تربیت دینے کے لئے ۱۹۶۲ء میں پونا میں فلم انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔ اس سے قبل اعلیٰ درجے کی فلمیں بنانے والے فلم سازوں کو مناسب شرح پر قرض دینے کیلئے ۱۹۶۰ء میں فلم فائنانس کارپوریشن کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۶۴ء کے آخر تک کارپوریشن تقریباً ایک کروڑ ۴ لاکھ روپئے کے قرضے دے چکا تھا۔ فوٹوگرافی اور سینما کی فلمیں بنانے کے لئے حکومت ایک فرانسیسی فرم کے اشتراک سے اوٹاکمنڈ میں خام فلموں کی فیکٹری بھی قائم کر رہی ہے۔

بین الاقوامی فلمی میلوں میں شرکت

دوسرے ملکوں کو ہندستانی صنعت فلمسازی کی نمایاں ترقیوں اور کامیابیوں سے باخبر بنانے کے لئے ہندستان بین الاقوامی فلمی میلوں میں شرکت کرتا رہا ہے۔ حال ہی میں کئی ہندستانی فلمیں مثلاً پاتھیر پنچالی، اپراجیتو، اپر سنسار، دو آنکھیں بارہ ہاتھ، جاگتے رہو، منا، مہانگر وغیرہ بین الاقوامی قدرشناسی سے نوازی گئی ہیں۔

فلموں کی برآمد

ہندستانی فلموں کی برآمد میں اضافہ کرنے کے لئے ۱۹۶۳ء میں انڈین موشن پکچرز ایکسپورٹ کارپوریشن قائم کیا گیا اور اسی سال ہندستانی

فلموں کی برآمد سے زرمبادلہ میں ایک کروڑ، ۷۰ لاکھ روپئے کی آمدنی ہوئی۔ ہندستانی فلموں کی بڑی بڑی منڈیاں سیلون، ملیشیا، مشرقی افریقہ، برما مشرق وسطیٰ کے ممالک اور انڈونیشیا ہیں۔

برآمد کرنے کے علاوہ ہندستان غیر ملکی فلموں کی درآمد بھی کرتا رہا ہے۔ زرمبادلہ کی مشکلات کی وجہ سے اگرچہ ان کی تعداد محدود رہی ہے پھر بھی ۱۹۶۲ء میں بھارت نے ۴۴ لاکھ ۲۹ ہزار روپئے کی مالیت کی فلمیں درآمد کیں۔

ڈاکومینٹریاں

فیچر فلموں کے علاوہ ہندستان بڑی تعداد میں ڈاکومینٹری (معلوماتی فلمیں) بھی بناتا ہے۔ ان فلموں کے بنانے کا زیادہ تر کام بھارت سرکار کے فلمز ڈویژن کے ہاتھ میں ہے جو ہر سال ۰۰ سے زیادہ ڈاکومینٹریاں تیار کرتا ہے۔ فلمز ڈویژن نے ۱۹۶۳ء میں ۱۱۷ ڈاکومینٹریاں بنائیں جن میں سے ۱۱ رنگین تھیں۔ اس کی کئی ڈاکومینٹریاں قومی اور بین قومی انعام حاصل کر چکی ہیں۔

بچوں کی فلمیں

یہ ہے ہندستانی صنعت فلم سازی کی تاریخ، ترقی اور کامیابیوں کا ایک خاکہ۔ طوالت کے خیال سے یہاں فلموں کے اقسام باعتبار موضوع ان کی اثر آفرینی، فلموں سے کس وقت اور کس طرح کے کام لئے جاسکتے ہیں، اقتصادی پہلو، سماجی اخلاق اور سینما وغیرہ وغیرہ مسائل پر بحث نہیں کی گئی۔ لیکن بچوں کی فلموں کے بارے میں اختصار کے ساتھ غور کر لینا نامناسب نہ ہوگا کیونکہ بچے کل کے معمار ہیں اور اس لئے وہ چیزیں جو ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے موثر وسیلوں کا کام دے سکتی ہیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

بچے کی شخصیت کو بنانے اور اس کی تشکیل کرنے میں متحرک تصویریں ایک اہم پارٹ ادا کر سکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کے ذہن پر متحرک تصویروں کا اثر دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔

آج ہندستان میں ۴ سے ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کی تعداد ۱۰ کروڑ ہے۔ اگلے بیس برس میں یہ معمر شہری بن جائیں گے اور ملک کی سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں پوری طرح حصہ لے سکیں گے۔ اسی طرح یہ سلسلہ آنے والی نسلوں تک چلتا رہے گا۔ چھوٹی عمر میں ان کے نازک اور اثر پذیر ذہنوں پر اچھے اثرات مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ بچوں کے ذہن میں اخلاقی اور روحانی اقدار اور طرز عمل پیدا کرنے کے لئے متحرک تصویریں آسان لیکن طاقتور ذریعہ ہیں۔

بچوں کے لئے فلمیں کئی قسم کی ہوسکتی ہیں جیسے تعلیمی فلمیں، کلاس روم میں دکھائی جانے والی فلمیں، سوانحی فلمیں، تاریخی فلمیں، ڈاکومینٹریاں اور تفریحی فلمیں۔ ان میں سے ہر زمرے کی فلمیں بچوں کی عمر کے لحاظ سے مختلف طور پر تیار کی جاتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے صرف تدریسی یا تعلیمی فلموں سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ سامان تفریح مہیا کرنے والی فلمیں زیادہ کارآمد ہوتی ہیں۔ مثلاً دلیری، ایمانداری، حوصلہ، بہادری، والدین کے لئے محبت، جانداروں سے شفقت، دوستی، رواداری اور انصاف کے موضوعات پر تیار کی گئی فلموں اور ان فلموں سے جن میں کارٹونوں اور متحرک تپلیوں کو پریوں کی کہانیاں، داستانیں اور لوک گیت پیش کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، بچے نفسیاتی طور پر زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح ان سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صحت مند اقدار کو بہتر طور پر جذب کر لیتے ہیں جو ان کے اخلاق و کردار کی تعمیر و تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس میں دو رائیں نہیں ہیں کہ نصاب سے الگ سرگرمیاں بچے کی شخصیت کی ترقی اور تعلیم میں اہم حصہ لیتی ہیں۔ اس ضمن میں بھی فلموں کے استعمال کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ اگر اس طرح کی فلمیں منظم اور باقاعدہ طریقے سے دکھائی جائیں تو اس کا بہت اچھا اثر مرتب ہوسکتا ہے۔

منصوبہ بندی کی ضرورت

اس میں شک نہیں کہ بچوں کی تفریحی فلموں سے ہر عمر کے بچے بلکہ بڑے بھی لطف اندوز ہوسکتے ہیں تاہم ان کے موضوعات کا انتخاب اور انھیں پیش کرنے کا طریقہ خاص عمر کے بچوں کی ضروریات پر مبنی ہونا چاہئے، مثلاً ۵ سے ۷ سال کے بچوں کیلئے جو فلم بنائی جائیگی اسکی کہانی کا انداز

ڈرامے دکھانے کا طریقہ اس فلم سے مختلف ہوگا جو ۱۰ سے ۱۲ اور ۱۴ سے ۱۶ سال کے بچوں کے لئے بنائی گئی ہو۔ چھوٹے بچے رنگوں اور کارٹونوں میں یا پتلیوں کے ذریعے پیش کی گئی پریوں کی کہانی پسند کریں گے جبکہ بڑے بچے بہادری اور حب الوطنی کی کہانیاں زیادہ پسند کریں گے۔ بچوں کے لئے فلمیں بناتے وقت ان کی لمبائی پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ عام طور پر ایک گھنٹے کی فلم بچوں کے لئے زیادہ مفید ہوتی ہے کیونکہ وہ طبیعت پر بار ہوئے بغیر اسے آسانی سے جذب کر سکتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تین ہزار سے چار ہزار فٹ لمبی فلمیں بچوں میں زیادہ مقبول ہیں۔ اسی طرح پانچ ہزار فٹ لمبائی کی فیچر فلمیں ان کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔

موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے فلمیں بچوں میں مختلف ردعمل پیدا کرتی ہیں۔ وہ فلم دیکھنے کے دوران تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کر کے یا ہنس اور مسکرا کر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ بعض بچے جذباتی مناظر دیکھتے ہیں تو بالکل خاموش ہو جاتے ہیں یا کبھی کبھی رو پڑتے ہیں یا سسکیاں بھرنے لگتے ہیں۔ ان کیفیتوں میں بھی بچے کو بڑی جذباتی تسکین ملتی ہے اور دراصل جذباتی تسکین ہی بچوں کی فلموں کا مقصد ہے۔

بچوں کی فلموں سے متعلق سوسائٹی

ہندستان میں بچوں کی فلموں سے متعلق سوسائٹی کا قیام ۱۹۵۵ء میں عمل میں آیا۔ یہ سوسائٹی مرکزی حکومت کی عام نگرانی میں قائم کی گئی تھی جس کی سرگرمیوں میں بچوں کی فلموں کی تیاری اور تقسیم شامل ہے۔ سوسائٹی نے سنہ ۱۹۶۲ء کے آخر تک ہندستان کی علاقائی زبانوں میں ۱۶ چھوٹی فیچر فلمیں اور ۱۲ شارٹ تیار کئے۔ اسی سال سوسائٹی کی از سر نو تنظیم بھی کی گئی اور اس نے بڑی 'فیچر فلمیں' کارٹون اور پتلیوں کی فلمیں بنانے کا کام شروع کیا اور سنہ ۱۹۶۳ء اور سنہ ۱۹۶۴ء کی پہلی ششماہی کے دوران میں اس نے ۶ ہزار فٹ کی ۴ فیچر فلمیں اور دو ہزار سے چار ہزار فٹ تک لمبائی کے ۵ شارٹ (مختصر فلمیں) تیار کئے۔ مختلف عمر کے بچوں کے لئے فلمیں تیار کرنے کے واسطے مختلف موضوع منتخب کئے گئے اور فلموں کی تیاری میں مختلف تکنیک سے کام لیا گیا۔



قومی ورثہ

"ایک شاندار ورثے سے زیادہ فائدہ مند اور باعث فخر کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن فقط اس ورثے پر ہی زندہ رہنے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے زیادہ خطرناک بھی کوئی اور بات نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم صرف اپنے آبا و اجداد کی نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتی ہے تو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔"

—— جواہر لال نہرو

بندیلکھنڈ میں آب پاشی

میدانی علاقے کی تنگ پٹی سے دریائے جمنا کے کنارے کنارے وندھیاچل کے پہاڑی سلسلے کی بلندیوں کی جانب آگے بڑھنے پر آپ کو حدنظر تک ویران اور منتشر پہاڑیوں کا سلسلہ دکھائی دے گا۔ ان بے شجر اور بنجر پہاڑیوں کے درمیان آپ کو کچھ ایسی پہاڑیاں بھی نظر آئیں گی جن میں گھنے جنگل ہیں۔ یہاں سے کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں نکل کر ہموار میدان علاقوں کی طرف بہتی ہیں اور جمنا میں جاکر مل جاتی ہیں۔

بندیلکھنڈ کے علاقے کے یہ عام جغرافی حالات ہیں اس کے شمال اور مشرق میں جمنا، مغرب اور شمال میں چمبل اور جنوب اور مشرق میں کیمور کے پہاڑی سلسلے ہیں۔ ریاست مدھیہ پردیش اس کے جنوب میں واقع ہے۔ نظم ونسق کے لیے یہ علاقہ چار اضلاع یعنی باندہ، ہمیرپور، جھانسی اور جالون میں تقسیم کیا گیا ہے۔

بندیلکھنڈ ڈویژن کا مجموعی رقبہ ۰۵،۸،۷ لاکھ ایکڑ ہے جس میں سے ۶۰،۳۶ لاکھ ایکڑ زیر کاشت ہے۔ یہاں جاڑے میں بہت کم بارش ہوتی ہے اور گرمی میں بھی اوسطاً محض ۳۶ یا ۳۷ انچ بارش ہوتی ہے لہٰذا کامیاب کھیتی کے لیے اس علاقے میں آب پاشی کے مصنوعی ذرائع کا جال بچھانا ضروری ہے۔

علاقے کی خصوصیات۔

یہ پہاڑی علاقہ ہے اس کی ندیاں جو وندھیا پہاڑوں سے نکلتی ہیں گرمی اور جاڑے میں سوکھ جاتی ہیں۔ اس کی سنگلاخ زمین میں ٹیوب ویل کی بورنگ ممکن نہیں ہے۔ اس کی ندیاں اپنا راستہ بدلتی رہتی ہیں اس لیے ان سے اس وقت تک نہریں نہیں نکالی جاسکتیں جب تک باڑھ کے زمانے میں ان کا پانی جمع نہ کرلیا جائے۔ لہٰذا یہاں قدیم زمانے سے خزانہ ہائے آب سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی اس علاقے میں پرانے خزانہ ہائے آب کے نشانات ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ امتداد زمانے کے ساتھ یہ خزانہ ہائے آب مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہوگئے اور دن بدن توسیع پذیر زراعت کے لیے آب پاشی کا مسئلہ دشوار ہوتا گیا۔

انگریزوں نے ۱۸۷۵ء میں آب پاشی کے کچھ چھوٹے ذرائع کی تعمیرات شروع کیں۔ انھوں نے بجوارا اور مگروار جھیلوں کی تعمیر کی اور کچنوہ بروا ساگر کلونچا بھانور۔ بینا اور وجے گڑھ کی پرانی جھیلوں کی مرمت کرائی۔ ان تعمیرات کے باوجود ۷۴-۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۷ء میں یہاں قحط پڑا۔ بعد ازاں اس مسئلہ پر مختلف اوقات میں غور وخوض کیا گیا۔

قحط کمیشن۔ مختلف قحط کمیشنوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ جب تک اس علاقے کے ۴۰ فی صدی مزروعہ رقبے کو آب پاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی نہیں جاتیں اسے قحط اور غذائی قلت سے محفوظ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے ۱۸۸۱ء میں اپنی پالیسی تبدیل کردی اس تبدیلی کے نتیجے میں ۸۹-۱۸۸۱ء میں پر پچھا پشتہ ۰۹-۱۹۰۴ء میں ڈھکواں پشتہ اور ۱۲-۱۹۰۸ء میں پاہج اور گڑھ بند تعمیر کیے گئے۔ یہ تمام تعمیرات

ضلع جھانسی میں کرائی گئیں اور بقیہ تین اضلاع نظرانداز کیے جاتے رہے۔ بعد ازاں ۹۷-۱۸۹۵ء کے شدید قحط اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک برابر خشک سالی کے حالات سے آب پاشی کے سرکاری ذرائع کی ضرورت اور زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگی۔

لہٰذا ۱۹۰۴ء اور ۱۹۱۵ء کے درمیان پورے علاقے میں ۲ء۵ کروڑ روپے کی لاگت سے بہت سے پختہ بند تالاب اور بندھیاں تعمیر کی گئیں۔ ان میں گنگلو بند اور ہرپارپور پیالشتہ شامل تھے۔ بعد میں کچھ اور چھوٹی تعمیرات کی گئیں جن سے ۱۹۳۰ء کے آخر میں سالانہ چار لاکھ ایکڑ کے رقبے کی آب پاشی ہونے لگی۔

اس علاقے میں آب پاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کوئی تعمیر نہیں کی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی کے بعد ریاستی حکومت نے ضلع جھانسی میں للت پور اور سپرار بند اور ضلع ہمیرپور میں کبرائی جھیل کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ان اسکیموں پر عمل درآمد کے دوران ایک پنج سالہ منصوبہ بنایا گیا اور بعد ازاں دوسرا اور تیسرا منصوبہ تیار کیا گیا۔

منصوبہ بند ترقی۔ پہلے منصوبے میں آب پاشی کے ذرائع کی تعمیر کی ۱۲ اسکیمیں شروع کی گئیں۔ ان میں سے بڑی اور درمیانی اسکیموں میں للت پور بند۔ سپرار بند۔ کبرائی جھیل۔ ماتاٹیلہ بند مرحلہ اول۔ ارجن بند اور رنگاواں بند کی اسکیمیں تھیں۔ چھوٹی اسکیموں میں نزہر تالاب۔ پالی تالاب پکھر کھاری نالہ پر بند کی تعمیر اور راروال تالاب اور سنوری تالاب سے نہروں کی تعمیر شامل تھی۔ پہلے منصوبے کے آخر میں مجموعی طور پر ۸۴۷۱۶۵ ایکڑ کے رقبے کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔

دوسرے منصوبے کی مدت میں پہلے منصوبے کی بیشتر نامکمل اسکیمیں مکمل کی گئیں۔ علاوہ ازیں پالیمکی (ردہین) سرودہ پر کام شروع کیا گیا اور آب پاشی کی کچھ چھوٹی اسکیموں کی تکمیل کی گئی۔ دوسرے منصوبے کے آخر میں مجموعی طور پر ۱۰۱۶۶۷۴ ایکڑ کے رقبے کو آب پاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔

تیسرے منصوبے کی مدت میں ماتاٹیلہ بند کی اسکیم مکمل کی گئی۔ اس مدت میں جو نئی اسکیمیں شروع کی گئیں ان میں برواہ بند۔ کیولادی تالاب۔ چندراول بند۔ جمنی بند اور آب پاشی کی کچھ چھوٹی اسکیمیں شامل تھیں تیسرے منصوبے کے آخر میں اس علاقے میں سیراب رقبہ بڑھ کر ۱۱۹۴۳۳۴ ایکڑ ہو گیا۔

آب پاشی کے سرکاری ذرائع سے ۶۶-۱۹۶۵ء کے دوران اس علاقے میں کل سیراب رقبہ ۸ء۲۱ لاکھ ایکڑ تھا جبکہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں یہ رقبہ محض ۷۶ء۳ لاکھ ایکڑ تھا۔ موجودہ منصوبے کے دوران آبپاشی کی کچھ درمیانی اور چھوٹی اسکیمیں شروع کرنے کی تجویز ہے۔

بندھیوں کی تعمیر۔ بندھیوں کی تعمیر اس علاقے کی آب پاشی کے پروگرام کا ایک اہم جزو ہے۔ تیسرے منصوبے کی مدت میں تقریباً ۸۰ ہزار بندھیوں کی تعمیر اور ۴۷ ہزار کی نوتعمیر اور مرمت کی گئی۔

گاؤں سبھاؤں نے بھی ۶۴-۱۹۶۳ء سے تالابوں اور بندھیوں کی تعمیر اور مرمت کا پروگرام شروع کیا ہے۔ گاؤں سبھاؤں نے ۱۵ ہزار ایکڑ کے رقبے کو آب پاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے ۱۵۸ اسکیموں میں سے ۵۴ اسکیمیں مکمل کر لی ہیں جن سے ۵۱۵۸ ایکڑ کا رقبہ سیراب ہوگا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۵۶-۱۹۵۵ء میں اتر پردیش میں کل مزروعہ رقبے کا ۲۵ء۴۹ فی صدی اور بندیلکھنڈ میں ۱۳ فی صدی رقبہ سیراب کیا گیا۔ مزید براں ۶۴-۱۹۶۳ء میں اتر پردیش کے فی صد میں ۵۵ء۱ اور بندیلکھنڈ کے فی صد میں ۵۳ء۳ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اتر پردیش کے کسی دوسرے علاقے کے مقابلے میں یہ سب سے زیادہ اضافہ تھا۔



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

بروا بند مقررہ وقت سے پہلے تکمیل کے قریب ــــ ایک لاکھ کی بچت کا اندازہ ... گنگا نہر کی ماٹ برانچ میں نئی نالیوں کی تعمیر ... آئندہ ربیع مہم کا نشانہ ... دیہی علاقوں کیلئے مزید ٹیچروں کی تقرری کی منظوری ... ریاستی نل کنووں سے آبپاشی کی شرحوں میں کمی ... گداموں میں مزید دو لاکھ کوئنٹل غلہ وغیرہ محفوظ کیا گیا ... لڑکیوں کے ۲۵ سینیر بیک اسکولوں کا قیام ... ریاست میں مزید سات پلوں کی تعمیر ... خود کفیل اسکولوں کو ۲ لاکھ روپے کی مالی امداد ... متفرقات

ضلع باندہ کی کردی تحصیل میں بھرتول گاؤں کے قریب زیر تعمیر ۲۷٫۷۶ لاکھ روپے کی لاگت کے بند میں ایک لاکھ روپئے سے زیادہ کی بچت ہونے کا امکان ہے۔

یہ پروجیکٹ جو مقررہ میعاد سے پہلے قریب تکمیل ہے، سنہ ۱۹۶۴ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس پروجیکٹ کے تحت ۲۸ میل لمبی نہروں کے ذریعہ خریف کے ۹۲۸۸ اور ربیع کے ۱۹۶۴ ایکڑ کے رقبے کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

اس علاقے میں سالانہ اوسطاً محض ۳۲ر۹ انچ بارش ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ اُمید کی جاتی ہے کہ اس سے ملے ہوئے کین نہر کے علاقے کی طرح اس علاقے میں بھی دھان کی آبپاشی کی معقول سہولتیں فراہم کی جاسکیں گی۔

اس پروجیکٹ سے سالانہ تخمیناً ۱۲۴۷۰۶ روپئے کی خالص آمدنی ہوگی جو مصارف سرمایہ کے ۴ر۸ فیصدی کے برابر ہے۔

اس پروجیکٹ کے تحت بروا نالہ کے نام سے موسوم ایک برساتی ندی پر ایک میل ۶ فرلانگ لمبا مٹی کا بند تعمیر کیا جاچکا ہے۔ اس علاقے کا رقبہ جس کا پانی بہہ کر اس ندی میں آتا ہے، ۴۴ مربع میل ہے جس میں ۲۸ مربع میل علاقہ اترپردیش میں اور ۱۶ مربع میل علاقہ مدھیہ پردیش میں پڑتا ہے۔

اس بند کی تعمیر سے جو ۲۷۰ فٹ اونچا اور ۲۰۰ فٹ چوڑا ہے، ایک خزانہ آب بن گیا ہے جس میں ۸۸۰ ملین مکعب فیٹ پانی جمع ہوسکتا ہے۔ تقریباً پندرہ دنوں میں یہ خزانہ آب آدھا بھر جائے گا۔

اس وقت پانی کے اخراج کے لئے ڈھانچہ زیر تعمیر ہے۔ بر... کے ستون اور بازو تعمیر ہوچکے ہیں اور پھاٹک لگانے کا کا... ہو رہا ہے۔

اس پروجیکٹ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا... سارا کام ہاتھ سے کیا گیا ہے جس سے سنہ ۱۹۶۴ء سے تقریب... ا۰۰ا مقامی مزدوروں کو کام ملا ہے۔ ساتھ ہی اس پروجیکٹ کی بدولت مقامی طور پر ایک بجی ورکشاپ کا قیام عمل میں آگیا ہے جہاں ٹریکٹروں اور اسی قسم کی دوسری مشینوں کی مرمت ہوتی ہے۔

آبپاشی کے علاوہ اس بند سے ایک دوسرا بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ گرمی کے دنوں میں جبکہ یہاں کے کنوئیں بھی خشک ہوجاتے ہیں لوگوں کو پینے کے پانی کی سہولتیں دستیاب ہوں گی۔

یہ بند رفتہ رفتہ ایک تفریح گاہ بن جائے گا کیونکہ اس کے گردوپیش کے قدرتی مناظر حد درجہ دلکش ہیں۔

گنگا نہر کی ماٹ برانچ میں ۲۰۰ میل سے زیادہ لمبی نالیاں اس غرض سے تعمیر کی جارہی ہیں کہ کالا گڑھ میں رام گنگا پروجیکٹ...

مکمل ہوجانے پر آبپاشی کے لئے مزید پانی فراہم کیا جاسکے۔

گنگا نہر کی یہ برانچ جو ۸۰ میل لمبی ہے بلند شہر، علی گڑھ، متھرا اور آگرہ کے ضلعوں کے علاقوں سے ہوکر گزرتی ہے۔

ان نئی نالیوں کے علاوہ تقریباً ۱۸۰ میل لمبی پرانی نالیوں کی اصلاح و درستی بھی کی جارہی ہے۔ اب تک ۱۰۹٫۵ میل لمبی نئی نالیاں تعمیر کی جاچکی ہیں اور ۳۲ میل لمبی پرانی نالیوں کی مرمت کی جاچکی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ چوتھے پنجسالہ منصوبے کے آخر تک ماٹ برانچ پر پانی کی مزید سپلائی سے تقریباً ۸۶ ہزار ایکڑ کے رقبے کو سیراب کیا جاسکے گا۔

پہلے پنجسالہ منصوبے پر عملدرآمد سے ماٹ برانچ کی معاون نہروں سے سیراب ہونے والے رقبے میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اس برانچ سے سنہ ۱۹۴۶ اور ۱۹۵۱ء کے درمیان سالانہ تقریباً ۱٫۹۲ لاکھ ایکڑ رقبے کی سینچائی کا اوسط تھا۔ لیکن پہلے منصوبے کے آخر میں یہ رقبہ بڑھ کر ۲٫۲۵ لاکھ ایکڑ سے زیادہ ہوگیا۔

دوسرے منصوبے کے پہلے سال یعنی سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں اس برانچ کی مرمت اور درستی کی گئی جس سے اس کی پانی کی سپلائی کی صلاحیت ۱۴۰۰ کیوسکس سے بڑھ کر ۱۸۰۰ کیوسکس ہوگئی۔ اس کے بعد چار برس ایسے گزرے جن میں اس علاقے میں بارش عام طور پر تسلی بخش رہی اس لئے اس برانچ سے پانی کی مانگ کم ہوگئی تاہم اس برانچ کی نہروں سے سالانہ اوسطاً ۱٫۲ لاکھ ایکڑ کی آبپاشی ہوئی۔

گزشتہ ۳۱ مارچ کو ختم ہونے والے پانچ برسوں میں اس برانچ سے سالانہ اوسطاً ۲٫۲۸ لاکھ ایکڑ رقبے کی آبپاشی ہوئی جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔

اس برانچ سے سیراب ہونے والے علاقے کے مخصوص جغرافی حالات کے پیش نظر زراعت کی ترقی میں پانی کی نکاسی کے بہتر نظام کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس علاقے میں بہت سے ایسے حصے ہیں جہاں بارش میں پانی جمع ہوجاتا ہے۔ ان حصوں سے پانی نکالنے کے لئے پنجسالہ منصوبوں سے پہلے ۲۹ میل سے زیادہ لمبی نالیاں تھیں۔ پہلے پنجسالہ منصوبے کے دوران میں ان نالیوں میں تقریباً ۱۴ میل کا اضافہ کیا گیا جس سے مزید ۶۵۲۰ ایکڑ کے رقبے کو فائدہ پہنچا۔ دوسرے اور تیسرے پنجسالہ منصوبوں کی مدت میں بالترتیب ۱۶۴٫۲۵ اور ۱۰۷٫۵ میل لمبی نالیاں تعمیر کی گئیں جن سے بالترتیب ۲۶۲۸۵ اور ۱۷۲۲۵ ایکڑ کے رقبے کو فائدہ پہنچا۔

اس علاقے میں سنہ ۱۹۶۲ء اور سنہ ۱۹۶۴ء کی شدید بارش نے جو نقصانات پہنچائے ان کے پیش نظر ایک ماسٹر پلان بنایا گیا جس کے تحت ۵۴۵۷۲ ایکڑ مزروعہ رقبے میں پانی کے جمع ہونے کی روک تھام کے لئے ۴۷٫۵ میل لمبی نئی نالیوں کی تعمیر اور تقریباً ۳۱۱ میل لمبی پرانی نالیوں کی مرمت اور درستی کی تجویز ہے۔ یہ ماسٹر پلان اس وقت زیر تکمیل ہے اور اب تک ۳۹ میل لمبی نئی نالیاں تعمیر کی جاچکی ہیں اور ۴۶ میل لمبی پرانی نالیوں کی اصلاح و درستی ہوچکی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ چوتھے پنجسالہ منصوبے کے آخر تک ماسٹر پلان کا کام مکمل ہوجائے گا۔

اتر پردیش میں آئندہ ربیع مہم کا مقصد یہ ہوگا کہ ریاست کو اناج کے معاملے میں خود کفیل بنایا جائے تاکہ ریاست میں ہر سال اوسطاً جو ۹ لاکھ ٹن اناج درآمد کرنا پڑتا ہے وہ نہ کرنا پڑے۔

اس نشانے کی تکمیل کے لئے گیہوں اور زیادہ پیداوار والی فصلوں کی اقسام کے زیر کاشت زیادہ سے زیادہ رقبے میں کھاد نیز کیمیاوی کھاد استعمال کی جائے گی اور نئے نئے علاقے گیہوں کے زیر کاشت لائے جائیں گے۔

مزید براں میکسیکو کے گیہوں کے بیج جن سے گزشتہ سال فی ایکڑ ۷۰ من تک پیداوار حاصل ہوچکی ہے۔ منتخب کسانوں کو بہم پہنچائے جائیں گے اور انھیں آبپاشی کی معقول سہولتیں بھی دی جائیں گی۔

مرکزی حکومت نے ۸۸۰۰ ٹن میکسیکو کا گیہوں ریاست کو الاٹ کیا ہے اور ریاستی محکمہ زراعت نے میکسیکو کے گیہوں کے مختلف اقسام کے وافر مقدار میں بیج حاصل کئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ رقبے میں بوئے جائیں گے علاوہ ازیں بہتر قسم کے مقامی گیہوں کی کاشت کو بھی مقبول بنایا جائے گا۔

اس مہم کے دوران ایسے تمام کھیتوں میں جو خریف میں بوئے نہیں

گئے ہیں نیز ان کھیتوں میں جو گنے کی پیڑی اور دھان کی فصل کے بعد خالی ہو گئے ہیں گیہوں کی کاشت کی جائے گی اور جو کھیت گیہوں کے لئے موزوں نہیں ہوں گے ان میں مٹر چنا یا مسور بوئی جائے گی۔

ریاست میں توسیعی عملہ کو ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ وہ کسانوں کو زیادہ پیداوار والی فصلوں کی کاشت اور پودوں کی ٹاپ ڈریسنگ اور ان کی جڑوں میں کیمیاوی کھاد کے مناسب استعمال کے بارے میں ضروری مشورے دیں اور ان کی رہنمائی کریں۔

مہم کے تحت اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ کسان گزشتہ سال کے مقابلے میں ۵۰ فیصدی زیادہ گیہوں پیدا کرنے کے لئے اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لائیں اور پوری لگن کے ساتھ کام کریں۔

حکومت اتر پردیش نے دیہی علاقوں کے جونیر بیسک اسکولوں میں یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء سے مزید ۴۳۶۴ تربیت یافتہ ٹیچروں کی تقرری کے لئے منظوری دیدی ہے۔ ان میں سے کم سے کم دس فیصدی لیڈی ٹیچر ہوں گی۔ بابت سال رواں میں اس مقصد کے لئے ۲۱۴۴۱۲۴ روپیہ مقرر کیا گیا ہے جو ضلع پریشدوں کو بطور مالی امداد دیا جائے گا۔

مزید ٹیچروں کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ دیہی علاقوں میں تیسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران بہت سے پرائمری اسکول کھولے گئے جس سے اسکول جانے والے بچوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔

الہ آباد۔ جونپور۔ گورکھپور۔ دیوریا۔ بستی۔ اعظم گڑھ۔ رائے بریلی اور گونڈہ کے ضلعوں میں سے ہر ایک میں ۱۰۷ ٹیچر مقرر کئے جائیں گے۔ دوسرے اضلاع میں ٹیچروں کی تعداد حسب ذیل ہوگی۔

سہارنپور۔ ۶۷۔ مظفر نگر۔ ۱۱۵۔ بلند شہر۔ ۱۲۴۔ آگرہ۔ ۱۲۳۔ علی گڑھ۔ ۹۴۔ متھرا۔ ۳۲۔ مین پوری۔ ۹۱۔ ایٹہ۔ ۱۳۱۔ بریلی۔ ۱۸۔ بجنور۔ ۶۳۔ بدایوں۔ ۹۳۔ مراد آباد۔ ۱۳۹۔ رام پور۔ ۲۴۔ پیلی بھیت۔ ۴۲۔ شاہجہانپور۔ ۴۰۔ فرخ آباد۔ ۵۰۔ اٹاوہ۔ ۱۱۴۔ فتح پور۔ ۹۹۔ ہمیر پور۔ ۸۳۔ باندہ۔ ۲۷۔ جھانسی۔ ۲۔ جالون۔ ۳۰۔ وارانسی۔ ۱۴۳۔ مرزا پور۔ ۳۴۔ غازی پور۔ ۹۰۔ بلیا۔ ۱۱۴۔ الموڑہ۔ ۲۷۔ لکھنؤ۔ ۱۳۔ اناؤ۔ ۱۰۲۔ سیتاپور۔ ۵۵۔ ہردوئی۔ ۱۲۸۔ کھیری۔ ۱۰۵۔ فیض آباد۔ ۱۵۰۔ بہرائچ۔ ۸۷۔ سلطانپور۔ ۱۰۸۔ پرتاپ گڑھ۔ ۱۵۲ اور بارہ بنکی۔ ۴۸۶۔

حکومت اتر پردیش نے سال رواں میں دھان اور ربیع ملیوا کے لئے ریاستی ٹیوب ویلوں سے آبپاشی کی شرحوں میں کمی کر دی ہے۔ شرحوں میں یہ رعایت کسانوں کو یکم جولائی سے ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۶۶ء تک ملے گی۔

آبپاشی کی گھٹائی گئی شرحوں کی تفصیل یہ ہے۔ بھاپ یا پن بجلی سے چلائے جانے والے ٹیوب ویلوں سے ۲۴ ہزار گیلن پانی فی روپیہ اور ڈیزل انجنوں یا ڈیزل بجلی گھروں سے حاصل کی گئی بجلی سے چلائے جانے والے ٹیوب ویلوں سے ۱۶۵۰۰ گیلن فی روپیہ۔ مذکورہ بالا اقسام کے ٹیوب ویلوں سے گنا کو چھوڑ کر تمام دوسری فصلوں کی آبپاشی کی موجودہ شرحیں بالترتیب ۱۶۰۰۰ گیلن فی روپیہ اور ۱۱۰۰۰ گیلن فی روپیہ ہے۔

ریاستی حکومت نے یہ فیصلہ اس مقصد کے پیش نظر کیا ہے کہ پیداوار میں اضافہ ہو سکے اور ریاستی ٹیوب ویلوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

آبپاشی کی شرحوں میں کمی ہو جانے سے کسان اپنے دھان کی فصلوں کی آسانی سے سینچائی کر سکیں گے جن کے لئے دوسری فصلوں کے مقابلے میں زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکومت نے خشک سالی کے حالات کی وجہ سے گزشتہ سال بھی یہ رعایت دی تھی۔ اتر پردیش میں تقریباً ۸۰۰۰ ٹیوب ویل ہیں جن سے کسانوں کو آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

اتر پردیش میں گزشتہ سال جولائی تک گداموں میں جتنی مقدار میں اجناس جمع کی گئی تھیں اس کے مقابلے میں اس سال جولائی تک ۴۲ گوداموں اور ۲ اذیلی گداموں میں مختلف قسم کی تقریباً دو لاکھ کوئنٹل اصلاح شدہ اجناس زیادہ جمع کی گئیں۔

گداموں میں جو اشیا ذخیرہ کی گئیں ان میں غلہ، تلہن، مونگ پھلی، شکر، گڑ، راب اور کھانڈساری اور دوسری چیزیں شامل ہیں۔

ان گداموں میں گزشتہ چار مہینوں میں مجموعی طور پر ۲۱ر۰۷،۸۵۱۵ کوئنٹل اشیا جمع کی گئیں جبکہ سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں اسی مدت کے دوران میں ۴۸ر۷،۳۲۲۲۸ کوئنٹل اشیا ذخیرہ کی گئی تھیں۔ ان گداموں میں جولائی کے مہینے میں ۳۰ر۴۴،۲۶۲۳ کوئنٹل اشیا پہلے سے موجود تھیں اور ۸ر۷۷،۰۹،۰۳۵ کوئنٹل مزید اشیا جمع کی گئیں اور ۷ر۸۷،۰۹۲۷،۱ کوئنٹل اشیا نکالی گئیں۔

اترا، اوریا، بدایوں، بھرتنا، لکھنؤ اور کالپی کے گداموں کی کارکردگی نمایاں طور پر بہتر رہی۔

حکومت اترپردیش کے دیہی علاقوں میں لڑکیوں کے ۲۵ سینیر بیسک اسکولوں کے قیام کے لئے منظوری دیدی ہے۔

یہ اسکول ضلع پریشدیں چلائیں گی لیکن حکومت ان کو قائم کرنے اور چلانے کے تمام اخراجات برداشت کرے گی اور اس سلسلے میں ضلع پریشدوں کو مالی امداد دے گی۔ ان اسکولوں کے لئے مالیاتی سال رواں میں ۶۰،۳۵۶ روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

مرزاپور۔ گورکھپور اور بستی کے اضلاع میں دو دو نیز بلند شہر۔ آگرہ۔ ایٹہ۔ بدایوں۔ باندہ۔ جونپور۔ غازیپور۔ دیوریا۔ اعظم گڑھ۔ المورڑہ۔ پوڑی گڑھوال۔ رائے بریلی۔ ہردوئی۔ فیض آباد۔ گونڈہ۔ بہرائچ۔ سلطانپور۔ پرتاپ گڑھ اور بارہ بنکی کے ضلعوں میں ایک ایک اسکول کھولا جائے گا۔

ریاستی محکمہ تعمیرات عامہ نے مالیاتی سال رواں کے دوران ۴۵۶ر۲۷ لاکھ روپئے کی لاگت سے مزید سات پلوں کی تعمیر مکمل کی ہے۔ ان پلوں کی تفصیل یہ ہے:

نجیب آباد۔ ننگل روڈ (ضلع بجنور) کرو پر رتنال ندی پر پل۔ لکھیم پور۔ نگھاسن روڈ (ضلع کھیری) پرال ندی پر پل۔ ضلع مین پوری میں سینگور اور سرسا ندیوں پر پل۔ ضلع رائے بریلی میں سئی ندی پر پل۔ ضلع بلیا میں ٹونس ندی پر پل اور ضلع پیلی بھیت میں بازار گھاٹ کی ستیا ندی پر پل۔

اترپردیش میں حصول آزادی کے بعد سے مختلف قسم کے ۱۹۵ پل تعمیر کئے گئے ہیں اور آمدورفت کے لئے کھول دئے گئے ہیں۔ مزید برآں اس وقت ۴۸ بڑے پل تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اب تک جتنے پل تعمیر کئے جا چکے ہیں اور جو زیر تعمیر ہیں ان کی مجموعی لاگت کا اندازہ ۱۷ کروڑ روپئے سے زیادہ لگایا گیا ہے۔

حکومت اترپردیش مالیاتی سال رواں میں ۸۰۰ سواولمبی (خودکفیل) اسکولوں کو مالی امداد دے گی۔ یہ امداد فی اسکول ۳۰۰ روپیہ سالانہ کے حساب سے دی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے دو لاکھ ۴۰ ہزار روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔

"سواولمبی اسکول" جو نجی پرائمری اسکول ہیں ان دیہی علاقوں میں کھولے گئے ہیں جہاں اسکول نہیں ہیں۔ ان اسکولوں کے قیام کیلئے موزوں اور سند یافتہ افراد کو امداد دی گئی۔ یہ امداد ان اسکولوں کو چلانے اور ایسے اسکولوں کے قیام کی ہمت افزائی کے لئے دی جائے گی۔

مختلف اضلاع میں سواولمبی اسکولوں کی تعداد جن کو مالی امداد دی جائے گی حسب ذیل ہے۔

سہارنپور۔ ۸۷۔ مظفرنگر۔ ۲۹۔ بلند شہر۔ ۱۵۸۔ علی گڑھ۔ ۱۳۶۔ متھرا۔ ۶۔ بجنور۔ ۲۔ بدایوں۔ ۲۔ مرادآباد۔ ۲۔ کانپور۔ ۱۔ فتح پور۔ ۸۔ الہ آباد۔ ۹۔ باندہ۔ ۱۔ وارانسی۔ ۷۵۔ مرزاپور۔ ۸۱۔ جونپور۔ ۹۴۔ غازی پور۔ ۳۷۔ بلیا۔ ۳۱۔ گورکھپور۔ ۹۔ ۱۰ ناؤ۔ ۲۔ رائے بریلی۔ ۲۔ سیتاپور۔ ۲۔ ہردوئی۔ ۴۔ کھیری۔ ۱۰۔ فیض آباد۔ ۴۔ پرتاپ گڑھ۔ ۶ اور بارہ بنکی۔ ۱۔

متفرقات

قومی بچت میں ایک لاکھ سے زیادہ جمع۔ گورکھپور میں گزشتہ ۱۰ ستمبر کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران قومی دفاع سرٹیفکٹوں میں ۱۲۴۱۶۰ روپیہ لگایا گیا۔

مزید براں قومی بچت سرٹیفکٹوں کی خریداری کے لئے کانپور کے جے ۔ کے ۔ آرگنائزیشن اور ضلع پریشد نے زیر نظر سال میں بالترتیب ۰۰۰،۰۵،۱ روپیہ اور ۶۰ ہزار روپیہ جمع ہوا۔

آر ۔ ڈی ۔ انٹر کالج سہاول ۔ ضلع فیض آباد کے طلبا نے حال میں منعقدہ ایک جلسہ میں اجتماعی میعادی ڈپازٹ کے ۲۸ کھاتے کھولنے کا فیصلہ کیا۔

ٹیوب ویلوں میں اضافہ ۔ ضلع متھرا میں ٹیوب ویلوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے ۔ پہلے دو پنجسالہ منصوبوں کی مدت میں ان کی تعداد سات تھی جو اب بڑھ کر ۱۶۳ ہوگئی ہے ۔

چھوٹی آبپاشی کے دیگر ذرائع کے ضمن میں بھی ضلع متھرا دوسرے ضلعوں سے کہیں آگے ہے ۔ پہلے پنجسالہ منصوبے کے آخر میں ضلع میں پانچ ٹیوب ویل ۳۵۴ رہٹیں ۔ ۶۴۸ کنوئیں اور ۱۲ پمپنگ سیٹ تھے اور ۶۷ کنوؤں میں بورنگ کی جا رہی تھی ۔ ان کے مقابلے میں ضلع میں اس وقت ۱۶۳ ٹیوب ویل ۱۱۵۷ رہٹیں اور ۵۰۰ پمپنگ سیٹ ہیں ۔ علاوہ ازیں مزید ۲۶۰۸ کنوؤں میں بورنگ کی جا رہی ہے ۔

آگرہ نہر سے آبپاشی ۔ آگرہ نہر کے اوپری ڈویژن کے علاقے میں تیسرے منصوبے کے آخری سال یعنی سنہ ۶۶ ۔ ۱۹۶۵ء کے دوران میں سب سے زیادہ آبپاشی ہوئی ۔

اس ڈویژن میں جو ضلع متھرا کے کچھ حصوں ضلع گڑگاؤں (پنجاب) اور ضلع بھرت پور (راجستھان) پر مشتمل ہے سنہ ۶۶ ۔ ۱۹۶۵ء میں ۱۹۷۴۵۵ ایکڑ ربیع خریف اور رگنا کی فصلوں کی آبپاشی ہوئی ۔ اس کے مقابلے میں سنہ ۶۲ ۔ ۱۹۶۱ء میں ۱۳۷۲۶۱ ایکڑ سنہ ۶۳ ۔ ۱۹۶۲ء میں ۱۱۷۴۹۱۷ ایکڑ سنہ ۶۴ ۔ ۱۹۶۳ء میں ۱۵۲۳۱۹ ایکڑ اور سنہ ۶۵ ۔ ۱۹۶۴ء میں ۱۶۴۲۷۷ ایکڑ کے رقبوں کی آبپاشی کی گئی تھی ۔

اس سال تقریباً ۶۰ ہزار ایکڑ کے رقبے کی آبپاشی کی جا چکی ہے اور خریف فصل کی حالت عام طور پر اچھی ہے ۔

بال سیوکاؤں کے وظائف میں اضافہ ۔ ریاستی حکومت نے نو سیوکا ٹریننگ سینٹروں میں بال سیوکاؤں کے ماہانہ وظیفوں کی رقم اس ماہ سے ۳۵ روپئے سے بڑھا کر ۴۵ روپیہ کردی ہے ۔

اس مقصد کے لئے ۰۰۰،۲۰ روپئے کی رقم منظور کی گئی ہے تاکہ یہ سینٹر بڑھے ہوئے اخراجات برداشت کرسکیں ۔ ہر ٹریننگ سینٹر کو ۲۲۰۰ روپیہ دیا جائے گا ۔

یہ نو مراکز بخشی کا تالاب (لکھنؤ) ۔ بلند شہر ۔ بیج پوری ۔ (آگرہ) ۔ دابھاسا مبھر (فیض آباد) ۔ رودرپور (نینی تال) ۔ فتح پور (سہارنپور) ۔ دوبائی میرٹھ ۔ بڑا گاؤں (جھانسی) اور غازی پور میں واقع ہیں ۔

ملاپ کا شمارہ ضبط ۔ دہلی نظم ونسق کے ذمہ داروں نے اردو روزنامہ "ملاپ" کا شمارہ مورخہ ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۶۶ء ضبط کرلیا ہے کیونکہ اس میں جو نقشہ شائع کیا گیا ہے اس میں ایسا مواد موجود ہے جس کی اشاعت ضابطہ فوجداری ترمیم ایکٹ سنہ ۱۹۶۱ء کی دفعہ ۲ کے تحت قابل سزا ہے ۔

مذکورہ بالا شمارہ کا ہر نسخہ نیز اس کے ترجمے اور اقتباسات کے تحت بحق حکومت ضبط کرلئے گئے ہیں ۔

بنگلہ کتاب کی ضبطی ۔ حکومت اترپردیش نے بنگلہ کتاب "اتہاسیر شری چیتنیہ" ضبط کرلی ہے ۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر امولیا چندر سین ہیں اور اسے شری کرن کمار رائے نے ۴۷ ۔ ایل منوہر پوکر روڈ کلکتہ سے شائع کیا ہے ۔ اس کتاب میں ایسا مواد ہے جس کا مقصد دیدہ و دانستہ ہندوستانی شہریوں کے ویشنو طبقہ کے مذہبی جذبات اور عقائد کو ٹھیس پہنچانا ہے اور جس کی اشاعت تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۵ (اے) کے تحت قابل تعزیر ہے ۔

اس کتاب کا ہر ایک نسخہ نیز اس کی اشاعت ثانی ترجمے اور اقتباسات بحق حکومت ضبط کرلئے گئے ہیں ۔

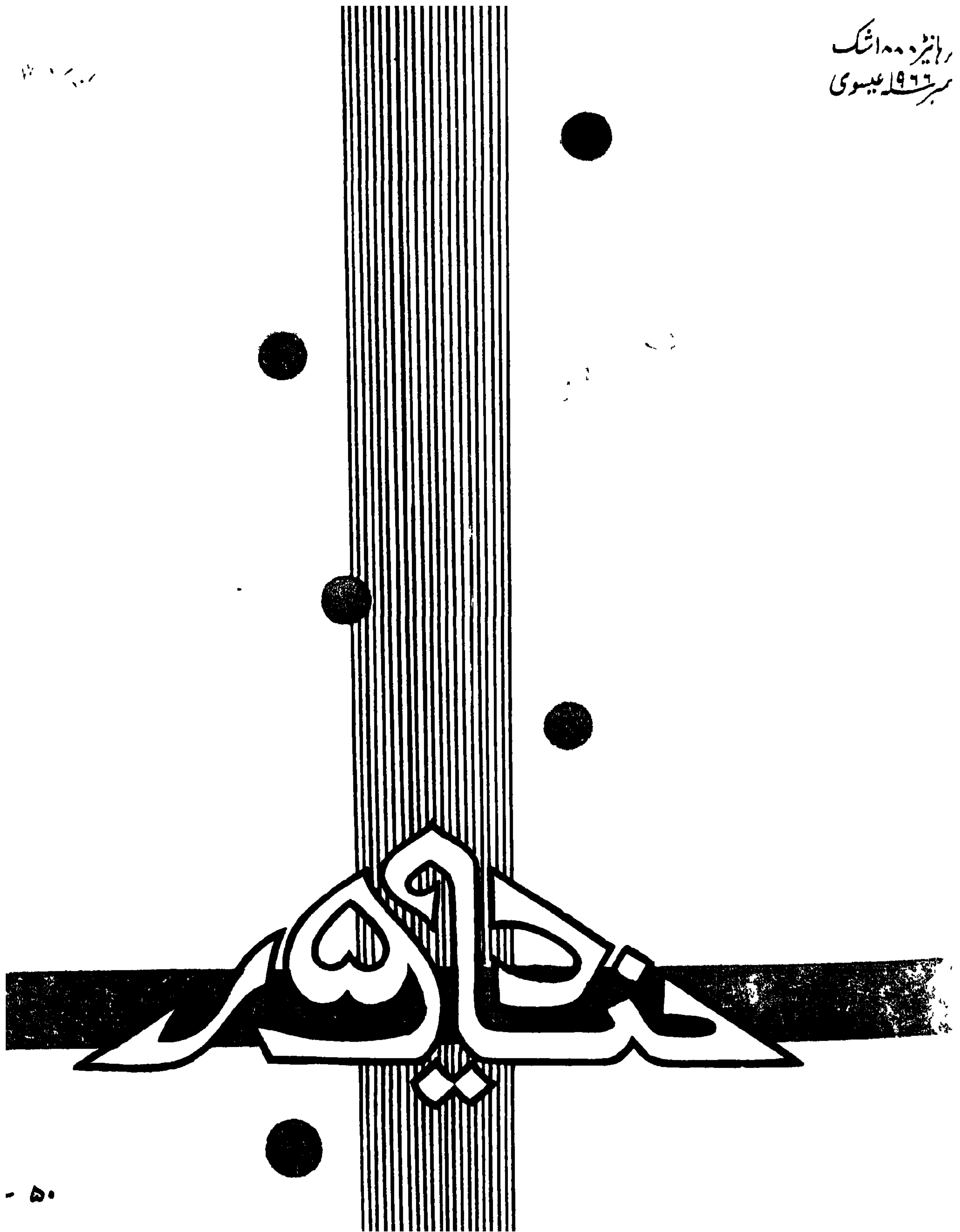


REGD. No. L-319

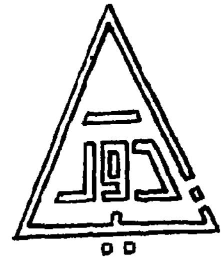


کیرالا میں کھجور کے درختوں کے درمیان دھان کے کھیت

رہائیژ ۵۵۱ اشک
سنه ۱۹۶۶ عیسوی



۵۰ -



جلد ۲۲ نمبر ۹

اگرہاینڑ ۱۸۸۸ شک
دسمبر ۱۹۶۶ عیسوی

جندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
ششی کانت بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہاج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

عنوانات

ٹائٹل کے چوتھے صفحے پر: ہندستان کے مشہور تیراک تری ہر سین نے ۳۲ میل لمبے آبنائے ڈارڈنل کو حال ہی میں ۱۲ گھنٹے ۳۵ منٹ میں تیر کر ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ پانی سے باہر آنے کے فوراً بعد کی اس تصویر میں وہ اپنی کامیابی پر خوش نظر آرہے ہیں۔

اپنی بات

اس وقت ملک خشک سالی کے ایک بڑے بحران سے گزر رہا ہے۔ خشک سالی کا یہ سلسلہ یوں تو پچھلے سال ہی سے ہے جو خریف اور ربیع دونوں فصلوں کی پیداوار پر اثر انداز ہوا اور قلت کے حالات پیدا ہوئے۔ لیکن حالت اتنی خراب نہیں تھی کیوں کہ اوّل تو بارش کم ضرور ہوئی تھی مگر اتنی بھی کم نہیں کہ کسی بڑے بحران کا پیش خیمہ بنتی۔ دوسرے ۶۵-۱۹۶۴ء کی بہترین فصل کا بچا کچا ذخیرہ موجود تھا پھر صورت حال پر قابو پانے کے لیے بہت سے اقدامات اور انتظامات کیے گئے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ سال کے مشکل دور کو ہم پار کر آئے۔ خیال تھا کہ اس سال بارش وقت پر اور مناسب مقدار میں ہوگی اور حالت نہ صرف ٹھیک رہنے کی بلکہ گزشتہ سال کی کمی کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس سال تو بارش کی کمی انتہا کو پہنچ گئی جس سے ایک طرف خریف کی فصل تباہ ہو گئی اور دوسری طرف ستمبر میں بارش کے، جو انتہائی اہم ہوتی ہے، نہ ہونے کی وجہ سے ربیع کا مسئلہ بھی بھیانک شکل اختیار کر گیا ہے۔ دو سال کی متواتر خشک سالی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والی ریاستوں میں اتر پردیش بھی ہے جہاں کم و بیش ۴۸ اضلاع اس کی لپیٹ میں ہیں۔ اس طرح کے سوکھے کی مثال پردیش کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ اس وقت نہ صرف فصلوں کی سینچائی کے لیے ہی پانی کی کمی پڑ رہی ہے بلکہ بعض علاقوں میں تو پینے کے پانی کی بھی بڑی کمی محسوس ہو نا شروع ہو گئی ہے۔ ایسے میں صورت حال کی سنگینی کو محسوس نہ کرنا یقیناً ہماری مجرمانہ غفلت شعاری کے مترادف ہوگا۔ بلاشبہ یہ ایک قومی بحران ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم میں سے ہر ایک کو آگے بڑھنا اور عملی اشتراک و تعاون کرنا چاہیے کہ یہی جمہوریت کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن عملی تعاون بھی اسی وقت کارگر اور موثر ہو سکتا ہے جب ہم اس طرح کے بحران کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کریں۔ جہاں تک سرکار کا تعلق ہے، وہ اس مشکل صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ مثلاً متاثرہ علاقوں میں شیر خوار اور چھوٹے بچوں، حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے غذائی امداد، دودھ کے پاوڈر، غذا بخش ٹکیوں کا اور بوڑھے اور ضعیف لوگوں کے لیے لنگر کا مفت انتظام کیا جا رہا ہے۔ متاثرہ علاقوں میں سستے غلے کی دوکانیں کھولی جا رہی ہیں، ٹسٹ ورک شروع کیے گئے ہیں، آب پاشی کی چھوٹی چھوٹی اسکیمیں بروئے کار لائی جا رہی ہیں۔ کچے کنوئیں کھودنے کے لیے مالی امداد دی جا رہی ہے۔ قابل مرمت نل کنوؤں کی فوری مرمت کے احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔ نل کنوؤں کے لیے بجلی کی مزید سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ بیج اور کھاد کے علاوہ بہت ہی کم قیمت پر ترکاریوں کے پودے مہیا کیے جا رہے ہیں اور پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا گیا ہے۔ غرض خشک سالی سے پیدا ہونے والی سنگین صورت حال کا مقابلہ کرنے کے واسطے حکومت ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور ہر طرح کی امداد دے رہی ہے۔ لیکن یہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ تنہا حکومت کی کوششیں کافی نہیں ہیں بلکہ اس نیک اور اہم کام میں ہم میں سے ہر ایک کو حصہ لینا چاہیے۔ جیسا کہ مرکزی وزیر غذا شری سی۔ سبرامنیم نے کہا "طلبا خدمت خلق کے اس اہم فریضے میں لگائے جا سکتے ہیں۔ انجینیرنگ کے طلبا آب پاشی کے وسائل، میڈیکل کالجوں کے طلبا طبی امور میں اور کالجوں کے طلبا راشن کارڈوں کی تیاری اور تقسیم میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔" وزیر اعلیٰ اتر پردیش شریمتی سوچیتا کرپلانی نے اس سلسلے میں حال ہی میں ایک اپیل شائع کی ہے جس میں عوام سے کہا کہ "یہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ جنتا کو بچانے کے لیے سبھی کو حصہ لینا چاہیے۔ یہ مصیبت تھوڑے دنوں کے لیے نہیں آئی ہے کیوں کہ جب تک نئی فصل تیار نہیں ہوتی ہمیں اناج کی زبردست کمی کا سامنا رہے گا۔ جو لوگ اس سلسلے میں عملی طور سے حصہ نہیں لے سکتے وہ مہربانی کے فراخ دلی کے ساتھ عطیے دیں۔ یہ عطیے چیک یا منی آرڈر کی شکل میں 'چیف منسٹرس ڈسٹرس فنڈ' (وزیر اعلیٰ کے امدادی فنڈ) کے نام بھیجے جائیں۔ میں ہر طبقے کے لوگوں سے یہ اپیل کرتی ہوں کہ وہ پرامن رہیں اور امن و امان کا انتظام کرنے والوں کی مدد کریں تاکہ حکومت کی توجہ جو اس وقت اس سوکھے کا مقابلہ کرنے میں ہی لگی ہوئی ہے، فضول کاموں میں نہ بٹنے پائے۔" خواتین کی تنظیموں سے خاص طور سے انھوں نے اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ "بچوں کو اور حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کو غذا فراہم کرنے اور ان کی دیکھ بھال پر پوری توجہ دیں۔ بیوپاریوں کو چاہیے کہ وہ قسم کھائیں کہ وہ غلے کا اسٹاک چھپا کر انسانی مصائب سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔" بہرحال اس سے پہلے بھی کئی بار قومی بحران کے موقعوں پر متحدہ کوششوں میں ہاتھ بٹانے کی ہماری عملی اور عزائم کا امتحان ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلے سال پاکستانی حملے کا اور اس سے قبل ۱۹۶۲ء میں چینی جارحیت کا ہم نے ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے مقابلہ کیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم طوفانوں کا رخ موڑنے اور حوادث کا دھارا بدل دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ حالات نے ایک بار پھر ہمیں چیلنج دیا ہے۔ کیا اس موقع پر پیچھے رہیں گے؟ وقت کا اہم ترین تقاضا یہی ہے کہ ہم خواہ طلبا ہوں یا سیاسی جماعتوں کے ممبر، سرکاری ملازم ہوں یا لوکل باڈیز کے کرمچاری، فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور ہوں یا کسی اور طبقے سے تعلق رکھنے والے عام آدمی، اپنے معاملات اور اپنی احتجاجی سرگرمیوں کو فی الحال روک کر اس بحران پر قابو پانے میں حکومت سے اشتراک و تعاون کریں ورنہ کل جب ہم سے سوال کیا جائے گا کہ ہم نے کیا خدمت کی تو کہیں ندامت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

● اس شمارے میں شہاب سرمدی صاحب کا ایک مضمون "تخلیقات جاری ہیں — ان کے نام" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ اس میں شہاب صاحب نے بعض الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں کچھ نئے اعراب استعمال کیے ہیں جو خود انھیں کے وضع کیے ہوئے ہیں۔ ان کی وضاحت بھی انھوں نے فٹ نوٹ میں کر دی ہے۔ اس وقت ہم اس سلسلے میں اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے۔ اس میں شک نہیں کہ زبان وہی زندہ رہتی اور ترقی کرتی ہے جو وسیع القلب ہو یعنی دوسری زبانوں کے الفاظ وغیرہ کو اپنے دامن میں جگہ دے اور انھیں اپنائے۔ ایک زبان کے بہت سے الفاظ ایسے ہو سکتے ہیں جو دوسری زبان میں اس طرح لکھے نہ جا سکیں کہ پڑھنے والا انھیں بالکل اسی طرح ادا بھی کرے جس طرح اصل زبان میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ مخصوص نشانات یا اعراب ایسے ہوں جن کی مدد سے یہ کام سرانجام پا سکے۔ غالباً اسی ضرورت کو محسوس کر کے شہاب صاحب نے یہ نئے اعراب وضع کیے ہیں۔ بہرحال حسب موقع ہم اس سلسلے میں اظہار خیال کریں گے۔

——— ایڈیٹر

تخلیقات جائسی ـــــ اُن کے نام

شہاب سرمدی

یوں تو جائسی کی تصانیف کی تعداد ۲۱ تک پہنچ چکی ہے[1] مگر محققین نے ۱۴ ہی کو زیادہ قابلِ ذکر سمجھا ہے[2]۔ ان میں بھی کچھ ایسی ہیں کہ تصنیف ایک ہی ہے نام دو، مثلاً 'چتر ریکھا (جیا دنی)[3] مہری بائیسی (کہرا نامہ)، مکھرا نامہ (مکھرا نامہ)' وغیرہ۔ اس طرح کل تعداد ۱۴ سے بھی کم قرار پاتی ہے، جن میں جہاں تک مجھے معلوم ہے پدماوت ؟ ' اکھراوٹ ؟ آکھری کلام ؟ چتر ریکھا' کہرانامہ اور مثلا نامہ ؟ چھپ چکی ہیں۔ یہی ان کی نمائندہ نظمیں سمجھی جاتی ہیں، اور انھیں پر تحقیقی اور تنقیدی کام بھی ہوا ہے۔

اس کام میں پہل کا سہرا ڈاکٹر گریرسن اور ان کے شریک کار پنڈت سدھاکر دویدی کے سر ہے۔ انھوں نے پدماوت کا ایک معتبر نسخہ نکالنا چاہا مگر پچیسویں باب ہی تک پہنچے تھے کہ پنڈت جی موصوف کی موت نے یہ سلسلہ روک دیا۔ ان کے بعد آچاریہ رام چندر شکل نے جائسی گرنتھاولی مدون کی۔ ایک گرنتھاولی ڈاکٹر ماتا پرشاد گپت نے چند قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی۔ موصوف نے پدماوت کا ایک اصح نسخہ بھی شایع کیا۔ ڈاکٹر واسدیو شرن اگروال نے بھی ایک ایسا ہی نسخہ مرتب کیا۔ ان کے علاوہ دوسرے اہلِ قلم حضرات نے جائسی ادب پر خاص توجہ دی۔ کلیات اور منظومات جائسی کے کئی اور نسخے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ تحقیقی مقالے اور تنقیدی مضامین بھی بہ کثرت لکھے جا چکے ہیں۔ غرض جائسی۔ ساہتیہ پر ہندی میں کم و بیش اتنا ہی مفید کام ہو چکا ہے جتنا اردو میں غالب پر۔ اس کے باوجود دو ایک بالکل سامنے کی باتوں پر ابھی تک نظر کم جا سکی ہے۔ ایک، جیسے جائسی کے حالاتِ زندگی ہیں۔ ہم ان کے نجی جیون کے بارے میں جتنا جاننا چاہیے اتنا نہیں جانتے۔ اسی طرح ان کی تصانیف کے نام ہیں۔ یہ بھی کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔

پدماوت کو "ہندی ادب کا جگمگاتا ہوا ہیرا" کہا گیا ہے[4]۔ آکھراوٹ کو بھی معیاری سمجھا جاتا ہے، مگر ان گرنتھوں کے نام جو ہم نے مشہور کر دیے ہیں وہ وہ نہیں جو خود مصنف نے رکھے تھے۔

عہدِ جائسی تک ایران اور ہندوستان میں جتنی مثنویاں بھی لکھی گئیں سب کو یا تو ہیرو۔ ہیروئن کے نام پر نام زد کیا گیا تھا جیسے وامق عذرا، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، دول رانی خضر خاں، چنداعن، مرگاوتی[5] وغیرہ، یا شاہنامہ، اور سکندر نامہ کے

اعرابی اشارے: | ملائم زیر ـــ صورت : ـِـ مثال : ریت (بمعنی بالو)، ملائم پیش ـــ صورت : ـُـ مثال : کو، سُش، غنائی حرکت ـ صورت : ن مثال : سنبھالنا (شہاب)

[1] مقالہ محمد جائسی۔ ناگری پرچارنی پتر کا، ۱۹۹۶۔ ص۵ [2] بہ حوالہ کوائف احلایہ (قلمی نسخہ)۔ اس میں بھی "چہار دہ کتاب از مصنفات" کا ذکر ہے۔ [3] امریش کہرانامہ، ص۲ [4] دیباچۂ پدماوت مرتبہ ڈاکٹر اگروال ص۱ [5] لیلاوتی جیسے نام یہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔

وزن پر بھی فامہ، خوش نامہ، ارشاد نامہ وغیرہ۔ ایسی کم ہی تھیں جنھیں ہفت پیکر، نیاسپوار اور نوسرہار جیسے نام دیے گئے ہوں۔ جائسی کو کلاسیکی انداز پسند تھا۔ ان کی ساری رچنائیں یا تو 'بلی' کے آدھار پر ہیں یا 'نامہ' کے[1]۔ چنانچہ پدماوت کا نام انھوں نے پدماوتی[2] رکھا تھا۔ اس کی سند کہیں اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ پدماوت ہی میں یعنی اس کی ہیروئن کے نام میں موجود ہے۔ پدماوتی کو بار بار پدماوتِ (تائے متحرک کے ساتھ) اس لیے کہنا پڑا کہ چوپائی چھند میں ایک، ماترے والے دیرگھانت شبد کی گنجائش بہت کم تھی،[3] ناگ متی کے لیے تھی اس لیے اسے ناگ متِ شاید کہیں نہیں کہا گیا۔

دراصل ہوا یہ ہے کہ فارسی لپی میں پدماوتِ اور پدماوت ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے۔ فارسی زبان میں لفظ کے آخری حرف کو حرکت دی بھی نہیں جاتی۔ مثنوی پدماوت کی شہرت عہد اکبری ہی سے جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی تھی[4]۔ عہد شاہجہانی تک یہ شہرت ہندوستان گیر ہوگئی۔ ایسا لگتا ہے کہ کتابت میں پدماوتی پہلے پدماوتِ ہوا پھر پدماوت۔ یہ کاتب حضرات کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے ہیروئن کا نام ہر جگہ پدماوت ہی پڑھا اور وہی کتاب کا نام بھی قرار دے دیا۔ اسی طرح اکھراوٹی، اکھراوٹ ہوگیا بلکہ قافیہ ملانے والوں نے اسے پدماوت کے وزن پر اکھراوت بھی کر دیا درآنحالیکہ جائسی نے صاف صاف بتا دیا تھا: "پنڈت پڑھیں اکھراوٹی . . ." خیر یہ تو ہوا جو کچھ ہوا اس سے کوئی خاص الجھن نہیں پیدا ہوئی بس کہنے کو بات رہ گئی کہ جن کے ناتے جائسی کا نام قائم ہے ہم نے انھیں کے نام کو قائم نہ رکھا۔

لیکن کہرانامہ کو تھری باٹسی کر دینا جائسی کے کیے پر پانی پھیر دینا ہے۔ اس لیے کہ ان کی اس نظم میں ایک تو ۲۲ نہیں ۲۵ بند ہیں[5] دوسرے یہ کہار کو آدھار بنا کر لکھی گئی ہے۔ ہمیں آنے والی نسلوں کو جائسی جیسے کوی کے ۱۲ جیتے جاگتے اشعار سے محروم کر دینے کا کوئی حق نہیں۔ اس کا بھی حق نہیں کہ ہم من مانی کوئی نام رکھ دیں۔ کہار اس کا اکلوتا اور اچھوتا کردار ہے۔ ہم کہرانامہ کو اس کے اصلی نام کہارانامہ پر تو بحال کر سکتے تھے لیکن تھری باٹسی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا تصنیف کے مقصد پر دھول ڈالنا ہوگا۔

ایسے ہی ان کی ایک مثنوی کچھ ہی دن ہوئے شاید پہلی بار مثالا (مسلا؟) نامہ کے نام سے چھپی ہے۔ اس نام کو یوں سمجھا یا گیا ہے:-

"ہو سکتا ہے کہ 'मसला' شبد انھیں صوفی سنتوں کی دین ہو۔ کیونکہ اس کے پہلے मसला نام کی کوئی چیز ہمارے دیش میں نہیں تھی۔ یہ لفظ 'مثل' سے بنا ہے، 'مثل' کا ارتھ ہے: بھانت، طرح، یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس سے دوسرے لفظ نکلے ہیں:-

"मिस्ल > मसलन > मिसाल > मसल > मसला"[6]

عربی میں مثَل اور مسئلہ یا مسئلۃ دو بالکل الگ الگ لفظ ہیں۔ پہلے کے لغوی معنی ہیں 'کسی کو اس طرح سزا دینا کہ دوسروں کو عبرت ہو' اور دوسرے کے ہیں سوال، تمنا وغیرہ۔ مثل سے ایک لفظ مُثُل بنا ہے جس سے قصہ، حکایت، کہاوت، مثال، استعارہ، کنایہ، تمثیل، تشبیہہ سبھی کچھ مراد لے سکتے ہیں۔ عربی روزمرہ میں مَثَلِ سائر رواج پائی ہوئی کہاوت کو کہتے ہیں اور اودھی روزمرہ میں 'پھر مثلوا' (عورتوں کی باتیں) اور مثل یا مشہور (مشہور مثل) بولتے ہیں۔ "مثل نہ مثل" کچھ لوگوں کا تکیہ کلام بھی سننے میں آیا ہے۔

---

[1] دیباچہ کہرانامہ، مثلا نامہ ۶، ص۲۱ مرتبہ امر بہادر سنگھ 'امریش'، ہندوستانی اکیڈمی ۱۹۶۲ء [2] گریرسن نے پدماوتِ [3] جیسے فعلن فعلن کی بحر میں متفاعلن کی [4] افسانۂ پدماوت کا تاریخی جیوڑن جاتا آئین آکبری ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے فارسی ترجمے اس کے علاوہ ہیں۔ [5] دیکھیے کہرانامہ ص۶ مرتبہ امریش۔ [6] کہرانامہ۔ مثلا نامہ۔ مرتبہ امریش، ص۱۰۱

ایسی صورت میں جو اودھی کو اپنی مادری زبان کی طرح جانتے ہیں اور جو جائسی کو پڑھا اور گڑھا دونوں مانتے ہیں ان کو سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ اپنی اس نظم کو جس میں انھوں نے شروع سے آخر تک صرف کہاوتوں کے سہارے زندگی کے گہرے سے گہرے راز کو بیان کر دیا ہے مثلاً نامہ ~~مسلا ناما~~ نہیں مثل نامہ نام دیا ہوگا، اس لیے جب تک کوئی سچ مچ مستند نسخہ نہ مل جائے یہی سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم مثل نامہ کو مثلاً نامہ سمجھ رہے ہیں۔

اب آئیے اُن کی اُس رچنا پر غور کریں جسے ہم نے ~~آخری~~ یا آخری کلام نام دیا ہے اور کچھ نے آکھری (آخری) کی مناسبت سے اسے اُن کی آخری تصنیف ہی سمجھ لیا ہے[1] یہی نہیں شاید "آخری" کو "آخرت" سے الجھا کر اور نظم کا موضوع ذکرِ قیامت سمجھ کر یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ اس میں "مسلمانی دھرم" کے ایک "انگ" کا پرچار ہے۔ یہ بھی عام خیال ہے کہ یہ نظم کمتر درجے ذہن کو ٹٹولتی ہے۔

یہ ساری غلط فہمیاں اس لیے پھیلیں اور پھیل رہی ہیں کہ ہم نے اس مثنوی کے صحیح نام اور اس کے موضوع بیان پر جیسا چاہیے تھا دھیان نہیں دیا۔

شکل جی اپنے ایک مضمون[2] میں فرماتے ہیں:

"ان کا (جائسی کا) ایک اور گرنتھ 'آکھری کلام' فارسی رسم الخط میں بہت پرانا چھپا ہوا حال میں ملا"۔

یہ ۱۹۳۵ء کے آس پاس کی بات ہے۔ تب سے اب تک نہ جانے کیسے اس طرف ہماری نظر ہی نہیں گئی کہ کہیں فارسی سے دیوناگری میں آتے ہوئے یا کسی اور کارن نامِ کتاب تو نہیں بدل گیا اور اگر نہیں بدلا تو آکھری یعنی آخری سے کیا سمجھا جائے؟ کیا یہ واقعی جائسی کی آخری تصنیف تھی اس لیے انھوں نے اسے اپنا آکھری کلام کہا؟ آخری تو نہ تھی اس لیے کہ یہ عہد بابری کی تصنیف ہے اور پدماوت، چترریکھا[3] عہد شیر شاہی اور عہد اکبری کی۔ اس کا سالِ تصنیف ۹۳۶ھ ہے اور اُن کا ۹۴۷ھ اور ۹۶۴ھ۔[4] یہ دونوں یقیناً اس کے بعد کی ہیں۔ پھر اگر بہ فرض محال یہ بھی کہا جائے کہ نظم کا موضوع چونکہ ذکر قیامت تھا اس لیے آخرت کلام نام رہا ہوگا جو بگڑ کر آکھری کلام ہو گیا تو ہمیں یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ جائسی عربی نہیں جانتے تھے اور زبان کے معاملے میں سمجھوتہ بھی کر سکتے تھے۔ مگر یہ دونوں باتیں خلافِ واقعہ ہیں۔ ہمیں دل سے یقین ہے کہ وہ عربی کا علم رکھتے تھے اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ جہاں انھوں نے اپنی زبان کے ٹھیٹھ پن کو معمولی سی معمولی ٹھیس بھی نہیں پہنچنے دی، وہاں کسی لفظ کو، وہ کسی زبان کا ہو، غلط استعمال بھی نہیں کیا۔ آخرت کا یہ مہمل استعمال ہی نہیں کہ ان کی لسانی پالیسی کے خلاف تھا اودھی روزمرہ کے بھی تھا۔ پھر جائسی جیسا نوک پلک درست فنکار جس نے اپنی اس مثنوی میں بھی خدا کو گوسائیں، رسول کو دین دیال، دین محمدی کو دُھرم، مومن کو بندہ، عالم کو پنڈت، کتب آسمانی کو بید پُران، لامکان کو اُن ترہیت، آواز غیب کو ناد، نجات کو نستار، میزانِ عمل کو تکھری، جلوۂ ذات کو چمکار، اور قیامت کو پرلے ہی کہا ہو وہ لغات و اصطلاحات کی اِس دیسی برادری میں آخرت جیسے لفظ کو ٹاٹ بھیتر کیوں کر سمجھ سکتا تھا۔

ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اپنی اس نظم کو انھوں نے آکھری کلام[5] نام دیا اور "بیانِ کتاب" کے باب میں یہ ظاہر بھی کر دیا کہ اسے یہ نام دے رہے ہیں۔ بیت ملاحظہ ہو:

نو سے برس چھتیس جب بھئے تب اِہ کتھا کے آکھر کہے

---

[1] دیکھیے ملک محمد جائسی، تصنیف سید کلب مصطفیٰ، انجمن ترقی اردو، ہند سنہ ۱۹۴۲ء ص ۳۵۔ دوسرے محققین نے بھی اسے ان کی تصانیف کی فہرست میں آخری ہی رکھا ہے۔ [2] جائسی گرنتھاولی۔ ۲۔ [3] چترریکھا، نوٹو کاپی بذریعہ پنڈت اُدے شنکر شاستری۔ [4] کلام سے فقہ کا فلسفہ بھی مراد لیا جاتا ہے۔ صوفی ادب میں یہ لفظ اکثر فلسفے کے معنی میں آیا ہے چنانچہ "ملفوظ کلام" سے مشائخ کے حکیمانہ اقوال مراد لیے گئے ہیں۔ آکھری اور ملفوظ کا مفہوم بھی بہت کچھ ایک ثابت ہوتا ہے۔

"ہجری ۹۳۶ھ تھا جب میں نے اس کتھا کے آکھر کہے۔"

کتھا سے اگر کہانی مراد لی جائے (حالانکہ اس نظم میں کہانی کی طرح کوئی کہانی نہیں کہی گئی) تو آکھر سے کیا سمجھا جائے۔ آکھر اَکشر کا دیسی رُوپ ہے۔ ہمارے یہاں اس لفظ کی رمزیت سدا اتھاہ رہی ہے۔ اس کے لغوی معنی سدا رہنے والے اور اَمِٹ کے ہیں۔ اسی اعتبار سے شبد، شر، ناد، برہما، شِو اور وشنو کو بھی آکھر کہا گیا ہے۔ آکاش بھی آکھر ہے، تپسیا اور تپوکش بھی۔ رام چرت مانس کی بیت ہے:

اَکُل آکھر اَرتھ نہ جانو ۔ بُرکُتی پَریُبھا ! ہیں پرتانو

"جن منتروں کے آکھر بے میل ہیں اور جن کا اَرتھ ہی سمجھ میں نہیں آتا، شِو کے فیض سے ان کا بھید بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔"

غرض 'آکھر' اور 'بھید' جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ کلام جائسی میں بھی یہ لفظ جہاں جہاں آیا ہے کہیں بھی "بھید" سے خالی نہیں[1]۔ پدماوت میں، جہاں تک میری نظر ہے، یہ لفظ تین جگہ آیا ہے:

ا۔ تب چندن آکھر ہیئے لکھے (ب ۱۹۵/۳؛ تب اس نے دل پر صندلیں آکھر لکھے۔)

۲۔ بُجھنہ نہ تیے آکھر پرجرے (ب ۲۰۰/۲؛ وہ لَو دیتے ہوئے آکھر بجھنے کو نہیں آتے تھے۔)

۳۔ ہیئے جو آکھر تُم لکھے (ب ۲۲۴/۹؛ تم نے دل پر جو آکھر لکھ دیے ہیں)

جائسی اکھراوٹ (اکھراوٹی) کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

کہو سُن گیان گُگھرا، سب آکھر مہ لیکھ
پنڈت پڑھ اکھراوٹی، ٹوٹا جوڑہ دیکھ

تلسی داس جی نے 'اَکُل آکھر' کہا تھا، جائسی کہتے ہیں کہ "آکھر کی آوٹ (اکھراوٹی) میں گیان کی باتیں کہہ رہا ہوں کہ جاننے بوجھنے والے ٹوٹی کڑیوں کو جوڑ کر بات پوری کر سکیں:

آکھر کیا ہے؟ جائسی نے اس کی بھی تشریح کر دی ہے:

آکھر پُسر نہیہ بول اکارا ۔ اَکتھ کتھا کا کہو بچارا[2]

"آکھر یا سُر منھ سے آواز نکالنا نہیں، اِن کی کہانی بیان سے باہر ہے، میں سوچ سوچ کر کیا کہوں؟"[3]

۱۔ 'اکتھ کتھا' کا بھید بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

آپ ہی کاگد، آپ مَسِ، آپ ہی لیکھن ہار
آپ ہی لکھنی، آکھر آپ ہی پنڈت اپار

"آپ ہی کاغذ، آپ ہی روشنائی، آپ ہی لکھنے والا، آپ ہی قلم، آپ ہی آکھر اور آپ ہی اس کا اپار پنڈت۔"

"وہ" سب کچھ ہے اور آکھر بھی، یہ ہے آکھر کی تہہ۔ یہی آکھر ان کی دونوں نظموں کا موضوع ہے۔ اکھراوٹی میں آکھر کی آوٹ سے (ابجد کے پردے میں) باتیں کہی گئی ہیں اور آکھری کلام میں اس آوٹ کو ہٹا کر۔ وہاں آکھر حرف ہے، معنی اس میں چھپا ہوا ہے؛ یہاں معنی آشکارا ہوا تو حرف عینِ معنی بن گیا ہے۔ یہ بڑا اونچا بہت ہی گہرا صوفی تصور ہے۔ مولوی معنوی فرماتے ہیں:

حرف ظرف آمد، درو معنی چو آب
بحرِ معنی عِندہٗ اُمُّ الکتاب

جائسی کہتے ہیں:

الف ایک اللہ بڑ سوئی ۔ دال دین دُنیا سب کوئی
میم محمد پریت پیارا ۔ تین آکھر یہ اَرتھ بچارا (اکھراوٹ)

جائسی کا 'آکھر' اور 'اَرتھ' اور رومی کا حرف و معنی ایک ہی ہیں۔ سنسکرت میں اکشر (آکھر) سے ورن بھی مراد لیتے ہیں۔ ورن یعنی رنگ بدل سکتا ہے۔ عربی میں حرف بدلتی ہوئی حالت کو بھی کہتے ہیں۔[4]

اور معنی حقیقت کو، روحانیت کو اور ان کے علاوہ کائنات کی ہر شے کو، چنانچہ علم معنی = کائنات کی ہر شے کا علم؛ عالم

---

[1] 'حرف' کی رمزیت بھی اسی قسم کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے: بہ حرف کس نماند حرف من مظہر حو جبریلم ؛ خدا بے واسطہ تعلیم و اصلاح سخن کردہ (مرزا مظہر جانجاناں)

[2] سُر وہ آواز جو کسی دوسری آواز کی محتاج نہ ہو۔ [3] 'آکھر' اور 'سُر' کی ماورائیت کی طرف اشارہ ہے۔ [4] موازنہ کیجیے:-

بازیچۂ کفر و دیں بہ طفلاں بسپار ؛ بگذر ز خدا ہم کہ خدا ہم حرفے ست (نامعلوم)

معنی = عالمِ روحانیت اور صورت بے معنی = وہ صورت جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

وحدت الوجود کے طرزِ فکر میں "ذات" و "صفات" کے نکتے کو اکثر معنی و حرف کے اسی ربط کو وسیلہ بناکر سمجھا سمجھایا گیا ہے۔ مثلاً

چون الف گر تو مجرد می شوی ۔ تو الف جیسا بے لاگ ہو جائے
اندریں رہ مردِ مفرد می شوی ۔ تو اس راستے میں تیرا کوئی جواب ہو
(رازی ؟)

ابجد نامہ، الٰہی نامہ، عطائی نامہ، محمود نامہ جیسی مثنویاں اسی مقصد سے لکھی گئیں۔ اکھراوٹ (اکھراوٹی) بھی اسی سلسلے کی مثنوی ہے:

خ۔ خاوند وہ نہٗ ہے نیارا ۔ سونہ دیکھ تو ذُسوٗ دُوارا

شاہ وجہن کی بیت ہے۔ جائسی کہتے ہیں:

گھا۔ گھٹ گھٹ جگت برابر جانا ۔ جیہہ مہٗ دھرتی سرگ سمانا

ان کی بحر ہی ایک نہیں، اندازِ بیان بھی ایک ہے اور مقصدِ بیان بھی ایک۔ یہ ایک طریقِ ریاضت ہے۔ اسے آج بھی "ذکر" یا "ذکرِ محمود" کہا جاتا ہے۔ اکھراوٹ (اکھراوٹی) میں یہی "ذکر" ہے۔ آکھری کلام میں اسی "ذکر" کا ثمرہ بیان کیا گیا ہے۔ طریقت کی رُو سے ایک نظم "ذکر" کی منزل میں ہے اور دوسری "مشاہدہ" کی منزل میں۔ اُس میں آکھروں کے ذریعے "صفات" کا ذکر ہے اور اِس میں آکھروں کا "پرم آکھر" میں سَم یعنی "صفات" کا "ذات" میں ضم ہو جانا دکھایا گیا ہے۔

اکھراوٹ (اکھراوٹی) میں کہا گیا تھا کہ

دا۔ وہ رُوپ نہ جائے بکھانی ۔ اگم اگوچر اکتھ کہانی

اور آکھری کلام میں خبر دی جاتی ہے کہ

بھنجن گڑھن سنوارن جن کھیلا سب کھیل
سب کہہ ٹار محمد ۔ اب ہوئے رہا اکیل

وہاں حسن (روپ) سرحدِ ادراک سے پرے (اگم) حواس کی نگاہوں سے دور (اگوچر) تھا، یہاں توڑنے گڑھنے سنوارنے کا کھیل ختم ہو چکا ہے، کثرت وحدت میں سما گئی ہے اور وہ اکیلا ہے:

ایک چمکار ہوئے اُجیارا
چھپے بیج تیہہ کے چمکارا

اب ایک چمک ہوگی۔ ایسا اُجالا پھیلے گا کہ بجلیاں ماند پڑ جائیں گی" — مختصر یہ کہ دونوں مثنویاں ایک ہی سلسلے کی ہیں۔ ایک تخلیقِ کائنات (سرشٹ) سے شروع ہوتی ہے اور دوسری تحویلِ کائنات (پرلے) پر ختم۔ انھیں ایک ساتھ پڑھنا چاہیے اور "آکھری ادب" ہونے کے ناتے ان کے نام "اکھراوٹی" اور "آکھری کلام" ہونے چاہییں۔[1]

---

[1] 'اکھراوٹی' اور 'آکھری' میں یائے نسبتی ہے۔ کلام جائسی میں "گنگ علاء الدین صاحبی"، اور "پنگہ سلطانی" جیسی مثالیں بھی بہت ہیں۔ ان کے علاوہ "گھَدنگی" "پھرنگی" "ہردانی" جیسی مثالیں بھی بہت ہیں لیکن سہاگ سے "سہاگی" (سہاگن)، پربت سے "پربتی" (پہاڑی)، دنواس سے "دِیواسی" جیسی بھی کافی ہیں۔ ان سے زیادہ دلچسپ ہیں "ہشانکھی" "گولا گندھی" "پھول دیہری" وغیرہ وغیرہ





فضا ابن فیضی

شفق جبیں پہ، رخ پہ سیم یاسمن بکھر گئی / مری لطافتِ نظر، بدن بدن بکھر گئی

یہ کاروبارِ رنگ و بو تمام میرے دم سے تھا / میں انجمن سے اُٹھ گیا تو انجمن بکھر گئی

تمھارے لب کی جنبشیں وسیلۂ بہار تھیں / کہاں کہاں حکایتِ گل و سمن بکھر گئی

کچھ اور قرب چاہیے، یہ سوچ کر مری نظر / ترے بدن پہ بن کے موجِ پیرہن بکھر گئی

ہمارے دل کے زخم ہیں کہ نافۂ غزال ہیں / یہ کیا ہنسے کہ اِک مہک ختن ختن بکھر گئی

یہ خود فریبیاں ہیں سب تصوّرِ حیات کی / کہیں گلاب کھل گئے، کہیں کرن بکھر گئی

مرے جنوں نے انگلیاں جو رکھ دیں نبضِ ہوش پر / جبینِ کائنات پر بھی کچھ شکن بکھر گئی

صبا کا ہم سفر رہا ہم اہلِ شوق کا نفس / شمیمِ دردِ پیرہن بہ پیرہن بکھر گئی

مرا جنونِ شوق تھا نہ منزلوں سے آشنا / وہ مل گئے تو راہ کی ہر اک تھکن بکھر گئی

یہ زندگی بجائے خود ہے اِک حسین حادثہ / نگہ سے لے کے قلب تک کوئی چبھن بکھر گئی

بنامِ شاہدِ غزل جو اُن کا ذکر آ گیا / خیال کی شگفتگی، سخن سخن بکھر گئی

تری غزل مہک اُٹھی گلاب کی طرح فضاؔ
کچھ اس طرح سے خوشبوئے شعورِ فن بکھر گئی



قیصر سرمست

چہچہاتے پرندوں کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن ان خوب صورت اور نرم و نازک پرندوں اور ننھی منی چڑیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اپنی دل کش اور سریلی آوازوں اور خوش الحانیوں سے کیف و سرور کا عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض پرندوں کے بارے میں یہ بھی خیال ہے کہ ان کا چہچہانا بے مقصد نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنے پیدا کرنے والے کی تعریف و توصیف کے نغمے گاتے ہیں اور اپنی زبان میں اپنے خالق کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ بہر حال یہاں ان پرندوں کا ذکر نہیں کرنا ہے جن کی آواز سریلی ہوتی ہے اور جب وہ بولتے ہیں تو نغمے کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے بلکہ یہاں ایک خاص زمرے یا خاندان کی چڑیوں کا ذکر مقصود ہے۔ یہ گرم خطوں میں پائی جانے والی ننھی منی چڑیوں کا خاندان ہے جو ٹراکی لائڈے (TROCHILIDAE) کہلاتا ہے۔ قد و قامت میں اگرچہ یہ پرندے یا چڑیاں بہت چھوٹی ہوتی ہیں مگر ان کی پرواز میں بلا کی تیزی اور سرعت ہوتی ہے۔ ان کے بال و پر بے انتہا نرم و نازک اور چمکیلے ہوتے ہیں۔ ان کا نام چہچہاتے پرندے[1] یا چہچہاتی چڑیاں اس وجہ سے پڑا کہ جب یہ ہوا میں معلق رہ کر پھولوں سے رس چوستی ہیں تو اس وقت ان کے پروں کی مسلسل حرکت اور جنبش سے ایک خاص قسم کی آواز نکلتی ہے جو پرندوں اور چڑیوں کے چہچہانے سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہوتی ہے۔

چہچہانے والے پرندوں کے اقسام، عادات و اطوار، حرکات و سکنات، غذا اور دوسری خصوصیات کا تذکرہ کیا جائے تو خود پرندوں کی برادری پر نظر ڈال لینا بے محل نہ ہوگا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سارے پرندے گرم خون والے حیوانات کے زمرے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پرندے "پردار"، دو پیر والے اور انڈے دینے والے ہوتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے آپ کو اس بات کا علم نہ ہو کہ پیدائش کے وقت ان کے اگلے حصہ جسم میں دو پیر ہوتے ہیں اور جیسے جیسے پرندے بڑے ہوتے ہیں ان کے یہی اگلے پیر پنکھوں (بازوؤں) میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پستانیہ (دودھ پلانے والے حیوانات) اور پرندوں کی ظاہری ساخت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے لیکن ان دونوں میں صرف اور صرف ایک چیز مشابہت رکھتی ہے اور وہ ہے ریڑھ کی ہڈی۔ پرندوں کا دل چار خانے دار ہوتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ تمام پرندے رینگنے والے حیوانات کی نسل سے ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں وہ لوگ ان قدیم ترین پرندوں کے آثار پیش کرتے ہیں جو رینگنے والے حیوانات سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔

قدرت نے کوئی چیز بے سوچے سمجھے، بے کار اور بے مقصد نہیں

1 HUMMING BIRDS.

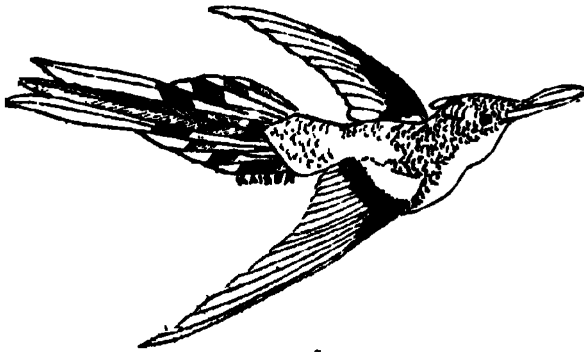
پیدا کی ہے۔ اب پرندوں کے دیکھنے اور سننے کی حس ہی کو لیجیے۔ پرندوں میں یہ حس ان کی ضرورت کے لحاظ سے کافی تیز ہوتی ہے۔ لیکن ان کا دماغ اتنا ہی مختصر ہوتا ہے۔ پرندے بہ ظاہر بہت ہی معمولی اور حقیر ہوتے ہیں۔ مگر یہ نوع انسانی نیز دوسرے جانوروں اور حیوانوں کی مقدور بھر خدمت انجام دیتے ہیں۔ مثلاً چوہوں وغیرہ کو وہ اپنی خوراک بنا کر اور اس طرح ان کی نسل کو غیر متناہی حد تک بڑھنے سے روک کر انسانوں پر احسان کرتے ہیں۔



اور حیوانوں پر ان کے کیا کیا احسانات ہیں یہ خود ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔ غرض مجموعی طور پر پرندے بہت زیادہ کارآمد ہیں۔ چناں چہ متمدن ممالک میں سرکاری طور پر ان پرندوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور ان کا شکار بھی مقررہ شرائط کے تحت ہی کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں پارلیمنٹ کے قوانین کے تحت خاص خاص موسموں میں بعض پرندوں کو نہ تو مارا جا سکتا ہے اور نہ بیچا جا سکتا ہے یہی نہیں بلکہ پرندوں کی رہائش کے لیے خاص جگہیں بنائی گئی ہیں جہاں ان کی حفاظت ہوتی ہے۔

خود ہمارے ملک میں بھی اس طرف کافی توجہ دی جا رہی ہے۔ چناں چہ سارے ہندستان میں ہر سال ماہ اکتوبر میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کا ہفتہ وسیع پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ حکومت نے یقیناً یہ ایک مستحسن اقدام کیا ہے ورنہ ہندستان شاید بہت جلد ایک بیش بہا سرمائے سے محروم ہو جاتا۔

اب اصل موضوع کی طرف آئیے۔ چہچہانے والے پرندوں کو عام طور پر پروں والی نسل کے ہیرے کہا جاتا ہے۔ جو قطعی مبالغہ نہیں۔ ماہرین نے ان کی اب تک پانچ سو قسمیں دریافت کی ہیں۔ ان میں سے ہر قسم اپنے خوب صورت رنگوں، سبک جسموں اور حسین ترین حرکات کی وجہ سے منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ زیادہ تر امریکہ،



اس کے آس پاس کے جزیروں، میکسیکو اور خط استوا کے قریب کے ممالک میں پائے جاتے ہیں اور اپنی اڑان کی وجہ سے پروں والی نسل میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ یہ عجیب انداز سے اڑتے ہیں۔ ان کی پرواز تتلی سے مشابہت رکھتی ہے۔ انھیں آپ مختلف قسم کے پھولوں کے پودوں اور جھاڑیوں کے پاس موسم بہار میں دیکھیں گے۔ دیکھنے کا لفظ خاص طور پر اس وجہ سے استعمال کیا گیا ہے کہ اگر ان کے قریب بھی آپ جانے کی کوشش کریں گے تو یہ اڑ جائیں گے۔ چنانچہ انھیں دیکھنا ہو تو ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اس احتیاط کے طفیل میں ہم ان کے مضبوط جسم اور ان کی باریک اور لانبی چونچ کو (جو پھولوں کا رس چوسنے میں مدد دیتی ہیں) دیکھ سکتے ہیں۔ چونچ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ یہ اپنی لانبی اور پتلی چونچ پھولوں میں ڈال کر ان کا رس چوستے ہیں۔ بعض پرندوں کی چونچ ٹیڑھی ہوتی

[illegible]

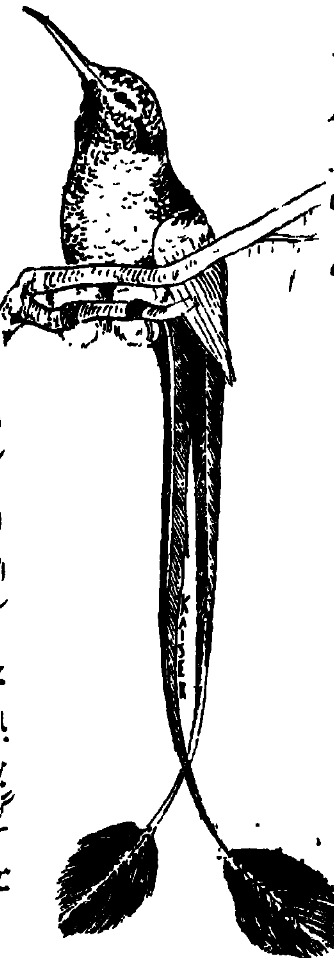
بعض کی سیدھی ہوتی ہے۔ لانبی اور مڑی ہوئی چونچ دوسرے عام پھولوں سے رس چوسنے میں مانع ہوتی ہے۔ چنانچہ جن چڑیوں کی چونچ لانبی اور مڑی ہوئی ہوتی ہے وہ ایک خاص قسم کے پھولوں سے ہی رس حاصل کرتے ہیں۔ ان پرندوں کی ایک قسم ایسی ہے جو ایک مخصوص پھول ہی کی طرف جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی چونچ کے دونوں حصے ایک دوسرے کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

آپ شاید غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ ان پرندوں کی زندگی کا انحصار پھولوں کے رس پر ہی ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دیجئے کیونکہ یہ ان کیڑوں کو بھی نہیں چھوڑتے جو ایسے پھولوں پر رہتے ہیں جن کا یہ رس چوستے ہیں۔ اب آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ ان ہی پھولوں سے یہ اپنی بھوک بھی مٹاتے ہیں اور پیاس بھی۔

کیڑوں کے علاوہ یہ چھوٹی چھوٹی مکڑیاں بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ موسم گرما کے ختم پر ایسے پھل جن سے رس ٹپکتا رہتا ہے اسے بھی پی کر یہ اپنی بھوک پیاس کا ازالہ کر لیتے ہیں۔ مگر ان پھلوں کو نقصان نہیں پہنچاتے جو اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔

ان کیڑوں اور مکڑیوں کو پکڑنے کے لیے ان پرندوں کی زبانیں بھی قدرت نے بہت ہی عجیب مگر اس کام کے لیے موزوں بنائی ہیں۔ تمام پرندوں کی زبانیں موٹی اور گداز ہوتی ہیں۔ ان کی زبانیں ویسی نہیں ہوتیں بلکہ بڑی حد تک بال کے مانند پتلی ہوتی ہیں۔ بناوٹ میں دوہری ہونے کی وجہ سے یہ ان کی مدد سے ہر کیڑے اور ہر پھول سے ایک ایک قطرہ رس یا رطوبت چوس سکتی ہیں۔

جن پرندوں میں اڑنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے بالعموم ان کے پاؤں چھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں۔ بس بالکل یہی حال ان پرندوں کا بھی ہے۔ چنانچہ ان چھوٹے پرندوں میں بھی جن کی قوت پرواز زیادہ ہوتی ہے ان کے پیر بھی چھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں۔ یہ ننھی سی جان بغیر تھکے دن بھر بہ آسانی اڑ سکتی ہے۔ انھیں چلنا پھرنا دبال معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ دن بھر پرواز کرتے رہتے ہیں اور سوائے رات کے یہ کبھی بیٹھتے یا کھڑے نہیں ہوتے۔



گویا یہ اپنی مسلسل پرواز سے اپنے کم زور پیروں کی تلافی کر لیتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ دنیا کے مختلف پرندے اپنے پروں سے مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں۔ اگر ہم ان آوازوں پر غور کریں تو بہ آسانی پہچان سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کا پرندہ ہے۔ البتہ تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اس ننھے منے پرندے کی جنھیں "ہمنگ برڈ" یعنی چہچہاتے پرندے کہتے ہیں جان ہی کتنی ہوتی ہے جو پروں سے آواز نکلے گی۔ اس لیے کہ عموماً اس کی لمبائی صرف چار انچ ہوتی ہے۔ مگر یہی کہ قدرت نے انھیں جن خصوصیات سے نوازا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کے پروں سے جب وہ دوران پرواز جنبش یا حرکت میں ہوتے ہیں چڑیوں کے چہچہانے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کا رنگ کانسی ہرا (BRONZE GREEN)[1] ہوتا ہے اور اس کا سینہ سرخی مائل بھورا (RED STAINED GRAY) ہوتا ہے۔

آخر میں اس کی خصوصیات بھی سن لیجیے یہی وہ واحد اور ننھا سا پرندہ ہے جو آگے اور پیچھے یکساں اڑ سکتا ہے اور پھولوں کے پاس آ کر ہوا میں معلق بھی ٹھہر سکتا ہے۔ اس وقت اس کے پر اتنی تیز رفتاری سے حرکت کرتے ہیں کہ نظر تک نہیں آتے۔ اپنی مختصر سی جسامت کے لحاظ سے وہ اپنے اندر جتنی طاقت رکھتا ہے اس کے اعتبار سے دنیا کا کوئی اور پرندہ اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اس کے لمبے اور پوری طرح سے بڑھے اور پھیلے ہوئے پر اور اس کی اڑنے کی غیر معمولی صلاحیت اور سکت اس کا پیچھا کرنے والے پرندوں کے لیے انتہائی پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔ شاید اسی لیے وہ مغرور ہو کر عقاب اور باز وغیرہ جیسے قوی پرندوں سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ افزائش نسل کے زمانے میں اکثر نر آپس میں گتھے نظر آتے ہیں اور قدرتی طور پر فاتح نر کے حصے میں مادہ آتی ہے۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا انداز

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۷ پر)

1 BRONZE GREEN ARE MIXTURES OF CHUMES AND BLACK PIGMENTS.

یہی دھرتی ہے یہی جنت ہے

بشانواز

طلوعِ خورشید کا یہ منظر، یہ موگرے کی حسین کلیاں
یہ اوس کے جگمگاتے موتی گلوں کی نازک کٹوریوں میں
چہکتی چڑیاں، مہکتے غنچے، یہ نرم شاخوں کا رقص پیہم
یہ ماتا کی مٹھاس، ماؤں کی نیم خوابیدہ لوریوں میں
یہ راستے میں خموش گلیاں، یہ غرقِ فکرو نشاط رہ رو
یہ ملگجی رہ گزر کے بازو بندھے ہوئے سبز ڈوریوں میں

جٹاؤں والا یہ بوڑھا برگد، جو سن چکا ہے ہزار قصے
وہ آم کے جھنڈ، کتنے راز دل جنکے بوجھ سے جو جھکے ہوئے ہیں
کسی کی الفت کے عہد و پیماں، کسی سے ملنے کے شوخ وعدے
مہکتی راتوں میں انہی راہوں پہ چاند کے سامنے ہوئے ہیں
چھپی ہوئی ہیں ہر ایک ذرّے کے دل میں کتنی ہی داستانیں
کہ ان ہی یادوں کے کتنے گلشن قدم قدم پر کھلے ہوئے ہیں

حدِ نظر تک یہ سر اٹھائے بلند ایوانوں کی قطاریں
چھتوں پہ دوشیزہ لب، مہکتی سیاہ زلفوں کی جلوہ تابی
گھروں کے آنگن میں ایک جانب سفید مٹّی کے کچھ گھروندے
یہ چھوٹے چولھے، یہ ننھے برتن، یہ گڑیاں کافور کی گلابی
یہ کچے پتہ گھروں کے اوپر بنے ہوئے سبز و سرخ بوٹے
یہ مدرسے جانے والے بچّے، حسین مہتابی، آفتابی

گھلی ہوئی ہیں یہاں کی ٹھنڈی ہواؤں میں بانسری کی تانیں
حسیں فضاؤں میں گونجتے ہیں یہاں اہنسا کے بول اب بھی
افق سے دل کے طلوع ہوتے ہیں روز سورج محبتوں کے
متاعِ جاں تک گنوا کے کرتے ہیں ہم وفاؤں کا مول اب بھی
اذان و ناقوس کی صداؤں میں نغمگی آج بھی جواں ہے
کہ وید و قرآن ہیں سنبھالے ہوئے یہاں اپنا تول اب بھی

یہ کارخانے کہ ڈھلتی رہتی ہے جن میں انسانیت کی عظمت
یہ کھیتیاں سبز لہلہاتی ہیں جن پہ قائم مدارِ ہستی
یہ مل کے مزدور آدمیوں کا یہ امنڈتا ہوا سمندر
کہ جن کے ہاتھوں میں دودھ کی نہر بن گئی پتھروں کی سختی
ہماری ان تھک مشقتوں کا صلہ بھلائی بھی بھاگڑہ بھی
ہمارے بے لوث پیار سے سربلند یہ ایک ایک بستی

یہی ہے دھرتی، یہی ہے جنت، یہی ہے خوابوں کی انجمن بھی
اسی سے ہر ایک دل کی دھڑکن، اسی سے تابندہ حسنِ فن بھی
یہی ہے دھرتی، یہی ہے جنت، یہی ہے منزل محبتوں کی
یہی ہے خورشید کا اجالا، یہی ہے مہتاب کی کرن بھی
یہی ہے دھرتی، یہی ہے جنت، یہی خیالوں کی اپسرا بھی
اسی کے قدموں میں اپنی روحیں نثار اسی پر ہمارا تن بھی

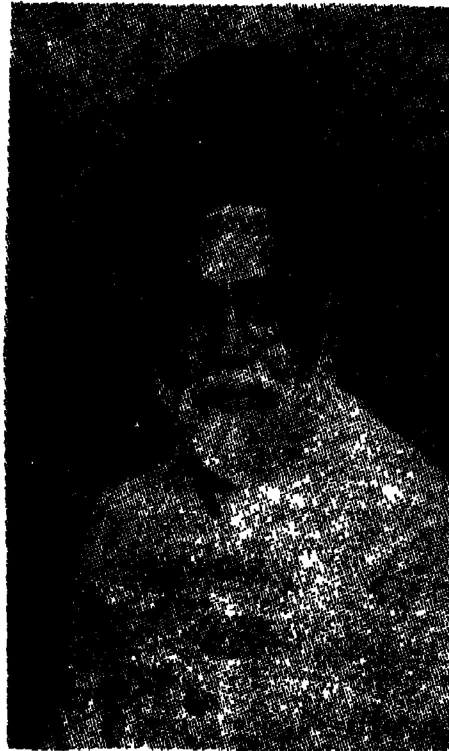
افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق

ایس۔ اے۔ حیات بادشاہ

ڈاکٹر عبدالحق ۲۱ رفروری ۱۹۰۰ء کو شہر کرنول میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد ماجد شمس العلماء الحاج مولانا محمد صاحب سے پائی جو ایک جید عالم اور اسلامیہ عربی کالج کرنول کے بانیوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق بچپن ہی سے ذکی وذہین اور چالاک تھے۔ وہ بلا کا حافظہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ صرف پانچ سال کی عمر میں آپ نے قرآن شریف ختم کرلیا۔ صغرسنی ہی میں آپ نے عربی زبان پر اتنی دست رس حاصل کرلی تھی کہ مشہور ومعروف تصنیف حجتہ اللہ البالغہ کا مطالعہ بآسانی سے کرسکتے تھے۔

آپ نے اپنے حافظے کے بارے میں اپنے ایک مضمون "مولانا عبدالسبحانؒ مرحوم" میں خود لکھا ہے:

"تیرہ سال کی عمر میں میرا حافظہ بہت قوی تھا۔ کسی کتاب کی عبارت ایک دو دفعہ دیکھنے پر یاد ہو جاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے والد مرحوم نے مجھے بچپن سے تقریر کرنے کی رغبت دلائی تھی۔ میں نے اس زمانے میں مولانا شبلی مرحوم کی اکثر تصانیف کا مطالعہ کیا تھا اور تاریخی مضامین پر تقریریں کرنے کا عادی تھا۔"



دکن کے "سرسید" افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق

آپ نے میٹرک کا امتحان میونسپل ہائی اسکول کرنول سے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا اور ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے، ۱۹۲۳ء میں افضل العلماء اور ۱۹۲۴ء میں ایم۔ اے کی ڈگریاں اول درجے میں مدراس یونی ورسٹی سے حاصل کیں۔ آپ ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ محمڈن کالج میں جو آج کل گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کے نام سے موسوم ہے، عربی فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ محمڈن کالج کی اردو سوسائٹی کا سہ ماہی رسالہ "سفینہ" ۱۹۲۸ء میں جاری ہوا اور آپ کی ادارت اور سرپرستی میں تین برس تک شایع ہوتا رہا۔ اپنی بیش بہا ادبی خدمات اور اعلیٰ ادبی معیار کی وجہ سے یہ رسالہ ہندوستان بھر میں مقبول ہوا۔ اکتوبر

سنہ ۱۹۲۷ء میں علامہ عبدالحق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے اور علم کے قدیم مرکز آکسفورڈ میں رہ کر ڈی فِل کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ڈگری مولانا کو ان کی علمی اور ادبی تحقیقات کے سلسلے میں دی گئی جو انھوں نے مصر کے ایک قدیم شاعر ابن سناء الملک کے عربی دیوان پر کی تھی۔

قیام انگلستان کے دوران ڈاکٹر عبدالحق نے افریقہ اور یورپ کے مشہور اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ اسلامی ممالک بالخصوص مصر نے جو علوم اسلامی و عربی کا مرکز ہے آپ کے علم و فضل کی بڑی قدر کی۔ یہاں کے علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں نے آپ کو اعظم العلماء اور الاستاذ الکبیر کے قابل افتخار القاب سے نوازا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد ستمبر ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ محمڈن کالج (موجودہ گورنمنٹ آرٹس کالج) کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آپ کی نگرانی اور سرپرستی میں اس کالج کا وقار بہت بڑھ گیا اور اس کا شمار صوبۂ مدراس کے ممتاز کالجوں میں ہونے لگا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں اس کالج کے جشن سیمیں کے موقع پر ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی ذاتی جہد و جہد اور سعی و کوشش سے اسلامی تہذیب و تمدن کی ایک زبردست نمائش کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ ملک کے گوشے گوشے میں اس کی تعریفیں ہوئیں، ارباب حل و عقد نے اسے بنظر قدر دانی دیکھا اور حکومت ہند نے اس نمائش کی فلمیں تیار کروائیں۔

سات سال تک پرنسپل کے عہدے پر فائض رہنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر عبدالحق ڈپٹی ڈاکٹر آف پبلک انسٹرکشن مدراس (متعلقہ مالیات) بنا دیے گئے اور ۱۹۴۸ء میں آپ مدراس کے قدیم اور مشہور پریسیڈنسی کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے۔ مدراس یونی ورسٹی کے زیر اہتمام افضل العلماء، منشی فاضل، ادیب فاضل، طبیب کامل اور افضل الاطباء کے امتحانات کا اجرا اور آنرس کے کورس میں اسلامی تاریخ اور مذہب کی شمولیت ڈاکٹر عبدالحق کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کی علمی قابلیت اور تنظیمی صلاحیتوں کو تسلیم کر کے شمال کے ارباب حل و عقد نے ۱۹۵۲ء میں آپ کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کی جگہ پر نامزد کیا۔ لیکن اسی سال حکومت مدراس نے آپ کو مدراس پبلک سروس کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ سات سال تک آپ اس عہدے پر مامور رہے پھر ۱۵ر جنوری ۱۹۵۸ء کو کمیشن کے عارضی چیرمین بنا دیے گئے۔ جس روز آپ کا انتقال ہوا اسی روز یعنی ۱۴ر مارچ ۱۹۵۸ء کو آپ کے عارضی تقرر کو مستقل تقرر سے بدلنے کے احکامات جاری ہوئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے کمیشن کو آپ کی سرپرستی نصیب نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے عارضۂ قلب میں ۱۴ر مارچ ۱۹۵۸ء کی شب کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح نہ صرف صوبۂ مدراس بلکہ پورا ملک ایک یگانۂ روزگار ہستی سے محروم ہو گیا۔ آپ مسجد والاجاہی کے احاطے میں مدفون ہیں۔ مختلف شعراء نے قطعہ ہائے تاریخ وفات لکھے ہیں۔ جن میں سے بعض ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

هوالحی الغفور

۱۳۷۷ھ

لوح گوشۂ تربت

۱۳۷۷ھ

مولانا الحاج ڈاکٹر محمد عبدالحق قبلہ طاب ثراہٗ

۱۹۵۸

اِرجِعِي إِلىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً

۱۹۵۸

مرد حق آگاہ، حق بیں، حق مقام — حق شناس و حق پسند و حق قوام
ڈاکٹر علامہ عبدالحق ما — در مہ شعبان بشد جنت مقام
گفت حادی سال رحلت فی البدٖ — رفت عبدالحق بہ حق دارالسلام
۱۳۷۷ھ

زاہد ذی احترام
۱۳۷۷ھ
مَوتُ العَالِمِ بِالحَقِّ مَوتُ العَالَم
۱۳۷۷ھ

غریق رحمت
۱۹۵۸
جوار رحمت حق ہے مقام عبدالحق
۱۳۷۷ھ

——— خطیب محمد عبدالباری حادی

ڈاکٹر عبدالحق ایک نیک سیرت وسیع النظر خلیق اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ بہت مستعد فرض شناس اور متواضع تھے۔ مہمانوں کی خاطر داری کرنے میں بہت خوش ہوتے تھے۔ آپ محتاط اور مصلحت شناس بھی تھے۔ آپ کی ذات گرامی میں پرانی تہذیب اور نئی تعلیم کا ایک قابل قدر امتزاج تھا۔ اپنی انسانیت دوستی اور پرخلوص محبت سے وہ اپنے اردگرد ایک ایسا ماحول پیدا کر لیتے تھے جو دلوں کو بہت جلد تسخیر کر لیتا تھا۔ آپ کو اپنی ذات اور اپنے فن پر کامل اعتماد تھا۔ بات کی تہہ تک پہنچ جانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے اور غیر معمولی بصیرت کے مالک تھے۔ مشکل سے مشکل کام کو وقار اور آسانی کے ساتھ دوسروں سے ختم کروا دیتے تھے۔ آپ جس عہدے اور منصب پر رہے اس کے فرائض بڑی تندہی اور انہماک سے انجام دیتے رہے اور اپنے فرض شناسی اور خدمت کے جذبے کی وجہ سے ہر جگہ مقبول رہے۔ انتظامی امور میں آپ کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے جنوبی ہند کی بیشتر تعلیمی تحریکوں کی رہنمائی اور قیادت اور نئے تعلیمی اداروں کی تشکیل کی۔ اپنی ان خدمات کی بدولت آپ بجا طور پر "دکن کے سرسید" مانے جانے لگے۔ کرنول کا عثمانیہ کالج آپ کا آخری کارنامہ ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کا آخری حصہ اس ادارے کی ترقی کے لیے وقف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحق کو اردو زبان و ادب سے والہانہ محبت تھی۔ وہ خود شاعر نہ تھے مگر مشاعروں کے بڑے مربی و سرپرست تھے۔ آپ میں شعر فہمی کا ملکہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آپ جس محفل میں چلے جاتے تھے محفل کی روح بن جاتے تھے، بالخصوص محفل مشاعرہ کی تو آپ روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شعراء بھی آپ کو کلام سنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالحق ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ایک بہترین ادیب بھی تھے۔ آپ کے مختلف مضامین مدراس اور آندھرا کے انٹرمیڈیٹ، ایس، ایس۔ ایل۔ سی اور میٹرک کے کورس کی کتابوں میں شامل کیے گئے تھے۔ جن میں یا پھی آئی۔ سفر و سیاحت۔ سیاحتِ یورپ۔ پاگل خانے کی سیر۔ مسٹر رچرڈ بائرن سے میری ملاقات جامع مسجد بن عاص۔ مدراس میں اردو صحافت کا زوال قابل ذکر ہیں۔

ایک صاحب طرز انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک بہترین مقرر بھی تھے۔ آپ کی تقریریں سادگی، برجستگی، ادبیت اور لطافت سے معمور ہوتیں۔ آپ صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی تقریر فرمانے کے عادی تھے۔

ڈاکٹر عبدالحق کی قبل از وقت موت نے وہ خلا پیدا کر دیا جو مشکل ہی سے پر ہو سکے گا۔ آپ کی موت نے جنوبی ہند سے ایک عالم باعمل اور قومی خدمت گزار کو چھین لیا۔ مگر آپ کی یاد ہر دل میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ زندۂ جاوید ہیں وہ ہستیاں جو تاریخ کے صفحات سے زیادہ ہمارے دلوں میں رہتی ہیں۔ وقت کی رو میں لکھا ہوا حرف مٹ سکتا ہے لیکن دلوں میں قائم کی ہوئی زندگیاں ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

یعنی میری موت کے بعد میری قبر کو زمین پر تلاش نہ کرو۔ تم مجھے ان لوگوں کے دلوں میں دفن پاؤ گے جو مجھ سے واقف ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کی ادبیت اور ان کی اعلیٰ انشا پردازی کا اندازہ ان کے مختلف مضامین سے لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اردو شاعری کی خوبیاں اور آج کل ادبیات میں اس کے درجے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون "نظم اردو کی مجمل تاریخ" میں مولانا لکھتے ہیں:

"مختلف حضرات نے اردو شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے لیکن سہولت کے لحاظ سے صرف دو حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے۔ قدیم و جدید اردو شاعری سے نظم کا وہ سارا ذخیرہ مراد ہے جو ابتدا سے غدر دہلی کے کچھ دنوں بعد تک شعرائے ہند کا 'سرمایۂ ناز' بنا رہا اور جس کے بیشتر حصے کے متعلق خواجہ الطاف حسین حالی کہتے ہیں ؎

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

سچ تو یہ ہے کہ یہ حصہ نہ اس قدر حقارت کے قابل ہے اور نہ قابل فخر و ناز ہے۔ مضامین کے لحاظ سے چند مطالب تک ہی شعرائے اردو کی طبع

آزمائی محدود رہی۔ فارسی کی تقلید کی لیکن ٹھیک نقل نہ اتار سکے چند شعراء نے تو اپنے کلام کو مجموعۂ خرافات بنا لیا۔ جرأت، رند وغیرہ کے کلام کا بیشتر حصہ اس قابل نہیں کہ مہذب سوسائٹی میں بار پاسکے، جو کچھ بھی ہو زبان اردو تو انھیں شعراء کی کمائی ہے۔ آج بھی وہی محاورات اور وہی استعارے اسی قسم کی ترکیبیں اور بندشیں، جدید خیالات کے لیے نہایت ہی موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ گل، بلبل، شمع و پروانہ، مے اور مینا کے متعلق استعارات ہی میں اقبال اور اکبر جیسے باکمال شعراء نے نہایت ہی پرجوش اور اچھوتے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اب شعرائے اردو نے زیر بحث مضامین کو وسعت دی ہے تاریخی اور سیاسی مضامین کو اس میں داخل کیا۔ مناظر فطرت کی نہایت ہی عمدہ تصویریں الفاظ میں کھینچیں تاریخی واقعات کو نظم کیا۔ قومی اور ملی خیالات سے نظم اردو کو روشناس کرایا بلکہ اب تو بعضوں نے قافیہ اور ردیف کی غیر ضروری بندشوں سے بھی نظم اردو کو آزاد کرانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ باوجود مختلف رکاوٹوں کے اردو شاعری نے گذشتہ صدی میں بہت ہی ترقی کی ہے اور بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا ایک شاندار مستقبل ہے۔"

مدراس میں اردو صحافت کے زوال کے اسباب تحریر فرماتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"اردو اخبارات کی مقبولیت عام اور کثرتِ اشاعت نے بہت سے کلا انشاپردازوں کو اس امر کی طرف مائل کر دیا تھا کہ وہ بھی اخبار جاری کریں اور اپنے ہمعصروں کی طرح فائدہ اٹھائیں لیکن خریداروں کی کمی اور اخبارات کی کثرت کی وجہ سے نفع کے عوض انھیں نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اکثر اخبارات بلند آہنگ دعووں کے ساتھ برآمد ہوتے تھے لیکن جس سرعت کے ساتھ یہ بند ہو جاتے تھے اس سے عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ اردو اخبار غیر مستقل اور ناپائیدار ہوا کرتے ہیں۔ اس خیال نے مدراس کی اردو صحافت کو بہت بھاری نقصان پہنچایا۔"

ایک اور مقام پر آپ لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی کے آخری دور میں اخبارات کی جلدوں کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معاصرانہ چشمک، جا و بے جا مدح و ذم، عیب جوئی، نکتہ چینی اور نارواتلخ وغیرہ ہی وسائل تھے جن کے ذریعے سے اخبارات کی اشاعت کو بڑھایا جاسکتا تھا...."

مولانا کو طالب علمی کے زمانے میں جان فن مور کی کتاب "اٹالی" (اطالیہ) پڑھنے کے بعد اطالیہ کے مشہور شہروں کو دیکھنے اور ان کی سیر و سیاحت کرنے کی تمنا رہی۔ آپ کی یہ تمنا ۱۹۳۶ء میں پوری ہوئی۔ آپ نے اطالیہ کی سیاحت کی وہاں کے مشہور شہر روما، نیپلز، وینس، فلورنس، پیزا اور ملان کی سیر کی اور اپنے تاثرات سیاحت کو قلم بند کیا ہے۔ روم کے متعلق آپ لکھتے ہیں:

"روما ملکِ اطالیہ کا صدر مقام ہے اور دنیا کے قدیم ترین شہروں میں اس کا شمار ہے۔ روما کے باشندے اپنے شہر کی قدامت کے بارے میں ایک کہانی سناتے ہیں کہ قدیم زمانے میں اس مقام پر جہاں آج کل شہر روما آباد ہے دو کم سن یتیم بچے، روملس اور رامیولس باپ اور ماں کے مرنے کے بعد جنگل میں بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے۔ ایک بھیڑیے نے انھیں دودھ پلا کر پرورش کی اور یہ بھیڑیوں کے ساتھ پلتے رہے۔ بڑے ہونے کے بعد ان دونوں بھائیوں نے کیاپٹل (CAPITOL) نامی ٹیلہ پر شہر روما کی بنیاد رکھی اور اس کو آباد کیا۔ آج بھی اس واقعہ کی یاد میں شہر روما میں ایک جگہ قدیم دروازے سے ملا ہوا ایک بہت بڑا پنجرہ رکھا گیا ہے جس میں ہمیشہ ایک زندہ بھیڑیا رکھا جاتا ہے تاکہ روملس اور رامیولس کی یاد تازہ رہے۔"

ساحلِ اطالیہ پر واقع بندرگاہ نیپلز کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"رات کو سمندر کی جانب سے کشتیوں میں یا جہازوں میں ناپولی (نیپلز) ہار بر سے قریب آنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی کا عکس سمندر کے پانی میں ایک اور شہر کا سماں دکھا رہا ہے۔ ناپولی کے حسین مناظر کی تعریف الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ سمندر کی لہروں میں روشنی کا عکس طلسم ہوش ربا کا سماں پیش کرتا ہے اس کی وجہ سے یہ کہاوت ضرب المثل بن گئی کہ "مرنے سے پہلے نیپلز کو دیکھ لو۔"

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

(بحر رمل سالم مسدس)



نازش پرتاپ گڑھی

توڑ دو، اے مے کشو! دو گھونٹ پی کر — ورنہ ہاتھوں میں چٹک جائے گا ساغر
ہو سلام روشنی، اُن رہ رووں پر — بجھ گئے جو راہ میں شمعیں جلا کر
پوچھتے ہیں تشنہ لب اک اک سے جا کر — اب کے فصلِ گل میں ٹوٹے کتنے ساغر
خود ہی یاروں کو بہم کرتا ہوں پتھر — یہ مقاماتِ جنوں، اللہ اکبر!
کوئی لغزش، کوئی دھوکا، کوئی ٹھوکر — کچھ تو گل بوٹے بنیں دامانِ دل پر
ہم نے عادت ڈال لی ہے زندگی کی — زندگی اب شاخِ گل ٹھہرے کہ خنجر
بے خبر! دبنا بھی، دُکھنا بھی پڑے گا — دل کو دل رہنے دے شیشہ کر نہ پتھر
زندگی نکھری سدا تہذیبِ غم سے — دل ہمیشہ دل بنا ہے چوٹ کھا کر
دوستو! یہ بے رخی اب کھل رہی ہے — کوئی چرکا، کوئی دھوکا، کوئی نشتر
زندگی تو سب بسر کرتے ہیں لیکن — زندگی کے تجربے کس کو میسّر؟
بات سے نازک نہ کلیاں ہیں نہ شبنم — بات سے بڑھ کر نہ پتھر نہ خنجر
بندگی، بے چارگی، تسلیم و اخلاص — کتنے دھوکے دے گیا اک سجدۂ سر
دشمنوں کی جستجو جب بھی ہوئی ہے — خود ہی پر ٹھہریں نگاہیں گھوم پھر کر
پختگی و خامیِ ذوقِ سفر ہیں — راستے میں کوئی رہ زن ہے نہ رہ بر
اُتنے ہی سخت اس کو دھوکے بھی ملے ہیں — جس کو جتنا ہی گماں تھا دوستوں پر

نازش اُس کی بے دماغی کا گلا کیا
جو خود اپنے سے خفا رہتا ہو اکثر

دسمبر ۱۹۶۶ء

سروش طباطبائی ـــــ ایک مطالعہ

سیّد نواب افسر

اردو کے شعری سرمایے میں سروش طباطبائی کا حصہ قابل لحاظ ہے۔ شعرا کی صف میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس اپنے خیالات اور اپنا رنگ و آہنگ ہو۔ عام طور پر انداز فکر اور طرز بیان میں تقلیدی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ مماثلت بتاتی ہے کہ قافلے کے قافلے ایک بندھے ٹکے راستے پر چل رہے ہیں۔ لیکن انھیں شعرا میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سر جھکا کر ساتھ نہیں چلتے۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے بھی ہیں اور اپنی سمتِ سفر کے متعلق سوچتے بھی ہیں۔ پھر ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی بالکل الگ راہ پیدا کرتے ہیں۔

سروش اپنے فن میں ایسے منفرد تو نہیں تھے جو اپنی مثال آپ ہوں لیکن اک امتیازی حیثیت کے مالک ضرور تھے۔ وہ روشِ عام سے کچھ ہٹ کے چلے۔ ان کے خیالات صحت مند تھے۔ ان کی نظر میں وسعت ذہن میں روشنی اور انداز بیان میں شستگی اور توانائی تھی۔ ان کو فارسی سے خاص شغف تھا یہ شغف ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ ان کی علمی استعداد بھی اچھی تھی اور مطالعہ بھی وسیع تھا۔

قدیم اسکول کے مصنوعی عناصر مثلاً تخئیل بندی اور رعایت لفظی کا تو خیر اس دور میں کوئی سوال نہیں۔ پھر بھی غزل کا ایک رچا ہوا رنگ ہے جو بڑی حد تک عام ہے۔ سروش اس عام رنگ کے شاعر نہیں تھے لیکن ان کو اس رنگ سے تمام تر پرہیز بھی نہیں تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی جس کا ادبی ماحول اُس وقت کے اساتذۂ فن سے متاثر تھا۔ بے شک سروش اپنی کم سنی میں فطری طور پر اس مذاق سخن سے آشنا ہوئے لیکن ان کے شعور سخن کی ابتدائی تربیت کا زمانہ لکھنؤ میں اک عبوری دور کی حیثیت رکھتا تھا۔ اصلاح کی وہ تحریک جو "معیار" کے زمانے سے چلی تھی اب کافی اثر انداز ہو چکی تھی۔ صفیؔ، عزیزؔ، محبتؔ وغیرہ اس تبدیلی کے علم بردار تھے۔ آرزوؔ اپنا ایک الگ اسکول قائم کیے ہوئے تھے۔ ینگ پارٹی کے خوش گو اور خوش نوا شعرا کا رنگ تغزل مشاعروں کی فضا پر چھایا ہوا تھا۔ سیاسی بے چینی بھی منظر عام پر آ چکی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ابھی ان ہمہ گیر انقلابی دھاروں نے، جو قدیم تصورات زندگی کی جگہ اک نئے شعور کو جنم دے رہے تھے، لکھنؤ کی قدیم روایات پر پوری طرح قابو نہیں پایا تھا۔ پھر بھی اعلیٰ تعلیمی ادارے ان نئے رجحانات کا مرکز بن چکے تھے۔ انھیں حالات کے درمیان سروش کا سلسلۂ تعلیم یونی ورسٹی تک پہنچا۔ وہ وہاں انگریزی شاعری کی قدروں اور عہد آفریں شعرا کی انقلابی سرگرمیوں سے روشناس ہوئے۔ انگریزی تنقید کے ساتھ انھوں نے اردو تنقید کا بھی مطالعہ کیا۔ حالیؔ کے مقدمۂ شعر و شاعری سے یقیناً ان کا ذہن بھی متاثر ہوا ہوگا۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی ان لوگوں کا میلان اشتراکیت کی طرف تھا۔ در اصل یہ تحریک بھی سختیِ حالات کا ردعمل تھی جیسا کہ ہر انقلابی تحریک سختیِ حالات کا ردعمل ہوتی ہے۔ یہ لوگ شاعری اور افسانہ نگاری کو مقاصد زندگی کے لیے استعمال کرنا

چاہتے تھے۔ چنانچہ مسائل زندگی سے متعلق وہ اپنے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد جاری تھی۔ نظریہ اشتراکیت ذہنوں میں جگہ پا رہا تھا۔ انتہائی پرجوش نظمیں لکھی جا رہی تھیں۔ غزل کو سڑی ہوئی لاش کہا جا رہا تھا۔ اس کشمکش میں ایک صالح متلاشی ذہن کو اپنا راستہ متعین کرنا تھا۔ تجربہ اور ناواقف تو اپنی جگہ مطمئن بیٹھے رہتے ہیں، مشکل ہوتی ہے ہوش مند و حساس طبیعت رکھنے والے کے لیے۔ اقدار سخن کی اس کشمکش میں سروش کے طبعی رجحان اور مطالعۂ حالات کی آمیزش سے ایک معتدل ذہن کی تعمیر ہو رہی تھی۔

صلاحیتوں کی صحت مند تربیت اور ترقی کے لیے مناسب رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غور و فکر اور تجربات سے ذہن حقیقت آشنا ہوتا ہے، خیالات وسیع اور واضح ہوتے ہیں لیکن اظہار خیالات کا ڈھب نہیں آجاتا۔ اسی طرح ادب خصوصاً تنقید کے مطالعے سے ذہن کو روشنی ملتی ہے، رجحانات کی صحیح سمتیں متعین ہوتی ہیں لیکن ان سمتوں پر چلنا نہیں آجاتا۔ اسی لیے میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ شاعری کی ابتدا میں کسی استاد فن سے وابستہ ہونا ضروری ہے جب تک عملی طور پر عیب و ہنر کا شعور اور فن کی سوجھ بوجھ نہ پیدا ہو جائے "بطور خود مطالعہ" پورا فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ سروش نے اپنے ہی خاندان کی ایک نمایاں اور باکمال شخصیت حضرت اثر لکھنوی سے استفادہ کیا جن کی خصوصی توجہ نے ان کے فن کو سنوارا اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ سروش کے کلام پر کم از کم فنی اعتبار سے حضرت اثر کی تعلیمات کی چھاپ ہے۔

سروش شاعری کی نئی قدریں اور نئے تصورات قبول کرنے کے باوجود حال و ماضی کا رابطہ توڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ قدیم و جدید کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دینا خلاف فطرت سمجھتے تھے۔ وہ مواد کی اہمیت کے ساتھ ہیئت کے حقوق بھی تسلیم کرتے تھے۔ وہ الفاظ کی دیکھ بھال اور انتخاب و نشست پر کافی وقت صرف کرتے تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے حامی تھے لیکن ان کو خود اپنی فکر و نظر پر پورا بھروسہ تھا۔ نہ کورانہ تقلید کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکے۔ کارل مارکس پر ان کی نظم بھرپور اور عقیدت مندانہ ہے۔ اس کے علاوہ سوویت روس اور خروشچوف پر بھی انھوں نے نظمیں کہیں لیکن اس کے بعد بھی وہ کمیونسٹ نہیں تھے کیونکہ کمیونزم سے وہ نصب العین اور اصول زندگی کی حیثیت سے متفق نہیں تھے۔

ملکی اور سماجی حالات نے ان کو اس دور میں نظموں کی طرف زیادہ متوجہ رکھا۔ ان نظموں میں زندگی اور زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ وہ دشواریوں سے مرعوب ہو کر سپر انداز ہونے کے قائل نہیں تھے۔ سماج کی خرابیاں اور ناہمواریاں بیان کرنے کے بعد ان کا راستہ یاس اور بیزارگی کی طرف نہیں بلکہ حوصلہ مندی اور رجائیت کی طرف جاتا تھا۔ مثلاً جنگ عظیم کے زمانے کی ایک نظم میں جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:

جان باقی ہے سسکتی ہوئی تہذیب میں بھی
شرر صدق ہے خاکستر تکذیب میں بھی
یعنی اس سلسلۂ غارت و تخریب میں بھی
اک نئے عہد کی تعمیر نظر آتی ہے

مناظر کشمیر کی خلد سامانیاں دیکھنے کے بعد انھوں نے جو نظم کہی تھی وہ انتہائی دلکش اور حسین ہے۔ اس نظم میں بڑی خوبصورتی سے منظر نگاری کا حق ادا کیا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ استعارے اور اشارے کے پردے میں زندگی کی نئی قدروں کا نئی آب و تاب کے ساتھ ابھرنا بھی دکھایا گیا ہے:

یہیں بدلتا ہے کہنہ روایتوں کا نظام — بہار بنتی ہے خلعت پئے زمیں ہر سال
یہیں سے ملتا ہے نور و زر و رنگ و بو کا پیام — کلی چٹکتی ہے پہلے پہل یہیں ہر سال
یہیں یہ رسم کشود حجاب ہوتی ہے
عروس لالہ و گل بے نقاب ہوتی ہے

نفسیاتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ ان کا فطری رجحان جمالیات کی طرف تھا۔ تلاش حسن کا یہ ذوق ان کی شاعری میں مسلسل کارفرما ہے۔ دوسرے موضوعات کے مقابلے میں وہ منظر نگاری اور حسن کی تصویر کشی میں زیادہ کامیاب ہیں۔ مثلاً ان کی ایک نظم ہے "ہولی کے رنگ"۔ ایک ماہ وش دریچے پر کھڑی شوہر کا انتظار کر رہی ہے:

ساجن کے انتظار میں اک ماہ وش پری   سرتا قدم شباب ہمہ حسن و دلبری
ہے آستانِ ناز پہ اپنے کھڑی ہوئی   تصویر جو کھٹے میں ہے گویا جڑی ہوئی
نوخیز جسم غرق ہے رنگِ شباب میں   کھلتی کلی کو جیسے ڈبو دو شراب میں
رخ کی دمک زری کے کناروں کی چھاؤں میں   مہتاب چھٹ رہی ہو ستاروں کی چھاؤں میں

آگے چل کر اس نظم میں ایک غریب عورت کی بیچارگی بہت موثر انداز میں بیان کی ہے اور سماج سے اس فرق کو مٹانے کے مقدس عہد پر نظم کو تمام کیا ہے :

لیکن وہ ہولی کم نہیں ہرگز جنون سے   زردار کھیلتا ہے جو مفلس کے خون سے
پہلے وطن سے رنگِ غریبی مٹائیں گے   جیتے رہے تو بعد کو ہولی منائیں گے

اپنے جمالیاتی ذوق کے باعث وہ غزل کے دلدادہ تھے چنانچہ جس دور میں وہ نظموں کی طرف نسبتاً زیادہ متوجہ تھے اس دور میں بھی برابر غزل کہتے رہے ۔ وہ غزل کی آب و ہوا میں پلے تھے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ غزل کے فارم اور لب و لہجے ہی سے بہت مانوس ہوں ۔ درحقیقت غزل کی رعنائی اور لطافت سے ان کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی ۔ نظموں میں ان کی فکری اور فنی صلاحیتیں نمایاں ہوتی ہیں، غزل میں ان کے مزاج کا رندانہ ترنم بروئے کار آتا ہے :

خدا کرے کہ یہ لمحے ابد سے مل جائیں   وہ اشک پوچھتے جاتے ہیں رو رہا ہوں میں

روح کو نین سے آتی ہے صدائے لبیک   کس نے آواز ملائی مری آواز کے ساتھ

ہر اک کے درد زباں ایک ہی فسانہ ہے   مگر کسی سے کسی کا بیاں نہیں ملتا

رسوا ہوئی نہ بوئے گل آوارگی میں بھی   کیا بات ہے مزاج کی پاکیزگی میں بھی

لیکن غزل میں رنگین بیانی اور کیف سامانی ہی سب کچھ تو نہیں ہے ۔ خیالات کی بلندی اور توانائی کی بھی بڑی اہمیت ہے ۔ سروش نے ستھرے تغزل کے ساتھ عام موضوعات پر جاندار خیالات بھی پیش کیے ہیں ۔ ان کی حوصلہ مندی غزل کے لب و لہجہ میں بھی نمایاں ہے :

اجل سے زیست کو دستِ گریباں کر دیا ہم نے   سفینے کو حریفِ موجِ طوفاں کر دیا ہم نے
سوادِ جہل ظلماتِ ستم شامِ سیہ بختی   جہاں بھی تیرگی دیکھی چراغاں کر دیا ہم نے

تھک گئے شوق کی وادی میں تگ و دو کرتے   شہپرِ وقت مرے بازوئے پرواز کے ساتھ

منزل سے آگے لے چلا ذوقِ سفر مجھے   اب عمر بھر تلاش کرے راہبر مجھے

اک حسیں شعلۂ رنگیں ہے محبت جس میں   نرمیٔ نور بھی ہے برہمیٔ ناز بھی ہے

منصبِ پیش روی عشق کو تفویض کرو   عقل فتنہ بھی ہے فتنوں میں گرفتار بھی ہے

سروش کی غزل میں اک نمایاں کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ عصری مسائل پہ استعارہ اور ایمائیت کے پردے میں بھی بہت کم اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ یہ کمی شاید اس وجہ سے ہے کہ دوسرے غزل گو شعرا کے مقابلے میں وہ نظمیں بہ کثرت کہتے تھے اور ان کے سیاسی اور ہنگامی تاثرات کا تقاضائے اظہار نظموں میں پورا ہو جاتا تھا ۔

ان کی چند نظمیں مثلاً کشمیر، صبح بنارس، ہولی کے رنگ، تاج محل وغیرہ ملک کے بعض معیاری رسائل میں شایع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں ۔ لیکن سروش کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ واقعی مستحق تھے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان میں خودشناسی کا احساس کچھ زیادہ تھا ۔ اسی لیے وہ عوامی اجتماعات اور عام مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے ۔ البتہ ایسی ادبی نشستوں اور مخصوص مشاعروں میں شوق سے شرکت کرتے تھے جہاں صفِ اول کے شعرا موجود ہوں ۔ عام طور سے اخبارات اور رسائل میں چھپنے کو بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے ۔ ان کی اس افتادِ طبع کو فطری کم آمیزی سے تو تعبیر کیا جا سکتا ہے غرور و تکبر سے نہیں ۔ سروش مغرور نہیں تھے ۔ وہ میرے ساتھی تھے اس لیے میں جانتا ہوں کہ ان میں خلق و مروت کی کمی نہیں تھی ۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بے تکلف تھے ۔ خوب ہنستے بولتے تھے ۔ لیکن عام طور پر لیے دیئے رہتے تھے ۔ ان کا یہ رکھ رکھاؤ ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے ۔ بہرحال ان کی اس کم آمیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ ادبی دنیا سے باقاعدہ روشناس ہو سکے اور نہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا پوری طرح اعتراف کیا جا سکا بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی کم آمیزی ہی ان کی شہرت و مقبولیت میں سدِ راہ ہوئی ۔

ہر فن کار اپنے فن کو پہچانتا ہے ۔ سروش بھی اپنے فن سے واقف

تھے۔ وہ چاہتے تو بہت جلد ممتاز شعرا کی صف میں اپنی جگہ بنا لیتے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ان کی فطری کم آمیزی ایک رکاوٹ بنی رہی۔ پھر بھی اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ زرا زیادہ پہچانے گئے۔ ان کا کلام بھی رسالوں میں زیادہ چھپا اور وہ خود بھی پبلک کے سامنے آئے۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے مشاعرے میں جو کئی سال کے بعد ہوا تھا انھوں نے ایک کامیاب غزل پڑھی تھی۔ اگرچہ ان کی اس غزل سے ان کے معیار فکر و فن کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس سے صرف ان کی شاعری میں آمد کا پہلو اور ان کا تغزل سامنے آتا ہے، لیکن اس ایک غزل سے بھی ان کی شاعرانہ اور فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے :

اس شہر حسن و عشق میں تنہا ہمیں ہیں کیا کوئی کسی کے ساتھ ہے کوئی کسی کے ساتھ
ہم تو سرؔدش شہر نگاراں میں بٹ گئے دل ہے کسی کے ساتھ نظر ہے کسی کے ساتھ

وہ شعوری طور پر اپنے اشعار میں وزن اور ہنک پیدا کرنے کے شائق تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ پیشتر لکھنؤ میں "جشن اثر" کے اجتماع میں انھوں نے شاید پہلی مرتبہ حضرت اثرؔ لکھنوی پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ سرؔدش کا یہ مقالہ ان کی استعداد و رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ فطری طور پر شوکت الفاظ کی طرف ان کا جو میلان تھا وہ اس مقالے میں بھی نمایاں ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے خود اپنے کلام پر حضرت اثرؔ کی اصلاحوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ الفاظ کی رد و بدل اور تراش خراش سے حسن ہیئت ہی نہیں نکھرتا مفہوم کی وسعت اور توانائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ سرؔدش زبان کی صحت اور اصول فن کے پابند تھے۔ یہ دیکھ بھال لکھنؤ اسکول کی خصوصیت ہے۔ ان کے لہجے میں ایک سمجھا بوجھا ٹھہراؤ ہے ایک ہمواری ہے جو قصیدے سے لے کر غزل تک میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ ایک کامیاب غزل گو ہی نہ تھے بلکہ ایک کامیاب نظم گو اور قصیدہ گو بھی تھے۔ سرؔدش نے نعت و منقبت کے علاوہ مرثیے اور سلام بھی کہے ہیں۔ ان میں بھی انھوں نے انسانیت کی اعلیٰ اور ہمہ گیر قدروں کو پیش نظر رکھنے اور ندرت بیان کے جوہر دکھائے ہیں۔ رہنمایان دین نے کردار کی پاکیزگی، اخلاق کی بلندی اور افکار کی رفعت کا سبق دیے اور آزادی ضمیر و حریت فکر کا حق دلانے کے سلسلے میں جو قربانیاں دی ہیں ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں دو مختصر مثالیں کافی ہیں۔ ایک نظم میں حضرت امام حسین کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں :

وہ ظرف مندی کا دل اور وہ بغاوت کا جگر آخری ضربت لگائی جس نے استبداد پر
مٹ کے جس نے لے لیا اپنی وفا کا خراج فرق پر جس کے نجات ابن آدم کا ہے تاج

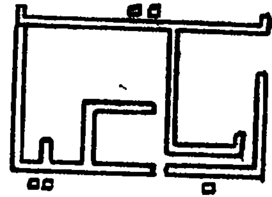
دوسری نظم میں خطابیہ انداز ملاحظہ ہو :

حسین ابن علی کا رنمایاں کر دیا تونے جنوں کے خارزاروں کو گلستاں کر دیا تونے
خزاں کو رد کش فصل بہاراں کر دیا تونے عروس زندگی کو گل بداماں کر دیا تونے
پھر اختر سوختہ انساں کو انساں کر دیا تونے

جہاں اقدار روحانی کے پیروں میں تھیں زنجیریں سروں پر جرم حق گوئی میں چل جاتی تھیں شمشیریں
جہاں نادار تھے افکار اور ناکام تدبیریں جہاں معذور تھے احساس اور مجبور تقریریں
ضمیر و دل کی آزادی کا ساماں کر دیا تونے

افسوس ہے کہ سرؔدش کا مجموعہ کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔ ادھر کچھ عرصے سے وہ اپنا کلام مرتب کر رہے تھے لیکن ایک شعلۂ مستعجل کی طرح خاموش ہو گئے۔ ان کا رنگا رنگ کلام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے "وہ زندہ رہنے والے شاعروں میں ہیں"، اس لیے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں جن قدروں کو جگہ دی ہے وہ خود جاندار اور باقی رہنے والی ہیں۔





اختر رضوانی

پیچ جانیے، سو رنگ کی تصویر بنا
ہر حال میں اِک پیکرِ تنویر بنا
کچھ پھول ہیں، کچھ حسن ہیں، کچھ غنچے ہیں
اِک ایک کی ترکیب سے کشمیر بنا

گل بوٹوں کی سرگوشیاں ہیں ایک طرف
چشموں کی ہم آغوشیاں ہیں ایک طرف
اے جنتِ ارضی! ترے جلووں کے نثار
بے جام بلانوشیاں ہیں ایک طرف

کانوں میں محبت کا پیام، آہستہ
ہاں! دَورِ مے و ساغر و جام، آہستہ
لینے دے مجھے بادۂ فطرت کا سرور
اے بادِ صبا! مشقِ خرام، آہستہ

ذرّوں کی دل آویز ہواؤں میں رہو
جھکے ہوئے دیہات کی چھاؤں میں رہو
دُنیا کی مسرت جو تمھیں ہے منظور
کشمیر کی جاں بخش فضاؤں میں رہو

ذی مرتبہ ہیں زندہ دلانِ کشمیر
خوش فکر ہیں سب پیر و جوانِ کشمیر
دشمن کے لیے حکمِ قضا رکھتی ہے
میں خوب سمجھتا ہوں زبانِ کشمیر

اگرابتی ۵۵۵ اشک.

غزل

محوی صدیقی لکھنوی

قدرت کے کسی ہوش رُبا راز کو دیکھا
یا آج تری چشمِ فسوں ساز کو دیکھا

ہم نے بھی تری انجمنِ ناز کو دیکھا
مسجودِ نظر حسنِ خدا ساز کو دیکھا

کیا پھول چُنا گلشنِ کونین سے اُس نے
ہم راز! مری چشمِ نظر باز کو دیکھا

نظریں بھی ملیں، دل بھی ملے، مل نہ سکے ہم
یارب! فلکِ تفرقہ پرداز کو دیکھا

تا حشر چھپاتے رہے جس راز کو دل میں
آخر نگہِ ناز میں اُس راز کو دیکھا

آغازِ محبت میں جو ہنستا رہا ہم پر
روتے ہوئے آخر اُسی ہم راز کو دیکھا

ہر غم کو کچلتی ہوئی پہنچی سرِ منزل
غم خوار! مری فطرتِ جاں باز کو دیکھا

سو بار نقاب اُٹھی ہے، چلمن بھی، نظر بھی
جی بھر کے نہ پھر بھی نگہِ ناز کو دیکھا

ہے ہوش بھی مجبور یہاں، ذوق بھی معذور
کہنے کو تو ہر ناز، ہر انداز کو دیکھا

اب خاکِ لحد جلوہ گہِ ماہ وشاں ہے
بربادِ محبت کے اس اعزاز کو دیکھا

اِک جست میں دام اور قفس دونوں ہیں خالی
صیّاد! مری ہمتِ پرواز کو دیکھا

محوی کی غزل اُس نے جہاں ساز پہ گائی
بے رنگ وہاں نغمۂ شیراز کو دیکھا

دسمبر ۱۹۶۶ء

(افسانہ)

پیبیت کی رہایت

اقبال متین

میں ابھی ابھی بس سے اتر پڑا ہوں اور بس مجھے چھوڑ کر روانہ ہوگئی ہے ــــ دریافت کرنے پر پتہ چلا ہے کہ مجھے اور آگے جانا چاہیے تھا ــــ یہ میری منزلِ مقصود نہیں ہے سوائے اس کے کہ آنے والی بس کا انتظار کروں ــــ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ یہ مقام بڑا پُرکشش ہے جہاں میں اتر پڑا ہوں۔ بس کا اسٹاپ جس بڑ کے پیڑ کے نیچے ہے وہ اتنا گھنا ہے کہ آسانی سے دس بارہ بسیں اس کی چھاؤں میں ٹھہر سکتی ہیں۔ اس بڑ کی شاخوں نے اپنی لمبی لمبی چوبی جٹائیں بوڑھے سادھوؤں کی طرح چھوڑ رکھی ہیں لیکن مسافروں کی سہولت کے لیے ان جٹاؤں کو جگہ جگہ سے تراش دیا گیا ہے۔

بڑ کے ایسے ہی کم زیادہ گھنے پیڑوں کا سلسلہ دور تک راستے کے دونوں کناروں پر چلا گیا ہے۔ پکی سڑک سے ملحق انھیں سایہ دار درختوں کے نیچے مختلف دکانیں سجی ہیں۔ موسمی میوے، بچوں کی مٹھائیاں اور رنگ برنگی باسکٹیں الگ الگ دکانوں میں دھری ہیں۔ تاڑ کے پتوں کی یہ خوب صورت باسکٹیں شاید یہاں کی گھریلو صنعت ہے۔

بس اسٹاپ سے قریب ہی گھنے سایوں میں ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل کے بمقابل سڑک کی دوسری سمت ایک اور ہوٹل ہے جس پر سائے اتنے گھنے نہیں ہیں اور اسی لیے پھوس کے چھپروں نے مسافروں پر اپنا سایہ ڈال رکھا ہے ــــ گھنے درخت کے نیچے والا ہوٹل پھوس کے چھپروں والے ہوٹل سے کم درجے کا ہے، بالکل اس طرح جیسے شہر کی جگمگاتی روشنیوں سے جنگل میں چٹکی ہوئی چاندنی کم درجے کی ہوتی ہے۔

پھوس کے ہوٹل میں ٹین کی کرسیاں بھی ہیں، ٹین کی میزیں بھی، بد رنگ ریڈیو بھی ہے اور بھونگے والا گراموفون بھی ــــ شیشوں میں سوکھی ہوئی پیسٹری بھی ہے، بسکٹ بھی۔ مسافروں کے لیے کیرم بورڈ بھی ہے اور شطرنج بھی ــــ شطرنج ایک تپائی کی سطح پر بنائی گئی ہے اور تپائی کی چول چول کھلاڑیوں کے کہنیاں ٹیک کر "چال" سوچنے کی عادت کے باعث ڈھیلی ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے اب کوئی کھلاڑی کہنیاں ٹیکنا چاہتا بھی ہے تو یہ تپائی پنگورے کی طرح جھول جاتی ہے اور کھلاڑی چونک کر با ادب ہو جاتا ہے۔

اب کم ہی کھلاڑی شطرنج کھیلتے ہیں۔ کیرم بورڈ پر مستقل گاہکوں کا زیادہ قبضہ رہتا ہے۔ چائے کی پیالیاں کم کھنکتی ہیں، گھٹیا سگریٹوں کا دھواں زیادہ اٹھتا ہے اور کیرم کی بازیاں چلتی رہتی ہیں۔

میں گھوم پھر کر گھنے درخت کے نیچے والے ہوٹل میں آگیا ہوں اور پتھر کی اس بنچ پر بیٹھ گیا ہوں جس پر چڑھ کر ہوٹل والے کا بچہ بڑ کی چوبی جٹائیں مضبوطی سے تھامتا ہے اور اس کا ننھا منا جسم لٹکتا جھولتا ہوا پینگ لے کر جب اس بنچ پر واپس آتا ہے تو اس کے پاؤں بڑی پھرتی سے بنچ پر ٹک جاتے ہیں کہ مبادا پاؤں تلے سے یہ بنچ کھسک نہ جائے۔

میرے اس بنچ پر بیٹھ جانے کا اس ننھے سے لڑکے پر یقیناً اثر ہوا ہے۔ دو تین بار جھول لینے کے بعد جب اس کو میرے وجود کا احساس ہوا تو اس نے کن انکھیوں سے مجھے ناپسندیدہ اجنبی کی طرح دیکھا اور بڑکی جٹائیں ہاتھ میں تھامے چپ چاپ بنچ پر کھڑا ہو گیا ـــ پھر اس نے بھی نظریں پھیر لی ہیں۔ یوں جیسے میں اسے نہیں دیکھ پا رہا ہوں لیکن وہ جان گیا ہے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں ـــ میں ذرا سا اس سے بے تکلف ہو جانا چاہتا ہوں۔

جھولو بھئی جھولو ـــ بہت عمدہ جھولتے ہو ـــ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اس کو اپنائیت کا احساس دلایا ہے۔ اب کی بار اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جو پینگ لی تو اس کے ہاتھ بڑکی جٹائیں چھوٹتے چھوٹتے بچیں اور اس کا چھریرا ننھا سا جسم ہواؤں میں ڈول کر رہ گیا اور میں نے لپک کر اس کو تھام لیا۔

اب یہ ننھا میرا دوست ہو گیا ہے اور میں ہوٹل والے کا محسن، جو اس ننھے کا باپ ہے۔

بڑا شریر ہے صاحب۔ مر ہی جاتا ـــ سندر دیوی نے جان بچا لی۔

میں نے زحمت بھی نہ کی کہ سندر دیوی کی نسبت کچھ پوچھوں۔ ذہن میں بات اس طرح آئی کہ سندر دیوی دواخانے کی کوئی نرس ہو گی یا کوئی ہمدرد لیڈی ڈاکٹر اور میں چپ ہو رہا۔

رات مجھے یہیں گزارنی ہے ـــ صبح صبح بس ملتی ہے جس سے میں اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہوں ـــ اب اس ماحول سے جی اکتانے لگا ہے۔ شہر یاد آ رہا ہے۔ اس کی جگمگاہٹیں، اس کے ہنگامے، اس کی ریل پیل، اس کی گہما گہمی، پھر اس کے وسیع قلب میں میرا اپنا چھوٹا سا گھر ـــ بیوی، بچے، اپنی کتابیں، اپنی میز سب یاد آ رہے ہیں ـــ اس انجانی بڑھتی ہوئی اداسی کا سبب یقیناً یہی ہو گا کہ ذرا سی اس غلطی نے کہ راستے ہی میں اتر پڑا ہوں میرا سارا پروگرام تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔

میں نے سوچا جب تک شام کا قافلہ اس بستی میں پڑاؤ ڈالے ذرا کی ذرا میں اس اونچے سے مندر میں ہو آؤں جس کے کلس گھنی جھاڑیوں میں سے جھانک رہے ہیں۔ یہ گھنی جھاڑیاں، ان کے درمیان سفید چمکتا ہوا مندر، اس کے دمکتے ہوئے کلس بس اسٹینڈ کے اس اُدین رائے ہوٹل سے جہاں میں بیٹھا ہوں بے حد پرکشش نظر آ رہے ہیں۔ میری نگاہیں اس مندر کی جانب بار بار اٹھتی ہیں اور میرا جی کئی بار چاہا ہے کہ میں اپنا باقی وقت وہیں گزاروں اور اگر مندر کے رکھوالے مجھے اجازت دیں تو رات کی رات وہیں پڑ رہوں۔

میں نے ہوٹل کے مالک سے مندر کا راستہ پوچھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح مندر کی بات چھیڑوں تو تھوڑی بہت تفصیلات مجھے گفتگو کے دوران میں معلوم ہی ہو جائیں گی۔

ہوٹل کے مالک نے کہا کہ میں سامنے دکھائی دینے والی پہاڑی کی سیدھی جانب پیپل کے اس جھنڈ کی طرف چلا جاؤں جہاں سائے بہت گہرے ہیں۔ انھیں سایوں میں مندر تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

اس نے کچھ سوچ کر مجھ سے پوچھا ـــ آپ کب تک لوٹ آئیں گے؟

میں نے کہا ـــ کیا معلوم ـــ مقام پسند آئے تو دیر تک بیٹھوں گا۔ مجھے اب کرنا بھی کیا ہے۔

وہ پھر کچھ سوچ میں پڑ گیا ـــ کہنے لگا ـــ ایک بات مانیے۔ ویسے مقام تو بہت پیارا ہے ـــ اتنا دل کش کہ اٹھنے کو طبیعت نہ چاہے گی ـــ مگر پھر بھی۔

اب اس کی باتوں میں میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ لیکن میں نے ایسی کوئی بات اس پر ظاہر نہیں کی ـــ

"جب وہ جگہ اتنی پرکشش ہے تو میں وہیں رات کی رات پڑ رہوں گا اگر مجھے مندر کے رکھوالے اجازت دیں۔"

نہیں ـــ نہیں ـــ وہ بے اختیار بول اٹھا ـــ میں ہی تو نہیں چاہتا کہ آپ رات میں وہاں ٹھہریں۔ اجازت تو عام طور پر مہنت دے دیتا ہے۔ وہ مسافروں کو یہ بھی بتلا دیتا ہے کہ رات کو تین بجے کے بعد وہ مندر اور اس کے احاطے میں کہیں نہ گھومیں ـــ بس لمبے لمبے ستونوں والے اس ہال ہی میں پڑے رہیں جو مسافروں کے لیے مخصوص ہے ـــ مسافر وجہ پوچھتے ہیں تو ـــ یہ بھی بتلا دیتا ہے

کہ سندر دیوی کی آتما تین بجے سے پانچ بجے تک جب چاہتی ہے ادھر ادھر مندر کے اطراف گھومتی ہے۔ بہتوں کو نظر نہیں آتی ـــــ کسی خوش نصیب کو درشن بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ جس کو درشن دیتی ہیں وہ ان کی محبت میں پاگل ہو جاتا ہے۔

میں ہنس پڑا ـــــ میں نے چاؤسے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بھائی تم فکر نہ کرنا ـــــ وہ مجھے درشن نہیں دیں گی۔ اور اگر دیں گی بھی تو میرا دل ان کی چاہت میں اتنا پاگل بھی نہ ہو جائے گا ـــــ اور میں چلنے کے لیے اٹھا۔

بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔ وہ کہنے لگا ـــــ جاٹوں کا ایک سردار اپنی ٹولی سے کٹ کر بھولا بھٹکا ادھر آ نکلا تھا ـــــ اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آج بھی مندر کی پہاڑی کے دامن میں بڑی رات کو صاف سنائی دیتی ہے ـــــ مندر میں رات بسر کرنے والے مسافر صبح کو یہ بات بتلاتے ہیں۔ جاٹوں کے اس سردار کو مرے دس سال بیت گئے۔ ان دنوں یہ گاؤں اتنا وسیع نہ تھا نہ یہ پکی سڑکیں تھیں۔ نہ سرکاری بسیں ادھر سے گزرتی تھیں۔ اب تو بستی بڑھتے بڑھتے مندر کی پہاڑی کے دامن سے قریب قریب آلگی ہے وہاں تک جہاں پر دیر جاٹ کی محبت کی نشانی میں ایک چھوٹا سا مندر اور بن گیا ہے۔ جہاں شادی سے پہلے گاؤں کا ہر دولہا درشن کرنے جاتا ہے ـــــ پرانے گاؤں کے زمینداروں نے اب نئی بستی میں پکے بنگلے بھی بنوالیے ہیں۔ ان کے گھروں کے اطراف باغ بغیچے بھی ہیں۔ مسافروں کے لیے سرائے بھی ہے۔ یہ بستی مندر کے اس جانب پہاڑی کے پیچھے چھپی ہوئی ہے ـــــ دو میل کا چکر لگا کر مندر کے مغرب میں کھائی کو پاٹنے والے پل پر سے ہو کر آپ باآسانی بستی میں پہنچ سکتے ہیں ـــــ ہوٹل والے سے کہہ کر اسپیشل کھانا بنوایا جا سکتا ہے ـــــ پھر آپ مندر میں کیوں رہیں بستی میں بھی تو رات بسر ہو سکتی ہے ـــــ اور ہاں کل بازار کا دن ہے ـــــ بازار بھرے گا، لوگ آج ہی سے اطراف کے قریوں اور ضلعوں سے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آج یوں بھی آپ کو کھانے پینے کے لیے معمول سے بہتر ہی مل جائے گا۔

وہ بغیر رکے بولتا جا رہا تھا ـــــ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

جاٹوں کا یہ سردار مندر کے اطراف کیوں گھومتا ہے"؟

سندر دیوی کی محبت میں ـــــ اس نے وثوق سے کہا۔

جاٹوں کے سردار کو مندر میں آنے کی اجازت نہ تھی ـــــ سندر رانی مہنت کی لے پالک بیٹی تھی۔ جاٹوں کا سردار سندر رانی پر سو جان سے فدا ہو گیا تھا۔ بس ایک نظر سندر دیوی کو دیکھنے کے بعد اس اونچے قد آور جاٹ نے سینہ تان کر چلنا ہی بھلا دیا تھا۔ جب وہ شروع شروع بستی میں داخل ہوا تھا۔ تو راول کے زمین دار کی بیٹی کا بیاہ تھا ـــــ مندر کا مہنت اور سندر دیوی بھی اس دعوت میں شرکت کے لیے راضی ہو گئے تھے ـــــ وہ ابھی آئے نہیں تھے، بس آنے ہی والے تھے ـــــ زمیندار نے چھ بیلوں کا رتھ ان کو لانے کے لیے بھجوایا تھا ـــــ اس وقت سندر دیوی مشکل سے اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اپسرا لگتی تھی۔ صورت کی موہنی کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے پلک جھپکانا بھول جاتے تھے ـــــ جاٹوں کا سردار جب گاؤں میں داخل ہوا تو گاؤں بھر کی نگاہیں اس پر اٹھیں ـــــ ایسا گبرو جوان کسی نے کاہے کو دیکھا تھا ـــــ ایسا لگتا تھا جیسے تڑپتی ہوئی بجلیوں پر سوار ہے ـــــ اس کی کالی گھوڑی ایک پل کے لیے بھی جیسے پیر زمین پر نہ رکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بجلی ہے کہ کوند رہی ہے۔ اور جاٹ تھا کہ بجلی کے ہنڈولے میں ڈول رہا تھا۔ طرہ دار پگڑی ـــــ کان میں سونے کی بالیاں، بائیں بازو تلوار لٹکتی ہوئی، پشت پر تیر کمان سجے ہوئے، ہاتھ میں نیزہ شکار سے راستہ بھولا ہوا شکاری۔ کسے خبر تھی کہ اس گاؤں میں آ کر خود شکار ہو جائے گا ـــــ اور جب وہ اس گاؤں میں پہنچا ہے تو بہت بھوکا پیاسا تھا۔ اس نے زمیندار سے پوچھا، کچھ کھانے کے لیے دو گے ـــــ میں ہر نوالے کے بدلے میں ایک مربع گز ایسی زمین تمھیں دوں گا جو سونا اگلتی ہو ـــــ زمیندار جب کھانے کا انتظام کرنے کے لیے خود بڑھا تو جاٹ نے نیزہ بڑھا کر بھنا ہوا مرغ نیزے کی انی سے سینی میں سے اٹھا لیا۔

اس نے بھنے ہوئے مرغ کو اپنے دانتوں سے کاٹا ہی تھا کہ مہنت

اور سندر رانی کھلے رتھ پر سوار آتے ہوئے نظر آئے ـــــ ویر جاٹ کی نظریں سندر رانی کی نظروں سے چار ہوئیں ـــــ وہ جیسے سب کچھ بھول بیٹھا' یہاں تک کہ بھوک کے عالم میں بھنا ہوا مرغ بھی ـــــ

اس نے اپنی گھوڑی کو قابو میں کرنے کے لیے باگیں کھینچ کر ایڑ لگائی۔ گھوڑی تھی کہ بجلی کی طرح تڑپتی تھی لیکن جاٹ کی نگاہیں ہر زاویے سے سندر رانی پر نچھاور ہو رہی تھیں ـــــ جب مہنت لوٹنے لگا تو اس نے بھی اپنی گھوڑی کی باگیں موڑ لیں اور رتھ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا ـــــ سندر رانی نے اس کی آنکھوں کو جیسے قید کر لیا تھا۔ وہ سندر رانی کے سوا جیسے کچھ اور دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔

مہنت نے اور گاؤں بھر نے ویر سردار کی اس حرکت کا بہت برا مانا۔ جب وہ مندر کی چڑھائی کے قریب پہنچ گئے تو ـــــ مہنت گرجا ـــــ

اب آگے نہ بڑھنا بچہ ـــــ اور سب لوگوں نے بڑھ کر سردار کو روک دیا۔

جاٹوں کا سردار مسکرایا ـــــ اس نے کہا' مندر میں ہر اس شخص کو جانے کا حق ملنا چاہیے۔ جو دیوتا کے چرنوں کو اپنے نین جل سے دھو سکتا ہے ـــــ میں اپنے نیزے کی انی' اپنی کمان کے تیر' اپنی تلوار کی دھار' یہاں تک کہ اپنے بازوؤں کا بل' اپنے بدن کا کس سب کچھ اس پہاڑی کے دامن میں تج کر نہتا' بالکل نہتا دیوتا کے چرنوں کو چھونا چاہتا ہوں تاکہ میری محبت اس اپسرا کو مانگ سکے جس کے بغیر اب میری آنکھیں' میری آنکھیں نہیں ہیں۔ وہ صرف اسی کو دیکھتی ہیں۔

جاٹوں کے سردار نے علانیہ ہاتھ اٹھا کر سندر دیوی کی طرف اشارہ کیا ـــــ اور وہ شرما کر' لجا کر' سمٹ کر مہنت کے پہلو میں گٹھڑی بن گئی۔

جاٹوں کے ویر سردار نے اپنی بجلی کی طرح ڈولتی ہوئی گھوڑی کی باگیں کھینچ لیں۔ اس نے کہا۔ میں کس بل دکھلا کر کسی شے کو حاصل کرنا نہیں چاہتا ـــــ میں اس وقت تک اس پہاڑی پر نہیں چڑھوں گا جب تک کہ مہنت مجھے خود آنے کی اجازت نہ دے ـــــ بھگوان سکے ہیں' ان کے پاس جاتی کی تفریق نہیں اور تم لوگوں نے میرا یہ حق چھین لیا ہے ـــــ لیکن' سن لو۔ اس نے کہا ـــــ میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا ـــــ خواہ دن مہینوں میں بدل جائیں اور مہینے موسموں میں اور میں یہیں مر جاؤں۔

رات ہوئی پھر دن نکلا' سورج نے اپنی حکومت پھر چندرما کو سونپ دی۔ چندرما نے دھرتی کو پھر سورج راجہ کے حوالے کیا۔ دن اور رات یوں ہی ایک دوسرے کا پیچھا کرتے رہے لیکن جاٹوں کا یہ ویر جوان اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس کی چنچل گھوڑی کی ٹھوکروں سے دھرتی پھٹتی گئی' کٹتی گئی ـــــ گاؤں والوں نے ویر سردار کو سمجھایا لیکن وہ نہیں مانا ـــــ مہنت نے شراپ دے کر کہا۔ وہ اپنی ہی کھودی ہوئی زمین میں اپنی گھوڑی سمیت دھنس جائے گا۔

چار دن بعد لوگوں نے دیکھا ویر سردار کی گھوڑی دھرتی میں اپنی پیٹھ تک سما گئی تھی ـــــ لیکن سردار کی آنکھیں مندر پر لگی ہوئی تھیں ـــــ دو دن اور گزرے تو اس کی گھوڑی زمین میں اتر گئی تھی اور سردار کندھوں تک دھرتی میں ڈوب گیا تھا لیکن اس کی آنکھیں مندر کو ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں۔

لوگوں نے جان لیا تھا کہ اب سردار کا خاتمہ ہے۔ صبح ہوئی تو سردار تھا نہ اس کی گھوڑی تھی ـــــ کٹی ہوئی زمین برابر ہو چکی تھی۔ سردار کے تیر کمان' اس کی تلوار' اس کا نیزہ سب زمین پر دھرے تھے۔ لوگ جمع ہوئے' گاؤں کا گاؤں ٹوٹ پڑا۔ جو مندر میں جا سکتے تھے وہ مندر میں جا پہنچے۔ جنھیں مندر میں آنے کی اجازت نہ تھی وہ پہاڑی کے دامن میں چیونٹیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

مہنت نے سب کو درشن دیا اور گلوگیر ہو کر اس نے کہا ـــــ سندر رانی بھی جاٹوں کے اس ویر سردار کے ساتھ دھرتی میں سما گئی ہے۔ جب دھرتی بند ہو رہی تھی' وہ خود چل کر وہاں تک پہنچی اور میں نے اسے دھرتی میں اترتے ہوئے دیکھا ـــــ میں اپنی بھول پر اب پچھتاتا ہوں ـــــ بھگوان کی کوئی جاتی نہیں ہے نین جل کی کوئی جاتی نہیں ہے' محبت کی کوئی جاتی نہیں ہے ـــــ تم سب مندر میں آ سکتے ہو ـــــ اور مہنت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور

اس دن مندر کے گھنٹے بہت زور زور سے بجے جب سب کے سب بستی میں لوٹ آئے ــــ جب دن کی روشنیاں چندرما کی چاندنی بن گئیں، جب گھنٹوں کو بجانے والا مہنت کے سوا مندر میں کوئی رہا اس وقت بھی سائیں سائیں کرتی ہوئی ہواؤں نے گھنٹوں کو مسلسل ہلایا، مانو وہ کہہ رہی تھیں ہواؤں کی کوئی جاتی نہیں ہے۔ دھوپ کی کوئی جاتی نہیں ہے۔ چاندنی کی کوئی جاتی نہیں ہے ــــ ہر وہ ہاتھ جو گھنٹوں تک پہنچ سکتا ہے وہ گھنٹوں کو ہلا سکتا ہے بجا سکتا ہے اور جب یوں نہیں ہوتا تو گھنٹے خود بخود اٹھتے ہیں۔

مسافر بابو ــــ اوپن ایر ہوٹل کا مالک مجھ سے کہنے لگا ــــ اب ہر آدمی مندر میں جا سکتا ہے ــــ مہنت کسی کو نہیں روکتا ــــ لیکن کیا تم دیر سردار کی گھوڑی کی ٹاپ رات کے سناٹوں میں سن سکو گے ــــ کیا تم سندر دیوی کی آتما کو مندر کی پہاڑی کے دامن میں حیران حیران کسی کی کھوج میں پھرتا ہوا دیکھ سکو گے؟

میں نے ہوٹل کے مالک کو مسکرا کر دیکھا اور مندر کی جانب روانہ ہو گیا۔



چہچہاتے پرندے

(بسلسلہ صفحہ ۱۱)

بڑا جاذب نظر ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو ہوائی جہاز آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔

اطراف و اکناف کے ماحول کے لحاظ سے یہ اچھا گھونسلا بنا لیتے ہیں اور موسم بہار میں اس میں انڈے دیتے ہیں۔ لیکن نر پرندہ انڈوں سے بچے نکلنے کے چند دن بعد عموماً بچوں کو مار مار کر گھونسلے سے نکال دیتا ہے۔ آخر میں یہ بتا کر آپ کو متحیر کرنا نہیں چاہتا کہ ان میں سے بعض پرندے گھڑی کے رقاص (PENDULUM) کی طرح بھی اڑ سکتے ہیں یہی وہ پرندے ہیں جن کے نزدیک "زندگی ایک نغمہ ہے"۔

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق

(بسلسلہ صفحہ ۱۶)

اطالیہ کے بعض مشاہیر کا ذکر کرتے ہوئے آپ رقمطراز ہیں:

"اطالیہ میں نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کی تحریک کے بعد سب سے زیادہ شہرت وہاں کے ماہر ریاضی اور سائنس داں گلیلیو کو حاصل ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے کشش ثقل کا کھوج لگایا اور اوپر سے نیچے آنے والی اشیاء کی رفتار اور کشش پر مقالہ لکھا۔ سیاروں کی رفتار اور کیفیت پر نئے نظریے پیش کیے چاند کی سطح کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی اور ایک ایسی دوربین بنائی جس سے سیاروں کی رفتار کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت تک عام طور پر یہ خیال تھا کہ ستارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں اور آسمان انھیں لیے ہوئے گردش کرتا ہے لیکن گلیلیو نے ثابت کیا کہ سیارے فضائے آسمانی میں گردش کرتے ہیں اور ان میں بھی باہم اسی طرح کی کشش ہے جس طرح کی کشش ثقل زمین میں پائی جاتی ہے۔"

یہ اقتباسات ان مضامین سے پیش کیے گئے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن یہاں ان کے درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان سے اندازہ ہو جائے کہ مولانا کی تحریر کتنی سادہ، دل نشین اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے اسے کس خوبی سے آسان لفظوں میں سپرد قلم کر دیتے تھے۔

چاندنی

وقار خلیل

رقص کرتی ہے فضاؤں میں رنگیلی چاندنی
کس قدر شفاف لگتی ہے نجیلی چاندنی
بانکپن سے پھر رہی ہے انجمن در انجمن
جانے کس کی جستجو میں یوں اکیلی چاندنی

فکر کے ایوانِ زرّیں میں اُتر آیا ہے چاند
تک رہی ہے طاقِ دانش کو نکیلی چاندنی
پھر خمارِ عشرتِ شب گوں کے چھلکاؤ ایاغ
نقرئی خوابوں کو لے آئی نشیلی چاندنی
جیسے یادوں کی دھنک انگڑائی لے کر جاگ اُٹھے
یوں دریچے سے اُتر آئی سجیلی چاندنی
فکرِ شاعر کے سمن پیکر حسینوں کی طرح
خوب صورت ہے، سجل ہے، یہ رسیلی چاندنی
یوں مہک اُٹھے ہیں اوراقِ کتابِ جان و دل
جیسے ہو فطرت کی انوارِ سہیلی چاندنی
تیرگی پر فتح پا کر شادماں ہے کس قدر
ہوش و ذکا فرادا، ضدّی، ہٹیلی چاندنی
سو گئی یوں فرشِ گُل پر اوڑھ کر رنگیں لباس
جیسے ویرانے میں دوشیزہ، اکیلی چاندنی
چار دن کی ہی سہی، ہے خار و گل پر گل فشاں
بُرّشِ شمشیرِ عریاں ہے کٹیلی چاندنی
چاند کا پرتو بھی ہے اور چاند کا دل بھی وقار
کہہ رہی ہے کہ اَن بوجھی پہیلی چاندنی

تجدیدِ الفت

جی، ایم، راہی فتح پوری

روشنی دینے لگے ہیں عہدِ رفتہ کے نقوش
ایک اک حرفِ تمنا بن گیا ہے سرگزشت
سُن رہا ہوں میں حدیثِ دل لبِ الفاظ سے
آپ کا مکتوب ہے گویا صدائے بازگشت
حسنِ اظہارِ تمنّا کے درخشندہ گہر
جگمگا اُٹھے تخیّل میں بہ رنگِ کہکشاں
بعد مدّت کے ملا تجدیدِ اُلفت کا پیام
روشنی میں آ گئی اِک نامکمل داستاں

دیکھتی ہیں میری نظریں شوخیِ تحریر میں
آپ کے لب کا تبسّم، آپ کا راز و نیاز
پھر تصوّر کے جھروکوں سے نظر آنے لگا
نور و نکہت میں نہایا آپ کا جسمِ گداز
اس طرح اُٹھنے لگا ماضی کے چہرے سے نقاب
خواب کی تعبیر جیسے ہو رہی ہو آشکار
بے خودیِ شوق میں بڑھنے لگے میرے قدم
لے چلا جانے کدھر پھر جذبۂ بے اختیار

رک گیا کچھ دُور چل کر کاروانِ زندگی
اپنے قدموں کے نشاں راہِ وفا میں دیکھ کر
داغ ہائے نامرادی، نالہ ہائے دل خراش
منتشر ہونے لگا شیرازۂ قلب و نظر
پردۂ احساس پر اُبھریں کئی پرچھائیاں
کچھ بہ عنوانِ تغافل، کچھ بہ حسنِ التفات
دفعتاً پھر جل اُٹھے ناکامیِ اُلفت کے داغ
کچھ بہ فیضِ شدتِ غم، کچھ بہ فیضِ حادثات

فسانۂ جدید و جام سرشار

عظیم الشان صدیقی

فسانۂ جدید، سرشار کا دوسرا ناول ہے جو اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے مختصر ناول نہیں کہا جا سکتا پھر بھی فسانۂ آزاد جیسے دیوزاد کے مقابلے میں بالکل بونا معلوم ہوتا ہے۔ کہاں فسانۂ آزاد کے ۱۸×۱۱ سائز کے ۳۲۳۶ صفحات اور کہاں اسی سائز کے تقریباً ۴۱۵ صفحات۔ لیکن فنی نقطۂ نظر سے یہ فسانۂ آزاد کے مقابلے میں زیادہ جامع اور مکمل ناول ہے اور سرشار کے تقریباً تمام ناقدین نے اس کو سراہا ہے۔ فسانۂ آزاد ہی کی طرح ابتدا میں اس کا بھی کوئی باقاعدہ نام نہیں رکھا گیا تھا اس لیے فسانۂ آزاد اور جدید ناول میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے اس کا نام فسانۂ جدید رکھا گیا۔ فسانۂ جدید کی تخلیق کے جہاں سماجی محرکات تھے وہاں سرشار کی مالی ضروریات کو بھی اس میں دخل تھا۔ چنانچہ مالک مطبع نول کشور نے جو سرشار کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھے انھیں ایک نیا ناول لکھنے کی جانب متوجہ کیا اور سرشار اس کے لیے تیار بھی ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر نہیں رہے تھے اور ڈاکٹر احسان الحسن نقوی کے بیان کے مطابق یکم فروری ۱۸۸۰ء کو وہ اس ذمے داری سے سبکدوش ہو گئے تھے اس کے بعد اودھ اخبار سے ان کا تعلق ایک مصنف کی حیثیت سے رہ گیا تھا اور فی کالم اجرت کے حساب سے وہ اس اخبار کے لیے مضامین لکھتے تھے جس کا سلسلہ ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔

فسانۂ جدید کی ابتدا کس طرح ہوئی، اس کے بارے میں سرشار نے جنوری ۱۸۸۰ء کے اودھ اخبار میں لکھا ہے کہ "ہمارا مقصد ہے کہ اس داستان آزاد کے علاوہ ایک ناول طرز نوی میں لکھیں"۔

مزید اس کے بارے میں شیو پرشاد منیجر اودھ اخبار کی زبان سے سنیئے:

"چونکہ فن ناول نویسی میں پنڈت صاحب کو ید طولیٰ حاصل ہے .... ناول نویسی کا کام جو از بس نازک اور اعلیٰ درجے کی لیاقت و مذاق کا ہے، پنڈت صاحب کے سپرد کیا گیا ...... پنڈت صاحب کئی قسم کے ناول اور ٹریجڈی اور کامڈی اور فکشن اور ڈراما وقتاً فوقتاً لکھیں گے .... اور ہفتے میں ایک بار سنیچر کے پرچے اخبار کے ساتھ ان کی خدمت میں بھیجیں اور ۱۲ صفحے سے ۱۶ صفحے تک اس کا حجم ہفتہ وار قرار دیں .... پنڈت جی نے وعدہ کر لیا ہے۔ اور یہ امر ان کی بیدار مغزی اور عالی دماغی اور روشنی طبع کا بہترین ثبوت ہے .... جہاں تک ہم کو ان معاملات میں دخل ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح قلم برداشتہ اور بلا خوض و فکر پنڈت صاحب نے فسانۂ آزاد لکھا اس طرح لکھنا کارے دارد" (اشتہار فسانۂ جدید از شیو پرشاد منیجر اودھ اخبار ۶ر ۱۸۸۰ء)

جس طرح فسانۂ جدید کی ابتدا ہوئی اور اس کا جو مقصد قرار پایا اسے بھی شیو پرشاد کی زبان سے سنیے:

"ماحصل اس کا یہ ہے کہ ناظرین کو عبرت ہو اور شائستگی ترقی پائے، مذاق اور مزاح کے طرز پر جو لکھا خوب لکھا اور لطف یہ کہ ہر ایک

بیان سے ایک ایسا نتیجہ معقول مستخرج ہوتا ہے کہ اگر اس کو
دفتر پند سودمند کہیں تو می زیبد۔"

یہ عبارت مندرجہ بالا اقتباس کا آخری حصہ ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک فسانۂ جدید لکھا جا چکا تھا۔ اس کی تصدیق درج ذیل اقتباس سے ہو جاتی ہے جو مذکورہ اقتباس ہی کا آخری جز ہے۔ اس میں اس فسانہ کی زبان و طرز بیان کی تعریف کے علاوہ اس کے سماجی پس منظر کے بارے میں بھی ہلکا سا اشارہ ملتا ہے:

"طرز بیان کو دیکھئے نکتہ رانی شیریں بیانی محاورات رنگیں فقرات دل نشیں ان سب پر طرہ اور پھر اس سے بڑھ کر لطف یہ کہ کوئی بیان خلاف واقعات نہیں ...... اس ناول کا ایک لطف مزید یہ بھی ہے کہ ہندوستانی اور یورو پین دونوں کو از بس دل حسب و دل کش معلوم ہو۔"

اب قیمت اور تاریخ اجرا کے بارے میں ملاحظہ فرمائیے:

"آیندہ ہفتہ کے اخبار کے ہمراہ جدید ناول کے ۱۲ سے ۱۶ صفحے تک طبع (ہوا کریں گے) ناظرین جوہر شناس بالفعل پانچ مہینے کے لیے آٹھ آنہ ماہواری کا خرچ گوارا فرمائیں .... یکم اگست سے دسمبر ۱۸۸۰ء تک کے لیے بحساب آٹھ آنہ ماہواری لیا جاوے گا ...... لیکن ماہ جولائی سنہ ۱۸۸۰ء میں مفت بلا قیمت ناظرین کو نذر دیا جائے گا ..... ہفتہ آیندہ سے ۱۲ صفحے سے ۱۶ صفحے تک ناول جدید چھپے گا ...... جو اس ناول کو ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں وہ از راہ نوازش ۲ر اگست سے دسمبر ۱۸۸۰ء تک کے لیے اڑھائی روپیہ ۲؎ پیشگی مطبع میں لطف فرمائیں۔ اور جو صاحب اودھ اخبار کے خریدار نہ ہوں اور ناول جدید کے مشتری ہونا چاہیں وہ مہربانی کر کے دس آنے ماہواری کے حساب سے تین روپیہ دو آنے دسیے یکمشت بابت پانچ مہینے کے پیشگی عنایت کریں شہر کے احباب کے لیے صرف دو آنہ فی پرچہ ہے۔"

مذکورہ اقتباسات میں جستہ جستہ عبارت اس اشتہار سے نقل کی گئی ہے جو فسانۂ جدید کی اشاعت سے قبل شیو پرشاد منیجر اودھ اخبار کی طرف سے ۲ر ...... (مہینہ کا نام نہیں ہے) ۱۸۸۰ء کو دیا گیا تھا اور غالباً اودھ اخبار میں چھپا تھا اور پھر یہ اشتہار فسانۂ آزاد جلد سوم طبع ثانی رسالہ نمبر ۱ بابت ماہ اپریل ۱۸۸۱ء میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس میں تاریخ اور سنہ تحریر ہے لیکن مہینے کا نام حذف کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کی عبارت یہ بتاتی ہے کہ اشتہار ۲ر جولائی ۱۸۸۰ء کا ہے کیونکہ اس میں "آیندہ ہفتہ کے اخبار کے ہمراہ جدید ناول کے ۱۲ سے ۱۶ صفحے تک طبع" ہونے کے بارے میں تحریر ہے اور فسانۂ جدید ۱۹ر جولائی ۱۸۸۰ء سے اودھ اخبار کے ہفتہ وار ایڈیشن کے ہمراہ قسط وار شائع ہونے لگا تھا، جس کی آخری قسط ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو شائع ہوئی ہو گی۔

فسانۂ جدید کا جو ایڈیشن منشی نول کشور کی فرمائش پر نظر ثانی، تصحیح و ترمیم کے بعد جام سرشار کے نام سے باتصویر شائع ہوا تھا اس میں شراب نوشی کی مذمت فسانۂ جدید کے مقابلے میں زیادہ واضح اور پر اثر انداز میں کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا نام جام سرشار رکھا گیا۔ یہاں لفظ سرشار ذومعنی ہے۔ سرشار رتن ناتھ کا تخلص بھی ہے اور جام کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ فسانۂ جدید کی تصحیح اور نظر ثانی کا کام سرشار نے خود انجام دیا البتہ اس میں پنڈت مادھو پرشاد کے مشورے بھی شامل رہے۔ یہ کام ۱۸۸۷ء میں انجام پا چکا تھا اور وہ فسانۂ جدید سے جام سرشار کے قالب میں ڈھل چکا تھا جیسا کہ قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ جام سرشار کے آخر میں منشی مراد علی، منشی بھوان سہائے فرحت رئیس سلون، منشی جوگل کشور شاد سکنڈ ماسٹر مدرسہ سلون اور منشی غلام حیدر صاحب کے قطعہائے تاریخ درج ہیں۔ یہاں طوالت کے پیش نظر چند قطعوں کے صرف وہ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں جن سے تاریخ نکلتی ہے۔

زہے جام سرشار عشق ابد ۱۳۰۴ھ	(منشی مراد علی)
خوشا جام جمشید فصاحت	(منشی مراد علی)
این مثل بود کلام شیریں ۱۸۸۶ء ۱۳۰۴ھ	(منشی بھوان سہائے فرحت رئیس سلون)
جام سرشار تو کتاب چھپی ۱۳۰۴ھ	(منشی جوگل کشور شاد)

مذکورہ بالا مصرعہائے تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جام سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی نئی تصنیف ہے اور اس کو فسانۂ جدید کا کوئی نیا ایڈیشن نہیں کہنا چاہیے۔ چنانچہ پنڈت مادھو پرشاد ڈپٹی کلکٹر و اکسٹرا اسسٹنٹ ملک مغربی و شمالی اودھ نے بھی اپنی تقریظ میں لکھا ہے کہ :

"جام سرشار پہلی مرتبہ فسانۂ جدید کے نام سے فسانۂ آزاد کے ساتھ اودھ اخبار ہفتہ وار میں چھ ماہ تک شائع ہوتا رہا تھا اور اسی نام سے پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہوا......
بعد میں نول کشور کی فرمائش پر رتن ناتھ نے اس میں تصحیح و ترمیم کر کے ازسرِ نو لکھا اور جام سرشار کے نام سے شائع ہوا۔"

فسانۂ آزاد کے دورِ ثانی میں فسانۂ جدید بھی اس کے ساتھ اودھ اخبار کے ہفتہ وار ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ پنڈت مادھو پرشاد کے بہ قول سرشار نے بعد میں منشی نول کشور کی فرمائش پر فسانۂ جدید میں "تصحیح و ترمیم کر کے ازسرِ نو لکھا" تھا۔ ایسی صورت میں جام سرشار کو سرشار کی الگ تصنیف ہی تسلیم کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ فسانۂ جدید اور جام سرشار کے پلاٹ، کرداروں کے اعمال و حرکات اور واقعات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے نیز سرشار کے زمانے ہی میں کامنی کے سرورق پر فسانۂ جدید اور جام سرشار کو سرشار کی الگ الگ تصنیفیں بتانا بھی اس کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں ایک نہیں بلکہ الگ الگ تصنیفیں ہیں۔ اس کی کچھ اور وضاحت مضمون کے آخر میں کی جا رہی ہے۔

دوسری مرتبہ فسانۂ جدید ماہانہ رسائل کی صورت میں چھ رسالوں میں شائع ہوا۔ یہ رسالے ۱۸۸۰ء میں ہی طبع ہو گئے تھے۔ ان رسائل میں سے پانچ رسالے مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ جولائی ۱۸۸۰ء کا ایک رسالہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی موجود ہے، جس کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے:

"فسانۂ جدید مصنفہ پنڈت رتن ناتھ صاحب لکھنوی جو اودھ اخبار کے ساتھ ۱۹ر جولائی ۱۸۸۰ء سے لغایت ۱۸۸۰ء شائع ہوا اور اب خریداران جدید کے لیے ازسرِ نو مرتب ہو کر طبع کیا گیا۔ مطبع منشی نول کشور مقام لکھنؤ ۱۸۸۰ء۔"

یہ رسائل چار چار قسطوں پر مشتمل ہیں۔ بعض قسطیں سولہ صفحوں سے زیادہ کی ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج کی ہے۔

فسانۂ جدید نمبر ۱۔ ماہ جولائی ۱۸۸۰ء کل صفحات ۷۲۔ از صفحہ ۱ تا ۷۲۔ ماہ جولائی کے رسالہ میں قصہ مسلسل ہے۔

فسانۂ جدید نمبر ۲۔ ماہ اگست ۱۸۸۰ء دستیاب نہیں ہو سکا اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فسانۂ جدید نمبر ۳۔ ماہ ستمبر ۱۸۸۰ء کل صفحات ۶۴۔ ہر قسط ۱۶-۱۶ صفحے کی ہے۔

فسانۂ جدید نمبر ۴۔ ماہ اکتوبر ۱۸۸۰ء کل صفحات ۷۱۔ پہلی دوسری قسط ۱۶-۱۶ صفحات پر، تیسری ۲۴ پر اور چوتھی ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

فسانۂ جدید نمبر ۵۔ ماہ نومبر ۱۸۸۰ء کل صفحات ۶۴۔ ہر قسط ۱۶-۱۶ صفحے کی ہے۔

فسانۂ جدید نمبر ۶۔ ماہ دسمبر ۱۸۸۰ء کل صفحات ۸۰۔ پہلی اور تیسری قسط ۱۶-۱۶ صفحے اور دوسری اور چوتھی قسط ۲۴-۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

غالباً اسی طرح اودھ اخبار کے ہفتہ وار ایڈیشن کے ساتھ یہ ناول قسطوں میں ۱۹ر جولائی سے ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۰ء تک شائع ہوا ہوگا۔ طبع اول و دوم میں یہ ناول بغیر کسی عنوان و ابواب کی تقسیم کے شائع ہوتا رہا۔ ماہ نومبر ۱۸۸۰ء کے رسالے میں ایک خریدار کا مندرجہ ذیل خط شائع ہوا ہے جس میں عنوانات کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے:

"پنڈت صاحب۔ تسلیم
بغیر عنوان کے مضمون اچھے نہیں معلوم ہوتے خدا جانے آپ سرخیاں کیوں نہیں لکھتے۔ مہربانی کر کے اس کی طرف متوجہ ہو جیے۔
آپ کا خادم
از کوہ آبو"

یہ خط فسانہ کی اشاعت اول کے دوران وصول ہوا ہوگا۔ فہرست کتب نول کشور کے مطابق یہ رسائل ۳۱ر اپریل ۱۸۹۱ء تک فروخت ہوتے رہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ ناول فسانۂ آزاد سے کم پسند کیا گیا ہوگا۔ اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ تصحیح و ترمیم سے قبل فسانۂ جدید اس قدر دل چسپ نہیں تھا جیسا کہ بعد تصحیح دل چسپ

ہو گیا ہے۔

عام طور پر جام سرشار کا سنہ طباعت ۱۸۸۷ء بتایا جاتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ جام سرشار کا پہلا ایڈیشن ماہ جون ۱۸۸۸ء میں چھپا جیسا کہ خاتمۃ الطبع کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

"خاتمۃ الطبع۔ پنڈت رتن ناتھ صاحب متخلص بہ سرشار سابق اڈیٹر اودھ اخبار ماہ جون ۱۸۸۸ء مطبع اودھ اخبار منشی نول کشور واقع لکھنؤ میں زیور طبع سے مزین ہوا۔"

نہیں جام سرشار میں کچھ خمار ۔۔۔ از منشی گوبند پرشاد فضا۔ ۱۸۸۸ء

سرورق مزین ہے۔ چاروں طرف حاشیے پر خوبصورت بیل ہے۔ اگست ۱۸۸۸ء کا چھپا ہوا ہے۔ سرورق پر بھی ایک عبارت درج ہے جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

"یہ ہے رتن ناتھ کا فسانہ کہ خوش بیاں کا میکدہ ہے
کہ جس سے ہر دم مشام جاں میں پہنچتی ہے بوئے خوش سر بسر

جام سرشار

قدر ریزی خامہ گہر بار

پنڈت رتن ناتھ صاحب لکھنوی متخلص بہ سرشار مصنف فسانۂ آزاد و شمس الضحیٰ و سیر کہسار و ترجمہ اعالنا وو سیہ وغیرہ۔ حسب الایمائے منشی نول کشور صاحب سی۔ آئی۔ ای تہذیب و ترتیب سے آراستہ ہو کر بہ تحفظ حق تصنیف بحق مطبع منشی نول کشور بمطبع نامی نول کشور واقع لکھنؤ میں رونق بخش بزم سخن ہوا۔ بماہ اگست ۱۸۸۸ء۔"

اشارہ تاریخ عیسوی کا کیا یہ ہاتف نے مجھ سے ارشد
(کہ) ہے معانی سے جام سرشار دیکھ لبریز آنکھ بھر کر"

سرورق پر دوسرا مصرع بغیر "کہ" کے چھپا ہوا ہے۔ ۱۸۸۷ء (۱۸۸۸) جس سے ۱۸۵۳ برآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "کہ" چھپنے سے رہ گیا ہے۔ "کہ" کے اضافہ کے بعد ۱۸۸۸ برآمد ہوتے ہیں اور یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ سرورق ۱۸۸۸ء کا ہی چھپا ہوا ہے نہ کہ ۱۸۸۷ء کا۔ جام سرشار کا متن ماہ جون ۱۸۸۸ء میں طبع ہوا اور سرورق اگست ۱۸۸۸ء میں چھپا۔

سرورق کی اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیر کہسار جون ۱۸۸۸ء تک تصنیف کیا جا چکا تھا۔ جام سرشار کا یہ ایڈیشن جو عام لائبریریوں میں نہیں ملتا ہے، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ کل صفحات ۴۹۰ ہیں۔ ہر صفحے پر چوطرفہ خوبصورت بیل ہے۔ اس کا سائز ۸ × ۶ ۱/۴ ہے۔ مسطر ۲۳ سطری اور کاغذ بادامی ہے۔ اس میں پورے قصے کو سترہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب دور کے نام سے موسوم ہے۔ باب کے شروع میں ایک تصویر ہے جو باب کی مناسبت سے دی گئی ہے۔ ان تصویروں کی تفصیل درج ذیل ہے:

تصویر نمبر ۱۔ صفحہ ۵ ۔ امین آباد کی پریزاد بیہودنیں۔

تصویر نمبر ۲۔ صفحہ ۱۵ ۔ نواب والا تبار اور سیٹھ گو جرمل ساہوکار

تصویر نمبر ۳۔ صفحہ ۲۰ ۔ سواری باد بہاری

تصویر نمبر ۴۔ صفحہ ۳۲ ۔ نزول اجلال تیاں جادو جمال

تصویر نمبر ۵۔ صفحہ ۴۷ ۔ گھوڑیوں کی تیز رفتاری اور میاں گھسیٹے کی گرفتاری

تصویر نمبر ۶۔ صفحہ ۸۰ ۔ بزم شراب

تصویر نمبر ۷۔ صفحہ ۱۲۲ ۔ بیہودنوں کی پریشانی اور حضرات پولیس کی کارستانی

تصویر نمبر ۸۔ صفحہ ۔ بیگم صاحب کا روٹھنا نواب کا منانا۔

تصویر نمبر ۹۔ صفحہ ۔ صحبت رندان ہمدم و ہمساز اور خاتون بلقیس مرتبت تحفۂ انشاراز

تصویر نمبر ۱۰۔ صفحہ ۱۹۰ ۔ نواب صاحب کھل کھیلے

تصویر نمبر ۱۱۔ صفحہ ۲۰۶ ۔ دھوم دھام کی تیاری اور تزک و احتشام کی مہمانداری

تصویر نمبر ۱۲۔ صفحہ ۲۲۸ ۔ سناٹا

تصویر نمبر ۱۳۔ صفحہ ۔ بگو کا ٹانگھن

تصویر نمبر ۱۴۔ صفحہ ۲۹۷ ۔ بچھڑوں کی ملاقات اور دن عید رات شب برات

تصویر نمبر ۱۵۔ صفحہ ۔ نواب جور تقاضل

تصویر نمبر ۱۶ صفحہ ۲۵۵ - سحر حرام و حلال اور نصرت الدولہ کا پتلا حال۔

تصویر نمبر ۱۷ صفحہ ۴۶۷ - کسی کا انجام بخیر نہ ہوا۔

جام سرشار مصنفہ سرشار کا دوسرا ایڈیشن کب چھپا یہ تو معلوم نہیں ہو سکا البتہ مارچ ۱۹۱۴ء میں اس کا جو ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپا ہے اس پر تیسرا ایڈیشن تحریر ہے۔ اس کی دو جلدیں ہارڈنگ لائبریری دہلی میں موجود ہیں۔ اس کا ایک ایڈیشن مع تقریظ نوشتہ مادھو پرشاد حال ہی میں پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں قطعۂ تاریخ نہیں دیے گئے۔

فسانۂ جدید اور جام سرشار کے موضوع، مواد، قصہ، پلاٹ، کردار اور زبان و بیان میں کیا فرق ہے، اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بقول پنڈت مادھو پرشاد سرشار نے فسانۂ جدید کو "از سر نو لکھا" ہے۔ فسانۂ جدید کے آخر میں سرشار نے جو نتائج برآمد کیے ہیں یہاں ان کو نقل کرنا ناظرین کے لیے دل چسپی کا باعث ہوگا۔

"فسانۂ جدید اب ختم ہو گیا۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ دسمبر تک یہ فسانہ شائع ہوگا..... چنانچہ ہم نے اپنا اقرار پورا کر دیا۔ ہم نے اقرار کیا تھا کہ بارہ سے سولہ صفحے تک یہ اشاعت پائے گا..... شکر ہے کہ ہم نے بیس بیس اور چوبیس چوبیس صفحوں تک یہ شائع کیا۔ اس فسانے کو جو صاحب ابتدا سے انتہا تک بغور ملاحظہ فرمائیں گے اغلب ہے کہ حظ اٹھائیں گے۔ نواب امین الدین حیدر بہادر کے حالات قابل دید ہیں اور مصاحبوں اور رفیقوں کے بھڑے بھی لطف سے خالی نہیں۔ نصرت الدولہ کا حال قابل عبرت ہے۔ وہ رئیس اعظم تھے جو بات بات پر ہزار ہا روپیہ ادنیٰ ادنیٰ سے آدمیوں کو دے نکلتے تھے...... وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر تھے...... جن کو بجز اس کے اور کوئی کام نہ تھا کہ دن رات شرابیں لنڈھائیں اور ارباب نشاط سے صحبت گرمائیں۔ وہ اب اس مصیبت میں پڑے کہ گھر بار چھوڑ کر غریب الوطن ہوئے۔ کوئی واقف ہی نہیں کہ کس طرف نکل گئے۔ فقیر ہو گئے یا خودکشی کی یا کیا ہوا...... یہ سب صحبت بد کا اثر بد ہے..."

"سیٹھ گوجرمل کی حالت اور بھی زیادہ افسوس کے قابل ہے ہمیں وہ وقت خوب یاد ہے جب کہ کمال عیش و عشرت میں سیٹھ جی صاحب مس للی کے دست نازک کو اپنے ہاتھ میں لے کر کمرے میں ٹہلتے تھے۔ مس للی ناز و ادا سے گفتگو کرتی تھیں اور سیٹھ گوجرمل کا دل ہاتھ سے جاتا تھا۔ وہ سیٹھ جی کا اصرار اور اس پری وش کا انکار کہ ہم نکاح نہ کریں گے اور مس للی کا اور بھی ادائے دلربا کے ساتھ اٹھلانا اور انا البرق کہتے ہوئے چمک دمک کے ساتھ عاشق زار کو رجھانا بھی بخوبی یاد ہے۔ مگر وہی سیٹھ گوجرمل کثرت شرابخواری اور بدمعاشی اور عیاشی کے پھیر میں ایسے ازخود رفتہ ہو گئے کہ بیان سے باہر آخرکار جنون کی ترنگ میں جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے....."

(ماخوذ از فسانۂ جدید رسالہ نمبر ۶ دسمبر ۱۸۸۰ء صفحہ ۸۰)

خاتمہ کی عبارت خاصی طویل ہے۔ یہاں اس کا کچھ حصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں جملہ مصاحبین کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس ناول کی ہیروئن ظہورن کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ صرف ابتدائی ابواب میں ظہورن ایک معمولی ملازمہ کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے اس کے بعد اس کا کوئی کردار نہیں دکھایا گیا۔ اسی طرح فسانۂ جدید میں نواب امین الدین حیدر کے بجائے سیٹھ گوجرمل خودکشی کرتے ہیں اور نواب امین الدین حیدر اس واقعہ سے متاثر ہو کر تمام بری عادتیں چھوڑ دیتے ہیں۔ علما و فضلا کی صحبت اختیار کرتے ہیں۔ مس للی کو سیٹھ گوجرمل کی خودکشی کا افسوس ہوتا ہے اور وہ کفن دفن کے لیے روپیہ دیتی ہے جبکہ جام سرشار میں مس للی کو بے وفا دکھایا گیا ہے۔ جن لوگوں نے جام سرشار کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ فسانۂ جدید کے ان نتائج کو پڑھ کر فسانۂ جدید اور جام سرشار کے فرق کا اندازہ لگا سکیں گے۔

بہرحال جام سرشار کے پلاٹ کی از سر نو تعمیر، کرداروں کے اعمال و حرکات میں نمایاں تفاوت پورے قصے کی ابواب میں تقسیم اور ہر باب کے ساتھ تصویر کی فراہمی وغیرہ کے پیش نظر ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں ایک نہیں بلکہ سرشار کی دو الگ تصانیف ہیں۔ سرشار کے زمانے ہی میں کامنی کے سرورق پہ فسانۂ جدید اور جام سرشار کو سرشار کی دو الگ تصنیفیں لکھا گیا ہے۔ فسانۂ جدید کے رسائل کا مکمل سیٹ ہندستان کی کسی لائبریری میں نہیں ملتا اگر کسی اہل ذوق کو مل جائے تو اس کو کتابی شکل میں چھپوانے کی ضرورت ہے تاکہ سرشار کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

رباعیات

سید حرمت الاکرام

نا دیدہ خلاؤں سے گزر آئی ہے
کس طرح اُٹھائے ہوئے سر آئی ہے
احساس کے پیچیدہ مراحل کی قسم
چہرے کی تھکن دل میں اُتر آئی ہے

اپنے ہی میں کھویا سا چلا جاتا ہوں
بھولا ہوا اِک خواب ہوا جاتا ہوں
وہ آگ کہاں ہے کہ تھی روشن دل میں
لمحات کے جھونکوں سے بجھا جاتا ہوں

تنقید کروں کس پہ، کسے تہمت دوں؟
نبضوں میں نہ تھم جائے مچلتا ہوا خوں
یہ دَورِ زبوں، یہ مری افتادِ مزاج!
ہے ایک جہاں ساتھ مگر تنہا ہوں

کیوں اپنا ہی سایہ مجھے ڈستا ہوتا
کیوں سینے میں یہ کھولتا لاوا ہوتا
رحم آتا ہے جاں کا ہی ذہن و دل پر
اے کاش کہ اپنے کو نہ جانا ہوتا!

کس دشت میں وہ عزمِ جواں چھوٹ گیا؟
کن موجوں میں وہ شعلۂ جاں چھوٹ گیا؟
ٹھہری تھی کبھی زندگی پل بھر کو جہاں
احساس کا وہ موڑ کہاں چھوٹ گیا؟

خوش رنگ اُمیدوں کا سہارا لیتا
یا درد بھرا گیت کوئی، گا لیتا
یہ آگہی اِک طرفہ غضب ہے ورنہ
دل کو میں کھلونوں ہی سے بہلا لیتا

دسمبر ۱۶۶

اگر ہا بزہ ۰۰۰ اشک

پنکھوں کا فیشن

حمید اُرموری

پنکھا بہ ظاہر دیکھنے میں ایک معمولی سی شے ہے، مگر اس کا ماضی انتہائی شاندار رہا ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سب سے پہلے انسان نے کب اور کیسے پنکھے کا استعمال شروع کیا۔ لیکن یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ پنکھا انسانی فطرت کی جبلّت، اس کی جدّت اور اختراع کی ایک عمدہ مثال ہے ـــ!

بھارت میں پنکھوں کا رواج عہدِ قدیم ہی سے چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ سنسکرت کے شہرۂ آفاق شاعر کالی داس کی کتابوں کمار سنبھو اور رُتو سمبھو میں پنکھوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت کے ایک اور مشہور شاعر بان بھٹ کی شہرت یافتہ تصنیف کادمبری میں لکھا ہے کہ جب کادمبری کی ہیروئن بے ہوش ہو جاتی ہے تو اس کی سہیلی تر لیکا اُسے ہوش میں لانے کے لیے پنکھا جھلتی ہے ـــ!!

چندر گپت موریا کے عہد کے مشہور سیاست داں کوٹلیا نے بھی اپنے دور کی ان دوشیزاؤں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو شاہی محلوں میں پنکھا جھلنے کے کام پر مامور تھیں ـــ!!!

بھارت کی طرح پنکھوں کی قدامت کے باب میں مصر بھی بے مثال رہا ہے۔ وہاں پنکھا جھلنے کا کام مردوں سے لیا جاتا تھا۔ مصری نقاشی اور بت تراشی کے جو قدیم نمونے THEBES میں اور دوسرے مقامات پر دستیاب ہوئے ہیں ان سے نہ صرف پنکھوں کے وسیع استعمال اور ان کی مقبولیت کا سراغ ملتا ہے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ پنکھا شاہانہ زندگی اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کا نشان بھی خیال کیا جاتا تھا۔ آج بھی مصری عجائب گھر میں پندرہویں صدی قبل مسیح کے دو نایاب پنکھے محفوظ ہیں جن کے دستے سونے کے ہیں ـ!؟

سترھویں صدی قبل مسیح کے اٹھارہویں خاندان کے ایک بادشاہ امین ہوٹپ (AMEN HOTEP) کے مقبرے سے جو چوبی پنکھا برآمد ہوا وہ بھی ابھی تک قاہرہ کے بولاک میوزیم میں محفوظ ہے۔

پرسی پولس (PERSEPOLIS) کے کھنڈرات بھی زبانِ حال سے پنکھے کی عظمت اور اُس کے شاہی فیشن کے طور پر استعمال ہونے کی داستان سنا رہے ہیں ـــ!

قدیم چین تو پنکھوں کا پہلا گھر کہلاتا ہے اس کا ذکر اکثر چینی حکایتوں میں ملتا ہے۔ چین میں نہ صرف پنکھوں کی قدر و منزلت کی گئی بلکہ پنکھوں کی شان و شوکت اور عظمت کو انتہائی عروج بھی نصیب ہوا ـــ!!

ہُن خاندان کے حکمرانوں نے کئی مشہور پنکھا سازوں کی سرپرستی بھی کی۔ اس زمانے میں شاہی بیگمات کے استعمال کے لیے چین میں خوبصورت نقش و نگار سے مزیّن پنکھے تیار کیے جاتے تھے۔ اور ایسے ہی سجے سجائے قیمتی پنکھوں کو شاہی تحفوں میں دینے کا رواج بھی عام تھا ـــ!

آج بھی چینی پنکھے اپنا ایک خاص مقام اور شہرت

رکھتے ہیں اور وہاں ہر شہر اور ہر صوبے کے پنکھے کا رنگ علاحدہ علاحدہ ہوتا ہے جس سے شہریت کا پتہ بہ آسانی چل جاتا ہے ۔۔۔ !؟

جاپان میں پنکھوں کا رواج کوئی چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران میں ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے پنکھے جاپان کی تہذیبی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گئے ۔۔۔ !

کچھ عرصے بعد ہمیں سے تہہ ہو جانے والے پنکھوں کی ابتدا ہوئی۔ ان پنکھوں کی ایجاد کے ساتھ ہی "پنکھوں کی دنیا" میں ایک حیرت انگیز انقلاب آگیا۔ شاید ان پنکھوں کے نامعلوم موجد نے تہہ ہو جانے والے پنکھے بنانے کا گر چمگادڑ کے پھیلتے اور سمٹتے بازوؤں سے سیکھا ہوگا ۔۔۔ !

ان کاغذی پنکھوں کی شکل نیم دائرہ نما ہوتی جو وقتِ ضرورت چھتر کی طرح پھیل جاتے تھے۔ ان پنکھوں پر گیت، اشعار اور نثری جملے شکستہ خط میں تحریر ہوتے تھے۔

جاپان میں عام طور پر ہاتھی دانت کی ڈنڈی والے قیمتی پنکھوں پر مشہور و معروف نقاشوں اور مصوروں سے خوبصورت نقش و نگار اور بیل بوٹے کندہ کرائے جاتے تھے۔ ایسے پنکھے بادشاہوں کی طرف سے پادریوں کو بطور تحفہ پیش کیے جاتے تھے۔ چنانچہ آج بھی وہ پنکھے جاپان کے بعض مشہور مندروں میں محفوظ ہیں۔ جو بارہویں صدی میں شاہی تحفوں میں پادریوں کو دیے گئے تھے۔

جاپان میں مارچنگ آرمی کے آگے آگے سپاہی بڑے بڑے جنگی پنکھے (WAR FANS) لیے چلتے تھے۔ جنھیں "پارسس آف کمانڈ" کہا جاتا تھا۔

جاپان کے علاقے نپور (NIPPO) میں سنہ ۱۶۳۵ء میں پرتگال تاجروں کی ایک بستی بسانے کے لیے جو مصنوعی جزیرے کی جگہ منتخب کی گئی تھی اس کی شکل بھی ایک پنکھے ہی کی طرح تھی۔ آج بھی جاپان میں پنکھے وہاں کی تہذیبی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں، خصوصاً ہر جاپانی عورت کے پاس کچھ نہ سہی ایک پنکھا تو ضرور ہوتا ہے ۔۔۔ !؟

جاپان سے پنکھوں کو پرتگالیوں نے یورپ پہنچایا جہاں ان پنکھوں کی کافی قدر ہوئی۔ پرتگال پنکھے نہ صرف رواجی ساز و سامان یا آرائشی اشیاء کے طور پر مستعمل ہونے لگے بلکہ انھیں تقدس بھی حاصل ہو گیا۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ کے اوائل میں کرسمس کی تقاریب کے دوران مقدس اور متبرک چیزوں پر سے مکھیوں کو اڑانے کا کام پنکھوں سے لیا جانے لگا ۔۔۔ !

بعض مرتبہ پنکھوں میں چاندی کی گھنٹیاں بھی باندھ دی جاتی تھیں اور یہ پنکھے مشرق و مغرب کے تقریباً سارے گرجا گھروں میں استعمال ہوتے تھے۔ اگرچہ آج کل یہ پنکھے صرف مشرقی عجائب گھروں کی زینت بن کر رہ گئے ہیں ۔۔۔ !؟

آج بھی پاپائے روم کا جو جلوس نکلتا ہے اس میں بڑے بڑے پروں کے پنکھے دکھائی دیتے ہیں جو پوپ کے جاہ و جلال، تقدس اور جلوس کی شان و شوکت اور اس کے کر و فر کے مظہر خیال کیے جاتے ہیں۔

شاہ ایڈورڈ ہفتم جب پرنس آف ویلز تھے اور ہندوستان کے دورے پر گئے تھے تو اس موقعہ پر دل کی شکل کا ایک نایاب پنکھا جس کی ڈنڈی پر ہاتھی دانت کا کام بہت ہی خوبصورتی سے کیا گیا تھا انھیں نذر کیا گیا ۔۔۔ !

پنکھے کی تقدیس سے قطع نظر بھارت میں اس کو ایک سماجی مقام بھی حاصل تھا۔ چنانچہ روم کی طرح بھارت میں بھی اسے لڑکیوں کو جہیز میں دینے کا رواج عام تھا بلکہ شاہی جہیز کا تو ایک نہایت اہم جز شمار ہوتے تھے۔ آج بھی بھارت میں پنکھوں کو دوسرے ساز و سامان کے ساتھ جہیز میں دینے کا طریقہ بدستور رائج ہے ۔۔۔ !

پنکھوں کے شاندار ماضی کا حسین ترین پہلو ان کا خواتین عالم میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرنا ہے۔ ساتویں صدی اور آٹھویں صدی کے دوران یورپ کی فیشن ایبل خواتین پنکھوں کو اس طرح استعمال کرتی تھیں جس طرح آج کل کی فیشن پرست خواتین وینٹی استعمال کرتی ہیں ۔۔۔ !

اعلیٰ طبقے کی حسین دوشیزائیں تو خوبصورت نقش و نگار سے مزین پنکھوں کو نہ صرف بے حد پسند کرتی تھیں بلکہ ان پنکھوں کے استعمال کو اپنے لیے باعثِ فخر اور برتری کا نشان سمجھتی تھیں ۔۔۔ !

شاہ ہنری ہشتم کے دربار کی شاہی مستورات بھی پنکھے استعم

اگر ایسٹر ۔۔۔ اشک

کرنے کی عادی تھیں ۔۔۔!

ایک تاریخی تصویر میں ملکۂ الزبتھ اول کو بھی ہاتھ میں پروں کا ایک گول پنکھا لیے ہوئے دکھایا گیا ہے یہ بھی مشہور ہے کہ ملکہ کے پاس ستائیس پنکھے تھے جنھیں وہ مختلف موقعوں پر استعمال کرتی تھیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں فیشن زدہ نوجوان حسین دوشیزائیں اپنے چاہنے والوں کو پنکھوں سے اشارے وکنائے کیا کرتی تھیں ۔۔۔!؟

پنکھوں کی مقبولیت کے بارے میں ایک انگریز سیاح کار پاٹ لکھتا ہے کہ ۱۶۰۸ء میں اٹلی میں پنکھوں کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ فرانس، اسپین، یونان اور امیریا کے عوام میں بھی پنکھے بہت مقبول تھے۔ اہلِ روما تو مور کے پروں سے تیار شدہ پنکھوں پر جان چھڑکتے تھے ۔ اا

مغربی ممالک میں پنکھے جمع کرنا ایک ایسا ہی دل پسند مشغلہ تھا جیسے آج کل یادگاری ٹکٹ جمع کرنا ایک محبوب مشغلہ ہے اور اس غرض کے لیے چین، جاپان اور ہندوستان سے ان ملکوں کو پنکھے درآمد کیے جاتے تھے۔ خصوصًا امریکہ نے تو ۱۸۹۱ء تک کوئی سات ملین سے زیادہ پنکھے درآمد کیے تھے۔ اس طرح پنکھوں کا کاروبار ایک نفع بخش تجارت بن گیا تھا ۔ !

عام طور پر قیمتی پنکھے چمڑے اور ریشم سے تیار کیے جاتے تھے۔ بعض پنکھے شتر مرغ اور مور کے پروں سے بنائے جاتے تھے جن میں خولصورت جھالر بھی ٹانک دی جاتی تھی ۔ ان پنکھوں کے دستے ہاتھی دانت، کچھوے کے خول، ہڈیوں اور صندل کی لکڑی کے بنے ہوتے تھے جن پہ خولصورت نقش ونگار کندہ ہوتے تھے ۔

انیسویں صدی کے پہلے دہے سے بیسویں صدی کے آغاز تک کھجور کی پتیوں اور مقوے سے تیار کیے ہوئے پنکھوں کا رواج امریکہ میں عام تھا ۔۔۔ آج بھی کھجور کی پتیوں اور مور کے پروں سے بنے ہوئے پنکھے بھارت کے بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں ۔

کہتے ہیں کہ پنکھوں کا موجودہ نام مغلیہ دور کی دین ہے جو پرندوں کے پروں یعنی پنکھوں سے مستعار ہے کیونکہ مغلیہ دور سے پہلے قدیم بھارت میں پنکھوں کو "تل برنت" ۔۔۔ "دیٹجن" وغیرہ جیسے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ البتہ انگریزی نام فین (FAN) لاطینی زبان سے ماخوذ ہے۔

پنکھا سازی کی دنیا میں پنکھوں کو خولصورت نقش ونگار سے آراستہ وپیراستہ کرنے کے فن کو روشناس کرانے کا سہرا جاپان کے سر ہے۔ ریشم اور کاغذ کے تیار شدہ رنگین پنکھے اپنی خولصورتی اور نقش و نگاری کا اعلٰے نمونہ ہوا کرتے تھے ۔ جن کی کافی مانگ تھی ۔ اسی لیے ساری آرائش وآسائش کی اشیاء میں سب سے زیادہ پنکھوں کی سجاوٹ گل کاری پر بے دریغ دولت لٹائی جاتی تھی قیمتی پنکھوں کے دستے ۔۔ آف پرل یا ہاتھی دانت کے بنائے جاتے تھے ۔ جن پہ ہیرے جواہرات جڑے ہوتے تھے ۔ یہ کام انگلینڈ، اٹلی، اور فرانس میں ہوتا تھا۔ کئی برسوں تک پیرس تو پنکھا سازی کا ایک عظیم مرکز رہا ہے ۔۔۔!

اس زمانے میں پنکھوں پر بیل بوٹے بنانے والے مصوروں (FAN PAINTERS) کی بہت مانگ تھی ۔ فرانس میں تو پنکھا سازوں نے اپنی ایک انجمن بھی بنالی تھی ۔ جن کے مفاد کی نگہداشت شاہی فرمان کے ذریعے کی گئی تھی ۔ لیکن جب یہ فرمان منسوخ ہوگیا تو فرانس کے ماہر پنکھا ساز انگلینڈ اور ہالینڈ میں جاکر پھیل گئے جہاں کی حکومتوں نے ان کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ قانون کے ذریعے ان کے مفادات اور حقوق کے حفاظت کو طمانیت بھی دی ۔ اس مقصد سے چین سے پنکھوں کی درآمد کو قانونًا ممنوع قرار دیا گیا ۔۔!؟

عالمی شہرت یافتہ مصوروں میں فرانس کے (J. A. WATTEAU) اور فرانکوئش بوچر کو ایک خاص مقام حاصل تھا : ان کے علاوہ قدیم پنکھا سازوں میں فرانس کے فلپ ڈی چمپین (PHILIPPE DE CHAMPAGNE) (PETER انگلینڈ کے پیٹر اولیور (OLIVER) اور اسپین کے کینوڈی اری ویلو (CANODE AREVLO) بہت مشہور تھے ۔ ایک انگریز کاریگر چارلس کونڈر کا نام بھی پنکھوں کی دنیا میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا جس کے خولصورت نمونے دل کش بیل بوٹے اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے ۔ ان کا ثانی نہیں تھا ۔۔۔!؟

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

رزمیہ شاعری اور میر انیس کا ایک مرثیہ

اکبر حیدر کاشمیری

رزمیہ (EPIC) جو تمام دنیائے ادب پر چھا گیا ہے ایپاس (EPOS) سے مشتق ہے جو یونانی زبان میں قصہ، کہانی، رجزیہ اور بیانیہ نظم کو کہتے ہیں۔ ایپاس کو انگریزی میں ایپک (EPIC) ہی کہتے ہیں اور ہماری شاعری میں یہ رزمیہ نظم سے موسوم ہے۔

رزمیہ میں شجاعت اور بہادری، جنگ و جدل کے علاوہ معرفت الٰہی، حسن اخلاق، بلند حوصلگی، انسانیت نوازی کا بھی درس دیا جاتا ہے۔ رزمیہ کے موضوع یا تو دیومالا سے تعلق رکھنے والی داستانیں ہوتی ہیں یا کوئی عظیم الشان تاریخی واقعہ۔ رزمیہ شاعری میں جزئی تفصیلات کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ علاوہ بریں اسمیں ایک تنہا شخص یا ہیرو اپنی بلندیٔ کردار کا ثبوت نہیں دیتا ہے بلکہ عام طور سے اُس کے دشمن بھی شان و شکوہ اور ہمت و شجاعت کے حامل ہوتے ہیں۔

رزمیہ شاعری کے لیے یہ ضروری ہے کہ نظم طویل ہو۔ ایسی نظموں میں خلاف قیاس اور ناممکن واقعات کا صحیح اور موزوں استعمال جائز قرار دیا گیا ہے بلکہ قرین قیاس یا ممکنات کو خلاف قیاس ممکنات پر ترجیح دی جاتی ہے۔ رزمیہ آخر میں جتنا ہی سبق آموز یا مصیبت آلود ہوتا اتنا ہی اُس کا زیادہ اثر سامعین پر پڑتا ہے۔ دنیا کی اہم ترین رزمیہ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

ہومر کی ایلیڈ اور آڈیسی (۲) ورجل کی اینیڈ (۳) تلسی داس کی رامائن (۴) ویاس کی مہابھارت (۵) فردوسی کا شاہنامہ (۶) ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ (۷) میر انیس کے مراثی۔

میر انیس اردو کے پہلے اور (غالباً) آخری عظیم الشان رزمیہ شاعر ہیں جن کے کلام میں رزمیہ کی جملہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے اس صنف نظم کو وہ بلند درجہ دیا یہاں تک شاید ارسطو کا تصور بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ ان کے کم و بیش ہر مرثیے میں مکمل موضوع ہے جس میں آغاز، درمیانی کڑیاں اور انجام تینوں حصے موجود ہیں۔ ان کے مرثیوں میں ٹریجڈی کی طرح کئی قسمیں کارفرما ہیں۔ سادہ، اخلاقی، اور المناک اور ان میں ارسطو کے مقرر کردہ رزمیہ شاعری کے متعلقہ اصول مثلاً انقلابات (REVERSALS) سانحات (INCIDENTS) اور دریافتیں (RECOGNITIONS) سبھی موجود ہیں۔ ان کی رزمیہ شاعری سے یہ بھی بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر ہیں، مورخ نہیں۔ رزمیہ شاعر اور مورخ میں بڑا فرق ہے۔ تاریخ ایک بڑے عہد کو بیان کرتی ہے اور رزمیہ کسی ایک اہم واقعہ یا داستان کو پیش کرتا ہے جس میں ابتدا، درمیان اور انجام موجود ہوں۔ انیس کی خداداد صلاحیت کی بلندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے ہر مرثیے کے واسطے اتنے ہی واقعات منتخب کیے جو ایک نظر میں سما سکتے ہوں اور پورے کے پورے ایک ہی نشست میں سنے جا سکتے ہوں۔ ان معنوں میں یہ مرثیے قدیم رزمیہ نظموں سے جو طویل ہوتی تھیں نمایاں برتری رکھتے ہیں۔

انیس نے اپنی رزمیہ نظموں کے واقعات کو اتنا بڑھا کر نہیں لکھا کہ ایک آدمی ایک نشست میں نہ پڑھ سکے اور مختلف نشستوں میں پڑھنے کی ضرورت

سے اس کو تاریخ کہا جائے نہ کہ رزمیہ نظم۔ انھوں نے ہر مرثیے میں جنگِ کربلا کے کسی ایک واقعہ کو چُنا اور اُس کو اس طرح بیان کیا کہ اسکی ابتدا، وسط، اور خاتمہ لکھ کر مرثیہ کو ایک ہی نشست میں مکمل کر دیا۔ اگر وہ شہادتِ حسین کے تمام واقعات کو شامل کر لیتے تو ان کی رزمیہ شاعری بے کیف ہو جاتی۔ دیگر رزم نگار شعرا نے اپنے موضوع کے لیے ایک داستان یا واقعہ کی تمام کڑیوں یا اپنے ہیرو کے تمام کارناموں کو چنا ہے۔ لیکن انھیں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی کہ انیس کے نصیب میں تھی۔ ہاں اس معاملے میں اگر کسی اور کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے تو وہ ہومر تھا جس نے ایلیئڈ میں ٹرائے (TROY) کی جنگ کی ساری داستان کو شامل نہیں کیا ہے بلکہ جنگ کا ایک ایسا حصہ نظم کیا ہے جس میں ابتدا، وسط اور انجام سب موجود ہیں۔

ذیل میں میر انیس کے ایک مرثیے "جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہوا" کا مختصر سا تجزیہ رزم نگاری کے اصولوں کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں ارسطو کے مقرر کردہ رزمیہ شاعری (EPIC POETRY) کے تمام لوازمات کارفرما ہیں۔ مرثیہ کا پلاٹ مکمل ہے۔ اس میں جتنے واقعات نظم کیے گئے ہیں وہ ایسے ہیں جن کا قرینِ قیاس یعنی (LAW OF PROBABILITY) یا لازمی نتیجے (LAW OF NECESSITY) کے تحت آنے کا امکان ہے۔ مثلاً کربلا میں پہنچ کر جب دریا کے قریب امام حسین کے خیمے نصب ہونے جا رہے تھے تو دشمن کی فوج آ گئی اور امیر لشکر نے حسین کے خیموں کے ہٹانے کو کہا۔ امام کے بھائی جناب عباس نے انکار کیا۔ اس پر ان سے اور فوجِ مخالف کے سردار سے تکرار ہوئی اور تلواریں کھنچنے کی نوبت آ گئی۔ عباس لڑنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو پانی کی جگہ پر قبضہ رہے اور دوسرے یہ کہ چاہے جنگ ہو مگر حسین کی کوئی سبکی نہ ہونے پائے۔ مگر حسین نے عباسؑ کو روک دیا۔

حسین ایک مختصر قافلے کے ساتھ کوفیوں کی دعوت پر کوفہ جا رہے تھے۔ ابھی وہ کوفہ سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ لشکرِ دشمن کے سپہ سالار حُر نے آ کر راستہ روک لیا۔ وہ انھیں ابنِ زیاد کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ حسین نے مدینہ واپس جانے کے لیے اصرار کیا مگر اُس نے انکار کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا ؎

بہتر ہے کہ اب کوفے میں چلیے میرے ہمراہ
میں اور طرف جانے نہیں دینے کا واللہ

بالآخر یہ طے ہوا کہ کوئی اور راستہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ حسینی قافلہ حُر کے لشکر سمیت کربلا میں وارد ہوا۔ حسین اپنے وجدان یا ادراک بلا واسطہ سے یہ سمجھ گئے تھے کہ یہی کربلا ہے ؎

تھمنے فرس کو روک کے شاہِ فلک وقار
منزل پہ ہم پہنچ گئے احسان کردگار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی پائے رہوار
یہ وہ زمیں ہے جس کے لیے دل تھا بے قرار
قربان اس مکان سعادت نشان کے
پایا مراد بڑی خاک چھان کے

اترا یہ کہہ کے کشتیٔ اُمت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا
اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

امام حسین اور اُن کے رفقا میں سے کسی نے بھی کربلا کو پہلے نہیں دیکھا تھا جیسا کہ عباس کے لفظ "شاید" سے پتہ چلتا ہے۔

"مشہور غاضریہ ہے شاید اسی کا نام"

غاضریہ کربلا کا دوسرا نام ہے۔ حسین نے زمینِ کربلا کو جب دیکھا تو سابق پیشین گوئیوں کی بنا پر اپنے وجدان سے بتلایا کہ یہاں ہم لوگوں کی موت واقع ہو گی "مقتل یہی زمیں ہے یہی مشہدِ امام"۔ یہ بھی فرمایا

"مرنا لکھا ہوا ہے یہیں سرنوشت میں"

"سرنوشت" خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے۔ وہ عباس کو اپنے مرنے کی جگہ بھی دکھاتے ہیں۔ پہچان (RECOGNITION) کو اس طرح ادا کرنا اس مرثیہ کا خاص انداز ہے۔ اس قسم کی پہچان کو ارسطو نے اچھی قسم قرار دیا اور مثال میں فینیڈے (PHINAIDAE) کو پیش کیا ہے۔ فینیڈے (PHINADAE) قدیم یونانی ٹریجڈی (ڈرامہ) ہے جو ۴۰۵ سال قبل مسیح تصنیف کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے کا ذکر ارسطو نے POETICS میں کیا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک جگہ دکھایا گیا ہے کہ کچھ عورتیں کہیں جا رہی تھیں۔ انھیں صحیح راستہ نہیں ملا اور وہ کسی دوسرے مقام پر پہنچ جاتی ہیں جہاں ان

کا جانے ارادہ نہیں تھا۔ انھیں اس مقام کو دیکھتے ہی اپنی تقدیر کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ کہتی ہیں کہ "ہمارے مقدر میں یہیں مرنا لکھا ہے کیونکہ تقدیر ہمیں یہاں لائی ہے"۔ مرثیہ میں بے جان چیزیں بھی موضوعِ دریافت ہیں جیسے زمین، صحرا، دریا، جنگل۔ ظاہر ہے کہ دونوں دریوں کی پہچان امید کے خلاف تھی کیونکہ ان کا ارادہ کربلا آنے کا نہیں تھا جہاں ان کی موت واقع ہونے والی تھی، بلکہ وہ کوفہ جانے والے تھے جہاں کے لوگوں نے انھیں مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے وعظ و نصیحت کے لیے مدعو کیا تھا جیسا کہ ان دو مصرعوں سے ظاہر ہوتا ہے:

چھوڑ آئے ہیں تمھارے بلانے پہ اپنا شہر
کیا خوب میہمان کی دعوت ہے واہ واہ

کربلا میں یکایک جائے شہادت پر پہنچ جانے کی پہچان خلافِ امید واقع ہوئی۔ ارسطو کے نزدیک پہچان یا دریافت (RECOGNITION) کی بہترین قسم وہ ہے جس کے ساتھ انقلاب حیثیت (REVERSAL OF INTENTION) بھی شامل ہو کیونکہ اس کی رائے میں انقلاب وہ تبدیلی ہے جو اس امید کے برعکس ہو جو عمل کے حالات سے پیدا ہوتی ہے اور وہ قرین قیاس (LAW OF PROBABILITY) یا لازمی نتیجے (LAW OF NECESSITY) کے طور پیدا ہو۔

بہرحال جب دریا کے قریب خیمے نصب ہونے جا رہے تھے تو دشمن کی فوج آگئی اور امیر لشکر نے امام حسین کے خیموں کے ہٹانے کو کہا۔ حضرتِ عباس نے انکار کیا۔ اس پر ان سے اور سردار لشکر سے تکرار ہوئی۔ عباس لڑنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن حسین نے انھیں روکا۔ حضرت عباس کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو پانی کی جگہ پر قبضہ رہے دوسرے یہ کہ چاہے جنگ ہو لیکن امام حسین کی سبکی نہ ہونے پائے۔ یہ موضوع مرثیہ کی ابتدا (BEGINNING) سے بیچ کے حصہ (MIDDLE) کی تمہید کا دوسرا مطلع شروع کرتا ہے۔

"گردوں پہ جب بیاضِ سحر کا ورق کھلا"

عشرے کی صبح کو انصارِ دیں مصلّوں پر ہی تھے کہ لشکر اعدا سے چند تیر آئے۔ عباس نے کچھ دیر پہلے دشمن پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر لڑائی کا اقدام تم نے کیا تو ہمیں مدافعت کرنا ہی پڑے گی۔

سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

قصہ کوتاہ عباس امام حسین کے لیے سینہ سپر ہوئے اور اس طرح دشمن نے جنگ کرنے میں سبقت کر لی۔ دشمن کی اس جارحانہ کارروائی پر امام حسین نے دفاع کے لیے لڑنے کا حکم دیا۔

"اچھا لڑو کہ خالقِ کونین ہے کفیل"

لڑائی صبح کی نماز کے بعد سے نصف النہار تک گھمسان کی ہوتی رہی۔ اس کے بعد حسین نے اپنے خاص رفقا اور اعزا کو ایک ایک یا دو دو کی تعداد میں میدان جنگ میں بھیج کر لڑائی کو عصر کے وقت تک پہنچا دیا اور اس بات کا ثبوت دے دیا کہ ایک کامل جرنل کس طرح مٹھی بھر سپاہ کو ایک ٹڈی دل دشمن کی فوج کے مقابلے میں سہ پہر تک لڑا سکتا ہے۔ سب انصار و عزیز یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ اب عباس میدان جنگ میں جانا چاہتے تھے۔ چونکہ حسین ایک روز قبل ان کو دشمن سے جنگ کرنے سے منع فرما چکے تھے اس لیے رخصت طلبی میں ہچکچاہٹ تھی۔ اس عرصہ میں عباس کو جناب سکینہ کی شدت تشنگی سے ایک عرض مدعا کا موقع ملا اور انھوں نے ؎

یہ کہہ کے رکھ دیا قدم شاہ دیں پہ سر
پیاسی سکینہ مرتی ہے یا شاہِ بحر و بر
گذرے ہیں تین دن یونہیں اس خوش صفات پر
گر اذن ہو تو پانی کو جاؤں فرات پر

حسین نے عباس کے مسلسل اصرار پر انھیں پانی لانے کی اجازت فرمائی۔ سکینہ نے اپنے ننھے ہاتھوں سے پانی لانے کے لیے مشک دے دی اور عباس پانی لانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ دریا پر جانے کے لیے لڑائی ہوئی اور عباس جنگ کر کے دریا پر پہنچ ہی گئے۔ پھر

"مشکیزہ بھر کے دوش پہ رکھا بہ چشم نم"

یہ تھیں درمیانی کڑیاں جو ابتدائی حصہ سے براہ راست نکلیں۔ اب آخری حصہ درمیانی حصہ سے یوں نکلتا ہے۔

"نکلا پلٹ کے نہر سے شبدیز تو خوش قدم"۔

اور ؎

بڑھتے ہی بحر ظلم کی موجوں میں گھر گیا
سقہ نبی کی آل کا فوجوں میں گھر گیا

اس کے بعد دشمن چلانے لگا سے

ہاں راہ روک لو یہ ہوئی چار سو پکار　　برچھے اٹھا اٹھا کے بڑھے سیکڑوں سوار
ڈھالیں بڑھیں بہم کہ اٹھا ابر کوہسار　　تیغیں علم ہوئیں کہ بندھا آہنی حصار

ہلتا تھا چرخ غلغلۂ دار و گیر سے
حلقہ کسی کماں کا نہ خالی تھا تیر سے

عباس نے جنگ شروع کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ؏

آدھی صفیں تو بچھ گئیں آدھی اُلٹ گئیں

پھر دشمنوں نے بڑی بزدلی اور شکست خوردگی کے احساس سے تیروں کی بوچھار شروع کر دی کہ خیمے تک پانی نہ پہنچنے پائے۔ عباس زخمی ہوئے اس کے بعد　"دیکھا جو پھر کے دست مبارک زمیں پہ تھا"

اور　"اب تھاما بائیں ہاتھ میں مشکیزہ و علم"

لیکن

تلواریں دو چلیں جو کمیں گاہ سے بہم　　اُلجھا ہوا وہ ہاتھ بھی بس ہو گیا قلم

اس حالت کے باوجود انھیں پیاسی سکینہ کی بڑی فکر تھی۔ چنانچہ مشک آب دانتوں میں داب لی اور خیمے کی طرف جانے لگے۔ اتنے میں فوج ستم چاروں طرف سے سمٹ آئی اور یکبار حملہ کیا۔ اس حملے کے نتیجے میں سے

اک تیر لگ کے مشک سے گزرا جگر کے پار　　پانی کے ساتھ سینے سے چھوٹی لہو کی دھار

اس کے بعد سے

گرز ستم سے شق ہوا ناگہ سر جناب　　تھرائے ہونٹ چھٹ گئی دانتوں سے مشک آب
فرمایا ہائے دیں گے سکینہ کو کیا جواب　　گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثل آفتاب

تڑپے اُٹھے کراہ کے خاموش ہو گئے
منہ رکھ کے خالی مشک پہ بیہوش ہو گئے

امام حسین وقتِ نزع عباس کے پاس تشریف لے گئے اور دونوں میں کچھ گفتگو ہوئی پھر سے

یہ بات سُن کے حضرت عباس تھرتھرائے　　قطرے لہو کے آنکھوں سے عارض پہ بہہ کے آئے
دو بار سر پٹک کے پکارے کہ ہائے ہائے　　برخوں دہن حسینؑ کے قدموں کے پاس لائے

ہچکی کے ساتھ موت کا خنجر بھی چل گیا
سر پاؤں پر دھرا رہا اور دم نکل گیا

عباس کو جو سکینہ سے محبت تھی اور امام حسین کے لئے ان کے دل میں جو احترا م تھا وہ اس بند سے ٹپکا پڑتا ہے۔ یہاں شاعر نے عباس کی حالتِ نزع کا جو منظر پیش کیا ہے وہ بہت ہی دردناک اور الم ناک ہے لیکن پھر بھی اسے اس نے ایسے سلیقے سے ادا کیا جس سے پڑھنے والے کو اس خوش سلیقگی پر ایک طرح کی خوشی حاصل ہے۔ ارسطو کے نزدیک ایسا طرزِ بیان رزمیہ کی شان کو دوبالا کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ یہ واقعہ مرثیے میں مکمل بیان ہوا ہے۔ یعنی اس کی ابتدا ہے، بیچ کی کڑیاں ہیں جو اسی سلسلے میں پیدا ہوئی ہیں اور آخری حصہ ہے جو اسی کا نتیجہ ہے اور ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتا ہے۔

میر انیس نے اس مرثیے میں جن کرداروں کا نام لیا ہے وہ سب حقیقی ہیں۔ فرضی کوئی بھی نہیں اور جن باتوں سے کام لیا ہے ان کی بنیاد بھی تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ نفسِ واقعہ حقیقتاً وقوع میں آیا تھا اس لئے مرثیے کا ہر جز سچا معلوم ہوتا ہے اور اس مرثیے کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ نفسِ واقعہ کیا ہے۔ یہ بھی جتا دینا چاہیے کہ شاعر نے تاریخ نہیں بلکہ واقعات سے ایک پلاٹ مرتب کیا ہے۔ مگر جب انھوں نے خالص تاریخی واقعات بیان کیے تب بھی طرزِ نگارش میں قرینِ قیاس (LAW OF PROBABILITY) یا لازمی نتیجے (LAW OF NECESSITY) کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس سارے مرثیے میں فطری تسلسل (NATURAL CONTINUITY) اور اس کے کرداروں میں یکرنگی قائم رہتی ہے۔ واقعات گو المیہ ہیں لیکن ان میں کشش ہے۔ باوجود اس کے کہ حضرتِ عباس دریا میں گھوڑا ڈالے ہوئے ہیں لیکن اس کی وفاداری مانع ہے اور وہ بغیر امام حسین اور اہلِ بیت کے پانی نہیں پیتا سے

گردن ہلا کے کہنے لگا اسپ تیز گام　　بے ذوالجناح مجھ پہ بھی پانی ہے یہ حرام
اس قوم میں نہیں کہ ڈبو دوں وفا کا نام　　آقا ابھی حسین کے بچے ہیں تشنہ کام

مطلب یہ ہے کہ ذکر وفا چار سو رہے
تر خشک لب نہ ہوں تو نہ ہوں آبرو رہے

خود حضرت عباس نے بھی امام کے بچوں کو پلائے بغیر پانی پینا گوارا نہیں کیا۔ غرض حضرت عباس کے اور ان کے گھوڑے کے پانی نہ پینے سے کمال رنج ہوتا ہے وہاں ان کی بلند اخلاقی و فرض شناسی سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے۔

آگے چل کر واقعات لرزہ خیز ہوجاتے ہیں۔ جب وہ مشک بھر کے چلتے ہیں تو پہلے پشت کی جانب سے وار ہوتا ہے اور ان کا ایک ہاتھ قلم ہوجاتا ہے یہاں شاعر نے کیا لطف کی بات بہادری کو محاکات سے ثابت کرنے میں پیش کردی ہے

شانے سے یوں ہل کے نہا خوں کہ الاماں — تیور اکے جھومنے لگے عباسِ نوجواں
مچھلی کی طرح ہاتھ تو ریتی پہ تھا تپاں — لیکن جدا نہ ہوتی تھیں تیغے سے انگلیاں
بیدست ہوگئی تھی جو اس صفدری کے ساتھ
تلوار بھی تڑپتی تھی دستِ جری کے ساتھ

اس بند کے تیسرے مصرعے میں میر انیس نے REFLEX ACTION کا بہ تفصیل نقشہ کھینچ دیا ہے جو کسی عضو کے جسم سے علیحدہ ہوجانے کے بعد اس کے مرکزِ اعصاب (MOTOR NERVE CENTRE) سے جو اس عضو میں ہوتے ہیں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ چوتھے مصرعے میں نفسیات اور PHYSIOLOGY کے اصولوں کی بحث ہوگئی ہے۔ یعنی یہ کہ کٹنے کے بعد انگلیاں اپنے مقام پر رہیں۔ یہ تو (NERVE CENTRE) کام کر رہے تھے اور انگلیاں ڈھیلی نہیں ہوسکتی تھیں۔ نفسیاتی اشارہ یہ ہے کہ اتنے جذبے کے ساتھ تلوار پکڑی گئی تھی کہ ہاتھ کٹنے کے بعد بھی وہ اثر نمایاں رہا۔ چھٹا مصرعہ بھی حقیقی واقعات کے مطابق ہے کیونکہ جب REFLEX AND NERVE ACTION سے ہاتھ تڑپ رہا تھا تو وہ تلوار بھی ہلتی جارہی تھی جس کو یہ ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا' اور ابھی اعصاب میں ڈھیلا پن جو سرد ہونے پر ہوجاتا ہے نہیں آیا تھا۔ ان ہی جزئیات کو شعری خوبی قائم رکھ کر بیان کر دینا شاعری کا کمال ہے۔ اب حضرتِ عباس مشک اور علَم کو دوسرے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ جب دوسرا ہاتھ بھی اسی طرح کٹ جاتا ہے تو مشک دانتوں میں دبا لیتے ہیں اس فعل سے شاعر یہ دکھلانا چاہتا ہے کہ وہ اب بھی پانی کو خیمہ میں پہنچانا چاہتے ہیں جیسا کہ ذرا دیر بعد "ہے ہے سکینہ کہہ کے فلک پر نگاہ کی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب "اک تیر لگ کے مشک پہ گزرا جگر کے پار" اور پھر فوراً بے ہوش ہوگئے۔ دیکھیے موت کس قدر لرزہ خیز ہے۔ لیکن شاعر نے اس کو کچھ ایسے انداز سے ادا کیا کہ اس سے ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت عباس کی اس لرزہ خیز شہادت کا واقعہ قرین قیاس (LAW OF PROBABILITY) یا لازمی نتیجے (LAW OF NECESSITY) کے تحت پیدا ہوا ہے

دہنا تھا ہاتھ تیغ اسی میں تھی ہے ستم — اب تھا ما بائیں ہاتھ میں مشکیزہ و علَم
تلواریں دو چلیں جو کمیں گاہ سے بہم — الجھا ہوا وہ ہاتھ بھی بس ہوگیا قلم
کس سے ہٹائیں فوج کو کس سے وغا کریں
بتلاؤ اب کہ حضرت عباس کیا کریں

اس بند میں ایک اور بات کا اضافہ کرکے میر انیس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ فوج کو نہ ہٹا سکنے کا سبب یہ تھا کہ بایاں ہاتھ بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں مشکیزہ بھی تھا اور علَم بھی تھا اور اس پر یہ اضافہ ہوگیا تھا کہ وہ ہاتھ بھی قلم ہوگیا تھا۔ پھر بھی ہے

ڈر سے قریں تو آ نہ سکا کوئی نابکار — پھر تیر سب لگانے لگے باندھ کے قطار
اک تیر لگ کے مشک پہ گزرا جگر کے پار — پانی کے ساتھ سینہ سے چھوٹی لہو کی دھار
ہے ہے سکینہ کہہ کے فلک پر نگاہ کی
مرنے پر سرِ ٹیک کے بہشتی نے آہ کی

اگرچہ یہ بند بھی بہت ہی المناک ہے لیکن طرزِ ادا کی خوبی سے جو لذت و مسرت دل میں پیدا ہوتی ہے وہ اعلیٰ پیمانے کی شاعری پر دال ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دوسروں کے فعل سے مرثیے کے ایک خاص کردار کا کریکٹر نمایاں ہوجاتا ہے یعنی اس سے عباس کی بہادری ظاہر ہورہی ہے۔ دشمن دور سے تیر چلا رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایسے بہادر ہیں کہ ہاتھ کٹنے کے بعد بھی دوسروں پر' اگر وہ نزدیک گئے تو غالب آجائیں گے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جب تلوار ہاتھ میں تھی تب تو لوگوں نے آکر حملہ کر ہی دیا۔ اب کیوں ڈر تھا جب ہاتھ کٹ گئے تھے۔ مگر صورت یہ تھی کہ پہلے عباس کو علَم سے مشکیزہ دونوں کا خیال تھا اور اب اگر دشمن آتے تو صرف اس کو زیر کرنے کا خیال ہوسکتا ہے اب مشکیزہ و علَم دونوں کی حفاظت سے سبکدوش ہوگئے تھے۔ عام طور سے تو یہ ہوتا ہے کہ خود کردار کے فعل سے کردار کا کریکٹر نمایاں اور ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بڑھ کر ہے کہ دشمن کے فعل سے بھی کردار کے کریکٹر کی وہی بلندی دکھلا دی گئی جو خود اس کے فعل سے دکھلائی گئی تھی۔ یہ ایسی شاعرانہ خوبی ہے جو سامعین کے لئے مسرت کے اسباب

بہم پہنچاتی ہے۔
آخرکار ؎

گرزِ ستم سے شق ہوا ناگہ سرِ جناب　　تھرائے ہونٹ چھٹ گئی دانتوں سی مشکِ آب
فرمایا ہائے دیں گے سکینہ کو کیا جواب　　گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثل آفتاب
تڑپے اُٹھے کراہ کے خاموش ہو گئے
منہہ رکھ کے خالی مشک پہ بے ہوش ہو گئے

اس سے قبل کے بند میں شاعر نے یہ دکھلایا ہے کہ دشمن دور سے تیر مار رہے تھے اور وہ ڈر کے مارے "قریں" نہیں آسکتے تھے اور اب جو گرز کی ضرب کا ذکر ہے تو بغیر کہے ہوئے ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ گرز کی ضرب پشت سے لگائی گئی تھی کیونکہ دشمن دور سے تیر اسی وجہ سے مارتے تھے کہ کسی کی ہمت سامنے سے "قریں" آنے کی نہ تھی۔ جب دانتوں سے مشکِ آب چھٹ گئی تو حضرت عباسؑ "منہہ رکھ کے خالی مشک پہ بے ہوش ہو گئے"۔ یہ ایسا مصرعہ ہے کہ لرزہ چھا جانے کے بعد بھی میر انیس کی قدرت زبان دیکھ کر طبیعت سرور ہو جاتی ہے۔ جب امام حسین وقت احتضار حضرت عباس کے پاس پہنچے تو مقدم الذکر کی حالت یہ تھی کہ اُنھیں حضرت عباس جو زمین پر پڑے ہوئے تھے دکھائی نہ دے رہے تھے۔ جیسا کہ حضرت علی اکبر کے کہنے سے معلوم ہوتا ہے ؎

اس شکل سے ترائی میں پہنچے جو شاہِ دیں　　رو کر یہ شہ سے کہنے لگے اکبر حزیں
بابا یہیں ہے لاش علمدار مہ جبیں　　گھوڑا کہیں ہے تیغ کہیں ہے علم کہیں
رکھے ہوئے ہیں مشک پہ منہہ پیار دیکھئے
شانے کٹے ہیں شان علمدار دیکھئے

جب امام حسینؑ نے ان کے مرنے سے پہلے یہ فرمایا کہ سکینہ کا ایک پیغام لایا ہوں تو

جنبش ہوئی لبوں کو بھتیجی کا سُن کے نام　　کی عرض اب غلام کی رخصت ہے یا امام
قدموں پہ آنکھیں ملنے کو دل بے قرار تھا　　مولا کے دیکھنے کا فقط انتظار تھا

ابھی حسین اپنا اور اپنی بچی سکینہ کا پیغام بھی نہ سنانے پائے تھے کہ عباس جاں بحق تسلیم ہو گئے مگر کریکٹر کی بلندی دیکھئے کہ اپنا سر حسین کے قدموں پر رکھ دیا ہے ؎

یہ بات سُن کے حضرتِ عباس تھرتھرائے　　قطرے لہو کے آنکھوں سے عارض پہ بہہ کے آئے
دو بار سر ٹپک کے پکارے کہ ہائے ہائے　　پُر خوں دہن حسینؑ کے قدموں کے پاس لائے
ہچکی کے ساتھ موت کا خنجر بھی چل گیا
سر پاؤں پر دھرا رہا اور دم نکل گیا

میر انیس کی شاعری میں الفاظ کی ترکیبوں کی ندرت، فصاحت و بلاغت کی بہتات اور اس کا حسن، الفاظ کی سلاست و روانی، لطفِ استعارہ، تشبیہات میں تنوّع، بلند خیالی، معنی آفرینی، قوتِ تخیلہ کی بلند پروازی اور ان سب باتوں پر مستزاد صفائی اور شگفتگی، خیالات کی پاکیزگی اور نفاست، الفاظ کی شان و شکوہ اور موزونیت، زبان کی آراستگی اور دلاویزی، محاورہ اور روزمرہ کی خوش اسلوبی اور رعنائی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اور وہ جملہ خوبیاں موجود ہیں جو نظم کے شاندار طرز بیان کے لئے ضروری ہیں۔ انیس کا یہ مرثیہ مطبوعہ ہے۔ اس لئے مزید مثالیں نہیں دی جا رہی ہیں۔ بہرحال اس مرثیے سے میر انیس کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے رزمیہ شاعری کے اصول اور لوازمات کو کس خوبی اور قدرت کے ساتھ برتا ہے۔



اُتر پردیش شاہراہ ترقی پر

لیسنس شدہ بیوپاریوں سے موٹے اناج کی خریداری ••• قومی بچت اسکیم کی رفتار تیز کرنے کی اسکیم ــــ نقد انعامات دینے کا فیصلہ ••• چھ مہینوں میں چھوٹی بچت کا ۹۲ فیصدی نشانہ مکمل ہوگیا ••• چھوٹی بچت اسکیموں کے تحت پانچ کروڑ سے زیادہ جمع ••• علم آثار قدیمہ کی مشاورتی کمیٹی کی تشکیل ••• ہریجنوں کو اسٹینوگرافی کی تربیت ••• اسکولوں کو عمارت اور ساز و سامان کے لئے اٹھارہ ہزار کی منظوری ••• گڑ، راب اور کھنڈساری کے لیسنسوں کی تجدید ••• فلاحی اداروں کو مالی امداد ••• سرکاری دفتروں میں کیفے ٹیریا کے قیام کی اسکیم ــــ سکریٹریٹ کا تجربہ کامیاب ••• ڈاکٹروں کی تنخواہ میں اضافہ ••• دیہی بجلی امداد باہمی انجمنوں کے ڈھانچے کا تعین ••• متفرقات

حکومت اتر پردیش لیوی سسٹم کے تحت لیسنس شدہ بیوپاریوں سے موٹا اناج مثلاً جوار، باجرہ اور مکا خریدے گی۔

اتر پردیش خریف موٹا اناج (لیوی) آرڈر سنہ ۱۹۶۶ء کے تحت جو فوری طور پر نافذ ہوگیا ہے ۱۱ ضلعوں میں جوار، ۱۹ ضلعوں میں باجرہ اور ۱۶ ضلعوں میں مکا خریدا جائے گا۔

اس آرڈر کے تحت فی کوئنٹل موٹے اناج کی جو انتہائی قیمتیں مقرر کی گئی ہیں وہ یہ ہیں: پیلی جوار ـ ۴۵.۵۰ روپیہ، لال جوار ـ ۴۵ روپیہ، سفید جوار ـ ۴۶ روپیہ، باجرہ ـ ۵۱ روپیہ اور مکا ۴۸ روپیہ۔

حکومت رائے بریلی، ہمیر پور، باندہ، جھانسی، کانپور، فتح پور، رام پور، اٹاوہ، جالون، مراد آباد اور بریلی کے اضلاع میں جوار ـ بدایوں، مراد آباد، مرزا پور، فتح پور، جالون، اٹاوہ، فرخ آباد، علی گڑھ، متھرا، آگرہ، ایٹہ، مین پوری، باندہ، ہمیر پور، کانپور، شاہجہانپور، بریلی، ہردوئی اور کھیری کے اضلاع میں باجرہ اور رام پور، نینی تال، ایٹہ، لکھیم پور کھیری، بہرائچ، ہردوئی، فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، گونڈہ، کانپور، پیلی بھیت، اناؤ، مراد آباد اور بریلی کے اضلاع میں مکا کی خریداری کرے گی۔

اس آرڈر کے تحت متعلقہ اضلاع میں لیسنس شدہ بیوپاری کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ جتنا جوار، باجرہ اور مکا خریدے یا اس کے قبضے یا تحویل میں آئے اس کا ۴۰ فیصدی ریجنل فوڈ کنٹرولر کے ہاتھ فروخت کرے۔

آرڈر کے تحت لیسنس شدہ بیوپاری اس وقت تک موٹے اناج کا اسٹاک فروخت نہیں کرسکیں گے جب تک وہ اس کا ۴۰ فی صدی ریجنل فوڈ کنٹرولر کے ہاتھ فروخت نہیں کردیں گے۔ اس کے علاوہ اس آرڈر کے تحت پرمٹ حاصل کئے بغیر موٹا اناج اس ضلع سے باہر نہیں بھیجا جاسکے گا جہاں حکومت موٹا اناج خریدے گی۔ تاہم حکومت کے اکاؤنٹ اور ملٹری کریڈٹ نوٹ کے تحت موٹے اناج کی نقل و حرکت پر پابندی نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں صارف کو اپنے گھریلو استعمال کے لئے بیک وقت ۴۰ کیلوگرام تک موٹا اناج لے جانے کی اجازت ہوگی۔ لائسنس شدہ بیوپاریوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ موٹے اناج کی آمد، فروخت اور باقی بچے ہوئے اسٹاک کی یومیہ رپورٹ ریجنل فوڈ کنٹرولر کو پیش کریں۔

حکومت اتر پردیش نے قومی بچت اسکیم کی رفتار تیز کرنے کے لئے ہر ضلع میں ایسی گاؤں سبھاؤں کو جو کسی مالی سال کے دوران اس اسکیم کے تحت روپیہ جمع کرنے میں پہلا اور دوسرا مقام حاصل کریں گی بالترتیب دو ہزار روپئے اور ایک ہزار روپئے کے نقد انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت نے چھوٹی بچت کے ضمن میں نمایاں کارگزاری دکھلانے والے افسروں اور غیر سرکاری افراد کو بھی انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ انعام کسی ضلع میں جمع کئے گئے ہر ۲۰ لاکھ روپے پر ایک ہزار روپیے کے حساب سے

دیا جائے گا۔ یہ انعامات ۱۵ ہزار روپیہ اور ۱۰ ہزار روپیے کے ان دو نقد انعامات کے علاوہ ہوں گے جو ریاست میں ایسے بلاکوں کو دئے جاتے ہیں جو روپیہ جمع کرنے میں پہلا اور دوسرا مقام حاصل کرتے ہیں۔

گاؤں سبھاؤں کو دو نقد انعامات دینے کی اسکیم ہر ضلع میں بہترین بلاک کو پانچ ہزار روپئے نقد انعام دینے کی اسکیم کی جگہ شروع کی گئی ہے کیونکہ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ قومی بچت اسکیم کو آگے بڑھانے میں بلاک زیادہ دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ گاؤں سبھائیں دیہی علاقوں میں چھوٹی بچت اسکیم کو کامیاب بنانے میں بہت زیادہ معاون ہو سکتی ہیں۔

ضلع اعظم گڑھ نے چھ مہینوں میں مالیاتی سال رواں کے لئے چھوٹی بچت کے مقررہ نشانے کے ۹۲ فیصدی کی تکمیل کر لی ہے۔ ضلع میں گزشتہ ۳۰ ستمبر تک ۴۵ لاکھ روپیے کے مقررہ نشانے کے مقابلے میں ۹۹۱-۴۱۹ روپیہ جمع ہوا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس میں سے زیادہ تر روپیہ ڈاک خانے کے سیونگز بینک میں چھوٹی چھوٹی رقموں کی صورت میں جمع ہوا اور فرضی رقم جمع کرنے کا ایک بھی واقعہ نہیں ہوا۔ افسروں کو پوری امید ہے کہ اس امر کے باوجود کہ خریف فصل کے زبردست نقصان سے بحیثیت مجموعی کسانوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے یہ ضلع بہت جلد چھوٹی بچت میں رقم جمع کرنے کے مقررہ نشانے کو پار کر لے گا۔

ضلع میں گھوسی بلاک کی کارکردگی اس سلسلے میں سب سے اچھی رہی ہے۔ اس بلاک میں ۹۸۶۶ خاندان ہیں جن میں ۱۵۲۵ بے زمین مزدور شامل ہیں۔ ان میں سے ۵۱۷۵ خاندان ڈاک خانے کے سیونگز بنک میں اکاؤنٹ کھول چکے ہیں۔ اس بلاک میں چھوٹی بچت کے لئے عوام کے جوش و خروش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بلاک پرمکھ کی صدارت میں منعقدہ ایک حالیہ جلسہ میں موقع پر ایک لاکھ روپیہ تمسکات میں لگانے اور ڈاک خانے کے سیونگز بنک میں حساب کھولنے کے لئے جمع ہو گیا۔

اتر پردیش میں مالیاتی سال رواں کے اول پانچ مہینوں میں گزشتہ اگست تک مختلف چھوٹی بچت اسکیموں میں ۹٫۷۶ کروڑ روپئے سے زیادہ جمع کیا گیا۔

فیض آباد ڈویژن میں سب سے زیادہ روپیہ جمع کیا گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے نشانے کا ۲۲٫۶۴ فیصد پورا کر لیا۔ گورکھپور اور لکھنؤ ڈویژنوں نے اپنے نشانوں کا ۹۹٫۳۳ اور ۸۲٫۳۰ فیصد پورا کر لیا۔ مجموعی طور پر فیض آباد میں ۱۲٫۰۹ لاکھ روپئے، گورکھپور میں ۹۹٫۵۷ لاکھ روپئے اور لکھنؤ میں ۲۲٫۸۳ لاکھ روپئے جمع کئے گئے۔

اضلاع میں دہرہ دون کا نام سرفہرست ہے جس نے اپنے نشانے کا ۶۰٫۴۷ فیصدی پورا کر لیا۔ اس کے بعد سلطانپور اور پرتاپگڑھ کا نمبر آتا ہے جنھوں نے اپنے نشانوں کا بالترتیب ۴۱٫۹۷ اور ۲۲٫۹۱ فیصدی پورا کر لیا۔ دہرہ دون میں ۳۰٫۲۷ لاکھ روپئے، سلطانپور میں ۸۷٫۱۹ لاکھ روپئے اور پرتاپ گڑھ میں ۳۰٫۱۵ لاکھ روپئے جمع کئے گئے۔

ریاستی حکومت نے علم آثار قدیمہ سے متعلق مشاورتی کمیٹی کی نو تشکیل کی ہے۔ اس کمیٹی کے ۱۲ ممبر ہوں گے اور اس کی میعاد ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء کو ختم ہوگی۔

محکمہ ثقافتی امور اور سائنسی تحقیق کے سکریٹری اس کے چیرمین اور افسر آثار قدیمہ اس کے ممبر سکریٹری مقرر کئے گئے ہیں۔ کمیٹی کے دوسرے ممبران یہ ہیں:۔ ڈاکٹر آنند کرشن۔ ریڈر بھارت کلا بھون۔ بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی، ڈاکٹر جی۔ آر۔ شرما۔ صدر شعبہ قدیم ہندوستانی تاریخ۔ الہ آباد یونیورسٹی، ڈاکٹر آر۔ کے دکشت۔ پروفیسر قدیم ہندوستانی تاریخ۔ لکھنؤ یونیورسٹی، پروفیسر سی۔ ڈی۔ چٹرجی۔ لکھنؤ، پروفیسر ایس۔ نورالرحمن۔ صدر شعبہ قدیم ہندوستانی تاریخ اور ثقافت۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شری کے سی۔ چٹوپادھیا وارانسی سنسکرت یونیورسٹی۔ وارانسی، ڈاکٹر وی۔ ایس۔ پاٹھک۔ پروفیسر اور صدر شعبہ قدیم ہندوستانی تاریخ اور ثقافت۔ گورکھپور یونیورسٹی، ڈائرکٹر ثقافتی امور۔ اتر پردیش سپرنٹنڈنٹ آرکیوالوجیکل سروے آف انڈیا۔ شمالی منطقہ۔ آگرہ، ڈائرکٹر اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ اور جوائنٹ سکریٹری محکمۂ مالیات اتر پردیش۔ لکھنؤ۔

حکومت اترپردیش نے مندرج فہرست اقوام کے امیدواروں کے لئے اسٹینوگرافی کا ایک نو مہینے کا ٹریننگ کورس شروع کرنے کے لئے مالیاتی سال رواں میں ۲۰ ہزار روپئے کی منظوری دی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ۲۴۰ امیدواروں کو اسٹینوگرافی کی ٹریننگ دی جائے گی تاکہ انھیں محفوظ جگہوں میں کام مل سکے۔

شروع میں یہ ٹریننگ ۱۰ اضلاع یعنی جونپور، اٹاوہ، دیوریا، ہردوئی، نینی تال، گونڈہ، سہارنپور، جھانسی اور مرادآباد میں دی جائے گی۔

ٹریننگ حاصل کرنے کے خواہشمند امیدواروں کو ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی دوسرا امتحان پاس ہونا چاہئے۔ وہ امیدوار جو ٹریننگ کے لئے منتخب کئے جائیں گے انھیں کاغذ، قلم، پنسل وغیرہ کے اخراجات کے لئے یکمشت ۲۵ روپئے اور ۴۰ روپئے ماہانہ کا وظیفہ دیا جائے گا۔ وظیفے کی ماہ بماہ ادائیگی کا انحصار متعلقہ اداروں کے افسران اعلیٰ کی رپورٹ پر ہوگا۔

اگر کوئی امیدوار نو ماہ کے اندر ٹریننگ چھوڑ دے گا تو اس کو وظیفہ کی کل رقم جو وہ لے چکا ہوگا واپس کرنا پڑے گا۔

ریاستی حکومت نے ضلع پریشدوں کے سینیر بیسک اسکولوں کو مزید عمارتوں اور ساز و سامان کی فراہمی کے لئے مالیاتی سال رواں کے واسطے ۱۸۰۰۰۰ روپیہ منظور کیا ہے۔

مجموعی طور پر ۳۰ سینیر بیسک اسکولوں کو مالی امداد ملے گی۔ ضلع پریشد ان اسکولوں کا انتخاب کریں گے جنھیں مالی امداد دی جائے گی۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے اسکولوں کو مالی امداد دینے پر غور کیا جائیگا اور ہر منتخب اسکول کو ۶۰۰۰ روپیہ کی غیر متواتر مالی امداد دی جائے گی۔

وارانسی، اٹاوہ اور گورکھپور اضلاع مالی امداد کے لئے دو دو اسکولوں کا انتخاب کریں گے۔ مظفر نگر، میرٹھ، آگرہ، علی گڑھ، فرخ آباد، کانپور، فتح پور، مرزا پور، جونپور، غازیپور، بلیا، دیوریا، بستی، اعظم گڑھ، فیض آباد، رائے بریلی، ہردوئی، سلطانپور، الموڑا اور پرتاپ گڑھ کے اضلاع ایک ایک اسکول منتخب کریں گے۔ چار اسکولوں کے متعلق جنھیں امداد دی جائے گی بعد میں فیصلہ کیا جائے گا۔

گنا کمشنر کے اعلانیہ کے مطابق گڑ، راب اور کھانڈساری تیار کرنے والے واحدوں کے مالک اپنے واحدے اگلے سال بغیر سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء کے لیسنس حاصل کیے ہوئے نہیں چلائیں گے اور اس وقت تک ریزروایریا سے گنا نہ خریدیں گے جب تک اس کا پرمٹ حاصل نہ کرلیں۔ ان لیسنسوں کی میعاد ۳۰ ستمبر کو ختم ہو چکی ہے۔

گنا کمشنر نے اعلان کیا ہے کہ:

(الف) ریزروایریا میں پاور کوشر کے لیے کوئی نیا لیسنس نہیں دیا جائے گا۔ صرف ان لوگوں کی درخواستوں پر غور کیا جائے گا جن کے پاور کوشر پہلے سے ریزروایریا میں لگے تھے اور ان کے ذریعہ گڑ بنایا جا رہا تھا اور وہ ایریا اب ریزرو کر دیا گیا ہے۔

(ب) جہاں فیکٹری کی مانگ سے گنا زیادہ ہو یا گنا فیکٹری تک لے جانا ناممکن ہو سنہ ۱۹۶۵-۶۶ء میں دیے گئے یا تجدید شدہ لیسنسوں کی تجدید موجودہ سال سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں مندرجہ ذیل صورتوں میں کی جائے گی۔

(الف) جن لوگوں کو سنہ ۱۹۶۵-۶۶ء میں مشروط لیسنس دیے گئے ہیں ان کی تجدید کی درخواست پر ان کی نوعیت کے پیش نظر غور کیا جائے گا اور مناسب کارروائی کی جائے گی۔

(ب) اگر سنہ ۱۹۶۵-۶۶ء کا کوئی لیسنسدار کسی شخص کو اپنا واحدہ منتقل کرنا چاہتا ہے تو اس کی درخواست پر غور کیا جائے گا بشرطیکہ جس شخص کو لیسنس منتقل کرنے کا ارادہ ہو وہ سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء کے لیے لیسنس پانے کا حقدار ہو اور لیسنس دار اپنا لیسنس اس شخص کے حق میں چھوڑنے کے لیے تیار ہو۔

واحدوں کو اسی شوگر فیکٹری کے ریزروایریا میں دوسری جگہ منتقل کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے بشرطیکہ فیکٹری اور قریب ترین خریداری مرکز کا فاصلہ پہلے سے زیادہ ہو۔

ریزرو ایریا میں بیلوں کے لیے نئے لیسنس نہیں دیے جائیں گے اور سال ۶۷-۱۹۶۶ء میں وہی لوگ لیسنس پانے کے حق دار ہوں گے جن کے پاس پہلے برسوں میں سے کسی بھی سال کا لیسنس ہو۔

سال ۶۷-۱۹۶۶ء میں بجلی سے چلنے والے کولھو چلانے کی تاریخ یا انھیں چلانے کے گھنٹوں پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

حکومت اتر پردیش نے ریاست کی مختلف فلاحی تنظیموں اور اداروں کو مالیاتی سال رواں میں مالی امداد دینے کے لیے ۳۸۹۰۰۰ روپیے کی منظوری دی ہے۔

اس رقم میں سے صیلا سہائے سنگھ لکھنؤ کے لیے ۲۵ ہزار روپیہ الہ آباد اور لکھنؤ کے اسٹرینجرس ہوم کے لیے پانچ ہزار روپیہ۔ یو۔پی اپرادھ نرودھک سمیتی لکھنؤ کے لیے ۲۲ ہزار روپیہ۔ ویمن سوشل سروس لیگ لکھنؤ کے لیے ۶ ہزار روپیہ۔ ریاست کے ودھوا آشرموں اور یتیم خانوں کے لیے ۵۰ ہزار روپیہ۔ بہروں، گونگوں اور اندھوں کے مختلف اسکولوں کے لیے ۱۲۷۳۰۰ روپیہ اور فلاحی کام میں لگے ہوئے ریاست کے اداروں اور تنظیموں کے لیے ۱۴۷۷۰۰ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

اتر پردیش کے سکریٹریٹ میں اکتوبر میں جو کیفے ٹیریا کھولا گیا تھا اس کی کامیابی کے پیش نظر ریاستی حکومت ریاست کے تمام سرکاری دفتروں میں اس قسم کے کیفے ٹیریا کھولنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ ابتدا میں یہ کیفے ٹیریا بڑے بڑے دفتروں میں کھولے جائیں گے۔ نظامت زراعت اور ٹرانسپورٹ کمشنر کے دفتر میں جلد ہی یہ کیفے ٹیریا کھل جائیں گے۔

سکریٹریٹ کا کیفے ٹیریا تقریباً ۲۵۰۰ ملازمین کی خدمت کر رہا ہے۔ اس کیفے ٹیریا کے قیام کی مختصر مدت میں وہاں روزانہ جانے والوں کی تعداد تقریباً ۵۰۰ سے بڑھ کر ۳۰ ستمبر تک ۱۲۰۰ سو ہوگئی تھی۔ اس کی روزانہ بکری ۳۵۰ روپیہ سے ۴۲۵ روپیہ تک تھی۔ اوسطاً ہر شخص کیفے ٹیریا میں تقریباً ۲۰ پیسے روزانہ خرچ کرتا ہے۔ کیفے ٹیریا میں چائے دس پیسے، کافی ۲۰ پیسے، سبزی اور گوشت کی پیٹیس ۲۰ پیسے، مٹھائی دس پیسے اور کیک ۱۵ پیسے کی ملتی ہے۔ مینو کارڈ میں ہر ہفتے مناسب ترمیم کی جاتی ہے تاکہ گاہکوں کو سستے داموں پر مختلف قسم کی چیزیں فراہم کی جاسکیں۔ ملازمین کو اپنی ضرورتوں کے مطابق پورے مہینے کے لئے کوپن خریدنے کی سہولت بھی دی گئی ہے تاکہ وہ مہینے کے آخری دنوں میں پیسے کی کمی کی وجہ سے ضروری ناشتہ سے محروم نہ رہیں۔

حکومت اتر پردیش نے میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والے ایلوپیتھک ڈاکٹروں کی تنخواہ کی شرحوں پر نظر ثانی کی ہے۔ تنخواہ کی نئی شرحیں یکم اپریل سے نافذ سمجھی جائیں گی۔

ڈپٹی ڈائرکٹروں، اسسٹنٹ ڈائرکٹر میڈیکل (پلاننگ)، سول سرجنوں، اڈیشنل سول سرجنوں، اسپتالوں کے سپرنٹنڈنٹوں اور سلیکشن گریڈ پی۔ ایم۔ ایس افسروں کے لئے نئی شرح تنخواہ ۶۰۰-۵۰-۸۰۰ ای۔ بی-۵۰-۱۰۵۰ ای۔ بی-۵۰-۱۲۵۰ روپیہ ہوگی جبکہ ان کی موجودہ شرح تنخواہ ۵۰۰-۵۰-۱۰۰۰ ای۔ بی-۵۰-۱۲۰۰ روپیے ہے۔

پی۔ ایم۔ ایس کی نئی شرح تنخواہ ۲۵۰-۲۵-۳۵۰ ای۔ بی-۲۵-۴۷۵ ای۔ بی-۲۵-۶۰۰ ای۔ بی-۲۵-۷۰۰ کی جگہ ۳۰۰-۲۵-۴۰۰ ای۔ بی-۳۰-۵۵۰ ای۔ بی-۳۰-۷۰۰ ای۔ بی-۵۰-۹۰۰ روپیہ مقرر کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ڈپٹی ڈائرکٹروں کو ان کی تنخواہ کے ۲۵ فیصدی کے حساب سے پریکٹس نہ کرنے کا بھتہ بھی دیا جائے گا جو کم سے کم ۷۵ روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ روپیہ ہوگا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر میڈیکل (پلاننگ) کو پریکٹس نہ کرنے کے بھتہ کے علاوہ ۷۵ روپیہ کی خصوصی تنخواہ بھی ملے گی۔

حکومت اتر پردیش نے دیہی بجلی امداد باہمی انجمنوں کے ڈھانچے کو قطعی کرنے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ یہ کمیٹی امداد باہمی اصول پر دیہی علاقوں میں بجلی کی فراہمی کے لئے تین یا چار علاقوں کا انتخاب بھی کرے گی۔ اس سلسلے میں ابتدائی اقدامات ضلع لکھنؤ کے گوسائیں گنج کے علاقے میں کئے گئے ہیں۔

اگرا ۱۰۰۰ ٹنک

کمیٹی کے ممبران کے نام یہ ہیں۔ شری افتخار حسین۔ اڈیشنل رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹیز، شری اختر عالم۔ جوائنٹ سکریٹری۔ ریاستی بجلی بورڈ، شری آر۔ این۔ سنگھ۔ سپرنٹنڈنگ انجینیر محکمہ چھوٹی آبپاشی، شری۔ ای بی پٹیل۔ سپرنٹنڈنگ انجینیر سیکنڈری سسٹم ڈیزائن سرکل، ریاستی بجلی بورڈ اور شری سرن پرشاد ڈپٹی سکریٹری محکمہ بجلی۔

متفرقات

ٹسٹ ورک پر کام کرنے والوں کو اناج کی فراہمی۔ حکومت اترپردیش نے ریاست کے چار اضلاع باندہ، الہ آباد، مرزاپور اور وارانسی میں ان مقامات پر جہاں ٹسٹ ورک چل رہا ہے سستے اناج کی دکانیں کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اضلاع خشک سالی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔

حکومت نے یہ فیصلہ ٹسٹ ورک کے مزدوروں کو موقع پر سستا اناج فراہم کرنے کے لئے کیا ہے۔

لکھنؤ میں بچوں کا ہفتہ۔ لکھنؤ میں ۷ نومبر سے ۱۳ نومبر تک بچوں کا ہفتہ منانے کے لئے ایک منطقائی پروگرام بنایا گیا تھا۔

چودہ نومبر کو جو پنڈت جواہرلال نہرو کا جنم دن بھی ہے بچوں کا دن منایا گیا اور اس موقعے پر اسپورٹس اسٹیڈیم میں ۲ بجے سے ساڑھے چار بجے دن تک ایک مرکزی بال میلہ منعقد کیا گیا۔

کیمیاوی کھاد کی تقاوی کی بلا شرط تقسیم۔ حکومت اترپردیش نے محکمہ جات اجتماعی ترقی اور زراعت کے منطقائی افسروں سے کہا ہے کہ وہ کیمیاوی کھاد کے لئے تقاوی کی تقسیم میں اس کے بقایا کی ادائیگی کی شرط نہ لگائیں۔

سرکاری بقایا کی وصولی کو ملتوی کرنے کے ساتھ یہ اقدام اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ کسانوں کو خشک سالی کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے کیمیاوی کھاد اور زراعتی قرضہ آسانی سے مل سکے۔

اردو کتاب کی ضبطی۔ حکومت آندھرا پردیش نے اردو کتاب "کافرنامہ" مصنفہ شری عشرت رحمانی اور شائع کردہ عثمانیہ بک ڈپو۔ حیدرآباد، ضبط کر لی ہے۔ اس کتاب میں ایسا مواد موجود ہے جو مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف دشمنی اور نفرت کے جذبات کو پروان چڑھاتا ہے اور جس کی اشاعت دفعہ ۱۵۲-اے قانون تعزیرات ہند کے تحت قابل سزا ہے۔

اس کتاب کا ہر ایک نسخہ نیز اس کے ترجمے اور اقتباسات بحق حکومت ضبط کر لیے گئے ہیں۔

پنکھوں کا فیشن —— (بسلسلہ صفحہ ۲۷)

دور جدید کے پنکھا سازوں اور مصوروں میں الگزینڈر، ڈیورلے (DUVERLLEY) فیٹ (FAYET) اور وینیر (VANIER) کے نام سرفہرست ہیں — !!

بہرحال بجلی کے پنکھوں کی ایجاد سے کچھ دن پہلے تک ساری دنیا میں ان ہی پنکھوں کا سکہ چلتا تھا۔ عدالتوں کے کمروں، افسروں کے اجلاسوں، منصفوں کے چیمبروں اور امیر امراء کی خواب گاہوں میں ایسے پنکھے بھی لگے ہوتے تھے جنھیں ایک ڈوری کی مدد سے ہلا ہلا کر ہوا فراہم کی جاتی تھی۔ مگر اب یہ پنکھے معدوم ہو چکے ہیں۔ البتہ افادیت و سہولت کے پیش نظر دستی پنکھوں کا چلن آج بھی ہے — !؟

مختصر یہ کہ ماضی میں پنکھے شان و شوکت، روایتی تقدس، اور سماجی مقام کے مالک تھے — اور ان کی کافی مانگ اور قدر تھی۔

اگرچہ آج پنکھوں کی ویسی قدر و قیمت نہیں رہی جیسی کہ ماضی میں تھی، اور نہ لوگ اب اُن پر اپنے شوق کی خاطر یا فیشن کے نام پر بے دریغ دولت لٹاتے ہیں اور نہ فن کار ظاہری نام و نمود اور نمائش کے لیے اپنے آرٹ کو ان پر نچھاور کرتے ہیں۔ اب تو یہ ساری باتیں اس مصرع کے مصداق نظر آتی ہیں ؎ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

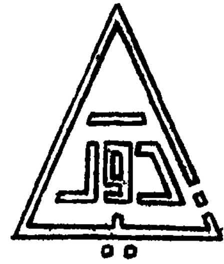
شاید اسی لیے بعض گوشوں سے پنکھوں کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بہرحال ہم کو پنکھوں کے مستقبل کے بارے میں مطلق مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اب پنکھے بنانے کا کام ماضی کی طرح کوئی فن یا آرٹ نہیں رہا — بلکہ ایک صنعت میں تبدیل ہو گیا ہے جو ترقی پذیری کی علامت اور ملک کی اہم ضرورت اور وقت کا صحیح تقاضا ہے — !؟

REGD. No. L-319









جلد ۲۲ | نمبر ۱۰

پوش ۱۸۸۸ شک
جنوری ۱۹۶۷ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
ششی کانت بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلیو۔ ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری، یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے ہر حال متفق ہو۔

اپنی بات

کلینڈر سال کا پہلا مہینہ ہونے کی وجہ سے جنوری کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ نئے سال کے آغاز پر پچھلے سال کی کارگزاریوں، کامیابیوں اور کمیوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے اور یہ توقع بھی وابستہ کی جاتی ہے کہ یہ ایک پرسکون، پرامن اور پرمسرت سال ثابت ہوگا۔ نیا سال جہاں مضامین اور اخبارات و رسائل کے اداریوں کا موضوع بنتا ہے وہاں شعرا بھی اسے اپنا موضوع سخن بناتے ہیں اور نئے سال سے متعلق بیسیوں نظمیں، قطعات اور رباعیاں نظر سے گزرتی ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ شعرا نئے سال کی آمد کو صرف بربنائے روایت اپنا موضوع سخن بناتے ہوں یا شاعرانہ موشگافیوں سے کام لیتے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نظمیں بڑی موثر جاندار اور شاعر کے سچے جذبات و محسوسات، اس کے شعور و ادراک اور اس کی قدرت بیان کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ بہرحال جنوری کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ یہ سال کا پہلا مہینہ ہے۔ مگر ہماری قومی زندگی میں اسے کئی وجوہ سے ایک خاص اہمیت بھی حاصل ہے۔ اوّل اس لیے کہ جنوری ہی کی چھبیس تاریخ کو جمہوریہ ہند کا استقلال عمل میں آیا۔ استقلال جمہوریہ کے لیے یہ تاریخ اس لیے منتخب کی گئی کہ ہر سال ۲۶ رجنوری کو ہم ہندستان کی آزادی کے حصول کے عہد کو دہراتے تھے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۲۹ء کے لاہور کانگرس سشن میں مکمل آزادی کا تاریخی رزولیشن منظور کیا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ جب تک ہندستان غیر ملکی اقتدار سے آزاد نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہر سال ۲۶ رجنوری کو حصول آزادی کے عزم کا اعادہ کیا جاتا رہے گا اور یہ عہد دہرایا جاتا رہے گا کہ ہم اس وقت تک دم نہیں لیں گے جب تک ہم آزاد نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہر سال ۲۶ رجنوری کو حصول آزادی کا عزم دہرایا جاتا رہا تا اینکہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہم آزاد ہوگئے۔ حصول آزادی کے بعد جب ہم نے اپنا دستور مرتب کیا تو چھبیس جنوری کو اس بنا پر کہ اسی تاریخ کو ہم اپنی آزادی کے عزم کا اعادہ کرتے رہے ہیں، ہندستان کے جمہوریہ بننے کا اعلان کیا۔ اسی لیے ہم ہر سال ۲۶ رجنوری کو قومی تہوار کی حیثیت سے جوش و خروش کے ساتھ یوم جمہوریہ مناتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دو عظیم قربانیوں کے باعث جو اسی جنوری کے مہینے میں دی گئی تھیں اس ماہ نے قومی اہمیت و خصوصیت اختیار کرلی ہے۔ ایک قربانی تھی فرقہ وارانہ اتحاد کی خاطر اور دوسری قربانی تھی امن کے لیے۔ پہلی قربانی دی ہمارے سب سے پہلے قومی رہنما مہاتما گاندھی نے اور دوسری قربانی دی شہید امن لال بہادر شاستری نے۔ قوموں کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ایسا ہی ایک وقت وہ تھا جب فرقہ وارانہ اتحاد کے قیام و استمرار کے لیے ایک عظیم قربانی کی ضرورت تھی۔ مہاتما گاندھی نے یہ قربانی دی اور اپنے لہو سے فرقہ وارانہ اتحاد کی تصویر میں وہ رنگ بھر دیا جو کبھی ماند نہ ہوگا۔ پھر اسی طرح کا ایک موقع اس وقت آیا جب امن کے استحکام و بقا کے لیے ایک بڑی قربانی درکار تھی۔ اس کے لیے قدرت نے لال بہادر شاستری کو منتخب کیا تھا۔ ہندستان ہمیشہ سے امن پسند، امن دوست اور امن پرور رہا ہے۔ ہم نے کبھی مسلح تصادم کو مسائل کے حل کا راستہ سمجھا نہ کبھی اس کی حمایت کی اور نہ کبھی خود پہل کی۔ ہاں جب دوسری طرف سے پہل ہوئی تو اس نے اپنی آزادی کی بقا اور اپنی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے مجبوراً ہتھیار ضرور اٹھائے۔ پھر بھی دنیا پر یہ واضح کرتا رہا کہ مسئلوں کو حل کرنے کا یہ راستہ ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا راستہ باہمی گفت و شنید ہے اور ہندستان نے جو ہتھیار اٹھایا ہے وہ خوشی سے نہیں بلکہ مجبور ہو کر اور دفاعی حیثیت سے۔ چنانچہ پاکستان سے مسلح تصادم کے دوران جس کی پہل ہماری طرف سے نہیں ہوئی تھی، امن پسند لال بہادر شاستری برابر اس پر زور دیتے رہے کہ اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہے اور اب بھی وقت ہے کہ مسائل کے تصفیے کے لیے ہوش مندی سے کام لیا جائے اور باہمی گفت و شنید کا راستہ اپنایا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ایسے وقت میں بھی جب ہمارا پلہ بھاری پڑ رہا تھا، آپس میں بات چیت کا راستہ نکلا تو انھوں نے بلا تامل جنگ بند کرنا اور تاشقند جا کر پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں سے بات چیت کرنا طے کرلیا۔ یہ شاستری جی کی خردمندی، امن پسندی، معقولیت پسندی اور اپنے موقف کے درست اور صحیح ہونے پر ان کا یقین ہی تھا جس نے انھیں اس فیصلے پر آمادہ کرلیا۔ باوجود اس کے کہ وہ دل کے مریض تھے، اس سے قبل ان پر دو بار دل کے دورے پڑ چکے تھے، انھوں نے امن کی خاطر دور دراز ملک روس کا سفر کرنا اور وہاں بات چیت کے ذریعے معاملات کو طے کرنا منظور کیا۔ وہ وہاں گئے اور اس معاہدے پر دستخط کیے جو تاشقند اعلان کے نام سے موسوم ہے۔ وہ پھر وطن واپس نہ آسکے۔ وہیں روس میں ان پر دل کا تیسرا دورہ پڑا ایسا پڑا کہ جاں بر نہ ہوسکے۔ اس طرح انھوں نے امن کی راہ میں جان دی اور شہید راہ امن بن گئے۔ قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ وہ دن آئے گا جب پاکستان ہندستان کے ساتھ ایک اچھے ہمسائے اور دوست کی حیثیت سے رہنے لگے گا اور ہندستان کی طرح پاکستان بھی سچے دل سے یہ محسوس کرنے لگے گا کہ ایک کی خوش حالی دوسرے کی خوش حالی ہے۔ اور یہی شاستری جی کی قربانی کا پھل ہوگا۔

● ہمیں افسوس ہے کہ بعض غیر متوقع حالات کے باعث نیا دور کی اشاعت میں ایک بار پھر خلل پڑ گیا اور جنوری کے پرچے کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ پرچے کی یہ تاخیر اشاعت کی وجہ سے خریداران و شائقین نیا دور کو جو زحمت اور پریشانی ہوئی اس کا ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ بہرحال اس بات کی پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ اشاعتیں جلد سے جلد معمول پر آجائیں۔

ایڈیٹر



شہیدِ امن — لال بہادر شاستری

متین سروش

کھویا وہ غزال اپنا، غربت کی فضاؤں میں　　سامانِ بہاراں ہے جس کی چمن آرائی
تھا جوشِ طلب اپنا، منزل سے گیا آگے　　دیوانہ بہاروں کا، وہ پھولوں کا شیدائی
طوفانوں سے ٹکرایا، وہ پیرِ جواں ہمّت　　جاں بازِ وطن بھی تھا، وہ امن کا سودائی
ہر دل کا ہوا فاتح ''نذرانۂ جاں دے کر　　یوں لال بہادر نے ہر دل میں جگہ پائی
تاریخ بھی نازاں ہو جس شمع فروزاں پر　　اے ماں ترے قدموں پر وہ موت کسے آئی؟
کیا مرثیہ لکھوں میں اُس مردِ مجاہد کا　　ہے جس کی شہادت اک پیغامِ سکوں زائی
پُر نور ہے جس غم سے کاشانۂ جاں میرا　　اے کاش اُسے دیکھے ہر چشمِ تماشائی
خوں بار ہوئیں آنکھیں صد پارہ ہوا دل جس سے　　محبوبِ من ہے اب، وہ جذبۂ سودائی

قربانِ وطن ہو کر اسرارِ بقا پائیں
مرنے کا بھی فن سیکھیں، جینے کے تمنائی!



آرزوؔ لکھنوی کی اصلاحیں

خلیر بھوردی

نیا دور کی اشاعت ۲۶ (جنوری و فروری ۱۹۶۶ء) میں "کچھ خطوط کچھ تصویریں" کے عنوان سے ممتاز اہل قلم اور مشاہیر ارباب فضل و کمال کے کم و بیش پچیس ۲۵ خطوط پیش کر چکا ہوں۔ ان خطوط کے ہمراہ تیرہ مشاہیر ارباب فضل و کمال کی تحریروں کے عکس بھی شایع ہوئے ہیں۔ ذیل میں آرزوؔ لکھنوی کے کچھ خطوط اور ان کی اصلاح کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

خطوط سراج علی آبادی مرحوم کے نام ہیں اور اصلاح بھی انھیں کے کلام پر ہے۔ سراج علی آباد ضلع سلطان پور کے رہنے والے تھے ان کے والد قاضی بدر الزماں کا شمار حضوری کے کامیاب درباریوں میں کیا جاتا تھا۔ سراج نے ابتدائی تعلیم علی آباد ہی میں حاصل کی تھی، جہاں ان کے حقیقی ماموں مولوی عبدالسبحان نے ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ سراج ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی تھے اور عرصے سے کلکتہ میں ان کا قیام تھا۔ یہیں شاعری شروع کی تھی اور آرزوؔ صاحب کے چہیتے شاگردوں میں گنے جانے لگے تھے۔ آرزوؔ صاحب فرط محبت سے ان کو کبھی "بھی اور جانی" کبھی "حبیب دل نواز" کبھی "سراج الصداقت" کبھی "سراج الاحیاء" اور کبھی "سراج الشعراء" لکھا کرتے تھے۔

یہ خطوط سراج مرحوم نے کلکتے سے اپنے مجموعۂ کلام کے ساتھ مجھے بھیجے تھے۔ یہ بات ۱۹۶۲ء کی ہے۔ اس وقت سراج کا مجموعۂ کلام نشان منزل پریس میں تھا اور اس کے کچھ حصے چھپ بھی گئے تھے کہ ان کا بلاوا وہاں سے آگیا جہاں نہ کوئی خواہش ہوتی ہے نہ کوئی حسرت و



علامہ آرزوؔ لکھنوی

(آرزوؔ صاحب کی تحریر کا عکس بھی مضمون کے ساتھ کسی صفحہ پر شایع کیا جا رہا ہے)

آرزو۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت کی نعمتیں عطا فرمائے۔

آرزوؔ صاحب ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

سراج الصداقت سلام علیک

آج ــــ ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۴ء ہے سلام اور غزل دیکھ کر روانہ کر رہا ہوں کہ وقت پر مل جائے امید ہے کہ آپ اپنے وطن سے بھی اپنی خیریت لکھتے رہیں گے۔ آرزو

پہلے ایک غزل کے بعض شعروں پر آرزوؔ صاحب کی اصلاح ملاحظہ کیجیے

نہ دوستی کے لیے ہے نہ دشمنی کے لیے مری نمود ہے دنیا میں بندگی کے لیے



سراج علی آبادی

(جن کے کلام پر آرزو صاحب کی اصلاحوں کے نمونے اس مضمون میں درج کئے گئے ہیں)

اس مطلع کو آرزو نے شعر بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ مطلع سست ہے اب شعر ہو جانے سے بہت بلند ہو گیا۔

یہ آنکھ جس میں لگاوٹ بھی ہے رکاوٹ بھی — نہ دوستی کے لیے ہے نہ دشمنی کے لیے

وہ سوزِ دل کا ہو یا سازِ زندگی کے لیے — مجھے قبول ہے سب کچھ تری خوشی کے لیے

پہلے مصرعے کی اصلاح "وہ سوزِ دل کا ہو یا" کی جگہ "قبول سوزِ جگر" اور دوسرے مصرعے کی اصلاح "قبول ہے سب کچھ" کی جگہ "سبھی ہے گوارا"۔

قبول سوزِ جگر سازِ زندگی کے لیے — مجھے سبھی ہے گوارا تری خوشی کے لیے

نگاہِ حسن سے اے شوق کوئی کھیل نہیں — کلیجہ چاہیے پتھر کا عاشقی کے لیے

پہلے مصرعے کی اصلاح "سے اے شوق" کی جگہ "ستم گر سے"۔

نگاہِ حسنِ ستمگر سے کوئی کھیل نہیں — کلیجہ چاہیے پتھر کا عاشقی کے لیے

دوسرے مصرعے کی بابت لکھتے ہیں کہ "یہ مصرع مجھ سے لڑ گیا ہے فقط قافیہ کا فرق ہے۔ میں نے زندگی لکھا ہے"۔ (آرزو)

نہ دل کو ہوتا جو احساس دردِ الفت کا — تو کوئی غم نہ اٹھاتا کبھی کسی کے لیے

دوسرے مصرعے کی اصلاح "غم نہ اٹھاتا کبھی کسی" کی جگہ "تو کوئی چیز نہ تھی لطف زندگی"۔

"تو کوئی چیز نہ تھی لطف زندگی کے لیے"

غزل کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "یہ چند شعر بھی شاعرے کے لیے کافی ہیں"۔ غزل گیارہ شعروں کی ہے۔ ذیل کے شعر پر تین صاد بنے ہوئے ہیں:

جدا ملی ہے ہر اک کو حیات کی لذت — مگر ہے ایک مزہ موت کا سبھی کے لیے

ایک اور غزل کے بارے میں جس کی طرح کا مصرع تھا:

"اب اور یہ دلِ خانہ خراب کیا کرتا"

لکھتے ہیں: "خوب غزل ہے۔ اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اصلاح کی صرف مقطعے میں ضرورت تھی وہ پوری کر دی۔ اسے بے پروائی نہ سمجھیے گا۔ غزل خوب ہے"۔

سراج ان کو جو دیکھا چھلک پڑے آنسو — مچل گیا دلِ خانہ خراب کیا کرتا

پہلے مصرعے میں "چھلک پڑے آنسو" کی جگہ "مچل گیا دلِ زار" اور دوسرے مصرعے میں "مچل گیا دل" کی جگہ "بتاؤ اور یہ" بنایا گیا ہے:

سراج ان کو جو دیکھا مچل گیا دلِ زار — بتاؤ اور یہ خانہ خراب کیا کرتا

اس غزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "خوب غزل ہے۔ اصلاح کی ضرورت نہیں" اور ذیل کے شعروں پر صاد بنا دیا ہے۔

پیامِ صبر کا دورِ اضطراب کیا کرتا — علاجِ تشنگیٔ دل سراب کیا کرتا

دُرِ مراد تو ملتا ہے تہ نشیں ہو کر — میں سطحِ آب پہ بن کر حباب کیا کرتا

بنا دیا جسے بیگانۂ خرد تم نے — وہ پھر خیالِ عذاب و ثواب کیا کرتا

نظر ہی اتنی نہ رکھتے تھے دیکھنے والے — وہ اپنے رخ سے الٹ کر نقاب کیا کرتا

ایک اور طرحی غزل "آغاز جوانی میں ہر گل ہم شکل گریباں ہوتا ہے" کے متعلق لکھتے ہیں: "غزل خوب ہے صرف ایک مصرعے میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ وہ بنا دیا۔ یقیناً شاعرہ آپ کے ہاتھ رہے گا"۔ وہ شعر جس کے پہلے مصرعے کی ترمیم ہوئی ہے، یہ ہے۔ ←

گردابِ مصیبت میں اے دل ہمت پہ بھروسہ کیوں کر ہو
موجیں بھی بلا بن جاتی ہیں جب زور پہ طوفاں ہوتا ہے

پہلے مصرعے کی ترمیم ۔

بڑھتے ہوئے جوش وحشت میں خطرہ ہے دل کی امنگوں سے
موجیں بھی بلا بن جاتی ہیں جب زور پہ طوفاں ہوتا ہے

اس غزل پر ۱۴ ردسمبر ۱۹۴۳ء درج ہے ۔

ایک غزل جو وحشت[1] کلکتوی کے مکان پر طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی تھی، اور جس کا مقطع یہ ہے ؎

میں سراج اس کا ہوں دل اس کا ہے جاں اس کی ہے
مجھ پہ تشنکے کے برابر بھی جو احساں کر دے

اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

" علاوہ آخری شعر کے یہی غزل تو میں نے دیکھ کر بھیجی تھی اگر وہ لفافہ گم ہو گیا اور یہ اشعار بے اصلاحی ہیں تو ان میں ضرورت اصلاح نہیں "

(آرزو)

ایک خط میں آرزو صاحب نے اپنی یہ نئی رباعی بھیجی تھی :

کانوں کی غرض کلام سمجھا تا ہے آنکھیں کیوں ہیں نظر خود آجاتا ہے
کیا کیا مانگوں یہ سوچنا ہے بے کار تو تو ہر چیز دے کے سمجھاتا ہے

ایک بار سراج صاحب نے آرزو مرحوم کی خدمت میں پوسٹ کارڈ پر یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا ۔ ؎

نہ ہو گر بارِ خاطر آرزو صاحب تو یہ پوچھوں
سراج بے زباں پر پھر کیوں استاد کم کر دی

اس کے جواب میں آرزو صاحب نے بمبئی سے ۱۵ رمئی ۱۹۴۵ء کو ذیل کا شعر پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیج دیا تھا ۔ ؎

بیانِ دردِ حسرت حد گویائی سے باہر ہے
نہ پوچھ اے ہم نوا کس واسطے فریاد کم کر دی

بمبئی سے ایک خط میں لکھتے ہیں :

حبیب دل نواز سلام مسنون

خط معہ غزل ملا ۔ مگر جوابی کارڈ کوئی نہیں ملا ۔ غزل دیکھ کر روانہ کر رہا ہوں ۔ آپ اپنے اندازِ گویائی کو پختہ کیے جائیے اور ضروری ہدایات کو ایسا یاد رکھیے کہ دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہ پڑے ۔ اس طرح پوری پختگی آجائے گی ۔ نہ زیادہ تعریف کا اثر لیجیے نہ حاسدانہ مذمت کی پروا کیجیے ۔

" بھرا "، " مرا " کا قافیہ اگر درمیانِ غزل میں آگیا ہے تو کوئی ہرج نہیں اس کے لیے مطلع میں ایک فارسی ایک ہندی قافیہ لانا ضروری نہیں ۔ اگر " زمانہ "، " نشانہ " وغیرہ قافیے ہوئے تو بیشک مطلع کے قافیوں کی پابندی شعروں میں بھی کرنا پڑتی یا ایک ہندی ایک فارسی قافیہ مطلع میں لانے کے بعد مخلوط قافیے کہے جا سکتے تھے مگر تحریر میں " زمانہ " الف کے ساتھ " زمانا " لکھا جاتا یعنی ہر فارسی قافیہ کی ہائے مختفی الف سے بدل جاتی ۔ (آرزو)

اس خط کے بعد والے خط میں لکھتے ہیں :

" غزل پر جتنا رنگ ہوا اگر نہ ہوتا تو ناانصافی تھی ۔ اشعار ایسے ہی تھے ۔ مگر اب آپ کو مشق جاری رکھ کر اپنے اس رنگ گویائی پر قابو حاصل کر لینا چاہیے ۔ یہ بہت وحشی فن ہے ۔ انسان میں مستغنی پیدا ہوا اور وہ اپنا راستہ آپ بھولنے لگتا ہے ۔ خدا کا شکر ہے اور یہ اس کا کرم ہے کہ دشمنوں پر اتنا اثر ہوا کہ وہ اپنے بخل کو کام میں نہ لا سکے ۔

وحشت صاحب کی غزل نظام میں بھیجی تھی ۔ نظر سے گزری ان کی گویائی صرف طنز ہو کر رہ گئی ہے ۔ جو نہ سمجھے وہ متاثر نہیں ہو سکتا اور جو سمجھے وہ مشکوک ہو کہ آخر یہ چوٹ کس پر ہے ۔

بمبئی کی فضا عرصے تک درست نہ ہو سکے گی ۔ اس لیے کہ یہاں متعدد ٹولیاں بنی ہوئی ہیں ۔ اس طرح بہت سے مشاعرے نہایت بے لطف ہوا کرتے ہیں ۔ ہمارے شاگرد اپنے اپنے کاموں میں اتنے الجھے رہتے ہیں کہ ابھی تک تنظیم نہیں ہو سکی ہے ۔ مگر اتنا ہو گیا ہے کہ ان لوگوں کے پڑھنے پر لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ آرزو اسکول کا رنگ ہی اور ہے ۔ اگر تنظیم ہو جائے تو یہاں بھی وہی حالت پیدا ہو سکتی ہے ۔ اچھے کہنے والے احسن دانا پوری اور سرورش الہ آبادی پھر بھی ہیں پر تو ان دونوں سے اول ہیں "

[1] رضا علی وحشت کلکتے کے مشہور شاعر تھے اپنے کو مقلد غالب کہتے تھے ۔

ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا صدارتی کلام بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۲۵ محرم کو میری صدارت میں ایک مسالمہ ہونے والا تھا۔ وہ ہوا مگر میں بیمار ہو گیا۔ اور نہ جا سکا زمین وہی تھی جس میں آپ کا سلام ہے۔ بڑی بحر والا اسی کارڈ پر نقل کیے دیتا ہوں (آرزو)

حسین میدان کربلا میں وہ تیغ جوہر دکھا رہے ہیں
کہ سامنے ہمتِ بشر کے ملک بھی گردن جھکا رہے ہیں
خلیل کے وارثِ حقیقی جو پیاس سے تلملا رہے ہیں
بپا ہے زم زم میں اک تلاطم بنا میں طوفان آ رہے ہیں
پہنچ گیا ہے حرم کا سقّا، جو لڑتا بھڑتا قریب دریا
بڑھی ہیں آغوش کھولے موجیں، حباب آنکھیں بچھا رہے ہیں
یہ گرد کعبہ کے کہ نیزے تانے، ہیں جمع کس طرح کے سماں
زباں پہ کلمہ ہے جس نبی کا شبیہ اس کی مٹا رہے ہیں
قضا جو آئی ہے کربلا میں رضائے خالق کا لے کے محضر
شہید پروانہ جہاں پر لہو سے مہریں لگا رہے ہیں
یہ معرفت ہے رضائے حق کی کہ چھ مہینے کی عمر والے
فنا میں پا کر بقا کی لذت، اٹھا کے دکھ مسکرا رہے ہیں
وہ عفو کا در، پناہ کا گھر، یہ تو صبر آئے دل کو کیونکر
جو لوگ اٹھے تھے کربلا سے وہ آج تک دل جلا رہے ہیں
خدا کا وعدہ ہوا ہے پورا، رسول کو فخر کا ہے موقع
ذبیح کے لب پہ مرحبا ہے، حسین گردن کٹا رہے ہیں
یہ ماتا ہے غریب ماں کی، یہ ٹوٹے دل کا ہے اک سہارا
کلیجا زہرا کا چھن رہا ہے حسین پر تیر آ رہے ہیں
شدید ہے تشنگی محشر تو آرزو کو ہے اس سے کیا ڈر
جو پیاسے آئے تھے کربلا سے وہ آج کوثر لٹا رہے ہیں

اسی خط میں لکھتے ہیں:

رباعیاں تو ہوتی ہیں۔ میں نے خاص کی بنیاد ڈالی ہے ایک نمونہ دیکھیے:

بیعت سے نہ دور دل کا کینہ ہوتا   ذلت بھی اٹھاتے تو نہ جینا ہوتا
انجام جس سے خوب واقف تھے حسین
کٹتا نہ گلا تو زہر پینا ہوتا   قسمت میں یہی خون پسینا ہوتا

سراج علی آبادی سنی العقیدہ تھے۔ وہ تیرھویں رجب مولائے کائنات کی ولادت کے موقع پر اور تیسری شعبان کو التزام کے ساتھ قصیدے کہتے تھے اور محرم کے زمانے میں سلام تو اکثر لکھتے تھے۔ ذیل میں ان کے دو سلام کے چند اشعار اور ان پر آرزو صاحب کی اصلاح کے نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

کفر کا سیلاب اپنی حد سے بڑھ کے بڑھا   مصطفیٰ کا لعل بڑھ کر دامنِ ساحل بنا

دوسرے مصرعے کی اصلاح "بڑھ کر دامن" کی جگہ "ہو کر سدِ رہ"۔

مصطفیٰ کا لعل ہو کر سدِ رہ ساحل بنا

اے حسین ابن علی تو خادرِ اسلام تھا   تو بھی تیرے در پہ جھکنے سے مہ کامل بنا

پہلے مصرعے کی اصلاح "تو خادر اسلام تھا" کی جگہ "اے مطلع انوار دیں"۔

اے حسین ابن علی اے مطلع انوار دیں

آفتیں دنیا کی جھیلیں آلِ احمد نے سراج   حق کے آگے جا کے تب باطل کہیں باطل بنا

دوسرے مصرعے کی اصلاح "کے آگے جا کے تب" کی جگہ "سے ٹکر کھا کے تب"

حق سے ٹکر کھا کے تب باطل کہیں باطل بنا

یوں ہی گرداں ہے بشر گردشِ تقدیر کے ساتھ   جیسے چکر میں ہے فلک مہر کے ساتھ

پہلے مصرعے کی اصلاح "یوں ہی گرداں ہے" کی جگہ "یوں ہے گردش میں"۔

"یوں ہے گردش میں بشر گردشِ تقدیر کے ساتھ"

تجھ کو اے شمر نہ دوزخ میں بھی رہنے دے گی   تیری بے ادبی آیۂ تطہیر کے ساتھ

پہلے مصرعے کی اصلاح "نہ دوزخ میں رہنے دے گی" کی جگہ "چکھا دے گی مزا دوزخ کا" دوسرے مصرعے کی اصلاح "آیۂ تطہیر" کی جگہ "حضرت شبیر"۔

تجھ کو اے شمر چکھا دے گی مزا دوزخ کا
تیری بے ادبی حضرت شبیر کے ساتھ

عکس تحریر آرزو لکھنوی

(خطوط بنام ڈاکٹر سراج علی آبادی)

ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر صاحب

یہ تھا اعجاز کہ دینے لگیں حق حق کی صدا
بیڑیاں پاؤں کی ٹکرائیں جو زنجیر کے ساتھ

پہلے مصرعے کی اصلاح: ”حال سجاد پہ اف اف کی صدا دینے لگیں“۔

حال سجاد پہ اف اف کی صدا دینے لگیں
بیڑیاں پاؤں کی ٹکرائیں جو زنجیر کے ساتھ

کھینچتے تو ہو اسے پہلوئے اکبر سے مگر
دل نہ سینے سے نکل آئے کہیں تیر کے ساتھ

پہلے مصرعے کی اصلاح:

کھینچتے تو ہیں اسے گردنِ اصغر سے حسین

دوسرے مصرعے کی اصلاح ”آئے“ کی جگہ ”جائے“:

کھینچتے تو ہیں اسے گردنِ اصغر سے حسین
دل نہ سینے سے نکل جائے کہیں تیر کے ساتھ

”پہلوئے علی اکبر میں برچھی لگی تھی۔ اور قافیہ تیر ہے اس لیے بدلنا پڑا مطلب یہ ہوا کہ بچے کے گلے سے تیر کھینچنے میں باپ کا دل سینے سے نہ نکل جائے“ (آرزو)

حشر کہتے ہیں جسے وہ ہے اسی کا خاکہ   کربلا میں جو ہوا حضرتِ شبیر کے ساتھ

پہلے مصرعے کی اصلاح ”وہ ہے اسی کا خاکہ“ کی جگہ ”دن ہے وہ اس فیصلے کا“:

حشر کہتے ہیں جسے دن ہے وہ اس فیصلے کا   کربلا میں جو ہوا حضرتِ شبیر کے ساتھ

نکلا آتا ہے تصور سے کلیجہ منھ کو   حالتِ غم ہو بیاں کس طرح تقریر کے ساتھ

دوسرے مصرعے کی اصلاح:

کیا بیاں حالِ شہادت کا ہو تقریر کے ساتھ

مضمون ختم کر چکا تھا کہ آرزو صاحب کے ایک نایاب فوٹو کا سراغ ملا۔ یہ فوٹو جو اس مضمون کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے، عطیہ ہے جناب وصی احمد صاحب انگر ایڈووکیٹ کا جو آرزو صاحب کے ارشد تلامذہ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

لکھنؤ میں آرزو صاحب کا قیام زیادہ تر انگر صاحب ہی کے یہاں رہتا تھا اور انگر صاحب بھی آرزو صاحب سے پرستش کی حد تک عقیدت رکھتے تھے۔ انگر صاحب کے نام آرزو صاحب کا ایک خط ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ یہ خط اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں آرزو صاحب نے ایک گیت لکھ بھیجا تھا جو انھوں نے کسی فلم کے لیے لکھا تھا اور جس کا علم انگر صاحب کے سوا شاید کسی اور کو نہ ہو۔

انگر صاحب کے پاس آرزو صاحب کے تیرہ غیر مطبوعہ مرثیے بھی محفوظ ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ استاد آرزو سے متعلق معلومات کا جتنا بڑا سرمایہ انگر صاحب کے قبضے میں ہے ہندوستان اور پاکستان میں شاید ہی کسی کے پاس ہو۔

(خط بنام انگر صاحب ایڈووکیٹ)

ویدیا منسن۔ چھکتا واڑی
تار دیو روڈ بمبئی نمبر ۷   ۹ مئی ۱۹۴۲ء

حبیب دل نواز

سلام و دعا۔

میرا خط پڑھ کر آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی مگر یہ روگ مقدر ہو چکا ہے اور لاعلاج ہے اس لیے جس طرح میں اپنا تماشا آپ دیکھ رہا ہوں اسی طرح آپ بھی مقدر آفریں کے ہلاکت خیز مناظر کو جان آفریں سمجھیے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

....

میں نے اسی ہلاکت خیز زمانے میں ایک کہانی مکالموں اور گانوں سمیت ختم کر دی اس وقت وہ دی سلاؤ بیٹھے ہوئے اس کو صاف کر رہے ہیں۔ اگر مسٹر سہراب اسے بنا سکے تو یہ اپنے اثر کے لحاظ سے جادو معلوم ہوگی۔ اس کے گانے اپنے اپنے محل کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں جن میں کا ایک گانا درج ذیل ہے یہ آپ کی تفریح کے لیے ہے جب تک پکچر بن نہ جائے کسی کو سنانا مناسب نہیں۔ بچوں کو دعا بہو صاحبہ کو سلام و دعا۔ ماسٹر صاحب نصیح میاں کو سلام مسنون۔

خیر طلب آرزو

گانا اور اس کا سچویشن

اک چودہ برس کی لڑکی جو برہمنی ہے مگر وہ اچھوت سمجھی جاتی ہے اسے خود بھی اپنا حال معلوم نہیں گھوڑے پر سے خوشبودار پھولوں کے پیڑ اتنگ کر کے دھوتی جاتی ہے

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

اجنتا

سعادت نظیر

جو حُسنِ کار کی روحِ رواں ہو، فن وہ ہے
نگار خانۂ فطرت کی جاں ہو، فن وہ ہے
نوید زندگیِ جاوداں ہو، فن وہ ہے

بغیرِ خونِ جگر، کوئی شاہ کار کہاں
نہ ہو یہ گلشنِ فن میں تو پھر بہار کہاں؟

یہ بے نظیر "اجنتا" سدا بہار چمن
نوادرات میں ممتاز اور مُرقّعِ فن
زمیں پہ آگیا تاروں کے ساتھ جیسے گگن

جنوں فزا یہ وہ مرکز ہے نور و نکہت کا
ہر آنکھ والے کو جس پر گماں ہو جنّت کا

بہ شکلِ قوسِ قزح اور بہ سینۂ کہسار
حسین وادیٔ گل میں بہارِ نقش و نگار
یہ دل فریب "اجنتا" کے خوب صورت غار

یہ غار گردشِ حالات سے دوچار نہیں
کبھی یہ سیلِ حوادث سے ہم کنار نہیں

نظر کے سامنے دُنیائے عشرت و غم ہے
شعور کی ہے فضا، آگہی کا عالم ہے
ہر اک گپھا میں مجسم حیاتِ گوتم ہے

یہ کوئی آخری منزل ہے حُسنِ صنعت کی؟
کہ کاوشِ بشری بھی ہے کس قیامت کی!

یہ جلوہ گاہِ تخیّل، یہ معبدِ رنگیں
یہ بُت، یہ عکسِ تمدن، یہ شاہ کارِ حسیں
بساطِ ارض پہ ان کا کہیں جواب نہیں

ہر ایک چیز یہاں جیسے اعتباری ہے
یہی کمال تو معراجِ حسن کاری ہے

کہیں ہے بھیل، گڈریا، کہیں برہنہ بدن
کسی ستون پہ وہ ایک سَر کے چار ہرن!
کہ جن کو دیکھ کے شرمائے ہر غزالِ "ختن"

کہیں سُنا ہے نہ دیکھا، یہ ایسے منظر ہیں
جہاں زمانے کے اہلِ کمال ششدر ہیں

کنارِ آب کہیں ناریوں کا وہ جمگھٹ!
بندھا ہے جُوڑا! جو اس کا کھُلی ہے اُس کی لٹ
ہر ایک ان میں سے توبہ! بلا کی ہے نٹ کھٹ

بتائیں کیا کہ یہ کیا دل رُبا نظارا ہے
بچا کے لائے دل اپنا، یہ کس کو یارا ہے!

اُتر کے پانی میں شعلہ بدن نہاتی ہیں
کہ چھینٹیں لڑتی ہیں آپس میں، غل مچاتی ہیں
حنائی ہاتھوں سے چنگاریاں اُڑاتی ہیں

لگی ہے ایسی قیامت کی آگ ساگر میں
شرابِ سُرخ کی لہریں ہوں جیسے ساغر میں

یہ موجِ آب، یہ ساگر ہے، یہ کنارا ہے
یہ مہ جبیں ہے، یہ مہ رُخ، یہ ماہ پارا ہے
وہ اپسرا نہیں، اُڑتا ہوا ستارا ہے

یہ روشنی، نہ یہ رنگیں فضا کہیں ہو گی
یہ آسمان نہ ہوگا، نہ یہ زمیں ہو گی

کسی حسینہ کا وہ روپ، وہ خد و گیسو!
وہ اُس کی آنکھ کنول سی، وہ دیدۂ آہو!
وہ پنکھڑی سے لب اور وہ کمانچے ابرو!

غرض کہ سر سے قدم تک جہاں نظر کیجے
یہ آرزو ہو، وہیں زندگی بسر کیجے

"حبش" کی راج کماری، وہ غیرتِ ناہید!
حضورِ شاہ وہ رقاصہ عجز کی تمہید!
وہ شاہ زادی سے شہ زادہ محوِ گفت و شنید!

ہزاروں ہوش ربا شوخیاں مچلتی ہیں
یہاں حیات کی رعنائیاں اُبلتی ہیں

کوئی ہے رقص میں گُم اور کوئی گاتی ہے
جو اک مجیرا تو مردنگ اک بجاتی ہے
سنور سنور کے کوئی یوں نرت دکھاتی ہے

یہ دیکھ کر کوئی آپے میں رہ نہیں سکتا
جو اُس کے دل پہ گزرتی ہے کہہ نہیں سکتا

وہ ایک رانی کے مرنے کا دل گداز سماں!
ادھر کنیزیں، اُدھر اقربا ہیں اشک فشاں
غرض کہ اپنے پرائے سبھی ہیں نوحہ کناں

یہ وہ سماں ہے کہ آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے
دلوں میں شعلۂ غم اور بھی بھڑکتا ہے

وہ ایک راجے کا دربار دیدہ زیب مقام!
جہاں ادب سے وہ "ایراں" کے ایلچی کا سلام!
نظر نواز وہ "خسرو" کے تحفے اور پیام!

عیاں خلوص ہے چہروں سے کس قیامت کا!
کوئی مٹا نہیں سکتا یہ نقش صنعت کا

کہیں وہ ایک بھکارن، وہ اس کا لختِ جگر!
کھڑے ہیں سامنے گوتم کے، التجا بن کر
کہ حالِ زار پہ ہو جائے اک کرم کی نظر

مہاتما وہ ہے، جو سب کا غم گسار بھی ہو
جو آدمی ہو، جسے آدمی سے پیار بھی ہو

نظر کا یہ کوئی دھوکا نہیں، حقیقت ہے
کہ ہر مقام یہاں اک مقامِ حیرت ہے
یہ کارنامۂ انساں، خدا کی قدرت ہے!

جنونِ ذوق جو معیار پر اُترتا ہے
تو ایسے کام بھی انسان کر گزرتا ہے



تذکرۂ شعرائے لکھنؤ

اور

خواجہ عشرت لکھنوی

نادم سیتاپوری

لکھنؤ کے ارباب کمال کا کوئی باضابطہ تذکرہ اس وقت تک نہیں لکھا گیا۔ جستہ جستہ حالات ادھر ادھر تذکروں میں کثرت سے بکھرے ہوئے ہیں لیکن انھیں یکجا کر کے کسی مستقل تالیف کا درجہ دیا گیا ہو، ایسا کوئی تذکرہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ پروفیسر آغا اشہر لکھنوی کا بیان ہے کہ اس قسم کا ایک تذکرہ مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی ترتیب دے رہے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔

اس صدی کے آغاز یا گزشتہ صدی کے آخری چند برسوں کے اندر ماہ نامہ معیار لکھنؤ میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے تذکرۃ الشعرا کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کی دو تین قسطوں سے جو معیار میں شائع ہوئی تھیں، یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے لکھنوی معاصرین کے حالات اور نمونۂ کلام کو ایک تذکرے کی شکل دینا چاہتے تھے لیکن معیار کے پہلے شمارے میں (افسوس کہ اس شمارے پر سن و ماہ کی کوئی تفصیل درج نہیں ہے) عزیز کا جو تمہیدی مضمون شامل ہے اس سے اس قیاس کی کوئی خاص تائید نہیں ہوتی۔ اپنے مضمون کے آخری حصے میں عزیز نے لکھا ہے:

"ہم اپنے باذاق شعرا کے اشعار پر جب غور کرتے ہیں تو ان سے زبان اردو کی ترقی کا اندازہ ملتا ہے اور جن باتوں کو ہمارا دل و دماغ ڈھونڈھتا ہے ان کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ واقعی زبان اردو کی ترقی نامحدود ترقی ہے اور اس کے ہونہار آثار بتا رہے ہیں کہ ابھی اور مدارج ترقی کے طے کرے گی۔ یہ کام ہمارے متاخرین کے ذمہ وہمت[1] پر موقوف ہے ۔۔۔ ہمارے شہر کے عالی خیال شعرا نے شاعری کے آئینۂ حکمت پر دوبارہ ویسی ہی صیقل کی ہے اور ویسے ہی جوہر دکھلائے ہیں جو کسی زمانے میں میر و غالب کے دست گاہ سے نمایاں ہوئے تھے.... اس وقت بہت سے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے زمین شعر کا پایہ آسمان سے ملا دیا ہے اور اپنی فکر رسا کو اس کنز مخفی تک پہنچا دیا ہے جو خاص خاص شاگردان الٰہی کا حصہ ہے۔ مگر افسوس کہ ناآشنائی روزگار سے وہ گوہر بے بہا ابھی تک اس دریا کی ایسی تہ میں ہیں کہ غواصان سخن فہم کے ہاتھ نہیں لگے اور نہ ان کا کلام آویزۂ گوش سامعین ہوا اور نہ ضرور انصاف پسندوں کے مجمع میں ایک ممتاز نظر سے دیکھے جاتے ہیں قریب قریب اس گروہ کا ناظرین معیار سے تعارف کرا کے ثابت کر دوں گا کہ زمانہ اہل کمال سے خالی نہیں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ تمام شعرا اور معیار کے کل ناظرین اس ضروری تعارف سے لطف اٹھائیں گے اور علاوہ شعرا کے دلچسپ حالات کے ان کا منتخب کلام بھی اپنی طرف متوجہ کر لے گا کیوں کہ یہ انتخاب انشاء اللہ آیندہ اس خوبی سے ہوگا کہ ہر ایک کا خاص رنگ اور مخصوص مذاق نمایاں کر کے دکھایا جائے گا۔" (ماہنامہ معیار لکھنؤ جلد نمبر۱ شمارہ نمبر۱)

لیکن یہ کام بھی مکمل نہ ہو سکا۔ دو چار شماروں میں منشی عبدالبصیر حضور، میر ضامن علی جلال، مرزا وصی علی خان مظہر اور مہدی

---

[1] اصل میں اسی طرح ہے (نادم)

حسن احسن کے حالات اور نمونہ کلام شایع ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا حالاں کہ اس وقت تک صرف "معیار پارٹی" کے باقاعدہ ممبروں کی تعداد سو سے زیادہ تھی جن کا نمونہ کلام معیار کے پرانے فائلوں میں بکھرا ہوا ہے۔ معیار کے مختلف شماروں میں اس پارٹی کے اراکین کے جو نام اور نمونہ کلام شامل ہے اس کی تفصیل بلا کسی خاص ترتیب کے درج ذیل ہے:

۱۔ آرزو۔ سید انور حسین لکھنوی (پتہ: میدان ایل خاں) ۲۔ اثر۔ سید محمد ابراہیم مرزا شاگرد ثمر لکھنوی ۳۔ احسن۔ محمد حسن خاں شاگرد مرزا جعفر علی اوج۔ ۴۔ ارم۔ مرتضیٰ حسین شاگرد ناشاد لکھنوی ۵۔ افضل۔ سید افضل علی خاں۔ ۶۔ بلیغ۔ نواب عسکری مرزا خاں عرف ببن صاحب (نواز گنج) ۷۔ بہار۔ سید محمد جعفر حسین عرف محمد صاحب، شاگرد فصاحت لکھنوی (تالاب گنگنی شکل) ۸۔ بیتاب۔ سید حسین شاگرد جاوید لکھنوی۔ ۹۔ بیدل۔ چکن ناتھ پرشاد شاگرد و خلف سکین سدھوری۔ ۱۰۔ اعجاز۔ اعجاز حسین شاگرد مشتاق لکھنوی۔ ۱۱۔ انجم۔ میر بہادر حسین خاں شاگرد اسیر لکھنوی ۱۲۔ بدر۔ نواب مہدی علی خاں شاگرد بلیغ لکھنوی۔ ۱۳۔ ثروت۔ نواب احمد علی خاں عرف پتن صاحب۔ ۱۴۔ جاوید۔ سیدہ بندہ کاظم ۱۵۔ جوہر۔ منشی محمد ابراہیم شاگرد نظر لکھنوی۔ ۱۶۔ حسن۔ حاجی سید احمد حسن تلمیذ خواجہ دہلوی۔ ۱۷۔ حمید۔ سید باقر مرزا۔ نبیرہ میرانیس۔ ۱۸۔ خوش دل۔ منشی نغام لال۔ ۱۹۔ دانش۔ حکیم مرزا فدا احمد۔ ۲۰۔ رسوا۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ ۲۱۔ رشید۔ سید مصطفےٰ مرزا عرف پیارے صاحب۔ ۲۲۔ رمز۔ سید فاضل حسین شاگرد مشتاق لکھنوی۔ ۲۳۔ سجاد۔ نواب سجاد علی خاں شاگرد مشتاق لکھنوی۔ ۲۴۔ سرشار۔ منشی صادق علی خاں۔ ۲۵۔ شائق۔ نواب باقر علی خاں شاگرد مشتاق لکھنوی۔ ۲۶۔ شرر۔ احسن مرزا شاگرد منظر لکھنوی۔ ۲۷۔ شفیق۔ علی نواب خلف سلیس لکھنوی۔ ۲۸۔ شہرت۔ سید باقر حسین عرف اچھے صاحب۔ ۲۹۔ صفی۔ سید علی نقی (لسان القوم) ۳۰۔ صہبا۔ نواب کاظم علی خاں شاگرد زیبا۔ ۳۱۔ ضیا۔ نواب پیارے مرزا شاگرد زیبا۔ ۳۲۔ عابد۔ میر عابد حسین شاگرد مشتاق لکھنوی۔ ۳۳۔ عاشق۔ بہادر علی خاں عرف چھبن صاحب، شاگرد وسیم۔ ۳۴۔ عجز۔ غلام مصطفےٰ خاں۔ ۳۵۔ فدا۔ شیخ فدا حسین خوش نویس۔ ۳۶۔ فصاحت۔ سید عباس حسن خلف امانت لکھنوی۔ ۳۷۔ قمر۔ منشی بال کرشن شاگرد امیر مینائی۔ ۳۸۔ کلیم۔ شیخ عبدالرحیم۔ ۳۹۔ محزون۔ مرزا علی محمد شاگرد جاوید لکھنوی۔ ۴۰۔ محشر۔ مرزا کاظم حسین۔ ۴۱۔ مد۔ سید رضا حسین شاگرد فصاحت لکھنوی۔ ۴۲۔ مذاق۔ شیخ محمد اسمٰعیل شاگرد مشتاق لکھنوی۔ ۴۳۔ مسکین۔ شیخ بہاری لال سدھوری ۴۴۔ مشتاق۔ نواب محمد باقر علی خاں عرف بتے صاحب۔ ۴۵۔ نادر۔ نادر حسین شاگرد فصاحت لکھنوی۔ ۴۶۔ ہاتف۔ نواب سید ذکی علی خاں عرف بنن صاحب۔ ۴۷۔ ابر۔ حکیم سید علی محسن خاں۔ ۴۸۔ سالم۔ نواب مبارک حسین خاں (تحسین گنج) ۴۹۔ شعلہ۔ سید محمد سلطان (بنجاری ٹولہ) ۵۰۔ عالم۔ مرزا الطاف حسین تلمیذ مشتاق لکھنوی۔ ۵۱۔ مدہوش۔ مرزا کاظم حسین خاں شاگرد جلال لکھنوی۔ ۵۲۔ ناطق۔ ابوالعلا حکیم سید احمد۔ ۵۳۔ نظر۔ منشی نوبت رائے۔ ۵۴۔ جویا۔ نواب مہدی علی خاں، عرف مجن صاحب (سرائے معالی خاں) ۵۵۔ مظہر۔ مرزا وصی علی خاں عرف مظہر آغا (کوچہ شاہ چڑا) ۵۶۔ ناصری۔ شیخ مہدی حسن (پروفیسر) شاگرد رشید لکھنوی (سلیم پور ہاؤس قیصر باغ) ۵۷۔ عابد۔ سید عابد حسین شاگرد فصاحت لکھنوی۔ ۵۸۔ بصیر۔ سید محمد ذکی۔ ۵۹۔ جلال۔ حکیم سید ضامن علی۔ ۶۰۔ حامد۔ حامد حسین شاگرد محشر لکھنوی ۶۱۔ حشر۔ سلطان خاں شاگرد جلال لکھنوی۔ ۶۲۔ صبیح۔ مولوی محمد اسمٰعیل۔ ۶۳۔ عاشق۔ نظیر حسین۔ ۶۴۔ مشتق۔ نواب محمد مرتضیٰ شاگرد مشتاق لکھنوی۔ ۶۵۔ یاس۔ میرزا اکبر حسین۔ ۶۶۔ حبیب۔ سید شریف حسن شاگرد رشید لکھنوی۔ ۶۷۔ حکیم۔ منشی سید غضنفر علی خاں خلف اسیر لکھنوی۔ ۶۸۔ سرور۔ میر سرور حسین شاگرد فصاحت لکھنوی۔ ۶۹۔ سعید۔ سید ابوالقاسم شاگرد خورشید لکھنوی۔ ۷۰۔ شوخ۔ حاجی سید سلطان احمد شاگرد جلال لکھنوی۔ ۷۱۔ یکتا۔ نواب ہادی علی خاں۔ ۷۲۔ مائل۔ مولوی صادق علی۔ ۷۳۔ قاسم۔ نواب قاسم علی خاں۔ ۷۴۔ عبرت۔ شیخ قربان حسین شاگرد جاوید لکھنوی۔

۷۵۔ نظم۔ احمد خاں شاگرد رشید لکھنوی۔ ۷۶۔ ہلال۔ شیخ رحمت علی شاگرد جاوید لکھنوی۔ ۷۷۔ آبرو۔ سید میرن صاحب شاگرد فصاحت لکھنوی۔ ۷۸۔ جواد۔ سید جواد علی۔ (درزی بیج) ۷۹۔ حسین۔ سید صادق علی شاگرد جاوید لکھنوی۔ ۸۰۔ طاہر۔ حکیم شیخ محمد طاہر شاگرد عزیز لکھنوی۔ ۸۱۔ دحتی۔ سید منظور علی شاگرد صفی لکھنوی۔ ۸۲۔ آشفتہ حکیم سید علی شاگرد عزیز لکھنوی (جوہری محلہ) ۸۳۔ طغرا۔ مرزا محمد رضا شاگرد عزیز لکھنوی (دفتی گنج) ۸۴۔ ذاکر۔ مولوی سید فرزند حسن عرف اچھن صاحب (پاٹا نالہ) ۸۵۔ آبر۔ پنڈت بشن نرائن بیرسٹر۔ ۸۶۔ احمد۔ حکیم مولوی سید احمد۔ ۸۷۔ بارق۔ حکیم میر عنایت حسین ۸۸۔ بیمار۔ شیخ تجمل حسین نبیرہ اچھے صاحب عیش لکھنوی شاگرد عزیز لکھنوی۔ ۸۹۔ توقیر۔ نواب چھبن صاحب شاگرد جلال لکھنوی۔ ۹۰۔ جگر۔ مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں۔ ۹۱۔ چکبست۔ پنڈت برج نرائن۔ ۹۲۔ حامد۔ حامد علی خاں بیرسٹر۔ ۹۳۔ خنجر۔ مرزا فدا علی۔ ۹۴۔ سحاب۔ مرزا کاظم حسین شاگرد فصاحت لکھنوی۔ ۹۵۔ سیف۔ عبدالحکیم شاگرد جلال لکھنوی۔ ۹۶۔ شاعر۔ سید اولاد حسین عرف للن صاحب۔ ۹۷۔ شگفتہ۔ سید محمد رضی شاگرد ذاکر لکھنوی۔ ۹۸۔ فاضل۔ حکیم متے آغا۔ ۹۹۔ مسرت۔ لالہ گوری شنکر شاگرد دانش لکھنوی۔ ۱۰۰۔ نکہت۔ سید حیدر حسین شاگرد فصاحت لکھنوی۔ ۱۰۱۔ مجروح فریدوں مرزا۔ ۱۰۲۔ ادیب۔ نواب سید محمد عابد (تنویر الدولہ) ۱۰۳۔ آسمان۔ سید محمد جعفر شاگرد بقا لکھنوی۔ ۱۰۴۔ ظریف۔ سید مقبول حسین۔ ۱۰۵۔ اشہر۔ سید منیر آغا (پروفیسر)۔

یہ فہرست تو ان لکھنوی شعرا کی ہے جو "معیار پارٹی" سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ لکھنؤ میں دوسرے ادبی ادارے بھی تھے جن کے "حلقے" علاحدہ قائم تھے اور ان حلقوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی پارٹی تھی جو ایک طرف تو "پیام یار" والے منشی نثار حسین سے قریب تر تھی دوسرے بہت سے غیر لکھنوی شعرا بھی کسی نہ کسی نہج سے اسی حلقہ ادب سے تعلق رکھتے تھے! مولوی عبدالحلیم شرر معرکۂ چکبست و شرر کی زد میں آکر جب غیر لکھنوی قرار دیے گئے تو اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر اسی طرف آ گئے! ریاض خیرآبادی، قیصر بھوپالی، مولوی عبدالباری آسی الدنی بیخود موہانی، یاس عظیم آبادی اور اسی قسم کے جانے کتنے غیر لکھنوی شاعر ہمیشہ معیار پارٹی سے دور ہی رہے اور ان کا جھکاؤ کسی دور میں اگر کچھ رہا تو وہ خواجہ عشرت ہی کی طرف تھا۔

خواجہ عشرت "لکھنویات" کے اچھے روایت نگار تھے۔ میر کلو عرش کے شاگرد رشید محمد جان شاد لکھنوی (پیرو میر) سے افتخار تلمذ تھا۔ چوک میں ان کی ایک چھوٹی سی کتابوں کی دوکان اپنے زمانے کا سب سے بڑا علمی و ادبی مرکز سمجھی جاتی تھی جہاں مولانا شبلی گھنٹوں بیٹھ کر اپنی کتابوں کے پروف دیکھا کرتے تھے!—

خواجہ عشرت نے لکھنویات پر جتنا لکھا ہے تحقیقی زاویہ نگاہ سے خواہ وہ زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو پھر بھی مجموعی طور پر اس کی لکھنوی اور روایتی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عشرت نے لکھنے کو تو کم و بیش ایک درجن کتابیں لکھی ہیں — لیکن تذکرہ "آب بقا" ان کی ایک پائیدار تالیف کا درجہ رکھتا ہے۔ اس تذکرے کو ۲۹ عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے جن میں "مشاہیر شعرا کے مزارات" اور "یاران گزشتہ" اپنی افادیت کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تذکرہ فروری ۱۹۱۸ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا تھا اور اب تقریباً کمیاب سا ہو چلا ہے۔ زیادہ تر لکھنوی شعرا کا ذکر اس تذکرے میں کیا گیا ہے۔ پھر بھی مومن دہلوی، یقین دہلوی، میر برجستہ دہلوی، شہنشاہ ظفر، داغ دہلوی، منیر شکوہ آبادی، ریاض خیرآبادی، صفیر بلگرامی، نواب کلب علی خاں والی رام پور اور تسلیم خیرآبادی کے حالات اور نمونۂ کلام شامل کر کے وسعت دیدی گئی ہے!

عشرت نے لکھنؤ کے اس آخری دور کی بہار دیکھی تھی جب میر مصحفی امیر، آتش، ناسخ وغیرہ کے دیکھنے والے موجود تھے۔ میر انیس، مرزا دبیر، مرزا حاتم علی مہر، میر دمیر شاد، میر مونس، امیر اور رشید کا زمانہ تو کم و بیش خود ان کی آنکھوں کے سامنے گزرا تھا — یہ تذکرہ یقیناً لکھنوی شعرا کا تذکرہ نہیں کہا جا سکتا پھر بھی یک جائی طور پر لکھنؤ کے کمی نامور شعرا کے، حالات جتنی تفصیل کے ساتھ اس تذکرے میں ملتے ہیں شاید ہی کہیں اور نظر آئیں —؟

آب بقا بلاشبہ کوئی مکمل تذکرہ نہیں ہے کیوں کہ خواجہ عشرت

اس کی اشاعت کے بعد بھی بہت سے لوگوں کے حالات وقتاً فوقتاً تذکرہ کی شکل میں لکھتے رہے تھیں اُب بقائے دوسرے ایڈیشن میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ عشرت کے انھیں مضامین میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مضمون "میر کلو عرش مرحوم" ہے جو اس تذکرے کی اشاعت کے دو سال بعد لکھا گیا تھا اور ماہنامہ "پیا" یا "اسا لکھنؤ" جون و جولائی سنہ ۱۹۲۶ء میں بالاقساط چھپا تھا۔

تذکرہ اُب بقاء کی اشاعت کے بعد خواجہ عشرت برابر اپنے اس کام میں لگے رہے اور اس سلسلے میں بہت سے مضامین لکھ کر مختلف رسائل میں برابر چھپواتے رہے تھیں اگر یک جا کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو "عہد رفتہ" کے بہت سے نقوش ابھارے جا سکتے ہیں۔ خواجہ عشرت کا ایسا ہی ایک مضمون "جلیس ماضی" کے عنوان سے ماہنامہ ہمارا قدیم لکھنؤ بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا جو ایک اچھا خاصہ تذکرہ ہے ان لکھنوی شاعروں کا جو عشرت کے ہم عصر تھے۔ مضمون کی تمہید میں انھوں نے لکھا ہے :

"چودھویں صدی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس باغ کی بہار ابھی تک ہم دیکھ رہے ہیں اس کے آغاز میں گلزار سخن اپنے پورے شباب پر تھا اس چمن میں ہزاروں خوش نوا بلبلیں چہک رہے تھے جنھیں خزاں کے دور نے مٹانا شروع کیا۔

کیسے کیسے بلیغ و فصیح شاعر ہماری آنکھوں کے سامنے پوشیدہ ہو گئے۔ سب کا ذکر تو درکنار۔ وہ زمزمہ پرداز سخن جو ہمارے ہم صحبت تھے دیکھتے ہی دیکھتے ہمیں مفارقت کا داغ دے گئے اور پھر ایسے خفا ہوئے کہ ہمارے پہلو سے اٹھ کر گوشہ تربت پسند کر لیا۔

ان بزرگانِ طریقت کا جب کوئی ذکر کرتا ہے تو آنکھ سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور دل پر عجب کیفیت طاری ہوتی ہے انھیں صاحب کمالوں کی برکت سے مشاعرے کی زینت تھی جن کے قدموں پر خوش گوئی آنکھیں ملتی تھی۔ وہ آسمان سخن کے تارے توڑ لاتے تھے ان کے مبارک عہد میں زبان کی اصلاح ہوئی۔ رسم الخط میں ترمیم ہوئی۔ زبان میں فصاحت آئی۔ خود فرماتے تھے۔ زبان کو سنوارا۔ قدر دانی اور جوہر شناسی کا دروازہ بند ہو چکا تھا مگر ان کی ہمت نے عروس سخن کو سنوارا اور خوب سنوارا۔"

اس مختصر سے تذکرے میں ۲۹ شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے جن میں دو غیر لکھنوی شاعر بھی شامل ہیں — حکیم عابد علی "کوثر" خیر آبادی اور محمد حیات بخش رسا (تلمیذ داغ دہلوی مرحوم)۔ کوثر خیر آبادی سے چونکہ عشرت کے بہت ہی گہرے مراسم تھے اور اسی زمانے میں (سنہ ۱۹۲۶ء) میں ان کا انتقال ہوا تھا اس لیے ان کا ذکر بھی ماضی کے ان ہم جلیسوں میں کر دیا ویسے ان کا وطنی تعلق لکھنؤ سے نہیں تھا۔ اسی طرح حیات بخش رسا بھی غیر لکھنوی شاعر تھے۔ ان سے بھی عشرت کے خصوصی تعلقات تھے غالباً اسی لیے ان کی یاد کو بھی انھوں نے اپنے مضمون یا مختصر سے اس "تذکرے" میں سمو دیا۔ میں نے زیر نظر مضمون میں انھیں شامل نہیں کیا ہے۔

عشرت کا یہ مضمون اب سے نصف صدی پہلے کی ادبی شخصیات کی ایک منھ بولتی تصویر ہے اور وہ دن دور نہیں جب ان لکھنوی شاعروں کے نام تک جاننے والے اس دنیا میں باقی نہ رہیں گے۔ بہر حال گزشتہ لکھنؤ کی ادبی زندگی کا یہ دھندلا سا عکس صحیح معنوں میں ادبی تاریخ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ماضی کے یہ دھندلکے اس دور تحقیق میں ماضی کے ان نقوش کو ابھارنے میں مدد دے سکیں گے جو لکھنؤ کی تاریخ ادب کو روشنی دینا چاہیں گے— ذیل میں ہم من و عن اس مضمون (جلیس ماضی) کو ماہنامہ ہمارا قدیم لکھنؤ جلد ایک شمارہ ۲ (اپریل ۱۹۲۶ء) سے نقل کر رہے ہیں صرف بعض مقامات پر انتخاب کلام کو یا تو چھوڑ دیا گیا ہے یا مختصر کر دیا گیا ہے :

(۱) حکیم ضامن علی جلالؔ لکھنوی — میانہ قد۔ خشخشی داڑھی۔ نازک مزاج۔ گرمی کے زمانے میں ہاتھ میں پنکھا لیے ہوئے آہستہ آہستہ تشریف لاتے ہیں اور دو چار شعر ایسے سنا جاتے ہیں کہ تمام جلسہ بیخود ہو جاتا ہے۔

(۲) مائلؔ۔ میر صادق علی لکھنوی — آخری شاہ اودھ کے انتقال کے بعد کلکتہ سے لکھنؤ چلے گئے اور زندگی بھر سہ پہر کو چوک میں ایک عطر فروش کی دکان پر نشست رکھی۔ ستر برس کا سن تھا۔ بہت خوش فکر تھے۔ کبھی کبھی راستے میں صاحب سلامت ہو گئی تو فکر تازہ کے دو چار شعر سنا دیتے تھے۔

(تین شعر نمونتاً درج کیے گئے ہیں۔ ایک مطلع یہ ہے)۔

اندھیرا تھا جو ہجر مہ جبیں سے
جلائی شمع آہ آتشیں سے

(۳) نواب مرزا مہدی علی خاں ثمر۔ شاگرد میاں بحر۔ تمام زندگی افلاس میں مبتلا رہے۔ مگر شعر گوئی کا مذاق جاری رہا۔ دو گھڑی یاروں میں بیٹھ کر دل بہلا لیا کرتے تھے۔ فن شعر سے بھی واقفیت کامل رکھتے تھے۔ آخر میں کربلائے معلی تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوگیا۔

(ان کے دو شعر پیش کیے گئے ہیں۔ مطلع یہ ہے۔)

خاکساران جہاں کا یہ خیال اچھا ہے
کہ رہ دوست میں مٹنے کا مآل اچھا ہے

(۴) سید ابو صاحب جلیس خلف سلیس نبیرۂ میر انیس — نہایت دوست پرور زندہ دل آدمی تھے — مگر گردش روزگار نے ایسا پیسا تھا کہ سر نہ اٹھا سکتے۔ جب ذرا مرثیہ کی طرف توجہ کی اور دو چار جگہ مرثیہ پڑھنے لگے آمدنی کی صورت نظر آئی تو قضا آگئی بس مجمع میں بیٹھ جاتے تھے غم غلط کرتے تھے۔ تخمیناً انتقال کو بیس برس ہوئے۔

(غزل کے چار شعر لکھے گئے ہیں۔ ان میں ایک شعر یہ بھی ہے۔)

بعد پہنچی موت! پہلے جان سے میں جا چکا
تیز ہے تیر نظر اس کا قضا کے تیر سے

(۵) سید مہدی صاحب جدید لکھنوی۔ مرثیہ گوئی کا بھی شوق — مگر غزل اچھی کہتے تھے۔ بامروت و دوست نواز تھے۔ دن دن بھر صحبتِ احباب میں گذار دیتے تھے۔ دنیا کی فکروں کے پاس نہ آتے تھے۔ ہر شخص کی تعریف کرتے تھے۔

(نمونے کے تین شعروں میں ایک یہ ہے)

ہر ایک ذرّے میں پیدا ہے کیفیت اس کی
دل و جگر مجھے دنیا میں یوں تباہ ملے

(۶) منشی امیر اللہ تسلیم۔ تلمیذ رشید نسیم دہلوی۔ آپ دربار رام پور میں ملازم تھے۔ لکھنؤ میں اکثر آیا کرتے تھے اور دو مہینے قیام کر کے چلے جاتے تھے۔ نہایت نیک مزاج تھے۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ ہر شخص سے بخلوص ملتے تھے۔ خوشنویس بھی تھے اپنا پہلا دیوان خود لکھا تھا جو مطبع نول کشور میں مطبوع ہوا۔ نواب کلب علی خاں مرحوم کے دیوان بھی آپ نے لکھے تھے۔

(۷) خواجہ بادشاہ صغیر۔ خلف خواجہ وزیر وزیر — چکن کی چوگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے۔ جالی کا رومال اوڑھے ہوئے۔ مشرع کا پائجامہ سلیم شاہی جوتا پہنے ہوئے۔ جریب ہاتھ میں لیے چلے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بزرگ پستہ قامت اسی وضع کے بہت ضعیف آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلے آتے ہیں۔ ان کو بخشی جی کہتے ہیں۔ شاہی میں فوج کے بخشی تھے۔ یاس تخلص فرماتے ہیں۔ نام تو ان کا کوئی نہیں پوچھتا۔ آتے ہیں اور سب سے سلام و نیاز کے بعد مزاج پرسی کرتے ہیں۔ منشی فدا علی عیش ان کے ہم سن ہیں۔ ان سے مذاق کی کچھ باتیں ہوتی ہیں پھر کلام سناتے ہیں۔ ان کے انتقال کو تیس [۳۰] برس ہوئے۔ اسی برس کا سن ہوا۔

(صرف ایک مطلع لکھا ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ یاس کا ہے یا صغیر کا)

پیار سے میں نے بلائیں لیں نہ ان سے بات کی
انگلیاں چٹکیں، صدا آنے لگی ہیہات کی

(۸) شیخ فدا علی عیش۔ تلمیذ میر کلو عرش — بڑے خوش مزاج آدمی ہیں مسکراتے ہوئے چلے آتے ہیں اور آتے آتے اپنے ہم سن شعراء پر دو چار آوازے کس دیتے ہیں۔ لوگوں کے اصرار سے دو چار شعر سنا دیتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز اچھا ہے۔ تلاش بھی اچھی ہے۔ پچیس [۲۵] برس ہوئے کہ انتقال کیا۔ ان کا دیوان بھی نہیں چھپا۔ آغا میر کی ڈیوڑھی پر مکان تھا۔

(۹) حکیم مولوی میر عنایت حسین صاحب برق۔ عمر بھر سال لیلائے سخن کے ایسے مجنوں ہوئے کہ تمام عمر تجرد میں گزار دی۔ وسیلۂ رزق مطلبی۔ ذی استعداد۔ دوپہر کا وقت ہے! حکیم صاحب ایک چادر اوڑھے ہوئے چھتری لگائے ہوئے آرہے ہیں۔ آئیے بیٹھے۔ ذرا سستائیے۔ مزاج پوچھا۔ خیریت پوچھی۔ دو شعر مزے کے سنائے اور خدا حافظ کہہ کر چلے۔ نہ مزاج میں غرور نہ تمکنت! انتقال کو دو برس ہوئے۔

(نمونہ کلام میں چار شعر درج کیے ہیں۔ دو یہ ہیں)

بجھا چراغِ عشق کا تھا سویدا ازل میں نام — نقطہ سا بن کے وہ جو ہرے دل میں رہ گیا
بیڑا اسی کا پار ہوا بحرِ عشق میں — جو دم تہِ غرق حسرتِ ساحل میں رہ گیا

(۱۰) میر بادشاہ علی بقا۔ خلف و شاگرد میر وزیر علی وزیر صبا۔ چیچک رو۔ مائل بہ فربہی۔ میانہ قد۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے۔ چکن کا رومال اوڑھے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ نہایت خلیق۔ متواضع۔ نیک طینت۔ معلومات شاعری سے مالا مال سنگی بیگ کے احاطے کے قریب محلہ شاہ گنج میں رہتے تھے۔

(۱۱) لالہ منشی دھرمپت کانستھ۔ شاگرد لالہ مینڈو لال زار تلمیذ موجی رام موجی۔ منشی باقر علی ہمسر نے کہا۔ حمت ہمارے استاد ہیں۔ ستر پچھتر برس کی عمر ہے۔ کہیں جانے کے قابل نہیں ہیں۔ تم کو دیکھنے کا شوق ہو ہمارے ساتھ چلو۔ محلہ اشرف آباد میں رہتے ہیں۔ پرانے شعراء میں مغتنم ہیں۔

ہم ان کے ساتھ گئے تو دیکھا۔ ایک سن آدمی۔ دبلے پتلے۔ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ایک کوٹھری میں لیٹے ہوئے ہیں۔ آس پاس کچھ کتابوں کا ڈھیر ہے۔ ہم کو دیکھ کر بیٹھ گئے اور صاحب سلامت کے بعد اپنا کچھ کلام سنایا۔ پھر کہنے لگے کچھ تم بھی اپنا کلام سناؤ میں نے کہا یہ خلاف تہذیب ہے کہ ایک بزرگ شاعر کے بعد اپنا شعر پڑھوں۔ فرمایا اچھا کچھ اپنے استاد کا کلام سناؤ۔ اُسن کر بہت داد دی۔ ایک تاریخ بھی آخری شاہ اودھ کے انتقال کی سنائی جس کا مادہ یہ تھا۔

چراغ ہند گل بے باد گردید

فرمانے لگے گل شدن اور گل کشتن تو میں نے سنا ہے لیکن گل گردیدن سے کان آشنا نہیں ہیں میں نے کہا آپ کے پاس تو جہاں عجم موجود ہوگی اس میں دیکھ لیجیے۔ دیکھا تو "گل گردیدن" بھی لکھا تھا۔ اپنا کان زور سے پکڑا اور کہنے لگے تم سچ کہتے ہو۔ ہائے کیا منصف لوگ تھے

(۱۲) سید علی محمد صاحب عارف نبیرہ میر خورشید علی صاحب نفیس۔ چوّن برس کی عمر میں انتقال کیا۔ شاعر مرثیہ گو تھے۔ غزل بھی کبھی کبھی کہتے تھے رنگِ سخن اچھا تھا۔ پابند وضع تھے

(چار شعر لکھے ہیں۔ جو درج ذیل کیے جاتے ہیں)

حسرتِ ہجر زبانِ وصال اچھا ہے — جس سے بہلا رہے دل کچھ وہ خیال اچھا ہے
پاتے ہیں مجھ کو وہ ہر روز سے بدلا ہوا — ہنس کے کہتے ہیں کہ آج آپ کا حال اچھا ہے
صبحِ رُخ نے اسے کافور کی ٹھنڈک بخشی — اب دل سوختۂ برق جمال اچھا ہے
طلبِ وصل پہ دیتے جو نہیں کچھ وہ جواب — ہم سمجھتے ہیں کہ انجام سوال اچھا ہے

(۱۳) بشیر احمد خاں بشیر تلمیذ امیر و جلال۔ دولت کدہ ملیح آباد میں تھا مگر زیادہ تر لکھنؤ میں رہتے تھے اور نہایت خلیق تھے۔ پینتالیس برس کی عمر پائی۔ نو برس آپ کے انتقال کو ہوئے۔ ایک مختصر دیوان چھپا ہے

(۱۴) حکیم سید علی محسن عزت نبیرہ آغا صاحب آبر تلمیذ شیخ محمد جان صاحب "بیرو میٹر"۔ رسالہ معیار کے ایڈیٹر تھے۔ زبان اردو کے بہی خواہ تھے اگرچہ اصول مفروضہ شاعری پر ہم سے مخالفت رہتی تھی مگر رسم ملاقات اور آمد و رفت برابر جاری رکھی اور کہتے تھے کہ شاعری کی بحث تو گل و بلبل کا جھگڑا ہے اس کو آپس کے مراسم سے کیا تعلق۔ نیک مزاج اور بڑے ملنے والے تھے۔ مناقشات تحقیق الفاظ کے بعد رفع ملال کرنا بھی انھیں کا حصہ تھا۔ معیار کا اجرا محض آپ کی ہمت پر موقوف تھا۔ انتقال کو تخمیناً دس برس ہوئے۔

(ان کے بھی مندرجہ ذیل چار شعر پیش کیے گئے ہیں)

ہے ناشکیبیٔ دلِ ناداں مجھے عزیز — وہ ہنس پڑے میں خوش ہوا خجلت ہی کیوں نہ ہو
دیوانگی تھی قیس کی محدود نجد تک — ہم سے جنوں میں کون سا ویرانہ چھٹ گیا
چارہ گر امید اسی کا نام ہے — دو دوا جب تک لبوں پہ دم رہے
رونے والے دفن کر کے رو چلے — اب امید گور پہ شبنم رہے

(۱۵) منشی نوبت رائے نظر تلمیذ رشید آغا مظہر۔ ایڈیٹر رسالہ خدنگِ نظر خوش گو شاعر تھے۔ دو برس ہوئے کہ انتقال کیا۔ فن مصوری سے بھی واقف تھے۔ قریب قریب روز ہی آتے تھے۔ کچھ زمانے سے اودھ اخبار کے ایڈیٹر بھی ہو گئے تھے۔ احباب سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ رسالہ زمانہ (کانپور) میں بھی ایڈیٹر رہ چکے تھے اور رسالہ ادیب کی ایڈیٹری کا فخر بھی حاصل تھا۔ باوجود افکار معاش کے شاعری کا شوق جاری تھا

رسالہ حسن فنگ نظم کا اجرا رخلد مکان ہز ہائینس میر محبوب علی خاں سرکار حیدر آباد کی سال گرہ کی یادگار میں کیا تھا۔ حسن قسمت سے کوئی قدر دانی نہ ہوئی اور رسالہ بند ہو گیا۔ پہلے نواز گنج میں رہتے تھے اس کے بعد اشرف آباد میں اٹھ آئے تھے۔

(چھ اشعار درج کیے گئے ہیں۔ ان میں چار شعر یہ ہیں)

دکھلانے والے کہاں تک دکھائیں گے دل کو — جنھیں ہے صبر سُنے گا کبھی خدا ان کی
بنے ہیں ظالم و مظلوم دیکھ دیکھ کے لوگ — وفا و فاہے ہماری جفا جفا ان کی
بھنک سی ہے دم نزع مسیح عاشق کی — بنا بنا کے سناتے ہیں سب صدا ان کی
وہ رنگ دیکھیں میں دیکھوں بہا رِخون جگر — چھڑائی جائے الٰہی کہیں حنا ان کی

(۱۶) نواب مرزا الماس شاگرد رشید لکھنوی ۔۔ ہر مہینے خود مشاعرہ کرتے تھے اور قریب قریب ہر ایک مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ شاعری کا نہایت شوق تھا۔ ایک مرتبہ پاؤں پکا ہوا تھا درد کی سخت تکلیف تھی۔ اسی حالت میں ڈولی پر سوار ہو کر مشاعرے میں شریک ہوئے۔ انتقال کو تخمیناً بارہ برس ہوئے۔

(یہ دو شعر پیش کیے گئے ہیں)

خدا کرے کہ میں اٹھ جاؤں پہلے دنیا سے — سنا ہے بزم سے عاشق اٹھائے جاتے ہیں
ہمارا حال بگڑتا ہے کوئی کہہ دے تلک — انھیں خبر نہیں گیسو بنائے جاتے ہیں

(۱۷) مولوی عبدالرحیم قلیم۔ تلمیذ منیر و لطافت۔ کہنہ مشق شاعر تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ ایک دیوان چھپ چکا تھا اور ایک غیر مطبوعہ تھا۔ فارسی کی استعداد اچھی تھی۔ مرزا بہادر مرزا محمد عباس کے مصاحبین میں داخل تھے۔ انتقال کیے ہوئے دو برس ہوئے۔ لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے بہت طرفدار تھے۔ ہر شخص سے نہایت خلوص سے ملتے تھے۔ شعر کا مزا خود بہت لیتے تھے۔ وضع دار تھے۔ نہایت پر گو تھے۔ سوا فکر شعر کے اور کوئی فکر نہ تھی۔

(تین شعر درج کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔)

ہچکیاں آتی ہیں کیوں کر نہ اسے یاد کروں
جو کرے میرا خیال، اس کا خیال اچھا ہے

(۱۸) میرزا ذاکر حسین یاس۔ شاگرد جلال۔ ان کے انتقال کو دس برس ہوئے۔ بہت کم سخن تھے۔ نواب مہدی علی خاں کی سرکار سے توسل رکھتے تھے۔ کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(نمونہ کلام کے چھ اشعار میں ایک یہ بھی ہے)

خبر نہیں ہمیں کچھ، کہتی ہے خدائی کیا؟
قیامت آگئی، اپنی طبیعت آئی کیا؟

(۱۹) مولوی عبدالاحد شمشاد فرنگی محلی لکھنوی تلمیذ رشید آفتاب الدولہ خلق شاہ عبدالعلیم آسی و حکیم جعفر حسین کاشف۔ نہایت پر گو تھے۔ تین دیوان آپ کے طبع ہو چکے ہیں۔ غازی پور میں مدرسہ چشمہ رحمت کے مینیجر تھے۔ علم فارسی و عربی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ گرمی کی تعطیل میں لکھنؤ آتے تھے اور زمانہ قیام لکھنؤ میں صبح سے شام تک ہمارے یہاں نشست رہتی تھی۔ نہایت وضع دار تھے۔ خوش پوشاک بھی تھے۔ احباب سے بہ خندہ پیشانی ملتے تھے۔

(نمونہ کلام میں چار شعر پیش کیے گئے ہیں۔ ایک شعر یہ ہے۔)

دھوکے میں جو بر آئے کہیں میری تمنا
ہو دست اثر، اور گریبان دعا کا

(۲۰) حکیم سید محمد مہدی کمال خلف میر ضامن علی جلال لکھنوی ۔۔ عمر ۷۵ سال ہے ۔۔ انتقال کو دس برس ہوئے۔ پہلے تو دوسری ریاستوں میں زمرۂ اطباء میں ملازم رہے۔ آخر میں ریاست رام پور سے تعلق ہو گیا تھا۔ لکھنؤ میں جب آتے تو ہم سے ضرور ملتے۔ نہایت خلیق اور منکسر مزاج تھے۔ اکثر اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ شعر اچھا کہتے تھے اور فن شعر سے واقف تھے۔

(پانچ اشعار میں دو شعر یہ بھی ہیں۔)

سادگی میں بناؤ کرتے ہیں — رنگ تصویر میں وہ بھرتے ہیں
تم سلامت رہو، یہ پھر کہنا — آپ میری بلا سے مرتے ہیں

(۲۱) مولوی سید محمد مصطفٰے صاحب، عرف مولوی لڈن صاحب خورشید ۔۔ دوست بے یار تھے۔ کنکوے کا بہت شوق تھا۔ انتخاب نام کا ایک رسالہ طرحی غزلوں کا نکالا تھا۔ مشاعرے بہت کیے اور بہت سے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ انتقال کو تیس برس ہوئے۔ آپ کی ایک کتاب افادات علم عروض میں طبع ہو چکی ہے

(چار شعر درج ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔)

پھر وہ ٹھکراتے ہیں، قبرِ عاشقِ بیتاب کو
آئے ہیں سوتے ہوئے فتنے جگانے کے لیے

(۲۲) مرزا محمد علی آرام لکھنوی — عمر تخمیناً پچاس سال — ان کے انتقال کو دس برس ہوئے۔ محلہ وزیر گنج میں رہتے تھے اور ریاست نانپارہ میں ملازم تھے۔ گندمی رنگ۔ چیچک رو۔ نیک مزاج تھے۔ تخمیناً آٹھ برس ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

(صرف دو شعر درج کیے گئے ہیں مطلع یہ ہے۔)

ہے بے پناہ تیر تری چشم ناز کا
تعلیم یافتہ اثر دل گداز کا ؟

(۲۳) نواب سید بنیاد حسین خاں صاحب جاہ لکھنوی۔ عمر تخمیناً پچاس سال۔ تلمیذ امیر مینائی ساکن ڈیوڑھی آغا میر۔ ان کے انتقال کو آٹھ برس ہوئے۔ آپ کا دیوان چھپ چکا ہے۔ سہ پہر کو آپ کے دولت کدہ پر شعرا کا مجمع ہوتا تھا۔ اکثر نواب شیش محل بھی آتے تھے۔

(۲۴) مرزا محمد وصی علی خاں منظر لکھنوی — ساکن محلہ تحسین گنج۔ تلمیذ منیر شکوہ آبادی۔ نہایت خوش گو شاعر تھے۔ ہمیشہ افکار میں مبتلا رہے۔ آخر عمر میں بزمرہ شعرا ملازم ہو گئے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور تخمیناً بہتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ طبیعت نہایت مذاق پسند تھی۔ تھوڑا زمانہ ہوا کہ انتقال فرمایا۔

(نمونہ کلام کے طور پر آٹھ شعر پیش کیے گئے ہیں۔ چند یہ ہیں۔)

جنھیں پردہ تھا صورت آفریں سے
لپیٹے منھ وہ آتے ہیں کہیں سے

سنبھل کر دل تراش لے کاہش غم
وفا کا نام ہو گا اس نگیں سے

سونگھ کر اس کو مری قبر کے مرجھائے پھول
رنگ باقی نہیں پر بوئے وفا دیتے ہیں

اور چندے بہار ہے داغ
توبہ کرنے کے دن بھی آتے ہیں

اشک کہتا ہے رکا میں تو قیامت آئی
وہ یہ کہتے ہیں ہوا حشر جو آنسو نکلا

(۲۵) سید مصطفےٰ میرزا عرف پیارے صاحب رشید لکھنوی — ساکن محلہ رکاب گنج، وال کی منڈی۔ مرثیہ گو شاعر تھے۔ غزل بھی اچھی کہتے تھے اور خوش گو شاعر تھے۔ ابتدا میں مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ آخر عمر میں غزل گوئی ترک کر دی تھی۔ مشاعرے میں جانا موقوف کر دیا تھا۔ ترک مشاعرے کی کیفیت ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ نواب سید اصغر حسین صاحب کے یہاں نہایت نفیس اور پاکیزہ صحبت شاعرے کی ہوتی تھی۔ شاعرے کی کوٹھی دلہن بنی ہوتی تھی۔ قد آدم آئینے لگے ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے اساتذۂ سخن سب جمع ہوتے تھے۔ مولوی علی میاں صاحب کامل، مولوی للن صاحب خورشید، سید بندہ کاظم جاوید، سید عباس حسن فصاحت وغیرہ — بات یہ تھی کہ نواب صاحب کا اخلاق سب کو کشاں کشاں محلہ نرہی تک لے جاتا تھا اور مراسم بھی کچھ ایسے تھے کہ کوئی شاعر ان سے علاحدہ نہ کرتا تھا۔ اوّل تو نواب خود خاندان اجتہاد سے تھے دوسرے رئیس سیر چشم۔ تیسرے ارتباط اور خلوص۔
اس مشاعرے میں جناب رشید بھی جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ شریک مشاعرہ تھے کہ ایک نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ تشریف لائے اور جناب رشید کے قریب بیٹھے۔ آتے ہی سب سے پہلے آپ نے ٹوپی اتار کر آگے رکھ دی اور آپ پشت بہ پہلو ہو کر کسی قدر صف سے آگے بڑھے ہوئے بیٹھے۔ یہ امر جناب رشید کی تہذیب کے خلاف ہوا۔ تو عاً و کرہاً مشاعرے میں بیٹھے رہے — اور اس کے بعد سے کسی مشاعرے میں شریک نہ ہوئے۔ لوگوں نے سبب پوچھا آپ نے کہا آج کل کے زمانے میں تہذیب مشاعرہ قائم نہیں رہی غرض مشاعرے سے یہ ہوتی ہے کہ شعرا کی تہذیب۔ ان کا ادب ان کا حفظ مراتب لوگوں کو آئے — اور اسی سے لوگ مشاعرے میں۔

آئے ہیں۔ اس انگریزی زمانے نے ان سب کو مٹانا شروع کر دیا ہے جو لوگ مشاعرے میں اپنی ٹوپی اتار کر بیٹھتے ہیں ان کو دوسرے کی ٹوپی کی کیا عزت ہو سکتی ہے۔ جب مشاعرے کی غرض باقی نہ رہی تو اس میں شریک ہونا بیکار ہے۔

ہم نے جناب رشید کو آخر میں دیکھا اور بارہا ان کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ کی تہذیب بہت اچھی تھی اور سب سے زیادہ قابلِ تعریف ان کی قناعت تھی — ان کے انتقال کو آٹھ برس ہوئے۔

(۲۶) حمید — سید باقر صاحب لکھنوی برادر رشید مرحوم۔ نہایت خلیق باوضع تھے سلیم المذاق شاعر تھے۔ اکثر مشاعروں میں تشریف لاتے تھے۔ تخمیناً چھ برس ہوئے انتقال فرمایا۔

(چار شعر منتخب کیے گئے ہیں جن میں سے تین شعر یہ ہیں۔)

پوچھنا چھوڑ دیا راہ گلی میں بھی مرے ۔۔۔ جان کر دوستوں نے مورد آفات مجھے

کسی موسم میں نہیں ہوتا ہے ارمانوں ۔۔۔ آپ کے ہجر میں ہر فصل ہے برسات مجھے

لبِ ساغر پہ نہ بھولے سے ہنسی آئے گی ۔۔۔ رو دیں گے بعد مرے اہلِ خرابات مجھے

(۲۷) حکیم حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنوی — نہایت خلیق ملنسار بہت متواضع تھے اور جب کبھی ملاقات ہوتی تھی نہایت خلوص سے پیش آتے تھے۔ ایک مرتبہ چوک سے تانگہ پر کہیں جا رہے تھے۔ مجھے دیکھا اور سلام علیک کے بعد تانگہ رکوا کر مصافحہ کیا۔ معانقہ کیا اور شکایت کی کہ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی کبھی کبھی تو آیا کرو۔ یہ عجیب بات تھی کہ سلام میں ہمیشہ انھیں کو سبقت رہتی تھی ہم کو ہمیشہ یہ حسرت رہی کہ ایک دفعہ تو پہلے ہم ان کو سلام کر لیتے۔ ہمیشہ انکسار کے بعد اپنا کلام سناتے تھے۔ انتقال کو چھ سات برس ہوئے۔

(نمونہ کلام کے چاروں شعر نقل کیے جاتے ہیں۔)

جو چیز ہوئی خلق نہیں عیب سے خالی ۔۔۔ کیا داغ جگر میں مرکامل نہیں رکھتا

ملتا ہے نہ قلزمِ رحمت سے یہ جاکر ۔۔۔ اشکوں کا وہ دریا ہے کہ ساحل نہیں رکھتا

خاک سے میری چمن کو رنگ یہ حاصل ہوا ۔۔۔ غنچے چٹکے بھی نہ تھے بوئے وفا دینے لگے

تم سلامت رہو اٹھی مری کس دھوم سے لاش

گر نہ آتے تو یہ رونق نہ یہ ساماں ہوتا



آرزو لکھنوی کی اصلاحیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

اور کورے گملوں میں لگائی جاتی ہے اور ذیل کا گیت گائی جاتی ہے۔

گیت

اس کومل رنگ کے واری، کیا سندر ڈاری ڈاری

دھرم تمھیں دے دھرتی ماتا برکھا دودھ پلائے

جھومتی آئے پون مت واری تھپک تھپک کے سلائے

میں سیوا کروں تمھاری۔

روپ کی رانی پھولوں کی ماتا جگہ نہیں یہ تمھاری

جیسے دلدر ٹاٹ پہ بیٹھے کوئی راج کماری

میں پوتر جل سے دھوؤں۔

کورے گملوں میں بوؤں۔

ہیر پھیر سے ان گملوں کے بنے نئی پھلواری، ہر جا بنے نئی پھلواری

اس کومل رنگ کے واری۔ کیا سندر ڈاری ڈاری۔

یہاں دو شارٹ ایسے آئیں گے کہ گملے مختلف ترتیبوں سے رکھے نظر آئینگے۔



ندائے سالِ نو

جاوید حیدرآبادی

آج ہے سارے زمانے پہ حکومت میری
یعنی مختار ہوں، مالک ہوں، سکندر میں ہوں
اب مرے ہاتھ میں تقدیرِ جہاں بانی ہے
بختِ امروز ہوں، فردا کا مقدّر میں ہوں

مردِ میداں کے لیے کارگہِ ہستی ہے
قوتِ عزم و عمل، قوتِ دست و بازو
وقت رہتا ہے زمانے میں اسی کا بندہ
وقت پر دستِ عزائم سے جو پالے قابو

شکوۂ آبلہ پائی ہے جہاں میں بے سود
چل پڑو، راہ میں خود پھوٹ پڑیں گے چھالے
فتح مشکل پہ جو پاتے ہیں لیے عزمِ صمیم
وہی کہلاتے ہیں دُنیا میں مقدّر والے

نیا سال مبارک (رباعیات)

محبوب "جام"

(۱)
وہ دیکھو، گئے سال کا سورج ڈوبا
وہ دیکھو، نئے سال کا سورج اُبھرا
حالات نے ماحول کا عالم اے جام!
خوش ہو کے نئی صبح کے بدلے، بدلا

(۲)
خوش ہو گے نئے سال کو دستک دینا
پھر نیّرِ اقبال کو دستک دینا
خاموش فضا گونج رہی ہے، دیکھو!
احساسِ خرد فال کو دستک دینا

(۳)
آیا ہے نیا سال، ترانے گاؤ
ہنس ہنس کے مسرّت بھرے نغمے چھیڑو
ہر صبح نئی، شام نئی ہے، اے جام!
پلٹے نہ کبھی، سالِ گزشتہ سے کہو

(افسانہ)

دو کا نوٹ

امتہ الہی جبیں

انعامی بانڈ میں معتد بہ رقم ملنے پر میرا اچھا ہوا ادبی ذوق عود کر آیا اور میں نے ایک بار پھر ایک ادبی ماہنامہ کے اجراء کا مصمم عزم کر لیا۔ اس سلسلے میں مجھے دیگر حضرات کے علاوہ شہلا صاحبہ سے خصوصاً ملنا تھا جو اس دور کی مشہور اہلِ قلم تھیں اگرچہ انھوں نے کچھ عرصے سے ادبی تخلیقات سے منھ موڑ رکھا تھا۔

اپنے دیرینہ دوستوں پر بلاوجہ بارِ خاطر نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے میں نے ایک شاہراہ پر واقع مشہور ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور قیام پذیر ہو گیا۔ تکانِ سفر دور کرنے کے بعد میں تیار ہو کر اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ احباب اور دوستوں کی پرانی یادوں اور کرم فرمائیوں سے مجبور ہو کر میرے قدم خود بخود فرینڈز کلب کی طرف اٹھتے گئے، جہاں کی نشست و برخاست اور ادبی صحبتیں دل پر ہنوز نقش تھیں۔ اتفاقاً میری ملاقات ایک پرانے شناسا بابر نواب سے ہو گئی جو پنشن یافتہ ہو کر میجر بابر کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ بابر نواب کلب کے برابر ہی ایک بار کے سامنے برآمدے میں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کسی کے منتظر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑھ کر انھوں نے اس گرم جوشی کے ساتھ جھٹکے دار ملٹری برانڈ مصافحہ کیا کہ ایسا محسوس ہوا گویا میرا شانہ دھڑ سے علیٰحدہ ہو جائے گا۔ اس جناتی مصافحے اور ایک عدد شجیشی قہقہے کے بعد انھوں نے مجھے بار کے ایک خالی کیبن میں تقریباً گھسیٹ کر بٹھا دیا اور انتہائی بے تکلفی سے سوالیہ نشان بن کر گویا ہوئے:

"آپ کیا لیں گے؟"

"آپ کی دعائیں —" بے ساختہ میں نے جواب دیا۔

"خیر، وہ تو ہر لمحہ حاضر ہیں — اس وقت میرا مطلب ڈرنک سے ہے۔"

"جی، مجھے تو معاف رکھیئے۔"

"کیوں۔ کیوں —!!"

"مجھے حکیم نے منع کیا ہے۔"

"کون، حکیم ناطق نے —!"

"جی ہاں، ناطقِ حقیقی نے — میں کولڈ ڈرنک پر اکتفا کروں گا۔ آپ کا جو جی چاہے بصد شوق نوش جان فرمائیں۔"

اس ردوکد کے بعد انھوں نے بیرے کو بلا کر میرے لیے لیمن اسکواش اور اپنے لیے ایک 'بڑا وہسکی' کا آرڈر دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب اُن کی زبانی فرینڈز کلب کے ٹوٹنے اور احباب کے منتشر ہونے کا حال معلوم ہوا تو مجھے بے حد رنج پہنچا۔ اب یارانِ طریقت سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں نے دل میں سوچا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کلب والی عمارت میں ایک معقول ہوٹل کھل گیا ہے۔ بہر حال میجر بابر سے کسی نہ کسی طرح گلو خلاصی کر کے میں اپنے کام کی جانب متوجہ ہوا۔ بار سے باہر نکل کر سواری کے لیے نظر پر دوڑائی۔ اڈے پر ویسے تو رکشا، آٹو رکشا اور تانگے سبھی موجود تھے مگر میری نگاہیں ایک گراں ڈیل تنومند فوجی جسم کے تانگے والے پر جم کر رہ گئیں جو خاکی رنگ کا ایک کھردرا سا اور لانبا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کوٹ میں یوں تو کئی کاج تھے مگر صرف دو میں پیتل کے دو بڑے فوجی بٹن نمایاں تھے جو ایک گلے کے پاس والے کاج کو اور دوسرا دامن سے ملے ہوئے نچلے کاج کو روکے ہوئے تھا۔ کوٹ کے وسطی حصے کے کاج خالی کھیسیں نکالے بٹن سے بے نیاز تھے۔ سر پر چھوٹے چھوٹے ڈھیلے گھونگر والے چیل کے گھونسلے جیسے بال اور موٹے ہونٹ سے وہ شدید النفس کسی شریف گھرانے کا تربیت یافتہ معلوم ہو رہا تھا۔

میرا قیاس صحیح نکلا جوں ہی مجھ سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں وہ تانگے پر بیٹھنے والی جگہ سے کود کر ڈامر کی سڑک پر آ گیا اور خندہ پیشانی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا، "آیئے حضور! شہر بھر میں کہیں تشریف لے چلیں مزدوری صرف ایک روپیہ!" جملہ ختم کرتے ہوئے کاندھے پر پڑی ہوئی چھاگل سے سیٹ صاف کر کے اور اسے تھپیلی سے تھپتھپا کر دوبارہ بولا۔

"آئیے تشریف لائیے سرکار!"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے قلبی واردات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ میں اس کی شائستہ طرزِ گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور جلدی سے پشت کی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے کہا "اشرف آباد۔" اور تانگہ چل پڑا۔

اشرف آباد پہنچ کر میں نے ایک روپیہ اُسے دیتے ہوئے تانگہ سے اترنا چاہا تو اس نے عذر کرتے ہوئے کہا:

"سرکار گنج سے اشرف آباد کا فاصلہ خاصا دور ہے ..... حضور خود ہی سمجھ لیں۔"

"دیکھو بھئی! کرایہ تو تم ہی نے طے کر دیا تھا۔ اب یہاں پہنچ کر جھک جھک کیسی؟"

"اس سے تو مجھے انکار نہیں سرکار۔"

"پھر کیا تم مجھے یہاں اجنبی سمجھتے ہو۔ میں نے لکھنؤ کی گلیوں میں اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا ہے۔ پاس کے محلہ نولستہ میں عرصہ تک رہا ہوں۔ مگر تم جیسے مجھے نووارد سمجھ کر بے وقوف بنانا چاہتے ہو!" میں نے ذرا لہجہ بدل کر کہا۔

"میری کیا مجال!" وہ بڑے عجز و انکسار پر اتر آیا۔ "سرکار، نواب صاحب، مجھ سے گستاخی ہوئی ہو تو میں دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل اب نا وقت ہو گیا گھوڑا بھی تھک چلا۔ اس گرانی میں لوگ کفایت شعاری پر اتر آئے ہیں۔ زیادہ تر لوگ بسوں پر سفر کر لیتے ہیں۔ صاحبِ ثروت کی یا تو اپنی سواریاں ہیں یا پھر وہ ٹیکسیوں اور موٹر رکشوں سے کام چلاتے ہیں۔ پھر سائیکل رکشے کیا کچھ کم ہیں۔ مرن تو حضور ہم جیسے تانگے والوں کی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کیا شئے تھے وہ اس دو رخ کی نذر ہو گئے۔" اس نے تانگے کی کوٹ کے اوپر سے دو رخ تھپتھپایا۔ "اب اس وقت آپ دو روپے عنایت فرما دیں تو بس مسئلہ حل ہو جائے۔"

اتنا کہہ کر وہ میری جانب حاجت مند نظروں سے دیکھنے لگا۔

دو روپے کا ایک نوٹ جو دستی بیگ سے بڑی صفائی سے ایک مہین کاغذ سے چپٹا ہوا تھا جیسے پرس [illegible] سے رکھا تھا تانگے والا کو ... پہلے سے اگرچہ طبیعت مکدر ہو چکی تھی پھر بھی اس کی لجاجت آمیز گفتگو نے مجھے اس کی حاجت پوری کر دینے پر آمادہ کر ہی لیا۔ معاً طالب علمی کے زمانے میں پڑھے ہوئے گریشم لا ــــ اقتصادی رد و بدل ــــ کا خیال دماغ میں آیا جس میں نفسیاتی طور پر پہلے خراب سکہ چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے تجربے کے طور پر وہی نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھا اور آگے بڑھ گیا۔

شہلا کے مکان تک پہنچنے میں ذرا تاخیر ہو گئی کیوں کہ راستے میں میرے ایک کرم فرما جو میرے کلاس فیلو بھی رہ چکے تھے مل گئے۔ ان کے ہمراہ میں قریب کے صاف ستھرے ہوٹل میں چلا گیا۔ آئس کریم کا آرڈر دے کر ہم لوگ گھل مل باتیں کرنے لگے۔ حضرت نے شادی فرمائی تھی اور تین عدد بچوں کے والد بزرگوار بن بیٹھے تھے۔ اسپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ میں اچھی اسامی پر کام کر رہے ہیں۔ دوران گفتگو میں خاندانی منصوبہ بندی کا بھی ذکر آیا۔ خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے اس کی ضرورت کو تسلیم اور جدید طریقوں سے فائدہ اٹھا کر اولاد کی تعداد میں مزید اضافہ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ ہوٹل سے نکل کر میں اپنے دوست سے رخصت ہوا اور شہلا صاحبہ کے مکان کی طرف چل پڑا۔ مکان جس جگہ واقع تھا وہ میری جانی پہچانی تھی۔ اس لیے میرے قدم خود بخود ادھر اٹھتے چلے گئے۔ اطلاع ہوتے ہی انھوں نے مجھے اندر اسی کمرے میں جہاں وہ فروکش تھیں بلوا لیا۔ سرو قد میرا خیر مقدم کرتے ہوئے مزاج پرسی کی اور بیٹھنے کے لیے اشارہ کرتے ہوئے خود بھی گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

شہلا بید مجنوں کی طرح دھان پان سی ایک نازک اندام خاتون تھیں۔ ان کے والد نوابین اودھ میں شمار کیے جاتے تھے۔ انتقال کے وقت وہ اتنی جائداد شہلا کے لیے چھوڑ گئے تھے کہ شریفانہ انداز سے بلا تردد اور فکر معاش سے بے نیاز ہو کر وہ زندگی گزار سکیں۔ وہ اعلیٰ ستھرے ادبی ذوق اور دلکش طرز نگارش کی مالک تھیں۔ ان کی ادبی اور شعری تخلیقات نے کچھ ہی عرصے پہلے ادبی دنیا میں ہل چل مچا دی تھی۔ ملک میں شائع ہونے والے معیاری جرائد ان کی نگارشات کو دیدہ زیب عنوانات سے شائع کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ البتہ ادھر کچھ عرصے سے انھوں نے لکھنا پڑھنا موقوف کر رکھا تھا۔ مزاج پرسی کے بعد میں نے اظہار مدعا کے لیے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:

"ادھر تو آپ نے جیسے ادبی دنیا سے تقریباً استعفا سا دے

رکھا ہے۔"

"جی ہاں۔ کیا عرض کروں شہاب صاحب! اوّل تو اب صحت اجازت نہیں دیتی پھر یہ کہ ......" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں کیا شک۔ پچھلے پانچ برسوں میں صحت میں جو تغیّر ہوا ہے وہ دیکھ ہی رہا ہوں۔"

وہ پھر کہنے لگیں: "جی ہاں۔ کن دماغی الجھنوں میں عرصے سے مبتلا ہوں اسے عرض نہیں کر سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ ذہنی سکون نہیں ہوتا تو نہ کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے نہ دماغ ہی کام کرتا ہے۔ جیسے تخلیقی قوت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ میں عرصے سے بڑے کرب و اضطراب کے دور سے گزر رہی ہوں۔"

"مگر خادم تو بڑی آرزو لے کر حاضر ہوا تھا!...."

"فرمائیے۔ فرمائیے، کوئی خدمت۔"

"ابھی پچھلے ہی ہفتے ہوا ہے۔ کچھ روپیہ انعامی بانڈوں کے ذریعے مل گیا۔ سوچا اپنا پرانا مشغلہ پھر شروع کروں۔ ایک معیاری رسالے کا اجرا مقصود ہے۔ اس لیے اپنے دیرینہ کرم فرماؤں اور قلم کاروں کے پاس آیا ہوں کہ ان سے لکھنے کی گزارش کروں۔ ان قلم کاروں میں آپ کا نام سرِفہرست ہے۔"

"اس مرتبہ آپ کے جریدے میں کس قسم کا ادب جگہ پائے گا؟"

"میری خواہش ہے کہ ادباء و شعراء اپنی نگارشات میں نئی طرز فکر و شعور اجاگر کریں تاکہ ترقی پذیر سیکولر ملک نا وابستگی کے ساتھ خود کفیل ہو کر صنعتی اعتبار سے آگے بڑھتا جائے۔"

"مگر شہاب صاحب! فن کار ہو یا قلم کار، اگر وہ ذہنی اضطراب خصوصاً اقتصادی بحران سے دوچار ہو تو کیا اس سے تعمیری ادب کی تخلیق کی توقع کی جا سکتی ہے؟"

"نہیں۔ مگر میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ اب تک تو میں آپ کی صحت ہی کی جانب سے فکرمند تھا۔ یہ آپ نے ....."

"خیر! چھوڑیے اسے ۔۔ آپ نا امید نہ ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "باوجود اس کے کہ میں بہت ناسازگار حالات سے دوچار ہوں پھر بھی آپ کے لیے جلد ہی کچھ نہ کچھ حاضر کروں گی ۔۔۔ آپ کے حکم سے سرتابی غیر ممکن ہے۔" پھر انھوں نے کھل کر ہنسنے کی

کوشش کی۔ مجھے ایسا لگا جیسے سبز رگوں کے درمیان ابھری ہوئی سیاہی مائل حلقہ نما گول آنکھوں کے ڈیلے روح اجزائے ترتیب سے پھڑپھڑا کر باہر نکل جانا چاہتی ہے۔ گھبراہٹ میں میری زبان سے نکلا: "حکم نہیں گزارش اور استدعا کہیے۔"

جیسے اچانک انھیں کچھ خیال آ گیا ہو اور انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر آواز دی:

"قطبن ۔۔! او قطبن ۔۔!"

پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"برا ہو نسیان کا۔ دیکھیے آپ اتنی دیر سے تشریف لائے ہیں اور میں نے آپ کے لیے چائے بھی نہ منگوائی!"

اس اثنا میں ایک بچی جو سیدی النسل معلوم ہوتی تھی آ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ بولیں۔

"نیچے جا کر آغا صاحب کے ہوٹل سے ایک ٹرے میں چائے اور کچھ عمدہ بسکٹ فوراً لانے کو کہہ آ، میری بچی۔ قیمت ادا کرتی آنا۔" اور یہ کہہ کر انھوں نے اسے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر دیا۔ نوٹ پر میری نظریں پھسلتی ہوئی پڑیں۔ مجھے شبہ ہوا جیسے یہ وہی نوٹ تھا جو میں نے کچھ دیر پہلے تانگے والے کو دیا تھا۔ مگر میرے لیے یہ ایک لاینحل عقدہ تھا کہ اتنی سرعت سے وہ یہاں کیونکر پہنچ گیا۔

بیگم شہلا نے کھڑے ہو کر الماری سے مرادآبادی کٹورہ اٹھایا جیجر کی تپائی کی طرف گئیں۔ پانی انڈیل کر کٹورہ منہ سے لگایا۔ ابھی مشکل سے دو ایک گھونٹ پیا ہو گا کہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ کٹورہ فرش پر رکھ کر سینے پر دوسرا ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ قطبن چائے کا آرڈر دے کر آ چکی تھی۔ اس نے جو یہ کیفیت دیکھی تو بوکھلا سی گئی۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولی: "بیگم صاحبہ پر غشی طاری ہو گئی۔"

میں نے اس کی مدد سے بیگم شہلا کو اٹھا کر آرام سے لٹا دیا۔ وہ آنکھیں موندے پنکھیا جھلنے لگی۔ اس کے ہاتھ سے پنکھیا لے کر [illegible]

"بچی قطبن تم [illegible] صاحب سے [illegible]

اور لپک کر کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ!!"

وہ باہر تقریباً دوڑتی ہوئی گئی۔ ذرا دیر میں ڈاکٹر صاحب مع اپنے

ہینڈ بیگ کے آتے ہی پہلے بیگم شہلا کی نبض پھر اسٹیتھسکوپ لگا کر دل کی رفتار دیکھی۔ اس کے بعد یوڈی کولون کی شیشی نکال کر قطبن سے پانی منگوایا۔ گاز کی پٹیاں بنا کر اس میں ڈبوئیں۔ ایک پرچہ لکھ کر قطبن کو دیتے ہوئے بولے "یہ پرچہ کمپاؤنڈر صاحب کو دے دینا۔ وہ جو سامان تمھیں دیں لے کر فوراً آ جاؤ"۔ اور ماتھے پر پٹیاں رکھتے بدلتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"جناب کا اسم گرامی؟"

"خاکسار کو شہاب کہتے ہیں۔ اب دلّی میں رہتا ہوں۔ ایک معیاری رسالہ کا اجراء مقصود ہے۔ اس سے قبل ایک شاہکار ماہنامہ تقریباً دس سال ایڈیٹ کر چکا ہوں۔ شہلا صاحبہ میرے قلم کاروں میں سے صف اوّل کی ایک ہیں۔ مجھ سے کسی قسم کا تکلف برتے بغیر ہمیشہ اپنے فطری اخلاق اور قدیم خاندانی وضع داری سے پیش آتی رہی ہیں۔ میری یہ آمد اپنے دیرینہ قلمی معاونین سے مل کر ان کی نگارشات حاصل کرنے کے سلسلے میں ہے۔ اسی لیے آپ مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں —" میری گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ انھیں کچھ ہوش آیا اور انھوں نے پانی مانگا۔ دو ہی چار گھونٹ حلق سے اترے ہی ہوں گے کہ کلیجہ اور سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اس کے بعد ان پر پھر غشی طاری ہو گئی۔"

"میرا نام شفیق ہے تقریباً پانچ سال سے میں ان کا معالج ہوں اس لیے ان کی جسمانی حالت اور مزاجی کیفیت سے کما حقہٗ آگاہ ہو چکا ہوں۔"

"یہ تو فرمایئے کہ کوئی خطرہ ....."

"خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ دراصل انھیں کوئی مرض نہیں ہے۔ یہ کیفیت ذہنی الجھن، کوفت نیز "انڈر فیڈ" اور "انڈر نورشڈ" رہنے — میرا مطلب [illegible] قوت بخش غذائیں نہ ملنے کی وجہ سے عام نقاہت اور کمزوری [illegible] ہے۔ دوسرے [illegible] آنتوں کو غذا نہیں پہنچی، جارج کو [illegible] خاندانی وضع برقرار رہے چاہے [illegible] کسی سے نہ اپنا دکھ درد کہتی ہیں نہ کسی سے امداد کی طالب ہوتی ہیں، بجز رشیدی انوار کے۔ یہ اس کی دودھ شریک بہن ہیں۔ ان کے والد نواب وقار الدولہ نے بچپن سے رشیدی انوار کو پالا تھا۔ انھیں کی ڈیوڑھی کا نمک خوار، صرف اس کی مددگار رہا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے تانگہ چلانے والے کی بساط ہی کیا؟"

قطبن گلوکوز کا ایک ڈبّہ اور تھرمس میں گرم دودھ لیے ہوئے آ گئی اور دوا کی بجائے ڈاکٹر نے گلوکوز دودھ میں شامل کر کے بیگم شہلا کو پلایا اور فوراً ہی انھیں افاقہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد بیگم شہلا کچھ دیر آہستہ آہستہ مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ بالآخر میں نے آرام کا مشورہ دیتے ہوئے رخصت چاہی۔ اس عرصے میں میں نے اپنے پرس سے دو سو روپے نکال کر مٹھی میں لے رکھے تھے۔ موقع پا کر وہ انھیں پیش کرتے ہوئے میں نے کہا:

"فی الحال یہ حقیر ہدیہ قبول فرمالیجیے۔ میں اسی غرض سے کافی روپے لے کر چلا ہوں کہ اپنے پرانے لکھنے والوں کو پہلی بار پیشگی معاوضہ حاضر کر دوں تاکہ قبل از وقت مجھے ان کی تخلیقات موصول ہو جائیں اور میرا جو جریدہ اب سے ڈیڑھ ماہ بعد شائع ہونے جا رہا ہے اس کے لیے مواد فراہم ہو جائے — آپ اسے قبول فرمالیں!"

بڑے اصرار اور ردّ و کد کے بعد انھوں نے پیشگی معاوضے کی رقم قبول کر لی۔ قطبن نے سرگوشی میں ان سے کچھ کہا اور اپنی چھوٹی سی مٹھی میں دبا ہوا وہی دو کا نوٹ واپس کیا جسے اب میں بلاشبہ پہچان چکا تھا۔

بیگم شہلا سے رخصت ہو کر میں نولستہ میں اپنے بے تکلف دوستوں سے، جن میں ایک امن بھی تھے، ملتا، آنجہانی رتن ناتھ سرشار کے والد اور آسیر لکھنوی سے نیاز حاصل کرتا، کوچہ میرانیس سے گزرتا، آتش و ناسخ کی قبروں پر فاتحہ پڑھتا اور دریا کے کوتی والی سڑک سے چھتر منزل ہوتا ہوا حضرت گنج پہنچا۔ میں صرف گنج اس لیے آیا تھا کہ ممکن ہے یہاں کافی ہاؤس میں کچھ اور پرانے دوستوں اور کچھ نئے لکھنے والوں سے ملاقات ہو جائے۔ مگر جب مرحوم فرینڈز کلب کے سامنے پہنچا تو وہاں جانے اور پرانی یادیں تازہ کرنے کی زبردست خواہش نے سر اٹھایا۔ آٹو رکشا کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے رکشا کو اس سے پوٹل تک واپس لانے کی ہدایت کی اور خیالات کی دنیا میں گم ہو گیا۔ رکشا ہوٹل کے سامنے رکا تو جونک کر میں اتر پڑا اور کرایہ ادا کر کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی منیجر باہر ٹیبل ٹینس کے کھیل میں مشغول نظر آئے۔ میں [illegible]

اُلٹے پیروں واپس ہونا ہی چاہتا تھا کہ میجر صاحب نے جنھیں شاید میرے آنے کی آہٹ مل گئی تھی، پلٹ کر دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ہیں سے دھاڑے۔ "اخاہ! آیئے آیئے، شہاب صاحب"! اس جناتی استقبال پر میری جو حالت ہوئی اُس پر ابھی میں نے قابو بھی نہیں پایا تھا کہ وہ عقاب کی طرح جھپٹے اور مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ہوٹل سے باہر لائے اور بار کا رُخ کیا۔ ایک خالی کیبن میں ہم لوگوں کے بیٹھتے ہی ویٹر آ گیا۔ بابر نواب نے جیب سے دو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک ہاف رم اور میرے لیے ایک لو اُدکا آرڈر دیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہ وہی دو کا نوٹ ہے جو شیدی انوا سے بیگم شہلا پھر قطبن پھر بیگم شہلا کے پاس ہوتا ہوا اب میجر بابر کی اُنگلیوں میں پھنسا ہوا تھا ـــــ میرے اللہ! آخر یہ کیا جادو تھا!! اب یہ طلسمی نوٹ بڑا پُراسرار ہوتا جا رہا تھا!!!

جب تک بیرا آرڈر لاتا میں ہاتھ منہ دھونے کے بہانے سے اُٹھ کر واش بیسن کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک پُرانا بیرا جو مجھے ایک بڑے ہوٹل میں ملازمت کے دوران سے جانتا تھا اور اب کچھ دنوں سے وہاں کی ملازمت چھوڑ کر اس بار میں آ گیا تھا، مل گیا۔ اُس نے نہایت انکساری کے ساتھ سلام کر کے میجر بابر کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ "سرکار! میجر صاحب کو....." میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "ہاں بھئی! جانتا تو میں اُنھیں بہت دنوں سے ہوں لیکن میں نے کبھی اُن سے بے تکلفی بڑھانے کی نہ کوشش کی نہ انھیں کبھی اپنے سے قریب تر ہونے دیا ـــ مگر یہ حضرت ہیں کہ یہاں مل گئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کی بے تکلفی ہے۔ کل اتفاقاً ملاقات ہو گئی، بس مصیبت بن گئے ہیں۔"

"جی ہاں سرکار! کیا کہا جائے ہوٹل کے لیے بھی ایک مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ یوں تو جیب روپیہ ان کے پاس بہت رہتا ہے، خوب فیاضی سے خرچ کرتے ہیں۔ نقد دیتے ہیں۔ پھر قرض پر اُتر آتے ہیں۔ قرض نہ ملے تو زبردستی کرتے ہیں۔ کبھی دکسی بہانے ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ ہوٹل کا مالک اور ہم سب اِن سے سخت بیزار ہیں۔ مگر کیا کریں ہوٹل کی ساکھ بھی بگڑنے نہیں دینا چاہتے۔ اس لیے بہر حال انھیں گوارا کرنا پڑتا ہے۔ میجر کچھ رُک کر کہنے لگا "سرکار! آج تو میجر صاحب کی جیب میں دس دس کے بہت سے نوٹ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آج فلش میں کہیں لمبا ہاتھ مارا ہے۔"

یہ سنتے ہی میرا خیال معاوضے کے روپوں کی طرف منتقل ہوا اور ذہن کڑی سے کڑی جوڑنے لگا۔ ساتھ ہی دل میں میجر بابر کی طرف سے جذبۂ نفرت اُبھرا۔ میں نے بیرا سے کہا۔ "تمھارے ہوٹل سے باہر جانے کے لیے دصلی دروازے کے علاوہ کوئی اور راستہ ہے؟"

"جی ہاں ہے! کیوں؟"

"میں اپنے ہوٹل واپس جانا چاہتا ہوں اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ میجر مجھے جاتے ہوئے دیکھے۔"

"آیئے میرے ساتھ" کہتا ہوا وہ مجھے عقبی دروازے سے نکال کر ایک گلی میں ہوتا ہوا دوسری سڑک پر لایا اور ایک آٹو رکشا بلا دی میں اس میں بیٹھ کر اپنی قیام گاہ واپس آ گیا اور کھانا کھا کر تھوڑی دیر بعد سو گیا۔

صبح ذرا جلدی آنکھ کھُل گئی۔ آج مجھے ان بقیہ احباب و قلم کاروں سے ملنا ضروری تھا جو ملاقات کے لیے میری ڈائری میں درج تھے اور جن سے میں ابھی تک نہ مل سکا تھا۔ پہلے میں حضرت گنج کے علاقے میں مقیم اُن حضرات سے مل کر گومتی اُس پار جانا چاہتا تھا۔ ابھی سویرا تھا اس لیے میں نے سوچا چاہے پی کر کچھ دور ٹہلتا ہوا چلوں۔ ہوا خوری بھی ہو جائے گی۔ اس لیے میں ہوٹل سے پیدل ہی چل کھڑا ہوا۔ ابھی بمشکل جمخانہ کلب پہنچا تھا کہ دیکھا اس سے ملحقہ سبز قطعے پر ایک جگہ خاصے لوگ اکٹھا ہیں۔ دو پولیس والے بھی موجود ہیں۔ میں بھی اُدھر متوجہ ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میجر بابر کی لاش اکڑی ہوئی پڑی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رات کے کسی حصے میں اچکّوں نے ان کو ٹھکانے لگایا اور قتل و خون کر کے رفو چکر ہو گئے۔ میجر بابر کو اس حالت میں دیکھ کر میں سکتے میں آ گیا۔ کچھ دیر ہکّا بکّا اُن کی لاش اور اُس جگہ کو جہاں یہ قتل ہوا تھا دیکھتا رہا۔ مجمع میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر میں مجمع سے باہر آیا اور تیز تیز قدم رکھتا ہوا حضرت گنج کی طرف چلنے لگا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات دماغ میں آتے رہے۔ اسی اُدھیڑ بُن میں فاصلے کا پتہ بھی نہ چلا اور گاڑیوں کا اڈہ آ گیا۔

ٹھیک وقت دینے والی گھڑی کی سوئی کی طرح شیدی انوار تانگہ اسٹینڈ پر موجود تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اُس نے اپنی عادت کے مطابق اپنے مخصوص انداز میں کہا— "آیئے سرکار! شہر میں کسی جگہ جانے کی مزدوری صرف ایک روپیہ"— اور جلدی جلدی تانگہ کی پچھلی سیٹ جھاڑ کر تھپ تھپائی:

— "تشریف لائیے حضور!"

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے شیدی کو دیکھا۔ پھر اچانک میری نگاہیں اس کے کھردرے بوسیدہ کوٹ کے اوپری کاج پر جم کر رہ گئیں۔

وہ بٹن!— اور ساتھ ہی جم خانہ کلب سے ملے ہوئے سبزہ زار پر میجر بابر کی اکڑی ہوئی لاش کے قریب ہی گھاس میں سنہرے رنگ کی ایک گول چیز چمکی اور غائب ہو گئی۔

"آیئے سرکار!" کی دوبارہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پھرتی کے ساتھ میں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پروگرام کے خلاف نہ جانے کیوں میرے منہ سے نکلا— "نئے حیدرآباد"— اور تانگہ چل دیا۔ کافی ہاؤس سے گزر کر اب تانگہ اوٹرم روڈ پر آگے بڑھ رہا تھا۔ کل سے آج تک کے واقعات ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے متحرک تصویر کی طرح گزرتے رہے اور جیسے کڑی سے کڑی ملتی رہی۔ جب سلسلۂ خیال شیدی کے کوٹ کے اوپری خالی کاج تک پہنچا تو پلٹ کر میں نے شیدی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں تانگہ ہنکائے جا رہا تھا۔ میں نے سوال کیا: "شیدی تمھارے کوٹ کا اوپری بٹن کیا ہو گیا؟"

اس نے عجیب انداز سے گردن گھمائی اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک رنگ گیا۔ اس کے منہ سے صرف "سرکار" نکلا اور اُس کا داہنا ہاتھ سرکتا ہوا گلے کی طرف جیسے بٹن کا تجزیہ لینے پہنچا۔ پھر جیسے بات نبھاتے ہوئے وہ بولا: "کہیں ٹوٹ کر گر گیا ہو گا۔"

"ٹوٹ کر گر گیا یا میجر بابر سے ہاتھا پائی کرنے میں.....؟"

شیدی نے بات کاٹی: "یہ— آپ کیا— کہہ رہے ہیں؟"

"دیکھو شیدی! اب مجھ سے کچھ چھپانا بے سود ہے۔ سارا معاملہ اچھی طرح میری سمجھ میں آ گیا ہے اور اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میجر بابر کا قتل کس نے کیا ہے؟"

ہکا بکا ہو کر اس نے ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور گھگھیا کر بولا:

"جب آپ سب کچھ سمجھ ہی گئے ہیں تو آپ سے کیا چھپانا۔ پھر بیگم شہلا کو آپ سے جو غیر معمولی خلوص و محبت ہے اس کی بنا پر میں آپ کو غیر نہیں سمجھتا اس لیے آپ سے سب کچھ بتا دینے میں مجھے کوئی جھجک نہیں۔ بات یہ ہے جناب کہ بیگم شہلا نے جب سے میجر بابر سے عقد کیا کسی دن غریب نے چین نہ پایا۔ پہلے تو میجر کا یہ بچہ دھیرے دھیرے اس کی ساری املاک پر چھایا گیا اور رفتہ رفتہ اُسے جوئے، شراب، ریس اور سیر و تفریح میں گنوا دیا۔ اس کے بعد اس نے رسائل و جرائد سے شہلا کو جو آمدنی ہوتی اس پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ اسے اپنی تن آسانی اور مشاغل کے آگے بیوی کی ذرہ برابر پروا نہ تھی۔ یہی نہیں جب پیسے کی تنگی ہوتی تو وہ غریب کو جسمانی اذیتیں پہنچاتا۔ مجھ سے یہ حالت دیکھی نہ جاتی دل ہی دل میں کڑھتا مگر کچھ کر نہ پاتا۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے اس کی حالت دیکھی ہے بے چاری گھٹ گھٹ کر مر رہی ہے۔ خوددار اتنی کہ زبان سے اُف نہیں کرتی۔ میں اپنی اس دودھ شریک بہن کو جیسے حقیقی بہن سے بھی زیادہ چاہتا ہوں، دوبارہ زندگی کی آسائشیں بہم پہنچانے میں سرگرداں رہا لیکن ایک تانگے والے کی بساط ہی کیا— کل بھی میجر نے اس سسکتی ہوئی جان پر ترس نہ کھایا۔ قطبین سے معلوم ہوا کہ آپ نے جو دو سو روپے مضمون کے لیے دیے تھے، حتیٰ کہ وہ دو روپے تک جو میں نے روزانہ کی طرح دیے تھے، کھسوٹ لایا— تو میں جان پر کھیل گیا— کیا کرتا سرکار! نواب صاحب کی ڈیوڑھی کا نمک خوار ہوں— مجبور ہو گیا—"

آخری جملے کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا۔

اب ہمارا تانگہ کاٹھ والے پل سے گزر کر نشاط گنج ہوتا ہوا نئے حیدرآباد میں میرے ایک ادیب دوست، رحمان کے بنگلے کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ میں نے شیدی سے تانگہ روکنے کو کہا۔ تانگے سے اتر کر میں نے جیب سے دو کا نوٹ نکال کر شیدی کو دیتے ہوئے کہا: "خیر جیسا تم نے کیا تم جانو۔ البتہ مجھ سے اطمینان رکھو۔ اس سلسلے میں مجھے جو کچھ معلوم ہے میرے سینے میں دفن رہے گا"— اور یہ کہتے ہوئے میں بنگلے کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔



فاتحِ امن وجنگ

(سورگیہ سابق وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری)

سید خورشید افسر بسوانی

مرحبا! اے رہبرِ امن! اے سفیرِ تاشقند!
تیری ہمت تھی جواں اور حوصلے تیرے بلند
اس طرح تو نے اچانک اپنی آنکھیں موند لیں
جیسے جینے سے زیادہ تجھ کو مرنا ہے پسند

ہند کیا، دُنیا کے امن و آشتی کے واسطے
جان دے دی دوسروں کی زندگی کے واسطے
امن کی حد ہے کہ دیکھی مضطرب جب اپنی روح
موند لیں آنکھیں سکونِ دائمی کے واسطے

ورنہ پہلے کی طرح پھر جنگ کر سکتا تھا تو
دشمنوں پر اپنی دُنیا تنگ کر سکتا تھا تو
تیرے ہاتھوں میں تھی قوت، تیرے بازو میں سکت
غیر پر باراں خشت و سنگ کر سکتا تھا تو

ٹینکوں کی جنگ جیتی، صلح میں بھی دی شکست
واقعی تجھ کو گوارا ہی نہ تھی اپنی شکست
ہر جگہ تیرا سرِ ایثار اونچا ہی رہا
دی نہ دشمن کو کسی نے آج تک ایسی شکست

آہ! پہلے ہم نے "نہرو جی" کا پیکر کھو دیا
ہند کا گنجینۂ لعل و جواہر کھو دیا
ایک آیا بھی جو آنسو پونچھنے کے واسطے
دستِ ہندستان نے وہ بھی بہادر کھو دیا

جس کی سادہ لوحی پہ نازاں تھا کلچر ہند کا
جس کو اربابِ جہاں کہتے تھے پیکر ہند کا
امن کا پیغام دے کر دشمنانِ ہند کا
ایشیا میں جس نے اونچا کر دیا سر ہند کا

قطعات

مست رحمانی

(۱)
ہر طرف اک دھواں دھواں سا ہے
ہر نفس اپنا امتحاں سا ہے
اے سکوتِ حیات! کچھ تو بتا
کون یہ مجھ سے بدگماں سا ہے

(۲)
آپ کا غم، حیات ہے میری
آپ کی بات، بات ہے میری
فیض یہ آپ کی محبت کا
شاعری کائنات ہے میری

(۳)
میری ہر شب تری یادوں میں گزر جاتی ہے
میرا ہر روز تری فکر میں کٹ جاتا ہے
اے مرے بھولنے والے! یہ بتا دے مجھ کو
کیا کبھی بھولا ہوا دوست بھی یاد آتا ہے؟

(۴)
زندگی میری لوٹنے والے!
تو نے پائی ہے زندگی کیسی؟
میرے چہرے پہ ہے خوشی، لیکن
تیرے ہونٹوں پہ خامشی کیسی؟

(۵)
اُن کے غم کے سہارے جیتا ہوں
پیرہن زندگی کا سیتا ہوں
مست اک کیفِ بے خودی کے لیے
شاعری کی شراب پیتا ہوں

چٹانی نقوش سے ابجد تک

محمد قیصر

سائنس کے گوناگوں انکشافات اور اثری تحقیقات نے آج اس مسئلہ پر معلومات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے کہ انسان اپنے عہد طفولیت کے چٹانی نقوش اور تصویروں سے بتدریج کس طرح ابجد تک پہنچا۔ دراصل ہمیں اس شخص کا بہت زیادہ شکرگذار ہونا چاہیے جس نے آگے بڑھ کر یہ انتہائی اہم انقلابی اور تاریخی قدم اٹھا کر پوری نوع انسانی پر احسان عظیم کیا ہے۔

کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ ہم اور آپ جو کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں وہ ابجد کے اسی قفل میں بند ہے۔ انسانی تمدن کی یہی کلید ہے۔ تاریخ انسانی کا اتھاہ ذخیرہ اور سارے علوم و فنون جو لاتعداد کتابوں میں محفوظ اور لاکھوں کروڑوں الفاظ میں مقید ہیں — اسی ابجد کی ایجاد کے مرہون منت ہیں۔

انسانی خیالات و جذبات کو مکتوبی علامتوں میں ظاہر کرنے کی کوشش کا قدیم ترین نمونہ فلسطین میں کنعانیوں کے ایک شہر جزر کے کھنڈروں میں دوسری جنگ عظیم سے کچھ سال پہلے دریافت ہوا ہے۔ اسے ہیورفورڈ کالج کے ایک امریکی ماہر اثریات ڈاکٹر گرانٹ نے برآمد کیا۔ یہ قابل قدر علمی جوہر برتن کا ایک ٹکڑا (کنعانی کوزہ گری کا ایک نمونہ) ہے، جس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ تحریر کا یہ ٹکڑا ۲۰۰۰ برس ق م کا اور ابجدی تحریر کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ یہی تحریر ہماری ابجد کا پیش خیمہ تھی۔

اس دریافت سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۴۰۰۰ سال پہلے کنعانی، جو بنی اسرائیل سے پہلے فلسطین کے مالک تھے وہ ابجد سے واقف تھے۔ اور اب تک کی تحقیقات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ کنعانیوں سے ہی ابجد کی ابتدا ہوئی لیکن جہاں تک کتابت کے مختلف طریقوں کا تعلق ہے اس کی ابتدا حجری عہد (STONE AGE) تک پہنچتی ہے یعنی تقریباً ۲۵ ہزار سال پہلے تک۔ اس وقت لوگ اپنے گرد و پیش کی چیزوں اور جانوروں وغیرہ کے نقوش اور تصویریں کھینچ کر مسرت حاصل کرتے تھے۔ یہی کتابت کی ابتدا ہے خواہ وہ کتنی ہی بھدی اور بے کیف کیوں نہ رہی ہو — جس طرح بچے اپنی تعلیم کے ابتدائی دور میں آڑے ترچھے نقوش کھینچ کر خوشی محسوس کرتے ہیں، آپ یقین کریں، نوع انسانی بھی عہد طفولیت کے اسی دور سے گذر چکی ہے۔

ہمیں معلوم ہے دنیا کے مختلف حصوں میں، مثلاً وسطی فرانس، قطب شمالی اور مشرق وسطیٰ وغیرہ میں حجری عہد کے انسان رہتے تھے جو ہڈیوں اور سینگوں پر جانوروں وغیرہ کی تصویریں کھینچتے تھے یا اپنے رہنے کے مقامات غاروں کی دیواروں پر ان کے نقوش بناتے تھے جو اصل سے نقل کرنے کی کوشش ہوتی تھی۔ مثلاً گائے کہنا مقصود ہوتا تو گائے کی ایک بھدی سی شکل بنا دی جاتی یا آنکھ کہنے کی ضرورت ہوتی تو آنکھ کی تصویر بنا دی جاتی یا مثلاً کسی شکار کا حال بیان کرنا ہوتا تو اس داستان کو جانوروں کی مکمل یا ادھوری شکلیں بنا کر بیان کرتے۔ کسی واقعے، شے یا حالت کو بیان کرنے کے لیے ابتداً یہ طویل اور بھدا طریقہ اختیار کیا گیا اور اس طرح قدیم ترین طرز کتابت یعنی خط تصویری (PICTOGRAPH) وجود میں آیا۔

یہ سست اور بھونڈا طریقہ ایک عرصے تک چلتا رہا پھر دھیرے دھیرے اس طریقے میں کچھ سدھار ہوا اور غالباً سب سے پہلے ۵ ہزار ق م میں کسی ذہین مصری شخص کے دماغ میں یہ بات آئی کہ کسی ایک خیال یا تصویر کو پہچاننے کے لیے ضروری نہیں کہ اس شے کی مکمل تصویر بنائی جائے لہٰذا اس مصری نے تصویروں کو مختصر کر دیا اور کسی شخص یا جانور یا شے کو ظاہر کرنے

کے لیے چند لکیروں سے کام لینے لگا۔ مثلاً انسان کی شکل بنانے کے لیے ایک کھڑی لکیر کے اوپر ایک گول دائرہ اور ہاتھوں کے لیے دو لکیروں سے کام لیا گیا جس سے شے مطلوب سمجھ میں آجائے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مختصر رسمی خط تصویری کی بنیاد پڑی۔ اسی طرح پر آگے چل کر ایک اور اہم انقلابی قدم اٹھایا گیا۔ غالباً کسی مصری ہی نے یہ منصوبہ قائم کیا کہ مستعمل مختلف تصویروں میں سے بعض کو منتخب کرکے ان سے "الفاظ" کی تعبیر کا کام لیا جائے۔ مثلاً "دشمن سے ہتھیار چھین لینے" کی تصویر کی تعبیر تحریر میں آکر "بے ہتھیار کرنا" یا "فتح" کی سی ہو گئی۔ اسی طرح سورج کی تحریری تعبیر "دن" سے ہو سکتی ہے یا جانوروں اور انسانوں کے نقش پا سے "چلنے" کی اور لہریا خط سے پانی کی تعبیر کی جا سکتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

حال ہی میں اس مختصر سادہ تصویری تحریر کا دستاویزی ثبوت بھی ملا ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندوں نے ایک پتھر پر جس کو انھوں نے جھیل سپیریر (SUPERIOR LAKE) کے پاس پایا تھا، یہ تصویری تحریر کندہ کردی تھی۔ سپیریر جھیل تک یہ لوگ ایک 'مہم' کے سلسلے میں گئے تھے۔ اس نوشتے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں ۱۵ آدمی شریک تھے جنھیں چھوٹی چھوٹی ۱۵ لکیروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کے ایک کمانڈر کا نام "شاہ پرند" تھا جس کے لیے وہی پرندہ بنا دیا گیا ہے۔ خشکی پر اترنے کی تعبیر کچھوے بنا کر کی گئی ہے۔ اس مہم میں ۳ دن صرف ہوئے۔ اسے دکھلانے کے لیے ۳ نصف دائرے بنائے گئے جن سے مراد آسمان ہے اور پھر دائروں کے نیچے ۳ نقطے بنا دیے گئے ہیں جن سے مراد سورج ہے۔

فطری مظاہر کی تعبیر کے لیے علامتیں تو متعین ہو گئیں لیکن چونکہ انسان تدریجی ارتقا کے میدان میں کئی منزل آگے بڑھ چکا تھا اس لیے اب یہ طریقہ تنگ دامن ثابت ہونے لگا۔ اب قدیم انسانوں کے سامنے ایک بڑا حل طلب مسئلہ یہ تھا کہ ان فطری مظاہر کے ناموں اور تصویروں کے علاوہ مجرد خیالات و تصورات اور کیفیات کے لیے کیا علامت ہو---؟ !! قدیم انسانوں نے اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ نکالا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اُن چیزوں کی تصویریں بنائیں جو ہر جگہ ان تصورات سے وابستہ سمجھی جاتی تھیں، مثلاً غم کے اظہار کے لیے آنسو، جنگ کے لیے ہتھیاروں اور بہار کے واسطے پھولوں کی تصویریں بنائیں اور انھیں اظہار مدعا کے لیے استعمال کرنے لگے۔ اس قسم کی تصویری مختصر نویسی کو ہیروغلیفی (HIEROGLYPHIC) کہتے ہیں۔ انکشافات اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ سب سے پہلے مصریوں ہی نے اسے مکمل کیا۔ یہی نہیں بلکہ ۳۰۰۰ سال قبل مسیح سے پیشتر وہ اسے باقاعدہ استعمال بھی کرتے تھے۔ آج بھی دنیا کے بعض ملکوں کے باشندے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ مثلاً چین، جاپان اور کوریا کو لے لیجیے ان کی تحریر میں جو لکیریں استعمال ہوتی ہیں، یہ ان چھوٹی چھوٹی لکیروں سے پیدا ہوئی ہیں جو قدیم چینیوں یا کوریائیوں نے ہزاروں سال پہلے ایجاد کی تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آج بھی ان کی تحریر کی بنیاد خط تصویری ہی ہے، کیوں کہ ان میں اشیاء خارجی کی بجائے تصورات کی تصویریں ہیں جو طویل بھی ہیں اور پیچیدہ بھی!

اس طرح کے جو مصری کتبے پائے گئے ہیں انھیں پڑھنے میں پہلے خاصی دقت اس لیے اٹھانی پڑی کہ مصریوں نے اپنی تحریر کی دو قسمیں کر رکھی تھیں۔ ایک مقدس تحریر جو خاص اہل علم کے لیے تھی اور دوسری اس زبان کے لیے جو عوام استعمال کرتے تھے۔ نپولین کی مصری مہم میں شریک فرانسیسی توپ خانے کے ایک نوجوان لفٹننٹ کو سنہ ۱۷۹۹ء میں مصر میں اسکندریہ سے چند میل کے فاصلے پر روزیٹہ میں جو کتبہ ملا تھا (اور جو اب لندن کے عجائب خانے میں موجود ہے) اس میں اسی قسم کی دوہری تحریریں ملی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری تحریر بھی ہے جو یونانی میں اس کا ترجمہ ہے۔ ان کتبوں کی تصویریں اتنی مسخ ہو گئی ہیں کہ اس کی کلید اگر فرانسیسی پوسار نامی افسر نے دریافت نہ کی ہوتی تو آج بھی یہ معلوم نہ ہوتا کہ مصری آثار و مقابر پر جو تصویریں بنی ہیں وہ کوئی نوشتہ ہیں۔

آج کی بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی خط تصویری کی یادگاریں باقی ہیں۔ مثلاً سوالیہ نشان (؟)، علامت استعجاب (!)، علامت ڈالر ($)، علامت پونڈ رقمی (£)، علامت پونڈ وزنی (lb)، مثبت (+)، منفی (-)، تقسیم (÷)، ضرب (×)، وغیرہ کی علامتیں۔ یہ الفاظ نہیں ہیں مگر باقاعدہ مستعمل ہیں اور بلا تکلف ہر ایک کی سمجھ میں آتی ہیں۔

اب ذرا انھیں ابتدائی ماخذ سے ملا کر دیکھیے۔ علامت استفہام (؟) لاطینی زبان کے لفظ کے پہلے اور آخری حرف سے ماخوذ ہے جس کے معنی سوال کے ہیں۔ اس کی شکل چھوٹے e.o کے اوپر انگریزی حرف

(O) کی ہے۔ علامت استعجاب لاطینی لفظ (Io) بمعنی خوشی سے ماخوذ ہے۔ پہلے اس کی علامت چھوٹے o کے اوپر I کی تھی۔ رقمی پونڈ کی علامت لاطینی لفظ کے پہلے حرف سے ماخوذ ہے اور پونڈ وزنی پہلے اور تیسرے حرف سے۔ ڈالر کی علامت غالباً 8 سے ماخوذ ہے جس سے مراد ۸ ریال اندلسی برابر ایک ڈالر کے ہے۔ مثبت اور منفی وغیرہ علامتیں پندرھویں صدی کے اطالوی سائنس دانوں کی ایجادیں ہیں۔

تصویری کتابت کا طریقہ مختلف خطوں میں بتدریج نشو و نما پاتا رہا۔ جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے، قدیم ترین خط تصویری مصری خط ہے جس کے زمانے کا تعین ۴ ہزار ق م کیا گیا ہے۔ جدید خط تصویری چینی ہے جس کی ابتدا ۳ ہزار ق م میں ہوئی۔ بابلی اور سمیری خط تصویری اس سے پہلے وجود میں آچکا تھا، جس کا زمانہ ۳۸۰۰ ق م تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کو مخروطی خط بھی کہتے ہیں۔ ان سب نے اپنے اثرات ایک دوسرے پر مرتب کیے ہیں لیکن ان کا تفصیلی تجزیہ آج آسان نہیں ہے کیوں کہ مثلاً مخروطی خط (CUNEIFORM) ہی کو لے لیجیے اس میں امتداد زمانہ نے اس قدر تنسیخ کر دی ہے کہ ان کی علامتیں پہچانی نہیں جاتیں۔ چنانچہ تصویری خط میں اس قسم کے جو کتبات دریافت ہوئے ہیں ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی مشکلات حائل ہیں۔ بہر حال ایک کتبہ جو شمال مغربی ایران میں ۱۶۰۰ فٹ کی بلندی پر ایک چٹان کے اوپری حصے پر کندہ ملا ہے، جو مخروطی خط میں ہے اور جسے لوگ تقریباً دو ہزار سال سے دیکھتے آرہے تھے لیکن کوئی پڑھ نہ پا رہا تھا، اسے سنہ ۱۸۵۱ء میں قدیم فارسی اور اثریات کے ماہر ایک انگریز فوجی افسر سر ہنری رالنسن نے ۳ سال کی جد و جہد کے بعد پڑھا۔ یہ کتبہ ایک اشتہار ثابت ہوا۔ اس سے دارائے اعظم کی شوکت و عظمت کا پتہ چلتا ہے جس نے ۵۲۱ سے ۴۸۵ ق م تک حکومت کی اور اسی کے حکم سے یہ داستان لکھی گئی۔ شہنشاہ موصوف نے خود ہی یہ چٹان منتخب کر کے یہ داستان فارسی، مدینی اور بابلی زبانوں میں کندہ کرائی تھی اور چونکہ مدینی قدیم فارسی سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لیے ماہر موصوف (سر ہنری) اس بابلی کتبے کو پڑھنے میں کامیاب ہو گئے جو اثریات کا ایک بڑا کارنامہ ہے!

اس کے بعد راہیں کھل گئیں اور سیکڑوں بابلی نوشتے کامیابی کے ساتھ پڑھ لیے گئے۔ ان میں وہ سنگی نوشتے بھی شامل ہیں جنھیں بعض سیاحوں نے سنہ ۱۸۷۲ء میں پایا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے چند سال پیشتر جب ان کے ترجمے مکمل ہوئے تو انھوں نے سائنس دانوں کی دلچسپی کے علاوہ مذہبی دنیا میں بھی ایک ہلچل برپا کر دی۔

ان لوحوں میں سے ایک میں یہ لکھا تھا کہ طوفان نوح ۴ ہزار برس پہلے نہیں بلکہ ۲۶ ہزار برس پہلے آیا تھا۔ دوسری لوح میں تخلیق عالم کا بیان تھا جو اس کتبے کے مطابق طوفان عظیم سے ۵ لاکھ سال پہلے ہوئی۔ ایک اور لوح تھی جس میں حضرت نوحؑ کا نام عبرانی زبان کی بجائے سمیری زبان میں تھا اور یہ بھی کندہ تھا کہ نوحؑ اور حضرت آدمؑ دونوں نے ثمر ممنوعہ کھایا تھا!

اس ضمن میں قدیم امریکہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ بہت سی دوسری چیزوں کی طرح تصویر نویسی بھی امریکہ میں بہت دیر سے آئی۔ ماہرین آثار قدیمہ کا اندازہ کچھ ایسا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں نے خود ہی اس کی طرف پیش قدمی کی۔ اثری تحقیقات سے یہاں تک پتہ چلا ہے کہ امریکہ کی قوم مایا (MAYA) کی تصویر نویسی تقریباً ۶۰۰ ق م پرانی ہے۔ لیکن ازٹکوں (AZTECS) کی تصویر نویسی صرف سنہ ۱۱۰۰ تک پہنچی ہے۔ ممکن ہے انھوں نے اس سے پہلے کتابت شروع کی ہو مگر ابھی تک اس امر کا کوئی دستاویزی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ اس کے امکانات کسی حد تک روشن ہو گئے ہیں کہ مایاوی تصویر نویسی کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکیں، کیوں کہ ماہرین اپنی مسلسل جد و جہد سے مایاوی تصویر نویسی یا ہیروغلیفی (HIEROGLYPHIC) کچھ کچھ پڑھنے لگے ہیں۔ اس راہ میں سب سے بڑی دقت یہ رہی ہے کہ روزیٹہ طرح مایاوی خط کے کتبات یا لوحیں زیادہ دریافت نہیں ہو سکی ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ "انسان ناطق" کی ضروریات کے تحت تصویر نویسی میں صوتی علامتیں شامل ہوتی گئیں۔ ایسی صوتی کتابت جس میں تصویر نویسی کا دخل نہ ہو، بعد کی مصری ہیروغلیفی سے ماخوذ ہے۔ واضح رہے کہ مصری ہیروغلیفی میں سترہ سو تصویریں تھیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ صوتی کتابت کو سامی اقوام نے اخذ کیا۔ ممکن ہے وہ کنعانیوں کے مورث ہوں۔

یہی تصویر نویسی بتدریج حرف نویسی میں تبدیل ہوتی گئی۔ مثلاً کسی جانور کی تعبیر کرنی ہوتی تو اس جانور کی ملفوظی شبیہ بنا دی جاتی۔ حرف نویسی کو

آواز نویسی کا ارتقائی مرحلہ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آواز نویسی بھی تصویر نویسی سے ہی شروع ہوئی لیکن وہ تصویری اشیاء کی تعبیر نہیں بلکہ ان کے ناموں کی آوازوں کی تعبیر تھی۔ مثال کے طور پر اگر کتابت کا کوئی طریقہ ہمارے پاس نہ ہوتو ناچار ہم بھی اشیا کو اُن کی شبیہوں سے ظاہر کرنا شروع کر دیتے جیسے "چشم" لکھنے کے لیے ہم آنکھ کی ایک تصویر بنا دیں گے اور "من" لکھنا ہوا تو من (وزن) کی ایک تصویر بنا دیں گے۔ اسی طرح اگر "چشم من" لکھنا ہوا تو آنکھ اور من کی ایک شکل بنا دیں گے۔ یہ آواز نویسی کی ایک مختصر اور سادہ سی صورت ہے۔ بچوں کے تصویری کھیل سے آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی ایک عجیب اور دل چسپ مثال ایک قدیم ازٹکی (AZTEC) مخطوطے میں دستیاب ہوئی ہے۔ یہ مخطوطہ اُس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب ہسپانوی فاتح ازٹکی عوام کو عیسائی بنا رہے تھے۔ کاتب کو "پاٹر ناسٹر" لکھنا تھا، جس کے معنی لاطینی زبان میں "ہمارے باپ" کے ہیں۔ اس زمانے میں ازٹکی عوام تصویر نویسی سے کام لیتے تھے۔ لہٰذا کاتب نے پہلے ایک جھنڈا بنایا جو ازٹکی زبان میں "پا" ہے، پھر ایک پتھر بنایا جو ازٹکی زبان میں "ٹے" ہے۔ پھر اس نے ناگ پھنی بنایا جو اسی زبان میں "ناخ" ہے اور پھر اس نے ایک پتھر بنا دیا۔ اس طرح اُن سے "پاٹے ناخٹے" بنتا ہے جو "پاٹر ناسٹر" کی قریب ترین صوتی تعبیر ہے!

ابجد کی ابتدا، صوتی کتابت کا براہِ راست نتیجہ یا ردِ عمل ہے۔ یہ بتانا تو بہت دشوار ہے کہ کس متعین وقت سے اس کی شروعات ہوئی، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ایجاد کی طرف اس زیرک اور ذہین انسان کا ذہن منتقل ہوا ہوگا جو اظہارِ مدعا کے لیے تصویر کشی سے اکتا گیا ہوگا یا اسے تضیعِ اوقات سمجھنے لگا ہوگا۔ اس کی مثال موجودہ دور کے شارٹ ہینڈ سے دی جا سکتی ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ ابجد کی ایجاد ایک ہی مرتبہ ہوئی۔ ذکنعانی کوزہ اس کا بہترین نمونہ اور ثبوت ہے البتہ جزوی طور پر اس میں اضافے اور اصلاحیں ہوتی رہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سویز کے مشرق میں بحرِ قلزم پر واقع وادیٔ سینا میں برطانیہ کے ماہرِ اثریات سر فلنڈرس پیٹری نے ۱۹۰۴ء میں جو متعدد سنگی لوحیں دریافت کی تھیں، پروفیسر لوتھ اور اُن کے شرکائے کار نے جب ان سینائی نوشتوں کو ڈاکٹر گرانٹ والے کنعانی کتابت کے دوسرے نوشتوں سے مقابلہ کیا تو حروف ایک ہی جیسے پائے۔ لیکن پیٹری اور گرانٹ والے نوشتوں کی عمروں کے تعین سے پہلے تک قدیم ترین ابجدی کتابت کا نمونہ ایک مآبی لوح کا نوشتہ سمجھا جاتا تھا، جس کو بحرِ موت کے آس پاس کلائن نامی ایک جرمن ماہر نے ۱۸۶۸ء میں دریافت کیا تھا [مآبی (MOASITE) بھی سامی اقوام میں سے تھے اور غالباً حضرت لوطؑ کی اولاد میں سے تھے] اب اس لوح کی عمر کا اندازہ ... ق م لگایا گیا ہے۔

تصویر نویسی سے ابجدی حروف اخذ کرنے کا طریقہ کچھ اس طرح رہا کہ تصویر نویسی میں اشیاء کے لیے جو علامت تھی اسی سے حرف ماخوذ کیے گئے مثلاً حرف 'A' کو لیجیے۔ عبرانی میں اس کو 'الف' کہتے ہیں یعنی بیل۔ قدیم مصری تصویر نویسی میں بیل کے سر سے بیل کی تعبیر کرتے تھے جب ابجد کی ایجاد ہوئی تو یہ علامت بہت کچھ سادہ ہو کر حرف 'A' کے ظاہر کرنے کے لیے چن لی گئی جو دیکھنے میں بیل کا کسی حد تک اُلٹا سر معلوم ہوتا ہے۔ شروع میں حرف کا نام ایسے لفظ پر رکھا گیا جس سے وہ شروع ہوتا ہے۔ مثلاً حرف 'B' عبرانی میں بیت (گھر) کہلاتا ہے اور تصویر نویسی میں اس کے لیے گھر سا بناتے تھے۔ اسی طرح حرف 'G' عبرانی میں جمل ہے جس کے معنی اونٹ کے ہیں۔ تصویر نویسی میں اونٹ کے لیے جو علامت تھی اسی سے یہ حرف بھی ماخوذ ہے۔

ابجدی کتابت کو مکمل اور سائنٹیفک طریقے پر مرتب کرنے کا سہرا یونانیوں کے سر ہے۔ انھوں نے سامی کتابت کے برعکس اسے بائیں سے داہنی جانب لکھنا شروع کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ۵ سو سال پہلے بعض برطانوی قوموں نے یونانی ابجد کو اپنا لیا اور اس میں کچھ تبدیلیاں کر دیں، کیونکہ ابتدائی ابجدی جدول میں حروفِ علت (VOWELS) یعنی a, e, i, o, u شامل نہیں تھے۔ اس طرح پہلے حروف ۲۲ تھے جو اضافے کے بعد ۲۶ ہو گئے۔ اطالویوں سے ابجدی طریقہ رومیوں نے سیکھا اور اسے رومی یا لاطینی کہنے لگے۔ یہی ابجد ہے جسے بعد میں انگریزی میں اپنا لیا گیا۔ قدیم کنعانی اور عبرانی ابجد کو سامی الاصل تاجر پیشہ فنیقی لوگوں (PHOENICIANS) نے بحرِ روم کے چاروں طرف پھیلا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرصے تک لوگ انھیں کو ابجد کا موجد سمجھتے رہے۔



غزل

سیف بجنوری

صبحِ عشرت زندگی کی شام ہو کر رہ گئی
حسرتِ دل موت کا پیغام ہو کر رہ گئی

زندگی وابستۂ آلام ہو کر رہ گئی
آرزوے دید بھی ناکام ہو کر رہ گئی

تم نے دُنیا کو لُٹا دیں نعمتیں، اچھا کیا
میری دُنیا، بس تمہارا نام ہو کر رہ گئی

خوفِ رسوائی نے مجھ کو، آہ بھی بھرنے نہ دی
لب تک آئی بھی تو ان کا نام ہو کر رہ گئی

دیکھ کر اُن کو، مری آنکھوں میں بھر آئے تھے اشک
بات ہی کیا تھی، مگر وہ عام ہو کر رہ گئی

اہلِ محفل دیکھتے ہی مست و بیخود ہو گئے
ہر ادا ساقی کی شرحِ جام ہو کر رہ گئی

اعتبارِ وعدہ سے دل اس قدر ہے باغ باغ
گل بداماں سیفؔ میری شام ہو کر رہ گئی

غزل

خان تبسم شاہجہانپوری

خراماں، خراماں نگاہیں جھکائے
قیامت کہاں سے یہ انداز لائے

بفیضِ محبّت، وہاں آگیا ہوں
جہاں عقل روئے، جنوں مسکرائے

اِدھر لطفِ دُنیا، اُدھر خوفِ عقبیٰ
کوئی دل سنبھالے کہ دامن بچائے

بڑی جاں شکن ہے تری آرزو بھی
مگر ہوں کلیجے سے پھر بھی لگائے

سرشکِ ندامت سے دامن کو دھویا
مُبارک وہ آنسو جو غم میں بہائے

مرے نقشِ پا نے، رہِ جستجو میں
زمانے کو آدابِ منزل سکھائے

جنونِ تمنّا میں ہم نے تبسمؔ
نشاناتِ ہستی بنائے مٹائے

منشی جوالا پرشاد برق لکھنوی

دیویندر پرشاد سکسینہ

جوالا پرشاد نام، برق تخلص، قصبہ محمدی ضلع لکھیم پور کھیری میں ۱۲/اکتوبر ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوئے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر جگجیت رام بابو سکسینہ اور دوسرے تذکرہ نویسوں اور ادیبوں نے لکھا ہے کہ برق ضلع سیتاپور قصبہ محمدی میں پیدا ہوئے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ محمدی ضلع لکھیم پور کھیری کا ایک معروف قصبہ ہے نہ کہ سیتاپور کا۔ آپ ایک معزز سری واستو کایستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خواجہ عشرت لکھنوی نے اپنی کتاب ہندو شعرا میں آپ کو پنڈت لکھا ہے۔ یہ غلطی بھی زیادہ تر تذکرہ نویسوں اور ادیبوں نے کی ہے۔ آپ کے والد منشی شیو دیال صاحب جو قصبہ محمدی کے راجا کے یہاں دیوان تھے، بڑے عالم و فاضل بزرگ ہوئے ہیں۔ برق بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم قصبہ محمدی میں ہوئی۔ آپ نے ۱۸۷۹ء میں ضلع لکھیم پور کھیری سے انٹرنس کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور ۱۸۸۱ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بی۔ اے کا امتحان اول درجے میں پاس کرنے کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ ہی میں اسسٹنٹ انگلش پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک سال کے بعد آپ نے ۱۸۸۳ء میں وکالت ہائی کورٹ کا امتحان پاس کیا اور فدائے قوم منشی کالی پرشاد کے دامن عاطفت میں تقریباً دو سال تک وکالت کی لیکن ۱۸۸۵ء میں وکالت ترک کر دی۔ پھر گورنمنٹ نے آپ کو منصف کے عہدے پر فائز کر دیا۔ منصفی سے ترقی کرکے سب جج اور کئی مرتبہ قائم مقام سشن جج بنے۔

آپ ۱۹۰۹ء میں گریفس کمیٹی ممبر مقرر ہوئے۔ پھر جج خفیفہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۲۶/جنوری ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں بہ عارضۂ طاعون انتقال کیا۔ اس وقت آپ جج خفیفہ لکھنؤ کے عہدے پر فائز تھے۔ منشی دیا نرائن نگم نے زمانہ مارچ ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں آپ کے مختصر حالات زندگی معہ تصویر شایع کی۔ اس میں آپ کی تاریخ وفات ۱۲/مارچ ۱۹۱۱ء درج ہے جو صحیح نہیں ہے۔ برق کے بھائی منشی جانکی پرشاد مرحوم کے لکھے ہوئے حالات زندگی ادیب الہ آباد بابتہ اپریل ۱۹۱۱ء میں شایع ہوئے ہیں اس میں منشی جانکی پرشاد رقم طراز ہیں :

"بالآخر ۲۶/مارچ ۱۹۱۱ء کو بوقت تین بجے (۲۰) بیس منٹ پر اس دار فانی سے کوچ کیا۔"

برق کے حالات زندگی کے سلسلے میں ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ اس لیے ان کے بھائی منشی جانکی پرشاد کے تحریر کردہ حالات زندگی یہاں درج کیے جاتے ہیں جو ادیب بابتہ اپریل ۱۹۱۱ء کے ایڈیٹوریل میں صفحہ ۲۰۳ اور ۲۰۴ پر شایع ہوئے ہیں :

"منشی جوالا پرشاد صاحب بتاریخ ۱۴/اکتوبر ۱۸۶۲ء یوم دوشنبہ/ماہ کنوار بمقام قصبہ محمدی ضلع کھیری پیدا ہوئے تھے۔ بزرگان منشی صاحب مرحوم قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی کے باشندے تھے۔ جد امجد

منشی نین سکھ عہدۂ جلیلہ پر بہ عہد شاہی ممتاز تھے اور اسی سلسلے سے قیام محمدی میں ہوگیا۔ والد ماجد منشی شیو دیال صاحب بھی عہد شاہی میں ممتاز رہے۔ منشی صاحب مرحوم بچپن سے خاموش محنتی اور شایق تحصیل علم رہے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں مڈل پاس کر کے انٹرنس، ایف۔ اے اور بی۔ اے میں برابر اول درجہ پاس ہوتے گئے۔ بی۔ اے پاس کر کے آپ اسسٹنٹ انگلش پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ میں مقرر ہوئے اور اسی زمانے میں قانون بہ مشورہ منشی کالی پرشاد صاحب مرحوم کل بھاسکر بانی کایستھ پاٹھ شالہ الہ آباد کے حاصل کیا۔ بی۔ اے کے امتحان کے ایک سال کے بعد ہائی کورٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ تخمیناً ایک سال وکالت عدالت العالیہ صاحب جوڈیشیل کمشنر بہادر میں کر کے منصفی ۱۸۸۵ء میں مقرر ہوئے۔ منصفی سے ترقی کر کے سب جج اور کئی دفعہ قائم مقام سشن جج مقرر ہوئے۔ بالآخر ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو بوقت (۳) تین بجے (۲۰) بیس منٹ پر اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔"

آپ کی وفات پر ۲ اپریل ۱۹۱۱ء کو ایک تعزیتی جلسہ قیصر باغ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اس میں اردو کے نامور اساتذہ اور شاعروں کے علاوہ ہزاروں شہریوں نے شرکت کی تھی۔ حضرت صفی مرحوم نے اس تعزیتی جلسے میں جو قطعۂ تاریخ وفات پڑھا تھا وہ بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ قطعۂ تاریخ اب تک حضرت صفی مرحوم کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہوا ہے:-

جج خفیفہ کے خوش اخلاق جوالا پرشاد
برق ہر کام میں تھے برق نے ذہن رسا

بات سنتے ہی مدعا تہ کو پہنچ جاتے تھے
لطف بہتے ہوئے دریا میں ہے غواصی کا

دل کے حالات قیافہ سے بتا دیتے تھے
مشغلہ روز عدالت میں یہی رہتا تھا

طبع سنجیدہ تھی ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح
رنگ تہذیب و متانت کا نہایت گہرا

اک ہموار برتاؤ سبھوں سے یکساں
کار سرکار میں نرمی نہ درشتی بیجا

رنگ انصاف میں ڈوبا ہوا انداز نگاہ
شوخیِ جنبشِ مژگاں سے ذہانت پیدا

نہ گرجتے تھے کسی پر نہ برستے تھے کبھی
برق کا کام اشاروں پہ فقط چلتا تھا

آنے جانے میں عدالت کے یہ پابندیِ وقت
کام کتنا ہی زیادہ ہو مگر کیا پروا

ختم کر دینا انھیں چار بجے تک سب کام
کہ نہ سائل ہوں پریشان نہ رج ہوں کلا

"کار امروز بفردا مگزار" اس پہ عمل
کام میں طول نہ کوتہ قلمی حد سے سوا

تجربہ کار نگاہیں ہمہ دان و ہمہ گیر
نکتہ نکتہ پہ نظر سامنے عرضی دعویٰ

صاف سلجھی ہوئی تقریر بھی تحریر بھی سب
نہ کہیں جھول عبارت میں نہ الجھاؤ ذرا

نکتہ چینیوں سے نہ ٹوٹے یہ طلسم تجویز
فیصلہ میں وہ سلیقہ کہ نہ دیکھا نہ سنا

کرسیِ عدل پہ جج، جج کی ملاقات میں دوست
صحبت شعر و سخن ہو تو ادیب یکتا

بذلہ سنجی میں سخن ساز طبیعت حاضر
فقرے فقرے میں ظرافت کا نمک شور افزا

جائیے گھر پہ جو ملنے تو ملنسار بڑے
آئے جب سر اجلاس تو انداز جدا

ڈٹ کے کرسی پہ جہاں بیٹھ گئے شیر کی طرح
رعب چہرے پہ خداداد نظر ہوش ربا

مذہبی رنگ تعصب کا کہیں نام نہیں
دل کے آئینے پہ آزاد خیالی کی جلا

جج میں جتنی صفتیں چاہئیں وہ سب موجود
اب دن آئے تھے کہ عہدہ کوئی ملتا اعلا

یوں تو مرنا ہے سبھی کو مگر افسوس اے برق
اجل آئی تمھیں بے وقت قلق ہے اس کا

لکھنؤ یہ تری قسمت کہ ترے ہاتھ سے آہ
ہوگیا گم وہ نگینہ کہ جو تھا بیش بہا

دیکھنا ٹوٹ رہے ہیں یہ ستارے کیسے
رو رہی ہے کسے اردو کی ستم کش دنیا

کس کے افسوس میں ہیں شیکسپیر کی جلدیں
کون اردو میں کرے گا وہ خیالات ادا

ترجمہ تیرے لیے چھوڑ گیا دیکھ اردو
تیرے سرمایۂ نازش کا بڑھانے والا

یادگار اس سے کوئی اور نہ ہوگی بہتر
کہ اشاعت سے تصانیف کو دی جائے بقا

کام باقی تھا بہت کچھ مگر افسوس افسوس
ساتھ تو نے نہ دیا زندگیِ سست وفا

مبتلائے تپ میں ہوئے مارچ کی اکیسویں کو
اور چھبیسویں کو آگیا پیغام قضا

سن چھیالیس برس تین مہینے کا ابھی
ساخت اعضا کی نہ کمزور نہ کمزور قویٰ

اسے کیا کیجیے دن گو کہ نہ تھے مرنے کے
لے گئی چھین کے احباب سے کمبخت وبا

ان کی اولاد کو اور ان کے عزیزوں کو تمام
تعزیت دیجیے اللہ کرے صبر عطا

آپ اے برق جہاں ہیں وہاں خوش رہیے
خوش رہے آپ سے دنیا میں سب اعلیٰ ادنیٰ

نگہ برق سے گویا کشش برقی تھی
سبق آموز محبت تھی ہر اک طرز ادا

تیرے شعلوں نے لیا برق کو آغوش میں جب
ابر غم انگیز جگر سوز شرر خیز چھٹا

دل احباب میں اک آگ لگا دی غم نے
حشر تک جو نہ بجھے گی نہ بجھے گی اصلا

لکھنے بیٹھا ہے صفی برق کی تاریخ وفات

دل رنجیدہ پہ چھائی ہے غم انگیز گھٹا

۱۹۱۱ء

برق کی وفات پر رسالہ ادیب الہ آباد کے اڈیٹر منشی نوبت رائے نظر لکھنوی نے اپریل ۱۹۱۱ء کی اشاعت کے اڈیٹوریل میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

"منشی جوالا پرشاد برق بی اے جج خفیفہ لکھنؤ کی افسوس ناک وفات اردو زبان کے لیے ایک سخت ماتم ہے۔ جن لوگوں نے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو نظم و نثر میں آپ کی فصاحت اور شیوا بیانی کیا درجہ رکھتی تھی۔ بنکم چندر اور شکسپیر کی تصنیفات کو فصیح اردو کا لباس دینا مرحوم پر ختم تھا۔ ان یگانۂ آفاق مصنفوں کی اصلی فصاحت منشی صاحب کے اردو ترجموں میں اس طرح جلوہ گر ہے جس طرح آئینے میں عکس۔ آخر میں شکسپیر کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کر رہے تھے کہ پیام اجل آگیا۔ ظرافت میں بھی آپ کو خاص دستگاہ حاصل تھی اور اودھ پنچ کے صفحات آپ کے فیضان قلم سے ہمیشہ سیراب ہوتے رہے۔ قانون کے لیے بھی آپ نے خاص دماغ پایا تھا اور آپ کی بے نظیر جوڈیشل خدمات کا سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ مرحوم کی وفات سے نہ صرف اردو کا ایک فصیح البیان مصنف، ایک زندہ دل اور ظریف الطبع شاعر ایک بے نظیر جج اور لکھنؤ کی سوسائٹی کا ایک اعلیٰ ممبر اٹھ گیا ہے بلکہ قوم کایستھ کا ایک رکن رکین اور مایۂ ناز فرد کم ہو گیا جو ہمارے لیے ایک صبر آزما قومی سانحہ ہے۔"

چکبست لکھنوی مضامین چکبست میں برق پر اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں:

"منشی صاحب موصوف ان معدودے چند لوگوں میں تھے جنھوں نے ابتدا سے اودھ پنچ کے پودے کو سینچا۔ ان کی ذہانت اور طباعی ضرب المثل تھی اور زبان دانی اور شاعری کے اعتبار سے لکھنؤ کے سخن سنجوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ علاوہ چھوٹی چھوٹی نظموں کے جو اودھ پنچ میں اکثر شایع ہوئیں مثنوی بہار اور معشوقۂ فرنگ جو کہ رومیو جولیٹ کا ترجمہ ہے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ مثنوی بہار کی دلچسپی اور اختصار کو دیکھ کر سر سید احمد خاں مرحوم نے فرمایا تھا کہ

"ددگے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد"

برق لکھنوی کی تصانیف جو میرے کتب خانے میں محفوظ ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) بنگالی دلھن۔ یہ بنکم چندر چٹرجی کے مشہور ناول دیوی چودھرانی کا ترجمہ ہے۔ اسے مطبع منشی نول کشور لکھنؤ نے ۱۹۲۱ء میں شایع کیا تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی ترجمہ ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل ناول ہی اسی زبان میں لکھا گیا ہے۔

(۲) مرنالنی۔ یہ بھی بنکم چندر چٹرجی کے ناول مرنالنی کا فصیح اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ ہے۔ اس ناول میں ایک دوشیزہ کا سراپا اور حسن کی تعریف بیان کی گئی ہے جسے پڑھ کر رینالڈس کے سراپے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ ترجمے میں اصل کا لطف پیدا کرنا زبان و بیان پر کامل قدرت رکھنے کی دلیل ہے۔ برق کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ ترجمے کو ترجمہ نہیں رہنے دیتے تھے بلکہ طبع زاد تصنیف کا لطف پیدا کر دیتے تھے۔ یہ ناول اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ اس کے تین اڈیشن منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوئے ہیں۔

(۳) مارِ آستین۔ مشہور بنگالی ناول بشا برکش کا ترجمہ ہے۔ اس ناول میں اخلاقی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ترجمے کی تعریف سر ایڈون آرنلڈ نے کی تھی جو انگریزی زبان کے ایک بلند پایہ نقاد تھے۔ اب تھیٹریکل کمپنیاں برق کے اس ناول کا تماشہ دکھاتی ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جس وقت لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج سے برق کا جنازہ جا رہا تھا اس وقت مارِ آستین کا ڈرامہ ایک تھیٹریکل کمپنی کھیل رہی تھی۔

(۴) دودھنی۔ یہ بھی ایک دلچسپ اور بے مثل ناول ہے اس کے کئی اڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

(۵) معشوقۂ فرنگ۔ یہ شکسپیر کے مشہور ڈرامے رومیو اینڈ جولیٹ کا اپنا پایہ منظوم ترجمہ ہے۔ رومیو اور جولیٹ کا ترجمہ برق نے سب سے پہلے "فیروز گلنار" کے نام سے کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا اڈیشن معشوقۂ فرنگ کے نام سے ۱۹۱۱ء میں نول کشور پریس سے شایع ہوا۔ اردو کے بعض ادیبوں نے "فیروز گلنار" اور معشوقۂ فرنگ سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ برق کی دو الگ الگ تصنیفیں ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ چیز ایک نام دو ہیں۔ اس ڈرامے کے افراد قصہ لکھنؤ

کے ظہور الدولہ، ریاض، غفور الدولہ، مشرت وغیرہ اور پادری یا راہب کے بجائے قاضی صاحب نظر آتے ہیں۔

(۶) مثنوی بہار۔ اس مثنوی کے کئی اڈیشن مختلف مطبعوں سے شایع ہو چکے ہیں۔ اس کے دو اڈیشن میری لائبریری میں محفوظ ہیں جو نول کشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوئے ہیں۔ یہ ایک مثنوی برق کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے لکھنؤ اسکول کو اس مثنوی پر ناز ہے۔ جناب حامد اللہ افسر میرٹھی اپنی کتاب تنقیدی اصول اور نظریے میں مثنوی بہار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"منشی جوالا پرشاد برق کی مشہور مثنوی بہار سلاست، روانی اور نازک خیالی میں لاجواب ہے۔ برق کو خارجی کیفیات کے نظم کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔"

غرض برق ایک بلند پایہ ناول نگار اور مترجم تھے۔ آپ نے بنگالی ناولوں کے ترجمے اس خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ سلیس عبارت میں کیے ہیں کہ ان میں اصل کی تازگی پائی جاتی ہے۔ آپ کے طبعزاد ناولوں میں پرتاپ اور رودھنی قابل ذکر ہیں۔ ان میں آپ کی افسانہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ آپ نے اپنے ناولوں میں غیر ملکی فضا نہیں پیدا ہونے دی ہے۔ ان کے ناولوں میں وطن پرستی کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ آپ کے کسی ناول میں عریانیت نظر نہیں آتی جس کی ان کے دور کے ناول نگاروں کے یہاں بہتات ہے۔ شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ منشی پریم چند برق کے بنگالی ناولوں کے ترجموں سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ان کی افسانہ نگاری کی ابتدا ان ہی ترجموں کو پڑھ کر ہوئی تھی۔ پروفیسر محمد حسن محوی صدیقی لکھنوی کا ایک مقالہ "ہمارے افسانے" رسالہ زمانہ کانپور بابتہ جولائی سنہ ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا ہے۔ اس میں برق کے ناولوں کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

بنگال کے سحر نگار ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کے اکثر و بیشتر ناولوں کا ترجمہ لکھنؤ کے مشہور و نامور ادیب و انشا پرداز منشی جوالا پرشاد برق آنجہانی نے کیا تھا۔ برق زبردست شاعر اور عدالت خفیفہ لکھنؤ کے جج تھے اور حسن کی لال کوٹھی کبھی جھاؤلال کے پل پر مشہور تھی۔ تقریباً ان کے سب ناول نول کشور پریس لکھنؤ میں چھپے اور ملتے ہیں۔ یہ ترجمے زبان اور افسانوی حیثیت سے لاجواب ہیں۔"

حضرت جگر بریلوی یاد رفتگاں میں آپ کے ناولوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"آپ کے بنگالی ناولوں کے ترجموں میں اصل کی سی تازگی اور لطف ہے۔ طبعزاد ناولوں کا کیا کہنا۔ سراپا بیان کرنے میں تو آپ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت اس کی چلتی پھرتی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ مناظر کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ایک سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ بالکل قدرتی دلفریب مضامین ہوائیں تازگیاں اور شگفتگیاں آنکھوں کو فرحت اور دل کو سرور بخشنے لگتی ہیں۔ شادمانیوں کا ذکر کرتے ہیں تو کلیجہ اچھلنے لگتا ہے۔ رنج و غم کا بیان کرتے ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کردار نگاری پر یہ قدرت ہے کہ قصوں کے افراد جیتے جاگتے چلتے پھرتے مختلف الخصائل انسان نظر آتے ہیں۔ زبان کی سلاست، پاکیزگی اور فصاحت ادب کا معیار ہے۔"

منشی جوالا پرشاد برق کسی تعارف کے محتاج نہیں اپنے زمانے کے بہترین نثر نگار اور اردو نظم میں ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ آپ کا منظوم ڈرامہ معشوقہ فرنگ اور مثنوی بہار ہمیشہ زندہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ مثنوی بہار ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ سلاست، برجستگی شگفتگی اور روانی کے لحاظ سے سحر البیان، گلزار نسیم، زہر عشق اور پیام ساوتری کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسری مثنوی اس کے مقابلے میں پیش کی جا سکے۔ جس طرح انگریزی ادب میں مختصر نظموں میں گرے کی نظم ایلجی (ELEGY) کا جواب نہیں ملتا اسی طرح اردو ادب میں بھی مثنوی بہار لاجواب ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ گرے کی نظم حزنیہ ہے اور مثنوی بہار طربیہ ہے۔ جگر بریلوی یاد رفتگاں میں برق پر اپنے مقالے میں مثنوی بہار کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"مثنوی بہار کی کبھی کبھی زیارت ہو جاتی ہے۔ اس مثنوی کا کیا کہنا۔ زبان و بیان کی خوبیوں کی داد نہیں دی جا سکتی۔ واقعی عروس بہار کی تصویر کھینچ دی ہے۔ ایسی حسین رنگین اور پاکیزہ نظم ہے جس کی نظیر نہیں۔ ایک طرف محاوروں کا لطف بندشوں کی نفاست ترکیبوں کا تناسب و تقابل مطالب کا ربط و تسلسل خیالات کی

شگفتگی دوسری طرف قانون روئیدگی و بالیدگی کی نزاکتوں کا لحاظ نشو و نما کی مسلسل کیفیتوں کا نقشہ کھیتی کے کاموں کی جزئیات تغیرات موسم سے کاشتکاروں کے امید و بیم کی حالتیں جنگل پہاڑ اور کھیتوں میں ابر و باراں اور بہاراں کا سماں حسینوں اور مہ جبینوں کے جوشش شوق اور ولولوں کا عالم کس کس بات کی تعریف کی جائے صفائی اور روانی کا یہ عالم ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف و شفاف نہر اٹھلاتی بل کھاتی چمنستان میں موجیں مارتی چلی جاتی ہے سرسید احمد خاں نے اس مثنوی کے متعلق سچ کہا تھا۔ ط

"روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد"

مثنوی بہار کے کچھ اشعار جا بجا سے پیش کیے جاتے ہیں موسم بہار کی آمد کا ذکر شاعر نے اس طرح کیا ہے کہ بس۔ موسم بہار کی تصویر کھینچ دی ہے:

اٹھلاتی بجاتی مسکراتی   کس ناز سے ہے بہار آتی
کمسن۔ الھڑ۔ حسین۔ انیلی   چوتھی کی دلہن نئی نویلی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن   اٹھتی کونپل ابھار کے دن
گہنا پھولوں کا زیب تن کر   دھانی جوڑا نیا پہن کر
گھونگھٹ اک ناز سے نکالے   سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے
اتری گلشن میں جب سواری   سورج نے آرتی اتاری
گل نے زر گل کیا نچھاور   صدقے ہوئی عندلیب اڑ کر
خوشیاں اشجار نے منائیں   میووں کی ڈالیاں لگائیں
غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں   بلبل نے چہک کے دیں دعائیں
بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی   کویل نے یہ پھیر دی منادی
معشوقۂ گلعذار آئی   آئی آئی بہار آئی

کسان کھیتی باڑی میں جس طرح اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

گھر سے اپنے کسان نکلے   بوڑھے، بالے، جوان نکلے
تاروں کی چھاؤں منہ اندھیرے   کھیتوں میں پہونچ گئے سویرے
گوڑی جوتی زمیں کمائی   نیچے کی زمین اوپر آئی
پُر سے پانی کسی نے کھینچا   بعضوں نے ڈھیکلی سے سینچا

برہا کوئی سنبھالتا ہے   نالی کوئی نکالتا ہے
کھیتی پہ نثار ہونے والے   وہ جوتنے بونے والے
پانی کھیتوں میں بھر چکے وہ   جو کچھ کرنا تھا کر چکے وہ

مثنوی بہار اردو کی پہلی مثنوی ہے جس میں کسان کا خوشحال ہونا ضروری سمجھا گیا ہے ورنہ برق کے دور کے جاگیردارانہ نظام میں تو اس کی مٹی پلید تھی۔ یہ اشعار آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں

گھبرا نہ کسان ہے خدا ساتھ   اللہ کے ہیں بڑے بڑے ہاتھ
دنیا کا رفیق تو ہے دہقاں   عالم کا شفیق تو ہے دہقاں
مفلس قلاش بھوکے محتاج   زردار امیر صاحب تاج
سب کا تو نے ہے پیٹ پالا   تیرا ہو جہاں میں بول بالا
تری فیاضیاں ہیں مشہور   کیوں کر نہ ہوں تجھ پہ مغرور
یا رب برسا دے ابر رحمت   لگ جائے ٹھکانے اس کی محنت
نیت میں ہو پھل جناب باری   محنت ہو سپھل جناب باری
ٹھنڈے جھونکے چلیں خدایا   شاخیں پھولیں پھلیں خدایا
ہاں جوشش نمو بڑھے الٰہی   یہ بیل منڈھے چڑھے الٰہی
پودے جو نہال ہوں تو بن جائے   دہقاں خوشحال ہوں تو بن جائے
اے ابر کنوں پہ ہوش ذرا   اے رحمت حق بجوش ذرا
گاڑھی ہے کسان کی کمائی   باشد کہ برد کرم نمائی

برق کو بیانیہ شاعری پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ ایک نظم میں بات کی کیفیت اور اس کے نتیجے میں جنگل کی حالت کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

خورشید کو بادلوں نے گھیرا   عالم میں چھا گیا اندھیرا
کرنوں سے ہوا لطیف ہو کر   چلنے لگی بن کے باد صرصر
بادل اڑتے ہوا سے بھاگے   باتیں کرتے ہوا سے بھاگے
میدانوں میں بڑھ کے آ گئے وہ   کہساروں پہ چڑھ کے چھا گئے وہ
ٹکرائے پہاڑ سے کہیں پہ   جھلا کے برس پڑے وہیں پر
اونچی نیچی پہاڑیوں پر   دھاریں گرتی ہیں لڑکھڑا کر
چشمے کہیں شور کر رہے ہیں   نالے کہیں زور کر رہے ہیں
سوتے ہیں ابل رہے کہیں پر   فوارے اچھل رہے کہیں پہ

نہریں اٹھلاتی جا رہی ہیں لہریں موجیں اڑا رہی ہیں

برسات کے بعد پہاڑوں اور جنگلوں میں جوشِ نمو اور ہریالی کی کیفیت ملاحظہ ہو:

سبزے سے ہرا ہے دامن کوہ پھولوں سے بھرا ہے دامن کوہ
تختہ ہے چمن کا یا پہاڑی گملا پھولوں کا ہے کہ جھاڑی
سبزے کا پہاڑ پر یہ انداز جیسے چہرے پہ سبزہ آغاز
گھاٹی پھولوں سے رشکِ گلزار دامن پہ درخت سلسلہ دار
مشاطۂ سبزہ رنگ ہے گھاس ہر پھول میں ہے دلہن کی بوباس
بیلیں ہیں پڑی ہوئی شجر پر بندھن واری بندھی ہے در پر
چرتے ہیں ہرن پرے جمائے پھرتے ہیں کنوتیاں اٹھائے
مستی میں کلیلیں کر رہے ہیں میداں میں طرارے بھر رہے ہیں

خدا کی قدرت کے کرشمے ہر طرف عیاں ہیں۔ ہر شے اس کی عبادت میں مصروف ہے۔ اس کی تصویر برقؔ نے بڑے دل کش انداز میں کھینچی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کھوہوں میں چھپے ہوئے ہیں زہاد دنیا بھولی ہوئی خدا یاد
چپ بیٹھے ہیں دھونیاں رمائے اللہ سے اپنی لو لگائے
صانع کی دیکھتے ہیں صنعت اللہ کی دیکھتے ہیں قدرت
ہر شے سے عیاں ہے نور اس کا ہر رنگ میں ہے ظہور اس کا
جھیلیں، دریا، پہاڑ، چشمے اس کی قدرت کے ہیں کرشمے
مرغانِ چمن سُروں میں گاؤ توحید کے زمزمے سناؤ
مرغانِ چمن چہک اٹھو تم گلہائے چمن مہک اٹھو تم
بلبل کی زباں پہ قال آئے پتی پتی کو حال آئے
قدرت کے ہتھکنڈے سے ترلے دیکھیں آنکھوں سے آنکھوں والے

بسنت رُت میں حسینوں اور مہ جبینوں کی کیفیت دیکھیے۔ مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

آتے ہی بسنت مدھ پر آئیں شاخیں آموں کی بور لائیں
کوئل کوکی تو آئے بادل سر پہ گلشن کے چھائے بادل
اوپر چھائی ہوئی گھٹا ہے نیچے پریوں کا جمگھٹا ہے
شکلیں نکھری ہوئی ہیں سب کی زلفیں بکھری ہوئی ہیں سب کی
سحر انکھڑیوں میں زباں میں جادو نظروں میں فسوں بیاں میں جادو
مستانی ادا نشیلی آنکھیں تیکھی چتون رسیلی آنکھیں
بانکی وہ چھب وہ ترچھی چتون شوخی طراری چلبلا پن
ہنستی پھرتی ہے کوئی تنتی جوڑا پہنے ہوئے بسنتی
کلیاں چن چن کے توڑتی ہیں آپس میں شگوفے چھوڑتی ہیں
کھل کھیلی ہیں راگ لا رہی ہیں مل مل کے بسنت گا رہی ہیں
دنیا تو بہار سے ہے مسرور ہے برقؔ کا سوزِ دل بدستور
واں دولت چمن کے لٹے ہیں یاں داغ کہن ہرے ہوئے ہیں

گل بے رخ یار خوش نباشد
بے یار بہار خوش نباشد

مختصر یہ کہ برقؔ لکھنوی ایک بلند پایہ شاعر، زبردست ادیب اور نامور انشا پرداز تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ انھیں ادبی دنیا نے ایک طرح سے بھلا دیا ہے اور ان کی یاد دلوں سے محو ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ بہ قول پروفیسر محوی صدیقی" اردو کی مستند تاریخوں میں بھی ان کا ذکر نہیں۔" اس لیے ضرورت ہے کہ ان کے تخلیقی کارناموں کو ادب دوستوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اس نامور ادیب و انشا پرداز کی ادبی اور تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں سے لوگ واقف ہو سکیں۔



نہرو کے جانشین شاستری

عبدالمجیب سہالوی

نہرو کے جانشین لال بہادر شاستری نیک طبیعت، سادہ لوح اور نرم مزاج آدمی تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عقائد میں سے ہی پختہ اور اپنے فیصلوں میں اتنے ہی اٹل تھے۔ وہ ہر شخص کے نقطۂ خیال کو ہمدردی سے سنتے لیکن مسائل کے متعلق رائے غور و فکر کے بعد خود قائم کرتے اور جب سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کر لیتے تو اس پر سختی سے جمے رہتے۔

نہرو کی جانشینی جہاں خوش قسمتی کی بات تھی وہاں ان کی جیسی ہمہ گیر اور بین اقوامی شخصیت کے بعد آنے والے کے لئے یہ دشواری بھی تھی کہ اس پر پڑنے والی نظریں پہلے ہی سے سورج کی روشنی سے ایسی چکاچوندھ ہوتیں کہ انھیں سامنے کی ہر چیز دھندھلی نظر آتی۔

شاستری جی وزیر اعظم ہونے کے بعد پہلی مرتبہ جب لکھنؤ آئے تو نہرو کی جگہ لینے والے وزیر اعظم کو دیکھنے کے لئے پبلک ٹوٹ پڑی لکھنؤ کے لئے لال بہادر شاستری نئے نہ تھے۔ دیکھنے کے لئے آنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو انھیں قریب سے دیکھ چکے تھے اور وہ بھی تھے جنھوں نے ابھی تک انھیں نہیں دیکھا تھا، جو دیکھ چکے تھے وہ محض انھیں نئی حیثیت میں دیکھنے آئے تھے لیکن جنھوں نے نہیں دیکھا تھا ان کا شوقِ دید دیکھنے والا تھا۔ مگر جب ان کے پاس سے کھلی جیپ کار میں پانچ فٹ کا چھوٹا سا آدمی بند گلے کا کوٹ اور دھوتی پہنے، ہاتھ جوڑے سلام کرتا ہوا گزرا تو نہرو کو دیکھنے والی نظریں کچھ مایوس سی نظر آئیں لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ آنکھوں کی چکاچوندھ ختم ہونے کے بعد شاستری جی کی شخصیت اس طرح اُبھر کر سامنے آنے لگی جس طرح غروب آفتاب کے بعد اُفق پر چاند طلوع ہوتا ہے۔ وہ قد و قامت اور شکل و صورت میں نہیں بلکہ نظریات اور عقائد میں نہرو کے سچے اور پکے جانشین ثابت ہوئے اور انھوں نے بڑی پامردی سے ان کی پالیسیوں پر عمل درآمد کرنا شروع کر دیا۔

نہرو کے بعد کون؟ کا سوال نہ صرف ہندستان کے لوگوں کے دماغوں کو پریشان کئے ہوئے تھا بلکہ مغربی ممالک کے سیاست داں بھی اس کے بارے میں عجیب و غریب قیاس آرائیاں کر رہے تھے لیکن جواہر لال کے بعد لال بہادر شاستری کے متفقہ انتخاب نے دنیا کی نظروں میں ہندستان کی ساکھ کافی اونچی کر دی۔ اس متفقہ انتخاب کے جہاں اور دوسرے اسباب تھے وہاں شاستری جی کا بے داغ سیاسی کیریر، نیک دلی، نرم مزاجی اور رواداری بھی تھی۔ اُن کے خلاف کسی کے دل میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ ان کے سیاسی مقابل بھی انھیں اپنا مخالف نہ خیال کرتے تھے۔ بغیر کسی تلخی اور گرمی کے اپنی بات منوانے کی اُن کے اندر خداداد صلاحیت تھی۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل صبر کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعہ طے کرنے کا طریقہ اپناتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔ آسام اور جنوبی ہند کے لسانی جھگڑے طے کرانے میں انھوں نے جو اہم رول ادا کیا وہ ان کے اندر ثالث بننے کی قدرتی اہلیت کا بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح انھوں نے موئے مبارک کی چوری کے بعد

کشمیر میں پیدا ہونے والی نازک صورت حال سے نپٹنے کے لئے براہِ راست گفت و شنید کا جو طریقہ اختیار کیا وہ ان کے مصالحانہ رویہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ انھوں نے کشمیر کے مسلمانوں سے کھلے دل سے بات چیت کر کے ان کے شبہات دور کئے اور انھیں اطمینان دلا دیا کہ مسروقہ موئے مبارک بازیاب ہو گیا ہے اور انھیں دھوکہ نہیں دیا جا رہا ہے۔

حالاتِ زندگی۔ نہرو کے بعد ہندستان کی باگ ڈور سنبھالنے والے وزیر اعظم لال بہادر شاستری ۲ راکتوبر ۱۹۰۴ء کو ایک غریب کائستھ خاندان میں ایک اسکول ٹیچر کے گھر مغل سرائے ضلع بنارس میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ ڈیڑھ ہی سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کی اور ان کی دو بہنوں کی تربیت کا بار ان کے نانا پر پڑا اور انھوں نے ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام بنارس میں کیا۔

ابھی ان کی عمر ۱۷ ہی سال کی تھی کہ وہ گاندھی جی کی تحریک ترک موالات میں شرکت کے لئے ۱۹۲۱ء میں تعلیم نامکمل چھوڑ کر چلے آئے اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ جیل پہنچ گئے۔ جیل سے رہائی کے بعد بنارس کی مشہور اور قدیم درسگاہ کاشی ودیا پیٹھ میں پڑھنے لگے۔ یہاں آچاریہ نریندر دیو اور ڈاکٹر بھگوان داس جیسے ممتاز ٹیچروں اور دیش پریمیوں کی صحبت میں انھیں اپنا کردار بنانے میں بڑی مدد ملی۔ کاشی ودیا پیٹھ سے انھوں نے شاستری کی سند حاصل کی جو بعد میں ان کے نام کا ایک ضروری جز بن گئی اور اسی بنا پر بعض لوگ غلطی سے انھیں برہمن سمجھنے لگے۔

للتا دیوی سے ان کی شادی ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ شادی کے موقع پر انھوں نے اس وقت کے عام رواج کے بالکل خلاف جہیز میں تھوڑی سی کھادی اور ایک چرخے کے علاوہ اور کوئی چیز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے سے ان کے مزاج کی سادگی اور اخلاق کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاستری جی شادی سے ایک سال پہلے ہی بنارس سے الٰہ آباد چلے آئے تھے اور انھوں نے مقامی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہاں انھوں نے میونسپل بورڈ کے ممبر اور ضلع کانگرس کمیٹی کے عہدے دار کی حیثیت سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ الٰہ آباد کے قیام میں انھیں پنڈت جواہر لال نہرو کے قریب آنے کا موقع ملا اور جلد ہی انھوں نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا جو آخر وقت تک قائم رکھا۔

رفتہ رفتہ شاستری جی کی سیاسی سرگرمیوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور وہ ضلع اور شہر کی سیاست سے آگے بڑھ کر صوبے کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ یو۔ پی ہندستان کا سب سے بڑا اور اہم صوبہ ہونے کی بنا پر تحریک آزادی کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۲ء کے درمیان مہاتما گاندھی کی چلائی جانے والی تحریکوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا کیونکہ گاندھی جی کا عدم تشدد کا طریقۂ کار ان کے مزاج کے بالکل موافق تھا۔ اس عرصے میں وہ سات مرتبہ جیل گئے اور مجموعی طور پر نو سال جیل میں رہے۔

جب کانگرس نے ۱۹۳۵ء میں صوبائی اسمبلیوں میں جانے کا فیصلہ کیا تو شاستری جی یو۔ پی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد تحریک آزادی کی سرگرمیاں بڑے زور شور سے شروع ہو گئیں اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں ملک کو آزادی حاصل ہو گئی۔ اس سال پھر شاستری جی یو۔ پی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس وقت شری گووند بلبھ پنت یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے شاستری جی کو اپنا پارلیمنٹری سکریٹری مقرر کیا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد انھیں اپنی کابینہ میں لے لیا۔

چند سال بعد ۱۹۵۱ء میں نہرو جی نے انھیں کانگرس کی انتخابی مہم چلانے کے لئے پارٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے دہلی بلا لیا۔ جب ۵۲ء میں نئی پارلیمنٹ وجود میں آئی تو شاستری جی نے راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے اپنا کیریر شروع کیا اور اسی سال وہ وزیر ریلوے و نقل و حمل بنا دیئے گئے۔ لیکن نومبر ۵۶ء میں ایک ریلوے حادثہ ہوا جس میں بہت سی جانوں کا نقصان ہوا جس کا گہرا اثر شاستری جی کے دل پر پڑا اور ان کے نیک ضمیر نے یہ محسوس کیا کہ ریلوے وزیر ہونے کی حیثیت سے اس کی ذمے داری ان کے اوپر آتی ہے اور انھوں نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ اس طرح انھوں نے ایک اچھی جمہوری روایت قائم کی جس کی بنا پر عوام کے دلوں پر شاستری جی کے خلوص، فرض شناسی اور ایمانداری کا بڑا اچھا اثر پڑا اور ان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔

پھر ۱۹۵۶ء میں انھیں دوبارہ وزیر مواصلات، نقل و حمل و صنعت و تجارت بنایا گیا۔ اس کے بعد مسٹر گووند بلبھ پنت کے انتقال پر شاستری جی کو ان کی جگہ وزیر داخلہ مقرر کیا گیا۔ وزیر داخلہ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد شاستری جی کو اپنی اہلیتوں کو بروئے کار لانے کا زیادہ موقع ملا اور انھوں نے اپنی محنت ایمانداری اور احساس فرض سے ملک کی سیاست میں ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی اور نہرو جی سے پندرہ سال چھوٹے ہونے کے باوجود وہ ان کے قریب ترین ساتھی اور بھروسے کے دوست بن گئے۔

کامراج منصوبے کے سلسلے میں کانگریس پارٹی کا کام کرنے کے لئے شاستری جی نے وزارت سے استعفا دیدیا لیکن نہرو جی نے اپنی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے انھیں پھر چھ ماہ کے بعد وزیر بلا محکمہ کی حیثیت سے بلا لیا۔ اس واقعے سے شاستری جی پر نہرو جی کے اس اعتماد کا پتہ چلتا ہے جو وہ ان پر رکھتے تھے۔ دراصل اس طرح انھوں نے بغیر نامزد کئے شاستری جی کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔

سادگی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ بنارس کے ایک گاؤں کا غریب لڑکا جس کے پاس بعض وقت اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ وہ کشتی کا کرایہ ادا کر سکے اور دریا پار کر کے اسکول سے اپنے گاؤں واپس جا سکے ایک دن ہندستان کی کشتی کا کھیون ہار بنے گا اور ملک کی نیا انتہائی نازک موقع پر پار لگائے گا۔ لیکن جیسے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں اسی طرح بڑا لیڈر اور ملک کا رہنما بننے والی شخصیتوں میں بچپن ہی سے ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو ان کے بڑے پن اور ان کے روشن مستقبل کی نشان دہی کرتی ہیں۔

شاستری جی کے بچپن کے ایک معمولی واقعے سے ان کی پوری شخصیت اور کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ایک دن وہ اسکول سے گھر واپس آ رہے تھے تو جب گھاٹ پر پہنچے تب انھیں احساس ہوا کہ ان کے پاس کشتی کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں، شام ہو رہی تھی، گھر پہنچنا تھا۔ وہ تھوڑی دیر گھاٹ پر کھڑے سوچتے رہے اور آخر انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ساتھیوں سے مانگنے یا کشتی والے کی خوشامد کرنے سے بہتر ہے کہ وہ ہمت کر کے تیر کر دریا پار کر جائیں چنانچہ وہ احسان کا بار اٹھانے کے بجائے سر پر کتابوں کا بستہ رکھ کر تیرتے ہوئے دریا پار کر گئے۔

جب وہ غربت کی گود سے نکل کو وزارت کی گدی پر پہنچے تب بھی انھوں نے اپنے رہن سہن میں وہی سادگی باقی رکھی جس کے وہ بچپن سے عادی تھے۔ وہ اپنی پوری تنخواہ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کو دیدیتے اور اس میں سے وہ ان کے ضروری اخراجات کے لئے جو رقم دیدیتی اسی میں گذر بسر کرتے۔ وہ گھر میں اپنے بال بچوں کے ساتھ گھل مل کر بے تکلفی اور سادگی سے رہتے۔ آخر وقت تک وہ مسہری کے بجائے معمولی چارپائی پر سوتے اور سادہ کھانا کھاتے رہے۔

کام سے تو وہ گھبراتے ہی نہ تھے بلکہ محنت تو ان کے لئے عبادت کی حیثیت رکھتی تھی وہ اپنا کام اسی خلوص اور لگن سے کرتے جیسے عبادت کی جاتی ہے۔ وہ صبح سویرے اٹھ جاتے اور رات گئے تک کام کرتے رہتے وہ روزانہ اوسطاً ۱۸ گھنٹے کام کرتے۔

شاستری جی کی سادگی اور سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے بڑے پن کو ظاہر کرنے کے بجائے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ مرکزی وزیر داخلہ ہونے کے بعد وہ ایک مرتبہ لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ میں قومی آواز کے دفتر سے نکل رہا تھا کہ گیٹ کے پاس گاندھی کیپ لگائے بند گلے کا کوٹ پہنے چھوٹے قد کا کوئی آدمی چپکے سے گزر گیا۔ مجھے کچھ شبہ ہوا۔ میں نے پلٹ کر غور سے جو دیکھا تو شاستری جی نیشنل ہیرالڈ کے اڈیٹر چلاپتی راؤ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے اور ان کی کار گیٹ سے کافی دور سڑک پر کھڑی تھی۔

انھیں خصوصیات کی بنا پر نہرو جی، شاستری جی کے متعلق کہا کرتے تھے کہ "کوئی شخص اس سے بہتر ساتھی کی کیا خواہش کر سکتا ہے؟" شاستری جی پنڈت نہرو کی ذات ہی سے قربت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے خیالات سے بھی کافی قریب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انتقال سے ایک دن پہلے جب نہرو جی دہرہ دون سے آرام کے بعد دہلی واپس آئے تو شام کو کابینہ کے ساتھیوں سے بات چیت کے بعد نہرو جی نے شاستری جی کو روک لیا اور انھیں ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں شاستری جی

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

آبپاشی کے مسائل کے حل کرنے میں عملی نقطہ نظر اپنانے پر وزیر اعلیٰ کا زور ... کچے کنوؤں کے لئے امداد دینے کا آسان طریقہ ... خاندانی منصوبہ بندی کی رفتار تیز کرنے کے لئے ترقیاتی عملے کو تکنیکی تربیت دینے کا فیصلہ ... بیوپاریوں کے لئے سیمنٹ کے اسٹاک اور قیمت کا ظاہر کرنا ضروری ... پردیش کے ۳۱ ضلعوں میں چھوٹی بچت کا مقررہ نشانہ نصف سے زیادہ پورا ... نہرو ادارہ کوہ پیمائی کے ادارے کا سنگ بنیاد رکھا گیا ... سوکھے کے پیش نظر کفایت شعاری پر زور ... میڈیکل کالج کے تعلیمی عملے کی تنخواہوں پر نظر ثانی ... نئے پڑھنے والوں کے لئے کتابیں —— پانچواں انعامی مقابلہ ... تعلیمی اداروں کی جانب سے دفاعی فنڈ میں ۴۵ لاکھ کا عطیہ

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شریمتی سوچیتا کرپلانی نے حال ہی میں انجینیروں سے [کہا] کہ وہ ریاست کے آبپاشی کے مسائل کو حل کرنے میں عملی نقطہ نظر اپنائیں۔ انھوں [نے] انجینیروں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں ضرورت کے مطابق آبپاشی کے [نئے] اور پرانے دونوں ہی طریقوں کو کام میں لائیں۔

شریمتی کرپلانی لکھنؤ میں ودھان بھون میں ریاستی آبپاشی کمیشن کے [پہلے] جلسے سے خطاب کر رہی تھیں۔ یہ کمیشن اس سال ستمبر میں اتر پردیش میں [آب]پاشی کی ترقی سے متعلق مسائل پر غور و خوض کرنے اور رپورٹ دینے کے لئے [مقر]ر کیا گیا تھا۔

وزیر اعلیٰ نے مزید کہا کہ گزشتہ سال جو دو لاکھ کنوئیں کھودے گئے تھے ان سے ایک لاکھ کنوئیں زبردست خشک سالی کے باعث پانی کی سطح نیچی ہو جانے [کی] وجہ سے سوکھ گئے۔ اس کی تلافی کے لئے اس سال پھر ایک لاکھ کنوئیں [کھو]دنا پڑے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے نل کنوئیں کسی نہ کسی وجہ سے بند [پڑ]ے ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ گنگا کا میدان آبپاشی کے وسائل اور [قابل] کاشت رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا علاقہ ہے۔ اس لئے جب انھیں [مرکز] سے مزید اناج مانگنے کے لئے جانا پڑتا ہے تو وہ شرم محسوس کرتی ہیں۔ [انھوں] نے کمیشن کے ممبروں کو صلاح دی کہ وہ بندیلکھنڈ کے منطقے میں بڑی [تعدا]د میں خشک تالابوں کو کام میں لانے نیز ندی نالوں سے پانی اٹھانے [کے ا]مکانات پر غور کریں۔

ریاست کے مغربی اضلاع کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ وہاں آبپاشی کے تمام وسائل دستیاب ہیں لیکن پانی لگنے کی وجہ سے فصلوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے اس مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

وزیر آبپاشی نے اپنی تقریر میں کہا کہ فصلوں کو سیلاب سے اکثر زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ سیلاب زمین سے قیمتی معدنیاتی اجزا کافی مقدار میں بہا لے جاتے ہیں جو اچھی فصلوں کے لئے بہت ضروری ہیں۔ سیلاب سے تقریباً ۵۰ لاکھ ایکڑ آراضی متاثر ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ انھوں نے کمیشن سے کہا کہ وہ مسئلے کے اس پہلو پر بھی توجہ دے اور زراعت کو بہتر بنانے کے لئے پانی کے ان وافر وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی حل تلاش کرے۔

اتر پردیش کی تاریخ میں آبپاشی سے متعلق یہ پہلا کمیشن ہے۔

کسانوں کو کچے کنوؤں کی تعمیر کے لئے مالی امداد دینے کے واسطے ایک آسان طریقہ اپنایا گیا ہے۔ ضلع افسروں کو ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ وہ ہر گاؤں سے سیکھ پالوں کے ذریعے مالی امداد کے واسطے درخواستیں جمع کرنے کا بندوبست کریں اور کسانوں کو مالی امداد کی ادائیگی کے لئے ایک تحصیل میں ۸-۱۰ مرکز قائم کریں [illegible] کے لئے نہ کہیں دور جانا پڑے اور نہ [illegible]

پوش ۱۰۰۰ اشک

۱۹۷۰ء

ان کا قیمتی وقت برباد ہو۔

مالی امداد کی درخواستوں کے لئے نہ کوئی کورٹ فیس لی جاتی ہے اور نہ اسٹامپ ہی لگانا ہوتا ہے۔ مختلف مرکزوں میں مالی امداد کی تقسیم کے بارے میں ہر گاؤں میں کافی پہلے سے اعلان کر دیا جائے گا اور آئندہ ۱۵ دسمبر تک اس کی تقسیم کا کام ختم ہو جائے گا۔

یہ مالی امداد ۳½ ایکڑ تک کی جوت والے کھاتے دار کو ایک کچے کوئیں کے لئے ۲۰ روپیہ کے حساب سے زیادہ سے زیادہ ۴۰ روپیہ تک دی جائیگی۔ اس کے لئے انفرادی یا پورے گاؤں کے لئے اجتماعی طور سے درخواستیں دی جا سکتی ہیں۔

ضلع افسروں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ لیکھ پالوں کو یہ ہدایات جاری کر دیں کہ وہ ہر معاملے میں درخواست کے ساتھ کھتونی کے انتخاب کے داخل کئے جانے پر اصرار نہ کریں۔ درخواست پر لیکھ پال سے یہ تصدیق کرانا کافی ہوگا کہ اس نے اپنا اطمینان کر لیا ہے کہ درخواست دہندہ کی گاؤں میں زمین ہے جو ۳½ ایکڑ سے زیادہ نہیں ہے اور درخواست پر متعلقہ کھاتے دار نے خود دستخط کئے ہیں۔

مختلف مرکزوں میں تحصیل دار یا سب ڈویژنل افسر متعلقہ کھاتے دار سے مقررہ فارم پر وصولیابی لکھانے کے بعد اسے مالی امداد ادا کریں گے۔ رقم کی ادائیگی کے وقت روپیہ پانے والے کی شناخت لیکھ پال کریں گے۔

ترقیاتی محکموں کے عملے کے لوگوں کو جنہیں پنچایت راج، اجتماعی ترقی اور زراعت کے محکموں کے تربیتی مرکزوں میں عوام سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے، خاندانی منصوبہ بندی کی مختصر مدت کی ٹریننگ دی جائے گی۔ اہم غیر سرکاری افراد مثلاً پرمکھوں، گرام سبھاؤں کے پردھانوں کو بھی یہ ٹریننگ دی جائے گی۔

یہ فیصلہ مرکزی خاندانی منصوبہ بندی کے سکریٹری شری گووند نرائن اور حکومت اتر پردیش کے افسران کے مابین خاندانی منصوبہ بندی کے کام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے موضوع پر تبادلہ خیالات کے بعد کیا گیا۔

اس سلسلے میں دوسرا اہم فیصلہ یہ کیا گیا کہ اتر پردیش کے چار اضلاع بستی، گورکھپور، میرٹھ اور علی گڑھ میں بھرپور خاندانی منصوبہ بندی کیمپ

ریاستی حکومت نے ریاست میں ہر سیمنٹ بیوپاری کے لئے یہ لازمی قرار دیدیا ہے کہ اس دن کا اسٹاک اور فی بوری خردہ قیمت کا نوٹس اپنے کاروباری مقام پر لکھ کر لگا دے۔

یہ نوٹس ہندی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے گا اور بیوپاری کی دکان کے دروازہ یا کسی اور نمایاں مقام پر لگایا جائے گا۔ اس نوٹس پر بیوپاری کے دستخط بھی ہوں گے۔

سیمنٹ کے بیوپاریوں پر یہ پابندی اتر پردیش سیمنٹ آرڈر سنہ ۱۹۶۶ء کے تحت عائد کی گئی ہے جو ۱۸ نومبر سے نافذ ہو گیا ہے۔

اس آرڈر کے تحت سیمنٹ بیوپاری کو ہر خریدار کو صحیح رسید دینا ہوگی جس میں خریدار کا نام اور پتہ خریداری کی تاریخ، فروخت شدہ مقدار، نرخ اور وصول شدہ کل رقم درج ہوگی۔ بیوپاریوں کو رسیدوں کی کتاب دکان پر رکھنا ہوگی اور اسے معائنہ کے لئے پیش کرنا ہوگا۔

اس حکم کے تحت ضلع مجسٹریٹوں کو یا ان کی جانب سے ضلع میں مقرر کئے ہوئے کسی دوسرے افسر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس آرڈر کی خلاف ورزی روکنے کے لئے کسی بھی عمارت، کشتی یا گاڑی میں داخل ہو سکتے ہیں، تلاشی لے سکتے ہیں اور معائنہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سیمنٹ کے کسی بھی ایسے اسٹاک کی تلاشی لے سکتے ہیں، اسے ضبط کر سکتے ہیں یا ہٹا سکتے ہیں جس کے بارے میں ان کو یقین ہو کہ اس آرڈر کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ مزید برآں وہ اس آرڈر کی خلاف ورزی کی روک تھام کے لئے کسی بھی عمارت گاڑی یا کشتی کے مالک قابض یا کسی بھی دوسرے شخص سے کوئی بھی رجسٹر، بہی کھاتے یا دوسرے کاغذات طلب کر سکتے ہیں۔

اتر پردیش کے ۱۲ ضلعوں میں مالیاتی سال رواں کے لئے چھوٹی بچت کے مقررہ نشانوں کے نصف سے زیادہ کی تکمیل ہو گئی ہے۔

چھوٹی بچت میں گزشتہ ۳۰ ستمبر تک جمع کی گئی رقم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ضلعوں میں سے چار ضلعوں نے اس رقم کا تین چوتھائی سے زیادہ جمع کر لیا ہے جو ان کو پورے سال میں جمع کرنا تھی۔ ان ضلعوں کے نام اور مقررہ نشانوں کی تکمیل کے فیصد کی تفصیل درج ذیل ہے۔

دہرہ دون ۸۲ء۰۹، غازی پور ۷۴ء۷۵، اعظم گڑھ ۵۶ء۹۱

اور سلطان پور ۶۴ء/۷۵۔

ڈویزنوں میں فیض آباد میں مقررہ سالانہ نشانے کے نصف سے زیادہ کی تکمیل ہوئی۔ ڈویزنوں کے چھ ضلعوں میں سے چار اضلاع فیض آباد، بہرائچ، سلطان پور اور پرتاپ گڑھ نے چھوٹی بچت کے ضمن میں نمایاں کارگزاری دکھائی۔

اتر کاشی سے تقریباً آٹھ میل دور اور سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر واقع بھی ڈنڈا میں ۱۴ نومبر کو نہرو ادارہ کوہ پیمائی کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے جو اتر پردیش میں قائم کیا گیا ہے۔

سنگ بنیاد رکھنے کے لئے اس دن کے انتخاب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کا جنم دن بھی تھا۔ پہاڑوں اور کوہ پیمائی سے پنڈت نہرو کی محبت کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ادارہ ان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس ادارے سے جو گزشتہ سال ۱۴ نومبر ہی کو قائم کیا گیا تھا اب تک ۱۲۷ افراد بیسک کورس اور ۱۳ افراد اعلیٰ کورس میں ٹریننگ حاصل کر چکے ہیں۔

اس موقع پر دوسرے اعلیٰ اور ساتویں بیسک کورسوں کی ٹریننگ پانے والوں کو سرٹیفکٹ دینے کی رسم بھی ادا کی گئی۔

تربیت پانے والوں نے پہاڑ پر چڑھنے اور جان بچانے کا مظاہرہ کیا نیز لوک گیتوں اور ناچوں کا ایک پروگرام بھی پیش کیا۔ اس کے علاوہ کوہ پیمائی کے ساز و سامان اور جڑی بوٹیوں کی ایک نمائش بھی منعقد کی گئی جس میں اس ادارے کی عمارت کا ایک ماڈل بھی رکھا گیا۔

اس ادارے کی کامیابی کے لئے ۲۰ ملکوں سے جن میں برطانیہ، فرانس اور روس شامل ہیں، پیغامات موصول ہوئے۔ علاوہ ازیں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی، سابق وزیر دفاع شری وائی۔ بی۔ چوہان، سابق وزیر تعلیم شری چھاگلا، فوج کے تینوں چیف، مہاراجہ پٹیالہ اور سکم کے چوگیال نے بھی اپنے پیغامات بھیجے تھے۔

حکومت اتر پردیش نے خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں عوام کی پریشانیوں کے پیش نظر سختی کے ساتھ کفایت شعاری کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ڈویزنل کمشنروں اور ضلع مجسٹریٹوں سے کہا گیا ہے کہ تمام افسروں کو چاہئے کہ وہ عام دعوتوں، افتتاحی تقریبات بالخصوص الوداعی پارٹیوں میں، جہاں کھانے وغیرہ کا انتظام ہو، شرکت کرنے سے احتراز کریں۔

حکومت نے ان افسران کو یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ غیر سرکاری کمیٹیوں کو عوام میں کفایت شعاری کا ماحول پیدا کرنے میں مدد دینے کے لئے راغب کریں۔

ریاستی حکومت نے میڈیکل عملہ کی کمی سے متعلق اعلیٰ طاقتی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق ریاست میں میڈیکل کالجوں میں تدریسی عملہ کی تنخواہ کی شرحوں پر نظر ثانی کی ہے۔

نظر ثانی شدہ شرحوں کے مطابق جو یکم اپریل سنہ ۱۹۶۵ سے نافذ کی گئی ہیں میڈیکل کالج کے پروفیسر کی شرح تنخواہ ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۴۰۰ - ۶۰ - ۱۷۰۰ روپئے کر دی گئی ہے اس کے علاوہ پروفیسر کو تنخواہ کا ۲۵ فیصدی پریکٹس نہ کرنے کے الاؤنس کے طور پر ملے گا لیکن یہ الاؤنس ۳۰۰ روپئے سے کم اور ۴۰۰ روپئے سے زیادہ نہیں ہوگا۔ پرانی شرح تنخواہ پریکٹس نہ کرنے کے الاؤنس کے ساتھ ۱۱۰۰ - ۴۰ - ۱۴۴۰ روپئے اور پریکٹس کرنے کی صورت میں ۹۰۰ - ۴۰ - ۱۱۴۰ روپئے تھی۔

ریڈروں کے لئے تنخواہ کی نظر ثانی شدہ شرح ۷۰۰ - ۵۰ - ۱۲۵۰ روپئے ہوگی اور ان کی ابتدائی تنخواہ ۷۵۰ روپئے ہوگی اور اس کے ساتھ انھیں تنخواہ کے ۲۵ فیصدی کے برابر پریکٹس نہ کرنے کا الاؤنس ملے گا جبکہ اس سے پہلے پریکٹس نہ کرنے کے الاؤنس کے ساتھ ان کی شرح تنخواہ ۶۰۰ - ۳۰ - ۹۰۰ روپئے تھی اور پریکٹس کرنے کی صورت میں ۵۰۰ - ۳۰ - ۸۰۰ روپئے تھی۔

اب میڈیکل کالج کے لکچرر کی شرح تنخواہ ۴۰۰ - ۴۰ - ۸۰۰ - ۵۰ - ۹۵۰ روپئے کر دی گئی ہے اور اس کی ابتدائی تنخواہ ۴۸۰ روپئے ہوگی اور تنخواہ کا ۲۵ فیصد پریکٹس نہ کرنے کے الاؤنس کے طور پر ملے گا جبکہ پرانی شرح تنخواہ پریکٹس نہ کرنے کے الاؤنس کے ساتھ ۴۰۰ - ۲۵ - ۶۵۰ روپئے اور پریکٹس کرنے کی صورت میں ۳۵۰ - ۲۵ - ۶۰۰ روپئے تھی۔

ڈیمانسٹریٹروں، رجسٹراروں اور ٹیوٹروں کی نئی شرح ۳۰۰ - ۲۰ - ۴۰۰ روپئے ہوگی۔ علاوہ ازیں انھیں ان کی تنخواہ کا ۲۵ فیصدی پریکٹس نہ کرنے کے بھتے کے طور پر ملے گا۔ پرانی شرح تنخواہ ۲۰۰ - ۲۰ - ۲۲۰ روپئے

تنخواہ کی نئی شرحوں کو منتخب کرنے والوں کو وہی مہنگائی بھتہ ملے گا جو سرکاری ملازمین کو نئی شرح تنخواہ میں ملتا ہے۔

حکومت ہند کے اشتراک سے یونسکو کے زیر انتظام نئے پڑھنے والوں کے لئے کتابوں کا پانچواں مقابلہ منعقد ہونے جا رہا ہے۔

"نئے پڑھنے والوں" سے مراد ایسے افراد ہیں جو نو خواندگی کے مرحلے سے گزر چکے ہیں لیکن وہ ابھی ایسی عبارت کو سمجھنے سے قاصر ہیں جس میں تخیل کی بلند پروازی، پیچیدہ جملے، اصطلاحی زبان، تجریدی خیالات یا دور از کار تشبیہیں ہوتی ہیں۔

اس مقابلے میں ہندوستانی مصنفین کو ۹۶۴ روپئے فی انعام کے حساب سے ۱۴ انعامات دئے جائیں گے۔ یہ انعام آسامی، بنگلہ، گجراتی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی، سندھی، تامل، تیلگو اور اردو کی کتابوں پر دئے جائیں گے۔ حکومت انعام پانے والی کتابوں کی ۱۵۰۰ تک کاپیاں بھی خرید سکتی ہے۔

مقابلے کے لئے وہ کتابیں قبول کی جائیں گی جو یکم جنوری سنہ ۱۹۶۵ء اور ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۶۶ء کے درمیان شائع ہوئی ہوں۔ مسودے قبول نہیں کئے جائیں گے۔ ایسی کوئی کتاب جس پر حکومت ہند کے کسی مقابلے میں انعام مل چکا ہے، اس مقابلے کے لئے نہیں بھیجنا چاہئے۔

ہر کتاب کے ساتھ دس روپئے کا ایک خزانے کا چالان بھیجنا چاہئے۔ یہ رقم کسی خزانے یا دہلی خزانے میں "۲۲ ــــ ایجوکیشن ــ ای ــ جنرل متفرقات ــ سنٹرل" کی مد میں جمع کرنا ہوگی۔ جن جگہوں پر خزانہ نہیں ہے وہاں یہ رقم کراسڈ پوسٹل آرڈر کی صورت میں معاون مشیر تعلیم (ایس۔ ای۔ یو۔ ۲) وزارت تعلیم، نئی دہلی کو بھیجنا چاہئے۔

مقابلے کی مزید تفصیلات معاون مشیر تعلیم ایس۔ ای۔ یو۔ ۲۔ وزارت تعلیم، نئی دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کتابیں داخلہ فیس کے ساتھ ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۶۷ء تک پہنچ جانا چاہئیں۔

مقابلے کے نتائج کا اعلان ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۶۷ء تک کر دیا جائے گا۔

اتر پردیش میں تعلیمی اداروں اور دفتروں نے قومی دفاع فنڈ میں مزید ۱۴۳۰۰۵ روپئے بطور عطیہ دیا ہے جس سے ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء تک ان اداروں کے عطیات کی کل رقم ۴۵۰۶۸۶۶ روپئے تک پہنچ گئی۔

ڈائرکٹر محکمہ تعلیم کے توسط سے گزشتہ اکتوبر تک ۲۹۲۹۵۴۶ روپئے اور دوسرے دفتروں سے ۱۵۷۷۳۲ روپئے قومی دفاع فنڈ میں دئے گئے۔

ان اداروں نے مالی سال رواں میں ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء تک قومی بچت اسکیم کے مختلف تمسکات میں ۷۲۵۱۷۴۴ روپیہ لگایا جبکہ سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۲۲۲۴۸۵۷۰ روپیہ لگایا گیا تھا۔



نہرو کے جانشین ـــ شاستری جی (بقیہ صفحہ ۴۲)

انتظامی معاملات پر باتیں کرنے لگے لیکن نہرو جی اُن سے کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اچانک اُن سے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی شیروانی ہے۔ اس خلاف توقع سوال سے شاستری جی کچھ شرما سے گئے۔ اُن کے پاس کوئی شیروانی نہ تھی۔ نہرو جی سمجھ گئے کیونکہ کشمیر جاتے وقت شاستری جی انھیں کا اوورکوٹ مانگ کر لے گئے تھے۔ لیکن مانگے کی شیروانی سے کام نہ چل سکتا تھا۔ اس لئے نہرو جی نے کہا کہ دو شیروانیاں بنوا لیجئے۔ جولائی میں آپ کو دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے لئے جانا ہوگا اس وقت شیروانی کی ضرورت پڑے گی ـــ اور دوسرے دن صبح نہرو جی کا انتقال ہو گیا۔

وزیر اعظم ہونے کے بعد شاستری جی نے یہ ثابت کر دیا کہ نہرو جی نے اُن پر جو اعتماد کیا تھا وہ اس کے مستحق تھے۔ وہ نہرو کے لامذہبی، ناوابستگی اور نا طبقہ واری اصولوں کی پوری طرح پابندی کرتے رہے اور آخر دم تک قیام امن کے کوشاں رہے اور اسی کوشش میں انھوں نے وطن سے دور تاشقند میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔



تصحیح نیا دور بابتہ دسمبر ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا ایک مضمون بعنوان "رزمیہ شاعری اور میر انیس کا ایک مرثیہ" شائع ہوا ہے۔ کتابت کی غلطی سے صاحب مضمون کا نام اکبر حیدری کی بجائے اکبر حیدر شائع ہو گیا ہے۔ ناظرین درست فرمالیں۔

نقد و تبصرہ

(تبصرہ صرف اس کتاب پر کیا جائے گا جس کے دو نسخے موصول ہوں گے)

دادکی بیداد : مصنف عبدالمجیب سہالوی ۔ ناشر نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ، لکھنو ۔ صفحات ۱۶۰ ۔ قیمت دو روپے پچیس پیسے ۔

مزاح پر تبصرہ یا مزاح کا تعارف بجائے خود ایک عجیب سی بات ہے ۔ اگر کوئی آپ کو ہنسانے کی، منانے کی یا آپ کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ اپنی ٹانگ درمیان میں اڑائے اور یہ بتائے کہ اس نے آپ کو کتنا یا کیسا یا کیوں ہنسایا لیکن مجیب صاحب کے مزاحیہ مضمونوں یا آج کل کی زبان میں فکاہیوں کے اس مجموعے پر تبصرہ لکھنے کا جواز خود کتاب کے آغاز میں مصنف کے لکھے ہوئے احوال واقعی کے ایک جملے سے نکل آتا ہے ۔ مجیب صاحب نے "احوال واقعی" کے آخر میں لکھا ہے، "اگر مضامین پڑھ کر آپ کو رونا آئے تو خدا کے لیے میری خاطر سے ہنسنے کی کوشش کیجیے گا ۔" مجیب صاحب نے تو ممکن ہے یہ جملہ کسر نفسی میں لکھا ہو لیکن صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، ان مضامین کو پڑھ کر ہنسی تو بے ساختہ آتی ہے مگر جی رونے کو چاہتا ہے ۔ قبل اس کے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو یہ بات صاف کر دینا ضروری ہے کہ رونا مضامین پر نہیں بلکہ اُن مسائل پر آتا ہے جو مجیب صاحب نے اپنے مضامین کا موضوع بنائے ہیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مجیب صاحب ہی کی ہمت ہے کہ وہ اُن معاملات پر ہنس سکتے ہیں اور ہنسانے کی کوشش کر سکتے ہیں جن پر متوسط اور نچلے متوسط طبقے کا آدمی دن رات رو

مجیب صاحب کا موضوع یہی طبقہ اور اس کے روزمرّہ کے مسائل ہیں ۔ انھوں نے بڑی شور زمین میں گلاب اُگانے کی کوشش کی ہے ۔ یہ اُن ہی کی ہمت ہے کہ وہ روزمرّہ جو کچھ عام انسان پر گزرتی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اُس کو ہی اپنا موضوع بناتے ہیں ۔ مضمون "شامت اعمال" میں مثلاً انھوں نے لاری اور یکّے کے سفر کی منظر کشی کی ہے اور اس طرح کی ہے کہ متوسط طبقے کی تمام مجبوریاں اور مشکلات آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں ۔ دوسرا ہوتا تو اس پر لعنت بھیجنے کے علاوہ کچھ نہ کرتا مجیب صاحب ہیں کہ کہتے ہیں "ہنسو" اور اس طرح کہتے ہیں کہ ہنسنا پڑتا ہے ۔ کوئی ایک "شامت اعمال" پر منحصر نہیں "ملاوٹ کی مصیبت"، "دلیج برسر"، "انتظار"، "نوکری کا چکر"، "ہمیں رہنے کو وہ ملا ہے گھر"، "قرض بالائے قرض"، "نیا لحاف جو بن نہ سکا"، "عید کی تیاری"، "کثرت اولاد" یہ سب مضامین صرف اور صرف متوسط طبقے کے روزمرہ کے مسائل سے متعلق ہیں ۔ مضامین پر مضامین پڑھتے جائیے اور آپ اسی طبقے کے مسائل سے دوچار ہوتے جائیں گے ۔ آپ اُن کو کہیں بھی عقائد، نظریات اور نظاموں سے دست بگریباں نہ پائیں گے ۔ رسومات پر بھی اُنھوں نے جہاں کہیں لکھا ہے اس میں بھی طنز و مزاح کا نشانہ براہ راست رسومات نہیں ہیں بلکہ ان سے عام اور متوسط طبقے کے لیے پیدا ہونے والے مسائل ہیں ۔

چند لفظ مجیب صاحب کے انداز اور تکنیک کے بارے میں بھی ۔ مجیب صاحب بے حد سادہ زبان لکھتے ہیں ۔ طنز و مزاح کے لیے وہ نہ الفاظ سے کھیلتے ہیں اور نہ اُن کا گورکھ دھندا بناتے ہیں ۔ وہ محض ذہانت اور ذکاوت سے نہیں ہنساتے بلکہ اُس بے ہنگم صورت حال کو اُجاگر کر دیتے ہیں جو مسائل میں مضمر ہے ۔ ہنسی ہم آپ کو اس پر آتی ہے کہ ہم بھی کیسے کیسے مضحکہ خیز معاملوں کا نشانہ ہیں ۔ مجیب صاحب صرف بتا دیتے ہیں کہ دیکھو' اس معاملے کا یہ پہلو بھی ہے ۔ یہ بھی نہیں کہ مجیب صاحب کی نثر شوخی و ذکاوت سے خالی ہے ۔ وہ بعض نشتر جیسے جملے بھی لکھ دیتے ہیں مثلاً "سائیکل" کا آغاز دیکھیے :

"سائیکل دو ٹانگوں کی وہ سواری ہے جو اپنی ٹانگوں کے بجائے سوار کی ٹانگوں کے بل بوتے پر چلتی ہے لیکن اس کے باوجود سوار کو یہ غلط فہمی رہی ہے کہ وہ پیدل نہیں سواری پر جا رہا ہے ۔"

اشعار سے بھی مجیب صاحب خاصا کام لیتے ہیں اور ان کو اپنے مطلب کے لیے خوب استعمال کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنجیدہ ادب سے اُن کی دلچسپی صرف وقت گزارنے کے لیے نہیں ہے' بلکہ گہری ہے ۔

دادکی بیداد سہالوی صاحب کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے مگر لکھنے والے وہ بہت پرانے ہیں ۔ ان میں سے بعض مضامین اخباروں کے کالم کے لیے لکھے گئے اور بعض رسائل کے لیے ۔ لیکن کتابی شکل میں یہ پہلی مرتبہ ہی شائع ہوئے ہیں ۔

مجموعے میں ۱۹ مضامین' اُن کا اپنا لکھا ہوا "احوال واقعی" اور سید احتشام حسین صاحب کا لکھا ہوا ایک تعارف شامل ہیں ۔

جامعہ کی کہانی مصنف عبدالغفار مدہولی' ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر' نئی دہلی ۔ صفحات ۲۹۶ ۔ قیمت ۶ روپیہ ۔

یہ کہانی ہے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی ۔ جامعہ کے قیام سے حصول آزادی

یعنی سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۴۶ء تک کے ۲۷ برسوں کی کہانی اور یہ کہانی سنائی ہو ایک ایسے شخص نے جو نہ صرف علمی، ادبی اور معلومات کے لحاظ سے اس کا پوری طرح اہل ہے بلکہ جس کو جامعہ سے عشق بھی ہے۔ چنانچہ یہ نہ صرف ایک ادارے، ایک تحریک اور ایک تعلیمی تجربے کی تاریخ ہے بلکہ ایک عاشق کی واردات کا صحیفہ بھی ہے۔

جس طرح جامعہ کی اپنی ایک شخصیت ہے انفرادیت ہے اور اس کا نام آتے ہی ذہن میں ایک نقشہ ابھرنے لگتا ہے اسی طرح جامعہ کی کہانی کے مصنف کی بھی ایک انفرادیت ہے۔ ان کا نام آتے ہی ذہن میں حلیہ، انداز، اطوار اور شخصیت کا ایک رنگا رنگ تصور ابھرنے لگتا ہے۔

آج جو لوگ ۳۰ اور ۴۰ برس کی عمر کے پیٹے میں ہیں اور اردو سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں ان میں کم ایسے ہوں گے جنھوں نے "ایک معلم کی زندگی" پڑھی نہ ہوگی اور اس سے متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔ کم ایسے ہوں گے جنھوں نے بچپن میں "قوم پرست طالب علم" اور "بچوں کا انصاف" جیسے ڈرامے نہ پڑھے ہوں گے اور آج تک ان کے نقوش ذہن میں تازہ نہ ہوں گے اور جن کو جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے ان کو یقیناً یاد ہوگا کہ مہولی صاحب باری باری ایک ایک "دارالاقامہ" میں نماز فجر کے بعد قصے سنانے آتے تھے اور کیا مزے میں سناتے تھے۔

انھیں مہولی صاحب کی یہ تازہ ترین کتاب جامعہ کی کہانی ہے۔ جامعہ کی کہانی سنہ ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتی ہے جب چند "باغیوں" نے تحریک آزادی کی صدا پر لبیک کہہ کر علی گڑھ یونیورسٹی سے بغاوت کرکے چند خیموں اور کرایے کے مکانوں میں ایک تحریک کی بنا ڈالی۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اپنے خون جگر سے اس کو سینچ کر ایک عظیم ادارہ بنا دیا۔ اس تحریک میں آپ کو اس وقت کے اکثر مسلم اور غیر مسلم دانشور اور لیڈر حصہ لیتے نظر آئیں گے۔ گاندھی جی، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں سے لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تک اس کی سرگرمیوں اور اس کے انتظام میں شریک نظر آئیں گے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ جامعہ کو چلایا عبدالغفار مہولی جیسے لوگوں نے جنھوں نے خود کو جامعہ میں سمو دیا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

جامعہ کے بارے میں اب تک بہت سے مضامین، مقالے اور روداد یں شایع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے سلور جبلی کے موقعے پر اپنے خطبے میں اس کی تاسیس و تعمیر کی تاریخ بڑے مؤثر انداز میں بیان کی تھی لیکن ابھی تک یہ تاریخ کہیں یک جا نہ تھی۔ اور وقت کے اس بدلتے ہوئے دھارے میں کسی کو ہوش بھی نہ تھا کہ ان اوراق کو یک جا کرتا، لیکن وہ عاشق ہی کیا جو وقت کے دھارے میں بہہ جائے۔ چنانچہ اس کام کا بیڑا بھی اٹھایا تو عبدالغفار مہولی نے۔ انھوں نے خود اپنے تجربات، رسالہ ہمدرد، جامعہ کی فائلوں، جامعہ کی دستاویزات اور دوسرے ذرائع سے معلومات جمع کرکے اس کو کتابی شکل دے دی ہے۔ اس میں اپنے خلوص و عشق کی چاشنی ملا کر اس کو روداد سے داستان بنا دیا ہے۔

سادگی جیسے مہولی صاحب کی شخصیت کا جز ہے ویسے ہی اس کتاب کا خاصہ بھی ہے۔ کتاب کو انھوں نے سال بہ سال کے واقعات الگ الگ ابواب میں بیان کرکے لکھا ہے۔ اس لیے کتاب پڑھتے وقت تسلسل زمانی کا احساس قائم رہتا ہے۔ اکتفا صرف جامعہ کی تحریک کے واقعات ہی پر نہیں کی ہے بلکہ جامعہ جو تعلیمی تجربہ کر رہی تھی اس کی تفصیلات و جزئیات کو بھی بیان کرتے گئے ہیں اور کالج کی دوسری سرگرمیوں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح کتاب بے جان بیان کے بجائے جان دار اور متحرک ہو گئی ہے۔

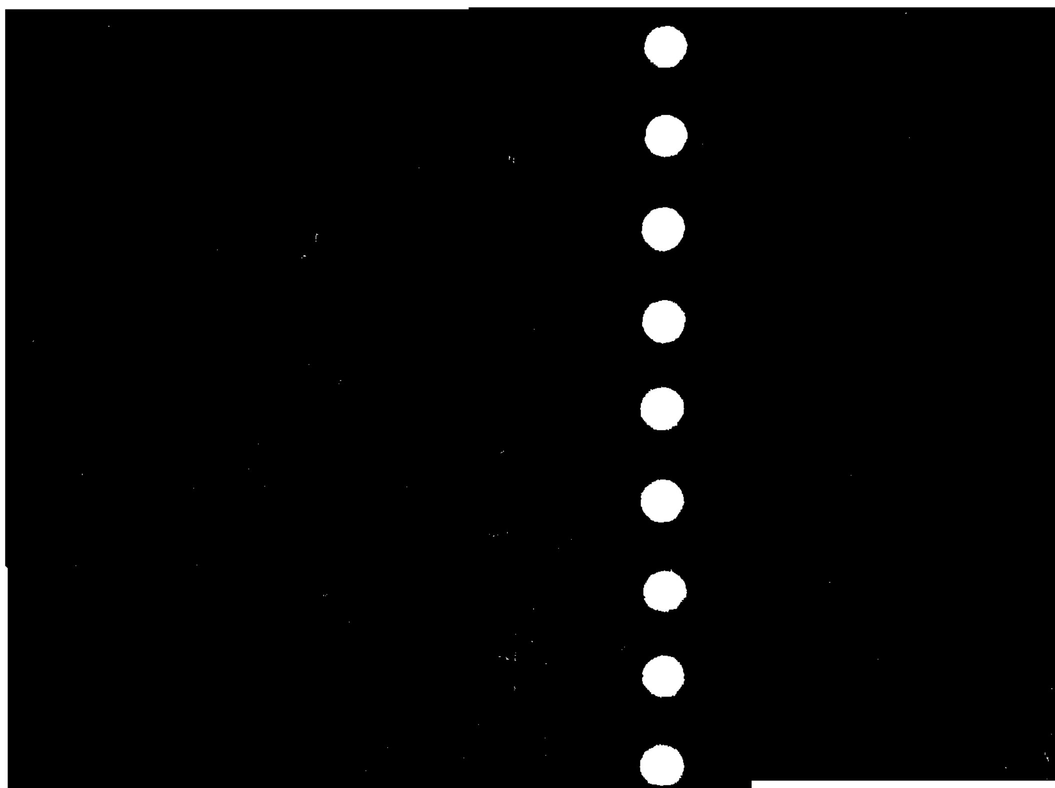
ان تمام باتوں کے علاوہ اس کتاب کا سب سے بڑا کارنامہ ملک کی اس فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یک جہتی کی زندہ تصویر کھینچ دینا ہے۔ متعدد ایسی تقریریں اور تحریریں اس کتاب کے ذریعے سامنے آتی ہیں جو جامعہ کی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بی، سی، رائے کی وہ تقریر بہت مؤثر ہے جو مہولی صاحب نے کتاب کے تیسرے باب میں درج کی ہے۔

کتاب کے آخر میں مختلف کارآمد ضمیموں کے علاوہ جامعہ کے مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کی ایک مکمل فہرست بھی درج ہے۔

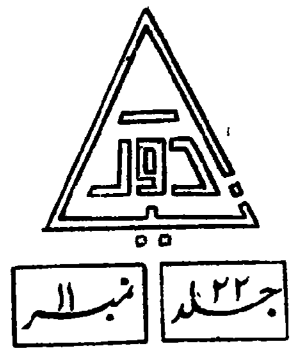
جامعہ ملیہ کے موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے کتاب کا جو پیش لفظ لکھا ہے اس کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے "مناسب ہے کہ اس نئے دور میں جب کہ یہ خواہش زور پکڑتی جا رہی ہے کہ جامعہ بھی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ہو جائے، گزشتہ دور کی بے سروسامانی اور فاقہ مستی کے مزے بھی یاد رہیں اور جامعہ کی انفرادیت کو قائم رکھیں۔" شیخ الجامعہ کی اس خواہش کو عاشق جامعہ مہولی کی یہ کتاب بخوبی پورا کرتی ہے:

—— عثمان غنی

Regd. N.o L. 319







ماگھ ۱۸۸۸ شک
۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء
چندہ سالانہ . پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
ششی کانت بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات . اُتر پردیش

پرنٹر
جے . ڈبلو . ہاج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری . یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس ، عیش باغ . لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات . اُتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے اس شمارے کو فروری کا شمارہ تصور کیا جائے ۔

اپنی بات

ہم ہر سال ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ ایک اہم قومی تہوار کی حیثیت سے مناتے ہیں۔ چھبیس جنوری کو یوم جمہوریہ قرار دیے کا بھی ایک پس منظر ہے۔ اب سے ۳۰ برس پہلے دسمبر ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس لاہور میں، جو پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، 'آزادیِ کامل' کی تجویز منظور ہوئی۔ اسی اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ سارے ملک میں ہر سال ۲۶ جنوری کو آزادی کا یہ عہد عام جلسوں میں دہرایا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق ہر سال ۲۶ جنوری کو ہندستان کے گوشے گوشے میں یہ عہد دہرایا جانے لگا یہاں تک کہ ہمیں آزادی حاصل ہوگئی۔ اس تاریخ کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہندستان نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنے لیے وہ نظام حکومت منظور کیا جسے جمہوریت کہتے ہیں اور اس تاریخ سے اس نے اپنا وہ دستور جو مہینوں کے غور و فکر اور بحث و مباحثے کے بعد اور دنیا کی دوسری جمہوریتوں کے آئینوں کو پیش نظر رکھ کر نیز ہر ملک کے دستور کی اچھی باتوں کو لے کر مرتب کیا گیا تھا، نافذ کیا۔ دستور کی رو سے ہندستان کے ہر رہنے والے کو مذہب، عقیدے، جماعت سازی، تحریر، تقریر، غرض سبھی طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اسی کے ساتھ دستور میں اس بات کی بھی ضمانت دی گئی ہے کہ ہر شہری کو ترقی کا یکساں موقع ملے گا۔ ان وجہوں سے یوم جمہوریہ ہمارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ لیکن ۱۹۶۷ء کا یوم جمہوریہ ہمارے واسطے بڑی ذمے داریوں کا پیغام اور ہم سے سخت محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مطالبہ لے کر آیا ہے۔ اس وقت ملک ایک بڑے بحران سے گزر رہا ہے۔ لگاتار دو سال سے بارش کی کمی کے باعث فصلوں کو جو نقصان پہنچا اس نے غذائی مسئلے کو سنگین سے سنگین تر بنا دیا ہے۔ خصوصاً ۱۹۶۶ء کے سوکھے کے باعث جس کی کم از کم اتر پردیش میں پچھلے پچاس سال میں مثال نہیں ملتی، غذائی سوال انتہائی مشکل اور سنگین ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال بجائے خود تشویش ناک ہے لیکن تشدد کی حکمت عملی جو اس وقت ملک میں برسر کار نظر آ رہی ہے وہ ہندستانی جمہوریت کے لیے بہت بڑا چیلنج بن گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عام طور سے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ جب تک عوام کی بے اطمینانیوں کو تشدد کی زبان میں نہ سمجھایا جائے گا اس وقت تک خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ تشدد کبھی مسائل کا حل نہیں ہو سکتا۔ اس سے کش مکش، بے اطمینانی، دہشت اور خوف و ہراس پھیلتا ہے اور بد نظمی پیدا ہوتی ہے جس سے ملک کی آزادی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک کا، ہندستان کے ہر شہری کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے پر غور کریں، سوچیں اور تشدد کی سیاست کا پوری طرح مقابلہ کریں تاکہ ہماری جمہوریت نہ صرف زندہ اور باقی رہے بلکہ ترقی کرے اور مستحکم ہو۔ اس سلسلے میں خصوصاً ہماری یونی ورسٹیاں اور ارباب دانش اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہندستان کے سابق چیف جسٹس اور بمبئی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر شری پی۔ بی۔ گجیندر گڈکر نے حال ہی میں جادو پور یونی ورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنے خطبے میں کہا کہ ہندستان اس وقت جس کٹھن اور نازک دور سے گزر رہا ہے اس میں یونی ورسٹیوں اور دانش وروں کا یہ فرض ہے کہ وہ رائے عامہ کی اس طرح رہ نمائی کریں اور ایک ایسی فضا پیدا کریں جس میں دستور میں کیا گیا وعدہ (سماجی اور اقتصادی انصاف دلانے کا وعدہ) پورا کیا جائے اور جس میں قانون کا احترام ہو جس سے سماجی اور اقتصادی انصاف کے نصب العین کے جلد حصول میں مدد ملے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ضبط و نظم کی جگہ تشدد کا تخریبی فلسفہ لے لیتا ہے تو پھر بد نظمی اور افراتفری پھیل جائے گی۔ اس لیے انھوں نے دانش وروں کو متوجہ کیا کہ ترقی پسند، متحرک اور تعمیری نا مذہبی افکار و خیالات کی، جو جمہوریت اور ضبط و نظم میں یقین رکھتے ہیں، ترویج و اشاعت کے لیے انھیں اٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔ اس طرح عوام میں ایک پختہ شعور پیدا ہوگا جو اس ملک میں جمہوری قدروں کے تحفظ و بقا کا ضامن ہوگا۔ ہماری جمہوریت کے لیے ان اندرونی چیلنجوں کے علاوہ ہمیں بیرونی چیلنج کا بھی سامنا ہے اور وہ ہے چین کا جارحانہ اور معاندانہ رویہ۔ حکومت ہند کے سخت احتجاجات کے باوجود ہندستان کے خلاف چین کی اعصابی جنگ شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ پیکنگ نے جولائی ۱۹۶۶ء سے ناتھولا کے پاس سے لاؤڈ اسپیکر کی جو مہم شروع کر رکھی ہے وہ ہمسایہ ملکوں کے خلاف تخریب کاری اور توسیع پسندی کی چینی اسکیم کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے چینی فوجی ہندستان کے خلاف زہر افشانی کرتے رہتے ہیں اور اسے بدنام کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ اس سارے پروپیگنڈے کا واضح مطلب ملک کے داخلی امور میں چین کی زبردست مداخلت ہے۔ اس کے علاوہ سرحد پر چینی فوجوں کا اجتماع، ہندستانی علاقے میں اس کی مسلسل مداخلت، پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی اور پاکستان میں گوریلا چھاپہ ماروں کی تربیت، یہ تمام باتیں واضح کرتی ہیں کہ ہندستان سے دشمنی چین کی پالیسی کا بنیادی اصول اور ہندستان کی علاقائی سالمیت کو تاراج کرنا اس کا نصب العین ہے۔ اس لیے آیئے یوم جمہوریہ کے مقدس موقع پر یہ عزم کریں کہ ہم نہ صرف اندرونی اور بیرونی چیلنج اور خطرات پر قابو پانے کے لیے بلکہ ملک کو خوش حال بنانے اور دنیا میں امن پیدا کرنے کے لیے محنت، جاں فشانی، استقلال اور بے غرضی کے ساتھ کام کریں گے اور کسی قربانی، کسی ایثار سے منہ نہ موڑیں گے۔

● کئی سال سے ۳۰ جنوری کو دنیا بھر میں یوم انسداد جذام منایا جاتا ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ ۳۰ جنوری مہاتما گاندھی کا یوم شہادت بھی ہے۔ گاندھی جی کو اس مرض کی روک تھام اور اس میں مبتلا بد نصیبوں کی فلاح و بہبود سے جس قدر گہری دل چسپی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انسداد جذام اور مریضوں کی فلاح و بہبود کے کام کو قومی تعمیری پروگرام میں شامل کر لیا تھا۔ جذام کا مسئلہ کئی پہلو رکھتا ہے۔ طبی، صحت عامہ سے متعلق اور سماجی۔ اس کے طبی پہلو کا تعلق علاج معالجے سے اور صحت عامہ کے پہلو کا تعلق اس مرض کو صحت مند علاقوں میں پھیلنے سے روکنے سے ہے۔ سماجی پہلو کا تعلق مریضوں اور ان کے متعلقین کی بہبود و ترقی سے ہے۔ بدقسمتی سے مسئلے کے اس پہلو پر ابھی اتنی توجہ نہیں کی گئی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کی بڑی وجہ غالباً اس مرض اور اس میں مبتلا لوگوں کے بارے میں غلط تصورات، توہمات اور مرض و مریض سے گھن ہے۔ بہرحال جذام کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ اس مرض کے حقائق سے عوام کو واقف کرایا جائے اور ان کے توہمات کو دور کیا جائے۔ ضرورت مند مریضوں اور ان کے لواحقین کے لیے مالی امداد، ان کے بچوں کی نگہداشت اور تعلیم، معذور اور اپاہج مریضوں کے دیکھ بھال کے مرکزوں کا قیام اور موزوں مریضوں کو بحالی کے لیے آمادہ کرنا، وہ چند تدبیریں ہیں جو اس مسئلے کے حل میں بڑی حد تک معاون بن سکتی ہیں۔ جذام کے مریضوں کی خدمت اور ان کی دیکھ بھال کی جو شریفانہ مثال گاندھی جی نے قائم کی تھی وہ یقیناً ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ کاش اس سے سبق لے کر ہم اپنے اندر ادائیگی فرض کا جذبہ پیدا کر سکیں۔

—— ایڈیٹر



شمیم کرہانی

جب سے خیالِ شوق میں اُن کا شباب ہے — دُنیا مری نگاہ میں جامِ شراب ہے
اب جس طرف نگاہ اُٹھاتا ہوں، دوستو! — کیا دیکھتا ہوں، زیرِ قدم آفتاب ہے
وہ دن گئے، کہ خاک اُڑاتی تھی زندگی — اب رونقِ بہارِ چمن، ہمرکاب ہے
دستِ نیاز مند ہے اور خوشۂ نجوم — آغوشِ خاکسار ہے اور ماہتاب ہے
تکلیفِ التماسِ نظارہ نہیں رہی — خود بامِ آرزو پہ کوئی بے نقاب ہے
شاید کہ رات بھیگ چلی ہے بہار کی — انگڑائیوں میں رس ہے تو آنکھوں میں خواب ہے
بیٹھا ہوا ہوں گیسوئے جاناں کی چھاؤں میں — مہکی ہوئی جنوں کی شبِ ماہتاب ہے
خود اپنی زندگی نظر آتی ہے اس طرح — جیسے کسی حسین کہانی کا باب ہے
ہوگی کبھی فسانۂ فریادِ بے کسی — اب زندگی غزل ہے، غزل کی کتاب ہے
شہنائیوں کے ساز پہ بجتی ہیں چوڑیاں — اب زندگی نگارِ دو شیزہ کا خواب ہے
تاثیر کھو چکی ہے شبِ غم کی تیرگی — اب زندگی ترنگ ہے، تابش ہے، تاب ہے
اک نو بہارِ ناز کا آنچل ہے سامنے — اب زندگی دھنک ہے، شفق ہے، شہاب ہے

وہ سامنے ہے محوِ تبسم کوئی، شمیم
اب زندگی سوال نہیں ہے، جواب ہے

۲۶ جنوری ۱۹۶۶ء — ماگھ ۱۸۸۸ اشک

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا ایک باب

ہارون خاں شروانی

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد بدیشی راج نے ہمارے ملک میں پوری قوت کے ساتھ اپنے پنجے جمالئے تھے اور مدت تک کسی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس راج کی مخالفت میں اپنی چھنگلی بھی اُٹھا سکے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ابتدائی زمانے میں کانگریس کی پہلی قرارداد "ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند کی غیر متزلزل وفاداری" کے جذبے پر مبنی ہوتی تھی۔ انگریزوں کا کہنا تھا کہ ۱۹۱۴ء کی پہلی سنساری جنگ آزادی اور انصاف کی خاطر لڑی جارہی ہے۔ ہندستانیوں نے یہ سمجھا کہ اب ہماری مُکتی کے دن آگئے اور یہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ ان میں بہت سوں نے فرانس، عراق، اور شام کی زمینوں کو اپنے خون سے سینچا مگر جو باقی رہ گئے انھوں نے واپس آکر دیکھا کہ انگریزوں کی سخت گیری پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی ہے اور آزادی کا آدرش بہت دور رہا پڑا ہے۔ وہ سوچنے لگے کہ ہم نے جو لڑائیاں لڑی ہیں وہ کیا صرف اس لیے کہ انگریزی جھنڈے کو سلامی دیا کریں اور انگریز افسروں کا حکم مانا کریں۔ اسے تو نہ آزادی کہتے ہیں نہ انصاف!

۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۰ء کا زمانہ بہت سے اعتباروں سے ہندستان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل سمجھنا چاہیے۔ یہی زمانہ تھا کہ مدت سے بچھڑے ہوئے دو بھائی، ہندو اور مسلمان، ایک پلیٹ فارم پر آکر جمع ہوئے اور لکھنؤ کے شہر میں وہ سمجھوتا ہوا جس کے اثر میں آکر انگریزوں کو ملک کی سیاسی اصلاحوں کی رفتار کو تیز تر کرنا پڑا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مہاتما گاندھی اپنی پوری تابناکی کے ساتھ ہندستان کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور آتے ہی پرانی بساط کو پلٹ کر گویا ایک نئی بساط بچھادی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوؤں سے زیادہ مسلمان اور مسلمانوں سے زیادہ ہندو ملک کی خودداری اور آزادی کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں کرنے پر آمادہ ہوئے۔ مسلمانوں نے ہندو نیتاؤں کو مسجدوں کے ممبروں پر لا بٹھایا اور ہندوؤں نے ان کے ساتھ کھانے پینے میں کسی طرح کا عار نہ سمجھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ایسے ایسے مرتبے کے لوگ جیسے چترنجن داس، محمد علی، ابوالکلام آزاد، موتی لال نہرو، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، سین گپتا، سروجنی نائیڈو اپنے آرام دہ گھروں سے نکل کر شوق سے جیل خانے جانے کے لئے تیار ہوئے اور گویا آگ کو گلزار بنا دیا۔

پہلی سنساری جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ مسلم لیگ میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس ہونی شروع ہوگئی۔ مسلم لیگ ایک اعتبار سے کانگریس کے مدمقابل کی حیثیت سے قائم ہوئی تھی، مگر آہستہ آہستہ اس کا آدرش، کانگریس کے آدرش کے قریب آنے لگا۔ لیگ کے آگرے والے اجلاس میں، جو سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں دسمبر ۱۹۱۳ء میں منعقد ہوا تھا، ڈاکٹر ناظر الدین حسن نے تحریک کی کہ ہندستانیوں کو بلا تخصیص مذہب فوج میں اعلیٰ عہدے دئے جائیں اور اس طرح انھوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ سب ہندستانیوں کو ایک نئے راستے کی نشاندہی کی۔ پہلی سنساری جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور اس کی ابتدا ہی میں چار عظیم مسلمان رہنماؤں یعنی محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی اور ابوالکلام آزاد کو نظربند کر دیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاس بمبئی میں منعقد ہوئے اور لیگ کی صدارت ایک دیرینہ کانگریسی رہنما مظہر الحق کے سپرد کی گئی، جن کا "صداقت آشرم" آج بھی ہماری خودداری کی رہنمائی کرتا ہے اور جو ہمارے پہلے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد کو آخر تک مرغوب رہا۔ علی برادران، مولانا آزاد اور

مظہر الحق نے کانپور کی چھوٹی سی مسجد کے بعض حصوں کے انہدام پر ملک بھر میں جو جوش و خروش پیدا کیا اس سے انگریزی حکومت کی گویا بنیادیں ہل گئیں اور ابوالکلام آزاد کے الہلال اور محمد علی کے کامریڈ نے دکھا دیا کہ ہندی مسلمانوں کی سیاست کا رخ کس طرح نہایت تیزی کے ساتھ وطن دوستی کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ حب وطن اور دیش بھگتی کی مثال حسرت موہانی سے بدرجۂ اتم ملتی ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قید فرنگ میں کاٹا یا پھر چاروں طرف سے انگریزوں کے سخت دباؤ کے باعث ایسی ایک مفلوک الحال زندگی بسر کرنی پڑی۔ ان کی قید وہ قید نہ تھی جیسی آج کل کے سیاسی قیدیوں کی ہوتی ہے جن کے آرام و آسائش کا مکمل انتظام کیا جاتا ہے، بلکہ انھیں تو قیدیوں کے کپڑے پہننے پڑتے تھے، ہتھکڑیاں ڈالنی پڑتی تھیں اور چکی پیسنا پڑتی تھیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

وہ ان تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

اچھا ہے اہل جور کئے جائیں سختیاں   پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام
سمجھے ہیں اہل شرق کو شاید قریب مرگ   مغرب کے یوں ہی جمع ہیں زاغ و زغن تمام

ادھر مسز بیسنٹ نے ہوم رول کا نعرہ بلند کیا اور ۱۹۱۶ء میں کانگریس کا جو اجلاس امبیکا چرن مزمدار کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں نام نہاد انتہا پسند گروہ جو کئی سال پہلے کانگریس سے کنارہ کش ہو گیا تھا، اس میں از سر نو شامل ہو گیا۔ اس کانگریس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ اس سمجھوتے کی وجہ سے ہے جو دسمبر کی آخری تاریخوں میں مسلم لیگ سے ہوا۔ اس بصیرت افروز اجلاس میں جن بزرگوں کو شریک ہونے کا موقع ملا تھا انھیں یاد ہوگا کہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں ہندو مسلمان کس طرح شیر و شکر ہو رہے تھے۔ کانگریس کے مقامی سکریٹری مرزا سمیع اللہ بیگ تھے اور صدارت ایک سفید ریش بنگالی بزرگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ کی صدارت کے فرائض ایک جوشیلے جوان مسلمان کانگریسی، محمد علی جناح، کے سپرد تھے۔ ہندو مسلمان نیتاؤں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر وہ مشہور سمجھوتہ کیا جو ہندستان کے باہمی میل جول کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس سمجھوتے کی بات چیت زیادہ تر راجہ محمد علی محمد خاں راجہ صاحب محمود آباد کے محل میں ہوئی جو قیصر باغ کے ایک بڑے حصے میں واقع تھا اور جب تمام مرحلے طے ہو گئے اور سمجھوتہ ہو گیا تو راجہ صاحب نے اس خوشی میں ہندو مسلمان نیتاؤں کو ایک ایسی ضیافت پر مدعو کیا جس کا ثانی خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

ہندستانی سیاسیات پر کانگریس لیگ سمجھوتے کا فوری اثر پڑا۔ اگلے ہی سال، ۱۹۱۷ء میں برطانوی حکومت نے مسز بیسنٹ اور ان کے رفقائے کار ارنڈیل اور واڈیا کو نظر بند کیا تو ہندستان میں آگ سی لگ گئی اور جو عظیم الچل ملک میں مچ گئی اس میں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، سب نے برابر کا حصہ لیا۔ اگست ۱۹۱۷ء میں قیصر باغ کی بارہ دری میں ایک بھاری اجتماع ہوا جس میں اردو کے مشہور شاعر برج نرائن چکبست نے اپنی نظم "پیغام وفا" پڑھ کر سنائی جس کے دو بند اس زمانے کے عام جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں:

حکم حاکم کا ہے فریاد و فغاں رک جائے   دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے   پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں نہ سرور انھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا نہیں اب قوم نے کروٹ لی ہے

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی   اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی
مادر ہند کی تصویر ہو سینے پہ بنی   بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور گلے میں کفنی

ہو یہ صورت سے عیاں عاشق آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

ہوم رول لیگ میں جو جگہ مسز بیسنٹ کی نظر بندی کی وجہ سے خالی تھی اسے راما سوامی آئر اور محمد علی جناح نے پُر کر دیا۔ ہندو مسلمانوں میں اتنی یگانگت پیدا ہو گئی تھی کہ کلکتے میں کانگریس، مسلم لیگ اور مسلم تعلیمی کانفرنس، کے جو جلسے ۱۹۱۷ء کے دسمبر میں ہوئے ان میں کانگریسی رہنماؤں نے لیگ اور کانفرنس کے جلسوں میں اور لیگ کے رہنماؤں نے کانگریس کے جلسوں میں جوق جوق شرکت کی۔ یہی کیفیت ۱۹۱۸ء میں تھی جب دہلی کانگریس کی سوآگت سبھا کے صدر حکیم اجمل خاں تھے اور لیگ کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ محمد [illegible] علی نظر بند تھے مگر یہ دونوں کانگریس

اور رنگ دونوں پر گویا چھائے ہوئے تھے۔

۱۹۱۸ء بہت سے اعتباروں سے ممتاز ہے اور کہنا چاہئے کہ اسی سال ہندستان نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ رولٹ ایکٹ کے پاس ہوتے ہی کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے دل میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک زبردست جذبہ پیدا ہو گیا اور ملک کے طول و عرض میں غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مہاتما گاندھی ہندستان کے سیاسی اُفق پر نمودار ہو چکے تھے اور اپنی سچائی، نیک نفسی، وطن دوستی اور بلیدان کے جذبے کی وجہ سے اپنا سکہ جما چکے تھے۔ جس طرح لارڈ کرزن کا عہد ہماری سیاسی بیداری کی تاریخ میں ایک اہم دور شمار کیا جاتا ہے اسی طرح رولٹ ایکٹ کو بھی ایک سنگ میل سمجھنا چاہئے۔ گاندھی جی نے چند ماہ بعد یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو اس مشہور حلف نامے کو شائع کیا جسے ستیہ گرہ کے اُصول کی گویا بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اس عہد نامے کے الفاظ یہ ہیں:

" ہم سچے دل سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر رولٹ بل قانون بن گیا تو ہم اس قانون کی خلاف ورزی کریں گے اور ہم اس کا بھی عہد کرتے ہیں کہ ہمیشہ سچائی پر قائم رہیں گے اور کسی انسان کے جسم یا جان کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچائیں گے نہ اس کی املاک میں کسی قسم کی مداخلت کریں گے۔"

اس حلف نامے کی اشاعت کے ساتھ ہی ہندستان بھر میں بے شمار جلسے ہوئے اور ان میں نہ صرف یہ حلف نامہ پڑھا گیا بلکہ ہزاروں لاکھوں نے بہ آواز بلند یہ قسم کھائی کہ ہم ان اُصولوں پر گامزن ہوں گے۔ حکومت نے جلسوں کے بانیوں اور حلف لینے والوں پر سختیاں کیں تو اکثر لوگوں نے ان سختیوں کو برداشت کیا اور اُف تک نہیں کیا بعض جگہ سختی کا جواب سختی سے دیا گیا اور پنجاب کے بعض شہروں میں غیر منظم انبوہ نے پولیس اور فوج سے ٹکر لی۔ پنجاب کے انقلابیوں کے نیتا سیف الدین کچلو اور ستیہ پال تھے؛ انھیں حکومت پنجاب نے صوبے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اس حکم کے نکلتے ہی صوبے بھر میں آگ سی لگ گئی۔ فوجی قانون جاری ہوا۔ امرتسر کے مشہور جلیانوالہ باغ میں ہندستانیوں کو (جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، سب ہی شامل تھے) گھیر لیا گیا۔ باغ سے نکلنے کا صرف ایک ہی چھوٹا سا دروازہ تھا؛ عین اس دروازے کے بیچ میں جنرل ڈائر نے مشین گنیں لگا دیں اور ان نہتوں کو، جن کے نکلنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، مشین گنوں کی گولیوں سے گویا بھون ڈالا۔ تقریباً چار سو شہید اور ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس قتل عام نے بعد فوجی قانون کو پنجاب میں سختی کے ساتھ نافذ کر دیا گیا اور پنجابیوں کو ذلیل اور ان کی طبیعتوں کو پست کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ بڑے سے بڑے ہندستانی پر یہ لازم کر دیا گیا کہ کسی معمولی گورے کو بھی سڑک پر چلتا ہوا دیکھے تو فوراً سواری سے اُتر کر اسے فرشی سلام کرے۔ امرتسر کی ایک سڑک پر ہر ہندستانی چلنے والے کو حکم دیا گیا کہ وہ جانا چاہے تو جانوروں کی طرح ہاتھ پاؤں پر رینگتا ہوا جائے۔ شہر کے بڑے بڑے چوراہوں پر لکڑی کے کٹہرے کھڑے کئے گئے اور جن بچوں، جوان اور بوڑھوں کو فوجی قانون کا مجرم ٹھہرایا گیا انھیں اس کٹہرے میں باندھ کر انگریز فوجیوں سے کوڑے لگوائے گئے اور اس سے بھی زیادہ جسمانی اور ذہنی صعوبتوں کا ناکردہ گناہوں کو شکار بنایا گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں اسی امرتسر میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس کے صدر تو موتی لال نہرو تھے مگر اس کی باگ مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ کانگریس کے اجلاس سے چند دن پہلے محمد علی اور شوکت علی اپنی سالہا سال کی نظر بندی کے بعد بیتول جیل سے رہا ہو گئے تھے۔ اس نظر بندی کا جو اثر محمد علی پر پڑا اسے خود ان کے اشعار میں ملاحظہ فرمایئے:

یہ نظر بندی تو نکلی ردِّ سحر — دیدہائے ہوش اب آ کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم — حق کے عقدے اب کہیں مجھ پر کھلے

محمد علی کی چہیتی بیٹی آمنہ ایک مہلک مرض کی شکار تھیں، تاہم انھوں نے بیتول سے سیدھا امرتسر کا رُخ کیا اور کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ محمد علی جس دل سے اپنی بیمار بیٹی کے پاس جانے کے بجائے اپنی وطن دوستی کا فرض ادا کر رہے تھے اس کا اندازہ ان کے چند اشعار سے ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں:

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا — جو ہر اک حال میں اُمید سے معمور نہیں
میری اولاد سے تو مجھ کو ملا دے یا رب — ورنہ کہدے تری امت کا یہ دستور نہیں

آزادی کا آدرش پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا اور امرتسر کا نگریس کا پنڈال "ہندو مسلمان کی جے" اور "مہاتما گاندھی کی جے" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ ہر ایک کا دل پنجاب کے واقعات کی وجہ سے زخمی تھا مگر گاندھی جی کی تلقین یہ تھی کہ ہمیں پاگل پن کا جواب پاگل پن سے نہیں بلکہ عقل کو کام میں لاکر دینا چاہئے اور قاعدہ داری اور ڈسپلن سے روگرداں کسی حال میں نہ ہونا چاہئے۔

۱۹۲۱ء میں ستیہ گرہ کو اور آگے بڑھایا گیا۔ حق یہ ہے کہ ہماری ذہنیت کی جس اصول نے کایا پلٹ دی وہ عدم تعاون یا نان کوآپریشن کا اصول تھا اور اسے راسخ کرنے میں محمد علی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہ اصول محمد علی نے قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کیا تھا "تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"۔ یعنی اچھی باتوں میں تعاون کرو اور بری باتوں یا گناہ کی باتوں میں تعاون مت کرو۔ یہ عدم تعاون کے اصول کا سامنے آنا تھا کہ ولایتی مال، انگریزی عدالتوں، سرکاری ملازمتوں اور سرکاری مدرسوں کا مقاطعہ ہونے لگا۔ سیکڑوں ہزاروں عورتیں اور مرد گرفتار ہونے لگے۔ جیل خانے کافی نہیں ہوئے تو بڑی بڑی کوٹھیوں اور مکانوں سے جیلوں کا کام لیا جانے لگا اور ملک میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ ان منفی واقعات سے حکومت اتنی متاثر ہوگئی کہ آخرکار اسے دو نسبتۃً میانہ رو رہنماؤں، یعنی ایم۔ آر جیکر اور تیج بہادر سپرو کو گاندھی جی کے پاس کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لئے بھیجنا پڑا۔ لیکن مہاتما جی نے ان دونوں مندوبوں کو جواب دیا کہ میں اس وقت تک سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے لئے تیار نہیں جب تک محمد علی کو جیل خانے سے رہا نہ کر دیا جائے۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا۔ اب کانگریس کلیتہً مہاتما جی کے قابو میں آگئی تھی اور انھیں سیویل نافرمانی کے ذریعے سے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے کانگریس کا آمر بنا دیا گیا تھا۔ لیکن جب حسرت موہانی نے کانگریس کی مجلس موضوعات (سبجکٹس کمیٹی) میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی تحریک پیش کی تو اس کا کوئی موئید نہ مل سکا اور تحریک بغیر تائید کے خارج ہوگئی! ابھی کانگریس کے لئے مکمل آزادی کا ریزولیوشن منظور کرنے کے لئے مزید آٹھ برس درکار تھے، اور اگر غایر نظر سے دیکھا جائے تو مکمل آزادی کی وہ قرارداد جو جواہر لال نہرو کی صدارت میں ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو دریائے راوی کے کنارے پاس ہوئی وہ اسی تحریک کا لب لباب تھا جسے حسرت موہانی ۱۹۲۱ء میں منظور کرانے میں ناکام ہوئے تھے۔

احمد آباد کانگریس کے دو مہینے بعد چوری چورا کا واقعہ پیش آیا۔ چوری چورا مشرقی یو پی میں شہر گورکھپور کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں پولیس کا ایک تھانہ تھا جس پر ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو ایک ہجوم چڑھ دوڑا اور کچھ پولیس والوں کو تھانے میں بند کر کے اس میں آگ لگا دی اور ان میں سے بائیس وہیں بھسم ہو گئے۔ مہاتما گاندھی کی ستیہ گرہ کے تخیل اور آج کی بے قاعدہ داری (INDISCIPLINE) میں کتنا فرق ہے کہ عین جس زمانے میں ستیہ گرہ اپنے پورے عروج پر تھی، مہاتما جی نے یک قلم تمام ملک میں ستیہ گرہ بند کرا دی اور کہا کہ ستیہ گرہ کی سب سے بڑی شرط اپنے آپ پر قابو پانا اور اہنسا کے اصول پر مکمل عمل کرنا ہے۔ اور جب خود وہ لوگ جو ستیہ گرہ کا دعویٰ کرتے ہیں دوسروں کی جان و مال اور آبرو پر حملہ آور ہوتے ہیں، تو حقیقت میں وہ ستیہ گرہی نہیں اور اس وقت تک ستیہ گرہ بند کر دی جائے جب تک یہ سبق عوام کو ازبر نہ ہو جائے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ اب کانگریس کو سیویل نافرمانی کی جگہ، جو ایک منفی عمل ہے، اچھوت ادھار، نشہ بندی اور کھدر پرچار کی طرف مائل ہو جانا چاہئے۔ بہت سے وطن دوستوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ یو پی کے ایک چھوٹے سے قصبے کے چند آدمی اگر کسی کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے تھے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام ستیہ گرہی ایسے ہی ہوں گے، مگر گاندھی جی کا ہاتھ تو پوری قوم کی نبض پر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مکمل اہنسا پر عمل کرنے کے لئے ابھی قوم کو بہت کچھ سیکھنا ہے، اور وہ اپنے حکم پر اٹل رہے۔ ان کی توجہ اب اچھوت ادھار، نشہ بندی، اور کھدر پرچار کی طرف تھی، اور ساتھ ہی ان کی یہ ہدایت بھی تھی کہ سرکاری عدالتوں سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے اور سرکاری تعلیم گاہوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اب بے عملی نہیں بلکہ عمل کا پیش نامہ بننے لگا۔ ہزاروں وکیلوں نے اپنی اپنی پریکٹس چھوڑ دی، جگہ جگہ قومی عدالتیں بن گئیں، سینکڑوں خانگی مدرسے قائم ہو گئے اور ان میں قومی تعلیم کا نصاب جاری کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، گجرات ودیا پیٹھ، کاشی ودیا پیٹھ اور ایسی ہی

دوسری تعلیم گاہیں قائم ہونے لگیں۔ دہلی کے عظیم الشان طبیہ کالج کا افتتاح مہاتما گاندھی کے ہاتھوں کرایا گیا۔ ملک میں بدیشی اطوار، بدیشی کپڑوں اور بدیشی خیالات کی جو تہہ جم گئی تھی وہ سودیشی پرچار اور پہننے کے رواج کی وجہ سے یک لخت چھٹ گئی۔ یہ کایا پلٹ انگریزوں سے دیکھی نہ گئی۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کو پھر گرفتار کر لیا گیا اور احمد آباد کے سشن جج نے انھیں چھ سال قید بامشقت کے احکام سنا دئے۔

کانگریس کا اجلاس کانپور میں ہوا اور اس کی صدارت ملک کی مایۂ ناز خاتون مسز سروجنی نائیڈو کو تفویض کی گئی۔ سروجنی نائیڈو ہندستان کی ممتاز خطیبہ تھیں۔ ان کا صدارتی خطبہ ایک، تو چھپا ہوا تھا اور دوسرا وہ جو انھوں نے فی البدیہہ دیا تھا۔ فی البدیہہ خطبے کا ایک بصیرت افروز اقتباس یہاں دیا جاتا ہے:

"اگر ہندو مسلمان دونوں تحمل اور بردباری جیسی صفات کو اپنا شعار بنالیں، اگر وہ ایک دوسرے کی عبادتوں اور طور طریق میں رکاوٹ پیدا نہ کریں اور ایک دوسرے کے مذہبی ارکان اور قربانیوں کے راستے میں مجنونانہ مداخلت کرنا چھوڑ دیں، اگر وہ ایک دوسرے کے مذہب کی خوبیوں کو پہچاننا اور ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن کی قدر کرنا سیکھ جائیں تو بھائیو اور بہنو ہم اپنی منزل مقصود کے بہت ہی قریب پہنچ جائیں گے۔"

تحریک آزادی کی تاریخ میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء کا زمانہ بڑی کشمکش کا زمانہ تھا۔ ہندستانی دستور پر نظر ثانی کرنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا جس کے صدر سر جان سائمن تھے۔ مگر چونکہ اس کمیشن کا کوئی ممبر ہندستانی نہ تھا اس لئے ہمارے سیاست کاروں کے ہر طبقے اور ہر پارٹی نے اس کا مکمل مقاطعہ کر دیا۔ اس مقاطعے میں ہندو، مسلمان، کانگریسی، مسلم لیگی، سب ہی شریک تھے، اور برطانوی حکومت کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہندستانی کسی مسلک کے پیرو کیوں نہ ہوں وہ ملک کے مفاد کے لئے ایک ہو جاتے ہیں اور بالفعل اپنے اپنے تفرقوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ انھوں نے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک کمیٹی مقرر کی اور اس کمیٹی کو یہ اختیار دیا کہ وہ ہندستان

تاکہ اسے برطانوی حکومت کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس رپورٹ کا تیار ہونا تھا کہ سکھوں اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی اور سکھ لیگ اور مسلم لیگ نے یہ ادعا کیا کہ اس رپورٹ میں سکھوں اور مسلمانوں کے حقوق کی کماحقہٗ حفاظت نہیں کی گئی۔ دوسری ایک جماعت ایسی بھی تھی جس کا کہنا تھا کہ اس رپورٹ میں ہندستان کی مکمل آزادی کا کہیں ذکر بھی نہیں اور اس لئے یہ ہمارے لئے ناقابل قبول ہے۔ اس جماعت کے سرگروہ خود موتی لال نہرو کے فرزند جواہر لال نہرو تھے۔ اور جب مہاتما گاندھی نے اپنی جگہ جواہر لال کو لاہور کانگریس کا صدر نامزد کیا تو ملک کو ایسا رہنما مل گیا جس نے اپنی قربانیوں، اپنی دیش بھگتی اور اپنی انتھک کوششوں کی وجہ سے نوجوانی ہی میں ملک پر اپنا سکہ جما لیا تھا۔ جواہر لال نہرو کی قیادت میں ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو راوی کے کنارے کانگریس کی نشست میں ہندستان کی مکمل آزادی کا وہ ریزولیوشن پاس ہوا جس کا خواب چند سال پہلے حسرت موہانی دیکھ چکے تھے اور جس کی یاد ہم ہر سال تازہ کرتے ہیں۔ کانگریس نے نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا اور یہ طے کیا کہ برطانیہ نے جو گول میز کانفرنس لندن میں طلب کی ہے اس میں ہماری شرکت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ساتھ ہی یہ اعلانیہ شائع کیا گیا کہ "قوم کو یہ ناقابل انتقال حق حاصل ہے کہ وہ بدیشی جوئے کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکے اور اس کا انگلستان سے جو بندھن ہے اسے توڑ ڈالے۔" اس اعلانئے کو ملک کے کونے کونے میں پڑھ کر سنایا گیا اور اس سے جو جوش و خروش پیدا ہوا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مہاتما گاندھی نے سیول نافرمانی کا از سر نو آغاز کر دیا اور خلاف قانون نمک سازی کی تحریک سے ایسی ملک گیر ستیہ گرہ شروع ہوئی جس کی وجہ سے عوام میں گرفتاری اور قید و بند کا جو رہا سہا خوف باقی تھا وہ بھی جاتا رہا اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں ملکی رہنمائی اور قیادت ایک نئے موڑ پر آگئی۔

ذکرِ غالب

علیم مسرور

ں میں ہیں شعر و انداز و بیان و فکر و فن
ضطرابِ شوق نے آراستہ کی انجمن
نیت گُل ریز ہے، الفاظ ہیں گُل پیرہن
ہے کچھ اور بھی آرائشِ حُسنِ سخن
روحِ رنگ و بو کو اک ہم رنگ قالب چاہیے
ذکرِ غالب، ہم نشیں! شایانِ غالب چاہیے

کاغذی تھا شوخیِ تحریر کا جب پیرہن
اُس نے بخشا اپنے اندازِ بیاں کا بانکپن
دیکھ کر اس کے لبِ اعجاز کا طرزِ سخن
شاعری بے تاب ہو کر بن گئی خود اُس کا فن
اک بُتِ شیریں ہے پیکر اس کی ہر تحریر کا
یہ کرشمہ، ہم نفس، لانا ہے جوئے شیر کا

کہ جس کے ہاتھ میں سو پشت سے شمشیر تھی
اعری جس کے لیے اجداد کی تحقیر تھی
س کا ورثہ خطوطِ یار، کچھ تصویر تھی
کر رسوائی جسے مر کے بھی دامن گیر تھی
آج اُس کی عظمتوں کا ذکر ہر محفل میں ہے
سُننے والا سوچتا ہے یہ بھی اس کے دل میں ہے

رند ہو کر کی ہے اس نے معرفت کی گفتگو
رکھ لی اُس نے آبروئے بادہ و جام و سبو
اس نے اس انداز سے توڑا طلسمِ ما و تو
رکھ دیا مٹی کا ساغر جامِ جم کے روبرو
ہے کسے انکارِ کراماتِ جلی ہوتا نہیں
اور وہ کہتا ہے، رندوں میں ولی ہوتا نہیں

لے کے درمانِ غمِ ہستی ملی اس سے اجل
وہ ہماری بزم میں ہے آج بھی، جیسے تھا کل
اب کہاں، مسرور! اس کی نیند کا نعم البدل
اُس کے شانے پر ہے گیسوئے پریشانِ غزل
شدّتیں غم کی بالآخر غم کا درماں ہو گئیں
مشکلیں اتنی پڑیں اُس پر کہ آساں ہو گئیں

۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء

ماگھ ۱۸۸۸ اشک

برہان قاطع پر
غالب کے چند اعتراضات کا ایک جائزہ

عرشی رامپوری

میرزا غالب نے فارسی کے مشہور لغت برہان قاطع پر جو تنقید کی تھی وہ پہلے قاطع برہان کے نام سے اور پھر درفش کاویانی کے لقب سے اُن کی زندگی میں چھپ چکی ہے۔

یہ تنقید یں اصل میں انھوں نے برہان قاطع کے اس نسخے کے حاشیوں پر لکھی تھیں جو اُن کے مطالعے میں رہتا تھا۔ یہ کمتر اردو اور زیادہ تر فارسی میں تھیں جب انھوں نے ان کو کتابی شکل دی تو از سرِ نو سب کو فارسی میں لکھا۔

برہان قاطع کا محولہ بالا نسخہ لوہارو میں تھا وہاں سے منتقل ہو کر رضا لائبریری میں آگیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے لفظوں پر نشان لگائے تھے مگر سب پر نہ لکھ سکے اور جن الفاظ پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے ان میں سے بھی بہت سے ترتیب کتاب کے وقت چھوڑ دیے۔

چونکہ یہ عبارتیں اس لیے بہت اہم ہیں کہ بے ساختہ لکھی گئی ہیں اس لیے آج کی صحبت میں ان میں سے ۲۰ کو غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ انھیں غالبیات میں معقول اضافہ شمار کیا جائے گا۔ اس سلسلے کی چند ردیفوں سے متعلق تحریریں ماہ نو، نیا دور اور نقوش میں شائع ہو چکی ہیں۔

میرے پیش نظر اسدی طوسی کی لغت فرس کے ساتھ برہان قاطع کا وہ نسخہ بھی رہا ہے جو تہران سے ڈاکٹر محمد معین کے حاشیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مناسب موقعوں پر میں ان دونوں کے حوالے دیتا گیا ہوں۔

اس مقالے میں ب سے برہان قاطع اور غ سے غالب مراد ہیں۔

۱۔ ب: راستاد بسکون سین بر وزن بامداد وظیفہ و راتب را گویند۔

غ: راستاد غلط است۔ رستاد است بہ رای مفتوح۔ و این رستی دار است۔ چہ رستی بمعنی روزی و ما حضر آمدہ است۔ رستی دار بہ سبب کثرت استعمال رُست داد شد۔ چون دو حرف قریب المخرج را ادغام رسم است، رُستاد ماند ۱۲

عرشی: قاطع (ص ۴۰) میں قدرے توضیح کے ساتھ ہے۔ درفش میں قاطع کی عبارت کے بعد لکھا ہے کہ "عزیزے بمن گفت کہ ترا از تخطیۂ جامع برہان قاطع غرض چیست؟ گفتم اعلانِ حق۔ قلب از جید و جعل از اصل جدا می کنم چنانکہ مرشد کامل تفرقۂ وساوس شیطانی از حضرت رحمانی خاطر نشانِ طالبان راہ حق می کند۔ اگر طبع سلیم داری، بیش[illegible] تردد کلام می کنی نا سزا مگوی و دشنام مدہ۔ حرفہای سودمند خرد پذیر در ضمیر فراہم آر، و عبارتے ترکیب دہ کہ اگر فصیح نبود، بارے سوال دیگر و جواب دیگر نباشد۔ من در دِ سخن دارم، داز دروغ میرنجم، از اں راہ جامع برہان قاطع

رازِ نہفت می گوییم؛ آں ہم ظریفانہ و حریفانہ بہ بذلہ و لطیفہ، نہ تحشّانہ و سفیہانہ بہ فحش و دشنام۔"

کاش، میرزا صاحب نے یہی کہا ہوتا۔ مگر اُنھوں نے تو کھُلم کھُلا گالیاں دی ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ہندوستانی اہلِ علم اُن کے خلاف دشنام طرازی پہ اُتر آئے۔

رہا لفظ راستاد کا غلط ہونا، تو ڈاکٹر معین نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ غالباً یہ اس وجہ سے ہوگا کہ رشیدی (ج صفحہ ۷۲۰) میں اس لفظ کی سند میں فردوسی کا یہ شعر درج کیا گیا ہے:

خدایا، بخواہم ز تو راستاد   چو جودت ہمہ را وظیفہ بداد

خان آرزو بھی راستاد کو صحیح مانتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے رستاد کو مخفف استاد بتا کر اس کے معنی بھی راتب و وظیفہ لکھے ہیں۔ فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں بھی راستاد کو اصل اور رستاد کو مخفف بتا کر دونوں کے معنی وظیفہ و راتبہ لکھے ہیں۔

۴۔ ب: رادش بہ فتح ثالث بروزن آتش کوکبِ مشتری را گویند۔

غ: رادش ہم برای مہملہ دروغ، ہم بہ واد مفتوح غلط۔ زاوُس بروزن طاؤس و کاؤس است۔ باشد کہ برای ضرورتِ شعر ہمزہ را بیندازند۔ لیکن ضمۂ واو دراں صورت نیز برقرار خواہد ماند؛ بہ معنی زاوش بروزن خامُش ۱۲

عرشی: قاطع (ص ۴۵) اور درفش (ص ۴۷) میں قدرے اضافے کے ساتھ اسے دُہرایا ہے۔ چونکہ برھان کے نسخۂ مطبوعہ کے حاشیے میں مصححین نے یہی بات کہی تھی، کسی جواب دینے والے نے اس پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو چبایا ہوا لقمہ ہے؛ تو درفش میں لکھا کہ "حاشیہ صفحہ ۳۵۵ برھان منطبعۂ کلکتہ دیدنیست تا دانند کہ اہلِ دانش و داد بودن رای بے نقطہ را، اسمِ مشتری زاوش است؛ روا نداشتہ اند۔" مصححین کا یہ نوٹ زیرِ نظر نسخے میں بھی صفحہ ۲۶۰ پر ہے، مگر درفش کی ترتیب کے وقت یہ نسخہ اُن کے پاس نہ تھا، اس سے صفحوں کا حوالہ دوسرا ہے۔

تاہم غالب کا اعتراض درست ہے، اور برھان کے بعد کسی مولفِ فرہنگ نے بھی اس لفظ کو باب الراء میں نہیں لکھا ہے بلکہ انجمن آرائے ناصری نے تو برھان کی تغلیط کی ہے، اور صحیح زاوش کو بتایا ہے۔

۳۔ ب: رت، بہ فتح اول، برہنہ و عریاں را گویند۔ و بہ ضم اول تہی دست و بے نوا و برہنہ و خالی را گویند۔

غ: "رت بہ فتح برہنہ و عریاں را گویند، و بہ ضم تہی دست و بے نوا و برہنہ و خالی را گویند۔" دیدہ وراں، خدا را، در ہر دو معنی کدام تفاوت پیدا شد۔ ہماں یک معنی بحال ماند۔ و ایں چنیں مقام ہمیں قدر نوشتن کافی بود کہ قیل بالفتح، وقیل بالضم[1] ۱۲

عرشی: قاطع (ص ۴۶) اور درفش (ص ۷۶) میں اسے الفاظ بدل کر لکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عبارت میں عیب ضعفِ تالیف موجود ہے۔ خان آرزو نے سراج اللغات میں لکھا ہے کہ "در جہانگیری بہ فتح برہنہ و بہ ضم تہی دست است۔ و ایں خطا است۔ ہر دو بہ ضم اول است؛ چنانکہ در سروری است، زیرا کہ مخفف روت است بہمیں معنی چنانکہ توسنِ آزردہ، و بعضے لوت بہ لام نیز گفتہ اند۔ و ایں نیز صحیح است، زیرا کہ بدل روت است۔ و تحقیق آنکہ بہ معنی تہی دست مجاز است، و مجازاً بہ معنی خالی ہم آمدہ، چنانکہ زمین رت گویند، یعنی زمین خالی از عمارت"، دوسرا انجمن آرائے ناصری میں رُت بہ ضم را بہ معنی برہنہ کو بتایا ہے کہ یہ اصل میں لخت تھا، از راہِ تخفیف لت ہوا، اور ل کا ر سے بدل ہوا تو رت بروزن بت ہو گیا۔ فرہنگ نظام میں بہ فتح را لکھ کر یہ بھی بتایا ہے کہ سنسکرت میں رِکْتْ रिक्त کہتے ہیں۔

۴۔ ب: رخنہ ـ و بہ ضم اول کاغذ را گویند بعربی قرطاس خوانند۔

غ: سند می خواہد ۱۲

عرشی: یہ اعتراض قاطع اور درفش سے خارج ہے۔ رشیدی (ج ا ص ۷۳۴) میں بھی بے سند کے مذکور ہے لیکن اسدی طوسی نے لغتِ فرس (ص ۵۰۸) میں شہید کا یہ شعر ثبوت میں پیش کیا ہے:

---

[1] یہ غالب کا خود نوشت املا ہے۔ صحیح بالفتح اور بالضم ہے۔

پیش تو زر رشتۂ اشعار مرا   بعد ازیں کن بگفت گفتار مرا

خان آرزو نے سراج میں تحفۃ السعادۃ کے حوالے سے بہ معنی کاغذ بھی بتایا ہے۔ انجمن آرائے ناصری اور فرہنگ نظام نے بھی بالضم کو کاغذ کا مترادف مانا ہے۔

۵۔ ب: رستاد بروزن بغداد مخفف راستاد است کہ بہ معنی وظیفہ و راتب و روزیانہ باشد۔

رغ: راستاد خود غلط است، مخفف یعنی چہ ۱۲

عرشی: راستاد کے سلسلے میں بحث اوپر گزر چکی ہے۔ قاطع اور ددفش میں یہ اعتراض بھی جگہ نہ پا سکا۔

۶۔ ب: رُرشتہ۔ بہ معنی روئیدہ ہم آمدہ است۔

رغ: رستہ را می گوید کہ بہ معنی روئیدہ ہم آمدہ است۔ ہمانا رستہ را لغتے غیر منصرف و جامد شمردہ است۔ ایں قدر نمی داند کہ رستہ مفعول رستن است۔ و روئیدہ مفعول روئیدن۔ رستن مصدر اصل است، روئیدن مصدر مضارعی ۱۲

عرشی: قاطع اور ددفش میں اسے بھی شامل نہیں کیا ہے، مگر ہے درست۔

۷۔ ب: رستی بہ معنی رزق و روزی و نان و حلوا و ماحضر و خوردنی اندک ہم ہست آہ۔

رغ: رستی بہ معنی روزی و ماحضر و رُستاد بہ معنی روزینہ و علوفہ ۱۲

عرشی: یہ عبارت صرف رُستاد کی خاطر لکھی گئی ہے، اور کوئی مطلب معلوم نہیں ہوتا۔

۸۔ ب: رکیدن، بروزن مکیدن، بہ معنی خود بخود سخن گفتن از روی قہر و غضب۔

رغ: غلط است۔ درکیدن تای فارسی یا کاف باید آید ۱۲

عرشی: قاطع (ص ۴۹) اور ددفش (ص ۷۷) میں اسے بڑھا کر لکھا ہے، یہ اعتراض بھی درست ہے۔

۹۔ ب: رگِ جان بکسر ثانی، کنایہ از شریان و حبل الورید۔

رغ: رگِ جان، ہمان جانست، نہ حبل الورید ۱۲

عرشی: یہ اعتراض بھی قاطع اور ددفش میں جگہ نہ پا سکا۔

رشیدی (ج ۱ ص ۴۵۷) میں برہان کی ہمنوائی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین نے بھی (حاشیہ برہان ج ۲ ص ۹۵۹) گلستاں کا یہ شعر نقل کرکے
* اس کے موید نظر آتے ہیں:

گفتی رگِ جان می گسلد زخمۂ ناسازش   ناخوشتر از آوازہ مرگ پدر آوازش

خان آرزو بھی سراج اللغات میں رگِ جاں کو بہ معنی "شریانی کہ بدل تعلق دارد" بتاتے ہیں۔ انجمن آرائے ناصری میں یہی معنی بتا کر کسائی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے:

بیداد گرے پنجہ فرو برد بہ زخم   بگرفتہ حریفے رگِ جانم کہ تو داں (گفت)

فرہنگ نظام میں بھی رگِ جاں کو بہ معنی شاہ رگ لکھا ہے۔

۱۰۔ ب: رگیدن بروزن رمیدن بہ معنی آہستہ آہستہ با خود از روی قہر و غضب سخن گفتن باشد۔

رغ: ہم بہ کاف عربی نوشت، و ہم بہ کاف پارسی۔ حالانکہ رای بے نقطہ دارد، نہ کاف فارسی ۱۲

عرشی: قاطع (ص ۴۹) اور ددفش (ص ۷۷) میں لفظ رکیدن کے تحت اس کو جگہ دی ہے۔

۱۱۔ ب: رنجال بروزن خنجال، طعام و خوردنی را گویند۔

رغ: رنجال بہ معنی طعام غلط، در تحقیق رای قرشت با یای حطی باید دید ۱۲

عرشی: قاطع و ددفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر معین نے بھی اس پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا، مگر لغت فرس اور رشیدی میں بھی یہ لفظ نہیں ملتا۔ نہ "ریچال" کوئی لفظ ہے۔ ریچال البتہ ہے اور بہ معنی اچار ہے۔ خان آرزو نے سراج میں برہان کا قول نقل کرکے "لیکن ریچال بہ تحتانی فی معنی از خوردنیست" چنانکہ بیاید لکھا ہے۔ انجمن آرائے ناصری میں بھی اسے ریچار اور ریچال بتایا ہے۔

۱۲۔ ب: روان کرد، بکسر کاف و سکون را و دال بے نقطہ بہ معنی ملکوت باشد چنانکہ کہ آباد بہ معنی جبروت است۔

رغ: روان کرد بکسر کاف، خطای اول این کہ تصریح کاف فارسی نکرد، دوم این کہ بہ معنی عالم ارواح نوشت۔ اصل انیست کہ روان گرد بہ کاف فارسی مکسور عالم ارواح را نامند ۱۲

عرشی : قاطع اور دفش میں یہ اعتراض بھی موجود نہیں۔ ڈاکٹر معین نے فرہنگ دساتیر (ص ۲۴۰) سے جو عبارت نقل کی ہے، وہ تلفظ میں غالب کی اور معنی میں برہان کی موید ہے۔ یہی صورت فرہنگ انجمن آرائے ناصری کی ہے۔ خان آرزو نے سراج اللغات میں تلفظ برہان کا اور معنی غالب کے مطابق لکھے ہیں۔

۱۳۔ ب : روزگار بردن کنایہ از عمر و اوقات ضائع کردن باشد۔

غ : روزگار بردن ہماں عمر بسر کردن است، خصوصیت تلف کردن لغو ۱۲

عرشی : قاطع اور دفش سے یہ اعتراض بھی خارج ہے۔ ڈاکٹر معین نے برہان کے خلاف کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔ رشیدی (ج ۱ ص ۷۵۵) اور انجمن آرائے ناصری میں "یعنی عمر و وقت ضائع کردن" معنی لکھے ہیں، جو برہان کی تائید میں ہے لیکن خان آرزو نے سراج میں برہان کے معنی لکھ کر کہا ہے کہ "لیکن صرف کردن عمر است مطلقاً" غالب کی تائید میں ہے۔

۱۴۔ ب : رو کش بہ فتح اول و کاف بروزن مہوش بہ معنی ہر باشد آہ۔

غ : "رو کش بہ فتح اول و کاف بروزن مہ وش" برای خدا دنان ہوش کجا درست می آید۔ بروزن نورس چرا ننوشت ۱۲

عرشی : اس اعتراض کو بھی قاطع اور دفش میں جگہ نہیں دی ہے۔

۱۵۔ ب : روم بہ ضم اول و ثانی مجہول بروزن موم موی زہار باشد۔

غ : روم بہ ضم اول و ثانی مجہول موی زہار را در کدام زبان گویند۔ فارسی خود نیست۔ عربی نہ خواہد بود۔ آرے، در ہندی روم رونگٹہ را گویند، و آں ترجمۂ مسام است۔ در فارسی ایں را نامے جداگانہ نیست، مگر بن مو گویند۔ رُوم بہ معنی موی زہار مسخر است ۱۲

عرشی : قاطع میں یہ اعتراض نظر انداز ہو گیا ہے۔ لفظ "رُم" کے تحت برہان میں لکھا ہے کہ "بہ ضم اول موی زہار آدمی باشد"۔ اس پر بحث کرتے ہوئے دفش (ص ۵۷) میں لکھا ہے کہ "دانچہ در لسان عرب معنی ایں لفظ گردآوردہ است یعنی گرفتن و گریز و چیز خوردن و بہ علاج آوردن و بہ تغیر اعراب، موی زہار، پرسش عیب نیست خاصۃً وقتے کہ پرسندہ جویای تحقیق باشد — موی زہار را خود برہانی خواجہ برہان آوردن سوء ادبست۔ ہر چند از علماء ثروت بیش رفت، و کتب مشہورۂ لغات عرب ورق ورق نگرستہ شد، کسے نگفت و در ہیچ فرہنگ بہ نظر نیامد کہ رم لغت عربیست بہ اول مفتوح بہ معنی فراز و بہ اول مضموم بہ معنی موی زہار — ایں قدر البتہ می تواند بود کہ خواجہ قطرب از عربی کردن لغت فارسی ثواب مسلمان کردن یک گبر اندوختہ باشد، آں ہم در خیال، نہ در واقع۔"

اس عبارت میں جملہ "معنی موئی زہار را خود بردی خواجہ برہان آوردہ سوء ادبست" اور اس کے بعد مولف برہان کو "خواجہ قطرب" کہنا جس کے معنی جاہل اور سفیہ بھی ہیں، اخلاق کے خلاف ہے۔

رہا غالب کا یہ کہنا کہ رم کے معنی سوائے بہ معنی رمہ کے سب غلط ہیں یا صاحب برہان نے رم بہ فتح اول کو عربی کہا ہے، یا بہ ضم اول بہ معنی موی زہار کو عربی بتایا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ رشیدی (ج ۱ ص ۷۴۶) میں لکھا ہے کہ "رم، بالضم، موی زہار، و بالکسر مخفف ریم، و بالفتح مخفف رمہ، و رمیدگی و امر برمیدن، و گوشت اندرون، بیرون دہان۔ رودکی گوید :

آرزومند آں شدہ تو بکور بکہ رسد نان پارہ ات بی رم

خود برہان سے اور رشیدی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی اور شکلیں رنب اور رنبہ بھی ہیں، چنانچہ رشیدی کا (ج ۱ ص ۷۴۶) میں رنبہ بالضم و بای مفتوح کے معنی موئے زہار لکھ کر لبیبی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے :

آں گاہ کہ من ہجات گویم تو بیش کنی و زنت و رنبہ

اسی رُم کی دوسری اشباعی شکل روم ہے۔ انجمن آرائے ناصری میں رم اور روم اور رومہ تینوں کو بہ معنی موئے زہار لکھا ہے، اور رومہ کے لئے سوزنی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے

شد جاجی جاجی ریختہ از ننگ وی او ریشے کہ ننگ دارد از رومہ ہا

سراج اللغات اور فرہنگ نظام سے بھی برہان ہی کی تائید

ہوتی ہے۔ خود برہان میں رومہ کے معنی موی زہار لکھے ہیں اور غالب نے اس کی تردید نہیں کی ہے۔ اس لیے اس میں شبہ نہیں رہتا کہ یہ لفظ بمعنی موی زہار بے اصل اور مستخرج کسی طرح بھی نہیں۔

۱۶۔ ب: رہبان، بضم اول و بای ابجد بہ الف کشیدہ بروزن بهتان زاہد و پرہیزگار باشد۔ و وجہ تسمیہ اش محافظت کنندۂ نیکی و سیرت نیک باشد۔ چہ رہ بمعنی نیکی و بان بمعنی محافظت کنندہ است، چنانچہ باغبان و گلہ بان و امثال آن۔ و بہ فتح اول ضد او ندر راہ۔

رغ: رُہبان بضم می نولید، و بازمی فولید کہ رہ بمعنی نیکی و بان بمعنی حافظ۔ گوئی این لغت را فارسی شمردہ، حالآں کہ در فارسی رہ بمعنی نیکی ہرگز نیامدہ۔ راہب و رہبان یقین است کہ لغت عربی باشد بمعنی زاہدان ترسا ۱۲

عرشی: قاطع اور ردفش میں اس اعتراض کو جگہ نہیں دی ہے، حالانکہ یہ درست تھا۔

۱۷۔ ب: رہیدن — بمعنی خلاصی شدن آہ

رغ: این مصدر مضارع رستن است ۱۲

عرشی: قاطع اور ردفش میں یہ اطلاع بھی مندرج نہیں ہے۔

۱۸۔ ب: ریتہ بہ فتح فوقانی بروزن ریشہ بار درختے است آہ

رغ: ریتہ ہرگز لغت فارسی نیست۔ ثمریست ہندی۔ مردم ولایت بہ تغیر لہجہ ریتہ گویند۔ ورنہ دراصل ریٹھہ نام آنست بہ تای ہندی مختلط التلفظ بہ ہای ہوز ۱۲

عرشی: یہ اعتراض بھی قاطع اور ردفش میں شامل نہیں کیا گیا، حالاں کہ ہے درست۔

۱۹۔ ب: ریچال بروزن قیقال بمعنی ریچار است کہ مربای دو شابی و آنچہ از شیر و ماست گوسفند و غیرہ پزند۔

رغ: ریچار بمعنی آچار درست ۱۲

عرشی: قاطع اور ردفش میں یہ تصویب بھی شامل نہیں ہے۔

۲۰۔ ب: رہانیدن بروزن پیچانیدن بمعنی ویران کردن باشد۔ رہانیدہ — یعنی خراب کردہ و ویران ساختہ۔

رغ: در صحت این ہر دو لغت تامل بلکہ انکار است ۱۲

عرشی: قاطع اور ردفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔ رشیدی، سراج اور انجمن آرای ناصری میں یہ لفظ موجود ہے۔

۲۱۔ ب: رہیدن بروزن پیچیدن بمعنی افتادن باشد آہ۔

رغ: رہانیدن و رہیدن، این ہر دو لغت جامع از پیش خود تراشیدہ است ۱۲

عرشی: یہ اعتراض بھی قاطع اور ردفش میں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ بھی وہی رشیدی وغیرہ میں ان لفظوں کا ملنا ہوگا۔

۲۲۔ ب: زاج سور بہ سکون جیم نام شادی و جشن و سوری باشد کہ در ہنگام زائیدن زنان و ایام ولادت کنند۔

رغ: زاج سور۔ بہ جیم عربی غلط۔ زاچ سورات بہ جیم فارسی۔ و ہندی آں چھٹی کی شادی ۱۲

عرشی: قاطع اور ردفش میں یہ بھی شامل نہیں ہے، شاید اس لئے کہ زاج جیم عربی و فارسی دونوں سے درست ہے۔

۲۳۔ ب: زادشم — نام پدر افراسیاب است۔ و بعضے گویند نام جد افراسیاب است آہ

رغ: نام پدر افراسیاب زادشم ہرگز نیست۔ نام جد وی زادشم ابن تور است۔ و نام پدر افراسیاب پشنگ ۱۲

افراسیاب ابن پشنگ ابن زادشم ابن تور ابن فریدون ابن آبتین ابن جمشید ۱۲

عرشی: قاطع اور ردفش میں اس کو بھی جگہ نہیں دی ہے۔

۲۴۔ ب: زادمرد — مخفف آزادمرد کہ جوانمرد و کریم و صاحب ہمت باشد۔

رغ: زادمرد مخفف آزادمرد سند می خواہد۔ و بمعنی جوانمرد و سخی رادمرد است بہ رائے بے نقطہ ۱۲

عرشی: قاطع اور برہان میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں ہے۔ رشیدی (ج ا ص۶۶) میں لکھا ہے: مخفف آزادمرد، مولوی گوید ع

زادمردے چاشتگاہے در رسید

اما دریں بیت برای مہملہ نیز خواندہ اند۔ یعنی جوانمرد۔

خان آرزو نے بھی "رادمرد" بالراء المہملہ کو اقرب بصواب بتایا

ہے۔ لیکن انجمن آرای ناصری میں زاد کو آزاد کا مخفف بتا کر لکھا ہے کہ عنصری نے بہ معنی آزاد کہا ہے:

گفتم کہ ساختی سمن فرزنشین
گفتا کہ زاد سرو زمانی فرو نشاں

نیز فرخی نے کہا ہے:

کنون چو مست غلامان بسبز پوشیدہ بو ستان شوند انباد زاد سر بزوال

(یعنی متحرک)۔ اور ظاہر ہے کہ سرو کو آزاد کہا جاتا ہے۔ لہذا یہاں راد نہیں ہوگا بلکہ زاد بہ زای منقوطہ ہی ہوگا۔

۲۵۔ ب: زاوش، بہ ضم واو بر وزن خامش نام کوکب مشتری باشد۔ و بایں معنی بر وزن خموش و خاموش ہم آمدہ است و بر وزن خاموش کوکب عطارد را نیز گفتہ اند۔

رغ: غلط است۔ عطارد را نگویند۔

عرشی: قاطع اور دفش میں یہ اعتراض بھی جگہ نہ پا سکا، حالانکہ خان آرزو نے سراج میں صاف لکھا ہے کہ شمس فخری نے جو اسے بہ معنی عطارد لکھا ہے وہ غلط ہے۔ اور کسی لغت سے بھی برہان کی تائید نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر معین بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ اس لیے یہ اعتراض بھی درست قرار پائے گا۔

۲۶۔ ب: زندش بر وزن رنجش بہ معنی تحیت و درود و سلام است۔

رغ: زندش بہ زای مکسور است ۱۲

عرشی: قاطع اور دفش میں یہ اعتراض بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ یہ دساتیری لفظ ہے اور فرہنگ دساتیر (ص ۲۴۹) میں موجود ہے۔

۲۷۔ ب۔ زی بہ فتح اول و سکون ثانی، جان و حیات و زندگی را گویند کہ نفس و روح است۔ و بہ ایں معنی بکسر اول ہم آمدہ است چنانکہ در امر بایں معانی گویند کہ دیر زی، یعنی بسیار بمان و پیوستہ زندہ باش۔ و بکسر اول بہ معنی اندازہ و حد باشد ہم چنانکہ گویند از زی خود بیروں رفتہ است، یعنی از حد و اندازۂ خود بیروں رفتہ است و بہ معنی سوی و طرف و جانب و نزدیک ہم است چنانکہ گویند زی فلاں، یعنی طرف فلاں و سوی فلاں و جانب فلاں و نزدیک فلاں۔ و با تشدید ثانی در عربی بہ معنی شعار باشد۔

رغ: زی بہ فتح اول و سکون ثانی جان و حیات و زندگی را گویند۔ ایں عبارت تا جائے کہ نشانست (ہ) ہمہ مہمل و دروغ و پوچ است۔ ہرگز بہ فتح زای ہوز نفس و روح را نگویند۔ زیستن مصدر، یعنی جینا، و زید مضارع یعنی جیے، زی امر یعنی جیتا رہ۔ و ایں کہ گفتہ است بمعنی اندازہ و حد، محض غلط۔ ہماں بہ معنی شعار است کہ خود نوشتہ است۔ آرے بہ معنی سوی و جہت در است۔ پس ایں لفظے است کہ در عربی با تحتانی مشدد بہ معنی شعار آید، و در فارسی صیغۂ امر است از زیستن۔ و بمعنی طرف و جہت مرادف سوی نیز آید۔ زی بہ فتح اول بہ معنی حیات و زندگی و نفس و روح شاید زبان اجنّہ باشد ۱۲

عرشی: پہلے عرض کر دوں کہ یہ اعتراض بھی قاطع اور دفش میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد یہ بات قابل ذکر ہے کہ میرزا صاحب نے "اجنّہ" غلط لکھا ہے، جن کی جمع جِنّۃ ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی آیا ہے: "مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاس۔"

رہا ان معانی کا غلط ہونا، تو ڈاکٹر معین نے اس سلسلے میں بالکل خموشی اختیار کی ہے۔ خان آرزو نے سراج میں لکھا ہے کہ برہان کا اسے بہ معنی حد و اندازہ لکھنا خطای فاحش ہے۔ یہ وہی عربی لفظ ہے بہ معنی شعار۔

۲۸۔ ب: ژکیدن — بہ ضم اول ہم آمدہ است۔

رغ: ژکیدن بہ زای فارسی مفتوح است، نہ بہ ژای فارسی مضموم، و نہ بہ رای مہملہ ۱۲

عرشی: قاطع اور دفش میں یہ اعتراض اس جگہ چھوڑ دیا ہے کیونکہ لفظ رکیدن کی بحث میں یہ باتیں گزر چکی ہیں۔ فرہنگ نظام میں اس لفظ کو نہ حرف ر میں لکھا ہے، نہ حرف ز میں، بلکہ ژائے فارسی کی ردیف میں ذکر کیا ہے، جو برہان کی تائید ہے۔

۲۹۔ ب: ستا بکسر اول — نوعے از چادر باشد کہ آں را شامیانہ و سائبان ہم می گویند ستارہ بہ فتح اول آہ

رغ: در ضمن اول ستا بہ کسرۂ سین شامیانہ و سائبان را گویند، حال آں کہ شامیانہ دیگر است، و سائبان دیگر۔

ازیں درگزشتہ ستارہ بہ فتح اول می نویسد۔ لاحول ولا قوت

الا یا فند[۱] ۱۲

عرشی: قاطع اور درفش دونوں میں اس اعتراض کو بھی شامل نہیں کیا ہے، حالانکہ یہ درست ہے۔

۴۰۔ ب: ستوسر بر وزن کبوتر ہوائی باشد با صدا کہ بے اختیار از راہ دماغ بجہد۔ و آں را بعربی عطسہ خوانند۔

غ: ستوسر بر وزن کبوتر عطسہ در بحث شین با نون شنوسہ می نویسد، و خود ہم دریں بحث ستوسہ می آرد، تا کدام لغت صحیح است ۱۲

عرشی: قاطع (ص ۴۸) اور درفش (ص ۷۹) میں یہ بھی بتایا ہے کہ صحیح لفظ شنوشہ ہے، جو خود آگے چل کر برہان میں بھی مذکور ہوا ہے۔ ڈاکٹر معین نے بھی (حاشیہ برہان ۲ ص ۱۱۰۲) اسے ستوسہ کا مصحف بتایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا املا شنوشہ دو شینوں کے ساتھ بھی ہے۔ رشیدی میں یہ لفظ اشنوسہ اور شنوشہ دو شکلوں میں مذکور ہوا ہے، اور معنی وہی عطسہ (چھینک) ہیں۔ شنوشہ کی سند میں رودکی کا یہ شعر دیا ہے:

مرا امروز تو بہ سود دارد　　چنانچہ دیو و دنداں را شنوشہ

اور اشنوشہ کی سند میں ابوالخیر کا یہ شعر لکھا ہے:

دماغ خشک او اشنوشہ تر　　چو آرد، گوش گردوں را کند کر

خان آرزو نے سراج میں ستوسر اور ستوسہ دونوں کو شنوشہ کا مصحف بتایا ہے، جو غالب کی تائید ہے۔ انجمن آرائے ناصری نے اس کی دو شکلیں بتائی ہیں۔ شنوشہ اور شنوسا۔ فرہنگ نظام میں صرف شنوشہ کو اختیار کیا ہے۔

۴۱۔ ب: سدر۔ بہ فتح اول و ثانی و سکون رائے قرشت آہ

غ: سدر بہ سکون رائے قرشت۔ یارب، در لغت فارسی طلاع سکون حرف آخر چرا ۱۲

عرشی: قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی نہیں ملتا مگر ہے درست۔

۴۲۔ ب: سراسیمہ، بہ معنی شوریدہ سر باشد، چہ آسیمہ بہ معنی شوریدہ آمدہ است۔ و بہ معنی مضطرب و حیران ہم گفتہ اند۔

غ: آسیمہ، بہ معنی آشفتہ، و سراسیمہ بہ معنی آشفتہ سر، قیاس مرد کنی است۔ سراسیمہ بہ معنی آشفتہ است، و تنہا آسیمہ بہ معنی ورم زدہ می تواند بود ۲

عرشی: قاطع اور درفش سے یہ اعتراض بھی خارج ہے۔ رشیدی نے آسیمہ کو بہ معنی پریشان لکھا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ آسیمہ (۱۵۰) میں آسامہ ہے، الف بہ صورت امالہ ی سے بدل گیا ہے۔ اور آسام یا تو قلب آماس بہ معنی ورم ہے، اور یا بہ معنی آماس ہے اور سام اس کا مخفف ہے، یہی رائے صاحب انجمن آرائے ناصری کی ہے۔ خان آرزو نے فردوسی کا یہ قول نقل کر کے:

بہ گیو ساد یہ پژمردہ روی　　ہمی نازد آسیمہ دیو و بوی

لکھا ہے کہ آسیمہ تنہا بھی بمعنی بیہوش و متحیر آتا ہے۔

۴۳۔ ب: سرانج، سراغوچ، سراغوش، سراگوش آہ

غ: یک لغت را پنج لغت ساخت۔ چرا در یک جا ذکر نکرد ۱۲

عرشی: یہاں غالب سے چوک ہو گئی ہے۔ "پنج" کے بجائے "چہار" لکھنا چاہیے تھا۔ بہرحال، یہ اعتراض بھی خارج از قاطع و درفش ہے، مگر ہے درست۔

۴۴۔ ب: سرایان ـ خوانندگی و گویندگی و نغمہ سرائی کناں را گویند۔

غ: سرایان، خوانندگی و گویندگی را نگویند۔ ایں وزن حالیہ ہست، چوں گریاں و خنداں ۱۲

عرشی: قاطع (ص ۴۸) اور درفش (ص ۷۹) اگلے لفظ سرایش کے ساتھ ملا کر یہ اعتراض لکھا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر اُن سے چوک ہو گئی۔ برہان میں سرایاں کے معنی خوانندگی و گویندگی نہیں لکھے ہیں، بلکہ "خوانندگی و گویندگی و نغمہ سرائی کناں" لکھے ہیں، اور یہ درست ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر معین نے بھی اس لفظ کو سرائیدن کا اسم فاعل[۱]

---

[۱] یہ غالب کا خود نوشت املا ہے۔ صحیح "تو" اور "بافد" ہے۔

حال بتایا ہے۔

۳۵۔ ب : سرائش ـ بہ معنی زبان قال است کہ سخن گفتنی و نغمہ پردازی آدمیاں وسرود مرغان باشد۔

رغ : سرائش تنہا زبان قال را نہ گویند۔ زبان سرائش زبان قال و زبان ناسرائش زبان حال ۱۲

عرشی : قاطع (ص ۴۸) اور ردقش (ص ۹۷) میں یہ اعتراض "سرایاں" کے ساتھ ملا کر لکھا ہے۔ رشیدی (ج ۲ ص ۸۴۵) اور سراج اللغات و انجمن آرائے ناصری میں اسے بہ معنی نغمہ پردازی و گویندگی لکھا ہے، اور صاحب برہان نے بھی زبان قال کی تشریح "سخن گفتنی و نغمہ پردازی آدمیاں و سرود مرغان" سے کی ہے۔ اس لئے یہ اعتراض قابل پیش رفت نہیں معلوم ہوتا۔

۳۶۔ ب : سرپرست ـ بروزن زیر دست بہ معنی خادم و خدمتگار باشد۔

رغ : سرپرست بہ معنی خادم و خدمتگار سند می خواہد۔ آرے در اردو ی مشہور سرپرست بہ معنی مربی و محسن زبان زد عام و خاص است و در فارسی بہ معنی خادم بہ نظر نیامدہ ۱۲

عرشی : قاطع (ص ۴۸) اور ردقش ص ۹۷ میں بھی اسے لکھا ہے اور سند مانگی ہے۔ ڈاکٹر معین نے (حاشیہ برہان ج ۱ ص ۱۱۱۷) لکھا ہے: "لغتہً بہ معنی پرستندہ (خدمت کنندہ) سر (سرور) در زبان کنونی بہ معنی رئیس و کفیل خانوادہ و موسسہ وغیرہ استعمال می شود۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ معنی مربی و محسن اردو ہی کا محاورہ نہیں ہے، بلکہ فارسی میں بھی اسی طرح بولا جاتا ہے۔ خان آرزو نے سراج میں بہ معنی خادم و خدمتگار کو مجازی استعمال قرار دیا ہے۔ انجمن آرائے ناصری نے بہ معنی "مہماندار و خادم و بیماردار و پرستار بیمار" بتایا ہے۔ فرہنگ نظام میں لکھا ہے : زبان شعر میں سرپرست کے معنی خادم و تیماردار و پرستار ہیں۔ لیکن عام بول چال میں بہ معنی مربی و نگاہ دارندہ ہے۔

۳۷۔ ب : سکاد ـ بروزن سواد سرکوہ و فرق سر آدمی را گویند۔

رغ : آں چکاد است بجیم فارسی۔ و جیم فارسی با سین بدل نمی شود ۱۲

عرشی : قاطع اور ردقش میں اس اعتراض کو درج نہیں کیا ہے۔ خان آرزو نے سراج میں اور ہدایت نے انجمن آرائے ناصری میں، ڈاکٹر معین نے (حاشیہ برہان ج ۲ ص ۱۱۰۵) میں اسے چکاد کا بدل مانا ہے۔



فکرِ تازہ

منوّر لکھنوی

یہ کس نے اثرِ مذاقِ گناہ کو دی ہے
سزا جو میرے دلِ داد خواہ کو دی ہے

ضرور تم نے اشارہ کیا ہے فتنوں کو
ادائے خاص سے جنبش نگاہ کو دی ہے

مجال کیا کہ اثر ہو شریکِ حال مرا
اثر کے ساتھ اجازت بھی آہ کو دی ہے

میں دے رہا ہوں دعائیں ہزار صحرا کو
اماں مرے دلِ وحشت پناہ کو دی ہے

بنا کے میں نے اسے چشمِ شوق کا سُرمہ
بہت بلند جگہ گردِ راہ کو دی ہے

مرے لیے سببِ فخر و ناز ہے، تم نے
جو اہمیت مرے حالِ تباہ کو دی ہے

جگر ہے یہ، کوئی دیکھے مرے کلیجے کو
کہ دل میں راہ محبت کی آہ کو دی ہے

زمیں پہ ہم نے پکارا ہے دشت و دریا کو
بلندیوں پہ جگہ مہر و ماہ کو دی ہے

یہ جانتے ہوئے دونوں میں فرق کتنا ہے
زمیں پہ ہم نے جگہ کوہ و کاہ کو دی ہے

رُخ اس کا کس کی طرف ہے، بتا تو دو مجھ کو
یہ کس خیال سے تاثیر آہ کو دی ہے

فرشتے اس سے پریشاں ہیں، دینے والے نے
جو منزلت مری فردِ سیاہ کو دی ہے

کسی کو حوصلہ کیوں کر ہو داد خواہی کا
صدا بھی تم نے کسی داد خواہ کو دی ہے؟

نوازنا ہے کسی کو کہ خاک کرنا ہے
یہ کس خیال سے گردش نگاہ کو دی ہے؟

نہ اس قدر طلبِ داد یہ کبھی کرتا
ہوا تجسس نے دلِ داد خواہ کو دی ہے

خیال کیا ہے جو کون و مکاں کی پہنائی
مری نگاہ کو، اپنی نگاہ کو دی ہے

کراہ، دست اٹھیں گے، تڑپ اٹھیں گے رقیب
گداز دل نے وہ تاثیر آہ کو دی ہے

نگاہ اٹھے گی پہلے گناہ گاروں پر
کریم نے یہ فضیلت گناہ کو دی ہے

رُخِ زمانہ پلٹ جائے، دینے والے نے
وہ تابِ دل کو، وہ طاقت نگاہ کو دی ہے

اسیر کون ہے یہ وسوسوں کے پنجے میں
یہ کس نے دل میں جگہ اشتباہ کو دی ہے

تمام خلق منوّر یہ جان چھڑکے گی
جگہ جو دل میں خیالِ رفاہ کو دی ہے

غزل

محمود عشقی

ڈال کر اونچی فصیلوں پر کمند
ماہِ نو ہونے لگا پھر سر بلند

نقرئی پازیب لہراتا ہوا
پیار کی راہوں سے گزرا من پسند

بلبلیں خوشیوں کی چہکیں، اڑ گئیں
غم کی کوئل دل کے پنجرے میں ہے بند

دل کے زخموں پر نمک پاشی کے بعد
دہن سے رہ رہ کے ٹپکاتا ہے قند

روز و شب مے کدے کا در کھلا
غم نہیں، توبہ کا دروازہ ہے بند

درد کی سوغات دل کو دے گئے
چشمِ نم ہیں آپ کے احسان مند

نیکیاں پرواز کو بے چین ہیں
ہو گیا شیطان شاید فتح مند

دستِ سرمایہ ہوا جتنا دراز
پرچمِ حرص و ہوس اتنا بلند

دشتِ غم میں دل دہی کے واسطے
کوئی میرے پاس آیا درد مند

میر کی عظمت

مالک رام

اردو ادب کی تاریخ میں میر کا جو مقام ہے، وہ آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو سکا۔ میر سے پہلے بھی اردو میں شعر کہے جا رہے تھے، اور انھیں اس جہان سے گزرے ہوئے جو ڈیڑھ صدی سے زیادہ گزر چکی ہے تو اس میں بھی سیکڑوں شاعروں کا کلام ہماری زبان کی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لیکن نہ ان سے پہلے کسی شاعر کو یہ رتبہ بلند ملا، نہ ان کے بعد کسی شاعر کو۔ میر کی بزرگی کا اعتراف سب نے کیا ہے، اور اس میں دلّی یا لکھنؤ کسی جگہ کی قید نہیں۔ ان میں غالب اور ذوقؔ دلّی کے ہیں، تو ناسخ لکھنؤ کے؛ اور یہ وہ حضرات ہیں جن میں سے ہر ایک بجا طور پر استاذ الاساتذہ کہلاتا ہے۔ انفرادی حیثیت سے ان شعرا میں سوچنے کا انداز، لب ولہجہ، اسلوب بیان — غرض کوئی چیز بھی مشترک نہیں؛ نہ ان میں سے کوئی صحیح معنوں میں میر کا مقلد یا متبع ہے، لیکن ان سب اختلافات اور خصوصیات کے باوجود جب میر کا نام آتا ہے تو ہر ایک کا سر یکساں ان کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے ۔

اس کی وجہ کیا ہے ؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں اردو شاعری کی تاریخ اور غزل پر غور کرنا ہوگا ۔

اردو کہاں اور کب پیدا ہوئی، اس سے متعلق مختلف رائیں ہیں؛ لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اس کا ادبی دور دکن سے شروع ہوا۔ جب ہم اردو شاعری کے دکنی عہد کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس میں تصوف اور حسن وعشق کی داستان بہت نمایاں ملتی ہے؛ اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ ابتدا میں مذہبی تحریکوں کا اثر بہت وسیع اور گہرا تھا۔ صوفیۂ کرام نے جہاں ملک کے طول وعرض میں لوگوں کی اخلاقی اصلاح اور روحانی رہ نمائی کی؛ وہیں اس زبان کی ترقی وترویج کے باب میں بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عام طور پر لوگ نثر کے مقابلے میں نظم زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں؛ اور اگر کوئی بات یاد رکھنے کی ہو، تو حافظہ اسے نظم کی شکل میں جلد اخذ کر لیتا ہے اور پھر لمبے زمانے تک محفوظ رکھتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان دینی پیشواؤں نے پیرووں اور عوام کی ہدایت اور تعلیم کے لیے ایسی نظمیں کہیں، جن میں مذہبی مسائل کی وضاحت تھی یا اخلاقیات کے نکتے بیان کیے گئے ہیں ۔

مذہب اور اخلاقیات کے باہر دوسرا میدان غزل کا تھا۔ اس کی روایت ہمارے ہاں سراسر فارسی غزل سے آئی، جہاں حسن وعشق کے سوائے کوئی اور موضوع تھا ہی نہیں ۔ محمد قلی قطب شاہ کا کلیات چھپ گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی غزل کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو دکنی میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکتے تھے ۔ فارسی صدیوں سے اس میدان میں جولانیاں دکھا رہی تھی، اس نے اپنے راس المال میں عربی فتوح کا اضافہ کر کے اس میں ایسی ایسی جدتیں اور انوٹھیں پیدا کر لی تھیں کہ دکنی یا اردو کو اس منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی لمبے سفر کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ غزل فارسی کی ہو یا اردو کی، اس میں خلوص یا صداقت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہ سراسر تصنع اور تکلف کا مرقع تھی ۔ اس کی زبان، بیان، استعارے — غرض پورا تار و پود مصنوعی اور غیر فطری تھا۔ اور چونکہ بات دل سے نہیں نکلتی تھی، اس کا اثر بھی نہیں ہوتا تھا۔ پڑھنے والا اور سننے والا شاعر

کی صناعی، کاری گری اور مرصع کاری سے تو ضرور مرعوب ہو جاتا، لیکن اس کا دل متاثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ تھی صورتِ حال، جب میر نے شاعری شروع کی۔

میر کے ضخیم کلیات میں ہر صنف کا کلام ہے: غزل، قصیدہ، ہجو، مثنوی، مرثیہ، رباعی، مخمس، مسدس ــــ غرض وہ کسی چیز میں پیچھے نہیں ہیں، لیکن جو شہرت انھیں غزل میں، یا کسی حد تک مثنوی میں بھی حاصل ہوئی، وہ کسی اور صنف کلام میں نہ مل سکی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کا اصلی میدان غزل ہے، اور اسی کی بنیاد پر ان کی بزرگی اور عظمت کی رفیع عمارت اٹھائی گئی ہے۔

میر کے معاصرین میں ایک خواجہ میر درد کو چھوڑ کر سب اسی روایتی رنگ میں رنگے ہوئے تھے جو ان سے پہلے رواج پا چکا تھا۔ لیکن درد کا میدان محدود تھا، انھوں نے تصوف کو موضوعِ سخن بنا لیا اور اس میں شبہہ نہیں کہ اس صنف میں ان کا کلام بہت کامیاب ہے۔ لیکن خالص غزل میں میر کا کوئی حریف نہیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہم غزل کے اجزائے ترکیبی پر ایک نظر ڈالیں۔

ظاہر ہے کہ یہ جذبے یا خیال، شدتِ احساس، زبان اور اسلوبِ بیان پر مشتمل ہے۔

سب سے پہلی چیز جذبہ یا خیال ہے۔ اگر شاعر نے نقالی نہیں کی اور اسے کسی سے مستعار نہیں لیا، بلکہ یہ اس کا اپنا جذبہ ہے، اس کی واردات ہے، وہ آفاق نہیں بلکہ انفس کی بات کر رہا ہے، تو اس میں خلوص ہوگا، سوز اور درد ہوگا۔ اگر یہ جذبہ اس کا اپنا ہے، اس نے مدتوں اپنے خون جگر سے اس کی پرورش کی ہے، اور اس کے مختلف دور اس کے قلب و روح پر وارد ہو چکے ہیں، تو اس کے بیان میں گہرائی اور شدت ہوگی۔ اسکے بعد ہر ایک بات اس کے دل سے نکلے گی اور یہ سامع کے دل پر اثر کرے گی۔

زبان اور بیان کا معاملہ اس سے مختلف اور مشکل ہے۔ یہ دونوں چیزیں اکتسابی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جذبہ اور خیال شاعر کا ذاتی ہو اور اس نے اسے مدتوں محسوس بھی کیا ہو، لیکن اگر اسے زبان پر پوری قدرت حاصل نہیں ہے، یا وہ اس جذبے کی مختلف کیفیات اور مدارج میں امتیاز نہیں کر سکا، تو اسی حد تک اس کا کلام حسن اور اثر کے پہلو سے ناقص رہ جائے گا۔

میر کے کلام کی یہی امتیازی خصوصیت ہے: جذبہ ان کا ذاتی ہے، اور یہ مدتوں ان کے دل و دماغ میں پرورش پاتا رہا ہے، ان پر طاری رہا ہے۔ اس کے تدریجی تغیرات اور ارتقا کو وہ خوب جانتے ہیں اور اس کی مختلف کیفیات انھوں نے محسوس کی ہیں۔ اور سب پر مستزاد یہ کہ انھیں زبان پر اتنی قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنے محسوسات کو من و عن الفاظ کا قالب دے سکتے ہیں۔

پس کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ ان کا کلام ہمیشہ خواص و عوام کے حلقوں میں مقبول رہا ہے۔ تعجب تو جب ہوتا کہ نتیجہ اس کے برعکس ہوتا اور چونکہ اس کے مقابلے میں کسی اور غزل گو شاعر کا جذبہ ان کے برابر خالص اور ذاتی وارد نہیں تھا، اس لیے نہ ان کا کلام اتنا محلِ تعریف بن سکا، نہ وہ خود وہ مقام حاصل کر سکے، جو میر کے حصے میں آیا۔

میر کے چھ دیوان مطبوعہ موجود ہیں اور جتنے انتخاب ان کے شائع ہوئے ہیں، میرے علم میں اور کسی شاعر کے نہیں ہوئے۔ اس لیے میرے دعوے کے ثبوت میں مثالوں کی کمی نہیں اور یہ اہل نظر سے مخفی بھی نہیں۔

تاہم چند شعر ملاحظہ ہوں:

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں ۔۔۔ ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ۔۔۔ دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
لگا نہ دل کو کہیں، کیا سنا نہیں تو نے ۔۔۔ جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو ۔۔۔ ہے خیر میر صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا
دیکھا جو میں نے یار! تو وہ میر ہی نہیں ۔۔۔ تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا
ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا ۔۔۔ دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
آئے بن اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر ۔۔۔ کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائیگا

یہ تھا ہی ان دنوں دوستاں! اثرہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ ۔۔۔ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر! ۔۔۔ پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں، میر! باز آ ۔۔۔ نادان! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا! ۔۔۔ آن بیٹھے، جو تم نے یاد کیا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر! ۔۔۔ مذہبِ عشق اختیار کیا

کہو اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا   پھر اس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا

زاب مجھ کو کیا اضطراب یہ دل نے میرؔ   کہ ٹک بھی اس کنے اس بن رہا نہیں جاتا

ہن نگہ سے میش کچھ نقصاں نہ آیا اسکے تئیں   اور میں بیچارہ تو لے مہرباں! مارا گیا

پوچھا جو میں نے درد محبت ہے میرؔ کو   رکھ ہاتھ ان نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم   پر سخن تا بلب نہیں آتا

انتخاب کچھ طویل ہوگیا، حالانکہ یہ اشعار میں نے دیوان اول کی ردیف الف کی صرف شروع کی غزلوں سے سرسری طور پر لے لیے ہیں۔ اسی ردیف میں اور بھی بیسیوں اچھے شعر مل جائینگے لیکن پورا استقصاء نہ میرا مقصود ہے' نہ ضروری ــــ میرا مدعا ان اشعار سے بھی واضح ہو جائیگا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان اشعار میں کہیں بھی کسی ایسی کیفیت یا جذبے کا بیان نہیں' جو ہماری اس گوشت پوست کی دنیا میں پیش نہ آتا ہو۔ حسن و عشق کا لگاؤ' ان کے باہمی تعلقات' ہجر و وصال کے معاملات' یہ سب فطری حادثے ہیں ــــ اور بیشتر لوگ زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ان سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے نتائج ہر جگہ یکساں نہیں ہوتے۔ کہیں یہ کامرانی پر ختم ہوتے ہیں' کہیں ناکامی اور شکست و بربادی پر۔ ناکامی کی صورت میں بھی اس کے اثرات مختلف ہوں گے' اور یہ اس شخص کی افتاد اور طبیعت کے رجحان پر موقوف ہے کہ وہ اس کے بعد اپنی زندگی کیونکر بسر کرتا ہے۔

یہیں سے میرؔ اور دوسروں میں حد فاصل قائم ہوتی ہے۔ جیسا کہہ چکا ہوں' میرؔ کی شاعری میں جذبہ ان کا اپنا ہے۔ انھیں سنی سنائی باتوں پر انحصار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انھیں اپنی محبت میں ناکامی ہوئی۔ چونکہ فطرت میں خلوص اور اس محبت میں صداقت اور گہرائی تھی' اس افسوسناک حادثے نے دیوانگی کے آثار پیدا کر دیے۔ وہ تو خیر گزری کہ بالکل ہی دیوانے نہیں ہوگئے' ورنہ 'قدمے فاصلہ دارد' والی صورت تو پیدا ہو ہی چکی تھی۔ لیکن اب یہ زخم ناسور بن گیا' اور پھر عمر بھر کے لیے آزار رہا۔

اس واقعے نے ان کی طبیعت اور مزاج' ان کی شاعری اور فکر ــــ غرض ان کی زندگی کے ہر ایک پہلو پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا! اسی نے ان کی شاعری کو وہ لہجہ عطا کیا جو ان سے مخصوص ہو گیا ہے۔ میں نے غزل کے چار اجزائے ترکیبی گنوائے تھے۔ ممکن ہے آپ انھیں کسی اور کے کلام میں بھی دریافت کر لیں' لیکن میرؔ نے اپنے خیالات اور جذبات و احساسات کو جس زبان اور خاص کر جس لہجے میں بیان کیا ہے' وہ ان کا حصہ ہو کے رہ گیا ہے۔ دیکھیے یہ شعر:

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں' پہ کیا کروں   منھ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

اپنے ہی دل کا گنہ ہے' جو جلاتا ہے مجھے   کس کو لے مریے میلانؔ اور کسے تہمت دیجے

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے   عمر نے ہم سے بیوفائی کی!

جفا اس کی نہ پہنچی انتہا تک   دریغا! عمر کی بیوفائی!

بہت سعی کریے' تو مر رہیے میرؔ!   بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

کہتے ہیں ترے کوچے سے میرؔ آنے کو ہے   جب جلیے' وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے   اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے   تھا جی میں آہ کیا کیا' پر کچھ نہ کہنے پائے

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا   اور بھی وقت تھے بہانے کے

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری   نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

سہل ممتنع زبان' نرم اور دھیما لہجہ' سوز و درد کی ہلکی ہلکی تپش' شاعر کی مسکینی اور مظلومیت' انتہائی کامل افتادگی اور بیوزدگی کا جو احساس ان اشعار کے پڑھتے وقت قاری کے ذہن پر طاری ہوتا ہے' وہ اور کسی جگہ نہیں ملتا: مل بھی نہیں سکتا۔ جب تک کوئی شخص انھیں تجربات سے نہ گزرے' جو میرؔ کو پیش آئے اور نتائج کو اسی طرح محسوس نہ کرے جس طرح انھوں نے محسوس کیا؛ اس کی ذہنی اور انفعالی کیفیت بھی میرؔ کے مماثل ہو تاکہ یہ اثرات اس کی زندگی اور مزاج کا جز بن جائیں ــــ اور سب سے بڑھ کر جب تک قدرت نے اسے وہی زبان طرز بیانِ ودیعت نہ کی ہو' جو میرؔ کو ملی تھی' یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ یہ بہت مشکل شرائط ہیں۔ اب ان سب کا کسی ایک شخص یا شاعر میں جمع ہو جانا امر محال ہے۔ میرے نزدیک اسی میں میرؔ کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ اور اسی لیے اردو غزل کا معیار ہی میرؔ کی غزل بن گئی ہے۔ خود ہی فرماتے ہیں:

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے   معتقد کون نہیں میرؔ کی استادی کا



۲۶ جنوری

ساجد امیٹھوی

ساغر کا حسن، جلوۂ مینا لیے ہوئے — آنکھوں میں اپنی مستیٔ صہبا لیے ہوئے
آزادیوں کا کیف سراپا لیے ہوئے — آئی ہے درد دل کا مداوا لیے ہوئے
بھارت نواسیوں کو ہے پیغام سرخوشی
چھبیس جنوری اے چھبیس جنوری

منظر کی دل کشی سے فضا نوجوان ہے — تسکین روح گاندھی و آزاد کی جان ہے
نہرو کے یہ کمال سیاست کی شان ہے — ہندوستان اس لیے اب ہندوستان ہے
بن ٹھن کے سامنے جو نگاہوں کے آ گئی
جمہوریت کو ناز و ادا سے لبھا گئی

رنگینیوں کی گود میں حسن تمام ہے — آغوش مہر و ماہ میں ہر صبح و شام ہے
شیشہ بدست آج یہ بادہ بہ جام ہے — اس کی نگاہ مست کا میخانہ عام ہے
پھینکا ہے دور دل سے غم دل نکال کے
ٹکڑے اڑا کے رکھ دیے حزن و ملال کے

رعنائی جمال نظاروں کے ساتھ ہے — انداز گل فروش بہاروں کے ساتھ ہے
اعجاز دل فریب اشاروں کے ساتھ ہے — جو بھی ادا ہے چاند ستاروں کے ساتھ ہے
اس کی نظر سے دل کے جہاں تک نظر گئی
ظلمت کدوں میں چاندنی سی اک بکھر گئی

بھر کر گل مراد سے دامان زندگی — برسا رہا ہے پھول گلستان زندگی
گاتے ہیں جھوم جھوم کے مرغان زندگی — ساجد یہی ہے روح، یہی جان زندگی
انگڑائیوں میں اس کی ہے معراج قیصری
کتنی عزیز ہم کو ہے چھبیس جنوری



غزل

رضا امروہوی

جب سے ترے خیال میں مستور ہو گئے
کچھ اور بھی جہان میں مشہور ہو گئے

مرہم نصیب ہو نہ سکا التفات کا
جتنے تھے زخم دل کے وہ ناسور ہو گئے

پہنچا گیا ہے دار و رسن تک جنون شوق
ہم آج اپنے وقت کے منصور ہو گئے

اے بے خودیٔ شوق، وہ جتنے قریب تھے
اُتنے ہی اتفاق سے ہم دور ہو گئے

معراج خود سپردگیٔ شوق، دیکھیے
مسرور تم نے کر دیا مسرور ہو گئے

ساقی! تری نظر کی چھلکتی ہوئی شراب
تھوڑی سی ہم نے پی تھی کہ مخمور ہو گئے

جی تو نہ چاہتا تھا تمہیں جائیں چھوڑ کر
پر کیا کریں کہ وقت سے مجبور ہو گئے

تم مل گئے تو ہم کو ملی دولت حیات
ہم اپنے انتخاب پہ مغرور ہو گئے

حالات نے کچھ ایسا ستایا ہمیں رضا
ہم ان کی انجمن سے بہت دور ہو گئے

سونی سڑک

سیدہ نسیم چشتی

خالہ جان دراصل کس کی خالہ تھیں اور یہ رشتہ کہاں سے شروع ہوا یہ اب کسی کو بھی یاد نہیں لیکن وہ جگت خالہ ہیں۔ محلّے پڑوس کے لوگ، دور کے رشتے دار، بڑے چھوٹے، بوڑھے ادھیڑ، بھشتی... دھوبی... نائی... سب ہی انھیں خالہ جان کہتے ہیں۔ اور نہ جانے کتنے برسوں سے کہتے ہیں کیونکہ زندگی کے الجھے ہوئے پھیلاؤ میں جس طرح خالہ جان سے کسی کو اپنا صحیح رشتہ بھی اب یاد نہیں رہا اسی طرح اب ان کی صحیح عمر بتلانے والا بھی کوئی باقی نہیں رہا... خود خالہ جان بھی اس بات کا صحیح جواب نہیں دے سکتیں۔ یا ہوسکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتی ہوں اور انھوں نے واقعی اس مسئلے پر کبھی غور ہی نہ کیا ہو۔ اپنی عمر کے متعلق سوالات سن کر کبھی کبھی وہ بڑے دردناک طنز سے مسکراتی ہیں۔ زندگی کے سارے تلخ مصائب کا بوجھل غم ان کے چہرے پر کانپنے لگتا ہے... اور وہ کہتی ہیں کہ اس سوال کو سن کر اب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجاتا ہے جب وہ چھوٹی سی تھیں۔ اور ان کی ماں انھیں بنا سنوار کر، ان کی آنکھوں میں موٹا موٹا کاجل لگا کر، ان کے بالوں کی سنڈھیاں گوندھ کر ان کا چہرہ دیکھتی تھیں اور بے ساختہ بلائیں لے کر دعائیں دیتی تھیں:

"اللہ میری بچی کو سلامت رکھے، در نصیبے در رہے۔"

خالہ جان کی غموں کے بوجھ سے جھکی ہوئی کمر... خزاں جھلسی ہوئی ...ں جیسے ہاتھ پیر... رخساروں کے ...ان گڑھے... آنکھوں کی ...ری... اور ان کے چہرے پر کروٹیں لیتی ہوئی ہزارہا جھریوں کو دیکھ کر یقین بھی نہیں آسکتا کہ خالہ جان کبھی جوان یا تر و تازہ رہی ہوں گی لیکن ایک زمانہ تھا جب خالہ جان جوان تھیں — کھلے ہوئے پھول کی طرح ہنس مکھ تھیں، شوخ تھیں اور بے حد جاذب نظر تھیں۔ لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔ اتنی پرانی کہ خالہ جان ہر وقت ماضی کے کنویں میں سر لٹکائے جھانکتی رہتی ہیں تب بھی ان کی نظریں اس حد تک گہرائی میں نہیں پہنچتیں۔ سفر کی وہ چند ابتدائی منزلیں گرد راہ میں چھپ کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو چکی ہیں — اور خالہ جان کتنا ہی پیچھے مڑ کر دیکھیں انھیں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

خالہ جان کی کہانی جو کچھ بھی ہم نے سنی وہ انھیں کی زبانی۔ اور ان کی یادوں کا سلسلہ ہی شروع ہوتا ہے اس زمانے سے جب ان کی شادی ہونے والی تھی۔ اس وقت وہ بارہ سال کی تھیں۔ اس سے پہلے کی زندگی کے متعلق وہ صرف اتنا ہی بتا پاتی ہیں کہ ان کے والد کچہری میں محرّر تھے۔ اور وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ اس زمانے کی قدامت پرستی کا خیال کرتے ہوئے خالہ جان کو بڑی توجہ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی گئی۔ یعنی وہ اکائی کے جوڑ لگانا جانتی تھیں بیس تک گنتی ان کو زبانی یاد تھی۔ دو کا پہاڑا رٹا ہوا تھا۔ کلام پاک دس سال کی عمر میں ختم ہو چکا تھا۔ باوجود سارے خاندان کی شدید مخالفت کے ان کو لکھنا بھی سکھایا گیا تھا۔ اور اردو کی تیسری کتاب وہ اٹک اٹک کر پڑھ رہی تھیں کہ ان کے نانا جان کو اس قدر حد سے زیادہ تعلیم کا اتنا غم تھا کہ وہ اس سلسلے کو منقطع کرنے کی

وصیت کر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی سال ان کی شادی کر دی گئی۔

خالہ جان کا بیان ہے کہ شادی کے بعد وہ میکے کے پورے پھیرے بھی نہ کر پائی تھیں کہ بڑے زور کا طاعون پھیلا۔ محلے کے محلے تباہ ہونے لگے۔ اور یہ تباہی ایک ہفتے کے اندر اندر ان کی ماں اور باپ دونوں کو لپیٹ لے گئی۔ اور ابھی ماں باپ کے غم کے آنسو خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ شوہر۔ جس سے ابھی انھوں نے آنکھیں چار کر کے بات بھی نہ کی تھی، اللہ کو پیارا ہوا۔ اور پھر گویا ان زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے قدرت نے انھیں ماں بھی بنا دیا۔

اس لمبی چوڑی دنیا میں خالہ جان ۱۴ سال کی عمر میں اس طرح تن تنہا رہ گئیں۔ میکہ اجڑ چکا تھا۔ ساس نیم پاگل تھیں۔ انھوں نے بہو کو سبز قدم اور منحوس کہہ کر گھر سے نکال دیا۔ ہاں مرے ہوئے بیٹے کے نام کی عزت کا اتنا خیال ضرور کیا کہ دو کوٹھریوں کا ایک چھوٹا سا مکان انھیں زندگی کے دن کاٹنے کو دے دیا۔

ساس کے احسان سے خالہ جان کو سر چھپانے کو جگہ تو ضرور مل گئی۔ لیکن دونوں وقت کا کھانا پہننا اوڑھنا۔ چھوٹے سے بچے کا خرچ۔ دو اصلاً زندگی کی ہزاروں ضرورتیں۔ اور خالہ جان بے یار و مددگار۔ خالہ جان کا میدہ شہابی رنگ زرد سے زرد تر ہوتے لگا۔ ... آنکھوں میں کم سنی کی شوخ مسکراہٹ کی جگہ فکر اور غم چھانے لگا۔ زیور کہاں تک پیٹ کی آگ بھرتے۔ چند دنوں میں وہ بھی ختم ہو گئے۔ ساس کے پاس پے در پے عرضیاں بھیجیں۔ تو وہ لوٹ بھی واپس آ گئیں۔ زبانی پیغام بھیجے۔ سخت سے سخت تر جواب آیا۔ محلے کے اوباش نوجوانوں نے ان کی مصیبت بھانپ لی اور ان کی کوٹھری کی کھڑکی کے پاس سے گزرنا ... اور پھر گنگناتے ہوئے گزرنا شروع کیا۔ جو زیادہ شریف تھے انھوں نے مشاطہ کے ذریعہ باقاعدہ نکاح کے پیغام بھیجے۔

لیکن ان پیغامات نے خالہ جان کے زخمی دل پر وہی کام کیا۔ جو بھڑکتی ہوئی آگ پر تیل کرتا۔ اپنی پھٹی ہوئی سلیپر ہاتھ میں لے کر انھوں نے ان مشاطاؤں کو گلی میں نکال کر دم لیا۔ اس ذلت نے ان کی خودداری اور غرور کو زندہ کر دیا۔ اور بے بسی کی تڑپ نے ان کے اندر ایک نئی طاقت پیدا کر دی۔ انھوں نے بہادری کے ساتھ اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور دنیا سے جنگ کرنے کی ٹھان لی۔ سر پر اپنا بوسیدہ برقعہ ڈال کر وہ زندگی میں پہلی بار سڑک پر نکل کھڑی ہوئیں۔ ڈولی کہار کے پیسے نہ تھے اور نہ اب اس طرح اپنے کو سات پردوں میں رکھ کر اطمینان ... پوری ہوتی دکھائی دی۔ لوگوں کے کہنے سننے کا خیال کر کے اب اور فاقے اور دکھ اٹھانا ان کے بس سے باہر تھا اور یوں بھی لوگوں نے کہنے سننے کو اٹھا کیا رکھا تھا۔ خالہ جان نے محلے کے ایک مڈل اسکول کی بڑی استانی کی نیک ... ترسی کا ذکر سن رکھا تھا۔ پتہ پوچھ پوچھ کر وہاں جا پہنچیں۔ بڑی استانی واقعی خدا ترس تھیں۔ خالہ جان کو فوراً چھوٹی بچیوں کو کلام پاک پڑھانے پر نوکر رکھ لیا۔ اور ان کو ۲۷ روپے ماہوار ملنے لگے۔

نوکری ملنے پر خالہ جان نے شکرانے کی نماز پڑھی، مولا مشکل کشا کی نذر دلوائی۔ اور سمجھیں کہ اب ان کی بقیہ زندگی بڑے سکون کے ساتھ گزر جائے گی جبکہ وہ ننھے حمید کو بے فکری کے ساتھ پال پوس کر بڑا کرنے کے سہانے خواب دیکھنا اور طرح طرح کی سنہری آرزوئیں اس سے وابستہ کرنے لگیں۔ انھوں نے کہیں سن رکھا تھا کہ ہر مصیبت کے بعد خوشی کے دنوں کا آنا لازمی ہے۔ اس لیے ان کا ایمان تھا کہ حمید کے بڑے ہونے پر ان کو اپنی ساری مصیبتیں اور سارے دکھ بھول جائیں گے۔

لیکن ننھا حمید جیسے جیسے بڑھتا گیا۔ خالہ جان کے خوابوں کے قلعے کو بڑی تیزی سے مسمار کرتا گیا۔ پڑھنے لکھنے سے اس کو سخت نفرت تھی۔ کتابوں کا وہ دشمن تھا۔ صاف رہنے سے اس کو بیر تھا۔ وہ گھنٹوں اپنا لمبوترا چہرہ جو سادے کاغذ کی طرح کورا ہوتا، اپنے ذیلے گھٹنے پر ٹکائے بیٹھا رہتا کھیل کود میں بھی اس کو دلچسپی نہ تھی۔ محلے کے غریب لڑکوں کے ساتھ کھیلنا یا پتنگ اڑانا وہ اپنی توہین سمجھتا تھا۔ ہاں اگر اس کو شوق تھا تو کھانے کا طرح طرح کے لذیذ مرغن اور قیمتی کھانوں کا ــــ اور کھانے کے بعد اس کو دلچسپی تھی تو گانے بجانے سے کہیں سے بھی گانے کی آواز آتی اور وہ ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ اور پھر بہت دیر تک گم سم میٹھا خلاؤں میں گھورا کرتا۔ اس کی آنکھوں کا تاثر ــــ عجیب مفلوج سا تاثر دیکھ کر خالہ جان کو اپنی نیم پاگل ساس کی آنکھوں کا انداز یاد آ جاتا ــــ وہ کانپ کر سجدے میں گر جاتیں اور رات ڈھلے تک اللہ سے گڑگڑا گڑگڑا کر حمید کے لیے زندگی اور اقبال کی بھیک مانگا کرتیں۔

جیسے جیسے حمید میاں بڑے ہوتے گئے، خالہ جان کے دل میں آرزوؤں کی تربتیں بنتی گئیں۔ ایک پڑھے لکھے ہونہار بیٹے کی جگہ ایک بے ڈول بے ہنگم بے کار نیم احمق لڑکا بجھو کی طرح بیٹھا آنکھیں چپکایا کرتا۔ بات بات پر ضد کرتا غصہ کرتا۔ وہ ہر احساس سے عاری تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود خالہ جان

کی اس سے محبت عشق میں بدلتی چلی گئی۔ ساس کے مرنے کے بعد تھوڑا سا اثاثہ ملا تھا۔ وہ حمید میاں کو بالائی پراٹھے کھلا کھلا کر انھوں نے ختم کر دیا اور جو تھوڑا بہت پیسہ خالہ جان نے وقت بے وقت کے لیے بچا رکھا تھا اسے بھی حمید میاں نے چپ چپ نکال لیا اور ایک ہارمونیم خرید لائے!

خالہ جان اب دن رات گھر پر رہتی تھیں۔ ان کی ملازمت ختم ہو گئی تھی کیوں کہ اب زمانہ بدل گیا تھا اور ان سے زیادہ پڑھی لکھی عورتیں اسکول میں آ گئی تھیں۔ کوئی چوتھی جماعت پاس تھی کوئی چھٹی اور کوئی اس سے بھی زیادہ۔ خالہ جان کا اب اسکول میں باقی رہنا مشکل تھا۔ بڑی استانی کسی نہ کسی طرح ان کو اٹکائے ہوئے تھیں۔ لیکن بقول خالہ جان کے ـــــ جس نے ان کا ہاتھ تھاما ہو سے اس کا دامن پکڑا۔ استانی بھی ختم ہو گئیں اور خالہ جان کی نوکری بھی۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ ساس بڑے موقع سے مریں اور خالہ جان کو بڑا مکان بھی مل گیا جس کا ۲۲ روپیہ ماہوار کرایہ ان کو ملنے لگا۔ ورنہ نہ جانے خالہ جان کا کیا حشر ہوتا۔

حمید میاں کی عمر اب پچیس ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کا سارا وقت گانے بجانے میں صرف ہوتا۔ آواز اچھی تھی۔ ریاضت سے اور بھی اچھی ہو گئی خالہ جان کے گھر سے اب نغمے ابلا کرتے تھے۔ ٹھمری۔ دادرے۔ خیال غزلیں.. ایک کوٹھری میں اب حمید میاں کے دوست جمع رہتے۔ اور ہارمونیم کا شور اور طبلے کی تھاپ سُن سُن کر خالہ جان کا دل کانپ جاتا۔ لیکن اف کرنے کی مجال نہ تھی۔ قرض ادھار کر کرکے حمید میاں کو چار انگل اونچے گھی کے تو ر اور پراٹھے کھلاتی رہیں۔ کمزور آنکھوں پر جبر کرکے سلائی کرتیں۔ کچھ پیسے اس سے مل جاتے لیکن راتوں کو یہ سوچ سوچ کر نیند نہ آتی کہ کل حمید میاں کو ناشتہ کس طرح دیں گی۔ حمید میاں کے لیے نئے کپڑے کس صورت سے بنائیں گی۔ انھیں فکروں نے انھیں بیمار کر دیا۔

بیماری یوں بھی مصیبت ہوتی ہے۔ پھر مفلسی میں تو بیماری سے موت بھی۔ لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ خالہ جان کے ایک دور کے عزیز حکیم تھے۔ وہ ضعیفی کے سبب مستقل طور سے وطن واپس آ گئے تھے۔ خالہ جان ان کے پاس علاج کے لیے گئیں۔ انھوں نے سب حال احوال پوچھا۔ اور رائے دی کہ حمید میاں کا اس طرح بے فکر اور بے پروا رہنا ٹھیک نہیں۔ ان کو ذمے داری کا بوجھ اٹھانا چاہیے۔ اگر وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں تو موسیقی کی تعلیم دے کر کچھ کما سکتے ہیں۔ قدرت نے انھیں ہنر دیا ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ اس رائے پر خالہ جان پہلے تو گھبرا کر بہت روئیں۔ پھر ان عزیز کی کئی پشتوں کو بآواز بلند کوسا کاٹا۔ کچھ دنوں تک خالہ جان کے ذہن میں یہ مسئلہ چکر لگاتا رہا۔ اور جیسے جیسے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوتا گیا اس رائے پر عمل کرنے کا خیال ان کو کم سے کم ناگوار ہوتا گیا۔ اور آخر حمید میاں کو حکیم صاحب کے لڑکوں کی مدد سے کئی ٹیوشن مل گئے۔ حمید میاں نے ٹیوشن میں کیا کمایا اس کا علم خالہ جان کو کبھی نہ ہوا کیوں کہ کبھی ان کے ہاتھ تک ایک پیسہ بھی نہ پہنچا۔ بلکہ خالہ جان کو ڈر تھا کہ خود حمید میاں کو بھی کبھی ایک پیسہ نہ ملا ہوگا۔ کیوں کہ حمید میاں نے کبھی پورے ایک ماہ کہیں کام نہ کیا۔ کسی نہ کسی بات پر تنک کر دو ہفتے دو ہفتے بعد بیکار ہو کر بیٹھ جاتے۔ ٹیوشن ملنے اور چھوٹنے کا یہ سلسلہ عرصے تک جاری رہنے کے بعد نتیجے میں حمید میاں پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نظر آنے لگے۔ لیکن حکیم کے لڑکوں نے جیسے حمید میاں کی زندگی کو خوشی کے راستے پر لگانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ انھوں نے اب حمید میاں کی شادی کی فکر شروع کی اور ان کی غربت کے عذر کو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ غریب امیر سب کی شادی ہوتی ہے اور وہ نیک بخت اپنی تقدیر کا کھائے گی در اصل خالہ جان کے دل میں بہو لانے کا جو ارمان تھا اس کو دیکھ کر حکیم صاحب کے لڑکوں کے دل میں رحم اور ہمدردی کا زبردست جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور ایک پیش کار صاحب کی لڑکی سے ان کا رشتہ طے کرنے کی کوشش شروع ہو گئی۔

جس روز پیش کار صاحب حمید میاں کو دیکھنے کے لیے آنے والے تھے حمید میاں کی تیاریوں کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ ان کے لیے بوسکی کی نئی قمیض سلی تھی اور چکنے لٹھے کا پاجامہ۔ سفید کریپ کے نئے جوتے آئے تھے۔ حجام بلوا کر ان کے بے ترتیب بالوں کو سلیقے سے کتروا دیا گیا تھا۔ حمید میاں اگر اس تیاری کی اہمیت کو سمجھ لیتے تو حالات کا رخ شاید اور ہی کچھ ہوتا لیکن وہ تو تقدیر کے پیچھے لاٹھی لیے گھوما کرتے تھے۔ نہ معلوم کیا ہوا کہ عین وقت پر ان کی غیرت بے تحاشا جاگ پڑی۔ اور انھوں نے "خیرات" کے کپڑے پہننے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن اگر یہ انکار صرف انکار ہی رہتا تو بھی غنیمت تھا۔ انھوں نے کہا کہ پیش کار صاحب کو ان کا صحیح حلیہ دیکھنا چاہیے۔ اور گویا اس کا نقشہ کھینچنے کے خیال سے وہ ہارمونیم اور طبلہ لے کر بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ پیش کار صاحب

آئے۔ مگر وہ الاپتے رہے۔ پیش کار صاحب نے مٹھائی کھائی۔ چائے پی۔ حکیم صاحب کے لڑکوں نے اس بے وقت کی شہنائی کو آرٹ سے مفتونیت کی حد تک عشق کا نام دے کر بات نبھانا چاہی۔ لیکن حمید میاں نے گانا بند کرنے میں اپنی ہتک سمجھی اور اسی طرح گردن دائیں بائیں۔ آنکھیں اوپر نیچے کرکے گاتے رہے۔ ہاں مہمان کے رخصت ہونے کے وقت ہارمونیم کی دھونکنی چھوڑ کر اور "سیاں نہ جا" کا لہرا گاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ہاتھ سر تک ضرور لے گئے۔ اور بس۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حمید میاں کو عورتوں سے دلچسپی نہ تھی۔ یا وہ شادی کے خواہاں نہ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس بات کے ثبوت میں بہت کم واقعات سننے میں آئے۔ لیکن آئے ضرور۔ اس سلسلے میں سب سے مشہور جو حادثہ ہوا وہ یہ تھا کہ ایک بار حکیم صاحب کے گھر ان کی ہمشیرہ اپنی چار جوان جہان لڑکیوں کو ساتھ لے کر آئیں۔ حمید میاں سے چوں کہ حکیم صاحب کے گھر کسی کا پردہ نہ تھا اس لیے ان کی بہن اور لڑکیاں بھی بے دھڑک سامنے آگئیں۔ اور اتنی بے تکلف بھی ہوگئیں کہ حمید میاں نے ان کے سامنے کئی بار اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔ ایک روز صبح صبح سب کی فرمائش پر حمید میاں بحر پر ہارمونیم لاد کر وہاں پہنچے تو لڑکیاں صحن کے ایک کونے میں کھرپے سے زمین کھود کر دھنیے اور مرچ کے بیج بو رہی تھیں۔ حمید میاں برآمدے میں ہارمونیم رکھ کر کیاری کے پاس پہنچے اور مکھن اور شہد جیسے لہجے میں پوچھا: "کیا بویا جا رہا ہے۔" ان میں سے ایک لڑکی نے کہا "مرچ کے بیج ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ حمید میاں نے یہ سن کر ایک ہلکی سی آہ بھری اور بولے: بھلا مرچ کیا بوتی ہو۔ بونا ہے تو محبت کے بیج بوؤ۔"

معلوم نہیں 'محبت کے بیج' سے حمید میاں کا کیا مطلب تھا۔ لیکن لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اور بہت دیر تک ان کا یہ جملہ دہرا دہرا کر تخت پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی رہیں۔ حمید میاں کے چھدرے سیاہ دانت، ان کی مونق صورت، ان پر ان شاعرانہ الفاظ نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ مگر حمید میاں کو یہ ہنسی اتنی ناگوار ہوئی کہ اسی وقت مع ہارمونیم کے واپس چلے آئے اور عرصے تک خفا رہے۔ ہوتے ہوتے یہ قصہ خالہ جان کے کانوں تک بھی جا پہنچا اور ایک بار پھر انھوں نے دونوں وقت ملتے آنچل پھیلا پھیلا کر حکیم صاحب کے خاندان کو جی بھر کے کوسا۔ یوں بھی خالہ جان کا بیشتر وقت کسی نہ کسی کو کوسنے ہی میں صرف ہوتا تھا۔ کبھی کوئی ظالم ان کے مکان کی دیوار کا سہارا لے کر چھپر ڈلوا دیتا۔ اور کبھی کوئی ستم ظریف اپنی اولتی کا رخ تاک کر ایسا رکھتا کہ اس کا سارا پانی خالہ جان کی دیوار کو کمزور کرنے کے کام آئے۔ پھر خالہ جان سر پر برقعہ ڈال کر ایک ایک عزیز کے گھر جاتیں اور ایسی تفصیل سے یہ قصہ سناتیں کہ سننے والے کی سمجھ میں اصل واقعہ ہی نہ آتا۔ انھیں غموں اور فکروں نے خالہ جان کو قبل از وقت بوڑھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا گندمی چہرہ فکر کی آڑی ترچھی لکیروں کے جال میں چھپتا جا رہا تھا۔ حمید میاں بہ ظاہر اپنی گوشہ نشینی اور تنہائی سے مطمئن تھے۔ لیکن خالہ جان کو ان کی شادی کا ارمان اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ جسم پر ہزاروں پیوند کے کپڑے پہنے اور چھلنی کی طرح سوراخ دار برقعہ سر پر ڈالے وہ لڑکی کی تلاش میں ایسی سرگرمی سے چکر لگاتی رہیں کہ آخر ایک لاوارث بیوہ کی لڑکی کے ساتھ نکاح طے کر ہی لیا۔ اس مبارک دن کے آنے کا یقین ہوتے ہی خالہ جان خوشی سے دیوانی گرتی پڑتی ہاتھ میں بالوشاہی کا دونا لیے گھر بھاگی آئیں اور حمید میاں کو یہ مژدہ سنایا۔ معلوم نہیں کہ اس خبر نے حمید میاں پر کیا اثر کیا لیکن دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کے بعد وہ کئی دن تک اکثر بے سبب اور بے وقت مسکراتے ہوئے دیکھے گئے۔

حمید میاں کی بارات دو یکوں پر مشتمل تھی۔ ایک پر وہ خود پگڑی سہرے اور زرد جامے میں ملبوس بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ان کے دو طبلچی دوست تھے۔ دوسرے پر خالہ جان ایک سینی میں لال ٹول کا جوڑا، دو ہار اور تھوڑا سا مصری چھوہارا لیے بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک میراثن بھی ڈھول لے کر بیٹھ گئی تھی اور اس نے پیسے نہ مانگنے کا وعدہ کیا تھا۔ دلہن کے گھر محلے کے دو بزرگ کندھوں پر انگوچھا ڈالے ایک مولوی صاحب کے ساتھ بارات کے منتظر تھے۔ اکادن روپیہ رائج الوقت مہر پر نکاح ہوا اور خالہ جان اپنے لائے ہوئے سرخ ٹول کے جوڑے میں سسکیاں لیتی ہوئی دلہن کو کلیجے سے لگائے یکے پر جا بیٹھیں۔ انھوں نے اب تک دلہن کو دیکھا نہ تھا مگر محبت تھی کہ امنڈی چلی آتی تھی۔ گھونگھٹ میں بار بار ہاتھ ڈال کر دلہن کی نتھ کا ڈورا برابر کرتی رہیں۔ دلہن کا ٹین کا پھول دار بکس، جہیز کا لوٹا کٹورا، دری تکیہ اور قرآن شریف بھی ساتھ ہی تھا۔ اس روز خالہ جان نے گھر کو خوب آراستہ کر رکھا تھا۔ برآمدے کو لیپ پوت کر ایک دری بچھائی تھی۔ محلے

نے بچوں سے کاغذ کے پھول منگوا کر طاقوں میں سجا دیے تھے۔ دلہن کا منہ میٹھا کرنے کے لیے فیرینی اور مٹھائی چاندی کے ورق سے ڈھکی رکھی تھی۔ ایک پرانے ڈوپٹے کو سرخ رنگ کر حمید میاں کی کوٹھری پر پردہ ڈال دیا تھا۔ چوکی پر صراحی میں تازہ پانی بھر رکھا تھا۔ خالہ جان نے صراحی پر ایک ہار تازہ رہنے کے خیال سے ڈال دیا تھا تاکہ صبح دلہن کی چوٹی پر لپیٹ دیں۔ حمید میاں کا شدید اصرار تھا کہ ان کی شادی کی اطلاع کسی کو نہ ہو لیکن شادی کہاں چھپ سکتی ہے۔ وہ بھی حمید میاں کی! خالہ جان کے انتظامات نے سب کے کان کھڑے کر دیے۔ حمید میاں محلے میں ویسے ہی عجوبہ اور تماشہ تھے۔ محلے کے لڑکوں نے اس خوشی میں پٹاخے خریدے اور بارات کی واپسی کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی حمید میاں کا یکہ رکا سب نے ایک ساتھ پٹاخے، گولے، چھچھوندریں اور انار چھوڑنے شروع کیے۔ خالہ جان خلوص کے اس اظہار پر بے حد مسرور اور شاد ہو گئیں اور دلہن کو اتار کر سہارا دیتی اندر لیے چلی گئیں۔ حمید میاں کا یکہ پیچھے رکا ہی تھا کہ ایک گولا گھوڑے کے عین منہ کے سامنے آ کر پھٹا۔ گھوڑا تڑپ کر پچھلے دو پیروں پر کھڑا ہو گیا اور اس کے بعد مع یکے کے کروٹ زمین پر گر گیا۔ حمید میاں اپنی دہلیز کے پتھر سے ٹکرائے اور پھر وہاں سے ٹپہ کھا کر پختہ نالی میں جا گرے۔

خالہ جان نے جو شور و غوغا سنا تو ان کا دل مارے خوشی کے حلق میں جا اٹکا۔ سمجھیں محلے والے ان کی خوشی میں شریک ہیں۔ برسوں سے کوڑی کوڑی جوڑ کر سونے کا ایک ٹیکہ خریدا تھا۔ دلہن کو رونمائی میں وہ ٹیکہ دینے کے لیے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلو کی گرہ کھولتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگیں۔ پھر کچھ خیال آیا۔ آدھے صحن سے پلٹ پڑیں۔ مٹھائی کی رکابی ہاتھ میں لے کر پھر دروازے کی طرف مڑیں۔ اور اب جو مڑیں تو محلے کے کچھ لوگ حمید میاں کی لاش ہاتھوں پر اٹھائے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اور ایک خلقت دروازے پر جمع تھی۔

خالہ جان آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی آنکھوں کی روشنی قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ کمر جھک کر دوہری ہو گئی ہے۔ وہ لاٹھی ٹیک ٹیک کر چلتی ہیں۔ لیکن ان کے سوکھے ہوئے ہاتھ لاٹھی پر بھی بڑی مشکل سے ٹکتے ہیں۔ ان کی لمبی ٹھوڑی بات کرتے وقت لپک لپک کر ان کی ناک کو چھوتی رہتی ہے۔ حمید میاں آج بھی ان کی گفتگو کا واحد موضوع اور ان کی فکر کا مرکز ہیں۔ ایک وقت کا کھانا بھی وہ بغیر حمید میاں کا فاتحہ دیے نہیں کھا سکتیں۔ گرمی جاڑے کپڑے ان کے نام پر خیرات کرتی رہتی ہیں۔ اکثر راتوں کو وہ خواب میں حمید میاں کو دیکھتی ہیں جیسے وہ تھکے ہوئے گھر واپس آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں "اماں بی۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے" خالہ جان اس وقت اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور جو کچھ ممکن ہوتا ہے ایسی پھرتی سے پکانا شروع کر دیتی ہیں جیسے سچ مچ حمید میاں آ کر کھانا کھانے والے ہوں۔ خالہ جان کو اس بات کی دن رات فکر ہے کہ وہ اب تک حمید میاں کی قبر پکی نہیں کروا سکیں۔ جس سے بھی وہ مدد کی امید کرتی ہیں وہی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مدد کے لیے ایک ایک عزیز کے گھر لاٹھی ٹیکتی جاتی ہیں۔ ایک ایک کے آگے مدد کے لیے اپنا رعشہ زدہ سوکھا ہوا ہاتھ پھیلاتی ہیں۔ اور پھر ایک جگہ سے خالی ہاتھوں واپس لوٹ کر کسی دوسرے کے گھر جا پہنچتی ہیں۔ زندگی کی سونی سڑک پر خالہ جان ہلتی کانپتی گرتی پڑتی ٹھوکریں کھاتی آج بھی اسی طرح لاٹھی ٹیکتی چلی جا رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ کہیں ان کی منزل بنی ہی تو نہیں؟ کہیں خالہ جان ابد تک اسی طرح چلتی نہ رہ جائیں؟



غزل

تسکین قریشی

کوئی نہ پھر مے خانے میں آیا، اور نہ دورِ جام ہوا
توبہ تو مے سے میں نے کی تھی، ساقی کیوں بدنام ہوا

ہے ستم وفا دشمن پہ نگاہِ لطف، خدا ہی خیر کرے
ہونے کو ہے اب حادثہ کوئی، صبح ہوا یا شام ہوا

ترک و طلب ہیں سب لاحاصل، جب تک دل کا خون نہ ہو
یعنی اسی کا عشق ہے کامل، عشق میں جو ناکام ہوا

آپ سا نیک مزاج ستم گر، کون ہے آج زمانے میں
جب بھی کی ہے جور سے توبہ اور بھی قتلِ عام ہوا

صحبتِ رنداں بھی نہ ہوئی تھی، اتنی باعثِ رسوائی
جتنا اہلِ دیر و حرم میں، بیٹھ کے میں بدنام ہوا

ہر انساں کے دل میں ہے پنہاں، جنّت ہو کہ جہنم ہو
واعظِ ظاہر بیں کیا جانے، کس کا کیا انجام ہوا

پھولوں پھولوں، کلیوں کلیوں، کیسی کیسی دھوم ہوئی
اہلِ قفس جب چھوٹ کے آئے، ایک ہجومِ عام ہوا

دل کی بدولت کیا کیا بیتی، مجھ پر تسکیں، آہ! نہ پوچھ
عشق کیا، بدنام ہوا، برباد ہوا، ناکام ہوا

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۶۷ء

ماگھ ۱۸۸۸ شک

سرؔوش طباطبائی

حبیب احمد صدیقی

سرؔوش صاحب کو اپنی ملازمت کے فرائضِ منصبی کی بجا آوری کے سلسلے میں اکثر کلکتے جانا پڑتا تھا۔ ایک بار ان کا قیام عرصے تک وہاں رہا تو میں نے انھیں لکھا کہ کیا غالبؔ کی طرح آپ نے بھی کلکتے کے "بتانِ خود آرا" کی صبر آزما نگاہوں اور طاقت ربا اشاروں کے آگے سپر ڈال کر کوئی حویلی کرایہ پر لے لی ہے اور کیا بنگال کے جادو نے ایسا مسخر کرلیا ہے کہ سال دو سال مراجعت کی توقع نہ کی جائے۔

اس کا جواب انھوں نے اپنے ۲۰ رمئی سنہ ۱۹۶۲ء کے خط میں دیا۔

"عنایت نامہ مورخہ ۱۶ رمئی شرفِ صدور لایا۔ اگر کلکتے کے بتانِ خود آرا' ہی کی بات چھڑے گی تو پھر مجھے اقبال کے اس شعر کو۔

بعشوہ ہائے جوانانِ ماہ سیما چیست   بیا بہ حلقۂ پیرے کہ دلبری داند

(جس کی ترمیم شدہ شکل گزشتہ خط میں نقل کی تھی) اس طرح بدلنا پڑے گا کہ اس پر ایک تازہ شعر ہی کا قیاس ہونے لگے۔

رہا ز حلقۂ نازِ بتانِ خود آرا   اسیرِ دامِ حبیبم کہ دلبری داند

اگرچہ یوں مصرعِ اولیٰ میں بتانِ خود آرا کی اسیری پہ تبین کا اعتراف پایا جائے گا لیکن پھر کیا کیا جائے۔ جس طرح آپ خوش ہوں۔ آخر آپ کی بات بھی تو رہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ کم از کم میرے اس ننگ کو گوارا کر لینے کے بعد تو مصرعِ ثانی سندِ قبول حاصل کرلے!"

اس کے بعد جب کبھی وہ کلکتے جاتے تو میں غالبؔ کے مشہور قطعہ کا ایک آدھ مصرع لکھ دیتا یا صرف اس کی طرف اشارہ کر دیتا اور کبھی کبھی وہ از خود لکھتے کہ بنگال کے جادو سے زیادہ کشش الہ آباد کے لوگوں میں پا رہا ہوں، اس لیے جلد الہ آباد پہنچوں گا۔ انھوں نے کلکتہ کی تعریف میں ایک بارہ تیرہ شعر کی نظم بھی کہی تھی جس کے پانچ چھ شعر لکھتا ہوں:

عجیب شہرِ نگاراں ہے شہرِ کلکتہ   بہشتِ دیدۂ حیراں ہے شہرِ کلکتہ
دل و نظر کا گلستاں ہے شہرِ کلکتہ   بہارِ خلد بہ داماں ہے شہرِ کلکتہ
سیاہ چشم بتانِ رمیدہ خو کی قسم   نشاط گاہِ غزالاں ہے شہرِ کلکتہ
اس اوجِ خاص پہ ہے سحرِ حسنِ بنگالہ   کہ مصر و شام پہ خنداں ہے شہرِ کلکتہ
تجلیوں سے ہر اک شب کو گوہرِ شب تاب   سحر کو لعلِ بدخشاں ہے شہرِ کلکتہ
سیہ شبی میں نہ کیوں بحر زیر ہو سرؔوش   دیارِ انجمؔ[1] تاباں ہے شہرِ کلکتہ

انتقال سے کچھ دن پہلے وہ کلکتہ ہی میں تھے میں نے انھیں لکھا کہ سیدھے لکھنؤ واپس جانے کے بجائے الہ آباد ہوتے ہوئے جائیں۔ انھوں نے معذرت کے ساتھ وعدہ کیا کہ عشرۂ محرم لکھنؤ میں گزار کر وہ الہ آباد آنے کا پروگرام بنائیں گے۔ عشرۂ محرم ختم ہوتے ہی ۱۰ر اور ۱۱ر محرم کی درمیانی شب میں وہ ایک دوسرے سفر پر چل دیے اور یہ سفر کلکتے کے سفر کی طرح نہیں جہاں سے واپسی پر الہ آباد آنے کی فرمائش کی جائے۔ آہ کیسی اچانک موت

---

[1] پروفیسر انجم جن سے جناب سرؔوش کے خصوصی تعلقات تھے۔

ہوئی۔ یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ یوں دفعتاً داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ ان کی ناگہانی موت ان کے احباب کے لیے ایک ایسا سانحہ ہے جو کبھی نہ بھلایا جا سکے گا۔

ان کے صاحبزادے کی زبانی معلوم ہوا کہ آخر وقت تک ہوش و حواس ٹھیک تھے اور اس کا بھی احساس تھا کہ جانبر نہ ہوں گے! ان آخری لمحات کو انھوں نے سعادت مدحِ اہل بیت کے لیے وقف کر دیا اور حضرت زینبؓ کی شان میں مندرجہ ذیل اشعار کہے۔

دھوم عالم میں تری رفعتِ کردار کی ہے — گونج دنیا میں تری جرأتِ اظہار کی ہے
کیوں نہ ہو پارۂ دلِ احمدِ مختار کی ہے — بیٹی حیدر کی ہو جعفر طیار کی ہے
سیدہ ماں ہے تو حسنین سے ماں جائے ہیں
اے خوشا! عون و محمد سے پسر پائے ہیں

غلطی ہے جو کوئی حور کے ہمسر جانے — حضرت مریم: حوا سے نہ بہتر جانے
تیرا رتبہ کوئی جانے بھی تو کیونکر جانے — منزلت تیری علی جانے پیمبر جانے
اللہ اللہ نہ فقط جاں کے برابر سمجھے
خاص آلِ عبا ماں کے برابر سمجھے

تجھ پہ قربان ہوئی فاطمہ کے پیار کی روح — کلمہ پڑھنے لگی جعفر طیار کی روح
خلد میں جھوم اٹھی حیدرِ کرار کی روح — وجد میں آگئی خود احمد مختار کی روح
جب سرِ رزم بھی یہ عزم دکھایا تو نے
بھائی کو جنگ کے گھوڑے پہ بٹھایا تو نے

تیرے انداز میں وہ دبدبۂ شیرِ خدا — تیرے اخلاق میں وہ حسن کمالِ زہرا
تو ہے معراجِ وفا شانِ وفا جانِ وفا — ایسا ایثار زمانے میں نہ دیکھا نہ سنا
کر لی اخلاق و محبت کی مہم سر تو نے
کر دیا بھائی پہ بیٹوں کو نچھاور تو نے

پہلے شعر میں حضرت زینبؓ کی جرأتِ اظہار کا ذکر ہے یہ اشارہ اس گفتگو کی طرف ہے جو سانحۂ کربلا کے بعد آپ کے اور یزید کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں آپ نے یزید کی عیش پرستی اور اہل بیت کے ساتھ انتہائی سفاکی کے سلوک کو بے خوف و ہراس برملا بیان فرمایا تھا۔

تین سال قبل یعنی مارچ ۱۹۶۳ء میں بھی ان پر قلب کا دورہ پڑا تھا اور اس حالت میں انھوں نے ایک نظم "حیات" کے عنوان سے کہی تھی۔ ہر چند اس بار بھی حالت بہت نازک ہو گئی تھی مگر چونکہ ابھی جینے کی مہلت باقی تھی اس لیے اس کا ذہن حیات و موت کی کشمکش کو فلسفیانہ نگاہ سے دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ مگر اس بار جب کہ فرصتِ حیات ختم ہو رہی تھی ان کے دل نے فلسفیانہ الجھنوں میں پڑنے کے بجائے انھیں مدحِ اہل بیت کی سعادت حاصل کرنے پر مائل کیا۔ دل کی اس ترغیب میں ان کے عقیدے کا خلوص کارفرما تھا۔ "نظمِ حیات" کو مکمل کرنے اور اسے لکھوا دینے کے بعد جب خود قلم بند کرنے بیٹھے تو یہ نوٹ تحریر کیا تھا۔

" نوٹ۔ بلرام پور ہسپتال لکھنؤ (اسپیشل وارڈ نمبر ۱) میں بسترِ علالت پر جو بسترِ مرگ بنتے بنتے رہ گیا رات بھر کے شدید قلبی دوروں کے بعد جب ۲۲ ر مارچ ۱۹۶۳ء کو زندگی کی نئی صبح آکسیجن کی مدد سے طلوع ہو رہی تھی نیم غفلت و نیم بیداری کے عالم میں یہ نظم کہی گئی۔ اور باوجود گفتگو کی سخت قدغن کے برادرِ عزیز احمد آغا سلمہٗ کو سرگوشی میں لکھوائی گئی۔"

میں ان دنوں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ ان کی علالت کی خبر سن کر سید صدیق حسن صاحب اور میں بلرام پور ہسپتال پہنچے۔ اس وقت سرورش صاحب کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ ہم سے گفتگو کی اور جو نظم کہی تھی اس کا ذکر کیا اور بعد میں تندرست ہونے پر سنائی۔ صدیق حسن صاحب جو بالکل تندرست اور تن و مند تھے اسی سال دسمبر کو اثنائے سفر میں رحلت فرما گئے۔ سرورش صاحب نے رسم وفا کچھ دنوں اور نبھائی مگر بالآخر وہ بھی پیمانِ وفا بھول گئے۔ ستم تو یہ ہے کہ ان دونوں سے بے وفائی کا گلہ بھی تو نہیں کر سکتے۔

"حیات" چوالیس شعر کی طویل نظم ہے جو اس وقت کہی گئی تھی جب موت سر پر منڈلا رہی تھی اس کیفیت کو یوں بیان کیا تھا۔

کیا کہوں ہمدم کل ایک خوابِ پریشاں تھی حیات — غفلتوں میں گاہ پیدا گاہ پنہاں تھی حیات
آندھیوں پر آندھیاں طوفان پر طوفان تھے — جھلملاتا سا چراغِ زیرِ داماں تھی حیات
شانۂ عیسیٰ میں سلجھانے کا دم باقی نہ تھا — اس قدر الجھی ہوئی زلفِ پریشاں تھی حیات
جو در آئے دل میں رک رک کے وہ کانٹا تھی اجل — جو ابھر آتا ہو رہ رہ کر وہ ارماں تھی حیات
ایک نامعلوم دنیا کی پیمبر تھی اجل — ایک نامربوط افسانے کا عنواں تھی حیات

لیکن جب ذرا شعاعِ امید نظر آئی تو حیات نے یہ صورت اختیار کی۔

یاس و ناکامی کے بادل خیمہ زن گر ہیں تو ہوں — بادلوں میں جیسے برقِ خراماں ہے حیات

کہ طوفان خزاں ہوں سر بہ بند لائے ہوئے ــــ پھر بھی گلپوش و گل اندام و گل افشاں ہے حیات
ہ پسینہ موت ہی کا کیوں نہ پیشانی پہ ہو ــــ بے بہا یا رشحۂ ابر بہاراں ہے حیات
ہر ماہ و مشتری و کہکشاں میں گرد راہ ــــ اس بلند آہنگ منزل میں خراماں ہے حیات
ندۂ جاوید ہیں ہم کشتۂ الفت سرؔوش ــــ جان جائے یا رہے تھی اور ایماں ہے حیات

اس بلند آہنگی کے ساتھ عین حیات و موت کی کشمکش میں چوالیس شعر کی نظم کہنے کے لیے ہمت مرداں چاہیئے۔ سرؔوش صاحب میں یہ ہمت مرداں بھی تھی اور اعلیٰ درجے کی قوت بیان بھی۔

سرؔوش صاحب کا نام سید محمد عسکری تھا۔ وہ ۲۵ ردسمبر کو (جو حضرت عیسیٰ کا یوم پیدائش سمجھا جاتا ہے) ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے یعنی انتقال کے وقت ۳ رمئی ۱۹۶۶ء کو ان کی عمر باون برس چھ مہینے کی تھی۔ بی اے تک تعلیم پائی تھی۔ ابھی بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ اگست ۱۹۳۳ء میں انھیں ملازمت مل گئی۔ پچھلے نو سال سے وہ بجلی کے محکمے میں اوڈٹ افسر (AUDIT OFFICER) تھے۔ اتر پردیش بجلی کی کچھ کمپنیوں کے صدر دفتر کلکتے میں ہیں۔ ان کے حسابات کی جانچ پڑتال کے لیے سرؔوش صاحب کو سال میں کئی بار کلکتے جانا پڑتا تھا اور بعض اوقات کافی عرصے وہاں رہنا پڑتا تھا۔

یہ نہیں معلوم کہ سرؔوش صاحب کی شادی کب ہوئی تھی۔ حمد سردار رضاں صاحب نے (جن کی ماتحتی میں سرؔوش صاحب نے ملازمت شروع کی تھی اور جو سرؔوش صاحب اور ان کی شاعری کے دلدادہ ہیں) مجھے بتایا کہ ملازم ہونے کے تھوڑے دن بعد ہی مرزا عاشق حسین صاحب ن صاحبزادی سے شادی ہوگئی تھی یعنی ۱۹۳۳ء میں ان کی شادی ہوئی لیکن ان کی رفیقۂ حیات نے زیادہ مدت رفاقت نہیں کی۔ ۱۹۴۴ء میں سرؔوش صاحب ان کی رفاقت سے محروم ہو چکے تھے وہ اپنے بجائے داغوں کی بہار چھوڑ گئی تھیں ـــ

ل ہیں داغوں سے لالہ زار افسوس ــــ تم نے دیکھی نہیں بہار افسوس

بیگم کے انتقال کے وقت سرؔوش صاحب کی عمر تیس سال کی تھی۔ یہ ایسی عمر نہ تھی کہ ان سے تجرد کی زندگی بسر کرنے کی توقع کی جاتی۔ مگر ت بندۂ مہر و وفا نے بقیہ زندگی بیگم کی یاد کی نذر کر دی اور جو داغوں ی بہار وہ چھوڑ گئی تھیں اسے خزاں کی دست برد سے تا حیات محفوظ رکھا۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ سرؔوش صاحب نے شاعری کب شروع کی تھی۔ ان کی بیاض میں جو سب سے پہلی نظم درج ہے وہ اگست ۱۹۳۴ء کی ہے اور اس کا عنوان "شوق مضمحل" ہے۔ ان کا جو کلام اس وقت میرے سامنے ہے وہ ایک تین سو چھ صفحوں کی بیاض اور علیحدہ علیحدہ اوراق پر (جن کے صفحوں کی تعداد بھی تین سو سے کم نہ ہوگی) مشتمل ہے۔ اشعار کی کل تعداد چھ سات ہزار سے متجاوز ہوگی۔ بیاض میں اہتمام کے ساتھ کسی خوش نویس سے کلام نقل کروایا گیا ہے۔ اس میں نظموں اور کچھ غزلوں پر مقام و ماہ تصنیف بھی درج ہیں۔ پہلے دس سال میں صرف نظمیں ملتی ہیں۔ ان کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ پہلے پانچ چھ سال میں یعنی ۱۹۳۴ء سے آخر ۱۹۳۹ء تک انھوں نے صرف تیرہ چودہ نظمیں کہی تھیں جن کے عنوان درج ذیل ہیں۔

۱۹۳۴ء میں "شوق مضمحل" اور "کیا کہنا" (دسمبر)۔ ۱۹۳۵ء میں "حسن و عشق" (جون)، "فہم کی فریب کاریاں" (جولائی) "صبح بنارس" (دسمبر) ۱۹۳۶ء میں ندارد۔ ۱۹۳۷ء میں "دو آتشہ" (اکتوبر) "ایک برق جہندہ" (دسمبر) ۱۹۳۸ء میں "زرین ماضی کی یاد" (جنوری) "مجھے معلوم نہ تھا" (فروری) "شام جدائی" (جولائی) "کس کے لیے ہے" (جولائی) "محبت" (صرف سال درج ہے) "جواں مرگ اہم کے غم میں" (مہینہ درج نہیں) ۱۹۳۹ء میں "سوز و ساز" (ستمبر) سب سے پہلی غزل پر دسمبر ۱۹۴۴ء درج ہے۔

نظمیں اور غزلیں جو بیاض میں درج ہیں ان کے طرز ادا کی پختگی کے پیش نظر یہ خیال کرنا درست ہوگا کہ اگست ۱۹۳۴ء میں ان کی شاعری کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا بلکہ یہ عمارت کافی عرصے سے بن رہی تھی۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے تو یقیناً دسمبر ۱۹۴۴ء سے پہلے وہ کافی غزلیں کہہ چکے تھے۔ اس بات کی غمازی وہ اشعار کرتے ہیں جو "مفردات" کے تحت درج ہیں اور جن کی تعداد سو کے قریب ہوگی۔ گمان غالب ہے کہ یہ ان غزلوں کے منتخب اشعار ہیں جو نظری کر دی گئیں۔ اس کے علاوہ اس بات کی شہادت کہ انھوں نے بہت کم عمری ہی سے

شعر کہنے شروع کر دیے ہوں گے۔ ایک خط میں ملتی ہے جو انھوں نے مئی ۱۹۶۲ء میں مجھے لکھا تھا۔ شعر و شاعری سے اپنے طبعی لگاؤ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

" اسیری پر تعشق مرحوم کا ایک حسین شعر یاد آگیا۔

جب اسیرانِ گزشتہ کی حکایت یاد کی ۔ رات بھر بیٹھا رہا نیند اڑ گئی صیاد کی

میں چھوٹا تھا جب گھر میں کسی بزرگ نے یہ شعر پڑھا۔ حضرت اثر بھی موجود تھے۔ میں نے کہا کہ 'بیٹھا رہا' کے الفاظ کو کسی طرح بھی تبدیل کیجیے 'روتا رہا'، 'ٹہلا کیا'، 'تڑپا کیا' وغیرہ وغیرہ وہ بات نہیں پیدا ہوگی۔ اثر صاحب نے تصدیق فرمائی اور اس نکتے پر بڑی ہمت افزائی کی۔ واقعی ملاحظہ فرمایئے 'بیٹھا رہا' میں تعلق خاطر۔ پسندیدگی۔ گرویدگی۔ تاسف۔ ہمدردی۔ انس و محبت۔ ندامت و شرمندگی، حیرت و استعجاب اور درد و کرب کے جو ملے جلے جذبات و کیفیات موجود ہیں ان کی تفصیل کے لیے صفحے درکار ہیں اور ان کی ترجمانی اور کسی لفظ سے نہیں ہو سکتی بلکہ دوسرے الفاظ سے شعر کی تاثیر کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔"

سروش صاحب کے جو کاغذات مجھے دیے گئے ہیں ان میں ایک مضمون کا مسودہ بھی ہے جو غالباً ۱۹۳۹ء میں (جبکہ ان کی عمر پچیس چھبیس سال کی تھی اور اگر ان کی بیاض کی شہادت باور کی جائے تو اس وقت تک انھوں نے ۱۴ نظموں کے علاوہ کچھ نہ کہا تھا) لکھا گیا تھا۔ اس میں اپنے سے کہیں زیادہ کہنہ مشق شاعر پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت تک انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا اور شاعری میں وہ بالغ نظری پیدا کر لی ہوگی جو اسے سمجھنے اور برتنے ہی سے آسکتی تھی۔ اپنے مضمون کا عنوان "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے" رکھا تھا اور مضمون ان الفاظ سے شروع کیا تھا۔

"نگار بابت اکتوبر ۱۹۳۹ء کے حصۂ نظم کا افتتاح مولانا کیفی چریا کوٹی کی ایک نظم 'طرز نیاز' سے ہوا ہے جس میں جناب نیاز کے انداز نگارش کی مدح و ثنا کی گئی ہے۔ مجھے اس نظم کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی معنی و بیان کا نقص۔ بندش کا جھول یا نحوی سقم محسوس ہوا جسے ذیل میں واضح کرتا ہوں۔" اس کے بعد اشعار کے نقائص واضح کیے ہیں۔ میں صرف مطلع پر اعتراض و اصلاح درج کرنے پر اکتفا کروں گا۔

"مطلع ہے۔

ہر لفظ کے دامن سے ہے دریا کی روانی ۔ اعجاز بیانی ہے کہ اعجازِ معانی

مصرع اولیٰ پہ دو اعتراض ہیں۔

(۱) دامن سے دریا رواں نہیں ہوتے۔ ہاں دامن میں دریا رواں ہوتے ہیں۔ مثلاً دامن کوہ میں، دامن دشت و صحرا میں۔ دریا تو پہاڑوں سے نکلتے ہیں جنھیں دامن نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ہاں اکثر چشمے ضرور زمین سے اُبلتے ہیں لیکن انھیں دریا نہیں کہہ سکتے۔ جب حقیقت اس کے خلاف ہے تو استعارتاً بھی دامن سے دریا کیسے نکالا جا سکتا ہے۔

(۲) مصرع تشنۂ تکمیل ہے۔ ہر لفظ کے دامن سے کاہے کا دریا رواں ہے اب دوسرے مصرع کو لیجیے کیا 'اعجاز بیانی' معانی سے خالی بھی ہوتی ہے اور محض لفظی گھروندوں کو اعجاز بیانی کہہ سکتے ہیں۔ شاید یہ مطلع یوں بہتر ہوتا۔

ہر لفظ کے دامن میں ہے دریا کی روانی ۔ اعجاز بیانی سی ہے اعجاز بیانی

اور حسن و نزاکت پیدا کرنا ہو تو پہلے مصرع کو یوں بدلیے۔

ہر لفظ میں ہے موجِ گہر کی سی روانی"

مجھے نہیں معلوم کہ سروش صاحب کا یہ مضمون شائع ہوا تھا یا نہیں نہ مجھے اس سے بحث ہے کہ اعتراض صحیح ہے یا غلط اور اصلاح نے شعر کو ترقی دی یا نہیں۔ اس کا فیصلہ خود اہل ذوق پر ہے۔ میرا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ پچیس چھبیس برس کی عمر میں سروش صاحب نے شعر و ادب میں وہ نگاہ پیدا کر لی تھی کہ کیفی صاحب ایسے کہنہ مشق شاعر پر اعتراضات کرنے میں انھیں جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ یہ خود اعتمادی بغیر کثیر مطالعے اور کافی مشق سخن کے نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے میں اس کو باور کرنے پر آمادہ نہیں کہ اگست ۱۹۳۴ء سے پہلے سروش صاحب شعر نہیں کہتے تھے حالاں کہ انھوں نے بچپن ہی سے شعر و شاعری کے ماحول میں تربیت پائی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اردو کے شعرا اپنی شاعری غزل سے شروع کرتے اور بہت سے میدانوں کی خاک چھان کر پھر غزل ہی پر ختم کرتے ہیں۔ جہاں تک سروش صاحب کی بیاض کا تعلق ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور غزلیں بہت بعد میں کہنا شروع کیں۔ اس بیاض میں غزلوں کے شعر نسبتاً بہت کم ہیں۔ لیکن بعد کے کلام

میں جسے وہ ترتیب نہ دے سکے) غزلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور مجموعی طور پر شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ غزلوں اور نظموں کے اشعار میں دو تہائی اور ایک تہائی کا تناسب ہوگا۔ اس غیر مرتب کلام میں کہیں کہیں تو ایسی ترمیم و تنسیخ اور کاٹ چھانٹ ملتی ہے کہ اسے پڑھنا بھی دشوار ہے اس میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر لکھے ہوئے اشعار بھی شامل ہیں۔ بلکہ دعوت نامے کیش میمو۔ چندے کی رسید اخبار اور کیلنڈر کے پھٹے ہوئے پرزوں پر بھی اشعار لکھے ہوئے ملتے ہیں مثلاً۔

(۱) ماہ اپریل ۱۹۶۴ء کے کیلنڈر کے پھٹے ہوئے پرزے پر دس بارہ شعر درج ہیں۔ پہلا شعر ٹھیک سے پڑھا نہیں جاتا۔ دوسرا شعر ہے ؎

ابھی تو آدمیت خواب میں کچھ کسمسائی تھی　　ضمیر آگہی بیدار ہونے بھی نہ پائی تھی

(۲) نیشنل ہیرالڈ اخبار مورخہ ۲۷ر فروری ۱۹۶۵ء کے ایک پرزے پر کچھ شعر درج ہیں۔ پہلا شعر ہے ؎

کیا ہوا جو چند آنسو بہہ گئے　　ہائے وہ طوفاں جو گھٹ کر رہ گئے

(۳) اشوک کمپنی کے کیش میمو مورخہ ۲۹ر جولائی ۱۹۶۵ء پر ایک غزل درج ہے۔ مطلع ہے ؎

تجھے گلشن میں لانا چاہتا ہوں　　بہاروں کو ستانا چاہتا ہوں

(۴) ایک غزل اس رسید کی پشت پر درج ہے جو "انجمن وظیفہ سادات مومنین" کو چندہ دینے پر ۲۲ر اگست ۱۹۶۵ء کو انھیں ملی تھی۔ اس کے کچھ شعر اس دعوت نامے کی پشت پر بھی درج ہیں جو بزم شعراء کے ۵ر ستمبر ۱۹۶۵ء کے مشاعرے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ مطلع ہے۔

دل کی دل سے وہ تاب بھی نہ رہی　　شوق کی کائنات بھی نہ رہی

کچھ اوراق پر کئی کئی غزلیں لکھی ہوئی ہیں اور اس طرح کہ ایک غزل کے اشعار ابھی ختم نہیں ہوئے کہ دوسری غزل بیچ میں آگئی اور پہلی غزل کے بقیہ اشعار بعد میں درج کیے گئے۔ مختصر یہ کہ سب کلام کو پڑھ لینا ایک دشوار کام ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نظم "کلکتہ" کے سب شعر پڑھوں مگر کامیاب نہ ہوا۔ اور چند نظموں اور غزلوں کو پڑھنے میں بھی کافی دشواری ہوئی۔

سرِ دش صاحب نے چونکہ غزلیں زیادہ کہی ہیں اور پچھلے دس گیارہ سال کی شاعری کو تو غزل ہی کی شاعری سمجھنا چاہیے اس لیے مناسب ہوگا کہ پہلے ان کی غزل گوئی کا جائزہ لیا جائے۔

سوائے ان چند غزلوں کے جن پر تصنیف کا مہینہ اور سال درج ہے اور سوائے ان کے جو آخری دور کی ہیں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کون سی غزل کب کہی تھی۔ چالیس پچاس غزلیں جو بیاض میں درج ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ابتدائی دور کی ہیں۔ آخری دس گیارہ سال کی کہی ہوئی کچھ غزلوں کی میں نشان دہی کر سکتا ہوں کیونکہ آخر ۱۹۵۵ء سے جب میں تبادلے پر لکھنؤ آیا تھا ان کے انتقال تک کی غزلوں میں سے بیشتر میری سنی ہوئی ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں میں نے چند احباب کی مدد سے ماہانہ مشاعروں کا سلسلہ لکھنؤ میں جاری کیا تھا۔ ان میں عموماً طرحی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ چنانچہ سرِ دش صاحب کی اور میری متعدد غزلیں ہم طرح ہیں۔ لکھنؤ سے میرا تبادلہ ہو جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو اپنا تازہ کلام بھیجتے رہتے یا ملاقات ہونے پر سنا دیتے تھے۔ تقریباً پچاس ساٹھ غزلیں مجھے ان کے کلام میں ایسی ملتی ہیں جو انھوں نے مجھے پچھلے دس گیارہ سال میں سنائی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ غزلیں اسی زمانے کی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان کا رنگ وہی ہے جو اس دور کی غزلوں کا ہے۔ ابتدائی دور کی غزلوں کا رنگ بہت مختلف ہے۔ اس لیے آخری دور کے کلام کی نشان دہی کرنا زیادہ دشوار نہیں۔

ابتدائی دور

بیاض میں سب سے پہلی غزل جو درج ہے وہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی کہی ہوئی ہے۔ دوسری غزل پر تاریخ درج نہیں۔ غالباً وہ ۱۹۴۵ء کی کہی ہوئی ہوگی۔ ان دونوں غزلوں کے تین تین شعر لکھتا ہوں۔

ہزار بار زمانے نے کروٹیں بدلیں　　مری وفا میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا
مآلِ ولولۂ عرضِ شوق کیا کہیے　　زبان کیسی نظر سے خطاب ہو نہ سکا
شفق نکھر کے بھی تیری حریف بن نہ سکی　　چمن سنور کے بھی تیرا جواب ہو نہ سکا

دردو لذت میں امتیاز نہیں　　ابھی آغاز آشنائی ہے
میں جدھر ہوں ادھر نہیں ہیں کبھی　　تم جدھر ہو ادھر خدائی ہے
قصدِ ترکِ وفا سرِ دش سرِ دش　　یہ ترے جی میں کیا سمائی ہے

ان اشعار کو بہ حیثیت زبان و انداز بیان کسی شاعر کی پہلی یا دوسری غزل کے اشعار کہنا بہت دشوار ہے۔ البتہ "مفردات" کے تحت جو شعر درج ہیں ان میں کا پہلا شعر ایک مبتدی کا ہو سکتا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

دباغ پر، نہ قفس پہ، نہ کل زمانے پر   گری بھی ٹوٹ کے بجلی تو آشیانے پہ

اس میں "نہ کل زمانے پر" بالکل بے محل ہے۔ مصرع اولیٰ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ کسی نومشق کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

عموماً اس دور میں جو غزلیں کہی ہیں ان میں سے کچھ بہت ہی طویل ہیں۔ کسی میں اکتیس شعر ہیں، کسی میں چوبیس، کسی میں تئیس، کسی میں اکیس اور ۱۵ شعروں سے زیادہ کی تو کافی غزلیں ہیں۔ نظم میں تو واقعات کا تسلسل ہونے کی وجہ سے طوالت ناگوار نہیں ہوتی لیکن غزل کی طوالت تھکا دیتی ہے۔ غالب آٹھ سے بارہ شعر کی غزل کہنے کو اچھا سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں کچھ غزلیں بارہ اشعار سے زیادہ کی بھی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ خود سرورش صاحب کے آخری دور کی غزلیں بارہ تیرہ شعر سے تجاوز نہیں کرتیں۔ چونکہ ابتدا میں ان کی طبیعت کو نظم سے زیادہ لگاؤ تھا اس لیے غزلیں بھی نظم نما ہی ہیں۔ ان غزلوں میں وہ نشتریت نہیں پائی جاتی جو غزل کی جان ہوتی ہے اور جو ان کے آخری دور کی غزلوں میں جابجا ملتی ہے۔ اس کے بجائے ان کے ابتدائی کلام میں محبوب کے کاکل، گیسو، زلف، لٹیں، سینے، رخ، عارض، مدھ بھری آنکھوں، انکھڑیوں، آنکھ کے ڈوروں، قدموں کی آہٹ، پاؤں کی آواز، پائے حنائی، لب نازک، ابروئے خمدار، نگاہوں کی سفاکی، نگاہوں کے وار، ماتھے کی شکن، انگڑائی، اوڑھنی، آنچل وغیرہ کا ذکر بار بار آیا ہے اور معاملات حسن وعشق اس بلند سطح پر نظر نہیں آتے جس پر آخری دور کی غزلوں میں آتے ہیں۔ اس کو واضح کرنے کے لیے کچھ مثالیں دینا مفید ہوگا۔

اک پیکر شباب کا اٹھیے خواب سے   تکیہ کہیں ہے زلف کسی جا ہے سر کہیں
نگاہِ ناز کی سفاکیاں بدنام کر دیتیں   دعائیں دو کہ نشتر کو رگِ جاں کر دیا ہم نے
زیر و بم راگ میں جس طرح رہے ساز کے ساتھ   دل دھڑکتا ہے ترے پاؤں کی آواز کے ساتھ
ان شوخ نگاہوں کا ہر وار قیامت ہے   اس وار کو کیا کہیے اس وار کو کیا کہیے
سینے پہ مچلتی ہوئی کاکل کا ہے سایہ   یا شیشے میں ناگن کوئی بل کھائی ہوئی سی
خوشبو ترے آنچل کی اڑا لائی ہے شاید   پھرتی ہے صبا باغ میں اترائی ہوئی سی
اب کیا کوئی سمجھے اسے غصہ کہ لگاوٹ   ماتھے پہ شکن لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی
اے دل جو میری مان تو رہ اس نظر سے دور   ان مست انکھڑیوں کہ طلسم اثر سے دور
سر پر شوق اور پائے حنائی   عجب رنگین جبیں سائی کے دن ہیں

یوں اڑیں دوشِ ہوا پہ وہ گھنیری زلفیں   رہ گیا مہر چراغ تہِ داماں ہو کر
آنکھوں میں اشک دوش پہ بکھری ہوئی لٹیں   یہ وضع سوگوار کہو کس خوشی میں ہے
لال ڈورے چشم ساقی کے نہ پوچھ   جام ہے اور اس پہ مینا کاریاں
رقص کرتی نظر آتی ہیں ہزاروں پریاں   انکھڑیاں تیری دیکھی ہیں پرستاروں کے
گھنیرے بال بکھرائے گئے ہیں   ہوا میں جال پھیلائے گئے ہیں
نیازِ سجدۂ پائے حنائی   خودی کے دل میں کھب جاتا تو ہوگا
لجے لجائے جو نظریں چرائے بیٹھے ہیں   کسے خبر ہے کہ یہ دل چرائے بیٹھے ہیں
پریشاں بال بے پروا نظر ڈھلکا ہوا آنچل   کسی کی سادگی میں بھی عجب عالم نکلتا ہے
نازک سینے کا یہ تموج توبہ   پھولوں پہ شبنم تل رہی ہے گویا

اس دور کی غزلوں میں ایسے اشعار کافی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ متین اور پرکیف شعر بھی ملتے ہیں:

حقیقت ہو تو کوئی صبر کر لے   ہوئی غم بن کے تڑپائے تو کیا ہو
نہ طلب رکھ بہار رنگ و بو سے   چمن تخلیق کر اپنے لہو سے
گرفتار رسوم جیب و دامن   گزر بھی جا غم چاک رفو سے
ہر شش جہت میں دام نظارہ بچھے ہوئے   تارے کہیں ہیں پھول کہیں ہیں شرر کہیں
کل یہ نکتہ ایک رند لاابالی سے سنا   ہوش کہتے ہیں جسے وہ بھی فریب ہوش تھا
تمام درد ہو دل اور نظر گلا نہ کرے   کسی غریب پہ یوں آبلے خدا نہ کرے
دل حزیں کی طرف ملتفت نہیں نہ سہی   یہ اس نظر کی مروت نہیں تو پھر کیا ہے
طرز اظہار مدعا یہ نہ جا   ٹوٹی پھوٹی زبان ہے پیارے
بہت دن رہے کفر الفت کے منکر   اب ایمان لانے کو جی چاہتا ہے
سمجھ کر فریبوں سے اصل حقیقت   فریب اور کھانے کو جی چاہتا ہے

آخری دور

ابتدائی اور آخری دور کے بیچ کے دور کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ پچھلے دس گیارہ سال کی بیشتر غزلیں میری سنی ہوئی ہیں اس لیے اس دور کے متعین کرنے میں کچھ قباحت نہیں۔ اسی طرح ابتدائی دور کی غزلیں بھی (جن میں کی بہت سی مرتبہ بیاض میں درج ہیں) آسانی سے پہچانی جا سکتی ہیں مگر درمیانی دور کی غزلوں کی نشان دہی کرنے کے لیے ان لوگوں کی شہادت ہی کام دے سکتی ہے جنھوں نے وہ غزلیں سنی ہوں۔ یوں تو میرے سرورش صاحب سے ایک عرصے سے تعلقات

تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء کی ایک غزل میں انھوں نے ارشاد بھی کیا ہے ؎

ہم کہاں منزل حبیب کہاں — اک کشش تھی جو کھینچ لائی ہے

لیکن ملاقات کی نوبت کم آتی۔ پہلی بار کئی مہینے ایک جگہ رہنے کا موقع بلیا میں ملا ۱۹۵۱ء میں وہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنے وہاں آئے اور کئی مہینے رہے۔ میں وہاں پہلے سے تھا۔ اس زمانے میں جو غزلیں انھوں نے سنائی تھیں ان میں کی دو ایک ہی ذہن میں محفوظ ہیں۔ مثلاً غالب کی غزل "آپ تو دے۔ داب تو دے" پر انھوں نے اپنی غزل سنائی تھی۔ اس کا مطلع بالخصوص بہت اچھا تھا ؎

وہ عرض شوق کا اچھا برا جواب تو دے — مگر شکستہ دلی جرأت خطاب تو دے

ایک اور غزل کا مطلع بھی ہے۔

ہمارے خون کا ہر ایک قطرہ ہے جوہر برق کا خرمن
ہم ایک دن بجلیوں کے دل میں بنائے چھوڑیں گے آشیانہ

بلیا سے جانے کے بعد انھوں نے ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۱ء کے خط کے ساتھ ایک غزل اور ایک نظم لکھ کر بھیجی تھی۔ غزل کا مطلع تھا ؎

شام تنہائی ہے آؤ راز کی باتیں کریں — دل بہل جائے کچھ اس انداز کی باتیں کریں

اور نظم تھی "بے قراری کے مزے" اس نظم کو پیش کرتے ہوئے انھیں احساس تھا کہ یہ کافی شوخ ہو گئی ہے چنانچہ معذرت میں لکھتے ہیں۔

"... مزے کی ردیف میں حسرت کے یہاں چند شعر ہے۔ میں نے پوری عمارت کھڑی کی ہے بلکہ فکر اس نظم میں کھل کھیلی ہے۔ حسرت ہی کا رنگ ہے ذرا شوخ ہو گیا ہے۔ پھر آپ کی سی بیدرد متانت و سنجیدگی کہاں سے لائے!

قائل ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط نفس کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

اور یہاں یہ حال ہے کہ اٹھنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا، وہ تھا"

آپ کے بعض اشعار پڑھ کر کبھی کبھی کے کہے ہوئے ایک شعر کی تفسیر مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

بحر غم کی شورش پنہاں کا عالم کچھ نہ پوچھ
سطح پر جتنا سکوں ہے تہ میں اتنا جوش ہے

ہاں تو حسرت کے وہ چند شعر بھی نقل کیے دیتا ہوں۔ ظالم نے ناواقفیت کے مزے خوب کہا ہے ..."

کہنا مقصود یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء سے پہلے ان کا کلام بہت کم سنا تھا۔ اس لیے ان غزلوں کے زمانہ تصنیف کی تعیین کرنا جو اس سے قبل اور ابتدائی دور کے بعد انھوں نے کہی ہوں گی میرے لیے بہت دشوار ہے البتہ آخری دور کی بیشتر غزلوں سے واقف ہوں اور در اصل یہی دور ان کی غزل گوئی کا بہترین دور ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ بہت سے شاعر شاعری شروع کرنے کے چند سال کے اندر ایک مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں ان کی شاعری آکر ٹھہر جاتی ہے اور پھر تمام عمر اس پر جمود طاری رہتا ہے۔ سرور صاحب ان شاعروں میں سے نہ تھے۔ ان کی شاعری ان کی عمر کے ساتھ ساتھ درجہ بدرجہ ترقی کرتی گئی۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی تھی۔ وہ کسی منزل پر زیادہ قیام نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا ہر قدم بلندی کی طرف اٹھتا جاتا تھا۔ ان کے آخری دور کی غزلیں اس ترقی کی شہادت دیتی ہیں جو ہر شاعر کے حصے میں نہیں آتی۔ غزل کی جس نشتریت کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے وہ اس دور کے اشعار میں جابجا ملتی ہے۔ اس دعوے کا ثبوت ملاحظہ ہو۔

جیسے قدموں پہ کوئی ڈال دے اک کونین — ہائے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے
کسی کی خوئے تغافل کا کچھ قصور نہیں — ہمیں میں کوئی کمی تھی کہ یاد آ نہ سکے
عشق زباں طلب کی سلیقہ شعاریاں — بے حاصلی کو زیست کا حاصل بنا دیا
ہر نفس ہوتا ہے جب دل کے لہو سے رنگیں — تب کہیں زیست میں پیغام دوام آتا ہے
عشق نے منزل حیرت کو بھی پیچھے چھوڑا — عقل ہمسفر نہ ہوئی وہم و یقیں کے آگے
سکوں جہاں میں نہیں آزما کے دیکھ لیا — تمھیں بھی وجہ تسلی بنا کے دیکھ لیا
نہ تمنا نہ تب و تاب نہ شورش نہ جنوں — ایسی جنت سے تو دوزخ کا عذاب اچھا ہے
کس منہ سے کریں شکوۂ انداز تغافل — جب حسن توجہ بھی کسی کام نہ آئے
اے غنچۂ لب بستہ تبسم ہے غنیمت — آئے کہ صبا کا کوئی پیغام نہ آئے

نگہ ہوش ربا کے ہوتے — بے خودی مورد الزام نہ تھی
دل کو اک گونہ سکوں ملتا تھا — جب کوئی صورت آرام نہ تھی
ہم نے یہ رسم نکالی ورنہ — جاں نثاری روش عام نہ تھی
ہائے وہ محویت شوق کہ جب — فرصت نامہ و پیغام نہ تھی

کون سمجھے تری نظروں کے سوا   وہ اسیری جو نہ دام ہوتی
ہے یہ وہ بدنصیب جو قیدِ قفس کے بعد   آزادیوں میں اپنی گرفتار ہوگئے

نکھرتا جا رہا ہے ذرّہ ذرّہ   نظر حیران ہوتی جا رہی ہے
بحمد اللہ اب تو سعیِ آدم   خدائی شان ہوتی جا رہی ہے

جانِ گلشن ہے مسکراہٹ   ہر چند کہ پھول ہے کلی کی
آتے آتے دلِ حزیں تک   تاثیر بدل گئی خوشی کی

بے رخی کا گلہ نہ کر اے دل   یہ بھی اک طرزِ التفات نہ ہو
دیکھ اپنی طرف بھی ایک نظر   تو ہی منشائے کائنات نہ ہو
ہر نفس میں ہے اک نشیب و فراز   زیست ترتیبِ حادثات نہ ہو
جیسا روزِ سیاہ ہے اپنا   ایسی یارب کسی کی رات نہ ہو
تم نے ٹھکرا دیا جسے ہنس کر   کسی بیکس کی کائنات نہ ہو

یہ زندگی ہے حقیقت کہ خواب کیا جانے   خروشِ سینۂ دریا حباب کیا جانے

نہ مٹے کشمکشِ ترک و طلب   زیست جولانگہِ طوفاں ہی سہی
ہم بھی کچھ رکھتے ہیں نسبت تجھ سے   کج کلاہی ترے شایاں ہی سہی
پیلو اک پوچھنے والا تو ملا   جان و ایمان کا خواہاں ہی سہی
مجھ کو اے تشنہ لبی کیا کیجے   عشق سرچشمۂ حیواں ہی سہی
لے ترے لطفِ بہارانِ علوم   سینہ داغوں سے گلستاں ہی سہی

کوئی آسان نہیں منزلِ معراجِ کمال   خونِ دل شرط ہے تکمیلِ ہنر سے پہلے

تری خود کامیوں کی ہیں طلسم آرائیاں ورنہ   نگاہ آشنائے راز میں اپنے نہ بیگانے

آدمی راہِ راست پر آئے   ہائے یہ معجزہ نہیں ہوتا

مفہومِ کامیابیِ دوراں بدل دیا   ناکامیوں کا لے کے سہارا کبھی کبھی

شاید تمھارے پاس سے ہو کر گزر گئی   بدلا ہوا مزاجِ نسیمِ بہار ہے

آسرا رہ گیا نہ جب کوئی   نامرادی نے دل دہی کی ہے
دل ہے اور اس نظر کی دلداری   جس نے شعلے سے دوستی کی ہے
ہر طرح ہم تو خوش ہیں تم کو بھی   لاج کچھ بندہ پروری کی ہے؟
غم کی فطرت بدل سکی ہے کہیں   مسکرا کر تری خوشی کی ہے
خود فریبی میں مبتلا ہے سرکش   دورِ منزل خود آگہی کی ہے

خدا کرے مری نظریں قصور کرتی ہوں   چمن کی خیر گلوں کا نشاں نہیں ملتا

میری ہستی کے فسانے میں نہ وہ شامل ہوئے   ہاں مگر افسانۂ ہستی کا عنواں ہوگئے

گزر گیا وہ زمانہ بھی تیرے بندوں پر   گماں ہوا کہ یہ بندے خدا نہیں رکھتے

نزدیک آگئی تھی مری منزلِ مراد   یہ خیریت ہوئی کہ قدم ڈگمگا گئے

تجھ کا اس کی نہ یارا نہ لطف کی برداشت   دلِ ستم زدہ آخر تجھے ہوا کیا ہے

اف ری کوتاہیِ خیال و نظر   چار تنکوں کو آشیاں سمجھے

راس آتی ہیں خطائیں بھی مگر   اتفاقات یہ کم ہوتے ہیں

جہاں اہلِ خرد کا مصلحت بینوں کا مجمع ہے   ہم اس محفل میں سر سے تا قدم دل بن کے بیٹھے ہیں

بھلی ہو یا بری بیٹھے ہیں ہم ہر بزم میں لیکن   امینِ آبروئے عصمتِ دل بن کے بیٹھے ہیں

راہ و رسمِ یگانگت اب تو   درخورِ التفات ہی نہ رہی

بخوفِ طوالت میں نے ایسے بہت سے شعر چھوڑ دیے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر دل کو لطف و سرور ملتا ہے۔ یہ ذوقِ شعری کو آبِ حیواں عطا کرتے ہیں اور ذہن کو آسودگی بخشتے ہیں۔ ان شعروں کو پڑھ کر اب پھر وہ ابتدائی دور کے شعر پڑھیے جن میں زلف کا کل۔ عارض و ابرو۔ دست و پائے حنائی انگڑائیوں اور ان کے ڈوروں۔ سینے اور اس کے تموج اور اوڑھنی اور ڈھلکے ہوئے آنچل وغیرہ کی کثرت ہے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ حسن و عشق کے معاملات کی دو مختلف سطحیں ہیں اور مندرجۂ بالا اشعار جس سطح کو پیش کرتے ہیں وہ نہایت ہی رفیع اور اس کی فضا نہایت ہی لطیف ہے۔ ان اشعار میں سے صرف یہ دو شعر لیجیے۔

انکار کی شوخی پر اقرار بھی قرباں ہے   اک کفر ہے ایسا بھی جو حاصلِ ایماں ہے
اس جانِ بہاراں کو نسبت کوئی کس سے دے   نکہت ہے سو آوارہ شعلہ ہے سو عریاں ہے

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے نے انکار کی شوخی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں نہ گیسوئے برہم کا ذکر ہے نہ سینے کے تموج کا۔ نہ مست انگڑائیوں کا سہارا لیا ہے نہ لال ڈوروں کا۔ یہاں نہ ابروئے خمدار کی شمشیر ہے نہ پائے حنائی کی ٹھوکر۔ مگر پھر بھی جو تصویر پیش کی ہے وہ کس قدر دل آویز اور نظر افروز ہے۔

مندرجہ بالا چالیس پینتالیس اشعار میں سے کسی کو لے لیجیے اور اس کی ندرتِ بیان اور لطافتِ خیال کا تجزیہ کیجیے۔ آپ سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہوں گے۔ میں چند شعروں کی ندرتِ بیان کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔

(۱) خدا کرے مری نظریں قصور کرتی ہوں   چمن کی خیر گلوں کا نشاں نہیں ملتا

چمن کی ویرانی و کس مپرسی دیکھ کر باغباں کی غفلت و بے توجہی پر دل دکھتا

[redacted]

باغبان کو حق باغبانی ادا کرنے پر شاعر راغب کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ اسے برا بھلا کہے اور تنبیہہ کرے کہ آیندہ ایسا ہرگز نہ ہونے پائے۔ یہ طریقہ عموماً سود مند نہیں ثابت ہوتا جس کی عیب جوئی کی جاتی ہے وہ اپنا عیب دیکھنے کے بجائے عیب جو کی برائیاں تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے۔ شاعر اس مخاصمانہ طریقے کے بجائے نہایت ہی مشفقانہ طور پر باغبان کو چمن کی تباہ حالی سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کو قصوروار ٹھہرانے کے بجائے اپنی نگاہوں کا قصور بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ چمن گلوں سے خالی ہو۔ ہو نہ ہو میری نظر کا قصور ہے۔ اب اگر باغبان میں ذرا بھی حمیت ہے تو ایسے مشفق خیر خواہ سے لڑنے کے بجائے اپنے دل میں شرمائے گا اور چمن کو سنوارنے کی فکر کرے گا۔

اسی زمین میں فانیؔ کا بھی ایک بہت خوب شعر ہے جس میں یہی تجاہل عارفانہ نمایاں ہے ؎

مجھے خبر ہے، ترے تیرِ بے پناہ کی خیر ‏ ‏ بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

انصاف کیا جائے تو سرورؔش کا شعر طرزِ بیان اور معنویت دونوں اعتبار سے زیادہ دل کش ہے۔

(۲) غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ‏ ‏ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سرورؔش کہتے ہیں ؎

گزر گیا وہ زمانہ بھی تیرے بندوں پر ‏ ‏ گماں ہوا کہ یہ بندے خدا نہیں رکھتے

دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے مگر غالبؔ کے یہاں رب العالمین کی جناب میں ایک گستاخی کا پہلو نکلتا ہے "ہم بھی کیا یاد کریں گے" میں ایک بیزاری سی پائی جاتی ہے یعنی یہ کہ بس دیکھ لیا اللہ میاں کو بھی۔ سرورؔش خود خدا کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ تیرے کچھ بندوں پر ایسا وقت پڑا ہے کہ کوئی سہارا انھیں نظر نہیں آتا حتیٰ کہ لوگوں کا گمان ہے کہ خدا نے بھی انھیں چھوڑ دیا ہے۔ دراصل شاعر اپنی تنگ حالی کا گلہ کر رہا ہے مگر اسے "حدیثِ دیگراں" کے طور پر پیش کرکے طرزِ ادا میں کس قدر ندرت پیدا کر دی ہے اور گستاخانہ پہلو کو بھی بچا لیا ہے۔

(۳) راس آتی ہیں خطائیں بھی، مگر ‏ ‏ تفاقات یہ کم ہوتے ہیں

اس شعر کی سادگیِ بیان میں سیکڑوں پرکاریاں پنہاں ہیں۔ یہ شاعری کا وہ مقام ہے جہاں پہنچنے کے لیے خود بقول سرورؔش ۔ خونِ دل شرط ہے تکمیلِ ہنر سے پہلے۔

ایسے نازک اور لطیف شعروں کی تشریح کرنے کا مشغلہ ہر چند دل پذیر ہے اور جی چاہتا ہے کہ یہ مشغلہ بہت دیر تک جاری رہے۔ مگر اب اس خیال سے دست کش ہونا پڑتا ہے کہ ابھی لکھنے کو بہت کچھ باقی ہے مندرجہ بالا اشعار سے سرورؔش صاحب کی غزل گوئی کا بلند مرتبہ خوب عیاں ہے۔ ایسے اشعار کسی بھی شاعر کے لیے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں۔ اور ایسے شعروں کی تعداد انھیں اشعار تک محدود نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ایسے اور بہت شعر ہیں جنھیں بخوفِ طوالت نقل نہیں کیا ہے۔

نظمیں

ابتدائی کلام میں نظموں کی بہتات ہے۔ بیاض کے ۳۰۶ صفحوں میں سے دو سو اکتالیس صفحے نظموں اور پینسٹھ صفحے غزلوں کے حصے میں آئے ہیں۔ بیشتر نظمیں رومانی ہیں۔ غزلوں کی طرح ابتدائی دور کی نظموں میں بھی حُسن کی ظاہری خصوصیات نمایاں ہیں اور شیفتگی کا زیادہ تر انھیں پر انحصار ہے۔ غزل گوئی کی طرح ان کی نظم نگاری نے بھی عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے۔ ویسے تو ابتدائی نظموں میں بھی ندرتِ تشبیہہ و استعارہ کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں جیسے ــ

(۱) "صبحِ بنارس" میں جو ۱۹۲۵ء میں کہی تھی اور جوان کی تیسری نظم ہے۔ صبح ہونے کا منظر بہت سی نادر تشبیہوں سے آراستہ کرکے پیش کیا ہے۔

جھلملاتے اختروں کے پھول برساتی ہوئی ‏ ‏ ریشمی گھونگھٹ شفق کا رخ سے سرکاتی ہوئی

مسکراتی رقص کرتی، بھیرویں گاتی ہوئی ‏ ‏ بادلوں کو چھیڑتی، تھم تھم کے اٹھلاتی ہوئی

سکۂ زر مہر کا جھولی میں بھر کر دان کو

آتی ہے گنگا پہ تو کس ٹھاٹھ سے اشنان کو

پہلے بند کے پہلے مصرعے پر غور فرمایئے۔ جب پھول برسائے جاتے ہیں تو وہ ذرا سی دیر فضا میں نظر آ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ سحر سے پہلے جھلملاتے ہوئے تاروں کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ابھی ہیں اور ابھی غائب۔ پھر ستاروں کی ساخت پھولوں سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ یہ تشبیہہ کتنی حسین اور کیسی مناسب ہے۔ اسی طرح "مسکراتی۔ رقص کرتی۔ بھیرویں گاتی ہوئی" کا جائزہ لیجیے۔ جب سورج کی زرنگار کرن نمودار ہونے لگتی ہیں تو ان میں ایک

روح افزا تبسم کی جھلک نمایاں ہوتی ہے اور وہ تبسم کسی "فتنۂ روزگار" کے گلابی ہونٹوں پر رقص کرتے ہوئے تبسم سے بہت مشابہ ہوتا ہے مگر سورج کی سب کرنیں بہ یک وقت نمودار نہیں ہوتیں اور تاریکی دفعتاً نہیں ہٹ جاتی۔ کچھ دیر تک تاریکی اور روشنی میں آنکھ مچولی ہوتی رہتی ہے جسے رقص سے تشبیہ دی ہے۔ اب رہا بکھیر دیں گا نا تو سحر ہونے سے پہلے ہی چڑیوں کا چہچہانا شروع ہو جاتا ہے۔ طائران خوش الحان کے یہ نغمے در اصل سحر کی بھیریں ہیں۔

(۲) ان کی نظم "کشمیر" میں جو ۱۹۴۲ء میں کہی تھی اور ابتدائی دور ہی کی چیز ہے، محاکات کا حسن قابل توجہ ہے۔

وہ کیف شام و بہار سحر کا مجموعہ	وہ نور و نزہت و رنگ شباب کا مخزن
شمیم و شبنم و لعل و گہر کا مجموعہ	عبیر و عنبر و مشک گلاب کا مخزن

جہاں کنول متبسم ہیں جوئباروں میں
بہار ہستی ہے کیسر کے کشت زاروں میں

بہار باغ کی وہ مے پرستیاں ہے ہے	وہ جوشش لالہ و نسرین و نسترن توبہ
نئی نویلی وہ کلیوں کی مستیاں ہے ہے	جوان و تازہ نہالوں کا بانکپن توبہ

ادا سے "نکہتِ شب" ہے لب حجاب کہیں
کلاہ کج کیے "شہزادۂ گلاب" کہیں

"سرخوش صاحب کی نظم "تاج محل" ان کے وسطی دور کی نظم ہے۔ یہ ۱۹۴۹ء میں کہی گئی تھی۔ اس میں ابتدائی دور کی افراط و تفریط کے بجائے ایک توازن اور ٹھہراؤ ہے۔ تاج محل کے مرمریں پیکر کی آب و تاب کو ان دو شعروں میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

پیکر سنگ میں بجلی کی تڑپ بھر دی ہے	چاندنی ساغر بلور میں حل کر دی ہے
ٹھاٹھیں لیتا ہوا سیماب کا دریا کوئی	آتش طور کا مچلا ہوا شعلا کوئی

تاج محل کی پر نور قبائے مرمریں کے لیے پیکر سنگ میں بجلی کی تڑپ کیسی نادر تشبیہ ہے اور بقیہ تینوں تشبیہیں بھی انوکھی اور حسین ہیں۔

سرخوش صاحب اور اشتراکیت

۱۹۴۳ء کی کہی ہوئی نظم "سویٹ روس" اور ۱۹۴۷ء کی کہی ہوئی "طلوع نو" اور ۱۹۴۹ء کی کہی ہوئی "کارل مارکس" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگر ان نظموں کو ان کے نظریۂ حیات کا صحیح ترجمان سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان کے نزدیک اشتراکیت ہی دنیا کو ظلم و استبداد، مفلسی و گرسنگی اور جہل و ظلمت سے نجات دے سکتی ہے اور انسان کے لیے اگر کوئی شعاع امید ہے تو بس اشتراکیت ہے۔ ان نظموں کے تھوڑے تھوڑے اشعار نقل کرتا ہوں۔

"سویت روس سے"

وہ نسل و قوم ہو یا رنگ و مذہب و ملت	ہر افتراق و تفاوت مٹا دیا تو نے
بتان وہم و جہالت کو منہدم کر کے	دلوں کو مرکز الفت بنا دیا تو نے
نظام کیسے قضا و قدر لرز اٹھے	اس انقلاب کا نقشہ دکھا دیا تو نے
بشر تو کیا ہے فرشتے بھی کانپ کانپ گئے	وہ امتحان جزا و سزا دیا تو نے

"طلوع نو سے"

مشرق خواب آشنا کے مطلع تاریک سے	اک طلوع نو بہ انداز دگر ہونے کو ہے
سر اٹھائے آ رہا ہے کاروان انقلاب	راندہ و مقہور عہد تاج و زر ہونے کو ہے
پھر برس پڑنے کو امنڈی ہیں گھٹائیں لطف کی	پھر غریبوں کی تمنا بار ور ہونے کو ہے
اٹھ رہے ہیں پے بہ پے اوہام باطل کے حجاب	آدمی پر فاش راز خیر و شر ہونے کو ہے

دور شیطاں۔ دور حیواں۔ دور یزداں ہو چکا
افتتاح عالم دو بشر ہونے کو ہے

"کارل مارکس" سے

صحیح و توانا ہے تیرا تفکر	جواں اور صالح ترا فلسفہ ہے
غریبوں کے والی حقیروں کے حامی	تو ہی عصر حاضر کا مشکلکشا ہے
جہاں بھی ہے انصاف کی حکمرانی	تری شوخیٔ فکر کا معجزا ہے
تباہی کی ہلچل میں جب ہو خدائی	خدائی کا اس وقت تو آسرا ہے
عقیدہ ہے میرا کہ انسانیت کے	شکستہ سفینے کا ناخدا ہے

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کارل مارکس کو مشکلکشا اور سفینے کا ناخدا سمجھنے والے لوگ مذہب کو افیون کی طرح معطل کر دینے والی چیز سمجھتے ہیں اور اسے انسان کے حق میں سخت مضرت رساں جانتے ہیں۔ اگر سرخوش صاحب واقعی اشتراکیت کی افادیت کے اس حد تک قائل تھے کہ اسی کو انسان کے لیے ذریعۂ نجات سمجھتے تھے تو ان کی مذہبی شاعری ایک معمہ بن جائے گی۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حضرت حسین وغیرہ کی شان میں جو نعتیں اور منقبتیں کہی ہیں اور جو عقیدت مندی ان میں ظاہر کی ہے اس پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لینا ضروری ہوگا۔

[redacted]

نعت

تری تعلیم حسیں کا آدمیت نام ہے   اے محمد تو خدا کا آخری پیغام ہے
کس زباں سے شکر ادا ہو تیرے لطفِ خاص کا   تیرے ہاتھوں زندگی انعام ہی انعام ہے

بہارِ جلوۂ عرفاں نگارِ عالمِ امکاں   زمین و آسماں صدقہ ہیں تیری رہنمائی کا
تولے کر نعمتیں آیا مساوات و اخوت کی   تو بن کر رستگار آیا غلامی و گدائی کا

تو ہی ہے جانِ جہاں کائنات کا مقصود   ہزار بار محمد پہ ہو سلام و درود
ترا کلام شگوفہ ترا نفس نکہت   تری نگاہ سے کارِ چمن کی بست و کشود
ادا بشر سے ہو کیا حق ترے تصور کا   کہ ہوش و فکر و خیال و قیاس ہیں محدود

منقبت حضرت علی۔

وارثِ ختم رسل۔ شافعِ روزِ محشر   قاسمِ خلد بریں ساقیِ حوضِ کوثر
تجھ کو بگڑی ہوئی قسمت کا بنانا ہے کھیل   تیرے اعجاز پہ شاید ہیں قضا اور قدر

مُحبّانِ علی کا میکدہ بھی طرفہ ساماں ہے   کوئی کوثر پہ ساغر ہے کوئی جنت بداماں ہے
میں جیتا ہوں فقط امید پر تیری عنایت کی   تری مرضی مرادیں ہے تری حب ایماں ہے

منقبت حضرت حسینؓ

انسانیت کا رہبرِ کامل حسین ہے   ہر جادۂ کمال کی منزل حسین ہے
تکمیلِ کائنات کا حاصل حسین ہے   عالم تمام جسم ہے اور دل حسین ہے

روحِ روانِ شانِ جمال و جلال ہے
فرماں روائے کشورِ حسنِ خیال ہے

ایسے سیکڑوں اشعار سرورش صاحب کے یہاں ملتے ہیں۔ کیا یہ سب بناوٹی باتیں ہیں۔ نہیں تو ایک طرف حضرت علیؓ کو مولا مشکل کشا کہنا اور دوسری طرف کارل مارکس کی مشکل کشائی کا قائل ہونا کیا معنی۔ ایک طرف آں حضرتؐ کی تعلیم کو ایسی تعلیم ٹھہرانا جس پر چل کر زندگی انعام ہی انعام ہو جاتی ہے اور جو مساوات و اخوت کی نعمتوں کی حامل ہے اور غلامی اور گدائی سے رستگاری عطا کرتی ہے اور دوسری طرف کارل مارکس کے تفکّر اور فلسفے کو اعلیٰ ترین تعلیم سمجھنا اور تنہا اسی کو عدل و انصاف کا علم بردار کہنا عجیب سی بات ہے۔ اسی طرح ایک طرف حضرت حسینؓ کو انسانیت کا رہبرِ کامل ٹھہرانا اور دوسری طرف انسانیت کے سفینے کی ناخدائی کارل مارکس کے سپرد کر دینی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ درست ہے کہ سرورش صاحب ایسے مذہب کے قائل تھے جو انسانوں میں کشت و خون اور باہمی منافرت کا باعث بنے چنانچہ وہ اپنی نظم "گم شدہ فردوس" میں کہتے ہیں۔

اختلافاتِ مذاہب کی غلاظت سے نکل   وادیِ شرعِ یک آہنگیِ انساں کو چل

مگر وہ اسلام کی اخلاقی قدروں کے قائل تھے انھوں نے جن مذہبی خیالات کا اظہار اپنی مذہبی نظموں میں کیا ہے وہ واقعی ان کے عقائد کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان سے جہاں شعر و ادب پر گفتگو ہوتی تھی وہیں دنیا کے رجحانات، اشتراکیت، سرمایہ داری وغیرہ ایسے موضوعات پر بھی اکثر تبادلۂ خیال ہوا ہے۔ انھوں نے اشتراکیت کے بجائے اسلام اور مومن سے اپنی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں چنانچہ "نغمۂ حیات" میں جو "سویت روس"۔ "طلوعِ نو" اور "کارل مارکس" کے بعد ۱۹۵۱ء میں انھوں نے کہی تھی مومن ہی سے وقت کے طوفان میں کشتی کھینے کی امید باندھی تھی۔

اٹھ اور اس پستی و ذلت کو فنا کر دے   حسنِ حریتِ ایماں کو دوبالا کر دے
یوں علَم روشنیِ طبع کا اونچا کر دے   کہ زمانے کے اندھیرے میں اجالا کر دے

بے خبر وقت کے طوفان میں کشتی کھے لے
اپنی کھوئی ہوئی میراث کو واپس لے لے

رہے وہ خیالات جو "سویت روس" "طلوعِ نو" اور "کارل مارکس" میں ظاہر کیے ہیں تو میرا خیال ہے کہ "ترقی پسند" دوستوں کے فیضِ صحبت سے کبھی ان کا بھی جی چاہا ہو گا کہ "ترقی پسند" بنیں مگر حضرت محمد مصطفےٰ اور ان کے اہل بیت کی محبت نے اس تعلیم کی طرف رجعت کرنے پر مجبور کیا جو تیرہ چودہ سو سال پہلے دی گئی تھی۔ سرورش صاحب کی اس "رجعت پسندی" نے بالآخر اشتراکیت پسندی پر فتح پائی اور وہ اپنی کھوئی ہوئی میراث کو پانے کی دھن میں لگ گئے اور یہ دھن آخر دم جاری رہی۔ اب یہ فیصلہ قارئین پر ہے کہ سرورش صاحب کارل مارکس کی ناخدائی کے قائل تھے یا آنحضرتؐ اور ان کے اہل بیت کی رہبری کے۔

سرورش صاحب کی نظموں کا دامن بہت پھیلا ہوا ہے۔ ان میں شیکسپیئر کی ایک نظم کا ترجمہ بھی ملتا ہے اور بچوں کے لیے "شیر" "گائے" "اونٹ" "ہاتھی" "کتا" "بلی" وغیرہ پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ تہنیت و تعزیت پر کئی نظمیں ہیں۔ کچھ سہرے ہیں۔ ایک آدھ منظوم خط ہے۔ نعتوں اور منقبتوں کے

علاوہ سلام اور نوحے بھی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اوراق رومانی نظموں کے حصے میں آئے ہیں۔ ان میں سے آخری دور کی ایک نظم "نینی تال سے واپسی پر" ہے۔ ۱۹۶۰ء میں سروش صاحب کچھ دنوں کے لیے نینی تال آئے تھے میں بھی وہاں تھا۔ اکثر ملاقات رہتی تھی واپسی پر مجھے یہ نظم بھیجی۔ اس کی پرکیف تخیلی پرواز اور زورِ بیان کا لطف اٹھانا ہو تو پوری نظم پڑھنی چاہیے میں ترغیب دلانے کے لیے کچھ شعر لکھتا ہوں۔

رقص گاہوں کا نگاہوں میں سماں لے کے چلے دل میں تصویرِ جہانِ گزراں لے کے چلے
آنکھ میں مستیِ سودائے شبِ گیسوئے حور رخ پہ موجِ نفسِ ماہوشاں لے کے چلے
موجِ رنگِ شفقِ عارضِ شعلہ رویاں آب و تابِ نظرِ زہرہ وشاں لے کے چلے
جنتِ شیوۂ دلداریِ چشمِ خوباں بوئے انفاسِ مسیحا نفساں لے کے چلے
جرسِ وقت کے بجتے ہوئے سناٹے میں نوبہ نو قافلۂ عمرِ رواں لے کے چلے
گنگناتے ہوئے چشموں کی رسیلی غزلیں آبشاروں کی دل افروز زباں لے کے چلے
لے کے آئے تھے دلِ سادہ و پرامنِ سروش شورشِ فتنۂ محشر روشاں لے کے چلے

مقطع سے پہلے شعر میں انھوں نے از راہِ محبت میرا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کو نقل کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس فیض کی طرف انھوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے وہ ویسا ہی خیالی اور غیر حقیقی ہے جیسے اس نظم کے "نفسِ ماہوشاں"۔ "بوئے انفاسِ مسیحا نفساں"۔ "شورشِ فتنۂ محشر روشاں" وغیرہ۔ یہ کہہ دینے کے بعد وہ شعر لکھ دینے میں چنداں مضائقہ نہیں۔

ابرِ کہسار کے مانند زہے فیضِ حبیب روح میں ولولۂ عزمِ جواں لے کے چلے

سروش صاحب نے رباعیاں اور قطعات بھی کہے ہیں مگر شاذ۔ ان کے یہاں چند مزاحیہ نظمیں بھی ہیں چونکہ وہ منظرِ عام پر لانے کے لیے نہیں کہی گئی تھیں اس لیے انھیں پردۂ خفا ہی میں رہنے دینا مناسب ہے۔ چند رباعیاں درج کرتا ہوں۔

(۱)

تفریق کی بندشوں سے بیگانہ بن آزادِ حرم و دیر و بت خانہ بن
صد حکمت و آگہی جنوں پر صدقے رکھتا ہے جو کچھ بھی ہوش دیوانہ بن

(۲)

افسانۂ عہدِ جوانی ہے ہے تسلیم وفا کی زندگانی ہے ہے
ہر جنبشِ دل میں نوکِ نشتر کی خلش ہر سانس میں خنجر کی روانی ہے ہے

(۳)

جو سمجھ نہ سکے وہ بات رہنے دیجے افسونِ تسلیات رہنے دیجے
منظور ہے مجکو عمر بھر کی خفگی اک آن کا التفات رہنے دیجے

شاعری کی زبان

سروش صاحب صحتِ زبان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی مشہور و معروف شعرائے عصر کے کلام کو بہ نظرِ غائر دیکھنے کے بعد زبان کی بہت سی غلطیاں تلاش کی تھیں اور افسوس کرتے تھے کہ شہرت کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی وہ لوگ الفاظ کے استعمال میں محتاط نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہر شاعر کو اپنے کلام کو دشمن کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ جب انھوں نے میرے کلام پر تبصرہ کر کے آج کل میں شایع کرایا اور میں نے انھیں لکھا کہ جتنی تعریف انھوں نے کی ہے میرا کلام اس کا مستحق نہ تھا اس لیے خیال ہوتا ہے کہ بربنائے محبت تعریف میں غلو سے کام لیا ہے تو جواب میں انھوں نے فرمایا

"اس تنقید نگاری میں ذاتی محبت کو قطعاً دخل نہیں ہے۔ میں شعر کو دشمن کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوں اور آپ کا کلام اس نگاہ کی زد سے بچا نہیں ہے خوشی ہوتی ہے کہ ماشاء اللہ حقیقتاً معائب سے پاک ہے اور مضمون لکھنے میں محبت کیسی مروت تک کو قطعاً دخل نہیں دینا پڑا..."

ظاہر ہے کہ جو زبان کی صحت کا انتہائی خیال رکھے اس کے یہاں غلطیاں کیونکر ہوں گی۔ سونے میں سہاگہ یہ کہ وہ جناب اثرؔ لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ جو کاغذات میرے سامنے ہیں ان میں اثرؔ صاحب کی کچھ اصلاحیں بھی شامل ہیں۔ چند اصلاحیں نمونے کے طور پر لکھتا ہوں جو نظم "محبت کے مزے" کے اشعار پر دی گئی ہیں

سروش۔ دل پہ اب تک نقش ہیں پہلی محبت کے مزے وہ گلے ملنے کی لذت اور وہ فرقت کے مزے
اثرؔ۔ " " " " " " عیش و راحت کے مزے
سروش۔ ایک کا فرِ ارتباطِ باہمی کے باوجود روح اور دل کے حسینِ عزمِ اظہارِ کے مزے
اثرؔ۔ اتنے بیباک ارتباطِ باہمی کے باوجود " " حلوے کے ساتھ زحمت کے مزے
سروش۔ حسن سر تا پا حجاب و عشق سر تا پا نگاہ پھر بھی پردے میں دو کشف و کرامت کے مزے
اثرؔ۔ " " " بحرِ اضطراب " " " " "
سروش۔ اک بجلانے مروت آشنا احوال میں شہرِ بیماری و شورِ عیادت کے مزے
اثرؔ۔ " " حقیقت آشنا " " " " " "

سرؔوش۔ وہ حقیقت میں تو شامل شوخ افسانوں کا رنگ اور افسانوں میں وہ رنگیں حقیقت کے مزے
اثرؔ 〃 〃 بھی 〃 〃 〃 〃 بھی 〃 〃

سرؔوش صاحب نے بہت سی خوب صورت ترکیبیں ایجاد کی ہیں۔
مثلاً کاکلِ شب تاب، چشمِ سخن ساز، دولتِ مسرت، رگیسو، خوشش گلہائے نوازش، شوقِ دامن گیر، چشمِ لالہ ساماں، عشقِ زیاں طلب، اتفاقِ شعبدہ پرداز، نطقِ گوہر بار، آتش کدہ بدوش، سازِ بے آواز، ناخنِ مضراب غم، طبعِ نکتہ گیر، تلخیٔ نابِ گوارا، لعلِ حیلہ ساز، رقصِ دوامِ جستجو، جحیمِ بداماں حسرتِ آتش بجاں، کنجِ سمن پوش، برہمِ فگنِ سلسلہ، جہانِ کشتیٔ تمنا، فردوسِ مراد، آبشارِ نور، خطاباتِ جمیل، شہپرِ دقت، محکومِ تعطل، مجبورِ جمود، نیشِ ضمیر، گوہر طرازی، خود سپاری، عربدہ پرداز، سیمِ سیال۔

ان کو زیادہ تر نظموں میں استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں کی زبان عموماً پرشکوہ ہے جیسا کہ نظم "حیات" اور "نینی تال سے" دیسی پر کے اشعار سے جو نقل کیے جا چکے ہیں ظاہر ہوا ہوگا۔ ابتدائی غزلوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک ہے۔ جیسے

سوادِ جہل، ظلماتِ ستم، شامِ سیہ بختی
جہاں بھی تیرگی دیکھی چراغاں کر دیا ہم نے

حسنِ بیگانہ تماشا ہے حجاب اندر حجاب عشقِ حیرت آشنا آغوش در آغوش ہے
وہ عدوئے جان و دل دم بھر کو ٹھہرا تھا فقط آج تک آغوش خمیازہ کش آغوش ہے

یہ شکوہِ لفظی نظموں میں تو آب و تاب پیدا کرتی ہے مگر غزل کی نزاکت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ سرؔوش صاحب اس راز سے واقف تھے۔ ان کی آخری دور کی غزلوں کی زبان نہایت سلیس و سادہ ہے۔ چند شعر سہل ممتنع میں ملاحظہ کیجیے۔

ہم ملامت کے بھی قابل نہ رہے ایک تم کیا کہ سبھی بھول گئے
لطف پیہم کہاں سرؔوش کہ اب بھولے بسرے نگاہ ہوتی ہے
ضبط کرتے نہ بنے اشک بہائے نہ بنے دل میں وہ آگ لگی ہے کہ بجھائے نہ بنے
کسی کی یاد ہے اور قلبِ مضطر قیامت خیز تنہائی کے دن ہیں
کسے سمجھا رہا ہے تو بھی ناصح ارے ناداں یہ خود رائی کے دن ہیں
شعلہ زاروں میں گھر بناتے رہے اور پھولوں میں آشیاں سمجھے
تھا میسر عتاب بھی کس کو جب وہ بگڑا تو مہرباں سمجھے
کل جو تسلی اس نے دیدی آج طبیعت اور حزیں ہے
جس کو دیکھو چلا ہے سمجھانے جس پہ بیتے اسی کا دل جانے

بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ابھی لکھنے کے لیے ان کے یہاں بہت کچھ ہے۔ مگر بہ خوفِ طوالت اس دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ خدا کرے ان کا کلام یا انتخابِ کلام بہت جلد شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کرے جس کا وہ ہر لحاظ سے مستحق ہے۔



بڑی طاقت

اوج یعقوبی

بڑی طاقت، بڑے رقبے کے ملکوں کو نہیں کہتے
بڑی طاقت
نئے ہتھیار کے انبار خانوں کو نہیں کہتے
بموں کو، آہنی توپوں، دبابوں کو نہیں کہتے
بڑی طاقت فقط جرّار فوجوں کو نہیں کہتے
خلاء میں راکٹوں کی دوڑ مستحسن ترقی ہے
بشر کے ہاتھ رخسارِ قمر کو چھو کے آئے ہیں
ہوا کے دوش پر حدّ نظر کو چھو کے آئے ہیں
بہ فیضِ جہدِ پیہم کل فلک کو زیر کر لیں گے

یہ ممکن ہے:
سرِ گردوں نشانِ نصرت و تسخیر لہرائے
یہ ممکن ہے:
زمیں کا آدمی افلاک کی تقدیر بن جائے
یہ سب تسلیم ہے مجھ کو
یہ فاتح، سائنس کی رو سے ترقی یافتہ ہوں گے
مگر میری زباں اُن کو بڑی طاقت نہیں کہتی
بڑی طاقت روا داری میں پنہاں ہے
محبّت، پیار، غم خواری میں پنہاں ہے
روابط، دوستی، یکجہتی ملنساری میں پنہاں ہے

بڑی طاقت:
اہنسا، آشتی، اقدارِ انسانی
ہم آہنگی، بقائے باہمی، اخلاص، یک جہتی
اگر بھارت نواسو! تم میں یہ جوہر نمایاں ہوں
تو پھر لکھ لو کہ سب سے بڑی طاقت ہو دنیا کی
توانائی کے معنی اتحاد و ربط باہم ہے
یہ جوہر پاس ہو جس کے وہ شکتی ہے، وہ ایٹم ہے!

ماگھ ۱۸۸۸ شک

غزل

ہنا ار لکھنوی

جو ہم تجدیدِ تعمیرِ وطن کی بات کرتے ہیں
فروغِ جادۂ دار و رسن کی بات کرتے ہیں
پئے تعمیرِ نو عہدِ کہن کی بات کرتے ہیں
سمجھ کر ہم شعورِ انجمن کی بات کرتے ہیں
ہوائے انقلاب! اِک آدھ جھونکا ان کی جانب بھی
ابھی کچھ کم نظر ترکِ وطن کی بات کرتے ہیں
قفس آئینہ ہے اپنی شکستِ عزم و ہمت کا
ہمیں دیکھو کہ ہم اب بھی چمن کی بات کرتے ہیں
نظر سے دل کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا
بڑی حسرت سے ہم دار و رسن کی بات کرتے ہیں
میں جس پتھر کو ٹھکرا دوں وہ جوئے شیر بن جائے
یہ ناداں مجھ سے عزمِ کوہ کن کی بات کرتے ہیں
یقیناً بجھ گئی شمعِ سماعت ان غریبوں کی
جو اکثر اپنے ہی وعدہ شکن کی بات کرتے ہیں
ہمیں دو چار شاید سر پھرے رہ جائیں گے زمانے میں
بہ ایں حالِ زبوں جو بانکپن کی بات کرتے ہیں
تمھیں اے ناصحو! قطعاً غلط فہمی ہوئی ہوگی
کہیں اہلِ محبّت مکر و فن کی بات کرتے ہیں

۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء

غالب اور قفلِ ابجد

آفتاب اختر

مرزا غالب بادہ خوار تھے۔ بادہ خوار نہ ہوتے تو ولی ہوتے۔ وہ ولی نہ تھے پھر بھی تصوف کے مسائل کو اپنے مخصوص اندازِ بیان سے دلچسپ ضرور بنا دیا ہے۔ اُن کی بادہ خواری رنگ لائی اور انھیں پورا مسلمان نہیں بننے دیا۔ وہ اگر مے خواری کے عادی نہ بھی ہوتے تب بھی وہ رہتے آدھے مسلمان ہی۔ وہ تاحیات آدھے مسلمان رہے اور کسی طرح پورے ولی نہ بن سکے۔ اس طرح اُن کی شخصیت منفی رُخ اختیار نہ کر سکی اور کوکنار ردگی سے محفوظ رہ گئی۔

غالب کی شخصیت اور اُس کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی اُن کی شاعری محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان ہفت رنگ ہے۔ س کے قوسِ قزحی انداز کا ادراک حاصل کرنے کے لیے "حلقۂ صد کام ہنگ" سے بچ کر نکلنا احتیاطاً ضروری ہے۔ اُن کی شاعری اور نخصیت کے "ہفت خواں" کو سر کر لینے کے بعد ہی یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ انھوں نے "رہینِ ستم ہائے روزگار" رہنے کے باوجود "اندیشہ ہائے و رودراز" میں مبتلا رہنے کا جو انداز سیکھ لیا تھا اُس نے انھیں ترومیوں میں گھرے رہنے کے باوصف قناعت پسند بھی بنا دیا تھا۔ س لیے وہ دنیادار ہونے کے باوجود سفلہ پن سے بچے رہے۔ وہ دنیادی رہوں' خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مدح و ثنا کے شغل سے تھ تو نہ کھینچ سکے پھر بھی کشتۂ آلام بنانے والوں اور ستمگروں کی ہجو پر نا بیعت کو مائل نہ کر سکے۔ انھیں باعزت زندگی گذارنے کے لیے دربارِ مغلیہ' سرکارِ انگلیشیہ اور امیرزادوں تک کی مدح و ثنا کے لیے مجبور ہونا پڑا لیکن امن و سکون کے دروازے اُن پر بیشتر بند ہی رہے۔ آلام و ستم کی پیہم یورشیں ہوتی ہی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں زندگی بھر ناقدریِ زمانہ اور بے مہریِ ایام کا شکار رہنا پڑا۔

زمانے کی ناقدری کچھ غالب ہی کے لیے مخصوص نہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں ہر ذہین شخص کو ناقدری کا شکار رہنا پڑا ہے۔ دنیا کے اس پُرانے دستور سے کون واقف نہیں۔ اچھوں کو بُرا کہنے کی عادت تو بہت پُرانی ہے۔ عہد ساز شخصیتوں کو ہمیشہ ہی خونِ جگر پینا پڑا ہے۔ ہر نئی آواز کو ٹھکرایا گیا ہے۔ عربی گھوڑوں کے بجائے گدھوں کی گردن میں طوقِ زرّیں کس دور میں نہیں ڈالے گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کی عظیم شخصیت کو ذلیل و خوار اور رسوا سرِ بازار ہونا پڑا ہے۔ اس لیے اگر غالب کو محرومیوں' نامرادیوں اور ناکامیوں سے واسطہ رہا تو اس میں نئی کون سی بات تھی؟

غالب بلاشبہ ذہین تھے۔ صرف ذہین ہی نہیں بلکہ نابغۂ عصر تھے۔ ایسے جینیس جو شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے اُن کی آواز اُن کے عہد میں اجنبی رہی۔ اگر اُن کے عہد میں اُس آواز کو سمجھا نہ گیا تو اس میں اُن کے عہد کا بھی کیا قصور؟ آخر انھوں نے انفرادی تجربات و مشاہدات کو جدیدیت کے انداز میں پیش ہی کیوں کیا؟ آخر انھیں کیا سوجھی تھی کہ اپنی شاعری میں اشاریت کی بجلیاں بھر دیں؟ آخر تجریدی فن اور اشاریت

کے پُل صراط سے گذرنے کے لیے انھیں کس نے اُکسایا تھا؟ آخر قطرے گہر ہونے تک کی داستانوں کی تفسیر پیش کرنے کے لیے انھیں کس نے مجبور کیا تھا؟ جہاں ہر ہر قدم پر اجنبی بن جانے اور ٹھکرائے جانے کا احتمال رہتا ہے۔ جہاں تندیِ صہبا سے آبگینے اکثر پگھل بھی جاتے ہیں۔ غالبؔ کو سمجھنے کے لیے اُن کی شخصیت کے "قفل ابجد" کے مخصوص کوڈ سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔ اُن کی محرومیوں، ناکامیوں اور حسرتوں کے ساتھ ساتھ اُن کی فتح مندیوں، کامرانیوں، کوششوں اور خوشامدوں کی "ابجد" کا مطالعہ کیے بغیر اُن کی شاعری وفن اور عظمت وذہانت کے بحرِ بیکراں میں شناوری ناممکن ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ غالبؔ پر کسی آخری رائے کا اظہار ممکن نہیں۔ اُن کی تہہ در تہہ شخصیت کا ادراک آخر ممکن بھی ہو تو کیوں کر؟ ایک طرف تو وہ اس امر کی تردید کر چکے ہیں کہ وہ "گل نغمہ" اور "پردۂ ساز" نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ راہ نمائی کے بجائے راہ گُم کرنے کے لیے کافی ہے۔ کیوں کہ اگر اُس کی بنیاد پر انھیں شکست خوردہ مان بھی لیا جائے تو پھر شکست خوردگی کے آثار کی تلاش کچھ آسان نہیں ہے۔ شکست خوردگی کے احساس کے بطن سے ظہور میں آنے والی قنوطیت تو بعد از سعیِ بسیار مفقود نظر آتی ہے۔ غالبؔ کے یہاں "میر" والی قنوطیت تو نظر نہیں آتی پھر "فانی" والی قنوطیت کی تلاش تو سعیٔ لاحاصل ہی ہے۔ اگر غالبؔ کو اُن کے بعض اشعار کی بنیاد پر شکست خوردہ ذہنیت کا عکاس مان بھی لیا جائے تو وہ رجائیت کے عطر میں اس درجہ بسی ہوئی ہے کہ اُسے جداگانہ حیثیت کے روپ میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔

غالبؔ پر کیا کہا جائے اور کیا نہیں۔ اس موقع پر قوتِ انتخاب جواب دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کیا یہ کہنا مناسب ہے کہ وہ محض شوخیِ داغِ کہن کے گل فروش تھے؟ یا وہ خارِ بیاباں پر پڑے ہوئے ایک قطرۂ شبنم تھے؟ یا یہ کہ شاہراہِ ہستی پر چلنے سے وہ آبلہ پا ہو گئے تھے؟ بظاہر ان کے بارے میں ان آرا سے اختلاف کی گنجائش نہیں لیکن اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے مے خانۂ جنوں پر کاسۂ گردوں خاک انداز بھی ہو گیا تھا۔ وہ قطرۂ شبنم تو تھے لیکن زحمتِ مہرِ درخشاں پر وہ قطرہ لرز بھی اُٹھتا تھا۔ وہ لاکھ آبلہ پا سہی لیکن راہ کو پُر خار دیکھ کر اُن کا جی خوش تو ہوا کرتا تھا ملول نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ صرف رندِ شاہد باز اور بادہ گُسار بھی نہ تھے۔ وہ کچھ بھی نہ تھے اور سب کچھ تھے۔ اِسی سب کچھ ہونے نے تو اُنھیں ڈبو دیا اور نہ ہونے کی شکست خوردگی نے "میں کیا ہوتا" کی حسرتِ تعمیر میں مبتلا کر دیا۔ اسی ہونے اور نہ ہونے، شکست خوردگی اور حسرتِ تعمیر کی کشمکش میں مبتلا ہو کر وہ اپنی صحیح منزل کو پہچان نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر رہرو کے ساتھ تھوڑی دیر چلنے کے تجربات سے گذرتے رہے۔ منزل کی جستجو میں مختلف رہرووں کے ساتھ سفر ہی کی وجہ سے تو انھیں شدائدِ روزگار میں گھرا رہنا پڑا۔ اِسی چکر میں گرفتار ہو کر ہی تو اُنھیں سو پشت سے چلے آنے والے اپنے آبائی پیشے، فنِ سپہ گری کو ترک کر کے شاعری اختیار کرنا پڑی اور آخر دم تک پیرِ تسمہ پا کی طرح وہ اُن سے چمٹی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسی شاعری کی بدولت شہرت ومقبولیت کی بلندیوں پر پہنچے لیکن صرف اُسے ہی ذریعۂ عزت سمجھنے سے ہمیشہ کتراتے ہی رہے۔

دراصل غالبؔ کو اسی "ہونے" اور "نہ ہونے" کی کشمکش نے تا حیات دست افشاں اور پا در رکاب رکھا۔ ایک طرف فنِ سپہ گری سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود وہ اسے اپنا نہ سکے اور دوسری طرف وہ اپنی شاعری میں تیغ زنی کے جوہروں کو دکھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی شاعری کی بُرِش سے خود ناآشنا رہے اور شاہدۂ حق کی گفتگو کے لیے دشنہ وخنجر کو لاکھ لاکھ آزمانے کے بعد بھی اپنے خلاف ہونے والی سازشوں، زیادتیوں، ناقدریوں اور بے مہریوں کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ پھینکنے میں قطعی ناکام رہے۔

غالبؔ کی شخصیت احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کے درمیان نشوونما پا کر اُبھری تھی۔ وہ زندگی بھر اسی نفسیاتی بھنور میں گردش کرتے رہے۔ اسی لیے تو وہ ایک طرف اپنے کو "عرضِ نیازِ عشق کے ناقابل"، "سرمۂ مفتِ نظر" اور "شمعِ کشتہ" سمجھتے رہے اور اپنے کو "درخورِ محفل" سمجھنے سے گریز کرتے رہے، تو دوسری طرف اُن کے ذہن پر "ہم سا کوئی پیدا نہیں ہوا" کا احساس ہمیشہ غالب رہا۔

غالبؔ میں برتری کا یہ احساس شدید قسم کے احساسِ کمتری کے ردِ عمل پیدا ہونے کے بجائے اس لیے پیدا ہوا تھا کہ وہ واقعیٔ قطرہ میں دجلہ اور جُز میں کُل دیکھنے کی مہارت رکھتے تھے اور دیدۂ بینا کے لیے باریک بینی و دروں بینی کو معیار گردانتے تھے۔

غالبؔ کے اسی احساسِ برتری نے اُن کے ذوق کو اس درجہ بلند کر دیا تھا، اتنا نکھار دیا تھا، شدتِ احساس کی اتنی گرمی پیدا کر دی تھی کہ وہ "جلوۂ گُل" سے "ذوقِ تماشا" حاصل کرنے کی پاکیزگی کے مالک ہو گئے تھے اور "موجِ گل" سے اُن کی ناک میں دم آجاتا تھا۔ اسی احساسِ برتری نے بندگی میں اُنھیں اتنا آزاد و خود دار و خود بیں بھی بنا دیا تھا کہ وہ درِ کعبہ کو اپنے استقبال میں کھلا نہ دیکھ کر اُلٹے پھر آتے تھے۔ وہ اسی جذبہ کے تحت دنیا کو "بازیچۂ اطفال" اور "اورنگِ سلیماں" کو ایک کھیل سمجھنے لگے تھے۔ یہی نہیں کار وبارِ دنیا اُن کی نگاہ میں محض ایک تماشا ہو کر رہ گیا تھا اور "اعجازِ مسیحا" کو وہ ایک بات سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ اس نفسیاتی پیچیدگی کے زندگی بھر شکار رہے۔ اُن کے یہاں پائے جانے والے احساسِ برتری اور احساسِ کمتری کی کشمکش نے اگرچہ انھیں "حریفِ مے مرد افگنِ عشق" ہونے کا برابر احساس دلایا تاہم "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" ہونے کے احساس سے وہ پیچھا نہ چھڑا سکے اور یہ احساس مختلف گوشوں سے کسی نہ کسی شکل میں برابر اُبھرتا ہی رہا۔

عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہونے کے احساس نے اگرچہ غالبؔ کے دل میں شدتِ غم کے موج در موج طوفان پیدا کر دیے تھے پھر بھی انھوں نے "برق کی عبادت" سے ہاتھ نہ کھینچا۔ اس لیے حاصل کا افسوس انھیں کرنا ہی نہ چاہیے تھا۔ لیکن وہ اپنی انسانی فطرت سے مجبور ہو کر ساقی سے اُس کی بے رُخی کا گلہ برابر کرتے رہے اور اپنے "گدائے بے سروپا" ہونے کا برابر یقین بھی دلاتے رہے۔

ساقی اگر بدلتے نہ رہتے تو شاید انھیں کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا ہی رہتا لیکن اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ جب بھی وہ کسی ساقی کو رام کرنے کی منزل پر پہنچتے، ساقی بدل جاتا اور انھیں نئے سرے سے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری کرنا پڑتا۔ اِس لیے اُن کے ہاتھ سوائے محرومیوں کے کچھ اور نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر انھوں نے پریشانیوں سے مفر حاصل کرنے کے لیے اور بندِ غم سے پیچھا چھڑانے کے لیے قیدِ حیات سے آزاد ہو جانا چاہا اور مرنے کی سنجیدگی سے ترکیبیں بھی کیں لیکن کامیابی انھیں اس میں کبھی نہ ہو سکی۔ وہ مرنے کی خواہش کے باوجود خودکشی تک نہ کر سکے۔ اس لیے نہیں کہ وہ بزدل تھے یا خودکشی کو حرام موت سمجھتے تھے۔ وہ خودکشی شاید اس لیے نہ کر سکے کہ انھوں نے "قیدِ حیات" اور "بندِ غم" کے دائمی گٹھ جوڑ کا راز پا لیا تھا اور ہجومِ غم میں بھی مسکرانے کی خو ڈال لی تھی۔ انھیں زندگی کی کشاکش سے چھوٹنے کا احساس تو رہا لیکن اس احساس کو وہ ایک نفس سے زیادہ ٹھہرا نہ سکے۔ اسی لیے وہ برق سے شمعِ ماتم خانہ روشن کرتے رہے اور "فانی" بننے سے بچ گئے۔ اُن پر تاریکی اور موت کا جتنا غلبہ ہوتا اُسی قدر برق بلا کی وہ قدر کرنے لگتے۔

غالبؔ کی شخصیت اور اُن کا فن بحرِ ذخار کی مانند ہے۔ اُن کی آگاہی و بصیرت، اُن کی عقل و فہم، اُن کی ذہانت و ذکاوت اور فطانت حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی شخص اس بحرِ ذخار میں دیدہ و دانستہ شناوری کی ہمت کرے تو کیوں کر؟

غالبؔ ہمہ صفت شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود ایک بدقسمت انسان بھی تھے۔ ایسے بدقسمت جنھیں زندگی بھر ناکامیوں سے کام رہا، جنھیں تاحیات فکرِ معاش اور غمِ شہرت و عظمت کی آگ میں جلنا پڑا، جنھیں ہمیشہ "ماتمِ یک شہرِ آرزو" میں مبتلا رہنا پڑا اور "گورِ غریباں کا چراغِ مُردہ" بن کر جینا پڑا، جن کا دل آخر وقت تک لاکھوں خون گشتہ آرزوؤں کا مدفن بنا رہا۔

غالبؔ واقعیٔ بدقسمت تھے کیونکہ بزمِ مے میں انھیں تشنہ کام رہنا پڑا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ آدابِ میخواری سے ناواقف تھے یا کم ظرف واقع ہوئے تھے۔ انھیں تشنہ کام محض اس لیے رہنا پڑا تھا کہ زمانے نے انھیں پہچاننے میں بے حد بخل سے کام لیا اور انھیں زمانے کی اسی بے اعتنائی کے سبب اپنی تمام اہلیتوں کے باوجود "انتظارِ ساغر" کھینچنا پڑا تھا۔ ناقدری زمانہ نے اُن کی یہ حالت کر دی تھی کہ فقیروں کا بھیس بنا کر انھیں "تماشائے اہلِ کرم" تک دیکھنے

کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اُنھوں نے اگر طبع خریدار دیکھ کر اپنی متاعِ سخن کے ساتھ خود بھی فروخت ہو جانا چاہا تب بھی انھیں کوئی ایسا قدر دان نہ مِل سکا جس کے طفیل رات دن کی انھیں وہ فرصت نصیب ہو جاتی جس میں وہ صرف "تصوّرِ جاناں" کیے بیٹھے رہتے۔

بدقسمت وہ اس لیے بھی تھے کہ بنیادی طور پر فارسی کا شاعر ہونے کے باوجود بحیثیت فارسی شاعر اُن کی اتنی بھی قدر افزائی نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ فارسی دانوں نے انھیں وہ درجہ بھی نہیں دیا جو اُن سے گھٹیا درجے کے شعراء کو وہ دے چکے تھے۔ اس لیے انھیں اُردو جیسی نئی زبان کی طرف ملتفت ہونا پڑا جہاں خود ساختہ عظیم شخصیتوں نے اُنھیں مہمل گو ٹھہرا کر زندہ درگور کر دیا، جس کے سبب انھیں ستائش کی آرزو اور صِلہ کی تمنا تک سے دست بردار ہو جانا پڑا تھا۔

غالبؔ کو اُن کی تمام ناکامیوں، نامرادیوں اور بدنصیبیوں کے باوجود خوش قسمت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اِن کی قسمت نے یہ نیا رُخ اُن کی وفات کے بعد اختیار کیا۔ غالبؔ کو خوش قسمت اس لئے نہیں کہا جا رہا ہے کہ انھیں زندگی کی تمام نعمتیں حاصل ہو گئی تھیں یا زمانے نے اُن کی قدر کرنا سیکھ لیا تھا یا کم رتبہ شاعروں نے شہ کا مصاحب ہونے کی وجہ سے اِترانا چھوڑ دیا تھا یا زندگی ہی میں اُن کی پرستش شروع ہو گئی تھی۔ خوش قسمت دراصل وہ تھے نہیں۔ اگر ہوتے تو وصالِ یار کے لیے انھیں بے انتہا پاپڑ نہ بیلنا پڑتے۔ خوش قسمت تو وہ اب نظر آتے ہیں۔ اس بیسویں صدی میں۔ انیسویں صدی میں جھانکیے تو اسداللہ خاں "مغلوب" نظر آئیں گے "غالب" نہیں۔ مگر آج وہ "غالب" ہی نظر آتے ہیں۔ آج انھیں بے انتہا شہرت و عزت حاصل ہو گئی ہے۔ آج اُن کے حریفوں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ آج وہ دربار مٹ چکے ہیں جہاں ان کی قدر نہیں ہوئی، جہاں انھیں "نوازش ہائے بیجا" کا چلن دیکھ کر "نگاہِ بے محابا" کا طلبگار رہنا پڑتا تھا۔ آج وہ ذہنیت ختم ہو چکی ہے جو انھیں مہمل گو سے زیادہ اہمیت دینے پر آمادہ نہ ہو سکی تھی۔ آج وہ روایتیں وقفِ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں جو انھیں رہ رہ کر موتیوں سے منھ بھر جانے کی داستانوں کی یاد دلا کر انھیں اپنی بے مہری قسمت کا گِلہ کرنے کے لیے موزوں اشخاص کے انتخاب اور تلاش و جستجو پر اکسایا کرتی تھیں۔ آج غالبؔ کے وہ دوست بھی زیرِ خاک ہو چکے ہیں جو چارہ سازی اور غم گساری کے بجائے صرف ناصح کا فرض انجام دیتے تھے۔ وہ محفلیں یقیناً دم توڑ چکی ہیں یا اگر کچھ باقی بھی ہیں تو وہ آخری سانسیں لے رہی ہیں جہاں سے بوئے گل، نالۂ گل اور دودِ چراغِ محفل کو پریشاں حال نکلنا پڑتا تھا۔ جہاں جلوۂ گل سے چراغاں ہوتا تھا اور عرش سے فرش تک موجِ رنگ کا طوفان موجزن رہتا تھا۔ لیکن غالبؔ کی مژگاں پر قطرہ ہائے خون کی شمعیں ہی فروزاں رہتی تھیں اور انھیں ایک ایک قطرہ کا حساب دینا پڑتا تھا۔

غالبؔ کی شخصیت کے مندرجۂ بالا نشیب و فراز، محرومیوں اور ناکامیوں کے زیر و بالا خطوط، نفسی پیش رفت و باز رفت، نا آسودگی و آسودگی کے مد و جزر اور عکس و روشنی کے عمل نے اُن کی شاعری میں بلا شبہ آصفی امام باڑہ کی بھول بھلیاں کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس لئے غالبؔ کے فن کا مطالعہ کرنے کے لیے اور اس کی شخصیت کے "قفلِ ابجد" کو کھولنے کے لیے اس کے مخصوص کوڈ سے واقفیت انتہائی ضروری ہے۔ جب تک اسے اپنا گائیڈ نہ بنایا جائے گا اس وقت تک اس کی شاعری کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہنا ہی مقدر رہے گا اور صحیح راستے کی دریافت ممکن نہیں ہو گی۔



میرا کشمیر



علامہ خضر برنی

واہ! کیا شہر نگاراں میں ہے ترئینِ بہار
اپنی پاکیزہ ودیعت میں شگفتہ گل زار
حسنِ فطرت کا دمکتا ہوا رنگیں شہ کار
ایسے گل ریز مناظر ہیں بھلا اور کہیں؟
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

حسن میں ڈوبے ہوئے باغ ہیں تصویرِ جمال
ٹہنیاں سرو کی ہیں مرمریں بانہوں کی مثال
نغمہ و شعر کے سانچے میں ڈھلے ہیں خد و خال
گنگناتی ہوئی وادی ہے کہ یہ ماہ جبیں!
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

رشکِ فردوس ہے کشمیر کا گوشہ گوشہ
ستہ پر وسہ ہے ہر اک سرد ہوا کا جھونکا
جھومتی گاتی مچلتی ہوئی ساون کی گھٹا
ایسا لگتا ہے کہ ہے رقص مرا اک ماہ مبیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

اک حسیں ڈل ہے کہ پھیلی ہوئی چاندی کی گھاٹ
ہیں سرِ آب جہاں تخت نشیں چار "چنار"
جلوہ افروز ہیں رنگین شکاروں کی قطار
بہتے پانی میں مکاں دیکھیے تا حدِ یقیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

عرش اور فرش کا ماحول برنگِ عناب
نور کی شال میں لپٹا ہوا نوخیز شباب
چودھویں رات کا اٹھلاتا ہو جیسے مہتاب
جیسے شہ زادہ کسی ملک کا ہو تخت نشیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

صبح پُرنور و منور ہے مجلّے ہر شام
کسی گلرو کی جوانی کا چھلکتا ہوا جام
شیخ بھی دیکھے تو ہو جائے گا محوِ اصنام
رند و صوفی کے تقاضوں کی ہے تکمیل یہیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

برف کی شال میں لپٹے ہوئے پربت ہیں یہاں
رنگ و رعنائی کا ہر سمت ہے اک سیل رواں
رشکِ مے خانہ نظر آتی ہے ہر سو رقصاں
اس کی ہر صبح حسیں شام حسیں رات حسیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

دیدنی صفحۂ پستی پہ بلندی کی نظر
سینۂ کوہ پہ بل کھاتی ہوئی راہ گزر
سامنے جس کے ہو خود زلفِ پریشاں ششدر
سلسلے سرو کے دو رویہ سرِ فرشِ زمیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

شہ جہاں نے جسے تزئین کیا دیکھ کے خواب
کیسے گل مرگ کی خوبی کا کوئی لائے جواب
میرے ہر دل کا وطن ایسی ہے دل چسپ کتاب
اس کے افسانوں کا عنوان ہے ہر طور حسیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

تھا یہی باغ کبھی جلوہ گہِ نور جہاں
جس پہ نثار کیا کرتے ہیں قربان دل و جاں
چشمِ بد دور، یہ ہے گل کدۂ لالہ رخاں
شوقِ تعظیم میں ہر فرد کی جھکتی ہے جبیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

کیسے صناعیِ قدرت کی ہو توصیف رقم
نکہتِ گل کا تقدس ہے بہاروں کا بھرم
حسنِ فطرت کے مچلتے ہوئے چشموں کی قسم
میرا گلشن ہے بہر طور محبت کا امیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

سجدۂ شکر ادا کرتی ہے گل مرگ کی شام
ہر مسافر کو بجا لاتی ہے ہر شاخ سلام
اس پہ اللہ کی رحمت کا ہوا ہے انعام
قومی یک جہتی کا درس ہے سنگم بھی یہیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

یہ وہی وادی ہے جس پہ کہ ہے عالم شیدا
دیکھ کر جس کو ہوا کرتے ہیں ارماں پیدا
میرا ہے، میرا رہے گا، نہیں اس میں پردا
اس میں کچھ دخل کسی غیر کا ہرگز بھی نہیں
میرا کشمیر یقیں جانو کہ ہے خلدِ بریں

۲۶ جنوری ۱۹۶۶ء

ماگھ ۱۸۸۸ شک

ہندستانی سماج اور عورت

سیّد محمّد سعید

آزادی کے بعد ہندستان میں عورتوں کی حالت میں نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ ہمارے دستور نے انھیں ہر قسم کے سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق مساویانہ طریقے پر دیئے ہیں۔ عورتوں کی حیثیت میں اس تبدیلی کو سطحی طور سے اس سیاسی انقلاب کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے جس کی ابتدا ہندستان میں ۱۸۵۷ء سے ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کو موجودہ درجہ دلانے میں ایک طویل جد وجہد کرنا پڑی ہے اور اس تبدیلی کے لانے میں سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی قوتوں نے اہم رول ادا کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتیں ہمیشہ اسی پستی کی حالت میں رہیں اور ہندستانی سماج میں انھیں کوئی درجہ حاصل نہ تھا یا ان پر مکمل جمود طاری رہا۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر ہم تاریخ کا جائزہ لیں اور سنسکرت کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ قدیم ہندستان میں عورتوں کو سماج میں ایک خاص مقام حاصل تھا اور انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف علوم میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ رگ وید میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کو تعلیمی اعتبار سے مردوں کے برابر درجہ حاصل تھا۔ رگ وید میں کچھ ایسے منتر (سوکت) بھی ہیں جو اُن پارسا عورتوں سے منسوب ہیں جنھیں "رشیکا" (RISHIKA) اور "برہم وادنی" (BRAHMAVADINI) کہا جاتا تھا۔ ان میں "روماسا" (ROMASA) "لوپا مُدرا" (LOPA MUDRA) "کدرو" (KADRU) "اپالا" (APALA) "گھوشا" (GHOSHA) "اندرانی" (INDRANI) "یمی" (YAMI) "نودھا" (NODHA) "اکرشٹ بھاشا" (AKRISHTABHASHA) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

"برہم وادنی" (BRAHMAVADINI) کے لئے تجرد (برہمچریہ) کی تعلیم حاصل کرنا ضروری تھی۔ رگ وید اور اتھروید میں کہا گیا ہے لڑکیوں کو پہلے "برہمچریہ" کی تعلیم جو ایک پاکیزہ طالب علمانہ زندگی ہے حاصل کرنا چاہئے اور اس کے بعد ہی وہ اپنے شوہر کا انتخاب کر سکتی ہیں۔ ما... معاملات میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل تھے اور کوئی بھی مذہبی رسم بغیر عورتوں کی شرکت کے نامکمل تصور کی جاتی تھی۔ عام سماجی زندگی میں بھی عورتوں کو حصہ لینے کا پورا موقع حاصل تھا۔ رگ وید (RIGVED) میں فلسفیوں (PHILOSOPHERS) کی ایک ایسی کانفرنس کا ذکر ہے جو "راج رشی" (KING PHILOSOPHER) ودھا... نے بلائی تھی اور جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مختلف مذہبی نظریات، لوگوں اور فلسفیوں کے خیالات کو ایک باضابطہ تحریری شکل دی جائے۔ اس کانفرنس میں بہت سے فلسفی اور مذہبی نمائندے شریک ہوئے تھے جن میں ایک خاتون فلسفی "گارگی" (GARGI) نے بھی شرکت کی تھی اور انھوں نے بڑی بے تکلفی اور دلیری سے مرد فلسفیوں کے ساتھ مباحثہ میں حصہ لیا تھا۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قدیم ہندستان میں بھی عورتوں کو سماج میں ایک اہم مقام حاصل تھا اور ان کے حقوق کا مسئلہ وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ عورتوں کے مسائل دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ایک سے رہے ہیں اور قدیم یونان میں بھی جسے جمہوریت کا گہوارا کہا جاتا ہے عورتوں کو ایک "ملکیت" تصور کیا جاتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ افلاطون نے یہ لکھا تھا کہ "ریاست میں عورت و مرد کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہ ہونا چاہیئے۔" اُس نے عورت و مرد کو مساویانہ حقوق دینے کی پُرزور سفارش کی تھی اور ایسا نہ کرنا ریاست کے لئے ایک نقصانِ عظیم تصور کیا تھا۔ افلاطون کے بعد "مِل" (MILL) اور دوسرے مفکرین نے بھی اس نظریہ کی پُرزور حمایت کی تھی۔ "جان مِل" (JHON MILL) نے اپنی ایک کتاب "SUBJECTION OF WOMEN" میں عورتوں کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو مساویانہ حقوق دینے کی پُرزور تائید کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود سماجی رسم و رواج، جہالت، معاشی کمزوری اور کسی حد تک مذہبی پابندیاں یا یوں کہنا چاہیئے کہ مذہب کی اندھی تقلید نے عورتوں کی ترقی کی راہوں کو مسدود رکھا۔ یوں تو امریکہ، روس اور دوسرے مغربی ممالک ہندستان سے بہت پہلے ترقی کی راہوں پر گامزن تھے لیکن عورتوں کے حقوق اور مسائل کی طرف ان ترقی یافتہ ممالک میں بھی جلد توجہ نہ کی گئی۔ اس طرح سے عورتوں کی سماجی حیثیت کا مسئلہ نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا اور نسلِ انسانی کا مسئلہ بن گیا تھا۔

عورتوں کی ترقی کی راہ میں مذہبی پابندیاں ہمیشہ سے مانع رہیں اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی محرومیوں اور سماجی و معاشی مجبوریوں نے بھی عورتوں کی زندگی کو مفلوج کر دیا تھا۔ فرانس میں انقلابِ عظیم کے زمانے میں بھی عورتوں کی حیثیت کو بالکل نظر انداز رکھا گیا اور "آزادی، مساوات اور بھائی چارہ" (LIBERTY, EQUALITY, FRATERNITY) کے نعرے کا تعلق بھی صرف مردوں سے ہی سمجھا گیا۔ امریکہ میں بھی جب ۱۷۸۷ء میں دستور کے مرتب کرتے وقت عورتوں کے حقوق رائے دہندگی کا مسئلہ پیش ہوا تھا تو جیفرسن (JAFFERSON) نے اس کی شدید مخالفت اس وجہ سے کی تھی کہ اس کے نزدیک عورتوں اور مردوں کے مخلوط اجتماعات اور جلسوں سے اخلاقی اور نسلی زوال کے امکانات زیادہ تھے ۔۔۔۔

جاگیردارانہ طبقوں میں عورتوں اور مردوں کے درمیان یہ تعصب زیادہ واضح شکل میں پایا جاتا تھا۔ کیوں کہ جاگیردارانہ نظام میں عورتیں عادتاً خوشامدی بن جاتی تھیں۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت ان تمام چیزوں کے استعمال اور ان طریقوں کو اپنانے میں صرف کرتی تھیں جن سے وہ اپنے شوہر کو خوش رکھ سکیں اور اسی کو وہ اپنا "مقصدِ حیات" سمجھتی تھیں۔ "شوہر پرستی" کے اس انتہا پسند جذبے نے ذاتی طور سے عورتوں کے کردار کو پست کر دیا تھا، اور ان میں اتنی صلاحیت باقی نہ تھی کہ وہ اپنے مسائل اور حقوق کی طرف توجہ کر سکیں۔ جہاں تک غریب طبقوں کی عورتوں کا سوال تھا انھیں اپنے خانگی معاملات سے اتنی فرصت ہی نہ رہی کہ وہ دوسرے مسائل پر سوچ سکیں اس کے علاوہ جاگیردارانہ نظام ان پر پوری طرح حاوی تھا۔ "شوہر پرستی" جیسے عورت کی پارسائی کی دلالت اور کسی حد تک مذہب کا ایک جز سمجھا جاتا تھا اور جاگیردارانہ نظام، ان دونوں ہی نے عورتوں کی ترقی کی راہوں کو بالکل مسدود کر دیا تھا اور انھیں اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

عورتوں کے آگے بڑھنے میں ان کی معاشی کمزوری بھی حائل رہی ہے اس لئے کہ معاشی حیثیت سے بھی ان کی زندگی کا انحصار مردوں ہی پر تھا اور اس چیز نے ان کو سماجی و سیاسی دونوں ہی حیثیت سے کمزور بنا دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس نظریے نے کہ "مرد کماتا ہے اس لئے وہی خاندان کا سربراہ ہو سکتا ہے" عورتوں کی پوزیشن کو سماج اور خاندان میں بہت ہی کم کر دیا تھا۔ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کا انحصار صرف مردوں پر تھا اور اس وجہ سے بھی ان میں غیر مناسب حد تک تابعداری اور وابستگی کا جذبہ بڑھتا گیا۔ عورتوں کو "گھر کی چیز" تصور کیا جاتا تھا اور ان کا "مقصدِ زندگی" کھانا، پہننا اور شوہر کی تابعداری سمجھا جاتا تھا۔ گویا عورت ایک پرندہ تھی جسے سماج کے پنجرے میں مقید کر دیا گیا تھا ۔۔۔۔

سماجی رسم و رواج جن پر جاگیردارانہ اثرات نمایاں تھے اور جن کو غلط طریقے پر مذہب کا ایک جز تصور کیا جاتا تھا، عورتوں کی ترقی میں

مانع رہے۔ جاگیردارانہ نظام اور اس کی سختیوں سے سماج کے غریب طبقوں کی عورتوں میں "مساوات" کے... نے کو بیدار کیا اور انھوں نے "آزادی" سے زیادہ "مساوات" کو ترجیح دی۔ دوسرے الفاظ میں سماج کے دو مختلف طبقوں (امیر اور غریب) کی عورتوں کے درمیان "مساوات" کی یہ جنگ شروع ہو گئی اور دونوں طبقوں کی عورتوں کے اس باہمی اختلاف نے بھی انھیں اپنے حقوق کی طرف سے بے خبر رکھا۔ دوسری طرف سماجی رسومات نے جن میں "ستی پرتھا" قابل ذکر ہے۔ عورتوں کی زندگی کو مفلوج کر دیا اور ایسی تمام رسومات جنھیں مذہب کا جزو سمجھا جاتا تھا جاری رہیں۔

در اصل ملک کی جہالت وہ بنیادی دشواری تھی جس کی وجہ سے عورتوں کو ترقی کا موقع نہ مل سکا۔ تعلیم کی کمی نے عورتوں اور مرد دونوں ہی کو متاثر کیا۔ جہالت کی وجہ سے مردوں میں قدامت پسندی، مذہب کی اندھی تقلید اور سماجی رسم و رواج کی پابندی کا جذبہ برقرار رہا اور دوسری طرف عورتوں کے ذہن بھی بیدار نہ ہو سکے۔ عورتوں کی تعلیم کو جس کا مطلب اس وقت صرف انگریزی تعلیم سمجھا جاتا تھا معیوب اور غیر ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ تعلیم کی کمی عورتوں کو بھی صحیح معنوں میں بیدار نہ کر سکی اور وہ بھی رسم و رواج کو زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مرد عورتوں کو "آزادی" دینے کے لئے تیار نہ تھے اور دوسری طرف عورتیں بھی کسی رتبک اپنے مسلک سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھیں اور وہ قدیم رسومات کو مذہب سے منسوب کرنے کی وجہ سے ان سے انحراف کرنا ایک گناہ عظیم تصور کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ان کی سماجی حیثیت میں تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر معاشی انقلاب سماجی ڈھانچے کو بدل دیتا ہے اس لیے صنعتی انقلاب (INDUSTRIAL REVOLUTION) نے تمام دنیا کی عورتوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ جاگیرداری کا خاتمہ ہوا پیداوار کے ذرایعوں میں نمایاں تبدیلی ہوئی، نئے نئے آلات ایجاد ہوئے انسان کی جگہ مشینوں نے لے لی اور زیادہ تر ممالک کا رجحان صنعت و حرفت کی طرف ہوا۔ اس صنعتی رجحان نے عورتوں کی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ عورتوں کو تعلیم کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ روزگار کی سہولتیں بھی حاصل ہوئیں اور ان میں بیداری پیدا ہوئی۔ حقیقت میں عورتوں کی آزادی و مساوات کی باقاعدہ تحریک ۱۸۴۸ء سے شروع ہوئی جب امریکی رہنما مسس بی انیتھونی نے اس کے لئے آواز اٹھائی اور اسی وقت سے یہ تحریک اپنے وسیع مقاصد کے ساتھ مختلف خواتین کی رہنمائی میں اور کچھ منظم اداروں کے تعاون سے ساری دنیا میں بڑھتی گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ عورتیں قومی و ملکی تعمیر میں مردوں کے برابر کام کر کے ایک مضبوط اور خوش حال ملک اور بالآخر ایک اچھی دنیا کی تشکیل کر سکتی ہیں۔ ہندستان پر بھی اس تحریک کا اثر پڑا اور یہاں بھی یہ تحریک زور پکڑتی گئی جس کے نتیجے میں ہندستان میں بھی عورتوں کی حالت میں تبدیلی شروع ہو گئی

ہمارے ملک میں عورتوں کی ترقی کا زیادہ تر انحصار مذہبی اور سماجی رسم و رواج میں اصلاح پر تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہندستان میں سب سے پہلے سماجی اصلاحات پر توجہ کی گئی۔ ملک کے عظیم معمار اور مصلح دوارکا ناتھ ٹیگور اور راجہ رام موہن رائے وغیرہ نے ستی پرتھا کو ختم کرنے کی جان توڑ کوشش کی اور عوام کو اپنی تقریر و تحریر سے اس بات کا سبق دیا کہ ستی پرتھا مذہب کا کوئی جزو نہیں ہے اور اسے ختم ہونا چاہیے۔ ودیا ساگر نے بیواؤں کی شادی کو جائز کرنے اور قانونی حیثیت دینے کے لیے حکومت کو مجبور کیا۔ ان اصلاحات سے عورتوں کی حالت میں تبدیلی اور ان کے ذہنوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ ان رسومات کا جو صدیوں سے ہندستانی زندگی کا ایک اہم حصہ تھیں فوری خاتمہ تو ہونا ناممکن تھا پھر بھی اس سے صنف نسواں کی اہلیت و صلاحیت کے بارے میں تنگ نظری کے بادل چھٹنے لگے اور عوام یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ عورتیں بھی آزادی و مساوات کی مستحق ہیں اور انھیں ترقی کا موقع ملنا چاہیے۔

ٹراونکور، کوچین، میسور وغیرہ کے تعلیمی مشن اور ملک کے مذہبی اداروں مثلاً برہمو سماج، آریہ سماج اور دیو سماج وغیرہ نے بھی عورتوں کی آزادی کے لیے اہم رول ادا کیا۔ ستی پرتھا کے بعد کمسنی کی شادی کی بھی مخالفت کی گئی اور دوسری اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان اصلاحات سے عورتوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور انھوں نے نہ صرف سماجی حقوق اور اپنی آزادی کے لیے سرگرم جد و جہد شروع کر دی بلکہ سماجی، سیاسی

اور ادبی زندگی میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ ان کے سامنے اہلیا بائی ادھولکر، جیجا بائی، رضیہ سلطانہ، زیب النساء مخفی، چاند بی بی وغیرہ کی مثالیں تھیں جنھوں نے تیرھویں صدی میں سیاسی اور ادبی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان پر انگریزوں کے تسلط نے عوام کی زندگی کو مفلوج کر دیا تھا اور اس غلامی کی زندگی میں عورتیں تو کیا مردوں کو بھی ترقی کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مغربی اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ ہندستانی عورتوں میں بھی بیداری پیدا ہوئی اور دوسرے ملکوں کی عورتوں کی ترقی کو دیکھ کر ان میں بھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے نہ صرف اپنی آزادی بلکہ ملک کی آزادی کے لیے اپنی جانوں کی قربانی دی جس کے بغیر آزادی کی تحریک یقیناً نامکمل رہ جاتی ہندستان آزاد ہوا اور ہمارے نئے دستور میں عورتوں کو تسلیم روزگار اور دوسرے سیاسی اور سماجی حقوق مساویانہ طریقے پر دے کر مردوں اور عورتوں کو ملک کی تعمیر ترقی کے لئے یکساں ضروری تصور کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کو وہ درجہ اور مقام حاصل ہو چکا ہے جو انھیں ملنا چاہیے۔ یہ آغاز کار ہے تکمیل نہیں۔ چنانچہ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کو بھی دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہاں بھی عورتوں کو تبدریج مردوں کے برابر درجہ حاصل ہوا ہے۔ جہاں تک سیاسی حقوق کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے نیوزی لینڈ میں سنہ ۱۸۹۳ء میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا۔ اسی طرح آسٹریلیا میں سنہ ۱۹۰۲ء میں، انگلینڈ میں سنہ ۱۹۱۷ء میں، کناڈا میں سنہ ۱۹۱۸ء میں، منگولیا میں سنہ ۱۹۲۴ء میں اور فرانس میں سنہ ۱۹۴۴ء میں حق رائے دہندگی عورتوں کو حاصل ہوا۔ اس اعتبار سے صرف ہمارے ملک ہی کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ یہاں جمہوری نظام کے قیام کے ساتھ ہی عورتوں کو مساوی حقوق دینے کی ضمانت کی گئی۔

عورتوں کی ترقی کے لیے کچھ بین الاقوامی اداروں مثلاً "WOMEN'S LEAGUE FOR PEACE & FREEDOM" و "INTERNATIONAL COUNCIL OF WOMEN" اور "انٹرنیشنل فیڈریشن آف یونیورسٹی ومن" وغیرہ نے بھی نمایاں کام انجام دیے ہیں۔ اقوام متحدہ بھی اس سلسلے میں سرگرمی سے کام کر رہی ہے اور اس کا ایک کمیشن COMMISSION ON THE STATUS OF WOMEN دنیا کی عورتوں کے مسائل کو حل کرنے اور انھیں بلند درجہ دینے کے لیے پوری طرح کوشاں ہے

بہر حال جہاں تک ہمارے ملک کا سوال ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد سے ہمارے یہاں عورتوں کی حالت اور ان کے درجے میں اتنی تیزی سے تبدیلی ہوئی ہے جس کی مثال شاید دنیا پیش کر سکے۔ اگرچہ ٹیکنیکل تعلیم سے عورتوں کی دلچسپی کم ہونے کے باعث میڈیکل، قانون اور خصوصاً انجینیرنگ اور ایسے ہی دوسرے ٹیکنیکل (TECHNICAL) شعبوں میں عورتوں کی تعداد ابھی بہت کم ہے پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ مستقبل قریب میں ہندستان میں عورتوں کو وہی حیثیت اور درجہ حاصل ہو جائے گا جو ہمارے دستور اساسی کا منشاء ہے یا ایک جمہوری نظام حکومت کا تقاضا ہوتا ہے۔



غزل

ساحر بھوپالی

عیش مانگے ہے نہ راحت کا چمن مانگے ہے
جوششِ دل حوصلۂ کوہ شکن مانگے ہے

رونق و دل کشیِ عہدِ کہن مانگے ہے
زندگی بھر نہ محبت کا چلن مانگے ہے

جان و دل، عزم و عمل، وقت کٹھن مانگے ہے
مجھ کو دینا ہے وہ جو میرا وطن مانگے ہے

فرشِ مخمل مرے تلووں کو نہ راس آئے گا
آبلہ پائی تو کانٹوں کی چبھن مانگے ہے

تاک میں بیٹھا ہوا آج ہر اک ایٹم گر
نعش انسان کی بے گور و کفن مانگے ہے

صبحِ نو واسطہ دے دے کے گریبانوں
تیرے دیوانوں کا معصوم بچپن مانگے ہے

کچھ خبر بھی ہے تمھیں، حرص و ہوس کے بندو!
وقت مر مر کے جیے جانے کا فن مانگے ہے

مادرِ ہند کے قدموں پہ لٹا دو سب کچھ
خوں بہا روحِ شہیدانِ وطن مانگے ہے

درد کہتا ہے، جہاں کو تہہ و بالا کر دے
اور یہاں، اور ہی کچھ دل کی تھکن مانگے ہے

رحم کر خالقِ کونین! چمن پر میرے
یہ دعا آج ہر اک اہلِ وطن مانگے ہے

اور یہاں پاس مرے یہ ہے نہ وہ، اے ساحر
کوئی دولت، کوئی حشمت، کوئی فن مانگے ہے

ماگھ ۱۸۸۸ شک

اعجازِ جمہور

شمیم بسوانی

نور ہی نور شبستاں میں ہے ہر ایک طرف
چاندنی اوڑھ کے آئی ہے مری شامِ حیات
کل یہاں صبح بھی ظلمت کا کفن پہنے تھی
پہلوئے وقت میں لیٹی تھی سیہ ناگن رات

شکر صد شکر کہ وہ عہدِ کہن ختم ہوا
اپنی تہذیب و تمدن کا چمن جاگ اٹھا
رام و گوتم کے مدھر گیت سنانے کے لیے
لے کے انگڑائی ہر اک اہلِ وطن جاگ اٹھا

اب تو ہر ذرہ ہے خورشید بداماں اے دوست!
اب تو اس دھرتی پہ تاروں کے کنول کھلتے ہیں
اب فضاؤں میں چمکتے ہیں روپہلے جگنو
جلوۂ حسن محبت سے گلے ملتے ہیں

ہر طرف لطف و مسرت کا ہے ساون برسا
پیڑ کی شاخوں پہ جھولے ہیں تو ہونٹوں پہ ملہار
سبزۂ خشک بھی پہنے ہے قبا مخمل کی
جب سے آئی ہے گلستاں میں دلہن بن کے بہار

اے زہے بخت! کہ روشن ہے عزائم کی جبیں
سارے منصوبے ہیں تعمیر و ترقی کا نشاں
تا بہ کے تیرگیِ وقت کا ماتم، اے دوست!
اسی دھرتی پہ نظر آئے گی اب کاہکشاں

اب سنورتا ہی چلا جائے گا یہ ذوقِ عمل
ابھی ہم چاند ستاروں پہ بھی ڈالیں گے کمند
پاؤں کو جہدِ مسلسل کے نہ رکنے دیں گے
ہم کو ہونا ہے بہت اوجِ ثریا سے بلند

آج اس فکر میں ہر درد گوارا ہوگا
کل تو اس خاک کا ذرہ بھی ستارا ہوگا

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۶۷ء

اہم قوانین کا خلاصہ

اتر پردیش یونیورسٹیز (وائس چانسلروں کی تقرری) (ترمیمی اور جواز) ایکٹ سنہ ۱۹۶۶ء (ایکٹ نمبر ۶ سنہ ۱۹۶۶ء)۔

اس کا منشاء آگرہ یونیورسٹی ایکٹ سنہ ۱۹۲۶ء، الٰہ آباد یونیورسٹی ایکٹ سنہ ۱۹۲۱ء، لکھنؤ یونیورسٹی ایکٹ سنہ ۱۹۲۰ء، گورکھپور یونیورسٹی ایکٹ سنہ ۱۹۵۶ء اور وارانسی سنسکرت وشو ودیالیہ ایکٹ سنہ ۱۹۵۶ء کی بعض شرائط میں ترمیم کرنا اور ان ایکٹوں کے بموجب وائس چانسلروں کے تقرر کو جائز قرار دینا ہے۔ چنانچہ اس کی رو سے مذکورہ بالا پانچوں قوانین کی تحتی دفعہ (۴) میں فقرہ (۱) کے تحتی فقرہ (ب) کو مندرجہ ذیل سے بدل دیا گیا۔

"(ب) کوئی شخص جو الٰہ آباد کی عدالت عالیہ کا چیف جسٹس ہو یا اس کا مقرر کردہ جج ہو۔ اور"

(۲) فقرہ (۲) کے بعد مندرجہ ذیل نیا فقرہ بڑھایا جائے گا:

"(۳) کمیٹی کی کوئی کارروائی صرف اس بنا پر ناجائز قرار نہیں دی جائے گی کہ اس کے ارکان میں کسی کی جگہ خالی ہے یا کسی ایسے شخص نے اس کی کارروائیوں میں حصہ لیا ہے جو بعد کو اس کا اہل نہیں سمجھا گیا۔"

کوئی کارروائی جو وائس چانسلر نے اس ایکٹ کے آغاز سے پہلے کی ہو صرف اس بنا پر ناجائز نہیں سمجھی جائے گی کہ کمیٹی کی تشکیل میں کوئی نقص ہے یا وائس چانسلر کے تقرر میں کوئی نقص ہے۔

اس قانون کی رو سے اتر پردیش یونیورسٹیز (وائس چانسلروں کی تقرری) (ترمیم اور جواز) آرڈیننس سنہ ۱۹۶۵ء منسوخ ہو گیا ہے تاہم مذکورہ آرڈیننس کے تحت کی گئی کوئی کارروائی اس قانون کے بموجب متصور ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس ایکٹ کا آغاز ۴ر دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء کو ہوا۔

انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن (ترمیمی) ایکٹ سنہ ۱۹۶۶ء (ایکٹ نمبر ۷ سنہ ۱۹۶۶ء)

انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن ایکٹ سنہ ۱۹۲۱ء کی بعض دفعات میں ترمیم کی غرض سے مجلس قانون ساز نے یہ ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے فقرہ (ز) کو مندرجہ ذیل سے بدل دیا گیا ہے:

"(د) فقرہ (ج) کے تحت کی گئی تمام اپیلوں کا فیصلہ علاقائی ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم فقرہ (ج) کے مطابق کرے گا۔

بورڈ یا اس کی کسی کمیٹی کے حکم یا فیصلے پر کسی عدالت میں اعتراض نہیں ہوگا۔

اس قانون کی رو سے اتر پردیش انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن (ترمیمی) آرڈیننس سنہ ۱۹۶۵ء منسوخ ہو گیا۔ تاہم اس کے تحت کی گئی کوئی کارروائی اس ایکٹ کے بموجب متصور ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس ایکٹ کا آغاز ۲۴ر دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء کو ہوا تھا۔

اتر پردیش کرشی وشو دیالیہ (ترمیمی) ایکٹ سنہ ۱۹۶۶ء (ایکٹ نمبر ۸ سنہ ۱۹۶۶ء)

اس کا مقصد اتر پردیش زرعی یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کرنا ہے۔ اس کی رو سے خاص ایکٹ کی دفعہ ۱۱ کی تحتی دفعہ (۱) کو مندرجہ ذیل تحتی دفعہ سے بدل دیا گیا ہے:

"(۱) وائس چانسلر، یونیورسٹی کا پورے وقت کا افسر ہوگا۔ پہلے وائس چانسلر کا تقرر چانسلر کرے گا۔ بعد کے وائس چانسلروں کا تقرر چانسلر ان تین اشخاص میں سے کرے گا جن کو متعلقہ کمیٹی نے نامزد کیا ہو۔

تحتی دفعہ (۲) میں الفاظ "چار سال" کو "تین سال" سے بدل دیا گیا ہے۔

تحتی دفعات (۵) اور (۶) میں لفظ "بورڈ" کو ہر جگہ لفظ "چانسلر" سے بدل دیا گیا ہے۔

تحتی دفعہ (۷) میں الفاظ "جب تک بورڈ کسی قائم مقام وائس چانسلر کو نامزد کرے" کی جگہ الفاظ "جب تک چانسلر کسی وائس چانسلر کا تقرر کرے"۔ کر دیے گئے ہیں۔

خاص ایکٹ کی دفعہ ۱۲ کے تحتی فقرہ (۱) کے الفاظ "وائس چانسلر بورڈ کی رضامندی سے تقرر کرے گا" کو الفاظ "ریاستی حکومت ایسی شرائط پر جو اس کے نزدیک مناسب ہوں تقرر کرے گی" بدل دیا گیا ہے۔

خاص ایکٹ کی دفعہ ۱۳ کی تحتی دفعہ (۲) کے الفاظ "اس کو دی جانے والی تنخواہ اور بھتے مقرر کیے جائیں گے" حذف کر دیے گئے ہیں۔

اس قانون کی رو سے اتر پردیش کرشی وشو دیالیہ (ترمیمی) آرڈیننس سنہ ۱۹۶۶ء منسوخ ہو گیا۔ تاہم اس کے تحت کی گئی ہر کارروائی اس ایکٹ کے بموجب متصور ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا اس ایکٹ کا آغاز ۱۸ر جنوری سنہ ۱۹۶۶ء کو ہوا۔

کسانوں کے عزم و استقلال سے سوکھے کے مصائب پر قابو پانے میں کامیابی

امدادی پروگراموں کو اوّلین ترجیح

سرکاری ملازموں کی بہبود کے لیے اہم اقدامات

غذائی پیداوار کے اعتبار سے اتر پردیش کے لئے یہ سب سے خراب سال رہا۔ پردیش کو جس بھیانک ترین سوکھے کا سامنا کرنا پڑا اس کی مثال گزشتہ پچاس سال میں نہیں ملتی۔ یہ متواتر دوسرا سال تھا جب بارش نے آنکھیں پھیر لیں۔ زیرنظر سال میں صورت حال اس لئے اور بھی خراب ہوگئی کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے جہاں خریف کی فصل کو شدید نقصان پہنچا وہاں زمین میں تری نہ ہونے کے باعث ربیع کے لئے جوتائی اور بوائی کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا۔

اس کے باوجود پردیش کے کسانوں نے اس چیلنج کا عزم و ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ حکومت نے تالابوں، پوکھروں، نالوں اور ندیوں سے پانی فراہم کرنے کے لئے ہزاروں پمپنگ سٹ نصب کئے، کسانوں نے لاکھوں کی تعداد میں کچے کنوئیں کھودے اور جس قدر بھی پانی دستیاب ہوسکتا تھا اسے زمین میں پیدا کرنے کے لئے کام میں لائے اور اس طرح صرف یہی نہیں ہوا کہ ربیع کی بوائی کی گئی بلکہ مزید رقبے میں بھی ربیع کی فصلیں بوئی گئیں کیونکہ سنچائی کے لئے پانی استعمال کرنے کے باعث جو تالاب اور پوکھرے وغیرہ خشک ہوگئے ان میں بھی ربیع بوئی گئی۔

ریاستی حکومت نے سنچائی کے وسائل کو بجلی مہیا کرنے کو اولین ترجیح دی اور کاشتکاروں کو آسان شرائط پر قرضے دینے کے لئے قواعد میں بھی نرمی کردی۔ جن کسانوں کے پاس ۳½ ایکڑ سے کم آراضیات تھیں انھیں ایک کچے کنوئیں کے لئے ۲۰ روپے امداد اور ۵۰ روپے تقاوی کے حساب سے مدد دی گئی۔

زیرنظر سال میں خریف مہم چلائی گئی جس کے دوران میں زیادہ سے زیادہ رقبے میں پیوندی مکا، جوار اور باجرہ جس کی اوسط پیداوار ۵۰ سے ۱۰۰ من فی ایکڑ ہوتی ہے، بونے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ تقریباً ۲۵۰۰۰ ایکڑ کے رقبے میں پیوندی مکا کی کاشت کی گئی۔ ضلع گونڈہ میں اس کی سب سے زیادہ کاشت ہوئی۔ پیوندی باجرہ جس کی پیداوار ۵۰ من فی ایکڑ ہوتی ہے، تقریباً ۲۰۰۰ ایکڑ کے رقبے میں بویا گیا۔ پیوندی جوار بھی کافی مقبول رہی۔ چنانچہ پردیش کے ان علاقوں میں جو جوار کی کاشت کے خاص علاقے ہیں، اس کی کاشت کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔

اس طرح زیرنظر سال میں خریف مہم کے دوران میں تائی چنگ نیٹو نمبر ۱ دھان کا بھی تجربہ کیا گیا جو بے حد کامیاب رہا۔ اس کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ گونڈہ، بستی اور گورکھپور کے اضلاع میں اس کی پیداوار ۱۰۰ من فی ایکڑ سے زیادہ رہی۔ اس کی کامیابی اور کسانوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر ریاستی حکومت نے ترقی پسند کسانوں سے بازار بھاؤ سے ۲۵ فیصدی زیادہ نرخ پر اس دھان کے ۵۰۰۰ ٹن بیج خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دھان کی مقامی ترقی یافتہ قسموں کو بھی مقبول بنایا جا رہا ہے۔

ربیع مہم کے دوران میکسیکن گیہوں کی زیادہ پیداوار والی قسموں نیز ترقی یافتہ مقامی قسموں کو جن کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے

کسانوں میں مقبول بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں ڈبلر بوائی کا طریقہ اپنا کر تاکہ کم بیج میں زیادہ کھیت بوئے جا سکیں۔ تقریباً ۵ لاکھ ایکڑ رقبے میں ان قسموں کی بوائی کی گئی۔

گیہوں کی زیادہ پیداوار والی ایک اور مقامی قسم کا نپور۔ ۱۰ ہفتیں کسانوں میں بہت مقبول ہوتی ہے۔ یہ قسم بعد میں بوئی جا سکتی ہے اور اس سے دہری فصل کی کاشت کے رقبے میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ کسان اسے دھان اور گنا کٹنے کے بعد ان ہی کھیتوں میں بونا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں زیر نظر سال میں تقریباً ۴ لاکھ ایکڑ میں اس کی کاشت کی گئی۔

ریاستی حکومت نے کسانوں کو فرٹی لائزر، کیڑے مارنے والی دوائیں اور اس مقصد کے لئے قرضے دینے کا بندوبست کیا تاکہ موجودہ وسائل کو کام میں زیادہ سے زیادہ رقبے میں زیادہ پیداوار والی فصلیں بوئی جا سکیں اور اس طرح غلے کی کمی سے پیدا ہونے والی پریشانیوں اور دشواریوں پر قابو پایا جا سکے۔

ضمنی غذا کے طور پر سبزی اور آلو کی کاشت کا پروگرام ایمرجنسی سطح پر شروع کیا گیا۔ آلو کی کاشت کے رقبے میں اضافے کی بھرپور مہم کے نتیجے میں پچھلے سال کے ۵۱ء۳ لاکھ ایکڑ کے مقابلے میں زیر نظر سال میں پانچ لاکھ ایکڑ کے رقبے میں آلو کی کاشت کی گئی۔ آلو کے بیج کی فراہمی کے سلسلے میں بروانگل (دیوریا) اور ردورالا (میرٹھ) آلو کے فارم شروع کئے گئے۔

سبزیوں کی کاشت کے پروگرام کے نتیجے میں نہ صرف دیہاتوں میں بلکہ شہروں میں بھی سبزی اُگانے کا جوش و خروش پیدا ہوا ہے جہاں لوگوں نے مکانوں کے آس پاس نیز اُفتادہ زمینوں میں، جو اب تک کاشت کے کام میں نہیں آئی تھیں جلد تیار ہونے والی سبزیوں اور ترکاریوں کی بڑے پیمانے پر کاشت کی۔

اب ریاستی حکومت نے زائد فصل کی مہم چلائی ہے اور اس سلسلے میں پیوندی مکا اور دھان کی زیادہ پیداوار دینے والی قسم تائی چنگ نٹو۔ ا کی کاشت مزید رقبے میں کی جا رہی ہے۔ پہلی بار گرمیوں کے موسم میں ایک لاکھ ایکڑ میں دھان بونے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس طرح جنوری اور فروری میں تقریباً ۱ء۷ لاکھ ایکڑ کے رقبے میں پیوندی مکا اور مقامی ترقی یافتہ مکا کی کاشت کی جائے گی۔ اس طرح اُمید ہے کہ ۵۰ لاکھ زائد اناج پیدا ہوگا۔

کھیتی کے کاموں میں سہولت پیدا کرنے کے خیال سے کسانوں کو زیادہ سے زیادہ آلات زراعت مہیا کرنے کی کوشش کی گئی۔ زیر نظر سال میں ۲۱ موٹر سے چلنے والے ہل (پاور ٹلر) بھی باہر سے منگوائے گئے تاکہ کسانوں پر اخراجات کاشت کے کم کرنے اور کھیتی کے کاموں کے لئے مزدوروں کی کمی کو دور کرنے کے سلسلے میں ان ہلوں افادیت واضح کی جا سکے۔

کاشتکاری کے ترقی یافتہ طریقوں کی تربیت کا بندوبست کرنے اور فصل کو بچانے کے وسیع پیمانے پر بندوبست کے علاوہ ریاستی حکومت نے کسانوں کی عورتوں کو کھیتی کے کاموں کی تربیت کے کورس بھی شروع کئے۔ پہلا تربیتی کیمپ لکھنؤ میں ہوا جس میں بڑی تعداد میں دیہات کی عورتوں نے حصہ لیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کسانوں میں ایک زبردست ذہنی تبدیلی رونما ہوئی ہے اور غذائی پیداوار بڑھانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ کھیتی کو جدید طرز پر لانے کے لئے آلات، سمنٹ اور دوسری سہولتوں کے سلسلے میں ان کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ وہی کسان جنھیں چند سال پہلے تک کنوئیں بنانے میں بھی تامل تھا اب وہ بجلی سے چلنے والے تل کنوئیں بنا رہے ہیں۔ پانی کھینچنے کے لئے بجلی کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ کاشتکار زیادہ سے زیادہ فرٹی لائزر کے لئے سپلائی ایجنسیوں کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ کیڑے مارنے والی دوائیں اور سامان مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ نئے بیجوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ تمام باتیں کم سے کم مدت میں اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے ایک فال نیک ہے۔

پردیش میں بھیانک سوکھے سے جس کی مثال پچھلے پچاس سال میں نہیں ملتی، متاثر ہونے والوں کے مصائب اور پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے ہر امکانی امداد اور بھرپور اقدامات زیر نظر سال کی ریاستی حکومت کی سرگرمیوں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ستمبر اور اکتوبر میں بہت تھوڑی سی اور نومبر کے وسط تک تقریباً نہیں کے برابر بارش ہونے کی وجہ سے پردیش کے اہم ضلعوں میں بھیانک سوکھا پڑ گیا جس سے ۱۹۹۶۸ مواضعات اور ۸۸ء۴ کروڑ سے زیادہ افراد متاثر ہوئے۔ خریف کی فصلیں بہت کچھ برباد ہو گئیں اور ربیع

کسانوں کے مصائب کا سرکار کو پورا پورا احساس تھا چنانچہ اس نے ۴۲ ضلعوں میں جو سوکھے سے بہت زیادہ متاثر تھے مال گزاری، تقاوی، سنچائی اور دوسرے سرکاری مطالبات کی وصولی التوا کا حکم ۲ ستمبر ۱۹۶۶ء کو دیدیا۔ بعد میں ضلع حکام کو تمام متاثرہ ضلعوں میں تمام سرکاری مطالبات کی وصولی کو ملتوی کر دینے کے اختیارات دے دئے گئے۔

سوکھے سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے سلسلے میں ریاستی حکومت نے تقاوی دینے کے لئے مزید ۲ کروڑ روپے، بے سہارا افراد کی اعانت کے لئے ۵۰ر۲ کروڑ روپے اور سوکھے والے علاقے کے غریب طلبا کیلئے ۱۳ر۱۷ لاکھ روپے منظور کئے۔ سوکھے والے علاقوں میں ٹسٹ ورکس کے لئے بھی ۵۲۳۲۰۰۰ روپے منظور کئے گئے۔ جہاں جہاں ٹسٹ ورکس ہو رہے ہیں وہاں لوگوں کی سہولت کے لئے سرکاری غلے کی دوکانیں کھولی گئیں جن پر موٹا اناج سستے داموں پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ معذور اور بے سہارا لوگوں کو ماہوار ۲۰۰۰ ٹن درآمد کیا ہوا گیہوں ۸ کیلوگرام فی بالغ اور ۴ر۲ کیلوگرام فی نابالغ ہر مہینے مفت دیا جاتا ہے۔ پھر ۱۵۰۰ ٹن بالائی اُترے ہوئے دودھ کے سفوف کا دودھ اور ۷۰ ٹن بسکٹ بھی ضرورتمند بچوں، حاملہ عورتوں اور زچہ کو تقسیم کیا جاتا ہے۔

الہ آباد، باندہ، اور مرزا پور کے اضلاع کے قلت والے علاقوں میں پینے کے پانی کا بھی ایک جامع پروگرام شروع کیا گیا۔ اسی طرح چھوٹی آبپاشی کی اسکیمیں بھی شروع کی گئیں اور کچے کنوئیں کھودنے کی غرض سے کسانوں کو تقسیم کرنے کے لئے ۲ کروڑ روپے منظور کئے گئے۔ اس کے علاوہ ۵۰ فیصد امدادی شرح پر ترکاریوں کے بیج فراہم کرنے کے لئے ۴۰ر۲۲ لاکھ روپے منظور کئے گئے۔

یہ اقدامات کسانوں کی مشکلات کو دور کرنے اور فصلوں کو بچانے نیز ربیع کی فصلوں کے لئے اُمید کی کرن پیدا کرنے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوئے۔

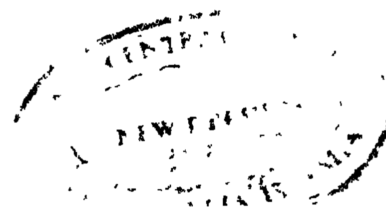
ریاستی حکومت ہمیشہ اپنے ملازموں کی فلاح اور ان کے لئے کام کرنے کے صحت مند اور مناسب حالات بہم پہنچانے کی خواہاں رہی ہے زیر نظر سال میں ملازموں کے لئے بہبود کے لئے جو کچھ کیا گیا اس کے اخراجات ۲۳ کروڑ روپے سالانہ یا جو تھے منصوبے میں ۱۱۷ کروڑ روپے ہوتے ہیں۔

ملازموں کے بچوں کے لئے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ، علاج معالجے کی سہولتیں، سستے مکانات، پراویڈنٹ فنڈ اور وارثوں کو پنشن وغیرہ وہ چند سہولتیں ہیں جو تنخواہ میں اضافے کے علاوہ ملازموں کیلئے مہیا کی گئی ہیں۔ تنخواہ کمیٹی کی سفارشات پر منجملہ اور باتوں کے شہری بھتہ کرایہ مکان کا بھتہ اور پہاڑوں پر تعیناتی کا بھتہ بھی دیا گیا سفر اور روزانہ کے بھتہ پر بھی نظر ثانی کر کے انھیں ملازموں کے لئے فائدہ مند بنا دیا گیا۔

مئی ۱۹۶۵ء میں یو۔پی گورنمنٹ امپلائیز ویلفیر کارپوریشن پھٹکر اسٹور کھولنے کی غرض سے جہاں سرکاری ملازموں کو روزمرہ کی چیزیں مناسب دام پر دستیاب ہو سکیں قائم کیا گیا۔ اب تک اس پروگرام کے ماتحت ۳۲ ضلعوں میں ۳۴ اسٹور کھولے جا چکے ہیں۔ پردیش کے اہم دفاتر میں سرکار کیفے ٹیریا بھی کھول رہی ہے جہاں صاف ستھرے اور تغذیہ بخش ناشتہ ملتا ہے۔ لکھنؤ میں سکریٹریٹ کے اندر اس طرح کا ایک کیفے ٹیریا کھولا جا چکا ہے اور کچھ اور کے لئے انتظامات مکمل ہو رہے ہیں۔

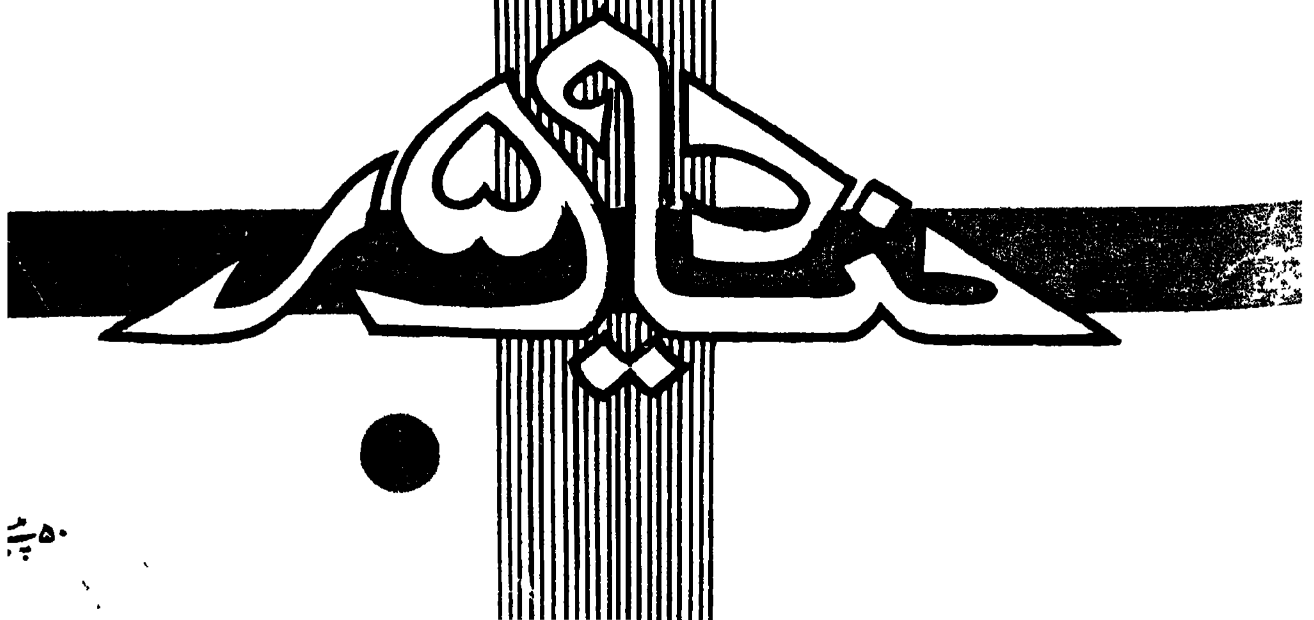
تنخواہ کمیٹی کی سفارشات کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم آمدنی کا تناسب ۸۰ : ۱ سے گھٹ کر ۶۰ : ۱ ہو گیا ہے جب ۱۹۴۸ء کے آوادی کانگریس رزولیوشن میں اس تناسب ۳۰ : ۱ تجویز کیا گیا تھا۔ انتظامی اخراجات ۱۹۴۷ء میں ۸ر۱۳ کروڑ روپے سے کم تھے اور آج یہ ۸۸ کروڑ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکومت اپنے ملازموں کی حالت سدھارنے کی کس قدر خواہاں ہے۔





Regd. No. L. 319

گر ۱۸۸۸ اشاک
ج۔ سنہ ۱۹۶ عیسوی



۵۰ پیسے

نیا دور

جلد ۲۲ | نمبر ۱۲

پھالگن ۱۸۸۸ شک
مارچ ۱۹۶۷ عیسوی
چندہ سالانہ۔ پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
ششی کانت بھٹناگر
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

ہر پانچ برس پر ہمارے ملک میں عام انتخابات ہوتے ہیں جن کے ذریعے عوام پارلیمنٹ، اسٹیٹ کونسلوں اور ریاستی مجالس قانون ساز کے لیے اپنے نمائندے چنتے ہیں۔ حالیہ عام انتخابات کو ملا کر اب تک چار الکشن ملک میں ہو چکے ہیں۔ پچھلے تین الکشن ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۲ء میں ہوئے تھے اور اب چوتھا الکشن ۱۵ فروری سے ۲۲ فروری ۱۹۶۷ء تک ہوا جس کے نتائج کا اعلان ۲۵ فروری تک ہو گیا۔ ہندستان دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت ہے اور اتنے بڑے پیمانے پر جس کی کوئی اور مثال تاریخ میں نہیں ملتی، عام انتخابات کا پُرامن طریقے پر ہو جانا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ بہرحال حالیہ انتخابات کے نتائج سے ایک بات یہ سامنے آئی کہ ہمارے دستور نے ملک کے ہر بالغ شہری کو جو یہ حق دیا ہے کہ وہ جس جماعت یا جن افراد کو چاہے ووٹ دے سکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک نئی حکومت کی تشکیل میں حصہ لے سکتا ہے، اس کو ووٹروں نے پوری آزادی کے ساتھ برتا۔ چنانچہ پچھلے تین الکشنوں میں ملک کی سب سے بڑی جماعت کانگریس انتخابات میں کامیاب ہوتی اور مرکز میں صوبوں میں حکومت کی تشکیل کرتی رہی۔ لیکن اس بار متعدد صوبوں میں اسے اتنی اکثریت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ حکومت کی تشکیل کرتی۔ اس لیے دوسری جماعتوں اور پارٹیوں نے مل کر وہاں حکومت بنائی ہے۔ خود ہمارے صوبے اتر پردیش میں بھی کانگریس کو مطلق اکثریت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ دوسری بات جو الکشن کے بعد سامنے آئی ہے۔ یہ ہے کہ الکشن سے قبل فضا میں بڑا تناؤ تھا۔ بہت سے لوگ مشکوک تھے کہ انتخابات ہو بھی سکیں گے یا نہیں اور اگر ہوں گے تو پُرامن طریقے پر ہو بھی پائیں گے؟ مگر انتخابات ہوئے اور چند تشدد کے واقعات کو (جو خاص طور سے بہار میں ہوئے) چھوڑ کر یہ الکشن پُرامن طریقے پر گزر گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے عوام نہ صرف یہ کہ امن و امان اور ضبط و نظم کے دل دادہ ہیں بلکہ اپنے حق رائے دہی کے استعمال اور اپنے فرائض کی ادائیگی کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ رائے دہندگان نے ذات، مذہب، زبان اور مقام کے سوال سے بالاتر ہو کر بڑی تعداد میں اور جوش و خروش کے ساتھ آزادانہ رائے دی اور اپنے فیصلے کو منوالیا۔ ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری جمہوریت ترقی کر رہی ہے اور اس پر ہمیں فخر ہونا چاہیے۔

● حکومت اتر پردیش نے حسب سابق اس سال بھی ہندی، اردو اور سنسکرت کی کتابوں کے بہتر مصنفوں کو ۲۵۰۰ روپے کے نقد انعامات دیے ہیں۔ ان انعامات کے علاوہ ۱۰۰۰ روپے کا ایک خصوصی انعام سیٹھ گووند داس ایم۔ پی کو ہندی زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات پر دیا گیا ہے۔

ہندی کتابوں پر ڈھائی ڈھائی ہزار روپے کے پانچ اسپیشل انعامات شری بلدیو اپادھیا (وارانسی)، ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن (لکھنؤ) ڈاکٹر گنپتی چندر گپتا (چنڈی گڑھ)، ڈاکٹر پربھاکر شکلا (لکھنؤ) اور ڈاکٹر سیتا رام جیسوال (لکھنؤ) کو ملا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲۵۰ - ۱۲۵۰ روپے کے دو اسپیشل انعامات ڈاکٹر بھگوت سرن اپادھیا (لکھنؤ) اور ڈاکٹر اودے نرائن رائے (الہ آباد) کو ان کی کتابوں پر دیے گئے ہیں۔ ڈھائی ہزار روپے کا نرالا انعام شری رگھوویر شرن مترا (میرٹھ) کو ملا ہے۔

اردو کی کتابوں میں ۱۲۰۰ روپے کا "اکبر الہ آبادی انعام" ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (لکھنؤ) کو ان کی کتاب دلی کا دبستان شاعری پر اور ۸۰۰ روپے کا "رام پرشاد بسمل انعام" ڈاکٹر سید محمد عقیل (الہ آباد) کو ان کی کتاب اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) پر ملا ہے۔ ان انعامات کے علاوہ پانچ پانچ سو روپے کے انعام ڈاکٹر اعجاز حسین (الہ آباد) کو ان کی کتاب ادبی ڈرامے پر، شری خلیل الرحمان اعظمی (علی گڑھ) کو ان کی کتاب نیا عہد نامہ پر، شری عمر انصاری (لکھنؤ) کو ان کے مجموعۂ کلام سازِ بیخودی پر، شری سفارش حسین رضوی (نئی دہلی) کو ان کی کتاب اردو مرثیہ پر، شری مالک رام (نئی دہلی) اور ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) کو گل کرسٹ پر ملے ہیں۔

سنسکرت کی کتابوں پر ۱۵۰۰ روپے کا "کالی داس انعام" ڈاکٹر بھاگی رتھ پرشاد ترپاٹھی (وارانسی) کو اور ۱۰۰۰ روپے کا "گنگا ناتھ جھا انعام" ڈاکٹر مراری لال شرما (وارانسی) کو ملا ہے۔

——— ایڈیٹر

غازی الدین حیدر اور علم لغت

سید مسعود حسن رضوی ادیب

اودھ کے چھٹے نواب وزیر اور پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر کو علم لغت سے خاص شغف تھا۔ انھوں نے اپنی ولی عہدی اور نوابی کے زمانے میں فارسی کا ایک لغت فرہنگ رفعت کے نام سے تالیف کیا جو بعد کو ہفت قلزم کے نام سے شایع ہوا۔ اپنی بادشاہی کے زمانے میں عربی کا ایک لغت مرتب کروانا شروع کیا جو ان کے فرزند اور جانشین نصیر الدین حیدر کے عہد میں مکمل اور شایع ہوا۔ یہ دونوں لغت کچھ مدت پیشتر تک میرے کتب خانے میں موجود تھے۔ اس مضمون میں ان کتابوں کا تعارف مدنظر ہے۔

فرہنگ رفعت معروف بہ ہفت قلزم

غازی الدین حیدر نے یہ کتاب لکھ کر اس کی تالیف و ترتیب مولوی قبول محمد کے سپرد کر دی۔ انھوں نے سنہ ۱۲۲۹ھ سے سنہ ۱۲۳۰ھ ہجری تک تقریباً دو سال کی مدت میں یہ خدمت انجام دی۔ اس کے پانچ برس بعد شاہی مطبعے میں اس کی طباعت شروع ہوئی اور محرم ۱۲۳۶ھ سے ذی الحجہ ۱۲۳۷ ہجری تک پورے دو سال میں ۲۱×۱۱ کے بہت بڑے سائز پر سات جلدوں میں چھپ کر تیار ہوئی، جن کی مجموعی ضخامت ایک ہزار پانچ سو پچاس صفحے ہیں۔

اس لغت کا اصل نام فرہنگ رفعت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر نے اس کو بادشاہ ہونے سے قبل تالیف کیا تھا، جب کہ ان کا خطاب نواب رفعت الدولہ رفیع الملک غازی الدین حیدر خاں بہادر شہامت جنگ تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد ان کا لقب ابوالمظفر معز الدین شاہ زمن ہو گیا۔

مولوی نجم الغنی مولف تاریخ اودھ اس لغت کو بادشاہ کی تالیف نہیں مانتے اور لکھتے ہیں:

"مولوی قبول محمد نے ایک کتاب علم لغت میں لکھی ہے، جس کا نام ہفت قلزم ہے۔ موجی الیہ اس کتاب کو بادشاہ کی تالیف بتاتا ہے۔"[1]

قبول محمد نے ہفت قلزم کی جلد ہفتم کے خاتمے پر غازی الدین حیدر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ دن کو مالی و ملکی کاموں میں مصروف رہتے تھے اور رات کو یہ کتاب لکھنے بیٹھتے تھے تو پو پھٹنے کے وقت اٹھتے تھے۔ نجم الغنی اس قول کو بھی قبول محمد ہی کا قول سمجھتے ہیں اور لکھتے ہیں

"قبول محمد کا یہ قول پایۂ صداقت سے نہایت دور ہے۔ جس بادشاہ کے حالات ایسے ہوں وہ اور کتاب بنائے اور پھر کتاب بھی نہایت ضخیم اور وہ بھی علم لغت میں، جو بادشاہ کے مذاق سے بالکل بعید تھا۔ ہفت قلزم جیسی ضخیم کتاب مدت دو سال میں غازی الدین حیدر جیسا شخص رات رات بھر بیٹھ کر تالیف کرے کیسی عجیب و غریب بات ہے"[2]

---

[1] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۰۰-۲۰۵

نجم الغنی کے اس بیان سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اگر غازی الدین حیدر کو مصنف بننے کا شوق تھا تو انھوں نے صرف ہفت قلزم کو اپنی طرف منسوب کرنے پر قناعت کیوں کی؟ ان کے حکم سے یا ان کی فرمائش پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان سب کو اپنی طرف منسوب کرنے میں ان کے لیے کوئی دشواری نہ تھی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ بادشاہ کے ایسے حالات کون سے ہیں جو ان کے لیے لغت کی تالیف کو غیر ممکن بنا دیں؟ نجم الغنی نے جو حالات بیان کیے ہیں وہ بادشاہ کی زندگی کی غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اس مضمون کے آخر میں پیش کی جائے گی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا علم لغت فی الحقیقت بادشاہ کے مذاق سے بالکل بعید تھا؟ فارسی کا ایک ضخیم لغت خود تالیف کرنا یا بہ قول نجم الغنی اس کی تالیف کو اپنی طرف منسوب کرنا اور عربی کے ایک جامع لغت کی تالیف کے لیے لغات عرب کے ماہرین کا ایک عملہ مقرر کرنا اس سوال کا جواب ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ بادشاہ نے یہ لغت صرف دو برس میں تیار کیا؟ قبول محمد نے اس کی ہر جلد کے آخر میں لکھ دیا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین کس تاریخ کو شروع اور کس تاریخ کو ختم ہوئی۔ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ساتوں جلدوں کی ترتیب میں قبول محمد نے ۱۲۲۹ھ سے ۱۲۳۰ھ تک دو سال صرف کیے۔ نجم الغنی نے شاید اسی مدت کو لغت کی تالیف کی مدت سمجھ لیا ہے۔

مولوی نجم الغنی نے ہفت قلزم کے بارے میں لکھا ہے:

"اس کتاب میں کوئی خوبی نہیں۔ صرف لغات برہان قاطع کو ترتیب قوافی کی رعایت پر جمع کر دیا گیا ہے ... لغات جمع کرنے کے وقت کسی دوسری کتاب سے بہت کم مدد لی ہے، کیوں کہ جو تصحیفات و تحریفات برہان قاطع میں ہیں۔ وہ بعینہ ہفت قلزم میں موجود ہیں[1]۔"

اس کے بعد برہان قاطع کی چند غلطیاں بتائی ہیں اور لکھا ہے:

"ہفت قلزم میں ترقی کی گئی ہے کہ برہان کی غلطیوں پر اور اضافہ کیا ہے۔ مثلاً آبادبیات ... کو آبادانیدات ... لکھا ہے اور اس غلطی میں مؤید الفضلا کا مولف بھی شریک ہے اور آسمان درہ ... کو آسران ... لکھا ہے[2]۔"

غازی الدین حیدر کو ایک لغت کا مولف ماننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو برہان قاطع اور مؤید الفضلا کے مولفوں سے زیادہ لغات فارسی کا محقق سمجھ لیا جائے۔ یہ دعویٰ بھی نہیں کیا گیا ہے کہ ہفت قلزم میں ان مولفوں کی غلطیوں کی اصلاح کر دی گئی ہے۔

نجم الغنی نے برہان قاطع کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے: "جہاں تو اعد فارسی کا بیان ہے وہاں بھی بے حد غلطیاں ہیں۔" پھر چند غلطیاں دکھانے کے بعد لکھا ہے: "اس کی غلطیاں ہم نے تفصیل وار کتاب نجم الادب میں دکھائی ہیں[3]۔"

میں نے نجم الادب میں وہ غلطیاں ڈھونڈیں لیکن وہی دو مثالیں نظر آئیں جن کا ذکر تاریخ اودھ میں کیا گیا ہے یعنی آبادانیدات اور آسران[4]۔

نجم الغنی کے لکھے ہوئے حالات غازی الدین حیدر سے ایک مثال پیش کرنے کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وہ مثال ملاحظہ ہو۔ انھوں نے ایک عنوان قائم کیا ہے "بادشاہ کے مزاج میں کچھ خبط بھی تھا۔" اور اپنے اس قول کی تائید میں لکھا ہے:

"محاربۂ غدر تالیف میٹری لال میں مذکور ہے کہ غازی الدین حیدر بادشاہ کا کیا پوچھنا۔ وہ تو ہوئے خبطے مشہور ہی تھے۔ اکثر یہ شغل فرمایا کرتے تھے کہ کوٹھے میں اجابت کی اور بعد فراغت کے جو سامنے پڑا اس سے کہا اس کو کھا۔ وہ یہ سنتے ہی آسمان کو تکنے لگتا تھا۔ آخر کار معتمد الدولہ اس کے بچانے کے واسطے اس کے قریب ہو جاتے تھے اور آہستہ سے اس سے کہتے تھے کہ میں تجھ سے کہوں کہ میں گوہ کھاؤں گا اور تو مجھ سے کہنا کہ میں کھاؤں گا۔ غرض اس طرح دونوں باہم کہتے سنتے لڑتے جھگڑتے اس گوہ کو معتمد الدولہ نگاہ سے پوشیدہ گومتی میں ڈال دیتے تھے۔ وہ شخص گوہ کھانے سے بچ جاتا تھا[5]۔"

---

[1]، [2] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۰۸-۲۰۹ [3] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۱۱ [4] نجم الادب صفحہ ۱۳ [5] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۰۹-۲۱۰

مینڈی لال بے چارہ شاہی معاشرت کے تصور سے بالکل بیگانہ تھا۔
اس کے اس بیان کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاہی بیت الخلا گزرگاہ عوام پر واقع تھا۔ بادشاہ وہاں تنہا چھوڑ دیا جاتا تھا چوکی پہرے کا کچھ انتظام نہ ہوتا تھا۔ ہر راہ چلتی راہ گیر بے روک ٹوک وہاں پہنچ جاتا تھا۔ اجابت کے لیے وہاں مٹی کا ایک کونڈا رکھ دیا جاتا تھا۔ وزیر اعظم معتمدالدولہ آغا میر بیت الخلا کے دروازے پر موجود رہتے تھے۔ بادشاہ جس شخص کو گو کھانے کا حکم دیتا تھا معتمد الدولہ اس سے سازش کر کے بادشاہ کی موجودگی میں جنگ زرگری کرتے ہوئے اس کو باہر نکال لے جاتے تھے اور بادشاہ نہ کچھ دیکھتا تھا نہ سنتا تھا۔ گومتی ندی بیت الخلا سے ملی ہوئی بہتی تھی۔ وزیر اعظم آغا میر نفس نفیس اجابت اور آبدست کے پانی سے لبریز کونڈا اپنے دست مبارک سے اٹھا کر گومتی میں ڈال دیا کرتے تھے۔

ان باتوں میں ایک بھی قرین قیاس نہیں ہے۔ لیکن شاہان اودھ کو بدنام کرنا نجم الغنی کا بہت مرغوب مشغلہ ہے۔ انھوں نے مینڈی لال کے سرتاپا مہمل بیان کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا اور اسی سے نتیجہ نکال کر اس کے عنوان پر جلی حرفوں میں لکھ دیا "بادشاہ کے مزاج میں کچھ خبط بھی تھا"۔

تاج اللغات

ہفت قلزم کی تالیف و ترتیب کے بعد غازی الدین حیدر نے لغات عرب کے ہندوستانی ماہروں کا ایک عملہ اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ عربی لغت کی مشہور و مستند کتاب قاموس کو بنیاد قرار دے کر امکانی حد تک الفاظ و فقرات کا اضافہ کر کے عربی کا ایک جامع ترین لغت تیار کریں اور معانی و مطالب فارسی میں لکھیں۔ علما کی اس جماعت نے سالہا سال کی محنت میں تاج اللغات کے نام سے ایک لغت تیار کیا جو عربی کے ہندوستانی ادیبوں کا ایک مایۂ ناز کارنامہ ہے۔

جو علما اس لغت کی تالیف و تدوین میں شریک تھے ان کے نام کتاب میں کہیں درج نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام جن کا مختلف ماخذوں سے پتا لگا ہے، یہ ہیں ـــــ مولوی تراب علی لکھنوی، مولوی محمد اسمٰعیل مرادآبادی لندنی، مولوی تفضل امام خیرآبادی، مولوی محمد اشرف لکھنوی، مولوی اوحدالدین بلگرامی، مولوی غنی نقی زیدپوری

مولوی محمد اسمٰعیل نے اس لغت کا طویل دیباچہ جو عربی نثر و نظم میں لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غازی الدین حیدر کو علمی شغف بہت تھا۔ وہ اہل علم کے سب سے بڑے قدردان تھے اور تصنیف و تالیف کا ان کو بہت شوق تھا۔ انھوں نے فارسی کا ایک عجیب و غریب لغت مرتب فرمایا۔ اس سے فراغت پانے کے بعد ایک عربی لغت مرتب کرنے کا ارادہ تھا اور اس کا ایک جز لکھ بھی لیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ہمیں انتظار تھا کہ دیکھیں کون اس عجیب و نادر لغت کی تکمیل کرتا ہے کہ خدا نے نصیر الدین حیدر کو بادشاہ کر دیا انھوں نے اس لغت کی تصنیف کی طرف توجہ فرمائی اور اور حیرت انگیز حسن و خوبی کے ساتھ اسے مرتب کر دیا۔

اس دیباچے کے آخر میں ایک 'فائدہ' ہے جس میں مؤلفین لغت کا بیان ہے کہ اس کے خاکے کے لیے ہم نے مثال کے طور پر قاموس کو سامنے رکھا اور اس پر آیات و احادیث، مقولوں اور کہاوتوں کے شواہد اور بہت سی مفید باتوں کا اضافہ کیا، جن سے سابق زمانے کی کتابیں خالی تھیں اور بہت سے لغات و الفاظ کا اضافہ کیا جن کا قاموس میں نام و نشان بھی نہ تھا نہ لغت کی کسی دوسری کتاب میں پائے جاتے تھے۔ الفاظ کے معنوں میں جو اضافے کیے ہیں ان کی کثرت حد شمار سے باہر ہے۔

غازی الدین حیدر کے بعد ان کے فرزند اور جانشین نصیر الدین حیدر کے عہد سلطنت میں یہ عظیم لغت مکمل ہو کر آٹھ جلدوں میں مرتب کیا گیا۔

غازی الدین حیدر نے لکھنؤ میں ٹائپ کا پہلا مطبع بہ صرف کثیر قائم کیا تھا۔ نصیر الدین حیدر نے لیتھو کا پہلا مطبع قائم کیا۔ یہ لغت انھیں مطبعوں میں چھاپا گیا۔ اس کی پہلی چار جلدیں بہت بڑے سائز پر ٹائپ میں اور آخری چار جلدیں اس سے بھی بڑے سائز پر لیتھو میں چھپیں

ہندوستان میں اس لغت کے صرف چند سٹ موجود ہیں، لیکن وہ زیادہ سے زیادہ سات جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر اشپرنگر کو ۱۸۴۹ء میں لکھنؤ کے شاہی کتب خانے میں بھی اس کی صرف سات ہی جلدیں ملی تھیں۔ اس کی آٹھوں جلدیں صرف میرے پاس تھیں جو ادارۂ کتاب نگر لکھنؤ کی معرفت کشمیر یونیورسٹی کے کتب خانے میں پہنچ گئیں۔ ان کے ابتدائی یا آخری یا ان دونوں صفحوں پر شاہان اودھ کے کتب خانوں کی مہریں ہیں اور ہر صفحے کی پیشانی پر اودھ کا شاہی مارکہ چھپا ہوا ہے۔ ٹائپ میں چھپی ہوئی جلدوں کا سائز "½۱۳ × ۱۸" اور لیتھو میں چھپی ہوئی جلدوں کا سائز "۱۵ × ۲۱" ہے۔ آٹھوں جلدوں

کے صفحات کی مجموعی تعداد ۳۵۱۰ ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔ جلد اول ۳۶۹، دوم ۶۳۶، سوم ۳۵۲، چہارم ۱۷۶، پنجم ۵۹۴، ششم ۴۰۰، ہفتم ۱۳۰، ہشتم ۴۰۰ صفحات۔

تاج اللغات کی تالیف میں جو علما شریک تھے ان کا مختصر تعارف ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مولوی محمد اسمٰعیل لندنی مراد آبادی مقیم لکھنؤ مولوی محمد مبین فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ ان کے والد مولوی وجیہہ الدین بحر العلوم مولوی عبد العلی فرنگی محلی کے شاگرد اور لکھنؤ میں سرکار شاہی میں داروغۂ عدالت تھے۔ مولوی اسمٰعیل عربی علم ادب میں کامل استعداد رکھتے تھے۔ مولوی تراب علی لکھنوی ان کے شاگردوں میں تھے۔ ان کی تصنیفوں میں حاشیۂ شرح تہذیب یزدی اور حاشیۂ میبذی مشہور ہیں۔ نصیر الدین حیدر نے ان کو اپنا سفیر مقرر کر کے لندن بھیجا تھا۔ اس لیے لندنی کہلاتے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک انگریز عیسائی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ آزاد خیال آدمی تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ کو انتقال کیا[۱]

مولوی فضل امام خیر آبادی اجلّہ علمائے اہل سنت میں تھے۔ علم معقول میں ان کا مثل کم پیدا ہوا۔ ان کو سرکار انگریزی سے شاہجہاں آباد کی مفتی گری دائرہ وسائرہ اور صدر الصدوری کا اعزاز حاصل تھا۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور شارح تھے۔ ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ کو انتقال کیا۔ ان کے فرزند اور شاگرد مولوی فضل حق خیر آبادی بہت بڑے عالم اور بہت بڑے معلم تھے[۲]

مولوی اوحد الدین بلگرامی عربی ادب و انشا میں شیخ احمد عرب یمنی شروانی مصنف نفحۃ الیمن کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ایک لغت نفائس اللغات کے نام سے لکھا جس میں اردو لفظوں کو اصل قرار دے کر ان کے عربی اور فارسی مترادفات بتائے ہیں۔ یہ لغت محمد علی شاہ کے عہد میں ۷ رجب ۱۲۵۳ھ کو تمام ہوا۔ سال وفات معلوم نہیں[۳]

اوحد الدین نے عربی بول چال سکھانے کے لیے کتاب مفتاح اللسان لکھی جو حروف تہجی کی ترتیب سے عربی میں سوالات مع جوابات اور ان کے اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ جس میں الف سے دال تک ہر حرف سے شروع ہونے والے سوالات ہیں، مطبع حسینی اثنا عشری، لکھنؤ میں بڑی تقطیع کے ستاون صفحوں پر ۱۲۹۱ھ میں چھپا تھا۔ اس دوسرا حصہ عین تک قریب چھپنے والا تھا[۴]

مولوی محمد اشرف لکھنوی قاضی نعمت اللہ خوشنویس کے بیٹے اور سید احمد مجاہد بریلوی کے مرید تھے۔ تدریس و تصنیف میں عمر گزاری۔ ان کی تصنیفات میں قرآن کی عربی تفسیر بھی ہے۔ عہد غازی الدین حیدر میں مولوی اوحد الدین بلگرامی، مولوی فضل امام خیر آبادی، مولوی محمد اسمٰعیل مراد آبادی اور مولوی تراب علی کے ساتھ تاج اللغات کی تالیف کے واسطے نوکر رکھے گئے۔ ۷ صفر ۱۲۶۱ھ کو وفات پائی اور جھوائی ٹولے میں اپنی مسجد میں دفن ہوئے[۵]

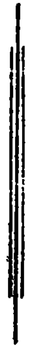
ابو البرکات رکن الدین محمد مولوی تراب علی لکھنوی ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲ صفر ۱۲۸۱ھ میں محمد آباد ضلع اعظم گڑھ میں وفات پائی۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ غازی الدین حیدر کی سرکار میں تیس روپیہ ماہوار پر تاج اللغات کی تالیف کے واسطے دوسرے چند علما کی شرکت میں چند سال ملازم رہے[۶]

مولوی سید غنی نقی رضوی زید پوری شاگرد آقا سید حسین اکثر علوم خصوصاً فنون ادبیہ و درسیہ و معقولات و لغت عرب وغیرہ میں بہت تبحر رکھتے تھے۔ بے حد ذہین و ذکی تھے۔ مباحث کلامیہ میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ بڑے متقی، مہذب اور منکسر مزاج تھے۔ بہت سے طالب علم ان کے درس کے فیض سے فاضل کامل ہو گئے۔ ان کی تالیفات سے رسالۂ فروقیہ ہے جس میں عربی کے لغات قریب المعنی کا فرق اس طور سے بیان کیا ہے کہ طب، فقہ، منطق و حکمت وغیرہ کے اہل علم کے لیے کارآمد ہے۔ اور کتاب تاج اللغات جو شاہی حکم سے لکھی گئی تھی اس میں وہ شریک غالب تھے۔ اس کا مسودہ ان کی اصلاح کے بعد صاف کیا جاتا تھا، بلکہ مشہور ہے کہ بعض مجلدات تو انھیں کی تصنیف ہیں۔ علما ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ علامہ مفتی سید محمد عباس شوشتری سے عربی نثر و نظم میں مراسلت کرتے تھے۔ ان کے بعض خطوط ظل ممدود میں درج ہیں۔ رجب ۱۲۸۰ھ میں ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا[۷]



[۱] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۸، وثمرات الانظار ج ۲ دوم ص ۷۔ [۲] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۶۴، ۱۶۵ - ۱۶۲ و تاریخ نوسنۃ [۳] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲ [۴] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۸ [۵] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۶ - ۲۵ وثمرات الانظار ج ۲ دوم ص ۳۰ - ۲۹ [۶] تذکرۂ عجب ہماقی تاریخ علمائے ونجوم السماء فی تراجم العلماء ص ۲۹۱ - ۳۹۰ وتذکرۃ العلما قلمی۔

غزل



عارف عباسی

میں آپ ہی اپنا راز داں ہوں، مرا کوئی راز داں نہیں ہے
کلام بھی ہوں، کلیم بھی ہوں، مرا کوئی ہم زباں نہیں ہے

میں واقفِ رازِ کیف و کم ہوں، ادا شناسِ مزاجِ غم ہوں
یقیں کی اس منزل حسیں میں نمودِ وہم و گماں نہیں ہے

سُنے تھے جو مطربِ ازل سے، وہی میں نغمے سُنا رہا ہوں
جنوں کی روداد کیف و مستی، بقیدِ لفظ و بیاں نہیں ہے

مزاجِ گل چیں اگر ہے برہم، تو بس مری آتشیں نوا سے
اُسے خبر کیا کہ آج گلشن میں کون آتش بجاں نہیں ہے

تجھی کو زاہد رہے مُبارک، میں ایسی جنت سے باز آیا
جہاں جنونِ طلب نہیں ہے، کشاکشِ امتحاں نہیں ہے

سجود کا مستحق نہ تھا سر تو سنگِ در تھے قدم قدم پر
نشانِ سجدہ ہوا اُجاگر تو اب کوئی آستاں نہیں ہے

میں بزمِ ساقی میں بار پاکر بھی نقشِ حیرت بنا ہوا ہوں
طلب سے بیگانہ بھی نہیں ہوں مگر طلب درمیاں نہیں

شکستہ پائی نے اور بھی کچھ بڑھا دیا ذوقِ جستجو کو
رہِ طلب میں جو رائگاں ہے، وہی قدم رائگاں نہیں ہے

نہ عشق و مستی کا وہ ترانہ، نہ ذکرِ لطفِ مئے شبانہ
کچھ ایسے چُپ ہیں جنابِ عارف کہ جیسے مُنہ میں زباں نہیں ہے

پھاگن ۱۸۸۸ شک

مارچ ۱۹۶۷ء

قدیم تہذیبوں کے نقوش

بدیع الزماں اعظمی

آثار قدیمہ کی کھوج کرنے والوں کا یہ ہم پر ایک احسان ہے کہ انھوں نے اپنی صبر آزما محنت سے زمانہ سلف کے فن کاروں کے تخلیق کردہ نوادر برآمد کرکے ہمیں اس بات کا موقع دیا کہ ہم اس دور کی تہذیبی خصوصیات کا ایک اندازہ کر سکیں۔ ان نوادر میں سے بیشتر تو عوامل شکست و ریخت کے نتیجے میں برباد ہو چکے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو ہزاروں سال تک مدفون رہنے کے بعد آج بھی محفوظ ہیں۔ ان میں سے وہ نمونے جو شاہکار کہے جانے کے مستحق تھے ہمارے عجائب خانوں کی زینت بھی بنے ہوئے ہیں اور جنھیں دیکھ کر ہم تصویر حیرت بن جاتے ہیں۔

محققین اس امر پر متفق ہیں کہ انسان نے فن معماری سیکھنے سے بہت قبل فن مصوری، فن سنگ تراشی اور فن رنگ آمیزی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ فن رنگ آمیزی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تاریخ انسانی ہے۔ آج سے بیس ہزار سال قبل کا زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں جنوبی فرانس اور شمالی اسپین میں بنی نوع انسان کی جو ٹولیاں آباد تھیں انھوں نے اپنے غاروں کی دیواروں پر مانوس جانوروں کی تصویریں بنا کر انھیں مزین کر لیا تھا۔ التمرہ (اسپین) کے غاروں میں ارنے بھینسوں، جنگلی سور، ہرن، گھوڑوں اور گائے بیلوں کی درجنوں رنگین تصویریں دیکھی گئی ہیں۔ ان اولین فن کاروں کی بنائی ہوئی تصاویر زندگی سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ اسی طرح فرانس کے فانٹ ڈی گوم (FONT - DE - GAUME) اور لاکمبریلیز (LES COMB=RELLES) کے غاروں میں مختلف جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جن میں مستودن رہاتھیوں کا مورث اعلیٰ) اور گینڈوں کی تصویریں اہل یورپ کے لیے خصوصی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں کیونکہ ان تصویروں میں ان کے جسم کو بال کے گچھوں سے ڈھکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس وقت یورپ یقیناً یخ کے زمانے کے بعد والے دور سے گذر رہا ہوگا۔ ان غاروں میں کھدائی کے بعد نہ صرف پتھر کے اوزار اور اسلحے دستیاب ہوئے ہیں بلکہ پتھر، ہڈی اور ہاتھی دانت پر کندہ ایسی تصویروں کے نمونے بھی برآمد ہوئے ہیں جنھیں دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے لوگ جانوروں اور مچھلیوں کا شکار کرلیتے تھے اور آگ کا استعمال جان گئے تھے۔

وادی نیل۔ مصر بھی اس قسم کے فن کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ نیل کی وادی نے دنیا کی قدیم ترین تہذیب کو جنم دیا۔ تاریخ کی ابتدا سے چار یا پانچ ہزار برس قبل ہی اہل مصر پتھر اور ہاتھی دانت پر کھدائی کے کام میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ ابتدا میں اُن کا ذوق مصوری اور ذوق سنگ تراشی ذاتی خواہشات کی تکمیل تک محدود تھا۔ اُن کی بنائی ہوئی تصویریں بہت ہی نیچرل ہوتی تھیں جیسا کہ دیواروں پر کندہ انسانی تصویروں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ مگر بعد میں جب مصر میں بادشاہوں کا اقتدار ہوا تو مصری فن مصوری اور فن سنگ تراشی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فراعنۂ مصر نے اپنے کو مافوق الفطرت انسان بنا کر پیش کرنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنی رعایا پر اپنی سطوت اور جبروت کا سکہ جمانے کے لیے خود کو اُن کا مذہبی

پیشوا اور قابلِ پرستش دیوتا قرار دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مصری آرٹ میں منظر نگاری کا عنصر دب کر شخصیت پرستی کا عنصر غالب آگیا جس کے نتیجے میں دیو قامت سنگی مجسمے، پہاڑ جیسے مقبرے، عالی شان محلات اور شاندار معابد ظہور پذیر ہوئے۔ شاہی مقبرے یا اہرامِ مصری پائیداری کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ سلاطینِ مصر نے اپنے محلات کے برعکس اپنے مقبروں کی تعمیر اس نہج پر کی تھی کہ وہ ہمیشہ قائم رہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ان خواب گاہوں کو ابدی مسکن کا لقب دے رکھا تھا۔

تاریخی پس منظر۔ ایک مصری مورخ مسمّی مانیتھو (MANETHO) نے سنہ ۳۰۰ ق م میں مصر کی تاریخ مرتب کی تھی۔ اس نے شہنشاہ مینز (MANES) سے سکندرِ اعظم تک یعنی سنہ ۳۰۰۰ ق م سے لے کر سنہ ۳۰۰ ق م تک سلاطینِ مصر کو تیس خاندانوں میں تقسیم کیا تھا۔ ابتدائی چھ خاندانوں پر پہلے دور کی سب سے قدیم حکومتیں مشتمل تھیں اور چوبیس خاندانوں پر درمیانی دور کی حکومتیں۔ اختصار کے خیال سے صرف ابتدائی چھ خاندانوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پہلے خاندان کا پہلا تاجدار مینز (MANES) تھا جس کا پائیہ تخت جنوبی مصر میں شہر ٹینز (THINIS) تھا۔ اس نے سنہ ۳۰۰۰ ق م میں شمالی اور جنوبی مصر کو متحد کر کے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پہلے اور دوسرے خاندان کی تہذیبی خصوصیات یکساں تھیں۔ ان دونوں خاندانوں میں سلاطین کی مجموعی تعداد اٹھارہ تھی، جنھوں نے تقریباً ڈھائی سو برس تک حکومت کی۔ ان کے عہدِ حکومت میں فنِ معماری، سنگ تراشی اور بت گری میں بتدریج ترقی ہوتی گئی جس کے نتیجے میں اہرام سازی کے دور کا آغاز ہوا۔

اہرامِ مصری۔ تیسرے خاندان کا پہلا بادشاہ ژوزر (ZOSER) تھا جس نے قاہرہ کے قریب ممفس (MEMPHIS) کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ یہ پہلا تاجدار ہے جس نے پہلا ہرم تعمیر کرایا۔ یہ زینہ دار ہرم ہے جو غازہ (GIZA) کے اہرام کے جنوب میں سقارہ کے مقام پر آج بھی باقی اور اپنے بنوانے والے کی عظمت کا گواہ ہے۔ اس ہرم کی تعمیر میں اگر ژوزر (ZOSER) کے لائق وزیر امین السیف (IMHOTEP) کا ہاتھ نہ ہوتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا ہوتا۔ امین السیف مصر کی تاریخ میں اپنی گوناگوں صلاحیت کی بنا پر زندۂ جاوید ہے۔ وہ ایک زیرک انسان اور مدبر، انجینیر، مذہبی قائد، طبیب حاذق، فنونِ لطیفہ کا مربی اور ضرب الامثال کا خالق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سکندرِ اعظم کے جانشین بطلیموس کے عہد میں اس کا رتبہ ایک دیوتا کا ہو گیا۔ اس خاندان کے سلاطین نوے سال تک حکومت کرتے رہے۔

چوتھا خاندان سنہ ۲۶۸۶ ق م میں برسرِ اقتدار آیا۔ اس خاندان کے سلاطین اپنے مستحکم اور پائیدار اہرام کی تعمیر کے لیے مشہور ہیں۔ خوفو (KHUFU) اس خاندان کے سلاطین میں سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار تھا۔ اس نے غازہ کے مقام پر ہرمِ اعظم تعمیر کرایا۔ اس کے بعد چار اور حکمراں گذرے ہیں۔ ان میں سے دو کا نام اپنے بنوائے ہوئے اہرام کی بدولت زندہ ہے۔ خفری (KHAFRE) اور منکری (MUNKARE)۔ ان دونوں نے غازہ کے مقام پر اہرام نمبر ۲ اور نمبر ۳ تعمیر کرائے۔ یہ تینوں اہرامِ مصری باہوش سنتریوں کی طرح نہ صرف نیل کے بہاؤ کو بلکہ وادیٔ نیل میں ہونے والے واقعات اور رونما ہونے والے انقلابات کو ہزاروں سال سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ اگر قدرت انھیں قوتِ گویائی عطا کر دے تو نیل کے سارے رازہائے سربستہ عیاں ہو جائیں۔ آئیے ہم بھی غازہ کے مقام پر ایستادہ اہرامِ مصری میں سب سے بڑے مقبرے کی جسامت کا ایک جائزہ لیں۔

یہ شاہی مقبرہ شہنشاہ خوفو نے اپنی ابدی آرام گاہ کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا کہ کبھی بھی کوئی بشر مدفون خزانے کے لالچ میں اس مقبرے کے اندر داخل ہو کر شہنشاہ کی ابدی نیند میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ پانچویں صدی قبل مسیح کا ایک یونانی مورخ مسمّی ارودن (HERODOTUS) نے لکھا ہے کہ اس مقبرے کی تعمیر کے سلسلے میں مزدوروں، کاریگروں اور انسپکٹروں کی مجموعی تعداد تقریباً ایک لاکھ یومیہ تھی جنھوں نے دن رات کام کر کے بیس سال میں اس کی تعمیر مکمل کی۔ یہ مقبرہ تیرہ ایکڑ زمین پر ایستادہ ہے اور مکمل مربع شکل میں ہے۔ اس کی زیریں منزل کے ہر پہلو کی چوڑائی ۷۵۵ فٹ ہے یعنی اس کا گھیر نصف میل سے بھی زیادہ ہے۔ اونچائی ۴۸۰ فٹ ہے جو آج کل کی ۴۸ منزلہ اونچی فلک بوس عمارتوں کی بلندی کے برابر ہے۔ اس ٹھوس مقبرے کی تعمیر میں زرد پتھر کے قدِ آدم سے

بھی بڑے تقریباً ۲۸ لاکھ ٹکڑے استعمال کیے گئے ہیں۔ ہر ٹکڑے کا وزن ساڑھے تین ٹن بتایا جاتا ہے۔ گویا اس کے ملبے سے ایک ایسے شہر کی تعمیر کی جا سکتی ہے جو پانچ پانچ منزلہ اونچے بائیس ہزار مکانات پر مشتمل ہو۔ اس عظیم الشان مقبرے کے ہر پہلو کی باہری پرت سفید چونے کے پتھر کی بنی ہوئی ہے جو دن کے وقت سورج کی کرنوں سے چمکتی رہتی ہے۔

ان اہرام کی سب سے بڑی خصوصیت جو آج کل کے انجینیروں کو محو حیرت بنائے ہوئے ہے یہ ہے کہ ان کے ہر چار پہلو ٹھیک ٹھیک شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کی سمت میں مکمل مربع کی شکل میں ہیں۔ کیا مجال کہ کسی منزل پر بھی ایک انچ کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حصے کا بھی فرق نکل آئے۔ یہ اہرام حدود مصر کے اندر ہی نہیں پائے جاتے بلکہ اس قسم کی دیوقامت عمارتیں سوڈان، الجزائر اور ہزاروں میل دور سمندر پار وسطی امریکہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔

ابوالہول۔ غازہ کے اہرام کے قریب ہی تقریباً چوتھائی میل کے فاصلے پر مصر کا ایک دوسرا عجوبہ ابوالہول ہے۔ یہ ایک سنگی مجسمہ ہے جسے فنکس (SPHINX) بھی کہتے ہیں۔ کسی کو پتہ تک نہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ بھی کچھ وثوق کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ اس کی تعمیر کی غایت کیا تھی اور اس کی عمر کتنی ہے۔ بہر حال عام خیال یہ تھا کہ یہ سورج دیوتا کی قائم مقامی کرتا تھا۔ غالباً اہرام کے مقابلے میں یہ زیادہ قدیم ہے۔ ابھی چند سال پیشتر کی بات ہے کہ اس کا نچلا حصہ ریت کے تودوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مصری حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ کی نگرانی میں آٹھ سو مزدوروں کی متعدد ٹولیوں نے اسے چھ مہینے میں صاف کیا۔ یہ دیوقامت سنگی مجسمہ ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ اس کی شبیہ ایک بیٹھے ہوئے شیر کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا چہرہ انسان جیسا ہے۔ اس کی لمبائی پنجہ سے دُم تک دو سو چالیس فٹ ہے اور اونچائی ۶۵ فٹ۔ پیشانی سے ٹھڈی تک چہرے کی لمبائی ۳۳ فٹ، منہ کی چوڑائی ۷½ فٹ اور ناک کی لمبائی ۵½ فٹ ہے۔ اس کے کان پانچ پانچ فٹ لمبے ہیں۔ اس مجسمے کا سب سے بڑا کمال جسامت کے اعتبار سے اعضاء کی موزونیت ہے۔



ابوالہول نامی سنگی مجسمہ یا فنکس (SPHINX)
نوٹ:- دونوں پنجوں کے درمیان بنا ہوا معبد ملاحظہ فرمایئے

فنکس (SPHINX) دراصل یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں گلا گھونٹنے والا۔ اس سے ایک ایسی خوفناک شخصیت متصور کی جاتی تھی جس کا چہرہ نسوانی تھا اور دھڑ شیر جیسا۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کے دو بازو بھی تھے۔ یونانی دیومالاؤں میں اس کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کا وطن افریقہ تھا۔ دیوتاؤں نے اسے یونان کے شہر سیبی (THEBES) میں اس غرض سے بھیج دیا تھا کہ وہ وہاں کے بانی حکمران کو اس کی بداعمالیوں کی سزا دے۔ یہاں پہنچ کر اس نے شہر کے قریب ایک چٹان کو اپنا مسکن بنا لیا۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق روزانہ ایک آدمی اس پر بھینٹ چڑھنے کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ عجیب الخلقت ہستی اُس سے سوال کرتی کہ وہ کون سی مخلوق ہے جو صبح کو چار، دوپہر کو دو اور شام کو تین ٹانگوں پر چلتی ہے۔ جو شخص بھی اس پہیلی کا حل نہ بتا سکتا وہ اس کے دہن کا لقمہ بن جاتا۔ بالآخر ایک دن ہونہار نوجوان اوڈیپس (OEDIPUS) کی باری آئی۔ اس نے پہیلی کے جواب میں کہا کہ انسان وہ مخلوق ہے کہ جو صغرسنی میں چار ٹانگوں پر، جوانی میں دو ٹانگوں پر اور بڑھاپے میں لاٹھی کا سہارا لے کر گویا تین ٹانگوں پر چلتا ہے۔ پہیلی کا صحیح حل پا کر فنکس (SPHINX) نے خود کو چٹان سے گرا کر خودکشی کر لی اور اس طرح اہل سیبی (THEBES) کو اس کی ہلاکت آفرینی سے نجات مل گئی۔

جب اہل یونان مصر میں آئے تو انھوں نے فراعنہ مصر کے تراشے

ہوئے محیرالعقول دیو قامت پتھر کی مجسموں کو جن کا چہرہ انسان کا اور دھڑ جانوروں کا تھا دیکھ کر انھیں فنکس کے نام سے موسوم کیا۔ حالانکہ یہ مجسمے فی الحقیقت فراعنہ مصر کی شان و شوکت اور جبروت کے علمبردار تھے۔

مصر کی قدیم عمارتوں میں غازہ کے اہرام اور فنکس کے علاوہ کرناک اور لکسر کے شاہی محلات اور مقبرے دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے کھنڈر ان کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ لکسر کے قریب دریائے نیل کی دوسری جانب فراعنہ مصر کے شاہی مقبروں اور فنکس کا گویا ایک پورا شہر بسا ہوا ہے۔ یہ حصہ شاہی وادی کہلاتا ہے۔ اگر آپ اس شہر خموشاں کی سیر کو جائیں تو آپ ایک ہفتے میں بھی اس کی شان و شوکت کا نصف حصہ بھی نہ دیکھ پائیں گے۔ ان مقبروں میں سب سے زیادہ دل کش مقبرہ ملکہ آسیہ (HATSU) کا ہے۔ اس ملکہ کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون کی یہ وہی ملکہ تھی جس نے حضرت موسیٰ کی خود حفاظت کی تھی۔ انھیں مقبروں میں کھدائی کے بعد سنہ ۱۹۲۲ء میں پانچویں خاندان کے ایک نامور تاجدار توتاخامن (TUTAN KHAMAN) کا مقبرہ بھی پایا گیا ہے۔ کھدائی میں نہ صرف توتاخامن کی مومیائی نعش برآمد ہوئی ہے بلکہ ہر قسم کے دلآویز فرنیچر، زرنگار تخت شاہی، طلائی مسہری، نقرئی صندوق، مرصع رتھ، دوم بتیاں اور منقش ظروف بھی دستیاب ہوئے ہیں جو سونے کے پترے سے منڈھے گئے ہیں اور دستکاری کے حسین نمونے ہیں۔

خاندان ششم کے حکمراں سنہ ۲۴۲۰ ق م سے سنہ ۲۲۷۰ ق م تک حکومت کرتے رہے۔ اس خاندان کے آخری تاجدار کے عہد حکومت ہی میں شیوخ البلاد نے طاقت پکڑ لی۔ وہ اپنی اپنی جگہ آزاد حکمراں بن بیٹھے۔ اس طرح سلطنت بٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی۔ امراء ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو گئے۔ مصری حکومت کی سالمیت ختم ہوتے ہی مصر پر غیر ملکی حملے شروع ہو گئے۔ تقریباً ۳۰۰ برس تک افراتفری کا دور رہا۔ بالآخر امراء متحد ہوئے اور از سر نو دوسرے دور کی مستحکم حکومت کی بنیاد پڑی۔

دجلہ اور فرات کی وادی۔ جس طرح وادی نیل کی گود میں قدیم مصری تہذیب کا جنم ہوا اسی طرح مغربی ایشیا میں دجلہ اور فرات کی وادی بھی ایک قدیم تہذیب کا گہوارہ رہ چکی ہے۔ یہاں بھی اسیریا اور بابل جیسی زبردست سلطنتوں کا عروج ہوا۔ لیکن اسیریا اور بابل کے فن معماری کو وہ پائداری حاصل نہ ہو سکی جو مصری فن معماری کو حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بابل اور نینوا جیسے عظیم الشان اور شہرۂ آفاق شہر آج ریت کے ٹیلوں کے مانند دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ان شہروں کی کھدائی کے بعد جو محل، عمارتیں اور نوادر برآمد ہوئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابلی فن معماری جن خصوصیات کا حامل تھا وہ مصری فن معماری کو نصیب نہ ہو سکا۔ دیواروں کو انواع و اقسام کی مینا کاری کی تختیوں سے مزین کرنا اور اُن پر اُبھری ہوئی ایسی تصاویر بنانا کہ بظاہر متحرک معلوم ہوں ان کے فن کا طرۂ امتیاز تھا۔ بابلی سنگ تراش جانوروں اور انسانوں کے مجسمے بنانے میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ برٹش میوزیم میں رکھا ہوا زخمی شیر کا مجسمہ جو اس کی جان کنی کا عالم پیش کرتا ہے، اتنا نیچرل ہے کہ فن سنگ تراشی کا شاہکار کہے جانے کا مستحق ہے۔ خورس آباد میں کھدائی کے بعد ایک شاہی محل کا پتہ چلا ہے۔ محل کے قریب سات منزلہ اونچا ایک معبد بھی ملا ہے جس کی ہر منزل مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ اس کی سات منزلیں سات سیاروں سے منسوب تھیں۔ دجلہ اور فرات کی وادی فن کاروں کی سرزمین کہی جاتی تھی۔ بابل کا معلق باغ اس کی بین دلیل تھی۔ یہ باغ اپنے زمانے کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

بابل کا معلق باغ۔ بغداد سے پچاس میل کی دوری پر دریائے فرات کے کنارے ایک بہت قدیم شہر کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شہر اپنے زمانے کے بڑے شہروں میں ایک عجوبہ تھا جسے دیکھنے کے لیے دور دراز ممالک سے لوگ جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ اس کا نام بابل تھا۔ بابل کا شہنشاہ بخت نصر (NEBUCHADNEZZAR) نے سنہ ۶۰۴ ق۔م۔ سے سنہ ۵۶۱ ق م یعنی ۴۴ سال تک حکمراں رہا۔ اس شہر کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ یہ شہر خوابوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ اس میں بہت سے عجائبات تھے جن میں معلق باغ کو ایک خصوصی درجہ حاصل تھا۔ بخت نصر کی حسین ترین ملکہ امیتی (AMYTIS) جو شمال مشرق کے سرسبز پہاڑی خطے کے دل کش مناظر کی گود کی پلی ہوئی تھی، بابل کے خشک علاقے میں آکر پریشان اور مغموم رہا کرتی تھی۔ بخت نصر نے اس کا غم غلط

کرنے کے خیال سے پہاڑی ماحول پیدا کرنے کے لیے اپنے محل کے اوپر معلق باغ لگوا کر اُسے ارضی جنّت کا درجہ دینے کی کوشش کی۔ یونانی مورخ ڈیڈورس (DIODORUS) نے اس عجیب و غریب باغ کا جو بیان قلم بند کیا ہے اس کی رو سے یہ باغ اپنی مثال آپ تھا۔ وہ رقمطراز ہے کہ دیکھنے میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ باغات کسی جادو یا سحر کے زور سے ہوا میں معلق تھے۔ یہ ایک دوسرے کے اوپر زینے دار لگے ہوئے تھے۔ سب سے نچلا باغ بھی سطح زمین سے قدرے اونچا ہی تھا۔ یہ باغ اونچی اونچی وسیع محرابوں کے اوپر لگائے گئے تھے۔ ان محرابوں کی بلندی ستر ستر فٹ تھی۔ باغ کا مجموعی رقبہ چار ایکڑ تھا اور سب کے سب مربع شکل میں تھے۔ محرابوں میں لگی ہوئی جستے کی موٹی چادروں پر مٹی اور کھاد کی اتنی مقدار ہوتی تھی جو قد آور درختوں کو اُگانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ درختوں اور پودوں کو سینچنے کا معقول انتظام تھا۔ بالائی منزل والے باغ کے اوپر پانی کی ٹنکی بنی ہوئی تھی اور وہیں سے پانی ہر منزل والے باغ کو ملتا تھا۔ ٹنکی میں پانی دریائے فرات سے پمپ ہو کر جاتا تھا۔ محل کی بالائی منزل سے پورے شہر بابل اور گرد و نوا کی سیر کی جا سکتی تھی اور شہر کے وسطی حصے سے بل کھا کر گزرتے ہوئے دریائے فرات کا حسین منظر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

ہر باغ کے اندر سنگ مَرمَر کے بنے ہوئے ضیافت خانے بھی تھے جن کی دل آویزی پچی کاری کی رہینِ منت تھی۔ ان کی دیواریں پرانی دیو مالاؤں کی رنگ بھری تصاویر سے مزین تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد خلوت خانے بھی تھے جہاں روزانہ رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ مخملیں گھاس کے تختوں کے مرکز میں خوبصورت پختہ حوض تراش کر بنائے گئے تھے جو یا تو کسی پھول کی شبیہ تھے یا بادشاہ اور بادشاہ بیگم کے ناموں کے ابتدائی حروف کی شکل کے تھے۔ ان کے اندر کنول کھلے رہتے تھے اور رنگین مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ حوض میں فوّارے بھی لگے ہوئے تھے جن سے اُچھلتی ہوئی پانی کی خاموش دھاریں سورج کی شعاعوں سے منعکس ہو کر قوسِ قزح کا سماں پیش کرتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ تیرنے کی مشق کے لیے بڑے بڑے پختہ تالاب بنے ہوئے تھے جن کا پانی حسب منشا رنگین کر دیا جاتا تھا جیسے بنفشی، ارغوانی، آسمانی وغیرہ۔ فوّاروں سے نکلتا ہوا خاموش پانی اور مصنوعی آبشاروں سے گرتا ہوا پُرشور اور کف آلود پانی ایک دلکش منظر پیش کرتا رہتا تھا۔ باغوں میں انواع و اقسام کی چڑیاں اپنے شیریں نغمات سے دلوں کو مسحور کرتی رہتی تھیں۔ ان باغات کے اندر شیش محل بھی بنے ہوئے تھے اور اس طرح آئینہ بندی کی گئی تھی کہ ان محلوں میں بچھے ہوئے دبیز قالینوں اور صوفوں پر لیٹ کر جسم کے مختلف پوز دیکھے جا سکتے تھے۔ باغ کے اندر مخصوص جگہوں پر سنگ مرمر کے مجسّمے بھی نصب تھے جن سے مذہبی عقائد اور اہم تاریخی کارناموں پر روشنی پڑتی تھی۔ فن کے اعتبار سے یہ مجسّمے اپنے دور کے شاہکار کہے جا سکتے تھے۔ باغ کے اشجار پھولوں سے ڈھکے اور پھلوں سے لدے رہتے تھے۔ دیواروں سے انگور کی بیلیں لٹکتی رہتی تھیں جن میں لگے ہوئے انگور کے خوشے آنے جانے والوں کو دعوتِ نظر دیا کرتے تھے۔ کھجور اور چھواروں کی وہ افراط تھی کہ غلاموں اور پرندوں کے کھانے کے بعد بھی درخت پھلوں کے بوجھ سے جھکے رہتے تھے۔ سارے باغ کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے ہوئے لیموں کے درختوں سے رس بھرے پھل ملتے تھے جو اس علاقے کی خشک آب و ہوا میں پیاس بجھانے کے لیے امرت رس کا درجہ رکھتے تھے۔

ایسے جنت نشان باغ کے اندر بادشاہ بیگم اپنی کنیزوں کے ساتھ اپنے فرصت کے لمحات بسر کرتی تھی اور شہنشاہ بخت نصر بھی جب ریاستی اُمور سے فارغ ہوتا تو اسی باغ میں آ کر ملکہ کے ساتھ سیر و تفریح میں مشغول ہوتا تھا۔

وادیٔ سندھ۔ مصر اور عراق کی طرح برصغیر ہند میں بھی سندھ اور گنگا کی وادی ایک معیاری تہذیب کی علمبردار رہ چکی ہے جس کا ثبوت ہمیں وادیٔ سندھ میں موہن جوڈرو اور ہڑپا کے قدیم اور مدفون شہروں کی کھدائی کے بعد مل رہا ہے۔ یہ دونوں شہر ایک دوسرے سے چار سو میل کی دوری پر بسے ہوئے تھے۔ موہن جوڈرو اگرچہ آج سندھ کے ریگستانی علاقے میں سندھ ندی سے ساڑھے تین میل دور ہے مگر یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ اس شہر کی تعمیر ندی کے کنارے ہی ہوئی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اس اثنا میں ندی نے اپنا راستہ بدل دیا ہو۔ ان دونوں شہروں سے جس تہذیب اور جس کلچر کی نشانیاں ہمیں مل رہی ہیں وہ اس مفروضے کو غلط ثابت کر رہی ہیں کہ آریوں کے آنے کے قبل برصغیر ہند

تہذیب و تمدن میں بہت پچھڑی ہوئی حالت میں تھا۔ اب ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑ رہا ہے کہ آسیہ لوگوں کے قبل کی قوموں کا معیار زندگی کافی بلند ہو چکا تھا۔ کھیتی باڑی ان لوگوں کا خاص پیشہ تھا۔ [illegible] اناج پیدا کیے جاتے تھے جن میں گیہوں سب کا اسپیشل تھا۔ گیہوں کے دانے جو پتھر کے ظرف میں رکھے ہوئے محفوظ پائے گئے ہیں سائز میں کافی بڑے اور موٹے ہیں۔ چاندی کے ایک برتن پر لپٹا ہوا سوتی دھاگا اور کپڑے کے ٹکڑے بھی ملے ہیں جو اس بات کے ثبوت ہیں کہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے فن کی ایجاد ہو چکی تھی۔

موہن جو ڈرو کی کھدائی کے بعد عمارتوں کی نو عدد تہیں ملی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ شہر کئی بار بسا اور برباد ہوا ہوگا۔ اوپری سطح کے مکانات کی عمر ڈھائی ہزار برس قبل مسیح سے کم نہ ہوگی تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ابتدائی دور میں بھی پختہ اینٹیں عمارتوں کی تعمیر میں استعمال کی گئی تھیں جبکہ اسی زمانے میں مصر کے اندر ایسی اینٹوں کے استعمال کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ عراق میں ان کا استعمال عام تھا۔ اس شہر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ سارے شہر کی سڑکیں سیدھی اور ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتی تھیں۔ ہر مکان کے اندر کشادہ صحن ہوتا تھا اور صحن میں پکی کنواں اور نہانے کے لیے پختہ حوض ہوتا۔ شہر کے وسطی حصے میں ایک بڑا اور پختہ تالاب بھی بنا ہوا تھا جسے مقدس ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ایک بڑا حمام بھی تھا جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے متعدد حمام بنے ہوئے تھے جن میں گرم اور سرد پانی کا انتظام رہتا تھا، جہاں لوگ بڑے اہتمام کے ساتھ نہایا کرتے تھے۔ شہر کا سارا گندہ پانی پختہ نالیوں کے ذریعے ایک بڑے نالے میں گرتا تھا جو اسے بہا کر سندھ ندی میں ڈال دیتا تھا۔ بت گری اور برتن سازی کے فن کے نمونے کافی تعداد میں برآمد ہوئے ہیں مٹی کے ظروف اور مٹی کے کھلونے کثیر تعداد میں ملے ہیں۔ کھلونوں میں جھنجھنے، سیٹیاں اور گاڑیاں مخصوص ہیں۔ مٹی کی بنی ہوئی مورتیوں میں گڈے اور گڑیاں، چڑیوں اور جانوروں کے مجسمے خصوصی درجہ رکھتے ہیں۔ برآمد ہونے والی مورتیوں میں کانسے کی بنی ہوئی ایک ایسی مورت بھی ملی ہے جس میں شیوجی کو رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس مورت کو دیکھ کر اس دور کے فن رقص کا بھی قدرے اندازہ ہوتا ہے۔ شیوجی کی پوجا یہ لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے تھے۔ ایک دوسری مورت میں انھیں ہرن پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ سر پر سینگوں کا تاج ہے، گلے میں ایک مالا اور ہاتھوں میں متعدد کڑے۔ چار منہ والے شیوجی کے تین چہرے تو نمایاں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چوتھا چہرہ پشت کی جانب ہو۔ شیوجی ایک ہرن کے اوپر آسن جمائے ہوئے بیٹھے ہیں اور ایک شیر، ایک بھینسا اور ایک گینڈا انھیں حلقے میں لیے ہوئے پر امید نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

کھدائی میں پتھر اور ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تقریباً دو ہزار مہریں بھی دستیاب ہوئی ہیں جو بابل اور نینوا کے کھنڈرات سے برآمد کی گئی مہروں کی شبیہہ ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بابلی تہذیب کے اثرات یہاں تک پہنچ چکے تھے۔ بیشتر مہروں پر عام جانوروں، جیسے گائے، بیل، بھیڑ، بکری، اونٹ، ہاتھی، شیر، ہرن، گینڈا، گھڑیال وغیرہ کی شکلیں کندہ ہیں۔ بعض مہروں پر کشتیوں کے نمونے بنے ہوئے ہیں جن سے ان کے ذوق کشتی رانی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض مہروں پر دیوی اور دیوتاؤں کی شبیہہ کندہ ہے جن کے قدموں پر جانوروں اور انسانوں کی قربانی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ غرضکہ ان مہروں پر انواع و اقسام کی تقریباً چار سو شکلیں بنی ہوئی ہیں جن سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ خط تصویری (PICTOGRAPH SCRIPT) کے نمونے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ لوگ فن تحریر سے بھی واقف تھے اور ان کی تحریر عربی خط کی طرح دائیں سے بائیں کو جاتی تھی۔ ان مہروں کو پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو نہ صرف نئی نئی باتوں کا انکشاف ہوگا بلکہ ماضی بعید کے اس دور کی تاریخ بھی مرتب کی جا سکے گی۔

غرض یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ لوہے اور دھات کے زمانے کی ابتدا اس برصغیر پر دنیا کے اور خطوں کے مقابلے میں پہلے ہوئی۔ محققین کا خیال ہے کہ لوہے کو گلانے اور صاف کرنے اور اس سے کارآمد اشیا بنانے کے فن میں ہمارا ملک سب ملکوں کا قائد تھا۔ بالخصوص یورپ تو اس فن میں ہمارا رہین منت ہے۔ ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔



ایسا کہاں سمندر

[illegible]

ساحل پر لائیں کسی تشنہ لب کو

ہم ہیں جنگلے والے صحرا

پھیل رہے ہیں خطہ خطہ

جیسے زہر کسی ناگن کا

جسم میں رہ رہ کر چڑھتا ہے

کون ساگر ہے ساگر ایسا

نگلے جو گندے نالوں کو

جھیلے جو اپنے سینے پر

جلے آگ بھرے نیزوں کے

لیکن سر پہ اٹھائے [illegible] تیرا!

پربت سر پہ [illegible] پر

بھر بھر چھاگل امرت جل کی

چھاگل ۰۰۰ اشک

تاج محل

عرشی کاظمی

اے تاج محل! شہر خموشاں تو نہیں تو

یہ سرو قداں سیم بران زہرہ جبیناں — یہ شعلہ رخاں لالہ رخاں مہر جمالاں
جیسے کوئی لیلیٰ کوئی عذرا کوئی سلمیٰ

جیسے کسی شیشے میں اُتارا ہو پری کو — جیسے چمنستاں میں کوئی حور کھڑی ہو
یا کشتیِ مہتاب سرِ ساحلِ جمنا

یا کوئی کرن پرتوِ مہتاب ہوئی ہے — یا کوئی کلی ہنس کے ابھی پھول بنی ہے
یا ٹوٹ پڑا ہے کوئی آکاش سے تارا

یہ سحر سی جادو سی جنوں خیز فضائیں — یہ شہد سی امرت سی مطرب پر لہرائیں
[illegible]

بوندوں میں جیسے کہکشاں پھول رہی ہے — [illegible] قوسِ قزح جھول رہی ہے
ہر نقش [illegible] میں ہوا ہے نکھرا

زنجیر شگوفوں کی وہ خوش [illegible] — [illegible] بہاروں کا وہ جادو
[illegible]

تو حسن ہے تو عشق ہے [illegible] — [illegible]
تو پیار کی آواز ہے [illegible]
اے تاج محل! شہر خموشاں تو نہیں تو
اے جنت نظارہ! بیاباں تو نہیں تو

جدید افسانے کا ذہنی سفر

دیوانند راہی

جدید افسانے کا اگر سب سے بڑا کوئی کارنامہ ہے تو یہ کہ اس نے انسان کے آزاد اور ذاتی وجود کو ہر طرح کی جبریت کے خلاف ادب میں مستقل حیثیت عطا کی۔ اس کا محرک ایک ایسے فلسفے کو ہے جو فلسفے کی رو سے ہی نہیں بلکہ اس سے باہر ادبی فکر کے روپ میں بھی کافی مشہور ہے۔ یہ فلسفہ ہے وجودیت کا۔ وجودیت پرستی نے جہاں زندگی کے بے معنی ہونے کے تصور کو ادب کا مرکزی موضوع بنانے کی کوشش کی ہے وہاں انسانی ارادے اور عمل کی آزادی کی قدر کو بھی قبول کیا ہے۔

جدید افسانہ آدمی کو ایک "وی۔ آئی۔ پی" کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے اور فطرت پرست نقطۂ نظر کے خلاف شخصیت کے پیچیدہ اور پوشیدہ محرکات اور محسوسات کی عکاسی کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فرائڈ نے انسان کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کے لاشعور کا تجزیہ کر کے افسانے میں عمیق کردار نگاری کو زیادہ مقبول بنایا ہے۔ لیکن اپنے آخری تجزیے میں فرائڈ نے انسان کو اپنی لاشعوری رو، بچپن کے کامپلکس اور اندھی جبلتوں کا نابینا غلام بنا دیا اور اس طرح انسان سے اس کے انتخاب، ارادے اور عمل کی آزادی اور اخلاقی نظر اور جمالیاتی لذت چھین کر اسے عدم اعتماد کے گہرے خلا میں پھینک دیا۔

فرائڈ کے نظریات نے جہاں انسان کو سماج اور تہذیب کے خلاف بلند تر دیا، وہاں انجام کار اسے نفسیاتی جبریت کا حقیر شکار بھی بنا دیا۔ فرائڈ کے نظریات نے نئی طرح کی حقیقت نگاری کو جنم دیا۔ جسے نفسیاتی حقیقت نگاری یا عین حقیقت نگاری بھی کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ فرائڈ کے نظریات کی اشاعت سے قبل بھی فطرت نگاری اور حقیقت پرستی کے رجحانات افسانے میں غالب رہے ہیں، لیکن ان میں نفسیات کے سائنٹفک تجزیے اور لاشعور کے نظریے کی اہمیت نہیں تھی۔ فرائڈ نے نفسیاتی حقیقت نگاری ہی کی نہیں سمبالزم اور خواب کی علامتوں پر مبنی سرریلزم کی بھی ترویج کی جو نفسیاتی حقیقت نگاری ہی کا نمونہ قرار دی جائے گی۔

فرائڈ کے زیر اثر نفسیاتی حقیقت نگاری بھی جبریت کے نظریے کا شکار ہو گئی۔ دراصل حقیقت پرستی کے ہر روپ میں جبریت کا یہ نظریہ ضرور کارفرما رہا ہے۔ چاہے وہ فطرت نگاری ہو یا مارکس کی سماجی حقیقت نگاری۔ فطرت نگاری آدمی اور اس کے گرد و پیش کی ڈاکومنٹری یا سائنٹفک رپورٹ پیش کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس میں کسی اخلاقی پہلو یا آدرش کو دخل نہیں۔ یہ حقیقت کو بے لاگ خارجیت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ ان "زندگی کے ٹکڑے" قسم کے افسانوں میں ایک خاص طرح کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو زندگی کے قنوطی اور تاریک پہلو کو عیاں کرتا ہے۔ چنانچہ اس رجحان کے تحت زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اور روزمرہ واقعات کی معمولی معمولی تفصیلات کو بے کم و کاست پیش کرنا معراج فن ٹھہرایا جانے لگا۔ فطرت نگاری میں زندگی کی ہو بہو عکاسی کو اہمیت حاصل ہے۔ گویا زندگی اپنے وسیع اور پیچیدہ دائرے سے نکل کر تجربہ گاہوں میں خوردبین کے نیچے معائنہ کیے جانے والا کیس (CASE) بن گئی۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ فطرت نگاری زندگی کے بارے میں میکانکی طرز فکر اور جبریت کی قائل ہے۔

لیکن دوسری طرف ایسے فطرت نگار افسانہ نگار بھی ہیں جو سماجی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جمالیاتی پہلو پر کم، انسانی اپیل اور پرچار پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بعض حقیقت نگار افسانہ نگاروں کا خیال ہے کہ انسان ماحول اور روایات سے صرف اثر ہی قبول نہیں کرتا بلکہ اس کا کردار

بھی ان سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے کردار کا اس کی منزل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح کردار کی عظمت اور ٹریجڈی کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ ان کے یہاں انسانی ذہن کی پیچیدگی نہیں ملتی بلکہ "مکمل سیاہ" اور "مکمل سفید" کردار ملتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ فطرت نگاروں نے انسانی روح میں جھانکنے اور موت، درد، خیر و شر کے مسائل کو سماجی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ فرد کے سماجی اور معاشی پس منظر پر سب سے زیادہ زور مارکسزم نے دیا ہے۔ بہت سے افسانہ نگار مارکسزم سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں۔ مارکسزم نفسیاتی جبریت کے مقابلے میں مادی جبریت کا فلسفہ ہے۔ مارکسزم نے طبقاتی کشمکش کو اہمیت دی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دراصل سماجی حقیقت ہی حقیقت ہوتی ہے، فرد کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسی طرح انسان کی اخلاقی ذمے داری کے بجائے سماجی جبر اور ارادے کی آزادی کے بجائے معاشی اور تواریخی جبریت کو مارکسزم نے ادب میں رائج کیا۔ ترقی پسند تحریک اسی نظریے کے تحت عروج پائی۔ مارکس نے طبقاتی کشمکش پر مبنی سماج میں جکڑے اور استحصال و معاشی بدحالی کا شکار رہنے والے انسان کو ایک ناطبقہ داری خوش حال سماج میں آزاد زندگی بسر کرنے کا یقین دلایا تھا۔ لیکن جلد ہی ادیبوں نے یہ محسوس کیا کہ آزادی کا یہ نعرہ ایک پارٹی اور پھر ایک شخص کی آمریت میں بدل گیا۔

ادب میں مارکس کے نظریات نے سماجی حقیقت نگاری کے رجحان کو فروغ دیا۔ لیکن فرائیڈ کے نظریات کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ نہ صرف ادب کے نظریے میں بلکہ تکنیک اور اسٹائل میں بھی تبدیلی آگئی۔ اور آج فرائیڈ کی نفسیاتی جبریت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی جنس اور لاشعور کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ کہانی ارسطو کی زمان و مکان اور تاثر کی تثلیث سے جو چھٹکارا حاصل کر گئی اس کا سہرا بہت کچھ فرائیڈ کے سر ہے۔ جدید افسانہ جہاں ابسرڈ (ABSURD) یعنی لغویت کے فلسفے سے متاثر ہوا ہے وہاں تکنیک اور اسٹائل میں شعور کے بہاؤ کے نظریے کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

شعور کے بہاؤ کی تکنیک کے تحت لکھنے والا ادیب بنیادی طور پر وقت کی داخلی اور فلسفیانہ نوعیت کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے ادیبوں کی تحریروں میں برگساں کے تصور وقت اور یادداشتوں کے سرچشمے کی جھلک ملتی ہے۔ برگساں کے اثر کے تحت افسانے میں وقت کے شعور کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس نظریے کی رو سے ماضی، حال میں کوئی حد فاصل نہیں رہ گئی اور نہ وقت ماضی حال اور مستقبل کے دائروں میں مستقل طور پر تقسیم رہتا جیسا کہ خارجی یا تقویمی وقت کے نظریے کا تقاضا ہے۔ وقت کا تسلسل اس طرح ضروری نہیں۔ ماضی حال اور مستقبل، یہ سب کچھ اضافی ہے۔ وحدتِ مکان و زمان کے نظریے کو اب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اب برسوں کے واقعات تاثرات اور یادداشتیں لمحوں میں سمٹ آتی ہیں۔ اس لیے اگر اہم ہے تو وہ لمحہ جو عمل پذیر تجربات سے گرفت میں لایا جاتا ہے۔ "ہم لمحے کو حاصل کرنے کے لیے تسلسل سے فرار کرتے ہیں اور لمحے سے اپنے آپ کو تسلسل میں کھو دیتے ہیں۔" جدید افسانے میں لمحے کی عکاسی کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے اس میں وقت کے اسی فلسفے اور نفسیاتی پہلو کا بڑا اہم رول ہے۔ افسانہ اب جسم کا سفر پیش نہیں کرتا بلکہ ذہن کے سفر کا پُر اثر ذریعہ بن گیا ہے۔

ولیم جیمز، کارل ژونگ اور فرائیڈ کے نظریات میں وقت کے شعور کی اہمیت موجود ہے کیوں کہ وہ لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر انسان کے اصل کردار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر ژونگ کے اجتماعی لاشعور کا نظریہ وقت کے اس نظریے کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اجتماعی لاشعور نوعِ انسانی کا مشترکہ لاشعور ہے۔ ژونگ کا آرکی ٹائپ کا نظریہ نوعِ انسانی کے لاشعور کو واضح کرتا ہے جس کے باعث ادب میں کردار نگاری کی نئی راہیں کھلیں۔ کردار نگاری کی نئی تکنیک میں تمثیل، خاص طور پر خواب کی تمثیلات، داخلی ہم کلامی، خود سر کی تحریروں، شعور کے بہاؤ، سرریلزم اور تحلیل نفسی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اگرچہ موجودہ افسانے پر فرائیڈ کا اثر غالب نہیں رہا۔ پھر بھی ان ماہرین نفسیات نے ادب میں کردار کے عمیق مطالعے پیش کرنے کی تحریک کو مستحکم کر دیا ہے۔ بہرحال موجودہ افسانوں کے بارے میں کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ ان کے کرداروں کا تجزیہ ژونگ یا فرائیڈ کے نظریات سے نہیں بلکہ ایڈلر کے نظریات کے تحت ہی ممکن ہے۔ اینٹی ہیرو (ANTI HERO) احساس کمتری کا پروردہ ہے۔ کچھ بھی ہو افسانوی کردار کے زوال کا باعث بھی یہی ہے کہ کوئی بھی آدمی ماہر نفسیات کے سامنے ہیرو نہیں رہ جاتا۔ افسانے میں کردار کی اگر تحلیل نفسی شامل ہو تو اس کا ہیرو پن تو ختم ہو ہی جائے گا۔ آج افسانے میں اسی اینٹی ہیرو کا رواج ہے۔ جلا وطن، اکیلا، کج رو، بے یار و مددگار اور

اور ضمیر سے عاری، اپنی گم شدہ ذات کی تلاش میں بھٹکتا ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ادب میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا۔ بہت سے ادیب مارکسزم سے انحراف کر بیٹھے تھے۔ اس ازالۂ سحر کا اثر اتنا گہرا اور ہمہ گیر ہوا کہ یورپ میں ادیب نئے فلسفے کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ یہ سب سے بڑا حملہ جبریت کے نظریے کے خلاف تھا۔ آلڈس ہکسلے، کرسٹوفر اشروڈ اور آرتھر کوسلر نے روحانیت میں پناہ لی۔ لیکن سارتر اور کامو اور دوسرے ادیب وجودیت پرستی کے مفسر بن گئے۔ انھوں نے آدمی کی ذمے داری اسی کے کندھوں پر ڈال دی۔

وجودیت پرست افسانہ نگار انسان کو مشیت یا خدا کی رضا کا بندہ یا غلام نہیں مانتے اور نہ ہی مقدر کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیرک گارڈ کا خیال ہے کہ ہماری دنیا رجحانات یا خیالات کی نہیں انسانوں کی ہے۔ ان میں ہر ایک اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک اسرار ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا خدا سے بڑا اہم رشتہ ہے۔ عقل خدا کے وجود اور اس کی اچھائی کو ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ یقین میں چھلانگ ہے۔ کافکا کے افسانوی ادب میں بھی ایک وجودیت پرست کے رجحانات ملتے ہیں مثلاً کیا کوئی آخری قوت ہے، اگر ہے تو کیا وہ انصاف پر مبنی ہے۔ اگر نہیں تو پھر ہر فرد کو اپنے لیے خود ہی انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ہر انتخاب جو فرد کرتا ہے وہ نوع انسانی کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر بہت بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ افسانوی ادب میں یہ نیا رجحان غالب رجحان ہے۔ کیونکہ اس نے ہمارے عہد کی جذباتی مایوسی کو آواز عطا کی ہے۔

افسانوی ادب میں یہ رجحان ایک دوسری سطح پر اینگری ینگ مین اور بیٹس (BEETS) کی تحریروں میں نمایاں ہوا ہے۔ اینگری ینگ مین موجودہ سماج کی اقدار کا منکر ہے۔ وہ انسانی خلوص کا شاکی ہے۔ وہ باغی ہے لیکن اس کا کوئی آدرش نہیں۔ وہ برہم ہے لیکن کسی سے ہمدردی کے باعث نہیں۔ "آؤٹ سائیڈر" روحانی طور پر نراجی سماج میں ایک باغی روح ہے۔ کولن ولسن فوق البشر کی تلاش میں مذہبی احیا کا نظریہ بھی پیش کر چکا ہے اور اپنی نئی کتاب (BEYOND THE OUTUSIDE) میں وجودیت پرست فلسفے کو انسانیت پرست اور رجائیت پرست نظریے کا روپ دینے میں کامیاب ہوا ہے۔

اخلاقی غیر یقینی صورت حالات کے باعث ادیب حقیقت کے زیادہ قریب ہو گیا ہے کیوں کہ وہ کسی مطلق قوت یا قدر سے بندھا ہوا نہیں۔ بیٹس جیسے ادیب اسی اخلاقی خلا کے تحت ہر قسم کے رواج اور اقدار کے خلاف ہیں۔ وہ (SQUARE اور DIRECTED) لوگوں کے خلاف ہیں جن سے یہ دنیا بھری ہے اور جو اس تکنیکی دنیا سے اپنے آپ کو ہم کنار کر رہے ہیں۔ وہ SHOCK TREATMENT کے قائل ہیں۔ وہ سنسنی پھیلانا چاہتے ہیں۔ وہ تنظیم کے خلاف ہیں، خلفشار کے پرستار ہیں۔ جنس، تشدد، کاروں کی برق رفتاری، خام تجربہ غرض ہر وہ چیز جو ہیجان انگیز ہو ان کو عزیز ہے۔ وہ ایسے افسانے نہیں لکھتے جو نقطۂ عروج کی طرف بڑھتے ہیں (جنس میں وہ اس نقطۂ عروج کے قائل ہیں)۔ وہ تکنیک کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے افسانے غیر منظم، بے ربط اور بے ترتیب ہوتے ہیں۔

اسی طرز فکر نے ابسرڈ (ABSURD) یا لغویت کے ادب کو جنم دیا ہے جو اینٹی تھیٹر کے ساتھ ساتھ اینٹی افسانے کو بھی رائج کر رہی ہے۔ لغویت کا نظریہ روایتی طرز فکر اور روایتی انداز تحریر سے بغاوت ہے۔ یہ افسانہ نگار حقیقت کو زمان و مکان سے ماورا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ان میں تجریدی طرز کا امتزاج ناگزیر ہے، اور اسرار کا پردہ حقیقت پر حاوی رہتا ہے۔ وہ ہر لحظہ نئی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ انسان کے مستقبل کے بارے میں انھیں کوئی خوش فہمی نہیں، بلکہ ان کا خیال ہے کہ موجودہ صورت حال انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ لیکن اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں مایوسی، تلخی، اور جارحانہ ذہنیت اور مضحکہ خیز واقعات کی جھلک ملتی ہے۔ وہ زندگی اور سماج کا مذاق اڑاتے ہیں اور غصے بھرے فتوے دیتے ہیں۔ وہ جہالت، میکانکی تہذیب، مروجہ روایتی اصول زندگی، دقیانوسی فکر، رسمی باتوں، جھوٹ، مکر و فریب اور منافقت، سیاسی پینترے بازی اور الفاظ کی شعبدہ بازی کے خلاف ہیں۔ ان کا ادب جدید دور کی زندگی انحطاطی تہذیب اور اس کے پیچیدہ مسائل کی پروردہ ہے۔ ان کے نزدیک تمام اقدار کا بھرم کھل چکا ہے اور کوئی ایسا نصب العین نہیں جس کے لیے جد و جہد کی جائے۔ انقلاب اور اصلاح کے نعرے بے کار ہیں۔ انسان بنیادی طور پر گمرہی اور الجھنوں کا شکار ہے۔ پرانی روایات مر چکی ہیں۔ ہم موجودہ فکر کے خلاف ایک نفرت انگیز احتجاج کر سکتے ہیں

لیکن اسے بدل نہیں سکتے۔ یہ ذہنیت ان ہی حالات کی پروردہ ہے جس نے دیگری ینگ سین اور بیٹس کو جنم دیا ہے۔

جدید افسانے میں انسان کو ایک فرد کی حیثیت سے قابل سمجھا جا رہا ہے۔ فطرت پرستی کے نقطۂ نظر کے برخلاف اس کی شخصیت کے پیچیدہ اور پوشیدہ عناصر کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے باعث اب سماجی حقیقت نگاری کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی اور اسی وجہ سے فرائیڈ کا نظریہ بھی قابل قبول نہیں رہ گیا۔ یہ دونوں نظریات جبریت کے قائل ہیں۔ جدید افسانے میں انفرادی احساسات اور ردعمل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انفرادی عمل، ارادے کی آزادی، اخلاقی ذمے داری اور شخصیت کے نقطۂ نظر کو افسانے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ نئے افسانے میں فن، شخصیت اور نقطۂ نظر کی آمیزش ملتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ موجودہ افسانوی ادب میں بہت سی تحریکیں وجودیت کے فلسفے سے متاثر نظر آتی ہیں۔

جدید افسانہ نئے ذہن کا عکاس ہے۔ یہ دور سائنس کا دور ہے۔ سائنس کی دریافتیں، فطرت اور کائنات کے اسرار کو عیاں کر رہی ہیں۔ لیکن انسان کی روح ابھی تشنہ ہے، غم زدہ ہے، شدید تنہائی اور محرومی کا شکار ہے، خواہش مرگ نت نئے روپ بدل بدل کر سامنے آ رہی ہے۔ زندگی مستقل آلام اور خطرے میں مبتلا ہے۔ مبہم اور غیر مبہم خوف کا تسلط، ہر لمحہ نابود ہو جانے، بھک سے اڑ جانے کا خطرہ۔ آرگنائیزیشن میں جلا وطنی، فرد کی شخصیت کے فنا ہونے کا عمل۔ ذات کا کرائسیس۔ اخلاقی خلا، سیاسی شعبدہ بازی، معاشی پھیلاؤ، اور تصادم، عدم یقین، تشکیک، ذہنی تذبذب غرض انسان کی داخلی اور خارجی زندگی میں انقلاب رونما ہو رہے ہیں۔ اور جدید افسانہ اس مکمل حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو منفرد حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دراصل جدید افسانہ۔ اس گناہ کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے جو اس کے کرداروں نے کیا نہیں اور یہی درد اسے منزل منزل بھٹکا رہا ہے جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام —!



پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شایع کیے جاتے ہیں

(۱) مقام اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری جے۔ ڈبلو۔ ایچ۔ ہندوستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اتر پردیش، الہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	ششی کانت بھٹناگر۔ ہندوستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش، لکھنؤ۔
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری خورشید احمد۔ ہندوستانی۔ ایڈیٹر، نیا دور، محکمۂ اطلاعات لکھنؤ۔
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں	نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں ششی کانت بھٹناگر اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
(دستخط) ششی کانت بھٹناگر۔ (پبلشر)

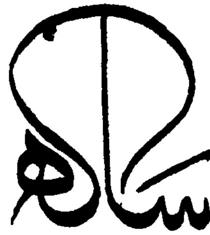
غزل

نازش پرتاب گڑھی

خاموشیوں کو ندرتِ گفتار کہہ گئے / کیا لوگ تھے جو درد کو کردار کہہ گئے
اب اور کیا رکھا ہے ترے وحشیوں کے پاس / اک حرفِ شوق تھا جو سرِ دار کہہ گئے
ہاں، اے حیاتِ سخت و گراں، ہم پہ ناز کر / ہم تھے جو ہر ستم کو ترے پیار کہہ گئے
طوق و رسن کو نام دیا زلفِ دوست کا / زنداں کو سایۂ نگہِ یار کہہ گئے
اپنی ہی طرح وہ بھی رہینِ ستم تھے، جو / شام و سحر کو کاکل و رُخسار کہہ گئے
اہلِ جنوں کی مصلحت اندیشیاں تو دیکھ / گُل تھا وصالِ یار مگر خار کہہ گئے
سمجھے تھے ذمہ دارِ وقارِ چمن جنھیں / نرگس کو وہ بھی دیدۂ بیمار کہہ گئے
اے زندگی! وہی قدِ رعنائے حُسن تھا / تیرا ادا شناس جسے دار کہہ گئے
ذہنِ بشر بھی دیتا ہے سو طرح کے فریب / خوابوں کو ہم بلندیِ افکار کہہ گئے
ملتے مرے غموں سے تو چیخ اُٹھتے وہ بزرگ / جو خامشی کو عظمتِ کردار کہہ گئے
ناآشنا رہے جو بیانِ سکوت سے / وہ حالِ دل کو تشنۂ اظہار کہہ گئے

نازش وہ خود بھی آخری دم تک جیا کیے
جو لوگ زندگی کو اک آزار کہہ گئے

(افسانہ)



رشید انور

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جس احساس نے ببّو کانے کی سانسوں کو چند لمحوں کے لیے روک دیا وہ فیضا کی ہاتھ بھراؤنی کی بات تھی۔ آج کی شام آزمائش کے آخری مرحلے سے گزار کر اسے فیضا کو اپنے معتمد شاگردوں میں شامل کر لینا تھا۔ لیکن آزمائش کا خیال ہی جیسے اسے کاٹے کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اسی لیے آج وہ اپنی زندگی میں شاید پہلی بار سوچ رہا تھا کہ فیضا اس مرحلے سے نہ گزرے نہ سہی۔ وہ یہ آخری امتحان دینے سے انکار کر دے بھی تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن فیضے کا بال بھی بیکا نہ ہو اور آج کی یہ شام اچھی طرح گزر جائے ورنہ وہ ہتو دادا کو کیا منھ دکھائے گا؟ آج سے صرف ایک مہینہ قبل جب ہتو دادا نے اسے یہ پیغام بھجوایا تھا کہ انھیں ببّو سے ایسی امید نہ تھی اور وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ببّو صرف فیضا جیسے لڑکے کو گھر کا ہنر سکھانے میں اتنا لمبا عرصہ لگائے گا۔ یہاں تک تو اس نے ہتو دادا کی باتوں کا برا نہ مانا تھا لیکن انھوں نے آگے جو بات کہی تھی اس سے ببّو کانے کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور اس کا خون اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔ ہتو دادا نے کہا تھا کہ ببّو اتنے دنوں میں ایک لونڈے کو کچھ نہ سکھا سکا۔ اگر ان کا زمانہ ہوتا اور ان میں وہ پہلا سا جوش و خروش اور ان کے بازوؤں کی مچھلیوں میں وہ پہلی سی اکڑ باقی ہوتی تو فیضا کی بات رہی الگ، وہ کسی چھوکری کو کام میں اتنا ماہر کر دیتے کہ کوئی دوسرا اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکتا۔ اسے ہتو دادا کی اس بات پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اگر یہ بات ان کے علاوہ کسی اور نے کہی ہوتی تو وہ دوسرے دن کا سورج نہ دیکھ پاتا۔ لیکن ببّو دنیا میں خدا کے بعد اگر کسی سے ڈرتا اور اپنا سر کسی کے آگے جھکاتا تھا تو وہ صرف ہتو دادا تھے۔ انھی کی تو مہربانیوں کا نتیجہ تھا جو آج وہ اپنے ہنر میں دور دور تک اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اتنے سارے شاگرد، اتنی دولت اور سکھ چین صرف انھیں کی تو دین تھی۔ ورنہ وہ آج بھی کسی بھٹیار خانے میں جھوٹے برتن صاف کر رہا ہوتا۔ اسی لیے اپنے غصے کو پی کر اس نے ہتو دادا کو کہلوا بھیجا تھا کہ ٹھیک ایک مہینے بعد وہ فیضا کو ان کے پاس بھیج دے گا۔ اور آج کی شام فیضا کو ہتو دادا کے پاس واپس چلا جانا تھا اور چھاؤنی کی روشن اور خوبصورت سڑکوں پر گھومتے ہوئے فوجیوں اور تنگ پتلونیں پہن کر گھومتے ہوئے کالج کے لڑکوں کے درمیان اپنا دھندہ شروع کرنا تھا۔ اپنے کسی شاگرد کی ہاتھ بھراؤنی کی شام کو وہ خود اس نوسیکھیے شاگرد کو کسی بڑے مشکل مقام پر لے جا کر کھڑا کرتا تھا اور کسی ایسی جگہ ہاتھ مارنے کے لیے بھیج دیتا جو بالکل ہی ناممکن نظر آتا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جب وہ نیا شاگرد اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا آتا تو ببّو آگے بڑھ کر اسے اپنی مضبوط باہوں میں بھینچ لیتا اور پھر اس شاگرد کو کوئی نیا علاقہ دے دیا جاتا جہاں وہ اپنا کاروبار بڑی آزادی اور بھروسے سے شروع کر دیتا۔ لیکن آج سے پہلے اپنے کسی بھی شاگرد کے لیے ببّو کا دل اس بری طرح ڈانواڈول نہ ہوا تھا اور نہ کبھی اس نے ایسی الجھن محسوس کی تھی۔ ہر بار اس کے شاگردوں نے اسے منٹوں کا کام سیکنڈوں میں کر دکھایا تھا۔ لیکن فیضا میں اسے کوئی جان ہی نظر نہ آتی تھی۔ اور ببّو کانے کی گھبراہٹ اور پریشانی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔ جانے کیوں ان آخری لمحوں کا تصور کرتے ہوئے اسے اپنے کانوں کے پاس لوگوں کی بھگدڑ، شور اور پولیس کی تیز سیٹیاں بھی سنائی دینے لگتیں اور اس تصور کے ساتھ اس کی چوڑی اور سیاہ پیشانی پسینے سے تر ہو جاتی اور وہ سوچنے لگتا کہ اگر ایسا ہو جائے

تو اس کی ساکھ کا کیا ہوگا۔؟ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے سر کیسے اٹھا سکے گا۔؟ اور اس کی نظریں ہتو دادا کی شکایت کرتی ہوئی نظروں سے کیسے مل پائیں گی۔؟؟

بوا بھی اپنے استاد کی طرح خوب ٹھونک بجا کر ہی اپنے شاگردوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتا تھا۔ لیکن فیضا کے معاملے میں اسے ہاتھ ٹیکنے پڑے کیوں کہ فیضا ہتو دادا کی بیوہ بہن کا اکلوتا لڑکا تھا۔ جب فیضا پڑھ لکھ نہ سکا کوئی کام اپنے لیے ڈھنگ کا نہ کر سکا اور اس کی ماں تھک ہار کر بیٹھ گئی تو ہتو دادا نے سوچا کہ فیضا کچھ نہ سہی اپنے آباد اجداد کا ہنر ہی سیکھ لے لیکن یہ ہنر وہ اپنی اولاد کو خود ہی سکھانے سے تو رہے۔ اس لیے اس کام کے واسطے انھوں نے بوکانے کو چنا۔ لیکن بوا کو شروع سے اس لڑکے کے چال چلن کچھ ٹھیک نظر نہ آتے تھے۔ بچوں کی طرح دھندے کی الف بے پڑھانے کے بعد بوا چاہتا تھا کہ فیضا کی نظر اب روپیوں پیسوں کے بوجھ سے لٹکتی ہوئی جیبوں کے سوا کہیں اور نہ رہے۔ لیکن اس کے ساتھ بھری پری سڑکوں پر چلتے ہوئے جب وہ کن انکھیوں سے اسے ادھر دیکھتا اس کی نظروں کو جیبوں کی بجائے لڑکیوں کے جسموں کو ٹٹولتا ہوا محسوس کرتا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور وہ سوچتا کہ کیا جوانی اس پر نہ آئی تھی۔؟ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ آدمی سب کچھ بھول کر ان چیزوں کی طرف دوڑتا پھرے یہ عمر تو ہوتی ہے کچھ سیکھ لینے اور اپنی زندگی بنانے کی۔ اسی لیے تو وہ چاہتا تھا کہ فیضا بھی دھندے کو اپنا ایمان بنا لے۔ لیکن فیضا سرتاپا غلطیوں کا مجسمہ تھا۔۔۔ ادھر دھندے کا وقت ہوتا اور سب لوگ اپنی اپنی راہوں پر چل پڑتے تو بوا چاہتا کہ وہ بھی کسی کے ساتھ ہولے تاکہ آہستہ آہستہ دھندے کی اونچ نیچ تو سمجھ لے۔ لیکن وہ اڈے سے نکل کر کچھ دور کسی کے ساتھ جاتا اور راستے میں جل دے۔ کر گل منڈ اور مچھلی مارکٹ کی رنگین فضاؤں میں جا پہنچ جاتا اور دلوں کا سودا کرتا پھرتا۔ کوئی بڑا میلہ لگتا یا کوئی جلسہ جلوس ہوتا اور بوکانے کا دھندا دیکھتے ہی دیکھتے چمک جاتا تب روپیوں کے ڈھیر سے اپنے ساتھیوں کا حصہ الگ کرتے ہوئے بوا یہ سن کر اداس ہو جاتا کہ ایسے سنہرے موقعے پر بھی فیضا لوفر کسی لونڈیا کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے ساتھیوں سے دور کہیں ویران اور نایاب سی راہوں پر پیار کے گیت گنگنا رہا تھا۔ بوا نے جتنی بھی کوششیں کی وہ سب رائیگاں گئیں۔ فیضا نے اپنے سیکھنے سکھانے کے دنوں میں ایک کام بھی ڈھنگ کا اور بوا کو ہمت دلانے والا نہ کیا

ادھر اسے کسی بھی معمولی شکار کے پیچھے لگایا جاتا اُدھر وہ گھنٹوں غائب ہو جاتا اور پھر خبر آتی کہ وہ معمول کے مطابق شاہ گنج کی روشنیوں اور لڑکیوں سے بھری پُری سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ اور جب اڈے پر حاضری اور حساب کا وقت ہوتا تو زیادہ تر وہ کسی ماہر اداکار کی طرح ہاتھ نچا نچا کر بوا کو بتانے لگتا کہ وہ پہلے ایسے گیا، پھر ویسے گیا اور بڑی ترکیب سے اس نے شکار پر ہاتھ مارا۔ لیکن۔۔۔ اس تلاش کی جیب میں چند آنوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔ اور وہ جیب سے دس اور پانچ پیسوں کے سکے نکال کر بوکانے کے سامنے ڈال دیتا۔ اور بوا کا جی چاہتا کہ اس کے منھ پر ایک زور کا 'لافہ' دے کر اسے اڈے سے باہر نکال دے۔ لیکن وہ اپنا ہاتھ روک لیتا اور اپنے سامنے پڑی ہوئی ریزگاری اسی کی طرف ڈھکیل دیتا۔

ہتو دادا سے وعدہ کرنے کے بعد سارا ہی مہینہ اس نے جان توڑ کوشش کی کہ یہ اونٹ کسی کل بیٹھ جائے تاکہ وہ ہتو دادا کو جواب دے سکے۔ لیکن وہ لمحہ کبھی بھی نہ آیا جب بوا کو اپنی کامیابی کا احساس ہو۔ اسی لیے بوا اسے اس مشکل امتحان میں ڈالتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ جانے کیوں اس امتحان اور ان لمحوں کے متعلق سوچ کر ہی اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے جا رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہتھکڑیوں کا جوڑا سا جھول رہا تھا۔ آج تک ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اور اپنے شاگردوں کو بڑی سے بڑی کٹھنائی سے ہنستے کھیلتے نکال لیا تھا۔ لیکن فیضا۔۔۔؟؟ بوکانے نے دل ہی دل میں بڑے نیم والے سعادات سے منت مانگی کہ آج کا یہ دن کسی بھی طرح گزر جائے تو وہ ان کی مزار پر پھولوں کی ایک چادر چڑھائے گا۔۔۔ کیسے بھی گزر جائیں یہ لمحے۔ چاہے فیضا خالی ہاتھوں لوٹے یا بھرے ہوئے ہاتھوں۔ لیکن لوٹے ضرور اور ساتھ خیریت کے لوٹے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر فیضا ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ لوٹے یا جُل دے کر نکل جائے تو وہ ہتو دادا کے پاس راتوں رات جائے گا اور ان کی جوتیوں پر اپنا سر رکھ دے گا اور ان سے کہے گا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اپنے استاد کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے لیکن وہ فیضا کو لائن پر لا ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ فیضا کسی زاویے سے اس لائن کا آدمی ہی نہیں ہے۔۔۔ وہ ان سے کہے گا کہ وہ فیضا کو کوئی پان پتی کی دکان کرا دیں یا پھر کسی فلم کمپنی میں نوکر رکھوا دیں۔۔۔ لیکن آج وہ لمحے گزر تو جائیں اور فیضا ہمیشہ کی طرح بالوں پر ہاتھ پھیرتا، اپنی تنگ پتلون اور پھول دار شرٹ کو دیکھتا اور مسکراتا ہوا ساتھ خیریت کے ان تک آ تو جائے۔۔۔ اور شام

کی وہ گھڑیاں بھی آگئیں۔ بوا اپنے دوسرے شاگردوں کے ساتھ منتخب کی ہوئی جگہ پر پہنچا تو فیضا کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اپسرا سینما کے سامنے وہی روز کا ہنگامہ اور گہما گہمی تھی۔ فلم کا پہلا شو شروع ہونے والا تھا اور لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بوا استاد اسے کوئی موٹی سی گالی دینا ہی چاہتا تھا کہ وہ جھومتا گنگناتا ان کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ بوا استاد کی باتیں بڑے دھیان سے سر جھکا کر سنتا رہا۔ اور ساری ہی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے بوا کا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے آج کے بعد دل کو دھڑکنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔ وہ فیضا کی طرف جب بھی نظر اٹھاتا اسے اپنے اور فیضا کے درمیان ہتھکڑیوں کا مضبوط جوڑا جھولتا سا نظر آتا اور اس کی آواز اس کے حلق میں پھنسنے سی لگتی۔ جب وہ فیضا کو سب کچھ اچھی طرح سمجھا چکا اور خطرے میں فرار کی راہیں بتا چکا تو اس نے 'اشوکا' کے کونے پر نیم تاریکی میں ٹہلتے ہوئے انگریز کی طرف متوجہ کیا۔

"وہ ہے تمھارا شکار۔ جاؤ۔ خدا تمھیں کامیاب کرے۔ اگر میدان مار لیا تو کل سے چھاؤنی تمھاری ہوگی۔ اور اگر ہاتھ خالی رہے تو میرے پاس لَوٹو بھی نہیں۔ میں خالی ہاتھ لَوٹنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

"لیکن استاد۔ لیکن میں . . .!" فیضا ہکلانے لگا۔

"لیکن کیا۔؟" استاد بوا کے ساتھ اس کے شاگردوں نے بھی غرا کر پوچھا۔

"استاد میں۔ میں استاد . .!" بالکل قریب آکر اسٹاپ پر رکنے والی چھاؤنی کی بس نے استاد بوا کی اور بس میں سوار ہوتی ہوئی دو خوبصورت لڑکیوں نے فیضا کی توجہ چند لمحوں کے لیے اپنی طرف کھینچ لی۔ لیکن فوراً ہی اس نے استاد بوا کی آہنی گرفت کو اپنے کندھے پر سخت ہوتا ہوا محسوس کیا تو وہ پھر گھگھیانے لگا۔

"استاد۔ میں۔ میں ٹھیک ہوں۔ ایسا ہی ٹھیک ہوں۔ میرا مطلب ہے امتحان کی کیا ضرورت ہے۔ میں چلتا ہوں۔ جاتا ہوں میں اس بس سے چھاؤنی۔ بس آپ دعا دیجیے۔ مجھے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ اور سوچ سکے اس نے استاد بوا کے پیٹ میں سر ڈال دیا اور اپنے ہاتھ سے استاد کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آگے بڑھتی ہوئی بس میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی کے پہلو میں جا بیٹھا۔ بس کی دور ہوتی ہوئی پچھلی لائٹ کی طرف دیکھ کر جانے کیوں بوکالے کو ایک لمحے کے لیے بے حد سکون کا احساس ہوا۔ جیسے اس کی نگاہوں کے سامنے جھولتا وہ ہتھکڑیوں کا جوڑا بہت دور چلا گیا ہو۔ استاد بوا کے ایک شاگرد نے بس کی طرف رخ کر کے تھوکتے ہوئے کہا۔

"بودا تھا۔ استاد تم ہتو داد اسے کہہ دینا کہ اسے چوڑیوں کی دکان لگوا دیں۔" لیکن دوسرے ہی لمحے بوا کے شاگردوں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کیوں کہ استاد بوا عجیب مسرت بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ لونڈا۔ یہ بہت آگے جائے گا۔ تم سب سے آگے۔ شاید مجھ سے بھی آگے۔" وہ سب بوکالے کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ انھیں یہ محسوس بھی نہ ہو سکا کہ استاد بوا کا ہاتھ ان کی کٹی ہوئی جیب سے ان کی ننگی ران کو چھو رہا تھا۔



ترانہ

ظفر احمد نظامی

جہانِ رنگ و نظر، کانِ علم و فن کہیے
رہِ نشاط میں خوشیوں کی انجمن کہیے
مرا وطن ہے جسے ہند کا چمن کہیے
وطن کے گیسوئے مشکیں کو ہم سنواریں گے

ہر اہلِ دل کی رگِ جاں سے بھی قریں ہے یہ
بہشت ایسے گلستاں سے بھی حسیں ہے یہ
حسین تاج و اجنتا کی سرزمیں ہے یہ
ہم اس کا حسن ابھی اور بھی نکھاریں گے

ہم امن دوست ہیں دامن میں پیار رکھتے ہیں
چمن کی گود میں فصلِ بہار رکھتے ہیں
"ہم اپنا عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں"
وطن کے فرش پہ ہم کہکشاں اتاریں گے

خوش بوسحرِ نو کی

قطب سرشار

روئے مہتاب پہ چھایا ہے اندھیروں کا غبار
رات ہے یا کسی بیوہ کا سیہ رنگ لباس
گل ہوئے سارے دیے، تیز ہوا چلتی ہے
ہر جگہ، ہر سو اندھیروں کی ردا پھیلی ہے

چہرۂ زیست بہر حال درخشاں ہی تو ہے
اک ذرا گردِ حوادث کی جمی رہتی ہے
دل کی دھڑکن نے بھی نغموں ہی کو تخلیق کیا
موجِ انفاس میں غلطیدہ ہے پُر درد نوا
ایک حسرت ہے جو سانسوں میں دبی رہتی ہے

رات شمشان ہے، لاشوں کو جلا دیتی ہے
دن جو صحرا ہے، کڑی دھوپ غموں کی ہے یہاں
اور اس دھوپ میں بے تاب ہیں اجسام کئی
حوصلے، ابر کے سائے کی طرح ٹھنڈے ہیں
سایۂ زلف کی مانند، گلِ تر کی طرح
شبنمی سحر کی مانند حیات افزا ہیں
حوصلوں اور عزائم کے خنک جھونکوں سے
چہرۂ زیست سے چھٹتا ہے حوادث کا غبار
وسعتِ تیرگی بے حد نہیں، محدود ہی ہے
نور کے قافلے آگے ہیں ذرا آگے ہیں

صنفِ غزل

طلحہ رضوی برق

ادبیاتِ عالم بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہیں، پہلا نثری ادب اور دوسرا شعری ادب۔ ہر دو حصے مختلف النوع اور چند در چند اصناف پر مشتمل ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے شعری ادب میں جو صنف سب سے زیادہ مشہور و معروف ہوئی اور جسے از حد قبولِ عام حاصل ہوا وہ ہے صنفِ غزل۔ غزل کی ابتدا اور اس کا آغاز عربی قصیدوں کے نسیب و تشبیب سے ہوا۔ قصیدے کا یہ حصہ عشق و شباب کی باتوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس کی ساخت، ہیئت اور مزاج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شعرا نے ایک صنف اس سے اخذ کر لی اور اسے غزل کے نام سے موسوم کیا۔ غزل عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں "سخن نرم با زنان گفتن"۔

ایران پر جب عرب کا غلبہ و تسلط ہوا تو آہستہ آہستہ عربی تہذیب و ثقافت، ایرانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ مدغم ہوتی گئی بلکہ اس پر غالب آ گئی۔ یہی زمانہ غزل کے آغاز و ارتقا کا ہے۔ غزل کی شروعات فارسی ہی میں ہوئی اور اس میں اس کی داغ بیل پڑی۔ غزل کو جو فروغ فارسی زبان میں ہوا وہ نہ اردو کو نصیب ہے اور نہ عربی کو نصیب۔ جس طرح اردو میں محمد حسین آزاد نے تحقیق سے پہلے ولی دکنی کو اردو غزل کا باوا آدم کہا اسی طرح فارسی میں رودکی سمرقندی کو فارسی غزل کا آدم اول کہا جاتا ہے۔ اہلِ فارس اور فارسی گو اہلِ ہند اور پھر اردو غزل گویوں نے صنفِ غزل کو جس طور پر برتا اور خونِ جگر سے اس کا جس طرح آبیاری کی اور اسے زندہ رکھا وہ غزل کا مقدر ہے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

ہندوستان میں اردو غزل کا آغاز دکن میں ہوا۔ جس وقت بیجاپور اور گولکنڈہ والے غزل کو اردو میں رواج دے رہے تھے، شمالی ہند کے شعرا اردو میں شعر کہنا بھی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ولی اورنگ آبادی جب پہلی مرتبہ دہلی آئے تو اس وقت مرزا مظہر جانِ جاناں، سراج الدین علی خاں آرزو اور شیخ حاتم موجود تھے۔ ان بزرگوں نے ولی کی اردو غزلیں پسند کیں اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے تو ولی کو مشورہ دیا کہ فارسی میں جتنے مضامین بکھرے پڑے ہیں انھیں اپنے استعمال میں لاؤ اور خود بھی طبع آزمائی کی۔ انجام کار فارسی غزلوں کی اندھی تقلید کا آغاز ہوا اور ایک زمانہ اُگلے ہوئے نوالوں کو چباتا رہا۔

خواجہ الطاف حسین حالی اگرچہ خود ایک کامیاب صاحبِ دیوان غزل گو تھے مگر سب سے پہلے انھیں نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو کی روایتی غزل کو ہدفِ ملامت بنایا۔ بعد کے تمام ناقدوں نے غزل کی موافقت یا مخالفت میں اپنی گفتگو کا آغاز اسی مفروضے سے کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حالی کی حمایت اور غزل پر ان کی نکتہ چینی صنفِ غزل کی اصلاح و بقا کے لئے تھی کوئی غزل دشمن جذبہ اس کے پیچھے کارفرما نہ تھا۔ وہ محض غزل کی روایتی فرسودگی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے تنگنائے غزل کو محسوس کیا غلط ہوگا کیونکہ غالب تو نواب محمد حسین خاں کی طرح سراج

کے لئے قصیدے کا وسیع میدان چاہتے تھے۔ غزل سے چونکہ قصیدے کا مصرف نہیں لیا جا سکتا، لہذا ان کا یہ کہنا کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

غزل سے قصیدے کی طرف گریز ہے۔ اس میں در اصل غالبؔ نے غزل کی ہیئت اور ساخت کی طرف اشارہ کیا ہے ورنہ اس صنف کی معنوی وسعت جس قدر غالبؔ پر واضح تھی کسی دوسرے پر نہیں تھی۔ آج اردو غزل کے "مختصر ترین" سرمائے پر سب سے زیادہ شہرت رکھنے والا شاعر غالبؔ ہی ہے۔

یہ غزل کی بدقسمتی ہے کہ چند حضرات صنفِ غزل اور غزل گویوں پر جی کھول کر برسے ہیں۔ مولوی وحید الدین سلیم غزل کو محض قافیہ پیمائی ہی سمجھتے ہیں، انھیں غزلوں میں حقیقی جذبات نظر نہیں آتے۔ عظمت اللہ خاں کے ذہن میں غزل کے لئے کوئی گوشہ نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد نے اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کر دیا کہ "غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے، اس کے اشعار میں تسلسل نہیں پایا جاتا اور یکجہتی کا فقدان تہذیب و تمدن کے منافی ہے بلکہ عہد ماقبل تہذیب کا آئینہ دار ہے۔" یہاں تک کہ جوشؔ ملیح آبادی کی نظر میں بھی غزل غیر فطری شاعری کا نمونہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان پر وقتِ واحد میں واحد جذبہ ہی طاری ہو سکتا ہے اور غزل جو وقتِ واحد کی تخلیق ہوتی ہے مختلف جذبات کی عکاسی کرتی ہے، لہذا مصنوعی ہے۔ چنانچہ اس اعتراف کے باوجود کہ "میرے باپ بھی شاعر تھے دادا بھی اور پردادا بھی" بڑی بیباکی کے ساتھ وہ لکھتے ہیں:

یہ فقط رسمی مقلد وامق و فرہاد کے　　مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
انکی تسبیر ہو انکھی انکی غیرت ہے عجیب　　گر نہیں جاتے جیا سی پہ اب حد کے رقیب
آج تک غالبؔ ہے ان پر وہ رقیب رو سیاہ　　کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے بہرے سرود　　انکے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پہ تھا
سلسلہ انکے سخن کا دور تک ہوتا نہیں　　کون ہے ان میں بالآخر جو کڑک ہوتا نہیں
سر سے پا تک یہ سُرے ہیں سر بسر نقال ہیں　　یہ حقیقی شاعر و نکے اصل میں نقال ہیں
قلب ان کا قطرۂ شبنم تو ہے چھالا نہیں　　کوئی ان میں زندگی کو دیکھنے والا نہیں

جوشؔ چونکہ ایک اچھے طنز گو ہیں اس لئے نظموں میں ان کی اس طرح کی پھبتیاں گوارا ہو سکتی ہیں مگر کسی سنجیدہ موضوع پر یہ اندازِ بیان اور لب و لہجہ زیب نہیں دیتا۔

بہر حال اردو غزل پر کئے گئے یہ اعتراضات صحیح ہوں یا غلط مگر ہمیں غزل کے متعلق سوچنے اور سمجھنے کا ایک نیا رخ ضرور عطا کرتے ہیں۔ غزل کے مخالفین علمی استعداد کے باوجود اپنی تہذیب و ثقافت کے معاملے میں احساسِ کمتری کے شکار ہیں۔ وہ مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے گرویدہ ہیں۔ جب اردو غزلوں میں مشرقی تہذیب و تمدن کی جلوہ آفرینی دیکھتے ہیں تو غیر شعوری طور پر ان کے مزاج میں ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کا اظہار کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ غزل کی تمام خوبیوں اور سارے محاسن کو الگ الگ ان کی نظروں کے سامنے بکھیر دیجئے، وہ حسنِ شعری کو محسوس کریں گے اور اس کا اعتراف بھی کریں گے مگر ذہنی طور پر غزل کے قائل نہ ہوں گے۔ یہ در اصل ایک نفسیاتی کمزوری ہے جس کا تعلق شعور سے نہیں لاشعور سے ہے۔ اور یہ تو بشریت کی ازلی کمزوری ہے کہ وہ اپنی اذعانیت کو جا و بیجا صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ یہ حضرات بھی اپنی شخصیت و شہرت کے بل بوتے پر اپنے غیر عقلی دعوؤں کو صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں مثلاً جوشؔ کا یہ ارشاد کہ "انسان پر وقتِ واحد جذبہ ہی طاری ہو سکتا ہے اور غزل جو وقتِ واحد کی تخلیق ہوتی ہے مختلف جذبات کی عکاسی کرتی ہے، لہذا مصنوعی ہے" کچھ اسی قسم کا غیر عقلی دعویٰ ہے۔

تخلیقِ شعر و ترکیبِ غزل کی کتنی منزلیں ہیں اور ہر منزل کتنی پیچدار ہے اگر وضاحت کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی جائے تو یہ ایک الگ مضمون ہو جائے گا۔ رہا غزل کو وقتِ واحد کی تخلیق کہنے کا سوال تو اس کے بارے میں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ وقتِ واحد کی تعریف بہت مشکل ہے۔ ایک لمحے میں تو انسان مختلف تجربات سے گذر جاتا ہے۔ مثلاً آنکھ بند کیجئے اور وقتِ واحد میں ہندستان بلکہ بیرونِ ہند کے بڑے شہروں کا تصور کیجئے، نہ جانے کتنے گذشتہ تجربات آنِ واحد میں سر اٹھائیں گے۔ غزل کا ہر شعر ایک تجربے کا حامل ہوتا ہے اور کوئی تجربہ جب احساس، جذبہ، تخیل اور انتخاب

ہیئت و الفاظ کی دشوار منزلوں سے گذر لیتا ہے تب اسے ہم شعر کہتے ہیں، پھر غزل جو اس طرح کے کئی اشعار کا مجموعہ ہے وقتِ واحد کی تخلیق کیسے ہو گی ہے حالی نے کیا خوب کہا ہے ؂

خشک سیروں تنِ شاعر میں لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

اور صائب تبریزی اس طرف یوں اشارہ فرماتے ہیں۔ ؂

دامنِ فکرِ بلند آساں نمی آید بدست
سرو می بیچد بخود تا مصرعۂ موزوں کند

غزل کو غیر فطری و نیم وحشی صنفِ سخن کہنا بھی یقیناً غلط ہے کیونکہ انسانی جذبات سے جتنی ہم آہنگی اور قربت غزل کو حاصل ہے کسی اور صنفِ سخن کو نہیں ہے۔ غزل میں شاعر دل کی باتیں کرتا ہے۔ دل کی باتیں مقتضیات انسان کی رہینِ منت ہیں اور انسان کے فطری تقاضے آدم اول سے آدم حاضر تک بنیادی طور پر یکساں رہے ہیں۔ حالات کی ناسازی اور ماحول کی بے اعتدالی نے انھیں متاثر ضرور کیا ہے، ان کی ترکیبیں اور قماشیں بدلی ہیں لیکن نہاں خانۂ دل میں پیدا ہونے والے جذبات ازل سے ایک ہیں اور ابد تک ایک رہیں گے۔ دل مرکزِ جذبات ہے، غزل میں جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جذبات کی کوئی شکل نہیں، اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تشنگی، اشتہا، جنس، خوف، خوشی اور غم کل بھی وہی تھے اور آج بھی وہی ہیں۔ انھیں نہ کسی نے بدلا ہے اور نہ کوئی بدل سکے گا۔ غزل میں ان جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے اور دل کی باتیں اشارے کنائے میں کی جاتی ہیں۔ غزل کا ایک ایک لفظ، ایک ایک ٹکرا گنجینۂ معنی کا طلسم ہے اور علامت ہے ایک پوری دنیائے خیال کی، استعارہ ہے ایک عالم رنگ و بو کا۔ ایک اچھا شعر پڑھئے اور احساس و جذبات کی دنیا میں پہنچ جائیے۔ ہاں! مگر اس کیلئے ادراک جو عطیۂ ایزدی ہے آپ کے پاس ہونا چاہئے۔

غزل چونکہ جذبۂ عشق کے اظہار کے لئے مخصوص تھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اسی لئے ہر دور میں یہ عاشقانہ مضامین کا حق ادا کرتی رہی اور شاید اسی لئے غزل پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ غزلوں کے اسّی فیصدی اشعار عاشقانہ ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے اور میں تو کہوں گا کہ سو فیصدی عاشقانہ ہوتے ہیں۔ ہر غزل گو عشق پیشہ تھا اور ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ عشق ہی سے اس کائنات کی نمود ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو کل بنی نوع انسان کے افکار و اعمال میں جاری ساری ہے:

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک   عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات   عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

جذبۂ عشق ایک ہے، داستان عشق بھی ایک، حادثات و واردات عشق بھی ایک لہذا تجربات عشق میں بھی یکسانیت لازم ہوئی۔ ہاں ان تجربوں کی کیفیات کے رد و قبول میں ضرور فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہر دور میں مختلف شعراء کا الگ الگ طرۂ امتیاز رہا ہے۔ عشق، بھوک اور پیاس کی طرح ایک بنیادی اور فطری جذبہ ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ معترضین غزل میں بیان کی گئی عشق کی تمام داستانوں کو کاربن کی اتاری ہوئی نقلیں کہتے ہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ جذبۂ عشق ازلی و آفاقی ہے معترضین کا قول غلط ثابت ہوتا ہے۔ حیاتِ انسانی کی بوقلمونی اور جذبات کی رنگا رنگی بے انتہا ہے۔ ہر شخص اس کے ردّ و قبول میں ایک دوسرے سے مختلف ہے مختلف کیفیات کی یہی شدت و جدت اور ان کا اظہار غزل کی جان ہے۔ صنفِ غزل معاملاتِ حسن و عشق کے لئے خاص طور سے وقف ہو چکی ہے۔ اس کے باوصف غزل میں حیات و کائنات کے ہر پہلو کی ترجمانی اور ہر رُخ کی جلوہ نمائی موجود ہے۔ غزل کو غزل کہنے کے بعد اس پر یہ اعتراض کہ یہ صنف صرف حسن و محبت کے لئے مخصوص ہے ویسا ہی غلط ہے جیسا یہ کہنا کہ قصیدے میں ہر شاعر کسی نہ کسی کی مدح و ستائش ہی کیوں کرتا ہے اور رباعی میں ہر شاعر صرف چار ہی مصرعے کیوں لکھتا ہے۔

عصرِ حاضر میں پھر لوگوں کا رجحان غزل کی طرف ہوا ہے۔ یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غزل ہی وہ واحد صنف ہے جو انسانی جذبات و واردات قلبی سے بہت زیادہ قریب ہے۔ ہمارا ادا

ان گنت انجانی تمناؤں کا گہوارہ ہے، صدہا آرزوئیں جنم لیتی ہیں، کتنے ہی ارمانوں کا خون ہوتا ہے، سیکڑوں حسرتیں پامال ہوتی ہیں اور ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے کا سماں رہتا ہے۔ ایک حساس شاعر اگر غزل کے متفرق اشعار میں ان کا اظہار نہ کرے تو وہ نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جائے۔ غزل کا ہر شعر ایک جہان معنی ہے، ایک اکائی ہے اور ایسی کئی اکائیاں مل کر ایک غزل مرتب کرتی ہیں۔ علم نفسیات کا بڑا ماہر ڈاکٹر فرائیڈ (DR. FREUD) نفسیات خواب کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہماری خوابیدہ تمنائیں اور سوئی ہوئی خواہشات جن کا حصول اور جن کی تکمیل ہماری قدرت سے باہر ہے اگر نیند کی حالت میں بہ شکل خواب ظاہر نہ ہوں تو ہمارا دماغی توازن برقرار نہ رہے۔ حالت خواب میں سنہرے سپنوں کی یہ بکھری ہوئی بے ربط و منتشر کڑیاں ہماری کتنی ہی بھولی بسری تمناؤں کی غیر شعوری تکمیل ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو قدرت کی طرف سے ہماری دماغی و جسمانی صحت کے لئے از خود ہوتا رہتا ہے۔ غزل میں بھی کچھ اسی قسم کی آرزوؤں کا بے ربط و غیر مسلسل اظہار دراصل ایک فطری عمل ہے جس کے لئے شاعر مجبور ہے۔ غزل کے برعکس دوسرے اصناف سخن اپنی خارجی و داخلی پابندیوں میں شاعر کو موضوع کے ساتھ جکڑ لیتے ہیں۔ شاعر اگر غزل نہ لکھے تو اس کا ذہنی و قلبی توازن برقرار نہ رہے (اس دعوے کی دلیل میں اکثر نظم گو شعراء کا نام پیش کیا جا سکتا ہے) خواب کو لاشعور سے تعلق ہے لیکن غزل بالکل لاشعوری نہیں ہوتی، ہاں! اس کا تخلیقی عمل بڑا تہدار و پیچیدہ ہے اور کسی نہ کسی منزل میں لاشعور سے اس کا پوشیدہ تعلق ضرور رہے۔ وہ لوگ جو غزل میں ربط و تسلسل نہیں پاتے شاید قافیہ اور ردیف کی پابندی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غزل میں ہماری فکر آسمانی وسعتوں میں پرواز کرتی ہے مگر پاؤں زمین ہی پر رہتا ہے۔ غزل کی زمین یعنی ردیف و قافیہ کی گرفت ہمیں فضا میں معلق نہیں ہونے دیتی۔ غزل ہی وہ متوازن اور اعتدال پسند صنف سخن ہے جو ہمیں ممکنات کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتی۔ غزل کو بے ربط نامسلسل اور نیم وحشیانہ صنف سخن کہنا حقائق سے چشم پوشی ہے۔

غزل کا معاملہ دل کا معاملہ ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی مصنوعی ہو جائے معاملات واردات قلبی نہیں بدلتے۔ غزل میں ان کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ایک دھڑکتا ہوا دل جب تک موجود ہے غزل مردہ نہیں ہو سکتی۔ دل کی زندگی عبارت ہے گداز و رقت سے۔ کوئی سنگدل شخص غزل گو نہیں ہو سکتا۔ جو دل حادثات و واردات سے اثر نہ قبول کرے، جس میں جذبات کی لہر نہ اٹھتی ہو وہ دل مردہ ہے۔ غزل کے لئے زندہ و تابندہ دل گداختہ کی ضرورت ہے ؎

حسنِ فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

دل زندہ ہمہ وقت اپنے ماحول، اپنے معاشرے، اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے۔ غزل تو بیان کا پیرایہ ہے، اظہار کا ایک ذریعہ ہے، گفتگو کا ایک وسیلہ ہے۔ اس کی وسعت اور اس کی پہنائی ہر عالم پر محیط ہے۔ غزل جو مخصوص تھی کیفیات حسن و عشق کی ترجمانی کیلئے جب ماحول و معاشرے کا جائزہ لینے پر آئی تو اسی شان دلربائی، اسی ایمائیت و اشاریت اسی تشبیہہ و استعارے، اسی مجاز و کنایے کے ساتھ جو غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

غزلوں میں ایک طرف معاملات عشق و نیرنگی حسن کا بیان اور پرواز تخیل و مضمون آفرینی اس روایتی ڈھنگ سے ہوتی رہی ہے:

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا — جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا — درد
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — میر
پوچھا جب حال دل کسی نے — اک بوند ٹپک پڑی لہو کی — میر
صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے — مومن
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا — غالب
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی — میں صد سخن آشفتہ بہ لب بستہ زباں ہوں — ذوق
اک دم ہمیں بیش مری ہستی موہوم — اسیر کبھی تو نہ خاطر تنگ گراں ہوں — "

عشق سے تیرے بڑھا کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا — حسرت

اے درد بتا کچھ تو ہی بتا اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم — شاد

نگاہِ شوق پہ الزام بیقراری کا — تمہاری برقِ تجلی کو اضطراب تھا — جگر

واہ رے عشق کہ شن کر مری نظمِ شیریں
قافیہ بن کے غزل میں مری فرہاد آیا — قتیل داناپوری

بنتِ عنب بھی ایک ہی مردم شناس ہے
اب تک نہ لگ سکی یہ کسی پارسا کے ہاتھ — قتیل داناپوری

اور دوسری طرف جب غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کا غلغلہ بلند ہوا اور ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کا نعرہ گونجنے لگا تو سارے دکھ درد اور غم والم کا مرکز اپنی ذات متصور ہوئی۔ عصرِ جدید کے غزل گو دیکھئے کس طرح نغمہ سنج ہیں:

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے — فیض

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے — روش

زندگی میں میں نے کاٹیں آنسوؤں کی کھیتیاں
چند سانسوں کے عوض یہ جان لیوا قرض تھا — پرکاش فکری

ہر تیرگی نے مجھ سے اُجالوں کی بات کی
ہر زہر اتفاق سے تریاق بن گیا — حامی

تلخیاں نیم کے پتوں کی ملی ہیں ہر سو
یہ مرا شہر کسی پھول کی خوشبو بھی نہیں — زبیر رضوی

دل کیا ہوا حریف غمِ روزگار کا
جیسے اک اہتمام ہے پھر جشن داری کا — تابش اکرامی

دامن کے چاک چاک ہیں کہ موسمِ بہار
آؤ کہ خونِ دل سے کریں گل فشانیاں — خلیل الرحمٰن اعظمی

غرض یہ کہ غزل کے موضوعات، اس کی طرز ادا، اس کا اسلوب و آہنگ اور اس کا لب ولہجہ تغیرِ حالات و تبدیلیٔ ماحول سے ہزار بدل جائیں، غزل کا اپنا مزاج اور اس کی مخصوص زبان نہیں بدل سکتی۔ گل و بلبل، شیشہ و ساغر، عاشق و رقیب، شمع و پروانہ، جلوت و خلوت، ہجر و وصال، زنجیر و زنداں، جام و سنداں، جیب و دامن، آستین و گریباں، نسیم و صبا، میخانہ و پیمانہ، جام و مینا، ساقی و شراب، بہار و خزاں، ابر و باد، دیر و حرم، شیخ و برہمن، کوچۂ یار و رسن و دار، زلف و عارض، ابرو و مژگاں، زاہد و پارسا، واعظ و ناصح، قلب و جگر، دشنہ و خنجر، اشک و آہ اور حسن و عشق اپنی بے پناہ جلوہ سامانیوں کے ساتھ بہرحال موجود رہیں گے۔ یہی غزل کی زبان ہے۔ ہر شاعر انھیں علامتوں کے استعمال سے اپنی اپنی طرز اور اپنا اپنا انداز پیدا کرتا ہے۔ غزل کا ہر لفظ اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔ ہزار سال قبل سے غزلوں میں یہی الفاظ استعمال ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ان کا استعمال ناگزیر ہے۔ اسی کو ہم تغزل کہتے ہیں۔ تغزل کے پردے میں تلخ و شیریں جرعات ہمیں سرور بخشتے ہیں۔ صدیوں بعد آج بھی ہم درد کا بادۂ تصوف پی کر مکیف ہوتے ہیں، سودا کے اشعار میں اپنے دل کی دھڑکنیں پاتے ہیں اور میر کے بہتر نشتر کی چبھن اسی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہے غزل کی ابدیت، اس کا لازوال حسن اور اس کی زندگیٔ جاوید۔ شاید ہی کوئی اس حقیقت کا منکر ہوگا کہ غزل میں اس مخصوص زبان کا استعمال ناگزیر ہے۔ یہاں تک کہ غالب کو کہنا پڑا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مضمون ہزار عشق و محبت کا ہو اگر زبانِ غزل کی استعمال نہ ہوئی تو تغزل ناپید اور تغزل ہی نہیں تو غزل کیسی!

حیرت اس پر ہے کہ یہ "نیم وحشی صنفِ سخن"، جو تمدن تسلسل کے سبب عہد ماقبل تہذیب کی آئینہ دار ہے" تہذیب و تمدن کی رو

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

غسلِ پریشان گوناگوں

سیّد شہنشاہ حسین

" مجھے تعجب نہ ہوا اگر نہلانے کے بعد مردہ تک زندہ ہو جائے....." کتنی بلاغت پنہاں ہے اس چھوٹے سے جملے میں! کسی ایسے ویسے کا بھی یہ قول نہیں کہ آپ کو اس میں چون وچرا کی گنجائش ہو سکے۔ اگر اعتراض کرنا ہو تو کیجیے حکیم بوعلی سینا پر! رہا یہ کہ کس سے اور کیوں اُنھوں نے یہ فرمایا تھا، اس کی تحقیق ابھی تک تو کسی نے کی نہیں۔ مجھ ناچیز کی رائے میں ابوسینا کو کسی دن نہانے کے ان گنت فائدے بتلانے کا وقت نہ ہوگا کسی ایسے غلیظ مریض کو جو غالباً کسی سرد ملک کا باشندہ ہوگا اور جاڑوں میں علاج کے لیے آیا ہوگا۔ اس کے پاس پیسہ زائد اور عقل کم ہوگی اس لیے ادویات پر خرچ بڑھنے کی اسے کوئی پروا نہ ہوگی۔ حکیم صاحب کا کافی وقت ضائع کرتا ہوگا مگر باوجود تاکید نہاتا نہ ہوگا۔ شکایت ہوگی معدے کی یا کسی جلدی بیماری کی — کیا عجب کہ دونوں قسم کی شکایتیں ہوں۔ اُس روز حکیم صاحب کے مطب میں مریض زائد ہوں گے اور یہ "چچڑ" رئیس مریض دوا لینے پر مصر ہوگا اور نہانے سے گریز کرتے رہنے کی لمبی چوڑی وجہیں بیان کر کے ان کا اور دوسرے مریضوں کا وقت ضائع کر رہا ہوگا..... اگر اس ناچیز کے اس حقیر نظریے کی کوئی وقعت آپ کے نزدیک نہیں ہے تو براہِ کرم کوئی دوسرا نظریہ پیش کر کے قارئین کو ممنون اور مجھے قائل کیجیے۔

پھر بھی، اس بیسویں صدی میں جب کہ بمبوں اور چشم زدن میں پانی گرم کرنے کے بجلی کے آلات کی کمی نہیں، دو چار حضرات ہیں میری نظر میں جو اکتوبر کے بعد بس مارچ ہی میں نہانے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں۔ اِنھی میں سے ایک صاحب میرے یہاں مہمان آئے۔ گلابی جاڑے تھے۔ ہم لوگوں نے گرم پانی سے نہانا شروع نہیں کیا تھا۔ میں نے ان کو ٹھنڈے پانی سے نہانے کے فوائد اتنے بتائے کہ وہ ہمت کر کے نہانے پر راضی ہو گئے۔ کافی دیر بعد غسل خانے سے نکلے تو ان کے سر کے بال بالکل خشک تھے! ہاتھ، منھ اور پیر دھو کر نکل آئے تھے۔ ہم لوگ اُن کو اب تک چڑاتے ہیں کہ "کہو بھئی! آج نہائے تھے؟" ایک محترمہ ہیں جن کا نہانا بہ اقساط دو دن میں مکمل ہوتا ہے۔ پان ڈلی کا سلسلہ اور گھرداری کے تمام احکامات دورانِ غسل جاری رہتے ہیں۔ یہ محترمہ روزانہ کیسے نہا پائیں؟ ہاں طولانی "میعاد" غسل سے تعدادِ غسل کی کمی کچھ پوری کر لیتی ہیں! ایک اور بزرگ ہیں جو گرمیوں تک میں، متعدد مشوروں کے بعد، گرم پانی سے نہاتے ہیں صرف اس ڈر سے کہ کہیں نزلہ نہ ہو جائے۔ ایسے حضرات کو روزانہ ٹھنڈے پانی سے نہانے کا حکم دے کر، شاید حکیم بوعلی سینا ہی ان کا مزاج درست کر سکتے!

مجھے تو بچپن سے روزانہ نہانے کی عادت ہے۔ ادھر تقریباً ایک ماہ کی علالت کے بعد، ڈاکٹر نے "اسپنج باتھ" کی اجازت دی تو گھر والوں نے میری ضد پوری کر دی۔ تب سے دماغ میں یہ خیالات دوڑ رہے ہیں کہ دنیا میں نہانے کے کتنے ڈھنگ ہیں۔ قلو پطرہ کا

بقائے حسن کے لیے گدھی کے دودھ سے نہانا یا تقریباً دو ہزار سال پہلے شہر روم کے حماموں کا عیش کدے بن جانا یا شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں دہلی کے دو ایک حماموں کا صرف ایک شمع سے گرم ہونا وغیرہ جیسے پرانے قصوں کا ذکر چھوڑیئے مجھے تو نہانے کے کچھ نرالے طریقوں کا ذکر کرنا ہے جو دنیا میں کہیں نہ کہیں اب بھی رائج ہیں۔

مغربی دنیا کے باشندے تو زیادہ تر ٹب ہی میں نہاتے ہیں۔ ٹب کے حدودِ اربعہ اور لوازمات نہانے والے کے تن و توش اور اس کی جیب کی وسعت پر منحصر ہوتے ہیں۔ اگر کسی کا جسم اس کی جیب یعنی استطاعت سے زیادہ وسیع ہوا تو اسے اپنے جسم کو گٹھڑی بنا کر ایک معمولی ٹین کے ٹب میں خود کو ٹھونسنے کی مشق ہو ہی جاتی ہے۔

تاریخی تاثرات سے مغربی ایشیا کی کچھ قومیں جب ہندستان میں بسیں تو بہت سے شہروں میں گرم حمام بن گئے جن میں ہوا کا گزر تک نہ ہوتا۔ زیرِ فرش ایک بہت بڑے آہنی توے کے نیچے آگ سلگنے سے حمام اور اس کے حوض کا پانی گرم رہتا۔ حمام میں داخل ہونے سے پہلے نہانے والے کو ایک کمرے میں کچھ دیر بٹھا کر آنے والی مصیبت کے لیے تیار کیا جاتا۔ حمام میں گھستے ہی نیم تاریکی، بدبو اور دھوئیں سے دم گھٹنے لگتا اور گیس ماسک (GAS MASK) کی ضرورت محسوس ہوتی۔ "مشت مال" پر کہیں کوئی راضی ہو جاتا تو بس شامت ہی آجاتی! ہاتھ پیر مڑوڑ کر نائی کیسہ سے میل کی اتنی بتیں نکال دیتا کہ شرمندگی ہوتی کہ جسم اللہ لتنے میلے! اور بابا آدم کے خاکی ہونے کا یقین کامل ہو جاتا!!

اب اقتصادی دقتوں سے اول تو ایسے حمام بہت کم رہ گئے ہیں اور جو ہیں بھی وہاں لوگ آئے اور نہا کر چلے گئے۔ چالیس پچاس سال اُدھر تک لکھنؤ کے کچھ پرانے مکانوں میں بھی ایسے حمام پائے جاتے تھے کیونکہ وُسا باہر نہانا تو درکنار بال کٹوانا یا خط بنوانا تک کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ان کے اسٹاف میں تو نائی تک ہوتے تھے۔

عراق کے تقریباً ایسے ہی ایک حمام میں لکھنؤ کے ایک میر صاحب کو بڑا تلخ اور اُن کے دوستوں کو ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہوا۔ میر صاحب تھے بہت سیدھے سادے۔ ہر شخص اُن سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتا۔ اُن کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔ نائی کے نشتر کی وجہ سے سر پر بسنے کی جگہ تو نہ تھی البتہ چہرے پر سبزے کو اُگنے کی پوری اجازت تھی۔ قد تھا چھوٹا گھیر زیادہ عقل کم۔ تجربہ اور بھی کم۔ ہمت ندارد!

زیارت کے لیے عراق تشریف لے گئے۔ جہاز پر ایک زندہ دل گروہ کو اپنی بھولی بھالی حرکتوں سے سرفراز کرتے رہے۔ ہر شخص ہر چیز سے ان کو ڈراتا اور وہ ڈرتے۔ خدا خدا کر کے سمندر کا سفر ختم ہوا۔ عراق پہنچے۔ حمام جانا طے ہوا۔ حوض کوئی سمندر تو تھا نہیں۔ یونہی تکلف کے بعد، ہمراہیوں کی دعوت پر حوض میں اُتر سے۔ یارانِ طریقت کے مزید اصرار پر ڈبکی لی۔ کسی ذات شریف نے منڈیا دبا کر اُن کے جسم کے سب سے دبیز حصے پر کس کے لات جو رسید کی تو میر صاحب پردے کی دیوار کے نیچے سے گذر کر حوض کے زنانے حصے میں پھکاریاں لیتے ہوئے سطحِ آب پر ایک آبدوز کشتی کی طرح دھیرے سے اُبھرے۔ میر صاحب شاید یہ سمجھے ہوں کہ ڈوبنے کے بعد اُن کے نیک اعمال نے اُن کو جنت میں حوروں کے جھرمٹ میں پہنچا دیا مگر ان کی غلط فہمی جلد ہی "پر زور طریقے" سے رفع کر دی گئی۔ لکھنؤ کی عورتیں تو تھیں نہیں جو "اوئی اللہ" کہہ کر حواس باختہ ہو جاتیں۔ میر صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عربی دستہائے نازک سے مرمت ہو جانے کے بعد اسی راستے سے بیک گیر (BACK GEAR) میں پانی اگلتے ہوئے پلٹے!

ٹرکش باتھ کے لیے ترکی جانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کے بڑے شہروں کا کیا ذکر، ہندستان ہی کے بعض شہروں میں آپ کو اس کا کچھ تجربہ ہو سکتا ہے۔ پیسہ اوسط سے زائد ہونا چاہیے اور حماقت بھی۔ کیونکہ غلط فہمی یہ ہے کہ یہ "نہانا" وزن بھی کم کرتا ہے۔ آپ کو ایک خوبصورت بکس میں بند کر دیا جائے گا۔ گھبرائیے نہیں! آپ کی گردن باہر رہے گی۔ بلاتشبیہ جس طرح مرغیاں جال سے منڈھی ٹوکری میں ریل کا سفر کرتی ہیں! پھر اسٹیم کھول دی جائے گی۔ آپ ایک مرغِ مقفس کی طرح پھڑپھڑا کر رہ جائیں گے۔ مگر خود کردہ را علاج نیست۔ اگر آپ نے زیادہ داد ملا نہیں کی تو وقتِ معینہ پر رہا ہو کر بہ صورتِ مردِ مسلم، مگر کافی بریاں ہو کر، نکلیں گے! غسل کی تکمیل کے لیے خوبصورت ملازماؤں کے دستِ نازک سے مالش کا انتظام بھی ممکن ہو سکے تاکہ آپ اُن کے دامِ زلف میں پھنس کر اس دنیا فانی قفس کی طرف

پھر بائل پروانہ ہوں! آپ کو "نہانے" سے پہلے اور بعد اپنا وزن لے کر عین الیقین ہو جائے گا کہ اتنے پاؤنڈ اتنے منٹ میں گھٹے۔ ممکن ہے مزید تحقیق کے لیے آپ اپنا پیٹ سہلا کر دیکھیں کہ کتنا گھٹا۔ تب آپ کو کھانے کی یاد آئے گی اور اشتہا سے مجبور ہو کر آپ فوراً ہی "مرغنات" (اگر اس ترکیب کو آپ جائز سمجھیں) کھا کر اپنے تحلیل شدہ وزن کو واپس لے لیں گے!

"ساؤنا" (SAUNA) یا فنیش باتھ (FINNISH BATH) علاوہ فن لینڈ کے کچھ اور پاس کے ملکوں میں بھی رائج ہے۔ اس قسم کے "نہانے" میں بھی پانی سے چنداں غرض نہیں۔ بھاپ ہی سے کام چلتا ہے مگر بہ شکل دیگر۔ حمام ایک بند کمرہ ہے۔ دیواروں میں ریل کے ڈبے کی طرح لیٹنے کے لیے متعدد درجے بنے ہیں جن میں بہت سے حضرات، لباس سے بے نیاز، اس مثل کو زندہ کیے ہوئے ہیں کہ "ایک حمام میں سب ننگے"۔ ان میں آپ بھی شامل ہو جائیے۔ فرش پر آگ میں تپائے ہوئے بڑے بڑے پتھروں پر پانی چھڑکنے سے حمام میں بھاپ پھیلی ہوئی ہے۔ پارۂ حرارت اتنا زائد ہے کہ اگر مجھے صحیح یاد بھی ہوتا تو آپ کب یقین کرتے۔ برا نہ مانیے گا بس یوں سمجھ لیجیے کہ ایسے حماموں میں نہانے کا عادی ہو جانے سے دوسری دنیا میں گناہوں کی سزا بھگتنے کی مشق ہو جائے گی! ہر شخص کا جسم حدت سے سرخ ہو رہا ہے۔ پسینے کے تراڑے بہہ رہے ہیں۔ نہانے والوں میں سے اگر کوئی صاحب فرشتۂ عذاب بن کر، گرز کے بجائے 'برچ' (BIRCH) درخت کی ٹہنی لیے آپ پر پل پڑیں تو ان سے کہیں لڑنے نہ لگیے گا۔ وہ تو صفائی کی غرض سے آپ کی زدو کوب کریں گے تاکہ آپ کے تمام مسامات کھل جائیں اور میل چھٹ جائے۔ آپ کو تو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، البتہ ان کا بدلہ آپ ویسی ہی شاخ کی مدد سے کسی دوسرے صاحب سے لے سکتے ہیں۔

جب آپ گناہوں کی کافی سزا بھگت لیں تو بابِ مغفرت کھولیے یعنی حمام کے باہر بھاگ کر، اسی میدان میں جہاں یقیناً برف باری ہو رہی ہوگی، خوب ہی لوٹ لگائیے یا اگر آپ کی خوش قسمتی سے قریب ہی کوئی منجمد جھیل ہو تو بس آنکھ بند کر کے، بلا سوچے سمجھے، کود ہی تو پڑیے کیونکہ یہ اس قسم کے غسل کا لازمی اختتام ہے۔ اس سے اگر ذرا بھی ہچکچائے تو بس سمجھیے کہ رہ گئے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی مہماں نواز آپ کے پس و پیش کو دیکھ کر، آپ کو جھیل میں زبردستی ڈھکیل دے تاکہ آپ کا غسل درجۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور آپ کے ضرورت سے زائد کھلے ہوئے مسامات پھر قدرت کی مقررہ حد تک بند ہو جائیں۔ چلیے چھٹی۔ ہاں کپڑے پہننا نہ بھول جائیے گا کیونکہ اس زمہریری تجربے کے بعد آپ کا جسم اور دماغ اتنا سن ہو چکا ہوگا کہ شاید لباس کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو!

جاپانی غسل کا تذکرہ کرنا مجھے سب سے پہلے لازم تھا کیونکہ جاپانیوں سے زائد کوئی اور قوم صفائی کی دلدادہ شدید ہی ہو۔ اور نہانا تو صفائی کا جزو اعظم ہے

جاپان میں اول تو وہی مغربی طریقہ ہے کہ مختصر سے لکڑی کے ٹب میں ٹھنس ٹھنسا کر غریب غربا ایک ضروری فرض ادا کر لیں۔ دوسرے زمین سے ابلتے ہوئے گرم چشموں کے پاس خود اپنی قبر کھود کر، بلا اندیشۂ نکیرین صبر سے لیٹ رہا جائے کہ چشمے کا پانی برس برس کر اس وقتی قبر کو لبالب کر کے حسرت تازگی پوری کر دے۔ کچھ بوڑھے تو اپنے بڑھاپے کے امراض کے علاج کے لیے ایسی خود ساختہ قبر سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے جب تک کہ وہاں کا منتظم آ کر قم باذنی نہ کہتا!

کتنے ہی اختصار سے کام لوں، پھر بھی تیسرے اور چوتھے جاپانی طریقۂ غسل کے بیان میں مجھے قلم کو روشنائی سے کافی نہلانا ہوگا:

کوتہ نتواں کرد کہ ایں قصہ دراز است

اوسطاً ایک جاپانی جتنے گرم پانی سے نہانے کا عادی ہے وہ ہمارے آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ بلا مبالغہ ایک سو بیس درجۂ حرارت (120° ف) کے پانی میں نہانا ایک جاپانی کے لیے کوئی کارنمایاں نہیں۔ بعض جوانمرد تو ایک سو چھبیس ڈگری (126° ف) سے بھی نہیں بھاگتے۔ ایسے موقعوں پر ایک نووارد، حوض میں اترنے سے پہلے تہذیباً اپنی آمد سے متنبہ کرتا ہے اور پھر بھی بہت آہستگی سے حوض میں داخل ہوتا ہے کیونکہ ایک ہلکی سی لہر بھی ان حضرات کو بہت ناگوار ہوتی ہے جو پہلے سے حوض میں جوش کھا رہے ہوں!

جس طرح ہم لوگ لکھنؤ کے بچے کھچے پارکوں میں کبھی کبھی ہوا کھانے جاتے ہیں اسی طرح جاپانی اپنے شہروں کے متعدد، صاف ستھرے

"اشنان گھروں" میں ہر وقت پہنچتے رہتے ہیں۔ صفائی کے خیال سے جوتے باہر اتار دینے پڑتے ہیں (غائب نہیں ہوتے!) کپڑے اتارنے کا کمرہ مخصوص ہوتا ہے۔ حمام کے وسط میں گرم پانی کا زمین دوز حوض ہوتا ہے جس کے چاروں طرف ڈھال اس طرح بنائی جاتی ہے کہ باہر سے پانی بہہ کر حوض کے اندر نہ جاسکے۔ حوض عموماً اتھلا ہوتا ہے یعنی تقریباً ایک گز گہرا۔ حوض کے اندر، چاروں طرف ایک بنچ ایسی بنی ہوتی ہے کہ اس پر بیٹھ کر، خوکانہ انداز میں، منڈیا پانی کے اوپر کیے ہوئے، جسم دھیمے دھیمے سینکا جاسکے۔ صابن اور تولیا ہر شخص اپنا لاتا ہے۔ پہلے حوض کے باہر جسم کو دھونا لازمی ہے تاکہ حوض کی برادری میں شامل ہونے سے پہلے صفائی ہوجائے۔ پھر پانچ چھ منٹ حوض میں مسامات کھولنے کے بعد پاس ہی گرم یا سرد پانی کے بمبوں کے نیچے صابن سے مزید صفائی کرکے دوسری مرتبہ حوض میں داخلہ ہوتا ہے اور تب جتنی دیر جی چاہے اپنے گوشت اور پوست کو اُبالا جائے۔ ساتھ ساتھ گپ بھی لڑتی رہے۔ اس کو آپ غسلِ سہ گونہ کہہ سکتے ہیں۔ جاپانی نام کب یاد رہے گا۔

ایک زمانے میں جاپان میں مرد اور عورت ایک ہی حمام میں برہنہ نہاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کو معیوب سمجھا جانے لگا۔ پہلے تو صرف ایک رسی بیچ میں کھینچ کر اصناف کی علاحدگی برتی گئی! اس میں ہنسنے کی کون بات ہے؟ جغرافیہ داں جب خطِ استوا سے اتنے بڑے کرۂ ارض کی خیالی تقسیم کرسکتے ہیں تو پھر خطِ رسن کچھ تو وجود رکھتا ہے! پھر رسی کی جگہ ایک نیچی دیوار نے لی، جس سے "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والا مضمون رہنے لگا۔ مگر اب تو زنانے اور مردانے پبلک حمام الگ الگ بننے لگے ہیں۔

ایک اور عجیب و غریب طریقۂ غسل ہے جس کا جاپانی نام بہت ٹیڑھا ہے۔ ہاں اپنی بولی میں "دیگ کا تھان" کہنے میں کیا خرابی ہے؟

حمام کے کنارے ایک نیم دفن دیگ کا تصور کیجیے جو فرش کی سطح سے کچھ زیادہ بلند نہیں۔ اُس کا نمودار حصہ لکڑی سے منڈھا ہے جس کی وجہ آگے چل کر، ٹھنڈے دل سے سوچیے گا تو خود ہی واضح ہوجائے گی۔ دیگ کی گہرائی تقریباً ایک گز اور منہ کا قطر اتنا ہے کہ اُس میں "الفربہ" حضرات بھی سما سکیں۔ حمام کے باہر مگر برابر دیگ کے نیچے آگ سُلگ رہی ہے۔ اس میں ہم آپ کیا "غسلِ گرم" کے دلدادہ کوئی جاپانی صاحب بھی ایک دم سے اتر نہیں سکتے۔ اسی لیے اس دیگ میں لکڑی کا ایک گول پٹرا اوپر تیر رہا ہے۔ اب پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ایک نٹ کی طرح، پٹرے کو اپنے ایک پیر سے پانی کے اندر دبانے کا کرتب دکھایئے اور موقع پاکر دوسرا پیر بھی اس طرح جمایئے کہ خوبیٔ قسمت سے وہ پٹرا دیگ کی تہ پر ہو اور آپ پٹرے پر۔ اگر پٹرے کو مذاق کی سوجھی اور نکل بھاگا اور آپ نے کہیں دیگ کی تہ پر پیر جما دئے تو آپ کا باقی جسم جوشاندہ و صاف نمودہ ہوکر نکل بھی آئے مگر آپ کے تلوے تو بس کسی آبلہ پا شاعر ہی کے ہوکر رہ جائیں گے جو دشت نوردی کی تمنا رکھتا ہو اور جس کو تلاش خارہائے مغیلاں کے علاوہ کوئی اور ہوس نہ ہو!

خیر! یہ مان لیا جائے کہ آپ فاتحانہ انداز سے پٹرے کو دشمن کی طرح پیر کے نیچے دبا کر کھڑے ہوچکے ہیں۔ اب کہیں جوش میں آکر دیگ میں ایک دم سے بیٹھ نہ جایئے گا ورنہ واقعی جوش ہوجائے گا! آپ کو تو ابھی اوپر کے باقی حصۂ جسم کو تدریجاً پانی کے اندر اس طرح لے جانا ہے جس طرح پیٹ بھرا سانپ آہستہ آہستہ بل میں گھستا ہے۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کو ماہِ نخشب کی طرح دیگ کے اندر غروب ہونا ہے ورنہ یاد رکھئے کہ جاپانی بڑے زندہ دل ہوتے ہیں اور کسی کو دیگ سے اُچھل کر بھاگتے دیکھ کر ان کا حسِ مزاح ان کی فطری تہذیب پر غالب ہوسکتا ہے۔

جب آپ دیگ میں تشریف لے جاچکے ہوں اور رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ کا وظیفہ شروع کر رہے ہوں، تب اگر باہر کی کھڑکی سے منہ نکال کر چولھا سلگانے والا ملازم یہ دریافت کرے کہ "پانی ٹھنڈا تو نہیں ہوگیا۔ آنچ تیز کردوں؟" تو براہِ کرم اس کو کوئی جواب نہ دیجیے گا۔ ممکن ہے کہ آپ کا گرما گرم جواب فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہو..... پردیس کا معاملہ..... کہیں بات بڑھ گئی تو؟!!



غزل

ابراے حفیظ بنارسی

زلف کو شام تو عارض کو سحر کہتے ہیں
ہم ہر اک بات بہ اندازِ دگر کہتے ہیں

مہ و انجُم کو سمجھتے ہیں ترے نقشِ قدم
کہکشاں کو تری اِک راہ گزر کہتے ہیں

زخم کو دیتے ہیں تشبیہِ گلِ خنداں سے
دل کے ہر داغ کو ہم رشکِ قمر کہتے ہیں

موت کا نام سکونِ ابدی رکھّا ہے
عرصۂ زیست کو اک رقصِ شرر کہتے ہیں

محفلِ زیست میں رائج ہے یہی طرزِ بیاں
دل کا افسانہ بہ عنوانِ نظر کہتے ہیں

میری پلکوں سے جو ٹپکے تو فقط قطرۂ اشک
اُن کے عارض پہ جو ڈھلکے تو گہر کہتے ہیں

ہونٹ سیتے ہیں تو بربادیِ دل ہوتی ہے
شکوہ ہوتا ہے کوئی بات اگر کہتے ہیں

کس نے سمجھا تھا کہ اس درجہ ترقی ہوگی
عیب کو اہلِ جہاں آج ہنر کہتے ہیں

نہ شرر ہے نہ دھواں، پر ہے بلا کی سوزش
ہے یہی آگ جسے سوزِ جگر کہتے ہیں

میرے اشعار سے ظاہر ہے مرا حُسنِ نظر
آئینے خود صفتِ آئینہ گر کہتے ہیں

کل جو ہنستے تھے مرے دیدۂ گریاں پہ حفیظ
اُن کا دامن بھی اب اشکوں سے ہے تر، کہتے ہیں

غزل

سحر اعظمی

میں خاک بسرتاج نہ زر ڈھونڈھ رہا ہوں
اخلاص ہو جس میں، وہ نظر ڈھونڈھ رہا ہوں

اک رابطۂ خاص سے اُمید لگائے
بے ربط دعاؤں میں اثر ڈھونڈھ رہا ہوں

سنگِ درِ جاناں کا یہاں ہوش ہے کس کو
سودا کا یہ عالم ہے کہ سر ڈھونڈھ رہا ہوں

آشوب گہِ دہر کی بے کیف فضا میں
آسودگیِ قلب و نظر ڈھونڈھ رہا ہوں

اے زلف بہ رخسار جو گزری ہے ترے ساتھ
دن رات وہی شام و سحر ڈھونڈھ رہا ہوں

تعمیرِ نشیمن کے لیے، اے چمن آرا!
آما جگہِ برق و شرر ڈھونڈھ رہا ہوں

دھوکا ہی تو ہے منزلِ آغازِ محبت
انجام ہے معلوم، مگر ڈھونڈھ رہا ہوں

تم بھی مرے مرنے کی دُعا شوق سے مانگو
میں بھی شبِ ہجراں کی سحر ڈھونڈھ رہا ہوں

عرفانِ تلاطم کا سحرؔ فیض تو دیکھو
ہر موج کے دامن میں بھنور ڈھونڈھ رہا ہوں

لے آئیں گے بازار سے .....

کے، پی، سکسینہ

شہنشاہِ سخن مرزا نوشہ تو یہ کہہ کر آنجہانی ہوئے کہ ـــــ 'لے آئینگے بازار سے جا کر دل وجاں اور' ـــــ

پھر انھوں نے پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ 'دوسرے دل وجاں' کا انتظام ہوا یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں ایک نئے دل کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی ہو۔ یا پھر نیا دل فراہم کرنا ان کے بس کی بات نہ رہی ہو۔ بہرحال آج کے کرشمہ ساز سائنسداں نے نئے دل وجاں کا انتظام کر دیا ہے! اور نوعِ انسانی کا ایک عظیم خواب پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ انسان نے دل پر قابو پالیا ہے اور پرانے قدرتی پھٹے پٹے شکستہ دلوں کی جگہ نئے دل فراہم کرنے کے لیے ایک کارخانہ قائم ہوچکا ہے۔ نیویارک کے اس عجیب وغریب کارخانے سے ہر دل والا پرانے دل کے عوض نیا دل حاصل کرسکتا ہے۔ ویسے اگر آپ جوانی ہی میں دل گنوا چکے ہیں تو اس کا علاج صرف محبوب کی زلفِ گرہ گیر میں ہے، اس کارخانے میں نہیں۔

اب سے دو سال پہلے کی بات ہے کہ ۱۷ر اپریل ۱۹۶۵ء کو نیویارک میں عالمی قلبی کانفرنس میں اس رائے سے اتفاق کیا گیا تھا کہ قلبی بیماریوں کا علاج نئے دل بنا کر ہی ہوسکتا ہے۔ سائنسداں سر جوڑ کر بیٹھے انھوں نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ بالآخر ۲۸ر جون ۱۹۶۶ء کو قلبی کارخانے نے کام کرنا شروع کر دیا اور پہلے ہی آرڈر میں ۶۹ نقلی دل سپلائی کیے گئے۔ نقلی دلوں کی سپلائی کے اس معاہدے پر ۲۷ قلبی سائنسدانوں نے دستخط کیے۔

سائنس کی اس حیرت انگیز ایجاد کا سہرا اسٹر مائیکل۔ ای۔ ڈی کے سر ہے۔ ڈاکٹر ڈیباکے دنیا کے مشہور ومعروف قلبی معالج ہیں۔ اپنے کی پہلی آزمائش انھوں نے قلبی بیماری کے دو مریضوں پر کی۔ ان دو مریضوں کے دل تقریباً بیکار ہوچکے تھے اور ان بدنصیبوں کو چند روز کا قرار دے دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ڈیباکے نے آپریشن کے ذریعے ان کے گھسے بیمار دلوں کی جگہ اپنے پہلے دو نقلی دل لگائے۔ لوگوں کی حیرت کی انت رہی جب یہ معلوم ہوا کہ دونوں نقلی دل اصلی دلوں کی طرح اپنا کام انجام دے رہے ہیں اور مریضوں کو نئی زندگی مل چکی ہے۔ ڈاکٹر ڈیبا نے اس سے قبل اپنے تجربے جانوروں کے دلوں پر کیے تھے۔ پہلی ہی کو میں انھوں نے نقلی دلوں کے سہارے چمپازیوں اور بندروں کو ۲۱ گھنٹ تک زندہ رکھا۔ اس تجربے میں ڈاکٹر ڈیباکے نے کافی وقت گنوایا مگر ا نے ہمت نہ ہاری۔

یہاں تعارف کے طور پر چند الفاظ ڈاکٹر ڈیباکے کے سلسلے میں لک غیر مناسب نہ ہوگا۔ ڈاکٹر ڈیباکے صرف پندرہ سال کی عمر میں فکرِ معاش سلسلے میں لبنان سے امریکہ چلے گئے جہاں ان کے والد کی انگریزی دو دوکان تھی۔ ڈاکٹر ڈیباکے اپنے تصور میں ایک مشہور معالج بننے کے خواب دوکان پر نسخے بنایا کرتے تھے۔ کالج کی تعلیم ختم کرکے انھوں نے نیویارک م فیکلٹی سے بی۔ ایس اور ایم۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے بعد نے پیٹ کے ناسور پر ریسرچ کی اور ایم۔ ایس کا اعزاز حاصل کیا۔ اسٹ

اور ہیڈل برگ یونیورسٹیوں میں جب وہ پروفیسر تھے تو ڈاکٹر ڈیبا کے نے پیرس کا سفر کیا اور وہاں کے ایک اسپتال کی نرس ڈائینا کوپے سے شادی کرلی۔ آہستہ آہستہ مشہور سرجن ڈاکٹر الٹن ایشنر کی نگرانی میں انھوں نے تبادلۂ خون (بلڈ ٹرانسفیوژن) میں مہارت حاصل کرلی۔ انھیں دنوں انھوں نے ایک ایسے عجیب رولر پمپ (ROLLER PUMP) کی ایجاد کی جو خود بخود ایک انسان کے جسم کا خون دوسرے انسان کے جسم میں پہنچا دیتا تھا۔ نقلی دل کی ایجاد کا خیال اسی دوران میں ان کے دماغ میں آیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں ڈاکٹر ڈیبا کے فوج میں بھرتی ہوگئے اور کرنل کا اعزاز حاصل کیا۔ ہیوسٹن کے بیلرس کالج آف میڈیسن کو ڈاکٹر ڈیبا کے نے اپنی تجربہ گاہ بنایا۔ اس تجربہ گاہ میں دن رات دماغ سوزی کرنے کے بعد ڈاکٹر ڈیبا کے کا نقلی دل بنانے کا خواب پورا ہوا۔

نقلی دل کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے پہلے قدرتی قلب انسانی پر ایک نظر ڈالیے ـــ بند مٹھی کے برابر، ہتھیلی جیسا ملائم، پاؤ بھر کا گوشت کا یہ جاندار لوتھڑا جسے ہم دل کہتے ہیں، دونوں پھیپھڑوں کے درمیان کچھ بائیں جانب ہوتا ہے۔ جوان دل فی منٹ ۷۵ - ۷۰ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ ۷۰ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے یہ ۲۶۰ کروڑ مرتبہ دھڑک چکا ہوتا ہے۔ ہر دھڑکن آٹھ سیکنڈ بعد ہوتی ہے۔ نوزائیدہ بچے کا دل ایک سو بیس (۱۲۰) سے لے کر ایک سو چالیس (۱۴۰) مرتبہ تک دھڑکتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ دل کی دھڑکن کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آکسیجن لے جانے والی خون کی نلیوں کی دیواروں کا پھیلا پن کم ہوتا جاتا ہے اور نلیوں کے پھیلنے سکڑنے کی طاقت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کا اثر دل کی دھڑکن پر بھی پڑتا ہے اور نتیجے میں دل کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ مرد کے دل کا وزن تقریباً ۱۲ اونس اور عورت کے دل کا وزن ۹ اونس ہوتا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن خون کو نلیوں کے ذریعے جسم میں پمپ کرتی ہے۔ دل کے چاروں طرف ایک مہین جھلی کی تھیلی ہوتی ہے جسے میراکارڈیم (MERACARDIUM) کہتے ہیں۔ دل کے مجموعی طور پر دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصے میں جسم کے مختلف حصوں سے کھنچ کر گندہ خون اکٹھا ہوتا رہتا ہے جو پھیپھڑوں میں پہنچ کر صاف ہوتا رہتا ہے اور دوسرے حصے سے یہی صاف شدہ اور تازہ خون جسم میں پمپ ہوتا رہتا ہے۔ خون کی نلیوں کی دیواروں کا لچیلا پن ختم ہو جانے پر خون کے تھکّے یا تھرامبین (THROMBIN) خون کے بہاؤ کی راہ میں روڑا بن جاتے ہیں اور آرتھو کلوراسس نام کی قلبی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بیماری بڑھتے بڑھتے مایو کارڈیل انفادکشن (MIOCORDIAL INFORCTION) کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ۱۲ اونس کا پمپ (دل) اپنا کام بند کر دیتا ہے۔ جسم کے کسی حصے کو خون نہیں پہنچتا اور سارا جسم نیلا یا سیاہ پڑ جاتا ہے اور انسانی جسم آکسیجن نہ ملنے کی وجہ سے 'خاک' کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک حرکتِ قلب بند ہو جانے پر مریض کو مردہ سمجھ لیا جاتا تھا۔ ڈاکٹروں کے سامنے ایک نیا سوال پیدا ہوا اور انھوں نے سوچا کہ اگر دل میں دوبارہ حرکت پیدا کر دی جائے تو انسان کو پھر سے زندگی بخشی جا سکتی ہے۔ روس میں اس تجربے کے سلسلے میں کئی مرتبہ بے جان دل پر مالش کے اثر سے حرکت پیدا کی گئی۔ کچھ عرصہ ہوا امریکہ کے ایک اسپتال میں ایک ایسا مریض لایا گیا جس کا دل سڑ کر بالکل خراب ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے آپریشن کی میز پر لٹایا ہی تھا کہ مریض نے دم توڑ دیا۔ مگر ڈاکٹروں نے ہمت نہ ہاری۔ فوراً آپریشن کر کے دل کو نقلی طور پر پمپ کیا گیا۔ جسم میں نقلی پمپ کے ذریعے خون پہنچایا گیا اور مریض نے آنکھیں کھول دیں۔ اس حیرت انگیز تجربے نے قلبی سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی کی اور ایک ایسا آلہ ایجاد کیا گیا جو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے بعد وقتی طور پر انسان کو زندہ رکھ سکے۔ اس آلے کا نام ہے 'پیس میکر' (PACE MAKER) ـــ جیب گھڑی کی طرح کا یہ آلہ انسانی جسم میں دل کے نزدیک بذریعہ آپریشن فٹ کر دیا جاتا ہے۔ ایک تازہ اخبار اطلاع کے مطابق واشنگٹن میں ایک دوکاندار پچھلے ڈھائی سال سے پیس میکر کی بدولت ہی زندہ ہے اور اپنی دوکان بہ خوبی چلا رہا ہے۔

نقلی دل پلاسٹک کا بنا ہوا دل کی شکل کا ایک ایسا آلہ ہے جس میں دل کے دونوں حصے موجود ہوتے ہیں۔ حرکت کرنے کے لیے اس آلے میں خود بخود بجلی پیدا ہوتی ہے۔ دلوں کے تبادلے کے وقت یعنی نقلی دل فٹ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ دماغ کو تازہ خون پہنچتا رہے اور جسم کو کم سے کم درجۂ حرارت پر زندہ رکھا جا سکے۔

نقلی دل کے سلسلے میں ایک بات آج بھی سائنسدانوں کے لیے باعثِ پریشانی بنی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ نقلی دل لگا دینے کے بعد ہر دوسرے سال اس میں نئی بیٹری لگانا پڑے گی۔ روسی سائنسداں اس سلسلے میں ایک

نئی ترکیب سوچ رہے ہیں۔ وہ یہ کہ نقلی دل ایسا ہو جسے آپریشن کے ذریعے جسم میں داخل نہ کرنا پڑے بلکہ معمولی ساعتی آلے کی طرح اسے جیب میں رکھا جا سکے یا گلے میں لٹکایا جا سکے۔ اس طرح بیٹری بدلنے میں کافی آسانی ہوگی، خواہ وہ ہر دوسرے سال ہو یا اس سے بھی پہلے۔ مگر اس میں بھی ایک خطرہ درپیش ہے۔ کسی حادثے یا ٹکر میں نقلی دل کی مشین ٹوٹ گئی تو؟ ایسی حالت میں یہ بے دلی آپ کو زندہ نہ چھوڑے گی۔ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے سائنسداں ایک نئی ترکیب سوچ رہے ہیں یعنی ایک ایسا نقلی دل تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو ایک مرتبہ آپریشن کر کے فٹ کر دیا جائے اور ریڈیائی طاقت کے ذریعے بغیر بیٹری زندگی کی آخری سانس تک حرکت کرتا رہے۔ چمپانزی بندر کے جسم پر یہ تجربہ کافی حد تک کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر ڈیباکے کا قول ہے کہ اس نقلی دل کو لگانے اور اس میں حرکت پیدا کرنے میں دماغ کا کردار خاصا اہم ہے۔ دل کی حرکت بند ہو جانے پر جسم کے دوسرے اعضا کی طرح دماغ کو بھی تازہ خون ملنا بند ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موت کا انحصار جسم کے کسی بھی حصے کی بہ نسبت دماغ پر زیادہ ہے۔ دماغ کو اگر چار منٹ تک متواتر تازہ خون نہ ملے تو دنیا کی کوئی طاقت انسان کو زندہ نہیں بچا سکتی۔ ایسی حالت میں نقلی دل بھی بیکار ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دل کی دھڑکن بند ہوتے ہی ڈاکٹر جسم کا درجہ حرارت کم کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دماغ کی آکسیجنی ضروریات قدرے کم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد نقلی دل کے فٹ کرنے کا عمل شروع کیا جاتا ہے۔ ہر حالت میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپریشن ہونے اور نیا دل فٹ ہونے تک دماغ کو زندہ رکھا جا سکے۔

عالمی ادارہ صحت (W.H.O.) کی رپورٹوں کے مطابق ایک لاکھ انسانوں میں سے ۴۵۶ انسانوں کی موت قلبی بیماریوں سے ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کے کل مرنے والوں کی تعداد کا ۴۹ فی صدی دل کی بیماری کی نذر ہو جاتا ہے۔ قلبی بیماریاں ۴۵ سال کی عمر سے لے کر ۵۴ سال کی عمر تک زیادہ ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ڈیباکے کے تجربے کے مطابق قلبی بیماریوں کی خاص وجہ خون کی نلیوں کا راستہ بند ہو جانا ہے۔ اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس بیماری کی ایک اہم وجہ خون کی نلیوں کی اندرونی دیواروں پر کولسٹرال (CHOLESTROL) نام کا مادّہ جمع ہو جانا بھی ہے۔ حالیہ تجربوں کی بنا پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ مادّہ آپریشن کے بعد کھرچ کر صاف کیا جا سکتا ہے۔ کھرچنے کے بعد نائلون کا پیوند لگا دیا جاتا ہے تاکہ مادّہ دوبارہ جمع نہ ہو سکے۔ نائلون کی نقلی نلیاں دل سے دماغ تک باندھنے میں بھی ماہرین قلب کامیاب ہو چکے ہیں۔ اس طرح مریضوں کو دماغی لقوے سے بھی بچایا جا چکا ہے۔ دل کے کپاٹ یا والو (VALVE) خراب ہو جانے پر پلاسٹک کے نقلی والو کا استعمال بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔

آج کل ڈاکٹر ڈیباکے کی نگرانی میں کئی معالج امراض قلب سو کتوں اور دوسرے جانوروں پر تجربے کر کے نقلی دل کو زیادہ بہتر بنانے میں کوشاں ہیں۔ فی الحال آپریشن کے وقت جو بجلی کا آلہ استعمال کیا جاتا ہے وہ کافی وزنی ہوتا ہے اور اسے اِدھر اُدھر لانا لے جانا دقّت طلب ہے۔ ڈاکٹر ڈیباکے ایک ایسے نئے آلے کی بھی چھان بین کر رہے ہیں جسے آسانی سے اسپتالوں میں استعمال کیا جا سکے۔

نوعِ انسانی کو قلبی بیماریوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے ڈیباکے کی پانچ کروڑ ڈالر کی اسکیم کا بیشتر حصہ عالمی ادارہ صحت نے پورا کیا ہے۔ نیشنل ہارٹ انسٹی ٹیوٹ (NATIONAL HEART INSTITUTE) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈیباکے صحیح معنی میں نئے دلوں کے جادوگر ہیں۔

نقلی دل کے بعد نقلی دماغ بنانے کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ جس دن عالمی سائنسدانوں نے اس عظیم خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اس دن آنے والی نسلوں کے نوجوان دل و دماغ کی بیماریوں کا مذاق اڑائیں گے اور 'دل لینے' اور 'دل دینے' کا مسئلہ رومانٹک حدود سے باہر نکل کر عملی صورت اختیار کر لے گا۔ اس دن شاید انسان فخر سے سر اونچا کر کے کہہ سکے گا کہ — لے آئیں گے بازار سے ۔ ۔ ۔ ۔



تمباکو اور حقّے کی وجہ تسمیہ

قمر الدین

ہر تصور کی تہہ میں ایک حقیقت ہوتی ہے اور ہر حقیقت کسی تصور کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر یوں کہیں کہ سورج نہ ہوتا تو اندھیرا ہوتا اور کوئی روشنی سے واقف بھی نہ ہوتا تو یہ ایک تصور ہے۔ لیکن اس تصور سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ روشنی بھی ہے اور اندھیرا بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حقیقت پہلے ہے اور تصور کا درجہ بعد میں۔

تمباکو نوشی کوئی تصور ہے یا حقیقت؟ میں آج تک اس فلسفے کو نہیں سمجھ سکا۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ع

زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

لیکن نہ یہ دیوانے کا خواب ہے اور نہ کہکشاں کی راہ میں چلتی ہوئی آوارہ زن کا سایہ۔ یہ انسان کی ایک بھول ہے جس سے زندگی کی چاندنی شمشان میں دہکی ہوئی آگ بن جاتی ہے۔ کسی بلا نوش کے منہ میں جلتا ہوا سگار ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ترا یہ اس کی تمناؤں کا مرگھٹ ہے جہاں شدت جذبات سے ہر نفس ایک بار ہے، آرزوؤں کا مزار ہے۔

راکھ ہی راکھ ہے اور دل کی گذرگاہ میں دھواں ہی دھواں ہے۔

بہرکیف میں تمباکو نوشی کو جھوٹی حقیقت یا ادھوری صداقت تسلیم کرتا ہوں۔ ماضی میں کوہکن نیزوں کی ہر نوک پر سینہ رکھ دیتا تھا اور تیشۂ کدال لے کر، موت کی صف میں کھڑے ہو کر تمازِ محبت ادا کرتا تھا۔ اس دور میں ذوقِ نغمہ کم ہے۔ مستی مے سے بہکی ہوئی عریانی عام ہے۔ سگرٹ کے دھوئیں اور سگار کے بل کھاتے ہوئے مرغولوں میں آج کا انسان فرار حاصل کر رہا ہے۔

اور یہ وبا (تمباکو نوشی) یوں تو آج کل ساری دنیا میں پائی جاتی ہے مگر ہندوستان میں تمباکو استعمال کرنے والوں کا ایک بڑا کنبہ پرورش پا رہا ہے۔ اور تمباکو مختلف طریقوں سے نہ صرف پیا جاتا ہے بلکہ سونگھا اور کھایا بھی جاتا ہے۔

دیہاتوں میں حقہ ہندوستانی تہذیب کا ایک ضروری جزو بن چکا ہے یہ نہ صرف دیہی بلکہ شہری اجتماعی زندگی کا بھی جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ خوشی یا رنج کا کوئی اجتماع ہو، حقہ کا ہر حالت میں ہونا ضروری ہے بلکہ اس حد تک کہ اس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ اسے پنچوں کا پیالہ سمجھا جاتا ہے، اسے سماجی عزت و توقیر کا نشان خیال کیا جاتا ہے۔ کسی محفل یا کسی اجتماع میں واجب التعظیم یا کسی بزرگ ہستی کو حقہ سب سے پہلے پیش کیا جاتا ہے یہی نہیں کہ اس کے ذریعے مجلسی آداب کو برتا جاتا ہے بلکہ حقہ صاحب خانہ کی شرافت و امارت کی علامت مانا جاتا ہے۔

ایک زمانے میں یورپ میں بھی حقہ دولت مندی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ہر گھر میں ایک حقہ بردار ہوتا تھا جو صاحب خانہ کے لئے حقہ تیار کرتا تھا۔ اس کی فرشی اور چاندی کی زنجیر کو چمکا کر رکھتا تھا۔ چلم پھونکتا تھا اور دعوتوں میں اپنے مالک کے ہمراہ رہتا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں عورتیں جب کسی مرد کی تواضع کرنا چاہتی تھیں تو اپنے حقہ کی نے اس کی طرف بڑھا دیا کرتی تھیں۔ اس کے برعکس مرد کسی خاتون کی حقہ سے تواضع کرنے کے لئے ایک فاضل نے رکھا کرتے تھے۔ مسلمانوں میں حقہ قومی اتحاد کا ذریعہ تھا۔ سب مسلمان ایک نے سے حقہ پی سکتے تھے۔ مسلم سرداروں کے حقّے بہت بڑے ہوتے تھے اس لئے ہر وہ شخص جو اس وقت موجود ہوتا تھا کافی دیر تک حقّہ پی سکتا تھا۔ ہندوستان میں مسلمان نوابوں اور ہندو راجاؤں کے حقّے بھی بہت بڑے اور قیمتی ہوا کرتے تھے اور حقہ بھرنے کے لئے تجربہ کار لوگ ملازم رکھے جاتے تھے۔

آج کل ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف قسم کے حقّے استعمال کیے جاتے ہیں۔ چھوٹے۔ بڑے۔ پیچوانی۔ لمبی نے والے۔ ربڑ کی نے والے۔

گڑ گڑی وغیرہ۔ اس کے علاوہ بیڑی، سگرٹ، چرٹ، سگار، پائپ وغیرہ کی شکل میں بھی تمباکو پیا جاتا ہے اور پان میں کھایا جاتا ہے۔ کھانے کی تمباکو بھی کئی قسم کی اور بعض بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ ہندستان کے کچھ علاقوں میں لوگ خالص تمباکو کھاتے بھی ہیں۔ تمباکو کو ہتھیلی پر رگڑ کر نچلے ہونٹ اور دانتوں کے بیچ میں دبا لیتے ہیں اور مزے لے لیکر اس کا رس چوستے رہتے ہیں۔

تمباکو امریکی لفظ ٹوبے کو سے بنا ہے۔ اسکی ایک شکل تماکو بھی ہے جو ہندستان اور وسط ایشیا میں بولا جاتا ہے۔ عربی میں اسے دخان اور کچھ ایشیائی ممالک میں اسے تبغ اور تتن بھی کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگرچہ اختلاف رائے ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تمباکو کا علم اور اس کے استعمال کا طریقہ باقی دنیا نے امریکہ سے سیکھا۔ سنہ ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے اپنے پہلے سفر کے دوران ایک پارٹی کو کسی نئی جگہ کی تلاش میں روانہ کیا جو اتفاقاً کیوبا پہنچ گئی۔ وہاں انھوں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو ایک جلتی ہوئی لکڑی کی مدد سے کچھ پتوں کو جلا کر خوشبو حاصل کر رہے تھے۔ تمباکو سونگھنے کی عادت کا مشاہدہ سب سے پہلے رومن پین (ROMON PANE) نے کیا جو کولمبس کے دوسرے سفر میں اس کے ساتھ تھا اور تمباکو کھانے کی عادت کا علم سب سے پہلے سنہ ۱۵۰۲ء میں اسپین والوں کو جنوبی امریکہ کے ساحل پر ہوا۔

اویڈو (OVIEDO) نامی ایک فرانسیسی نے سب سے پہلے حقہ کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے جو انگریزی کی Y کی شکل کا ہوتا تھا اور جس کے اوپر کی دونوں نلکیاں حقہ پینے والے کی ناک میں ہوتی تھیں اور نیچے کا سرا جلتے ہوئے تمباکو میں۔ اس طرح تمباکو کا دھواں ناک کے ذریعہ اوپر کھینچا جاتا تھا۔ گویا تمباکو نوشی کے لئے انسان کا یہ ابتدائی حقہ تھا جسے ٹاباکو (TABACO) کہتے تھے۔

اویڈو کے بعد مسٹر ہنسلاپ نے حقہ کا ذکر اپنی تصنیف میں سنہ ۱۶۷۵ء میں کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مصنفین اور سیاحوں کے روزنامچوں میں بھی حقہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ حقہ کا علم عام ہوتا گیا۔ حقہ کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً کریم کابن۔ ایلون۔ کلیان۔ نرکل اور گڑگڑی جو آج کل دیہات میں کسان اپنے کھیتوں پہ کام کرتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ جہاں سنہ ۱۷۴۰ء تک ہندستان میں حقہ کا رواج اتنا عام ہو گیا تھا کہ تقریباً ہر گھر میں استعمال ہونے لگا۔ حد یہ ہے کہ عورتیں بھی حقہ پینے لگیں اور دولت مند گھرانوں میں حقہ بردار نام کے خاص ملازم رکھے جانے لگے جو اپنے مالک کے لئے حقہ تیار کرتے اور مالک کی چہل قدمی کے وقت بھی حقہ لے کر ساتھ چلتے تھے۔

بین زونی (BENZONI) جس کی کتاب ٹریولز ان امریکہ (TRAVELS IN AMERICA) سنہ ۱۵۶۵ء میں چھپی ہے، لکھتا ہے کہ تمباکو کے پتوں کا میکسیکن نام ٹباکو (TABACO) تھا۔ یورپ میں تمباکو کے پودے کو سب سے پہلے سنہ ۱۵۵۸ء میں اسپین کا ایک ڈاکٹر جسے شاہ اسپین فلپ دوم نے کچھ ادویاتی پودوں کی تحقیقات کے لئے میکسیکو بھیجا تھا، اپنے ساتھ لایا تھا۔ یورپ میں تمباکو کی درآمد اور کاشت کے سلسلے میں جین نکوٹ (JEAN NICOT) کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے (غالباً نکوٹین اسی کے نام پر ہے)۔ اسپین سے ہی تمباکو سارے یورپ میں پھیلا اور اسے پینے کے مختلف طریقے انگریزوں نے ایجاد کئے۔

رالف لین (RALPH LANE) (جو ورجینیا میں اولین انگریز گورنر تھا) اور فرانسس ڈریک سنہ ۱۵۸۶ء میں امریکہ سے تمباکو اور تمباکو نوشی کے آلات اپنے ساتھ انگلینڈ لائے تھے۔ رالف لین پہلا انگریز تمباکو نوش کہلاتا ہے۔ سر والٹر ریلے نے سب سے پہلے تمباکو عوامی اجتماعات میں پینا شروع کیا۔ سترھویں صدی میں تمباکو دنیا کے بہت سے ممالک میں پھیل گیا اور سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کی سخت مخالفت کے باوجود تمباکو نوشی کا شوق روز بروز بڑھتا گیا۔

سترھویں صدی کے شروع میں تمباکو ترکی، عرب اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گیا اور بہت جلد امریکہ سے درآمد کیا جانے لگا۔ اگرچہ مسلم ممالک میں علما ہمیشہ اس کی مخالفت کرتے رہے لیکن اس کے باوجود اس کا استعمال بڑھتا ہی رہا۔

ہندستان میں تمباکو سنہ ۱۶۰۴ء میں آیا۔ اسد بیگ قزوینی

جو اکبر کے دربار کا ایک منصب دار اور مشہور شاعر تھا، سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھیجا گیا۔ وہاں اُس نے کچھ زائرین کو دیکھا جو کہ معظمہ سے آئے تھے اور پائپ میں تمباکو رکھ کر پی رہے تھے۔ اسد بیگ کو یہ شغل اتنا پسند آیا کہ اس نے تمباکو کی وہ پوری مقدار جو زائرین اپنے ساتھ لائے تھے، خرید لی۔

اسد بیگ نے تمباکو اکبر کی خدمت میں پیش کیا۔ اکبر نے اُس کے چند کش لگائے اور اُسے تمباکو پسند آیا۔ لیکن اکبر کے معالجین بضد تھے کہ وہ تمباکو نہ پئے کیونکہ اُن کی کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ مگر اسد بیگ نے حبیب بتایا کہ "یورپین ڈاکٹر تمباکو کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اور اسے دن میں کئی بار پیتے ہیں اور ان میں بہت سے ایسے دانش مند بھی ہیں جن سے شاید ہی کبھی کوئی غلطی ہوئی ہو" تو اکبر نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا اور ہندستان میں تمباکو نوشی کو رواج دینے کا حکم دے دیا۔

اسد بیگ نے تمباکو کے پتے تمام سرداروں اور منصب داروں کے پاس بھی بھیجے۔ آگرے کے سوداگروں نے جب تمباکو کے بارے میں سُنا تو انھوں نے اسد بیگ سے ہندستان میں تمباکو کی درآمد کے ذرائع معلوم کئے۔ سال بھر کے اندر ہی ہندستان میں تمباکو کی تجارت پنپ گئی اور ملک میں تمباکو نوشی کا رواج تیزی سے بڑھنے لگا۔ مغل دربار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے رکارڈوں سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۶۰۰ء اور سنہ ۱۷۵۰ء کے درمیان ہندستان میں تمباکو کی کاشت بہت تیزی سے پھیلی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے سنہ ۱۷۴۰ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں تمباکو کی فصل کو نقد جنس قرار دے دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تمباکو کا لگان کسان نقد رقم کی صورت میں ادا کرتا تھا کیونکہ تمباکو کی فصل تیار ہوتے ہی فروخت ہو جاتی تھی۔ تمباکو کی کاشت کے ساتھ ساتھ ملک میں تمباکو نوشی کی عادت بھی بڑھتی گئی۔

شروع شروع میں تمباکو پائپ میں رکھ کر پیا جاتا تھا اور اس کے پتے لکڑی کی آگ پر ٹھیک کئے جاتے تھے۔ لکڑی کا دھواں تمباکو کے پتوں میں جذب ہو کر انھیں بدبودار بنا دیتا تھا اور اُس کے دھوئیں میں کڑواہٹ بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ لیکن سنہ ۱۸۲۵ء میں امریکہ کے لوگوں نے اس کے پتوں کو پتھر کے کوئلوں پر ٹھیک کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔

ہندستان میں کمہاروں نے سب سے پہلے پائپ کی نلکی میں تبدیلی پیدا کی اور اس کی جگہ انھوں نے بلا نلکی کی چھوٹی اور سیدھی چلمیں بنائیں۔ اس طرح کی چلموں کا رواج ابھی تک ہندستان کے دیہاتوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ لوگ ایک بھیگا ہوا کپڑا اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور باری باری سے چلم پیتے ہیں۔ اس سے دو مقصد حل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ بھیگے کپڑے کی مدد سے گرم چلم ہونٹوں کو تکلیف نہیں پہنچاتی اور دوسرے یہ کہ دھوئیں کا اثر اور اُس کی بدبو کپڑے میں جذب ہو جاتی ہے۔ بھیگا ہوا کپڑا حسب خواہش اور حسب ضرورت بدلا جا سکتا ہے۔

سترھویں صدی میں حقہ کے لئے خوشبودار پانی نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ چنانچہ خوشبودار پانی میں مسالہ ملا کر حقہ پیا جانے لگا۔ اس کے لئے چلم کے علاوہ دوسرے ظروف بھی ایجاد کیے گئے۔ نقش ونگار کے ساتھ پہلا چاندی کا حقہ جہانگیر کے لیے بنایا گیا تھا اور یہ مشہور ہے کہ شہنشاہ نے اس حقہ کے کاریگر کو سات گاؤں انعام میں دیے تھے۔

حقہ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی صندوقچی کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ صورت میں حقہ کی ایجاد جنوبی فارس کے ایک بادشاہ نے سترھویں صدی میں کی تھی۔ مورخین اس روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اس لیے کہ بمبئی میں سب سے پہلے حقہ کریم کان کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا جس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ حقہ کے موجد، اس ایرانی بادشاہ کا نام کریم خان زند تھا۔

انسانی صحت پر تمباکو نوشی کے جو مہلک اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ کسی بیان کے محتاج نہیں۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں سائنس داں برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ تمباکو کا کوئی ایسا پودا اگانے میں کامیاب ہو جائیں جس کے مہلک اثرات انسانی صحت پر نہ پڑیں۔ لیکن ہندستان میں تمباکو جس جس طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید آج کا انسان اس کے مہلک اثرات سے بالکل بے خبر ہے۔



بے ثباتی

تحسین زبیدہ

دیکھنا وہ عشق پیچاں بھی ہے لہرائی ہوئی
ہر طرف سبزے پہ ہے مستی سی اک چھائی ہوئی
پھول پر شبنم کے قطروں سے ہے موتی کا گماں
مرمریں سے حوض میں ہیں پیاری پیاری مچھلیاں
نیم وا نرگس کا منظر بھی ہے کتنا دل نشیں
ایک دوشیزہ کی آنکھیں جیسے ہوں کچھ سرمگیں
وہ بڑا سا خوب صورت پھول ہے شاہِ چمن
برچھیاں تانے جلو میں خار ہیں سایہ فگن
گونج ہے بھنوروں کی یا شہنائی بجتی ہے کہیں
بڑھ رہا ہے روح کا ذوقِ سماعت آفریں
اک سماں باندھے ہوئے ہیں کالی کالی بدلیاں
پھول پر بھنورے کہیں ہیں اور کہیں ہیں تتلیاں
جنّت الفردوس کی ہیں اس چمن میں جھلکیاں
دور ہوتی ہیں یہاں پر زندگی کی تلخیاں
غنچے کچھ ہنستے رہے، کچھ پھول مرجھاتے رہے
بے ثباتی کا وہ تحسینؔ راز سمجھاتے رہے

غزل

بھگوان سروپ سکسینہ مسافر

وہ پوچھ رہے ہیں حالِ دل، خاموش نہیں رہتے بنتا
کہنے کی تمنا کیا کہیے، اور کچھ بھی نہیں کہتے بنتا
خاموش رہوں تو اے ہمدم، خاموش نہیں رہتے بنتا
کہنا تو بہت کچھ ہے لیکن کچھ تجھ سے نہیں کہتے بنتا
دنیا میں ہزاروں غم ہیں مگر ہے سب کا جدا احساس اثر
کم ہیں جو سہے جا سکتے ہیں، اکثر کو نہیں سہتے بنتا
یہ دنیا دنیا ہو جاتی، جنّت کا نمونہ بن جاتی
جس طرح تمنّا تھی اپنی، اس طرح اگر رہتے بنتا
اللہ ری وفا کی مجبوری، قربت پہ بھی تجھ سے یہ دوری
ہوتا نہ اگر تو شاملِ غم، یہ غم کیوں کر سہتے بنتا
یہ لالہ و گل، یہ شمس و قمر، یہ کوہ و دریا، شام و سحر
اے کاش کہ اس دنیا میں کہیں انسانوں سے رہتے بنتا
گل چاکِ گریباں ہوتا ہے، بلبل بن کے پریشاں ہوتا ہے
پابندیٔ صحنِ گلشن میں، جب اس سے نہیں رہتے بنتا
تنکے میں بھی یہ قوت تھی لیکن دل رکھ لیا موج و طوفاں کا
اے کاش کبھی طوفانوں سے، تنکے کی طرح بہتے بنتا
منزل پہ پہنچ کر، اے ہمدم! اب راہوں کی یاد آتی ہے
اے کاش مسافرؔ سے اپنی منزل پہ ہی رہتے بنتا

مشترکہ تہذیب اور اُردو نظم

ندا فاضلی

تہذیب، مذہب کی مانند بند کمرہ نہیں ہوتی۔ اس کی کھڑکیاں اور روشن دان ہر طرف کی خوشگوار ہواؤں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ فلپ۔ بی۔ رالف کے لفظوں میں

"یہ ٹھہرے ہوئے ستاروں کی طرح ایک محدود دائرے میں ہی نہیں گھومتی۔ اس کی رفتار انسان کی ذہنی رفتار کے مطابق بڑھتی پھیلتی رہتی ہے۔"

مذہب میں کسی قسم کے ردوبدل کے خیال کو بھی گناہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور تہذیب وقت کی بدلتی سمتوں سے تازہ خون حاصل کرکے اور شاداب و شگفتہ ہوجاتی ہے۔ کسی ملک یا عہد کا کلچر یک طرفہ ہو... ممکن نہیں۔۔ اس ایک رنگ میں کئی ہلکے گہرے رنگوں کی جلوہ سامانی ہوتی ہے۔ یہ کھلے آکاش اور پھیلی دھرتی کی طرح اسیم ہوتا۔ ہندو برسر اقتدار ہو یا مسلمانوں کی حکمرانی ہو، بودھ دھرمی راجہ ہوں یا عیسائیوں کے ہاتھوں میں باگ ڈور ہو۔ کلچر یا تہذیب کا بہاؤ ہمیشہ نظریاتی، اعتقاداتی اور طبقاتی چٹانوں کو پھلانگتا ہوا اپار ساگر کی طرف رُخ کئے بہتا رہتا ہے۔

مذہب فرد اور طبقہ کے رشتے سے متعلق ہوتا ہے اور کلچر فرد اور سماج کے رشتے کا توازن قائم کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک عقیدے کو بنیاد بنا کر چلتا ہے اور دوسرا عقیدے اور منطق دونوں کو حسب ضرورت کام میں لاتا ہے۔ یعنی رنگ برنگے پھولوں کی ہم آہنگی اور حسن کا احساس۔

گلہائے رنگ رنگ سے زینتِ چمن کی ہے
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

زندہ ادب فرد کے واسطے سے سماج کی مجموعی روح کا ترجمان ہوتا ہے۔ بڑھتے پھیلتے سماج کا ترجمان۔ جو مختلف رجحانات اور نظریات کے حامل افراد سے مرتب ہوتا ہے۔ اور چونکہ سماج اور فرد کے رشتے کا توازن بدلتے حالات اور ملکی و بیرونی تبدیلیوں کے مطابق اپنی نوعیت کا فیصلہ کرتا رہتا ہے اسی لئے ادب بھی عہد بہ عہد اپنا روپ رنگ بناتا، سنوارتا رہتا ہے۔ وقت کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے ادبی تخلیقات میں بھی اسی لحاظ سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ روایت اور جدیدیت کا فطری تصادم ہی کسی زبان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ کسی زبان کا ادب ہو اُسے کسی خاص بنے بنائے چوکھٹے میں فٹ کرکے دیکھنا مناسب نہیں۔ ادب پر اُس عہد کی جس میں اُس کی تخلیق ہوئی ہے۔ گہری چھاپ ہوتی ہے۔ جس کو جانچنے، پرکھنے کے لئے تاریخی شعور کے ساتھ اُن خاص حالات اور اثرات کی سوجھ بوجھ بھی ضروری ہے جو اپنے عہد کی امتیازی خصوصیات رہی ہیں۔

اردو زبان نے دوسری ملکی بھاشاؤں کی طرح ہندستان کی فضاؤں میں ہی جنم لیا ہے مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے کھڑی بولی (جس کی ترقی یافتہ شکل آج کی ہندی، اردو یا ہندستانی ہے) دتی اور دلی کے آس پاس بسنے والوں کی عام بول چال کی بولی بن چکی تھی۔ سنسکرت کا راج صرف ایک مخصوص طبقے تک محدود تھا۔ فوجی سپاہی اپنے اپنے خطوں اور قبیلوں کی زبان اپنے ساتھ لاتے تھے۔ سفر کی ضرورتوں اور عملی مجبوریوں نے انہیں بھی اُسی زبان سے قریب کیا جو اس کی نہیں بلکہ عوام کی بولی تھی۔ اس قربت سے ہوا یہ کہ دیسی بولی میں کچھ عربی فارسی ترکی اور دوسری مقامی بولیوں کے الفاظ بھی شامل ہوگئے۔ لیکن مجموعی طور سے اس کی ساخت، بناؤ اور قواعد قریب قریب ویسے ہی رہے جیسے کہ پہلے تھے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس لسانی اشتراک سے دیسی عوامی زبان کا روپ کچھ اور نکھر گیا، اس کے تیوروں میں کچھ اور نکھار آگیا، اس کے لہجے میں کچھ اور نکھار پیدا ہوگیا، اس کی ساخت میں کچھ اور چستی آگئی۔

اردو ادب کی تاریخ اسی جذباتی ہم آہنگی اور تہذیبی ارتباط سے شروع ہوتی ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے شعرا اور امیر خسرو کا کلام اس کا خوبصورت ثبوت ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کے ہاں ہندوؤں کے رسم و رواج، مذہبی عقائد اور رہن سہن کی جھلکیاں نمایاں طور سے نظر آتی ہیں بلکہ خالص دیسی الفاظ محاورات، جذباتی اسالیب، سلجھی ہوئی نرم روی اور مترنم بحروں کا استعمال بھی ان کی اہم خصوصیات ہیں۔ امیر خسرو، قطب شاہ اور نصرتی وغیرہ اس اشتراکی زنجیر کی بڑی جاندار کڑیاں ہیں۔ نصرتی کی ایک مشہور مثنوی "گلشن عشق" کا تو موضوع بھی کنور منوہر اور مدمالتی کی داستان معاشقہ سے لیا گیا ہے اور محمد قلی نے جو اکبر کے عہد کا شاعر تھا۔ ہندوستانی ترکاریوں، پھولوں، موسموں، شادی، بیاہ، اور میلے ٹھیلے تہواروں کے موضوعات پر کئی نظمیں کہی ہیں۔ محمد قلی کی نظم "بسنت" کے دو شعر دیکھیے:

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا
تمہیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ
رنگیلا ہو رہیا ترلوک سارا

بسنت خالص دیسی تہوار ہے۔ یہ زراعتی مزاج کا اشاریہ ہے ہاں اب اس میں اتنی تبدیلی ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ یہ دیومالائی روایات کے ساتھ اب "نبی کے صدقے" بھی کھیلی جانے لگی ہے۔ اب اس میں "عشق" کی طلسماتی فضا بھی پیدا ہو گئی ہے۔

امیر خسرو کی شاعری کے لوچ، رس، نرمی، اور موسیقیت کے دیسی پن سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ ان کی نظموں، پہیلیوں، دوہوں میں بھارتی دکھوں، خوشیوں، مسکراہٹوں، پیار، خواب، الجھنوں اور فکروں کی جھلکیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ ایک گیت ملاحظہ کیجیے۔ کوئی لڑکی سسرال میں ہے۔ آسمان پر بدلی اُمڈتی آ رہی ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کی سرسراہٹ سے باریک دوپٹے ڈھلکے جاتے ہیں۔ ہرے ہرے پتے بھولے بچوں کی طرح تالیاں بجا رہے ہیں۔ آم اور ڈالی کے پیڑوں پر پڑے جھولے کھنکتے سازوں کی مانند نت نئی راگنیوں سے گونجنے لگے۔ اور وہ

سہاگن سہیلیوں کے اصرار سے مجبور ہو کر جھولے پر تو آن بیٹھی مگر دل کسی اپنے کی یاد میں کھویا ہوا ہے۔ امیر خسرو نے اس تصویر میں یوں رنگ بھرے:

آماں میرے باوا کو بھیجو ری ... کہ ساون آیا رے
بیٹی! تیرا باوا تو بڈھا ری ... کہ ساون آیا رے
آماں میرے بھائی کو بھیجو ری ... کہ ساون آیا رے
بیٹی! تیرا بھائی بالا ری ... کہ ساون آیا رے
آماں میرے ماموں کو بھیجو ری ... کہ ساون آیا رے
بیٹی! تیرا ماموں تو بانکا ری ... کہ ساون آیا رے

اکبر آباد کا درویش صفت شاعر نظیر (اکبر آبادی) بھی اسی کا اہم اور سب سے نمایاں نام ہے۔ نظیر کی شاعری میں مادر ہند اپنے پورے جمال و رعنائی اور ست سنگار سمیت جلوہ فرما ہے۔ اس کا بدن ہولی کے رنگوں سے شرابور ہے اور کپڑوں سے عید کے عطر کی خوشبو آ رہی ہے۔ ہاتھوں میں سرسوں کے پھولوں کے گجرے بندھے ہیں اور بالوں میں چنبیلی اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ اس کے کانوں میں جھمکیاں جھوم رہی ہیں تو گردن میں چاندی کی ہنسلی دمک رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ویدوں کی چمک بھی ہے اور چہرے پر قرآنی تقدس بھی۔ اس کے ادھروں پر کرشن کی بنسی لگی ہے اور دھڑکنوں میں مرثیے کی شان ہے۔ نظیر کی شاعری اشتراکی حسن کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔ ان کی نظمیں خلائی یا تصوراتی نہیں!! یہ دھرتی پہ چلتی پھرتی دھوپ کا فن ہے۔ کرشن جی، گرونانک، حضرت محمد، ہولی، عید، جانور، پیشے، ریت رواج، روٹی، لباس، رشتے ناطے، غریبی امیری، موت زندگی..... شاید ہی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہو جس کی جیتی جاگتی تصویریں نظیر کے کلام میں نہ ملتی ہوں۔ ہولی کے تہوار پر نظیر کی کئی نظمیں ہیں۔ ان میں لہجے کی مٹھاس، نشیلا پن، سبک نغمگی، تخیل کا رچاؤ، قریبی مشاہدہ اور جزئیات نگاری ۔۔۔ اس تہوار سے شاعر کی ذہنی و جذباتی وابستگی کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہونا چاہیے جس میں مختلف فیکلٹیاں ہوں۔ اس سے قبل وزیر زراعت شری رام لکھن نے اصل سوال کا جواب دیتے ہوئے ایوان کو مطلع کیا کہ اجودھیا کے بابا نیواری داس نے گزشتہ ۲۱ ر اکتوبر کو وزیر اعلیٰ سے ملاقات کی تھی اور انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ اجودھیا میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔

× × ×

وزیر ریاست برائے سماجی فلاح شریمتی حامدہ حبیب اللہ نے حال ہی میں سوالات کے وقفہ کے دوران ودھان پریشد کو مطلع کیا کہ حکومت لاوارث لاشوں کو جلانے کے سلسلے میں ۱۵ اضلاع میں اول زمرہ کے لیے ۲۵ روپیہ فی لاش اور بقیہ اضلاع میں دوم زمرہ کے لیے ۱۵ روپیہ فی لاش کی شرح سے رقم دیتی ہے۔

ایک ضمنی سوال کے جواب میں وزیر سماجی فلاح نے کہا کہ اضلاع کی درجہ بندی آبادی کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ لاوارث لاشوں کو جلانے کے لیے دی جانے والی رقم میں اضافہ کرنے کی تجویز حکومت کے زیر غور ہے۔

متفرقات

عمر کی پابندی پر عمل درآمد ملتوی۔ ریاستی حکومت نے ہائی اسکول کے امتحان میں شرکت کرنے والے امیدواروں کے لیے ۱۴ سال کی کم سے کم عمر کی پابندی کو فی الحال ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس سلسلے میں متعلقہ افسران کو ضروری ہدایات جاری کر دی گئی ہیں۔

ٹیپ، فواڑہ اور ٹینس پر بکری ٹیکس میں کمی۔ ریاستی حکومت نے کل شام یہاں منعقدہ ایک جلسہ میں ٹیپ، فواڑہ اور ٹینس جیسے متعدد مرحلوں میں وصول کیے جانے والے بکری ٹیکس کی شرحوں میں ۵ر۳ فی صد سے ۲ فی صد تک کمی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ان اشیاء کے تیار کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔

قومی بچت میں کمایوں ڈویژن سر فہرست۔ اتر پردیش میں کمایوں ڈویژن نے ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران قومی بچت میں سب سے زیادہ رقم جمع کر کے گورنر کی رننگ شیلڈ حاصل کی ہے۔ اضلاع میں گڑھوال نے پہلا مقام حاصل کیا ہے اور وزیر اعلیٰ کی رننگ شیلڈ بطور انعام حاصل کی ہے۔ اس سے پہلے سال ۱۹۷۱ء میں یہ شیلڈیں بالترتیب گڑھوال ڈویژن اور ضلع گڑھوال نے حاصل کی تھیں۔

قومی بچت مہم۔ وزیر مالیات شری نرائن دت تیواری نے کابینہ کے اپنے ساتھیوں اتر پردیش سے منتخب پارلیمنٹ کے ممبروں اور ریاستی مجالس قانون ساز کے ممبروں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے دوروں کے دوران عوام کو قومی بچت اسکیم میں حصہ لینے کی اہمیت سے آگاہ کریں تاکہ ترقیاتی مقاصد کے لیے وسائل کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لایا جا سکے۔

انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ اس مہم کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں سماجی کارکنوں اور اداروں کا تعاون حاصل کر سکیں تو یہ انتہائی مفید ہوگا۔

"آرگنائزر" کا شمارہ ضبط۔ حکومت مغربی بنگال نے ایک انگریزی ہفت روزہ "آرگنائزر" کا ۱۷ ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کا شمارہ ضبط کر لیا ہے جسے شری برج بھوشن نے بھارت پرکاشن لمیٹڈ نئی دہلی کے لیے شائع کیا تھا اور جس کی تدوین شری کے۔ آر۔ ملکانی نے کی تھی۔ مذکورہ شمارہ کا ہر نسخہ اور دیگر ایسے تمام دستاویزات جن میں اس کی نقل کی گئی ہو نیز اس کی طبع ثانی اور ترجمہ یا اقتباس بحق حکومت ضبط کر لیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا شمارے میں ایسا مواد موجود ہے جو مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد برقرار رکھنے کے سلسلہ میں مضر ثابت رہا ہے اور جس سے امن عامہ درہم برہم ہو [illegible] ہے اور ایک فرقہ کے مذہبی جذبات کو [illegible]

طرف سے پمپنگ سیٹ اور ٹیوب ویل لگانے کے لیے کسانوں کو
دیے ہوئے قرضے کے استعمال کے سلسلہ میں غلط سرٹیفکیٹ دیے
ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں جتنی شکایتیں موصول
ہوئی ہیں ان کی جانچ کے احکام دیدیے گئے ہیں۔

وزیر موصوف نے کہا کہ قرضہ کی رقم کی تقسیم سے متعلق موجودہ
نظام میں کچھ خامیاں ہیں اور اس نظام کے نقائص دور کرنے کے
لیے حکومت متعدد اقدامات پر غور کر رہی ہے۔ ان اقدامات میں
... امداد باہمی فیڈریشن کو پمپنگ سیٹوں کی فروخت کا کام سپرد
... شامل ہے۔ وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ ۷۱-۱۹۷۰ء اور
۷۲-۱۹۷۱ء میں ضلع سلطان پور کی کادی پور اور سلطان پور تحصیلوں
میں کل ۵۹۹ افراد کو ۲۴۱۲۱۱۲ روپے کی رقم پمپنگ سیٹ اور ٹیوب
ویل خریدنے کے لیے بطور قرض دی گئی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ قرضہ
کی ادائیگی سے قبل کسان کو بینک میں بلاک ترقیاتی افسر کا یہ سرٹیفکیٹ
پیش کرنا ہوتا ہے کہ جن مشینوں کے لیے قرضہ دیا جا رہا ہے
وہ مشینیں کسانوں کو موصول ہو گئی ہیں۔

x x x

اترپردیش کے فوجیوں کی فلاح سے متعلق ڈائرکٹر کے جاری
کردہ ایک پریس نوٹ کے مطابق ریاستی تعمیر مکانات کمیٹی نے
... ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی ۱۹
... کے لیے اور معذور ہو جانے والے ۶ فوجیوں کو ۲۵ مکانات ...
ان مکانات ... ہیں۔
... ہیں۔ ان مکانات میں سے ۱۳ لکھنؤ میں اور چھ آگرہ میں اور چھ میرٹھ
... پسماندگان کے لیے ... مکانات کی تعمیر جنگ میں شہید ہونے والے فوجیوں کے
... سے کی گئی ہے ... تعمیر مکانات اسکیم کے تحت ۴/۲ لاکھ روپے کی اس
... سے متعلق امداد ... ریاستی حکومت اترپردیش کی پولیس اور مسلح
... پولیس فنڈ کی طرف ... دی تنظیم اور سابق فوجیوں کی بحالی سے متعلق
... دیہی علاقوں میں ... سے مہیا کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ شہری [illegible]
حکومت کے زیر ... مختلف مقامات پر مزید ۲۸۵ مکانات کی تعمیر کی اسکیم
... رہی ہے۔

ضلع لکھنؤ کے رحمان کھیڑا میں ۲۲۰ ایکڑ زمین کو زراعتی تحقیق
کی ہندوستانی کونسل کو اس غرض سے منتقل کر دینے کا فیصلہ کیا
گیا ہے کہ یہاں آموں کی تحقیق سے متعلق ایک قومی مرکز قائم
کیا جا سکے۔ اس میں سے ۲۰۰ ایکڑ زمین تحقیقی مقاصد کے لیے استعمال
کی جائے گی اور بقیہ پر عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔

یہ فیصلہ ریاستی کابینہ نے اپنے ایک حالیہ جلسہ میں کیا۔

یہ زمین محکمۂ زراعت کے زمین کے تحفظ اور تربیت سے
متعلق مرکز کی ہے اور اسے ایک روپیہ سالانہ کی برائے نام
شرح پر ۹۹ سال کے لیے پٹہ پر دے دیا جائے گا۔ مذکورہ کونسل
اس سے قبل اس زمین پر آموں کی تحقیق کا ایک ادارہ قائم
کرنا چاہتی تھی لیکن بعض دشواریوں کی بنا پر اب یہ آموں کی تحقیق سے
متعلق ایک مرکز قائم کرے گی۔

x x x

عظیم انقلابی اور شہید چندر شیکھر آزاد کی جائے پیدائش
ضلع اناؤ کے موضع بدرکا کے باشندوں کو پینے کا پانی پائپ لائن
کے ذریعہ جلد ہی فراہم کیا جائے گا۔ یہ اعلان وزیر لوکل سیلف
گورنمنٹ شری بینی سنگھ نے آزاد کے ۶۷ ویں یوم ولادت کے
موقع پر موضع بدرکا میں منعقدہ ایک تقریب میں کیا۔

اس واٹر ورکس کی تعمیر تقریباً ۱۰ لاکھ روپے کی تخمینی لاگت سے
کی جائے گی اور اس سے پائپ کے ذریعہ موضع بدرکا اور سات
یا آٹھ قریبی مواضعات کے تقریباً ...... باشندوں کو پانی مہیا
کیا جائے گا۔

x x

وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے ودھان سبھا میں
سوالات کے وقفہ کے دوران مطلع کیا کہ حکومت اجودھیا میں جلد
ہی ایک مکمل یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے پوری پوری کوشش
کر رہی ہے۔

شری ترپاٹھی نے مزید کہا کہ حکومت کا خیال ہے کہ اجودھیا
میں ایک زراعتی یونیورسٹی کی بجائے ایک مکمل یونیورسٹی

[illegible]

روزگار کی فراہمی کے لیے خصوصی پراجیکٹ ••• اسپتالوں میں چوبیس گھنٹے کی ایمرجنسی سروس ••• بیمنگ سیٹوں کی خریداری کے لیے امداد باہمی قرضوں کا بندوبست ••• جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی بیواؤں اور معذور فوجیوں کی بحالی ••• [illegible] کے تحقیقاتی مرکز کے لیے زمین کی فراہمی ••• امر شہید آزاد کے گاؤں میں پانی کی فراہمی ••• اجودھیا میں یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم ••• لاوارث لاشوں کو جلانے کا بندوبست ••• متفرقات

وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے حال ہی میں ودھان پریشد میں وقفۂ سوالات کے دوران بتایا کہ ریاستی حکومت نے ۸۹۴ کروڑ کا ایک خصوصی پراجیکٹ شروع کیا ہے جس کے تحت ۷۳-۱۹۷۲ء کے دوران ۱۱ لاکھ تعلیم یافتہ اور تکنیکی طور پر تربیت یافتہ افراد کو روزگار کی فراہمی متوقع ہے۔

شری ترپاٹھی نے بتایا کہ اس پراجیکٹ میں ریاست کے محکموں یعنی زراعت۔ اجتماعی ترقی۔ لوکل سیلف گورنمنٹ آبپاشی۔ نگہداشت مویشیاں۔ تعمیرات عامہ۔ صنعت۔ پنچایت راج اور بجلی کی ۱۵ اسکیمیں شامل ہیں۔ اس پلان بجٹ کے ۵۰ فیصد اخراجات مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔ انھوں نے کہا یہ اسکیمیں ۷۳-۱۹۷۲ء کے دوران جاری رہیں گی۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ گذشتہ دسمبر تک اس پروگرام پر تخمیناً ۳۲ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے

× × ×

شہری اسپتالوں اور ریاستی میڈیکل کالجوں سے ملحق اسپتالوں میں مریضوں کو ان اسپتالوں میں "ادائیگی کلینکوں" کے کھل جانے کے بعد بھی چوبیس گھنٹے ہنگامی خدمات کی سہولتیں حاصل رہیں گی تاکہ جو مریض ادائیگی کلینکوں کی خدمات حاصل کرنے کے خواہش مند نہیں ہیں انھیں وہ تمام طبی سہولتیں مل سکیں جو اب تک ہنگامی حالات میں مہیا کی جاتی تھیں۔

میڈیکل سکریٹری نے یہ ہدایات اتر پردیش کے علاج و صحت سے متعلق خدمات کے ڈائرکٹر کو ایک خط میں دی ہیں۔ ادائیگی کلینکوں کے قیام سے متعلق ایک تفصیلی اسکیم تیار کی جا رہی ہے اور اس سے متعلق احکام جلد ہی جاری کیے جائیں گے۔ اس اثنا میں یہ بندوبست کرنا ضروری تھا کہ مریضوں کو اسپتالوں میں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ادائیگی کلینکوں کے کھلنے تک ایسے مریضوں کو دیکھنے جانے کے لیے ڈاکٹروں کے موجودہ طریقے پر کوئی پابندی نہیں عائد ہونا چاہیے جن کی حالت تشویش ناک ہو اور جو چاہتے ہوں کہ ڈاکٹر انھیں ان کی جائے رہائش پر آ کر دیکھے۔ ڈاکٹروں کی وصول کی ہوئی فیس سرکاری خزانے میں جمع کر دی جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں الگ احکام جاری کیے جائیں گے کہ ڈاکٹروں کو اس میں کتنا حصہ ملنا چاہیے۔

یاد ہوگا کہ حکومت نے سول اسپتالوں اور ریاستی میڈیکل سے ملحق اسپتالوں میں لازم ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس پر یکم فروری ۱۹۷۳ء سے ممنوع کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان اسپتالوں میں ادائیگی کلینک قائم کیے جائیں گے جہاں ڈاکٹر کو کلینک کی آمدنی میں حصہ ملے گا۔ ڈاکٹروں کو ان کی تنخواہ کا ۵۰ فی صد پریکٹس نہ کرنے کے عوض میں بھتہ کے طور پر دیا جا رہا ہے

× × ×

وزیر امداد باہمی شری گوپی ناتھ دکشت نے ودھان پریشد میں سوالات کے وقفہ میں بتایا کہ ریاستی حکومت ان افسران کے خلاف سخت کارروائی کرے گی جنھوں نے ترقی آراضی بینک

دو نمائش کا بھی اہتمام کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اس نمائش کا مقصد مسلمانوں کے بڑے سائز کے فوٹو گراف، ہاتھ کی ڈرائنگیں، پلان کے پینل پر ہندی اور اردو کی تحریرات کے ذریعے اردو کی تاریخ کو قلی قطب شاہ سے ۱۹۴۷ء تک پیش کرنا ہے۔ اس میں خاص طور سے یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو زبان نے اپنی پیدائش سے حصول آزادی تک حب وطن، قومی یکجہتی، تحریک آزادی میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نمائش میں اردو کے اہم مصنفین کی رنگین تصویریں ایک ہوتے ہوئے کو اسکی کے ذریعے دکھائی جائیں گی اور ایک حصے میں جہاں ممکن ہوگا ہر اردو مصنف کی بڑے سائز کی تصویر اور اس کے ساتھ پرانی کتابیں، اخبارات اور قلمی مسودوں کے فوٹو گراف کا بھی انتظام ہوگا۔

اس نمائش کا ابتدائی مرحلہ ایک مفصل اسکرپٹ تیار کرنا ہے اس کے بعد یہ تخمینہ لگایا جائے گا کہ اس سلسلے میں کتنی تصویریں، ہاتھ کی ڈرائنگ، ٹرانسلائٹوں وغیرہ کی ضرورت ہوں گی اور پھر اخراجات کا تخمینہ تیار کیا جائے گا۔ سامان محکمۂ اطلاعات اترپردیش کے مشورے تیار کرایا جائے گا۔ سامان تیار ہو جانے کے بعد اسے کم سے کم [illegible] فٹ کے ایک خوبصورت اور دلکش پولین میں (جو بجلی کے بلبوں اور ٹیوب لائٹ سے مزین ہوگا) نہایت سلیقے سے نمائش کی تیار کی ہوئی چیزوں کی ترتیب دی جائے گی۔ اندازہ ہے کہ اس نمائش کے تیار کرانے میں تقریباً چالیس ہزار روپے خرچ ہوں گے اور پولین بنانے میں [illegible] یا دس پندرہ ہزار۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ نمائش تیار ہو جائے گی تو اس کی مانگ ہندوستان کے ہر شہر میں ہوگی اور یہ اردو کی نشر و اشاعت اور اردو سے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہوگا۔

رابطہ عوام سب کمیٹی؛ عوام سے رابطہ قائم کرنے اور اردو کے بارے میں ان کی شکایتیں معلوم کرنے کے لیے تشکیل کی گئی ہے۔

اکاؤنٹس سب کمیٹی اکاڈمی کے دفتر کے اکاؤنٹس کے قواعد ضوابط وغیرہ وضع کرنے کا کام کر رہی ہے اور تقررات سب کمیٹی اردو اکاڈمی کے دفتر میں اسامیاں پر کرنے کے سلسلے میں امتحان اور انٹرویو لیتی ہے اور اہل ترین امیدوار کا تقرر کرتی ہے۔

ایک سال کے اندر اردو اکاڈمی کے کاموں کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے اس کے متعلق یہ دعویٰ بالکل نہیں کیا جا سکتا کہ اس ایک سال کی مدت میں بہت کچھ کر لیا گیا ہے۔ لیکن اس امر کے پیش نظر کہ یہ اکاڈمی کا پہلا سال تھا۔ اسے متعدد مرحلوں سے گزرنا تھا اور اب بھی گزرنا ہے۔ جو کچھ بھی اب تک ہوا ہے وہ ایک خوشگوار اور پرامید ابتدا ضرور ہے۔

★

جنگِ آزادی کے ایک جانباز سپاہی (صفحہ ۵۳ کا بقیہ)

کیونکہ جس مقصد کے لیے آپ نے سیاست کا راستہ اپنایا تھا، وہ پورا ہو گیا تھا۔ سیاست سے دست بردار ہو کر آپ علمی اور ادبی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ آپ کو اردو ادب اور اردو شاعری سے ایک خصوصی لگاؤ ہے۔ آپ ایک کہنہ مشق شاعر اور اعلیٰ پایہ کے ادیب ہیں۔ اس کے علاوہ آپ عربی اور فارسی کے بھی جید عالم ہیں۔ آپ کی مالی حالت ہمیشہ کمزور رہی ہے اس لیے کوئی ضخیم کتاب نہ کرا سکے البتہ نظموں کی چو ورقی "چالیس بیتالیس کتابیں شائع کرا چکے ہیں جن میں "آہ"، "نظارہ"، "پیسہ"، "جھگڑا"، "ہمشتہ" کافی مقبول ہوئی ہیں۔ خصوصاً جھگڑا تو لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئی۔

آج کل آپ دمہ جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس موذی مرض نے بے حد کمزور کر دیا ہے۔ کام کاج برائے نام رہ گیا ہے۔ زیادہ تر وقت چارپائی پر پڑے پڑے گزرتا ہے۔ جب کبھی طبیعت سازگار ہوتی ہے تو اپنے چھوٹے سے کتب خانے میں بیٹھ جاتے ہیں اور وقت گزاری کی کچھ سبیل نکل آتی ہے۔

★

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

چوتھے منصوبے میں مزید طبی سہولتوں میں اضافے کا پروگرام ••• دو مزید میڈیکل کالجوں کا قیام ••• چودہ ہزار نجی ٹیوب ویلوں کو بجلی کی فراہمی ••• اضلاع میں نل کنووں کو بجلی کی فراہمی کے سلسلے میں مقررہ نشانوں سے زیادہ کام ہوا ••• دیہی صنعتوں کی ہمہ گیر ترقی ••• صنعتی تعلقوں کا پروگرام تقریباً مکمل ••• تیسرے پنجسالہ منصوبے میں چھوٹی صنعتوں کی پیداوار میں ۸۰ فی صد کا اضافہ ••• پردیش میں خاندانی منصوبہ بندی کی تیز تر ترقی کے ریڈیو اسٹیشنوں میں خصوصی شعبے کا قیام ••• چار ضلعوں میں چھوٹی بچت کے نشانے سے زیادہ جمع ••• تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے ٹیچروں کو نقد انعامات ••• ملازمین کے بہبودی پروگرام کے سلسلے میں مزید کیفے ٹیریا کا قیام ••• متفرقات

اتر پردیش کے ۹۲.۶ و ۱۱۱۳ لاکھ روپے کے چوتھے پنجسالہ منصوبے کی مدت میں علاج کی مزید سہولتوں کی فراہمی کے لیے ریاست کے مختلف اسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں ۵۰۰۰ پلنگوں کا اضافہ کرنے کی تجویز ہے۔ ان پلنگوں کے اضافے سے اتر پردیش میں ۲۵۰۰ کے لیے ایک پلنگ کا موجودہ تناسب ۲۲۲۲ کی آبادی کے لیے ایک پلنگ ہو جائے گا۔ اس وقت ریاست کے مختلف اسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں مریضوں کے لیے ۴۰۰۳۲ پلنگ فراہم ہیں۔

چوتھے منصوبے کے دوران اضافہ کیے جانے والے پلنگوں میں سے ۳۰۰۰ عام پلنگ ہوں گے نیز ۲۰۱۳ پلنگ ریاست کے مختلف میڈیکل کالجوں سے ملحق اسپتالوں کو الاٹ کیے جائیں گے اور ۴۴۳ پلنگ ملازمین ریاستی بیمہ اسکیم کے تحت چلائے جانے والے مختلف اسپتالوں میں فراہم کیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں دق کے مریضوں کے لیے ۳۱۶ اور دیہی ایلوپیتھک ڈسپنسریوں میں ۔۔۔ کا اضافہ کیا جائے گا اور بقیہ ۵۰۰ پلنگ شہری علاقوں کے آیورویدک اسپتالوں اور دیہی آیورویدک ڈسپنسریوں میں فراہم کیے جائیں گے۔

اس کے علاوہ منتخب تحصیل کے اسپتالوں میں پہلی بار ایکسرے یونٹوں اور سرجن کا انتظام کرنے کی بھی تجویز ہے۔

منصوبہ کی مدت میں علاج کی سہولتوں کی اسکیموں پر ۹۴۳ لاکھ روپے سے زیادہ رقم صرف کرنے کی تجویز ہے۔

جھانسی اور گورکھپور میں مزید دو میڈیکل کالج کھولنے کی تجویز ہے جس کے نتیجے میں میڈیکل طلباء کے سالانہ داخلوں کی تعداد ۷۵۰ سے بڑھ کر ۱۰۲۳ ہو جائے گی اور ریاست میں میڈیکل کالجوں کی تعداد بنارس اور علی گڑھ یونیورسٹیوں کے دو مرکزی امداد یافتہ میڈیکل کالجوں کے علاوہ سات ہو جائے گی۔

ان کالجوں کے قیام کے بعد چوتھے منصوبے کے آخر تک ڈاکٹروں کا تناسب آبادی کے فی ۶۹۱۰ پر ایک ڈاکٹر ہو جائے گا۔ موجودہ تناسب آبادی کے فی ۸۰۰۰ پر ایک ڈاکٹر ہے جب کہ دوسرے منصوبے کے آخر میں یہ تناسب آبادی کے فی ۰۰۰ ۸ ایک ڈاکٹر تھا۔

اتر پردیش میں مالیاتی سال رواں میں ۳۱ جنوری ۱۹۶۵ء تک ۱۰ ہزار کے مقررہ نشانے کے مقابلے میں ۱۴ ہزار سے زیادہ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کی گئی۔

ڈویژنوں میں میرٹھ سرفہرست رہا جہاں اس مدت میں ۳۲۲۷ ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کی گئی اس کے بعد وارانسی ڈویژن کا نمبر رہا جہاں یہ تعداد ۲۲۷۶ رہی۔ باقی ڈویژنوں میں سے گورکھپور میں ۱۹۴۹ بریلی میں ۱۶۳۹ فیض آباد میں ۱۳۲۹ آگرہ میں ۱۲۰۲ الہ آباد میں ۷۹۸ لکھنؤ میں ۳۰۸ جھانسی میں ۳۶۱ اور کمایوں میں ۳۰۱ ٹیوب ویلوں پمپنگ سیٹوں کو بجلی دی گئی۔

ریاست کے صحت عامہ اور علاج سے متعلق چوتھے پنجسالہ منصوبے کے تحت

نظامت صنعت نے دیہی صنعتوں کی ۳۸۰۰ امداد باہمی انجمنیں ۔۔۔

رجسٹرڈ اداروں کو گزشتہ ستمبر میں ختم ہونے والی ڈیڑھ سال کی مدت میں مجموعی طور پر بالترتیب ۵۰ء۲۳ لاکھ روپے اور ۳۰ء۳ لاکھ روپے کی مالی امداد منظور کی۔ یہ مالی امداد ریاستی کھادی اور دیہی صنعت بورڈ کی منظوری کے مطابق دی گئی۔

یہ مالی امداد جن صنعتوں کو دی گئی ان میں خاص خاص یہ ہیں — ہاتھ سے کاغذ تیار کرنے کی صنعت، تیل کی گھانی، ہاتھ سے دھان کی کٹائی، چمڑہ، گڑ، کھانڈساری، مٹی کے برتن، ریشہ اور صابن کی صنعتیں۔ زیر نظر مدت میں دیہی صنعتوں کی ۲۵ نئی امداد باہمی انجمنوں کی تنظیم کی گئی جن سے ان کی مجموعی تعداد ۳۱۹ تک پہنچ گئی۔

کھادی اور صنعتوں کے اداروں نے تقریباً ۴۰ء۳ کروڑ روپے کی مالیت کا سامان تیار کیا اور ۳۵ء۴ کروڑ روپے کی بکری ہوئی۔ ان توں سے ۹۰ ہزار سے زیادہ افراد کو پورے اور جزوی وقت کا کام ملا۔

ریاست اتر پردیش میں مختلف زیر تعمیر صنعتی تعلقوں میں ۱۰۳۵ مجوزہ شیڈوں میں سے ۹۶۷ شیڈ تعمیر کیے جا چکے ہیں۔

چند تعلقوں کو چھوڑ کر جن میں ناگزیر وجوہ کی بنا پر کام رکا ہوا ہے گزشتہ تین پنجسالہ منصوبوں کے تحت مجوزہ تمام صنعتی تعلقے قریب قریب مکمل ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۶ صنعتی تعلقوں میں مال تیار بھی ہونے لگا ہے۔ ان تعلقوں میں ۱۲۶۰۰ اشخاص کو روزگار فراہم کیا گیا ہے اور سالانہ تقریباً ۵ کروڑ روپے کی مالیت کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ یہ تعلقے اتر پردیش کے تقریباً تمام اضلاع کا احاطہ کرتے ہیں۔ صنعتی تعلقوں میں تعمیر شدہ ۹۶۷ شیڈوں میں سے گزشتہ ستمبر تک ۶۰۰ صنعت کاروں کو الاٹ کیے جا چکے ہیں، ۴۳۵ پر قبضہ مکمل ہو گیا ہے اور ۳۲۲ میں مال تیار ہونا شروع ہو گیا ہے۔

اتر پردیش میں ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کرنے کے لیے تیز رفتار پروگرام کے تحت ۴۸ ضلعوں میں شاندار نتائج حاصل ہوئے۔ ان میں سے کچھ ضلعوں میں اگرچہ خشک سالی کی وجہ سے بجلی لگانے کے سالانہ نشانے کافی بڑھا دیے گئے تھے تاہم وہاں مقررہ نشانوں سے دوگنے سے زیادہ کام ہوا جب کہ جنوری کے آخر تک موجودہ مالیاتی سال ختم ہونے میں دو مہینے باقی تھے۔

مقررہ نشانوں کے فی صد کے اعتبار سے ۴۸ ضلعوں میں جنوری کے آخر تک جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سہارنپور ۲۶۷ء۲، رام پور ۲۲۴، مظفر نگر ۲۰۳ء۷، بدایوں ۱۹۵، مراد آباد ۱۶۹ء۵، میرٹھ ۱۶۶ء۲، بلند شہر ۱۶۰ء۴، نینی تال ۱۵۰، علی گڑھ ۱۴۷ء۳، آگرہ ۱۳۶ء۶، شاہجہاں پور ۱۳۵، فیض آباد ۱۳۲ء۴، بجنور ۱۳۱ء۳، کھیری ۱۲۹ء۵، وارانسی ۱۰۷ء۷ اور اعظم گڑھ ۱۰۳ء۷۔

اتر پردیش میں تیسرے منصوبے کے دوران چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی پیداوار میں تقریباً ۸۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اس مدت میں صنعتی پیشوں میں کام کرنے والوں کی تعداد میں ۱۱۱ء۸ فیصدی اضافہ ہوا۔

تیسرے منصوبے کی مدت میں تقریباً ۷۵۳ء۲ چھوٹی صنعتی یونٹوں نے ۱۰۹ء۶۷ کروڑ روپیہ کی مالیت کا مال تیار کیا اور ۱۱۰۶۰۰ اشخاص کو روزگار فراہم کیا جب کہ اس منصوبے کے شروع میں ۹۳ء۹ یونٹوں نے ۳۹ء۱۶ کروڑ روپیہ کی مالیت کا مال تیار کیا تھا اور ۵۰۵۹۵ اشخاص کو روزگار فراہم کیا تھا۔

اس طرح گزشتہ منصوبے کی مدت میں صنعتی یونٹوں کی تعداد میں ۴۰۳ء۱ اور تیار مال کی مالیت میں ۷۰ء۵۱ کروڑ روپے اور بے روزگار افراد کی تعداد میں ۶۰ ہزار کا اضافہ ہوا۔

صنعتوں کے سکٹر میں بڑی صنعتیں بھی شامل ہیں، چھوٹی صنعتی یونٹیں اب کل کا ۲۴ فی صد مال تیار کر رہی ہیں اور کل روزگار کا ۳۵ء۰ فیصد روزگار فراہم کر رہی ہیں جب کہ ۱۹۶۰ء کے آخر میں یہ تناسب بالترتیب ۱۳ اور ۲۰ء۴ فیصد تھا۔

خاندانی منصوبہ بندی پروگراموں کو مستحکم بنیاد پر آگے بڑھانے کے لیے ریاست میں لکھنؤ، الہ آباد اور رام پور کے ریڈیو اسٹیشنوں میں ایک خصوصی خاندانی منصوبہ بندی شعبہ قائم کیا جائے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ یونٹ جو ایک ڈپٹی افسر، ایک فیلڈ رپورٹر اور ایک اسکرپٹ رائٹر پر مشتمل ہوگی آئندہ

میں ۵ دسمبر کو کھولا گیا تھا اس لیے گنڈی کے باوجود ماہانہ ۲۰ ہزار روپے
کی بکری ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ اب اس کی بکری بڑھ کر ۵۰ ہزار روپے ماہانہ
تک پہنچ جائے گی۔

متفرقات

گاؤں سماجوں کے تالابوں میں مچھلی پالنے کی اسکیم۔ حکومت اتر پردیش
نے امسال رواں سال میں دیہی علاقوں میں گاؤں سماجوں کے تالابوں میں
جن کا مجموعی رقبہ ۱۰ ایکڑ ہے مچھلی پالنے کی ایک اسکیم منظور کی ہے۔ اس پر
تخمیناً ۳ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔
اس اسکیم پر مختلف مرحلوں میں جونپور، اعظم گڑھ، دیوریا، گورکھپور،
بستی، وارانسی، میرٹھ، آگرہ، پرتاپ گڑھ، غازی پور
میں عمل درآمد کیا جائے گا۔
ہر گاؤں سبھا کو مچھلی پالنے کے لیے تالابوں کو گہرا
کرنے کے لیے فی ایکڑ تین ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ تالاب
گہرا کرنے کے کام کو تسلی بخش طور پر پورا کرنے پر گاؤں سبھا
کی رقم کا ایک چوتھائی مالی امداد میں تبدیل کر دیا جائے گا۔
بہادری کے لیے پنشن۔ حکومت اتر پردیش میں شری
موضع ... پور ضلع گورکھپور کے پسماندگان کو ۳۰ روپے
پنشن منظور کی ہے۔ شری رام ... اہلکار ... سے
ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوئے تھے۔

اہم قوانین کا خلاصہ

اتر پردیش جوت چک بندی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۶۶ء
(ایکٹ نمبر ۲۱ ۱۹۶۶ء)

اس قانون کا مقصد اتر پردیش چک بندی ایکٹ ۱۹۵۳ء
میں ترمیم کرنا ہے جس کی رو سے کاغذات کی تصحیح کے لیے ہر کارروائی
اور حقوق کے اعلان کے بارے میں ہر مقدمہ اور کارروائی جو کسی عدالت میں
ہو، اس عدالت کے حکم سے ختم سمجھی جائے گی بشرطیکہ ایسا حکم فریقین کو نوٹس
دینے کے بعد اور ان کو اپنے عذرات بیان کرنے کا موقع دینے کے بعد دیا گیا
ہو۔ نیز اشتہار دینے کے بعد متعلقہ علاقے میں واقع آراضی سے متعلق ہر ایسا
حکم رد ہو جائے گا۔

اتر پردیش پنچایت راج (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۶۶ء
(ایکٹ نمبر ۲۰ ۱۹۶۶ء)

اس قانون کی رو سے اتر پردیش پنچایت راج ایکٹ ۱۹۴۷ء کی دفعہ ۱۲
میں موجودہ ذیلی دفعہ (۲) کو مندرجہ ذیل عبارت سے بدل دیا گیا ہے:
"(۲) دفعہ ۱۲ - کی شرائط کے بموجب ہر گاؤں پنچایت کی
میعاد پانچ سال یا ریاستی حکومت کے اعلان کے بموجب زیادہ سے
زیادہ آٹھ سال تک ہوگی۔"
ساتھ ہی اتر پردیش پنچایت راج (ترمیمی) آرڈیننس
۱۹۶۶ء کو منسوخ کرتے ہوئے زیر نظر قانون
آرڈیننس کے تحت جو بھی کارروائی کی گئی ہو
کے تحت متصور ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا
۴ جولائی ۱۹۶۶ء کو ہوا۔

اتر پردیش صنعتی کاروبار (بیـ
کی غرض سے خاص انتظامات
ایکٹ ۱۹۶۶ء (ایکٹ نمبر ۲۵ ۱۹۶۶

اس قانون کا منشا ان صنعتی اداروں
بیکاری کے انسداد کے لیے چلتے رہنا لازمی
تعلقات، مالی ذمہ داریوں اور اسی طرح
ریاستی حکومت کو ایک محدود مدت کے لیے
کا اختیار دینا ہے۔ اس کی رو سے ریاستی
صنعتی ادارے کے بارے میں جو جاری کیا
کے زیر انتظام ہو گیا ہو یا جسے قرض یا امداد
اطمینان ہو جائے کہ بیروزگاری کے روکنے
رکھنا یا دوبارہ چالو کرنا ضروری ہے تو ریاستی
کاروبار قرار دے سکتی ہے۔